علی سردار جعفری بحیثیت شاعر، نقاد و صحافی

مقالہ
برائے
ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار
محمد عبدالرؤف
ایم اے۔ایم فل (اردو)
رجسٹریشن نمبر:08HUPH03

نگراں
ڈاکٹر محمد انورالدین
پروفیسر آف اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبہ اردو
اسکول آف ہیومانِٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500046

2013

ALI SARDAR JAFRI BAHYSIAT SHAER, NAQQAD-O-SAHAFI

(Ali Sardar Jafri as a Poet, Critic & Journalist)

Thesis

Submitted to the University of Hyderabad
in partial fulfilment of the requirement
for the award of Doctor of Philosophy in Urdu

Submitted by

Mahammed Abdul Rawoof
M.A, M.Phil. (Urdu)
Reg. No. 08HUPH03

Supervised by

Dr. Mohammed Anwaruddin
Professor of Urdu, University of Hyderabad

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad – 500 046

2013

Dated: / /2013

DECLARATION

I Mohammed Abdul Rawoof, hereby declare that this thesis entitled "Ali Sardar Jafri bahysiat Shaer, Naqqad-o-Sahafi" (Ali Sardar Jafri as a Poet, Critic and Journalist) submitted by me under the guidance and supervision of professor Mohammed Anwaruddin is a bonafied research work.

I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma.

(Mohd. Abdul Rawoof)
Reg. No. 08HUPH03

Dated: / /2013

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled “Ali Sardar Jafri bahysiat Shaer, Naqqad-o-Sahafi” (Ali Sardar Jafri as a Poet, Critic & Journalist) submitted by Mohammed Abdul Rawoof, Registration No. 08HUPH03 in partial fulfilment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in Urdu is a bonafied work carried out by him under my supervision and guidance.

The thesis has not been submitted previously in part or in full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma.

(Signature of the Supervisor)

/Countersigned/

Head, Department of Urdu

Dean, School of Humanities

فہرست ابواب

باب		عنوان	صفحہ نمبر
پہلا باب	:	سوانح	009
دوسرا باب	:	شخصیت	131
تیسرا باب	:	ترقی پسند تحریک اور سردار جعفری کی وابستگی	223
چوتھا باب	:	شاعری	258
پانچواں باب	:	تنقید نگاری	559
چھٹا باب	:	صحافتی خدمات	758
ساتواں باب	:	سردار جعفری ادیبوں، دانشوروں اور ممتاز شخصیتوں کی نظر میں	826
آٹھواں باب	:	اختتامیہ	886
کتابیات (ببلیو گرافی)			919

”پیش لفظ“

پیش لفظ

ایم (اردو) کی تعلیم کے دوران ہی میرا جھکاؤ تحقیق وتنقید کی طرف ہونا شروع ہوگیا تھا۔ایم فل کا نصاب تین پرچوں ''طریقہ تحقیق، متنی تنقید اور عملی تنقید'' پر مشتمل تھا۔نصاب کی کتابوں اور حوالہ جاتی سفارش کردہ کتابوں کا مطالعہ سونے پہ سہاگہ اساتذہ کرام کا سمجھانا اور اپنے عملی تجربے کو share کرنا کچھ ایسا دلکش تھا کہ تحقیق سے میرے لگاؤ کو مہمیز ملی اور میں نے پی ایچ ڈی ڈگری کے لئے تحقیقی کام کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اردو میں علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری بڑی تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ایم اے کے مطالعہ کے دوران اس تحریک سے وابستہ اہم ادیبوں اور شاعروں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ان میں علی سردار جعفری کی شخصیت کچھ منفرد نظر آئی۔ بنیادی طور پر وہ ایک عظیم شاعر تو ہیں ہی نثر کی بعض اصناف ادب پر بھی انہوں نے تخلیقی کام کیا ہے۔تنقید اور صحافت میں بھی ان کا وقیع کام موجود ہے۔انہوں نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انسان دوستی کو اپنا نصب العین بنایا۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ کے بعد موضوع تحقیق کے انتخاب کے مرحلے میں، میں نے شعبہ اردو کے ایک سینئر استاد، محقق، نقاد پروفیسر محمد انورالدین کی نگرانی میں علی سردار جعفری پر کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پروفیسر موصوف نے مجھے سردار جعفری کی شاعری، تنقید اور صحافتی خدمات پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد بیگ احساس نے اسے منظوری دے دی اور میرا موضوع تحقیق ''علی سردار جعفری بحیثیت شاعر، نقاد اور صحافی'' طے پایا۔

مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''سوانح'' ہے۔اس میں علی سردار جعفری کا شجرہ نسب، ددھیال ننھیال کا تعارف، سردار جعفری کی ولادت، بچپن، تعلیم، شادی، اولاد، معمولات، معاشی حالات، حلقہ احباب، کمیونسٹ پارٹی میں شرکت، جدوجہد آزادی میں سرگرم رول، عملی سیاست، جیل، ادبی زندگی کا آغاز، تصانیف، صحافت، انعامات واعزازات، مشاعروں، کانفرنسوں وسمیناروں میں شرکت، سردار جعفری کے معترضین وموئیدین، سردار جعفری کی زندگی کا نصب العین، علالت، وفات وغیرہ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ دوسرا باب ''شخصیت'' ہے۔ اس باب میں ابتداء میں سردار جعفری کی شخصیت کی تشکیل وتعمیر کا پس منظر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد سردار جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جیسے سیرت وکردار، عادات واخلاق، اہل خاندان کے ساتھ روابط وسلوک، پڑوسیوں، کاریگروں، کسانوں، مزدوروں، دوست واحباب، ہمعصر ادیبوں، شاعروں، مہمانوں، ملاقاتیوں سے روابط، برتاؤ، بے پناہ مصروفیت، اندازِ گفتگو، قناعت پسندی، منکسرالمزاجی، قوت برداشت، جیل کی زندگی، رجائیت، لیڈرشپ کی صلاحیتیں، معاصرین پر اثر، وسیع مطالعہ، کتابوں اور علم کی قدردانی، انسان دوستی وغیرہ۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ستون اور روح رواں تھے۔تیسرا باب ''ترقی پسند تحریک اور سردار جعفری کی وابستگی'' ہے۔اس باب میں ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء، اس تحریک کی اساس اور مقاصد، تحریک کی دین کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک سے سردار جعفری کی وابستگی اور خدمات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھا باب ''شاعری'' ہے۔اس باب کے آغاز میں شعر کی خصوصیات، شاعر وادیب کا انسانیت کے تئیں فرض منصبی، ترقی پسند شاعری اور اس کے موضوعات، ترقی پسندوں کا صنف ''نظم'' کو اپنانے کی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سردار جعفری کے دس شعری مجموعے شائع ہوئے جیسے پرواز، نئی دنیا کو سلام، مٹنوی جمہور، خون کی لکیر، امن کا ستارہ، ایشیاء جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراہن شرر لہو پکارتا ہے۔سردار جعفری کی آزاد نظموں کے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔سردار جعفری کی انقلابی شاعری، رومانی شاعری اور رومان انقلاب کا امتزاج رکھنے والی شاعری کا ان کی نظموں کے حوالوں سے مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔نظموں کے بعد ان کی غزل گوئی، مرثیہ نگاری اور قطعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔سردار جعفری کے شعری اسلوب کے ضمن میں طرز اظہار، ڈکشن، تراکیب، تشبیہات واستعارات، علامات، جذبات واحساسات، بیانیہ، خطیبانہ لہجہ، جوش وولولہ، ہمہمہ، منظر نگاری، ترسیل، پیکر تراشی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

پانچواں باب ''تنقید نگاری'' ہے۔اس باب میں سردار جعفری کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ابتداء میں تنقید، عملی تنقید، ترقی پسند تنقید، مارکسی نظریۂ تنقید کی وضاحت کی گئی ہے۔اس کے بعد علی سردار جعفری کی تصانیف، ''مخدوم محی الدین''، ''ترقی پسند ادب''، ''اقبال شناسی''، ''پیغمبران سخن''، ''سرمایہ سخن'' کے حوالوں سے سردار جعفری کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔تصانیف کے علاوہ سردار جعفری کے تنقیدی مضامین، دیباچے اور تبصرے، مکاتیب، خطبات وتقاریر، انٹرویو اور ادبی شخصیتوں سے ملاقاتوں میں سردار جعفری کی دیگر ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات پر جو

تنقیدیں لکھی گئی ہیں،ان کا جائزہ لیا گیا ہےاوران میں سردارجعفری کے جوتنقیدی افکار ملتے ہیں،ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔تنقید میں سردارجعفری کےاسلوب کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا باب ''صحافتی خدمات'' ہے۔اس باب میں سردارجعفری کی صحافتی خدمات میں پرنٹ اورالیکٹرانک میڈیا دونوں ہی شامل ہیں۔سردارجعفری کی ہفت روزہ پرچم لکھنو، ماہنامہ نیا ادب لکھنوومبئی، سہ ماہی گفتگو میں وقیع خدمات کا جائزہ لیا گیا جن میں تنظیمی،ادارتی ذمہ داریاں شامل ہیں۔انہوں نے اپنے وقیع اداریے،تنقیدی مضامین اور دیگر تخلیقات بھی ان رسالوں میں شائع کئے۔سردارجعفری نے ہندوستانی بک ٹرسٹ کے ایڈیٹر، کتاب نما کے مہمان مدیر،فن اورشخصیت کے کملیشور نمبر کی مجلس مشاورت میں بحیثیت ممبر،فن اورشخصیت کے غزل نمبر کے نگراں کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔الیکٹرانک میڈیا میں ریڈیائی تقاریر، انٹرویو،فلم سازی،فلمی کہانیوں،فلمی گیت، دستاویزی فلمیں، تمثیلیں، روشنی اورآواز پروگرام کے اسکرپٹ رائٹر،ٹی وی سیریل میں خدمات انجام دیں۔ٹی وی کےاعزازی پروڈیوسر بھی رہے۔سردارجعفری کے پرنٹ اورالیکٹرانک میڈیا میں ان تمام کارناموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ساتواں باب ''سردارجعفری ادیبوں، دانشوروں اورممتاز شخصیتوں کی نظر میں'' ہے۔اس باب میں سردار جعفری کی شخصیت،فن اورانسانیت کے تئیں ان کی خدمات اوران کے مقام کے بارے میں بہت سے ادیبوں، دانشوروں اورممتاز شخصیتوں کی آراءدرج کی گئی ہیں۔آٹھواں باب ''اختتامیہ'' ہے جس میں سردارجعفری کی شاعری، تنقید نگاری،صحافتی خدمات کالب لباب ہے۔اس کے بعد بلیوگرافی دی گئی ہے۔

اس تحقیقی کام کے سلسلہ میں جن کتب خانوں سے مواد حاصل کیا گیا ان میں اندرا گاندھی میموریل لائبریری، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد کی دیگر جامعات، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، نظام ٹرسٹ لائبریری حیدرآباد، مولانا آزاداورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لائبریری شامل ہیں۔

میں دل کی گہرائی سے شکرگذار ہوں اپنے ہردلعزیز سپروائزر پروفیسر محمد انورالدین کا جنہوں نے میرے تحقیقی کام میں بھرپور رہنمائی کی۔ میں شکرگذار ہوں صدر شعبہ اردو پروفیسر کے مظفرعلی شہ میری کا جنہوں نے مفید مشوروں سے نوازا۔شعبہ اردو کے دیگر سبھی اساتذہ کرام سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد بیگ احساس، ڈاکٹر رضوانہ معین،

ڈاکٹر عرشیہ جبیں، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر نشاط احمد اور ڈاکٹر زاہد الحق میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے میرے تحقیقی کام کے دوران اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور کسی نہ کسی طرح میری حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے اہل وعیال، بہن بہنوئی، بھائی کا شکر گذار ہوں کہ ان سبھوں نے مجھے اپنا تعاون دیا۔ میں اپنے مرحوم والدین کے درجات کی بلندی کیلئے اللہ ربّ العزت سے دعا گو ہوں جن کی ہدایتیں اور نصیحتیں ہر وقت میرا عزم وحوصلہ بندھائے رکھتی ہیں۔

محمد عبدالرؤف

ریسرچ اسکالر ایم اے ایم فل (اردو)

حیدرآباد

مورخہ

باب اول

"سوانح"

سوانح

نام :

علی سردار جعفری تھا۔حافظ شیرازی کے مدحیہ اشعار سے ان کے نام کا سجع بنتا ہے۔حافظ کے قصیدے کا مطلع ہے ۔

مقدر یکہ زآثار صنع کرد اظہار سپہر دہر دمہ وسال وماہ ونیل ونہار

بدوستی نبیؐ و ولی اساس نہاد جہاں وہر چہ دروہست،خالق جبار

اس کے بعد حافظ نے حضرت علیؓ کی منقبت میں اشعار کہے ہیں۔اس منقبت کا شعر یہ ہے ۔

علیؓ امام و علیؓ ایمن و علیؓ ایمان

علیؓ امین و علیؓ سرور وعلیؓ سردار

حافظ کے اس آخری شعر سے سردار جعفری کے والد کے ایک دوست نے ان کے نام کا سجع کہا تھا۔ ؎

بہ فیض احمدؐ مرسل ہوئے علیؓ سردار

سردار کے بچپن کی ایک رباعی ملاحظہ کیجئے:۔

نور نظر احمد مختار ہوئے ہیں
قلب وجگر حیدر کرار ہوئے ہیں
ہیں فتح و ظفر قوت بازو سردار
یعنی پسر جعفر طیار ہوئے ہیں

تخلص:

شاعری میں سردار یا علی سردار تخلص استعمال کرتے رہے لیکن مرثیے ''حزیں''تخلص کے تحت لکھے۔اس سلسلہ میں رضا جعفری نے روشنی ڈالی ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

''حزیں کے قلمی نام سے اب وہ ایک کے بعد ایک مرثیے کہنے اور پڑھنے لگے۔۔۔بس ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ حزیں کے دور کو یاد رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ان کے دوست کالی داس گپتا رضا بمبئی کی دسمبر 1981ء کی ایک صبح کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔''میں نے کہا کہ شروع شروع میں تو آپ مرثیہ بھی کہتے تھے اور اس وقت آپ کا تخلص حزیںؔ ہوتا تھا۔۔۔میں نے ''الناظر''لکھنو کا ایک قدیم شمارہ ان کو پیش کر دیا جس میں جعفری صاحب کا مرثیہ حزیں تخلص کے ساتھ چھپا تھا۔جاتے ہوئے وہ یہ متاع گم گشتہ اپنے ساتھ لے گئے۔اب یاد نہیں کہ انہوں نے وہ شمارہ لوٹا دیا تھا یا نہیں۔۔۔افسوس یہ ہے کہ اب نہ سردار جعفری ہیں اور نہ کالی داس گپتا رضا۔حزیں کے تخلص سے لکھے گئے مرثیے اب ان کے خاندان میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔''

1

انور ظہیر خاں نے سردار جعفری کا حلیہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے:

''سردار جعفری کے اوسط درجے کے سیپ سے کان، موتی جیسے دانت، پھول کی پنکھڑی جیسے پتلے پتلے، گلابی لب ہیں۔ ہونٹوں کے دونوں سروں سے رخساروں کو مس کرتے اوپر کو جاتے ہوئے دو خطوط جو ناک کے آدھوں آدھ پہنچ کر غائب ہو جاتے ہیں۔اس طرح منہ اور گالوں کے درمیان مساوی زاویوں کا ایک مثلث بنتا ہوا (مثلث جو تخلیق، زندگی اور ارتقاء کی علامت ہے)، اس مثلث کے اوپر دو زاویوں کے مابین دو نتھنے سانس اور آس کا ثبوت دیتے ہوئے، رخساروں پر سرخی بھی ہے، سفیدی بھی گویا Pinkish Rose کی دو پنکھڑیاں دھری ہوئیں، غلافی آنکھیں، آنکھوں کے دیے مدھم اور ملائم کو دیتے ہوئے بھنوؤں کے چھپّر دیز اور گنجان، جن کے کچھ دراز تنکے اپنی خودسری، سرکشی اور آزادی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔جبیں ماہِ تمام کی سئی کے داہنی داہنی جانب بھنوؤں کے درمیان، ذرا اوپر کو اُٹھا ہوا کول کول، کالا مسّا رکھا ہوا، گویا ماہِ تمام میں ایک سیاہ داغ، سفید مکھن کی طرح لانبی زلفیں گردن کی طرف پلٹی ہوئی جو سامنے سے سنوری نظر آتی ہیں، مگر گدی اور کنپٹی کے گرد الجھی الجھی رہتی ہیں جنہیں ہوا کے غیر مرئی ہاتھ چمپئی کتابی چہرے پر بکھرانے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں، اور انھیں بڑے پیار سے تخلیق کی گنگا بہانے والی انگلیاں سنوارنے میں لگی رہتی ہیں۔ان کے یہاں سنوارنے کا عمل ہستی سے گیتی تک پھیلا ہوا ہے۔کرتا، پائجامہ، جیکٹ، شیروانی، چپل، جوتیاں، پینٹ شرٹ، سوٹ بوٹ۔غرض جو جی بولے اور جیسا موسم ہو ویسا لباس۔آواز میں جمالی سے زیادہ جلالی لہریے جیسے میدان جنگ میں عرب کا کوئی سورما رجز پڑھ ہو۔دماغ اربوں کھربوں، خلیوں کی آماجگاہ، جس سے ذہانت کی کرنیں پھوٹتی رہتی ہیں۔مطالعہ تقریباً ہر موضوع پر محیط اور حاضر مزاج اور عمل ترقی پسندانہ۔اپنے آپ میں ایک مشن، ایک تحریک، ایک منزل، اینگلز او رمارکس، رومی اور حافظ کوئٹے اور گورکی، کبیر، میرا اور میر، غالب، انیس اور اقبال، ایلیا اہرن برگ اور لوئی اراگاں، ناظم حکمت اور پابلو نرودا، ٹیگور گاندھی اور نہرو۔ان سب کی عظمت کے پرستار۔شخصیت کا مجموعی تاثر، دانشورانہ، جس پر عزم و رزم و بزم، سطوت و صلابت اور جلال کی چھوٹ پڑتی ہوئی۔'' 2

بقول نگار عظیم:

''سردار جعفری کے بال نہ کالے تھے نہ سفید بلکہ سرمئی رنگ کے تھے۔اس کا راز انہوں نے یہ بتایا کہ میں نے کبھی صابن استعمال نہیں کیا۔'' 3

شجرہ نسب:

سردار جعفری کا شجرۂ نسب سینتیسویں پشت میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے ہوتا ہوا ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملتا ہے۔ترتیب یوں ہے۔

1۔ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

2۔ حضرت فاطمۃ الزہراء و حضرت علیؓ

3۔ حضرت امام حسینؓ

4۔ حضرت امام علی زین العابدینؒ

5۔ حضرت امام محمد باقرؒ

6۔ حضرت امام جعفر صادقؒ

7۔ محمد المامون الملقب بہ کوکب دیباج

8۔ علی الحارصی

9۔ علی خاصی

10۔ حسن حارصی

11۔ ابو طاہر

12۔ جعفر

13۔ سید سلطان

14۔ سید احمد

15۔ سید عبداللہ (عرف قلندر)

16۔ سید محمد

17۔ شمس الدین شیرازی

18۔ جمالی الدین

19۔ شرف الدین

20۔ کبیر الدین

21۔ سید بڑے

22۔ سید محمد

23۔ سید محمود

24۔ علاؤالدین

25۔ دریا خاں

26۔ اجمل

27۔ مربی

28۔ سید رحمان علی

29۔ باقی

30۔ لطف علی

31۔ روشن علی

32۔ سردار علی

33۔ سپہ دار علی

34۔ عجائب علی

35۔ سید مہدی حسن

36۔ سید جعفر طیار

37۔ سید علی سردار

4

پیدائش:

سردار جعفری کی پیدائش 29 نومبر 1913ء کو مشرقی یوپی کے بلرام پور ضلع گونڈا، اُتر پردیش میں ہوئی۔ ان کی پیدائش پر ان کے والد کے قریبی دوست فرخ حسن نے ایک قطعہ میں تاریخ پیدائش نکالی جس کے آخری مصرع سے تاریخ 1332ھ نکلتی ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے۔

دیا حق نے جعفر کو ثانی پسر
ہر اک دیکھ کر جس کو شیدا ہوا
کہی دل نے تاریخ اس دم مرے
مبارک خوش اقبال پیدا ہوا

سردار جعفری کی تاریخ پیدائش بہت جگہوں پر 29 نومبر 1913ء درج کی گئی ہے اور البتہ بعض جگہوں میں اس پر اختلاف بھی ملتا ہے۔ سردار جعفری کی بہن ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

سردار بھائی، پانچ بہنوں اور ایک بھائی کے بعد 26 بقرعید مطابق 26 نومبر 1913ء کو بلرام پور میں پیدا ہوئے۔ والدین سے سنا ہے پیدائش کے وقت بہت گورے اور تندرست تھے۔ میں نے بزرگوں سے یہی تاریخ پیدائش سنی تھی ۔۔۔اماں سالگرہ بھی 26 بقرعید کو کرتی تھیں لیکن سردار بھائی کو 29 نومبر یاد ہے۔ اوپر تاریخ پیدائش کا قطعہ موجود ہے جو حضرات اس سے تاریخ نکالنا جانتے ہوں وہ معلوم کر سکتے ہیں۔''

5

عمر رضا نے تاریخ پیدائش کے اختلاف کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''ان (سردار جعفری) کے ایک دوست ایوب واقف نے لکھا ہے کہ ان (سردار جعفری) کا سنہ پیدائش 29 نومبر 1913ء ہے ۔۔۔اپنی پیدائش کے سلسلہ میں اس تاریخ کا تعین سردار جعفری نے خود کیا ہے ۔۔۔اس لیے اس کے متعلق کسی شبہ کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ۔۔۔کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے کہ جب انہوں نے سردار جعفری سے اس کی مزید تصدیق چاہی تو پھر انہوں نے 29 نومبر 1913ء ہی بتائی ۔۔۔ان کی والدہ نے بتایا تھا ولادت یکم محرم 1332 ہجری کو ہوئی تھی جو مطابق 29 نومبر 1913ء کے''۔

''انہوں نے اپنی مختلف تحریروں میں تاریخ پیدائش 29 نومبر 1913ء ہی لکھی ہے''۔ 6

''راقم الحروف بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سردار جعفری کی صحیح تاریخ پیدائش 29 نومبر 1913ء ہے''۔

آباواجداد:

رام لعل نے 1984ء میں خدا بخش لائبریری' پٹنہ کے لیے ایک انٹرویو لیا تھا جس میں انہوں نے سردار جعفری سے ایک سوال یہ کیا تھا؟۔'' آپ نے کہاں تعلیم پائی' آپ کے آباواجداد کہاں سے آئے تھے۔آپ کا اصلی وطن کونسا تھا اور کہاں کہاں جا کر آپ بسے؟

اس کے جواب میں سردار جعفری نے اپنے خاندان کے بارے میں یہ بتایا تھا۔

''میرا خاندان دراصل آگرے اور پہپر سر (سردار جعفری کے آبا واجداد پہپر سر (آگرہ) کے جعفری کہلاتے تھے۔اس مقام کو مسلمانوں نے ایک پہر کی مدت میں فتح کیا تھا۔اس وجہ سے اسے پہپر سر کہا جاتا تھا) کا بھرت پور خاندان ہے۔وہاں بھرت پور سے قریب ایک گاؤں تھا پہپر سر۔1947ء میں جیسے اور بڑی تباہیاں ہوئیں تو وہاں بھی تباہی ہوئی اور اس طرح سے وہ گاؤں بالکل خالی ہو گیا اور آگرے میں جو ہمارے خاندان کے لوگ تھے وہ آگرے سے بھی چلے گئے۔شاہ گنج کے محلے میں اور جناب اس میں سے کتنے خاندان ہیں جو کینڈا میں بسے ہوئے ہیں اور وہ بچے جو باہر پیدا ہوئے ہیں ہندوستان سے جانے کے بعد جواب جوان ہو گئے ہیں۔لیکن اب میرے والد اور میرے دادا اور پردادا ایک مقام ہے، بلرام پور لکھنو کے قریب ریاست تھی تعلق داری' وہاں یہ منتقل ہو گئے تھے۔یہ لوگ وہاں کی انتظامیہ میں شریک تھے' بڑے عہدیدار تھے''۔ 7

ستارہ جعفری نے بتایا ہے:

''ہمارا خاندان آگرہ کا ہے لیکن کوئی بزرگ ملازمت کے سلسلے میں ریاست بلرام پور آ گئے تھے۔بلرام پور کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے۔۔۔اُس وقت جو وہاں کے جاگیردار تھے اُن کو ہمارے بزرگ نے مہاراجہ بلرام پور کا خطاب دلوایا تھا پہلے زمانے میں تو چھوٹی سی بات کا بھی بہت بڑا احسان مانا جاتا تھا۔لہٰذا مہاراجہ نے ان کو اپنی ریاست کا منیجر بنا دیا اور رہنے کے لئے ایک بڑی سی کوٹھی دی جس کو خاندانی حیثیت مل گئی''۔ 8

دادا:

سردار جعفری کے دادا کا نام سید مہدی حسن جعفری تھا۔ستارہ جعفری نے بتایا:

''ہمارے دادا کو ریاست کی طرف سے چار گاؤں ملے تھے۔اس میں ضرورت کی ہر چیز پیدا ہوتی تھی اور باغات تھے۔ان میں آم' لیچی اور دوسرے پھل بکثرت پیدا ہوتے۔سال تمام ہونے کے بعد کچھ رقم ریاست کے خزانے میں داخل کر دی جاتی تھی۔'' 9

والد:

علی سردار جعفری کے والد کا نام سید جعفری طیار جعفری تھا۔وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔بستی کے سبھی لوگ

انھیں بڑے بھیا کہہ کر پکارتے تھے۔ستارہ جعفری نے اپنے والد کی ملازمت،علالت اور وفات کے بارے میں لکھا ہے:

ریاست بلرام پور کے اسلحہ خانہ (جہاں پر ہتھیار رکھے جاتے ہیں) اور توشہ خانہ کے آفیسر ہو گئے (توشہ خانہ جہاں مہاراجہ کے خاندان کے زیورات جواہرات اور کپڑے رکھے جاتے ہیں) وہ گرلس ہائی اسکول کے ایڈوائزری کمیٹی کے رکن تھے۔۔۔ابا جان اور چچا کے آفس جانے کے لیے بگھی تھی جس میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے۔کوچوان کے علاوہ دو آدمی بگھی کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے تب وہ روانہ ہوتی تھی۔تانگہ،ٹم ٹم اور ہاتھی بھی تھا۔۔۔یہ تمام لوازمات ریاست کی جانب سے تھے۔۔۔1948ء میں ابا جان اور آپا بہت سخت بیمار ہو گئے۔ابا جان کے مثانہ میں پتھری پڑ گئی تھی جس کے لیے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ بغیر آپریشن کے نہیں نکالی جا سکتی۔ابا جان بے حد مذہبی خیالات کے تھے۔ہم لوگوں کی کوششوں کے باوجود آپریشن پر تیار نہیں ہوئے۔کہتے تھے ڈاکٹر برانڈی استعمال کریں گے۔اب آخری عمر میں یہ گناہ نہیں کروں گا۔۔۔۔سات سال بیمار رہنے کے بعد فروری 1953ء میں ابا جان کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔بھائی جان نے فوراً سردار بھائی کو تار دیا۔جواب میں انہوں نے بھی تار دیا کہ میں آ رہا ہوں۔جس وقت سردار بھائی کی آمد کا تار ملا ہے۔ابا جان کا آخری وقت تھا۔ رَو باجی پانی پلا رہی تھیں اور میں سر دبا رہی تھی۔ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا اور پوچھا ''کیا سردار آ گیا''؟ کسی نے کہا ''ہاں آ گیا''بس آنکھیں بند کر لیں۔میرے چچا قریب کھڑے ہوئے تھے۔انہوں نے جھک کر دیکھا پھر ہم دونوں سے کہا ''بی بی! اب تمہاری خدمت کا وقت ختم ہو گیا''اور لحاف سے منہ ڈھک دیا۔ابا جان کی خالہ نے بلند آواز سے سورہ یٰسین پڑھنی شروع کر دی تب میری سمجھ میں آیا۔ابا جان ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔سردار بھائی دوسرے دن کی ٹرین سے پہنچے تب تک ابا جان سپرد خاک کر دیئے گئے تھے۔ابا جان کے چہلم کے دن اماں بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔'' 10

والدہ:

سردار جعفری کی والدہ کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔قصبہ میں وہ بڑی بہو کہلاتی تھیں۔والدہ کی کمزوری اور وفات کے تعلق سے ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''بھائی اور جوان بیٹیوں کی موت،پھر سردار بھائی کے بار بار جیل جانے کا دکھ اس نے اماں کو بھی بالکل بیکار اور کمزور کر دیا تھا۔۔۔ابا جان کے چہلم کے دن (مارچ یا اپریل 1953ء میں) اماں بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔'' 11

بھائی:

سردار جعفری کے ایک بھائی تھے جو سردار جعفری سے بڑے تھے۔ان کا نام ظفر عباس تھا۔بعض جگہ ان کا نام ظفر مہدی بتایا گیا ہے جیسے:

1۔علی سردار جعفری ایک نظر میں۔ماہنامہ ہمارا ادب بھوپال۔ستمبر 2000ء صفحہ 4۔ 12

2۔علی سردار جعفری ایک نظر میں۔راشٹریہ سہارا۔نئی دہلی 13 اگست 2000ء بحوالہ اُردو دُنیا۔ستمبر 2000ء صفحہ 28۔ 13

3۔سوانحی خاکہ مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب۔
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی۔صفحہ 46) 14

4۔سوانحی خاکہ۔ایوان اُردو۔علی سردار جعفری نمبر ستمبر 2000ء۔ 15

سردار جعفری کے بڑے بھائی اگریکلچر کالج کانپور سے بی ایس سی کرنے کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار ''ہمصفیر'' کے نام سے نکالنے لگے۔ 16

اس سلسلہ میں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''کتاب نما' سردار جعفری نمبر مرتب کرتے وقت جعفری صاحب نے ناچیز کو اپنے بھائی کا نام ظفر مہدی بتایا تھا۔البتہ اپنے خاندان کے ہم قافیہ ناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے بھائی کا نام ظفر عباس بتایا ہے۔لکھتے ہیں:''معلوم نہیں میرے بڑے بھائی ظفر عباس کا نام ان قافیوں سے الگ کیوں تھا''۔۔۔۔غالباً ظفر عباس ہی نام ہوگا کیوں کہ ستارہ جعفری بھی یہی نام بتاتی ہیں۔'' 17

بہنیں:

سردار جعفری کی سات بہنیں تھیں۔

1۔زبیدہ خاتون

2۔جعفری خاتون

3۔فخر النساء

4۔صادقہ خاتون

5۔قمر النساء

6۔رباب بانو

7۔شہر بانو معروف بہ ستار

سردار جعفری کے انتقال سے چند دنوں پہلے ہی رباب بانو اور شہر بانو (ستارہ) کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔یہ دونوں بہنیں سردار جعفری کی کفالت میں ان ہی کے ساتھ رہیں۔رباب جعفری کا انتقال 29 جولائی 1997ء کو رات کے 11 بجے ہوا۔ستارہ جعفری کا انتقال 23 مئی 2000ء کو ہوا۔اس وقت خود جعفری صاحب مرگ و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے اور شاید ہوش و حواس سے بھی بیگانہ تھے۔ستارہ کی موت پر اظہارِ افسوس کیا کرتے۔

چچا:

سردار جعفری کے دو چچا تھے۔سید حیدر کرار جعفری اور سید احمد مختار جعفری عرف سید صاحب۔ستارہ جعفری کے مطابق منجھلے چچا اسسٹنٹ منیجر اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔اس کے علاوہ گرلس ہائی اسکول کے لائف پریسڈنٹ تھے۔۔۔چھوٹے چچا

اس وقت کے بہترین فوٹوگرافر اور مہاراجہ بلرام پور کے ولی عہد کے اتالیق تھے۔۔۔موٹر، چچا نے شوقیہ خرید لی تھی"۔ 18

عمر رضا نے بتایا ہے:

"چوں کہ سردار کے اولد اور منجھلے چچا دونوں سرکاری عہدیدار تھے۔اس لیے ریاست کی طرف سے کوٹھی کے علاوہ اس کی حفاظت اور صفائی کے لیے سات آٹھ مرد ملازم بھی تھے۔مزید کھانا وغیرہ پکانے کے لیے ملازم عورتیں تھیں۔علاوہ ازیں گاؤ ں کی نگہداشت کے لیے دو منشی بھی تھے۔رات میں کوٹھی کی حفاظت کے لیے خاکی وردی پہنے ہوئے چھ سپاہی اور ایک حوالدار بھی ہوا کرتے تھے جو بھری بندوق سے رات بھر پہرہ دیا کرتے تھے۔علاقے میں اس خاندان کا بڑا رعب و دبدبہ تھا اور اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔" 19

سردار جعفری نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

"میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گزار دی۔میری ماں کے سارے زیور بک گئے لیکن کسی کو کانوں کان یہ خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔وہ بڑے خلوص سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔" 20

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی کے مطابق "ان کا (سردار جعفری) گھرانہ بڑا مذہبی تھا اور روایتوں کی بندش بڑی مضبوط تھی۔ گھر کا ماحول بڑا مذہبی تھا۔صرف محرم کے دوران ہی نہیں سال بھر مجالس و محافل کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ان میں بطور خاص انیس کا کلام پڑھا جاتا تھا۔گھر میں ادبی و مذہبی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی مطالعہ کا چسکا تھا۔ان حالات نے ان کی معنوی نشو و نما میں اہم رول ادا کیا۔" 21

مذہبی، تعلیم یافتہ عزت دار خاندان:

سردار جعفری کا خاندان سادات جعفری تھا۔بقول سردار جعفری یہ بڑا ایماندار، مذہب کا پابند اور پرہیز گار خاندان تھا۔ ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

"چوں کہ ہمارے خاندان میں پردہ کا رواج تھا۔نو سال کی عمر ہونے کے بعد لڑکی پردہ کرنے لگی تھی پھر باہر نہیں نکل سکتی تھی۔اس لیے عورتیں اور لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھی اور کوٹھی مردوں کے استعمال میں رہتی تھی یا جو کوئی مہمان آتا تھا وہ ٹھہرتا تھا۔۔۔ہمارا خاندان بے حد مذہبی اور ایماندار تھا۔کسی نے رشوت کا ایک پیسہ نہیں لیا۔لہٰذا مہاراجہ سے لے کر پورے بلرام پور کے لوگ عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جب کبھی دوسرے خاندانوں میں جھگڑا ہوتا تھا تو میرے والد اور چچا بلائے جاتے تھے اور ان کے فیصلے کو سب مان لیتے تھے۔۔۔سردار بھائی نے اس ماحول میں پرورش پائی۔اس وقت ہماری کوٹھی میں بڑے اور بچے ملا کر 100 آدمی رہتے تھے۔کبھی کبھی خاندان کی عورتوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا لیکن جلدی صلح ہو جاتی تھی۔ نفرت یا کینہ کسی کے دل میں نہیں رہتا تھا۔لڑکیوں کو تعلیم دینے ایک اُستانی صاحبہ آتی تھیں جو قرآن شریف، دینیات اور اُردو پڑھاتی تھیں۔آپا زبیدہ کو تو باقاعدہ فارسی کی تعلیم ملی تھی۔لڑکے اسکول میں پڑھتے تھے۔ان کو قرآن شریف اور دینیات پڑھا

نے ایک صاحب آتے تھے جن کو سب میاں جی کہتے تھے۔ جو حساب اور انگلش پڑھاتے تھے وہ ہندو منشی جی کہلاتے تھے۔ لڑکے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ بھیج دیے جاتے تھے۔ میرے ایک چچا نے لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی"۔ 22

سردار جعفری کے خاندان میں اطمینان، سکون اور خوشی کا ماحول تھا۔ اس سلسلہ میں سردار جعفری خود لکھتے ہیں:

"خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے۔ جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔ خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں ورنہ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔" 23

ڈاکٹر معین الدین جینابڑے لکھتے ہیں:

درمیانی طبقے میں چند ایک ایماندار، مذہب کے پابند اور پرہیز گار خاندان بھی پائے جاتے تھے۔ ان کے پاس دولت نہیں، دولت مندی کی شہرت ہوا کرتی تھی۔ ان کا اصل سرمایہ صبر و قناعت کا سرمایہ تھا۔ ان گھروں میں ایک ایک کر کے بیویوں کے زیور بک جاتے تھے اور باہر امارت کا بھرم قائم رہتا تھا۔ یہ خاندان مشرقی تہذیب کے اقدار کے امین ہوا کرتے تھے۔ علی سردار جعفری نے اس درمیانی طبقے کے ایک ایسے ہی روایتی مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اُن کی شخصیت کی تعمیر اور سائیکی کی تخمیر میں کارل مارکس، لینن اور سوشلسٹ لیٹریچر کی اثر اندازی سے کہیں پہلے اُن کے آبائی مذہب کی مساوات، بھائی چارے اور انسانی دردمندی کی تعلیمات اپنا بھرپور رول ادا کر چکی تھیں۔" 24

بچپن:

ڈاکٹر صاحب علی نے سردار جعفری کے بچپن کے ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"علی سردار جعفری نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جو مختلف رسم و رواج اور مذہب سے عبارت تھا۔ اس ماحول میں بھائی چارہ، یگانگت، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ اتحاد و اتفاق کا یہ عالم تھا کہ لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ایک دوسرے کے شادی و غم میں شریک ہوتے تھے۔ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب و عقیدے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے۔ مسلمانوں کی مذہبی و ثقافتی تقریبات جیسے میلاد و محرم کی مجلسوں، مزارات پر عرس اور قوالی کی محفلوں، صوفیوں کی خانقاہوں، مشاعروں اور عیدوں وغیرہ میں غیر مسلم شرکت کرتے تھے۔ سردار جعفری کی جائے پیدائش جغرافیائی اعتبار سے اودھ کا ایک علاقہ ہے۔ یہاں کے ماحول میں اودھ کلچر رچا بسا ہے۔ اس کلچر میں مذہبی رواداری، احترام آدمی، یکجہتی اور بھائی چارے کی روایت کافی مستحکم رہی ہے۔ اُسی اودھی کلچر میں علی سردار جعفری نے نہ صرف آنکھیں کھولی تھیں بلکہ وہ پلے اور بڑھے بھی تھے اور ان کی ذہنی تربیت بھی ہوئی تھی۔ اسی تربیت کی بدولت انہوں نے احترام آدم کو

اپنے فکروفن کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اس کا ساری زندگی پر چاروپر سار بھی کیا۔محبت اور یگانگت کی فضا عام کرنے کے لئے انہوں نے تمام نظمیں لکھیں اور نثر میں خامہ فرسائی کی''۔ 25

ستارہ جعفری نے سردار جعفری کے بچپن کے کچھ واقعات بیان کیے ہیں جن سے سردار جعفری کی حاضر جوابی،شعر میں سوال کا جواب دینے کا شوق،انگریزی میں جواب دینے کا شوق،کسی سے مرعوب نہ ہونا اور جلد معاملہ طے کرنے کی خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجئے:

(1)اماں اور بڑی بہنوں سے سنا ہے سردار بھائی کی عادتیں بچپن سے بھائی جاں اور اپنے ہم عمر لڑکوں سے الگ تھیں۔ کوٹھی کے پیچھے کے حصے میں جو برآمدہ تھا اُسی کے قریب ایک امرود کا درخت لگا ہوا تھا۔جب منشی جی پڑھانے آتے تھے تو سب لڑکے ان کے قریب بیٹھ کر پڑھتے تھے اور یہ امرود کے پیڑ کی کسی شاخ پر بیٹھ کر اپنا کام کرتے۔بیچارے ہندو منشی جی چلاتے:ارے تم ہمرے کپار پر کاہے چڑھتے ہو،نیچے اترو۔یہ وہیں سے جواب دیتے ہیں:''جناب نازی ہوا میں حساب کے سوال جلد حل ہوجاتے ہیں۔''حاضر جوابی اور سرکشی بچپن سے مزاج میں تھی لیکن بات چیت نہایت تمیز سے کرتے تھے۔''

(2)''ایک روز سردار بھائی اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے۔اس وقت ایک صاحب جو عربی اور فارسی زبان کے عالم سمجھے جاتے تھے اور ابا جان اور چچا کے خاص دوستوں میں شمار ہوتا تھا،تشریف لائے۔ہمارے خاندان کے یہ آداب تھے کہ بزرگوں کو آتا دیکھ کر بچے کھیل بند کردیتے تھے۔لہٰذا سب بچوں نے کھیل بند کردیا اور ان کے قریب جا کر سلام کیا۔انہوں نے جواب میں بچوں کو دعائیں دیں۔سردار بھائی نے اپنی جگہ سے کہا''آداب عرض ہے جناب!''۔مولانا نے فرمایا''تم نے پاس آکر سلام کیوں نہیں کیا''؟ انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

محروم میں نہیں ہوں سلام حضور سے

پاس ادب یہی ہے کہ مجرا ہو دور سے

مولانا یہ جواب سن کر خاموشی سے اندر چلے گئے اور ابا جان سے کہا۔ماشاءاللہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا حاضر جواب ہے کہ میں لاجواب ہوگیا۔پھر پورا قصہ سنایا۔

(3)''حاضر جوابی،اعلیٰ دماغی اور کسی سے مرعوب نہ ہونا ان کو ورثہ میں ملا تھا۔چوں کہ اپنے ہم عمروں میں یہ غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے اس لیے ان کو سب ہی پیار کرتے تھے۔''

(4)''ہماری کوٹھی کے قریب گرلس اسکول تھا۔اس وقت اس کی ہیڈ مسٹریس ایک کرسچین خاتون مس برچ تھیں وہ ان کی بہت پیار کرتی تھیں۔ان کی صحبت میں رہ کر یہ پڑھنے سے پہلے انگریزی بولنا سیکھ گئے تھے۔''

(5)''سردار بھائی کی بے پناہ تیزی کو دیکھتے ہوئے ابا جان زیادہ سے زیادہ وقت ان کو اپنے پاس رکھتے تھے۔لہٰذا دربھنگہ اپنے ساتھ لے گئے۔وہاں جس دکان سے سامان خریدنا تھا اس کا مالک انگریز تھا۔ایک ہفتہ گزر گیا اور معاملہ طے نہیں ہورہا تھا۔ایک روز انگریز ابا جان کے پاس آیا تو سردار بھائی نے پوچھا''یہ کون صاحب ہیں؟''ابا جان نے جواب دیا''انھیں سے سامان خریدنا ہے۔''سردار بھائی فوراً انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئے۔''مجھے اپنی ماں بہت یاد آرہی ہیں جلدی معاملہ

طے کیجئے۔''اس زمانے میں اتنے چھوٹے بچے کا انگریزی بولنا تعجب خیز بات تھی۔انگریز نے ابا جان سے دریافت کیا''یہ آپ کا کون ہے؟ابا جان نے جواب دیا''یہ میرا بیٹا ہے۔اب ان کو اپنی ماں اور گھر بہت یاد آرہا ہے۔اُس انگریز نے دو چار سوال ان سے اور کئے۔ان کا جواب بھی انہوں نے انگلش میں دیا۔وہ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ابا جان سے کہا۔بہت ذہین اور ہوشیار بچہ ہے۔فوراً معاملہ طے کر دیا۔سردار بھائی سے کہا اب تم اپنی ماں کے پاس جاسکتے ہو۔ابا جان پہلی ٹرین سے بلرام پور واپس آگئے۔''

26

سردار جعفری کے بچپن کے مشاغل کے بارے میں ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی کو اسکول کے بعد جو فرصت کا وقت ملتا تھا اُس میں گھوڑا دوڑانا' درختوں پر چڑھنا اور شکار کھیلنا ان کا بہترین شغل تھا۔کئی بار چوٹیں بھی کھائیں اور ہاتھ پیر میں موچ بھی آئی۔اماں کو ہر وقت فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں ہاتھ پاؤں کی ہڈی نہ ٹوٹ جائے مگر یہ تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔سردار بھائی نے اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے ایک الگ کمرہ لے لیا تھا۔مجھے یاد ہے،یہ بہت خوش مذاق' نفاست پسند اور خوبصورت چیزوں کے دلدادہ تھے۔اپنی کوئی چیز بے ترتیب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ان کے کمرے کی دیواروں کا رنگ ہلکا فیروزی تھا۔اس کی دیواروں میں جیسے پہلے زمانے میں الماریاں بنائی جاتی تھیں ایسی دو الماریاں تھیں۔ان کے تختوں پر یہ اپنی ادبی کتابیں رکھا کرتے تھے اور ان کے کناروں پر اُس زمانے میں باہر کی بنی ہوئی ریشمی چوڑی چوڑی بیلن آتی تھیں جو اماں اور بڑی بہنیں اپنے دوپٹوں کے آنچل میں لگاتی تھیں اور یہ زرد رنگ کی بیل کی جھالر بنوا کر الماری کے تختوں کے کناروں پر لگاتے تھے۔کھڑکی کے قریب ان کے لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی رکھی رہتی تھی۔کھڑکی پر سفید جالی کا پردہ پڑا رہتا تھا۔اسکول جاتے وقت اپنے کمرے کے دروازے میں تالا ڈال دیا کرتے تھے تاکہ کوئی ان کے کمرے کی چیزوں کو خراب نہ کرے۔''

27

بچپن میں ہی سردار جعفری کو علمی قابلیت نصیب تھی۔ستارہ جعفری نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کی قابلیت اُجاگر ہوتی ہے۔ملاحظہ کیجئے۔

''ایک اخبار میں آگرہ کے مولوی مبارک علی صاحب نے عقد بیوگان کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔یہ اس کو پڑھ کر بھڑک گئے اور خود اس کے خلاف مضمون لکھا۔یہ بحث بہت روز تک چلتی رہی۔آخر کو مولوی مبارک علی صاحب نے ان سے ملاقات کرنی چاہی اور پتہ دریافت کیا۔انہوں نے اپنے گھر کا پتہ بھیج دیا۔ایک دن اچانک وہ تشریف لے آئے۔ابا جان' چچا سے مولانا کی واقفیت تھی کیوں کہ مولوی صاحب آگرہ میں پیش امام تھے۔۔۔بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ سردار بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ابا جان نے سردار بھائی کو بلا کر ان سے تعارف کرایا۔مولوی صاحب تعجب سے دیکھنے لگے۔پھر ابا جان سے فرمایا۔''میں اس لڑکے سے نہیں بلکہ حضرت علی سردار جعفری سے شرف ملاقات حاصل کرنے آیا ہوں۔''ابا جان نے جواب دیا یہی میرا بیٹا علی سردار جعفری ہے۔''مولانا نے فرمایا میں تو ان کو سن رسیدہ شخص سمجھتا تھا۔۔۔اتنی کمسنی میں عقد بیوگان پر ایسی بحث کہ میں ملاقات کے لیے مجبور ہو گیا۔سوچا اتنی قابل اور بزرگ ہستی سے مل کر زبانی بات چیت کرنی چاہیے۔کمال ہے صاحب! کیا دماغ پایا ہے۔خدا نظر بد سے بچائے۔اپنے وقت پر تو خدا جانے کیا ہوگا۔یہ بات سن کر تو اور بھی خوشی ہوئی کہ

یہ آپ کے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔" 28

سردار جعفری کو بچپن سے ہی اشعار سے دلچسپی تھی اور وہ اشعار پڑھا کرتے۔انھیں کئی اشعار ازبر تھے۔ان کے ذوق و شوق پر روشنی ڈالتے ہوئے ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

(1) ''چھ سات سال کی عمر میں ان کو پانچ سو اشعار زبانی یاد تھے۔اماموں کی شان میں لکھی ہوئی رباعیاں اور قصیدے بھی ازبر تھے۔کوئی شخص کسی قسم کا سوال کرتا تو اس کا جواب زیادہ تر شعر میں دیتے تھے۔''

(2)۔۔۔''رمضان کے مہینے میں سب لوگ بڑی پابندی سے روزے رکھتے تھے۔۔۔سب کے ساتھ یہ بھی روزے رکھتے تھے۔۔۔ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی تو اپنے بستر پر لیٹ کر بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیتے۔

نازاں تو ایک جام پہ ہے اپنے ساقیا
چودہ پلانے والے ہیں پرواہ مجھے ہے کیا
بتلائے دیتا ہوں تجھے مئے خانوں کا پتا
بطحا و کاظمین اور خراسان و سامرہ
برج شرف مرا دریکتا صدف میں ہے
اک کربلا میں ایک میرا ساقی نجف میں ہے
.....مشہور شش جہت ہیں شرف پنجتن کا ہے
پہلے تو نام پاک رسول زمن کا ہے
پھر اس کے بعد خسرو خیبر شکن کا ہے
اور اسم بھی بتول اسیر محن کا ہے
چو تھے جوا جو ہیں حسن سبز فام ہیں
اور پانچویں حسین علیہ اسلام ہیں

29

(3) گرمیوں کی تعطیل میں بہت مزا آتا تھا۔۔۔دوپہر میں شعروشاعری کا دور چلتا۔ہمارے سب سے بڑے پھوپھی زاد بھائی جن کا نام آل مرتضیٰ تھا، ہم سب ان کو بڑے بھائی جان کہتے تھے۔وہ ان (سردار جعفری) کی ذہانت اور تیزی سے بہت متاثر تھے۔بڑے بھائی، سردار بھائی سے ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ سنانے کی فرمائش کرتے۔اس وقت ترنم سے پڑھتے تھے۔بس فوراً جوش آجاتا۔شیروانی پہن کر لہک لہک کر زبانی سناتے۔سب لوگ تعریف کرتے۔ان کو اقبال کی ''بانگ درا'' زبانی یاد تھی۔بڑے بھائی جان کو ان کی زبانی، اقبال کی یہ نظم سننے میں بہت لطف آتا تھا۔

اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز بیاں میری

30

رضا جعفری نے سردار جعفری کے بچپن کے واقعات لکھے ہیں۔ چند واقعات پیش ہیں:

1۔ ''ان (سردار جعفری) کی پیدائش 29 نومبر 1913ء ہے اور انہوں نے 1933ء میں بلرام پور کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس طرح کل 20 سال وہ بلرام پور میں مستقل طور سے رہے۔۔۔ بلرام پور میں سید صاحب کی کوٹھی کے اندر نیم کا ایک بہت قدیم درخت لگا ہوا تھا جس کی شاخیں اس کوٹھی کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ والد، چچا اور چھوٹے چچا کا خاندان اسی کوٹھی کے الگ الگ حصوں میں آباد تھا''۔

2۔ کہتے ہیں کہ ان کی شرارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ اسی نیم کی شاخوں شاخوں وہ ہر گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔

3۔ چھ سات سال کی عمر میں ان کو تقریباً پانچ سو اشعار زبانی یاد تھے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اس زمانے میں وہ زیادہ تر سوالوں کا جواب شعر میں دیتے تھے۔

4۔ رمضان میں سب کے ساتھ روزے رکھتے تھے مگر سحری کھانے سے پہلے نہلائے جاتے تھے کہ بستر گیلا کرنے کی عادت ان میں کافی بڑی عمر تک رہی۔

5۔ سحری کھانے کے بعد جب ان کی والدہ اور بڑی بہنیں نماز اور دعائے سحر میں مشغول ہوتیں، یہ لہک لہک کر انیس کی رباعیاں اور اقبال کا کلام پڑھنا شروع کر دیتے۔

نازاں تو ایک جام پر اپنے ہے ساقیا
جو وہ پلانے والے ہیں پروا ہے مجھ کو کیا

(6) جب ذرا بڑے ہوئے تو چھوٹے چچا جو چھوٹے بابا کہلاتے تھے اور جو بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، ان کے بڑے کام آئے۔ ان کے پاس بہترین نسل کے گھوڑے، عمدہ بندوقیں اور کیمرے تھے۔ اب وہ خوب گھوڑے دوڑاتے اور بندوق لے کر شکار کھیلنے کے لیے ہالی پور، اور پرنا پور کی تعلقہ داریوں کی طرف نکل جاتے اور شکار کی تلاش میں ہفتوں ان علاقوں میں قیام کرتے۔ شاید یہی وہ زمانہ تھا جب ان کا شعور جاگنا شروع ہوا تھا اور ان کی نگاہیں حالات پر ٹھہرنے لگی تھیں۔ 31

رباب جعفری نے لکھا ہے:

''بچپن سے سردار بھائی کو اپنے والدین بھائی بہنوں اور عزیزوں سے بے پناہ محبت ملی ہے اور اب ان کے ایسے محبت آمیز برتاؤ سے سب کے دلوں میں ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔'' 32

اساتذہ:

ابتدائی تعلیم کے اساتذہ میں بہار کے نامعلوم مولوی صاحب، منشی بدری پرشاد (ریاضی کے اُستاد)، بشیر صاحب (انگریزی کے اُستاد) شامل ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، خواجہ منظور حسین، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر سدھانت شامل ہیں۔

تعلیم:

ابتداء میں ایک مولوی صاحب سے گھر پر قرآن کی تعلیم لی ۔قصص الانبیاء پڑھی اور فارسی سیکھی ۔سات آٹھ سال کی عمر میں سلطان المدارس لکھنو میں داخل کیے گئے تا کہ مولوی بن سکیں مگر سردار جعفری کی طبیعت اس طرف مائل نہ ہوئی اور تین بار وہاں سے راہ فرار اختیار کی ۔اس سلسلہ میں ستارہ جعفری نے لکھا ہے:

''سردار بھائی کی ذہانت اور تیزی کو دیکھتے ہوئے بزرگوں نے یہ طے کیا کہ ان کو سند اجتہاد حاصل کرنے کے لیے مذہبی تعلیم دی جائے ۔غالباً سات آٹھ سال کی عمر میں لکھنو کے سلطان المدارس میں داخل کرا دیا گیا ۔وہاں عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی ۔پھر کچھ سالوں کے بعد عراق بھیج دیا جاتا تھا۔وہاں سے باقاعدہ سند حاصل کر کے مجتہد، بن جاتے تھے کیوں کہ خیال تھا اگر خاندان کا ایک شخص مجتہد بن جائے تو پورے خاندان کی عاقبت سنور جاتی ہے لیکن ان کے سرکش مزاج نے اس ماحول کو قبول نہیں کیا۔ یہ دو مرتبہ اکیلے بلرام پور واپس آ گئے ۔دونوں مرتبہ سمجھا بجھا کر کسی کے ساتھ لکھنو واپس بھیج دیا جاتا۔ جب تیسری مرتبہ یہ لکھنو سے واپس آ گئے تو ابا جان نے ان پر کوئی سختی نہیں کی بلکہ بڑے پیار سے پوچھا ''تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟''انہوں نے جواب دیا ''جناب !میں انگریزی پڑھوں گا۔وہاں میرا دل نہیں لگتا۔''ان کی رائے سن کر ابا جان نے اُسی دن بلرام پور میں انگریزی پڑھنے کے لیے ایک اُستاد کے سپرد کر دیا ۔اُن کا نام ماسٹر بشیر تھا۔ان کا ایک جنرل اسٹور تھا۔یہ شام کو وہاں پڑھنے جاتے تھے ۔اس وقت یہ طریقہ تھا کہ جب تیسری کلاس تک کا حساب اور انگریزی جب تک بچے کو نہ آ جائے اسکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ماسٹر بشیر ان کو بڑی محبت سے پڑھاتے تھے اور ابا جان سے اُن کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے کہ بڑی جلدی سبق یاد کر لیتا ہے''۔ 33

سردار جعفری نے بلرام پور میں منشی بدری پرشاد سے تیسرے سے چھٹے درجے تک حساب سیکھا اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ماسٹر بشیر سے گھر پر انگریزی پڑھی ۔پھر بلرام پور کے انگریزی اسکول لائل کالجیٹ اسکول میں شریک ہوئے ۔

میٹرک کی تعلیم کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

اب سردار جعفری میٹرک میں پہنچ گئے تھے چنانچہ اس کے امتحان کی تیاریوں میں وہ پوری طرح مصروف ہو گئے ۔۔۔۔ پوری دلجمعی کے ساتھ سردار جعفری نے میٹرک کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گئے ۔۔۔۔جس زمانے میں انہوں نے میٹرک پاس کیا اُن کی عمر بیس سال کی تھی ۔عمر کے لحاظ سے سردار جعفری کو بی اے اور ایم اے میں ہونا چاہیے تھا لیکن ابتدائی چند سال چوں کہ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم میں صرف کر دیے تھے ۔اس لیے تعلیم میں پچھڑ گئے اور جب وہ انٹرمیڈیٹ میں پہنچے تو ان کی عمر کے طلباء بی اے اور ایم اے کر رہے تھے ۔اس طرح سردار جعفری نے 1933ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 34

سردار جعفری کی میٹرک کے بعد کی تعلیم کی بارے میں ستارہ جعفری نے لکھا ہے:

''پھر علی گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا ۔ابا جان کی دلی خواہش تھی کہ یہ ڈاکٹر یا بیرسٹر بنیں ۔ساڑھے تین سال علی گڑھ میں پڑھنے کے بعد ایک روز اچانک یہ بلرام پور واپس آ گئے ۔ابا جان کو تشویش ہوئی ۔انہوں نے اماں سے کہا۔یقیناً

یہ کالج میں کچھ گڑبڑ کر کے آئے ہیں۔اس وقت علی گڑھ کالج کے وائس چانسلر سر ضیاءالدین صاحب تھے جو چاچا کے کلاس فیلو دوست بھی تھے۔دوسرے روز چاچا کے نام اُن کا خط آیا۔اس میں لکھا تھا کہ سردار نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں رات کو بارہ بجے پندرہ منٹ کی تقریر میں ہمارے کئی ہزار لڑکوں کے خیالات بدل دیئے ہیں لہذا اس جرم میں ان کو تین سال کے لیے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔حالاں کہ اتنے ذہین اور قابل لڑکے کو نکالتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوئی ہے۔علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد ابا جان نے ان کو عربک کالج دہلی میں داخل کرا دیا لیکن وہاں بھی ان کو تقریر کرنے کا شوق باقی رہا۔کالج کے تقریری مقابلوں میں کئی مرتبہ فرسٹ آئے۔سونے کے کئی میڈل اور گنگا جمنی بنی ہوئی چھوٹی سی دہلی کی مسجد انعام میں حاصل کی۔یہ سب چیزیں لے کر جب بلرام پور آئے تو والدین اور سب عزیز بے حد خوش ہوئے لیکن کچھ روز بعد اپنے ایک دوست کی مالی امداد کرنے کے سلسلے میں وہ تمغے اور گنگا جمنی مسجد فروخت کر دی۔دہلی سے بی اے کرنے کے بعد لکھنو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ابا جان کی خواہش تھی کہ لکھنو یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر لیں۔ایک سال قانون پڑھنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میرا دل اس مضمون میں نہیں لگتا اور ایم اے میں داخلہ لے لیا۔“ 35

1939-40ء میں ایم اے۔انگریزی سال اول کا امتحان پاس کیا۔پھر اپنی شاعری میں مخالف جنگ پروپگنڈہ کرنے اور تحریک آزادی میں سرگرم ہونے کی وجہ سے انھیں ایم اے فائنل امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا۔یہی نہیں بلکہ گرفتار کر کے انھیں جیل بھیج دیا گیا۔

ستارہ جعفری نے بتایا:

”انھیں دنوں میں ایک کتاب ”آزادی کی نظمیں“ چھپی۔۔”آزادی کی نظمیں“ کی اشاعت کے چند دنوں کے بعد اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب برٹش حکومت نے ضبط کر لی اور جتنی کاپیاں ملیں وہ جلا دی گئی ہے۔۔۔شروع دسمبر 1940ء کی ایک صبح پایونیر اخبار میں سردار بھائی کی گرفتاری کی خبر آ گئی۔“ 36

سردار جعفری کے اچھے تعلیمی ریکارڈ کے تعلق سے ان کے ساتھی خواجہ تصور علی حیدر نے لکھا ہے:

”وہ ایک ذہین اور قابل طالب علم بھی تھے۔اس کے باجود کہ وہ اپنا کافی وقت علمی و ادبی کاموں اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف کرتے تھے اور جہاں تک کورس کی کتابوں کا تعلق ہے وہ کلاس روم میں لیکچر سننے کے علاوہ امتحان کے دنوں میں ہی ان کی طرف کما حقہٗ توجہ دیتے تھے۔امتحان میں ان کے ہمیشہ اچھے نمبر آتے تھے۔۔۔۔۔دلّی یونیورسٹی جہاں سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا غیر منقسم ہندوستان کی واحد یونیورسٹی تھی جہاں فرسٹ ڈویژن چھیاسٹھ فیصدی یا اس سے زیادہ نمبروں پر آتا تھا۔باقی سب یونیورسٹیوں میں فرسٹ ڈویژن ساٹھ فیصد نمبروں پر مل جاتا تھا۔بی اے میں ان کا سکینڈ ڈویژن آیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے ساٹھ فیصد سے زیادہ نمبر آئے تھے یعنی اور یونیورسٹیوں کے معیار سے ان کا فرسٹ ڈویژن ہوتا۔“ 37

خواجہ تصور علی حیدر نے علی سردار جعفری کے کھیل کود کے بارے میں لکھا ہے:

”کالج میں کھیلوں کے سالانہ مقابلے ہونے لگے تو مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ٹینس سنگلز کے

ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے اپنا نام دے دیا ہے وہ کالج ٹینس کلب کے ممبر نہیں تھے اور میں نے انھیں کبھی ٹینس کھیلتے نہیں دیکھا تھا۔ان کے پاس ٹینس کی کِٹ بھی نہیں تھی اپنے پہلے میچ میں وہ بغیر کسی پریکٹس کے کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس میدان میں اُترے اور دو چار انٹ شٹ شوٹ مارنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ فارم میں آنے لگے اور وہ میچ انہوں نے جیت لیا۔پھر کچھ پریکٹس کی۔قصہ مختصر وہ کالج کے سنگلز چمپئن ہو گئے۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ علی گڑھ میں ٹینس کھیلتے رہے تھے۔یہ بھی ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک پہلو ہے۔اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے جس علم یا فن میں دلچسپی لی،اس میں کمال درجہ حاصل کیا۔''

38

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سردار جعفری نے کھیل ترک کر دیا۔اپنی خودنوشت میں وہ رقمطراز ہیں:

''میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گزارتا تھا۔''

39

ملازمت:

سردار جعفری نے ملازمت کبھی نہیں کی۔مشاعرے،ٹی وی پروگرام اور اکیڈمیوں کے انعامات نے انھیں سہارا دیا۔بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں وہ ہمیشہ قلم کی روٹی کھاتے رہے۔آزادانہ طور پر اخباروں اور پھر رسالوں کے لیے لکھتے اور شاعری کرتے رہے۔''

40

انور ظہیر خاں نے لکھا ہے:

''انہوں نے (سردار جعفری) نے نوکری چاکری کبھی کی نہیں،مستقل آمدنی کا کبھی کوئی ذریعہ بھی نہیں رہا۔کسی کی ساجھے داری میں پرنٹنگ پریس ڈالا تو اس میں بھی گھاٹا ہی ہوا۔''

41

حسن کا پہلا احساس:

بلرام پور میں اپنے ہی خاندان کی کسی حسینہ کے بارے میں سردار جعفری نے اپنی کتاب ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں لکھا ہے:

''گرمی کی ایک تپتی دوپہر میں دیوار کے سایے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔وہ غافل سو رہی تھی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔''

سردار جعفری کے رشتہ کی ایک بہن تھی جو انھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔سردار جعفری جنھوں نے غلامی،ظلم و زیادتیوں کے واقعات سے بے حد متاثر تھے۔اس لڑکی کی آنکھوں کی چمک نے سردار جعفری کو اس بات پر آمادہ کیا وہ اس سے مفلسی،امارات،ظلم،ناانصافی،استحصال وغیرہ کی باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالا کریں،رفتہ رفتہ سردار جعفری کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ان کے درمیان نازک اور لطیف رشتے نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی ہے۔ان کے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔محبت کا عالم یہ تھا کہ کچھ برسوں بعد جب ان کے والدین نے شادی کے سلسلہ میں گفتگو کی تو سردار جعفری نے اسی

کا نام پیش کر دیا۔اس لڑکی کے والد نے سردار جعفری کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا۔ 42

سردار جعفری نے اپنی کتاب ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں لکھا کہ لڑکی کے والد کے مطابق ''میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا' نہ رہنے کا ٹھکانہ ہوگا' نہ کھانے کا' لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی''۔ 43

شادی:

سلطانہ جعفری سے علی سردار جعفری نے 30 جنوری 1948ء کو ممبئی میں شادی کی۔اس سے قبل ان سے لکھنو کی طالب علمی کے زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی۔سلطانہ جعفری کی طلبہ تحریکیوں میں شرکت' ان کے خاندان' سلطانہ کی پہلی شادی' علاحدگی' ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت، استعفیٰ اور پھر سردار جعفری سے دوبارہ ملاقات' شادی اور ازدواجی زندگی کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے:

''مجھے تو یاد نہیں لیکن سردار ہی نے یاد دلایا کہ ان کی رفیقۂ حیات سلطانہ سے ان کی ملاقات بھی میری ہی وساطت سے ہوئی۔وہ اس وقت سلطانہ منہاج تھیں۔ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں اور طالب علموں کی سیاست سے دلچسپی بھی۔میں لکھنو یونیورسٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ان سے میری ملاقات طلبہ کی تحریکوں ہی کے سلسلہ میں ہوئی۔طلبہ کا کوئی جلسہ ہوتا یا ہڑتال ہوتی تو اس میں طالبات کا شمول بھی ضروری ہوتا۔ایسے موقعوں پر سلطانہ سے تعاون کی درخواست کی جاتی۔وہ خود اور ان کی چھوٹی بہنیں آمنہ اور خدیجہ شریک ہوتیں' لیکن تحریک میں عملی طور پر سلطانہ ہی زیادہ حصہ لیتیں ویسے تزئین حبیب اللہ بھی جو بعد میں تزئین فریدی ہوگئیں اور یونین کی صدر بھی منتخب ہو چکی تھیں لیکن ان کو وہ ذہنی اور فکری لگاؤ نہیں تھا جو سلطانہ کو تھا۔ سردار نے ایک اور جگہ کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے حکایت کچھ یوں بیان کی ہے جیسے میں نے ان سے صرف سلطانہ کے حسن کا ذکر کیا ہو۔یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔یہ ذکر بھی ان کے ترقی پسندانہ خیالات کے ضمن میں آیا تھا۔حسین تو وہ تھیں ہی اور ہیں، لیکن ان کی ترقی پسندی بھی ان کی واضح شناخت تھی۔'' 44

محمد اسداللہ نے منہاج سلطانہ کے خاندان' منہاج سلطانہ کی تعلیم' سیاسی سرگرمیوں' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کی رفیقۂ حیات کوئی معمولی شخصیت نہیں تھیں۔وہ اپنی جگہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع شخصیت تھیں اور وہ سلطانہ آپا ہیں۔سلطانہ آپا کا ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق ہے۔یہ ایک عجیب خاندان ہے۔ان کے والد متحدہ پنجاب کے چیف اری گیشن افسر تھے اور ان کی چھ بیٹیاں تھیں۔سب کی سب تعلیم یافتہ، ترقی پسند' سوشل اور پھر بہت ہی خوبصورت۔ان سب میں سلطانہ آپا چیز ے دیگر تھیں' سب سے بڑی' سب سے خوبصورت' سب سے زیادہ ترقی پسند اور باشعور۔۔۔۔بلکہ پوری کی پوری مارکسزم کی طرف مائل۔لکھنو یونیورسٹی میں سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ سردار بھائی جب علی گڑھ سے نکالے گئے اور لکھنو یونیورسٹی میں انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لیا اور جب سابق سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے تو اس دور میں سردار بھائی کی سلطانہ آپا سے ملاقات ہوئی۔سلطانہ آپا پولیٹکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھیں۔'' 45

سردار جعفری نے سلطانہ سے ملاقات، محبت پھر دوسری جگہ سلطانہ کی شادی اور طلاق کے بارے میں لکھا ہے:

''1939ء میں جب میں لکھنو یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ابھی وہاں ''نیا نویلا'' ہی تھا کہ میرے ساتھ ایک حسین حادثہ ہوا ۔میرے ساتھی علی جواد زیدی نے ایک روز مجھ سے کہا آیئے میں آپ کا تعارف ہمارے کیمپس کی خوبصورت ترین لڑکی سے کراؤں ۔میں بھی راضی ہوگیا۔ہم ایک کافی ہاوس میں ملے ۔اس کا نام سلطانہ تھا۔پہلی ہی ملاقات میں مجھے وہ بہت اچھی، بڑی بھلی سی لگی ۔ہم اکثر ملنے لگے اور محو گفتگو رہتے۔ایک روز میں نے اس کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔آپ تو بالکل وینس ڈی میلو لگتی ہیں ۔اس بات کو قریب ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ایک روز اس لڑکی نے مجھے وینس ڈی میلو کا ایک مجسمہ تحفے کے طور پر پیش کیا جسے میں نے یہ کہتے ہوئے لیا کہ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں ۔اس وقت تک ہماری دوستی کی راہ میں ایک نیا موڑ آ گیا۔اس کی منگنی اس کے رشتہ ہی کے کسی بھائی سے طے ہوگئی ۔۔۔سلطانہ کی شادی ہوگئی لیکن دونوں کی آپس میں نہیں بن سکی اور علاحدگی ہوگئی اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔''

46

علاحدگی کے بعد سلطانہ نے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازمت کر لی تھی ۔1946ء میں ان کا تبادلہ ممبئی میں ہوگیا۔ یہاں رفعت سروش کارگزار تھے ۔رفعت سروش نے سلطانہ کی آمد، سردار جعفری سے ملاقات اور بعد ازاں ریڈیو اسٹیشن سے سلطانہ کے مستعفی ہونے کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ہمارے سیکشن میں اُردو کے ادیب شاعر اور ڈرامہ نویس ہی آتے تھے ۔کرشن چندر۔۔۔ساغر نظامی، سردار جعفری، قدوس صہبائی ۔۔۔یہ سب مشاہیر ہمارے مختلف پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔۔۔بشیر چودھری کا تبادلہ لاہور ہوگیا اور ایک دن ہمارے اسمارٹ اسسٹنٹ ڈائرکٹر رام راٹھے ایک نہایت اسمارٹ خاتون کے ساتھ ہمارے کمرے میں آئے اور تعارف کرایا کہ یہ سلطانہ بیگم ہیں، پروگرام اسسٹنٹ ۔لاہور سے ان کا تبادلہ بمبئی ہوگیا ہے ۔سلطانہ بیگم کے چوڑے چہرے پر مسکراہٹ تھی ۔ایک گال پر خفیف سا گڑھا جوان کی شخصیت کو اور پُروقار بنائے ہوئے تھا۔سلطانہ کا انداز صوفیہ نٹراجن کی طرح خشک افسرانہ نہیں بلکہ نہایت مخلصانہ تھا۔اسی دن تیسرے پہر میں نے سردار جعفری کو فون کیا۔سلطانہ نے کہا سردار جعفری کو فون کر رہے ہو تو میں بھی ان سے بات کروں گی اور سلطانہ نے فون پر سردار کو اپنے بمبئی آنے کی اطلاع دی ۔۔۔تھوڑی دیر میں سردار جعفری بھی آ گئے اور پھر ہم تینوں میرین ڈرائیو گھومنے چلے گئے ۔اس دن کے بعد سلطانہ اور مجھ میں خاصی قربت ہوگئی اور میں ان کے سیکشن کے کام میں خاصی طور سے دلچسپی لینے لگا۔خود سلطانہ نے بھی بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ کے میری بہت ہمت افزائی کی جبکہ ہمارے سیکشن کے دوسرے پروگرام اسسٹنٹ اپچ آر شاہ چڑھتے تھے اور ہر وقت افسری جھاڑنے کی فکر میں رہتے تھے ۔سلطانہ اور میں دوپہر کو کھانا کھانے ایم جی کیفے یا کٹ کیٹ ریستوران میں چلے جاتے تھے ۔یہ دونوں ریستوران ہمارے دفتر کے قریب ہی تھے ۔شاہ صاحب کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی وہ اپنے آپ کو سینئر سمجھتے تھے اور سلطانہ ان کو چڑھانے کے لیے اپنی میز پر اور بے تکلفی سے بیٹھتی تھیں اور کبھی کبھی ٹھاٹھ سے پاؤں میز پر رکھ لیتی تھیں ۔ایک دن ہم دونوں لنچ کر کے ڈھائی بجے لوٹے۔شاہ صاحب کے چہرے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں ۔۔۔انہوں نے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا تھا کہ افسران بالا سے ہم دونوں کے دیر تک غائب رہنے کی شکایت کر آئے تھے ۔چنانچہ ہمارے کمرے میں گھستے ہی انہوں

نے مجھ سے کہا کہ تمہیں مسز نٹراجن نے بلایا ہے اور سلطانہ سے کہا کہ آپ کو مرڈھیکر صاحب نے بلایا ہے۔ میں مسز نٹراجن کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے تنبیہ کی کہ لنچ کا ٹائم صرف آدھ گھنٹہ ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی کچھ سلطانہ بیگم کے ساتھ ہوا ہوگا۔ سلطانہ آئیں تو ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے اور اسی دن سے وہ ریڈیو کی نوکری سے بددل ہوگئیں اور رہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ کچھ دنوں بعد استعفیٰ دے دیا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔" 47

عمر رضا نے لکھا ہے:

"سلطانہ یوں تو کالج ہی کے زمانے سے ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں لیکن سردار جعفری کی وجہ سے وہ کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ سرگرم رکن بن گئیں۔ قربت نے محبت کو مزید پختگی بخشی دی اور سردار جعفری نے بہت جلد سلطانہ سے دائمی رفاقت کا فیصلہ کرلیا۔" 48

ستارہ جعفری نے سردار جعفری کی شادی کے سلسلہ میں خاندان والوں کی مخالفت لیکن والدین کی اجازت کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"آپا زبیدہ بلرام پور میں رہتی تھیں۔ ایک روز ابا جان نے آپا کو بلا کر کہا ہم دونوں کی صحت روز بروز گرتی جارہی ہے اور ہماری اب آخری عمر ہے۔ اس خوشی کو تو دیکھ لیں۔ تم اپنے بھائی سے دریافت کرو۔ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ آپا نے سردار بھائی کو خط لکھا۔ اُس وقت خاندان کے بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپا نے ان سب کے نام لکھے اور ان کی پسند دریافت کی۔ اس خط کے جواب میں سردار بھائی نے لکھا یہاں ایک لڑکی سلطانہ بیگم ہیں، میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ایک بات یہ ہے کہ وہ سنی ہیں۔ کیا والدین ان سے شادی کی اجازت دے دیں گے؟ آپا نے وہ خط ابا جان کو سنایا۔ خط سن کر ابا جان نے کہا تم لکھ دو ہماری طرف سے اجازت ہے کیوں کہ زندگی تمہیں اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ جب خاندان والوں کو علم ہوا تو سب نے اس شادی کی مخالفت کی لیکن ابا جان اور اماں نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ ہمیں اپنے بیٹے کی خوشی منظور ہے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ شادی کہاں پر ہوگی؟ سردار بھائی نے لکھا ہم بہت سادہ طریقہ سے ممبئی میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کے بعد میں سلطانہ کو لے کر بلرام پور آؤں گا۔ والدین نے اس رائے کو بھی قبول کرلیا۔۔۔ 30 جنوری 1948ء شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ جب شادی کی خبر عام ہوئی تو سلطانہ بھابھی کے ایک چچا بلرام پور میں رہتے تھے، وہ تشریف لائے اور ابا جان سے کہا "یہ شادی کس طرح ہوسکتی ہے۔ ہمارا خاندان قریشی ہے اور آپ لوگ جعفری ہیں۔" ابا جان نے جواب دیا "میں تو بستر علالت پر ہوں۔ لڑکے کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ سلطانہ کے چچا ہیں۔ اپنی لڑکی کو روک لیجئے۔ اس جواب کو سن کر وہ ناراض ہوگئے اور ایسے گئے کہ پھر ہمارے گھر نہیں آئے۔" 49

رفعت سروش نے سردار جعفری کی شادی کے دن کی تفصیلات اپنی خودنوشت میں درج کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"30 جنوری 1948ء۔۔۔ آج علی سردار جعفری اور سلطانہ بیگم کی شادی ہے۔۔۔ کیفی اعظمی نے اس موقع پر چھوٹی سی خوبصورت تقریر کی ہے کہ میں نے سردار جعفری سے بہت کچھ سیکھا مگر ایک چیز میں نے ان کو سکھائی، شادی کرنا اور کیفی نے ایک خوبصورت نظم پڑھی ہے۔ پہلے حصے میں سردار جعفری سلطانہ سے مخاطب ہیں۔ اپنے مخصوص آہنی لہجے میں یہ ان کی

مشہور نظم ؎

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ

جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے

کی پیروڈی ہے۔نظم کا دوسرا حصہ بہت ہی دلچسپ ہے'سلطانہ اپنے انداز میں کہہ رہی ہیں کہ اگر دیر سے آؤ گے تو ٹھنڈی روٹی کھانے کو ملے گی۔۔۔آخر میں سردار جعفری کو بولنے کی دعوت دی گئی ہے۔سردار جعفری اپنی عادت کے برعکس کچھ محجوب سے ہیں اور کچھ یوں بات شروع کرتے ہیں کہ میں آج پہلی بار بولنے میں جھجک محسوس کر رہا ہوں۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ سلطانہ کی دوسری شادی ہے (سلطانہ کے پہلے شوہر سے ایک لڑکی دردانہ ظو یا عرف گڈو ہے جو اس وقت پانچ چھ برس کی تھی۔سلطانہ نے اپنے شوہر سے ریڈیو اسٹیشن کے زمانے میں ہی طلاق لے لی تھی۔یہ خوبصورت تقریب اختتام کے قریب ہے کہ ریڈیو ہر شام کے چھ بج کر دس منٹ کی خبریں سنتے ہی ہندی کے مشہور ادیب رمیش سنہا مائک پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں انھیں کسی نے گولی ماردی۔مجمع پر سناٹا چھا جاتا ہے اور ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔۔۔سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے ہیں گاندھی جی کی موت کی خبر آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل جاتی ہے۔بسیں اور ٹرامیں بند ہیں۔۔۔ہم لوگ گلی گلی ہوتے ہوئے کسی طرح اپنے گھر کھڑک پہنچتے ہیں۔۔۔ہمارے پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا اور سب لوگ اس کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے۔'' 50

شوکت کیفی نے لکھا کہ یہ خبر ملتے ہی ایسے بھگدڑ مچی کہ کسی کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ دولھا دلہن کہاں گئے۔غالباً عصمت چغتائی کے ساتھ کیوں کہ سلطانہ نے کہا کہ شادی ولیمہ کی دعوت میں عصمت چغتائی نے احباب کو آئس کریم کھلائی۔'' 51

ازدواجی زندگی:

علی سردار جعفری کی بیوی سلطانہ جعفری نے سردار جعفری کے انتقال کے بعد اپنے ایک مضمون ''میرا سردار'' میں اپنے شوہر کی شخصیت اور اپنی خوشگوار زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

1۔''سردار بہت عمدہ آدمی تھے'بہت وسیع خیال تھے۔مجھے کبھی کہیں جانے سے روکا نہیں۔میرے لیے کبھی ''نا'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔حالاں کہ ان کا مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔اس کے باوجود کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ میں ملازمت کروں اور پیسے کماؤں۔میں نے اُن کے ساتھ بھرپور زندگی گزاری۔ایسی بھرپور کہ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہوسکتی۔یہاں ہم 1961ء میں رہنے کے لیے آگئے تھے۔شروع میں ہم کرایے پر رہتے تھے لیکن 1968ء میں پچاس ہزار روپے میں یہ مکان خرید لیا تھا۔سردار کے ساتھ نصف صدی سے زیادہ کی زندگی بڑے اطمینان اور سکون سے گزری۔وہ اتنی اچھی طبیعت کے آدمی تھے کہ اُن میں اور مجھ میں کبھی کسی بات پر کوئی اختلاف نہیں ہوا۔نظریاتی اختلاف تو ویسے بھی نہیں تھا۔رہا روزمرہ کی زندگی میں کسی چھوٹی موٹی بات پر رونما ہونے والا اختلاف تو صاحب کسی دن کوئی اختلاف ہوا بھی تو بات فوراً رفع دفع ہوجاتی تھی۔ہوتا یہ تھا کہ کوئی بات ہوتی تو میں چپ ہوجاتی'لیکن سردار تو باتیں بنانا جانتے تھے۔وہ

اپنے اس فن سے مجھے رام کرلیا کرتے تھے۔۔۔"

علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 51-50

2۔"۔۔۔وہ رات بھر غور و فکر کرتے" کچھ پڑھتے، کچھ لکھتے اور خوب سگریٹس پیتے تھے۔میں کبھی رات میں جاگ جاتی تو کہتی سردار تم کتنی سگریٹ پی رہے ہو، لیکن وہ بُرا نہیں مانتے۔صرف اتنا کہتے کہ جب تک سگریٹ نہ ہو میرا قلم ہی نہیں چلتا ہے۔۔۔"

(3)۔۔۔میرا سفر (نظم) میں انہوں (سردار جعفری) نے میرا بھی ذکر کیا ہے کہ ؎

ہر عاشق ہے سردار یہاں

ہر معشوق سلطانہ ہے

اس تذکرہ میں اکثر کہتی کہ یہ میرا تذکرہ نہیں بلکہ کئی سلطانائیں ہیں جو سردار کی معشوقہ ہیں تو وہ مسکرا دیئے۔" 52

آدمی جسے چاہتا ہے سب سے پہلے اپنی خوشیوں میں اُسے شریک کرتا ہے۔سردار جعفری سے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے جب یہ سوال کیا کہ گیان پیٹھ ایوارڈ کے اعلان کی اطلاع سب سے پہلے کس سے شیئر کی؟ تو سردار جعفری نے برجستہ کہا "اپنی بیوی سلطانہ جعفری کے ساتھ۔اُس وقت وہ جوہو میں واقع شبانہ اعظمی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔شبانہ نے جواب میں برجستہ ان ہی کا شعر پڑھا۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں

ہر معشوق سلطانہ ہے

53

سلطانہ جعفری بہت سی خوبیوں کی حامل خاتون تھیں۔سید سجاد ظہیر ان کی قابلیت کے معترف تھے۔

محمد اسداللہ نے لکھا ہے:

"ایک زمانے میں وہ بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) کی سکریٹری بھی ہوا کرتی تھیں۔بمبئی کا وہ دور ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے عروج کا دور تھا۔سلطانہ آپا نہایت باوقار، بردبار، اور رکھ رکھاؤ کی حامل تھیں۔بنے بھائی نے ایک دفعہ ماسکو میں ہوٹل یوکرین میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ "ہندوستان میں جتنی خواتین سے مجھے ملنے یا اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، ان میں سے چار پانچ خواتین کا بھی میں انتخاب کروں تو اس میں سلطانہ بھی ہوں گی۔وہ بڑی محنتی، بہت ہی پابند ڈسپلن اور سب سے بڑی بات یہ کہ صحیح سیاسی بصیرت کی حامل ہیں۔۔۔سلطانہ آپا کا ظرف اور حوصلہ تھا پچاس سال کی طویل مدت تک انہوں نے سردار بھائی کی ان بہنوں کو اپنے مختصر سے فلیٹ میں رکھا۔پھر ان کے دو بیٹے ہیں۔ان کی بھی مدد سردار بھائی ہی کے حصے میں آئی۔سردار بھائی عمر کے 86 سال بتا گئے اور اتنے شاندار کارنامے اپنے پیچھے چھوڑ گئے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس حقیقت کے پیچھے جس کا ہاتھ ہے وہ یقیناً سلطانہ ہیں۔رفاقت کے 52 سال کم مدت نہیں۔اس طویل مدت میں یہ لوگ کیسی کیسی بدبودار گندے اور ایک چارپائی کی گنجائش کے مختصر سے کمرے

میں سالہا سال مقیم رہے۔"

54

سید محمد مہدی نے بھی اسی بات کا ذکر کیا ہے۔

"ان کی (سردار جعفری) کی شخصیت کو نکھارنے اور تخلیقی کام کی ڈگر پر لگانے میں سلطانہ کا بھی بہت ہاتھ رہا ہے جو ان کی شریک زندگی بھی رہیں۔ ذہنی سفر کی رفیق بھی اور موضوع سخن بھی۔ ان کی شاعری میں محبوبہ کا نام سلطانہ ہے" 55

اولاد:

سردار جعفری کو صرف دو بیٹے ہیں علی ناظم عرف پپّو (ولادت 6 مئی 1949ء) اور علی حکمت عرف چھّم (ولادت 1951ء)۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

"میرے استفسار پر جعفری صاحب نے اپنی بیٹی دردانہ جعفری کا نام بھی بتایا تھا لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے اور جعفری صاحب کے چند احباب اور ہم عصروں کی زبانی بھی یہ معلوم ہوا کہ دردانہ جعفری سلطانہ آپا (سردار جعفری کی بیوی) کے پہلے شوہر کی بیٹی ہیں جن سے انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ یہ جعفری صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور مشفقانہ مزاج کا ثبوت ہے کہ وہ دردانہ کو اپنی سگی بیٹی ہی کی طرح چاہتے تھے۔"

56

معمولات:

نیند سے بیداری:

جعفری صاحب صبح 9 بجے کے بعد فوراً اُٹھ جاتے تھے۔ 57

سبط حسن رقمطراز ہیں:

"سردار تو دیر تک سونے کے عادی تھے"۔۔۔"پچھلی بار کراچی میں دیر سویرا اُٹھنے کی بات نکلی تو بڑی حسرت سے بولے "یار، اب تو آنکھ چار بجے کھل جاتی ہے۔ دس بجے تک سونے کو ترس گئے۔ سحر خیزی کی یہ نئی عادت نہ جانے سلطانہ بیگم کی صحبت کا اثر ہے یا عمر کا تقاضہ۔۔۔"""۔۔۔وہ (سردار جعفری) ممبئی میں اپنے دوست شاکر علی کے ساتھ رہتے تھے۔ شاکر اُن دنوں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتے تھے۔ ان کا فلیٹ بائی کلہ کی نہایت چلتی سڑک پر واقع تھا جہاں شور و غل سے کان پڑی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی لیکن سردار جعفری پر اس شور و غل کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ لکھنو کی طرح یہاں بھی رات میں دیر تک جاگتے اور صبح دیر سے سو کر اُٹھتے۔ دقیانوسی ٹرام میں کھڑکھڑ کرتی اُن کے سر کے پاس سے گزر جاتیں مگر سردار کی نیند میں مطلق خلل نہ پڑتا۔"

58

سلطانہ جعفری کے مطابق "سردار جعفری رات بھر غور و فکر کرتے، کچھ پڑھتے، کچھ لکھتے۔" 59

لباس:

سردار جعفری کے لباس کے بارے میں ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''کپڑے بھی قیمتی اور خوبصورت پہنتے تھے۔اس وقت باہر کی بنی ہوئی سلک آتی تھی جو بوسکی کہلاتی تھی اور روپیہ گز ملتی تھی جب بوسکی بہت قیمتی کپڑا سمجھا جاتا تھا۔سردیوں کے موسم میں بوسکی کی قمیص سوٹ اور ٹائی استعمال کرتے تھے۔گرمیوں میں نہایت باریک ململ کے ہاتھ کے سلے ہوئے کرتے پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے۔اماں اور بڑی بہنیں یہ ناز برداریاں بڑی خوشی سے کرتی تھیں۔جو یہ کہتے تھے وہی کام ہوتا تھا۔یہی صفائی اور نفاست پسندی ہمارے والدین میں تھی۔وہ تو ہر موسم میں استعمال کرنے کا عطر بھی رکھتے تھے۔یہاں تک کہ رات کو بستر میں بھی عطر لگایا جاتا تھا۔'' 60

ناشتہ:

یوسف ناظم نے سردار جعفری کے ناشتہ کے بارے میں بتایا ہے:

''میز پر ایک ٹوسٹر بھی رکھا ہوتا۔جعفری صاحب خود اپنے توس سینکتے اور ایک ابلے انڈے کے ساتھ کھا لیتے۔کھانے سے پہلے دیکھ لیتے کہ دس بجے ہیں یا نہیں۔چائے بکثرت پیتے' بکثرت سے مراد یہ کہ پیالی میں چائے کی مقدار زیادہ ہوتی دودھ اور شکر کی کم اور اگر کیتلی میں چائے مقررہ مقدار سے زیادہ ہوتی تو اپنے ناخواندہ ملاقاتی کو بھی شریک مشروب نوشی کر لیتے۔میرے لیے یہ مشروب بھی جمال ہم نشین ہی کا درجہ رکھتا تھا۔'' 61

سبط حسن نے بتایا ہے:

''پارٹی آفس میں کھانا ٹھیک نو بجے ملتا مگر سردار کو گرم گرم دال روٹی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ان کا کھانا الگ ڈھک کر رکھ دیا جاتا اور وہ دس ساڑھے دس بجے آ کر ٹھنڈا کھانا مزے سے کھا لیتے۔'' 62

سردار جعفری کی غذا کے بارے میں ستارہ جعفری نے بتایا:

''کھانے میں بھی ان کے بڑے نخرے تھے۔گوشت کے علاوہ صرف گنی چنی سبزیاں کھاتے تھے۔شلغم اور مولی کی بھوجیا پکتی تھی تو یہ پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ اس کا چمچا الگ رکھا جائے۔اگر رکابی میں گوشت کی بوٹی ٹوٹ جائے تو فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیتے تھے۔کباب' کوفتے اور مسلّم کے بے حد شوقین تھے۔ہمارے یہاں تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے کا طریقہ تھا۔اگر دسترخوان پر دھبا پڑ جائے تو پھر یہ اس کو استعمال نہیں کرتے تھے ۔۔۔۔سردار بھائی انڈے کا حلوہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔'' 63

رباب جعفری نے سردار جعفری کے معمولات پر روشنی ڈالی ہے۔

ذیلی عنوانات کے تحت ان کے اقتباسات پیش ہیں:

چائے نوشی:

''سردار بھائی صبح سات بجے بیدار ہو جاتے ہیں۔اس وقت صرف دو پیالیاں چائے پیتے ہیں۔

مطالعہ:

صبح چائے کے دوران روزانہ گھر میں آنے والے اخبارات پڑھتے ہیں۔اسی وقت میں اپنی پسند یا ضرورت کی کتابوں کا

مطالعہ کرتے ہیں۔کبھی کبھی ناشتے سے پیشتر ہی اپنا لکھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں کیوں کہ ناشتہ دن کے دس بجے کرتے ہیں۔ کبھی اسی دوران نظموں کا نزول بھی ہوتا ہے۔کبھی خاموشی سے نظم لکھتے ہیں اور کبھی اشعار آہستہ آہستہ پڑھا کرتے ہیں۔

تخلیقی کام:

تخلیقی کام رات کو سونے سے اُٹھ کر بھی کرتے ہیں لیکن روزانہ نہیں۔۔۔ہم لوگوں کو کسی نظم کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم کتاب تلاش کر رہے ہوتے ہیں تو یہ ہم سے پوچھ کر فوراً بتا دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ نظم موجود ہے۔

ٹائپ ٗترجمہ:

ٹائپ کرنے کا کافی کام سردار بھائی خود کرتے ہیں۔باقی کام ان کے اسسٹنٹ شمیم احمد شمیم کرتے ہیں۔اس میں ذاتی خطوط کے جوابات،اپنے آرٹیکل،اپنے کام کے ضروری کاغذات وغیرہ اپنے سامنے لکھ کر نہیں رکھتے ہیں۔دماغ سوچتا ہے اور انگلیاں بڑی تیزی سے ٹائپ کے حروف پر چلتی ہیں۔اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو وہ بھی کاغذ پر نہیں لکھتے۔دماغ خود ترجمہ کرتا ہے۔انگلیاں ٹائپ کی مشین پر رقص کر کے کاغذ کو سونپ دیتی ہیں۔

میٹنگیں،ادبی جلسے:

شہر میں مختلف قسم کی میٹنگیں ادبی جلسے وغیرہ ہوتے ہیں اُن میں شرکت کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ذاتی ضروریات کے لیے بھی گھر سے جانا ضروری ہوتا ہے۔اس طرح کسی دن کئی کئی مرتبہ گھر سے باہر جاتے ہیں پھر جو فرصت کا وقت ملتا ہے اس میں پڑھا کرتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔اس پر بھی سردار بھائی کو شکایت ہوتی ہے کہ ''مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔

انٹرویو لینے والوں کی آمد:

سردار بھائی سے ملنے کے لیے روزانہ بہت سے لوگ آتے ہیں۔ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو ان سے شاعر کی حیثیت سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔کچھ افراد اپنی ذاتی ضروریات میں مدد لینے آتے ہیں۔ہندی' اُردو' انگریزی میگزین کے نامہ نگار انٹرویو لینے آتے ہیں۔ملک میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جاتا ہے یا کوئی فن کار' ملک کا بڑا لیڈر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ٹی وی اور آل انڈیا ریڈیو پر اُن کے بارے میں بولنے کے لیے بلایا جاتا ہے یا اُن دونوں اداروں کے لوگ گھر پہ ریکارڈنگ کے واسطے آجاتے ہیں کیوں کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہاں جانے کی فرصت نہیں نکال سکتے'' 64

لکھنے کا وقت:

سلطانہ جعفری لکھتی ہیں:

''سردار رات ہی کو لکھتے تھے۔اس وقت جب گھر کے سارے لوگ سو جاتے' سردار لکھنے بیٹھتے تھے۔اندر کے کمرے میں جہاں اُن کی تمام کتابیں رکھی ہوئی ہیں' وہ رات بھر غور و فکر کرتے' کچھ پڑھتے کچھ لکھتے اور خوب سگریٹیں پیتے تھے۔۔۔لکھتے

وقت ضروری ہوتا کہ اُن کے کمرے میں کوئی نہ ہو۔ جب یہاں اُن کی بہنیں آ گئیں تو وہ اپنے اُس کمرے کی بجائے باہر کے روم میں بیٹھتے۔ لکھتے وقت وہ چاہتے تھے کہ آس پاس کوئی نہ ہو، کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر نہ آئے۔ یہیں اس کمرے میں بیٹھ کرانہوں نے اپنی کئی خوبصورت اور شاہکار نظمیں لکھیں۔'' 65

وہ (سردار جعفری) جب غور وفکر میں غرق ہوتے ہیں تو ان کی انگلیاں بار بار اپنے بالوں میں گھومنے لگتی ہیں۔'' 66

محمد ایوب واقف نے بتایا کہ سردار جعفری خطوط کے جوابات جلد دے دیتے تھے۔

''جس زمانے میں اپنی مستقل تصنیف علی سردار جعفری شخصیت اور شاعری'' مکمل کرنے میں مصروف تھا اکثر امور خاص طور سے اختلافی اور بحث طلب معاملات کی وضاحت اور صراحت کے سلسلہ میں جعفری صاحب سے یا تو ٹیلی فون پر گفتگو کرتا تھا یا پھر انھیں خطوط لکھتا تھا۔ جعفری صاحب میرے ہر سوال کا جواب فوراً مرحمت فرمایا کرتے تھے۔'' 67

مشغلہ:

پروفیسر عبدالستار دلوی نے سردار جعفری کے مشاغل یوں بیان کیے ہیں:

''سیاسی جماعتوں (کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس) سے اور اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی اور انگریزی، اُردو فارسی زبانوں کا وسیع مطالعہ۔'' 68

کتابوں کا ذوق وشوق:

سردار جعفری کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

ان کے گھر میں موجود کتابوں کے ذخیرہ کے بارے میں رباب جعفری نے بتایا ہے:

''جس کمرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں اسی میں ہم دونوں بہنیں رہتی ہیں۔ کمرے کی دیواروں میں الماریاں لگی ہیں اور ان میں کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ میزوں اور زمین پر بھی کتابیں رکھی ہیں۔ غرض یہ کہ جس طرف نگاہ جاتی ہے کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔'' 69

مذہبیت:

سردار جعفری توحید اور رسالت میں پختہ یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ''خودنوشت'' میں لکھا ہے:

''اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردعمل صرف جذباتی تھا اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ وبغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں۔ خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوندوں کی چادر میں ہے اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں، اب اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ نظم میں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا۔ لیکن والد اور چچا کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التجا حسین صاحب تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا ''تم خدا کو مانتے ہو'' وہ مجھے اسی طرف لے جانا چاہتے تھے

کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں' لیکن گفتگو میں بات یہاں تک آ پہنچی کہ میں نے کہا کہ ''میں خدا کو اس لیے مانتا ہوں کہ رسول کو مانتا ہوں۔'' بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا۔ میں یہاں تک کہہ گیا کہ آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن میرے پاس ہے اور وہ کہ رسولؐ نے کہا ہے کہ خدا ہے''۔ میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا اور دیر تک بانگ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہنچا۔

تھی تو موجود ازل ہی سے تیری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشان تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت تیرے محبوبؐ کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل کو پیش کر کے آیا ہوں۔'' 70

قرآن کی آیت کل من علیھا فان کو سردار جعفری نے بارہا پڑھا ہے۔ بچپن ہی سے موت' قبر کی زندگی، حساب کتاب، قیامت کی باتیں ان کے کانوں میں پڑی ہیں۔ انہوں نے زندگی اور موت کو خدا کی نعمت سمجھا۔ سردار جعفری کے مضمون ''دلھوں کے چراغ'' کے حوالے سے عمر رضا نے لکھا ہے کہ موت اور زندگی کے اسلامی تصور پر سردار جعفری کے مثبت رویے کا اظہار ملتا ہے۔ عمر رضا لکھتے ہیں:

''1970 کے آس پاس تحریر کردہ چار قسطوں پر مشتمل مضمون ''دلھوں کے چراغ: موت اور زندگی کے آئینہ میں'' آج کل دہلی کو روانہ کیا جو جنوری تا اپریل 1996ء میں شائع بھی ہوا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سردار جعفری اس عہد میں بھی نہ صرف یہ کہ اپنے رجائی طرز فکر پر قائم و دائم رہے بلکہ موت کے روحانی تصور کو بھی وہ اس کے وسیع تر معانی و مفاہیم کے ساتھ قبول کر رہے تھے۔ بالخصوص اس مضمون میں موت اور زندگی کے اسلامی تصور پر انہوں نے جس طرح کے مثبت رویے کا اظہار کیا ہے' اس سے اسلام کے تئیں ان کے ایقان میں آئی صحت مند تبدیلی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون کی پہلی قسط میں وہ لکھتے ہیں۔ ''میرے کان بچپن سے ان الفاظ کے عادی ہیں کہ موت برحق ہے' قبر برحق ہے' قیامت برحق ہے' حساب و کتاب برحق ہے۔ زندگی خدا کی نعمت ہے اور موت بھی خدا کی نعمت ہے اور کفران نعمت گناہ۔ قرآن شریف کی یہ خوب صورت آیت جو میں نے بچپن میں لکھنو کے نہایت خوش الحان قاریوں سے سنی ہے اور بار بار پڑھی ہے اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔

کل من علیھا فان و یبقٰی وجہ ربك ذو الجلال و الاکرام فبای آلاء ربکما تکذبٰن

(جو مخلوق زمین پر ہے وہ سب فنا ہونے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات جو عظمت اور کرامت والی ہے باقی رہے گی تو اپنے مالک کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے)

''میرے حافظے میں یہ بات کہیں محفوظ نہیں ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ یہ کہا گیا ہو کہ زندگی کی طرح موت بھی خدا

کی نعمت ہے"۔

"۔۔۔علاوہ ازیں سردار جعفری نے اس مضمون میں موت اور زندگی کے فلسفے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ مضمون کے چاروں اقساط بے حد دلچسپ اور معلو ماتی ہیں ۔۔۔تیسری قسط میں ۔۔۔۔۔سردار جعفری نے نثر میں شاعرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے موت اور زندگی کے فلسفے کو کتنے آسان اور خوبصورت لہجے میں بیان کر دیا ہے۔" 71

سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"میں اس خیال سے خوف زدہ ہوں کہ خدانخواستہ نیوکلر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا۔ میری پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اُڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اُتر کر سوا نیزے کے فاصلے پر آجائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا نیوکلیر جنگ اس سے کم بھیانک ہوگی۔" 72

ستارہ جعفری نے لکھا ہے "رمضان میں سردار بھائی بھی سب کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔۔۔ہر شب جمعہ سردار بھائی مجلس پڑھنے لگے"۔ 73

فضیل جعفری لکھتے ہیں:

"اس کشادہ ذہنی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے مذہبی آدمی تھے" 74

رباب جعفری کا انتقال 29 جولائی 1997ء کو ہوا۔ سردار جعفری نے مضمون دعائے مغفرت لکھی، ملاحظہ کیجئے۔

دعائے مغفرت (برائے رباب باتو جعفری)

رباب درد ہے خاموش، دل کے تاروں میں
نہ کوئی نغمہ جانکاہ ہے نہ شعلہ آہ
بس ایک اشک کا قطرہ ہے بھیگی پلکوں پر
تمہارے کرب مسلسل کے خاتمے کا گواہ
سکون کہتا ہے چہرے کا، باغ جنت سے
جناب فاطمہ زہرا ؑ کی پڑ رہی ہے نگاہ
تمہارا زادِ سفر، عشق اہلِ بیت رسولؐ
تمہاری دولتِ ایمان، تمہارا توشۂ راہ
جوارِ رحمتِ حق میں ملے جگہ تم کو
بحق اشہدان لا الہ الا اللہ

75

حمایت علی شاعر کے مطابق علی سردار جعفری نے ایک کٹر مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ 76

ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے:

میں نے کتاب کا پیش لفظ حرفے چند کے عنوان سے لکھا اور جعفری صاحب کو بھیج دیا تھا تا کہ چھپنے سے پہلے ان کی نظر سے گزر جائے۔انہوں نے مسودہ جوں کا توں واپس کر دیا اور اس پر ''سبحان اللہ'' لکھ کر دستخط کر دیے۔پھر چند دنوں بعد انہوں نے اپنے مضمون ''چند باتیں'' کا مسودہ کتاب میں شامل ہونے سے پہلے مجھے بھیجا۔میں نے اسے پڑھا اور اسی طرح لوٹا دیا اور لکھ دیا ''سبحان اللہ'' کالی داس گپتا رضا'' فوراً فون آیا اور فرمایا ''بہت خوب''۔ 77

سردار جعفری اسلام میں زکوۃ اور وراثت کے مسائل دریافت کیے تا کہ اس کے مطابق اپنی مرحوم بہن کے فنڈ' گریجویٹی' کمیوٹیشن' بینک بیلنس سے زکوۃ اور وراثت کے مسائل حل کریں۔انیس چشتی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری۔۔۔بلا کے کمیونسٹ تھے لیکن گھر سے رخصت ہوتے ہوئے امام ضامن بندھواتے تھے۔۔۔ایک مرتبہ اس وقت میں بہت چونک پڑا۔جب انھوں نے مجھ سے زکوۃ اور وراثت کے مسائل دریافت کرنے شروع کر دیے۔میں بہت سٹپٹایا اور دولت کی مساوی تقسیم کا شہرہ آفاق نعرہ روس کی شکست کے بعد میرے ذہن میں یہ تصور لیے کوند گیا کہ شاید اشتراکی نظام کی شکست کے اسباب وعلل کے تعلق سے سردار جعفری صاحب کے ذہن میں کوئی نیا Concept ہے۔میں نے عرض کیا ''حضرت! یہ استفسار تو مولوی صاحبان اور مفتیان کرام سے کرنے کا ہے'' باتوں سے ایسا لگا کہ شاید وہ ان کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتے اور موٹی موٹی باتوں اور مسائل سے واقف ہونا چاہتے ہیں تا کہ کوئی بڑا معرکہ نہیں بلکہ گھریلو مسائل سر کر سکیں۔ میں ان کی عدم سرمایہ داری سے واقف تھا۔۔۔میں نے اضطراراً کہنا چاہا کہ حضرت! یہ مسائل آپ کو کب سے پیش آنے لگے اور پھر یہ کہ آپ مسلکی طور پر فقہ جعفری کے قائل ہیں اور اس میں میرا مطالعہ صفر ہے۔انھوں نے چند جملوں میں اپنے موقف کو واضح کیا اور کہا کہ میں ان اختلافات کا قائل نہیں۔مجھے یہ بتایئے کہ اسلام کیا کہتا ہے۔میں نے اپنی معلومات بھر زکوۃ' صدقہ' فطرہ' عشر' خمس' نصاب اور وراثت کے تعلق سے معلومات بہم پہنچائیں۔بعد میں پتہ چلا کہ حال ہی میں ان کی جس ہمشیرہ رباب بانو کا وصال ہوا تھا اور وہ کسی اسکول میں ملازم تھیں۔چنانچہ ان کا فنڈ' گریجویٹی' کمیوٹیشن' بینک بیلنس اور شاید انشورنس وغیرہ کے بھی مکلف جعفری صاحب ہی تھے اور وہ اس رقم کا شرعی طور پر نپٹارہ کرنا چاہتے تھے تا کہ ہمشیرہ کے فرائض بھی ادا ہو جائیں اور پسماندگان وراثت سے بھی محروم نہ رہیں۔یہ تھا ان کا اسلامی شغف جسے ہم Applied Islam کہہ سکتے ہیں۔اب یہ تو ان کے گھر والے ہی بتا سکتے ہیں کہ آگے کیا ہوا۔'' 78

معاشی حالت:

سردار جعفری قناعت پسند تھے انہوں نے وقار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ان کے احباب نے ان کی مالی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔محمد اسداللہ نے سردار جعفری کی معاشی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

''سردار بھائی عمر کے جو 86 سال بتائے گئے اور اتنے شاندار کارنامے اپنے پیچھے چھوڑ گئے' وہ ایک تاریخی حقیقت ہے

اور حقیقت کے پیچھے جس کا ہاتھ ہے وہ یقیناً سلطانہ ہیں۔رفاقت کے 52 سال کم مدت نہیں۔اس طویل مدت میں ان لوگوں نے کیسی کیسی اذیتیں جھیلیں، کن کن مصائب سے گزرے، کتنی پریشانیوں کا سامنا کیا، بدبودار، گندے اور ایک چارپائی کی گنجائش کے مختصر سے کمرے میں سالہا سال مقیم رہے۔مدت بعد جو تھوڑی سی فراغت ملی تو وہ کس قدر کم تھی، ان کے سالہا سال میری نظروں کے سامنے ہیں۔سردار بھائی کے ساتھ بسوں کی قطار میں کھڑے ہو کر سخت گرمی کے موسم میں، یا بارش کے دنوں میں بارش میں بھیگنے بس کے انتظار کرنے کا تجربہ مجھے آج بھی یاد ہے۔چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں کھانا کھانا یا پھر ایرانی ریستوران میں آدھی پیالی سستی چائے پینا کل ہی کی بات لگی ہے۔کتنی ہی بار ہم نے پیدل فاصلہ طے کیا چوں کہ ہم دونوں کے ہاں بس کے کرایے کے پیسے بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔سردار بھائی کی تحریروں سے انھیں کیا ملا؟ سچ تو یہ ہے کہ اپنی رائلٹی سے وہ سانس کی ڈور بھی تھامے نہیں رکھ سکتے تھے۔نوکری انہوں نے کبھی کی نہیں، البتہ مشاعرے، ٹی وی پروگرام اور بعد کو اکیڈمیوں کے انعامات نے ان کو سہارا دیا۔دور سے دیکھنے والے اور دوسروں کے منہ کے نوالے گننے والے نہیں جانتے کہ بمبئی مہنگا شہر ہے، زندگی میں آدمی کو طرح طرح کی ضرورتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بیماری کے اپنے مطالبات ہوتے ہیں اور بڑھتی عمر میں قویٰ جواب دینے لگتے ہیں۔پھر بھی سردار بھائی نے اپنے زندگی Dignity کے ساتھ گزاری۔سر کو اونچا ہی رکھا۔اپنے وقار میں اپنے مرتبہ میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیا اور یہ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ سردار بھائی کی پشت پر سلطانہ آپا کا ہاتھ تھا۔اپنے 2 ستمبر 1995ء کے خط میں سردار بھائی نے مجھے لکھا تھا کہ ''عمر کے 82 سال عزت آبرو کے ساتھ گزر گئے اور یہ کہ ''باقی سال بھی ایسے ہی سبک روی کے ساتھ گزر جائیں، بس یہی تمنا ہے۔'' 79

ایک جگہ سردار جعفری نے لکھا ہے:

''میرا تو بیشتر وقت فکر معاش میں ہی گزر گیا۔'' 80

شوکت کیفی نے سلطانہ جعفری کی ملازمت کے بارے میں لکھا:

''سلطانہ آپا نوکری کرتی تھیں۔اپنے بچے کو پالتی تھیں اور کمیون چلاتی تھیں جس میں کہنے کو تو ہر کامریڈ کو ہر مہینے اپنے کھانے کے پچاس روپے دینے پڑتے تھے لیکن یہ بھوکڑ لوگ کئی کئی مہینے پیسے نہیں دے سکتے تھے ان کو کھانا وہی کھلاتی تھیں اور ان میں میں بھی ایک تھی کیفی انڈر گراونڈ چلے گئے تھے اور میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔'' 81

محمد اسداللہ نے قبیلہ پرور سردار جعفری کی مالی مشکلات کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

1۔ سردار بھائی کو کمیونسٹ پارٹی سے 40 روپے ملا کرتے تھے۔سخت مالی دشواریوں کی وجہ سے سلطانہ آپا نے سوشیل ایجوکیشن آفس میں کام کرنا شروع کیا، ان کو بمبئی کے اسکولوں کے معائنے کے لیے بہت سی عمارتوں میں سیڑھیاں چڑھنی ہوتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریڑھ کی ہڈی کا درد ستانے لگا۔میں ان دنوں لندن میں رہتا تھا۔میں نے اپنے چند امیر دوستوں سے صلاح کی اور طے کیا کہ سلطانہ آپا کو علاج کے لیے لندن لانا چاہیے۔میرے خط کے اور میری پیشکش کے جواب میں 8 دسمبر 1958ء کو سردار بھائی نے مجھے لکھا کہ ''لندن میرے لیے مہنگا رہے گا'' اور یہ کہ ''شاید ماسکو میں علاج کا بندوبست ہو جائے''۔سلطانہ آپا باہمت خاتون تھیں۔وہ یہ مصیبت جھیل گئیں اور پھر طرح طرح کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

2۔سچائی یہ ہے کہ زندگی کے آخرلمحوں تک گزر بسر کے لیے سردار جعفری کو محنت کرنی پڑی۔انھیں کنواں کھودنا اور پانی نکالنا پڑتا تھا تب ہی پیاس بجھتی تھی۔وہ بھی پوری نہیں۔پھر وہ تنہا نہیں تھے۔ان کی دو غیر شادی شدہ بہنیں ستارہ اور رباب بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔''

82

یوسف ناظم نے لکھا ہے:

''اسی کتاب (لکھنو کی پانچ راتیں) کے ایک مضمون میں جعفری صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سبطِ حسن اور مجاز لکھنوی کی سڑکوں پر گھنٹوں اس لیے پیدل چلتے رہے کہ ان تینوں کی جیبوں میں جملہ دو آنے تھے اور کوئی بھی تانگے والا دو آنے میں تین سواریاں قبول کرنے پر رضامند نہیں تھا۔''

83

انور ظہیر خاں نے سردار جعفری کی معاشی حالت کا ذکر کیا:

''فیاض احمد فیضی اپنی عادت کے مطابق پوچھ بیٹھے: ''جعفری صاحب! آپ نے ''کہکشاں'' (سیریل) کے ذریعے لاکھوں روپے کمائے ہوں گے۔۔۔(وہ) بولے ''پتہ نہیں کیوں لوگ میرے تعلق سے اس طرح کی رائے قائم کر لیتے ہیں، وہ بھی عجلت میں۔یقیناً اس سیریل سے اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی لیکن یہ بہت پہلے کا پروجیکٹ تھا۔اشتہارات زیادہ مل نہیں پائے تھے۔اس میں پارٹنر شپ بھی تھی۔بمبئی سے دہلی بھاگ دوڑ میں مصارف اتنے رہے کہ پلّے کچھ نہیں پڑا بس شوق پورا ہو گیا۔اور بتاؤں جناب! اگر میں مشاعرے نہ پڑھوں، سمیناروں میں شرکت نہ کروں تو سفید پوشی برقرار رکھنا مشکل ہو جائے''۔۔۔۔۔سردار جعفری کا پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے نام تحریر کردہ خط (مطبوعہ کتاب نما، دہلی)۔۔۔میں ایک مقام پر انہوں نے کچھ اس طرح کے الفاظ لکھے تھے:

''مجھے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے، تب کہیں پانی نصیب ہوتا ہے۔۔۔''

۔۔۔جب جعفری صاحب کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تو اس کے پندرہ ہی دنوں کے اندر وہ دبئی جانے کا پروگرام بنانے لگے۔ان سے عرض کیا گیا کہ ابھی تو آپ پورے طور پر جانبر بھی نہیں ہوئے ہیں لہٰذا جانا مناسب نہیں۔ان کا جواب تھا۔''

''اگر نہ جاؤں تو اسپتال کا بل کیسے Pay کیا جائے گا۔''

84

رضیہ فصیح احمد نے لکھا ہے:

''یہ سب لوگ (سردار جعفری اور ان کی فیملی) کن مالی مشکلات سے گزرے، کن چٹانوں سے ٹکرائے، جیلوں میں رہے۔یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔آدرش کی خاطر جان پر دکھ سہنا بڑی بات ہے۔''

85

لکھنو میں دسمبر 1947ء میں ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس میں سردار جعفری کو انجمن کا جنرل سکریٹری چن لیا گیا اور انجمن کا دفتر بمبئی منتقل کیا گیا۔سردار جعفری نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے حرف آخر میں بمبئی میں رہائش گاہ کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب میں اپنی کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔میرا کرائے کا مکان مجھ سے اس لیے چھین لیا گیا کہ اس میں کبھی سجاد ظہیر رہا کرتے تھے اور اب وہ پاکستان چلے گئے ہیں جس کی وجہ سے حق کرایہ داری متروکہ جائیداد قرار دے دیا گیا۔بمبئی میں مکان

تلاش کرنا اور حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے ۔۔۔پگڑی پیش کرنا میرے بس کی بات نہ تھی ۔کئی مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد بمشکل تمام مجھے ایک کمرے کا مکان مل گیا جہاں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہوگیا اور اب تک اسی کمرے میں رہ رہا ہوں ۔۔چار چھ مہینے کی مزید کوشش کے بعد مجھے اسی گھر میں ایک اور چھوٹا سا کمرہ مل گیا اور مجھے اطمینان ہوگیا کہ میں اس بے ہوا بے نور کمرے میں بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتا ہوں لیکن اطمینان پھر بھی نصیب نہ ہوا۔میرے ایک اور ادیب دوست جو ہندی کے شاعر ہیں آگئے ۔وہ بھی میری طرح بے گھر تھے اور انہوں نے اس کمرے میں آکر پناہ لی ۔اب یہ چھوٹا سا کمرہ میرا کتب خانہ بھی ہے' میرے شاعر دوست کا ٹھکانہ بھی اور میرے گھر کا مہمان خانہ بھی ۔۔۔بعض اوقات وہ (کمرے میں موجود لوگ) میری کوئی ایسی کتاب اٹھا کر لے جاتے ہیں جسے میں حوالے کے لیے استعمال کر رہا ہوں اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ کتاب کہاں گئی ۔۔۔اکثر جب مجھے کچھ سوچنے یا لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے اپنے شاعر دوست کی کوئی طویل نظم سننی پڑتی ہے یا میں انھیں داد دوں یا بتاؤں کہ میں نے داد کیوں نہ دی ۔۔عین میرے کمرے کے نیچے کا کمرہ مردہ خانہ ہے جہاں سے اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں ان کے عزیز و اقارب کو دی جاتی ہیں ۔۔۔لاش کفنائی جاتی ہے پھر ماتم کے ساتھ جنازہ اُٹھتا ہے اور یہ شور ماتم کبھی دن میں بلند ہوتا ہے کبھی رات میں ۔۔۔انہی نامساعد حالات میں مئی 1949 میں بھیونڈی (علاقہ بمبئی) میں ترقی پسند ادیبوں کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔''

86

سردار جعفری نے ہمیشہ چھوٹے گھروں میں زندگی گزار دی۔کئی ادیبوں نے ان کی رہائش گاہوں کا ذکر کیا ہے۔

یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''ان کے (سردار جعفری) ناقدین سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جعفری صاحب اُردو کے اتنے بڑے آدمی ہونے کے باجود عمر بھر اس چھوٹے سے کرایے کے فلیٹ میں رہے جو شاید ان کے نام تھا بھی نہیں ۔اس سے زیادہ قدر دانی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

87

علی جواد زیدی نے سردار جعفری کی ایک رہائش کا ذکر کیا ہے۔

''سردار شروع شروع میں حضرت گنج کے ایک کمرے میں سبط حسن کے ساتھ رہتے تھے۔کبھی کبھی اُن کے ساتھ کوئی اور بھی سو رہتا۔زمین کے فرش میں یہی تو آسانی ہوتی ہے۔کھانا کسی رستوراں میں جا کر کھا لیتے یا کمرے میں ہی منگا لیتے ۔وہی دفتر تھا وہیں شعر نازل ہوتے ۔نظریاتی مضامین لکھے جاتے' رسالے ترتیب پاتے ۔ترقی پسند ادب کی ترویج کے منصوبے بنتے ۔دو چار ہم خیال جمع ہو جاتے تو چھوٹی موٹی مجلس شعر بھی مرتب ہو جاتی ۔پھر یہ لوگ وہاں سے وسیع تر قندھاری لین والے مکان میں منتقل ہوگئے ۔''

88

رفعت سروش نے سردار جعفری کی بنّے بھائی کے مکان میں رہائش کے بارے میں لکھا ہے:

''آزادی کے بعد کچھ دن تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستیں بنّے بھائی کے مکان پر ہی منعقد ہوتی رہیں ۔کیوں کہ وہ کئی ماہ بعد پاکستان گئے تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی کیفی اعظمی اور سردار جعفری کافی دن تک اس مکان میں رہے۔'' 89

محمد اسد اللہ نے سردار جعفری کی شادی کے وقت کی رہائش کا ذکر کیا۔

''یہ لوگ کمیون میں رہتے تھے جو اندھیری میں تھا۔شہر سے کافی دور۔1945ء تک یہ عمارت اٹلی کے نظر بندوں کی جیل تھی اور یہی عمارت بعد میں انڈین پیپلز تھیٹر اسوسی ایشن کا صدر دفتر بنی۔'' 90

رباب جعفری نے سردار جعفری کی رہائش گاہوں کے بارے میں لکھا ہے:

''سردار بھائی سیتا محل میں 1962ء سے رہتے ہیں۔اس کے پیشتر کھیت واڑی عرب بلڈنگ میں رہتے تھے۔یہ فلیٹ کمیونسٹ پارٹی کا تھا اور بہت بڑا۔سردار بھائی کے پاس اس فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ایک میں ہم دونوں بہنیں رہتی تھیں۔دوسرے میں سردار بھائی اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں ناظم اور حکمت کے ساتھ رہتے تھے۔باقی کمروں میں دوسرے پارٹی ممبر اپنے خاندانوں کے ساتھ مقیم تھے۔اس جگہ بھی سکون نایاب تھا۔پارٹی میٹنگیں' ادبی میٹنگیں دوسرے رہنے والوں کے عزیزوں کی آمد و رفت' کھیت واڑی میں بھی بچے سردار بھائی کے کمرے میں کھیل کر خوش ہوتے تھے۔۔۔سردار بھائی خاموشی سے اپنی چھوٹی سی میز پر بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔اس سے خوش رہتے تھے کہ بچے خوش ہیں۔'' 91

حلقہ احباب:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے 1990ئمیں جب وہ کتاب نما کا گوشۂ سردار جعفری ترتیب دے رہی تھیں اُس وقت انھیں سردار جعفری نے اپنے حلقہ یاراں کے نام گنائے تھے۔اُسے انہوں نے تقدیم و تاخیر نیز حسب مراتب سے قطع نظر اپنی تصنیف ''علی سردار جعفری:ایک مطالعہ'' میں صفحہ 27پر درج کیا۔وہ اس طرح ہے:

''ڈاکٹر ملک راج آنند۔پنڈت سمترانندن پنت'ڈاکٹر رشید جہاں'مجاز'سبط حسن'جذبی' جاں نثار اختر'سجاد ظہیر'عصمت چغتائی'فیض احمد فیض'احمد ندیم قاسمی'خواجہ احمد عباس' کرشن چندر'راجندر سنگھ بیدی'وامق جونپوری' حیات اللہ انصاری'علی جواد زیدی'مخدوم محی الدین' کیفی اعظمی'مجروح سلطان پوری'سعادت حسن منٹو'ساحر لدھیانوی'ن۔م۔راشد'اختر الایمان'سکندر علی وجد''زہرا نگاہ'ماجد علی'احمد فراز'زاہدہ زیدی'ساجدہ زیدی'ڈاکٹر محمد حسن'پروفیسر قمر رئیس اور بے شمار نام''۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یہ فہرست 1990ئتک کی ہے۔اس کے بعد کے دس سالوں میں اگر سردار جعفری کی کسی سے دوستی ہوئی ہو اس کا تو انھیں پتہ نہیں' کچھ نام ویسے بھی رہ گئے تھے۔انہوں نے لکھا کہ دو ایک نام تو وہ جانتی ہیں جیسے یوسف ناظم'عرفانہ عزیز'انل سہگل اور سیما سہگل' کالی داس گپتا رضا'وغیرہ جن سے جعفری صاحب کے دوستانہ مراسم رہے۔رفیعہ شبنم عابدی اور صہبا لکھنوی نے حسب ذیل نام بھی درج کیے ہیں۔ڈاکٹر عبدالعلیم'حمید اختر'عبدالرحمٰن چغتائی' صادقین'اداجعفری'ہاجرہ مسرور'خدیجہ مستور'احمد علی خاں'حسن عابدی'شوکت صدیقی' قتیل شفائی'ابراہیم جلیس'قرۃ العین حیدر'احتشام حسین'رام لعل'پروفیسر کوپی چند نارنگ'شمس الرحمٰن فاروقی'شاہد علی خاں'عبدالقوی ضیا'صہبا لکھنوی'بیدار بخت'ممنون حسن خاں'پروفیسر جگن ناتھ آزاد'اشفاق حسین'محمد علی صدیقی'اختر سعید خاں وغیرہ۔ 92

مشاہیر سے ملاقاتیں:

ٹیگور'مہاتما گاندھی'سروجنی نائیڈو'جواہر لال نہرو'مولانا ابوالکلام آزاد'پبلو نرودا'جولو کیوری'ایلیا اہرن برگ'پال رابسن'

فرانسیسی شاعر لوی آراگاں، قدیف، ترسون زادہ، خروشچوف، یوری گگارین، ناظم حکمت، شیخ محمد عبداللہ، او ماشنکر جوشی، اندرا گاندھی، پنڈت روی شنکر، اُستاد اللہ رکھا (طبلہ نواز)، پنڈت اوم کار ناتھ ٹھاکر (موسیقی)، ایم ایف حسین (مصور)، جیمنی رائے (پینٹر) ستیہ جیت رے، یوسف خاں عرف دلیپ کمار، پرتھوی راج کپور، نرگس، شالوخوف، پاسترناک، ولاتھول۔

کمیونسٹ پارٹی میں شرکت:

محمد حسن نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

''1946ء میں ہندوستانی بحریے کی بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کی کمیونسٹ پارٹی نے بھرپور حمایت کی۔ اس پر نظمیں سردار نے بھی لکھیں اور اسے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ صحیح بھی تھا کیوں کہ انگریز حکومت نے اسے خطرے کی گھنٹی سمجھ کر ہندوستان کو آزاد کرنے کی ٹھان لی اور آخر کار لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 1947 میں تقسیم ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔۔۔ اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی نے انقلابی حکمت عملی اپنائی اور 1948ء میں پارٹی نے انقلاب کا نعرہ دیا۔ تلنگانہ اور شبھا گا کی تحریکیں شروع ہوئیں ملک بھر میں طویل ہڑتال کہیں نہیں ہوئی۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے۔ انہوں نے پارٹی پر پھر پابندی لگا دی اور اسی دوران سردار جعفری پھر جیل چلے گئے۔ البتہ اسی زمانے میں پارٹی کے ایک خفیہ سرکلر میں سردار جعفری کے جیل میں اسٹاف سے دوستی بڑھانے اور مراعات حاصل کرنے کے الزام میں پارٹی سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ملی۔'' 93

سردار جعفری نے لکھنو یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی سے مختلف زبانوں میں ہفتہ وار رسالے جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اُردو رسالے کے لیے سجاد ظہیر اور سردار جعفری کو بمبئی بلایا گیا۔ 1942ء میں سردار جعفری نے پارٹی کے اخبار میں کام کرنے کے لیے بمبئی آئے۔ اخبار کے دفتر کے قریب ایک عمارت میں دفتر میں کام کرنے والوں کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ چالیس روپے تنخواہ ملتی جس میں تیس روپے کھانے کے کٹ جایا کرتے۔ اخبار کے دفتر میں کئی کام کرنے والے ہوتے اور باہر اخبار کی فروخت سب مل کر کیا کرتے ممبئی میں ترقی پسند مصنّفین کے جلسے ہر ہفتہ ہوا کرتے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی نے 51-1950ء میں الہ آباد میں منعقدہ ایک مشاعرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے شعراء نے ایک اور رسم مشاعرے میں شروع کی تھی مشاعرے کے درمیان شعر خوانی چھوڑ کر شعراء مجمع میں سامعین کے درمیان اُتر جاتے اور رومال پھیلا کر کمیونسٹ پارٹی کے لیے چندہ جمع کرتے۔ سردار جعفری، مجروح، وامق، راہی اور مسعود اختر جمال سب مجمع میں اُتر گئے اور انہوں نے بہت سا چندہ اکٹھا کیا اور پھر واپس آ کر مشاعرہ پڑھنے لگے۔'' 94

روس میں فکر و نظر کی پابندیوں کے ہندوستان کے آدمیوں پر اثرات اور سردار جعفری کا کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ کی تجدید نہ کرنے کے پس منظر پر علی جواد زیدی نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب روس میں جو انکشافات اور وہاں فکر و نظر کی آزادی پر پابندیوں کی جو داستان سامنے آئی، انہوں نے ان سبھی کو

جھنجھوڑ کے رکھ دیا جو ترقی پسندی کے رجحان ساز تھے۔اس سخت گیر رویے کی ایک مثال وہ قصائد اور نظمیں تھیں جو استالین کی شان میں لکھوائی گئی تھیں۔ان میں کیفی اعظمی اور رفعت سروش، سردار جعفری کے ساتھ ساتھ ہر دل عزیز فطری اعتبار سے خوش نظر مخدوم محی الدین تک کو شامل ہونے پر مجبور کیا گیا۔اُستالین کی مخالفت تو پہلے سے ہونے لگی تھی لیکن یہ کون سوچ سکتا تھا کہ لینن کا مجسمہ بھی لڑکھڑانے لگے گا۔تاریخ کے اس کارواں کے ساتھ مشرق و مغرب کی تین چار نسلیں چلی ہیں۔سردار بھی ان نظریوں کے اثر میں آئے۔ان کا بیان ہے کہ 1958ء کے بعد انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ کی تجدید نہیں کرائی تھی یعنی ان کے یہاں بھی ایک خاموش نظر ثانی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔اس لیے انقلاب کے بعد جو کچھ روس میں ہوا یا اس کی قیادت میں ہندوستان میں یا دوسرے ملکوں میں ہوا، ان سب کے خطاوار سردار تو نہیں ہیں۔وہ تیز ہوا تھی، طوفان کا جھونکا تھا جو اپنی رو میں بہت کچھ بہا کر لے گیا تھا لیکن مارکسیت کوئی جامد عقیدہ نہیں تھا۔غلطی ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اسے جامد بنانا چاہا۔'' 95

شخصیتیں جن سے سردار جعفری متاثر تھے:

سردار جعفری انیس، اقبال، جوش، فیض، غالب، میر اور شبلی سے متاثر تھے جس کا ذکر بہت سے ادیبوں نے کیا ہے۔

1۔ محمد علی صدیقی کے مطابق ''ان (سردار جعفری) کے بعض اشعار پر فیض کے اثرات واضح ہیں۔۔۔۔علی سردار جعفری اپنی شاعری کے اوائلی دور میں انیس، اقبال اور جوش سے زیادہ متاثر رہے ہیں، اقبال سے بالخصوص۔'' 96

2۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے انیس، اقبال اور جوش سے متاثر ہونے کی وجہ بھی بتلا دی ہے وہ رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری اُردو شاعری کی ساری وراثت کو قبول کرتے ہوئے بھی انیس، اقبال اور جوش سے خاص طور پر متاثر ہونے والا مزاج لے کر آئے تھے۔وقت کی رفتار، ان کی ذہنی اپج اور عملی سرگرمیوں نے اس پر جلا کی۔ان شاعروں سے ان کی فطری ہم آہنگی کا سبب یہ تھا کہ ان سب لوگوں نے جس مثالی زندگی کا خواب دیکھا تھا، اس سے صرف اپنی آنکھوں کو روشن رکھنے کے بجائے دوسروں کو اس میں شریک کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا تھا۔انیس، اقبال اور جوش کے خواب مختلف ضرور تھے مگر انھیں اپنی اپنی مثالی دنیا پر اس قدر یقین تھا کہ وہ اس کی تمنا کو اپنی ذات کے نہاں خانوں میں قید نہیں رکھ سکتے تھے۔ان کی شاعری پیغام اور صلائے عام کی شاعری تھی۔سردار جعفری جیسا شاعر جو سرگوشیوں کا شاعر نہیں تھا، وہ ان شاعروں سے خصوصی قرب کیے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔اپنے اندر اندر گھلنے اور دل ہی دل میں رونے اور پچھتانے کے بجائے بلند آہنگی سردار جعفری کو راس آئی۔'' 97

3۔ پروفیسر محمد حسن نے سردار جعفری کے اقبال سے متاثر ہونے کے سلسلہ میں بتایا ''اب تک سردار جعفری کم و بیش جوش ملیح آبادی کے طرز پر انقلابی یا جوش دلانے والی وطنی شاعری کرتے تھے۔اب سردار نے ذرا وسیع پیمانے پر اقبال اور ان کے نصب العین کے مبلغانہ طرز ہی کو نہیں کسی قدر ان کے آفاقی تصور، فلسفیانہ لہجے اور شاعرانہ آہنگ کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔'' 98

4۔ سلمیٰ صدیقی کے مطابق ''ان کی (سردار جعفری) کی شاعری میں کہیں انیس کی خطابت اور دردمندی ہوتی، کبھی اقبال کا پرشکوہ لہجہ، کہیں غالب کی خوش ذوقی اور میر کا سوز و گداز میں ڈوبا ہوا انداز بھی کبھو کبھو۔'' 99

پرفیسر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں:

''زبان وبیان کے اعتبار سے سردار جعفری ابتدا سے ہی جوش اور اقبال سے متاثر رہے ہیں۔لہٰذا ان کے یہاں لفظیات کے اعتبار سے جوش کا بھرپور اور وسیع ذخیرۂ الفاظ ملتا ہے۔جوش کی طرح ان کے یہاں بھی نئے نئے دو رخو بصورت الفاظ کی مینا کاری کے نمونے ملتے ہیں۔وہیں لہجے کا بانکپن اور صوتی گھن گھرج سردار جعفری کے یہاں بھی ہے جو جوش کا نشان امتیاز سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اقبال کی ژرف نگاہی اور فلسفے کی بازگشت' عالمانہ متانت اور تخئیل کی رفعت نیز لہجے کا ترنم اور صوتی غنائیت بھی سردار جعفری کے کلام میں رواں دواں نظر آتی ہے۔۔۔۔نثر میں وہ شبلی سے متاثر تھے۔شبلی سے متاثر ہونے کا ذکر انہوں نے راقم السطور سے کیا تھا۔وہ شبلی کو اعلیٰ پایہ کا نثار سمجھتے تھے اور اس کی تقلید سے اپنی نثری تحریروں کو آبدار بناتے تھے اور وہ ایک شاعر کے ساتھ اُردو کے بہترین نثر نگار بھی ثابت ہوئے۔'' 100

دوسری جگہ دلوی صاحب نے لکھا ''انہوں نے (سردار جعفری) شبلی سے نثر لکھنے کا سلیقہ سیکھا ہے۔۔۔۔انہوں نے شبلی کی علمی عظمت کے ساتھ ان نثر نگاری کی داد دی اور ان کے نثری اسلوب کو بھی خراج تحسین پیش کیا تھا۔'' 101

سردار جعفری نے ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں لکھا ہے کہ وہ انیس' غالب اور اقبال سے متاثر ہیں۔معزہ ابراہیم قاضی نے لکھا ہے:۔۔۔''سردار جعفری بھی آہنگ اور فکر کے اعتبار سے انھیں دو شاعروں سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری اور عصری شعور پر ان دو شاعروں کی پرچھائیاں سب سے زیادہ ہے۔'' 102

ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے لکھا ہے:

''اپنی ڈرامائی شاعری میں اپنے بلند پرواز آئیڈیلزم کو شعری پیکر میں ڈھالنے اور انھیں جذبات واحساسات سے مالامال کرنے کا فن بھی سردار جعفری نے میر انیس سے سیکھا ہے جگہ جگہ ان کا بیانیہ انداز بھی میر انیس کی یاد دلاتا ہے۔۔۔۔لیکن نئی دنیا کو سلام میں جب سردار جعفری آفاقیت کی بات کرتے ہیں تو وہ اقبال کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔'' 103

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اقبال اور سردار جعفری کے فکر ونظر کے یکساں خطوط کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اقبال نے دنیا کو بدلنے کا خواب دیکھا تھا سردار بھی اپنے اردگرد کی فضاء سے نامطمئن ڈاکٹر نقی حسین جعفری کے مطابق ''ترقی پسند ادیبوں میں اقبال کو سب سے زیادہ پسند کرنے والوں میں سردار جعفری سرفہرست ہیں۔وہ اقبال سے بہت متاثر ہیں۔۔۔جعفری کی بعض نظموں کے عنوانات اقبال کی نظموں کے عنوانات سے ماخوذ ہیں مثال کے طور پر زندگی اور اے بانکے افغان کے عنوان کی نظم'' 104

ایک دوسری جگہ پروفیسر علیم اللہ حالی نے لکھا ہے:

''اقبال نے دنیا کو بدلنے کا خواب دیکھا تھا۔سردار بھی اپنے اِردگرد کی فضا سے نامطمئن تھے اور اس میں انقلاب لانے کے جویا تھے۔اقبال کے یہاں جو مضبوط' منضبط اور تعمیری فلسفۂ حیات ملتا ہے اس کی عکاسی سردار جعفری کے یہاں واضح طور پر ملتی ہے۔اقبال کی طرح سردار جعفری کے یہاں بھی کمزوروں سے ہمدردی اور ظالم وجابر کے خلاف نفرت وبیزاری کے جذبے عام ہیں۔مشرق ومغرب کے فرق وتضاد میں مشرق کی ہمنوائی اقبال کا بھی شیوۂ کار رہا ہے اور سردار کا بھی۔'' 105

بقول ڈاکٹر رفعت انساء بیگم ''سردار جعفری فکری اعتبار سے اقبال اور غالب سے اور نزاکت کے لحاظ سے میرؔ سے قریب ہیں۔''

106

سردار جعفری صوفی، سنتوں، فقیروں، سنت گیا نیشور، امیر خسرو، کبیر اور سنت تکا رام سے متاثر تھے۔

سردار جعفری نے حمید اللہ بھٹ کو ایک انٹرویو میں بتایا:

''میری تخلیقات پر صوفی سنتوں اور فقیروں کا گہرا اثر ہے۔ سنت گیا نیشور، امیر خسرو، کبیر اور سنت تکا رام نے انسانیت کو اونچا مقام دیا اور طبقاتی فرق کو ختم کیا وہی اثر میری تصنیفات میں در آیا ہے۔ انسانی معاشرے کی آزادی اور انسان کی سربلندی کی لڑائی لڑی ہے۔ میں نے اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کے لیے ہی استعمال کیا ہے''۔ 107

سردار جعفری لوئی آراگوں، جولیو کیوری، پال رابسن، ایلیا اہرن برگ، Rossetti، سوئن برن، پابلو نرودا، والٹ وٹ مین، مایا کووسکی، کارل مارکس اور ناظم حکمت سے متاثر تھے۔

1۔ محمد علی صدیقی نے لکھا ہے ''علی سردار جعفری نے اپنی شاعری کے دوسرے دور میں روسیٹی (Rossetti)، سوئن برن اور پابلو نرودا کے اثرات کے علاوہ انگریزی، میٹا ''فزیکل'' شاعروں کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا تھا اور غالباً ان کی شاعری میں جلال کے مقابلے میں جمال کا وفور اسی لیے ملتا ہے۔'' 108

2۔ حمید اللہ بھٹ نے سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر ان کا انٹرویو لیا تھا۔ اس میں سردار جعفری نے ایک سوال کے جواب میں کہا ''عظیم شاعروں نے ہمیشہ ہی انسان کی سربلندی کی لڑائی لڑی ہے۔ اپنے قلم کو انسان کی بقا کے لئے استعمال کیا ہے۔ انسان کو بہتری کی راہ دکھائی ہے۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ پابلو نرودا اور ترکی کے ناظم حکمت جیسی معروف ہستیاں میرے قریب رہی ہیں وہ میرے بزرگ تھے اور مجھے ان سے تحریک ملی ہے ہم سب والٹ وٹ مین اور مایا کووسکی وغیرہ سب ہی فارسی اور عربی کے شعراء سے متاثر تھے۔ 109

3۔ محبوب الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

''وہ کارل مارکس، پبلو نرودا اور ناظم حکمت کے ساتھ ہی وہ حافظ کے بھی دیوانے تھے۔'' 110

4 ۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''یہ شخصیات عالمی شہرت کی مالک ہیں جو سردار جعفری کو بہت عزیز ہیں۔ کارل مارکس، اقبال، لوئی آراگوں (فرانس کا عظیم شاعر اور ناول نگار جس نے گزشتہ جنگ (دوسری عالمی جنگ) میں جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانسیسی ادیبوں کو منظم کیا) پابلو نرودا (چلی، جنوبی امریکہ کا عظیم اور نہایت حسین شعروں کا شاعر جو ہسپانوی زبان کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے وہ برسوں جلاوطن رہا اور موت اس کا پیچھا کرتی رہی۔ پابلو نرودا نے 1950ء میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ انھیں 1951ء میں لینن اور 1971ء میں نوبل انعام سے نوازا جا چکا ہے۔ اس شاعر کا انتقال 1973ء میں ہوا۔ جولیو کیوری (فرانس کا مشہور عالم، حبشی مسوسیقار جس کے نغموں نے دوستوں اور دشمنوں سب سے خراج تحسین وصول کیا، ایلیا اہرن برگ (سوویت یونین کا ادیب اور صحافی، بین الاقوامی امن تحریک کا رہنما)''۔ 111

سردار جعفری نے 1984ء میں رام لعل کو انٹرویو دیتے ہوئے بہت سے ادیبوں کا نام لیا ہے جن سے وہ متاثر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''وہ شعراء جن کی آواز سب سے پہلے میرے کانوں میں پڑی، وہ انیس تھے اور انیس سے زیادہ فصیح و بلیغ شاعر تو اُردو نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اور پھر غالب، اقبال اور پھر فارسی کے شعراء کیوں کہ بچپن میں میری تعلیم فارسی کی بھی ہوئی ہے تو میں نے حافظ کو بھی پڑھا، سعدی کو بھی، فردوسی، خسرو اور نظامی کو بھی پڑھا تو فارسی شعرا کے اثرات اور پھر انگریزی تعلیم کے اثرات تو میں شیلی، کیٹس اور بائرن تک محدود نہیں رہا بلکہ اس سے میں باہر نکلا، چنانچہ میں نے ملٹن کو پڑھا اور شکسپیئر کو تو سبھی پڑھتے تھے۔ پھر جرمن مطالعے میں گوئٹے میرے لیے بڑا بھاری Inspiration بن گیا۔ Virgil پہلے پڑھا میں نے اور فاؤسٹ بعد میں اور آسکر وائلڈ کے بڑے اثرات تھے مجھ پر۔'' 112

سیاسی افکار، سیاسی سرگرمیاں اور جدوجہد آزادی میں سرگرم رول:

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ادب اور سیاست کے گہرے تعلق کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادب اور سیاست میں چوں کہ چولی دامن کا رشتہ ہے۔ اس لیے ان دونوں کی رفاقت زندگی اور ادب دونوں کے لیے نیک فال ہے۔ چنانچہ ادب کو سیاسی جدوجہد میں عملی صورت اختیار کرنی چاہیے۔'' 113

لیڈرشپ کی صلاحیتیں:

زاہدہ زیدی کے مطابق ''سردار جعفری شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈرشپ کی صلاحیتیں بھی ان میں خداداد تھیں۔'' 114

ادب اور سیاست کے درمیان موجود رشتے کی اہمیت اور معاشرے میں سیاست کے عمل دخل کی نشاندہی کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ ''سیاست ہر جگہ ہے، ہر طرف ہے۔ فن اور ادب کی ہر تخلیق میں ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ کہیں سیاست ترقی پسند ہے اور کہیں رجعت پرست۔ جب فن پارے میں ترقی پسند سیاست ہوتی ہے تو فوراً انگلیاں اٹھتی ہیں یہ فن نہیں ہے سیاست ہے۔ اور اگر سیاست رجعت پرست ہے تو وہ اعلیٰ درجے کا فن ہے، تفریح ہے۔۔۔ ایک فلم میں تشدد کا استعمال مظالم کے خلاف ہے، استحصال کے خلاف ہے اور دوسری فلم میں تشدد صرف تشدد سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہے اور اس کا استعمال کبھی کسی کی دولت پر قبضہ کرنے یا کسی معصوم لڑکی کی عصمت لوٹنے کے لیے ہے۔ ان فلموں میں Thrill ہے۔ کتھارسس نہیں ہے۔ یہ تماشائیوں کو سنگ دل، وحشی اور بزدل بناتی ہیں۔۔۔

2۔ ادب اور تحریک کا اپنے ملک قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری عمل ہے لیکن ادب اور تحریک کو کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر کوئی سیاسی جماعت اپنے ممبروں پر مشتمل کوئی تنظیم بنائے تو یہ الگ بات ہے۔ اس صورت میں وہ تنظیم اس سیاسی جماعت کے نام سے منسوب ہوگی۔ جب پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ کہا تھا کہ

ادب سیاست کے پیچھے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ وہ مشعل ہے جو سیاست کو راہ دکھاتی ہے تو وہ ادیب کی انفرادیت اور معاشرے کی اجتماعیت کے رشتے کو ظاہر کر رہے تھے"۔۔۔۔

3۔ شاعر جس سیاسی جماعت سے چاہے اپنا فکری اور ذہنی رشتہ قائم کر سکتا ہے اور بغیر اس کے بھی سماج کی جنبش اور حرکت پر ایک خلاقانہ نظر رکھ سکتا ہے۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی جماعت کا ممبر بن کر اس کا نقیب ہو۔تخلیقی سطح کی بلندی پر وہ کسی بھی سیاسی جماعت کا ممبر ہونے کے باوجود اول درجے کا ادیب ہو سکتا ہے۔سوویت یونین کے دو سب سے بڑے شاعر اور ادیب کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔گورکی اور مایا کوفسکی ان کے برعکس لوئی آراگوں، پال ایلوار پکاسو، فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ پابلو نرودا چلی کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا اور صدارت کا الیکشن لڑنے کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔اقبال اور حسرت موہانی دونوں مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ٹیگور کی وابستگی کسی جماعت سے نہیں تھی لیکن ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں۔ پال روبسن کے پاس پارٹی کارڈ تھا۔۔۔۔۔۔دراصل یہ بات شاعر اور ادیب کی اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح تخلیق کرتا ہے اس کا رشتہ عوام کے ساتھ مضبوط ہونا چاہیے اور عوام صرف درمیانی طبقہ نہیں ہے بلکہ مزدور اور کسان طبقات بھی جو اکثریت میں ہیں۔"

115

ڈاکٹر عمر رضا رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ رہے اور انہوں نے ادب میں سیاست کی دخل اندازی کو جائز قرار دیا ہے ان کے تمام تر ادبی بیانات یا پھر تخلیقات کسی نہ کسی شکل میں سیاست سے متاثر نظر آتے ہیں۔"

116

سردار جعفری نے دنیا سے جنگوں کے خاتمہ کے لیے جن باتوں کی اہمیت بتائی ہیں وہ یوں ہے:

"معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خودغرضی، غلط احساس برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

117

سردار جعفری کے سیاسی افکار پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھا ہے:

1۔"جنگ (دوسری عالمی جنگ) کے فوراً بعد سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں ایٹم بم آ گیا۔اس کے مقابلے میں روس نے بھی ایٹمی ہتھیار بندی شروع کر دی۔اس میں روس امریکہ کے ساتھ دوسری بڑی طاقت بن کر تو ضرور اُبھرا لیکن صرف فوجی طاقت اور اسلحہ کی طاقت کے اعتبار سے وہ اور زیادہ کمزور ہو گیا"۔۔۔

2۔"سوویت روس میں کمیونزم کی ناکامی کے لیے انہوں نے (سردار جعفری) مغربی طاقتوں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔سردار جعفری نے کمیونزم کو ناکام نہیں بتایا ہے۔ بلکہ ان کا ماننا ہے کہ نیشنلزم کی انتہاپسندی کے سبب روس میں کمیونزم کو نکال باہر کیا گیا"۔۔۔3۔"اشتراکی نظام سے سردار جعفری کی بہت سی خوش آئند اُمیدیں اب بھی وابستہ ہیں جس میں انھیں ایک بہتر سماج کی تعبیر نظر آتی ہے۔"

118

سردار جعفری نے بچپن ہی سے غریبوں، کسانوں، مزدوروں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہوئے دیکھے اُن کا دل پسیج

گیا۔انہوں نے ظلم وستم،استحصال کا قلع قمع کرنے کمر بستہ ہوگئے۔میر ہاشم لکھتے ہیں ''علی سردار جعفری نے نوعمری ہی سے غریب کسانوں اوران کی عورتوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھا اوران کے دکھ درد کو محسوس کیا۔بلرام پور (ضلع گونڈہ اودھ) پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا قصبہ ان کا پیدائشی وطن ہے۔مزدوروں اور کسانوں کی حالت غلاموں جیسی تھی۔انھیں ایک وقت کی روٹی مشکل سے میسر ہوتی وہ سب زمین داروں اور ٹھیکہ داروں کے قرض دار تھے اور یہ قرض نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ان کی جان مال اور آبرو پر زمین داروں کا پورا حق تھا۔انہوں نے وہ مناظر دیکھا جب کسی معمولی قصور کی پاداش میں ایک عورت کو سرِ عام بے لباس کردیا گیا تھا۔ان کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسا کیوں ہوا؟اس کے ذمہ دار کون ہے؟ان حالات کو بدلنے کا کیا راستہ ہے؟اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ 1932ء میں اپنی عمر کے بیسویں سال علی گڑھ پہنچے وہاں اختر حسین رائے پوری،سبط حسن،حیات اللہ انصاری،سعادت حسن منٹو،مجاز لکھنوی،جاں نثار اختر،آل احمد سرور،سب طالب علم تھے۔عصمت چغتائی اور جذبی بھی تھے۔ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر علیم اساتذہ تھے۔سردار جعفری نے اپنے مطالعہ کو وسعت دی۔گوئٹے کا ''ورتھر'' اور اس کا شاہ کار ''فاوسٹ'' پڑھا تو ان کی ادبی نگاہ بلند ہوئی۔لینن کی سوانح نے ان کے ذہن کے دروازے کھول دیے۔انھیں لگا کہ کچلے جانے والے عام لوگوں،غریب مزدوروں اور کسانوں کا حل مل گیا۔

ہندوستان بھر میں آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔علی گڑھ بھی اس کا ایک حصہ تھا۔سردار جعفری اس جدوجہد میں عملاً شریک ہوگئے۔پاداش میں علی گڑھ سے نکالے گئے۔انقلابی اور رباغیانہ نظمیں لکھنے،تقریریں کرنے اور ہڑتال میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل جاتے رہے۔''

119

سردار جعفری نے فن کی آبیاری کے ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا جس کا ذکر مختلف ادیبوں نے کیا ہے سبط حسن نے لکھا ''سردار جعفری نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ان کی مشق سخن بھی جاری رہی اور سیاسی سرگرمیاں بھی۔

120

حمید اختر نے لکھا ہے:

''اُس دور کے جن دو تین اہم شاعروں نے اپنے فن کی آبیاری کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اُن میں علی سردار جعفری،کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین کے نام نمایاں ہیں۔''

121

ساجد رشید کے مطابق:

''1936ء میں انہیں (سردار جعفری) انگریز سامراج کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں یونیورسٹی سے نکلنا پڑا تھا۔یہاں سے وہ لکھنو یونیورسٹی پہنچے جہاں سے انھیں جیل بھیج دیا گیا۔جرم وہی ۔۔۔انگریز سامراج مخالف سرگرمیاں!تب تک جعفری صاحب پورے ملک میں ایک انقلابی شاعر اور Activist کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرچکے تھے۔'' 122

سردار جعفری کا سیاست سے رشتہ عملی تھا۔ناانصافیوں کے خلاف ان کا احتجاج شدید تھا۔سرور الھدیٰ نے سردار جعفری کے سیاسی لگاؤ پر روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری نے ایک فکر ایک ارادے کے ساتھ اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا۔اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ

بہت فعال اور متحرک تھے ۔انہوں نے ہنگامہ خیز اور خطرات سے پُر زندگی گذاری ان کے ساتھ سفر کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے ۔مگر کیا وجہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت سردار کے حصے میں آئی وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی ۔میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ترقی پسند تحریک وجود میں نہ بھی آتی تو بھی سردار کی زندگی کچھ مختلف نہیں ہوتی ۔سردار کی حد سے بڑھی ہوئی فعالیت، شدتِ احساس اور آواز کی بلند آہنگی نے ان کو سب سے منفرد بنا دیا ہے ۔وہ کئی بار جیل بھی گئے' کالج اور یونیورسٹی سے نکالا بھی گیا۔سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ سردار کے ساتھ کیوں ہوا۔کیا وہ وقتی شہرت اور عزت کے خواہاں تھے۔کیا وہ سیاست میں اپنے لیے کوئی جگہ بنانا چاہتے تھے۔یہ وہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے سیاست دانوں کو ادب سکھا نہیں دیا جاتا ۔علی سردار جعفری کا سیاست سے گہرا لگاؤ دراصل اسی رویے کو ظاہر کرتا ہے ۔وہ سیاست دانوں کو ادب سکھا سکے یا نہیں یہ ایک دوسری بات ہے مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ سردار نے سیاست کی گھناؤنی اور مکروہ پیشہ کو طنز کا نشانہ بنایا اور اپنی شاعری کے ذریعہ حکومت او رسیاست کا ایک ایسا خوش نما پیکر پیش کیا جو سب کو بھلا معلوم ہو۔بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کے یہاں سیاسی شعور موجود ہے مگر ان کا رشتہ سیاست سے صرف ذہنی ہے عملی نہیں ۔اس لیے وہ جب اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں تو اس میں ایک ٹھہری ہوئی فضا ہوتی ہے مگر وہ لوگ جن کا رشتہ سیاست سے عملی ہے وہ اپنے اظہار بیان میں شدید ہوتے ہیں ۔سردار جعفری سیاست کی چال بازیوں اور مکاریوں کے تماشائی نہیں تھے بلکہ وہ اس کے شکار بھی ہوئے ۔سیاست کی غلط پالیسیوں اور حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اُٹھانے کی انہیں قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ سیاست اور حکومت کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تو اس میں احتجاج کی لئے تیز ہو جاتی ہے ۔سردار جعفری نے جیسی زندگی گزاری تھی شاید اس کا تقاضہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ہم میدان سے باہر کے لوگ ان کے جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس نہیں کر سکتے جو میدانِ عمل میں دشمنوں سے سینہ سپر ہے۔'' 123

سردار جعفری کی سیاسی لیڈر شپ اور سیاست داں ہونے کا اعتراف بہت سے ادیبوں نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری اپنے زمانے اور حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔۔۔ان کی حیثیت سیاسی لیڈر کی بھی ہے۔'' 124

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی رقمطراز ہیں:

''علی سردار جعفری کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ۔ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور ایسے اوصاف بہت کم ایک جگہ نظر آتے ہیں ۔وہ ایک مقرر' ایک سیاست داں' ایک بے باک صحافی' ایک دانشور و مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ صفحۂ اول کے قلم کار بھی تھے۔'' 125

سردار جعفری کو کم عمری ہی سے مزدوروں کے حقوق کا خیال تھا اور انہوں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔

ستارہ جعفری نے دو واقعات لکھے جن سے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے:

ا۔''بلرام پور میں ایک شکر مل ہے ۔اس میں ہمارے گاؤں سے بھی گنا جاتا تھا۔ایک مرتبہ گاڑی پر سے گنا اُتارنے

والے مزدوروں نے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے کہا۔چھوٹے چاچا اس پر تیار نہیں ہوئے۔مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کو توڑنے کے لیے پولیس بلائی گئی۔یہ بات سردار جعفری کو معلوم ہوئی شام کو گھر میں کسی کو بتائے بغیر شکرمل چلے گئے۔ وہاں تقریر کی اور مزدوروں سے کہا۔جب تک تمہارا حق نہ ملے ہرگز کٹائی مت اُتارنا اور نا پولس سے ڈرنا۔وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔آخر کار مزدوروں کی فتح ہوئی اور چھوٹے چچا کو اجرت بڑھانی پڑی۔۔۔۔"

2۔"برسات شروع ہونے پر کھیتوں میں چاول کی بوائی کا کام شروع ہوتا ہے اس وقت کوئی گھر کا آدمی جاتا تھا حالاں کہ منشی امام علی وہاں دیکھ بھال کرنے کے لیے دن رات رہتے تھے۔(منشی امام علی آج تک گاؤں کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں)ایک سال ابا جان نے سردار بھائی سے کہا"تم وہاں جا کر سب کام اپنے سامنے کرادو" یہ چلے گئے لیکن وہاں جا کر سب کھیت مزدوروں کی تنخواہ بڑھا دی اور پرانے قرضے معاف کر کے گھر واپس آ گئے۔منشی جی نے ابا جان کو خط لکھا چھوٹے بھیا تو گاؤں کا خرچ بہت بڑھا گئے اور سب باتیں تفصیل سے لکھیں۔" 126

سردار جعفری کی طالب علمی کے زمانہ کی سیاسی سرگرمیوں،جیل کی سزا اور بھری عدالت میں انگریزوں کی عدالت اور اس کے قانون کو تسلیم نہ کرنے کا برملا اظہار کے بارے میں سبط حسن نے لکھا ہے:

"سردار جعفری نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ان کی مشق سخن بھی جاری رہتی اور سیاسی سرگرمیاں بھی۔وہ لکھنو یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہے تھے۔طلبہ کی تحریک سے ان کی آشنائی بہت پرانی تھی۔۔۔اسی اثنا میں سامراجی جنگ کے خلاف شورش نے شدت اختیار کی۔جلسوں جلوسوں کا موسم آیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔طلبہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔سردار جعفری کب نچلے بیٹھنے والے تھے چنانچہ ایک تقریر کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے۔اُس وقت تک امتناعی نظر بندیوں کی ریت نہیں پڑی تھی بلکہ سیاسی قیدیوں پر بھی عدالت میں مقدمہ چلتا تھا اور معینہ مدت کے لیے سزا دی جاتی تھی۔سردار کے خلاف فرد جرم اتنی پھس پھسی تھی کہ وہ مقدمہ لڑتے تو یقیناً بَری ہو جاتے مگر انہوں نے ملک کی دیرینہ سیاسی روایت کا احترام کرتے ہوئے بھری عدالت میں کہہ دیا کہ ہم نہ اس عدالت کو تسلیم کرتے ہیں نہ اس کے قانون کو لہذا صفائی پیش کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ان کو چھ ماہ کی قید سخت کی سزا ہو گئی۔وہ کچھ دن لکھنو جیل میں رہے پھر بنارس بھیج دیئے گئے"۔ 127

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اور صہبا لکھنوی نے علی سردار جعفری کی قید و بند کی تفصیلات بیان کی ہیں:

"پہلی بار سردار جعفری 4 دسمبر 1940ء کو لکھنو میں گرفتار ہوئے اور لکھنو ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سنٹرل جیل میں قید رہے (تقریباً آٹھ ماہ) دوسری بار 20 جنوری 1949ء کو ممبئی میں گرفتار کیے گئے۔بھیمڑی کانفرنس ممبئی کے وزیر اعلیٰ مرار جی دیسائی نے پابندی عائد کر دی تھی اور کانفرنس کی مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے سردار جعفری کو گرفتار کر کے آرتھر جیل میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بھیمڑی کانفرنس منعقد ہوئی اور چار روز جاری رہی۔تقریباً دو سو مندوبین کے قیام و طعام کے سارے انتظامات عصمت چغتائی، شاہد لطیف اور کیفی اعظمی وغیرہ نے کیے اس کی تفصیلی روداد ماہنامہ افکار بھوپال نے بھیمڑی کانفرنس نمبر میں شائع کی ہے۔۔۔تیسری گرفتاری 19 اپریل 1949ء کو عمل میں آئی اور سردار جعفری آرتھر ڈ جیل ممبئی اور سنٹرل جیل ناسک

میں مقید رہے (تقریباً پندرہ ماہ بلا جواز) رہائی جولائی 1950ء میں ملی۔عید کے دن۔'' 128

قومی رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج:

عمر رضا نے 1940ء کی سردار جعفری کی سیاسی سرگرمیوں اور گرفتاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

1۔1940ء میں کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ستیہ گرہ تحریک چلائی۔سردار جعفری ایم اے سال آخر کے طالب علم تھے۔اسی دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے عدالت میں ایسا بیان دیا جس نے پورے ملک میں آگ سی لگادی تھی اور روز آنہ کوئی نہ کوئی قومی رہنما گرفتار ہو رہا تھا جس پر لکھنو یونیورسٹی کے طلباء احتجاج کر رہے تھے۔اس احتجاج میں سردار جعفری ہمیشہ پیش پیش رہتے کیوں کہ وہ اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری تھے۔سردار جعفری کی اس طرح کی سرگرمیوں پر حکومت نے نگرانی شروع کر دی تھی۔

2۔انگریز چیف جسٹس اور چانسلر کے سامنے شرط:

''دہلی یونیورسٹی نے دو طالب علموں کو سامراج دشمن سرگرمیوں کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکال دیا۔۔۔اسی دوران دہلی یونیورسٹی کے چانسلر سر ماریس گوائر جو اس وقت ہندوستان کے چیف جسٹس بھی تھے' لا سوسائٹی کا افتتاح کرنے اور لکھنو یونیورسٹی کے کانووکیشن میں خطبہ پڑھنے نومبر 1940ء میں آنا تھا۔۔۔طلباء اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور چانسلر کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ جب تک دہلی یونیورسٹی کے طالب علموں کی ڈگریاں واپس نہیں کی جاتیں، اس وقت تک سر ماریس گوائر کو خطبہ پڑھنے نہیں دیا جائے گا۔بالآخر سر ماریس گوائر کو خطبہ پڑھے بغیر ہی واپس جانا پڑا۔۔۔صوبے کے انگریز گورنر نے لکھنو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو یہ ہدایت دی کہ سردار جعفری اور دوسرے باغی طالب علموں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔۔۔اس وقت تھوڑی سی باز پُرس کے بعد انھیں چھوڑ دیا گیا لیکن یکم دسمبر 1940ء کو سردار جعفری اس وقت باقاعدہ گرفتار کر لیے گئے جب وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک ضروری میٹنگ سے واپس آرہے تھے۔۔۔2 دسمبر 1940ء کو سردار جعفری لکھنو ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیئے گئے''۔

3۔مخالف جنگ نعروں کا الزام

20 دسمبر 1940ء کو ان کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔الزام یہ تھا کہ انہوں نے 21 نومبر کو طالب علموں کے جلوس میں مخالف جنگ (دوسری جنگ عظیم) نعرے لگائے تھے۔علی سردار جعفری نے عدالت سے کہہ دیا کہ وہ موجودہ حکومت اور اس کے کل پُرزوں کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اور انھیں مقدمے کی کاروائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔عدالت نے انھیں چھ مہینے قید کی سزا دے دی 29 دسمبر کو انھیں بنارس جیل بھیج دیا گیا۔۔۔تقریباً چھ مہینے زنداں کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد جون 1941 کے پہلے ہفتے میں وہ رہا ہوئے۔۔۔سردار جعفری بلرام پور آگئے لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کے آرڈر کے بموجب سردار جعفری ایک سال تک بلرام پور سے باہر نہیں جا سکتے۔۔۔سردار جعفری کی نظر بندی دسمبر 1941ء کے پہلے ہفتے میں ختم ہو گئی۔'' 129

4۔آزادی کی تحریک میں حصہ:

سردار جعفری نے اپنے آپ کو ادیبوں کے اس گروہ میں شامل کیا ہے جن کی وابستگی سیاسی پارٹی سے بھی تھی اور جو ادب تخلیق کرنے کے علاوہ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔حسن عابدی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''ہمارے درمیان دو طرح کے ادیب تھے۔ادیبوں کا ایک گروہ تو وہ تھا جو ادب کی تخلیق میں ہمہ تن اور پوری یکسوئی سے مصروف تھا اور دوسرے گروہ میں، جن کے درمیان میں خود کو بھی شامل کرتا ہوں وہ ادیب تھے جن کی وابستگی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھی اور جو کہانیاں لکھنے اور ادب تخلیق کرنے کے علاوہ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔'' 130

جنوری 1949ء اور اپریل 1949ء میں سردار جعفری کی گرفتاری کے سلسلہ میں عمر رضا نے وضاحت کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ پارٹی کی انتہا پسندی شباب پر تھی۔پورے ملک میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔چند ہی مہینوں بعد جنوری 1949ء میں سردار جعفری بھی گرفتار کر لیے گئے لیکن پندرہ دن بعد رہا کر دیے گئے تھے۔ ابھی کچھ ہی ماہ گزرے ہوں گے کہ حکومت ہند نے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔اپریل 1949ء کا زمانہ تھا۔ سلطانہ جعفری کے بڑے بیٹے علی ناظم جعفری کی پیدائش کا وقت قریب تھا کہ 10 اپریل کی صبح جب سردار جعفری ابھی سو کر بھی نہیں اُٹھے تھے، پولیس والے آئے اور ان کو گرفتار کر کے لے گئے۔سردار کی یہ گرفتاری بمبئی میں بھیمڑی کانفرنس منعقد کرانے کے جرم میں ہوئی تھی۔اس وقت بمبئی کے وزیر اعلیٰ مرارجی دیسائی تھے۔انہوں نے ہی اس کانفرنس پر پابندی عائد کی تھی اور کانفرنس (27 تا 29 مئی 1949ء) سے قبل ہی سردار جعفری کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔۔۔یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سردار جعفری کی اس گرفتاری کی تاریخ کا تعین متعدد لوگوں نے کیا ہے لیکن یہ سبھی تاریخیں مشکوک ہیں کیوں کہ جب سردار جعفری گرفتار کر کے جیل بھیجے گئے تو وہاں سے انہوں نے اپنی شریک حیات سلطانہ کے نام دو دن کے بعد ایک خط روانہ کیا تھا۔خط پر 12 اپریل 1949ء کی تاریخ درج ہے اور لکھا ہے ''میں پرسوں یہاں آیا ہوں اور دو ہی دن میں جیل مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگی۔'' (سردار جعفری بنام سلطانہ جعفری مشمولہ گفتگو۔ترقی پسند ادب نمبر دسمبر 1978ء تا مارچ 1989ء صفحہ 145)

اس خط کے مطابق سردار جعفری کی گرفتاری 10 اپریل 1949ء کو عمل میں آئی۔۔۔۔چنانچہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی اور صہبا لکھنوی کا یہ مشترکہ بیان کہ ''تیسری گرفتاری 19 اپریل 1949ء کو عمل میں آئی'' مستند نہیں ہے'' ۔۔۔تقریباً ڈیڑھ سال بعد جولائی 1950ء میں وہ رہا ہوئے۔'' 131

سردار جعفری کے ہاں پہلا لڑکا 6 مئی 1949ء کو پیدا ہوا۔اس وقت وہ جیل میں تھے۔

انہوں نے جیل میں اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھا۔

سرحد کی خلیج کم کرنے کی مساعی:

انور الحسن وسطوی کے مطابق:

''سردار جعفری نے اپنے قلم سے سرحد کی خلیج کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ ہندو پاک تنازعہ سے انھیں بڑی تکلیف تھی۔ وہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔'' 132

انیس چشتی نے لکھا ہے۔''جب تک سردار جعفری زندہ رہے ان سے نہ تو اُردو والوں نے ہی کوئی مثبت کام لیا اور نہ ہی ہندو پاک کی حکومتوں اور خیر سگالی کی کوشش کرنے والوں نے جب کہ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

133

نکہت کاظمی رقمطراز ہیں:

''صرف شاعری کا تحفظ ہی اس ایکٹووسٹ شاعر (علی سردار جعفری) کے لیے فکر کا باعث نہیں بلکہ اس کے نزدیک اتنا ہی اہم امن و آشتی کا قیام بھی ہے خصوصاً ایسے دور میں جب ظلمتوں کے گہرے بادل عالمی افق پر کسی بھی لمحے اپنے بدنما وجود کا سایہ گہرا کر سکتے ہیں۔ جعفری صاحب آج کل امن کے ایسے مشن کی تفصیلات طے کرنے میں مشغول ہیں جس میں ہندوستان اور پاکستان کے پانچ پانچ شاعروں پر مشتمل وفد دونوں ملکوں کا دورۂ امن و آشتی کرے گا۔'' 134

علی احمد فاطمی نے سردار کی کمیونسٹ پارٹی میں سرگرم شرکت کے بارے میں لکھا ہے۔۔

''دوسری جنگ عظیم نے دنیا کے تمام مزدور، مظلوم طبقوں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اگر چہ اس وقت ہندوستان کی سیاست پر کانگریس اور مسلم لیگ ہی پارٹیاں تھیں لیکن دیکھتے دیکھتے کمیونسٹ پارٹی ایک تیسری جماعت بن کر عوام میں مقبول ہو رہی تھی۔ اس پارٹی کے مقبول ہونے کا ایک سبب بہر حال یہ بھی ہے کہ اس میں ترقی پسند تحریک کے اکثر بڑے شاعر اور دانشور شامل تھے۔ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، ساحر کے ساتھ ساتھ کیفی اعظمی بھی سرگرم شریک تھے۔'' 135

ترقی پسند تحریک کو کانگریس کا ہمنوا بنا دینا:

ساجد رشید نے لکھا ہے:

''سردار اگر چہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے لیکن وہ بھی دوسرے بہت سے کمیونسٹوں کی طرح پنڈت نہرو کے رومانی سوشلزم کے اسیر تھے۔ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سردار جعفری اور ان کے حلقہ احباب نے ترقی پسند تحریک کو ایک ادبی اور سماجی تحریک سے زیادہ کانگریس کا ہمنوا بنا دیا۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے لان پر نہرو کے ساتھ نہروئین سوشلزم (Nehruvian Socialism) کی چائے پیتے ہوئے کمیونسٹوں نے اپنے انقلاب کو شکر کی طرح گھول کر پی لیا تھا۔ جعفری صاحب کے اندر کے انقلابی نے پتہ نہیں کیسے ہندوستان کی سب سے بڑی ادبی تحریک کی شعلگی اور اپنے باغیانہ تیوروں کو نہرو کی شیروانی میں

لگے گلاب کے تر و تازہ پھول کے ساتھ ٹانک دیا تھا۔'' 136

1975ء کی ایمرجنسی کے نفاذ کی حمایت:

ساجد رشید رقمطراز ہیں:

''پنڈت نہرو کی شخصیت کے سحر نے سیاست میں ڈانگے جیسے انقلابی لیڈر کو جس زوال سے دوچار کیا' کم و بیش وہی حشر ادب میں انقلابی تیور رکھنے والے جعفری صاحب کا ہوا۔ دو مختلف لیکن اہم میدانوں میں سرگرم شخصیتوں نے اپنا ہی نہیں اپنی تحریکات کا نقصان نہرو میں اپنے یقین محکم کی وجہ سے کیا جو ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ استحصال اور ظلم و جبر کے شکار طبقات کے حق میں اور اسٹبلشمنٹ کے خلاف سب سے بلند آواز رکھنے والی یہ دونوں عظیم شخصیتیں نہرو ہی نہیں ان کی عقیدت میں ان کے خاندان کی بھی ارادت مند ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1975ء کی ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد اندرا گاندھی کی آمریت کی حمایت کرنے میں انھیں ذرا بھی عار نہیں ہوا تھا۔ ایک جانب وہ سردار جعفری تھے جو 1935ء سے 1960ء تک اسٹبلشمنٹ اور استحصال پسند طبقے کی مخالفت میں اپنی قوت تحریر اور تقریر دونوں کا بے پناہ استعمال کرتے رہے تھے۔ لیکن آرتھر ڈجیل سے رہائی کے بعد جعفری صاحب میں ان کے احباب نے بڑی غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ اسٹبلشمنٹ کی بہت بڑی مشین کے ایک پرزے میں ڈھلتے چلے گئے۔ جعفری صاحب ارباب اقتدار کی نظروں میں جیسے جیسے چڑھ رہے تھے ترقی پسند تحریک کا گراف اسی رفتار سے گرنے لگا تھا۔'' 137

شاہ بانو مقدمہ اور تسلیمہ نسرین کا معاملہ اور سردار جعفری:

ساجد رشید لکھتے ہیں:

''جعفری صاحب نے مذہبی انتہا پسندوں سے کبھی مفاہمت نہیں کی' خاص طور پر مسلم انتہا پسندوں کے سامنے انہوں نے کبھی سپر نہیں ڈالی۔ اُس وقت بھی نہیں جب شاہ بانو کی حمایت کرنے پر حیدر آباد میں منعقد ایک آل انڈیا مشاعرہ میں کچھ پُر جوش مسلم نوجوانوں نے ان کے گلے میں جوتے کا ہار پہنا کر قوم مسلم پر مذہبی غیر رواداری کے الزام کی تصدیق کر دی تھی۔ انتہا پسند مسلمانوں کے اس سلوک کے بعد بھی وہ اپنے موقف پر قائم رہے اور جب اصغر علی انجینئر اور تسلیمہ نسرین کا معاملہ سامنے آیا تو دونوں ہی موقعوں پر جعفری صاحب اُردو کے پہلے ادیب تھے جنھوں نے مذہبی انتہا پسندوں کی سخت لفظوں میں مذمت کی تھی۔ اس طرح انہوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان نوجوان ادیبوں کے مقابلے میں جن کو ضعیف فکر ہو گیا ہے وہ ضعیف جسم رکھتے ہوئے بھی جوان حوصلہ رکھتے ہیں۔

جعفری صاحب دراصل ایک رومانی انقلابی تھے۔ ان کی رومانیت انھیں ابتداء میں مارکس کے فلسفے تک لے گئی پھر وہ نہرو کے سوشلزم میں اس انقلاب کی تلاش کرتے رہے، اس کے بعد اندرا گاندھی کے پُر کشش نعروں میں انہیں انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ وہ اسی رومانی انقلاب کے تعاقب میں چلتے رہے جو ریگزار میں سراب ہی دکھاتا ہے' اس کے باوجود اُردو ادب میں اُن جیسا بلند قامت ادیب اب کوئی دوسرا نہیں رہا۔'' 138

پس ماندہ، دبے کچلے لوگوں کا جگانا:

انوارالحسن وسطوی رقمطراز ہیں:

''اِنہوں نے (سردار جعفری) ہمیشہ پس ماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو اپنی تخلیقات سے جگانے کا کام کیا۔انسانی زندگی کی بہتری کے لیے انہوں نے اپنے قلم کو ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔'' 139

شاعر اور ادیب بہت حساس ہوتا ہے۔اس کے اطراف جو کچھ ہوتا ہے وہ اس سے متاثر ہوتا ہے اور اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتا ہے۔سردار جعفری نے اپنی زندگی میں جن قومی اور بین الاقوامی سیاسی حالات دیکھے، ان کا ذکر رفیعہ شبنم عابدی نے کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ان کا (سردار جعفری) پہلا شعری مجموعی 1943ء میں شائع ہوا تھا۔یعنی پورے پچپن برس پہلے۔وقت کی رفتار دیکھئے تو یہ پچپن برس سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کے بعد بے حد اہم سال ہیں۔ان میں انقلاب کی دھمک بھی ہے، جنگ آزادی کے فلک شگاف نعرے بھی، سرفروشوں کا لہو بھی، سنگینوں کا شور بھی، فرنگیوں کا زور بھی، صبح آزادی کی روشنی بھی، مابعد آزادی کی مایوسیاں اور ناکامیاں بھی اور جمہوریت کی اُبھرتی ہوئی تصویر بھی، آزاد ہندوستان کی بدلتی ہوئی تقدیر بھی، پنچسالہ پلان اور صنعتی ترقی بھی، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا سفاکانہ قتل بھی، چین، پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگیں بھی، کشمیر کا مسئلہ بھی اور ناشقتد معاہدہ بھی ''دل بدلو'' سیاستیں بھی اور ''حوالے گھوٹالے'' بھی، 1992ء کے منحوس واقعات اور خونریز فسادات بھی، بم بلاسٹ بھی اور حالیہ ایٹمی دھماکا بھی۔یہی نہیں ایک عالمی منظر نامہ بھی اُن کے سامنے رہا ہے جس میں ویت نام، فلسطین، اسرائیل، عراق، ایران، کویت، افغانستان اور جنوبی افریقہ کی تحریکیں بھی، جنگیں اور جھڑپیں بھی شامل ہیں۔روس کا پارہ پارہ نظام بھی وہ نظام جس کے نقیبوں میں سردار جعفری خود بھی رہے ہیں اور امریکہ کی اعلیٰ طاقت بھی غرض یہ کہ ان کی آنکھوں نے بہت سے انقلاب دیکھے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سرتاپا انقلاب بن گئی ہے''۔ 140

افغانستان اور جنوبی افریقہ کی تحریکیں بھی، جنگیں اور جھڑپیں بھی شامل ہیں۔روس کا پارہ پارہ نظام بھی، وہ نظام جس کے نقیبوں میں سردار جعفری نے خود بھی رہے ہیں اور امریکہ کی اعلیٰ طاقت بھی، غرض یہ کہ ان کی آنکھوں نے بہت سے انقلاب دیکھے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سرتاپا انقلاب بن گئی ہے''۔ 141

طالب علمی کے زمانے ہی سے سردار جعفری نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ضیاءالدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''سردار کی اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی وہ طلبا کے لیڈر بھی رہے، اس وقت ملک میں قومی اور سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں، ہر طرف سرفروشان وطن نے انگریزوں کے خلاف پرچم بغاوت بلند کر رکھا تھا اور پورا ملک انقلاب کے نعروں اور آزادی کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔سردار بھی اقبال سہیل کا یہ رجز پڑھتے ہوئے آزادی کے دیوانوں کے لشکر میں جا ملے۔

قید غلامی و حیات ننگ ہے، ننگ کائنات — لعنت بندگی کے ساتھ صبوتِ زندگی نہ دیکھ
پھاڑ کے جیب و آستین کر علم جنوں بلند — عشق کے میر کارواں پرچم خسروی نہ دیکھ

عمر رضا نے لکھا ہے:

''جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو یہاں اپنی انقلابی تقاریر کے ذریعے زبردست ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس کی پاداش میں انھیں کالج سے نکالا بھی گیا۔اسی طرح اینگلو عربک کالج (دہلی) سے بی اے کرنے کے بعد جب وہ لکھنو یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو وہاں بھی اپنی انقلابی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے فضا کو متاثر کیا۔جس کے لیے انھیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی تھیں۔ 142

سردار جعفری کالج سے نکال دیئے گئے۔لکھنو میں تعلیم کے دوران تحریک آزادی میں حصہ لیا۔انھیں ایم اے فائنل امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا' گرفتار ہوئے اور جیل بھیج دئے گئے۔ترقی پسند تحریک میں سرگرم حصہ لیا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رسالہ نیا ادب اور اخبار پرچم نکالے۔

ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی ہفتہ بھر کی رپورٹ ہم سب کو سناتے تھے کہ کس طرح ہم لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔اب جلدی ہندوستان کے گلے سے غلامی کا طوق اُتر جائے گا۔۔۔اُن کو بہترین کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ایک مرتبہ لکھنو سے آئے تو اپنے ساتھ ہاتھ کا بنا ہوا کھدر لائے جو بے حد موٹا اور کھردرا تھا۔مجھ سے کہا تم اس کے پاجامے سی دو۔کرتے تو ہم نے لکھنو سے سلوا لیے ہیں۔'' 143

ان دنوں ایک کتاب آزادی کی نظمیں شائع ہوئی۔یہ کتاب برٹش حکومت نے ضبط کر لی اور جتنی کاپیاں ملیں وہ جلا دی گئیں۔اس کتاب میں انگریزوں کے لیے سب سے قابل اعتراض نظم جوش کی ''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام'' اور سردار جعفری کی نظم 'فوجی بھرتی'' تھی۔فوجی بھرتی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سڑک کے اس کنارے ایک سیہ لکڑی کے تختے پر
جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے
پکارا جارہا ہے ہند کے بھوکے کسانوں کو
بجا سا آج اخلاق شہنشاہی کا تیور ہے
حکومت ہو تمہاری اور ہم توپوں کا ایندھن ہوں
یہ دیوانے کا اک خواب جنوں اب بندہ پرور ہے
ہمارے خون سے شہزادیوں کا روپ نکھرا ہے
ہماری ہڈیوں کے ہار سے ملکہ کا زیور ہے
ستارے کی طرح سے ٹوٹ کے گرنے ہی والا ہے
وہ ہیرا جس کی ضو سے تاج انگلستان منور ہے

دسمبر 1940ء میں سردار جعفری گرفتار کر لیے گئے۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی اور بنارس جیل بھیج دیئے گئے۔ جون 1941ء میں انھیں رہائی ملی۔ دوسرے دن دوپہر ٹرین کے ذریعہ سردار جعفری بلرام پور اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر سردار جعفری کے استقبال کا حال ستارہ جعفری نے یوں بیان کیا:

''تین چار سو آدمی جمع ہیں۔ اور ایک یکہ کیلے کے پتوں اور گیند کے پھولوں سے سجا ہوا کھڑا ہے۔ جیسے ہی ٹرین آئی مجمع نے زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیا۔ پورا اسٹیشن علی سردار زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ ہمارے گھر والوں کو جلوس والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ موٹر میں نہیں ہم یکہ میں بٹھا کر سردار جعفری کا جلوس نکالیں گے۔ اس وقت بدیسی چیزوں کا بائکاٹ کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا موٹر انگریزوں کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے گھر کے لوگ جلدی واپس آ گئے۔۔۔ ہمارا گھر ریلوے اسٹیشن سے کئی میل دور ہے۔ جون کی اس چلچلاتی گرم دوپہر میں جلوس والوں نے یکہ سے گھوڑا نکال دیا تھا اور خود گھسیٹ کر لائے تھے۔۔۔ سردار بھائی کی آمد اور ان کے گرم جوش استقبال کی خبر ساری ریاست میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ اس زمانے میں ریاست کا منیجر انگریز تھا وہ بہت گھبرایا۔۔۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا آرڈر بھی میرے پاس (چاچا) کے پاس آ گیا۔ سردار جعفری ایک سال تک بلرام پور سے باہر نہیں جا سکتے۔۔۔ ابا جان اور چاچا نے کوشش کر کے نظر بندی کی مدت چھ ماہ کرا دی تا کہ یہ ایم اے کا امتحان دے دیں۔ سردار بھائی پھر لکھنو چلے گئے۔ چند ماہ بعد ایک روز بلرام پور آئے اور اماں ابا جان سے کہا۔ ''میں بنّے بھائی کے ساتھ ممبئی جا رہا ہوں وہاں ہم لوگ کام کریں گے۔۔۔ ہم بہنوں اور بھابھی جان کو بتایا کہ ہم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے لگے ہیں اور اس سلسلہ میں ہمارا گروپ ممبئی جا رہا ہے۔''

30 جنوری 1948ء شادی کے چند ماہ بعد سردار جعفری اپنی اہلیہ کو لے کر بلرام پور آئے۔

بلرام پور سے واپسی کے بعد سردار جعفری کی گرفتاری کے بارے میں ستارہ جعفری نے لکھا:

''صرف تین دن رہ کر یہ دونوں واپس چلے گئے۔ بلرام پور سے واپسی کے چند ماہ بعد پھر سردار بھائی کی گرفتاری کی خبر آ گئی لیکن پندرہ روز بعد رہا کر دیا گیا۔ پھر کچھ ماہ گزرے ہوں گے کہ گورنمنٹ نے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور سردار بھائی کو گرفتار کر کے ناسک جیل بھیج دیا اور باقی انڈر گراونڈ ہو گئے۔'' 144

انور الحسن وسطوی نے تحریک آزادی میں سردار جعفری کی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری نے اُردو ادب کی جتنی خدمت کی ہے اس سے کم خدمت ملک و قوم کے لیے ان کی نہیں رہی ہے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جیل کی سلاخوں میں بھی بند رہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے وطن کی آزادی کے لیے خود بھی لڑتے رہے اور دوسروں کی بھی للکارتے رہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کو ملک کی آزادی کے لیے بطور اسلحہ استعمال کیا۔ تحریک آزادی کی لڑائی کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے انہوں نے ساری زندگی سامراجیت، ظلم و جبر اور طبقاتی تفریق کے خلاف انتھک جدوجہد کی اور اپنی شاعری کے ذریعے غریبوں اور محنت کشوں کی ترجمانی کرتے رہے۔'' 145

سردار جعفری مجاہد آزادی تھے۔ انہوں نے جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔

برج پریمی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے جدوجہد آزادی کے ہر گام پر اپنیا عطیہ پیش کیا ہے۔آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد وہ برابر اور مسلسل اپنے تخلیقی جوہر کی طاقت کے ساتھ وقت کے چیلنج کو للکارتے رہے ہیں اور نہ صرف قومیت بلکہ بین الاقوامیت کے نقوش اُبھارتے رہے ہیں۔'' 146

جیل کی زندگی کو جس طرح عظیم سیاست دانوں نے خوش آمدید کہا اور اس میں رہ کر بہترین ادب تخلیق کیا' اسی طرح سردار جعفری کا بھی رویہ رہا ہے۔

12 اپریل 1949ء کو جیل سے سلطانہ کے نام اپنے خط میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ہمیں اس لیے بھی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ مجھے آرام پہنچا رہی ہے تاکہ تھکے ہوئے دل و دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔دنیا کے کئے شاہکار جیلوں میں لکھے گئے ہیں۔میں اگر یہاں زیادہ دن رہا تو میں بھی بہت کچھ لکھوں گا جو بہت دنوں سے لکھنا چاہتا ہوں۔اپنی گرفتاری کے دوران انہوں نے چند نہایت اچھی نظمیں لکھیں مثلاً پتھر کے دیوار' نیند' اودھ کی خاک حسین' ان کے علاوہ تمہاری آنکھیں' شادی کا دن اور جیل کی رات بھی جیل میں ہی کہی گئی تھیں۔'' 147

انیس چشتی رقمطراز ہیں:

''قوتِ برداشت کو جلا بخشنے کے لیے جیل جانا ضروری ہوتا ہے۔اس کے بغیر آدمی اپنی انا کے مارے دوسروں کی تنقید کو برداشت نہیں کرسکتا۔سردار جعفری نے دو قسطوں میں تقریباً سوا دو سال جیل کی سزا کاٹی ہے۔شاید یہ بھی ایک وجہ رہی ہو کہ وہ ہم جیسے نوآموز' بے بضاعت اور انھیں کی کتابیں پڑھ کر یونیورسٹی کے امتحانات پاس کیے ہوئے خوشہ چینوں کی تنقید کو بھی برداشت کر لیتے تھے۔'' 148

ڈاکٹر عمر رضا نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری نصف صدی سے زائد اُردو ادب کے میدان میں سرگرم رہے اور انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سرمایہ داروں' زمینداروں اور انگریزوں کے ہاتھوں مزدوروں' کسانوں اور ہندوستانی عوام کے مظالم و استحصال کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجے میں انھیں نہ صرف یہ کہ غلام بلکہ آزاد ہندوستان میں بھی جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔'' 149

ادبی زندگی کا سفر:

سردار جعفری کا ذہن تخلیقی تھا۔انھیں شاعری سے بے پناہ لگاؤ تھا۔انہوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر 1928ء یا 1929ء سے ہی مرثیے کہنا شروع کیا تھا۔پہلے مرثیہ کا پہلا بند یہ ہے۔

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے اپنے جلو میں فوج ہدایت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے لب پر دعائے بخشش اُمت لیے ہوئے
پھیلی ہے بوفضا میں شہ مشرقین کی آتی ہے کربلا میں سواری حسینؑ کی

سردار جعفری نے اپنے چچاؤں کے نام سید حیدر کرار جعفری اور سید احمد مختار جعفری کے ناموں کو استعمال کرتے ہوئے کم عمری میں ایک رباعی کہی تھی۔

نورِ نظر احمد مختار ہوں میں
لختِ جگر حیدر کرار ہوں میں
میں فتح و ظفر قوت بازو سردار
یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں

بہت جلد سردار جعفری نے افسانے بھی لکھنا شروع کیا۔ان کے چار ابتدائی افسانے 1۔ آتشیں قمیص 2۔لالہ صحرائی 3۔ہجوم وتنہائی اور 4۔تین پاؤ گندھا ہوآتا ہیں۔محفلوں اور مجلسوں میں وہ قصیدے ومرثیہ پڑھا کرتے۔سردار جعفری نے اپنا پہلا ڈرامہ ''دیوانے'' سہیل' علی گڑھ سالنامہ جنوری 1936ء میں شائع ہوا۔ان کا افسانہ ''شمع تفاول'' علی گڑھ میگزین کے پہلے شمارہ جنوری 1936ء میں شائع ہوا۔دوسرا ڈرامہ ''گوتم کا مجسمہ'' علی گڑھ میگزین کے دوسرے شمارے اپریل 1936ئمیں شائع ہوا۔سردار جعفری نے علی گڑھ میں ترقی پسند مصنّفین کے پہلے جلسہ میں ایک مضمون ''جدید اُردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' پڑھا تھا جو علی گڑھ میگزین کے تیسرے شمارے جولائی 1936ء میں شائع ہوا مسلم یونیورسٹی چھوڑ کر وہ دہلی آئے اور اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا اور یہیں سے 1938ء میں بی اے پاس کیا۔اس کالج کے میگزین ''عربک کالج میگزین'' میں اُردو اور انگریزی میں انہوں نے مضامین لکھے۔

طالب علمی کے اس زمانے میں انہوں نے دو ڈرامے 1۔عذرا 2۔شیطان کے بچے' ایک افسانہ بچھی' ایک انشائیہ ''آؤ ہم اس دنیا سے نکل چلیں۔دو نظمیں 1۔تیرا اور میرا خدا 2۔ساقی لکھا۔

انہوں نے ایک انگریزی مضامین The importance of India in European Politics لکھا جو دسمبر 1937ء اور دوسرا انگریزی مضمون Life Sketch of Lenin لکھا جو مارچ 1938ء میں شائع ہوا۔دسمبر 1938 کے شمارے میں ان کی نظم ''ساقی'' شائع ہوئی۔

مجاز' سبط حسن اور سردار جعفری تینوں نے مل کر لکھنو سے ''ماہنامہ'' نیا ادب'' اور ہفت روزہ ''پرچم'' جاری کیا۔نیا ادب پہلا شمارہ اپریل 1939ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں سردار جعفری کا ایک تنقیدی مضمون ''ترقی پسند مصنّفین'' شامل ہے۔یہ رسالہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کا ترجمان تھا۔''منزل'' سردار جعفری کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو 1939ء میں شائع ہوئی۔29 ڈسمبر 1940ء کو سردار جعفری کو بنارس سنٹرل جیل بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے مشہور نظم ''پتھر کی دیوار'' لکھی۔انہوں نے ایک سیاسی مثنوی ''جمہور'' لکھی جو 1946 میں شائع ہوئی۔ان کی معرکتہ الآرا تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' مئی 1947ء میں شائع ہوئی۔1948ء میں سردار جعفری کی کتاب ''مخدوم محی الدین'' شائع ہوئی۔1950ء میں ان کا شعری مجموعہ ''امن کا ستارہ'' شائع ہوا۔اکتوبر 1950ء میں ایک طویل نظم ''ایشیاء جاگ اُٹھا'' شائع ہوئی۔قید کے دوران سردار جعفری نے کئی معرکتہ الآرا نظمیں لکھیں جو اگست 1953ء میں ''پتھر کی دیوار'' کے نام سے شائع ہوئیں۔اس کے بعد سردار جعفری کی

تصانیف ''ترقی پسند ادب'' 1951ء لکھنو کی پانچ راتیں 1964' ایک خواب اور 1965 پیرا ہن شرر 1966ء' پیغمبران سخن 1970ء' اقبال شناسی 1976' لہو پکارتا ہے 1978ء' ترقی پسند تحریک کی نصف صدی 1987ء' غالب کا سومنات خیال 1997' اور سرمایہ سخن 2001' منظر عام پر آئیں۔ان کے علاوہ انہوں نے کچھ کتابیں مرتب کیں' ترجمے اور تدوین کا کام کیا ،بہت سے مضامین لکھے اور وہ شائع ہوئے۔ 1967ء سے سردار جعفری نے اپنی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' بھی جاری کیا۔

انہوں نے ڈاکیومنٹری کا مسودہ ''ہندوستان ہمارا'' اور ''بولو اے سنت کبیر'' تیار کیا جنھیں خواجہ احمد عباس نے ڈائرکٹ کیا۔ایک ڈاکیومنٹری ''تحریک آزادی میں ادب کا حصہ'' کا مسودہ تیار کیا اور خود ہی ڈائرکٹ بھی کیا۔ایک ٹیلی ویژن سیریل ''کہکشاں'' کا مسودہ تیار کیا جسے جلال آغا نے ڈائرکٹ کیا۔''روشنی اور آواز'' کے پروگرام کے مسودے بھی انہوں نے ہی لکھے۔مہاتما گاندھی کے ڈانڈی مارچ کو پیش کرتی ڈاکیومنٹری فلم کا مسودہ بھی لکھا۔ان کی تقاریر اور مکاتیب بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

سردار جعفری کی شاعری کی ابتداء:

عمر رضا نے سردار جعفری کی شاعری کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے:

''بنیادی طور پر سردار جعفری کا ذہن تخلیقی تھا۔خاص طور پر شاعری سے بے پناہ دلچسپی تھی۔۔۔پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر بھی کہنے لگے تھے۔چوں کہ بلرام پور میں مرثیہ کا ماحول تھا' عزاداری کی مجلسوں اور محفلوں میں بڑے بڑے ذاکر اور عالم اپنی خطابت سے لوگوں کو متحیر کر دیتے تھے جن میں مولانا سبط حسن کی خطابت بے حد موثر ہوا کرتی تھی۔لہذا سردار جعفری ان کی خطابت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔علاوہ ازیں انیس کے مرثیوں کا بھی خوب شہرہ تھا۔ان حالات نے سردار جعفری کو مرثیہ گوئی کی طرف مائل کیا۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں کر دیا تھا۔۔۔'' 150

پُرگو:

میر ہاشم لکھتے ہیں:

''سردار جعفری اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ پُرگو تھے۔29' 30 سال کی عمر میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''پرواز'' 1943ء میں شائع ہوا۔ 151

سردار جعفری کے افسانے کی ابتداء:

سردار جعفری نے مرثیہ گوئی کے بعد بہت جلد افسانہ بھی لکھنے لگے تھے۔خاص طور پر اسکول سے آنے کے بعد اکثر و بیشتر افسانے لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔وہ اگرچہ افسانے لکھا کرتے لیکن انہوں نے شاعری ترک نہیں کیا۔وہ شاعری ہی سے اپنے قصبے میں مشہور تھے اور خاص طور پر مرثیوں کے لیے جانے جاتے تھے۔۔۔محفلوں اور مجلسوں میں اکثر وہ قصیدے و مرثیے

پڑھا کرتے تھے۔"

مختلف اداروں سے وابستگی:

1۔صدر انجمن ترقی پسند مصنّفین برائے اُردو' 1977ء تا ستمبر 1990ء

2۔صدر فلم رائٹرس اسوسی ایشن ممبئی 1992ء

3۔جنرل سکریٹری آل انڈیا صد سالہ جشن اقبال کمیٹی 1970ء

4۔رکن سینٹ' ممبئی یونیورسٹی۔

5۔نائب صدر' مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکاڈمی اور ڈائرکٹر مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈمی (ممبئی) 1994ء تک۔

6۔گجرال کمیٹی کے ضمن میں نئی تشکیل شدہ "سردار جعفری کمیٹی" کے صدر۔

7۔کل ہند اقبال صدی تقریبات کمیٹی کے جنرل سکریٹری۔

8۔رکن علامہ اقبال ادبی مرکز' بھوپال۔

مختلف اصناف ادب میں سردار جعفری کا پہلا کارنامہ:

غزل کا پہلا شعر: ؎

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

پہلی نظم کا ایک بند: (بقول ستارہ جعفری) ؎

نکال دوں تمہیں اس طرح دل کے گوشے سے
کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ لے کوئی
میری حسین ثریا یہ ہو نہیں سکتا

سترہ سال کی عمر میں 1930ء میں سردار جعفری نے پہلا مرثیہ لکھا جس کا پہلا بند یہ ہے۔ ؎

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے لب پر دعائے بخششِ امت لیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہؓ کے ماہ تاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

پہلی آزاد نظم:

آل انڈیا لکھنو کے مشاعرے میں 1941ء میں سردار جعفری نے پہلی آزاد نظم سنائی جس کا عنوان "نووارد شعراء کا مشاعرہ" تھا اس مشاعرہ کی صدارت جوشؔ نے کی تھی۔

پہلا افسانہ:

سردار جعفری نے پہلا افسانہ ''آتشیں قمیص'' لکھا جو غالباً شائع نہیں کیا گیا۔ پہلا مطبوعہ افسانہ ''تین پاؤ گندھا ہوا آٹا'' پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی کتاب ''علی سردار جعفری: ایک مطالعہ'' کے صفحہ 29 میں اس افسانہ کے تعلق سے لکھا ہے کہ یہ افسانہ کہاں شائع ہوا اس کا سراغ نہیں مل سکا البتہ ستارہ جعفری اس کے شائع ہونے کا ذکر ضرور کرتی ہیں۔

پہلی نثری تصنیف:

''منزل'' (افسانوں کا مجموعہ 1938ء میں)

پہلا ڈرامہ:

''دو دیوانے''

پہلا مشاعرہ:

سردار جعفری نے اوناوہ میں مشاعرہ پڑھا جس میں انھیں بطور نذرانہ پچیس روپے ملے۔

شعری تصانیف:

1۔ پرواز (اشاعت حیدرآباد) 1944ء

2۔ نئی دنیا کو سلام (طویل تمثیلی نظم) کتب پبلشرز بمبئی۔

3۔ خون کی لکیر نوہند پبلشرز لمیٹڈ بمبئی 1949ء

4۔ امن کا ستارہ کتب پبلشرز بمبئی 1950ء

5۔ ایشیا جاگ اُٹھا' مکتبہ شاہراہ' دہلی 1950ء

6۔ پتھر کی دیوار (مجموعہ) مکتبہ شاہراہ' دہلی 1953ء

7۔ ایک خواب اور (مجموعہ) حلقۂ ادب' بمبئی' مارچ 1956ء

8۔ پیراہن شرر (مجموعہ) حلقۂ ادب' بمبئی 1966ء

9۔ لہو پکارتا ہے۔ (مجموعہ) مکتبہ جامعہ دہلی

10۔ غزلیں' سنگھم پبلشرز' لاہور' 1978ء

11۔ نومبر میرا گہوارہ (نامکمل خودنوشت) اسی لیے باقاعدہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوسکی۔

12۔ کلیات علی سردار جعفری (دو جلدیں) مرتبہ علی احمد فاطمی' قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی' 2005ء۔

سردار جعفری کی کتابوں کے خوب صورت ٹائٹل:

مشہور مصور ایم۔ ایف حسین نے سردار جعفری کی کتابوں کے ان کی شاعری کے اعتبار سے خوب صورت ٹائٹل بنائے۔ 153

سردار جعفری کی حسب ذیل اُردو نظمیں ہندی میں بھی ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔

1۔فریب (15 اگست اور اس کے بعد)　　2۔''ایک خواب اور''

3۔میرا سفر　　4۔تم نہیں آئے تھے جب

5۔قتل آفتاب　　6۔پیراہن شرر　　154

سردار جعفری کی نظموں کے کیسٹ:

سردار جعفری کی نظموں کی کیسٹ کے بارے میں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے بتایا:

''سردار جعفری کے زبردست عقیدت مند اور دوست انل سہگل کی شریک حیات مشہور گلوکار سیما سہگل نے اُن کی (سردار جعفری) کی نظموں کا ایک البم ''سرحد'' کے نام سے تیار کیا تھا جس میں اُن کی پانچ مشہور نظمیں ''گفتگو بند نہ ہو'' تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ''، ''تم نہ آئے تھے تو جب''، ''صبح فردا''، ''میرا سفر'' کو دلکش دھنوں سے سنوارا گیا تھا۔اس میں اقبال کی مشہور غزل بگولیش رہ سپاری اے دل' اے دل ۔۔۔ مرا تنہا گزاری، اے دل' دل'' کی زمین میں کہی گئی ایک غزل بھی شامل ہے۔اس کا اجرا نہرو کلچر سنٹر کی جانب سے ڈاکٹر رفیق زکریا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔یہ کیسٹ ''سمجھوتہ اکسپریس'' کے اجرا پر وزیر اعظم اٹل بہاری باجپائی نے پاکستان کو محبت کے ایک تحفے کے طور پر پیش کیا۔سردار جعفری سیما سہگل کو سراہتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''سیما سہگل اُردو سمجھتی ہیں اور ایک ایک لفظ کو اس کی معنوی اور جذباتی کیفیت کے ساتھ ادا کیا ہے۔وہ خود کمپوز کرتی ہے اور خود گاتی ہے پڑھی لکھی خاتون ہے۔اس وقت وہ میرا ایک اور کیسٹ تیار کر رہی ہے۔سیما سہگل نے نہرو کلچر سنٹر کی جانب سے ہونے والے سردار جعفری سیمینار میں جو اُن کی وفات کے بعد منعقد کیا گیا' جعفری صاحب کی چند اور نظموں کو پیش کیا جو دوسرے کیسٹ میں موجود ہیں۔''　　155

علی سردار جعفری کی نظموں پر رقص:

1۔مشہور رقاصہ شوبھنا نرائن نے سردار جعفری کی نظم ''میرا سفر'' کو جنوبی ہند کے مقبول رقص کتھک کی صورت میں پیش کیا۔ پروگرام کی تفصیل سردار جعفری نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے نام ایک خط (محررّہ 9 اپریل 1994ء) میں یوں پیش کی ہے:

''ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ دہلی میں کتھک کی ایک بہت اچھی رقاصہ شوبھنا نرائن نے میری نظم ''میرا سفر'' کو رقص کی شکل میں پیش کیا ہے۔یہ خوبصورت شام 3 اپریل 1994ء کو تھی۔تقریباً ایک ہزار کے مجمع نے نظم اور رقص کو جی بھر کر داد دی۔شریک ہونے والوں میں وسنت ساٹھے اور پاکستان کے ہائی کمشنر بھی تھے۔اُردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اور صحافی اور دانشور۔یہ میری شاعری کا نیا پہلو Dimension ہے جس کے لیے سب شوبھنا نرائن کے شکر گزار ہیں ان خاتون کو ان کے فن کے لیے پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا ہے''۔

۲۔اڑیسہ کی رقاصہ چندرما نے علی سردار جعفری کی دلکش نظم ''موسموں کا گیت'' کو اُڑیا ڈانس کے ذریعے پیش کیا۔

نثری تصانیف:

سلسلہ نشان	تصانیف	سنہ اشاعت	
1	منزل (افسانے)	1938ء	
2	تین مختصر ڈرامے	1942ء	بحوالہ اردو کے اہم ڈرامہ نگار اور ان کے ڈرامے مشمولہ اردو تھیٹر کل اور آج مطبوعہ اردو اکادمی دہلی 1999ء صفحہ 137
3	یہ خون کس کا ہے (ڈراما)	1943ء	
4	پیکار (ڈراما)	1944ء	
5	ترقی پسند ادب (تنقید)	1951	انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ۔
6	لکھنو کی پانچ راتیں (یادداشت، خود نوشت، افسانہ، رپورتاژ وغیرہ)	1964	مکتبہ جامعہ دہلی،
7	اقبال شناسی (تنقید)	1969	
8	پیغمبران سخن (تنقید)	1970	مکتبہ گفتگو، بمبئی
9	ترقی پسند تحریک کی نصف صدی (نظام اُردو خطبات، دہلی یونیورسٹی)	1987ء	
10	سرمایۂ سخن (اُردو شاعری کی ایک انوکھی لغت اور فرہنگ)	2001ء	مکتبہ جامعہ دہلی
11	غالب اور اس کی شاعری Ghalib and His Poetry	1969ء	انگریزی میں قرۃ العین حیدر کے اشتراک کے ساتھ
12	غالب کا سومنات خیال	1997ء	اُردو مرکز عظیم آباد، پٹنہ
13	سردار جعفری کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم	2001ء	انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی
14	سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز	2004ء	ساقی بک ڈپو، دہلی

مطبوعہ مضامین:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے کہ علی سردار جعفری کے ادب، ثقافت اور سیاست سے متعلق تقریباً تین سو سے زیادہ مضامین طبع ہوئے جن میں سے چند یہ ہیں۔

1۔ چراغ لالہ (اقبال کی شعری استعارے سے متعلق)

2۔ لحنِ داؤدی

3۔ جشنِ انسانیت (انقلاب روس کی پچاسویں سالگرہ)

4۔ اُردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات (علی گڑھ میگزین 1936ء)

5۔ اقبال اور فرنگی

6۔ دیکھ تو کس منزل طوفان سے آئی ہے حیات (مشترکہ تہذیب سے متعلق مقالہ چار قسطوں میں مطبوعہ کتاب نما نئی دہلی)

7۔ آہنگ جلال و فرہنگ جمال (مولانا آزاد)

8۔ فیض کے مرثیے کے متعلق ایک مضمون روزنامہ انقلاب ممبئی۔

9۔ ذی عظیم (روزنامہ انقلاب بمبئی)

10۔ افغانستان سے متعلق مضمون (انگریزی میں)

11۔ فردوسی (انگریزی)

12۔ ٹیگور (انگریزی)

13۔ اُردو کی لسانی انفرادیت سے متعلق ایک مضمون مطبوعہ انڈین لٹریچر، بمبئی۔

14۔ اپنی علالت کے موقع پر ایک مضمون (جس میں بیماری اور موت کا تذکرہ ہے)

15۔ انگریزی میں مطبوعہ السٹریٹیڈ ویکلی، بمبئی۔

16۔ گیان پیٹھ کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب کا دیباچہ ایک مضمون کی شکل میں۔ 156

علی سردار جعفری کی تخلیقات کے تراجم:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

1۔ ''ان کی (سردار جعفری) کی منتخبہ نظموں کا ترجمہ روسی ''ازبک''، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ جیسی غیر ملکی زبانوں میں ہوا۔

2۔ ان کی طویل نظم ''من کا ستارہ'' بارہ ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے۔

3۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کی تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' تقریباً چودہ زبانوں کے لیے منتخب کی تھی جن میں سے سات

زبانوں میں ترجمے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں خصوصاً شری پاد جوشی کا کیا ہوا مراٹھی ترجمہ کافی مقبول ہوا۔

4۔ان کے کلام کا انتخاب راج کمل دلی نے ہندی میں ''پیاس کی آگ'' کے نام سے شائع کیا۔

5۔ان کی نظموں کا انگریزی ترجمہ جو بیدار بخت نے کیا تھا' کتابی شکل میں شائع ہوا جس کا اجراء سابق وزیر اعظم گجرال کے ہاتھوں ہوا۔یہ کتاب اسٹرلنگ نے شائع کی تھی۔

6۔ان کی نثری کتابیں' لکھنو کی پانچ راتیں' کبیر بانی' دیوانِ غالب اور دیوان میر وغیرہ بھی ہندی میں شائع ہوئیں۔ 157

7۔ان کی متعدد نظموں کے ترجمے مختلف ہندوستانی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

8۔گیان پیٹھ نے جعفری صاحب کا ایک شعری انتخاب ہندی میں ''میرا سفر'' کے نام سے شائع کیا۔

9۔بیدار بخت نے اُردو اصل نظموں کے ساتھ انگریزی تراجم پر مشتمل ایک انتخاب شائع کیا۔یہ انتخاب My Journey کے نام سے Sterling نے شائع کی۔ 158

پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

''جعفری صاحب کی کتابوں کے ہندوستانی زبانوں میں ترجمے نجی طور پر بھی ہوئے ہیں مثلاً ان کی شاعری کا ایک اچھا انتخاب ہندی میں ''پیاس کی آگ'' کے نام سے ہوا ہے۔یہ انتخاب راج کمل دلی نے شائع کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کی مشہور تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا بھی ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس کا مراٹھی ترجمہ نیا جگالا پرانام کے عنوان سے شری پاد جوشی نے کیا ہے جو اس سے قبل اُردو شعر و ادب کو مراٹھی میں منتقل کرنے کا کام کرتے رہے ہیں۔'' 159

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری کا ترجمہ روسی' انگریزی' ازبیک' فارسی' فرانسیسی اور ہندی کے علاوہ کئی ہندوستانی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ان کی شاعری اور نثری تصانیف ہندی پڑھنے والوں میں بھی بہت مقبول ہیں۔'' 160

ڈاکٹر رفعت النساء بیگم رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری کی چند نظموں کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے۔نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا چودہ ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔'' 161

امن کا ستارہ بارہ ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے۔

ترتیب' تدوین تالیف اور ترجمے:

1۔شیکسپیئر کی کہانیاں (میری اور چارلس لیمب کی لکھی ہوئی کہانیوں کا اُردو ترجمہ) مارچ 1951ء

2۔دیوان غالبؔ (ہندی اُردو شبداولی) 1958ء

3۔دیوان میر (ہندی اُردو شبداولی) 1960ء

4۔کبیر بانی (ہندی اُردو شبداولی) 1960ء

5۔پریم وانی (ہندی اُردو شبداولی مع فرہنگ) 1970ء

6۔غزل نامہ (دیوناگری رسم الخط میں) ڈاکٹر راج نگم کے اشتراک سے دیوناگری رسم الخط میں اُردو غزلوں کا انتخاب' سات جلدوں میں شائع کیا جسے ہندی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔

7۔سومنات خیال (غالب کی فارسی مثنوی "چراغ دیر" کا اُردو ترجمہ 1997ء۔

8۔غالب اور اس کی شاعری (انگریزی میں) بہ اشتراک قرۃ العین حیدر۔

دیباچہ۔تقریظ'تبصرہ:

1۔ہم وحشی ہیں (افسانے) کرشن چندر

2۔جب کھیت جاگے (ناول) کرشن چندر

3۔چغد (افسانے) سعادت حسن منٹو

4۔پرچھائیاں (طویل نظم) ساحرلدھیانوی

5۔غزل (شعری مجموعہ) مجروح سلطان پوری

6۔ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ (نظم) کیفی اعظمی

7۔گنج پیلے پھولوں کا (شعری مجموعہ) عشرت آفریں

8۔کفِ بہار (شعری مجموعہ) عرفانہ عزیز

9۔پاکستانی شاعرہ سیدہ پروین فنا کے شعری مجموعہ پر دیباچہ

10۔اُستاد جلیل کی غزلوں کے مجموعہ پر دیباچہ

11۔خمار بارہ بنکوی کی غزلوں کے مجموعہ پر دیباچہ

12۔بمبئی کے ایک مشہور صنعت کار کی بہو روپا مہتہ نغمہ کے شعری مجموعہ پر طویل دیباچہ 162

تبصرہ:

1۔چاندنی کی پتیاں (ناصر شہزاد)

2۔نیا عہدنامہ (خلیل الرحمٰن اعظمی) 163

خاکے:

1۔پابلو نرودا 2۔ایلس ایرن برگ 3۔جگر مرادآبادی

4۔جوش ملیح آبادی 5۔ویرا بکووا 6۔کیفی اعظمی

7۔سجاد ظہیر 8۔دو بہنیں

خراج تحسین ومحبت:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''جعفری صاحب نے آل انڈیا ریڈیو کے مستقل پروگرام ''یادرفتگان'' کے تحت متعدد ادیبوں کے انتقال پر مضامین نشر کیے جو بعد میں شائع بھی ہوئے''۔

1۔درگا پرشاد دودھر 2۔ن۔م۔راشد 3۔مرنے والوں کی جبین روشن ہے اس ظلمات میں

4۔نذر سجاد ظہیر 5۔سراج لکھنوی 6۔حبیب جالب

7۔کفن بردوش (مجاز کے انتقال پر) 8۔کرشن چندر 9۔ایک خوبصورت پھول (راہی معصوم رضا) 164

تقاریر وخطبات:

سردار جعفری نے کئی تقاریر کیں اور خطبات دیے۔چند ایک یہ ہیں۔

1۔جوش قبلہ رندان جہاں (جموں یونیورسٹی)

2۔اُردو شاعری میں محبوب کی بزم آرائیاں (جموں یونیورسٹی)

3۔اُردو کی عالمی حیثیت (جموں یونیورسٹی)

4۔فلم آرٹ (جموں یونیورسٹی)

5۔میری یادیں (جموں یونیورسٹی)

6۔اُردو کی ترقی پسند شاعری (انگریزی میں۔جموں یونیورسٹی)

7۔وقت کا تصور اور محنت کا پھل (جموں یونیورسٹی)

8۔ترقی پسند تحریک کے پچاس سال (دو لیکچر۔نظام خطبات' دہلی یونیورسٹی)

9۔ذکر یار (فیض فاونڈیشن' لاہور ۱۹۸۵ء)

10۔کامریڈ ایچ کے دہاس میموریل لیکچر (جودھپور)

11۔مولانا حسرت موہانی (خلافت ہاؤس' ممبئی)

12۔جلال الدین رومی' حافظ اور اقبال (انڈو عرب سوسائٹی۔ممبئی)

13۔امیر خسرو (مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی' ممبئی)

14۔اقبال صدی خطبہ (مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی' ممبئی)

15۔اُردو ادب کے چالیس سال (مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی۔ممبئی)

16۔فقہی میموریل لیکچر (انجمن اسلام' ممبئی) 165

تقاریر و خطابت:

سردار جعفری کی تقریروں اور خطابت کی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے مظہر امام نے لکھا:

''سردار جعفری کو بحث و مباحثے کا شوق اوائل عمر سے ہی تھا اور طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ کئی معرکے سر کیے تھے اور انعامات پائے تھے۔ سردار جعفری کی تقریروں میں Oratory (خطابت) Debate (بحث و تمحیص) دونوں کی طرح کی خصوصیات گھل مل گئی تھیں۔ خطابت کے لطف کے ساتھ ان کی گفتگو نہایت مدلل persuasive ہوتی تھی اور ان کی تقریر کے دوران ان سے اختلاف کے پہلو شاذ ہی نکلتے تھے۔'' 166

زیر طبع نامکمل تصانیف:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے جعفری صاحب کی زیر طبع نامکمل چھ تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک کلیات علی سردار جعفری شائع ہو چکی ہے۔ دیگر پانچ تصانیف اس طرح ہیں۔

1۔ رقص ماہ و سال:

اپنی اسّی ویں سالگرہ کے موقع پر جعفری صاحب نے نظم و نثر کی اپنی اسّی تخلیقات کا انتخاب خود کیا تھا جو غالباً انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شائع ہونے والا تھا۔ اس میں جعفری صاحب کا ایک مختصر سا مقدمہ اپنی شاعری سے متعلق شامل تھا لیکن جعفری صاحب کی مصروفیات اور بیماری نے اس کا موقع نہ دیا۔

2۔ یاران میکدہ:

اساتذہ کے تذکروں پر مشتمل تھی جن سے سردار جعفری کو ملنے کے مواقع ملے مثلاً جوش، جگر، سراج لکھنوی وغیر۔ یہ سلسلہ برسوں پہلے ''بیسویں صدی'' میں شروع کیا گیا تھا پھر چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر منقطع ہو گیا تھا۔

3۔ ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری (انگریزی میں)

اس عنوان سے جعفری صاحب ایک کتاب مرتب کر رہے تھے لیکن افسوس وہ ان کی زندگی میں منظر عام پر نہیں آسکی۔

4۔ اقبال کی سوانح حیات:

جعفری صاحب اقبال پر ایک بڑا سمینار منعقد کرنا چاہتے تھے اور اس موقع پر وہ انگریزی میں قرۃ العین حیدر اور جگن ناتھ آزاد کے تعاون سے یہ کتاب لکھنا چاہتے تھے۔

5۔ اقبال، کمیونزم اور اسلام:

یہ کتاب بھی وہ انگریزی ہی میں لکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے نام ایک خط مطبوعہ 20 جنوری 1998ء سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب پٹنہ (غالباً اُردو مرکز، پٹنہ) سے شائع ہو رہی تھی جو بقول سردار جعفری (مارچ 1998ء) تک منظر عام پر آجانی

چاہیے تھی۔خدا جانے وہ شائع ہوئی ہے یا نہیں اور نہیں ہوئی تو کیوں۔اگر ہوئی تو ناچیز کی نظر سے نہیں گزری۔'' 167

صحافت:

1۔مدیر ''نیا ادب'' 2۔'' قومی جنگ'' کی مجلس ادارت کے رکن 3۔''گفتگو'' کی مجلس ادارت کے رکن

4۔مہمان مدیر ''کتاب نما'' 5۔مدیر نیشنل بک ٹرسٹ'' 168

6۔انگریزی رسالہ انڈین لٹریچر کی ادارت 169

اداریے:

گفتگو کے چند اداریے حسب ذیل ہیں

1۔پیش گفتار (پہلا اداریہ گفتگو) 2۔گفتگو بند نہ ہو 3۔کون تنہا ہے

4۔گفتگو ترقی پسند ادب نمبر 5۔کتاب نما' دہلی کے مہمان اداریے

آل انڈیا ریڈیو:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کے مطابق:

''سردار جعفری نے آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں کئی حیثیتوں سے حصہ لیا مثلاً بحیثیت شاعر' بحیثیت مقرر' بحیثیت فیچر نگار اور پھر رکن بورڈ آف ڈائریکٹرز برائے بزم اُردو (اُردو پروگرام)۔ 170

رفعت سروش لکھتے ہیں:

''براڈ کاسٹنگ کے لیے ضروری ہے کہ آواز دلکش ہو' تلفظ درست ہو' زبان سلیس ہو اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اسکرپٹ وقت پر مل جائے۔سردار میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں۔اس لیے آئے دن وہ پروگرام نشر کرتے رہتے تھے۔ ایک بار تو میں نے ان کی بارہ تقریریں دو دن میں ریکارڈ کیں۔تین تقریریں کالی داس پر' تین غالب پر' تین اقبال پر اور تین ''نیا ادب'' پر۔اس سے سردار کی زود نویسی اور عملی تبحر کا پتہ چلتا ہے'' 176

ٹی۔وی:

1۔پروڈیوسر ایمریٹس ٹی وی پروگرام ''محفل یاراں'' پانچ سال تک 1980ء تا 1985ء۔اس پروگرام کی حیثیت خالص ادبی تھی اور اس میں اُردو ادب کے مختلف موضوعات پر ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کو مدعو کیا جاتا تھا اور خود جعفری صاحب Anchor کے فرائض انجام دیتے تھے۔کچھ دنوں کے لیے جب وہ علیل ہوئے تو ممبئی ٹیلی ویژن نے پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کو اس کے لیے مدعو کیا تھا۔بعد میں دیگر اُردو پروگراموں کی طرح یہ پروگرام بھی ختم کر دیا گیا۔۔۔

2۔پروڈیوسر ٹی وی سیریل ''کہکشاں'' تحریر کیا۔جعفری صاحب نے 17 اپی سوڈ پر مشتمل اپنے ہم عصر شعرا کی شاعری اور حیات سے متعلق ایک سیریل اُردو میں شروع کیا تھا جن میں حسرت موہانی' جگر مرادآبادی' جوش ملیح آبادی' فراق گورکھپوری

،فیض احمد فیض،مخدوم محی الدین اوراسرارالحق مجاز کے نام شامل تھے ۔یہ تمام اپی سوڈ جعفری صاحب نے خود تحریر کیے تھے۔ ہدایت جلال آغا کی تھی اور موسیقی جگجیت سنگھ نے دی تھی۔" 172

3۔جدوجہد آزادی کے سو سال (انگریزی) 173

4۔اٹھارہ اپی سوڈ پر مشتمل سریل ''آج کل'' بنائی 174

فلم:

1۔پھر بولوا ے سنت کبیر (اُردو) (دستاویزی فلم) کہانی اور مکالمے سردار جعفری اور ڈائرکٹر خواجہ احمد عباس۔

2۔ڈاکٹر محمد اقبال (اُردو) (دستاویزی فلم) کہانی اور مکالمے سردار جعفری اور ڈاکٹر خواجہ احمد عباس

3۔ہندوستان ہمارا (اُردو) (دستاویزی فلم) کہانی اور مکالمے (پانچ ہزار سال کی مشترکہ تہذیبی میراث)

4۔دی لٹریری اسٹارم (تحریک آزادی میں ادب کے حصہ کے موضوع پر تین حصوں پر مشتمل انگریزی میں دستاویزی فلم) مسودہ اور ڈائرکشن سردار جعفری۔ پہلا حصہ 1857ء سے 1905ء تک دوسرا حصہ 1905ء سے 1920ء تک اور تیسرا حصہ 1920ء سے 1947ء تک۔

5۔فلمی کہانیاں: فلم میلہ، سازش، حبہ خاتون۔

6۔فلمی نغمے: انہونی ،زلزلہ ،فٹ پاتھ ،پردیسی ،شہر اور سپنا ،دھوبی ڈاکٹر ،انارکلی ،نکسلائٹ ایک آدمی ،دھرتی کا لال ،منّا اور آسمان محل وغیرہ۔

7۔پروڈیوسر فلم: گیارہ ہزار لڑکیاں (خواجہ احمد عباس کے تعاون سے)

اسٹیج:

1۔اپٹا (انڈین پیپلز تھیٹر) کی بنیاد ڈالنے والوں میں سردار جعفری پیش پیش تھے ۔غالب کی یاد میں "لال قلعہ دہلی کا یادگار مشاعرہ" اسٹیج کیا۔خود بھی ایک کردار کیا۔۔۔"

2۔علی سردار جعفری کی مشہور تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" پروفیسر زاہدہ زیدی کی رہنمائی میں اسٹیج پر پیش کی گئی۔" 175

سوایلومیر (روشنی اور آواز ڈراما):

جعفری صاحب نے تاریک اسٹیج پر روشنیوں اور لاوڈ اسپیکر پس منظر آوازوں کے ذریعے کئی خوب صورت ڈرامے" روشنی اور آواز" کے نام سے مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے جس میں تحریر اور پس منظر آواز انہیں کی تھی ۔نسوانی آواز کے لیے ایک پروگرام میں مینا کماری کو زحمت دی گئی ۔ان میں سے چند یہ ہیں:

1۔لال قلعہ دہلی ۔موضوع عہد شاہ جہاں سے ہندوستان کی آزادی تک۔

2۔شالیمار باغ ،سرینگر کشمیر 1960ء جہاں گیر اور نور جہاں سے عہد حاضر تک (اس کے ایک قصہ میں مینا کماری نے آواز دی تھی)۔

اس باغ میں لیلیٰ مجنوں کی کہانی پھولوں اور پودوں کی زبانی کہی گئی ہے ۔باغ میں بہتی ہوئی نہر وقت کا استعارہ ہے۔ پانی پر تیرتے ہوئے پھول لیلیٰ کا استعارہ ہیں اور نہر کے دونوں طرف سے جھکی ہوئی بید مجنوں کی شاخیں پھولوں کو چھو نہیں سکتیں' مجنوں کا استعارہ ہیں ۔نہر کے دونوں طرف کیاریوں میں لیمو اور سنترے کے دو دو پودے جنت میں لیلیٰ مجنوں کی یکجائی کی علامت ہیں ۔ناقہ' لیلیٰ کی علامت اب باقی نہیں رہ گئی ہے ۔یہ علامت سبز گھاس کے قطعات پر ٹیلوں کی شکل میں تھی جن پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں ۔کشمیری کہانی بھوزا اور نرگس تحریک آزادی کی کہانی سناتی ہے جس میں بھوزا مجاہد کی علامت ہے اور نرگس (محبوبہ) آزادی کی علامت ۔جاڑے کی برف پگھل جانے کے بعد جب زنبور بہار گنگنا تا ہوا نرگس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے تو آزادی کی بہار آتی ہے ۔تین رنگ کے کشمیری کنول کے پھول برہما' وشنو اور مہیش کی علامت کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں ۔سرخ کنول صبح ازل کا طلوع آفتاب ہے ۔نیلا کنول کائنات کی دوپہر ہے اور سفید کنول موت کی علامت ہے جو تجدید حیات کی آئینہ دار ہے۔

تین مورتی نواس:

۳۔جواہر لال نہرو کی قیام گاہ 1972ء کے بعد کی کہانی۔

4۔سابرمتی آشرم احمد آباد 1970ء مہاتما گاندھی کی کہانی ۔ڈانڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

ان تمام پروگراموں کو دیکھ کر سردار جعفری کے تاریخی شعور' سیاسی سوجھ بوجھ اور فنی' تخلیقی و ذہنی صلاحیتوں اور جدت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔'' 176

علی سردار جعفری کی حیات اور شخصیت پر دستاویزی فلم:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

1۔''مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے سردار جعفری کی زندگی ہی میں ان کی حیات اور شخصیت سے متعلق ایک پندرہ منٹ کی رنگین دستاویزی فلم بنائی تھی جو ان کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر ممبئی میں ایشین ہاوس میں دکھائی گئی اس میں ''ہاتھوں کا ترانہ'' اور ''میرا سفر'' شامل ہیں''۔

2۔''ان کی (سردار جعفری) کی دو اور نظموں پر ایک مشہور فلم ساز دستاویزی فلم بنا رہے تھے جس میں دلیپ کمار نے سردار جعفری کی نظمیں پیش کی ہیں اور میوزک روی شنکر کا تھا۔پتہ نہیں وہ فلم مکمل ہوئی یا نہیں۔'' 177

علی سردار جعفری سے لیے گئے انٹرویو:

انور ظہیر خاں نے سردار سے انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی تھی تو سردار نے انھیں پہلے ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے لیے کہا۔

''جعفری صاحب ! میں (انور ظہیر خاں) ڈاکٹر شمیم حنفی کے ایماء پر رسالہ جامعہ کے لیے آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔۔۔''

''۔۔۔دیکھئے بھئی انٹرویو کرنے سے پہلے آپ میری ساری شعری اور نثری تصانیف بغور پڑھ جائیں تا کہ آپ میرے فکری وفنی رویوں سے واقف ہوسکیں۔واقفیت اس لیے ضروری ہے کہ لوگ میری شاعری پڑھے بغیر سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں اور یہ ساری ہوائی میرے ادبی حریفوں کی اڑائی ہوئی ہے۔''

''۔۔۔حضور! میں نے لکھنو کی پانچ راتیں چار مرتبہ ترقی پسند ادب دو دفعہ اور پیغمبران سخن کا پانچ مرتبہ مطالعہ کیا ہے۔ آپ کے کلام کے سارے مجموعے پرواز، پیراہن شرر بار بار پڑھے ہیں۔میں نے آپ کی کتابوں کے لیے (کذا۔'' سے) روشنی حاصل کی ہے۔جب جب آپ کی تحریریں پڑھی ہیں تو دل کی گہرائیوں سے ایک نیاز مند آواز بھری ہے۔۔۔میں نے دیکھا کہ اندر سے اٹھتی ہوئی خوشی کی ایک لہر نے ان کی سنجیدہ چہرے کو شبنمی اور تبسمی کر دیا ہے۔۔۔میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔۔لیکن آپ سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہیں، اگر آپ کی آنکھوں پر ادبی تعصب کی عینک لگی ہوئی ہے تو مجھ سے انٹرویو نہ لیں۔اگر آپ کا اصرار ہے تو میری کتابیں ایک بار پھر جم کر پڑھ جائیں تب آپ دیکھیں گے کہ میرے یہاں کیسے کیسے نئے شعری ڈکشنز اور فنی رویے موجود ہیں'' 178

سردار جعفری کے فن کی پذیرائی کے اعتراف میں ان سے کئی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے انٹرویو لیے۔

1۔گفتگو بند نہ ہو، راہی معصوم رضا اور رفیعہ شبنم عابدی کے ساتھ۔ کتاب نما ''سردار جعفری نمبر''، ''افکار ''سردار جعفری نمبر''۔

2۔ایک پرانی ملاقات ندا فاضلی کے ساتھ۔ملاقاتیں۔کتاب نما سردار جعفری نمبر۔

3۔سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر حسن عابدی کے ساتھ۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔

4۔ہم عصر ادبی مسائل محمد علی صدیقی حسن عابد، مسلم شمیم، شاہد نقوی اور مظہر جمیل۔ افکار سردار جعفری نمبر۔

5۔تحریک نسواں کا ایک باب اشفاق حسین۔افکار سردار جعفری نمبر۔

6۔سردار جعفری سے گفتگو۔رام لعل۔افکار سردار جعفری نمبر۔

7۔سردار جعفری کا انٹرویو محسن بھوپالی۔افکار سردار جعفری نمبر۔

8۔ سردار جعفری سے ایک ملاقات عظمیٰ ناز۔افکار سردار جعفری نمبر۔

9۔علی سردار جعفری سے ملاقات و مکالمہ حسن اکبر کمال کے ساتھ۔سہ ماہی روشنائی۔جنوری تا مارچ 2001ء پاکستان۔

10۔علی سردار جعفری کی شوخی گفتار کا ایک رنگ جمال نقوی روشنائی۔جنوری تا مارچ 2001ء کراچی، پاکستان۔ 179

4 ستمبر 1970ء کو حیدر آباد میں سراج ولا (خیریت آباد) میں سردار جعفری سے باتیں ہوئیں۔باتیں کرنے والوں میں ''سلیمان اریب، رام لعل، صدیق عثمانی اور سری نواس لاہوٹی شامل تھے۔احمد جلیس نے ابوالفیض سحر کی مدد سے اس بات چیت کا کچھ حصہ قلم سے ریکارڈ کیا جسے ماہنامہ صبا، حیدر آباد فروری، مارچ 1966ء میں صفحہ 19 تا 25 شائع کیا گیا۔

محمد علی صدیقی، حسن عابد، مسلم شمیم، شاہد نقوی اور مظہر جمیل نے علی سردار جعفری سے انٹرویو لیا، جسے ''ہم عصر ادبی مسائل '' کے عنوان سے افکار کراچی نے علی سردار جعفری نمبر میں شائع کیا۔یہ انٹرویو 27 صفحات پر مشتمل ہے۔

(افکار'نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 102 تا 122)

رام لعل نے سردار جعفری کا ایک انٹرویو 1984ء میں خدا بخش نیشنل اورینٹل لائبریری' پٹنہ کے لیے لیا تھا۔ اسے ''سردار جعفری سے گفتگو'' کے عنوان سے افکار کراچی سردار جعفری نمبر میں صفحہ 135 تا 148 شائع کیا گیا۔ محسن بھوپالی کا لیا گیا انٹرویو ''سردار جعفری کا انٹرویو'' کے عنوان سے افکار' کراچی' سردار جعفری نمبر کے صفحہ 149 تا 151 شائع ہوا۔ عظمیٰ ناز کا لیا گیا انٹرویو ''سردار جعفری سے ایک ملاقات'' کے عنوان سے افکار' کراچی' سردار جعفری نمبر کے صفحہ 152 تا 159 شائع ہوا۔

10 اپریل 1990ء کو ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے سردار جعفری سے ان کے سیتامحل والے رہائشی فلیٹ میں انٹرویو لیا۔ اس وقت سلطانہ جعفری اور رفیعہ شبنم عابدی بھی موجود تھیں۔ اس پورے انٹرویو کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ بعد ازاں اسے افکار کراچی' سردار جعفری نمبر' نومبر دسمبر 1991ء میں شائع کیا گیا۔ یہ 26 صفحات پر مشتمل ہے۔ انٹرویو شروع ہونے سے پہلے راہی نے سردار سے گفتگو کا موقع ملنے پر اپنی جہاں اپنی خوشی کا اظہار کیا وہیں اس بات کا یہ کہہ کر اعتراف کیا کہ سردار جعفری ہمارے ان بزرگ شاعروں' نقادوں اور مفکرین میں سے ہیں جنھوں نے رہنمائی کی اور سیاسی شعور کو بڑھنے میں مدد دی ہے۔ انٹرویو خاصا طویل ہے۔ ایک اقتباس پیش ہے۔

''سردار جعفری نے بتایا کہ جس وقت ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اس وقت یورپ میں فاشزم کا عروج تھا اور ہندوستان میں ہم امپریلزم کے خلاف لڑ رہے تھے۔۔۔ ہم اپنے ادب کو عوام کی بہبود کے لیے استعمال کریں گے۔۔۔ ہم نے زبان کو وسعت دی اور جب تک کہ زبان میں ایسی وسعت نہیں آئے گی' اس وقت تک ہم زیادہ بڑے طبقے تک نہیں پہنچ سکتے۔'' 180

حسن عابدی نے سردار جعفری کا انٹرویو لیا تھا جو پاکستان کے روزنامہ ''ڈان'' کے شمارہ 7 جون 1991ء میں شائع ہوا تھا اسے افکار' کراچی سردار جعفری نمبر' نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 70 تا 75 میں شائع ہوا۔

''مارچ 1991ء میں جعفری صاحب اپنے کسی عزیز کے یہاں کسی تقریب میں الہ آباد آئے۔ اسی درمیان الہ آباد ریڈیو نے جعفری صاحب اور ان کی شاعری پر ایک انٹرویو ریڈیو آرکایوز کے لیے ریکارڈ کیا جو جعفری صاحب کی شاعری پر اچھا ریکارڈ ہے۔'' 181

اعزازات:

1۔ پدم شری 1967ء (صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی طرف سے) شاعری کے لیے۔

2۔ جواہر لال نہرو فیلوشپ 1969ء 1968ء

3۔ ڈی لٹ (اعزازی دکتورادب کی سند) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1986ء

مسلم یونیورسٹی نے اس وقت تک صرف چار شاعروں کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال' سروجنی نائیڈو' جگر مرادآبادی اور علی سردار جعفری شامل ہیں۔

4۔ خصوصی ایمریٹس فیلوشپ' ڈپارٹمنٹ آف کلچر' حکومت ہند' نئی دہلی۔

5۔ممبر سینٹ، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی (دوبار)

6۔پروڈیوسر ایمیرٹس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن 1980ء سے 1985ء تک

7۔صدر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین (اُردو) 1977ء تا ستمبر 1990ء

8۔جنرل سکریٹری، آل انڈیا اقبال صدی کمیٹی 1970ء

9۔وزیٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی۔ اکتوبر تا دسمبر 1983ء

10۔ٹرسٹی، نیشنل بک ٹرسٹ (ہند) نئی دہلی۔

11۔صدر کمیٹی برائے جائزہ سفارشات، گجرال کمیٹی (اُردو) مارچ تا ستمبر 1990ء۔

12۔ڈائرکٹر، مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی، ممبئی 1988ء۔

14۔نائب صدر، مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی، ممبئی 1994ء۔

15۔صدر فلم رائٹرز اسوسی ایشن، ممبئی، جنوری 1994ء۔

15۔کورٹ ممبر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

16۔وزیٹنگ پروفیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

17۔دہلی یونیورسٹی نے اپنی پلاٹینم جوبلی کے موقع پر جب سابق طلباء کو اعزاز دیئے تو ان کو اینگلو عربک کالج (قدیم دلی کالج کے طالب علم ہونے کے سبب جعفری صاحب کو بھی اس اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا۔ 182

18۔جسٹس آف پیس رہ چکے ہیں۔ 183

19۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر ایمریٹس 1980ء تا 1985ء۔

انعامات:

سردار جعفری کو بہت سے انعامات سے نوازا گیا جیسے:

1۔سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ 1965ء۔شعری مجموعہ ''ایک خواب اور'' کے لیے۔

2۔سجاد ظہیر ایوارڈ لکھنو 1974ء نہرو کلچرل اسوسی ایشن لکھنو کی جانب سے شاعری کے لیے۔

3۔اُتر پردیش کاڈمی ایوارڈ لکھنو 1977ء ''اقبال شناسی'' کے لیے۔

4۔اقبال میڈل، پاکستان 1978ء حکومت پاکستان کی جانب سے تمغۂ امتیاز۔

5۔اُتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ لکھنو 1979ء۔ ''لہو پکارتا ہے'' کے لیے۔

6۔مخدوم ایوارڈ حیدر آباد 1980ء اُردو اکیڈمی حیدر آباد کی جانب سے اُردو شاعری نیز ادبی خدمات کے لیے۔

7۔میر تقی میر ایوارڈ، بھوپال 1982ء مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی بھوپال کی جانب سے شاعری اور ادبی خدمات پر۔

8۔کمارن آسن ایوارڈ ملیالم لنگویج ترینڈرم 1983ء طویل نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' کے لیے۔

9۔خصوصی تمغۂ ماسکو 1984ء ستر سالہ جشن پیدائش پر۔

10۔ہندروس دوستی میڈل 1984ء بین الاقوامی دوستی کے لیے۔

11۔فیض احمد فیض ایوارڈ 1987ء عالمی اُردو کانفرنس، نئی دہلی کی جانب سے شاعری کے عوض۔

12۔بین الاقوامی اُردو ایوارڈ 1988ء۔اکیڈمی آف اُردو لٹریچر، ٹورنٹو (کینڈا) کی جانب سے شاعری کے لیے۔

13۔گنگا دھر مہر ایوارڈ، 1992ء سمبل پور یونیورسٹی کی جانب سے شاعری کے لیے۔

14۔مولانا آزاد ایوارڈ لکھنو۔1994ء اُتر پردیش اکیڈمی کی جانب سے شاعری کے لیے۔

15۔میر ایوارڈ لکھنؤ 1992ء میر اکادمی لکھنو کی جانب سے شاعری کے لیے۔

16۔ظ۔انصاری ایوارڈ، ممبئی 1995ء مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی کی جانب سے شاعری کے لیے۔

17۔مولانا مظہر الحق ایوارڈ، بہار 1997ء حکومت بہار کی جانب سے جملہ ادبی خدمات کے لیے۔

18۔ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) گولڈ میڈل 1999ء شاعری کے لیے۔ 184

19۔اقبال سمان 1986ء مدھیہ پردیش سرکار کا انعام شاعری کے لیے۔

20۔سنت گیانیشور ایوارڈ (اُردو اکیڈیمی حکومت مہاراشٹرا)۔

21۔گیان پیٹھ ایوارڈ (ملک کا سب بڑا ادبی انعام) 1997ء۔ 185

22۔25 جون 1999ء کو ان کو حکومت اُتر پردیش کا اعزاز ''اودھ سمان'' بیگم حضرت محل پارک میں گورنر کے ہاتھوں دیا گیا۔ 186

23۔خصوصی ایمریٹس فیلوشپ، ڈپارٹمنٹ آف کلچر، حکومت ہند، نئی دہلی۔ 187

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے علی سردار جعفری کا نام:

ڈی لٹ کی ڈگری کی پیشکش کے موقع پر جو تعریفی و توصیفی کلمات کہے جاتے ہیں اور چانسلر سے ڈگری عطا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔1986ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے علی سردار جعفری کو ڈی لٹ دیے جانے کے موقع پر جو تقریر کی گئی اس میں جعفری صاحب کا مختصر تعارف، ان کی شاعری کی خصوصیات، جدوجہد آزادی میں ان کے سرگرم رول کا ذکر، جیل کی صعوبتیں، تنقیدی شعور، صحافتی خدمات کے ذکر کے بعد آخر میں عالمی امن کے کاز کے سلسلہ میں ان کی مساعی، اُردو اور ملک کی خدمات کی ستائش ان الفاظ میں کی گئی تھی، ملاحظہ کیجیے۔

''علی سردار جعفری نے عالمی امن کے کاز کے لیے اور اقوام عالم میں باہمی آشتی اور دوستی کے لیے جرأت رندانہ کے ساتھ کام کیا ہے۔انہوں نے ہندوستان اور دیگر ممالک کے مابین تعلقات کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔جعفری نے اب تک متعدد قومی اور بین الاقوامی انعام حاصل کیے ہیں جو اُن کے کمالات کا محض جزوی اعتراف ہیں۔انہوں نے اُردو اور ملک کے لیے لافانی خدمات انجام دی ہیں۔آج جب کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہے یہ امر بطور

خاص موزوں ومناسب ہے کہ ہماری جامعہ اپنے بہت معروف بیٹوں میں سے ایک بیٹے کی خدمات کا اعتراف کرے۔اسی وجہ سے جناب چانسلر کیا میں آپ سے درخواست کرسکتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم علی سردار جعفری کوڈاکٹر آف لیٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا فرمائیں۔" 188

اقبال سمّان کے لیے علی سردار جعفری کے انتخاب میں جیوری کا فیصلہ:

1986-87ء کے اقبال سمّان کے لیے علی سردار جعفری کے انتخاب میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کی فلاح وبہبود وچین وسکون کے لیے اُن کی مساعی کا بطور خاص ذکر کیا گیا۔جیوری کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے۔

"محکمہ ثقافت مدھیہ پردیش (بھوپال) کے ذریعے قائم کردہ اقبال اعزاز کی جیوری کی نشست بتاریخ 4/اکتوبر 1986ء بھوپال میں منعقد ہوگئی جس میں 1986-87ء کا پہلا اقبال سمّان تجویز کرنے کے معاملے پر غور کیا گیا۔نشست میں درج ذیل ممبران نے شرکت کی۔ 1۔جناب خواجہ احمد عباس فاروقی 2۔پروفیسر گیان چند جین 3۔پروفیسر قمر رئیس 4۔جناب شمس الرحمٰن فاروقی۔اراکین جیوری نے اس بات پر غور کیا کہ یہ اعزاز طویل اور قابل قدر تخلیقی کاروں کے اعتراف کے لیے ہے۔اقبال سمّان کے شرائط کی رو سے یہ سمّان ایسے ادیب کو دیا جانا چاہیے جو اس وقت بھی ادب کے میدان میں سرگرم عمل ہو اور اس کا پورا کارنامہ جیوری کے سامنے پیش نظر ہونا چاہیے۔جیوری کے سامنے جو کاغذات پیش کیے گئے ان کی رو سے حکومت مدھیہ پردیش کے محکمۂ ثقافت نے (396) ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانشوروں سے سفارشات منگوائی تھیں۔112 حضرات نے 85 نام تجویز کیے۔جیوری نے ان تمام سفارشات کا مفصل جائزہ لیا اور اقبال سمان کے رہنما اُصولوں کو پوری طرح دھیان میں رکھتے ہوئے کافی غور وخوص اور بحث کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ 1986-87ء کا اقبال سمان جناب علی سردار جعفری کو دیا جائے۔اراکین جیوری نے شاعر اور تخلیقی فن کار کی حیثیت سے سردار جعفری کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ جدید اُردو شاعری میں سردار جعفری انتہائی منفرد اور معتبر مرتبے کے مالک ہیں۔ سردار جعفری نے کلاسیکی نظم وضبط اور شائستگی کے ساتھ ساتھ جدید اسالیب اظہار وبیان کو بڑی خوبی سے اپناتے ہوئے آج کی دنیا خاص کر تیسری دنیا کے انسان کی آواز کو اپنی آواز میں سمولیا ہے۔ان کی شاعری اور فکر دونوں نے گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں اُردو ادب پر نمایاں اثر ڈالا اور آج بھی اُردو ادب کے منظر نامے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔" 189

بیرونی ممالک کا سفر:

سردار جعفری نے کئی ممالک کا دورہ کیا ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں۔

سردار جعفری نے مختلف ممالک کا دورہ کیا ہے جیسے پاکستان، فرانس، ڈنمارک، سویڈن، مصر اور ماروے (1954ء)، عراق اور یونان (1955ء)، بلغاریہ (1959ء)، چیکوسلواکیہ (1960ء)، جرمنی اور انگلستان (1971ء)، امریکہ اور کینڈا (1980ء)، انگلستان (۱۹۸۵ء)، خلیجی ممالک مثلاً شارجہ، دوبئی، دوحہ قطر، کویت، مسقط وغیرہ (1988ء اور 2000ء) کے دوران کئی بار سوویت یونین (تاجکستان، ازبکستان، روس، سائبیریا، جارجیا، آذربائیجان)، یمن، مصر،

چیکوسلواکیہ، فن لینڈ۔

سردار جعفری نے بیرونی ممالک میں جن یادگار تقریبات میں شرکت کی تھی اُن میں حسب ذیل شامل ہیں۔

سوویت یونین کے ادیبوں کی دوسری کانفرنس، ماسکو دسمبر 1954ء صد سالہ جشن اقبال، لاہور 1977ء جشن صدرالدین حسینی، تاجکستان اپریل 1978ء جشن نظامی گنجوی، گنجینۂ آذربائیجان 1978ء کو عرب شعرا کی کانفرنس عدن (یمن) 1979ء عالمی شعرا کی کانفرنس، ماسکو 1985ء جشن طلائی انجمن ترقی پسند مصنفین لندن 1985ء جشن فیض (کینڈا)۔

اندرونی و بیرونی ممالک میں منعقدہ مشاعرے، سمینار، کانفرنس، ادبی و تہنیتی اجلاسوں میں سردار جعفری کی شرکت:

بلراج کومل نے مشاعرہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے:

''مشاعرہ اُردو شاعری کا صدیوں پرانا ثقافتی ادارہ ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ مشاہرہ وہی ہے جو اُردو شاعری کو وسیع پیمانے پر سامعین تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے'' 190

ساجد رشید رقمطراز ہیں:

''یہ مشاعروں کی تہذیب کا دور تھا۔ پورے ملک میں اکتوبر تا مارچ کے مہینے تک مشاعرے منعقد ہوتے۔ یہ مشاعرے رات کے پہلے پہر سے رات کے بھیگنے تک چلتے۔ کبھی کبھی فجر کی اذان پر مشاعرہ کا اختتام ہوتا۔ خواتین کے لیے مشاعرہ گاہ میں پردہ کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ جوش، فیض، فراق، مجاز، جان نثار اختر، ساحر، کیفی، مجروح اور سردار، ان مشاعروں کے ایسے ہیرو ہوتے جن کے بغیر کسی مشاعرے کی کامیابی کا تصور محال تھا۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں ان شاعروں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے آزادی کے بعد کے بارودی دونوں میں رجعت پسندی اور فرقہ واریت کا مقابلہ قلم سے جس سطح پر کیا تھا اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔'' 191

مشاعروں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے لکھا ہے:

''مشاعروں اور عوامی جلسوں کا جہد آزادی کے زمانے میں بہت اہم رول تھا جس سے ترقی پسندوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا کہ نظریاتی اور احتجاجی شاعری کرنے والوں کا ایک اہم مقصد عوام کے بڑے سے بڑے حلقے تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ آزاد اور معریٰ نظم کی مقبولیت کو ان ہی مشاعروں اور جلسوں نے فروغ دیا۔'' 192

رئیس مرزا نے ایک نئے مشاعرے کی بنیاد ڈالنے کے سلسلہ میں سردار جعفری کی مساعی کا ذکر کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

''تقسیم ملک کے بعد انڈو پاک مشاعرہ بہت مقبول ہوا جس کا اہتمام دہلی کے تجارتی مرکز ڈی سی ایم کے تحت ہوتا تھا۔ اب سے دو سال پہلے ڈی سی ایم کے مالکان نے یہ مشاعرہ بند کر دیا۔ سردار بھائی خاص طور پر لالہ بھرت رام سے ملے کہ آپ اسے جاری رکھیں مگر وہ راضی نہ ہوئے چنانچہ اس کے بعد چند دوستوں کے اشتراک سے ایک نئے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام ''جشن بہار'' رکھا گیا۔ مشاعرہ محترمہ کامنا پرساد کی رہنمائی میں دوسرے سال بھی کامیابی سے پیش کیا گیا۔ اس

مشاعرہ کے شروع کرانے میں یا آپ کہہ سکتے ہیں اس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سردار جعفری کا بڑا ہاتھ ہے۔" 193

مشاعروں میں علی سردار جعفری کی آزاد اور معرٰی نظم کی قبولیت' سردار جعفری کا شعر پڑھنے کے انداز پر روشنی ڈالتے ہوئے صدیق الرحمٰن قدوائی رقمطراز ہیں:

"مشاعروں میں ان کی (سردار جعفری) آزاد نظمیں بھی عجیب جادو جگاتی تھیں۔ جس ماحول میں غزل کی غنائیت اور ایمائیت جگر جیسے خوش نوا کے مترنم میں ڈھل کر ہر طرف چھا جاتی تھی' اس میں سردار جعفری کا بلند بانگ' تحت اللفظ انداز نہ صرف مانوس ہو گیا بلکہ آزاد اور معرٰی نظم کو اگر قبول کر لیا گیا تو اس میں سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے شاعروں کا بڑا دخل تھا۔ اُردو کے ادبی کلچر میں یہ معمولی اضافہ نہیں تھا۔ غزل تو ہمیشہ ہی سے حاوی رہی تھی۔ پھر جوش کا تحت اللفظ بھی بہت مرعوب تھا مگر وہ پابند نظموں کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس ماحول میں آزاد اور معرٰی نظم کو اُردو کے خوش مذاق سامعین کے کانوں سے آشنا کرنا اور اس حد تک مقبول بنانا کہ وہ اس عہد کی مانوس آواز بن جائے' اُردو تہذیب میں ایک نئی جہت تھی جسے سردار جعفری اور ترقی پسند شاعروں کی بدولت ہمیشہ کے لیے ایک جگہ مل گئی۔" 194

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کانفرنسوں اور سمیناروں کی کامیابی کا راز بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"کانفرنسوں اور سمیناروں کی کامیابی یہی ہے کہ اس میں اچھے اور نامور مندوبین شامل ہوں' اس کا انتظام اچھا ہو' سامعین کی تعداد اچھی ہو اور جو مقالے پڑھے جائیں وہ سامعین کو انگیز کریں' جو کمیاں کسی ادبی تحریک میں آجاتی ہیں ان کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ کچھ اچھی تنقید بھی ہو۔ ان کے علاوہ کانفرنسوں اور سمیناروں کا اور ماحصل کیا ہوتا ہے؟ کسی طرز فکر یا نظام فکر کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش ہوتی ہے۔" 195

سردار جعفری کا شعری سفر نصف صدی پر محیط ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انہوں نے اپنا پہلا مشاعرہ انا وہ میں 1933ء میں پڑھا تھا۔ 196

پروفیسر وارث کرمانی نے سردار جعفری کے شعر پڑھنے کے انداز کے بارے میں لکھا ہے:

"سردار جعفری کے بارے میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ کاغذ پر جب ان کی نظم پڑھی جاتی ہے تو اس کا قاری پر وہ اثر نہیں پڑتا جو کسی مشاعرے میں ان کے پڑھنے سے قائم ہوتا ہے۔ سننے اور پڑھنے کا یہ فرق دوسرے مشاعروں کے کلام میں کم محسوس ہوتا ہے۔ ان کی اپیل غائبانہ طور سے بھی کاغذ پر 75 فیصدی کے قریب باقی رہتی ہے بلکہ فیض کی اپیل پڑھنے کے مقابلے پر کاغذ پر زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں فیض خراب طرح سے شعر پڑھتے تھے۔ سردار کی شاعری کے سننے اور پڑھنے میں جو فرق محسوس ہوتا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے منصوبہ بند شاعری کی ہے۔ جس میں جذباتی عمل کے بجائے طے شدہ مطالب کو قادر الکلامی کے ساتھ منظوم کیا جاتا ہے۔ جذباتی عمل میں عام طور سے عشق ضرور شامل ہوتا ہے سردار جعفری کی شاعری میں اس عنصر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ انہوں نے حسن و عشق والے روایتی مضامین کیوں نہیں باندھے۔ نظم میں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہوتی لیکن اُردو شاعری بلکہ پوری فارسی روایت میں عشق ایک زیر زمین دریا کی طرح مرزعہ شاعری کو سرسبز و شاداب کرتا رہا ہے' یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں نے بھی اپنی تشنگی اس

زیر زمین دریا سے بجھائی ہے اور اپنی منظومات کو سیراب کیا ہے۔" 197

پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

"مشاعروں میں بھی سردار نے اکثر اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ان کے لہجے میں ایک منفرد قسم کی دلکشی تھی جو مصرعے او راشعار تو کیا نثر کے جملوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی۔" 198

علی سردار جعفری نے اندرون ملک اور بیرون ملک کئی مشاعروں' سمیناروں کانفرنسوں اور ادبی نشستوں میں شرکت کی ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں:

1938ء میں الہ آباد میں یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ ہوا۔سبط حسن نے لکھا ہے:

"سردار جعفری نے اپنی نظم بغاوت بڑے گھن گھرج سے پڑھی۔ان دنوں وہ شعر ترنم سے پڑھتے تھے۔ترنم کیا لٹھ گھماتے تھے۔مگر ان کی پاٹ دار آواز سے ہال کے در و دیوار لرز رہے تھے۔نظم طلباء کی ذہنی کیفیت کے عین مطابق تھی لہٰذا شاعر کو ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی تھی۔" 199

اُردو ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک صوبائی کانفرنس اپریل 1949ء میں الہ آباد میں منعقد ہوئی۔کانفرنس کے اختتام پر مشاعرہ ہوا۔سردار جعفری نے اپنی تازہ ترین تحت اللفظ میں اپنی تازہ نظم "نئی دنیا کو سلام" کے چند حصوں کو پیش کیا۔ حاضرین نے دلچسپی سے سنا اور اس سے متاثر بھی ہوئے۔بقول سجاد ظہیر "ہر چند منٹ کے بعد کسی زوردار بند یا خوبصورت مصرعے کے خاتمے پر زوردار تالیاں بجتیں۔۔۔جب جعفری ختم کر کے بیٹھے تو جتنی تحسین و آفرین انھیں نصیب ہوئی کسی دوسرے ہندی کوی کو اس سمیلن میں اتنی نہیں ہوئی۔" 200

1950-51ء الہ آباد میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس اور مشاعرہ کے بارے میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے لکھا ہے:

1۔"مشاعرہ الہ آباد کے ایک محلّہ ساوتھ ملا کا کے سنگیت سمیتی ہال میں منعقد ہوا شاید اکتوبر کی آخری تاریخیں تھیں یا نومبر کا پہلا ہفتہ۔۔۔سردار جعفری نے "یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہ حیات" شروع کی۔قیامت کا اثر اس نظم کا ہوا۔پھر نظم ختم کرتے ہی سردار نے دوسری نظم شروع کر دی۔وہی "املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے" والی نظم۔شاید ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب (صدر مشاعرہ) کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ بغیر صدر کی اجازت کے سردار نے دوسری نظم کیوں شروع کر دی۔انہوں نے آہستہ سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔سردار جعفری صاحب اپنی نظم نامکمل چھوڑ کر غصے میں اسٹیج سے اُٹھ گئے اور جا کر ایک کونے میں خاموش کھڑے ہو گئے۔سارا مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔وہ ہنگامہ ہوا کہ لوگ اسٹیج تک چڑھ آئے کہ سردار جعفری کو کیوں پڑھنے سے روکا گیا۔انھیں فوراً بلایا جائے۔خیر اعجاز صاحب وامق اور مسعود اختر جمال وغیرہ کسی طرح سردار جعفری کو منا کر لے آئے اور مشاعرہ پھر سے شروع ہوا اور اپنی بلندیوں کو پہنچا۔"

2۔"تقریباً ایک سال بعد الہ آباد یونیورسٹی کے یونین ہال میں جب سالانہ مشاعرہ ہوا تو پھر سردار جعفری کو طلباء نے دعوت دی سردار جعفری کی باری آئی۔لوگوں نے "شاہراہ حیات" کی آواز لگائی مگر جعفری صاحب نے "ایشیا جاگ اُٹھا" میں

سے اشعار سنانے شروع کیے جو اس وقت ان کا تقریباً تازہ کلام تھا۔۔۔مشاعرہ میں ہر طرف سے واہ واہ کے تقریباً نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے۔۔۔۔فراق صاحب نے زوروں کی ہانک لگائی۔''ارے بھائی عزیز کہاں ہو مجھے گھر تک پہنچاؤ (عزیز انصاری مرزا پور کا رہنے والا ان کا ایک طالب علم تھا)۔۔۔شاعروں کو پڑھنے نہ دینا اور مشاعرہ چھوڑ کر چلے جانا کیا آپ کے مشاعرے کی تہذیب ہے؟ایک ہڑبونگ کی صورت پیدا ہو گئی۔جعفری صاحب شعر پڑھنا چھوڑ کر آگے بڑھے اور فراق صاحب کی مدد کر کے انھیں بلند اسٹیج سے نیچے اُتارا،واپس آ کر پھر مشاعرہ شروع کرایا۔سب شعری اور ادبی سنجیدگی غت ربود ہو چکی تھی بلکہ ''غدر بود'' ہو گئی۔جعفری صاحب کے علاوہ کوئی اور شاعر ہوتا تو مشاعرہ کیا دوبارہ جمتا؟اسی وقت سامعین میں سے آواز آئی۔۔۔''شاہراہ حیات'' سنائیں اور جعفری صاحب نے نظم ''یہ آدمی کی گزرگاہ شاہرہ حیات'' شروع کی اور پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک انہیں جو جو یاد آتا گیا وہ سناتے گئے۔یہ 1952-53ء کی بات ہے۔الہ آباد میں جعفری صاحب کا یہ سب سے اچھا مشاعرہ تھا جو تین بجے رات تک چلتا رہا۔۔۔

3۔آخری بار جعفری صاحب اپنے 80 سالہ جشن کے سلسلے میں الہ آباد 1994ء میں آئے۔یہ جشن انجمن ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے منایا گیا تھا۔۔۔وزیر ارجن سنگھ صاحب نے جعفری صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ہندی،اُردو اور الہ آباد یونیورسٹی کے تقریباً تمام دانشوروں نے اس میں شرکت کی۔'' 201

23 دسمبر 1938ء کو انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کا انعقاد کلکتہ میں ہوا۔اس کانفرنس میں سردار جعفری نے نظمیں پڑھیں۔

شاہراہ،دہلی،جون 1952ء میں کلکتہ میں 2 تا 6 اپریل 1952ء کو منعقدہ کانفرنس کا ذکر۔پرکاش پنڈت نے ''کہت کبیر سنو بھی سادھو'' کے عنوان سے لکھے رپورتاژ میں کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اپنی کرسی سے بار بار اُٹھ کر لوگوں کے رہنماؤں کو اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دے رہا ہے۔یہ سردار جعفری ہے۔وہی سردار جعفری جس کی شاعری میں اقبال کا خطیبانہ رنگ ہے اور مائیکا فسکی کی گھن گرج اور پبلو نرودا کی تشبیہات ہیں اور غالب کی غزلوں کا لوچ۔۔۔اسی اجلاس (صبح) میں سردار جعفری نے امن اور کلچرل کے تعلق پر ایک نہایت پر مغز پیپر پڑھا۔پیپر کے آغاز ہی میں جب اس نے کہا کہ ''امن'' بظاہر ایک معمولی سا لفظ ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اکثر ایک معمولی سا لفظ اس قدر اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے احاطہ میں آجاتی ہے تو سارا مجمع تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھا۔۔۔مشاعرہ میں سردار جعفری،کیفی اعظمی،مجاز،مجروح۔۔۔نے حصہ لیا۔مشاعرہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ سردار جعفری نے سامعین سے ان شاعروں کے لیے چندہ کی اپیل کی جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے تھے اور اب اپنے اپنے کلام سے انھیں محفوظ کر رہے تھے۔سردار نے کہا کہ اُسے معلوم ہے کہ ان شاعروں میں سے کون کون شاعر کس کس طرح سے صرف ایک طرف کا کرایہ لے کر یہاں پہنچا ہے اور اب ان کے لیے یہاں سے واپسی کا سوال بنا ہوا ہے۔شاعر اپنی اپنی جھولیاں پھیلا کر سامعین کے پاس آئیں گے اور سامعین کا فرض ہے کہ جس طرح وہ ان کے کلام سے محظوظ ہو رہے ہیں اُسی طرح وہ اپنی توفیق کے مطابق انھیں بھی محفوظ کریں۔سردار ابھی یہ سب کہہ ہی رہا تھا کہ ایک

نکڑ سے ایک شخص نے ڈائس کے قریب آکر اطلاع دی کہ ایک سیٹھ صاحب اس سلسلہ میں ایک ہزار روپیہ دینا چاہتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ شاعر اس طرح جھولیاں پھیلا کر لوگوں کے پاس نہ آئیں ۔تالیوں کی گونج میں سردار نے سیٹھ صاحب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔۔۔سیٹھ صاحب اس بات پر افسوس کرنے لگے کہ کیا آج ہمارے کوی ہم سے بھیک مانگیں گے؟انہوں نے کہا کہ وہ کوی کے استھان کو خوب پہنچانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کوی کی سندر کویتا جیون میں رنگ روپ بھرتی ہے۔کم از کم وہ اپنے سامنے مانوتا کے ان مہان کایوں کوئی اس طرح جھولی پھیلائے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ۔ہزار کی بجائے پانچ ہزار ان کی بھینٹ کرتے ہیں لیکن ان کی پرارتھنا ہے کہ کوئی اسی طرح بیٹھے رہیں اور اپنی کویتائیں سناتے رہیں اور تالیاں پھر بج اُٹھیں اور مشاعرہ پھر شروع ہوگیا۔کوئی اپنی سندر کویتائیں سنانے لگے اور رات کے گیارہ بجے اس مارواڑی سیٹھ جس نے لوگوں کے دلوں میں نیشنل بورژواژی کی اہمیت کا احساس تازہ کر دیا تھا' نہ جانے کہاں سے نقد پانچ ہزار روپیہ سردار کے سامنے ڈھیر کر دیا ۔۔۔رات آدھی ڈھل چکی ہے۔مجمع اسی طرح جما ہوا ہے۔۔۔لیکن اسٹیج پر اب سردار جعفری تن کر کھڑا ہو گیا ہے۔اس کی ٹائی اڑ اڑ کر اس کی گردن سے لپٹ رہی ہے اور وہ دانت پیس کر اور اپنے ایک ہاتھ سے بالوں کو سہلاتا ہوا آواز دیتا ہے۔

ناگہاں شور ہوا

لو شب تار غلامی کی سحر آپہنچی

مجروح کے بعد سردار اپنی نظم اسٹالن سناتا ہے۔

کانفرنس کا جو اعلان نامہ مرتب کیا گیا اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہمیں اپنے ملک کی ان صحت مند روایات کو اپنا اور آگے بڑھانا ہے جن کے ذریعے ہم نے ہمیشہ صداقت کو حاصل کیا ہے اور صداقت کی جستجو کرتے رہے ہیں۔۔۔ایک لاکھ حاضرین کے اجلاس میں۔۔۔بنگالی ادیب کے مشہور و معروف ادیب گوپال ہلدر نے بنگالی زبان میں کانفرنس کی پانچ روزہ کاروائی کی رپورٹ پیش کی۔'' 202

''بقول سردار جعفری 1941ء میں لکھنو ریڈیو نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جو سارے ہندوستان میں بڑے ذوق و شوق سے سنا گیا۔اس کا نام تھا ''نووارد شعراء کا مشاعرہ'' جوش نے صدارت کی لیکن کلام نہیں سنایا فیض' مخدوم' مجاز' جذبی اور جان نثار اختر نے میرے ساتھ اس مشاعرے میں شرکت کی۔ن۔م راشد کسی وجہ سے نہیں آسکے۔یہ نئی ترقی پسند اُردو شاعری کے ساتھ سیارے تھے جن کی تابناک گردش کا نغمہ آج بھی گونج رہا ہے۔'' 203

دسمبر 1947ء میں لکھنو میں ترقی پسند مصنّفین کی ایک کانفرنس ہوئی اور ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت اثر لکھنوی نے کی تھی۔پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے مشاعرہ میں اپنی نئی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔لکھنو کے بیشتر لوگ آزاد نظم کے قائل نہیں تھے۔مشاعروں میں غزل کی گرم بازاری تھی اور نظم بھی چل جاتی تھی لیکن آزاد نظم لکھنو کے اس حلقہ کے لیے جو مشاعروں کا عادی تھا' گلے سے اُترنے والی چیز نہیں تھی۔بہر حال جگر کی غزل کی تو بڑی تعریف ہوئی تھی اور وہ حاصلِ مشاعرہ قرار پائی تھی لیکن سردار جعفری ہوٹ ہو گئے تھے۔'' 204

وارث کرمانی نے 1948 ئمیں لکھنو میں منعقدہ مشاعرہ کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''علی سردار جعفری صاحب کو میں نے 1948ء کے مشاعرے میں پہلے پہل دیکھا تھا۔اس زمانے میں ترقی پسند ادب کا زور تھا اور ہمارے ملک کے بہت سے پر جوش شاعر اور سامعین اس مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنو میں جمع ہوئے تھے۔اس موقع پر سردار جعفری نے اپنی ایک طویل نظم سنائی تھی جس پر مشاعرے میں مسلسل ہوٹنگ ہوتی رہی۔ان کے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر شعرا انھیں اسی ترقی پسندانہ نظم کو ختم کرنے کا بار بار مشورہ دیتے رہے لیکن سردار نے ہوٹنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پوری نظم سنا کر ہی اُٹھے لیکن اُٹھتے وقت بھی انہوں نے سامعین سے یہ جملہ کہا تھا''میں نے یہ نظم زبردستی آپ کو اس لیے سنائی ہے تا کہ آپ لوگوں کے ذوق کی تربیت ہو۔'' 205

لکھنو میں آخر فروری 1990ء میں فراق پر سمینار ہوا جس کے پانچویں سشن میں سردار جعفری نے بحیثیت صدر،مقرر، مبصر،مفسر اور شارح حصہ لیا۔

اکتوبر 1954ء میں حیدر آباد میں کل ہند ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس ہوئی۔ہندوستان کے گوشے گوشے سے ادیب و شاعر اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔اس میں سردار جعفری نے تقریر کی۔یہ کانفرنس ترقی پسند تحریک کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے کئی معرکتہ الاراا جلاس ہوئے۔اس کانفرنس سے ترقی پسند ادیبوں کا رشتہ عوام کے ساتھ زیادہ مضبوط ہوا اور بڑے شہروں اور قصبوں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔کرشن چندر نے کانفرنس کا رپورتاژ''پودے'' لکھا۔

1947ء میں حیدر آباد میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔

''رام لعل کے شب و روز 1993ء سے''ادبی ڈائری کے اوراق مرتبہ ھما جمال رضوی شائع شدہ 1996ء میں سردار جعفری کے حیدر آباد کے سفر کا ذکر ملتا ہے۔اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

''4 ستمبر جیلانی بانو نے اپنے گھر پر مجھ سے ملانے کے لیے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرلیا۔۔۔سردار جعفری، مخدوم محی الدین، حیرت بدایونی، عادل، آمنہ ابوالحسن، اختر حسین سلیمان اریب، صفیہ اریب، اکرام جاوید، مجتبیٰ حسین۔۔۔سرینواس لاہوٹی۔۔۔وغیرہ تین درجن کے قریب!''

یکم اپریل۔۔۔''سردار جعفری کے سامنے کسی کا جمنا مشکل ہو رہا ہے۔۔۔بیس سال سے شعر کہنے والا تو بھی نیا ہو سکتا ہے۔نئے سے مراد بیس سال کی عمر ہرگز نہیں ہے کوئی کوئی بیس سال کا ادیب بھی بوڑھا ہو سکتا ہے۔مغرب میں پچاس سال کی عمر سے زیادہ کے بعض ادیب ابھی تک نئے ہیں۔نیا ہونے کا تعلق ذہن سے ہے،سوچنے کے طریقے سے ہے۔لب ولہجہ اور اظہار سے ہے۔''

2 مارچ۔۔۔محمد حسن کے ساتھ ان کے تازہ مضمون''جدیدیت۔نئی ترقی پسندی''پر باتیں ہوئیں۔۔۔نئے ترقی پسند ذہنوں کو نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے دعوت دیتا ہے۔کسی نئے رجحان کو سیاسی عینک لگا کر دیکھنا غلط ہوتا ہے۔سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے اس سلسلے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ قابل تعریف نہیں۔اورنگ آباد میں گزشتہ دسمبر میں بیدی اور مخدوم محی الدین کے ساتھ کافی تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔وہ بھی سردار جعفری کے اس رویہ کے خلاف تھے کہ کسی نئے رجحان کو ٹھیک طرح

سے سمجھے بوجھے بغیر ہی اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جائے! بعض جدیدیت کے حامی نئے لوگ بھی یقیناً کھلے ہوئے انٹی پروگریسیو ہیں۔ یہ تو ان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن سارے کے سارے نئے ادیب و شاعر انٹی پروگریسیو کہاں ہیں۔ سجاد ظہیر یا سردار جعفری کا مخالف ہونا انٹی پروگریسیو کیسے ہو سکتا ہے۔ بعض باتوں میں، میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن وہ مجھے انٹی پروگریسیو کیوں نہیں سمجھتے۔ ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسے ابھی تک کسی نے بھی کنڈم نہیں کیا۔ اسے ادب کے طور پر سب نے قبول کیا ہے۔ ہم ادب کو خالص ادب ہی سمجھتے ہیں۔ ہم سے میری مراد میرے ہم عمر ادیب ہیں جو گزشتہ دس پندرہ سال سے میرے آگے پیچھے یا میرے ساتھ لکھ رہے ہیں لیکن مجھے ان کی طرف سے بولنے کا حق ہی کیا ہے؟

17 مارچ: دہلی میں ترقی پسند تحریک کے تیس سالہ جشن میں ایک پیپر پڑھا جس میں تحریک کے روشن پہلوؤں کے علاوہ بعض ادیبوں کی تیس سالہ تہذیبی فسطائیت (Cultural Dictatorship) کا بھی ذکر تھا۔ خواجہ احمد عباس نے وہاں تو پیپر کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن بمبئی جا کر میرے خلاف بلٹز میں پورا آخری صفحہ صرف کر ڈالا۔ اس کے بعد وہی مضمون افکار میں بھی شائع کرایا۔ ایک ملاقات میں سردار جعفری نے مجھ سے کہا۔ میں نے عباس سے کہا ہے اپنے سے چھوٹوں کے خلاف نہیں لکھنا چاہیے۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کیوں؟ کیا اس سے بڑوں کا قد چھوٹا ہو جاتا ہے؟ یا چھوٹوں کا قد بڑھ جاتا ہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکرا کر رہ گئے۔ اپنی تحریک پر دیانت داری سے تنقید کرنے سے ہی میرا اعتماد مضبوط بھی ہوا ہے''۔

''یکم فروری 1973ء میں جس ترقی پسند گروپ میں شامل تھا اس میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، سید احتشام حسین، معین احسن جذبی، ڈاکٹر علیم، مجاز وغیرہ'' (شامل تھے)۔

13 ستمبر 1973ء: شام چار بجے کارلٹن ہوٹل میں ۔۔۔۔ بیدی کے علاوہ سردار جعفری، جاں نثار اختر، پنڈت آنند نرائن ملا، حسرت جے پوری، ایس این سنہا، بشن کپور، سمبل پور وغیرہ کو ملا کر تیس کے قریب مہمان تھے۔ رات کو ایوارڈ فنکشن اور مشاعرہ تھا سردار جعفری نے چند روز پہلے کے ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک سمینار کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا یہ سب سی آئی اے کی سازش بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا وہ بھی ترقی پسند تحریک کے غیر ملکی ہونے کا الزام لگائیں گے۔ انہوں نے اور علی جواد زیدی دونوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کا خاصا ذکر کیا جو پی ڈبلیو اے کے سخت مخالف ہیں۔ بیدی نے تحریک کو بہت مفید ثابت کیا لیکن اسے سیاسی بھی قرار دیا۔''

206

10 مارچ سے 12 مارچ 1995ء کو حیدر آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی ۔۔۔۔ راج بہادر گوڑ مشاعرہ کمیٹی کے صدر تھے۔ مشاعرہ کی صدارت کمال احمد صدیقی نے کی۔ سردار جعفری نے بھی اشعار سنائے۔ اُردو ہال میں کل ہند انجمن ترقی مصنفین کا سمینار ہوا۔۔۔۔

''سردار جعفری نے کہا سمینار میں سوالات اُٹھنے ہی چاہئے۔ ضروری نہیں کہ ان کے تسلی بخش جوابات بھی ملیں۔ جوابات تو مختلف ہوا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے وضاحت طلب کی کہ اس کانفرنس کو سلور جوبلی کانفرنس کہا جا رہا ہے اور حیدر آباد کی 1945ء کی کانفرنس کو پہلی کانفرنس کی۔ یہ کس طرح؟ عارف نقوی نے کہا سردار جعفری ایک عہد، ایک تاریخ اپنے سینے میں لیے

اس عمر میں بھی ہر جگہ اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔اُردو ہال میں مندوبین کا جلسہ ہوا۔سردار جعفری نے مختصراً باتیں سنیں تو بڑی وضاحت سے بولے" دیکھئے ترقی پسند وہ ہے جو مارکسسٹ ہے۔یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے اور اب یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے"۔ اس کا دائرہ پھیلنا چاہیے۔یہ انجمن قوس قزح کی طرح ہے۔" 207

رفعت سروش نے لکھا:

"1946ء کے موسم سرما میں رائے پور میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔وہاں کے مشہور نوجوان شاعر حامد عزیز مدنی نے دعوت نامہ بھیجا اور سردار جعفری نے پروگرام ترتیب دیا۔بمبئی سے ادیبوں اور شاعروں کا جو مختصر قافلہ روانہ ہوا۔اس میں سردار جعفری، قدوس صہبائی، ساحر لدھیانوی، ظ۔انصاری اور راقم الحروف شامل تھے۔رائے پور اسٹیشن پر حامد عزیز مدنی نے ہمارا استقبال کیا اور ساتھ ہی یہ خبر سنائی کہ آپ سب لوگوں کے قیام کا انتظام میرے غریب خانے پر ہے اور باقی لوگ جو حیدر آباد سے آئے ہیں اور ساغر نظامی اور ان کی بیگم، ڈپٹی کمشنر زیدی صاحب کے مہمان ہیں۔وہ بے حد پریشان تھے۔کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے زیدی صاحب نے اپنے گھر ٹھہرانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔سردار جعفری نے مدنی کو دلاسا دیا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ہم تمہارے یہاں اپنے گھر کی طرح رہیں گے اور مدنی ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ایک سادہ سا مکان تھا جہاں ہم لوگوں نے بڑی اپنائیت محسوس کی اور ڈپٹی کمشنر کی "جی ہاں" "جی جناب" اور مصنوعی طمطراق سے بچے"۔ 208

1946ء میں احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی اس میں سردار جعفری نے اقبال کی شاعری پر تقریر کی۔

سردار جعفری نے راہی معصوم رضا کو 18 اپریل 1990ء کو انٹرویو دیتے ہوئے دلی کے ایک مشاعرہ کے بارے میں بتایا:

1۔"1954ء میں دلی میں جامع مسجد کے اُردو بازار میں ایک دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔۔۔کسی نے مجھ سے کہا کہ اینگلو عربک کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ بھی چلئے۔میں نے کہا "میرا پرانا کالج ہے میرے پاس دعوت تو نہیں ہے۔چلو چلتے ہیں ۔۔صدارت خواجہ غلام السدین کر رہے ہیں اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ سامعین میں ہیں۔۔۔میں نے وہاں "پتھر کی دیوار" سنائی بہت مقبول ہوئی اور ڈاکٹر عابد حسین نے یہ کہا کہ ترقی پسند شاعری جوان ہو گئی ہے۔۔۔

2۔اسی کالج میں دس بارہ دن کے بعد ایک اور مشاعرہ ہوا اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی اور مخدوم محی الدین بھی تھے۔وہاں میں نے یہ نظم پھر سنائی۔مولانا آزاد کا ذوق بڑا کلاسیکی تھا۔انہوں نے مشاعرے کے بعد مجھ سے اور مخدوم سے کہا کہ آپ مجھ سے ملنے آیئے۔وقت فوراً دے دیا۔ہم اُن کے دفتر میں ان سے ملنے آ گئے۔۔۔انہوں نے بلایا تو شعر سننے کے لیے ہی تھا۔" 209

انجمن عروج ادب دلّی کی ایک اہم ثقافتی تنظیم ہے۔یہ انجمن 1958ء میں قائم ہوئی۔"گل دستہ" مرتبہ ایس کے بھٹناگر میں انجمن کے اُردو مشاعروں کا ذکر ملتا ہے جس میں سردار جعفری نے شرکت کی تھی۔چند اقتباسات دیکھئے۔

"انجمن نے آبادی کے مختلف الخیال اور مختلف المزاج گروہوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور باہمی میل ملاپ کو بڑھاوا دینے والی دوسری کلچرل سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک سالانہ اُردو مشاعرے کے انعقاد کا سلسلہ بھی شروع کیا۔۔انجمن

کا یہ سالانہ مشاعرہ ہر برس 15 اگست کو۔۔۔شان وشکوہ سے منعقد ہوتا ہے۔۔۔انجمن عروج ادب کی طرف سے مشاعرے کے موقع پر ایک سوونیر بھی شائع کیا جاتا ہے۔مشاعرے کے مصارف کی کفالت کا ذریعہ یہی سوونیر ہے لیکن یہ محض اشتہارات کا پلندہ نہیں ہوتا۔اس میں اہم شخصیتوں کے پیغامات کے علاوہ شاعروں کا کلام'تعارف اور تصویریں بھی شامل رہتی ہیں۔کلام اُردو اور ہندی دونوں رسم خط میں چھاپا جاتا ہے تا کہ اُردو شاعری کے وہ شائقین بھی جو اُردو رسم خط سے واقف نہیں ہیں اپنے محبوب شعرا کے کلام کے مطالعے سے محروم نہ رہیں۔۔۔۔زیر نظر جلد پانچ برس کے مشاعروں کا احاطہ کرتی ہے۔مزید پانچ برس کے مشاعروں کا کلام دوسری جلد میں پیش کیا جائے گا۔۔۔انجمن کے مشاعروں میں ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ان میں کلاسیکل روایت کے امین شاعر بھی ہیں'ترقی پسند بھی'جدید بھی کچھ ایسے شاعر بھی اس محفل میں شریک ملیں گے جن کی ادبی حیثیت مستحکم نہ سہی لیکن جو مشاعروں کے سامعین میں مقبول ہیں۔۔۔۔مشاعرہ 15 اگست 1973ء میں علی سردار جعفری نے شرکت کی اور نظم ''صندل و گلاب کی راکھ'' پیش کی اور مشاعرہ 16 اگست 1976ء کے مشاعرہ میں غزل پیش کی جس کا مطلع ہے ۔

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ

210

افتخار امام صدیقی نے لکھا ہے کہ انہوں نے علی سردار جعفری کے ساتھ متعدد سفر کیے تھے۔دہلی جمشید پور'دوبئی'دوحہ'قطر' ڈی سی ایم کا پہلا مشاعرہ جعفری صاحب کے ساتھ پڑھا تھا۔وہ رقمطراز ہیں:

''ایک بار ڈی سی ایم کے مشاعرے میں جعفری صاحب اپنی نظم سنا رہے تھے۔سامعین کا مزاج قدرے ہونگ والا تھا۔ جعفری صاحب نے تھوری سی مزاحمت کی اور کہا۔' 'میں چوں کہ ہوائی جہاز سے آیا ہوں اور اسی سے واپس جانا ہے۔خطیر معاوضہ لیا ہے لہٰذا مجھے اپنا کام کرنے دیجئے۔آپ اپنا کام کرتے رہیے۔میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔جعفری صاحب نے مکمل نظم سنائی اور تالیوں کی گونج میں واپس مسند پر آ بیٹھے۔''

211

علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

''جواہر لال نہرو سے اسی زمانے میں ملاقات ہوئی اور ملاقات کا یہ شرف آخری دن تک قائم رہا۔ان کے انتقال سے دو ماہ قبل تین مورتی ہاوس میں اندرا گاندھی نے ایک چھوٹا سا مشاعرہ پنڈت جی کی تقریح طبع کے لیے کیا تھا جس میں فراق'سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین شامل تھے۔میں نے اپنی نظم ''میرا سفر'فرمائش پر سنائی تھی۔''

212

دلی میں 17 اپریل 1976ء ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس غالب اکیڈمی میں منعقد ہوئی۔مجلس صدارت میں عصمت چغتائی'قرۃ العین حیدر'ڈاکٹر محمد عقیل'کیفی اعظمی اور سردار جعفری تھے۔۔۔۔ٹھیک پانچ بجے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ سمینار کا موضوع ہے ''ترقی پسند تنقید کے چالیس سال''اظہار اثر لکھتے ہیں:

''سردار جعفری بذات خود ترقی پسند ادب کی تاریخ ہیں۔۔بنے بھائی کی بے وقت موت کے بعد سردار جعفری ہی ایک ایسی

شخصیت رہ گئے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں کہے جاسکتے ہیں۔وہ دوٹوک بات کہنے کے عادی ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں ''اگر ادب کو عوام تک لے جانا ہے تو اس کی سطح دوسری ہوگی۔اس میں رمزی اور علامتی اظہار کا رنگ گہرا نہیں ہوسکتا ۔۔۔ساڑھے آٹھ بجے مندوبین سے درخواست کی گئی کہ کوئی تجویز پیش کرنا چاہیں تو مجلس صدارت کو پہنچا دیں۔۔سردار جعفری نے پہلی تجویز پڑھ کر سنائی جس میں فلسطین اور چلی کے مجاہدین جنگ آزادی اور ادیبوں کی تائید اور خراج عقیدت پیش کیا۔احمد جمال پاشا نے اسی وقت مائک پر آکر کہا کہ اس تجویز میں روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے نام بھی شامل کر لیے جائیں ان کی ترمیم فوراً سب نے منظور کر لی۔۔۔مشاعرہ کے اختتام پر سردار جعفری دوسرے دن بارہ بجے مجلس عاملہ کی میٹنگ کا اعلان کرتے ہیں۔''

213

علامہ اقبال کا صد سالہ جشن ولادت 1977ء میں دہلی میں منعقد کیا گیا۔جشن اقبال کا افتتاح نئی دہلی کے وگیان بھون میں 29 اکتوبر 1977ء کی رات کو ایک کل ہند مشاعرے کی شکل میں ہوا۔۔۔30 اکتوبر 1977ء کو وگیان بھون میں بین الاقوامی اقبال سمینار شروع ہوا۔علی سردار جعفری نے جنرل سکریٹری اور سمینار کے ناظم کی حیثیت سے ابتدائی تقریر کی۔''

10 تا 12 جنوری 1992ء کو دہلی اُردو اکاڈمی نے عصمت چغتائی کی یاد میں ایک سہ روزہ سمینار ''عصمت چغتائی اور نیا اُردو افسانہ'' کا اہتمام کیا۔علی سردار جعفری ان دنوں دہلی میں تھے بقول ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''محض عصمت کا نام سن کر وہ اس سمینار میں شرکت کرنے آگئے کہ تقریباً پچاس 50 سال کی رفاقت کا سلسلہ عصمت کے نام سے وابستہ تھا وہ اسے کیسے توڑ سکتے تھے۔۔۔سردار جعفری نے کہا۔۔۔گھروں میں بولی جانے والی بولیوں کی نقل کرنا مشکل کام ہے اور عصمت نے یہ مشکل کام کر دکھایا ہے۔انہوں نے گھریلو زبان کو تخلیقی اعجاز عطا کیا۔۔۔عصمت پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لکھتی ہیں بڑے مسائل پر ان کی نظر میں نہیں تھے۔جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں انھیں نہیں معلوم کہ زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہی بڑی بنتی ہے'' سردار جعفری قاضی عبدالستار کی تقریر سے خوش ہوئے۔بہت اچھی تقریر کی۔پتہ نہیں ٹیپ ہوئی یا نہیں۔اشتیاق عابدی سامنے سے گزرے۔جعفری صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ سمینار کی ساری روداد ٹیپ ہو رہی ہے یا نہیں۔۔۔کے کے کھلّر کا مضمون قریب الختم تھا۔سارے واقعات و دلائل کی روشنی میں انہوں نے نتیجہ نکالا ''عصمت اور منٹو دونوں ادب کے قفنُس تھے''میں نے (علی احمد فاطمی) سردار جعفری سے اس کے معنی پوچھے۔انہوں نے بتایا ''قفنس ایسا پرندہ ہے جو گاتا ہے اور اتنا اچھا گاتا ہے کہ اس میں جل جاتا ہے اور اس کے بعد زندہ ہوتا ہے''۔''بہت اچھی مثال دی'' سردار جعفری بھی خوش تھے اور مقالے کو پسند کر رہے تھے۔''

214

نگار عظیم نے ''ایک شام سردار جعفری کے نام'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''8 دسمبر 1998ء کو بزم ہمقلم جناب جوگندر پال کی صدارت میں بہت اہم شخصیتوں کے درمیان ایک شام علی سردار جعفری کے نام منانے کا فخر حاصل کر چکی ہے۔وہ یادگاری شام بزم ہمقلم کا انمول سرمایہ ہے۔کسی طرح میری (نگار عظیم) صرف ایک گزارش پر انہوں نے اپنی قیمتی شام ہمیں عنایت کی اور متعدد نظمیں ایک کے بعد ایک سامعین کی فرمائش پر وہ سناتے چلے گئے۔بے انتہا خوش تھے اور بزم ہمقلم کے کاموں کو نہ صرف سراہا بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔'' 215

سجاد ظہیر نے لکھا ہے ''انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بمبئی کے مارواڑی ودیالیہ (ہائی اسکول) میں ہوتی تھی۔ آخر میں ایک سنیما ہال میں ایک بڑا مشاعرہ کیا جس میں تقریباً دو ہزار کی حاضری تھی۔ ہم نے اس کی شرکت پر ٹکٹ لگایا تھا۔ اس لیے حاضری اتنی تھی ورنہ بمبئی میں ایسے مشاعروں میں جس میں جوش، ساغر، مجاز، سردار جعفری، کیفی اور مجروح وغیرہ شریک ہوں آٹھ دس ہزار کا مجمع کر لینا مشکل نہیں ہے۔ اس مشاعرہ سے ہمیں کافی آمدنی ہوئی اور کانفرنس کے اخراجات پورے کرنے میں اس سے سب سے زیادہ مدد ملی۔'' 216

بمبئی میں ترقی پسندوں کے پہلے جلسہ کے بارے میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

''ہمارے پہلے جلسے میں کوئی پچیس تیس آدمی موجود رہے ہوں گے۔ ان میں ''سردار جعفری بھی شامل تھے۔''

ممبئی کے اجلاسوں کے بارے میں علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

''جیسا کہ سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے کہا کہ بمبئی ان دنوں ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ بن گیا تھا 46ء اور 47ء کے زمانے میں جب کہ آزادی کی لہر جاری و ساری تھی انجمن ترقی مصنفین شاخ بمبئی کے ہفتہ وار اجلاس والکیشو روڈ واقع جیون ہاوس میں منعقد ہوتے تھے۔ ان میں جو گفتگو و بحثیں ہوتی تھی انھیں حمید اختر قلم بند کر کے ہفتہ وار اخبار نظام میں شائع کرتے تھے۔۔۔ 23 مارچ 47ء کی میٹنگ میں سردار نے کیفی کی شاعری پر کھلی بحث کی۔'' 217

بقول شوکت کیفی ''ہم دونوں (کیفی اور شوکت کیفی) مل کر پارٹی میٹنگوں میں شریک ہوتے جہاں کبھی سردار جعفری تقریر کرتے کبھی سجاد ظہیر'' 218

ترقی پسندوں کے بعض جلسوں میں ادبی چشمکیں بھی ہوئیں۔ رفعت سروش نے کوٹھاری مینشن میں۔۔۔ اس وقت دو نشستوں کا ذکر کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

ساحر اور کیفی اعظمی میں بہت پرانی دوستی تھی۔ اس قدر کہ حیدر آباد کانفرنس سے لوٹنے کے بعد ساحر نے بھی اپنی ایک نظم کیفی اعظمی کے نام منسوب کی تھی۔۔۔ ان دونوں دوستوں میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ کوئی ادبی مسئلہ نہ تھا بلکہ قطعاً ذاتی اور رومانی قسم کی بات تھی۔ مگر ایسا ہوا ہے کہ یار لوگوں نے ذاتی رنجشوں کو ادب کے اسٹیج پر لا کر زور آزمائی کی اور نتیجہ کے طور پر ادبی تحریک پر منفی اثر پڑا۔۔۔ سردار جعفری جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ کیفی اور ان کی بیگم بھی جلسے میں موجود تھے۔ ساحر نے ایک مضمون پڑھا جس میں کیفی کی شاعری کے معائب ہی اجاگر کیا گیا تھا اور ہر زاویے سے نقائص ہی نقائص تلاش کیے گئے تھے اور نفس مضمون یہ تھا کہ اول تو کیفی شاعر ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو گھٹیا درجے کا۔ ساحر معہ اپنے مخصوص احباب کے جلسے میں تشریف لائے تھے اس لیے اہل محفل نے مجموعی طور پر مضمون پر واہ واہ کی۔ کچھ بحث ہوئی مگر مجمع کا موڈ ہی کچھ اور تھا۔۔۔ صاحب صدر نے حسب معمول جوشیلی تقریر کی مگر وہ بھی ساحر کے مضمون کا طلسم پوری طرح نہ توڑ سکے سردار نے جب ادب لطیف اور سویرا کی ان تحریروں کا حوالہ دیا جس میں ساحر نے بحیثیت ایڈیٹر کے کیفی کی تعریف میں اپنا زور قلم صرف کیا تھا تو ساحر نے برجستہ کہا کہ وہ میرے کمرشل نوٹ تھے، ناقدانہ رائے نہیں تھی۔۔۔ کیفی جلسے کے آخر تک موجود رہے مگر انہوں نے ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں نہیں کہا۔۔۔ سردار جعفری بہت بھنائے اور انہوں نے پی ڈبلیو اے کی اگلی میٹنگ میں ایک جوابی

مضمون ساحرلدھیانوی کی شاعری کے بارے میں پڑھا۔اس میں بھی وہی یک رخاپن تھا۔سردار نے ساحر کی مشہور نظم ''تاج محل'' پر سخت تنقید کی اور کہا کہ اس نظم میں ہندوستان کے تہذیبی ورثے اور تاریخی عظمت کا مذاق اڑایا گیا ہے اور یہ رویہ نہایت رجعت پرستانہ ہے اور یہ نظم نہایت کم تر درجے کی ہے۔ساحر کی اور نظموں کی بھی اسی طرح درگت بنائی۔جب مضمون ختم ہوگیا تو ساحرلدھیانوی بہت اطمینان سے اپنی جگہ سے اُٹھے اور پورے قد کے ساتھ اُٹھ کر کہا ''اس مضمون سے آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ساحرلدھیانوی گھٹیا شاعر ہے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کیفی اعظمی اچھا شاعر ہے۔'' 219

سبط حسن نے 1261ھ کا یادگار مشاعرہ کے بارے میں لکھا ہے:

''بمبئی میں جنوری کے مہینہ میں بچے بھائی نے تجویز پیش کی کہ یوم غالب منایا جائے۔قاضی عبدالغفار اپنی اہلیہ کے ساتھ حیدرآباد سے بمبئی آئے۔اس موقع پر غالب کا جیسی سائز کا ایک مختصر سا انتخاب بھی شائع کیا گیا جو خوب فروخت ہوا۔۔۔''

''۔۔۔اس تقریب کا حاصل 1261ھ کا دوسرا یادگار مشاعرہ تھا جو لال قلعہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے روبرو منعقد ہوا تھا اور جس میں غالب، مومن اور دوسرے ممتاز شعراء نے شرکت کی تھی۔اس مشاعرے کو نہایت خوش اسلوبی سے اسٹیج کرنے کا سہرا سردار جعفری کے سر ہے۔انہوں نے محبوب اسٹوڈیو سے مغلیہ پوشاکیں فراہم کیں اور اداکار جمع کیے جن میں بعض شاعر اور بعض فلم اسٹار لیکن سب سے کٹھن کام ان نازک مزاجوں کو پرانے زمانے کے مشاعرے کے آداب سکھانا اور پرانے شاعروں کی شعرخوانی کا انداز ذہن نشین کروانا تھا۔۔۔ساغر نظامی نے غالب کا کردار ادا کیا تھا۔سردار جعفری خود چوب دار بنے تھے کیوں کہ شاعروں کا تعارف کروانا چوب دار کا فریضہ ہوتا تھا۔اُس وقت تک وہی سی آر کیمروں اور فلموں کا رواج نہیں ہوا تھا لہذا مشاعرے کی کوئی فلم نہ بن سکی۔'' 221

(سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شاعر، شخص اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 72۔23)

پروفیسر عبدالستار دلوی نے فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری کے اعزاز میں ممبئی میں منعقدہ تقاریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''فیض احمد فیض کے اعزاز میں ممبئی میں منعقدہ تقریب کی صدارت جعفری صاحب نے فرمائی''۔۔۔۔

1986ء میں شعبہ اُردو، ممبئی یونیورسٹی نے علی سردار جعفری کی اسّی ویں سالگرہ کے موقع پر تہنیتی جلسہ اور سمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں ملک کے نامور اسکالروں نے جعفری صاحب کی شخصیت، شاعری اور فن پر مقالات پیش کیے۔جناب محمد اسد اللہ صاحب نے سمینار میں شرکت کی غرض سے برلن (جرمنی) سے تشریف لائے تھے۔اس تہنیتی جلسہ اور سمینار کی صدارت مشہور عالم اور مورخ اور سابق وزیر حکومت مہاراشٹر اڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمائی تھی۔'' 221

27 نومبر 1993 کو شعبہ اُردو، ممبئی یونیورسٹی کی طرف سے ۸۰ ویں سالگرہ کے سلسلہ میں ایک تہنیتی جلسہ اور سمینار منعقد ہوا۔اس جلسہ کے بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

29 نومبر 1993ء کو شعبۂ اُردو، ممبئی یونیورسٹی کی طرف سے (80 ویں سالگرہ) کے سلسلہ میں تہنیتی جلسہ اور سمینار منعقد

ہوا۔اس جلسہ میں ڈاکٹرعلی احمد فاطمی نے لکھا:

''سردار جعفری صاحب کو دہلی سے بمبئی کل ہی آجانا تھا لیکن راستے میں کوئی حادثہ ہوجانے کی وجہ سے گاڑی غیر معینہ مدت کے لیے لیٹ ہے۔کسی وقت بھی آسکتی ہے اور کسی وقت بھی وہ یہاں آسکتے ہیں۔۔۔۔ساڑھے گیارہ بجے تک انتظار کرنے کے بعد طے پایا کہ پروگرام شروع کیا جائے۔۔۔علی جواد زیدی بتا رہے ہیں کہ ان کا اور سردار جعفری کا تقریباً ۵۰ سال کا ساتھ رہا ہے۔خلوت وجلوت کا ساتھ۔۔۔محمد اسداللہ نے کہا''گزشتہ ۴۰ چالیس برسوں میں نے سردار جعفری کے ساتھ بہت سفر کیے۔بین الاقوامی سطح کے سفر۔۔۔سردار کی دنیائے ادب پر اچھی نظر ہے وہ عالمی مسائل پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔مجھ پر انہوں نے بے پناہ اثر ڈالا ہے۔پروفیسر میر چندانی شاد(سندھی)۔۔۔جو اچھی خاصی اُردو بھی جانتے ہیں انہوں نے سندھی شاعری میں سردار جعفری کی مقبولیت کے بارے میں روشنی ڈالی۔پی۔اے سندی(کنڑ)صاحب نے کہا سردار جعفری صرف اُردو کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ ایک قومی شاعر ہیں اور شاعر قوم کے ہوا کرتے ہیں وہ سندھی' کنڑ' اُردو کی سرحدوں سے نکل کر ملک اور بیرون ملک اور تاریخ کے شاعر ہو جایا کرتے ہیں۔اے جے پروہت(مراٹھی)صاحب نے کہا کہ سردار جعفری کو صرف اُردو کا شاعر کہنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے اور ہمارے ساتھ بھی۔وہ ہمارے ملک کے شاعر ہیں' ہمارے شاعر ہیں۔سیاست عارضی ہوتی ہے اور فلسفہ دائمی۔سردار کی شاعری فلسفہ کا روپ اختیار کر چکی ہے۔کمیونزم سردار کے یہاں وسیع تناظر میں ہے۔انسان اور انسانیت کو سمجھنے کے لیے سردار نے پوری ہندوستانی تہذیب سے اپنے رشتے استوار کیے بلکہ اسے تخلیق کیا۔وہ ہندوستان کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے انسانی عظمتوں کا بار بار ذکر کیا۔۔۔تین بجے دوسرا اجلاس ہوا۔۔۔جلسہ گاہ میں ایک ہلکا سا شور' چہروں پر خوشی کے آثار دکھائی دیے۔۔۔پروفیسر دلوی صاحب تیزی سے باہر جاتے ہوئے نظر آئے۔معلوم ہوا سردار جعفری صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ابھی ابھی بمبئی پہنچے ہیں اور سیدھے اسٹیشن سے ہی چلے آرہے ہیں۔ہم سب کھڑے ہو گئے۔پورا ہال کھڑا ہو گیا۔۔تھوڑی دیر میں سردار جعفری داخل ہوئے پورے ہال نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اپنے مہمان خصوصی کا اپنے سردار جعفری' اُردو کا عظیم شاعر و مفکر کا پرجوش استقبال کیا۔۔۔''

''۔۔۔علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں کہا اُردو شاعری کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ وہ غزل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔۔۔بڑا شاعر کئی طرح کے تجربے کرتا ہے۔ضروری نہیں کہ اس کی تمام شاعری ایک طرح کی ہو۔۔۔کچھ لوگ نعرہ بازی کی شاعری کو بُری شاعری کہتے ہیں۔اقبال کا شکوہ کیا ہے نعرہ ہی تو ہے لیکن بڑی شاعری بھی ہے۔۔تقریر کی تعریف تو تھی ہی' اس طاقت اور جرات کی بھی جو اسّی سالہ فن کار میں تھی اتنے لمبے سفر کے بعد بغیر تھکے رُکے تقریباً ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ بولتا رہا۔ اس کے علم کی' اس کے حافظہ کی اس کی فراخ دلی کی' اس کے نظریاتی وسعت کی اور اس کی عظمت کی۔۔۔تالیاں بجاتے بجاتے سب کھڑے ہو گئے۔۔۔سردار خود بھی تالیاں بجاتے رہے۔۔۔''

222

مالیگاؤں کے دو لڑکوں نے ممبئی کی ایک کانفرنس کے موقع پر سجاد ظہیر سے ملاقات کی اور مالیگاؤں میں اُردو کی ادبی کانفرنس اور مشاعرہ کرنے کے لیے مدعو کیا۔سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''مالیگاؤں کو ممبئی سے جو شاعروں اور ادیبوں کا قافلہ گیا(مجاز' ساحر' سردار جعفری' کیفی اعظمی' سجاد ظہیر وغیرہ تھے)ان

میں ساغر نظامی بھی تھے ۔تیسرے درجہ کا سفر تو ساغر صاحب مسکرا کر برداشت کر گئے ۔۔۔۔دن دن کا سفر تھا اور بہت سے دوستوں کے ساتھ تھا لیکن مالیگاؤں میں ہم لوگ ایک ایسے کمرے میں ٹھہرائے گئے جو نیا بنا ہوا اور وسیع تو تھا لیکن جس کے بالکل چوکھٹا پر سے ایک کافی بدبودار نالہ گزرتا تھا۔سونے کے لیے پلنگ بھی نہیں تھے۔ہم میں سے اکثر ممبئی میں رہ کر زمین پر سونے کے عادی ہو گئے تھے۔ہمارے مالیگاؤں کے دوستوں کا خلوص اور محبت اور ہم سب کو حتی الامکان آرام پہنچانے کی کوشش اور سب سے بڑھ کر ان کی ترقی پسند ادب اور ترقی پسند خیالات کو مالیگاؤں میں مقبول بنانے اور پھیلانے کی خواہش ایسی تھی جس کا احساس کر کے چھوٹی چھوٹی جسمانی تکلیفوں کی طرف خیال بھی کرنا اتبذال اور چھچھورہ پن معلوم ہوتا تھا۔۔۔ہماری کانفرنس مالیگاؤں کے ایک سنیما ہال میں منعقد ہوئی تھی۔۔۔اپنے خیالات اور نظمیں ان کے سامنے پیش کر کے ذہنی اور روحانی قوت حاصل کی ۔۔۔۔مشاعروں میں تڑپ اور حرارت ان اچھی نظموں سے زیادہ پیدا ہوتی تھی جن میں شاعر ظلم کرنے والوں پر ضرب لگاتے تھے۔ریاکاریوں کی پول کھولتے تھے۔جمہوریت کی اصلی حالت کا موثر بیان کرتے تھے۔اتحاد،عمل اور جدوجہد کا پیام اور ایک ایسے زمانے کی بشارت دیتے تھے جس میں آزادی، خوشحالی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا۔اس خیال کی تصدیق صرف مالیگاؤں کے ایک ہی مشاعرہ سے نہیں بلکہ اور بہت سے مشاعروں او رادبی محفلوں میں ہمارے تجربہ سے ہوتی تھی ۔۔۔۔نوجوان ترقی پسند شعرا سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، ساحر وغیرہ بھی مدعو کیے جاتے تھے ۔۔۔چار پانچ ہزار آدمیوں کے بڑے مجمع میں ہمارے یہ شاعر اور ان کی سیاسی نظمیں اتنی مقبول ہوتی تھیں ۔۔۔حاضرین اصرار کرتے رہتے۔'' 223

رفیع احمد قدوائی میموریل ٹرسٹ بستی کے تحت 6 نومبر 1976ء کو ایک بڑا جلسہ بیس نکاتی پروگرام، سجاد ظہیر کی یاد اور پھر رات کو ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا قاضی جلیل عباسی نے اپنی کتاب ''کیا دن تھے'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

''مشاعرہ کا انعقاد اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا جس میں داخلہ ٹکٹ سے تھا۔بمبئی سے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، نوشاد، جانی واکر کے علاوہ نرگس دت اور شبانہ اعظمی نے بھی شرکت کی ۔۔۔علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی تو بہر کیف اپنے دوست ہیں۔ان پر میرا حق ہے۔اور انہوں نے میری دعوت کو بخوشی قبول کر لیا اور شبانہ اعظمی، شاہد بجنوری اور جانی واکر کو بستی آنے پر آمادہ کرنے کی ذمہ داری بھی لے لی۔یہ پورا قافلہ بمبئی سے ہی آیا۔۔۔مجمع کا یہ حال تھا کہ ایک ایک کرسی پر دو دو بیٹھے تھے اور کافی لوگ کنارے کھڑے تھے۔۔۔لوگوں نے حسن انتظام کی تعریف کی۔ٹکٹ کے فروخت پر البتہ قابو نہ پایا جا سکا اور کافی لوگ بلا ٹکٹ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔اس کے باوجود تمام اخراجات نکالنے کے بعد کوآپریٹیو بنک بستی میں رفیع احمد قدوائی میموریل ٹرسٹ بستی کے فنڈ میں بچت کے قریب ستر ہزار روپیہ جمع ہوئے۔اسی سے کئی کمرے بنوائے گئے اور اسکول کی توسیع ہوئی۔آج کل وہ جونیر ہائی اسکول سے ہائر سکنڈری اسکول ہو چکا ہے۔۔کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری کا نام اُردو دنیا میں اتنا مشہور ہے کہ مشاعرے میں ان کی شرکت کا اعلان مشاعرے کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔علی سردار جعفری کا جشن آج دوسرے ممالک میں منایا جاتا ہے۔بستی کا یہ اتنا بڑا جلسہ اور اتنا عظیم الشان مشاعرہ بستی میں اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔اسی لیے اس کو یادگار مشاعرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔نرگس دت ۔۔۔لکھنو سے بستی آرہی تھیں۔۔۔انہوں نے ۔۔۔ایک بہت چھوٹی چا

ے کی دوکان کے سامنے کار رکوادی۔۔۔کہا کہ زندگی میں ایسا موقع پہلی بار ملا ہے کہ لوگ مجھے جانتے نہیں ہیں اور میں جہاں چاہوں آزادی سے گھوم سکتی ہوں۔" 224

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے مدراس میں ان منعقدہ ادبی پروگراموں اور مشاعرہ کا ذکر کیا جن میں علی سردار جعفری نے شرکت کی تھی۔وہ رقمطراز ہیں:

1۔نیشنل بک ٹرسٹ کے "ادیبوں میں ملئے" پروگرام میں جو 3 تا 6 جنوری 1971ء کو مدراس میں منعقد ہوا تھا۔۔۔ 4 جنوری 1971ء کو شام میں بلال ہوٹل میں شعری نشست پر سردار جعفری نے شرکت کی لیکن جلد ہی اجازت چاہی۔بتایا گیا کہ شکایت قلب کے باعث وہ زیادہ وقت نہیں رہ سکے۔اس موقع پر ان کی اہلیہ محترمہ سلطانہ جعفری بھی ان کے ہمراہ تھیں۔۔۔ میں نے ایک مقالہ لکھا 'سردار جعفری کی شاعری' جس کو قبلہ اعجاز صدیقی صاحب نے شاعر کے سالنامہ 1972ء میں شائع کیا۔۔۔اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دہلی کے کسی سمینار میں "جعفری صاحب" نے بتایا کہ "افکار" کراچی والے سردار جعفری نمبر شائع کر رہے ہیں اور انہوں نے یہ مقالہ اس میں شامل کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔" 225

8 نومبر 1992ء کے سہ روزہ سمینار کے بارے میں پروفیسر آفاق احمد نے لکھا ہے:

"مجھے 8 نومبر 1992ء کا وہ سہ روزہ سمینار یاد ہے جس کا افتتاح کرتے ہوئے سردار جعفری نے اقبال کے خطبہ الہ آباد' جاوید نامے اور ذہن ہندی پر اپنی گل افشانی گفتار کے ذریعے ذہنوں پر تنے ہوئے کتنے ہی جالوں کو صاف کیا تھا۔انہوں نے واشگاف انداز میں اعلان کیا:

"ملک کے تنگ نظر عناصر نے اقبال کو ہندوستان سے خارج کر کے اقبال کا نہیں خود اپنا نقصان کیا ہے۔"

"اقبال تصور پاکستان کے خالق نہیں بلکہ ایک وسیع تر انسانیت اور عالمی رواداری کے علمبردار تھے۔ان کی فکر ٹیگور' بھارتیندو' گاندھی اور جواہر لال کی طرح وسیع پس منظر کی حامل تھی۔"

اس کے بعد سردار جعفری نے اقبال کے ذہن ہندی اور خطبہ الہ آباد پر "جاوید نامہ" کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے اس ضرورت پر زور دیا کہ اقبال کے ذہن ہندی کو جاوید نامہ کے مطالعہ کی روشنی میں سمجھا جائے۔" 226

پرفیسر آفاق احمد نے بھوپال میں سردار جعفری کے مشاعروں کے بارے میں لکھا ہے:

"سردار جعفری اتنی بار بھوپال آتے کہ اس کا شمار بھی مشکل ہے۔۔۔وہ 14 نومبر 1998ء کو اُردو اکاڈمی کی دعوت پر ایک ہندو پاک مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔۔۔اس جلسے میں اُردو مشاعرے کا گل سرسبد احمد فراز کی نظم "دوستی کا ہاتھ" اور سردار جعفری کی نظم "کون دشمن ہے؟" تھی۔اس جلسے میں ایٹمی اسلحہ کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا اور ہندوستان پاکستان کی دوستی کی قسمیں کھائی گئیں۔۔۔آخری بار سردار جعفری ملینیم کے آغاز میں قومی یکجہتی اور مخالف فرقہ وارانہ کانفرنس کے سلسلہ میں بھوپال تشریف لائے۔شریمتی سونیا گاندھی کے علاوہ ملک کے کئی اہم دانشور ادیب اس کانفرنس میں شریک تھے۔۔۔وہ ایک وہیل چیر پر راستہ طے کر رہے تھے۔۔۔بے حد کمزور نظر آرہے تھے۔اور پھر یہی کیفیت ہوٹل میں بھی پیش آئی۔افتتاحی جلسہ میں بھی وہ بہت کم بولے۔" 227

لاہور میں فیض کا جشن تھا۔ ہندوستان سے سردار جعفری اور مجروح اور کیفی جشن میں شرکت کے لیے لاہور گئے۔ علی سردار جعفری نے وہاں فرمائش پر اپنی نظم ''پتھر کی دیوار'' سنائی۔ 1985ء میں ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے لندن کا سفر کیا انہوں نے اپنی تصنیف 'لندن۔ او۔ لندن: ایک سیاحت نامہ ایک رپورتاژ میں وہاں کے سفر جس میں سردار جعفری نے بھی شرکت کی تھی کا ذکر کیا ہے۔

اقتباسات پیش خدمت ہیں:

''ہم اہلِ قلم جو ترقی پسند تحریک کا جشن زریں منانے کے لیے لندن میں جمع ہیں۔۔۔ہم سمجھتے ہیں کہ وفا پرستوں کے ہاتھوں اطلاع رسانی اور میڈیا کے وسائل کا بے جا اور گمراہ کن استعمال ادب کی نشو ونما کے منافی ہے۔۔۔کانفرنس کا افتتاحی اجلاس 3 اگست 1985ء کو گریٹر لندن کونسل (GLC) کے کاونٹی ہال میں ٹھیک دس بجے شروع ہوا۔۔۔مجلس صدارت میں سید سبط حسن، کرتار سنگھ دگل، علی سردار جعفری، مسز ایلیس فیض اور پروفیسر رالف رسل شامل تھے۔۔۔ہندوستان سے سید محمد عقیل۔۔مقررین میں علی سردار جعفری۔۔۔تھے۔ سردار جعفری صاحب نے ابتداء کی۔۔۔انہوں نے ترقی پسندی کے اثرات کا تمام فنون لطیفہ پر کیا اثر پڑتا رہا ہے، اسٹیج، سنیما، تہذیبی زندگی سب ترقی پسند ادب اور تحریک سے کس طرح متاثر ہورہے ہیں، ان تمام باتوں کا بہت دلچسپ جائزہ لیا۔۔۔چوتھا اجلاس مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ سات بجے شام شروع ہوا۔۔۔ صدارت علی سردار جعفری کے سپرد تھی۔ اس مشاعرہ کی خوبی یہ بھی تھی کہ یہ بین اللسانی مشاعرہ تھا۔ اس میں اُردو ہندی پنجابی اور انگریزی کے شعراء بھی شامل تھے۔۔۔مشاعرہ گیارہ بجے رات تک چلتا رہا۔۔۔ساتواں اجلاس۔۔۔ساڑھے تین بجے شروع ہوا۔۔۔علی سردار جعفری نے اس ضمن میں پچاس برس کے ترقی پسند ادبی ورثے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ادیبوں کو فرقہ پرستی کے خندقوں سے ہشیار رہنا چاہیے کہ آج جنگ کے ساتھ فرقہ پرستی اور احیائیت کی طاقتیں بھی اپنے اثرات بڑھانے میں کوشاں ہیں اور یہ انسانیت کو بانٹ دینے کا دوسرا طریقہ ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے ایسی صورتوں سے لڑنے کے لئے ماضی میں بھی کوششیں کی ہیں اور آج بھی انھیں اسی طرح کی کوششیں کرنی چاہیے۔ اسی کے ساتھ انھیں اپنی فلسفیانہ اور نظریاتی بنیادوں کو بھی تلاش کرنا چاہئے۔'' 228

(تاجکستان) اس میں منعقدہ کانفرنس کی روائداد حکیم محمد سعید نے ماہ و روز: روزنامہ سفرِ روس کتاب میں پیش کیا جسے ہمدرد اکیڈیمی پاکستان اپریل 1980ء میں شائع کیا۔

اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ہندوستان کے تین مندوبین شرکت کے لئے آئے تھے۔ جناب ڈاکٹر جعفری صاحب اور ان کی اہلیہ سلطانہ جعفری اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ۔۔۔سردار جعفری صاحب کو انگریزی مترجم ملی جو ماسکو سے ساتھ آئی تھیں۔ تاجکستان بڑا علم نواز خطہ ایشیاء ہے۔ اہلِ علم شب و روز فروغ علم کے لئے مصروف عمل رہتے ہیں۔ تین بجے سہ پہر عینی ہال میں جلسہ افتتاحیہ برپا ہوا۔ اس میں تمام قائدین حکومت و شہر نے شرکت کی دس بجے ہم کانفرنس ہال میں پہنچ گئے۔۔۔تیسرا مقالہ ہندوستان کے جناب علی سردار جعفری صاحب کا تھا۔ انہوں نے اپنا مقالہ دوشنبہ آکر ہی لکھا۔ درحقیقت یہ عینی (صدرالدین عینی) اور حکومت

کے لیے کلمات خیر تھے جن کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا۔ان کی زبان بہت پاکیزہ ہے۔ان کے خیالات ایک پختہ ادب کے ترجمان ہیں۔روس میں ان کا مقام متعین ہے۔ان کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ان کا مقام وہ ہے جو فیض احمد فیض کا پاکستان میں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ فیض صاحب کی روس میں قدر ومنزلت زیادہ ہے وہ لینن پرائزونر بھی ہیں کہ جو روس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔علی سردار جعفری صاحب کے بعد اکیڈیمیشین عاصموف نے نہایت موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔۔۔مجھے انہوں نے مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی میں نے چند منٹ فارسی میں خطاب کیا اور معذرت چاہی کہ میرا مقالہ غیر فارسی زبان میں ہے۔میں نے وضاحت کی کہ میں طب کے میدان میں حقیر محقق ہوں اور انگریزی زبان میں طب قدیم کو متعارف کرا رہا ہوں اس لیے علمی اور تحقیقی زبان انگریزی ہے۔مادام مریم سلگانگ صاحبہ فوراً میرے ساتھ آ گئیں اور انہوں نے انگریزی سے روسی میں ترجمہ کی ذمہ داری سنبھال لی۔محترمہ مریم سلگانگ ادارۂ مصنفین روس میں شعبۂ ممالک خارجہ کی صدر ہیں۔اُردو بھی جانتی ہیں۔انگریزی پر عبور وقابو ہے۔۔۔۔جناب علی سردار جعفری نے بھی اپنا ایک ترقی پسند کلام پیش کیا۔۔۔ڈرامہ (زندگی عینی) ختم ہونے کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے واپس مہمان خانے آیا تو صدر دروازے پر فیض احمد فیض صاحب کھڑے تھے۔اُن کے ساتھ سردار جعفری بھی تھے۔جعفری صاحب کی بیگم صاحبہ اور محترمہ عصمت چغتائی ڈرامے میں میرے ساتھ تھیں۔میں ذرا پہلے آ گیا تھا۔۔۔(دوپہر دن) ہماری موٹریں ایسے مقام کی طرف روانہ ہوئیں جہاں اُترنا تھا۔۔۔یہ استراحت گاہ نویسندگان ہے۔یہ مقام واقعی بہت پرفضا تھا" ہماری موٹریں باغ بوتا نیکی میں داخل ہوگئیں۔۔۔اس میں ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے۔۔۔کتاب الرائے میں جعفری صاحب نے ایک شعر بھی لکھ دیا۔

درخت دوستی بنشاں کہ دست دل یار آور
نہال دشمنی بر تن کے رنج بیشمار آور

۔۔۔جناب فیض احمد فیض اور جناب علی سردار جعفری۔۔۔دونوں کی طبیعت واقعی خراب تھی۔۔۔ان کو آج ہی شام ماسکو جانا تھا۔۔۔چار بجے شام کو ہم جامعہ سمرقند گئے۔۔۔وائس چانسلر جناب شکوروف۔۔۔نے۔۔۔طلبا سے ہمارا تعارف کرایا۔"

229

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے کینڈا میں منعقدہ اُن مشاعروں کا ذکر کیا جن میں علی سردار جعفری نے شرکت کی تھی۔ اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

1۔"اُردو سوسائٹی ٹورنٹو جس کے سربراہ اس وقت حفظ الکبیر قریشی تھے۔ان کے دعوت پر 1980ء میں پہلی بار علی سردار جعفری کینڈا تشریف لائے۔۔۔جعفری صاحب کے علاوہ اختر الایمان، کیفی اعظمی، بیکل اتساہی، واجدہ تبسم، مینا قاضی، عزیز قیسی اور حسن کمال کے نام خاصے نمایاں ہیں۔شام کو بین الاقوامی مشاعرہ کا اہتمام ایک ہائی اسکول کے ہال میں کیا گیا۔صدارت کے فرائض فیض صاحب نے انجام دیے۔جعفری صاحب کی غزلوں کے علاوہ "دیوار" اور "کربلا" نامی نظمیں بہت پسند کی گئیں اور فرمائش کر کے اس کے کئی بند بار بار پڑھوائے گئے۔"

''دو سال بعد 1982ء میں اُردو سوسائٹی کی دعوت پر جعفری صاحب دوبارہ کینڈا آ گئے ۔وہ ایک اُردو کانفرنس میں بحیثیت مقرر،شاعر اور ادیب مدعو تھے۔یہ کانفرنس 25اور 26دسمبر 1982ء کوٹورنٹو یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ شرکا میں جعفری صاحب کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر کارلو کپولا،احمد فراز،سردار جعفری،جمیل الدین عالی شامل تھے۔ ڈاکٹر نارنگ صاحب کے انگریزی مقالے کے بعد سردار جعفری نے اپنا مقالہ بعنوان

Progressive Movement and its influence on Urdu poetry

پیش کیا۔شام کو رنگا رنگ محفل شعر و سخن سجائی گئی۔جعفری صاحب کا خیر مقدم لوگوں نے کھڑے ہو کر کیا۔ان کی آمد پر تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔ان کی کتنی ہی نظموں کو بار بار سنا گیا۔پھر اُن سے غزلیں سنانے کی فرمائش ہوئی اور انہوں نے جی بھر کے شگفتگی سے بھرپور کئی غزلیں اپنے مخصوص لہجے میں سنائی۔شعر پڑھتے جاتے تھے اور حسب عادت بالوں پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔کبھی مسکرانے لگتے۔کبھی سنجیدگی اختیار کر لیتے۔غرض یہ کہ وہ شام جعفری،احمد فراز اور عالی کے ہاتھ رہی اور مشاعرہ انھیں حضرات نے لوٹا''۔۔۔۔

''۔۔۔پھر یہ کارواں اوٹاوا پہنچا جہاں جعفری اور احمد فراز صاحبان کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔۔۔یہاں ہر شخص اُن سے بلا تکلف ملنے آ جا سکتا تھا۔دن بھر شیدائیان جعفری کا تانتا بندھا رہا۔شام کو اوٹاوا یونیورسٹی کے ایک ہال میں محفل شعر و سخن کا انعقاد ہوا۔اُس شام مشاعرہ خوب جما اور مہمان شعراء کا کلام سننے کے لیے لوگوں کی بے چینی اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر مشاعرہ دوسرے دن تک جاری رہتا تو وہ لوگ اپنی جگہوں سے اُٹھ کر نہ جاتے۔۔۔''

1984ء میں۔۔۔علی سردار جعفری کو اس لیے مدعو کیا گیا کہ ان کا ستر سالہ جشن سالگرہ منایا جائے اور تقریبات میں ایک بین الاقوامی مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں شرکت کے لیے جمیل الدین عالی،امجد اسلام امجد،پروین شاکر،تسلیم الٰہی زلفی،افتخار عارف وغیرہم کو بھی مدعو کیا گیا۔20نومبر 1984ء کو شام ہالی ڈے ان ڈاون ٹاون کے ایک پُر تکلف لاونج میں ''شام جعفری'' کے عنوان سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔شرکاء کی تعداد ہال کی مناسبت سے سو(100) رکھی گئی مگر جیسے جیسے یہ خبر عام ہوئی لوگوں کا اشتیاق جعفری صاحب کے جشن سالگرہ میں شرکت کرنے کا بڑھتا گیا۔پھر بھی ایک مخصوص تعداد کے بعد لوگوں سے معذرت کر لی گئی۔اس طرح ایک بڑی تعداد ''شام جعفری'' میں شرکت سے محروم رہی۔جمیل الدین عالی گھبرائے ہوئے ہانپتے کانپتے ہالی ڈے ان پہنچے اور اندوہناک خبر کہ فیض احمد فیض کا انتقال ہو گیا سنائی۔اس خبر کا سننا تھا کہ سارے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یہ کیا ہوا ''فیض صاحب کا انتقال ہو گیا'' وہاں جو بھی موجود تھا اس کو یہی محسوس ہوا کہ جیسے اس کے قریبی عزیز کی موت واقع ہو گئی۔جعفری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور دوسروں کی طرح ان کا چہرہ بھی لٹک گیا۔وہ فیض صاحب کے دیرینہ ساتھیوں میں سے تھے،ان کے پرانے رفیق تھے،ہم مسلک تھے،ہم مشرب تھے،ہمدم بھی تھے،دمساز بھی تھے۔دونوں نہ جانے کتنی تحریکوں میں وابستہ رہے تھے،کتنے ہی ادارے اُن دونوں کی جاں سوز کوششوں کی وجہ سے پروان چڑھتے تھے۔کتنی ہی انجمنیں ان دونوں کے باہمی تعاون کی وجہ سے برصغیر میں مقبول ہوئی تھیں۔اُن کا آبدیدہ ہونا قدرتی تھا۔سچ پوچھئے تو جس آنکھ کو دیکھئے وہ نم تھی۔جشن سالگرہ تقریب وقتی طور پر

روک دی گئی ۔تعزیتی جلسے کا اعلان ہوا۔دو منٹ کی خاموشی فیض صاحب کے احترام میں اختیار کی گئی ۔ایک تعزیتی قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی جس کی کاپیاں ایلیس فیض کے علاوہ مختلف اخباروں اور ٹی وی اسٹیشنوں کو بھیج دی گئیں ۔اس کے بعد جشن سالگرہ کا آغاز ہوا مگر اب سارا ماحول اس مصرعے کے مصداق تھا ۔

جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتا ہے

یوں تو جعفری صاحب کی شان میں تہنیتی نظمیں بھی پڑھی گئیں ۔مبارک باد کے گیت بھی گائے گئے ۔مبارک باد بھی پیش کی گئی مگر فضا اتنی بوجھل ہو چکی تھی کہ جو مسرّت اور لذت اس قسم کے جلسوں میں شرکت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ ہو نہ پائی ۔''

شامِ جعفری کے چند روز بعد 8 دسمبر 1984ء کی شام کو Ontario Institute of Studies in Education کے آڈیٹوریم میں بین الاقوامی مشاعرے کے بزم سجی جس کی صدارت جعفری صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض اشفاق حسین نے انجام دیئے ۔

یہ قافلہ اعجاز بزمی کے سالاری میں اونا وا کی جانب روانہ ہوا جہاں کی بزم اردو ادب نے جس کے سربراہ سعید اور حمیرا انصاری تھے ایک نفیس ہال میں مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔صدارت جعفری صاحب کے سپرد تھی ۔نظامت کی درخواست پر وین شاکر سے کی گئی جو انہوں نے بخوشی منظور کر لی ۔۔۔مشاعرے کا آغاز ایک مقامی شاعر سے ہوا جس نے اپنا کلام پیش کرنے سے پہلے یہ کلمات ارشاد فرمائے کہ جعفری صاحب چوں کہ یہ آپ کی سترویں سالگرہ کا موقع ہے لہٰذا میں نے ایک غزل ملے جلے رنگ میں آپ کی خاطر کہی ہے اور وہ آپ کی نذر ہے'' ملے جلے رنگ کی غزل سننا تھا کہ جعفری صاحب کا چہرہ لال ہو گیا ۔وہ ادب کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے جیسے جیسے وہ شاعر اپنے شعر پڑھتا تھا ویسے ویسے جعفری صاحب کے چہرہ کا رنگ متغیّر ہوتا جاتا تھا کہ سارے شعر مہمل اور غیر موزوں تھے ۔غزل سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔غزل ختم ہونے کے بعد جب اس نے اُٹھ کر وہ کاغذ جس پر غزل لکھی ہوئی تھی جعفری صاحب کو پیش کیا تو انہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کاغذ کو پرے ہٹا دیا۔باقی محفل مشاعرہ انتہائی اطمنان اور سکون کے ساتھ اختتام کو پہنچی''

''جعفری صاحب آخری بار 1988ء میں رائٹرز فورم آف پاکستانی کینڈین اور کینڈین اسوسی ایشن آف پاکستانی میڈیم (کیمپ) کے اشتراک سے جو اس عہد کے عظیم مفکر، شاعر، فلسفی، حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال کی پچاس سالہ برسی کا اہتمام کیا گیا تھا اس کی تقریبات میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے ۔۔۔یہ تقریب 8 جولائی 1988ء کو رائل پارک ہوٹل میں منعقد ہو ئی اس میں ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے متعدد نامور ادیب اور شاعر مدعو تھے ۔علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت سے متعلق جو فلم حکومت ہند نے تیار کرائی تھی اور جس کی پروڈکشن میں علی سردار جعفری نے اہم کردار ادا کیا تھا وہ فلم بھی دکھائی گئی کتابوں کی نمائش بھی منعقد ہوئی اور 16 جولائی 1988ء کی شام کو Dise کے ہال میں بین الاقوامی مشاعرہ بھی بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا ۔دوسرے دن مذاکرہ اور ادبی مقالوں کا سشن تھا جو انتہائی کامیاب رہا۔مجموعی طور پر رائٹرز فورم اور کیمپ کا اُردو کی ترویج کے سلسلہ میں یہ سب سے اہم کارنامہ تھا۔۔۔شرکا کے تعارف اور تقاریر کے بعد ایک مختصر محفل مشاعرہ سجی جس

کی صدارت کے لیے جمال زبیری نے سلطانہ جعفری کا نام تجویز کیا۔یہ کینڈا میں پہلا اتفاق تھا کہ ایک غیر شاعر خاتون نے مشاعرے کی صدارت کی ہو۔۔۔استقبالیہ کے آخر میں حاضرین کی فرمائش پر علی سردار جعفری صاحب کو اپنا کلام سنانا پڑا۔ جعفری صاحب نے نظم ''دولتِ دنیا کا حساب'' اس کے بعد دو چار نظمیں اور سنائیں ۔۔۔1984ء کا ایوارڈ علی سردار جعفری کو جس میں ایک ہزار ڈالر رقم 'ایک Plaque اور ایک Souvenir بھی شامل تھا، دیا گیا۔جعفری صاحب وہ ایوارڈ لینے آگے بڑھے تو جذبات سے مغلوب ہو چکے تھے۔انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے ساتھیو میرے کامریڈز مجھے زندگی میں بہت سے اعزازت 'انعامات اور ایوارڈس ملے ہیں مگر اکیڈیمی کی جانب سے اس ایوارڈ کی نوعیت ہی کچھ اور ہے کہ یہ مجھے ایسی سرزمین پر دیا جارہا ہے جہاں کی زبان نہ اُردو ہے نہ ہندوستانی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی ہے اور جہاں اُردو کی شمع کو جلے ہوئے مشکل سے بیس بائیس سال ہوئے ہیں۔یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اُن پر رقت طاری ہوگئی۔جعفری صاحب تقریر کرتے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو پوچھتے تھے'' دوسری نشست میں بیرونی ممالک سے آئے ہوئے شعراء کرام نے اپنا کلام سنایا۔اب باری تھی صدر صاحب کی۔جعفری صاحب نے ابتداء کچھ اس طرح کی۔

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بر دوش

یہ اشعار سننا تھا کہ محفل کا رنگ بدلا۔لوگوں کے موڈ بدلے 'ساری فضا ہی بدل گئی اور پھر انہوں نے دوسری نظم سنائی۔

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد

مرے خلاف اُٹھا یا قلم حریفوں نے

''گفتگو بند نہ ہو۔۔۔جعفری صاحب کے دیر تک شعر سنے گئے اور وہ دیر تک پوری دلچسپی کے ساتھ شعر سناتے رہے اور پھر یہ محفل اختتام کو پہنچی ۔۔۔آخری دن ایک مذاکرہ اور مقالوں کا سشن تھا۔۔۔جعفری صاحب کی حیثیت مبصر کی تھی ۔۔۔ دوسرے سشن میں احمد فراز اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مضامین پیش کیے۔بعد میں جعفری صاحب نے فرمایا۔۔۔ہندوستان میں (اقبال) انسان دوست کی حیثیت سے یاد کیے گئے کہ عظمت انسانی ان کے کلام کا بنیادی موضوع ہے'' 230

25 ستمبر کی صبح اُردو کانفرنس منعقدہ کینڈا میں سردار جعفری کا مقالہ جو ترقی پسند تحریک سے متعلق تھا' بے حد پسند کیا گیا اور شام کے مشاعرے میں ان کی نظمیں وہاں کے سامعین کو بہت پسند آئیں۔26 ستمبر کی شام ٹورانٹو کے ایک ثقافتی مرکز میں جوش پر مذاکرہ تھا۔۔۔احمد فراز نے کہا ''اُردو ادب میں جوش کا کوئی کانٹری بیوشن نہیں ہے'' سردار جعفری مائک پر آئے اور کہا ''جوش نئی نسل کی آواز ہیں۔کچھ لوگ اگر جوش کی عظمت سے انکار کرتے ہیں تو دوسرے اقبال کو نہیں مانتے۔حالا کہ اپنے اپنے مقام پر دونوں شاعر عظیم ہیں۔'' 231

29 ستمبر کو اناوہ میں مشاعرہ سردار جعفری کی صدارت میں ہوا۔

سردار جعفری دوبارہ شکاگو آئے۔رضیہ فصیح احمد نے لکھا ہے:

''کئی مشاعرے بھگتا کر لوٹے تھے۔بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔پہلے دن کے مقابلے میں ان کی صحت اور پژمردگی دیکھ کر دکھ ہوا۔سلطانہ اپنے کسی رشتے دار کے پاس کسی اور اسٹیٹ میں تھیں۔باجود تھکے ہونے کے انہوں نے اسی

توانائی کا مظاہرہ کیا اور تقریباً ساری رات بیٹھے رہے ۔۔۔یہ سب لوگ کن مالی مشکلات سے گزرے کن چٹانوں سے ٹکرائے جیلوں میں رہے یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔آدرش کی خاطر جان پر دکھ سہنا بڑی بات ہے۔'' 232

سردار جعفری کے آخری مشاعرہ کے بارے میں فضیل جعفری نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری مرحوم نے اپنی زندگی کا آخری مشاعرہ 22 اپریل 2000ء کو نہرو سنٹر میں پڑھا۔وہ اس قابل نہیں تھے کہ اسٹیج پر بیٹھ سکتے ۔انھیں اسٹیج کے نیچے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں ۔مشہور افسانہ نگار اور جوائنٹ انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے ۔میں نہ تو مشاعروں میں جاتا ہوں اور نہ مجھے مدعو کیا جاتا ہے' لیکن میرے جو رفیق کار وہاں موجود تھے، انہوں نے بتایا کہ اشرف کے بار بار درخواست کرنے کے باوجود جعفری صاحب چپ چاپ کرسی پر بیٹھے رہے ۔ان کے چہرے پر قطعاً کوئی تاثر نہیں تھا۔پھر ان کی کرسی کا رخ سامعین کی جانب کر دیا گیا۔وہ اس وقت بھی خاموش رہے ۔دس پندرہ منٹ یوں ہی گزر گئے ۔سامعین بھی دم بخود تھے ۔اشرف اور سلطانہ بھابھی کے بار بار اصرار کرنے کے بعد انہوں نے کہا ''کوشش کرتا ہوں کہ کچھ یاد آجائے'' پھر انہوں نے اپنی مشہور نظم ''میرا سفر'' سنانی شروع کی اور آخر تک سنائی ۔سامعین نے ان کے اعزاز میں تالیاں بجانی شروع کیں تو یہ سلسلہ کوئی دس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد وہ اسپتال داخل ہو گئے ۔'' 233

صاحب گفتار Conversationalist:

کئی ادیبوں نے سردار جعفری کو خوش گفتار قرار دیا ہے۔مظہر امام لکھتے ہیں:

''سردار جعفری ایک بہت اچھے Conversationalist بھی تھے ۔خوش گفتار' طرز کلام کے ماہر۔ان کی باتوں میں ''گلوں کی خوشبو'' تھی ۔ان کے پاس بیٹھنے پر یہی جی چاہتا تھا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ۔'' 234

رباب جعفری نے لکھا ہے:

''سردار بھائی کے ایک قریبی دوست کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر ہم سب جو گفتگو سنتے ہیں اُس میں اساتذہ سے لے کر موجودہ دور کے نئے شعراء کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔'' 235

سبط حسن کی سردار جعفری سے پہلی ملاقات 1938ء میں الٰہ آباد میں ہوئی ۔اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''سردار بولتے جا رہے تھے اور میں ان کی صورت دیکھتا ''ہاں''، ''نہیں'' میں جواب دے رہا تھا۔دراصل ان کی انوکھی شخصیت نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔گندمی رنگ بھرا بھرا کتابی چہرہ' سر پر ریشم کے سے ملائم بالوں کا ڈھیر' انگلیوں کا رنگ تمباکو نوشی کی کثرت سے سیاہ مائل زرد' آنکھیں منگولوں کی سی غلافی مگر بڑی بڑی اور ان میں چمک ایسی گویا دیے روشن ہوں اور پھر ان کی گرجدار آواز جس میں بلا کی خود اعتمادی تھی ۔۔۔مجاز جتنے کم سخن بلکہ شرمیلے تھے سردار اُتنے ہی تیز طرار اور جلد بے تکلف ہو جانے والے ۔وہ بولتے تو یوں محسوس ہوتا گویا جلسہ عام میں تقریر کر رہے ہوں ۔'' 236

یوسف ناظم نے لکھا ہے:

''وہ (سردار جعفری) جب بھی کسی موضوع پر بولنے کھڑے ہوتے سامعین سحر زدہ ہو جاتے اور اپنی اپنی نشست پر جنبش تک کرنا بھول جاتے کبھی کبھار کوئی دلبر داشتہ اعتراض کرنے کھڑے بھی ہوتا تو جعفری صاحب کی حاضر دماغی اور برجستگی اسے نادم کرنے کے لیے کافی ہوتی۔''

237

سید محمد مہدی رقمطراز ہیں:

''ان کا (سردار جعفری) مبلغ علم دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں بہت وسیع تھا اور حافظہ بلا کا پایا تھا وہ اپنی رائے پر بڑی شدومد کے ساتھ جمے رہتے تھے اور چوں کہ غیر معمولی قوت گفتار بھی پائی تھی اس لئے بحث میں ان کی بازی مار لے جانا آسان کام نہیں تھا۔''

238

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے کس خوبصورتی سے سردار جعفری کے انداز گل افشائی گفتار پر روشنی ڈالی ہے' ملاحظہ کیجئے:

''انھیں (سردار جعفری) پہلی مرتبہ زمانہ طالب علمی میں دیکھا تھا۔ اُف وہ انداز گل افشائی گفتار!!۔۔۔ جو مجھ جیسی نوآموز قلم کار اور ادب کی ایک ادنیٰ سی طالبہ کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا پھر جنبشِ دہن نے گویا فضاؤں میں موتی رول دیے۔ لگا علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے اور جب بار بار سنا تو محسوس ہوا کہ غلط فہمی تھی۔ دریا نہیں' یہ تو ایک سمندر ہے۔ ایک بحر ذخار ایک قلزم بسیط و عمیق!!۔۔۔ یہاں سے وہاں تک حروف و معانی کے درمہائے شاہوار اپنی تابانی و درخشانی سے ہزارہا دل و نظر کو خیرہ کرتے ہوئے!! جس کا جیسا جی چاہے ویسے موتی چن لے۔ ادب' فلسفہ' منطق' سیاست' معاشیات' سماجیات' تاریخ' تصوف' مذہب' کون سا باب اس کتاب وجود میں وا نہ تھا۔ جس موضوع پر بولنے پر اُترتے' ایسا لگتا جیسے یہی موضوع ان کا خاص موضوع ہے۔ الفاظ' نپے تلے' انداز سنجیدہ' لہجے میں متانت و شرافت' آواز میں بلندی اور اعتماد بلکہ احساسِ طمانیت!! اور چہرے پر ایک ہلکی سی تاب ناک' سرخی جو علم کی روشنی کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔''

239

پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے۔

''سردار جعفری کے اندر یہ صلاحیت بدرجہ اُتم موجود تھی کہ وہ دوسروں کی باتوں کو یکسوئی سے سن سکتے تھے۔'' 240

علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

''سردار جب بولتے ہیں تو صرف سردار نہیں ہوتے۔ ایک تاریخ ہوتی ہے' ایک تہذیب جس کا ان کا دشمن بھی قائل ہوتا ہے۔''

241

مجتبیٰ حسین رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری اگرچہ مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے ہیں لیکن ہم انھیں ''مذاکروں'' میں سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر جب بولتے ہیں تو کچھ اس طرح بولتے ہیں کہ سننے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہوئی' منطق کے سرے تلاش کرتی ہوئی' آگہی کی راہوں پر چلتی ہوئی' کہیں رکتی ہوئی' گاہ گاہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی' پھر سرپٹ دوڑتی ہوئی' تاریخ اور مذاہب عالم کے حوالے دیتی ہوئی' فلسفہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی' دانش کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی' ان کی باتوں سے آپ کو اختلاف بھی ہو تو آپ ان کی جادو بیانی کے سحر میں ڈوب کر بہت دور

تک چلے جائیں گے۔۔۔سردار جعفری نے نہ صرف اس صدی کی سوچ کو اپنے اندر سمولیا ہے بلکہ اس صدی کی سوچ کی تشکیل میں بھی حتی المقدور اپنا حصہ ادا کیا ہے۔" 242

اُردو کی خدمت:

سردار جعفری اُردو، فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے۔

ابرار رحمانی کو سردار جعفری کے مجاہد اُردو ہونے اور اعلیٰ سطح کے دانشور اور مفکر ہونے کا اعتراف ہے لیکن ان کا احساس یہ بھی ہے کہ گجرال کمیٹی کے رکن اور نظر ثانی کے لیے بنی جعفری کمیٹی کے صدر ہونے کے ناطے وہ اُردو کو اس جائز حق دلانے کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔انہوں نے لکھا:

"گجرال کمیٹی کے معزز رکن ہونے کی حیثیت سے اور پھر اس کمیٹی کی سفارشات پر نظر ثانی کے لیے بنی جعفری کمیٹی کے صدر ہونے کے ناطے "اُردو" کو اس کا جائز حق نہ دلانا قابل تشویش بات ضرور رہی، کیوں کہ گجرال ان کے خاص دوستوں میں تھے اور وہ چاہتے تو گجرال پر اپنا اثر خاص استعمال کر سکتے تھے۔لیکن شاید یہ اُردو کی ہی بدنصیبی ہے ورنہ سردار جعفری نے بھی "اوروں" سے کہیں زیادہ اُردو کے لیے کوششیں کیں۔اس کے لیے ہم بجا طور پر انہیں مجاہد اُردو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس دور کے سب سے قد آور شاعر تھے اور اب ان جیسا دانشور اور مفکر دور دور تک نظر نہیں آتا۔"243

(میں ہوں تخیلِ انساں کی پرواز (علی سردار جعفری) مشمولہ تلخ و شیریں صفحہ 164)

رسم الخط کے سلسلہ میں سردار جعفری کے تبدیل شدہ موقف کے بارے میں مظہر امام رقمطراز ہیں:

"ایک زمانے میں سردار جعفری نے اُردو کے لئے ناگری رسم خط کی حمایت کی تھی بعد میں جب ان پر بہت اعتراضات ہوئے تو انہوں نے اُردو زبان کے تحفظ اور اس کا جائز مقام دلانے کے سلسلے میں اپنی رضا کارانہ سرگرمیاں تیز کیں اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر نئے حالات میں نظر ثانی کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس کی سربراہی کی اور اسے جعفری کمیٹی سے منسوب کیا گیا۔" 244

(سردار جعفری کی ایک خواہش، اُردو دنیا، ستمبر 2000ء صفحہ 26)

شعبہ اُردو ممبئی یونیورسٹی سے سردار جعفری کی غیر معمولی وابستگی کے بارے میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

شعبہ اُردو ممبئی یونیورسٹی کے قیام میں جعفری صاحب نے عملاً دلچسپی لی اور شعبہ کے قیام کے بعد جو مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی کے عطیہ سے قائم کیا گیا تھا، شعبہ اُردو کا افتتاحی خطبہ بھی آپ نے دیا۔اس موقع پر دیگر شرکاء میں جناب معین الدین حارث (مشہور صحافی اور دانشور و صدر انجمن اسلام، ممبئی) کے علاوہ پروفیسر لا۔بھی جوشی (مشہور مراٹھی ادیب اور اُردو سے مراٹھی کے مترجم) اور ڈاکٹر عبدالقدوس منشی (سابق چیرمین مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی) نے بھی کیا تھا۔اس افتتاحی جلسہ کی صدارت سابق وائس چانسلر، ممبئی یونیورسٹی، پروفیسر رام جوشی نے کی تھی مذکورہ تقریب کے بعد بھی جعفری صاحب کا شعبہ اُردو سے گہرا تعلق رہا۔وہ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔اس سے راقم الحروف (پروفیسر عبدالستار دلوی) کو بڑا حوصلہ ملتا

رہا۔۔۔1982ء سے 1997ء تک جعفری صاحب نے شعبہ اُردو کو اپنی شرکت سے پچیسوں بار رونق بخشی تھی۔ یہ ان کی شعبۂ اُردو سے غیر معمولی وابستگی تھی۔'' 245

معترضین و موئیدین:

مجتبیٰ حسین نے سردار جعفری کی متنازعہ شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

''بلاشبہ سردار جعفری ہمارے ادب کی سب سے فعال، متحرک، توانا مگر ساتھ ہی ساتھ متنازعہ شخصیت رہے ہیں اُن کے مخالفین تو انھیں نزاعی شخصیت مانتے ہی رہے ہیں اُن کے مداح اور چاہنے والے بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تین برس پہلے ممبئی کے انتظامیہ نے انھیں ایک نوٹس جاری کر کے کہا تھا کہ وہ اپنے ہندوستانی شہری ہونے کا ثبوت فراہم کریں ۔۔۔جعفری صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی انھیں شاعر نہیں مانتے اور باقر مہدی انھیں نقاد اور دانشور نہیں مانتے اور اب تو حد ہوگئی کہ ممبئی کا انتظامیہ انھیں ہندوستانی شہری بھی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ آخر وہ کہاں تک اپنے ہندوستانی شہری ہونے، شاعر ہونے اور ناقد ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرتے رہیں گے۔۔۔اب جب کہ ملک کا اعلیٰ ترین ادبی انعام مل چکا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ اب جعفری صاحب کو اپنے طور پر اپنے ہندوستانی شہری ہونے، شاعر ہونے اور ناقد سیکولر ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ابھی پچھلے مہینے مہاراشٹرا اُردو اکاڈمی نے ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام عائد کرتے ہوئے اپنا انعام دینے سے انکار کیا تھا۔''246

ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں تبصروں اور مضامین کی شکل میں جو تحریریں لکھی گئی ہیں ان میں عموماً انتہا پسندانہ زاویہ نظر اختیار کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ بعض تحریریں واضح طور پر ان کی موافقت میں لکھی گئیں اور بعض ان کی مخالفت میں مخالفت میں لکھی جانے والی تحریروں کو جب تک دلائل اور براہین کی بنیاد پر نہیں لکھا جاتا، ان میں کوئی وزن و وقار پیدا نہیں ہوتا، جب کہ تعریف و تحسین کے لیے اس نوع کے کسی منطقی طریق کار کا استعمال اکثر غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس طریق کار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اعتراضات تو ادبی سماج کو یاد رہ جاتے ہیں مگر توصیفی کلمات بہت جلد ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں۔ اگر سردار جعفری کی شاعری پر لکھی جانے والی تنقید کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحیح معنوں میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین کی کوئی بڑی اور سنجیدہ کوشش ہنوز منظر عام پر نہیں آئی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سردار جعفری کے کلام کو اس کے مخصوص ادبی، روایتی اور فکری سیاق و سباق میں پیش کیا جائے تا کہ اس کی تفہیم اور تعین قدر کی راہیں استوار ہو سکیں۔'' 247

یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''ان کے (سردار جعفری) کے مزاج میں ایک عجیب قسم کی بردباری تھی اور ان کی یہی بُردباری دوسروں پر بار تھی۔''248

قصیر تمکین نے سردار جعفری کے کچھ معترضین کے بارے میں لکھا ہے:

''کوئی شاعر و ادیب فرشتہ نہیں ہوتا ہے۔ بشری کمزوریوں اور خامیوں سے کوئی بھی مبرا نہیں ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے

فکروفن کے ضمن میں کچھ ایسے مقامات ضرور آتے ہیں جہاں تنقید وگرفت کے پہلو نکل سکتے ہیں لیکن ہمیں تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب ان پر نکتہ چینیاں ایسے مصلحت پسندوں' عہد پرستوں اور ذرا ذرا سے ذاتی مفاد کے لیے متاع دین و دانش بیچ کھانے والوں کی طرف سے ہوتی ہیں جنھوں نے خود علی سردار جعفری کے ہی فکروفن سے چراغ جلائے ہیں۔ یہ لوگ شب خون مارتے وقت تنہائی اور خاموشی کے لمحات میں بھی یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ جعفری' عمر' تجربے' مطالعے اور ادبی محاسن او افکار میں ہمارے دور کے بہت بڑے فن کار تھے وہ بلاشبہ اپنے آپ میں پورے عہد کی تاریخ سموئے تھے۔ وہ ایک فنکار و قلم کار ہی نہیں بلکہ بلکہ ایک تہذیب و تحریک بھی تھے''۔۔۔جعفری صاحب نے ملک و ادب کے لئے جتنی جدوجہد اور شعروفن میں ان کی جو خدمات ہیں ان کے پیش نظر یہ خیال ہی روح فرسا لگتا ہے کہ ان کی شخصیت وخدمات کو داغدار بنانے کی بھی کوششیں ہوتی رہیں ۔ہندوستان میں بعض سرکار پرستوں نے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن غصب کر کے جعفری صاحب سے عداوت و دشمنی کے مظاہرے کیے۔ یہ مخاصمت جعفری صاحب سے نہیں بلکہ پوری ترقی پسند تحریک اور ادب میں ترقی پسندوں کے سرمایے کو ملیامیٹ کرنے کی خواہش کی پروردہ تھی۔''

محمد اسداللہ نے لکھا ہے:

1۔'' آج جب میں برلن میں اپنے گھر میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہوں' مجھے دو ایک ایسی باتیں یاد آرہی ہیں جن کا تصور کر کے بھی کوفت اور اذیت ہوتی ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ سردار جعفری جیسے شخص کے بارے میں جس کی ساری زندگی کھلی کتاب رہی ہے کس طرح الزام تراشی کی جاتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ بلراج مشرا کے ایک مضمون میں پڑھا تھا کہ ''سردار جعفری اگر اپنے فلیٹس اور کاریں بیچ دیں اور وہ پیسہ ادیبوں میں بانٹ دیں تو بہت سے لکھنے والوں کا بھلا ہوگا۔''

محمد اسداللہ لکھتے ہیں:

فلیٹس اور کاریں؟ کتنی غلط کتنی مہمل اور کتنی لغو تہمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس فلیٹ میں سردار بھائی اور سلطانہ رہتے تھے وہ بھی پوری طرح ان کا خریدا ہوا نہیں تھا۔ سلطانہ کی بہنیں مالی اعتبار سے خوشحال ہیں۔ ان لوگوں نے سردار بھائی اور سلطانہ آپا کی دربدری دیکھ کر کچھ رقم دی' کچھ روپیہ سلطانہ آپا کے پروویڈنٹ فنڈ سے اور تھوڑی سی رقم سردار بھائی کی کتابوں کی رائلٹی سے حاصل ہوئی اور اس طرح 1967ء میں یہ فلیٹ 52 ہزار میں خریدا گیا اور آج بھی صرف اور صرف یہی فلیٹ ان کا کُل سرمایہ ہے۔ باقی ساری باتیں غلط' جھوٹ اور الزام تراشی ہیں۔۔۔۔

2۔ بعض دوستوں کی زبانی یہ بات بھی سننے میں آئی کہ سردار بھائی لوگوں کی خاطر تواضع نہیں کرتے ہیں' اپنے گھر کسی کو کھانے پر نہیں بلاتے ہیں۔ یہ بھی جھوٹ ہے اور تہمت ہے۔ میں نے ہمیشہ ان کے گھر میں مہمانوں کو دیکھا' جب بھی کوئی ان کے ہاں آیا کھانے کا وقت ہو تو انہوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا' چائے کا وقت ہو تو چائے کے لیے پوچھا۔ ظ۔ انصاری نے بار بار مجھ سے شکایت کی کہ سردار بھائی کبھی انھیں کھانے پر نہیں بلاتے ہیں' کتنی غلط شکایت ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہو' بے شمار لوگوں سے رابطہ اور تعلق رہتا ہو تو ہر کسی کی مہمان داری عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ میرا جب بھی بمبئی جانا ہوا' سردار بھائی نے ہمیشہ مدعو کیا۔ جب بھی میں بیوی بچوں کے ساتھ بمبئی گیا' ہر بار ہم سب کو اصرار سے لنچ پر،

شام کے کھانے پر بلایا۔ممبئی میں جب بھی ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھے سردار بھائی نے ہمیشہ ہی ٹیکسی کا کرایہ دینے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ اختر الایمان نے مجھے اور سردار بھائی کو اپنے ہاں مدعو کیا میں اور سردار بھائی ٹیکسی میں ان کے ہاں گئے۔میرے اصرار کے باجود سردار بھائی نے ڈھائی سو روپے ٹیکسی کے دیئے۔واپسی پر بھی میں نے حد درجہ اصرار کیا لیکن پھر بھی سردار بھائی ہی نے بل ادا کیا۔۔۔۔ایسے بہت سے واقعات ہیں اور یہ بات لغو ہے کہ سردار بھائی مہمان نواز نہیں تھے لیکن ظاہر ہے کہ دوستوں کے لیے۔سارے شہر کی خاطر مدارت کرنا نہ ان کے لیے ممکن تھا نہ کسی اور آدمی کیلئے ممکن ہوتا ہے وہ بے حد مہمان نواز تھے۔"

250

سردار جعفری ہمدرد انسان تھے دوستوں، رفیقوں پر خرچ کرتے، ان کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، ان کے دل میں ان لوگوں کے لیے جگہ تو تھی ہی لیکن اپنے چھوٹے سے گھر میں وقت ضرورت وہ انھیں رکھتے۔اس سلسلہ میں حمید اختر لکھتے ہیں:

"علی سردار جعفری۔۔۔ایک سچے، کھرے اور ہمدرد انسان تھے، وہ دوستوں کے دوست اور انسانی قدروں کے پاسبان تھے۔پیسہ ان کے پاس کبھی نہیں رہا مگر اپنی محنت سے انہوں نے جو کچھ بھی کمایا اسے انہوں نے دوستوں، رفیقوں اور ضرورت مندوں پر بشرط ضرورت خرچ کرنے میں کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔کیفی بیمار ہوئے تو ان کے علاج کے لئے بمبئی کے ڈاکٹروں کے پاس بھاگے بھاگے پھرتے رہے، پھر انھیں ایک بہت اچھے کلنک میں داخل کرایا اور ان کی بیگم کو اپنے گھر لے آئے، کیوں کہ اُن کا گھر اسپتال سے نزدیک تھا جس میں کیفی داخل تھے۔کرشن چندر، ساحر اور بمبئی میں رہنے والے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی بیماری میں علی سردار جعفری ہی سب سے زیادہ اُن کے کام آتے رہے۔کسی کو اچھے ڈاکٹر اور اسپتال کی تلاش میں مدد بہم پہنچائی تو کچھ ایسے بھی تھے جن کے لیے فنڈ زفراہم کرنے کی ضرورت تھی جو علی سردار جعفری نے پوری کی۔بمبئی میں اُن کا فلیٹ بہت بڑا نہیں ہے، پھر اس میں اُن کے اپنے بیٹوں بہوؤں کے علاوہ ان کی دو بہنیں مستقلاً رہتی تھیں۔یہ دونوں سردار جعفری کے لائبریری روم میں جہاں ہر طرف کتابوں کے ڈھیر اور الماریاں تھیں، مقیم تھیں۔اس کے باوجود سردار دوستوں کو اپنے گھر ٹھہرا کر خوش ہوتے۔اس کے باجود 1979ء میں ساحر کی بیماری کے وقت، تقسیم ملک کے بعد پہلی بار جب میں میری بیوی اور میرا چھ سالہ بیٹا عمیر بمبئی گئے تو دو ہفتے کے قریب ساحر کے بہت بڑے اور محل نما مکان "پرچھائیاں" میں ٹھہرے۔ہمارے وہاں جانے کا مقصد ہی ساحر کی تیمارداری تھی۔دو ہفتے کے اس قیام کے دوران میں سردار جعفری سے بھی ملاقاتیں رہیں مگر ہمارے قیام کے آخری چار پانچ روز وہ بہت زور دے کر ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ان کا کہنا تھا کہ تم نے اپنے دوست ساحر کے ہاں کافی دن گزارے ہیں۔ہم بھی تمہارے دشمن نہیں دوست ہیں۔اس لیے پاکستان واپسی سے قبل کچھ دن ہمارے ہاں بھی قیام کرو۔اُن کی بیگم سلطانہ ساحر کے ہاں آئیں اور ہمیں اپنے گھر لے گئیں۔وہاں جگہ کم تھی، سردار جعفری نے اپنی بہنوں کو اپنے کمرے میں منتقل کر دیا اور لائبریری روم ہمارے حوالے کر دیا جگہ کی تنگی کے باوجود ہم نے یہ چار پانچ روز بڑے مزے سے وہاں گزارے اور سردار کی صحبت میں گزرے ہوئے یہ دن زندگی بھر یاد رہیں گے۔"

251

شوکت کیفی نے اپنے مضمون "سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست" میں لکھا ہے "کیفی صاحب کو اچانک اسٹروک ہوا تو کس طرح سردار جعفری اور سلطانہ نے ان کی مدد کی۔یہ روداد بھی انہوں نے لکھی ہے بلکہ یہاں تک "اگر کیفی اس وقت زندہ ہیں

تو اس میں ان کا اور سلطانہ آپا کا ہاتھ ہے" (ملاحظہ ہو: رضیہ فصیح احمد 'سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری)۔ 252

انور ظہیر خاں رقمطراز ہیں:

"جب کینسر جیسے موذی و مہلک مرض نے عزیز قیسی جیسے قوی ہیکل شخص کو ہلکان کر دیا تو ان سے نظریاتی اختلاف کے باوجود سردار جعفری نے مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکادمی کی بورڈ میٹنگ میں خود یہ تجویز رکھی کہ ان کی مالی امداد کی جائے۔ چنانچہ ان کی تجویز پر اکادمی بورڈ نے پچیس ہزار کی رقم منظور کی۔ جب کہ اس سے پہلے کسی بھی فن کار کو اتنی رقم طبی امداد کے طور پر نہیں دی گئی تھی۔" 253

مجاز کے سانحہ ارتحال کے وقت سردار جعفری:

زہرہ جمال نے "5 دسمبر کی رات" عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں مجاز کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت سردار جعفری بھی وہیں موجود تھے۔ اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"سردار بھائی اور ساحر مضطرب ہیں۔ مجاز کو دیکھ تو آئیں پھر جلسہ ختم ہونے پر چلے جائیں گے ان کے پاس" اور جاتے جاتے سردار بھائی نے مجھے پکارا "زہرہ تم مجاز کو دیکھنے چلو گی؟ ۔۔۔ وہ مجاز کی بھتیجی ہیں ۔۔۔ ہاسپٹل آ گیا ۔۔ سردار بھائی نے کہا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں تین بجے بے ہوشی کی حالت میں ایک مریض کو داخل کیا گیا ہے کیا آپ بتا سکیں گی وہ کہاں ہیں ۔۔۔ مجاز کو آکسیجن دی جا رہی ہے ۔۔۔ آپ جلدی سے ڈاکٹر کو لے آیئے۔ سردار جعفری نے پھر پکارا "زہرہ سنو تم اس نرس سے دوستی کر لو تا کہ وہ اچھی طرح مجاز کی دیکھ بھال کرے ۔۔۔ موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہو رہی۔ کوئی ڈاکٹر نہیں ملا۔ سردار بھائی اور ساحر صاحب پھر گئے ہیں تا کہ اجلاس ملتوی کروا دیں اور ڈاکٹر کو تلاش کر کے لائیں ۔۔ ساحر کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ انہوں نے تلخی سے کہا "اس ہسپتال میں باہر کا ڈاکٹر نہیں آ سکتا" عصمت آپا اور سردار بھائی بھی آئے۔ ہر سمت آنسو ہیں۔ امبولنس آئی مجاز کو گھر لے جا رہے ہیں ۔۔۔ پانچ بجے اخبار والے آواز ۔۔۔ اسرار الحق مجاز کا انتقال ۔۔۔ سردار بھائی نے ساحر سے کہا "زہرہ نے کل دوپہر سے کچھ کھایا نہیں تم اسے کھانا کھلاؤ۔ میں حیران ہوں سردار بھائی یہ چھوٹی سی بات اس قدر محسوس کر رہے ہیں ۔۔۔ مجاز کا تعزیتی جلسہ ہے ۔۔۔ سردار بھائی 'بنے بھائی'۔ ایک ایک جملہ ان کا دل کا تہہ و بالا کر رہا ہے ۔۔۔ 254

سردار جعفری پر کچھ لوگوں کا اعتراض تھا کہ انہوں نے ادب میں کسی کو آگے نہیں بڑھایا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے سلام بن رزاق نے لکھا ہے:

"بعض کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی شخصیت میں "نرگسیت" کا عنصر شامل تھا۔ نیز یہ کہ انہوں نے کبھی کسی کو پروموٹ نہیں کیا۔ ادب میں کوئی کسی کو پروموٹ نہیں کرتا۔ یہاں پروموشن انھیں کو ملتا ہے جو اپنی ٹھوکروں سے راہ کے روڑے ہٹاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں ویسے میرا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے جعفری صاحب اپنے سے چھوٹوں سے بھی بہت محبت سے ملتے تھے۔ گھر جاؤ تو ہزار مصروفیت کے باوجود بیٹھ کر پوری دل جمعی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ واپسی پر کبھی لفٹ تک تو کبھی دروازے تک پہنچانے آئے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار مہاراشٹر کالج میں کوئی ادبی نشست تھی۔ جعفری صاحب اور

ظ۔انصاری صاحب بھی مدعو تھے۔کسی نے نشست کی صدارت کے لیے جعفری صاحب کا نام پیش کیا۔جعفری صاحب نے انکار کرتے ہوئے کہا ''بھئی آخر ہم لوگ کب تک صدارت کرتے رہیں گے نئے لوگوں کو بھی آگے آنا چاہئے'' پھر میری طرف دیکھ کر بولے ''میں اس نشست کی صدارت کے لیے سلام بن رزاق کا نام پیش کرتا ہوں۔ظ انصاری صاحب نے تائید کی اور خاکسار کو صدر بنا دیا گیا۔وہ نشست میری زندگی کی یادگار نشست تھی۔'' 255

سردار جعفری پر ڈاکٹر محمد حسن کے اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے حبیب الرحمٰن چغانی نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون ''گیان پیٹھ اور علی سردار جعفری'' (ماہنامہ قصے فروری 2000ء) میں سردار جعفری کو آڑے ہاتھوں لیا ہے' وہ ان کی شاعری پر کم اور ان کے کردار پر زیادہ برہم ہیں۔جذبات دل کی۔۔۔شدت غیظ میں انہیں خوب مطعون کیا ہے۔انھیں غصہ اس بات پر ہے کہ جسے اپنے مارکسی نظریات کی وجہ سے زندگی بھر برا کہتے رہے اسی فرقہ پرست جماعت کے سربراہ کے ہاتھوں سے انعام قبول کیا۔بہر حال وہ یہ کہنے پر بھی مجبور ہو گئے کہ ''ایسا نہیں ہے کہ سردار جعفری کا میں سرے سے قائل ہی نہیں رہا ہوں۔یہ صحیح ہے کہ میں ان کی عام طور پر مقبول نظموں کا مداح نہیں ہوں' لیکن ان کی شاعری نے ''ایک خواب اور'' کے بعد جو کروٹ بدلی (کوان سے ان کا کمٹ منٹ کا غلو کمزور پڑا اور وہ تقریباً شاعرانہ وابستگی کی دنیا میں آگئے) وہ کروٹ انہیں شاعری سے قریب لے آئی اور اس کے بعد اس شاعرانہ کیفیات میں برگ و بار آئے۔'' 256

فضیل جعفری نے سردار جعفری پر لگائے گئے الزامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری کی زندگی میں ان پر ادبی نوعیت کے الزام بھی لگائے گئے اور سیاسی بھی۔سیاسی الزامات میں ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے ایمرجنسی کی حمایت کی اور ''حرف حق'' کے عنوان سے نظم بھی لکھی۔ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس وقت سی پی آئی کی یہی پالیسی تھی جو ہمارے نزدیک صحیح تھی۔ایمرجنسی کے نفاذ کی حقیقی وجہ اندرا گاندھی کے خلاف الہٰ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سنہا کا فیصلہ نہیں بلکہ یہ تھی کہ فاشسٹ طاقتیں اس فیصلے کو بہانہ بنا کر ملک سے جمہوریت کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔جہاں تک فن کار کا سوال ہے خشونت سنگھ' ایم ایف حسین' راجندر سنگھ بیدی اور سکندر علی وجد وغیرہ بھی ایمرجنسی کے حامیوں میں شامل تھے۔اب یہ الگ بات ہے کہ گالیاں زیادہ تر جعفری صاحب کو ہی دی گئیں۔'' 257

سید محمود الحسن لکھتے ہیں:

''عوام کے ساتھ ساتھ وہ (سردار جعفری) دانشوروں' ادیبوں اور ناقدوں میں بھی مقبولیت کی امتیازی بلندی تک پہنچ گئے۔ان کی شدت سے مخالفت بھی ہوتی رہی لیکن ان کے انداز فکر میں کسی جگہ مصالحت کی گنجائش نہ تھی۔آخر کار ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی سحر انگیز شخصیت کا معترف بن گیا۔'' 258

زندگی کا نصب العین:

سردار جعفری کا نصب العین انسانیت کی خدمت اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے جدو جہد ہے کئی ادیبوں نے سردار جعفری کے نصب العین پر روشنی ڈالی ہے۔حبیب الرحمٰن چغانی نے لکھا ہے:

''ان کی (سردار جعفری) زندگی کا مقصد پیار و محبت اور انسان دوستی تھا' غلامی کی زنجیروں کو توڑنا' نفرت کی دیواروں کو گرانا' دلوں کو جوڑنا' وطن کو آزاد کرانا اور حقیقی آزادی کو پالینا تھا۔ اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں بھی انہیں اُٹھانا پڑیں۔ آزاد ہند میں بھی اپنی اسی جدوجہد کی خاطر انہیں پس زنداں ڈال دیا گیا۔ زندگی بھر وہ عالم انسانیت کو پیغام محبت دیتے رہے۔'' 259

شوکت کیفی رقمطراز ہیں:

''ان کی (سردار جعفری) شاعری اور ان کی شخصیت نے مجھے بے حد مرعوب کیا اور میرا جی چاہنے لگا کہ میں ان سے باتیں کروں۔ ان کے فلسفہ حیات کے بارے میں جانوں اور پھر مجھے آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ ان کی دنیا کچھ اور ہی ہے جو ہماری دنیا سے الگ ہے۔ یہ بھوکے ننگے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہندوستان سے غریبی' بیکاری اور بے روزگاری ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اور اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کر چکے ہیں۔'' 260

اختر حسین رائے پوری نے لکھا ہے:

1۔ جو ظلم اور بے انصافی کے خلاف جہاد کو زندگی کا مقصد بناتے ہیں' علی سردار جعفری کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔'' 261

2۔ ممنوں حسن خاں کے مطابق:

''سردار جعفری ایک پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں اور بڑے ہی پیارے آدمی ہیں ۔۔۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے ادب اور سماج دونوں کو جدید صحت مند بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی میں ارتقاء اور انسانیت کے خواہاں ہیں۔ وہ ایسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جہاں ناانصافی نہ ہو' عدم توازن نہ ہو بلکہ محبت ہو' شرافت ہو' حسن ہو' طاقت ہو' صداقت ہو۔'' 262

ابوالفیض سحر کے خیال کے مطابق:

''جعفری صاحب صرف انسانیت کی ابدی اور مثبت قدروں کی تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر ایقان و ایمان بھی رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی حیات و کائنات کے دائرہ فکر و عمل میں تعمیر و ترقی کے روشن امکانات کی وکالت و تبلیغ ہی ان کا بنیادی مسلک ہے۔'' 263

سچا فن کار اور سچا اُستاد وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگردوں کو اپنے علم و فن سے زیادہ اونچا دیکھنا پسند کرے' اس کی ترغیب دے' رہنمائی کرے۔ سردار جعفری میں بھی یہ صفت موجود تھی پروفیسر ضیا (علیگ) رقمطراز ہیں۔

''بقول معین اشرف جو کینڈا میں ایک عرصے سے مقیم ہیں اور تارکین پاکستان میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور جن کے افسانے اکثر لوگوں نے ''افکار'' میں پڑھے ہوں گے۔ ان کے اندر افسانہ نگاری کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں مگر کاہلی کی بنا پر لکھنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کو ادب کی دنیا میں داخل ہونے اور افسانہ لکھنے کی ترغیب دینے میں علی سردار جعفری کا ہی ہاتھ ہے۔ اس طرح گویا معین اشرف کو افسانہ نگار بنانے کا سہرا جعفری صاحب کے ہی سر جاتا ہے۔'' 264

سردار جعفری ان ادیبوں میں سے تھے جو دوسروں کی ادبی کاوشوں کو سن کر خوش ہوتے تھے۔ نگار عظیم اور ان کے شوہر عظیم صاحب سردار جعفری سے ملاقات کا وقت لے کر ان کے گھر پہونچے۔ نگار عظیم لکھتی ہیں:

''کتنی باتیں ہوئی تھیں اس پہلی ملاقات میں۔ سارا شجرہ معلوم کر لیا تھا میرا اور عظیم صاحب کا بہت خوشی کا اظہار کیا تھا

اس بات سے کہ میں بھی قلم سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' 265

عمر رضا نے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے نہ صرف یہ کہ ادب اور صحافت بلکہ فلم اور ٹیلی ویژن کی دنیا میں بھی اپنی ایک حیثیت قائم کر رکھی تھی اور ان تمام ذرائع کا استعمال انہوں نے اپنی صحت مند فکر کو عوام تک پہنچانے کے لیے کیا جس کے ذریعے انہوں نے مشرق و مغرب کی تفریق مٹانے کے معاشرتی استحصال و عدم مساوات جیسے مسائل کی طرف پوری دنیا کی توجہ مرکوز کر کے عالمی امن' انسانی مساوات اور رواداری کی دعوت دی۔'' 266

سردار جعفری کی پرورش اور تربیت علمی گھرانہ میں ہوئی اور وہاں حق و انصاف کی خاطر جان کی بازی لگا دینا فریضۂ آدمیت قرار دیا جاتا تھا۔اس ماحول کے پروردہ سردار جعفری نے انسانیت اور انسان دوستی پر مبنی جو نصب العین بنایا تھا اس پر وہ زندگی بھر خلوص نیت سے کاربند رہے۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''ایک مخصوص ماحول اور تہذیب کے پروردہ سردار جعفری اپنے ہر لفظ سے اپنی فکر و نظر کی آئنہ داری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ ماحول جس میں حق پرستی کی تعلیم دی گئی' جس میں سرفروشی کی اہمیت سمجھائی گئی' جہاں علم کو ہر دولت پر فوقیت دی گئی' جہاں مظلوموں کی حمایت نے بغاوت کا احساس اور انقلاب کا نعرہ عطا کیا' سردار جعفری کی جڑیں اسی سرسبز و نم مٹی میں پیوست ہیں اور سر آسمان کی طرف' مگر ان کے پاؤں اپنی زمین سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔اسی لیے ان کی بالاقدی کو بآسانی ناپا جا سکتا ہے۔وہ نہ ہواؤں میں اُڑے' نہ خلاؤں میں کھوئے' نہ زمین سے بچھڑے۔انہوں نے ہر مقدس ہاتھ کی تعظیم و تکریم کی۔چاہے وہ یزیدیت کے خلاف بولنے والے ہوں یا تحریک آزادی میں انقلاب زندہ باد' کا نعرہ لگانے والے کسی مجاہد وطن کے' انسان دوستی کے ترانے گانے والے کسی شاعر کے یا محنت کرنے والے کسی کسان یا مزدور کے۔انہوں نے لہو کی عظمت کو پہچانا۔سروں کو مقدس جانا' اور قلم کی حرمت کو مقدم گردانا۔نفرت سے نفرت کی اور محبت سے محبت۔انسانیت اور انسان دوستی کو فریضۂ آدمیت قرار دیا۔چھوٹوں کا احترام کیا' بڑوں کو مشعل راہ بنایا۔'' 267

پرآشوب دور' انتہائی مصروف زندگی ہمیشہ خوش و خرم اور متبسم:

یوسف ناظم نے سردار جعفری کی دشوار زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اُن کے (سردار جعفری) کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں بچھی تھی۔سخت کھردرے اور نکیلے پتھر کنکر بکھرے ہوئے تھے اور علی سردار جعفری نے زخمی تلووں کے سہارے انہی پتھروں پر چل کر اپنا 87 سالہ سفر مکمل کیا تھا۔۔۔خود مسافر کو حیرت ہوتی ہوگی کہ وہ منزل عشق پر کیسے کامیاب و کامران پہنچ پایا جب کہ اس کے سارے ساتھی ایک ایک کر کے راستے میں چھوٹ گئے یا کنارہ کش ہو کر خاموش بیٹھ گئے تھے۔'' 268

مجتبیٰ حسین نے سردار جعفری کے پُرآشوب عہد کا ذکر کیا ساتھ ہی سردار جعفری کی ستائش بھی کی کہ انہوں نے اپنے عہد

کے پر آشوب دور میں بھی بھرپور اور قابل رشک زندگی گزاری۔ وہ رقمطراز ہیں:

''پوری بیسویں صدی کے لگ بھگ سارے اہم واقعات اور حوادث کو انہوں نے برصغیر کے تناظر میں پورے ہوش و حواس اور فہم و ادراک کے ساتھ جھیلا ہے۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ میں ایک سنگین اور عجیب و غریب تضادات والی صدی کے روپ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ دو عظیم جنگیں اس صدی میں سردار جعفری کی آنکھوں کے سامنے لڑی گئیں۔ نوآبادیاتی نظام کے پرخچے اڑ گئے۔ برصغیر آزاد ہوا۔ سائنس نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ انسان خلا کی وسعتوں پر قابض ہونے اور دسترس رکھنے کے خواب دیکھنے لگا۔ انقلاب روس بھی اسی صدی میں آیا اور اسی صدی میں اس کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ بیسویں صدی نے انسانیت کو نئے نئے خواب دیے اور اسی صدی میں یہ خواب چکنا چور بھی ہوئے۔ اس صدی میں پیدا ہونا اور پیدا ہو کر پل پل ایک حساس آدمی کی طرح زندہ رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سردار جعفری نے اسی پُر آشوب صدی میں زندگی جی ہے اور ایسی بھرپور زندگی جی ہے کہ ان کے جینے پر رشک آتا ہے۔ کتنے شعلے تھے جو وقت کی دھار پر چلتے چلتے بجھ گئے یا مدھم پڑ گئے لیکن سردار جعفری نے اس صدی کے ایک ایک پل کے ساتھ جینا نہیں چھوڑا۔'' 269

بے حد مصروف زندگی:

سردار جعفری نے بے حد مصروف زندگی گزاری ہے۔

علی احمد فاطمی کے نام تحریر کردہ ان کے صرف تین خطوط کے اقتباس پیش ہیں جن سے ان کی مصروف زندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

8 مارچ 1998ء: ''جشن غالب الٰہ آباد میں 17 مارچ کو ہے یا 11 اپریل کو غالباً کسی خط میں 11 اپریل ہے۔ میرے لیے دونوں تاریخیں ناموزوں ہیں۔ میں وسط مئی تک بیحد مصروف ہوں تفصیلات سے تم اندازہ لگا سکتے ہو۔

11 سے 16 مارچ تک ساہتیہ اکیڈمی کی تقریبات اور شاعری پر سمینار۔

7 اور 19 کے درمیان علی گڑھ میں صابرہ زیدی یادگاری تقریبات۔

22 مارچ پٹنہ میں مشاعرہ۔

23 مارچ بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں گیان پیٹھ ایوارڈ کا جشن اور چھوٹا سا سمینار۔

25 مارچ پونے میں ایک مراٹھی ادبی تنظیم کی طرف سے جلسہ۔

28 مارچ حیدرآباد میں جشن غالب کا افتتاح۔

30 مارچ نئی دہلی میں کتھا نام کی تنظیم کی طرف سے ادیبوں کو انعامات۔

3 اپریل لدھیانے میں ایک جلسہ۔

5 اپریل کو جشن غالب اور جشن ساحر لدھیانوی۔

6 اپریل اور 13 اپریل کے درمیان عالمی اردو کانفرنس کی طرف سے جشن غالب

6 سے 20 تک سردار جعفری جشن کے مشاعرے اور مذاکرے۔

22 اپریل کو دوحہ میں مشاعرہ۔

اس کے بعد اپریل کے آخری ہفتہ میں دہلی میں گیان پیٹھ ایوارڈ کی تقریبات مئی کے پہلے یا دوسرے ہفتہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں میری تقریر کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اگر وہاں جانا ہوا تو آخری مئی سے پہلے ہندوستان میں واپسی نہیں ہوگی جون میں اطہر بنی لکھنو میں جوش ملیح آبادی کا صد سالہ جشن منانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ 28 اپریل 1998ء ۔۔۔ ایسے فرصت کے دنوں میں لکھنے کا کام کرتا رہا اس وقت بھی دو نہایت اہم مضامین لکھے ہیں۔ ایک تو گیان پیٹھ کی تقریبات کے وقت شائع ہونے والی کتاب کا دیباچہ اور دوسری انعام کے بعد شکریے کی تقریر جو پہلے شائع کر کے تقسیم کر دی جائے گی۔ کتاب اسی نوے تخلیقات پر مشتمل ہے۔ تیس پرانی چیزیں اور پچاس ساٹھ نئی چیزیں۔"

10 اگست 1998: "۔۔۔ میں بے انتہا مصروف ہوں۔ ایک دن بھی سانس لینے کے لیے نہیں مل رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ خطوں کے جواب لکھنا مشکل ہے ۔۔۔ تمہارے رسالہ کے لئے دس ہزار کے اشتہار کا وعدہ پورا کرنا ہے۔ جلد ہی کوئی سبیل نکالوں گا۔ اس رسالہ کا ہر حالت میں جاری رہنا ضروری ہے۔ تمہاری ہمت اور محنت قابل داد ہے ۔۔۔ آج اپنی نظموں کی ریکارڈنگ میں مصروف ہوں۔ کل جودھپور جا رہا ہوں۔ کامریڈ ایچ کے دیاس میموریل لکچر کے لیے۔ واپس آ کر حیدرآباد اور پھر دہلی چلا جاؤں گا۔ پانچ، چھ تقریبات اور کانفرنس ہیں۔ وسط ستمبر تک واپس آسکوں گا۔ پھر دو تین روز کا سفر درپیش ہے اور اکتوبر کا مہینہ آجائے گا۔ اس میں بھی مصروفیات کا یہی عالم ہے"۔

مجتبیٰ حسین نے سردار جعفری کی ہمہ جہت مصروف زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"دراصل میں سردار جعفری نے ادب سے اپنے سروکار کو کچھ ایسا مستحکم اور اٹوٹ بنایا کہ بھلے ہی کوئی انھیں شاعر، ادیب اور دانشور نہ مانے پھر بھی انہوں نے ادب اور سراسر ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا، اُٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا بنالیا۔ ادب سے ایسا والہانہ سروکار شاید ہی اُردو کے کسی اور ادیب کی زندگی میں نظر آئے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی اور اپنے مخالفین سے نبرد آزما ہوتے وقت انھیں پینترے بدلنے پڑے۔ انہوں نے پینترے ضرور بدلے لیکن تھک ہار کر نہیں بیٹھ گئے۔ وہ اصل میں کل وقتی ادیب ہیں ہماری طرح جز وقتی ادیب نہیں جنھیں ادب لکھنے کے ساتھ ساتھ بجلی، پانی اور ٹیلی فون کے بل جمع کرنے پڑتے ہیں۔ بال بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سودا سلف لانے کے لیے بھی جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی بال بھی بنوانے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی مجبوری میں ادبی محفلوں میں بھی جانا پڑتا ہے پچھلے چالیس برسوں میں ہم نے جب بھی سردار جعفری کو دیکھا ادب اور سماج کی کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے یا بعض وقت سلجھی ہوئی گتھی کو پھر سے الجھانے میں مصروف پایا۔ ان کی شخصیت کی جہتیں بھی کئی ہیں کہانی کار میں (سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا) جہاں وہ حافظ، رومی، غالب، اقبال، کبیر اور ٹیگور کے شیدا ہیں وہیں ایلیا اہرن برگ، لوئی اراگان، پابلو نرودا کے عاشق ہیں۔ مارکس اور اینگلز سے ان کی عقیدت کا یہ عالم ہے ۔۔۔ اب تو ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان دونوں کی مدافعت میں ہی گزر جاتا ہے۔" 271

زندگی خوشی اور غم سے عبارت ہے کوئی شخص کیوں نہ ہو اُسے کوئی نہ کوئی مسئلہ کبھی نہ کبھی پیش آتا ہی ہے اُن مسائل کے

درمیان آدمی کا خوش وخرم رہنا' مسکراتے ہوئے زندگی گزار دینا راضی بہ رضا رہنے والی Rare شخصیتوں کے پاس ہی نظر آسکتا ہے سردار جعفری کا شمار ایسے ہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

''سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں کچھ اس طرح کہ وہ صدی کی پہچان اور صدی ان کی پہچان کا حوالہ بن جاتی ہے۔وہ پوری صدی پر چھائے رہے' سرگرم رہے۔زندگی کے آخری لمحے تک فکرمند' سرگرم' متکلم' بے پناہ کام' بے پناہ مصروف' بے پناہ سفر لیکن وہ خوش رہتے اور مسکراتے رہتے۔زبردست اختلافات ہوتے لیکن وہ مسکراتے رہتے۔اپنے ہی دوستوں سے گلے شکوے لعن طعن ہوتی وہ مسکراتے رہتے۔اکثر گھریلو قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے وہ مسکراتے رہتے کہ مسکراہٹ ان کی دلنواز شخصیت کا حصہ بن گئی۔''

272

خوش مزاج:

سردار جعفری نے راہی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''میں ایک لطیفہ بھی سنا دوں۔ہماری ایک بھانجی ہے۔سلطانہ کی بہن کی بیٹی۔ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔وہ پوری طرح وفادار ہیں پاکستان کی اور بڑی اچھی بات ہے۔ہونا بھی چاہیے۔جب آتی ہیں تو یہی کہتی ہیں کہ ''خالو'' آپ کے ہاں کیا رکھا ہے۔بمبئی میں درخت پہ درخت' پتھر پہ پتھر' اینٹ پہ اینٹ۔ہمارے پنجاب میں تو یوں ہے'' ایک دن میں عاجز آ گیا۔میں نے کہا۔دیکھو بی بی! دنیا کی بہترین چیزیں صرف ہندوستان میں ہوتی ہیں۔یہیں ملتی ہیں'' کہنے لگیں ''ایک کا نام بتا دیجئے'' میں نے کہا ''پاکستان' تو یہ بات میں نے جمیل الدین عالی کے لیے بھی کہی کہ یہ بھی ہمارے ہندوستان کا ہے۔مہدی حسن بھی ہمارے ہندوستان کا ہے۔پروین شاکر بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔عشرت آفریں بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔زہرا نگاہ بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔سب یہیں کا مال ہے۔میڈ ان انڈیا (Made in India)''

273

(انٹرویو 18 اپریل 1990ء۔راہی معصوم رضا۔سردار جعفری' گفتگو بند نہ ہو)

سردار جعفری کا اثر معاصرین پر:

عبدالاحد ساز اور ان کے ساتھیوں نے سردار جعفری کا اثر قبول کیا۔انہوں نے تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ چند اقتباسات پیش ہیں۔

1۔''ہم نے اپنے ساتھ کے شعر کہنے والے دوستوں سے جب تبادلہ خیال کیا اور یہ پوچھا کہ وہ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں اپنے شعری مطالبات کی ابتداء میں کن شعراء سے متاثر ہوئے تھے تو' رات بھر کی گفتگو کے بعد صبح تک جو حرف و فا ڈھل کر سامنے آیا وہ یہی تھا کہ صاحب' اسکول کے آخری ایام میں یا کالج کے زمانے میں درسی کتابوں سے باہر جو شاعری پھیلی ہوئی تھی اور جو ہماری جذباتی و ذہنی نشو ونما اور ہمارے فکر و شعور کی ساخت کا حصہ بنی اور ہماری سائیکی میں جذب ہوئی اس میں سردار جعفری اور ان کے معاصرین کی شاعری کا بڑا رقبہ تھا۔۔۔۔جب ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں 'ایشیا جاگ اُٹھا'' پڑھی تھی تو اس نے ہمارے دائرۂ نظر کو وسیع کیا تھا' ہمارے ذوق جمال کی پذیرائی کی تھی اور ہمیں فنی پیرایۂ اظہار کی جدتوں اور

ندرتوں سے بہرہ ور کیا تھا۔۔۔"

"۔۔۔ہمارے ہمعصر شعراء کے دو ڈھائی دہائیوں کے شعری سفر کے بعض مقامات پر جعفری صاحب' کے قدموں کی چاپ کہیں کہسار میں گونجتی ہوئی اور کہیں زیر سنگ خنک پانیوں کے چشمے کے ترنم کی طرح سنائی دیتی ہیں۔۔۔فنی و شعری سطح پر احساس و آگہی کی رو سے' ادبی وژن کے ضمن میں' فکر و نظر کی وسعتوں اور ذوقِ حسن کی لطافتوں کے باب میں ہم جعفری صاحب کی شاعری کے ساتھ Grow ہوئے ہیں۔۔۔یہ شاعری صرف اپنے عہد کے حصار میں گھٹ کر رہ جانے والی نہیں بلکہ اس حصار کو توڑ کر آئندہ زمانوں کی کھلی فضا میں پرواز کرنے والی' آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سائے دراز کرنے اور اپنی کرنیں مرکوز کرنے والی اور اُردو شعریات کی پیشانی پر اپنی نگاہوں کا عکس چھوڑ جانے والی شاعری ہے۔یہ شاعری روایتوں کی امین بھی ہے اور جدتوں کی نقیب بھی۔" 274

مشہور شاعر کیفی اعظمی نے سردار جعفری سے جو اثر قبول کیا تھا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

"احتشام حسین و سردار جعفری کی ملاقاتوں اور باتوں' کمیونسٹ لٹریچر کی حکایتوں اور حرارتوں سے وہ (کیفی) اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کا تیور اور آہنگ بھی بدل گیا۔۔۔یہ ملاقات یہ رابطے 1943ء کے آس پاس کے ہیں۔۔۔علی سردار جعفری اور سجاد ظہیر، کیفی اعظمی کو بمبئی لے گئے اور ترقی پسند تحریک کے رکن ہو گئے۔یہ بات 1943ء کی ہے۔ 275

پروفیسر محمود الحسن رقمطراز ہیں:

"انجمن کی نشستوں کے زیر اثر شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات کے مطالعہ کا ذوق بڑھا' مارکسی نظریات کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور یہی زمانہ تھا جب سردار جعفری کی شخصیت اور ان کی ادبی' سماجی و سیاسی خدمات کے غائبانہ تعارف سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔۔۔یہ اشتیاق بے چینی سے تھا کہ ان سے ملنے کا موقع ملتا اور یہ خواہش ۱۹۵۵ء میں پوری ہوئی۔" 276

نگار عظیم لکھتی ہیں:

"رشتوں کا جو معیار علی سردار جعفری کے یہاں ملتا ہے وہ ان کی آفاقی شہرت کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ان کی انسان دوستی دلوں پر گہرا نقش چھوڑتی ہے۔عظیم صاحب (نگار عظیم کے شوہر) بھی مجھ سے کچھ کم متاثر نہ تھے ان کی شخصیت سے" علی سردار جعفری نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔

انہوں نے زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے جوجھنا سکھایا۔وہ کہتے تھے کہ کھل کر مڈ رہو کر اپنے فن کو استعمال کرو۔تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے اور قلمکار کی ذمہ داری۔" 277

آخری تحریر:

رضا جعفری نے علی سردار جعفری کی آخری تحریر کے متعلق لکھا ہے:

''سردار جعفری گھر کے اندر ہوں یا گھر کے باہر۔ وہ ہمیشہ بڑی تیز اور حساس نظر رکھتے تھے۔ وہ ہر بات میں اپنے آپ کو شریک رکھنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ صحت مند رہے ان کا ذہن کسی کمپوٹر کی طرح برق رفتاری سے کام کرتا تھا۔ آخری عمر میں جب برگِ زبان سے نطق وصدا کی ساری تتلیاں اڑ چکی تھیں اس وقت بھی ان کا ذہن کسی بے ترتیبی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور کبھی کبھی راکھ سے بھی چنگاری نکل آتی تھی۔ ایسا ہی کرشمہ ممبئی کے ان کے گھر میں دیکھنے میں آیا۔ انتقال سے کچھ مہینے پہلے وہ اپنے بستر پر بے حس پڑے تھے۔ ایسے میں اچانک کہیں دور سے کوئل کی آواز سنائی دی۔ ان کی بھتیجی جو پاس ہی بیٹھی تھی بے ساختہ بول پڑی ''کہیں کوئل بول رہی ہے'' اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ایسا لگا جیسے سردار جعفری کے بے حس جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا ہو۔ اُسی وقت ان کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔ وہ بجھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے ''کوئل بولتی نہیں، کوئل کوکتی ہے'' اور پھر اپنے ذہنی کمزوری میں وہ برابر دہراتے رہے ''کوئل کوکتی ہے'' ان کی اس ذہنی بیداری کو دیکھ کر سبھی خوش ہو گئے۔ ان کی بھتیجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو فرط جذبات میں ایک کاغذ اور قلم اس نے آگے کر دیا۔ ''چچا جان! یہی جملہ اس کاغذ پر لکھ دیجئے'' ۔ اور سردار جعفری نے بچوں کی طرح کہنا مانتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی پھوٹی تحریر میں پورے کاغذ پر جملہ پھیلا دیا ''کوئل کوکتی ہے'' شاید یہی ان کی آخری تحریر ہے جو ان کی بھتیجی کے پاس کسی گراں قدر رسوغات کی طرح آج بھی محفوظ ہے۔'' 278

زندگی کا احتساب:

زندگی بھر کا احتساب کرتے ہوئے ایک جگہ سردار جعفری نے اپنے بارے میں لکھا تھا:

''میں جب بھی پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی کامیاب گزری۔ لیکن میں وہ سب کچھ نہ کر سکا جو میں چاہتا تھا۔ کاش! میں نے اس سے بھی اچھی شاعری کی ہوتی۔ اس سے بھی زیادہ کتابیں لکھی ہوتیں! لیکن کیسے؟ ۔۔۔ میرا تو بیش تر وقت فکر معاش میں ہی گزر گیا۔ پھر بھی مجھے اُمید ہے کہ میرے بعد آنے والے ادیب اور شاعر میری فکر کو بڑھائیں گے اور اسے تکمیل تک پہونچائیں گے۔ زندگی کے جن حسین پہلوؤں تک میری نگاہ نہ جا سکی وہ ان پہلوؤں کو ضرور دیکھیں گے، محسوس کریں گے، سمجھیں گے اور سمجھائیں گے۔'' 279

علالت:

کئی سال سے سردار جعفری کی صحت بگڑتی جا رہی تھی۔ معمولی سا ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ فضیل جعفری نے سردار جعفری کی علالت کے بارے میں لکھا ہے:

''گزشتہ چار پانچ برسوں میں میری ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات 18 مارچ 2000ء کو ہوئی۔ میرے ایک پرانے دوست جناب سمیع خطیب نے جوہو میں اپنے پرانے بنگلے کو منہدم کر کے نیا بنگلہ بنوایا تھا۔ انہوں نے اپنے نئے بنگلے کے سلسلہ میں ایک تقریب منعقد کی ۔۔۔ میں لان میں کھڑا ہوا اپنے کچھ پرانے ساتھی اساتذہ کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ سردار جعفری بھی آئے ہوئے ہیں اور اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔۔۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ انہوں نے صرف ہاتھ اُٹھا دیا۔ میں نے کہا آپ کی سالگرہ کے دن گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ حیدرآباد گئے ہوئے

ہیں۔انہوں نے جواب دیا کہ ''حیدرآباد جانے کا خیال تھا لیکن گیا نہیں۔میں ممبئی ہی میں تھا'' دراصل اس وقت تک ان کی یادداشت جواب دے چکی تھی کیوں کہ کچھ دنوں بعد بیگم سلطانہ جعفری نے بتایا کہ سردار جعفری اُس دن واقعی حیدرآباد میں ہی تھے۔سلطانہ بھابھی نے اپنے گھر پر اسی ملاقات کے دوران بتایا کہ جعفری صاحب بامبے اسپتال میں تھے۔ان کے دماغ کے اگلے دونوں حصوں میں ٹیومر کی تشخیص ہوئی تھی۔وہ اب نہ کچھ بول سکتے تھے اور نہ ہی کسی کو پہچان پاتے تھے۔بیگم جعفری نے یہ بھی بتایا کہ دماغ میں ٹیومر ہونے کے باوجود کسی کو ان کی بیماری کا اندازہ نہیں ہوا۔انہوں نے کبھی سر درد کی شکایت نہیں کی۔ ہاں ادھر چند ماہ سے بہت کم گفتگو کرنے لگے تھے۔اگر کچھ بولتے بھی تو ٹھہر ٹھہر کر اور بڑی دھیمی آواز میں۔ان کی بیماری کا پتہ بہت بعد میں چلا۔یہ جون 2000ء کی بات ہے۔۔۔وہ اسپتال داخل ہو گئے۔دو چار دنوں کے لیے گھر لوٹے لیکن پھر اسپتال میں انھیں دیکھنے کے لیے آخری بار سنیچر 29 جولائی کو بامبے اسپتال گیا۔پتہ چلا کہ انھیں اسپتال کی نئی بلڈنگ کے بستر نمبر 1059 سے پرانی بلڈنگ کے ICU کے بستر نمبر 378 پر منتقل کر دیا گیا ہے۔میں انھیں دیکھ کر بے حد افسردہ ہو گیا۔ان کے وہ لمبے لمبے گھنے بال جو برسوں سے ان کی شخصیت کا حصہ تھے اور جن پر وقفے وقفے سے ہاتھ پھیرنا ان کی ایک خاص اور پر کشش شاعرانہ ادا بن چکی تھی، نابکار شعاعوں کی وجہ سے بالکل صاف ہو چکے تھے۔وہ بستر پر ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری بنے پڑے تھے۔ناک اور منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک کی مدد سے صرف ان کی سانس چل رہی تھی۔اس وقت ایک لیڈی ڈاکٹر انھیں انجکشن دے رہی تھی۔جب وہ کیبن سے باہر نکلی اور میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے دھیمے اور غمگین لہجے میں کہا کہ ''اب کوئی اُمید نہیں ہے''۔یکم اگست 2000ء کی صبح انہوں نے اپنا سفر مکمل کر لیا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔''

سردار جعفری کی عیادت:

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال اور ان کی اہلیہ کی سردار جعفری کی عیادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہماری زبان'' 8 جولائی 2000ء کے شمارے میں ایک خبر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔خبر یہ تھی کہ سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال اور ان کی اہلیہ محترمہ شیلا گجرال علی سردار جعفری کی عیادت کرنے ممبئی ان کے پاس گئے جو شدت سے علیل تھے اور ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔اس وقت ان کے پاس ان کی اہلیہ محترمہ سلطانہ جعفری، ان کی بیٹی، بیٹا اور ان کے ایک دوست ان کی خدمت میں موجود تھے۔سردار کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کو وہ لیٹے ہوئے دیکھ رہے تھے (کتاب کا نام درج نہیں) بیگم سلطانہ نے سردار کی توجہ ان کی طرف دلائی۔سابق وزیر اعظم نے علی سردار جعفری کا کندھا پکڑ کر یہ کہا کہ سردار کیا پڑھ رہے ہو لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔خاموش پڑے رہے۔مسز سلطانہ بار بار کہتی رہیں کہ کچھ تو بولو گجرال اور شیلا دونوں دہلی سے صرف تمہی سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ان سے کم سے کم بات تو کرو لیکن شاید ان کے کانوں تک یہ آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔اسی لیے وہ بار بار اپنی خاموشی کا اظہار کر رہے تھے۔وہ دونوں گھنٹوں سردار کی عیادت میں رہے۔آخر بجھے دل

سے انھیں الوداع کہا۔انھیں بھی اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔سردار سے ہاتھ ملایا تو انھیں احساس ہوا کہ جس گرم جوشی سے ہاتھ ملایا کرتے تھے وہ گرم جوشی نہیں رہی۔آخر وہ لوگ اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئے مگر یہ جملہ کہتے گئے کہ ''یہ روشن چراغ بجھ بھی گیا تو بھی یہ آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتا رہے گا۔'' 281

وفات،نماز جنازہ اور تدفین:

علی سردار جعفری نے یکم اگست 2000ء کو ممبئی میں وفات پائی۔پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے کہ سردار جعفری کی پہلی نماز جنازہ شیعہ قبرستان رحمت آباد میں اور دوسری نماز جنازہ سنی قبرستان جوہو میں ہوئی۔ 282

فضیل جعفری نے لکھا ہے ''پہلے یہ طے ہوا کہ انھیں (سردار جعفری) اثناعشری قبرستان،رحمت آباد میں دفن کیا جائے لیکن پھر بیگم سلطانہ جعفری کی خواہش کے احترام میں جوہو کے اسی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا جہاں ان کے کئی قریبی دوست خواجہ احمد عباس،مجروح سلطان پوری،ساحر لدھیانوی،جاں نثار اختر اور راہی معصوم رضا پہلے سے ہی زیر خاک آرام کر رہے ہیں۔ 283

سردار جعفری موت سے کبھی خائف نہیں رہے۔وہ اُسے زندگی کے تسلسل کا ایک حصہ خیال کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا:

''ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ موت کی حکمرانی ہے دنیا پر لیکن یہ واقعہ نہیں ہے کیوں کہ اگر موت کی حکمرانی ہوتی تو یہ دنیا قبرستان ہوتی۔آبادی بڑھتی چلی جارہی ہے۔اس لیے زندگی موت پر حاوی ہے۔

صدیوں سے اسی صورت
ہے حکمِ سفر جاری
کل صبح کے دامن میں تم ہوں گے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر کچھ نقش قدم ہوں گے
سائے میں درختوں کے پھر لوگ بہم ہوں گے

سید عزیز قادری نے قطعات (تاریخ وفات علی سردار جعفری) لکھے۔ملاحظہ کیجیے:

1۔ ہوگا اشکوں سے تر دامن
چشم نم کا دن آئے گا
ہم کو علی سردار خبر تھی
رنج کا غم کا دن آئے گا 1421ھ

2۔ اشکوں کی روانی سے
دامن ہے میرا بھی نم
سردار کی رحلت پر
لے آیا ثبوت غم 285

ڈاکٹرمحمد ولی الحق انصاری نے قطعہ تاریخ وفات مجروح وعلی سردار جعفری لکھا۔ملاحظہ کیجئے: ؎

دو شاعر یگانہ امسال درگزشتند

یک عاشق غزل مرد یک مرد آگہی مرد

مجروح رفت اول ازایں جہان فانی

پس از وفات او ہم سردار جعفری مرد

چوں سالِ فوتِ ایشان پرسیدم از ولی گفت

ہے ہے زمرگ ایشان لیلیٰ شاعری مرد

مصراعِ زیریں اعداد اسم من خواں مجروح مردہ و بعدش سردار جعفری مرد

1954+46=2000 (اعداد ولی)

تعزیت:

اندر کمار گجرال، سابق وزیر اعظم ہند نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا:

''علی سردار جعفری کا انتقال ادبی دنیا کے لیے بہت دردناک سانحہ ہے۔ہندوستانی تاریخ کے کئی موڑوں پر ان کا تعاون بے پناہ وسیع تھا۔آزادی کے بعد کچھ کم نظروں نے ہندی اُردو کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی۔سردار جعفری ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس خلیج کو پاٹ کر دائمی رشتوں کو مضبوط کیا۔آج اُردو کے لیے ماحول میں جو خوشگوار تبدیلی آئی ہے اس میں سردار جعفری کا خاصا دخل ہے۔عام طور پر جب کبھی ترقی پسند مصنّفین کے متعلق بات کی جاتی ہے تو یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ اس تحریک کی دین صرف اُردو ادب کو نہیں تھی۔اس تحریک نے ہر زبان کو نئی سوچ دی تھی۔اس کا اثر اُردو زبان پر تو تھا ہی لیکن ہندی اور دیگر زبانیں ایسی نہیں تھیں جس نے اس سوچ کو نہ اپنایا ہو۔سردار جعفری نے اپنے آپ کو ساری عمر ایسے مقصد کے ساتھ وابستہ رکھا جو انسان دوستی کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔'' 286

شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی نے تعزیتی جلسہ نہیں کیا:

شعبہ اُردو، ممبئی یونیورسٹی نے علی سردار جعفری کی وفات کے بعد تعزیتی جلسہ تک نہیں کیا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے کہ:

''افسوس کہ ان کے (سردار جعفری) انتقال کے بعد میرے بعد شعبہ اُردو کی باگ ڈور سنبھالنے والوں نے تعزیتی جلسہ تک کو بھی ضروری نہیں سمجھا، اگر چہ وہ جعفری صاحب کی زندگی میں ان سے فیضیاب ہوتے رہے اور جعفری صاحب سے اپنے قرب کا دعویٰ کرتے رہتے۔'' 287

☆☆☆

حواشی

1 رضا جعفری، ماہنامہ آج کل، دہلی، اکتوبر، 2000 صفحہ 5 بحوالہ رضا جعفری، سردار جعفری کا بلرام پور،
ماہنامہ آج کل، اکتوبر 2001، صفحہ 9

2 انور ظہیر خاں، سردار جعفری، جامعہ، جولائی تا ستمبر 1996، صفحہ 128-127 صفحہ 128-127

3 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا: سردار جعفری کی یاد میں، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 118

4 انور جعفری، نیا سفر، الٰہ آباد 17، صفحہ 24-23 بحوالہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ
از رفیعہ شبنم عابدی، صفحہ 21-20

5 ستارہ جعفری، سردار بھائی۔ افکار۔ کراچی، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 195

6 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 59-58

7 رام لعل، سردار سے گفتگو، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1931، صفحہ 136-135

8 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 196

9 ستارہ جعفری، سردار جعفری۔ افکار۔ کراچی، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 197

10 ستارہ جعفری، سردار جعفری، افکار، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 218 ,216, 197

11 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991، صفحہ 218

12 علی سردار جعفری: ایک نظر میں ماہنامہ ہمارا ادب، بھوپال، ستمبر 2000، صفحہ 4

13 اردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 28

14 سوانحی خاکہ مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 46

15 سوانحی خاکہ، ایوان اردو، علی سردار جعفری نمبر، ستمبر 2000

16 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 55

17 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 22

18 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر صفحہ 197

19 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 56

20 علی سردار جعفری، خودنوشت، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 641

21 ڈاکٹر جاوید کامٹوی، علی سردار جعفری اور مرثیہ نگاری، نیا دور، دسمبر 2009ء، صفحہ 33

22 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 198-197
23 سردار جعفری،لکھنو کی پانچ راتیں صفحہ 18
24 ڈاکٹر معین الدین جینابڑے،علی سردار جعفری کی منزل تعارف وتجزیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص) شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 472-471
25 ڈاکٹر صاحب علی،علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 453-452
26 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 199-198
27 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 199-198
28 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 204
29 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991،صفحہ 198, 200,201
30 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 205
31 رضا جعفری،سردار جعفری،کابلرام پور،آج کل،اکتوبر 2001،صفحہ 7
32 رباب جعفری،میرے بھائی،افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 190
33 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 199
34 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 69
35 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 206
36 ستارۂ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 210
37 خواجہ تصور علی حیدر،علی سردار جعفری کا زمانہ طالب علمی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 184-183
38 خواجہ تصور علی حیدر،علی سردار جعفری کا زمانہ طالب علمی،افکار،کراچی سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء ،صفحہ 184
39 علی سردار جعفری،خودنوشت،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء،صفحہ 647
40 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،علی سردار جعفری،شخصیت اور شاعری جرنل ستمبر 1999ء صفحہ 93
41 انور ظہیر خاں،سردار جعفری،جامعہ جولائی تا ستمبر 1996ء صفحہ 139
42 علی سردار جعفری،لکھنؤ کی پانچ راتیں،صفحہ 67
43 علی سردار جعفری،لکھنؤ کی پانچ راتیں صفحہ 31
44 علی جواد زیدی،رفیق زنداں سردار،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991،صفحہ 169,170

45 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 397-396

46 علی سردار جعفری، ایک منزل محبت کی بھی (مرتبہ سمرتھ بالی) کتاب نما، سردار جعفری نمبر، جلد 30، شمارہ 11، نومبر 1990ء صفحہ 59 بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 88

47 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945ء تا 1958ء، صفحہ 40, 53, 54

48 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 99

49 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 216

50 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958ء صفحہ 71, 72

51 شوکت کیفی، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 76

52 سلطانہ جعفری، میر سردار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 51-50

53 ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، علی سردار جعفری سے ملاقات، اردو دنیا، جنوری تا مارچ 1998ء صفحہ 78

54 محمد اسداللہ، سردار بھائی مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 199-198

55 سید محمد مہدی، سردار جعفری: شخصیت کے چند پہلو، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 85

56 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار ایک مطالعہ، صفحہ 26, 27

57 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 62

58 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 72 '69

59 سلطانہ جعفری، میر اسردار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 52

60 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 200

61 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 62

62 سبط حسن، سردار جعفری: چند باتیں، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 72

63 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر، دسمبر 1991ء، صفحہ 200, 210

64 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر، 2001
(سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 89, 90
65 سلطانہ جعفری، میرا سردار، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 52
66 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، یاترا (رپورتاژ) صفحہ 44
67 محمد ایوب واقف، مکاتب علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 448
68 پروفیسر عبدالستار دلوی، سوانحی خاکہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 46
69 رباب جعفری، میرے بھائی، افکار، کراچی، علی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 190
70 علی سردار جعفری، خودنوشت، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 647
71 علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت اور زندگی کے آئینے میں) پہلی قسط، آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ 8
72 علی سردار جعفری، اگر آرزو اور تمنا ہو تو تاخیر میں بھی لذت ہے، اردو دنیا، جولائی تا ستمبر 1998ء، صفحہ 17
73 ستارہ جعفری، سردار بھائی، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001 (سردار جعفری: فن اور شخصیت)
صفحہ 49, 51
74 فضیل جعفری، علی سردار جعفری: چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، صفحہ 32
75 ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا، میرے بزرگ دوست، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 8
76 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری، کتاب نما، اپریل 2003، صفحہ 10
77 ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا، میرے بزرگ دوست، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 9
78 انیس چشتی، علی سردار جعفری: کچھ یادیں، کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 100, 101
79 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 199
80 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، کتاب نما، خصوصی شمارہ سردار جعفری، صفحہ 55
81 شوکت کیفی، سردار جعفری: میرے ہمدم میرے دوست، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر
نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 222
82 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 398-397
83 یوسف ناظم، متحرک علی سردار جعفری، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 239
84 انور ظہیر خاں، سردار جعفری، جامعہ، جولائی تا ستمبر 1996ء، صفحہ 162, 139

85 رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 82

86 علی سردار جعفری حرف آخر، ترقی پسند ادیب

87 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو، نیا سفر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 46-45

88 علی جواد زیدی، رفیق زنداں، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 173-172

89 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں: خودنوشت 1945 تا 1958، صفحہ 66

90 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 397

91 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز، سردار جعفری: فن اور شخصیت، عالمی اردو ادب 2001،
سردار جعفری نمبر، صفحہ 92

92 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ، افکار کراچی،
سردار جعفری نمبر، صفحہ 16-15

93 پروفیسر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام،
عالمی اردو ادب 2001ء، سردار جعفری نمبر، سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 124

94 پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، سردار جعفری کا ایک جائزہ الٰہ آباد کے حوالے سے مشمولہ سردار جعفری: شخص اور فن
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 82-81

95 علی جواد زیدی، رفیق زنداں سردار، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001
(سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 83-82)

96 محمد علی صدیقی، علی سردار جعفری ایک خراج عقیدت، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001، صفحہ 131

97 پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 69-68

98 پروفیسر محمد حسن، خطبہ صدارت: سردار جعفری کی وراثت مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن،
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 21

99 سلمیٰ صدیقی، علی سردار جعفری مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 46

100 پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 34, 33, 32

101 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی صفحہ 388

102 معزہ ابراہیم قاضی، سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 378
103 ڈاکٹر افغان اللہ خاں، نئی دنیا کو سلام، مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 203
104 پروفیسر علیم اللہ حالی، سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،
گاندھی نگر، صفحہ 109
105 پروفیسر علیم اللہ حالی، سردار جعفری پر اقبال کے اثرات مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن،
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 269
106 ڈاکٹر رفعت النساء بیگم، سردار جعفری کی شاعرانہ مرتبت مشمولہ طرز نگارش، صفحہ 13
107 ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، علی سردار جعفری سے ملاقات، اردو دنیا، جنوری تا مارچ 1998ء، صفحہ 78
108 محمد علی صدیقی، علی سردار جعفری: ایک خراج عقیدت، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001، صفحہ 133
109 ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، علی سردار جعفری سے ملاقات، اردو دنیا، جنوری تا مارچ 1998ء، صفحہ 79
110 محبوب الرحمٰن فاروقی، میں پھر آؤں گا، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 2
111 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کو گیان پیٹھ، اردو دنیا، جولائی تا ستمبر 1998ء، صفحہ 181
112 رام لعل، سردار جعفری سے گفتگو، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 132
113 ڈاکٹر وہاب اشرفی، ترقی پسند تحریک اور سردار جعفری کی شاعری، شاعر، فروری 2001ء، صفحہ 22
114 زاہدہ زیدی بحوالہ ابتدائیہ از علی احمد فاطمی، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 8
115 علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، صفحہ 86, 87, 91, 103
116 ڈاکٹر عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 565
117 علی سردار جعفری، حرف اول، پیراہن شرر
118 ڈاکٹر عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 557, 558
119 میر ہاشم، نقیب صبح فردا، علی سردار جعفری، سب رس، حیدرآباد، ستمبر 2007ء، صفحہ 19
120 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں، عالمی اردو ادب 2001 سردار جعفری نمبر،
سردار جعفری فن اور شخصیت، صفحہ 75
121 حمید اختر، ایک چراغ اور بجھا، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 106

122 ساجد رشید، رومانی انقلاب کا آخری سالار، عالمی اردو ادب 2001،
سردار جعفری نمبر، سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 114

123 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر: علی سردار جعفری۔ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی ستمبر 2000، صفحہ 102 ,101

124 ڈاکٹر ابرار رحمانی، میں ہوں تخیل انسان کی پرواز، علی سردار جعفری مشمولہ تلخ و شیریں صفحہ 161 ,157

125 ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی، علی سردار جعفری اور مرثیہ نگاری، نیا دور، دسمبر 2009ء، صفحہ 33

126 ستارہ جعفری، سردار بھائی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، صفحہ 205

127 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 70 ,69

128 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی اور صہبا لکھنوی، علی سردار جعفری: زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ،
افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 16

129 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 94 ,93 ,92

130 حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 74

131 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 197 ,102 ,101

132 انوار الحسن وسطوی، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، ہماری زبان،
علی سردار جعفری نمبر یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 15

133 انیس چشتی، علی سردار جعفری: کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 97

134 ٹائمز آف انڈیا 15 ستمبر 1998ء ترجمہ ارجمند آرا بحوالہ نکہت کاظمی، سردار جعفری کی ایک خواہش،
اردو دنیا ستمبر 2000، صفحہ 27

135 علی احمد فاطمی، کیفی اعظمی اور ترقی پسند تحریک مشمولہ تین ترقی پسند شاعر (سردار، مجروح، کیفی) صفحہ 130

136 ساجد رشید، رومانی انقلاب کا آخری سالار، عالمی، اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 115

137 ساجد رشید، رومانی انقلاب کا آخری سالار، عالمی، اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 116-115

138 ساجد رشید، رومانی انقلاب کا آخری سالار، عالمی، اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 116

139 انوارالحسن وسطوی،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، ہماری زبان،علی سردار جعفری نمبر،
یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 15

140 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کو گیان پیٹھ،اردو دنیا، جولائی تا ستمبر 1998،صفحہ 19-20

141 ضیاءالدین اصلاحی،وفیات،معارف،اگست 2000،صفحہ 144

142 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 113

143 ستارہ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991،صفحہ 207

144 ستارہ جعفری،سردار بھائی،افکار،کراچی،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991 صفحہ 214, 215, 217

145 انوارالحسن وسطوی،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، ہماری زبان،علی سردار جعفری نمبر،
یکم 21/اکتوبر 2000،صفحہ 15

146 برج پریمی،سردار جعفری اور قومی رواداری مشمولہ ذوق نظر از برج پریمی،صفحہ 78

147 مکتوب علی سردار جعفری مورخہ 12/اپریل 1949 بنام سلطانہ جعفری
بحوالہ مظہر امام،شعری اظہار اور سردار جعفری،ماہنامہ ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 42

148 انیس چشتی،علی سردار جعفری، کچھ یادیں، کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 98-99

149 عمر رضا،پیش لفظ،علی سردار جعفری،صفحہ 9

150 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 61-62

151 میر ہاشم،نقیب فردا،علی سردار جعفری،سب رس،حیدرآباد،ستمبر 2007،صفحہ 23

152 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 63

153 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،علی سردار جعفری ایک مطالعہ،صفحہ 42

154 شمیم حنفی/مظہر مہدی (مرتبین)،آزادی کے بعد اردو نظم: ایک انتخاب،صفحہ 177 تا 200

155 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،علی سردار جعفری: ایک مطالعہ،صفحہ 42

156 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،علی سردار جعفری: ایک مطالعہ،صفحہ 32-33

157 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،علی سردار جعفری: ایک مطالعہ،صفحہ 40-41

158 سوانحی خاکہ مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) صفحہ 48

159 پروفیسر عبدالستار دلوی،ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری
مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 270

160 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری،جنل،ستمبر 1999،صفحہ 94

161 ڈاکٹر رفعت انساء بیگم، سردار جعفری کی شاعرانہ مرتبت مشمولہ طرز نگارش از ڈاکٹر رفعت انساء بیگم، صفحہ 30

162 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 33

163 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 34

164 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 34

165 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 35-36

166 مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، اردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 24

167 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 31-32

168 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 40

169 جرنل، پٹنہ، 1995

170 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 39

171 رفعت سروش بحوالہ کتاب نما، سردار جعفری خصوصی شمارہ مرتبہ رفیعہ شبنم عابدی، صفحہ 74

172 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 39

173 سوانحی خاکہ مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 48

174 ابرار رحمانی، علی سردار عہد سے لحد تک، آج کل، اکتوبر 200، صفحہ 2

175 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 38, 40, 42, 43

176 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 39-40
اور سردار جعفری، زندگی کا مختصر سفرنامہ (خودنوشت)، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر
جلد نمبر 19، 200، صفحہ 22, 23

177 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 43

178 انور ظہیر خاں، سردار جعفری، جامعہ جولائی تا ستمبر 1996، صفحہ 143, 144

179 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری ایک مطالعہ، صفحہ 43-44

180 ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 77, 78

181 پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، سردار جعفری کا ایک جائزہ الہ آباد کے حوالے سے،
مشمولہ سردار جعفری (شخصیت اور فن) مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 89

182 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 37-38

183 شوکت کیفی، میرے ہمدم میرے دوست، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، صفحہ 227

184 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 37-36

185 سوانحی خاکہ مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 47

186 پروفیسر محمود الحسن، سردار جعفری: چند تاثرات، کچھ واقعات، صفحہ 101

187 سردار جعفری، زندگی کا مختصر سفر نامہ (خودنوشت) عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001، صفحہ 25-24

188 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، صہبا لکھنوی، علی سردار جعفری: زندگی، شخصیت اور فن کا مستند، جائزہ،
افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 18-17

189 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، صہبا لکھنوی، علی سردار جعفری: زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ،
افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 18

190 آزادی کے بعد اردو شاعری (رپورتاژ از شہزاد انجم) مشمولہ آزادی کے بعد اردو شاعری،
مقالات و مباحث مرتبہ شہزاد انجم، صفحہ 460

191 ساجد رشید، رومانی انقلاب کا آخری سالار مشمولہ سردار جعفری: فن اور شخصیت،
عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر صفحہ 115

192 پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 226

193 رائیس مرزا، ہمارا جواب پیدا کر، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 30

194 پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 226

195 پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، لندن اور لندن: ایک سیاحت نامہ، ایک رپورتاژ، صفحہ 48

196 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کو گیان پیٹھ، اردو دنیا، جولائی تا ستمبر 1998ء، صفحہ 19

197 پروفیسر وارث کرمانی، ملک الشعرأ سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 105-104

198 پروفیسر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام،
عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001۔ سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 127

199 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 66

200 سجاد ظہیر، روشنائی، صفحہ 409

201 پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، سردار جعفری کا ایک جائزہ الہ آباد کے حوالے سے،
مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صحہ 89 ,84 ,83 ,81 ,80 ,78

202 پرکاش پنڈت، کھت کبیر سنو بھی سادھو، صفحہ 152 ,149 ,148 ,146 ,143

203 عمر رضا علی سردار جعفری، صفحہ 95-94

204 پروفیسر آل احمد سرور، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس صفحہ 42

205 وارث کرمانی، سردار جعفری، شاعر، مارچ 1998، صفحہ 6

206 ھما جمال رضوی (مرتب)، ''رام لعل کے شب و روز 1953 سے'': ادبی ڈائری کے اوراق''
صفحہ 298 ,297 ,285 ,150 ,147 ,146 ,127 ,94 ,93

207 علی احمد فاطمی، یاترا (رپورتاژ) صفحہ 91

208 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 59-58

209 راہی معصوم رضا، سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 89

210 ایس کے بھٹناگر (مرتب) گل دستہ 18 ,11 ,10 ,8 ,7 ,6

211 افتخار امام صدیقی، بمبئی کے مشاہیر شعرا اور مشاعرے، شاعر، جنوری 2010، صفحہ 57

212 علی سردار جعفری، زندگی کا مختصر سفر نامہ، سہ ماہی نخلستان، جے پور، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 112

213 اظہار اثر، ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس مشمولہ اردو میں رپورتاژ نگاری
مرتبہ عبدالعزیز، صفحہ 272 ,261 ,260 ,256 ,251 ,240 ,239

214 علی احمد فاطمی، جڑیں اور کانپلیں (دور پورتاژ) صفحہ 122 ,121 ,120 ,105 ,104

215 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا: سردار جعفری کی یاد میں، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 118

216 سجاد ظہیر، بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 128-127

217 علی احمد فاطمی، تین ترقی پسند شاعر: سردار، مجروح، کیفی صفحہ 129

218 شوکت کیفی، کیفی میرے ہمسفر بحوالہ تین ترقی پسند شاعر: سردار، مجروح، کیفی از علی احمد فاطمی، صفحہ 130

219 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958، صفحہ 94 ,93 ,92

220 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شاعر، شخص اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 73-72

221 پروفیسر عبدالستار دلوی، اپنی بات، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 35

222 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، جڑیں اور کونپلیں (دور پور تاثر)، صفحہ 41 to 38, 23, 22, 19, 18

223 سجاد ظہیر، بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 132-128

224 قاضی جلیل عباسی، کیا دن تھے، صفحہ 219 تا 223

225 پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری جلد اول، صفحہ 37

226 پروفیسر آفاق احمد، سردار جعفری کی یادوں کا اجالا مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، صفحہ 96

227 پروفیسر آفاق احمد، سردار جعفری کی یادوں کا اجالا مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، صفحہ 100, 99

228 پروفیسر سید محمد عقیل، لندن اولندن: ایک سیاحت نامہ: ایک رپورتاژ، صفحہ 47, 45, 32, 29, 27

229 حکیم محمد سعید، ماہ و روز، روزنامچہ سفر روس،
صفحہ 328, 322, 276, 262, 256, 217, 196, 155, 125

230 پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، صفحہ 236 تا 246

231 عرفانہ عزیز، نیلا فرشتہ، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 234

232 رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 82

233 فضیل جعفری، علی سردار جعفری: چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی صفحہ 33

234 مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، ستمبر 2000، صفحہ 25

235 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 91

236 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 72

237 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 40

238 سید محمد مہدی، سردار جعفری: شخصیت کے چند پہلو، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 83

239 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 106, 105

240 پروفیسر وہاب اشرفی، قصہ بے سمت زندگی کا، صفحہ 292, 291

241 علی احمد فاطمی، یاترا (رپورتاژ)، صفحہ 105

242 مجتبیٰ حسین، سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام، کتاب نما، فروری 1998ء، صفحہ 40, 41

243 ابرار رحمانی، میں ہوں تخیل انسان کی پرواز: علی سردار جعفری مشمولہ تلخ و شیریں، صفحہ 164

244 مظہر امام، سردار جعفری کی ایک خواہش، اردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 26

245 پروفیسر عبدالستار دلوی، اپنی بات، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 35

246 مجتبیٰ حسن، سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام، کتاب نما، فروری 1998ء، صفحہ 39

247 ابوالکلام قاسمی، اردو نظم نگاروں میں سردار جعفری کا امتیاز مشمولہ شاعری کی تنقید مرتبہ ابوالکلام قاسمی، صفحہ 182

248 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 40

249 قیصر تمکین، سردار جعفری ایک نذرانہ عقیدت، کتاب نما، جون 2002، صفحہ 23, 24

250 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 398 تا 400

251 حمید اختر، ایک چراغ اور بجھا، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر، سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 110, 111

252 ملاحظہ ہو: رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75

253 انور ظہیر خاں، سردار جعفری، جامعہ، جولائی تا ستمبر 1996، صفحہ 162

254 زہرہ جمال، 5 دسمبر کی رات مشمولہ اردو میں رپورتاژ نگاری از عبدالعزیز صفحہ 349, 332

255 سلام بن رزاق، علی سردار جعفری کی یاد میں، ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2000، صفحہ 72

256 حبیب الرحمٰن چغانی، علی سردار جعفری، مریخ، پٹنہ، ستمبر اکتوبر 2000، صفحہ 10

257 فضیل جعفری، چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2000، صفحہ 31, 32

258 سید محمود الحسن، علی سردار جعفری: فکر و فن کے چند پہلو مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 145

259 حبیب الرحمٰن چغانی، علی سردار جعفری: شخصیت و شاعری، جرنل 121، ستمبر 2000، صفحہ 57

260 شوکت کیفی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 220

261 اختر حسین رائے پوری، پیغامات، تاثرات، افکار، سردار جعفری نمبر صفحہ 702

262 ممنون حسن خاں، پیغامات، تاثرات، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 704

263 ابوالفیض سحر، تناظر اور تجزیے، صفحہ 100

264 پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 243

265 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا: سردار جعفری کی یاد میں، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 117

266 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 104

267 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کا شعری سفر مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 350

268 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 54

269 مجتبیٰ حسین سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام، کتاب نما، فروری 1998، صفحہ 40, 39

270 سردار جعفری کے خطوط مورخہ 8 مارچ 1998، 28 اپریل 1998 اور 10 اگست 1998 بنام ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری، نیا سفر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 140 تا 143

271 مجتبیٰ حسین، سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام، کتاب نما، فروری 1998ء، صفحہ 40

272 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، تین ترقی پسند شاعر: سردار، مجروح، کیفی، صفحہ 64

273 انٹرویو 18 اپریل 1990، راہی معصوم رضا۔ سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 91

274 عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم، نئی سماعتوں کے درمیان، مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، صفحہ 146, 142, 133, 132

275 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، تین ترقی پسند شاعر: سردار، مجروح، کیفی، صفحہ 128, 127

276 پروفیسر محمود الحسن، سردار جعفری: چند تاثرات، کچھ واقعات، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 96

277 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا: سردار جعفری کی یاد میں، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 120, 119

278 رضا جعفری، سردار ماموں، آج کل، اگست 2003، صفحہ 20

279 علی سردار جعفری بحوالہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، کتاب نما خصوصی شمارہ، صفحہ 55

280 فضیل جعفری، علی سردار جعفری: چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2000، صفحہ 33, 32

281 ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، علی سردار جعفری اور عوامی ادب، ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 10

282 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 45

283 فضیل جعفری، علی سردار جعفری: چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی، ستمبر 2000، صفحہ 33

284 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، علی سردار جعفری: ایک مطالعہ، صفحہ 46-45

285 سید عزیز قادری، قطعات، آج کل، نئی دہلی، اکتوبر 2000، صفحہ 12

286 ملاحظہ ہو، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 8

287 پروفیسر عبدالستار دلوی، اپنی بات، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 36

☆☆☆

باب دوم

"شخصیت"

شخصیت

1۔شخصیت کی اہمیت:

فنون لطیفہ کی تمام شاخوں میں فن کار کی شخصیت کی کارفرمائی ہوتی ہے ادب اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ادیب وشاعر کا نصب العین،اس کی سرگرمیاں اس کی تخلیق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ڈاکٹر اسلم پرویز نے فن کار کی شخصیت اور اس کے فن کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''آرٹ کے بارے میں اتنا ہم مان کر چلتے ہیں کہ اس کی اساس میں زندگی کی صالح اقدار ہی ہوتی ہیں ۔ادب کے تعلق سے ادیب اور شاعر عام طور پر اچھی چیزوں کی تمنا کرتا یا خواب دیکھتا ہے اور اپنے ادبی اقوال میں اپنے زیاں کی قیمت پر بھی دنیا میں بہتر تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے۔بقول جگرؔ:

اس نفع وضرر کی دنیا سے یہ میں نے لیا ہے درس جنوں
خود اپنا زیاں منظور مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

وہ ہزار مایوسی کے باوجود پانی کی اس بے بضاعت بوند کے مانند ٹپ ٹپ ٹپکتا رہتا ہے جو بالآخر پتھر میں سوراخ نہ بھی کر پائے تو اس پر گڑھا تو ڈال ہی دیتی ہے۔ادب کی اس صالح قدر کا سلسلہ اس طرح خصوصاً اس ادیب کی ذاتی زندگی سے جا کر کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے جو بحیثیت ایک انسان کے بھی اچھا ہے ۔اسے ادیب یا شاعر کے فن اور اس کی ذاتی زندگی کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے دو آئنے ایک دوسرے کے روبرو رکھے ہوں اور ہر ایک آئنے میں دونوں آئنوں کے عکس کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی تنقیدی رویہ اپناتے ہوئے یار کی یاری کے ساتھ یار کے فعلوں سے بھی کام رکھنا پڑے گا ورنہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتا ہے چنگیزی'' والا مضمون ہو جائے گا۔چنانچہ ایسے ادیب اور شاعر کی نگارشات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی زندگی کے آدرش نظریے اور فلسفے کو اور ان سے متعلق اگر کوئی علمی سرگرمیاں ہیں تو ان کو بھی نظر میں رکھنا ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے ۔اس لیے کہ یہ تمام چیزیں براہ راست اس کے تخلیقی رویے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔'' 1

ڈاکٹر ایس ایم زیڈ کوہر نے تخلیق میں فن کار کی مکمل شخصیت کے اثر انداز ہونے کے تعلق سے لکھا ہے:

''ادب وفن میں ادیب وفنکار کی شخصیت اپنے تمام داخلی اور خارجی تقاضوں اور شعوری ولاشعوری مطالبوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔'' 2

ادیب وشاعر سماج کا ایک فرد ہے بیرونی محرکات اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ فن کار کی تخلیق میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن رقمطراز ہیں:

''ادیب کے شخصی ذہن میں اجتماعی محرکات بھی دخیل رہتے ہیں۔ہم شخصیت کے اس پہلو کو جن پر بیرونی محرکات اثر کرتے ہیں معاشرتی روابط میں اچھی طرح پہچان سکتے ہیں لیکن فن کار کی شخصیت کے یہ پہلو بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں جن کو اجاگر

کرنے میں معاشرتی روابط کام نہیں آسکتے ۔اس لئے کہ باوجود سخت بندشوں اور کڑی روک ٹوک کے کسی نہ کسی شکل میں وہ ادب میں اپنے کو نمایاں کر لیتے ہیں۔۔۔شخصیت کے بعض اہم اور بنیادی جوہر سطح سے بہت نیچے رہتے اور سرگرم عمل رہتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں ادب کی تخلیقات میں سرایت کر جاتے ہیں۔سطح کی نیچی والی دنیا سے ہمارا ربط محض تحلیل نفسی کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔''

3

1:1 شخصیت کی تشکیل

شاعر کا کلام اور اس کے معاصرین کی شہادت 'فن کار کی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''کسی بھی شاعر کی سیرت کی سب سے بڑی سند اس کا کلام اور اس کے ہم عصروں کی شہادت ہوتی ہے جن سے اس کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔''

4

1:2 شخصیت کے تعین کے پیمانے:

شخصیت کی تعین کے مختلف معیارات میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے عصری حالات میں اپنے آپ کو کس حد تک شریک کیا۔

اختر الواسع کہتے ہیں:

''کسی شخص اور شخصیت کی قدر و قیمت اور اہمیت متعین کرنے کے کئی معیار اور پیمانے ہو سکتے ہیں۔ان میں سے ایک معیار اور پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے زمانے اور اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی اور رواں دواں زندگی اور اپنے عہد کے انسانوں کو کس کس طرح متاثر کیا اور اپنے وقت کے اہم سوالات اور معاملات میں اس نے کس طور سے شرکت کی ۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علی سردار جعفری ہمیں کئی سطحوں پر چھوتے ہیں اور صرف چھو کر گزر نہیں جاتے بلکہ ہمارے حواس و شعور پر ایک ایسا لمس اور ذائقہ چھوڑ جاتے ہیں جو ہمارے لیے ان کا ایک مستقل تعارف بن جاتا ہے۔'' 5

1:3 علی سردار جعفری کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کا پس منظر:

علی سردار جعفری کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر کارفرما رہے ہیں ذیل میں ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) گھر کا ماحول جہاں بچوں کے کانوں میں اذاں، قرآن اور احادیث سنائے جاتے۔

(2) جاگیردارنہ نظام کا پیدا کردہ جبر و استبداد جنھیں سردار جعفری نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(3) سرزمین اودھ کے حالات جن کا ذکر سردار جعفری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہ خوبصورت گیتوں ،دھان، کھیتوں اور انتہائی اخلاص کی سرزمین ہے۔اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں۔گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جھلستے ہوئے کسان، جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں۔ان کے جوتے مارے جا رہے ہیں اور دہائیاں دے رہے ہیں۔پیڑ کی شاخوں میں بالوں سے لٹکتی ہوئی عورتیں، پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے

،بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں ان دیہاتوں میں جا کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔''

6

اور پھر سردار جعفری کے شعور نے پہلی بار ان سے یہ سوال کیا ''یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے؟ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں؟ ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔

(4) گاندھی جی کی تصنیف ''تلاشِ حق'' پلوٹارک کی مشاہیر یونانو روما'' اسکروائلڈ، گوئٹے کی تحریریں اقبال کی بانگ درا، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی رسالہ ''نگار'' میں انقلاب فرانس سے متعلق نیاز فتح پوری کے مضامین وغیرہ کا مطالعہ۔

(5) اشتراکیت، مارکسیت کے فلسفے سے تاثر اور پھر ترقی پسند تحریک سے وابستگی۔

(6) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجاز نے طلباء یونین کے مشاعرے میں اپنی نظم ''انقلاب'' پیش کی تھی ڈاکٹر سلطان احمد کے مطابق اس نظم کا سردار جعفری پر گہرا اثر مرتب ہوا انہوں نے اس کے ہر ہر مصرعے میں اپنے دل کی دھڑکن محسوس کی۔7

(7) منٹو کے توسط سے وکٹر ہیوگو اور گوا کی سے تعارف۔

(8) علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام سے سردار جعفری کے وژن اور فکر و نظر میں وسعت اور ہمہ گیری۔

(9) عالمی سطح پر ہونے والے انقلابات کا اثر۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''انہوں نے (سردار جعفری) کی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ان تلخ حقائق پر ان کی نگاہ گئی جو ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم یا حاکم بنا دیتے ہیں۔وہ سماجی عوامل ان پر واضح ہوتے گئے جن کے سبب ظالم اور مظلوم کا المیہ جنم لیتا ہے۔جبر و استبداد کے افسانے پرورش پاتے ہیں۔آزادی اور غلامی کی کشاکش جوان ہوتی ہے۔ان سماجی ناانصافیوں سے لڑنے کے لیے حوصلے کی ضرورت تھی۔ہمت درکار تھی.....تب سردار جعفری یہ سوچ کر کہ حق و صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے'' بے خطر اس آتش نمرود میں کود پڑے، جیلوں کی سختیاں سہیں۔سامراجی سپاہیوں کے ڈنڈے کھائے گالیاں سنیں مگر جس راہ کو نشانِ منزل سمجھ لیا تھا اس پر ہمیشہ چلتے رہے۔اسی لیے ان کی شاعری میں لہو کی عظمت و طاقت حق کوئی و صداقت پسندی، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، انقلاب کی خواہش اور بغاوت کی ترغیب، انسان دوستی، تاریخی ادارک و سماجی شعور، خطابت، عظمت انسان کا اعتراف، انسانی ہاتھوں کا قصیدہ، اشتراکیت، مارکسیت اور سوشلزم کے نظریات ،فطرت انسانی کا باہمی رشتہ، عالمی امن و خوش حالی کا خواب اور ماضی، حال اور مستقبل کا صحیح تصور جیسے عناصر در آئے جو اُن کی شخصیت اور فکر و فن کی پہچان بن گئے۔''

8

حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی ان کے پیش نظر تھی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

''انتہائی کچی عمر میں گھر کی شیعی تہذیب میں رہ کر، منبر پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھنے والا نوجوان اندھی عقیدتوں میں غرق ہونے کے بجائے حضرت امام حسینؓ کے غیر معمولی کردار سے ظلم کے خلاف بغاوت کا سبق سیکھ کر، جاگیردارانہ نظام کو ٹھوکر مار کر لکھنو آتا

ہےاور یہاں آ کر لکھنو یونیورسٹی کا طالب علم ہوتے ہی انگریزوں کے ظلم وجبر کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے اور وہ ساری تکلیفیں برداشت کرتا ہے جو اُس وقت کے دیوانے باغیوں کا مقدر بنی ہوتی تھیں۔علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کے وژن اور نقطۂ نظر میں غیر معمولی تبدیلی آتی ہے۔دنیا کے انقلابات کی دھمک سے ان کا ذہن کھلبلا اٹھتا ہے۔اشتراکیت اکلوتی مضبوط راہ دکھائی دیتی ہے۔روس کا انقلاب اور بہت سے دوسرے انقلابات پابلو نرودا، ناظم حکمت، جواہر لال نہرو، قاضی نذرالاسلام، وطن کی نامکمل آزادی، خواب در خواب ایک نئی جنگ کی تیاری، دنیا کی تاریخ، تہذیب، تصوف، انسان دوستی غرض کہ خیالوں کی دنیا میں کروٹیں ہیں کروٹیں۔نئے نئے چراغ جلتے گئے۔شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ حافظ، سعدی، روحی، پابلو نرودا، ناظم حکمت، کبیر، نانک، میرا، میر، غالب، اقبال سب کو ایک لڑی میں پرو دیا۔دنیا کے انسانوں کے درد کو ایک لئے میں ڈھال دیا۔''9

بشیر احمد انصاری نے اپنے مضمون ''علی سردار جعفری اور انسانی اقدار'' میں حسب ذیل محرکات کی نشاندہی کی ہے جن سے سردار جعفری کی شخصیت متصف تھی۔

1۔ ''سردار جعفری نے غلامانہ زندگی کے لیل ونہار میں طبقاتی کشمکش کی تیز آنچ کو محسوس کیا''

2۔ ''جب وہ اپنے اجداد کے فارم ہاوس میں ایک مزدور کسان عورت کو اس لئے سزا پاتے ہوئے دیکھتا ہے کہ اس نے مٹھی بھر کچے چاول منہ میں ڈال لیے تھے تو اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔اس دہقاں عورت کے منہ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نظام کے تانے بانے کو تاوہ دینے والی ماڑ میں انسانی خون کی آمیزش ہے۔اس نے خود کہا کہ یہ ایسا نظام نہیں جس پر انسانیت ناز کرے۔یہ فرسودہ نظام ہے جس میں انسانیت سسک رہی ہے، دم توڑ رہی ہے۔جس میں محنت کش طبقے کا استحصال ہو رہا ہے۔یہ خیال اور احساس آہستہ آہستہ ایک جذبہ اور تحریک کی شکل اختیار کرنے لگا۔وہ ننھا فرشتہ جو کبھی یہ سوچتا تھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے جوان ہوتے ہوتے فطری بے چینی اور بے اطمینانی کے دائرے میں محیط ہو گیا۔وہ کبھی پنڈت نہرو کی تقریر سے متاثر ہوتا کبھی گاندھی جی کی تلاش حق میں اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔علی گڑھ کے تہذیبی دھارے سے مانوس ہوتے ہوئے اس کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی۔اُسے معلوم ہوا کہ انسان کو فراہم ہونے والے وسائل کی تقسیم کی دشواریاں صرف ایک ملک اور ایک قوم تک محدود نہیں ہیں۔یہ انسان کا عالمی مسئلہ ہے اور زماں ومکاں کا پابند نہیں۔جب کہیں اور جہاں کہیں انسان نے اپنے وسائل اور اپنی احتیاج میں توازن برقرار نہیں رکھا، انسانیت استحصال کا شکار ہوئی اور انسانی اقدار مجروح ہوئیں۔''

(3) ''انسانی اقدار کے بنیادی نکات جو ہر جگہ تسلیم کیے گئے ہیں یہی ہیں کہ ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔مساوات انسانیت کی روح ہے۔تہذیب وتمدن کی برکتوں سے تمام انسانوں کو فیض یاب ہونے کا حق حاصل ہے۔انسانیت کی عمارت حق گوئی اور حق پرستی پر قائم ہے۔انسانیت رواداری کی متقاضی ہے اور بزرگی کا احترام چاہتی ہے۔علم وفن کی قدر کرتی ہے، محبت، عزت نفس، شرافت اور وضعداری کو گلے لگاتی ہے۔زندگی جینے کا حوصلہ دیتی ہے اور بے باکی کی خوبیوں سے سرشار کرتی ہے۔انسان کا نئے خواب دیکھنا اس کا حق ہے اور کوئی طاقت اور اقتدار اُسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا''۔

(4) ''انسانی سماج میں وسائل کی غیر مساوی تقسیم اور مواقع کی جانبدارانہ عنایت انسانی قدروں کو گھن کی طرح کھانے

لگتی ہیں ۔ جہاں صداقت، علمیت اور محنت کشی کا اعتراف نہ ہو اور اعزاز سے محرومی عالموں اور محنت کشوں کا مقدر بن جائے وہاں ہوسنا کی اعلیٰ اقدار کو پنپنے نہیں دیتی ۔ جس نظام میں آدمیت کا احترام نہ ہو وہ نظام باطل ہے ۔ ہر وہ عمل جس سے کسی فرد کا نقصان ہو جس سے کسی فرد یا جماعت کا حق چھن جائے، جس سے اصول پرستی کی جگہ موقع پرستی چلن بن جائے، انسانیت کش کہلائے گا ۔"

(5) سردار جعفری نے ان تمام نکات کو جو انسانی خوبیوں سے تعلق رکھتے ہیں فطری اور شعوری طور پر برتا ۔ انہوں نے زنگ خوردہ نظاموں کو جو اقدار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تھے باطل قرار دیا ۔"

(6) یہ وہ شخص ہے جو زمینداری کے عیش کو خیر باد کہتا ہے، تمام سہولتوں کو جو اسے ماحول میں حاصل تھیں، ترک کرتا ہے اور انسان دکھوں کا علاج ڈھونڈنے نکل پڑتا ہے ۔ وہ بورژوا کی تفہیم کے لیے ورق گردانی کرتا ہے اور صحیح انسانی نظریے کے اظہار کے لیے تقریر و تحریر، شاعری اور گفتگو کا سہارا لیتا ہے ۔ لکھنو اور بنارس کی جیلوں میں اپنی نظموں کے آہنگ اور جھنکار سے ہر کسی کو متوجہ اور مسحور کرتا ہے ۔ ایک مفکر اور ادیب کے طور پر پریم چند کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے کہ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہے ۔ ٹیگور کے اس پیغام کو مشعل راہ بناتا ہے کہ ادیب عوام سے دور رہ کر بیگانہ محض رہ جائیں گے ۔ یہ حقیقت اُس کے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہو جاتی ہے اور اس طرح روشن ہو جاتی ہے کہ اخیر عمر تک کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکا ۔ اس کی بالغ نظری اسے یقین دلاتی ہے کہ عصر حاضر میں انسانیت کو فروغ دینے اور انسانی قدروں کو عام کرنے کے لیے آمریت، سرمایہ داری اور سامراجیت پر سوشلزم اور جمہوری نظام اور قدروں کو ترجیح دینی ہوگی ۔ فاشسٹ نظریے کو ختم کیے بغیر انسانی قدریں ابھر نہیں سکتیں ۔ نوجوان سردار جعفری کو کیمونزم میں وہ قوت نظر آتی ہے جو فاشزم کو ختم کر سکتی ہے ۔ انقلاب روس نے اس یقین کو مستحکم کر دیا ۔ آخر وہ نظریاتی اور عملی اعتبار سے کمیونسٹ بن جاتا ہے لیکن اس کا کمیونزم اسلام کی نفی نہیں کرتا نہ کسی ایسے مذہبی اعتقاد کو چیلنج کرتا ہے جو انسان دوستی کی تعلیم دیتا ہے ۔ ..... ایک بار جو انہوں نے زاویہ نگاہ طے کیا وہ عمر بھر ان کے ساتھ رہا ۔ زاویۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی کبھی نہیں ہوئی ۔ جس طرح انسانی قدریں بنیادی طور پر نہیں بدلتیں جعفری صاحب کے نظریے کی بنیاد بھی قائم رہی ۔ البتہ قدروں کے اظہار کے انداز Menifestations زمانے کے مطابق تبدیل ہوتے ہیں ۔ 10

1:3 حلیہ:

سبط حسن نے سردار جعفری سے الٰہ آباد میں پہلی بار 1938ء میں ملاقات کی تھی ۔ انہوں نے سردار جعفری کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے ۔

"گندمی رنگ، بھرا بھرا کتابی چہرہ، سر پر ریشم کے سے ملائم بالوں کا ڈھیر، انگلیوں کا رنگ تمباکو نوشی کی کثرت سے سیاہی مائل زرد آنکھیں منگولوں کی سی غلافی مگر بڑی بڑی اور ان میں چمک ایسی گویا دیئے روشن ہوں ۔" 11

رفعت سروش کے مطابق:

''سردار جعفری چھریرے بدن اور درمیانہ قد وقامت کے پھرتیلے نوجوان ، لمبے لمبے بال جن میں ٹھہر ٹھہر کر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھا کرنے کے عادی ہیں۔ سوچتی ہوئی آنکھیں، چہرہ پر خود اعتمادی اور صلابت ، کھدر کے کالر والے کرتے اور پائجامے میں ملبوس کہ ان دنوں یہی ترقی پسندوں کا قومی لباس تھا۔'' 12

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے مطابق:

''جعفری صاحب بڑے وجیہہ و شکیل، اسمارٹ اور قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔'' 13

1:4 غذا:

رباب جعفری نے سردار جعفری کی غذا کے بارے میں بتایا:

''کھانا دن میں دو ڈھائی بجے کھاتے ہیں۔ جیسا بھی کھانا میز پر ہوتا ہے اسی کو بہ خوشی کھا لیتے ہیں .... اگر دوپہر میں کسی ضروری کام سے گھر سے باہر جانا ہوتا ہے تو دوپہر میں کھانا نہیں کھاتے صرف ایک توس، ایک سیب کافی کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس کے پندرہ بیس منٹ بعد اپنے کام کے لیے چلے جاتے ہیں۔''14

1:5 دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی سی نیند:

سردار جعفری دوپہر کے کھانے کے بعد گھنٹہ آدھا گھنٹہ سونے کے عادی تھے۔

1:6 سگریٹ نوشی:

سردار جعفری کو سگریٹ نوشی کی عادت تھی۔

1:7 بالوں میں اپنے ہاتھ پھیرنے کی عادت:

یوسف ناظم نے سردار جعفری کی اس عادت کے بارے میں اپنے انداز میں بتایا:

''شعر پڑھنے کے بعد انہوں نے فرط مسرت میں اپنے سر کے بالوں پر اپنا ہی دست شفقت پھیر دیا۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔'' 15

1:8 نفاست پسند:

سردار جعفری بچپن ہی سے نفاست پسند رہے۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری ہمیشہ ہی سے نفاست پسند رہے ہیں۔ ان میں ذوق جمال کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ نفاست پسندی بچپن ہی سے ان کی فطرت میں نمایاں تھی۔ یہاں تک کہ کھانے میں بھی مظاہرہ ملتا ہے۔ ان کی بہن ستارہ جعفری بتاتی ہیں کہ گوشت کے علاوہ وہ صرف گنی چنی سبزیاں کھاتے تھے۔ شلغم اور مولی کی بھوجیا پکتی تھی تو یہ پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ اس کا ایک چمچہ الگ رکھا جائے۔ اگر رکابی میں گوشت کی بوٹی ٹوٹ جاتی تو فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیتے۔ دستر خوان پر دھبہ پڑ جاتا تو یہ

اس کواستعمال نہیں کرتے تھے۔“ 16

1:9 پسندیدہ رنگ:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کے پسندیدہ رنگوں کے تعلق سے لکھا ہے:

”ان کے پسندیدہ رنگ تھے سرخ، سبز اور نیلا۔ سرخ رنگ جو شہادت کا رنگ ہے۔ انقلاب اور بغاوت کا رنگ ہے۔ سبز رنگ جو شادابی، خوش حالی، روشن ضمیری اور روشن خیالی کی علامت ہے اور نیلا رنگ جو روحانیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور انہیں رنگوں سے ان کی شخصیت اور ان کا فن عبارت ہے۔ اگر اُن کی شاعری اُن کے مخصوص لب و لہجے اور شعلہ بیانی کی آئینہ دار ہے تو ان کی نثر اُن کی خوش بیانی کی عکاس کرتی ہے۔“ 17

1:10 رعب دار شخصیت:

بصیرت افروز خیالات اور دلنواز طرز گفتگو سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔

سلام بن رزاق نے سردار جعفری کی اس صفت کو یوں بیان کیا ہے:

”غالباً 65-1964 میں پہلی بار جعفری صاحب کو یو پیا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی شخصیت کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ بمبئی میں رہتے ہوئے بھی ایک عرصے تک ان سے ملنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جلسوں اور مشاعروں میں انھیں دور دور سے دیکھتا، سنتا ..... جعفری صاحب سے قربت سب چاہتے تھے مگر ان کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب کچھ ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ ان سے قریب ہونے کی جرأت کم ہی لوگ کر پاتے تھے۔ مگر جب کوئی ان سے ایک بار مل لیتا تھا ان کی سحر انگیز شخصیت کا جادو، ان کا دلنواز طرز گفتگو اور ان کے بصیرت افروز خیالات سے ایسا متاثر ہوتا کہ عمر بھر انھیں کا دم بھرتا۔“ 18

1:11 آواز:

سردار جعفری کی گرج دار آواز جس میں بلا کی خود اعتمادی تھی

سبط حسن کے مطابق:

”وہ بولتے تو یوں محسوس ہوتا گویا جلسہ عام میں تقریر کر رہے ہوں۔“ 19

1:12 کن چیزوں سے لگاؤ تھا:

سلمیٰ صدیقی نے لکھا ہے:

”انہیں (سردار جعفری) حسن سے لگاؤ تھا، لیکن وہ حسن کسی خاص صنف کا پابند نہیں رہا۔ انہیں خوبصورت عورتوں، ذہین مردوں، پر جوش طلباء، معصوم بچوں، شگفتہ پھولوں اور رقد رتی مناظر سے بے انتہا لگاؤ تھا۔“ 20

1:13 وقت کے پابند:

بڑے لوگ عموماً وقت کے پابند ہوتے ہیں۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا:

''سردار جعفری وقت کے بہت پابند تھے اور جب کبھی انہیں کسی ادبی تقریب میں مدعو کیا جاتا وہ پابندئ وقت کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے''۔ 21

1:14 غضب کا حافظہ:

علی سردار جعفری کو خدا نے بچپن ہی سے غضب کا حافظہ عطا کیا تھا۔مرثیوں کے بند کے بند اور اساتذہ کے بیسیوں اشعار انہیں ازبر تھے۔

''جعفری زور کلام کے ساتھ حافظہ بھی غضب کا پایا ہے۔علی گڑھ میں بھی مرثیوں کے بند کے بند اور لمبی لمبی نظمیں بے تکان سناتے چلے جاتے تھے۔بعد میں بھی انھیں کبھی بیاض میں جھانکتے یا نوٹ بک ٹٹولتے نہیں پایا۔'' 22

''ان کا (علی سردار جعفری) حافظہ بلا کا تھا۔اساتذہ کے اشعار انہیں ازبر، واقعات نوکِ زباں پر، کتابوں اور دانشوروں کے نام انھیں گھر کے دروازوں اور اہل خاندان کے بچوں کی طرح یاد تھے۔'' 23

رضا جعفری کے مطابق:

''ان کا حافظہ ادب عالیہ کی ایک ایسی لائبریری تھا کہ جس میں ہر مضمون نکل کر ان کی زبان پر کسی جھرنے کی طرح رقص کرنے لگتا تھا۔'' 24

حبیب الرحمٰن چغانی کے مطابق سردار جعفری کا حافظہ ضرب المثل بن چکا تھا:

''سال رواں میں (حبیب الرحمٰن چغانی) خدا بخش لائبریری نے فیض احمد فیض سیمنار کیا جس میں جگن ناتھ آزاد نے بھی شرکت کی۔اس موقع پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا۔آزاد صاحب نے شکایت کی کہ پہلے سے بتادیا ہوتو تو بیاض ساتھ لے آتا۔میں نے کہا کہ دو تین غزلیں سنانا آپ کے لیے کون سا مشکل کام ہے وہ برجستہ بولے کہ آپ نے کیا مجھے سردار جعفری سمجھ لیا ہے۔ان کا حافظہ ضرب المثل بن چکا تھا۔'' 25

خواجہ تصور علی حیدر نے لکھا:

''ان کا (سردار جعفری) حافظہ بہت اچھا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ ایک دفعہ سن لیتے یا پڑھ لیتے تھے وہ انھیں یاد ہو جاتا تھا۔'' 26

انیس چشتی رقمطراز ہیں:

''ان کا (علی سردار جعفری) حافظہ بلا کا تھا۔اساتذہ کے اشعار انہیں ازبر، واقعات نوکِ زباں پر، کتابوں اور دانشوروں کے نام انھیں گھر کے دروازوں اور اہل خاندان کے بچوں کی طرح یاد تھے۔'' 27

ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا نے سردار جعفری کی قابلیت اور حافظہ کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جعفری صاحب کا حافظہ غضب کا تھا.... ان کا دماغ متعدد اردو اور فارسی اساتذہ کے کلام کا تو گویا خزانہ تھا۔ایک دفعہ کیفی اعظمی صاحب نے مجھ سے مولانا حالی کے مرثیہ غالب کے چند اشعار طلب فرمائے۔میں نے کہا کہ دیکھ کر کل بتاؤں گا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد جعفری صاحب میرے یہاں تشریف لائے۔میں نے یوں ہی کیفی صاحب کی بات دہرائی۔میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے وہ پورا مرثیہ زبانی مجھے سنا دیا۔6 اگست 1985 کی شام کو انڈین مرچنٹس ہال میں علامہ اقبال، حافظ شیرازی اور مولانا رومی پر لیکچر کے لیے جعفری صاحب کو منتخب کیا گیا۔.....اس لیکچر میں انہوں نے جو اپنے حافظہ کا کمال دکھایا تھا وہ سنتے اور دیکھتے بنتا تھا۔گھنٹہ بھر کی اسپیچ میں وہ جس طرح موضوع پر حاوی رہے وہ انہی کا حصہ تھا۔ تینوں برگزیدہ شعراء کے سینکڑوں اشعار انہوں نے محض اپنے حافظے اور وہبی صلاحیت کی بنا پر پیش کر دیے۔سامعین عش عش کر اٹھے۔''

28

1:15 مذہب سے لگاؤ:

علی سردار جعفری کا گھرانہ مذہبی تھا۔اُن کی سیرت اسلامی اقدار سے متصف تھی۔خوف خدا انھیں نصیب تھا۔

خواجہ تصور علی حیدر رقمطراز ہیں:

''وہ (سردار جعفری) اس دور کے اور بہت سے نوجوانوں کی طرح پابند صوم وصلوۃ نہ تھے لیکن اسلامی اقدار ان کی سیرت میں رچی بسی ہوئی تھیں۔اس سلسلہ میں مجھے یاد ہے کہ میں ایک روز صبح کی نماز پڑھنے نہیں اُٹھا، اور خلاف معمول ان کی آنکھ کھل گئی تو انہوں نے مجھے آواز دے کر کہا۔تصور! اٹھو نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

29

سلمیٰ صدیقی کے مطابق:

''وہ (سردار جعفری) اشتراکیت کے قائل تھے لیکن مذہب کے منحرف نہیں تھے۔''

30

سرداری جعفری عیش میں یاد خدا اور طیش میں خوف خدا رکھنے والی شخصیت تھی۔

سلمیٰ صدیقی نے بتایا:

''میں ان (سردار جعفری) کے بارے میں ان شب و روز کا تذکرہ کروں گی جو ممبئی کے تقریباً پینتیس سال پر مشتمل ہے۔ ان کی گھریلو اور مجلسی زندگی میں، دوستوں کی محفلوں میں اور دشمنوں کے اجتماع میں، روزی روٹی کی تگ و دو میں، سیاسی مسائل کی الجھنوں میں مبتلا میں نے انھیں دیکھا ہے۔میں نے دشمنوں کا ذکر بطور محاورے کے نہیں کیا ہے بلکہ اپنے تجربے اور انداز ے کے مطابق اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کسی بھی نوعیت اور سطح کی غیر معمولی شرافت اور شریفانہ اوصاف کے افراد کو عموماً دشمنی یا دشمنوں یا دونوں ہی کا اکثر و بیشتر سامنا کرنا پڑتا ہے۔سردار جعفری کو بھی اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو عیش میں یاد خدا اور طیش میں خوف خدا سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ایسا نہیں تھا کہ انہیں غصہ نہیں آتا تھا یا اپنی برائی سن کر وہ مسرور ہوتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ

''یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے''

31

سردار جعفری کو خیر کے راستے میں ہی نجات کا ایقان تھا اور وہ نئی نسل کو اس کی ترغیب دیتے تھے۔

محمد ایوب واقف لکھتے ہیں:

''ان کا (سردار جعفری) کا یہ عقیدہ ہے کہ خیر اور شر کے دو راستوں میں سے خیر کا راستہ ہی نجات کا راستہ ہے۔ اسی راستے سے رشتہ استوار کر کے عالمگیر انسانی محبتوں کی خوبصورت قندیل روشن کی جا سکتی ہے۔ اس راستے سے الگ دوسرے تمام راستے انسانوں کو تباہی کے بھیانک غار کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی لیے علی سردار جعفری نے نئی نسل کی تربیت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اپنی تقاریر سے اپنے مقالوں کے ذریعے اور گاہے گاہے اپنی شاعری کے وسیلے سے وہ یہ مقدس فریضہ انجام دیتے رہے ہیں''۔ 32

1:16 انسانیت کی خدمت:

انسانیت کی خدمت نیکوکاروں کا شیوہ رہا ہے۔

شان الحق حقی نے لکھا ہے:

''وہ (علی سردار جعفری) ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ادب کے ساتھ انسانیت کی خدمت بھی کی''۔

''جعفری صاحب بیسویں صدی کے ان خرد کیشوں میں شامل ہیں جو نسل انسانی کو ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دینے کی علمی، ادبی اور علمی جدوجہد کرتے رہے جو شرفا کا ہمیشہ سے آئڈیل رہا ہے''

''واقعی ان کی زندگی ایک مقدس مشن کے حصول کے لیے گزری''۔ 33

رفیعہ شبنم عابدی نے بتایا:

جعفری صاحب ایک بے حد وفادار اشتراکی ضرور تھے مگر مذہب بیزار نہیں تھے۔ خدا، رسول ﷺ اور اہلبیت اطہار سے عقیدت و محبت انھیں گھٹی میں ملی تھی جو براہ راست انہیں انسانیت اور انسان دوستی کی منزل تک لے جاتی تھی۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود براہ راست ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں کیا ہے۔ اس پر بار بار فخر کیا ہے کہ ہمارے گھر میں انیس کے مرثیے بارہ مہینے پڑھے جاتا تھے'' اور جس کا انکشاف ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ظفر گورکھپوری کو ان کے جوان سال فرزند جاوید کی مرگ ناگہانی پر پُرسہ دیتے ہیں انھیں مذہبی عقاید و تہذیبی اقدار کے سائے میں ملاحظہ ہو۔

''تعزیت ایسے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ایسے وقت میں ہر لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ میری پرورش شیعہ گھرانے میں ہوئی ہے۔ بچپن سے یہ تربیت دی گئی ہے کہ سوائے غم حسینؓ کے اور کسی کے غم میں آنسو نہ بہیں۔ اس لیے جب جوان بیٹا ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتا ہے تو حضرت علی اکبر کی مجلس ہوتی ہے۔ بھائی کے غم میں حضرت عباسؓ کی مجلس۔ بہن کے غم میں حضرت زینبؓ کی مجلس''۔

''یہ کربلا کی مکمل تہذیب ہمارا ورثہ ہے جو غم کا سہارا بن جاتی ہے''۔

(مکتوب بنام ظفر گورکھپوری تحریر کردہ بمبئی 29/اگست 1988 مطبوعہ ''چراغ چشم تر'' از ظفر گورکھپوری صفحہ ۱۱۵) 34

1:17 مصلحت بینی سے محرومی:

یوسف ناظم نے لکھا ہے:

''جعفری صاحب کو یوں تو میں قریب سے جانتا ہی تھا لیکن زیادہ قریب سے جاننے کی صورت یوں پیدا ہوئی جب وہ مہاراشٹرا اُردو اکاڈمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے منتخب ہوئے میں سکرٹیری تھا اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ موصوف میں چند عادتیں جو ہونی چاہئے تھیں نہیں ہیں۔ مصلحت بینی کی صفت سے وہ محروم تھے اور ان کے ناقدین سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جعفری صاحب اردو کے اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود عمر بھر کرایے کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہے جو شاید ان کے نام تھا بھی نہیں۔ اس سے زیادہ قدر دانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں کہ جعفری صاحب دل بے مدعا رکھتے تھے۔ اب اس موضوع پر بولنے سے فائدہ کیا ہے۔''
35

1:18 ہندوستانی تہذیب کے پرستار:

سردار جعفری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے دلدادہ تھے۔

سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری ہندوستانی تہذیب اور اُردو کلچر کے نہ صرف پرستار تھے بلکہ اس کی بھرپور نمائندگی بھی کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ہمارے ملک ہندوستان کی حیثیت اور نوعیت دوسرے ملکوں سے مختلف اور متضاد ہے اور اس زمین کا آنچل بہت وسیع ہے۔ اس میں گنگا جمنا اور سرسوتی کا پانی، قرآن، گیتا، بائبل اور گرو وانی سب ہی کچھ شامل ہے اور اس امتزاج نے اس کو ایک لافانی خصوصیت عطا کی ہے۔''
36

سردار جعفری علی گڑھ کے طالب علم رہ چکے تھے انھیں وہاں کی تہذیبی روایات کا پاس ولحاظ تھا۔

سلمیٰ صدیقی نے بتایا:

''دراصل وہ (سردار جعفری) درس گاہ علی گڑھ کے ان طلبا میں سے ایک تھے جنھیں علی گڑھ کی تعلیم سے زیادہ یہاں کی تہذیب عزیز تھی۔''
37

پروفیسر غلام دستگیر شہاب نے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس میں انہوں نے علی گڑھ کے طلبا کو وہاں کی تہذیبی روایات کی پاسداری کی یاددہانی کرائی تھی۔

وہ لکھتے ہیں:

''بزرگوں کے احترام کا ایک سبق انہوں نے علی گڑھ کے طلباء کو بھی دیا تھا جب طلباء شعرا کو بغیر ٹوپی پہنے کلام سنانے پر احتجاج کر رہے تھے۔ اس ہنگامے پر قابو پانے کے لیے جعفری صاحب کھڑے ہوئے اور طلباء سے گویا ہوئے ''سینئر زاور بزرگوں کا احترام کرنا بھی علی گڑھ کی روایت رہی ہے۔ اس روایت سے انحراف کرنا مناسب نہیں''۔ یہ سبق انہوں نے اس نئی نسل کو دیا جو مستقبل میں تہذیبی روایات کی امین ہونے والی تھی۔ تہذیبی روایات کی پاسداری، اقدار کی پاسداری ہے۔''
38

1:19 لکھنوی تہذیب وشائستگی کا نمونہ:

سردار جعفری کا وطن بلرام پور (لکھنو) تھا۔انھیں لکھنوی تہذیب وشائستگی پسند تھی۔

رئیس مرزا لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری لکھنوی تہذیب وشائستگی کا نمونہ تھے۔ میں نے کسی محفل یا مشاعرے میں انہیں تہذیب کا دامن چھوڑتے ہوئے نہیں پایا۔مشاعروں میں وہ پیتے ضرور تھے مگر اتنی کہ دوسروں کو سنبھال سکیں۔''بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ رقص وموسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور تہذیبی سرگرمیوں میں جہاں تک ممکن ہوتا حصّہ لیتے تھے۔'' 39

1:20 ناشائستہ، بے محابا، مبتذل گفتگو سے دور، الفاظ کی حرمت کا لحاظ:

سردار جعفری شائستہ گفتگو کیا کرتے تھے۔

سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں۔

''سردار جعفری کو میں نے کبھی کوئی ناشائستہ الفاظ استعمال کرتے نہیں سنا کبھی بے محابا اور مبتذل گفتگو کرتے نہیں دیکھا، انہیں الفاظ کی حرمت کا لحاظ رہتا تھا۔مشاعروں میں وہ پرانے عہد کے شعراء اور بزرگوں کی طرح نشست وبرخاست کا خیال رکھتے تھے خواتین اور بچوں کی محفل میں کچھ زیادہ ہی محتاط رہتے تھے۔'' 40

1:21 دیدہ ور، تہذیب وشائستگی کی حامل شخصیت:

''آخر سردار جعفری کی شخصیت کا وہ راز کیا ہے جو انھیں مخالفت اور حسد و رقابت کی سیاہ آندھیوں میں بھی کسی ہرے بھرے شجر کی طرح سربلند اور راسخ رکھے ہوئے ہے؟ جس نے ان کے مخالفین کو بھی بزدل بنا دیا ہے کہ ان کے پس پشت ان پر بڑھ چڑھ کر تنقید کرنے والے انھیں سامنے دیکھ کر اپنے کپکپاتے ہوئے لبوں پر قابو پا کر ان کا قصیدہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا اُن کے خلاف زہر افشانیوں کے پلندے بانٹنے والے انھیں اپنے سامنے پا کر لرزتے ہاتھوں سے اپنے قلم کی حماقتوں کو سمیٹ کر دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسکنے لگتے ہیں۔شاید یہ اسی دیدہ ور کی تہذیب وشائستگی کا نتیجہ ہے جو ان کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں میں جھلکتی نظر آتی ہے۔'' 41

1:22 ازواجی زندگی:

سردار جعفری کی ازواجی زندگی خوشحال تھی دونوں میں خلوص تھا۔دونوں ایک دوسرے کی خوشی وغم میں برابر کے ساتھی تھے۔دونوں ہی نے اپنے اپنے فرائض کا خیال رکھا۔

رباب جعفری کے مطابق:

''سردار بھائی اور بھابی میں آپس میں بہت محبت ہے۔زندگی کے ہر قدم پر ایک دوسرے کے مددگار رہیں۔دونوں ایک دوسرے کی پسند اور جذبات کا خیال کرتے ہیں۔سردار بھائی نے کبھی سلطانہ بھابی کو کسی بات کے لیے منع نہیں کیا اور نہ کوئی کام کرانے کے لیے ان پر جبر کیا۔وہ اپنا ہر کام اپنی مرضی اور خوشی سے کر سکتی ہیں .... ان دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔اس سبب سے دوستی کی فضا قائم ہے اور گھر کا ماحول پُرسکون ہے۔'' 42 30

''سردار بھائی بے حد حسن پرست ہیں اور عاشق مزاج بھی لیکن اپنی بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے۔'' 43

رضیہ فصیح احمد نے سردار جعفری اور سلطانہ جعفری کے تعلق خاطر کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''میں نے (رضیہ فصیح احمد) ان کو (سردار جعفری) بیوی سے ایک خاص تعلق خاطر نہایت خلوص، عزت سے پیش آتے دیکھا جو (اللہ مجھے معاف کرے) میں نے کم ہی لکھنے والوں میں دیکھا''۔ 4

رضیہ فصیح احمد نے سردار جعفری کی خوشحال ازواجی زندگی کا ایک واقعہ نقل کیا۔

''جب بہت باتیں ہو چکیں اور کئی نظمیں 'غزلیں سنا چکے اور پھر بھی فرمائشیں ختم نہیں ہوئیں تو انہوں نے کہا میرا گلا ساتھ نہیں دے رہا دوبارہ آوں گا پھر سناؤں گا۔ پھر موقع ملے گا۔ ہاں جب انہوں نے کچھ پڑھ کر سنانے کے لیے اپنی کتاب مانگی تو سلطانہ بولیں ''اب تم نے اپنی پستک کھول لی تو صبح ہو جائے گی'' بڑے مزے سے انہوں نے یہ بات کہی اور بڑے سلیقے سے سردار جعفری نے سن لی۔ میں نے اُن کو بیوی سے ایک خاص تعلق خاطر نہایت خلوص وعزت سے پیش آتے دیکھا۔ جو (اللہ مجھے معاف کرے) میں نے کم ہی لکھنے والوں میں دیکھا۔''45

خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے میاں بیوی دونوں میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہ ہم آہنگی سردار جعفری اور ان کی اہلیہ سلطانہ میں پائی جاتی تھی۔

یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''سیتا محل کے اس مختصر سے فلیٹ میں، نفوس اور بے شمار کتب ورسائل کی بہتات نے گھر کے ماحول میں جو وسعت اور فراخی پیدا کر دی تھی وہ دیکھنے میں تو آتی ہے لیکن کم اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جعفری صاحب کی رشک انگیز، مجلسی زندگی کی اصلی بنیاد ان کی یہی گھریلو زندگی تھی۔ نشیب وفراز کی آزمائشوں اور پر مسرت لمحوں سے لبریز یہی زندگی ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ روشن اور درخشاں پہلو تھا اور اس کا سہرا صرف علی سردار جعفری کے سر نہیں، بیگم جعفری کے بھی سر ہے اور اگر سہرے کی پیمائش ہی کرنی ہو تو بیگم جعفری نصف بہتر سہرے کی حقدار ہیں۔'' 46

علی سردار جعفری نے بتایا جب وہ جیل میں تھے تو کس طرح ان کی اہلیہ نے معاشی اور گھریلو ذمہ داریوں کو نبھایا اور اس کے ساتھ طویل مسافت طے کر کے ان سے ملنے بھی آیا کرتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سلطانہ سے میرا تعلق ایک خصوصی نوعیت کا ہے .... شادی کے بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں چالیس روپے مہنے پر کام کیا کرتا تھا۔ ان دنوں سلطانہ سوشل ایجوکیشن کمیٹی میں کام کرتی تھیں۔ انہیں دو سو روپے ماہانہ ملا کرتا تھا ان دنوں (جیل کے دنوں) سلطانہ کماتی بھی تھیں، بچے کا خیال بھی رکھتی تھیں اور پھر آٹھ گھنٹے کا سفر طے کر کے مجھ سے ملنے جیل بھی آتی تھیں۔ اس طرح میرے اور سلطانہ کے درمیان رفاقت کا جذبہ ارتقا پزیر ہوا اور ہمارا رشتہ میاں بیوں کے رشتے سے زیادہ رفاقت کا رشتہ ہے''۔ 47

محسن حیدر آبادی کے مطابق:

''ان کی (علی سردار جعفری) ازواجی زندگی نہایت خوش حال اور باوقار انداز سے گزری۔'' 48

''ایسا کہا جاتا ہے کہ ہر مرد کی ترقی کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔.....سردار جعفری کی زندگی میں سلطانہ منہاج اور کیفی اعظمی کی زندگی میں شوکت کا اہم کردار ہے۔ سچ پوچھئے تو ان دونوں شعراء کی زندگی اور شاعری کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان دونوں خواتین کا ایثار و قربانی مدد و معاون رہا ہے''۔ 49

بحیثیت باپ:

سردار جعفری اپنے بچوں کو بہت چاہتے تھے ان کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

سلطانہ جعفری لکھتی ہیں۔

''اپنے بچوں سے سردار کو بے حد پیار تھا۔ بیٹے بالخصوص ناظم کو وہ بہت چاہتے تھے۔ جس وقت ناظم پیدا ہوئے وہ (ناسک) جیل میں تھے۔ بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ملی تو بہت تڑپے اور نظم کہی جس کا عنوان ''نیند'' ہے۔

..... نظم کے یہ مصرعے اُسی درد اور تڑپ کو بیان کرتے ہیں:

رات خوبصورت ہے نیند کیوں نہیں آتی۔
روز رات کو یوں ہی/ نیند میری آنکھوں سے/
بے وفائی کرتی ہے/ مجھ کو چھوڑ کر تنہا/
جیل سے نکلتی ہے/ بمبئی کی بستی میں/
میرے گھر کا دروازہ جا کے کھٹکھٹاتی ہے/
ایک ننھے بچے کی انکھڑیوں کے بچپن میں/ میٹھے میٹھے خوابوں کا/ شہد گھول دیتی ہے
/ اک حسین پری بن کر/ لوریاں سناتی ہے/ پالنا ہلاتی ہے
رات خوبصورت ہے/ نیند کیوں نہیں آتی'' 50

رباب جعفری نے بتایا کہ سردار جعفری اپنے بچوں کی تعلیم تربیت اور خوشیوں کا خیال رکھتے۔

''یہ (سردار جعفری) اپنے بچوں سے بھی بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ یوں تو دنیا کے سب والدین اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں لیکن ان کی چاہت کا رنگ دوسرا ہے۔ سردار بھائی کا ایک بیٹا بچپن میں بے حد شریر تھا۔ اس کی شرارت کی وجہ سے گھر کی بے شمار چیزیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی کھڑکیوں میں لگے ہوئے شیشے اور کھانے کی میز کا شیشہ بھی ٹوٹ جاتا تھا۔ اس وقت اگر یہ گھر میں ہوتے تھے تو فوراً اس جگہ جاتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی چیز دیکھنے کے بجائے اپنے بچے کے ہاتھ پاؤں دیکھتے تھے کہ کہیں خراش تو نہیں آگئی۔ قیمتی سے قیمتی چیز خراب ہو جانے پر بچوں کو کبھی نہیں مارا۔ بس ہر وقت بچوں کے آرام کا خیال پیش نظر تھا۔ گرمی اور سردی کی راتوں میں اٹھ کر دیکھتے تھے کہ ان کہ کمرے کا پنکھا چل رہا ہے۔ کھڑکیاں کھلی تو نہیں رہ گئیں۔ اپنے بیٹوں کی ہر خواہش کو پورا کیا لیکن اس طرح کہ یہ ادب اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ دی۔ علی ناظم اور علی حکمت ماشاءاللہ برابر کے لیکن دونوں بھائی باپ کا بے حد ادب کرتے ہیں۔''

(2)سردار بھائی کا ایک بیٹا شاید چار پانچ برس کا ہوگا اس نے کسی بات پر خفا ہو کر اپنے گھر کے باورچی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ یہ (سردار جعفری) سامنے بیٹھے تھے جب بات ختم ہوگئی تو بیٹے کو پاس بلا کر کہا کہ جاؤ منہ ہاتھ دھوڈالو۔ پھر میرے پاس آنا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کو سمجھایا کہ ابھی تم نے جس آدمی کو مارا ہے وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے یہ تم نے بہت بُرا کام کیا ہے ۔تم ابھی اس کے پاس جاؤ اور اس سے معافی مانگو۔ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں نہ تم سے بات کروں گا اور نہ پیار کروں گا۔ بچے نے اپنے باپ سے یہ بات سن کر باورچی کے پاس جا کر معافی مانگ لی۔ اس واقعہ کے بعد کبھی کسی بچے نے نوکروں سے بدتمیزی نہیں کی۔" 51

بچوں کو گرویدہ بنانے کے فن سے سردار جعفری خوب واقف تھے۔

شوکت کیفی بتاتی ہیں:

"سردار بھائی بچوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ کیسا ہی مرکھنا بچہ کیوں نہ ہو وہ اسے دو منٹ میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ پہلے اسے اپنی پیشانی کا مسّہ دکھائیں گے۔ پھر اچھالیں گے۔ پھر اس کی زبان سے دلچسپ باتیں کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان کا دوست بن جائے گا۔ آج ان کا پوتا اقبال ان کا سب سے گہرا دوست ہے"۔ 52

"ستارہ جعفری کے مطابق وہ بچوں سے بے حد پیار کرتے ہیں کیسا ہی مرکھنا بچہ کیوں نہ ہو وہ (سردار جعفری) اُسے دو منٹ میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے مزاج کے اسی پہلو کو دیکھ کر عرفانہ عزیز انھیں "نیلا فرشتہ" یا دیومالائی کردار خیال کرتی ہیں۔ گندم کی سنہری بالیوں سے معصوم بچوں کی ہنستی آنکھوں تک جس کا پیار پھیلا ہوا ہے۔" 53

گھر کے ملازمین سے اخلاقی برتاؤ:

سردار جعفری گھر کے ملازمین سے محبت سے پیش آتے اور اسی کی تاکید کرتے۔

رباب جعفری نے لکھا:

"اپنے گھر میں کام کرنے والے آدمیوں سے (سردار جعفری) بہت شائستہ برتاؤ کرتے ہیں بڑی عمر کے آدمیوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ لڑکوں سے بیٹا کہتے ہیں۔ ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گھر میں سب پر یہ تاکید ہے کہ نوکر کو نوکر نہ کہا جائے یہ محنت کش لوگ ہیں ان سے اخلاق سے پیش آنا چاہئے"۔ 54

کاریگر کو برابر کی عزت:

جو لوگ "Work is worship" کے قائل ہوتے ہیں وہ کاریگر کی قدر کرتے ہیں ان کے ساتھ برابری کا معاملہ رکھتے ان سے عزت سے پیش آتے۔ سردار کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔

رباب جعفری لکھتی ہیں۔

"ایک مرتبہ ایک TV پکچر کی شوٹنگ ان کے (سردار جعفری) کام کرنے کے کمرے میں ہوئی تھی۔ جو لوگ کام کرنے کے لیے آئے تھے ان کو دوپہر کا کھانا کھلایا تھا۔ کھانے کے وقت پر کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سب کو بلایا۔ سب لوگ میز کے

قریب آ گئے لیکن وہ تین آدمی جو کیمرا وغیرہ اٹھانے کا کام کر رہے تھے۔ وہ کھانا آتے ہوئے دیکھ کر گھر سے باہر چلے گئے تھے۔ سردار بھائی نے جب ان تینوں آدمیوں کو کھانے میں شریک نہیں دیکھا تو ان کو بلانے کے لیے خود گئے اور اپنے ساتھ لے کر واپس آئے۔ جب ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو بے چاروں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ سردار بھائی نے ان سے کہا کہ ''میرے گھر میں سب برابر ہیں آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھر ان کو اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ وہ اپنی عزت افزائی سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔'' 55

گھر والوں سے اچھا برتاؤ:

اپنے گھر والوں سے اچھا برتاؤ روا رکھنا کسی بھی آدمی کی سیرت کا بہت اہم پہلو ہے۔ سردار جعفری نے ہمیشہ اپنے گھر والوں کو خوش رکھا۔

ان کی بہن رباب جعفری لکھتی ہیں۔

''گھر میں ہم سب سے (سردار جعفری) بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ غصہ نہیں کرتے، بلکہ یہ کہنا چاہتے کہ بڑوں سے لے کر بچوں تک کے دوست ہیں۔ سب کے رازدار ہیں۔ گھر میں رہتے ہیں تو گھر والوں کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہتا۔ سب کے خیر خواہ ہیں''۔ 56

گھر والوں کی ضروریات کا خیال:

رباب جعفری نے یہ بھی لکھا:

''گھر کے دوسرے افراد کی ضروریات ہر وقت (سردار جعفری کے) پیش نظر رہتی ہے۔ سب کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے ہیں''۔ 57

خاندان والوں کا سہارا، طاقت دکھ اور درد کا ساتھی:

..... ''یہ (سردار جعفری) خاندان والوں کے لیے ایک مضبوط سہارا ہیں۔ ایک بڑی طاقت ہیں اور ہمیشہ سے سب کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔'' 58

بحیثیت بھائی:

رباب جعفری نے اپنے مضمون ''مرے بھائی'' میں سردار جعفری کی بہنوں سے محبت، سلوک، تعلیم و تربیت، پرورش پر روشنی ڈالی ہے اس مضمون کے اقتباسات پیش ہیں۔

(1) ''میری نگاہ میں وہ (سردار جعفری) ایک محبت کرنے والے شوہر بچوں کے شفیق باپ، بہنوں کے رفیق بھائی، بھائیوں کے قوت بازو، عزیزوں کے غمگسار، پڑوسیوں کے خیر خواہ، دنیا کے تمام انسانوں کے دوست کا نام سردار جعفری ہے۔ 59

(2) بقول ستارہ جعفری ''سردار بھائی نے ہم بہنوں سے کہا'' رباب سات سال کی بیماری سے بہت تھک گئی ہو۔ یہاں رہو گی تو وہی خیال آتا رہے گا۔ لھذا تم دونوں میرے پاس بمبئی چل کر رہو'' نومبر 1953 میں ہم دونوں بہنیں بمبئی آ گئیں اور

اب تک سردار بھائی کے ساتھ ہیں وہ ادبی شعور جو بلرام پور میں ابھرا تھا سردار بھائی کے سائے میں رہ کر نکھر گیا"۔ 60

(3) "والدین کی موت کے بعد سردار بھائی نے مجھے اور چھوٹی بہن ستارہ کو اپنے پاس بلایا .... کہاں تمہیں یہاں رہنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی ..... میرے ہوتے ہوئے تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہاں اگر تم اپنا وقت گزارنے کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو۔کام کرنا بہت اچھی بات ہے۔اس سے انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔اس کے بعد ہم نے جو کام کیا کسی نے مخالفت نہیں کی اور ہم زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔سردار بھائی نے ہم بہنوں کی ہر قدم پر رہنمائی کی"۔

"جس کمرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں اُسی میں ہم دونوں بہنیں رہتی ہیں ..... میری ایک دوست جو بہت امیر اور علیٰ تعلیم کی مالک ہیں ایک روز وہ حسب معمول آئی ہوئی تھیں۔کہنے لگیں "رباب تم بہت خوش نصیب ہو .... تمہارے پاس علم و ادب کا سرمایہ ہے۔یہ بہترین کتابیں تمہاری ہر وقت کی ساتھی ہیں۔پھر خدا نے تمہیں ایسا عالم بھائی دیا ہے۔تم علم و ادب کے پُرسکون ماحول میں رہتی ہو۔جب میں اس کمرے میں تمہارے پاس آکر بیٹھتی ہوں تو میرے دل کو بڑی قوت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس جگہ آنے کے بعد کہا تھا "تمہاری ماں نے تمہیں ایک ایسا بے بہا ہیرا دیا ہے جس کا کسی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔وہ تمہارا بھائی سردار جعفری ہے۔" 61

شوکت اعظمی لکھتی ہیں:

"1953 میں والد کے انتقال کے بعد اپنی دو بہنوں کو اپنے پاس بلا لیا جو آج تک ان کے ساتھ ہیں۔انھیں خود کفیل بنانے میں سردار بھائی کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے"۔ 62

اپنی بہنوں سے علی سردار جعفری کی محبت و شفقت پر روشنی ڈالتے ہوئے یوسف ناظم نے لکھا ہے:

"یہ جعفری صاحب ہی کی شفقت اور غیر معمولی مودّت تھی کہ ان کی دونوں بہنیں جو ناکتخدا تھیں عمر بھر انہی کے ساتھ رہیں اور جعفری صاحب کی حیات ہی میں ان دونوں نے یکے بعد دیگرے دنیا کو خیرباد کہا۔میں نے جعفری صاحب کی گھریلو زندگی کے کئی مناظر دیکھے ہیں کئی سال پہلے ایک مرتبہ جعفری صاحب کو علاج کے لیے دواخانہ لے جایا جا رہا تھا تو گھر سے رخصت ہوتے وقت دونوں بہنوں نے با دیدۂ پُرنم قرآنی آیتیں ورد کرتے ہوئے انہیں رخصت کیا اور یہی نہیں دروازے پر دونوں نے ان کے سر پر قرآن مجید کا سماوی سایہ بھی کر دیا اور جعفری صاحب نہایت خاموشی اور عقیدت کے ساتھ اس صحیفہ آسمانی کے سایے میں اپنے گھر سے رخصت ہوئے۔ .... دونوں بہنیں جعفری صاحب ہی سے نہیں سلطانہ جعفری پر بھی جان چھڑکتی تھیں۔ان کا دائرہ عمل ہی یہ تھا اور یہ تربیت ان کے ترکے میں ان کے ساتھ آئی تھی ..... جعفری صاحب نے اپنی بہن رباب جعفری کی رحلت پر جو شعر کہے تھے وہ شعر نہیں ان کے دل سے نکلی ہوئی آہیں اور آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسو تھے اور عجیب اتفاق جسے سانحہ کہئے یہ ہے کہ جس دن دل گرفتہ شاعر نے یہ مرثیہ کہا میں ان کے گھر پر موجود تھا اور میں ہی پہلا شخص تھا جسے جعفری صاحب نے اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں یہ اشعار سنائے"۔ 63

بحیثیت دادا:

سردار جعفری اپنے پوتی پوتے کو بہت چاہتے تھے، انھے تفریح کراتے ان کے ساتھ کھیلتے ان کی ضرورتوں اور خواہشوں کی چیزیں دلاتے اور ان کے شور شرابے سے ہرگز جز بز نہیں ہوتے۔

رباب جعفری کے مطابق:

''سردار جعفری اپنے پوتی پوتے کو بیحد پیار کرتے ہیں محمد اقبال آٹھ سال کے ہیں۔مہ ناز چار سال کی ہیں۔ان کی ہر فر مائش بڑے پیار سے پوری کرتے ہیں۔بچے اپنے دادا سے بیجا ناز برداری بھی کراتے ہیں۔ کبھی بچوں کی خواہش ہے کہ ٹکیسی سے ورلی سی فیس چلو، کبھی بچے اپنے دادا کے ساتھ بینکنگ گارڈن (مالا بار ہل) یا وارڈن روڈ کے دوسرے باغوں میں کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کبھی پوتی کی انگلی پکڑے کھلونوں کی دکان پر کھڑے قلم و پنسل دلاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال، مہ ناز جب چھوٹے چھوٹے سے تھے تو یہ اپنے گھر کے آگے کی فٹ پاتھ پر بچوں کی گاڑی میں بٹھا کر ٹہلایا کرتے تھے۔ دادا بچوں کے جج کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔منٹ منٹ پر ان کی شکایتیں سنتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔دن میں تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ ضرور گذارتے ہیں۔دونوں بیحد شریر اور ذہین بچے ہیں۔ہر وقت گھر میں شور برپا کئے رہتے ہیں۔سردار بھائی اس ہنگامہ سے بے نیاز اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔یہ ممکن ہے کہ ان کو اپنے پیارے پوتی پوتا کی آواز دلکش گیت یا نغمہ بن جاتا ہو۔ہر بات انسان کے سوچنے پر منحصر ہے''۔

64

رباب جعفری نے مزید لکھا:

''ننھا اقبال خوبصورت اور ذہین بچہ ہے۔وہ کمرے میں آتے ہی میز پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔کبھی قلم لینا چاہتا ہے۔کبھی کاغذ کھینچتا ہے۔سردار بھائی کو ٹائپ کرتا ہوا دیکھ کر اس کو مانگتا ہے۔اس وقت یہ (سردار جعفری) کتنا ہی ضروری کام کر رہے ہوں اس کو چھوڑ کر پوتے کی خواہش پر ٹائپ رائٹر اس کو کھیلنے کے لیے دے دیتے ہیں۔اپنے پوتے محمد اقبال جعفری کو دونوں بیٹوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

65

بحیثیت چچا:

سردار جعفری اپنے بھتیجے کو بہت چاہتے تھے۔انہوں نے بھتیجے کی تعلیم و تربیت اور شادی میں اس خلوص اور خوشی سے دلچسپی لی جس طرح اوہ اپنے بچوں کے سلسلہ میں دلچسپی لے سکتے تھے۔

رباب جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی بھی بھتیجے سے بہت محبت کرتے ہیں۔جب انجینئری پاس کر کے یہ گورنمنٹ کی ملازمت کرنے لگے تو ان کو حسن مہدی (ظفر عباس جعفری کے بیٹے) کی شادی کی فکر ہوئی..... سردار بھائی نے شروع سے اپنے بھتیجے کے تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی تھی۔شادی بھی بہت شوق اور خوشی خوشی اپنے گھر سے کی۔حسن مہدی بھی اپنے چچا (سردار جعفری) کو اپنے والد کے برابر عزت دیتے ہیں''۔حسن مہدی کی شادی بمبئی کے مشہور مسلم لیڈر رسید ابو محمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی

ہے۔جب شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی تو اسی زمانے میں سردار صاحب کو دل کی تکلیف ہوگئی۔ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کے لیے ہسپتال لے جانا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہ کر انکار کر دیا کہ میری دلی تمنا ہے کہ حسن مہدی کو دولہا بنتا دیکھوں۔ڈاکٹر یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔اس بارے میں ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا گیا۔انہوں نے فرمایا بھتیجے کی شادی کی خوشی میں یہ اس وقت اپنی بیماری بھول گئے ہیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ خوشی مرض پر غالب آجائے''۔

ریسیپشن(Reception) سے واپس آکر انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ ہم سب کو بتایا کہ جب حسن مہدی کے چہرے سے مقنہ اور سہرا اٹھایا گیا تو بے ساختہ لوگ کہنے لگے کہ ہم نے ایسا خوب صورت دولہا نہیں دیکھا تھا۔کچھ لوگ اس حسن کو دیکھ کر صلوٰۃ بھیجنے لگے۔دوسرے بھتیجے حسین جعفری کی شادی بھی ان کی خوشی کے مطابق ابو محمد صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی''۔ 66

بحیثیت خسر:

سردار جعفری نے اپنی بہو کا انتخاب مال و دولت کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ رشتہ طے کرتے وقت ہی انہوں نے لڑکی والوں پر واضح کر دیا کہ انھیں لین دین روپیہ پیسہ سازو سامان کی ضرورت نہیں۔

رباب جعفری رقمطراز ہیں:

''ناظم جعفری کی شادی سردار بھائی نے بڑی سادگی سے کی۔ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ بہو خوبصورت،خوش مزاج اور تعلیم یافتہ ہو۔امیر لڑکی تلاش نہیں کی۔ناظم کی شادی حیدرآباد کے معزز خاندان میں ہوئی ہے۔وہاں برسوں سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے گھوڑے جوڑے کی شکل میں بہت زیادہ روپیہ مانگتے ہیں۔

جب ان کی شادی کی تاریخیں طے ہوگئیں تو دلہن کے چچا نے سردار بھائی کو لکھا'' آپ یہاں آکر لین دین کے بارے میں بات کر لیجئے''۔انہوں نے جواب دیا''مجھے یا میرے بیٹے کو گھوڑے جوڑے کے نام پر روپیہ یا کسی سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ہم اپنی بہو سے بیٹیوں جیسا برتاو کرتے ہیں''۔ 67

پڑوسیوں کی نگاہ میں سردار جعفری:

سردار جعفری کے پڑوس سے بہت اچھے روابط تھے پڑوس بھی ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔سردار جعفری کی دو بہنیں رباب جعفری اور ستارہ جعفری جو سردار جعفری کے ہی گھر میں رہا کرتی تھیں انہوں نے سردار جعفری اور ان کے پڑوسیوں کے مابین خلوص و محبت کو اجاگر کیا ہے۔

اس تعلق سے رباب لکھتی ہیں:

''سیتا محل میں رہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری بلڈنگ میں سردار جعفری کے روپ میں ایک دیوتا رہتا ہے''۔68

سردار کا پڑوسیوں سے حسن سلوک:

ستارہ جعفری رقمطراز ہیں:

''پڑوسی تو کہتے ہیں۔اس بلڈنگ میں ایک دیوتا رہتا ہے۔بھگوان کی طرح کسی کے ساتھ کیا بھلائی کرتا ہے اور کیا دیتا ہے۔یہ معلوم ہی نہیں ہوتا ورنہ لوگ تو ایک پیسہ کسی کو دیتے ہیں تو بتاتے ہیں۔مزاج میں قناعت پسندی اور بھی زیادہ آگئی ہے اس لیے حوصلہ زیادہ بلند ہے''۔ 69

بحیثیت دوست:

سردار جعفری کو مثالی دوست کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔معدودے چند ہی لوگ ہوا کرتے ہیں جو دوستوں کو اپنا سگا بھائی سمجھتے ہیں'ان کی خوشی وغم میں شریک ہوتے ہیں۔دامے درمے سخنے ان کی مدد کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

سردار جعفری کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رباب جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی اپنے دوستوں سے بھی بہت اچھے مراسم ہیں۔ان لوگوں میں آپس میں کسی قسم کی غیریت نہیں ہے۔اپنے دوستوں سے بھائیوں جیسا برتاؤ ہے۔ان کی فکر و پریشانی میں برابر کے شریک ہیں۔دوستوں کی خوشی ان کی خوشی ہے۔سردار بھائی کے دوستوں کے دلوں میں بھی ان کے لیے بڑی گنجائش ہے۔وہ لوگ ان کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔چند سال پہلے اُردو کے مشہور شاعر کیفی اعظمی صاحب پر رات میں کسی وقت فالج کا حملہ ہوا تھا۔سردار بھائی کو یہ خبر دوسرے دن گیارہ بجے دوپہر میں ملی۔یہ سنتے ہی ایک دم سے گھبرا گئے۔اٹھ کر یہاں کے کئی اسپتالوں میں فون کیا اور ایک گھنٹے کے اندر بمبئی کے بہت اچھے نرسنگ ہوم برج کینڈی میں داخل کر دیا۔ان کی بیوی شوکت کیفی کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میرا گھر نرسنگ ہوم سے قریب ہے یہاں رہنے میں تم روز جو ہو جانے کی تکلیف سے بچ جاؤ گی اور کیفی سے بھی قریب رہو گی۔شبانہ اور بابا کی بھی دلجوئی کرتے تھے۔کیفی صاحب کے پروڈیوسروں کے پاس ان کا روپیہ باقی تھا وہ منگوا کر شوکت کیفی کو دے دیا اور یہ تسلی دی کہ کیفی کا علاج کرانا میری ذمّے داری ہے تم گھبرانا نہیں۔جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس صاحب، کرشن چندر کی بیماری میں بھی سردار بھائی بے چین اور بے قرار تھے۔ہر وقت ان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ ان کے ہمعصر ادیبوں کے علاج میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔کرشن چندر اور مظفر شاہ جہاں پوری کے علاج کے لیے گورنمنٹ سے روپیہ دلوایا کیوں کہ دل کی بیماری میں روپے کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ایک دو شعرا کو چھوڑ کر کسی ادیب یا شاعر کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا علاج خود کرا سکے''۔ 70

پرخلوص دوستوں کی محفلوں میں سردار جعفری کی خوشیوں کا ذکر یوسف ناظم نے اس طرح کیا ہے:

''بے تکلف دوستوں کی بے ریا صحبت میں وہ لطیفے سنتے، پُر مذاق باتیں کرتے اور بے ساختہ ہی نہیں انہیں بے محابا قہقہے لگاتے بھی پایا گیا ہے۔ان کی پیشانی پر بل بھی آئے ہیں لیکن صرف اس وقت جب وہ لوگ جوان کی خوشہ چینی سے مستفید و متمتع ہونے کے بعد انہیں کی نکتہ چینی میں لب کشائی فرماتے تھے۔روشنی ان کے چراغ کی لو سے حاصل کرتے تھے اور پھر اندھیرے

میں چھپ کر انہی کی طرف تیر پھینکتے تھے.... جب حلیفوں کا رویہ بھی حریفانہ اور حریفانہ سے آگے بڑھ کر غاصبانہ ہو جائے تو ظاہر ہے جعفری صاحب جیسے متحمل شخص کا مکدّر اور منغض ہونا فطرت انسانی کا تقاضہ تھا''۔ 71

دوستوں کی دعوتیں کرنا پسند:

سردار جعفری اپنے ہاں دوستوں کی محفلیں منعقد کرتے ۔ان محفلوں میں علم و ادب کے چرچے ہوا کرتے شعروشاعری کے خوبصورت اور مترنم نغمے پیش کے جاتے۔

اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رباب جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی کو اپنے گھر میں دوستوں کی دعوتیں کرنا بہت پسند ہے۔بمبئی میں رہنے والے دوستوں کے علاوہ بیرونی ممالک سے بھی جو دوست آتے ہیں ان کے اعزاز میں سب کو کھانے پر بلاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان محفلوں میں شاعروں اور ادیبوں کا مجمع ہوتا ہے..... ان محفلوں میں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، مہندر ناتھ، کیفی اعظمی، ساحر، مجروح سلطان پوری، مخدوم حیدرآبادی، وجد صاحب کی وجہ سے محفل کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔ان کے خوبصورت نغموں اور دلکش ترنم سے سننے والوں کی روح سرشار ہو جاتی تھی۔ان میں علم و ادب کے چرچے ہوتے تھے۔کبھی روسی شاعروں کا کلام سنتے تھے۔کبھی کناڈا وغیرہ کے شاعروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔جوش صاحب اور فیض صاحب کی دعوت کی تقریب میں بہت سے ادب نواز اور شاعری کے شیدائی، قدر شناس لوگ بھی آجاتے تھے۔گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی آنے والے خوش رہتے تھے۔'' 72

''.....اپنے دوستوں، مداحوں کے گھر رات کے کھانے پر جاتے ہیں.....یہ (سردار جعفری) دستوں کی دعوت کرتے رہتے ہیں۔ان محفلوں میں ان کی شخصیت بڑی باغ و بہار رہتی ہے۔دوست شاعروں کی نظمیں سنتے ہیں اور اپنا کلام سناتے ہیں۔دس گیارہ بجے رات تک کھانے سے فارغ ہو کر اور دوستوں سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے جاتے ہیں۔پھر دن بھر کا تھکا ہوا دل و دماغ مزید تھکن برداشت نہیں کر سکتا''۔73

مہمانوں کی عزت اور حسن سلوک:

سردار جعفری اپنے مہمانوں کی بہت عزت کرتے۔خود تکلیف اٹھاتے لیکن مہمانوں کو اس کا احساس تک نہیں ہونے نہیں دیتے۔

رباب جعفری رقمطراز ہیں:

(1) ''اپنے گھر میں آنے والوں کے ساتھ بھی سردار بھائی کا بہت شائستہ برتاؤ ہے۔ان کو بہت عزت دیتے ہیں۔اس بلند اخلاق کی وجہ سے سردار بھائی کے بارے میں ان لوگوں کے بڑے اچھے خیالات ہیں''....

(2) ''سردار بھائی کے دوست اور عزیز اکثر بمبئی آیا کرتے ہیں۔کبھی کبھی ایک وقت میں بہت سے مہمان آجاتے ہیں تو سونے کے لیے جگہ کم ہو جاتی ہے۔اسوقت یہ (سردار جعفری) اپنے سونے کا کمرا ان لوگوں کے واسطے خالی کر دیتے ہیں اور خود

زمین پر بستر بچھا کر سوجاتے ہیں۔بارہا ہم لوگوں نے کہا کہ آپ پلنگ پر سوجایئے ہم نیچے سوجائیں گے لیکن یہ کسی کو زمین پر نہیں سونے دیتے اور اپنے گھر میں آنے والوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ اس کی وجہ سے میزبان کو تکلیف ہے بلکہ وہ ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرتا ہے"۔ 74

محمد اسداللہ نے اپنا ایک واقعہ لکھا اور بتایا کہ کس طرح سخت گرمی میں سردار جعفری انھیں receive کرنے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔

"میں نے دہلی سے سردار بھائی کو بمبئی فون کیا اور کہا کہ آئندہ ہفتے ٹرین سے بمبئی آرہا ہوں۔بعد میں انھیں ٹرین کا نمبر اور کس وقت گاڑی بمبئی پہنچے گی اُس سے مطلع کردیا۔مقررہ دن جب گاڑی بمبئی کے اسٹیشن پر پہنچی تو لیٹ تھی،مین گیٹ پر دیکھا تو وہ دھوپ میں کھڑے تھے۔میں نے کہا" آپ نے کیوں زحمت کی،ناظم (بیٹے) کو بھیج دیتے"۔انہوں نے جواب دیا "میں خود تمہیں لینے آنا چاہتا تھا۔ہم دونوں اسٹیشن سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ پر آئے۔بے حد گرمی تھی۔ جھلسا دینے والی گرمی.....وہ میرے ساتھ ہی کھڑے رہے،.....سردار بھائی کا پورا دن ضائع ہوگیا۔ٹرین دو گھنٹے لیٹ تھی۔یہ ان کی انسانیت اور رکھ رکھاؤ تھا کہ دو گھنٹے اسٹیشن پر ہی کھڑے میرا انتظار کرتے رہے"۔ 75

ملاقاتیوں سے عمدہ سلوک:

سردار جعفری گھر پر ملنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتے۔رباب جعفری نے سردار جعفری کے اپنے ملنے والوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"عام طور سے سردار بھائی کسی شخص سے ملنے کے لیے منع نہیں کرتے۔ہاں ہر ایک پر یہ تاکید ہے کہ وہ فون کر کے اُن سے ملنے کے لیے آتے تاکہ یہ اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کرسکیں۔بات چیت میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اپنے مہمانوں کو بغیر چائے یا کھانے کا وقت ہے تو بغیر کھانا کھائے ہوئے واپس نہیں جانے دیتے بشرطیکہ آنے والے کے پاس بیٹھنے کا وقت ہو۔بے جا تکلف پسند نہیں کرتے۔"سردار بھائی کبھی کسی ضروری کام میں مصروف ہوتے ہیں اور اس وقت میں ان کا کوئی بے تکلف دوست آجاتا ہے تو اپنا کام چھوڑ کر اس سے باتیں کرتے ہیں۔پھر اُس سے معذرت کر کے اپنے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں۔اُسوقت کی خاطر داری کا کام ہم لوگ اور بھابھی انجام دیتے ہیں۔ان کے دوست اس بات کا بُرا نہیں مانتے۔اپنے کام سے فارغ ہوکر دیر تک اس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں"۔

"..... کھانے کے بعد دوپہر میں مشکل سے گھنٹے آدھے گھنٹے آرام کرتے ہیں۔گھر کے لوگوں کو ہدایت ہے کہ اگر کوئی صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آئیں یا کوئی فون آئے تو مجھے فوراً جگا دیا جائے"۔ 76

بغیر اطلاع آئے ہوئے مہمان کی خاطر سردار جعفری اپنے کام کو پیچھے ڈالنے والے آدمی تھے۔نگار عظیم نے سردار جعفری کی سیرت کے اس پہلوں کو اجاگر کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''ایک مرتبہ بغیر فون کئے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔موجود تھے۔دروازہ کھولا کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔لیکن جانے کی تیاری میں ہیں؟نہیں آؤتم ..... میں (نگار عظیم) بغیر اطلاع کے آگئی۔بس ایسے ہی موڈ بنا۔خالی تھی سوچا آپ سے مل لوں۔میری وجہ سے بیٹھ گئے۔سیب کھاؤ گی؟ جی نہیں۔چائے تو ضرور پیو گی؟ بالکل نہیں۔سنگترہ لے لو۔ضرور لوں گی۔اور میں نے ایک سنگترہ اٹھالیا۔پہلے یہ بتائیں کہیں جارہے تھے آپ؟ میری وجہ سے آپ کا پروگرام۔۔تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔آپ کی طرف ہی جانا ہے۔میری طرف تو پھر میرے یہاں کیوں نہیں؟ پھر کبھی۔کہیں فون کیا اور گاڑی طے شدہ وقت سے آدھے گھنٹے دیر لانے کے لیے کہا اور پھر آرام سے محو گفتگو ہوئے۔اس روز خالص ادبی گفتگو تھی۔میرے مجموعے پر ان کا اظہار خیال، ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے نیا سفر، ادبی رجحانات اور زمانے کے تقاضے، قلم کی حقیقت بیانی، کہانی کے کرداروں کی زبان اور مجلس کا ذکر کرتے ہوئے اس کی افادیت پر زور وغیرہ وغیرہ۔جعفری صاحب اپنے مخالفین کا ذکر کرتے تھے لیکن بُرا نہیں کہتے تھے۔پتہ ہی نہیں چلا کیسے آدھا گھنٹہ بیت گیا۔گاڑی آگئی ہم دونوں ایک ساتھ جامعہ آئے۔مکتبہ سے شاہد صاحب کو لیا ان کے بیوی بچوں سے ملاقات کی۔پھر صدیق الرحمان قدوائی صاحب کے یہاں پہنچے۔ڈرائیور کو تاکید کی کہ مجھے گھر تک چھوڑ کر آئے''۔

77

بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت:

پروفیسر عبدالستار دلوی کے مطابق:

''وہ (سردار جعفری) بزرگوں سے احترام وعقیدت سے پیش آتے تھے اور اپنے چھوٹوں سے ان کا برتاؤ انتہائی مشفقانہ تھا''۔

78

دولت کی ہوس اور مادہ پرستی کے مخالف:

انسانوں کے مابین تفریق پیدا کرنے والی چیز دولت کی ہوس اور مادہ پرستی ہے۔ڈاکٹر فاطمہ تنویر نے بتایا کہ سردار جعفری اس سے کوسوں دور تھے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری کے خیال میں انسانوں انسانوں میں تفریق پیدا کرنے والی شئے دراصل دولت کی ہوس ہے اور مغرب کی مادہ پرستی نے اُس کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے۔دوسرے مغرب نے قوم پرستی کے نظریہ کو ہوا دے کر انسانوں کو تقسیم کرنے کا جرم بھی کیا ہے۔''

79

فطری شرافت:

سردار جعفری فطرتاً شریف آدمی تھے۔انہوں نے ہمیشہ بزرگوں کا احترام کیا اور ہوس، لالچ اور مادّی آسائشوں سے اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچائے رکھا تھا بشیر احمد انصاری، سردار جعفری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مالیگاؤں میں جعفری صاحب آخری بار ہارون بی۔اے کی دعوت پر آئے تھے۔وہ صابر ستار ہال میں ٹھیک وقت پر

حاضر ہو گئے اور پہلی صف میں بیٹھ گئے ۔تھوڑی دیر بعد ایک بزرگ استاد شاعر حضرت احسن معمولی لباس میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے تشریف لائے ۔انھیں آتا دیکھ کر جعفری صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ۔آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مصافحہ کیا اور اپنے بازو کی نشست پر انھیں بٹھایا ۔بزرگی کا یہ احترام انہوں نے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں کیا۔یہ تو ان کی فطری شرافت تھی ....''

جعفری صاحب کو اردو اکادمی کا ڈائرکٹر بھی بنایا گیا تھا۔انھیں اس عہدے کی وجہ سے ایک کار ملنی تھی۔جعفری صاحب نے کار لینے سے انکار کر دیا۔یہ ان کی شرافت کی ایک اور مثال ہے۔'' 80

چھوٹے فلیٹ میں قناعت پسند زندگی:

سردار جعفری کی ایک صفت قناعت پسندی تھی ۔انہوں نے چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی بسر کی جہاں آٹھ افراد خاندان رہا کرتے تھے۔

شوکت کیفی نے اس بارے میں بتایا:

''سردار بھائی کو صرف ان کی ادبی خدمات کی بناء پر کم سے کم لکھپتی ہونا چاہئے تھا لیکن اس عمر میں بھی جب کہ وہ ستر سال کے ہو چکے ہیں وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے ہیں جس میں صرف دو بیڈروم ہیں اور ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں آٹھ لوگ رہتے ہیں۔دو بہنیں، دو بیٹے، بڑے بیٹے کی بیوی، ایک تین سال کا پوتا اور ایک نوکر۔ان کے لکھنے کے کمرے میں لوگ رہتے ہیں۔لوگ ملنے آتے ہیں اور وہیں بیٹھتے ہیں کیوں کہ کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے اور اسی کمرے میں یہ تخلیقی کام بھی کرتے ہیں ۔اب کیوں کہ اتنے بڑے کنبے کو پالنا ہے ۔اس لیے سلطانہ آپا اپنی کمر کی تکلیف کے باوجود نوکری کرتی ہیں ۔ حساس اتنے ہیں کہ آج تک مجھ سے یا کیفی سے کبھی اپنی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا ۔مدد مانگنا تو دور کی بات ہے''۔ 81

سردار جعفری کے رہائیشی کمرہ کی منظر کشی دیگر لوگوں نے بھی کی ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں:

سمرتھ بالی کے مطابق:

''ان (سردار جعفری) کا رہائشی کمرہ جہاں کتابوں کا انبار فرش سے چھت تک چلا گیا ہے، ایک مکتب سے کم نہیں جو علم و ادب کے کسی بھی طالب علم کے لیے باعث رشک ہے ۔وہاں اور کوئی سامان عیش نظر نہیں آتا ۔ایک میز ہے جس پر کچھ کتابیں، کاغذات اور فائلیں بکھری پڑی رہتی ہیں ۔میز پر سنگ مرمر کا ایک ٹیبل لیمپ اور نئے پین کی ایک جوڑی، جو ماحول سے بے نیاز ایک جگہ رکھے ہوئے ہیں ۔کمرے کے ایک گوشے میں دانتے کا ایک پیتل کا مجسمہ ہے، بیراگی سا مغموم و اُداس، خاموشی میں ڈوبا ہوا''۔ 82

ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری... سیتا محل کے فلیٹ کا ایک کمرہ، آٹھ نو من کتابیں، دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی نیند، بکھرے ہوئے بہت سارے کالے سفید بال، 555 برانڈ کی سگریٹیں، فرش کھڑکیاں، دیواریں ۔فرنیچر، ٹیلی فون، پنڈت نہرو کی تصویر، پدم

شری کی دستاویز۔سردار جعفری کتنی ساری چیزوں سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ان تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ پھلانگنا پڑتا ہے"۔ 83

بقول رباب جعفری:

"میں دیکھتی ہوں دوسرے ادیب شاعروں کے پاس کام کرنے کے علحدہ کمرے ہیں۔جب وہ کام کرتے ہیں تو گھر میں خاموشی رہتی ہے لیکن سردار بھائی کو مشکل سے چند گھنٹے ایسے ملتے ہیں جن میں وہ تنہائی میں کام کرسکیں۔ہم دونوں بہنوں کے علاوہ آنے والے مہمان اسی کمرے میں آکر بیٹھتے ہیں۔اکثر بچے بھی یہاں آکر کھیلتے ہیں۔کبھی بچوں کو شور کرنے پر انہیں منع نہیں کرتے۔اگر کوئی دوسرا روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ بچوں کو کھیلنے دو"۔ 84

حق تلفی نہ کرنے والی شخصیت:

کسی معاشرہ میں لوگ دوسروں کے حقوق ادا کرنے والے ہوں تو وہاں انصاف اور پر امن ماحول بنا رہے گا۔بیشتر اختلافات، بے چینی، محرومی کا احساس وغیرہ کی جڑ حق تلفی ہوتی ہے۔سردار جعفری حق تلفی کرنے والوں میں نہ تھے۔

سلمیٰ صدیقی نے لکھا ہے:

"انہوں نے (سردار جعفری) کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی نہ ادب میں نہ عام زندگی میں"۔ 85

پرخلوص بے تکان محنت، لگن سے مقام پیدا کیا:

سخت محنت، لگن، جستجو، دلچسپی، یہ ایسی خصوصیات میں شامل ہیں جن سے سماج میں بڑا مقام اور مرتبہ نصیب ہوتا ہے۔

محمد ایوب واقف لکھتے ہیں:

"ہر عہد میں کوئی نہ کوئی ادبی شخصیت ایسی ضرور ہوتی ہے جو اپنی بے تکان محنت، لگن اور کوشش سے اپنے مقام اور مرتبے کو بہت بلند و بالا کر لیتی ہے اور زمانہ اس کے انفرادی کمالات اور اوصاف کے پیش نظر عظمت و برتری کا تاج اس کے سر پہ رکھتا ہے اور ہمارے عہد میں یہ قابل ستائش مرتبہ اور رتبہ ترقی پسند تحریک کے اولوالعزم اور مابہ الامتیاز شاعر، نقاد اور دانشور جناب علی سردار جعفری کو حاصل ہوا ہے"۔ 86

دھن کے پکے:

کامیابی اور کامرانی کے لیے آدمی کا مستقل مزاج اور Dedicated ہونا لازمی ہوتا ہے اور ان صفات سے سردار جعفری متصف تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مطابق۔

"اس میں شک نہیں کہ علی سردار جعفری دھن کے پکے ہیں"۔ 87

فعال، متحرک، مستعد:

آدمی اگر بچپن ہی سے محنتی ہو تو پھر اس کی یہ عادت آگے بھی برقرار رہتی ہے۔

یوسف ناظم نے سردار جعفری کے بارے میں بتایا ہے۔

''علی سردار جعفری اپنی 50 سالہ سیاحت کے باوجود آج بھی اتنے ہی فعال متحرک اور مستعد ہیں جتنے کہ وہ اُس وقت تھے جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی اور لکھنو یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور اُنھیں ان یونیورسٹیوں سے خارج اور جیل میں داخل کیا گیا تھا۔'' 88

بہتر سے بہتر کی تلاش میں ثابت قدم:

ثابت قدمی، بہتر سے بہتر کی تلاش میں آدمی کو سرگرم عمل رکھتی ہے اور وہ اسے پانے کی طرف رواں دواں اور جواں رہتا ہے۔

راشد انور راشد نے سردار جعفری کے بارے میں لکھا ہے۔

''جینوین فنکار زندگی کے کسی موڑ پر اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا اور یہی اضطرابی کیفیت سے بہتر سے بہتر کی تلاش میں ثابت قدم رکھتی ہے۔ سردار جعفری کی زندگی عملی جدوجہد کا نمونہ تھی۔ ان کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ درد کی لہروں میں ان کی کشتی حیات ڈوبتے ابھرتے کسی طرح طمانیت کے ساحل سے ہم کنار ہونے کو مضطرب ہے''۔89

محنت کاروں، کسانوں سے محبت کرنے والا:

عرفانہ عزیز کے مطابق:

''محنت کاروں اور کسانوں سے محبت کرنے والا، آزادی اور امن کے گیت گانے والا اور انسانی ہاتھوں کی عظمت سے آشنا یہ نیلا فرشتہ جس کا نام علی سردار جعفری ہے۔'' 90

انسانی ہاتھوں کی تعظیم کرنے والوں کی شخصیت:

انسانی ہاتھوں کی تعظیم کیے جانے کی وجوہات پر سردار جعفری کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے

بشیر احمد انصاری لکھتے ہیں:

''یہ (سردار جعفری) ایک مثالی کردار ہے جسے پھول پیش کیے جاتے تو کہتا کہ یہ آپ لوگوں کا اقبال کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت ہے۔ میں نے تو وہی کیا جو اقبال کہہ چکے ہیں۔ میں انسانیت کی عظمت کا قائل ہوں۔ انسان کے ہاتھوں کی تعظیم وتکریم کرتا ہوں کیوں کہ وہ خام پتھر سے آئینہ بنانے کا ہنر جانتا ہے اور زہر کو تریاق اور شربت بنانے کے عمل سے واقف ہے۔ انسان کی یہ خلاقی جب انسانیت کی تعمیر میں تعاون کرتی ہے تو اپنی معراج کو چھوتی نظر آتی ہے۔ اور انسانی اقدار کا ایک جزو بن جاتی ہے۔'' 91

عرفانہ عزیز نے انسانی ہاتھوں کی عظمت کی اہمیت اجاگر کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں۔

''اجنتا کے غاروں سے ٹیکسلا تک اور ٹیکسلا سے ایتھنز، روم، زیورخ اور پیرس تک جہاں بھی میں نے فن تعمیر اور ثقافت کا

حسن دیکھا انسانی ہاتھوں کی عظمت پر یقین آیا اور علی سردار جعفری کی نظم پر بھی۔ دراصل آدمی کی واحد میراث آدمی کے ہاتھ ہیں جو لعل و گہر کو پہاڑ سے علحدہ کرتے ہیں اور اناج کو مٹی سے۔'' 92

وسیع القلب، عالی ظرف، حقیقت شناس:

سردار جعفری دوسروں کے فکر و فن کی تعریف کھلے دل سے کیا کرتے۔

اس سلسلہ میں سبط حسن لکھتے ہیں:

''وہ (سردار جعفری) ایک وسیع القلب، عالی ظرف، وضع دار اور حقیقت شناس انسان ہیں۔'' 93

رضیہ فصیح احمد کے مطابق۔

''وہ (سردار جعفری) وسیع القلب تھے۔ کھلے دل سے اپنے ساتھیوں کی تعریف کرتے تھے۔'' 94

بتول محمد ایوب واقف۔

''سردار جعفری صاحب کی شخصیت کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ دوسروں کے یہاں اگر کوئی لائق ستائش خوبی دیکھتے تھے تو اس کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔'' 95

رفعت سروش نے بتایا۔

''میں نے اپنی ایک دو نظمیں سنائیں تو سردار نے خاص طور پر ہمت افزائی کی۔'' 96

پروفیسر ضیاء علیگ نے بتایا۔

(1) ''جعفری صاحب نے اشفاق حسین کی (ان کے اشعار سن کر) ہمت افزائی فرماتے ہوئے برملا یہ کہا کہ ''نصاب غم دل'' بڑی خوبصورت ترکیب ہے۔ یہ بھی جعفری صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے کہ وہ ہمیشہ چھوٹوں کا دل بڑھاتے ہیں اور جو بات قابل تعریف ہو اس کی دل بھر کر تعریف کرتے ہیں قطع نظر اس کے کہ کہنے والا کون ہے....''

(2) ''.....1984 میں کینڈا میں ایک مشاعرہ ہوا۔ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے شعراء کرام نے اپنا کلام سنایا ''مشاعرے میں سب سے زیادہ داد احمد فراز کو ملی۔ لوگوں کا اشتیاق ان کو سننے کے لیے اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر وہ رات بھر سناتے رہتے تو لوگ خاموشی سے رات بھر ان کا کلام سنتے رہتے۔ جب تھک کر وہ اپنی نشست پر جا بیٹھے تب بھی لوگوں نے تالیاں بجانا بند نہ کیا۔ جعفری صاحب کی فراخ دلی اور وسعت قلبی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ احمد فراز کا ہاتھ پکڑ کر خود پوڈیم تک لے گئے اور ان سے خود فرمائش کی کہ کچھ اور سنائیں۔ انہوں نے ایک غزل کے چند اشعار پیش کئے۔'' 97

نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی:

نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے کارناموں کی ستائش کرنا اساتذہ کا کام ہے۔ اس سے فن کار کی کوششوں کو مہمیز ملتی ہے، ادب میں اضافہ ہوتا ہے اور اساتذہ کا یہ عمل ان کی اعلیٰ ظرفی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس اسلسلہ میں سیفی سرونجی لکھتے ہیں۔

''آج بیسویں صدی کا سب سے قابل احترام نام علی سردار جعفری کا ہے قدرت نے انہیں یہ عظیم مرتبہ یونہی نہیں بخشا بلکہ اس میں ان کی بہت سی خوبیاں بھی چھپی ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتنا بڑا مقام رکھتے ہوئے بھی نئی نسل سے نہ

صرف محبت کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے ..... ہمیشہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے سرونج سے نکلنے والے پرچے انتساب کے لیے ایک معیاری رسالہ کہکر اُردو دنیا میں انہوں نے جو عزت مجھے بخشی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ان کا یہ سلسلہ میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ نئی نسل کے ہر اُس فنکار سے تھا جس میں کچھ کرنے کا جذبہ وہ دیکھتے تھے۔اس بات کے گواہ میرے دوست بھائی عبدالاحد ساز بھی ہیں۔" 98

ہمعصر شعرا اور ادیبوں کی صلاحیتوں کی تعریف:

علی سردار جعفری ہمعصر شعرا کی خوبیوں کو اجاگر کیا کرتے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے بتایا:

"سردار جعفری نے اپنے ہمعصروں کے بارے میں بھی بات چیت کی اور اختر الایمان ،کیفی اعظمی اور دیگر کی شعری صلاحیتوں کو سراہا۔ان کے ادبی مقام کی ستائش کی۔یہ چیز میں نے ذرا کم ہی لوگوں میں دیکھی ہے۔کہیں کہیں ایسی بات کہہ دی جاتی ہے کہ اپنی بڑائی اور دوسروں کی بُرائی کا پہلو نکل آتا ہے لیکن سردار جعفری کا زاویہ گفتگو نہایت معروضی تھا۔یہی وجہ تھی کہ ہر حلقے میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔" 99

پروفیسر علی احمد فاطمی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس سے سردار جعفری کی اس سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔

"جلسہ شروع ہوا درمیان میں مجروح صاحب کی نظر مجھ پر (علی احمد فاطمی) پر پڑی ۔وہ (مجروح سلطان پوری) .....مائک پر آئے اور بولے "حضرات ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آج کی اس محفل میں ایک نوجوان آیا ہے جس پر ہم لوگ ناز کرتے ہیں۔وہ اُردو کا سپاہی تو ہے ہی ہماری انجمن کا بھی سپاہی ہے۔شمالی ہند میں اور بالخصوص اتر پردیش میں اُردو کی کسی تقریب کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں ۔وہ اُردو کا استاد ہے۔ادیب و ناقد بھی اور الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر بھی۔میری مراد علی احمد فاطمی سے ہے ..... میں ..... دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آئے اور آپ تالیوں سے اس کا خیر مقدم کریں۔مجروح صاحب کے یہ جملے۔پھر تالیاں اور ان تالیوں میں سردار جعفری، یوسف ناظم اور ندا فاضلی کی بھی تالیاں۔" 100

انداز گفتگو:

انسان کی شخصیت میں انداز گفتگو میں انداز گفتگو کی اہمیت کا اندازہ مشہور کہاوت "Sytle is the man" سے لگایا جاسکتا ہے۔سردار جعفری کا انداز گفتگو نہایت عمدہ تھا محمد اسداللہ نے ان کے شائستہ انداز گفتگو پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"ان کا (سردار جعفری) انداز گفتگو بڑا شائستہ ہوتا تھا۔ان کے جملے ترشے تراشے،ان کی گرمی گفتار قابل دید اور قابل سماعت ہوتی تھی۔ان کا حافظہ کمال کا حافظہ تھا، کیا مجال کہ زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جائے ،جملوں کا ربط ٹوٹ جائے ،تقریر میں یا گفتگو میں کوئی جھول آجائے۔اپنے بے پناہ حافظے سے اپنی خداداد ذہانت سے وہ بڑے اجتماع ہوں یا دوستوں کی مختصری محفل ہر جگہ جادو جگاتے تھے۔سحر کرتے تھے۔اور نمایاں رہتے تھے۔" 101

سوالات میں صاف گوئی پر اصرار، جواب واضح، مدلل:

سوالات اور جوابات میں clarity ہونی چاہئے۔ابہام اور گنجلک پن جیسے نقائص سے پاک ہو۔

رضیہ فصیح احمد نے سردار جعفری کی صاف گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

''بہت سے لوگوں نے ان (سردار جعفری) سے انٹرویو لیے۔وہ سوالوں میں صاف گوئی پر اصرار کرتے تھے اور جواب میں دوٹوک بات کرتے تھے''۔ 102

صاف گوئی، غلو سے پاک گفتگو:

لگی لپٹی باتیں یا غلو ایسی خامیاں ہیں جس سے مخاطب دھوکہ کا شکار ہو جاتا ہے۔سردار جعفری کی گفتگو ان نقائص سے پاک تھی۔

پروفیسر ضیاء (علیگ) لکھتے ہیں۔

''ان کا (سردار جعفری) ایک خاص لب ولہجہ ہے جس میں دیانتداری اور ذہانت کو بڑا دخل ہے۔وہ صاف گو ہیں اور صاف گوئی پسند کرتے ہیں۔لگی لپٹی رکھنے کے عادی ہیں نہ سننے کے۔وہ کسی کی مذمت میں انتہا پسندی کو دخیل ہونے نہیں دیتے اور نہ مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ہی ملاتے ہیں۔نہ وہ اپنے سامعین کو مخمصے میں نہیں ڈالتے ہیں کہ گنجلک پن ان کے طریقے گفتگو میں شامل نہیں۔'' 103

رضا جعفری کے مطابق۔

''سردار جعفری بہت صاف گو تھے اور ان کا ذہن اپنے عقیدے میں بہت پختہ تھا''۔ 104

آواز میں آہستگی اور لطافت:

سردار جعفری کی آواز کی خصوصیات کے بارے میں ریوتی لال شاہ نے بتایا:

''علی سردار جعفری کی شخصیت کی انفرادیت یہ ہے کہ ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہوتے ہوئے بھی ان کی آواز میں غصہ اور نعرے بازی کے ساتھ ایک آہستگی اور لطافت کا عالم بھی ہے۔یہ وہ پیمانہ ہے جو لبریز ہو کر بھی چھلکتا نہیں ہے۔یہ انداز دشوار تو ہے لیکن اس کا اثر گہرا اور پائیدار ہے''۔ 105

رفعت سروش لکھتے ہیں۔

''کھل کر باتیں کرنے والے، آواز میں کھنک، گفتگو میں لطافت اور فرصت ہو تو ہنسی مذاق بھی گوارا'' 106

لہجہ میں مٹھاس:

انسان کی شخصیت میں اسکی گفتگو کے لہجے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

سردار جعفری کے لہجے کے بارے میں رضیہ فصیح احمد نے لکھا ہے۔

''ان کے (سردار جعفری) کے لہجے میں مٹھاس کے ساتھ ایک زور بھی تھا مگر زبردستی بالکل نہیں۔ 107

رضا جعفری کے مطابق۔

''وہ (سردار جعفری) جب بولتے تھے تو ان کے الفاظ کی روانی ان کے لہجے کا جلال اور ان کی شخصیت کی دلکشی سے ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ان کی بات ختم ہوتے ہی لوگ کسی مقناطیسی کشش میں بندھ کر ان کے اردگرد ہالہ بنا لیتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ وہ کب ان سے مخاطب ہوں۔ان کے معاصرین میں فیض احمد فیض کے علاوہ یہ سعادت کسی اور کے حصے میں نہیں آئی تھی۔'' 108

توجہ سے بات سننے کے عادی:

Great men are listeners مشہور بات ہے۔بڑے لوگ دوسروں کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں اور ان کی بات توجہ سے سنتے بھی ہیں۔انسان کو اس کی پوری بات کہنے کا موقع دیا جائے اور پھر اس کی بات کو توجہ سے سن لیا جائے تو کہنے والے کو ایک قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے بصورت دیگر آدمی کو ملال رہتا ہے کہ اسے اپنا مطمع نظر اپنا خیال، اپنی وضاحت، اپنے دلائل پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔انسانی شخصیت کا یہ ایک بڑا پہلو ہے کہ آدمی دوسرے کو پوری بات مکمل کرنے دے، اس توجہ سے سنے۔سردار جعفری ہر کسی کی پوری بات توجہ کے ساتھ سنتے۔

سردار جعفری کی اس صفت کے بارے میں پروفیسر ضیاء علیگ لکھتے ہیں۔

''نہ ان کو (سردار جعفری) کسی کی دل شکنی پسند ہے نہ کسی کی تضحیک مقصود ہے۔ہر ایک بات کو توجہ سے سنتے ہیں۔کہنے والا بڑا ہو یا چھوٹا انھیں اس سے غرض نہیں۔صرف اس سے مطلب ہوتا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔نہ یہ کہ کون کہہ رہا ہے۔'' 109

غرور سے پاک:

کسی بھی انسان کے لیے غرور کی ویسے کوئی گنجائش نہیں ہے۔بین الاقوامی مقبولیت کی حامل شخصیت غرور، تکبر سے پاک ہو تو اس شخصیت کا کیا کہنا۔

شوکت اعظمی نے سردار جعفری کے بارے میں لکھا:

''اتنی شہرت کے باوجود (سردار جعفری) ذرا بھی غرور نہیں کرتے ہیں۔'' 110

مسائل کو انا کا مسئلہ بنانے سے کار متاثر ہوتا ہے، شخصیت مجروح ہوتی ہے۔

بشیر احمد انصاری نے سردار جعفری کی انا سے پاک شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

''انسانی اقدار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں جھوٹی انا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔خودداری اور انا میں تمیز کرنا ہر عالم کا وصف ہوتا ہے۔جعفری صاحب نے مسائل کو انا کا مسئلہ کبھی نہیں بنایا۔وہ تو اس کے قائل تھے کہ انا کی کینچلی اتارے بغیر کلی کھل کر پھول نہیں بن پاتی۔'' 111

علمیت جتانے سے کوسوں دور:

سوالات کے جوابات تفصیل سے دینا، دلائل پیش کرنا اور علمیت جتانا دونوں میں فرق ہے۔

علمیت جتانے سے کوسوں دور سردار جعفری کے بارے میں رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں۔

''ہر سوال کا جواب تفصیل سے دیتے اور مدلل۔ مگر علمیت جتانے کا انداز بالکل نہ تھا۔ 112

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے بھی اس بات کی تائید میں لکھا ہے۔

''سردار جعفری عصر حاضر کے عظیم اور ممتاز شاعروں میں تھے لیکن وہ عصر حاضر کے عظیم اور نمائندہ انسان بھی تھے اور اسی میں ان کی بڑائی، بزرگی اور برگزیدگی تھی۔ ان سے ملاقاتیں رہیں، کئی ملاقاتیں لیکن کبھی انہوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کو تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔'' 113

منکسر المزاج، نرم خو، سادہ دل، رکھ رکھاؤ کا حامل:

انکساری، نرم خوئی، سادگی، رکھ رکھاؤ ملنساری سے آدمی کی شخصیت کم نہیں ہوجاتی بلکہ عظیم ہوجاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے ایک واقعہ پیش کر کے سردار جعفری کی ان خوبیوں کو اجاگر کیا۔

وہ رقمطراز ہیں۔

''سردار جعفری سے دوسری ملاقات شکاگو میں ہوئی۔ اکتوبر 1994 میں انہوں نے شکاگو سے فون کیا کہ یوسف ناظم صاحب نے آپ کے لیے کوئی چیز بھیجی ہے میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچی..... سلطانہ جعفری بہت محبت سے ملیں۔ سردار جعفری صاحب بھی بہت اچھی طرح ملے۔ یوسف ناظم کا پیکٹ دیا..... میں نے کہا..... ہمارے گھر چلئے۔ دونوں فوراً راضی ہوگئے۔ ان کی شخصیت کا یہ رخ بھی بہت اچھا لگا۔ یہ پدم شری یافتہ سینکڑوں ایوارڈ لیے، جسٹس آف پیس اور نہ جانے کیا کیا۔ بین الاقوامی شاعر اس قدر منکسر المزاج، نرم خو اور سادہ دل کہ بیان سے باہر۔ ہمارے گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ اپنی کتابیں دیں۔ ایک ٹیپ دیا۔ ''شاعر کا پرچہ یہ کہکر دیا کہ ایڈیٹر نے آپ کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کے ساتھ بھیجا ہے''۔ میں نے دیکھا کہ وہ سردار جعفری نمبر تھا۔ انھیں اپنا نمبر خود دینا اچھا نہیں لگا۔ آج یہ رکھ رکھاؤ کہاں۔'' 114

عام آدمی کی طرح گھل مل کر معمولی کام کرتے:

کوئی کام چھوٹا نہیں۔ کام کام ہوتا ہے۔ پچھلے صفحات میں مشہور کہاوت Work is Worship نقل کی گئی ہے۔ بشیر احمد انصاری نے سردار جعفری کی زندگی کے چند ایک واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ سردار نے اپنے مشن کی خاطر عام شخص کی طرح مختلف قسم کے کام انجام دیے۔

''انسانی قدروں کا اعتراف کرنا اور انھیں اپنی ذات کا وصف بنالینا دو الگ باتیں ہیں۔ جعفری صاحب کو اپنا مشن عزیز تھا۔ وہ عام شخص کی طرح لوگوں میں گھل مل جاتے۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر اخبار فروخت کرنے میں انھیں کوئی عار نہیں تھا کیوں کہ یہ عوامی تحریک کا ایک حصہ ہے۔ مئی 1966 میں رنگ بھون میں انہوں نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا، غالباً آصف

علی ایجوکیشن فنڈ کے لیے ۔مشاعرہ ان کی صدارت میں تھا اور وہ اسٹیج پر گاؤ تکیہ اور چادریں بچھانے میں خود بھی مدد کر رہے تھے۔اس مشاعرے میں فلم اسٹارس بلراج ساہنی، مینا کماری اور چوپڑہ صاحب بھی مہمان کی حیثیت سے شریک تھے۔مینا کماری نے مشاعرے میں جعفری صاحب کی ایک غزل سنائی جو خواجہ احمد عباس کی فلم آسمان محل میں شامل تھی۔آخر میں جعفری صاحب نے اپنا کلام سنانے کے بجائے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور جمع شدہ رقم کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف دو شعر پڑھ کر مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔صدر مشاعرہ خود مہمان کو رخصت کرنے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور اسباب جمع کرنے میں مظفر شاہجہاں پوری کی مدد کر رہے تھے۔ایک بار پونہ میں اردو اکیڈیمی کے ایک سیمنار میں (موضوع: اُردو صحافت) دوپہر کے وقفے میں کھانے میں داچہ کھانے کا انتظام تھا۔جعفری صاحب نے والٹیرس کے ساتھ بڑے شوق سے داچہ کھانا کھایا اور کہا کہ انھیں اپنے وطن کی بگھاری دال یاد آگئی جو انھیں بہت پسند تھی۔'' 115

منتظمین جلسہ کو لانے اور لے جانے کی زحمت نہ دیتے:

عموماً بڑی شخصیتیں جلسوں سمیناروں وغیرہ میں یہ توقع کرتے ہیں کہ منتظمین جلسہ انھیں ان کی رہائش سے جلسہ گاہ لے جائیں اور پھر واپس بھی لائیں سردار جعفری کی شخصیت ایسی نہ تھی۔

پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں۔

''انہوں نے (سردار جعفری) منتظمین جلسہ کو کبھی لانے اور جانے کی زحمت نہیں دی۔'' 116

شوکت کیفی نے سردار جعفری کی سادگی کا ایک واقعہ لکھا ہے:

''سادہ مزاج اس قدر ہیں کہ ایک بار پدم پد سنگھانیا کے ہاں دعوت تھی۔تمام ترقی پسند شاعر اور ادیب مدعو تھے۔سجاد ظہیر ،سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس۔سردار بھائی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔اندر کرتا پرانا تھا عصمت آپا ایک شرارتی، انہوں نے شرارت سے کرتے کی آستین کھینچنی شروع کی۔پوری آستین عصمت آپا کے ہاتھ میں آگئی۔وہ ہنسنے لگیں، لیکن سردار بھائی بالکل نارمل رہے میں نے پوچھا ''اتنی فارمل پارٹی میں آپ پھٹا ہوا کرتا پہن کر کیوں آئے ؟سردار بھائی بغیر شرمندہ ہوئے نہایت اطمینان سے بولے ''ان لوگوں نے مجھے میری شاعری سننے کے لیے بلایا ہے نہ کہ میرے کپڑے دیکھنے کے لیے۔'' 117

کسی کو اپنے سے کم تر نہیں سمجھتے تھے:

سب انسانوں کی قدر کرنا کسی کو اپنے سے کم تر نہ سمجھنا یہ ایک بہت بڑی صفت ہے ایسا سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والا انسان بہت عظیم بھی ہوتا ہے اور دینوی اور اخروی فائدہ میں رہتا ہے اور ایسے لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

رئیس مرزا نے سردار جعفری کی اس صفت کے بارے میں لکھا۔

''انہوں (سردار جعفری) نے کبھی کسی کو اپنے سے کم تر نہیں جانا۔بہت سوں نے بہت کچھ کہا لیکن وہ خاموش رہے''۔

118

ڈاکٹر غ۔ع۔شیخ نے بھی لکھا ہے۔

''جعفری کی فطرت میں یہ بات موجود تھی کہ وہ کسی کو کبھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھے اور نہ کبھی کسی کو اپنے سے چھوٹا سمجھے۔یہ ان کا اپنا اخلاقی ظرف ہے۔کوئی انھیں شاعر ماننے سے انکار بھی کر دیتا تو وہ کبھی اس پر ناراض نہیں ہوتے۔کبھی اپنے ماتھے پر بل تک نہ لاتے۔'' 119

کم مائیگی کا اعتراف:

علم ایک سمندر ہے۔آدمی کتنا بھی علم حاصل کر لے لیکن پھر بھی اس کو اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرنا ہی ہوگا۔علم کا سچا طلب گار ہمیشہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا اور اس کی اپنی کم مائیگی کا اعتراف اسے علم سیکھتے رہنے اور اس میں اضافہ کرنے کا باعث ہوتا رہے گا۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں۔

''تاریخ ان کا (سردار جعفری) پسندیدہ موضوع تھا اور اس کا مطالعہ وہ بے حد ضروری خیال کرتے تھے۔یہاں تک کہ زنداں میں بھی انھیں تاریخ کے مطالعے ہی کا خیال آتا ہے۔تاریخ سے اچھی خاصی آگہی کے باوجود بھی انھیں لگتا تھا کہ انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔اپنے خط میں ناسک سنٹرل جیل سے انہوں نے سلطانہ کو لکھا تھا ''کبھی کبھی یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور علوم کے بارے میں میری معلومات کتنی کم ہے۔'' 120

وقت اور وعدے کے پکے:

سچائی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔سچا آدمی وعدہ کا پکا ہوتا ہے اور جو زندگی کی قدر و قیمت جانتے ہیں وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور اپنے schedule کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔

نگار عظیم نے علی سردار جعفری کے بارے میں بتایا:

''علی سردار جعفری وقت اور وعدے کے بہت پکے تھے۔'' 121

یوسف ناظم نے بھی سردار جعفری کے ان اوصاف کی ستائش کی ہے۔

''وہ (علی سردار جعفری) وعدہ ایفا کرنے میں نپولین بوناپاٹ ہیں۔'' 122

شکر گزاری میں جذبات سے مغلوب:

نرم دل آدمی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے غم تو غم ہے خوشی میں بھی اس کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہو جاتے ہیں۔ سردار جعفری بھی نرم دل انسان تھے۔

ان کی شکر گزاری کی کیفیت پروفیسر ضیاء (علیگ) کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

''کینڈا میں 1984 کا ایورڈ علی سردار جعفری کو جس میں ایک ہزار ڈالر کی رقم ایک cheque اور ایک Souvenir بھی شامل تھا' دیا گیا۔جعفری صاحب وہ ایوارڈ لینے آگے بڑھے تو جذبات سے مغلوب ہو چکے تھے۔انہوں

نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے ساتھیو، میرے comrades، مجھے زندگی میں بہت سے اعزازات، انعامات اور ایوارڈس ملے ہیں، مگر اکیڈمی کی جانب سے اس ایوارڈ کی نوعیت ہی کچھ اور ہے کہ یہ مجھے ایسی سرزمین پر دیا جا رہا ہے جہاں کی زبان نہ اُردو ہے نہ ہندوستانی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی ہے اور جہاں اُردو کی شمع کو جلے ہوئے مشکل سے بیس بائیس سال ہوئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرّا گئی۔ اُن پر رقّت طاری ہوگئی۔ جعفری صاحب تقریر کرتے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو پوچھتے تھے۔''

123

وضعداری:

لوگوں سے محبت کرنے والا ان کی خوشیوں سے خوش ہونے والا تہذیب و شائستگی کا حامل سنجیدہ اور ذمہ دار فرد عموماً وضعدار ہوتا ہے اور اس کی وضعداری میں استواری ہوتی ہے۔

نگار عظیم نے سردار جعفری کی وضعداری کے بارے میں بتایا:

''اس دن (نگار اور ان کے شوہر عظیم سردار جعفری سے پہلی ملاقات) کے بعد سے علی سردار جعفری دہلی میں اپنی آمد کی اطلاع دینا کبھی نہیں بھولے۔ چاہے وہ ملاقات مشاعرہ میں ہو کسی سیمنار یا ورک شاپ یا کسی اور سلسلہ کی۔ نئے سال اور عید پر کارڈ بھیجنا بھی یاد رکھتے خط کا ہمیشہ جواب دیتے۔ عظیم صاحب کو ہمیشہ یاد رکھتے اور یہ سلسلہ آخری وقت تک برقرار رہا۔''124

خط کے جواب میں تاخیر پر معافی چاہنا:

خط لکھنے والا جواب کا منتظر رہتا ہے۔ اس کے کرب کو سمجھنے والے عموماً خط کا جلد جواب دے دیا کرتے ہیں۔ سردار جعفری خطوط کے جوابات جلد ہی دے دیا کرتے تھے۔ چوں کہ وہ بے حد مصروف رہا کرتے اسلئے کبھی کبھار تاخیر ہو ہی جاتی ہے ایسے موقعوں پر وہ مکتوب نگار سے معافی مانگ لیا کرتے۔

سیفی سرونجی نے بتایا:

''دہلی میں اردو اکادمی کے ایک سمینار میں حاجی انیس دہلوی اور زبیر رضوی صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی..... انہوں نے (سردار جعفری) نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ نظر پڑتے ہی میری طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ بھائی سیفی آپ کا خط مجھے مل گیا تھا لیکن جواب میں تاخیر ہوگئی۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''125

منافقت سے دور:

جھوٹ، دھوکا اور منافقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سردار ان سے دور تھے۔

بقول بشیر احمد انصاری:

''ان کا (سردار جعفری) چہرہ ان کا اپنا چہرہ ہے جو کسی نقاب پارسائی کا محتاج نہیں۔ ان کے چہرے کی سرخی ان کے باطنی صفات کا مظہر اور سفیدی ان کی حق پرستی کی علامت ہے۔ یہ ایک انسان کا گل عذار چہرہ ہے جو جنت کے کرایہ دار چہروں سے الگ ہے''۔

126

بے جا تکلفات اور تصنع آمیز اخلاق سے گریز:

آدمی کتنا بھی تصنع، بناوٹ، دکھاوا روا رکھے بہر حال وہ پہچانا جاتا ہے بے جا تکلفات اور تصنع سے انسان کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے سردار جعفری کی ان خوبیوں کے بارے میں بتایا:

"سچ پوچھئے تو جعفری صاحب کے لیے کینڈا کے ہر شہر میں ایک ننھا منا سا لکھنو آباد ہے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تو وہ اپنے طور پر طریقوں، قرینوں، اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے اس کو لکھنو کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں اور میزبان چاہے وہ کہیں کا رہنے والا کیوں نہ ہو اس کو لکھنوی بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ بھی جعفری صاحب کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت ہے اور یہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ کس قدر بے تکلف قسم کے آدمی ہیں اور بے جا تکلفات اور تصنع آمیز اخلاق سے گریز کرتے ہیں۔" 127

حسد سے پاک شخصیت:

حسد کے بے شمار دینوی اُخروی نقصانات ہوتے ہیں۔ حاسد انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اس کی صحت متاثر رہتی ہے۔ حسد ایک آگ ہے اور حاسد اپنی ہی آگ میں جھلستا رہتا ہے۔ حاسد تنگ نظر ہوتا ہے، قناعت پسند نہیں ہوسکتا۔ دوسرے کا مال ومتاع وغیرہ کو دیکھ کر حاسد کا دل کھڑھتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ حسد جیسی بیماری سے پاک ہوتے ہیں وہ دوسروں کی نعمتوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

ایسے ہی خوش ہونے والے سردار جعفری کے متعلق شوکت اعظمی لکھتی ہیں:

"مجھ سے پوچھتے کیفی نے کوئی نئی نظم کہی ہے۔ اگر میرے علم میں نہیں ہوتا تو خود ان کی میز پر کسی کاغذ پر یا سگریٹ کی ڈبیہ پر جو بھی انھیں لکھا ہوا ملتا لے جاتے اور چھپوا دیتے۔ حسد نام کا کوئی جذبہ ان کے دل میں نہیں ہے۔ کیفی کی کسی اچھی نظم پر اسی طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح وہ اپنی نظم پر خوش ہو سکتے ہیں۔ جب کیفی کو لوٹس ایوارڈ Lotus Award ملا تو دلّی کے مشاعرے میں جوٹی وی پر ہو رہا تھا، سب سے پہلے کیفی کے ایوارڈ کو سردار بھائی نے اناونس کیا۔" 128

کدورت سے پاک:

سردار جعفری کی شخصیت کدورت سے پاک تھی۔ سید محمد مہدی نے سردار جعفری کے ایک خط کے اقتباس سے ان کی سیرت کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔

"وہ (سردار جعفری) خود اپنی تنقید کرنے کا بھی جگر رکھتے تھے۔ ایک بار ہم لوگوں کے درمیان کچھ رنجش ہوگئی۔ ان دنوں میں دہلی میں تھا اور سردار جعفری ہمارے مہمان تھے۔ اسی رات وہ ممبئی واپس چلے گئے اور وہاں سے ایک طویل خط لکھا۔ کچھ حصہ آپ بھی سن لیجئے جس سے شاید آپ کو اندازہ ہو کہ ان کا دل کدورت سے کتنا پاک تھا۔ "ہم سب نقابوں میں رہتے ہیں اور یہ نقابیں کبھی کبھی اٹھتی ہیں۔ اس بے پردگی سے تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن حقیقت سامنے آجاتی ہے جس کی قیمت

انتہائی تکلیف کے باوجود ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ میں نے اس جھگڑے میں اپنا ایک نہایت گھنونا پہلو دیکھ لیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اب میں اس خباثت کا گلا گھونٹنے میں شاید کامیاب ہو جاؤں جو دل کے کسی گوشے میں چھپی بیٹھی ہے اور اس رات بے نقاب ہوگئی۔ میں کل سے سوچ رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف پہنچا کر مجھے کیا ملا۔ ندامت تو بعد کی کیفیت ہے۔ اس وقت یقیناً کوئی غیر شعوری تسکین ہوئی ہوگی، کچھ لذت ملی ہوگی۔ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لذت حاصل کرنے سے بڑی خباثت اور کیا ہو سکتی ہے''۔ وہ (سردار جعفری) میرے بزرگ بھی تھے اور میرے دوست بھی اور ایسے بزرگ دوست کا اس قسم کا خط پڑھ کر مجھے خود اپنے سے شرم محسوس ہونے لگی کہ میری وجہ سے انہیں روحانی کرب سے گزرنا پڑا ہے۔ مجھے صرف اس کا احساس ہی نہیں پورا علم تھا کہ دوستوں کی ہر طرح سے مدد کرنا ان کے ضابطۂ اخلاق کا جزو اعظم تھا۔ بیماری، آزاری، مالی پریشانی اور مشکل میں وہ دوستوں کی مدد پر دوڑ پڑتے تھے''۔ 129

شگفتہ مزاج، ہنس مکھ:

شگفتہ مزاجی شخصیت کی ایک اہم خوبی ہے۔ شگفتہ مزاج آدمی لوگوں میں مقبول ہوتا ہے۔ ایسی شخصیت سے ملنے، اس کے پاس بیٹھنے، اُس سے باتیں کرنے سے روحانی خوشی میسر ہوتی ہے۔ شگفتہ مزاج لوگ ہنستے ہنساتے دلچسپ اور پتے کی بات کہہ دیتے ہیں اُن باتوں سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے سردار جعفری کی شگفتہ مزاجی کا یوں ذکر کیا ہے۔

''جعفری صاحب ایک شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، ہنس مکھ قسم کے آدمی ہیں۔ وہ ہنسی ہنسی میں بہت سی دلچسپ باتیں کر جاتے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں بہت سی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کا باتیں کرنے کا انداز خوب ہے۔ باتیں کرتے وقت مسکراتے بھی رہتے ہیں اور ہاتھوں پر ہاتھ بھی پھیرتے جاتے ہیں''

..... جعفری صاحب سے میری ملاقات گذشتہ دنوں لکھنو میں فراق سیمنار کے سلسلہ میں ہوئی جو آخر فروری 1990 کو منعقد ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کی آواز میں وہی کھنک تھی جو 1980 میں تھی جب وہ پہلے پہل کینڈا تشریف لائے تھے۔ ان کے چہرے پر وہی تروتازگی تھی جواب سے دس سال پہلے تھی۔ وہی بالوں پر ہاتھ پھیرنے کا انداز تھا۔ تقریر میں وہ زور بیانی اور لہجہ میں وہی آہنگ تھا جو شائد شروع ہی سے ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ سیمنار کے پانچوں سیشن میں انہوں نے بحیثیت صدر مقرر، مبصر، مفسر اور شارح حصہ لیا..... ایک نجی محفل میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا پھر موقع ملا..... جس میں میرے اور جعفری صاحب کے علاوہ قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، ندا فاضلی، زبیر فاروقی اور دو ایک حضرات شریک تھے۔ جعفری صاحب وہاں ایسی بے تکلفی سے چہک رہے تھے جیسا کہ میں انھیں فیض صاحب کے ساتھ کینڈا میں گرم گفتگو کرتا پایا تھا۔ وہی بے تکلفی وہی سج دھج، وہی ہنستا ہوا چہرہ وہی لمبے لمبے شانوں پر بکھرے بال۔'' 130

مرنجان مرنج، شگفتہ اور سلجھے ہوئے انسان:

محمد حفیظ الکبیر قریشی نے بھی سردار جعفری کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

''سردار جعفری شخصی اعتبار سے نہایت مرنجان مرنج، شگفتہ اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔'' 131

شگفتہ مزاج آدمی چھوٹوں بڑوں سبھی کو خوش کرتا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کے بارے میں بتایا ہے:

''سردار جعفری کی نواسیاں کیک لے آئیں ..... کیک کاٹا گیا اور تالیاں بجیں۔ بجانے والوں میں خود سردار جعفری بھی تھے۔ اسّی برس کے سردار جعفری بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے اپنے خردوں کا دل رکھ رہے تھے''۔ 132

چہرہ شناس:

خدا کی نعمتوں میں بصیرت بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ آدمی آنکھ سے تو دیکھتا ہی ہے، صاحب بصیرت لوگ اپنے دل کی آنکھوں سے بھی بہت کچھ پہچان لیتے ہیں۔

سردار جعفری کو عطا کی گئی اس خداداد نعمت کے بارے میں یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''جعفری صاحب کی بینائی کتنی تیز تھی اور وہ صرف کتابیں ہی نہیں کتابی اور غیر نصابی چہرے بھی پڑھتے تھے۔ یہ ان کا چلتا پھرتا مطالعہ تھا اور یہ ان کی اکتسابی نہیں خداداد صفت تھی۔..... جعفری صاحب ابتدائے عمر ہی سے دھندلکوں اور اندھیروں میں بھی نوشتۂ دیوار پڑھ لینے کی مشق کرتے رہے ہیں اور شاید اسی مشق، شوق اور جنون کے سبب جعفری کی آنکھوں نے پتھر کی دیوار کو بھی چلمن بنا دیا تھا۔'' 133

قوت برداشت:

سردار جعفری کے پاس زبردست قوت برداشت تھی ان کی دونوں بہنوں رباب جعفری اور ستارہ جعفری نے اس کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

''سردار بھائی کے اسسٹنٹ شمیم صاحب ہال میں بیٹھ کر ٹائپ کرتے ہیں جس کی آواز برابر کمرے سے آیا کرتی ہے۔ اس آواز کے شور کے باوجود یہ اپنی میز پر بیٹھے ہوئے کام کرتے رہتے ہیں۔ سردار بھائی کی قوت برداشت اور اعلیٰ دماغی کی داد دینی چاہئے کہ ان حالات میں انہوں نے عظیم ادب تخلیق کیا۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود انہوں نے بڑی تیز اور نڈر طبعیت پائی ہے۔ اگر ان کو کوئی بات ناگوار گزرتی ہے تو فوراً غصہ آجاتا ہے۔ چونکہ خدا نے قوت برداشت حد سے زیادہ عطا کی ہے اس وجہ سے اظہار نہیں کرتے، خاموشی سے ٹال دیتے ہیں''۔ 134

ستارہ جعفری لکھتی ہیں۔

''اب میں نظر ڈالتی ہوں تو یہاں کے سردار بھائی اور بلرام پور کے سردار بھائی میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ وہ جو کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے آج ان کی قوت برداشت ہمالیہ پہاڑ کی طرح پائیدار ہے جو صدیوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ اٹل ہے۔ حالاتِ زمانہ اور وقت انسان کو کتنا تبدیل کر دیتے ہیں''۔ 135

دوسروں کے پہنچائے ہوئے زخموں کو متاع عزیز، ہدیۂ تہنیت اور ارمغان محبت سمجھتے:

''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں'' کے مصداق سردار جعفری دوست دشمن سبھی کے پہنچائے ہوئے دکھ درد اور

نقصانات کو اپنا عزیز سرمایہ سمجھتے اور وہ پوری تندہی سے اپنے مشن کی طرف جٹے رہتے۔

یوسف ناظم رقمطراز ہیں۔

''ان کے (علی سردار جعفری) مزاج میں ایک قسم کی بردباری تھی۔اوران کی یہی بردباری دوسروں کے لیے بار تھی۔وہ حریفوں کے ہی نہیں اپنوں کے بھی پہنچائے ہوئے زخموں کو اپنے لیے متاع عزیز سمجھتے تھے۔ہر گزند کو ہدیۂ تہنیت اور ارمغان محبت سمجھنے کی عادت نہ صرف ان کے لیے تسکین وطمانیت کا باعث تھی بلکہ ان کی سبک روی کے لیے مہمیز بھی''۔136

شوکت کیفی نے بتایا:

بیماری کے بعد ان میں قوت برداشت کی کمی ضرور ہوگئی ہے لیکن پھر بھی کسی کا دل نہیں دکھاتے''۔137

جلد بے تکلف ہوجانے والے:

بقول سبط حسن:

''سردار جعفری جلد بے تکلف ہوجانے والے تھے۔'' 138

مضبوط قوت ارادی:

محمد ایوب واقف نے لکھا ہے۔

''جعفری صاحب کے بارے میں ایک بات یہ بھی بہت وثوق سے کہی جاتی ہے کہ وہ قوت ارادی کے بہت مضبوط انسان تھے۔'' 139

حوادث کا پامردی سے مقابلہ:

بڑی شخصیتیں حوادث کا پامردی سے مقابلہ کرتی ہیں۔سردار جعفری کی بھی ایسی ہی شخصیت تھی۔

وارث علوی نے بتایا ہے۔

''سردار جعفری کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ حوادثِ تاریخ کے سامنے سپر انداز ہوتی''۔140

مستحکم ذہن:

سردار جعفری مستحکم ذہن رکھتے تھے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی کے مطابق:

''وہ (سردار جعفری) غیر معمولی طور پر فلسفیانہ اور توانا و مستحکم ذہن کے حامل ہیں۔دھند، تشکیک، مصلحت نوازی یا غلط اندیشوں کی خوشنودی کے لیے فکری دوراہے پر چلنے کا وطیرہ سردار جعفری نے کبھی سیکھا نہیں''۔141

جیل کی زندگی میں بھی پُرسکون، باہمت:

جو لوگ عظیم مقصد کو لے کر چلتے ہیں انھیں آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور وہ ان آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں۔ابوالکلام آزاد عظیم مجاہد آزادی تھے جنھیں زندگی کے طویل عرصہ جیل میں گزارنا پڑا۔اس دوران انہیں بیوی کی جدائی،

انھیں معاشی مشکلات، ان کی علالت اور پھر وفات کی خبریں ملتی رہیں اور وہ جیل میں بیٹھے سب کچھ برداشت کرتے رہے ان کے پایہ ثبات میں جنبش نہیں آئی تھی۔ سردار جعفری شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد آزادی بھی تھے۔ انھیں بھی جیل جانا پڑا۔ انہوں نے نئی نویلی دلہن کی جدائی برداشت کی۔ ان کے پایۂ ثبات میں بھی کسی قسم کی جنبش نہیں آئی۔ عظیم شخصیتوں کے سامنے عظیم مقاصد ہوتے ہیں کسی قسم کی مصیبت ان کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ محمد ایوب واقف نے سردار جعفری کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی۔

وہ لکھتے ہیں۔

''علی سردار جعفری صحیح معنوں میں بڑے دانشور، بڑے مفکر اور فلسفیانہ بساط اور مقدرت رکھنے والے ادیب و شاعر تھے۔ ان کا ذہن مریضانہ جذباتیت کا شکار کسی بھی حالت میں نہیں ہوا۔ شادی کے چار پانچ سال بعد ہی جب انھیں گرفتار کر کے ناسک جیل بھیج دیا گیا تو جیل کی مضبوط چار دیواری کے اندر بیٹھ کر انہوں نے نئی نویلی بیوی کی جدائی کو اپنے ذہن پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے جدائی کو محسوس تو کیا لیکن جدائی کے بے پناہ غم کے بار کو زندگی کی فلسفیانہ گدگدی Titilation سے کس طرح ہلکا کیا یہ دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے''۔

142

خواتین کا احترام:

سردار جعفری خواتین کی عزت کرتے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کرتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے:

''سردار جعفری خواتین کا بہت احترام کرتے تھے کسی بھی مجلس میں خواہ نجی ہو، دوستوں کی ہو یا ہم خیال رفیقوں کی کبھی خواتین کے بارے میں ریمارک پاس نہیں کرتے تھے۔ کسی کی داستان عشق کو چھیڑا بھی جائے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے تھے کہ اس میں پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں''۔

''کوئی تین سال پہلے پونہ کے فوجی افسروں کے کلب نے جشن غالب منایا تھا۔ پروگرام میں شودنا نارائن کا رقص بیلے کی شکل میں پیش کیا گیا تھا جو مرزا غالب کی نظم چراغ دیر کی ایک ڈرامائی شکل تھی۔ رقص کے ساتھ انگریزی اور اردو میں چراغ دیر کا ترجمہ بھی پڑھا جا رہا تھا۔ اس بے حد کامیاب آئٹم کے آخر میں جعفری صاحب اپنی بیگم سلطانہ کے ساتھ اسٹیج پر آئے شودنا نارائن کو (جو غالباً سرکاری افسر ہیں) مبارکباد دیتے ہوئے سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''یہ میری بہن بھی ہے میری بیٹی بھی ہے.....''

''....وہ خواتین کی ہمت افزائی کرتے تھے اور ان کی کوششوں کو سراہتے تھے۔'' 143

عرفانہ عزیز نے لکھا ہے کہ:

''ٹورنٹو میں قیام کے دوران ایک خاتون سردار بھائی سے گفتگو کرنے لگیں ۔۔۔۔وہ خاتون کہنے لگیں یہ گفتگو بڑی دلچسپ تھی جس کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سردار بھائی عورت کی عزت کرتے، اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے اور نسوانیت کی جانب ان کا رویہ تحفظ آمیز احترام کا سا ہوتا ہے۔۔۔آٹوا کا مشاعرہ سردار جعفری کی

زیرِ صدارت منعقد ہوا۔۔۔جب میری باری آئی تو سردار بھائی اہلِ محفل سے کہنے لگے ''یہ کینڈا کے شمال سے آئی ہیں جہاں برف کے پھول گرتے ہیں۔اپنے ماحول کے منجمد نقوش میں یہ زندگی کی حرارت اپنے نغموں میں پیدا کرتی ہیں۔ان کی نظمیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔اس دوران میں اپنی بیاض ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔انھیں شوخی سوجھی اور سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔''ان کا کلام واقعی بہت عمدہ ہوتا ہے اور اگر وہ فوراً اٹھ کر مائیک تک نہ پہنچیں تو میں ان کی تعریف میں یہ تقریر بند کردوں گا۔محفل پر شگفتگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔سردار بھائی کبھی بور نہیں کرتے۔ 144

نگار عظیم رقمطراز ہیں:

''علی سردار جعفری عورت کی بہت عزت کرتے تھے۔بہت احترام کرتے تھے۔ایک ملاقات پر مجھ سے کہا میں تمہارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔بے ساختہ میرے منہ سے نکلا سچ۔لیکن پھر شرمندہ سی ہو کر بولی اس کی کیا ضرورت تھی کہنے لگے جب کسی بادشاہ سے کسی بچہ سے اور کسی خوبصورت عورت سے ملتے ہیں تو کوئی تحفہ ضرور دیتے ہیں۔۔۔میں حقیقت کہہ رہا ہوں۔نگار تمہارا دل بہت خوبصورت ہے۔علی سردار جعفری کے منہ سے یہ الفاظ سن کر واقعی شرمندہ سی ہوئی لیکن خوشی سے پھول گئی کیوں کہ تحفہ میں ان کی نظموں کا کیسٹ ''سرحد'' تھا جسے کئی ماہ تک میں روزانہ سنتی رہی تھی کہاں پیدا ہوتے ہیں ایسے شخص؟ فوراً جذبات سے میں ان کے کاندھے سے لگ گئی۔انہوں نے میری پیشانی پر ایک بوسہ دیا، پیٹھ تھپتھپایا بوسہ ان کی شاعری میں امن، محبت، عشق، پیغام، دوستی، تحفظ اور تہذیب کی علامت ہے کیا کیا لکھوں؟ کیا کیا یاد کروں؟ یادوں اور باتوں کا ایک سلسلہ ہے جو ختم نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہر سرا ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے۔'' 145

آدرش کی خاطر ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کیا:

سردار جعفری اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے آدرش کی خاطر ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کیا۔

رضیہ فصیح احمد کے مطابق:

''وہ (سردار جعفری) دوبارہ شکاگو آئے۔کئی مشاعرے بھگتا کر لوٹے تھے۔۔۔باوجود تھکے ہونے کے انہوں نے اسی توانائی کا مظاہرہ کیا اور تقریباً ساری رات بیٹھے رہے۔جہاں تک یاد پڑتا ہے کیفی اعظمی بھی اس مشاعرے میں تھے۔۔۔وہ دور جب یہ دونوں اور ان کے بہت سے ساتھی ایک شہر میں یکجا ہوں گے کیا شاندار دور رہوگا ہم اس تصور سے خوش ہوتے رہے لیکن اصل میں یہ سب لوگ کن مالی مشکلات سے گزرے، کن چٹانوں سے ٹکرائے، جیلوں میں رہے۔یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔آدرش کی خاطر جان پر دکھ سہنا بڑی بات ہے۔'' 146

نظریے پر اپنی ذات کو ترجیح دینے سے گریز:

سردار جعفری ''نظریے'' کی اہمیت کے قائل تھے۔

بتول بشیر احمد انصاری:

''انہوں نے (سردار جعفری) کبھی نظریے پر اپنی ذات کو ترجیح دینے یا اُجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔جہاں کہیں لائحہ عمل میں غلطی ہوئی اور عمر کے کسی حصے میں اس کا احساس ہوا اس کا انہوں نے اعتراف کیا۔کبھی اپنے نام کا ڈنکا بجوانے کے عمل

میں ملوث نہیں ہوئے۔"147

اپنے خیالات دوسروں پر مسلط نہیں کرتے:

سردار جعفری، نئی نسل کو حسین خواب دیکھنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی ترغیب دیا کرتے۔

راشد آذر نے بتایا:

"سردار جعفری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود اپنے خیالات، اپنے خواب، اپنے بعد کی نسلوں پر مسلط نہیں کرتے آنے والی نسلوں کو حسین خواب دیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اُن سے اُن خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی اُمید رکھتے ہیں۔" 148

درویشانہ، طالب علمانہ زندگی گزاری۔ بڑے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرتے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے کہ:

"اپنی ادبی شخصیت اور بے پناہ عظمت اور مقبولیت کے باوجود مزاجاً درویشانہ اور طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے چھوٹوں سے بھی جہاں کہیں علمی مشورے کی ضرورت ہو، مشورہ کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔"149

محمد ایوب واقف کے مطابق

"وہ (سردار جعفری) علمی و ادبی امور میں کوپی چندنارنگ کی آرا کو کتنی اہمیت دیتے تھے چاہے وہ "جشن اقبال" کی تیاری کا معاملہ ہو یا انیس پر سمینار کی بات۔ ان کی کسی نظم کے ترجمہ کا مسئلہ ہو یا کسی مجموعہ کلام کی اشاعت کا سوال ان تمام اُمور پر سردار جعفری صاحب کوپی چندنارنگ سے مشورہ ضرور کرتے تھے"۔

"وہ (سردار جعفری) اپنے اکثر معاملات میں اپنے احباب کی آرا اور مشوروں پر دھیان بھی دیتے۔" 150

فطرتاً یاس پسند اور قنوطی نہیں:

انسان کو نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ ظلم کی بیا دیر تک نہیں چلتی سردار جعفری تابناک مستقبل پر ایقان رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

"سردار جعفری فطرتاً یاس پسند اور قنوطی نہیں ہیں ۔۔۔۔ وہ ہمیشہ اُمید و یقین کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ اُنھیں یقین ہے کہ ظالموں کا بیڑا ضرور غرق ہو کر رہے گا اور مظلوموں، محکوموں اور ستم رسیدوں کو ایک نہ ایک دن آزادی، خوشحالی اور عزت و عافیت کے دن دیکھنا نصیب ہوں گے۔" 151

ڈاکٹر افغان اللہ خاں کے مطابق:

"سردار جعفری کا مستقبل میں کامل یقین ہے۔" 152

سمرتھ جالی رقمطراز ہیں:

"انھیں (سردار جعفری) انسان کی ذہانت اور عظمت پر پورا یقین ہے اور اسی یقین کے سہارے وہ ہمیشہ ایک خوش آئند کل کا انتظار کرتے رہے ہیں۔" 153

قنوطیت کے تاریک ایوانوں میں رجائی فکر کے دیئے جلانے والی شخصیت:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا، جعفری صاحب کو اپنے ایک بزرگ کی حیثیت سے دیکھا۔ایک سینئر ادیب، ایک کہنہ مشق صاحب قلم جس کا حرف حرف پھولوں کی طرح شگفتہ، لفظ لفظ نپا تلا۔جس کا دل باغی، تیور انقلابی، لہجہ خطیبانہ، ذہن فلسفیانہ اور دل صوفیانہ تھا۔حرفِ محبت کا مارا وہ شاعر جس نے نئی دنیا کو سلام کیا اور ایشیا کی بیداری کو اپنے جاگتے ہوئے قلم میں سمو کر خواب پر خواب دیکھتا رہا۔جس نے پتھر کی دیوار میں خیالوں کے پھول کھلائے، جس نے پیراہن شرر زیب تن کر کے انسانی لہو کی پکار پر لبیک کہہ کے انسانیت کی محافظت کا فریضہ انجام دیا کہ وہ انسان دوستی اور امن عالم کا تمنائی اور شیدائی تھا۔قنوطیت کے تاریک ایوانوں میں رجائی فکر کے دیئے جلانے والی وہ ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک!!'' 154

بشیر احمد انصاری نے بتایا:

''انسانی اقدار کی ایک خوبی یہ ہے کہ دانشور اپنے ماحول کی پراگندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔وہ کمزور ہوتے ہیں جو صرف چیختے ہیں اور اپنی تگ و دو کو نعروں میں گم کر دیتے ہیں۔جعفری صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ سقراط آج بھی زہر کا پیالہ پی رہا ہے اور حق کو کو آج بھی دار پر آویزاں ہے۔یہ کبھی مایوس نہ ہونے والا، شام اودھ اور صبح بنارس چھوڑ کر بمبئی کے شبستانوں میں بس جانے والا دانشور کہتا ہے''۔

طلوع آدمیت ہے بہت آہستہ آہستہ
ابھی انسان کو کرنا ہے صدیوں انتظار اپنا

یہ آہ نہیں، اظہار حقیقت اور ایک طویل مدتی انقلاب کی طرف اشارہ ہے۔'' 155

باہمت:

سردار جعفری ہمت کے پہاڑ تھے اور ہر حال میں دوسروں کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی کی بلند اخلاقی، کسی بھی مصیبت کے وقت میں ہمت نہ ہارنا، سب کے بُرے وقت میں کام آنا، چاہے اپنے پاس پیسہ نہ ہو لیکن ضرورت مندوں کی مدد کرنا خاص صفات ہیں۔'' 156

قومی و بین الاقوامی مقبول شخصیت:

سردار جعفری کی قومی و بین الاقوامی مقبولیت کے سب ہی خواہاں ہیں۔لوگ انھیں پسند کرتے ہیں۔

انیس چشتی نے کہا ہے کہ:

''سردار جعفری کی منارہ قد شخصیت کا لوہا سب نے تسلیم کر لیا تھا۔اُردو والوں کے لیے کیا یہ اعزاز کم تھا کہ انھیں متعدد ملکوں کے سربرآوردہ افراد بہ نفس نفیس جانتے تھے۔''

بشیر احمد انصاری نے سردار جعفری کی مقبولیت کا سبب یہ بتایا کہ:

''سردار جعفری کو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا پاس ولحاظ تھا یہ دیکھا گیا ہے کہ ریستوراں میں یا ہوٹل میں جہاں اُن کے (سردار جعفری) قیام وطعام کا انتظام کیا جاتا اکثر منیجر بنفس نفیس خود انتظام دیکھنے آتے۔ ہوٹل میں آنے والے پڑھے لکھے گاہک انھیں ادب سے سلام کرتے۔ ان میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ یہ وقار انھیں یونہی نہیں ملا۔ پوری زندگی انسانی قدروں کے پاس کا ثبوت رہی ہے۔'' 158

پروفیسر زاہدہ زیدی نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری اپنے دور کے بہت اہم اور مقبول شاعر تھے اور ان کی شہرت عالمگیر تھی۔'' 159

لوگوں کا والہانہ لگاؤ:

عرفانہ عزیز اور رباب جعفری نے سردار جعفری کی شخصیت اور شاعر کی مختلف خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے لوگ سردار جعفری سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔

عرفانہ عزیز لکھتی ہیں:

''وہ (سردار جعفری) جب شمالی امریکہ آتے ہیں تو کیا طوفان برپا نہیں ہوتا۔ لوگ ان کی جانب کویا ریشم کی ڈوری سے بندھے چلے آتے ہیں۔ صف بہ صف کینڈا کے مختلف صوبوں سے، دور دراز بستیوں اور آبادیوں سے جن میں ٹرانٹو، نیاگرا سٹی اور ہملٹن قابل ذکر ہیں۔ وہ اونٹاریو کے محنت کاروں میں بہت مقبول ہیں اور ان کے درمیان وہ علی سردار جعفری نہیں سردار بھائی ہوتے ہیں۔ طبیعت کی ہمواری، ذہنی بلوغت، جذباتی شائستگی مزاج کا تحمل اور میانہ روی ان کی شخصیت کو وہ دلاویزی عطا کرتے ہیں جو ایک عام سادہ لوح انسان کے لئے بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ وہ عوام کی رسائی میں رہتے ہیں۔ عوام جس ملک کے بھی ہوں انہیں چاہتے ہیں۔ ان کے دوست ہر سرزمین پر ہیں اور دوستوں کے لیے ان کی زندگی شعاع نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کی تاریکیوں میں ان کے دوستوں نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ ایک سایا سا دریچے سے جھانکتا ہے۔ دروازے پر دستک دیتا ہے اور دبے پاؤں روح میں یوں در آتا ہے کہ ہر سو روشنی سی بکھر جاتی ہے ان کی زندگی کے ہر گوشے میں، ہر طاقچے میں ایک کسوٹی تلے شمع جلتی ہے۔ یہ شمع آدمیت کا جوہر ہے جو انسان کو انسان اور دوست کو دوست بناتا ہے۔'' 160

رباب جعفری رقمطراز ہیں:

''سردار بھائی کی شاعری میں اپنے وطن کی عظمت، محبت، اس کا وقار، انسان کا احترام، عوام کا درد، ظلم واستبداد سے نفرت، تابناک مستقبل کی بشارت ہے۔ عام عالم انسانیت کے لئے بلاتفریق مذہب وملت عزت نفس کا پیغام ہے۔ شاعری کے اس حسن کی وجہ سے ان کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ ہندوستانی عوام دل وجان سے چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں اپنے مایہ ناز شاعر کے لیے بڑی عقیدت ہے۔ بمبئی کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مقامات میں بھی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ اُردو کانفرنس وغیرہ ہوتی ہے جہاں ان کو بڑے اصرار کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اُن کے پرستار موجود ہیں۔ وہاں کے لوگ مشاعروں کے ذریعے اپنے پسندیدہ شاعر کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ کینڈا، جرمنی،

نیویارک، پاکستان اور عراق وغیرہ میں ان کو مشاعرے اور امن کانفرنس کی نمائندگی کے لیے بلایا گیا ہے۔'' 161

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے کینڈا میں لوگوں کا سردار جعفری کے ساتھ والہانہ لگاؤ کا واقعہ بیان کیا ہے۔

''پھر یہ کارواں اوٹاوا پہنچا جہاں جعفری اور احمد فراز صاحبان کو ایک موٹیل میں ٹھہرایا گیا..... یہاں ہر شخص ان سے بلاتکلف ملنے آجا سکتا تھا۔ دن بھر شیدائیان جعفری کا تانتا بندھا رہا۔ شام کو اوٹاوا یونیورسٹی کے ایک ہال میں محفل شعر وسخن کا انعقاد ہوا..... مہمان شعرا کا کلام سننے کے لیے لوگوں کی بے چینی اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر مشاعرہ دوسرے دن تک جاری رہتا تو وہ لوگ اپنی جگہوں سے اٹھ کر نہ جاتے..... 20 نومبر 1984 کی شام کو..... شام جعفری کے عنوان سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ شرکاء کی تعداد ہال کی مناسبت سے سو رکھی گئی مگر جیسے جیسے یہ خبر عام ہوئی لوگوں کا اشتیاق جعفری صاحب کے جشن سالگرہ میں شرکت کرنے کا بڑھتا گیا۔ پھر بھی ایک مخصوص تعداد کے بعد لوگوں سے معذرت کرلی گئی۔'' 162

انیس چشتی رقمطراز ہیں:

''ان (سردار جعفری) کے پاس بیٹھ کر طبیعت اوبتی نہیں تھی بلکہ جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور کوئی نہیں چھیڑتا رہے۔ ہمارے بزرگوں نے طبیعت کی اس روانی کو ''سبک روی'' کہا ہے''۔ 163

بیرون ملک پسندیدہ میزبان کے گھر اپنائیت خلوص:

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے سردار جعفری بحیثیت میزبان ذکر کیا ہے جن سے سردار جعفری کی اپنائیت کا پتہ چلتا ہے۔

''جعفری صاحب کو ان حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں پیر کی صبح کو دونوں میاں بیوی کام پر چلے گئے اور خانہ خالی کو جعفری صاحب پر چھوڑ گئے۔ اب وہ مہمان بھی ہیں اور میزبان بھی۔ خود ہی چائے بنا رہے ہیں، خود ہی ناشتہ تیار کر رہے ہیں، آنے جانے والوں کی خاطر داری بھی کر رہے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر میزبان کے بچے اسکول نہیں گئے تو ان کی ''بے بی سٹنگ'' بھی کر رہے ہیں مگر وہ یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ ماتھے پر بل نہیں ڈالتے کسی سے کسی بات کی شکایت نہیں کرتے۔ ان کی یہی محبوب ادا ہے کہ ہر کوئی ان کو اپنے یہاں ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے وہ ٹھہریں کہیں بھی مگر ملتے سب سے یکساں طور پر ہیں اور کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کس کے دوست زیادہ ہیں اور کس کے کم۔'' 164

سردار کو وفات کے بعد ان کے احباب کا انھیں یاد کرنا:

جو شخص اپنی زندگی میں لوگوں کو چاہا، ان کے کام آیا، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی شمع روشن کرنے میں اپنی زندگی گزار دی ایسا دردمند دل رکھنے والا پر خلوص انسان مر کر بھی امر ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے یاد کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت علی سردار جعفری کی بھی تھی۔

محمد اسد اللہ لکھتے ہیں:

''ان کا (سردار جعفری) خیال آتا ہے (اور بار بار آتا ہے) تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان کا وہ دردمند دل، ان کی وہ شیرینی گفتار، ان کا وہ ذہن رسا، ان کی نثر، انکے شعر، ہر چیز ہر بات کی یاد آتی ہے۔ آنے والے دور میں بھی ہر دور کی طرح اہل

دانش پیدا ہوتے ہی رہیں گے لیکن کوئی بھی ان کا سا نہ ہوگا"۔ 165

سردار جعفری سے معترضین کے لیے وجہ شکایت:

سردا جعفری کے معترضین کو سردار جعفری سے شکایت کی کیا وجہ تھی اس پر سردار جعفری نے بھی روشنی ڈالی ہے جسے رضیہ فصیح احمد نے پیش کیا ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

''خود سردار جعفری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ''ہمارے معترضین کے لیے وجہ شکایت ہماری شاعری نہیں، بلکہ ہمارا فلسفہ زیست رہا ہے۔ یاروں نے اس فکر کو مطعون کرنے کے لیے ایسے بہتان تراشے ہیں جن کی نہ کوئی علمی بنیاد تھی اور نہ ادبی دیانت۔" 166

بدخواہوں کی نظر میں سردار جعفری گھمنڈی:

سردار جعفری کے بدخواہوں کی سردار جعفری سے شکایات کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے سبط حسن نے لکھا ہے۔

''مولوی عبدالحق صاحب کہا کرتے تھے کہ اس شخص سے بچو جس کی سب تعریف کرتے ہوں یا جو شخص سب کی ہاں میں ہاں ملاتا ہو۔ جب میں سردار جعفری کے بدخواہوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ سردار بڑے گھمنڈی ہیں یا اُن میں لچک بالکل نہیں تو مجھے مولوی عبدالحق صاحب کی باتیں یاد آتی ہیں۔ سردار جعفری کی شخصیت بڑی نزاعی ہے اور ہونی بھی چاہئے کیوں کہ انقلاب کے نغمہ خواں کا شیوہ ہر کس و ناکس کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں بلکہ سچ بولنا ہے۔ سردار کی وفاداریاں وابستگیاں جن انسانی قدروں اور حیات بخش قوتوں سے ہیں وہ بعض حلقوں کو سخت ناپسند ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر کا نہ تو کوئی جیون آدرش ہونا چاہئے نہ اُس کے جذبات اور احساسات کو افتادگان خاک کے غموں، خوشیوں، آرزوؤں اور امنگوں سے کوئی سروکار رکھنا چاہئے مگر صدق وصفا کی یہی ریاضت وجدان کا یہی خلوص اور ادراک و آگہی کی یہی بصیرت تو ان کے فن کی جانچ ہے۔ وہ ظلمت پرستوں کی تسکین قلب کے لیے خودکشی کرنے سے رہے۔ اُن کا فن ان کے مجاورانہ فلسفہ زیست کا پرتو اور ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ انہوں نے رضا جوئی کے بجائے سدا نبرد آزمائی کی ہے۔ البتہ جو لوگ سردار جعفری سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ گواہی دیں گے کہ سردار اگر رزم گاہ ہستی میں فولاد کی مانند سخت ہیں تو بزم گاہ حسن و محبت میں ریشم سے بھی زیادہ نرم ہیں۔'' 167

اس سلسلہ میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

''جب انھیں (سردار جعفری) 1996 میں مہاراشٹرا اردو اکیڈمی نے اپنے سب سے بڑے انعام ''سنت گیانیشور ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا تو جنسر پسندوں نے واویلا مچایا اور اس انعام کے خلاف تحریک شروع کی، اس مخالفت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ سردار جعفری فرقہ پرست شاعر ہیں اور ان کی نظم ''اجودھیا'' اس کی مثال ہے۔ میں نے (پرفیسر عبدالستار دلوی) بحیثیت ایگزیکٹیو چیرمین، اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس مخالفت کا بھرپور مقابلہ کیا، مگر جب ایوان حکومت سے اس انعام کو منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی تو میں نے اس غلط فیصلے کے خلاف حکومت وقت سے احتجاج کرتے ہوئے اکیڈمی کی چیرمین شپ سے استعفیٰ دیا۔ جب میرے استعفے کی خبر انگریزی، مراٹھی اور ہندی کے اخبارات میں شاہ سرخیوں میں شائع ہوئی اور

جب قومی اخبارات نے میرا ساتھ دیا تو حکومت نے ناگپور اسمبلی سے یہ اعلان کیا کہ میرا استعفیٰ قبول نہیں کیا جارہا ہے اور نہ ہی میں استعفیٰ پر اصرار کروں اور سنت گیانیشور ایوارڈ سردار جعفری کو دیا جائے گا، میں نے اگر چہ اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیا مگر بعد میں یہ ادبی انعام سردار جعفری صاحب کو پیش کیا گیا۔ اپنی نظم ''اجودھیا'' کے پس منظر میں جعفری صاحب نے ایک مختصر تحریر کر کے مجھے عنایت فرمائی جو معترضین کا جواب ہے''۔ 168

پروفیسر عبدالستار دلوی نے اس تحریر کو اپنی کتاب ''علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) کے صفحہ 493-490 پر شائع کر دیا ہے۔

مخالفین، معترضین اور دشمنوں کے الزامات اور زہر افشانی پر سردار جعفری کا ردّ عمل:

مخالفین، معترضین اور دشمنوں کے الزامات اور زہر افشانی پر سردار جعفری مختلف طرح سے ردّ عمل (React) ظاہر کرتے ہیں جیسے:

(1) جواب نہ دیتے یا ہنس کر ٹال دیتے۔

(2) جھلاہٹ کے بجائے پرسکون انداز میں اپنے دلائل پیش کرتے۔

(3) مخالفین، معترضین کے خیالات کو سنتے اور ان پر بحث کرنے سے پہلو تہی بھی نہیں کرتے۔

(4) اختلاف بھی کرتے تو دل شکنی، طنز، نیچا دکھانے کی کوشش نہ کرتے۔

(5) حرف شکایت زبان پر نہ لاتے

(6) دوست دوشمن سب کے ساتھ محبت، شفقت سے ملتے اور حتی المقدور ان کی مدد بھی کرتے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا ہے۔

''وہ (سردار جعفری) معترضین کا کبھی جواب نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے متعدد بار مجھے (عبدالستار دلوی) بھی مشورہ دیا کہ میں معترضین کو جواب نہ دوں اور انھیں ہنس کر ٹال دیا کروں۔'' 169

بشیر احمد انصاری کے مطابق سردار جعفری الزام تراشی پر جھلاہٹ کے بجائے اور پرسکون انداز میں دلائل پیش کرتے۔

''پونہ میں وہ آخری بار فروری 1998 میں آئے تھے۔ لالہ طور کے منظوم ترجمہ کی رونمائی کے لیے۔ اسی مہینہ ان کے نام گیان پیٹھ ایوارڈ کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ تاریخی تقریب اعلان کے بعد کی پہلی تہنیتی تقریب بھی تھی۔ ان دنوں بعض کم دماغ نیتاؤں نے اقبال کو پاکستان کا بانی کہتے ہوئے اپنی تقریروں میں سارے جہاں سے اچھا، کو رد کرنے اور نہ گانے کی تحریک چلانے پر زور دیا۔ جعفری صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی۔ انہوں نے اس یادگار جلسے میں جس میں غیر اُردو داں طبقہ بھی شریک تھا، اقبال کے بارے میں ایک معرکت الآرا تقریر کی۔ چالیس منٹ کی اس مدلل گفتگو میں جو محفوظ کر لی گئی ہے، جعفری صاحب نے اقبال کو عالمی انسانیت کا شاعر ثابت کیا اور اس خیال کو غلط قرار دیا کہ اقبال پاکستان کے بانی تھے یا محرک تھے۔ دوسرے دن انگریزی اخبار میں اس کی تفصیل شائع ہوئی۔ خاص بات کہنے کی یہ ہے کہ انہوں نے اقبال پر الزام تراشی پر ذرا بھی جھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہایت اطمینان سے اپنے دلائل پیش کئے۔'' 170 141

سید محمد مہدی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری شاعر تھے۔نقاد تھے،مصنف تھے،مولف تھے،صحافی تھے،فلم ساز تھے عالم باعمل تھے،اپنے عقیدے پر اٹل انسان تھے لیکن مخالف نظریوں اور خیالوں کو سننے اور ان پر بحث کرنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کرتے تھے۔''171

رضیہ فصیح احمد نے بتایا:

''اگر اختلاف بھی کرتے تو اس خوبی سے کہ دل شکنی نہ ہو ..... بین السطور کسی پر طنز یا کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش ان کے ہاں سرے سے نہیں''۔ 172

پروفیسر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں:

''وہ (سردار جعفری) اپنے دوست اور دشمن دونوں سے خندہ پیشانی اور محبت وشفقت کے ساتھ ملتے تھے اور حسب موقع مقدور بھر ہر طرح سے مدد بھی کرتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ یہ شخص ان کا مخالف یا دشمن ہے۔انسان اور انسانی قدروں کا احترام ان کے مزاج کا حصہ تھا۔وہ اپنے دشمنوں کے لیے کبھی حرف شکایت ہونٹوں پر نہیں لاتے تھے۔انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر ان کے دشمن اور معترضین ان کے سامنے جھک جاتے''۔ 173

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ سردار جعفری اپنے سخت ترین مخالف بھی مدد کرتے۔

''جعفری صاحب بہت بڑے دل کے آدمی تھے۔محبتوں سے بھرا ایک دل جس میں حکایتیں بھی محفوظ تھیں اور شکایتیں بھی۔مگر باوجود کوشش کے وہ ''یاروں کے روبرو'' کچھ بھی نہ کہہ سکے کہ وہ ''دشنام طرازی'' کے قائل نہ تھے ''دیدہ تر'' کی شائستگی کو جزو تہذیب خیال کرتے تھے۔اسی لیے دوست دشمن سب کے مددگار تھے۔ان کے اکثر مخالفین ضرورت پڑنے پر انھیں کے پاس آتے تھے۔ ایسے ہی، بمبئی کے ایک صاحب جو آئے دن جعفری صاحب کے خلاف محفلوں میں زہر افشانی کیا کرتے تھے ،ایک مرتبہ کسی ذاتی غرض سے ان کے پاس گئے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ سوائے جعفری صاحب کے ان کا یہ کام کوئی نہیں کرسکتا۔مجھے اس کی اطلاع ملی تو بڑا غصہ آیا۔میں نے جعفری صاحب کو فون لگایا۔اتفاق سے جعفری صاحب نے ہی ریسیور اٹھایا۔میں نے کہا ''فلاں فلاں صاحب آپ کے پاس کسی ذاتی غرض سے آنے والے ہیں اور میں جانتی ہوں کہ یہ بات غلط ہے۔لیکن پھر بھی مجھے کہنے دیجئے کہ آپ ان کا کام نہیں کریں گے۔تجاہل عارفانہ سے بولے ''کیوں؟''میں نے کہا ''وہ آپ کے سخت ترین مخالف ہیں اور آپ کے بارے میں اکثر محفلوں میں اناپ شناپ بکتے رہتے ہیں''ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''ہاں میں جانتا ہوں اور تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ وہ اس وقت یہاں تشریف فرما ہیں۔میں نے پھر دہرایا۔ ٹھیک ہے لیکن آپ ان کا کام ہرگز نہیں کریں گے۔کھنکتی ہوئی آواز میں بولے ''وہ تو میں کرچکا'' مجھے مزید غصہ آیا ان کی اس دریا دلی پر۔میں نے جھنجھلا کر کہا ''آپ نے ایسا کیوں کیا جب کہ آپ کو ان کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔مجھے دکھ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنے کمینہ فطرت ہیں پیٹھ پیچھے آپ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔آپ کے دشمن ہیں۔خون کے پیاسے ہیں لیکن جب وقت پڑتا ہے تو پھر آپ ہی کے در پر پہنچتے ہیں سوالی بن کر۔ہنس کر فرمایا ''حضرت علیؓ کے ساتھ بھی تو یہی ہوتا تھا نا؟ میں تو کچھ

بھی نہیں پھر تم میرے لیے کیوں دکھی ہوتی ہو؟ اور اس جواب کے ساتھ ہی میں لاجواب ہو چکی تھی۔''174

لیڈر شپ کی صلاحیتوں کے حامل:

سردار جعفری لیڈر شپ کی صلاحیتیں رکھتے تھے جن میں حالات سے باخبری، فرنگی سامراجیوں کا آلہ کار بنے سے گریز، مسائل کو حل کرنا، راستے کا انتخاب کرنا، سرفروشی، وقتی مفاد کی خاطر بے جا مصالحت سے بچنا، بے جان مسائل میں نہ الجھنا وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر زاہدہ زیدی کے مطابق:

''سردار جعفری شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈر شپ کی صلاحیتوں بھی ان میں خداداد تھیں۔ ساتھ ہی وہ ایک فعال اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔'' 175

سردار کا حالات سے باخبر رہنے کے تعلق سے سبط حسن نے بتایا:

1938 میں سبط حسن نے سردار جعفری سے الہ آباد میں پہلی بار ملاقات کی لکھنؤ سے متعلق تفصیلات سردار جعفری نے انہیں بتائیں۔

سبط حسن کے الفاظ میں اس طرح ہیں:

''سردار جعفری نے مجھ کو دو ہی دن میں لکھنؤ کی سیاسی اور ادبی زندگی کے تمام خشک و رنگین پہلوؤں سے آگاہ کر دیا۔ کون وزیر کتنا با اثر ہے کس لیڈر کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں۔ کون جماعت کتنی سرگرم عمل ہے۔ ادبی ماحول کیا ہے۔ ادیبوں کا کیا حال ہے۔ دانشور کیا سوچ رہے ہیں۔ طلبہ کی تحریک کس سمت جا رہی ہے۔ لالہ رُخان لکھنؤ کی بزم جمال کہاں کہاں آراستہ ہوتی ہے اور ان میں کن کن احباب کو باریابی کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ ساری داستان سنانے کے بعد سردار نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ لکھنو کیوں نہیں آجاتے بلکہ کہا تو یہ کہ تم لکھنؤ کب منتقل ہو رہے ہو گویا انہوں نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ مجھ کو لکھنؤ بہر صورت آنا ہی ہے۔'' 176

قیصر تمکین کے مطابق:

''سردار جعفری انتہائی ذہین، قابل، ہونہار اور مختلف الصفات شخصیت رکھنے کے باوجود فرنگی سامراجیوں کی مشین کا پرزہ نہ بنے اور راستہ انہوں نے وہ چنا کہ جہاں افق سلاسل، تازیانوں، بیڑیوں اور پھانسی کے پھندوں کی گرم بازاری تھی۔ ادیب وفن کے لیے پوری زندگی کو شامی و کوفی طریقہ ہائے فکر سے مبارزت کے لیے وقف کر دینا۔ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہاں معجزہ فن کے لیے خون جگر کے علاوہ سرفروشی بھی درکار ہوتی ہے اور یہ تو حقیقت ابدی ہے ہی کہ سرفروشی کے بغیر سرداری کا تصور ہی بے معنی ہے..... انہوں نے وقتی مفاد کی خاطر بے جا مصالحت کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ رشتہ ہمیشہ ان غلط یا صحیح آدرشوں سے برقرار رکھا جنھوں نے برصغیر کے عہد نو کی تعمیر کے سلسلہ میں سنگ بنیاد کا کام دیا تھا۔''177

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے بتایا کہ

جلال، اشتعال سے پاک سردار جعفری کی شخصیت کس طرح معاملات کو سلجھایا کرتی تھی:

''میں نے جعفری صاحب کو قریب سے دیکھا تھا۔اُن کے ساتھ نجی اور ادبی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے بولنے اور سننے کے پیش تر مواقع مجھے نصیب ہوئے تھے ..... میں نے جعفری صاحب کے مزاج کی مختلف کیفیتیں دیکھی ہیں لیکن انھیں کبھی جلال یا اشتعال کی حالت میں نہیں دیکھا۔ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہی ہر معاملے کو سلجھایا۔یہ ظرف کسی اور کے حصے میں نہیں آتا۔''178

بے جان مسئلوں میں الجھنے سے گریز:

بشیر احمد انصاری اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فراخ دلی بھی انسانیت کا ایک وصف ہے۔تین سال پہلے ایک مختصری کتاب شائع ہوئی تھی جس میں جعفری صاحب پر زبردست تنقید کی گئی تھی۔پونہ میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کتاب پڑھی۔انہوں نے کتاب تو کجا اس کے مصنف کی پہچان سے بھی انکار کیا۔یقیناً ان کے علم میں یہ بات آئی ہوگی لیکن ان کی قد آور شخصیت بے جان مسئلوں میں الجھنے سے گریز کرتی تھی خصوصاً جب وہ ان کی ذات کے بارے میں ہو۔'' 179

سردار جعفری بحیثیت مقرر:

علی سردار جعفری بہترین مقرر اور بلند پایہ خطیب تھے۔ادب،تاریخ تہذیب،سیاست جیسے موضوعات و مسائل پر گھنٹوں تقریر کرتے۔

پروفیسر نظیر صدیقی کے مطابق:

''سردار جعفری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مایۂ ناز فرزندوں میں سے تھے۔وہ ایک غیر معمولی مقرر بھی تھے۔ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی بیان میں ان کے زبردست مقرر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔''180

اس ضمن میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی رقمطراز ہیں:

''وہ (سردار جعفری) خوش تقریر ہیں اور بقول خود انہوں نے یہ فن مجتہدوں سے سیکھا ہے۔'' 181

پروفیسر صدیق الرحمٰن وائی نے بتایا:

''ہمیں یاد ہے کہ ہزاروں کے مجمع میں سردار جعفری کی آواز ایک ولولہ پیدا کر دیتی تھی''۔ 182

رفعت سروش کے مطابق سردار جعفری کی تقریر علم و معانی،حقائق و دلائل سے بھرپور ہوتی۔

(1) ''وہ (سردار جعفری) محض بے باک صحافی ہی نہیں بلند پایہ خطیب بھی تھے اور بڑی پُراثر اور ولولہ انگیز تقریر کرتے تھے''۔

(2) وہ (سردار جعفری) اس وقت زیادہ فعال ہوتے ہیں جب کوئی انھیں چیلنج کر دے عثمانیہ یونیورسٹی کے کچھ طلبا نے کہہ دیا کہ ایک معمولی گریجویٹ ہمیں کیا خطاب کرے گا۔مگر سردار نے یونیورسٹی ہال میں اقبال پر ایسا سیر حاصل لیکچر دیا کہ اساتذہ اور طلبا عش عش کر اُٹھے۔سردار دھواں دھار تقریر نہیں کرتے جوش خطابت میں ان کے منہ سے کف نہیں نکلتا۔ان کی تقریر علم و معانی کا تیز دھارا ہوتی ہے۔حقائق اور دلائل سے بھرپور۔ایک رفتار اور ایک انداز سے بولتے ہیں اور بولتے چلے جاتے ہیں''۔ 183

بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

''وہ (سردار جعفری) اول درجے کے خطیب اور مقرر بھی ہیں۔ان کی آواز بلند اور چھا جانے والی ہے۔وہ بڑے اعتماد ووقار سے ادب، تاریخ، تہذیب اور سیاست کے موضوعات ومسائل پر گھنٹوں تقریر کرتے تھے۔اب تو وہ تقریباً 85 سال کے ہو گئے ہیں اور کمزور بھی ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس عمر میں بھی ان کے اندر جو دم خم، ہمت، حوصلہ اور کام کرنے کی امنگ ہے، وہ قابل رشک ہے۔وہ اب بھی لکھتے پڑھتے اور تقریر کرتے رہتے ہیں۔'' 184

خواجہ تصور علی حیدر نے لکھا ہے:

''مجھے علی سردار جعفری کی جس صفت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی بحیثیت مقرر اعلیٰ صلاحیت ہے .....وہ مجھ سے بدرجہا بہتر مقرر تھے۔'' 185

علی سردار جعفری کا معاصرین پر اثر:

سردار جعفری نے معاصرین پر کیا اثر ڈالا اور معاصرین کی سردار جعفری سے والہانہ محبت کا ذکر مختلف ادیبوں نے کیا ہے۔

بقول نگار عظیم:

''علی سردار جعفری کی شخصیت نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔انہوں نے زندگی کے اتار چڑھاؤ سے جوجھنا سکھایا۔ وہ کہتے تھے کھل کر نڈر ہو کر اپنے فن کا استعمال کرو۔تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے.....''

''.....ان کی (سردار جعفری) شخصیت کی ادائیں منفرد اور مخصوص تھیں۔رشتوں کا جو معیار علی سردار جعفری کے یہاں ملتا ہے وہ ان کی آفاقی شہرت کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ان کی انسان دوستی دلوں پر گہرا نقش چھوڑتی ہے۔عظیم صاحب (نگار کے شوہر) بھی مجھ سے کچھ کم متاثر نہ تھے ان کی شخصیت سے۔جب ہم لوگ کافی بے تکلف ہو چکے تھے اس وقت کی بات ہے میں نے کہا آپ اپنی جوانی کی عمر میں اتنے اچھے نہیں لگتے تھے جتنے آج۔کسقدر گریس فل لگتے ہیں، ماشاء اللہ اور اس پر زلفیں سنوارنے کا انداز؟ مسکرانے لگے۔تو میں نے کہا اور پھر مزید اتنی دل آویز مسکراہٹ آپ کو معلوم ہے اُچک اُچک کر آپ کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے بے چین رہتی تھی میں۔دیکھئے اپنے میاں کے سامنے کہہ رہی ہوں۔میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔اس مرتبہ جعفری صاحب خاموش نہ رہے بولے ''ہم بھی اپنی بیوی سلطانہ کے سامنے کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔''سچ۔اور پھر ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔سچ پوچھئے تو مجھے بزرگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ان میں بیک وقت بچپن کی معصومیت جوانی کی امنگ اور بزرگی کا تقدس شامل ہوتا ہے۔ایک عجیب سرور ہوتا ہے ان سے ملنے کا، بات چیت کا چھونے کا، اور مزید علم وادب کا اضافہ ہو جائے تو انسان لمحہ بھر کو جنت بھول جائے۔'' 186

رضیہ فصیح احمد نے بتایا:

''ان کا کلام پڑھا بھی تھا مگر ان کی زبان سے سامنے بیٹھ کر سننے میں کچھ اور لطف آیا۔'' 187

ضیاءالدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری بڑی وجیہ اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ان کی سیرت کا اصل جوہر ان کی شرافت، محبت، دل نوازی، انسان دوستی اور حسن اخلاق تھا، میری ان کی ملاقات چند بار ہی کی ہے مگر ابھی تک اس کے لطف ولذت سے سرشار ہوں۔وہ دل کو موہ لینے والی باتیں کرتے تو جی چاہتا تھا کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔'' 188

بقول محمد اسداللہ:

''اگر میرا قیام بمبئی میں چند روز کا بھی ہوتا تو میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ یہ سارے ہی دن سردار بھائی کے ساتھ گزریں..... لیکن جب بھی فرصت کے لمحے میسر آتے ان کے گھر پر یا پھر کسی اور جگہ ملاقات کا وقت طے ہوتا۔اس کی بھی مجھے خوشی حاصل رہی ہے کہ میرے قیام بمبئی کے دوران سردار بھائی کہیں مدعو ہوتے تو مجھے بھی اصرار کے ساتھ لے جاتے ان کے ساتھ رہ کر ان کے قریب بیٹھ کر عجب طرح کی تسکین ہوتی تھی۔ 189

لیجنڈ Legend:

سلام بن رزاق نے سردار جعفری کی شخصیت کے کونا کوں پہلوؤں پر اشارے کرتے ہوئے انھیں لیجنڈ کہا ہے۔

''بعض شخصیتیں اس قدر مقبول ہوتی ہیں کہ وہ اکثر عوام کے درمیان موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اپنی زندگی میں ہی ایک Legend کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔جعفری صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ان کی شاعری، ان کی گفتگو، ان کی تقریریں، ان کے مضامین، ان کی فلمیں یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا معمولی سے معمولی فقرہ بھی فوراً موضوع بحث بن جاتا تھا۔یقیناً اس کا سبب ان کی غیر معمولی مقبولیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' 190

بقول رفعت سروش:

''سردار جعفری بلاشبہ living legend ہیں''۔ 191

"A Scholar par excellence", A man of all seasons A man of letters"

وزیر اعلیٰ اونٹاریو (کینڈا) نے سردار جعفری کو اس طرح کہہ کر مخاطب کیا۔

پرفیسر ضیاء (علیگ) نے بتایا:

کینڈا کی ایک تقریب میں سردار جعفری کو 1984 کا ایوارڈ دیا گیا۔اس تقریب میں ٹونی روپرٹ نے وزیر اعلیٰ اونٹاریو کا پیغام پڑھ کر سنایا اور جعفری صاحب کو

A grand old man of Urdu rather A young man of Urdu

کہہ کر مخاطب کیا۔ان کے بارے میں برملا یہ کہا کہ یہ A man of all seasons A man of letters ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ AScholar par excellence بھی ہیں۔'' (192)

عالمی سطح کے عظیم دانشور:

بہت سے ادیبوں نے سردار جعفری کو عالمی سطح کا عظیم دانشور قرار دیا۔ پروفیسر محمد حسن کے مطابق سردار جعفری عالمی سطح کے دانشور ادیب تھے۔

انہوں نے لکھا:

''باخبری ایسی کہ بین الاقوامی سے لے کر قومی سطح تک تحریکوں اور سرگرمیوں سے واقف ہی نہیں ان میں سرگرم اور اس کی نتیجہ تھا کہ ایک زمانہ میں عالمی سطح کے دانشور اور ادیبوں میں ان کا (سردار جعفری) کا نام بھی شامل تھا۔ پہلو نرودا۔ لوئی اراگان، ایلیا اہرن برگ، محمود درویش، ناظم حکمت، اور واتھول کے ساتھ سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ یہ شرف اس لئے تھا کہ سرداران سب کے ہم صفیر تھے۔''

193

بشیر احمد انصاری نے بتایا کہ اس عظیم دانشور کی ذات میں فکر، علم اور عمل کا امتزاج نظر آتا ہے۔ فکر، علم اور عمل میں ہم آہنگی ایک بہت بڑی صفت ہے جس سے سردار جعفری متصف تھے۔

''صالح انسانی اقدار کی بقا کی ضمانت اُن بزرگوں سے ہوتی ہے جو اپنی بلند فکر، اپنے سنجیدہ مزاج، شگفتہ زبان و بیان اور قابل تقلید عمل سے انسانیت کے اعلیٰ معیار کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ان قابل احترام ہستیوں میں کوئی ایسا عالم و دانشور بھی نکل آتا ہے جو روئے زمین پر انسانیت کی تاریخ اور دنیا کے مختلف نظام ہائے زندگی سے واقف ہوتا ہے۔ اُسے مختلف دور کے فلسفیوں کے نظریات کا علم ہوتا ہے۔ وہ اپنی خداداد صلاحت، مطالعہ اور گروہوں کے میل جول اور تصادم کے مشاہدوں سے انسانی ہوس اور ایثار، جبر اور ضبط میں تمیز کر سکتا ہے اور عصری تقاضوں کے پیش نظر عالمی انسانیت کا صالح معیار ڈھونڈ نکالتا ہے، پھر اس معیار کی عملی تصویر بن جاتا ہے اور اسے عام کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے خاک کے پردے سے ایسا انسان کبھی کبھی نکلتا ہے۔ مرحوم علی سردار جعفری ایسے ہی عظیم دانشور تھے جن کی ذات میں فکر، علم اور عمل کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔''

194

یوسف ناظم نے لکھا:

(1) ''ایسے قد آور دانشور کی رحلت سے اُردو دنیا کتنی سونی ہوگئی ہے اور محفلیں کتنی بے رونق''

(2) ''..... علی سردار جعفری بلاشبہ بیسویں صدی کے .... دیومالائی حیثیت کے ادیب اور دانشور تھے۔''195

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے سردار جعفری کو دانشور اور مفکر قرار دیا۔

''وہ (سردار جعفری) اس دور کے سب سے قد آور شاعر تھے اور اب ان جیسا دانشور اور مفکر دور دور تک نظر نہیں آتا۔''

196

پروفیسر نظیر صدیقی نے لکھا ہے۔

''ترقی پسند تحریک کے اُردو رہنماؤں میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری بہت پڑھے لکھے آدمی تھے''۔ 197

بقول قیصر تمکین:

''وہ (سردار جعفری) ایک شاعر یا ادیب ہی نہیں بلکہ مایہ ناز دانشور بھی تھے۔'' 198

عالمگیر فلاح کا مبلغ:

عرفانہ عزیز کے مطابق:

''علی سردار جعفری کی ذات بڑی پہنائیوں کی حامل ہے..... گندم کی سنہری بالیوں سے معصوم بچوں کی ہنستی آنکھوں تک ان کا پیار پھیلا ہوا ہے۔غم دہر سے ان کا رشتہ بڑا استوار ہے۔وہ سچ کی جدوجہد میں جب آگے بڑھتے ہیں تو ان کے ساتھ دریا، پہاڑ اور سمندر بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور انسان کی عالمگیر برداری کی فلاح کے لیے اُن کی آواز چہار دانگ گونج اٹھتی ہے اور ہر سچے فن کار کی سوچ سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔'' 199

مختلف زبانوں پر دسترس:

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے بتایا:

''سردار جعفری جو اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم، عربی، ہندی، انگریزی اور سنسکرت علمی و ادبی روایت پر اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ دسترس اور عبور رکھتے تھے۔'' 200

بقول میر ہاشم:

''سردار جعفری کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔انہیں اُردو فارسی کے کلاسیکی ادب اور انگریزی پر عبور حاصل تھا''۔201

بحث و مباحث سے دلچسپی:

جس ادیب کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور جس کو علم کی طلب لگی رہتی ہے اسے علمی و ادبی مباحثے میں لطف آتا ہے۔

بقول سبط حسن:

''ان کو (سردار جعفری) کو بحث مباحثے کا بھی بڑا چسکا تھا..... کالج کے زمانے میں طلبہ کے مباحثوں میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے جاتے تھے اور انعام پائے تھے۔ادب ہو یا سیاست یا کوئی اور موضوع، کوئی شخص ان سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔'' 202

گل افشانیٔ گفتار Conversationist:

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے نہایت دلچسپ انداز میں سردار جعفری کو علم کا سمندر، بحر ذخّار، قلزم بسیط و عمیق، قلم و ادب اور مختلف سماجی علوم کے موتی لٹانے والی خوش گفتار شخصیت قرار دیا۔

''اف وہ انداز گل افشانی گفتار!!..... جنبش دہن نے گویا فضاؤں میں موتی رول دیے لگا علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے اور جب بار بار سنا تو محسوس ہوا کہ غلط فہمی تھی دریا۔ دریا نہیں، یہ تو ایک سمندر ہے۔ایک بحر ذخّار۔ایک قلزم بسیط

وعمیق !!یہاں سے وہاں تک حروف ومعانی کے در ہائے شاہ وار اپنی تابانی و درخشانی سے ہزار ہا دل ونظر کو خیرہ کرتے ہوئے !!جس کا جیسا جی چاہے ویسے موتی چن لیے۔ادب فلسفہ، منطق، سیاست معاشیات، سماجیات، تاریخ، تصوف، مذہب کون سا باب اس کتاب وجود میں وا نہ تھا۔جس موضوع پر بولنے پر اُترتے ۔ایسا لگتا جیسے یہی موضوع ان کا خاص موضوع ہے۔الفاظ نپے تلے، انداز سنجیدہ، لہجے میں متانت وشرافت، آواز میں بلندی اور اعتماد بلکہ احساس طمانیت !!اور چہرے پر ایک ہلکی سی تابناک سُرخی جو علم کی روشنی کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔'' 203

رباب جعفری لکھتی ہیں:

''سردار بھائی کے ایک قریبی دوست کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر ہم سب جو گفتگو سنتے ہیں اُس میں اساتذہ سے لے کر موجودہ دور کے نئے شعراء کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔'' 204

وسیع مطالعہ:

علی سردار جعفری کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ وہ وقت ضائع نہ کرتے اور جہاں کہیں کچھ پڑھنے کا موقع مل جاتا وہ ضرور اس سے استفادہ کرتے۔

پروفیسر غلام دستگیر شہاب لکھتے ہیں:

''جعفری صاحب کی انسان دوستی میں ان کے وسیع مطالعہ 'حق کی تلاش کے لیے جدوجہد اور کربلا کے واقعہ کے تاثر کا بڑا دخل رہا ہے ..... جعفری صاحب عوامی ادارے (مومن پورہ، ممبئی) میں تشریف لاتے تو رسالے اور کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے کہ کہیں کوئی اہم چیز ایسی تو نہیں جسے انہوں نے نہ پڑھا ہو۔دیودھر ہال میں ترقی پسند مصنفین کی میٹنگوں میں شہاب صاحب نے نشاط شاہدی کے ساتھ کئی بار شرکت کی تھی۔انہوں نے بتایا تھا کہ جعفری صاحب میٹنگ شروع ہونے سے پہلے کوئی کتاب پڑھتے رہتے ..... سچ تو یہ ہے کہ اس مطالعہ نے اُن کے جوان شخصیت کو بزرگی عطا کی۔مطالعہ کے ساتھ شعوری تجربے نے بالغ نظری پیدا کی اور ان کی شخصیت میں ایک انوکھا، عجیب لیکن خوشگوار اعتدال پیدا کیا۔انسانی اقدار کی ایک شرط شخصیت میں توازن کا ہونا ہے۔جعفری صاحب کی شخصیت میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔'' 205

پڑھنے لکھنے سے دلچسپی رکھنے والی شخصیتوں کو تھکن کا شکوہ نہیں ہوتا بلکہ انھیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔

سردار جعفری کی اس صفت پر رباب جعفری نے روشنی ڈالی ہے:

''باہر سے واپسی پر پھر پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔غرض کہ صبح سے شام تک انہی کاموں میں غرق رہتے ہیں۔اس مصروفیت کے باوجود کبھی تھکن کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ خوش رہتے ہیں۔'' 206

حلقہ احباب کے عملی وادبی کارناموں کے بارے میں

اپنی رائے اور تنقید کا برملا اور بے باک اظہار:

سلمیٰ صدیقی نے سردار جعفری کی عمدہ طریقے سے معاصرین کے کارناموں پر بے باک رائے دینے کے بارے میں لکھا:

''ان کے (سردار جعفری) احباب کا حلقہ وسیع تھا، اپنے ہمعصر اور قریبی دوستوں اور ساتھیوں کے علاوہ وہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو، ماؤسی تنگ اور کارل مارکس، پابلو نرودا اور ناظم حکمت، جوش، فراق اور فیض، مجاز، جاں نثار اختر، ساحر، کیفی اور مجروح سب سے قریب تھے، لیکن ان کے بارے میں اپنی رائے اور تنقید کا برملا اور بے باک اظہار کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں جب ان پر بھی شہر یاروں سے رقابت کا جنون طاری تھا وہ فراق کو رکھپوری سے الجھتے رہتے تھے، یہ ذاتی ''الجھاؤ'' نہیں تھا بلکہ خالص ادبی اور علمی سطح پر ہوتا تھا اور یہ بحث اگر کبھی اپنا رُخ کسی ایسی سمت کر لیتی جو تہذیب کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچا سکتی تھی تو وہ اپنی گل افشانئ گفتار پر قابو پا لیتے اور بے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں کا انداز اختیار کر کے ہتھیار ڈال دیتے۔''

207

محتاط اور ذمہ دار ادیب:

علم ایک بحر ذخار ہے۔ ایک فرد کا مطالعہ اور علمی و ادبی area محدود ہوتا ہے کسی موضوع پر تقریر کرنے کے لیے اس موضوع پر مقرر کا مطالعہ رہنا چاہئے۔ جس موضوع پر کسی کا مطالعہ نہیں ہے تو اُس کا اعتراف بھی کرنا چاہئے اور یہ اعلیٰ ظرفی کی بات ہے۔

یوسف ناظم نے بتایا:

''1944 میں جب حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو جعفری صاحب بھی حیدرآباد آئے تھے ..... اس موقع پر ہم چند لڑکوں نے وہاں ایک یوم نظیر اکبرآبادی بھی منایا تھا اور اُن سے اس جلسے میں تقریر کرنے کی فر مائش کی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ ''نظیر پر میرا مطالعہ نہیں ہے۔ اس لیے میں جلسے میں تو ضرور آوں گا لیکن تقریر نہیں کروں گا''۔ اس وقت ہم نے ان کے انکار کا بُرا مانا تھا لیکن بعد میں جب بھی میں نے ان کے عذر پر غور کیا تو محسوس ہوا جعفری صاحب شروع سے محتاط اور ذمہ دار قسم کے شخص تھے''۔

208

ادیبوں، شاعروں کی حوصلہ افزائی اور مالی امداد کی مساعی:

علم کا سچا قدر داں کتابوں کی قدر کے ساتھ ساتھ ادیبوں، شاعروں کی بھی قدر کرتا اور ان سے دوستی رکھتا ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے ساتھ دست تعاون دراز کرتا ہے۔ سردار جعفری کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ جعفری صاحب جونیر ادیبوں اور شاعروں کو اولیت دیا کرتے جس سے وہ بہت متاثر ہوتے، حوصلہ پاتے اور آگے بڑھنے میں تیزی پیدا کرتے۔ بہت سے ادیبوں نے سردار جعفری کی اس خوبی کی ستائش کی ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

(1) ''راقم الحروف (عبدالستار دلوی) کو ان سے قرب کا اعزاز حاصل رہا ان کی شفقتیں اور حوصلہ افزائی بھی شریک حال رہیں۔ جب میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری (ہندوستان پرچار سبھا، ممبئی) سے بحیثیت ڈائرکٹر منسلک تھا (1967-1982) جعفری صاحب نے ہمیشہ میری دعوت کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے تقریبات کی رونق بڑھائی''۔ (اپنی بات۔ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 35)

(2) ''راقم الحروف (عبدالستار دلوی) سے انھیں مشفقانہ تعلق تھا۔ ''اُردو میں تلفظ کا مسئلہ'' پر جب میں نے اپنا مقالہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی فرمائش پر انجمن اسلام میں پڑھا(1936) تو جعفری صاحب نے ازارہ حوصلہ افزائی یہ مقالہ مجھ سے حاصل کیااور ''گفتگو'' میں شائع کیا۔''
209

یوسف ناظم کے مطابق :

''اُردو اکادمی کا کوئی مشاعرہ ہوتا تو نوجوان شاعروں کو اولیت دیتے۔کسی اور مشاعرے کی فہرست ان کی بھی نظر سے گزرتی تو اس میں بھی کچھ ناموں کا اضافہ کروانا اپنا فرض سمجھتے۔''
210

رضیہ فصیح احمد نے اپنا ایک واقعہ لکھتے ہوئے سردار جعفری کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کیا:

''سردار جعفری صاحب سے پہلی ملاقات یاد آتی ہے غالباً 1983 میں اور مقام غالب لائبریری کراچی ..... تقریب کے آخری میں مرزا ظفر الحسن، ہاجرہ سرور، احمد علی خاں سید انور اور دیگر بہت سے حضرات وخواتین سردار جعفری کے ساتھ تصویر یں اتروا رہے تھے۔گو میرا تعارف ہو چکا تھا لیکن میں ادب میں حسب مراتب کا بہت خیال رکھتی ہوں لہٰذا جونیر ادیب کی حیثیت سے ایک طرف کھڑی رہی۔تصویر کے بعد سردار جعفری کی نظر مجھ پر پڑی۔شاید انھیں میرا اس طرح نظر انداز کیا جانا اچھا نہیں لگا۔انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ''تصویر گر'' سے کہا ''بھئی رضیہ کے ساتھ ہماری تصویر لو' سینئر ادیب ایسا کم کم کرتے ہیں۔خصوصاً جب چاروں طرف بیسیوں پرانے احباب اور سینکڑوں پروانے موجود ہوں۔باتوں کے دوران مجھ پر ان کی شخصیت کا بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔وہ سدا سوسائٹی کے ان افراد کے ساتھ رہے جن کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔انہوں نے اپنا موقف کبھی نہیں بدلا''۔
211

بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے:

''شعراء اور ادبا کی دوستی انھیں عزیز تھی۔ایک بار اُردو اکادمی کی میٹنگ میں تشریف لائے اور یہ تجویز رکھی کہ فلاں شاعر جو بہت مقبول تھے' نہایت علیل ہیں۔انھیں فوراً مالی امداد چاہیے۔چنانچہ فوراً یہ تجویز منظور کرلی گئی۔''212

کتابوں کی قدر ومنزلت اور محبت :

سردار جعفری کو کتابوں سے کس قدر محبت تھی اور وہ کس قدر ومنزلت سے انھیں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

اس کے بارے میں سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں۔

''ان کے (سردار جعفری) گھر میں کتابوں کی ایسی قدر ومنزلت تھی جو بعض کتب خانوں میں بھی نہیں ملتی۔انہیں کتابوں سے محبت تھی ان کے گھر کی سجاوٹ میں ان کی اپنی دلکش و دل آویز شخصیت کے علاوہ ان کی کتابوں کا بھی بہت بڑا حصہ شامل تھا۔''
213

نگار عظیم نے بتایا کہ سردار جعفری نے کس قدر خوشی سے ان کے شعری مجموعہ کو قبول کیا، اسے پڑھنے کا وعدہ کیا اور اس مجموعہ کے پیش لفظ لکھنے والے نقاد پروفیسر قمر رئیس کو ہیرا قرار دیا۔

''میں نے (نگار عظیم) اپنا مجموعہ عکس' ان کی (سردار جعفری) کی خدمت میں پیش کیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اچھا۔ قمر رئیس نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جانتی ہو؟..... ''ہیرا ہے وہ''..... میں اس مجموعہ کو ضرور پڑھوں گا اور رائے بھی دوں گا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی تفصیلی ملاقات سے یقین ہو گیا تھا کہ علی سردار جعفری کوئی معمولی انسان نہیں۔ میں نے قلم کے محافظ دونوں ہاتھوں کو تعظیم سے چھوا آنکھوں سے لگایا چوما اور اس پہلی ملاقات کی مہر ثبت کر دی۔'' 214

شعر و ادب کی ناقدر دانی و بے ادبی نا قابل برداشت:

سردار جعفری ادب کی عظمت اور مرتبہ کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ایسا شخص کہیں بھی ادب کی ناقدری اور بے ادبی ہوتی ہوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پروفیسر ضیاء (علیگ) نے مانٹریال (کینڈا) میں منعقدہ مشاعرہ کا ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے سردار جعفری کی ادب کے تئیں قدر دانی کی ترجمانی ہوتی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں۔

''اوٹاوا کے بعد شاعر حضرات کو مانٹریال جانا تھا..... مشاعرہ گاہ تک آفاق حیدر کی بیٹی رومانہ اپنی اسپورٹس کار میں بٹھا کر اپنے چچا (جعفری صاحب) کو لے کر گئی۔ جعفری صاحب بڑے خوش خوش اور تر و تازہ نظر آ رہے تھے مگر مشاعرہ گاہ پہنچنے اور وہاں کا عالم دیکھا تو ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ہال کے اندر چائے پانی (کوکا کولا) اور سموسوں کا اسٹال لگایا گیا تھا۔ لوگ اس اسٹال کے اردگرد زیادہ جمع تھے۔ شعر توجہ سے سننے کا کسی کو سلیقہ نہ تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا تو ایک طرف تو شاعر اپنا کلام بلاغت نظام سنا رہا ہے اور دوسری طرف مجمع اسٹال کے اردگرد کھڑا ہوا سٹر سٹر چائے پی رہا ہے۔ سموسے یا پکوڑے کھا رہا ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ سکریٹری بزم اُردو ادب ناظم مشاعرہ کو پرے ہٹا کر بار بار کوئی نہ کوئی بے معنی اعلان کرنے مائیکروفون تک پہنچ جاتا ہے۔ جعفری صاحب کی فطرت کے یہ منافی ہے کہ وہ اُردو زبان، ادب و شعر کی اس طرح ناقدری دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ یہ ہڑبونگ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مقامی رسم و رواج کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے برملا تو کچھ نہ کہا البتہ خاموش احتجاج کے طور پر مشاعرہ عالی صاحب کے سپرد کر بیٹی رومانہ سے کہا کہ مجھے گھر لے چلو کہ مجھ سے ادب کی یہ بے ادبی پڑھے لکھے انسانوں کے ہاتھوں نہیں دیکھی جا رہی ہے۔ اور وہ ہال سے اٹھ کر چلے آئے۔ نہ اُن کو اس سے غرض تھی کہ اس طرح ان کو کسی مالی خسارے کا شکار ہونا پڑے گا نہ اس سے واسطہ تھا کہ منتظمین ان کے اس طرح اچانک مشاعرہ گاہ سے چلے جانے کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ جعفری صاحب کی یہی ادا ان کے کردار کی شان ہے کہ وہ ادب کی عظمت کا سودا نا اہل اور ناپختہ شعور کے ہاتھوں نہیں کر سکتے۔ جس پودے کو انہوں نے اپنا لہو پلا پلا کر سینچا' اس کو ایک ایسا سایہ دار درخت بنایا جس کے سائے میں بیٹھ کر کتنے ہی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو سوچنے کا موقع ملا اور اپنی ذہانت اور فطانت کو تیز کرنے میں مدد ملی وہ اس درخت کی شاخوں کو کسی کم علم اور کور ذوق کے ہاتھوں ڈالر کی لالچ میں کٹتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا وہاں سے اٹھ کر چلے آنا ایسی غیر منظم محفل کے خلاف ایک پُر زور اور پُر جوش احتجاج تھا جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان کی طرح ادب کا مرتبہ جانتے ہیں اور شعر و شاعری کا وقار خاک میں ملتے نہیں دیکھ سکتے۔'' 215

ادبی جلسوں، سمیناروں، مشاعروں وغیرہ کی دعوتوں میں شریک ہوا کرتے:

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بڑے مشاعر وادیب مخصوص جلسوں میں ہی شریک ہوتے ہیں لیکن جنھیں انسانیت کا پیغام ہر جگہ پہنچانا ہوتا ہے وہ ہر چھوٹے بڑے جلسہ میں شریک ہوتے ہیں۔سردار جعفری کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا۔

بقول ناظم :

''میں نہیں سمجھتا کہ جعفری صاحب نے کسی بھی بڑے یا چھوٹے شہر میں وصول ہونے والی کسی دعوت کو رد کیا ہو۔''216

پروفیسر غلام دستگیر شہاب نے بتایا:

''ہر جلسہ میں جس میں وہ شریک ہوتے ان کے commitment کو پورا کرنے کا ایک عمل ہوتا تھا۔ہر تقریب ان کی انسانی تحریک کا یک حصہ ہوتی تھی اور عوام کو اپنے موقف سے آگاہ کرنا اس کا مقصد ہوتا تھا''۔ 217

انسان دوستی:

سردار جعفری انسانیت سے پیار کرتے تھے ان کی انسان دوستی بلا لحاظ مذہب مسلک، ملک، وطن، زبان، رنگ ونسل اور تمام امتیازات سے بالاتر تھی۔وہ تمام انسانوں کو ایک اکائی سمجھتے تھے۔ان کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔وہ ہمدرد انسان تھے۔کسی پر ظلم، ستم، استحصال اور نا انصافی کو ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔انہوں نے عالم انسانیت کے لیے زندگی بھر مسلسل مساعی کی کہ انسانیت نواز فضا کی تشکیل، برقراری اور انسانیت کی شمع فروزاں رہے، عالم انسانیت میں یگانگت بھائی چارگی، خلوص محبت، ایثار قربانی قائم رہے۔مختلف ادیبوں نے سردار جعفری کی انسان دوستی کی تعریف کی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کے مطابق:

''جعفری صاحب زندگی بھر انسان دوستی کا دم بھرتے رہے۔مذہب، مسلک، وطن، زبان نسل ورنگ تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر انہوں نے انسان کو اپنے نظر سے دیکھا۔'' 218

سردار جعفری کا تمام انسانوں کو ایک اکائی اور ساری دنیا کو ایک شہر سمجھنے کے بارے میں میر ہاشم نے لکھا:

''سردار جعفری کا وژن بہت وسیع تھا۔وہ تمام انسانوں کو ایک اکائی اور ساری دنیا کو ایک شہر سمجھتے تھے''۔219

ڈاکٹر فاطمہ تنویر کہتی ہیں:

''وہ (سردار جعفری) مشرق ومغرب کے درمیان جو دیواریں حائل ہیں اُن کو ہندم کر دینا چاہتے ہیں''220

مذہب، قوم، ملک جیسے تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر ساری انسانیت کے تئیں سردار جعفری کی محبت کے بارے میں رباب جعفری لکھتی ہیں۔

''سردار بھائی انسانیت سے پیار کرتے ہیں۔دل سوز محبت سے لبریز ہے۔تمام انسانوں کے دل کا درد اس دل میں محسوس ہوتا ہے۔یہ آنکھیں ہر ایک کے غم میں اشکبار رہیں اور سب کی خوشیوں میں مسکراتی ہیں۔غریبوں، دکھیوں اور غمزدوں کے لیے رحم کے جذبات سے چھلک جاتی ہیں۔ہنستے کھلکھلاتے ہوئے بچوں میں ان کے لیے بڑی کشش ہے۔ان ننھے ننھے

پھولوں کی بڑی ناز برداری کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسے انسان دوست کا حلقۂ ملاقات کتنا بڑا ہوگا؟ اُن سے ملنے والوں اور دستوں میں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سماج کے دوسرے افراد بھی ہیں مثلاً ڈاکٹر، انجینئر، ایڈیٹر، طالب علم، صحافی اور دوسری زبانوں کے شاعر و ادیب۔یہ محبت، خلوص اور اخلاق کا پُرشکوہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔اس نے مذہب اور قومیت کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ملکوں کی حدوں، فرسودہ سماج کی دیواروں کو توڑ دیا ہے اور سمندر کی وسعتوں کو پار کر کے یہ ملک در ملک خوبصورت خیال کی طرح پھیل گیا اور عطر بیز ہواؤں کی طرح دوستوں کے دل و دماغ میں بس گیا ہے۔"221

ڈاکٹر غ۔ع۔شیخ نے بتایا کہ سردار جعفری دوسروں کے دکھ درد اور غم کو اپنا دکھ درد، غم سمجھتے۔

"جعفری ایک ہمدرد انسان ہیں ان کے سینے میں انسانیت سے بھرا دل تھا وہ کسی پر ظلم و ستم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایک انسان دوست شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں انسانیت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔وہ اوروں کے غم کو اپنا غم اوروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ان کی شاعری خلوص و محبت کا پیکر ہے۔" 222

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے مطابق:

"(سردار جعفری نے) اپنی انسان دوستی، اپنی تہذیبی اقدار، اپنی شرافت، شستگی اور شائستگی سے متاثر کیا۔"223

عالم انسانیت کے لیے سردار جعفری کی مسلسل جد و جہد کے متعلق بشیر احمد انصاری رقمطراز ہیں:

"حسن کردار میں جو چیز انھیں دانشوروں میں ممتاز کرتی ہے وہ عالم انسانیت کے لیے مسلسل جہد ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ صرف اُردو ادباء کے دانشور نہیں تھے بلکہ تمام زبانوں کے عالمی ادب میں ان کا شمار بحیثیت ایک علم دوست اور انسان دوست دانشور رہوتا تھا۔بلاشبہ وہ بیسویں صدی کے انسانیت کے محرک، متحرک اور مقبول ہندوستانی تھے۔" 224

انسان دوستی کا مبلغ:

سردار جعفری نے انسان دوستی پر عمل اور اپنی تخلیقات میں اس کے فروغ کی مساعی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس اہم کام کو جاری و ساری رکھنے کی اپیل بھی کی۔انہوں نے تمام دانشوروں، elite اور عوام سے دردمندانہ اپیل بھی کی کہ پنپنے والی فسطائیت کے خلاف کمربستہ رہیں اور انسانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کو روکتے رہیں۔

بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے:

"عصمت آپا کے اعزاز میں ایک جلسہ اُردو اکادیمی کی جانب سے منعقد ہوا۔اس موقع پر جعفری صاحب نے جو تقریر کی اس کے ایک ایک نقطہ سے درد کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے انتباہ کیا کہ "ملک میں جو انسانیت کش ذہن تیار ہو رہا ہے وہ ساری انسانی قدروں کو جو ہمارے ملک کا اثاثہ ہیں تہس نہس کر دے گا۔اس لیے ملک کے تمام دانشور، ادیب، elite، امراء اور عوام کو مل کر انسانیت نواز فضاء تیار کرنی ہوگی۔فسطائیت پنپ رہی ہے، ہم تو عمر بھر قدروں کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔اپنے بعد کی نسل کو بھی یہی کہنا ہے کہ دیکھو انسانیت کی شمع فروزاں بجھنے نہ پائے۔کچھ حالات ایسے ہیں جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتے ہیں۔آج کی سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ انسانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو روکا جائے۔یہی انسانیت کی پکار اور صدا ہے"۔

''اس کی (سردار جعفری) انسان دوستی ہر ادبی شہ پارے میں ان اجزاء کو تلاش کرنے میں لگتی ہے جو عوامی، گروہی اور علمی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہی انسان دوستی ان کی شخصیت کو وقار بخشتی ہے۔''225

پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے :

''ان کے (سردار جعفری) افکار چاہے شاعری میں ہوں یا نثر میں یا ان کی تقاریر میں، ان کے پیش نظر یہی بنیادی مقصد رہا ہے کہ زبان و ادب کو اظہار محبت، دوستی و یگانگت' بھائی چارہ اور انصاف پسندی کو محدود جغرافیے میں جگانے کا کام کرتے رہے۔'' 226

ادبی عظمت کے ساتھ حسن اخلاق اور شفقت و محبت کا پیکر:

سردار جعفری کے حسن اخلاق، ان کی شفقت، محبت من موہنی پر خلوص، ہر دل عزیز شخصیت کی تعریف بہت سے ادیبوں نے کی۔

پروفیسر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں۔

''علی سردار جعفری اُردو کے ممتاز شاعر اور ادیب بھی تھے اور اچھے انسان بھی تھے۔ مجھے زمانہ طالب علم سے سردار جعفری کو سننے اور پھر ملنے کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ انسانی زندگی کی چھوٹی موٹی خطاوں اور کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوتی تاہم مجموعی حیثیت سے لوگ شخصی طور پر چھوٹے یا بڑے کہلائے جاسکتے ہیں..... وہ ایک دانشور، عالم شاعر، ادیب اور نقاد تھے۔ وہیں پر وہ ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ اگر ادبی عظمت کے ساتھ شخصیت کی جملہ خصوصیات سے بھی شخصیت آراستہ ہو تو اس کی قدر و قیمت زندگی اور سماج میں دو چند ہو جاتی ہے۔ سردار جعفری ادبی عظمت کے ساتھ حسن اخلاق اور شفقت و محبت کا پیکر بھی تھے۔ وہ وقت کے حد درجہ پابند تھے اور لوگوں کو اپنے اخلاق سے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ 227

سردار جعفری کی من موہنی شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا:

''ان کی (سردار جعفری) کی بڑی ادبی و دانشورانہ شخصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ علم کا اپنا جادو ہوا کرتا ہے وہ جادو تو ان کے پاس تھا ہی ساتھ ہی ان کی شخصیت کا رچاؤ، ان کے لمبے گھنیرے سرمئی بالوں کا غبار، تمام دنیا کے حسن کو جذب کر لینے والی جادوئی آنکھیں، ان کی مخروطی انگلیاں، ان کی ہوش ربا مسکراہٹ، ان کی گفتگو کا سلجھا ہوا منطقی انداز سب کے سب ان کے علم و دانش کی گواہی دیتے اور اس کے اظہار کا پُرکشش حصہ بن جاتے۔ ان سب غیر معمولی خوبیوں نے ان کے اظہار و ایثار نے سردار کی شخصیت کو ایک تاریخ ساز اور نظریہ ساز بنا دیا تھا جن سے اختلاف کیا جانا فطری تھا لیکن سردار کی طلسمی، من موہنی شخصیت کے جو بھی قریب آتا غیر معمولی تاثر لئے بغیر نہ رہتا۔ سردار کی فنکارانہ اداؤں کے قیدی تو نہ جانے کتنے سلطان اور سلطانائیں تھیں لیکن ان کی عملی اور طلسمی شخصیت کا قیدی تو پورا زمانہ تھا۔ اسی لیے کہا جا رہا ہے کہ سردار کیا رخصت ہوئے ایک دور رخصت ہو گیا۔ ایک تاریخ رخصت ہو گئی''۔ 228

رفعت سروش نے ایک واقعہ لکھ کر سردار جعفری کی پر خلوص شخصیت کو اجاگر کیا۔

''مجاز نے سردار جعفری کو ترقی پسندوں کا ظفر علی خاں کہہ کر گویا سردار کی جملہ صلاحیتوں اور محاسن کا تعارف کرا دیا اور

میرے دل میں سردار سے ملنے کی خواہش تیز تر ہوگئی۔اور کچھ دن بعد جب میں بمبئی گیا تو مجاز نے سردار کے نام ایک تعارفی پرچہ دیا اور میں اسی مجاز کے خط کے سہارے سردار سے ملا..... صرف دو لائن کا پرچہ ''یہ رفعت سروش ہیں۔اچھے شاعر ہیں انھیں کیفی وغیرہ سے ملا دو''۔سردار بڑے خلوص سے پیش آئے..... سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔کیفی اعظمی، سبط حسن، سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف، ہاجرہ بیگم، ضیاء الحسن، محمد علی اور کئی حضرات..... رمیش سنہا، پریم ساگر گپتا، رومیش چندر، پریم دھون، شمشیر سنگھ وغیرہ..... یہ سردار ہی تھے جن کی پرخلوص شخصیت کی کشش مجھے تقریباً روزانہ پارٹی آفس لے جاتی تھی اور یوں میں بہت جلد اس ماحول کا عادی ہوگیا اور مجھے بہت اچھے دوست اور محبت کرنے والے بزرگ مل گئے۔''229

عوام وخواص کے وسیع حلقہ میں سردار جعفری مقبول اور ہر دل عزیز شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے۔

''سردار جعفری تحریکی آدمی ہیں۔اس لیے بے شمار لوگوں سے ان کی ملاقات اور دوستی ہے۔اُردو، ہندی، روسی اور دوسری بہت سی زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں سے ان کے تعلقات ومراسم ہیں۔ان کے ملنے والوں اور دوستوں میں جہاں مشہور شاعر وادیب ہیں وہیں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ بھی ہیں۔اخباروں کے صحافی بھی، موسیقی اور مصوری کے میدانوں کے آرٹسٹ بھی۔سردار جعفری نے ہندوستان کے شہروں اور گانوؤں کا سفر بھی کیا ہے۔اس کے بدلے ان کو عوام و خواص میں جو مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے، وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' 230

ظلم، استحصال، ناانصافی، تنگ نظری اور غلامی کے خلاف آواز اٹھانے والی شخصیت:

دردمند دل رکھنے والا انسان دوست آدمی دوسروں پر ہونے والے ظلم، ستم، استبداد، استحصال ناانصافی وغیرہ دیکھ نہیں سکتا۔وہ اس کے خلاف جرأت کے ساتھ آواز اٹھاتا ہے، احتجاج کرتا ہے اور اس کام کے سلسلہ میں جو بھی مصیبت جھیلنا پڑتا ہے وہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔سردار جعفری کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ علی سردار جعفری ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے..... گرچہ علی سردار جعفری ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے لیکن ان کی فکر پر حالات کے قبول اور تغیر کا اثر بھی پڑتا رہا۔وہ انسان دوست تھے۔ظلم دیکھنا گوارہ نہ تھا۔ان کے سینے میں جذباتیت کا موج رواں رہتا تھا۔اظہار کے لیے ان کے پاس خوبصورت اور برمحل الفاظ تھے۔'' 231

غیر منصفانہ معاشرے کو بدل دینے کی جرأت:

سید محمد مہدی کہتے ہیں کہ:

''کائنات اور تاریخ کی شناخت کا شعور اور غیر منصفانہ معاشرے کے خلاف جذبہ احتجاج اور اس کو بدل دینے کی جرأت رندانہ جس نے انھیں وطن عزیز کی آزادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار کیا۔''232

دوسروں کی تکلیف میں سردار جذباتی:

شوکت اعظمی کہتے ہیں:

''سجاد ظہیر کی بیوی رضیہ آپا کی موت کے بعد جب کیفی نے کنڈولنس میٹنگ بلائی تو سردار بھائی رضیہ آپا کے بارے میں تقریر کر رہے تھے۔تقریر کرتے کرتے وہ رونے لگے۔ان کی آواز بھرا گئی اور بول نہیں سکے۔تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے ان کا دل گلاب کی پنکھڑی کی طرح نازک ہے جو ذرا سی تکلیف سے مرجھا جاتا ہے۔'' 233

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے سردار جعفری کو آزادی و حریت، امن، شانتی، محبت و مساوات کا علمبردار قرار دیا۔

''سردار جعفری نے ہر زمانے میں ظلم و ستم، استبداد و استحصال، نا انصافی و نابرابری، عصبیت و تنگ نظری اور غلامی و محکومی کی مذمت کی ہے۔وہ آزادی و حریت، امن و شانتی، محبت و مساوات کے علم بردار رہے ہیں۔انہوں نے غریبوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی ہمیشہ وکالت و حمایت کی ہے۔دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کا خون بہے وہ اس پر تڑپ اٹھتے ہیں۔دنیا کے چنگیزوں، ہٹلروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جس طرح کھل کر اور جتنا بڑھ چڑھ کر انہوں نے لکھا ہے، شاید ہی کسی شاعر نے لکھا ہوگا۔اپنی ادبی خدمتوں اور انسان نقطۂ نظر کے لیے وہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔'' 234

نگار عظیم کے مطابق :

''علی سردار جعفری کسی ایک شخصیت، تحریک یا روایت کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل داستان کا نام ہے۔غم جاناں، غم دوراں، غم ذات کے علاوہ ایک وطن پرست شاعر تھے۔تنگ نظری، ظلم، نا انصافی، معاشرتی المیوں اور انسانی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے والے علی، عاجزی اور انکساری کی ایسی مثال تھے جس کا کوئی ثانی نہیں۔'' 235

دوستوں شناساؤں، غریبوں، مفلسوں، بیماروں، ضرورت مندوں کی مدد اور عزت و اکرام و خاموشی کے ساتھ:

رباب جعفری نے چند ایک واقعات لکھے ہیں جن سے سردار جعفری کی غریبوں محتاجوں، بیماروں اور ضرورت مندوں کی مدد کا پتہ چلتا ہے۔

(1) ''بمبئی سے باہر کے ایسے بہت سے لوگ آتے ہیں جن کے پاس یہاں کے اسپتالوں کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔جب سردار بھائی کو ان لوگوں کی یہ حالت معلوم ہوتی ہے تو یہ ان کی مدد کرنے کے لیے خود روپیہ دیتے ہیں، اپنے عزیزوں اور دوستوں سے دلواتے ہیں۔بمبئی میں ایسے بہت سے ادارے موجود ہیں جو ضرورت مند مریضوں کی روپیہ یا مرض کی ضرورت کے اعتبار سے اشیاء کی صورت میں امداد دیتے ہیں۔سردار بھائی ان اداروں سے رابطہ قائم کر کے ان کی ضرورت پوری کرا دیتے ہیں۔بمبئی کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ مفلسی سے مجبور ہو کر ان سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔سردار بھائی ان سے ایک دوست، ایک عزیز کی طرح ملتے ہیں اور ان کی ضرورت کے لیے روپیہ دیتے ہیں لیکن اس طرح کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کس کو کیا دیا؟ دست سوال پھیلانے والے کو مجبوری اور

لاچاری کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اس طریقے سے پیسے دیتے ہیں کہ اس کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔محبت، ہمدردی کسی کے برے وقت میں کام آنے کا جذبہ خدا نے سردار بھائی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔اپنی نرم دلی کے باعث کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے۔"

(2)"ایک سال بمبئی میں شدید بارش ہوئی تھی۔سامنے کی بلڈنگ کے سائے میں بارش سے پناہ لینے کے لیے فٹ پاتھ کے بچے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔معصوم بچوں کے جسم پر صرف پھٹے ہوئے جانگیے تھے۔تیز ٹھنڈی ہوا اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بچے تھر تھر کانپ رہے تھے سردار بھائی نے جب یہ دلخراش منظر دیکھا تو فوراً گھر میں چھوٹے چھوٹے کپڑے نکال کر اور روٹیوں میں سالن رکھ کر دونوں چیزیں غریب بچوں کو دے دیں۔بچے کھانا اور کپڑے لے کر بہت خوش ہوئے"۔

(3)"سردار بھائی گھر سے باہر جاتے ہیں تو کبھی کبھی مزدوروں اور فقیروں کے بچے دوڑ کر ان کے پاس آجاتے ہیں اور پیسے مانگتے ہیں۔یہ پیسے دینے کے بجائے بچوں کو اپنے گھر کے نیچے بنے ہوئے چھوٹے سے ہوٹل میں لے جا کر چائے، پیسٹری یا کھانا کھلا دیتے ہیں تا کہ بچوں میں بھیک مانگنے کی عادت نہ پڑے"

(4)چند سال پیشتر گجرات میں ہولناک قحط پڑا تھا۔ہزاروں لوگ بے گھر بے دیار ہو گئے تھے۔ان میں سے بہت سارے لوگ بمبئی میں روزگار کی تلاش میں آگئے تھے۔ایک روز سردار بھائی نے دیکھا کہ ان کی بالکنی کے نیچے چند مرد عورت کھڑے ہوئے سردی سے کانپ رہے ہیں۔فاقہ کشوں کی یہ کیفیت دیکھ کر شاید ان کا دل دہل گیا۔اس وقت وہ گرم جاکٹ پہن رہے تھے۔انہوں نے اس کو اتار دیا اور بکس میں سے دوسرے سوٹیر جاکٹ نکال کر ان لوگوں کو دے دیے۔انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سلام کیا اور اپنی زبان میں دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔تھوڑی دیر میں ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بالکنی کے نیچے قحط کے مارے ہوئے انسانوں کا مجمع کھڑا ہوا ہے۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے جن چار پانچ آدمیوں کو کپڑے دے دیئے تھے۔انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جا کر بتایا کہ ایک رحم دل انسان غریبوں کو گرم کپڑے بانٹ رہا ہے۔ان سے یہ بات سن کر یہ بہت سارے آدمی آئے تھے۔بڑا دردناک منظر تھا۔اس وقت گھر میں جتنے گرم کپڑے اور چھوٹی چھوٹی گرم شالیں تھیں وہ گھر والوں کے واسطے ایک ایک چھوڑ کر سردار بھائی نے سب کپڑے غریبوں کو دے دیئے۔جب یہ آدمی چلے گئے تو ان کی جگہ دوسرے ننگے بھوکوں نے لے لی جن میں بچے بھی شامل تھے۔ان کی خستہ حالی دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔گھر کے سب گرم کپڑے ختم ہو گئے تھے۔سردار بھائی نے گرانٹ روڈ بازار بھیج کر چھوٹے بڑے کپڑے منگائے اور وہ بھی تقسیم کر دیئے۔پھر سلطانہ بھابی نے سمجھایا کہ تم نے غریبوں کو کپڑے دے کر ان کی سردی سے بچایا لیکن تم ہزاروں آدمیوں کا تن نہیں ڈھک سکتے۔"

(5)"سردار بھائی کی زندگی ایسے سینکڑوں واقعات سے روشن ہے۔اگر سب لکھے جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے.....ایک مرتبہ ہمارے گھر کے قریب کی کئی بلڈنگوں میں کسی وجہ سے پانی بہت کم آتا تھا جس سے وہاں کے رہنے والوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ہماری بلڈنگ میں 24 گھنٹے پانی دستیاب تھا۔وہاں کے بہت سے لوگ ہمارے فلیٹ سے پینے اور نہانے کے لیے پانی لے جاتے تھے"۔

(6)''سردار بھائی کے ایک دوست کی لڑکی پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے اوپر کے فلیٹ میں رہتی تھی لیکن کھانا کھانے کے لیے ہمارے گھر میں آتی تھی۔اس زمانے میں ہمارے یہاں ایک نیا لڑکا کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ایک روز اس نے سردار بھائی سے کہا''صاحب!ہم آپ کے گھر میں کام نہیں کریں گے''۔انہوں نے پوچھا''کیوں؟''لڑکے نے برجستہ جواب دیا ''آپ کا گھر گھر نہیں ہے ہوٹل ہے۔کوئی آدمی کھانا کھانے کے لیے آتا ہے تو کوئی ناشتہ کر کے چلا جاتا ہے اور کچھ لوگ یہاں سے پانی بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔مجھے یہ طریقہ بالکل پسند نہیں ہے''۔سردار بھائی نے یہ سن کر خاموشی سے اس کی تنخواہ نکال کر دے دی اور اس سے کہا کہ میں تمہاری وجہ سے اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا''۔دوسرے نوکر نے الماری میں سے سونے کے بندے نکال لیے۔جب اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ ان کے پیروں پر گر پڑا اور رو رو کر کہنے لگا کہ''مجھ سے غلطی ہو گئی۔میں نے اپنی بیوی کے کہنے پر بُندے نکالے ہیں اور وہ وطن بھیج دیے صاحب مجھے معاف کر دیجئے ورنہ میری بیوی مجھے چھوڑ کر بھاگ جائے گی اور میرا گھر اجڑ جائے گا''۔واقعی سردار بھائی نے اس کا قصور معاف کر دیا۔دوسرے دن وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔گھر میں ایک دو مرتبہ اور بھی چوریاں ہوئیں لیکن انہوں نے کسی نوکر کو پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ہمیشہ یہی کہتے کہ''مفلسی انسان سے سب کچھ کراتی ہے''۔

(7)چوں کہ بمبئی ایک صنعتی شہر ہے تمام ہندوستان کے لوگ کھچ کر آتے ہیں۔یوپی اور بہار وغیرہ کے بہت سے نوجوان لڑکے روزگار کی تلاش میں آتے ہیں جن کی زندگیاں عسرت اور رفاقتوں میں گذرتی ہیں۔دو تین لڑکے ایسے آئے جن کے بارے میں چند ماہ کام کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ٹی بی کے مریض ہیں۔سردار بھائی نے ان بیمار لڑکوں کو گھر سے نہیں نکالا بلکہ ان کو اسپتال میں داخل کرا کے علاج کرایا۔دواؤں اور کھانے کے اخراجات خود برداشت کیے۔جب اچھے ہو گئے تو ان کو آفس میں چپراسی کی جگہ دلا دی۔اس طرح وہ مزدوری کی جفاکشی سے بچ گئے۔اب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں عید، دیوالی کے تہواروں پر اپنے بچوں کو لے کر یہاں آتے ہیں۔''

236

شوکت کیفی نے بھی سردار جعفری کی سخاوت اور رحمدلی پر روشنی ڈالی ہے۔

(1)''مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ جتنے بڑے ترقی پسند شاعر اور ادیب ہیں انھیں زندگی سے اتنا ہی پیار ہے۔انھیں اپنے آپ سے پیار نہیں ہوتا بلکہ پورے عالم سے پیار ہوتا ہے۔اسی لیے دوسروں کے دکھ کو بہت ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں جیسے سجاد ظہیر، پی سی جوشی، کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری، راجیشوراؤ۔سردار جعفری۔کیفی اعظمی۔کرشن چندر۔عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس۔یہ لوگ کسی دوسرے کی تکلیف کو اتنی شدّت سے محسوس کرتے ہیں، تب ہی تو سوشلزم لانا چاہتے ہیں اور اتنے اچھے شاعر ہیں یہی حال سردار بھائی کا ہے۔کچھ پھل خرید کر لا رہے ہیں۔نیچے پھٹے پرانے کپڑے پہنے غریب بچے للچائی ہوئی نظروں سے پھلوں کو دیکھ رہے ہیں۔تقریباً سارے پھل بانٹ دیں گے۔ایک دو پھل لائیں گے اپنے لیے یا اپنے گھر کے لیے۔کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگیں گے، لیکن جب کسی دوسرے کو ضرورت ہوگی تو سب دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اور اپنی طرف سے بھی جتنا بن پڑے گا مدد کریں گے.....''

(2)''.....اندھیری کمیون میں ہمارا اور سردار بھائی کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا۔وہاں مجھے سردار بھائی کو اور قریب سے

دیکھنے کا موقع ملا۔انتہائی سادہ مزاج، رحمدل، زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتے ..... کچھ مہینوں بعد وہ کمرہ بھی چھن گیا..... کیفی بھی ریڈ فلیگ ہال میں منتقل ہو گئے تھے کیوں کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا کمیون تھا۔وہاں آٹھ سال ہم نے گزارے اور وہیں مجھے سردار بھائی کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ان کی انسان دوستی، ہمدردی، سادگی نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا..... کمرے کے اندر کھانا پکانے کے تصور سے مرادم گھٹنے لگتا تھا اور مجھے رونا آجاتا تھا، سردار بھائی کو اس کا احساس ہوا۔انہوں نے بڑے پیار سے کہا کہ تم اپنا کھانا مرے کمرے کے پچھلے حصّے میں پکا لو..... تشکر کے جذبے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور ایک بار مجھے محسوس ہوا کہ اس دنیا میں ایسا انسان بھی ہے جو لوگوں کی تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے اور انھیں اپنی حد تک دور کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔.....ایک دن سلطانہ آپا کا سونے کا..... منگل سوتر چوری ہو گیا۔اس وقت ہمارے پاس ایک بہت ہی چور قسم کا آدمی، جس کا نام انتون تھا، نوکر تھا۔میرا اور سلطانہ آپا کا خیال تھا کہ منگل سوتر اسی نے چرایا ہے۔چنانچہ اسے پولیس میں دیا گیا۔وہاں پولیس نے اس نار چہ کیا، لیکن اس نے کہا کہ اس نے نہیں چرایا ہے (شاید نہ ہی چرایا ہو)۔پولیس اسے سردار بھائی کے پاس لے آئی۔اس نے رو کر کہا "صاحب میں نے نہیں چرایا۔مجھے چھوڑ دیجئے" اور اس نے اپنے بال دکھائے کہ پولیس کس طرح بید ردی سے اس کے بال نوچتی اور مارتی رہی ہے۔بس سردار بھائی کانپ گئے۔اس وقت تو اسے کسی طرح بھیج دیا لیکن کام نہیں کر سکے۔رات بھر ٹہلتے رہے۔پھر سلطانہ آپا سے گھبرا کر کہا "سلطانہ خدا کے لیے اُسے چھوڑ دو میں لکھ نہیں سکتا۔جیسے ہی قلم اٹھاتا ہوں انتون اپنے بال لیے میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے"۔سلطانہ آپا نے دوسرے ہی دن جا کر اسے چھڑا دیا۔"

237

علی سردار جعفری نے تہی دست زندگی کا سفر طے کیا اُس میں بھی وہ دوستوں اور شناساؤں کی تکلیف نہ دیکھ سکے اور ان کی حتی المقدور خاموش مدد کرتے رہے۔

یوسف ناظم نے بتایا۔

"فون کی گھنٹی بجتی تو جعفری صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر فون تک جاتے اور اس وقت تک کھڑے رہ کر گفتگو کرتے جب تک کہ فون پر ان کا مخاطب بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتا۔جعفری صاحب فون پر بھی "گفتگو بند نہ ہو" کا خاموش پیغام دینے کے عادی تھے۔کئی سال بعد جب ان کی استطاعت نے انہیں اجازت دی تو انہوں نے ایک دستی فون خرید لیا اور گھر میں ان کی چہل قدمی میں کچھ افاقہ ہوا، ورنہ کھڑے رہ کر فون پر یکطرفہ مذاکروں نے انہیں خاصہ تھکا دیا تھا.....وہ اپنے دوست تو دوست کسی شناسا کی بھی تکلیف کی خبر سن کر بے چین ہو جاتے اپنی تہی دستی کے باوجود اپنے وسائل سے کوئی نہ کوئی صورت نکال کر اس کی مدد کرتے اور اس بات کی احتیاط کرتے کہ ان کے دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہو اور شاید یہی وجہ تھی کہ جعفری صاحب کو قریب سے جاننے والے ان ہاتھوں کی تعظیم کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔" 238

علالت و ضعیفی میں بھی سردار جعفری دوسرے کے لیے زحمت اٹھانے تیار رہتے۔

رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

"جلسے کے اختتام پر جب میں ان سے (سردار جعفری) سے ملنے گئی تو دیکھتے ہی فوراً بولے تمہاری کتابیں مل گئیں اور ان

میں سے ایک کتاب جو تم نے کرشن چندر پر لکھی ہے میں نے خاص طور پر کل ہی پڑھ ڈالی۔اچھا لکھا ہے میں نے کہا.....اس سلسلہ میں میں آپ کو عنقریب زحمت دوں گی۔اس کتاب کا اجراء آپ ہی اپنے دست مبارک سے فرمائیں گے۔کہنے لگے''ہا ں ضرور آوں گا''۔ایک آدھ ہفتے بعد بھی وہ میری کتاب کے اجراء جلسے میں تشریف لائے۔کافی دیر سے پہنچے۔جلسہ شروع ہو چکا تھا۔چل نہیں پا رہے تھے۔میں نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔میرا سہارا لے کر وہ اپنی نشست کی طرف بڑھنے لگے۔میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔بچپن میں باپ اپنی اولاد کی انگلی پکڑتا ہے لیکن آج مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے باپ اپنی بیٹی کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہو۔ان کا سارا بدن ضعف سے تھرتھرا رہا تھا۔دل دہل دہل سا گیا۔ایک عجیب سا روح فرسا احساس رگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔میرے اللہ ! اُردو کا یہ قطب مینار اب زمین بوس ہونے کے قریب ہے۔خدایا اسے یوں ہی ایستادہ رکھنا.....میرے اُردو ترجمے سلام کا مطالعہ کرتے رہے۔بعض نظموں کو خاص طور پر انگلی رکھ کر مجھ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فر ماتے رہے.....''

ساتھیوں کی دکھ بیماری میں سردار جعفری کے جی جان سے ساتھ دینے کے متعلق پروفیسر شبنم عابدی نے بتایا:

''.....آج سے تین سال پہلے جب مجھ پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی۔میرے شوہر حسن اختر عابدی کو اچانک یکے بعد دیگرے دل کے دو شدید دورے پڑے اور پھر چند لمحوں کے لیے دھڑکنیں معدوم سی ہوگئیں۔سانسوں کا سلسلہ منقطع سا ہوگیا۔ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔زندگی کی تیقن کی مدت صرف چوبیس گھنٹے قرار دی گئی۔میرے تو ہوش وحواس جاتے رہے۔مگر مخلصین نے دعائیں مانگیں،تسلیاں دیں غم گساری کی۔ذاتی طور پر آکر بھی اور فون پر بھی۔ان میں سے تین فون ایسے تھے جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔سب سے پہلا فون علی رضا صاحب کا تھا کہ''بی بی فکر مت کیجئے۔آپ جیسا کہیں، میں مدد کو حاضر ہوں''پھر جاوید اختر صاحب کا فون آیا''آپ بالکل نہ گھبرائیں،جس اسپتال میں کہیں،ان کے علاج کا انتظام ہو جائے گا''خلوص،ہم دردی،غم گساری اور انسانیت سے بھرپور ان دونوں کے بعد تیسرا فون جعفری صاحب کا تھا''رفیعہ میں نے ڈاکٹر کویل سے appointment لے لیا ہے''اور اس کے بعد سارا کام یوں منٹوں میں ہوگیا کہ پتہ نہ چلا۔ڈاکٹر بی کے کویل جو صدر جمہوریہ، وزیر اعظم ہند اور گورنر آف مہاراشٹرا کے معالج تھے اور جن سے appointment ملنے ہی میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔جب میں ان کے کلینک پہ پہنچی تو محسوس ہوا گویا وہ ہمارے ہی منتظر بیٹھے تھے۔فوراً ان کا معائنہ کیا۔ اسپتال کے کمرے میں پہنچوانے کا انتظام کیا۔دوسرے ہی دن ان کا آپریشن ہوا۔جعفری صاحب بہ نفس نفیس خود ان کی عیادت کو اسپتال تشریف لائے۔جب کہ ان دنوں وہ خود بھی بیمار تھے۔ضعف کا عالم تھا۔عصا کے سہارے چل رہے تھے۔ مگر پھر بھی''اُن''کے پاس دو گھنٹے بیٹھے رہے۔اپنی تازہ ترین نظم سنائی جو غالباً جعفری صاحب کی آخری نظم تھی جس میں انہوں نے فلسفیانہ انداز میں انسانی تاریخ قلم بند کی ہے۔ادھر اُدھر کی باتیں اور دلچسپ لطیفے سنا کر ان کا دل بہلاتے رہے۔جاتے وقت جعفری صاحب نے ان کے سر پر ایک شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو''ان''کا دل بھر آیا۔لیٹے لیٹے بولے''جعفری صاحب! آپ نے میرے سر پر ہاتھ کیا رکھا مجھے ایسا لگا جیسے میرا مرحوم باپ مجھ سے ملنے آیا ہو''جعفری صاحب نے ایک بار پھر بڑے پیار سے''ان''کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔کچھ بولے نہیں۔ہولے سے تھپتھپا کر باہر نکل آئے لیکن میں

نے دیکھا کہ جعفری صاحب کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی تیر رہی تھی جسے وہ اپنے رومال میں جذب کرنے لگے۔شاید انھیں بھی اپنے دور افتادہ بیٹے یاد آ گئے تھے۔بہر حال میرے لیے وہ لمحے بڑے قیمتی تھے۔میں انھیں آج تک فراموش نہیں کر پائی۔ آج بھی میں سوچتی ہوں کاش وہ موتی میرے دامن میں گرے ہوتے تو میں انھیں عمر بھر دل کی ڈبیا میں سنبھال کر رکھتی۔''239

سردار جعفری کے گھر والوں، دوست احباب اور ان کے افراد خاندان میں کوئی بھی بیمار ہو جاتا تو سردار جعفری اس کے علاج معالجے، تیمارداری اور گھر کے لوگوں کا ہر طرح خیال رکھتے۔

رباب جعفری رقمطراز ہیں:

''سردار بھائی کے دوستوں یا گھر کے لوگوں میں کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو پھر سب کام ایک طرف عیادت سے لے کر مریض کو اسپتال میں داخلے کی ذمہ داری ان کی ہے۔'' 240

یوسف ناظم کے مطابق :

''ان کے (سردار جعفری) دوست عالم خوندمیری جب بیمار ہوئے جعفری صاحب نے یہ علالت اپنے سر لے لی۔''241

ضرورت مند کی امداد میں سردار جعفری رازداری برتا کرتے:

بقول سلمی صدیقی:

''سردار جعفری ضرورت مند کی امداد میں نہایت رازداری برتتے تھے۔''

سردار جعفری کے معالج ان کے قدرداں:

رباب جعفری کے مطابق:

(۱)''سردار جعفری کے معالج ہندوستان کے مشہور ماہر قلب ڈاکٹر موثق الدین صاحب تھے۔''

(۲)بمبئی کے بڑے بڑے ڈاکٹر سردار بھائی سے فیس نہیں لیتے اور علاج بڑی توجہ کے ساتھ کرتے ہیں۔یہ ڈاکٹر بہت مصروف رہتے ہیں لیکن ان کے بلانے پر چاہے دن ہو یا رات کبھی انکار نہیں کرتے۔ایک ڈاکٹر نے فیس لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جعفری صاحب آپ اپنے ادب کے ذریعے ہمیں پہلے ہی فیس دے چکے ہیں.....''242

دوسروں کی ہتک، غیبت، انتقام اور نقصان پہنچانے کے

مذموم جذبات سے پاک دل:

سردار جعفری خوش اخلاق، انصاف پسند آدمی تھے۔رباب جعفری نے سردار جعفری کی سیرت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ مذموم جذبات سے پاک تھے۔

''.....ان کے (سردار جعفری) کے سامنے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں ہتک آمیز باتیں کرتا ہے تو یہ گفتگو کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔اس کو اسی جگہ روکتے ہیں۔چوں کہ خود انصاف پسند، فراخ دل، خوش اخلاق، خوش گفتار اور شائستہ کلام انسان ہیں، سبب سے بے جا باتوں پر اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔اپنے اصولوں پر

سختی سے پابند ہیں۔"

243

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے مطابق:

"ان کے (سردار جعفری) مزاج کا ایک اور پہلو جو نا چیز (ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی) نے دیکھا ہے اور خود ان کی مرحوم بہن رباب جعفری بھی اس کی قائل تھیں، وہ یہ کہ ان کے سامنے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں ہتک آمیز بات کرتا ہے تو یہ اس گفتگو کو بالکل برداشت نہیں کرتے اور اس کو اُسی جگہ روک دیتے ہیں اور اس کی صفائی میں بولنے لگتے ہیں۔" 244

بھید بھاؤ، علمی و ادبی تعصب سے کوسوں دور:

تعصب سے پاک شخصیت سردار جعفری کے بارے میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

"اپنے نظریات پر شدت سے قائم رہے اور ادب میں ہو کہ زندگی میں انہوں نے (سردار جعفری) کبھی بھید بھاؤ اور علمی و ادبی تعصب سے کام نہیں لیا۔" 245

اسٹیج اور مائیکروفون کی کبھی ہوس نہ کی:

جن لوگوں میں خلوص ہوتا ہے ان میں شہرت کی حرص و ہوس نہیں ہوتی ترسیل کے جو بھی مواقع اور سہولتیں انھیں نصیب ہوتی ہیں انہیں سے وہ اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے۔

"یوسف ناظم ان کی (سردار جعفری) کی متحرک شخصیت کے کے مداح ہیں اور انھیں متوازن مزاج کہہ کے پکارتے ہیں جس نے اسٹیج پر چڑھنے اور مائیکروفون کی طرف دوڑنے کی کبھی ہوس نہیں کی۔" 246

سیماب صفت لیکن متوازن، متحرک، فعال منضبط اور فیض رساں:

یوسف ناظم نے لکھا ہے:

"ایک تعزیتی جلسے میں، میں نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے کوہ نور ہیرا کھو دیا ہے بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ علی سردار جعفری جیسی سیماب صفت لیکن متوازن متحرک اور فعال لیکن منضبط اور فیض رساں شخصیت کو ایک بے جان، بے روح اور بے فیض چیز سے خواہ وہ ہیرا ہی کیوں نہ ہو تشبیہ دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔" 247

ذہن صاف، منزل متعین اور فکر انسان دوستی کی ترجمان:

محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

"علی سردار جعفری کی ساری زندگی آزادیٔ موہوم کو حقیقی آزادی میں تبدیل کرنے کی خواہش میں گزری وہ عوام دوست تھے اور دنیا بھر کے محنت کشوں کے ساتھی۔ وہ ہم سب کے لیے اسی بنا، پر قابل احترام رہے اور ہیں۔ انہوں نے برصغیر میں روشن خیالی کی تحریک کے لیے نہ صرف بحیثیت شاعر بلکہ مفکر، محقق، شارح اور مترجم کی حیثیتوں میں جو کام کیا اور بطور صحافی جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کیا وہ صرف اسی شخص کا حصہ ہو سکتا ہے جس کا ذہن صاف، منزل متعین اور فکر انسان دوستی کی ترجمان ہو۔" 248

زندگی سے محبت:

سمرتھ بالی کے مطابق:

''سردار بھائی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔'' 249

بقول یوسف ناظم سردار جعفری ہر حال میں پُرمسرت زندگی گزارتے۔

''جعفری صاحب نے رنگ و رامش میں نہائے اور نو دمیدہ کلیوں کی خوشبوؤں میں بسے اشعار اس وقت کہے تھے جب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی سرگرمیوں کا تاوان ادا کرتے تھے۔ان کی عصری حسیت نے انہیں وہاں پہنچایا تھا لیکن اس اسیری نے ان کے محسوسات میں برقی یوں پیدا کردی کہ عصری حسیت کے علاوہ ان کی بصری حسیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا.....ان اشعار میں رچی اور سجی امیجری نے میں کہہ سکتا ہوں کہ جیل کی آہنی سلاخوں کو پھولوں کی لڑیوں میں بدل دیا ہوگا اور شاعری کے مزاج کی نرمی زندانی ہواؤں میں سرایت کرگئی ہوگی۔شاعر کو اپنی زندگی کے ہر لمحے اور ہر ثانیہ کو پرمسرت بنانے کا ہوشربا فن آتا ہے۔'' 250

ڈاکٹر نریش نے بتایا:

''سردار جعفری کو زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔تگ و دو تو انسانی زندگی کا جزو ہے۔وہ تو ہر کسی کو ہی کرنا پڑتی ہے۔سردار کو بھی کرنا پڑی لیکن سلطانہ بھابی جیسی رفیقۂ حیات سعادت مند بیٹے، محبت کرنے والی بیٹی، متعدد یار دوست، بے شمار چاہنے والے، اقتدار کی گلیوں تک رسائی، دیس بدیس کا سفر مسلسل، جن معدودے چند کو نصیب ہوتا ہے۔سرداران میں سے ایک تھے''۔ 251

سچائی اور حق کی آواز:

سید عاشور کاظمی رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے ساری زندگی سچائی کے لیے وقف کی ہے۔ہمیشہ حق کی آواز بلند کی ہے۔'' 252

پرفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے مطابق:

''ان (سردار جعفری) کے اندر ایک حساس، دردمند اور ہر صورت میں ایک سچا فطری ردعمل رکھنے والا انسان ہے۔'' 253

اصول پرست، مصلحت سے دور، ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والی شخصیت:

سردار جعفری نے زندگی کی بے ثباتی اور عارضی آسائشوں کی حقیقت کو پہچان لیا اس لیے انہوں نے آسائشوں کو ٹھکرا دیا اور ضمیر کی آواز کو لبیک کہا۔

راشد انور راشد لکھتے ہیں:

''زندگی کے ابتدائی سفر سے آخری وقت تک سردار جعفری کی زندگی دھوپ چھاؤں اور اتار چڑھاؤ سے مسلسل دوچار ہی

۔انہوں نے اصول کی خاطر زندگی کی تمام تر آسائیش ٹھکرا دیں، مصلحت پسند دنیا سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔'' 254

دوسروں کو جینے کا حوصلہ عطا کرنے والا:

انسان دوست ہمیشہ دوسروں کے غم میں شریک رہتا ہے انھیں حوصلہ دیتا ہے رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے۔

''وہ وجود (سردار جعفری) جو کتنے دلوں کو جینے کا حوصلہ عطا کرتا''۔ 255

جاہ و مرتبہ کے خیال کے بغیر انسان کا قدرداں:

انسان کی تعظیم کرنے والا عظیم ہوتا ہے رتبہ، جاہ و منزلت نصیب سے ملتے ہیں جو عارضی ہوتے ہیں۔

سلمی صدیقی نے لکھا ہے۔

''وہ (سردار جعفری) انسان کی قدر کرتے تھے۔اس کے رتبے یا جاہ و منزلت کی نہیں۔'' 256

عظمت انسانی کے علمبرداروں کے لیے نشان راہ:

سید عاشور کاظمی نے کس بہتر انداز میں سردار جعفری کے لیے compliment دیا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

''سردار جعفری نے قلم کی حرمت اور قلم کی عظمت کا لوہا منوالیا ہے۔ یہ سادہ سا انسان جس کی پیشانی پر اس کے نا قابل تسخیر عزم کی لکیریں ہیں، جس کے چہرے کی شکنوں پر دنیا بھر کے مظلوموں کی داستانیں لکھی ہیں، جس کے سپید و سیاہ بال ظلم کے اندھیروں میں صبح آزادی کی علامت ہیں، ایسے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کے لیے نشان راہ ہے جو انسانیت کی عظمت کا سفید پرچم بارود کے ڈھیر پر کھڑی کائنات پر لہرانا چاہتے ہیں۔'' 257

انسانی اقدار کو فروغ دینے والا بڑا شاعر:

سردار جعفری نہ صرف انسانی اقدار کے قدرداں تھے بلکہ انھیں فروغ دینے والوں میں سے ایک تھے۔

ڈاکٹر تاراچن رستوگی کے مطابق۔

''سردار جعفری ایک انجمن ہیں ایک تحریک ہیں انسانی اقدار کو فروغ دینے والے بڑے شاعر اور بڑے نقاد ہیں۔'' 258

جدیدیت کے شعرا و ادباء کی آزادی کے بخوشی قائل:

سردار جعفری زندگی بھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن وہ جدیدیت کے شعرا و ادباء کی آزادی کے بخوشی قائل تھے۔ بشیر احمد انصاری نے سردار جعفری کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے جس میں سردار جعفری نے کہا کہ ہر کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے علمی ذوق و صلاحیت کے مطابق شعری تجربے کرے اور یہ کہ جدید شعراء بھی نئے آہنگ اور نئی فکر کے مطابق تجربے کریں۔

بشیر احمد انصاری رقمطراز ہیں۔

''جعفری صاحب کسی کی تضحیک گوارا نہیں کرتے تھے۔ عالمانہ بحث میں دلائل اور اعلیٰ تہذیبی روایات کو برقرار رکھتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مجلس میں یا پارٹی یا جلسہ میں ان کی وجہ سے تنازعہ پیدا ہوا ہو۔ اصولی بحث ضرور ہوتی تھی اور متنازعہ

مسئلوں کو سلجھانے میں اپنی جچی تلی رائے دیتے تھے۔ مالیگاؤں کے ایک جلسے میں ترقی پسندوں نے ان سے کہا۔ ''دیکھئے! آج کل جدیدیے بہت شور مچا رہے ہیں۔ آج جلسے میں ان کی گوشمالی ہو یا ان کو نصیحت دی جائے تو بہتر ہوگا'' جعفری صاحب مسکرا کر رہ گئے۔ اپنی تقریر میں ترقی پسندی سے جدیدیت تک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر کسی کو حق ہے کہ اپنے علم، مذاق، ذوق اور صلاحیت کے مطابق شعری تجربے کرے۔ ترقی پسندوں نے ایک نظریے کے تحت مختلف تجربے کیے، کہیں کامیاب ہوئے کہیں نہیں ہوئے۔ ان کے فن اور تجربے سے انکار کرنا انصاف نہیں۔ جدید شعراء بھی نئے آہنگ اور نئی فکر کے مطابق ضرور تجربے کریں، البتہ ترقی پسندوں کو نظر انداز کرنے پہلے کچھ شاہکار چیزیں، ایک آدھ مجاز، کوئی فیض، مخدوم، جذبی یا جاں نثار پیدا کرلیں تو ان کی بات یا تنقید جاندار ہو جائے گی اور ان کے تجربوں کو بھی سند مل جائے گی''۔ دیکھئے یہ سلیقہ تھا ان کی گفتگو کا۔ اس میں نہ چڑ چڑا پن تھا نہ کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش۔''259

کثیر الجہات شخصیت:

سردار جعفری ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ مختلف ادیبوں نے ان کی شخصیت کے پہلوؤں کا ذکر کیا ہے:

پروفیسر شارب ردولی نے سردار جعفری کی شخصیت کو پہلو دار شخصیت قرار دیتے ہوئے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی۔

''سردار جعفری کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ آج اُردو میں ایسی پہلو دار شخصیت رکھنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ وہ شاعری بھی تھے، ناقد بھی۔ نظریہ ساز بھی تھے عملی سیاست داں بھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک کے علمبردار بھی تھے اور ادبی صحافی بھی۔ فلم ساز بھی تھے، خطیب بھی مارکسٹ بھی تھے اور مذہب کی اعلیٰ قدروں کو ماننے والے بھی۔ ان کے یہاں متضاد پہلوؤں نے ایک خوش آہنگ اور دلکش صورت اختیار کرلی تھی۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر احتشام حسین کے بعد اگر کسی کو نظریہ ساز قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ سردار جعفری ہیں۔'' 260

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے بھی سردار جعفری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔

''سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ ایک شفیق باپ، ایک ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر، ایک محترم و مشفق بھائی، ایک بے بدل خطیب ایک شاعر آتش نوا، ایک صاحب نظر نقاد، ایک ذی فہم ادیب، اپنے ہمعصروں کا ایک حریف شریف، اپنی پارٹی کا ایک سرگرم اور وفادار رکن اشتراکیت کا شیدائی، پُرامن انقلابی، انسان دوستی کا حامی، عالمی امن کا پیغامبر اور ایک بالغ نظر مفکر غرض یہ کہ ان کا ذہنی سفر کئی جہتوں اور کئی ابعاد میں بٹا ہوا ہے۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے؟ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی، ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری!!'' 261

محمد علی صدیقی نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک انشا پرداز، خطیب، صحافی، محقق اور دستاویزی فلموں کے کامیاب فلم ساز اور ہدایت کار بھی ہیں۔ وہ اُردو دنیا کے معدودے چند اہم اقبال شناسوں میں ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے قومی شاعر کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلہ میں نہایت والہانہ انداز میں ہندوستان کے دانشوروں اور صوبائی و مرکزی حکومتوں کی توجہ

مبذول کرواتی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب و کامران رہے۔ان کی مساعی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔'' 262

ڈاکٹر سلطان احمد قمطراز ہیں:

''سردار جعفری کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔نقاد بھی تھے اور خطیب بھی، مفکر بھی تھے اور دانشور بھی، صحافی بھی تھے اور فلم ساز بھی، اشتراکیت کے علمبردار بھی تھے اور امن عالم کے پیغامبر بھی، ان اوصاف کے علاوہ، وہ ایک مثالی شوہر، ایک مہربان بھائی، ایک شفیق باپ اور ایک بے لوث دوست تھے۔غرض یہ کہ ان کا ذہنی، فکری، علمی او رعملی سفر متعدد جہات ارمنفرد ابعاد پر محیط ہے۔'' 263

بقول ڈاکٹر وحید اختر:

''سردار جعفری شاعری کی حیثیت سے خوابوں کی دنیا کے باسی ہیں، وہ خواب دیکھتے ہی نہیں، تخلیق بھی کرتے ہیں۔ایک باشعور فرد کی حیثیت سے وہ خوابوں کے دھندلکے سے اُتر کر حقیقت کی سنگلاخ زمین پر تعبیر کے صحراؤں میں آبلہ پا سرگرداں بھی رہتے ہیں، مگر خوابوں کو آنکھوں میں بسائے ہوئے۔وہ خواب دیکھنے والے شاعر ہی نہیں بلکہ حیات و کائنات کے ناظر بھی ہیں اور اپنے عہد کے نباض بھی۔ان کی شخصیت میں کئی شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔مخدوم نے ''بساطِ رقص'' کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ شاعر ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔سردار جعفری شاعر ہی نہیں بلکہ ناقد بھی ہیں اور نظریہ ساز بھی۔۔۔سردار جعفری نے ایک عمر میں کئی عمریں ہی نہیں گزاریں بلکہ ہر عمر میں مختلف سطحوں پر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن اسی کے ساتھ ادب کے اچھے ناقد بھی ہیں۔بے مثال مقرر بھی ہیں۔کلاسیکی ادب کے شارح بھی، سیاسی رہنما بھی اور ادبی نظریہ ساز بھی۔'' 264

بشیر احمد انصاری لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ سرداری جعفری نے ایک زندگی میں کئی زندگیاں جی لی ہیں۔ترقی پسند ادیب، تحریک کا ترجمان، عالمی امن کے استحکام کا جری سپاہی، شاعر، مساوات کا علمبردار، جرنلسٹ، عوامی نمائندہ، شارح اقبال، انسانیت کا بین الاقوامی مندوب، محنت کشوں کی آواز، مستقبل کے خوش آئند تصورات کا نقیب، غرض ہر زندگی میں ان کا انسانی پیکر تر شاہوا نظر آتا ہے۔'' 265

انیس چشتی کے مطابق:

''سردار جعفری اچھے دانشور، محنتی محقق، اچھے مدیر، عمدہ شاعر اُردو کے مبلغ اور صاحب نظر و نظر یہ ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے اور رواں دواں انسان تھے۔'' 266

حبیب الرحمٰن چغانی نے لکھا ہے:

''وہ شخص جو گفتار کا غازی ہو جس کی تقریر دلوں کی موہ لے۔۔۔ایک شاعر، مصنف، مؤلف، مرتب، مترجم، خطیب، محقق، ناقد، مفکر، دانشور، صحافی، سیاست داں، مجاہد آزادی، امن و آشتی کا پیامبر۔۔۔وہ شعلہ جاں وہ عشق مجسم اُمید فردا۔۔۔'' 267

پروفیسر عبدالستار دلوی کے مطابق:

''ان کی (علی سردار جعفری) کی شخصیت پہلو دار شخصیت تھی ۔۔۔سردار جعفری ایک مرنجان مرنج شخصیت کا نام۔'' 268

(ابتدائیہ ۔علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 43)

رفعت سروش نے لکھا ہے:

''حیدرآباد کانفرنس کے رپورتاژ ''پودے'' میں کرشن چندر نے سردار کی بابت بالکل صحیح لکھا ہے کہ سردار اپنے چہرے سے ہنسیا اور ہتھوڑا معلوم ہوتے ہیں اور ان سے بات کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی تحریک سے مل رہے ہیں''۔۔۔ 287

اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک تحریک، ایک کارواں:

رفعت سروش رقمطراز ہیں:

''۔۔۔آہستہ آہستہ مجھ پر کھلا کہ بہ ظاہر نوجوان نظر آنے والا سردار اپنی ذات سے ایک انجمن ہے۔عام گفتگو میں عالمانہ شان، خطیبانہ انداز، بحث و مباحثہ کا عادی اور مدّ مقابل کو قائل کرنے میں ماہر اور وقت گنوانا تو شاید سردار نے سیکھا ہی نہیں، جب دیکھئے اپنی میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، یا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں، یا کسی اہم مسئلہ کے حل کی تلاش میں منہمک ہیں ۔۔۔سردار جعفری ''نیا زمانہ'' کے علاوہ ''نیا روپ'' کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے اور پیلز پبلی کیشن ہاوس کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔رجنی پام دت کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔۔۔ان صحافتی اور تالیفی ذمہ داریوں کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی کاروائیوں میں بھی وہ پیش پیش تھے ۔۔۔وہ تو اس نوجوانی میں بھی ترقی پسند کی مشین کا ایک ایسا متحرک پہیہ تھے جس کے گھومنے پر دوسرے چھوٹے چھوٹے پہیے حرکت میں آتے ہیں۔وہ غم دوراں کے حق میں اپنی ذاتی زندگی کی دلچسپیوں سے بھی تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے ۔۔۔سردار کی ہمہ جہت شخصیت نے اپنے آپ کو کسی ایک میدان تک محدود نہیں کیا۔یہ چشمہ تخلیق بہ یک وقت کئی سمتوں سے ہی بہتا رہا۔'' 269

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے بھی لکھا ہے:

''سردار جعفری صرف ایک شاعر یا محض ایک ادیب کا نام نہیں ہے۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک اور ایک کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں اُردو ادب کی تاریخ اور ہندوستان کی کلچر ہسٹری میں ان کا نام بہت نمایاں طور پر محفوظ ہو گیا ہے۔'' 270

سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں:

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کہتے ہیں:

''سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں کچھ اس طرح کی وہ صدی کی پہچان اور صدی ان کی پہچان کا حوالہ بن جاتی ہے۔وہ پوری صدی پر چھائے رہے۔سرگرم رہے زندگی کے آخری لمحے تک فکرمند، سرگرم، متکلم، بے پناہ کام، بے پناہ مصروف، بے پناہ سفر لیکن وہ خوش رہتے اور مسکراتے رہتے۔اپنے ہی دوستوں سے گلے شکوے لعن طعن ہوتی وہ مسکراتے

رہتے ۔اکثر گھریلو قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے وہ مسکراتے رہتے کہ مسکراہٹ ان کی دلنواز شخصیت کا حصہ بن گئی۔'' 271

ایک عہد کے امین:

حمایت علی شاعر کہتے ہیں:

''سردار جعفری ادبی و علمی اعتبار سے بھی ایک عہد کے امین تھے۔'' 272

تاریخی شخصیت:

پروفیسر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

''تخلیق وتنقید، تقریر وتصویر، جلال و جمال، شعلہ وشبنم، غرض یہ کہ ہر طرح کے جذبات سے معمور سردار جعفری کی شخصیت اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔ایک داستان اور ایک دبستان ۔ایسی تاریخی شخصیت جس کا غم منایا جانا ایک فرد کا نہیں بلکہ اسّی سالہ تاریخ وتہذیب سیکولرزم اور سوشلزم کا غم منایا جانا ہے۔'' 273

البیلا پن، دلنوازی اور کشش:

بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

''علی سردار جعفری البیلے انسان تھے ۔ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی دلنوازی اور کشش تھی جو اُن کی مقبولیت میں اضافے کا باعث تھی۔'' 274

تاریخی شعور کا زندہ استعارہ:

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے مطابق:

''ادب میں ان کی شخصیت تاریخی شعور کا ایک زندہ استعارہ بن کر اُبھر آئی ہے۔۔۔ان کا تاریخی شعور کم سنی ہی میں بیدار ہوگیا تھا۔۔۔ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ انسانی سماج کی یا کسی مخصوص علاقے کی یا کسی مخصوص دور یا ادوار کی تاریخ سلسلہ وار بیان کر دی جائے بلکہ مختلف سماجی حقائق کی صحیح تفہیم اور زماں و مکاں کے اعتبار سے ان کا بیان او راظہار اصل تاریخی شعور ہے۔اسی تاریخی شعور نے سردار جعفری کو انسان دوستی کا جذبہ عطا کیا ہے۔''

معطر رکھنے والا پھول:

''ان کی (سردار جعفری) ذات ایک ایسا ہی پھول تھی جو پوری طرح کھل چکا تھا اور جس کی مہک چار دشاؤں کو نصف صدی سے مسلسل معطر رکھے ہوئے تھی۔'' 275

سمندر صفت شخصیت:

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:۔

''کچھ شخصیتیں کسی سمندر کی طرح ہوتی ہیں، وسیع وعریض، کراں تا کراں شانت، خاموش، چپ چپ، پرسکون، ٹھہری

ٹھری، سنبھلی سنبھلی، بلند ظرف، گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے۔اندر، صف بہ صف موجیں، تلاطم، سیکڑوں گہرہائے آبدار کا خزینہ، سینے پر کئی سفینوں کا بوجھ، اور ساحل پر روشنیوں اور مسرتوں کی ایک دنیا آباد!! کہ جہاں پہنچ کر واپس لوٹنے کو جی نہ کرے۔ زندگی کی چہل پہل، ہما ہمی، رونق، علم وحیا، سنجیدگی، وقار اور متانت۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

کچھ ایسی ہی شخصیت ہے سردار جعفری کی !! بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سردار جعفری کسی شخصیت کا نام نہیں۔ایک عہد کا نام ہے۔ایک نظریہ کا نام ہے۔ایک ازم کا نام ہے۔وہ ایک شعلے کا نام ہے۔انقلاب کی ایک قاتل ادا کا نام ہے۔خنجروں کی چمک کے مقابل بلند ہونے والے نعرۂ پرجوش کا نام ہے۔ایک پرچم ہے اور اشک کا ایک موتی ہے جو درد کے نیلے رخساروں پر پھیلا ہوا ہے۔یا خون ناحق کی ایک بوند ہے جو سفاک تلوار کی دھار پر چمک رہی ہے۔وہ بھوکے اور پیاسے ہونٹوں کا تبسم ہے جس کے آگے استبداد پانی پانی ہو جاتا ہے۔سردار جعفری اس تحریک کا نام ہے جو بیسویں صدی کے چوتھے دہے کے آغاز میں چکن دوزوں کے شہر لکھنو سے شروع ہوئی اور بنکروں کی بستی بھیونڈی کی تنگ گلیوں تک جس کی گونج سنائی دی۔اس روشنی کا نام ہے جو بلرام پور کے کھیتوں کھلیانوں سے نکل کر بمبئی کی شاہراہوں میں پھیل گئی۔۔۔غرض یہ کہ ایک سفر ہے جو کراں تا کراں پھیلا ہوا ہے۔"

276

تشبیہات میں شخصیت کی عکاسی:

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں:

1۔"سردار جعفری کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔بدلتے موسموں کا ہر وار سہتی ہوئی، ہر رُت میں تر و تازہ، سرسبز و شاداب، زندہ و تابندہ، ساتھ اور پاس کے درختوں کی سازشوں سے بے نیاز، آندھیوں اور طوفان کی عیاریوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ مطمئن، مستحکم گرد و غبار اور خس و خاشاک کی گستاخیوں پر خنداں و تبسم فشاں اور ننھے پرندوں کی شرارتوں اور بوڑھے حشرات الارض کی خباثتوں سے محفوظ و شاداں!!۔۔۔"

2۔"ماہ اگست کے ابتدائی دنوں میں جب جعفری صاحب کی یاد میں لوگ جہاں جمع ہوئے تو ایک تعزیتی مجلس میں، میں نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے ایک کوہ نور ہیرا کھو دیا ہے۔بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ علی سردار جعفری جیسی سیماب صفت لیکن متوازن، متحرک اور فعال لیکن منضبط اور فیض رساں شخصیت کو ایک بے جان، بے روح اور بے فیض چیز سے خواہ وہ ہیرا ہی کیوں نہ ہو، تشبیہ دینا، کتنی بڑی غلطی ہے۔علی سردار جعفری بلاشبہ، بیسویں صدی میں دیومالائی حیثیت کے ادیب، شاعر اور دانشور تھے۔"

3۔پورے ہندوستان میں جعفری صاحب کی خطیبانہ، شاعرانہ، ناقدانہ، صلاحیتوں کی شہرت کے ساتھ ایک شہرت یہ بھی تھی کہ جعفری صاحب وعدہ ایفا کرنے میں نپولین بوناپارٹ ہیں اور محفلوں مجلسوں کے ٹیپو سلطان۔ہزیمت نام کی کوئی ناقص چیز ان کے سامنے نہیں آتی۔۔۔"

4۔"ان کی (سردار جعفری) شخصیت کے سارے پہلوؤں کو سمیٹنا ایسا ہی ہے جیسے چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی پتیوں کو جمع کرنا۔ یہ پتیاں بکھری ہوئی حالت ہی میں اچھی بلکہ جنت نگاہ دکھائی دیتی ہیں۔ان دو لفظوں میں شاید علی سردار جعفری کی شخصیت سما جائے۔" 277

ہمہ تن علم اور ہمہ صفت موصوف:

پروفیسر ضیاء (علیگ) لکھتے ہیں:

"جعفری صاحب سے ملنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے اندر ایک بڑا ہی پیارا انسان اور ایک عظیم دانشور چھپا ہوا ہے۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔سنجیدہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے حسنِ ظرافت ان میں نام کو نہیں اور جب ہنستے ہیں تو محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔وہ نہ صرف اس دور کے ممتاز ترین شاعروں، ادیبوں، نقادوں او رانشاء پردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں بلکہ وہ کئی ڈاکٹومینٹری فلموں کے ہدایت کار اور پروڈیوسر بھی ہیں۔کئی رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری بھی انہوں نے بخوبی سنبھالی ہے۔ادب شناسی، سنجیدہ تنقید، اعلیٰ معیار کی شاعری کی جو مثالیں انہوں نے قائم کی ہیں وہ اس دور کے کام ادبا کر پائے ہیں۔علم و ابلاغ کی جو شمعیں انہوں نے روشن کی ہیں وہ ہمیشہ جلتی رہیں گی اور اپنی روشنی سے آنے والی نسلوں کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے ذہن کو جلا بخشتی رہیں گی۔اُردو ادب کی کلاسیکی شاعری سے ان کو خاص شغف ہے۔ان کے مطالعے کی حدود لامحدود ہیں، ان کا فکری افق وسیع بھی ہے متنوع بھی۔انہوں نے انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی اور ہندی ادب اور فلسفہ کا مطالعہ بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے وہ ہمہ تن علم اور ہمہ صفت موصوف ہیں۔" 278

یہ تھیں چند ایک ادیبوں، شاعروں، نقادوں، دانشوروں، سردار جعفری کے دوستوں اور ہمعصر لوگوں کی آراء جنھوں نے سردار جعفری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا تھا، ان کے ساتھ وقت گزارا تھا، ان کے ساتھ سردار جعفری کا سابقہ ہوا تھا۔ ان آراء کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ علی سردار جعفری بیسویں صدی کی ایک عظیم بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت تھی۔انہوں نے عالم انسانیت کی خدمت کے عظیم مشن کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔وہ اس پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور ساری زندگی خلوص دل سے اس پر عمل پیرا بھی رہے اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتے رہے۔

☆☆☆

حواشی

1۔ڈاکٹراسلم پرویز،شاعرعلی سردارجعفری مشمولہ علی سردارجعفری:ایک مطالعہ۔گجرات اُردوساہتیہ اکاڈمی،
صفحہ 84تا 85

2۔ڈاکٹرایس ام زیڈ کوہر،اُردو میں رپورتاژنگاری کافن اورارتقاء صفحہ 34

3۔ڈاکرسید شبیہ الحسن،اُردو میں رپوتاژنگاری کافن اورارتقاءصفحہ 34

4۔ڈاکٹرظہیراحمدصدیقی،فانی کی شاعری صفحہ 21

5۔اختر الواسع،سردارجعفری،نظریاتی وابستگی اورشعری تجربہ مشمولہ جامعہ،جنوری تامارچ2002، صفحہ 144

6۔علی سردارجعفری،لکھنوکی پانچ راتیں، صفحہ 24

7۔ڈاکٹرسلطان احمد،علی سردارجعفری شخصیت اورفن کے آئینہ میں مشمولہ سردارجعفری: شخصیت اورفن
مرتبہ اصغرعباس،صفحہ256

8۔پروفیسررفیعہ شبنم عابدی،بہتے ہوئے لہوکامحافظ کتاب نما اپریل 1993ء صفحہ 82

9۔ڈاکٹرعلی احمدفاطمی،علی سردارجعفری،ایک علمی،ایک طلسمی شخصیت،مشمولہ سردارجعفری شخصیت اورفن
مرتبہ اصغرعباس، صفحہ176تا175

10۔بشیراحمدانصاری،علی سردارجعفری اورانسانی اقدارمشمولہ علی سردارجعفری(شخص،شاعراورادیب)
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی،صفحہ 83 تا 86

11۔سبط حسن،سردارجعفری پچندیادیں مشمولہ علی سردارجعفری (شخص،شاعراورادیب)
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی، صفحہ66

12۔رفعت سروش،اک حرف انقلاب ہےسردارجعفری۔کتاب نما،اپریل1993ء صفحہ 71

13۔ڈاکٹرممتازاحمدخاں،علی سردارجعفری،شخصیت اورشاعری۔جرنل۔ سپٹمبر 1999ء صفحہ 95

14۔رباب جعفری، بھائی کے شب وروز،سردارجعفری۔فن اورشخصیت ۔عالمی اُردوادب،
سردارجعفری نمبر،جلد19،صفحہ 90

15۔یوسف ناظم،علی سردارجعفری کی پہلودارشخصیت کے کچھ پہلو ۔نیاسفرالہ آباد،
جولائی تادسمبر 2000ء صفحہ43

16۔پروفیسررفیعہ شبنم عابدی،سردارجعفری:ایک جائزہ مشمولہ علی سردارجعفری: ایک مطالعہ،
گجرات اُردوساہتیہ اکادمی،صفحہ9

17۔پروفیسررفیعہ شبنم عابدی،علی سردارجعفری ایک مطالعہ صفحہ 11

18۔سلام بن رزاق،علی سردار جعفری کی یادیں ۔ماہنامہ ایوان اُردو دہلی صفحہ 71 تا 72

19۔سبط حسن،سردار جعفری:چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) صفحہ 66

20۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 46

21۔پروفیسر عبدالستار دلوی،ابتدائیہ۔علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی صفحہ 44

22۔شان الحق حقی،پیغامات،تاثرات،افکار،کراچی صفحہ 708

23۔انیس چشتی،علی سردار جعفری: کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 96 تا 97۔

24۔رضا جعفری،سردار ماموں۔آج کل آگست 2003ء صفحہ 19۔

25۔حبیب الرحمٰن چغانی،علی سردار جعفری،شخصیت و شاعر۔جرنل 121 سپٹمبر 2000ء صفحہ 69۔

26۔خواجہ تصور علی حیدر،سردار جعفری کا زمانہ طالب علمی ۔افکار،علی سردار جعفری نمبر۔
نومبر،دسمبر 1991ء صفحہ 183۔

27۔انیس چشتی،علی سردار جعفری: کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 9۔

28۔ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا،میرے بزرگ دوست مشمولہ آج کل،اکتوبر 2000،صفحہ 6۔

29۔خواجہ تصور علی حیدر،علی سردار جعفری کا زمانہ طالب علمی ۔افکار،علی سردار جعفری نمبر۔
نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 186۔

30۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 45

31۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 46

32۔محمد ایوب واقف،تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر)
سہ ماہی ترسیل،جنوری تا جون 1998ء صفحہ 31۔

33۔شان الحق حقی،پیغامات،تاثرات۔افکار علی سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 708۔

34۔پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔نیا سفر،الہٰ آباد،جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 19۔

35۔یوسف ناظم،علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 61۔

36۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 46 تا 47

37۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 47

38۔پروفیسر غلام دستگیر شہاب،علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 87۔
39۔رئیس مرزا، ہمارا جواب پیدا کر۔آج کل،اکتوبر 2000ء صفحہ 30۔
40۔سلمیٰ صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 48۔
41۔پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کا شعری سفر مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 349۔
42۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر،دسمبر 1991ء صفحہ 187۔
43۔شوکت اعظمی،سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 81۔
44۔ رضیہ فصیح احمد سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 81۔
45۔رضیہ فصیح احمد،سردار جعفری کی یاد میں،جامعہ۔جنوری،مارچ 2000، صفحہ 163۔
46۔یوسف ناظم،علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 60۔
47۔ڈاکٹر نیر جہاں،علی سردار جعفری کی شاعری میں عورت کا تصور مشمولہ تنقیحات صفحہ 143 تا 144۔
48۔محسن حیدرآبادی،مرقع شعرائے اُردو:مصور،تحریر و تدوین۔صفحہ 117۔
49۔سردار اور کیفی ایک مطالعہ۔آج کل۔مئی 2003ء صفحہ 7۔
50۔سلطانہ جعفری،میرا سردار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 51 تا 52۔
51۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار،سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 187،188،192۔
52۔شوکت کیفی،سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار۔سردار جعفری نمبر،
نومبر۔دسمبر 1991ء صفحہ 223۔
53۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری،ایک جائزہ ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ۔
گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی۔صفحہ 10۔
54۔رباب جعفری،ہمارے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر 1991ء صفحہ 192۔
55۔رباب جعفری،ہمارے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر 1991ء صفحہ 192۔
56۔رباب جعفری،بھائی کے شب و روز۔سردار جعفری:فن اور شخصیت:عالمی اُردو ادب۔
سردار جعفری نمبر،جلد 19،2000،صفحہ 93۔

57۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 193۔

58۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 190۔

59۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 187۔

60۔ستارہ جعفری،سردار بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 218۔

61۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۸۷۔

62۔شوکت اعظمی،سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار،

سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 225۔

63۔یوسف ناظم،علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 59 تا 60۔

64۔رباب جعفری، بھائی کے شب و روز۔سردار جعفری:فن اور شخصیت:عالمی اُردو ادب۔

سردار جعفری نمبر،جلد 19، 2000،صفحہ 91۔

65۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 193۔

66۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 189۔

67۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 189۔

68۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 190۔

69۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 218۔

70۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 190۔191۔

71۔یوسف ناظم،علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 60۔61۔

72۔رباب جعفری، بھائی کے شب و روز۔سردار جعفری:فن اور شخصیت:عالمی اُردو ادب۔

سردار جعفری نمبر،2001،صفحہ 90۔91۔

73۔رباب جعفری، بھائی کے شب و روز۔سردار جعفری:فن اور شخصیت:عالمی اُردو ادب۔

سردار جعفری نمبر،2000،صفحہ 93۔

74۔رباب جعفری،میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 190۔193۔

75۔محمد اسداللہ،سردار جعفری۔خطوط ہمہ رنگ،صفحہ 401۔

76۔رباب جعفری، بھائی کے شب و روز،سردار جعفری:فن اور شخصیت،عالمی اُردو ادب،

سردار جعفری نمبر جلد 19، 2001،صفحہ 90، 92، 93۔

77۔نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں) نیا سفر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 120۔

78۔پروفیسر عبدالستار دلوی، اپنی بات مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 35)

79۔ڈاکٹر فاطمہ تنویر، اُردو شاعری میں انسان دوستی، صفحہ 234۔

80۔بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعری اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 87۔86۔

81۔شوکت کیفی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔

نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 228

82۔سمرتھ بالی، لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں (چند لمحے سردار جعفری کے ساتھ)

کتاب نما، اپریل 1993ء صفحہ 55۔

83۔ندا فاضلی، خوشبو کی طرح لطیف باتیں (ایک پرانی ملاقات) کتاب نما، اپریل 1993ء صفحہ 48۔

84۔رباب جعفری، میرے بھائی۔افکار۔سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 193۔

85۔سلمیٰ صدیقی، علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 48۔

86۔محمد ایوب واقف، تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ: سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر)

سہ ماہی ترسیل، جنوری تا جون 1998ء صفحہ 31۔

87۔ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پیغامات۔تاثرات۔افکار۔سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 702۔

88۔یوسف ناظم، متحرک علی سردار جعفری۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 237۔

89۔راشد انور راشد، علی سردار جعفری: چند تاثرات۔ماہنامہ ایوان اُردو۔دہلی ستمبر، 2000ء صفحہ 97۔

90۔عرفانہ عزیز، نیلا فرشتہ: شخصیت: ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔کتاب نما۔اپریل 1993ء صفحہ 42۔

91۔بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 91۔

92)عرفا عزیز، نیلا فرشتہ۔افکار۔سردار جعفری نمبر، نمبر و دسمبر 1991، صفحہ 230۔

93)ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری ایک جائزہ، ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری ایک مطالعہ

گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، صفحہ 10۔

94)رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75۔

95)محمد ایوب واقف، کاتیب علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 445۔
96)رفعت سروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری۔کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 71۔
97)پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب سے چند ملاقاتیں کینڈا میں ۔افکار
سردار جعفری نمبر۔نومبر و دسمبر 1991، صفحہ 250۔
98)سیفی سرونجی، علی سردار جعفری سے چند، ماہنامہ پیام اُردو، حیدرآباد۔سالنامہ مئی 2001، صفحہ 37۔
99)پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری حصہ اول، صفحہ 93۔
100)پروفیسر علی احمد فاطمی، سب دیے روشن تمہارے نام کے (مجروح کی یاد میں)
نیا سفر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 238۔
101)محمد اسداللہ، سردار جعفری، خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 396۔
102)رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75۔
103)پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب سے چند کینڈا میں ۔افکار۔سردار جعفری نمبر
نومبر و دسمبر 1991، صفحہ 244۔
104)رضا جعفری، سردار ماموں ۔آج کل ۔اگست 2003، صفحہ 19۔
105)ریوتی لال شاہ، علی سردار جعفری مشمولہ افکار۔علی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 541۔
106)رفعت سروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری۔کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 71۔
107)رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75۔
108)رضا جعفری، سردار ماموں ۔آج کل ۔اگست 2003، صفحہ 19۔
109)پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں ۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر و دسمبر 1991، صفحہ 244۔
110)شوکت اعظمی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔
افکار۔سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 صفحہ 227۔
111)بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 98۔
112)رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75۔

113)پروفیسر سلیمان اطہر جاوید،ادبی ڈائری جلد اول،صفحہ 36۔

114)رضیہ فصیح احمد،سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 75۔

115)بشیر احمد انصاری،علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 75۔

116)پروفیسر عبدالستار دلوی،ابتدائیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)مرتبہ عبدالستار دلوی صفحہ 44۔

117)شوکت کیفی،سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991 صفحہ 223۔

118)رئیس مرزا،ہمارا جواب پیدا کر۔آج کل۔اکتوبر 2000،صفحہ 30۔

119)ڈاکٹر غ۔ع شیخ،بیسویں صدی کا انوکھا شاعر علی سردار جعفری۔

ہماری زبان یکم تا 21/اکتوبر 2000 صفحہ 17۔

120)ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری: تاریخی شعور کا زندہ استعارہ۔سہ ماہی فکر و تحقیق،

اکتوبر تا دسمبر 2000،صفحہ 17۔

121)نگار عظیم،میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں)نیا سفر۔جولائی تا دسمبر 2000،صفحہ 121۔

122)یوسف ناظم،علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 58۔

123)پروفیسر ضیاء (علیگ)،جعفری صاحب کینڈا میں۔افکار۔سردار جعفری نمر۔نومبر و دسمبر 1991،صفحہ 251۔

124)نگار عظیم،میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں)نیا سفر۔جولائی تا دسمبر 2000،صفحہ 118۔

125)سیفی سرونجی،علی سردار جعفری سے چند ملاقاتیں،ماہنامہ پیام اُردو،حیدرآباد

سالنامہ مئی 2001،صفحہ 38-37۔

126)بشیر احمد انصاری،علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 91۔

127)پروفیسر ضیاء (علیگ)،جعفری صاحب کینڈا میں۔افکار۔سردار جعفری نمر۔نومبر و دسمبر 1991،صفحہ 242۔

128)شوکت کیفی،سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔افکار سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991 صفحہ 225۔

129)سید محمد مہدی،سردار جعفری:شخصیت کے چند پہلو۔نیا سفر۔جولائی تا دسمبر 2001 صفحہ 84۔

130)پروفیسر ضیاء (علیگ)،جعفری صاحب کینڈا میں۔افکار۔سردار جعفری نمبر

نومبر و دسمبر 1991،صفحہ 244'254۔

131)محمد حفیظ الکبیر قریشی،علی سردار جعفری مشمولہ افکار سردار جعفری،نومبر دسمبر 1991،صفحہ 602۔

132)ڈاکٹرعلی احمد فاطمی، جڑیں اور کونپلیں (دور پورتاژ) صفحہ 69۔

133)یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 56-55۔

134)رباب جعفری، سردار بھائی ۔افکار سردار جعفری ۔نومبر دسمبر 1991، صفحہ 193۔

135)ستارہ جعفری، سردار بھائی ۔افکار۔سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 218۔

136)یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 55۔

137)شوکت کیفی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست ۔افکار سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 صفحہ 225۔

138)سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) صفحہ 66۔

139)محمد ایوب واقف، مکاتیب علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 447۔

140)وارث علوی، سرزنش خار، صفحہ 8۔

141)پروفیسر علیم اللہ حالی، روح عصر کا شاعر، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 24۔

142)محمد ایوب واقف، مکاتیب علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 444-443۔

143)بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 88-87۔

144)عرفانہ عزیز، نیلا فرشتہ: شخصیت: ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم مشمولہ کتاب نما اپریل 1993، صفحہ 45۔

145)نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں) نیا سفر۔
جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 120-199۔

146)رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 82۔

147)بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسان اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 91۔

148)راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ علی سردار جعفری، صفحہ 44۔

149)پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی صفحہ 44۔

150)محمد ایوب واقف، مکاتیب علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 445۔
151)ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری۔ جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 103
152)ڈاکٹر افغان اللہ خاں، نئی دنیا کو سلام مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 200۔
153)سمرتھ باقی، لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں (چند لمحے سردار جعفری کے ساتھ)
کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 55۔
154)پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔ نیا سفر، الہ آباد، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 105۔
155)بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 92-91۔
156)ستارہ جعفری، سردار بھائی۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 218۔
157)انیس چشتی، علی سردار جعفری: کچھ دیادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 96۔
158)بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 94۔
159)پروفیسر زاہد زیدی، علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن،
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 116۔
160)عرفانہ عزیز، نیلا فرشتہ۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نمبر و دسمبر 1991، صفحہ 230۔
161)رباب جعفری، سردار بھائی۔ افکار سردار جعفری۔ نومبر دسمبر 1991، صفحہ 194-193۔
162)پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب کینڈا میں۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 246, 248
163انیس چشتی، علی سردار جعفری: کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر، ادیب)
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 96
164پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب کینڈا میں۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 245
165محمد اسداللہ، سردار جعفری۔ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 402
166رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یادیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 82
167سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) صفحہ 73

168 پروفیسر عبدالستار دلوی، اپنی بات مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 38-37

169 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 44

170 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 89

171 سید محمد مہدی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 56-55

172 رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یادیں مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 75

173 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 44

174 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔ نیا سفر الہ آباد، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 108-107

175 پروفیسر زاہدہ زیدی، علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات مشمولی سردار جعفری شخصیت اور فن،

مرتبہ اصغر عباس صفحہ 129

176 سبط حسن، سردار جعفری، چند یادیں مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 67-66

177 قیصر تمکین، سردار جعفری: ایک نذرانہ عقیدت: کتاب نما، جون 2002، صفحہ 22۔

178 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم، نیا سفر۔ الہ آباد، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 104

179 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی صفحہ 90

180 پروفیسر نظیر صدیقی، علی سردار جعفری مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس صفحہ 54

181 ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پیغامات، تاثرات۔ افکار سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء صفحہ 702

182 پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عزم و پیکار کی یادگار مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 69

183 رفعت شروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری۔ کتاب نما۔ اپریل 1993ء، صفحہ 72

184 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری۔ جرنیل، ستمبر 1999ء، صفحہ 95

185 خواجہ تصور علی حیدر، سردار جعفری کا زمانہ طالب علمی۔ افکار۔ علی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء،

صفحہ 182-181

186 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یادیں)۔ نیا سفر۔ جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 119-120

187 رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یادیں۔ جامعہ، جنوری تا مارچ 2002ء، صفحہ 159

188 ضیاءالدین اصلاحی، اردو کا سردار چلا گیا۔ معارف، اگست 2000، صفحہ 149

189 محمد اسداللہ، خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 369

190 سلام بن رزاق، علی سردار جعفری کی یاد میں۔ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی دسمبر 2000، صفحہ 71

191 رفعت سروش، اک انقلاب ہے سردار جعفری: کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 77

192 پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 291

193 پروفیسر محمد حسن، خطبہ صدارت (سردار جعفری کی وراثت)۔ سردار جعفری دو روزہ قومی سمینار، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ 25'26 نومبر 2000 کے مقالات مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 24

194 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 83

195 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 53

196 ڈاکٹر ابرار رحمانی، میں ہوں تخیل انسانی کی پرواز: علی سردار جعفری مشمولی تلخ و شیریں، صفحہ 164

197 پروفیسر نظیر صدیقی، علی سردار جعفری مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 51

198 قیصر تمکین، سردار جعفری: ایک نذرانۂ عقیدت۔ کتاب نما۔ جون 2002ء، صفحہ 22

199 عرفانہ عزیز، نیلا فرشتہ مشمولہ افکار علی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 229

200 قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، سردار جعفری کی تہذیبی ترجیحات (نظموں کے حوالے سے)، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 17

201 میر ہاشم، نقیب صبح فردا: علی سردار جعفری۔ سب رس، ستمبر 2007ء، صفحہ 23

202 سبط حسن، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 69

203 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔ نیا سفر۔ الہ آباد۔ جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 106-105

204 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز۔ سردار جعفری: فن اور شخصیت: عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر، 2001، صفحہ 19

205 پروفیسر غلام دستگیر شہاب، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 86

206 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز ۔سردار جعفری: فن اور شخصیت ۔عالمی اردو ادب ۔
سردار جعفری نمبر 2001، صفحہ 93
207 سلمٰی صدیقی، علی سردار جعفری مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 46
208 یوسف ناظم، متحرک علی سردار جعفری۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 238
209 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 44
210 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاو راور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 63
211 رضیہ فصیح احمد، سردار جعفری کی یاد میں مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 74
212 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 87
213 سلمٰی صدقی، علی سردار جعفری مشمولی سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس صفحہ 48
214 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں) نیا سفر۔جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 117118
215 پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب کینڈا میں ۔افکار۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 249
216 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 58
217 پروفیسر غلام دستگیر شہاب، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولی علی سردار جعفری (شخص، شاعر او ر ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 87
218 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم ۔نیا سفر۔جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 114
219 میر ہاشم، نقیب صبح فردا: علی سردار جعفری۔سب رس، حیدرآباد، ستمبر 2007ء، صفحہ 21
220 ڈاکٹر فاطمہ تنویر، اردو شاعری میں انسان دوستی، صفحہ 233
221 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز ۔عالمی اردو ادب ۔سردار جعفری نمبر، جلد 19، 2001، صفحہ 88
222 ڈاکٹر غ۔ع۔شیخ، بیسویں صدی کا انوکھا شاعر: علی سردار جعفری۔ہماری زبان۔یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 17
223 پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری، حصہ اول، صفحہ 36
224 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 90-91

225 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 94-93
226 پروفیسر عبدالستار دلوی، ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری
(شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 267
227 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 43
228 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، علی سردار جعفری: ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 184
229 رفعت سروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری۔ کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 71
230 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری۔ جرنل، ستمبر 1999ء، صفحہ 95-94
231 ڈاکٹر ابرار رحمانی، علی سردار جعفری۔ اردو بک ریویو، ستمبر اکتوبر 2000، صفحہ 50، 52
232 سید محمد مہدی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 56
233 شوکت اعظمی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر۔ نومبر دسمبر 1991، صفحہ 225
234 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری۔ جرنل ستمبر 1999ء صفحہ 92-91
235 نگار عظیم، میں مر کے امر ہو جاؤں گا (سردار جعفری کی یاد میں)۔ نیا سفر۔ جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 116
236 رباب جعفری، میرے بھائی۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر۔ نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 192-190
237 شوکت کیفی، سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء،
صفحہ 228-227 '223-222
238 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 63-62
239 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔ نیا سفر۔ الہ آباد، جولائی تا دسمبر 2000،
صفحہ 107, 106, 111
240 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز۔ سردار جعفری: فن اور شخصیت، عالمی اردو ادب،
سردار جعفری نمبر 2001، صفحہ 91
241 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو۔ نیا سفر۔ جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 46
242 سلمی صدیقی، علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 48
243 رباب جعفری، میرے بھائی۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر۔ نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 190

244 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: ایک جائزہ، ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ۔
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، صفحہ 10

245 پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری، حصہ اول، صفحہ 39

246 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: ایک جائزہ، ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ۔
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، صفحہ 10

247 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 53

248 محمد علی صدیقی، علی سردار جعفری: ایک خراج عقیدت۔ سردار جعفری: فن اور شخصیت، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر،
جلد 19، 2001، صفحہ 130-131

249 سمرتھ بالی لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں (چند لمحے سردار جعفری کے ساتھ) مشمولہ کتاب نما،
اپریل 1993، صفحہ 55

250 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی شخصیت کے کچھ پہلو مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 57

251 ڈاکٹر نریش، اک چراغ اور بجھا، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 27

252 سید عاشور کاظمی، سخن گسترانہ بات، لندن کی ایک شام علی سردار جعفری کے نام، صفحہ 28

253 پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 71

254 راشد انور راشد، علی سردار جعفری: چند تاثرات۔ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی ستمبر 2000، صفحہ 97

255 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم۔ نیا سفر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 114

256 سلمیٰ صدیقی، علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 48

257 سید عاشور کاظمی، سخن گسترانہ بات، لندن کی ایک شام علی سردار جعفری کے نام، صفحہ 28

258 ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، سردار جعفری بحیثیت نقاد مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 431

259 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 89-88

260 پروفیسر شارب ردولوی، کلیدی خطبہ: سردار جعفری: ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ مشمولہ سردار جعفری:
شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 26

261 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، اداریہ: ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ، (علی سردار جعفری (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتبہ رفیعہ شبنم عابدی، 78 ویں سالگرہ پر طبع شدہ دوسری بار اپریل 1993ء، صفحہ 6

262 محمد علی صدیقی، علی سردار جعفری۔ دار و رسن سے کوچہ دلدار تک۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 10

263 ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئینے میں۔ مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 252

264 ڈاکٹر وحید اختر، سردار جعفری: خواب اور شکست خواب مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 184, 183, 182۔

265 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 91

266 انیس چشتی، علی سردار جعفری: کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 91

267 حبیب الرحمٰن چغانی، علی سردار جعفری: شخصیت و شاعری۔ جرنل 121، ستمبر 2000، صفحہ 57

268 پروفیسر عبدالستار دلوی، ابتدائیہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 43

269 رفعت سروش، اک حرف انقلاب ہے سردار جعفری۔ کتاب نما، اپریل 1993، صفحہ 72-71

270 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری۔ جرنل۔ ستمبر 1999ء، صفحہ 94

271 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، علی سردار جعفری: ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 185-184

272 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری۔ کتاب نما، اپریل 2003ء، صفحہ 9

273 پروفیسر علی احمد فاطمی، سردار کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی۔ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی ستمبر 2000، صفحہ 84

274 پروفیسر کوپی چند نارنگ، علی سردار جعفری: ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ مشمولہ جدیدیت کے بعد مرتبہ پروفیسر کوپی چند نارنگ، صفحہ 469

275 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: تاریخی شعور کا زندہ استعارہ۔ سہ ماہی فکر و تحقیق، اکتوبر تا دسمبر 2002ء، صفحہ 144, 137, 131

276 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، بہتے ہوئے لہو کا محافظ۔ کتاب نما، اپریل 1993ء، صفحہ 79-78

277 رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: ایک جائزہ ایک مطالعہ۔ گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، صفحہ 47, 46, 43, 39, 1

278 پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب کینڈا میں۔ افکار۔ سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 244

☆☆☆

باب سوم

''ترقی پسند تحریک اور سردار جعفری کی وابستگی''

ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقاء

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہٹلر کے مظالم حکومت تک ہی محدود نہ تھے بلکہ دانشور اور ادیب بھی اس کا شکار تھے۔ سرمایہ داری کے لیے عوام کو کچلا جا رہا تھا۔ سجاد ظہیر جو لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے ان حالات سے متاثر ہو رہے تھے۔ سجاد ظہیر کی ڈائری کے مطابق انھیں لندن اور پیرس میں جرمن سے بھاگے نکالے لوگ ملتے۔ فاشزم کے ظلم کے درد بھرے واقعات سنائی دیتے۔ جرمنی میں آزادی چاہنے والوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ دار طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دیا کرتے۔ عوام کے بہی خواہ رہنماؤں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہونے کی خبریں اخبار میں شائع ہوتیں۔ ان واقعات سے سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے سکون کو مٹا دیا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کا مقابلہ کر سکتی تھی اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت۔ یہ طاقت انقلابی جماعتی شعور پیدا کر رہی تھی اور سرمایہ داری کو شکست دے کر معاشرتی تعمیر کی اہلیت رکھتی تھی۔ وہ لوگ رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ نوجوانوں کے اس گروہ نے 1935 میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس انجمن میں سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی اور بنگالی کے ادیب بھی شامل ہو گئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ تمام ادیبوں، شاعروں کو چاہئے کہ وہ اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں اور اپنے قلم، فن اور علم کو ان طاقتوں کے خلاف استعمال کرنا چاہئے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، روپیہ کے بل پر حکومت کرتی ہیں، فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنے یورپ کے قیام کے دوران ہی لائف ناکس اور لوئی اراگوں جیسی ادبی شخصیتوں سے مل کر ہندوستان میں اس تحریک کے شروع کرنے کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا۔

علی سردار جعفری نے ایک انٹرویو میں ترقی پسند ادب کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

''ترقی پسند ادب تحریک آزادی سے واضح وابستگی رکھتا تھا اور یہ تحریک آزادی محض ہندوستان کی تحریک آزادی نہیں تھی بلکہ ایک عالمگیر جدوجہد کا حصہ تھا۔ سامراجی استحصال کے خلاف، اس میں جغرافیائی، نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ہماری ہمدردیاں دنیا بھر میں برپا ہونے والے ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں، ایک طرف ملکی اور مقامی سطح پر ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہا جا سکتا تھا اور دوسری طرف کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں سے اغراض ممکن نہ تھا۔ یہ تھا پس منظر جس میں ترقی ادب کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس میں دو عالمی جنگوں اور قحط بنگال کی ہولناکیاں بھی شامل ہیں''....

.....ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحے کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری

کی بھی جولمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت بھی حاصل کر سکے .... فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری پیدا ہوتی ہے وہ بالکل ہی بے معنی نہیں ہوتی، یہ بات شاید آج کی صورت حال میں زیادہ بہتر طور پر نہ سمجھی جا سکے لیکن اگر اس کو اس وقت کے تناظر میں دیکھیں تو پوری بات سمجھنا آسان ہو جائے گی، جیسا کہ عرض کیا اس وقت ہم ایک ہیجانی صورت حال سے دوچار تھے، ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی، بنگال کے قحط کی ہولنا کیاں تھیں، بحریہ کی ہڑتال تھی، کسانوں مزدوروں اور نچلے طبقوں کی جدوجہد تھی، غرض حوادث و واقعات کا ایک سیل رواں تھا جو ہمارے چاروں طرف امڈا ہوا تھا۔ کیا ترقی پسند ادیب کے لیے جو اپنا رشتہ عوام سے استوار رکھتا ہو اور جو تخلیق ادب کو ایک سماجی ذمہ داری بھی جانتا ہو، ان بدلتے ہوئے حالات سے چشم پوشی ممکن ہو سکتی تھی، ظاہر ہے نہیں۔''

1

یوروپ کی مختلف جامعات میں ہندوستانی طلبا زیر تعلیم تھے اور وہ سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سوشلزم سے قریب ہوتے گئے۔ ان کی دلچسپی اور کوششوں سے ایک ادبی حلقہ بن گیا۔ 1935 میں لندن کے مان کنگ ریستوران میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا اس میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی ایک انجمن تشکیل دی گئی۔ اس جلسہ کے شرکاء میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور محمد دین تاثیر شامل تھے۔ ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ انگریزی زبان کے ادیب اور ناول نگار تھے۔ جیوتی گھوش اور مود سین گپتا بنگالی ادب اور محمد دین تاثیر اُردو کے ادیب تھے۔ سجاد ظہیر انگریزی اور اُردو کے ادب اور دانشور تھے۔ اس انجمن میں پیش کیے گئے منشور پر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، کے ایس بھٹ، ایس سنہا اور محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔

منشور یہ ہے:

''ہندوستانی ادب قدیم تہذیبی کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی۔ آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہو گئی ہے جذبات کی نمائش عام ہے۔ عقل و فکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کر دیا گیا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے، زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے۔ اور تخلیقی و تنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہو گی۔ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے، جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یکجہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اس کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔

2

مذکورہ مقاصد کو سامنے رکھ کر اس انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں:

1)۔ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا ۔ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط وتعاون پیدا کرنا،صوبوں کی مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

2)۔ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

3)۔ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمے کرنا جو صحت منداور توانا ہو جس سے ہم تہذیبی پس ماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

4)۔ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم خط کو قومی رسم خط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

5)۔ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا،عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے کے لیے امداد چاہتے ہیں۔

6)۔فکر ونظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

ڈاکٹر عمر رضا نے لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک مذکورہ بالا ادیبوں کے ذہن کی اختراع ہے جس کی شروعات 1932 میں ''انگارے'' کے ذریعے ہوگئی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یوروپ میں فاشزم کے خلاف احتجاج کرنے والی قوتوں، کارول مارکس کے اشتراکی نظریہ اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی نے اسے جلا بخشی تھی۔بہر کیف سجاد ظہیر کے ذریعے لندن سے بھیجے گئے محولہ بالا مینی فسٹو پر ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں نے غور کرنا شروع کیا اور تین چار مہینوں میں اس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔اس درمیان خود سجاد ظہیر بھی ہندوستان تشریف لائے اور اپنے والد کے ساتھ الہٰ آباد میں رہنے لگے تھے۔'' 3

الہ آباد میں ترقی پسند مصنّفین کی تشکیل کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں ایسی ہی انجمنیں قائم کی گئیں جیسے لاہور علی گڑھ، حیدرآباد کلکتہ اور امرت سر اور صوبہ بہار میں بھی جن سے وابستہ ہونے ،ترویج واشاعت کے کاموں میں حصّہ لینے والوں میں سردار جعفری بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر صادق نے اختر حسین رائے پوری کے ایک اعلان نامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اختر حسین رائے پوری نے ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس (لکھنو) کے انعقاد سے کچھ دنوں قبل بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور اجلاس میں ایک اعلان نامہ پیش کیا تھا جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دیگر مسائل سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ادب کو زندگی سے فرار کی راہ اختیار کرنے کے بجائے غیر جانبداری کا رویہ ترک کر کے زندگی کی رہنمائی کا کام کرنا چاہئے۔ان کے مطابق: زندہ اور صادق ادب سماج کو عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا رہے۔انہوں نے اس ایقان کا اظہار بھی کیا ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا۔اس اعلان نامے پر پریم چند،مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو، پنڈت نہرو اور اختر حسین رائے پوری نے دستخط کیے تھے۔'' 4

مذکورہ اعلان نامہ یہ واضح کرتا ہے کہ لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اولین کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی ہندوستانی

ادیبوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کا اظہار کیا تھا۔

1935ء میں منعقدہ ہندوستانی اکیڈیمی کی ایک کانفرنس میں سجاد ظہیر نے پریم چند، جوش اور مولوی عبدالحق سے مل کر اپنے اپنے منصوبے کے متعلق بتایا۔ان ادیبوں نے اس سے اتفاق کیا اور مینی فسٹو پر دستخط ثبت کر دیے۔رفتہ رفتہ انہوں نے ہندوستانی ادیبوں کے ایک بڑے گروپ کو اپنا ہمنوا بنایا۔ان میں فراق گورکھپوری، سید اعجاز حسین (الہ آباد یونیورسٹی میں بالترتیب انگریزی اور اردو کے استادم سید احتشام حسین، وقار عظیم الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم)وغیرہ الہ آباد میں سرگرم تھے۔علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ جو علی گڑھ میں نئے ادبی رجحانات کو فروغ دے رہے تھے۔فیض احمد فیض، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، میاں افتخار الدین، فیروز الدین منصور، سہیل عظیم آبادی اور اختر اورنیوی پنجاب و بہار میں ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ہندوستان کے مختلف شہروں میں ترقی پسند خیالات رکھنے والے ادیبوں نے انجمنیں قائم کیں اور سرگرم عمل ہو گئے۔علی گڑھ کے طالب علموں میں ترقی پسند تحریک کے تعلق سے بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔علی گڑھ میں ترقی پسند مصنّفین کا پہلا جلسہ 1936 کے اوائل میں ہوا تو سردار جعفری نے ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔

سجاد ظہیر نے لندن سے ہندوستان آ کر ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کی۔الہ آباد میں ترقی پسند مصنّفین کی تشکیل عمل میں آئی۔ ملک میں ترقی پسند خیالات رکھنے والے ادیبوں نے مقامی طور پر انجمنیں قائم کیں۔لکھنو میں ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی۔

جس میں پریم چند نے خطبہ صدارت دیتے ہوئے کہا تھا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ہمارے ادیب تخیلات کی دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے کہیں فسانۂ عجائب کی داستاں تھی کہیں بوستان خیال کی، کہیں چندر کانتا سنتو کی۔ان داستانوں کا منشاء محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین..... مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔بے شک آرٹ کا مقصد حسن ذوق کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، روحانی یا معنوی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو..... ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

5

ڈاکٹر خالد علوی کے مطابق ''ان تصورات کی روشنی میں ترقی پسند تحریک نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا..... تحریک نے اپنے منشور میں مقصدیت پر زور دیا تھا۔اور اُردو کے ادیبوں کو سماجی ذمہ داری قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اس تصور میں ہر مکتب خیال کے لوگوں کے لیے کشش تھی یہی وجہ ہے کہ تحریک کو بہت سے اہم ادیبوں کی ہم نوائی حاصل ہوئی ....ہندوستانی ترقی پسندوں میں حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملا، حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق جیسے مختلف الخیال لوگوں کے باوجود کمیونسٹوں کی اکثریت تھی وہ مارکسی نظریات جمالیات کے مبلغ تھے۔مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور ذہنی زندگی کے

طریقے اور آداب مقرر کرتے ہیں۔ ہمارا تمام ادب اور فنون لطیفہ ہماری مادّی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں مارکسی نظریہ ادب میں حقائق ہی اہم ہیں اور تخیل کی گنجائش نہیں ہے ....ہندوستانی ترقی پسند اس ادبی نظریے کے مبلغ تھے اور ادب کے افادی پہلو پر زور دیتے تھے۔ان کے نزدیک اچھے ادب کی پہچان یہ تھی کہ وہ سماجی استحصال کے خلاف تحریک دیتا ہو۔" 6

تقریباً ڈھائی سال کے وقفے کے بعد 23/دسمبر 1938 کو انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کی جگہ ڈاکٹر عبدالعلیم کو کل ہند ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔اس طرح انجمن کا صدر دفتر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔اس کانفرنس نے ترقی پسند تحریک کو تنظیمی طور پر کافی مستحکم کردیا اور کارکنوں میں نیا عزم وخود اعتمادی کو فروغ ملا۔ساڑھے تین سال کے طویل وقفے کے بعد مئی 1942 میں دہلی میں ایک کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔سجاد ظہیر لکھتے ہیں۔

"ہندوستانی ادیبوں اور فن کاروں نے یہ اعلان کیا کہ ان کی ہمدردی اتحادی اقوام کے ساتھ ہے اور وہ فاشزم کے خلاف ہیں۔اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے قلم اور اثر کو جمہوری جنگی کوششوں کی حمایت کے لیے استعمال کرنے اور ملک کو فاشزم کے خطرے سے آگاہ کرنے کے تہیہ کا اعلان کیا۔ہمارے وطن کی آزادی جنگ میں جمہوری قوتوں کی فتح کے ساتھ وابستہ تھی۔ہم نے برطانوی سامراج کے اس رویّے کی مذمت کی کہ وہ ان نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کو تیار نہیں ہے۔ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔" 7

1942ء کے نصف آخر میں بیشتر ترقی پسند ادیب اور شاعر شمالی ہند سے بمبئی منتقل ہوئے۔انجمن ترقی پسند مصنّفین کی چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی اس کانفرنس میں پہلی بار دس زبانوں کے نمائندوں نے حصہ لیا جن میں اُردو، ہندی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، گجراتی کنڈ، ملیالم اور تلگو شامل ہیں۔اس کانفرنس میں طے کیا گیا کہ انجمن کا صدر دفتر لکھنؤ سے بمبئی منتقل کردیا جائے۔اس کانفرنس میں یہ بھی طے ہوا کہ پانچویں کانفرنس اکتوبر میں کی جائے گی اور وہ صرف اُردو تک ہی محدود ہوگی۔اس سے قبل جتنی بھی کل ہند کانفرنسیں منعقد کی گئی تھیں ان میں مختلف زبانوں کے نمائندوں نے حصہ لیا تھا اور اُردو کے مسائل پر زیادہ توجہ نہیں دی جاسکتی تھی۔حیدرآباد میں یہ کانفرنس اکتوبر 1945 میں منعقد ہوئی اس کے اجلاس پانچ دنوں تک جاری رہے۔اس کانفرنس کی مجلس صدارت میں مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تارا، چند قاضی عبدالغفار، کرشن چندر، فراق، احتشام حسین کے نام شامل تھے۔اس کانفرنس کی افتتاحی رسم سروجنی نائڈو نے انجام دی۔اس کانفرنس میں کچھ قراردادیں منظور کی گئیں۔ایک قرارداد ترقی پسندوں پر فحاشی کے الزامات سے متعلق تھی۔قرارداد میں کہا گیا کہ ترقی پسند ادیب ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں اور اسے برا سمجھتے ہیں۔1946ء میں ترقی پسند مصنّفین کی ایک شاخ احمد آباد میں قائم کی گئی۔اس نے ایک کانفرنس منعقد کی جس کا پہلا اجلاس 5/جولائی 1947 اور دوسرا 6/جولائی 1947 کو ہوا۔

لکھنؤ میں دسمبر 1947 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔اس کے تین اجلاس ہوئے پہلے اجلاس کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی جس میں ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے مسائل سے متعلق گفتگو ہوئی۔قاضی صاحب نے فرقہ وارانہ فسادات، ملک کی تقسیم اور موجودہ سیاسی افراتفری میں ترقی پسندوں کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کا ذکر کیا۔انجمن

ترقی پسند مصنّفین کی بھوپال شاخ نے چاروزہ کانفرنس 25 تا 28 جنوری 1949 کا انعقاد کیا۔ اس کے تین مہینے کے بعد اپریل 1949 میں اتر پردیش کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں ہندی اور اُردو کے مصنّفین نے حصہ لیا۔ 1949 میں یہ طے کیا گیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین 1936 کے اعلان نامے کی جگہ ایک ایسا اعلان نامہ سامنے لائے جو وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔اس مقصد کے لیے بھیمڑی میں 27 تا 29 مئی 1949 کو انجمن کی چھٹی کل ہند کانفرنس بلائی گئی اور ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا جس میں ترقی پسند قوتوں کو کھل کہ رجعت پسندوں کے مقابلے میں آنے کا مشورہ دیا گیا۔ اعلان نامہ کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا۔

''کوئی ادب اس وقت تک عظیم نہیں ہوسکتا اور عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتا جب تک اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو۔ترقی پسند ادیب عظیم انسانی آدرشوں سے کسب نور کرے گا جیسے امن، محبت، قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش، انسان دوستی جو جنگ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی ہے۔ادب کا یہ عظیم اخلاقی مقصد مطالبہ کرتا ہے کہ تمام ادیب اپنی تحریروں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کریں انھیں مقبول اور خوبصورت بنائیں تا کہ ہماری جنتا ان سے محبت کر سکے ان سے جوش حاصل کر سکے اور ان پر فخر کر سکے۔عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ یہ مستقبل معتبر ہاتھوں میں ہے۔'' 8

ترقی پسند مصنّفین نے 8/ مارچ 1953 کو دہلی میں اپنی ساتویں کل ہند کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا۔3 تا 5 مارچ 1956 کو قصبہ مئو ضلع اعظم گڑھ میں اُردو کانفرنس منعقد ہوئی 18 تا 20 مئی 1956 کو حیدرآباد میں کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی۔اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے کہا کہ جو بھی کام کرنا تھا، انجمن کر چکی اور اب ایک کل ہند اُردو ادیبوں کی انجمن بنائی جائے، رجعت پسندی کے مقابلے کے لیے سب کو متحد کرنا پڑے گا۔سجاد ظہیر نے کہا ''آج ہند کی نئی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر ہو رہی ہے جس پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لیے ادبی جنگ کریں۔ ہماری تنظیم سیاسی نہیں ہوگی۔ہم کو اپنے اختلافات کم کرنے ہیں اور مشترکہ باتوں کو لے کر آگے بڑھانا ہے۔'' 9

1957 میں احمد آباد میں ایک اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوا۔طویل عرصے کے بعد 1966 میں ایک کل ہند کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔تسلسل کے اعتبار سے یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی آٹھویں اور آخری کل ہند کانفرنس تھی۔

ترقی پسند تحریک کی اساس اور اس کے مقاصد:

حقانی القاسمی نے ترقی پسندانہ نظام فکر کی اساس پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا ہے:

''ترقی پسندانہ نظام فکر کی اساس انسانیت پر ہے۔سماج میں جب تک جبر، ناانصافی، ظلمت پرستی، طبقاتی امتیاز اور معاشی احتکار موجود ہے تب تک ترقی پسند فکر کو موت واقع نہیں ہوسکتی کیوں کہ ترقی پسندی انہیں ظلمتوں اور تاریکیوں کے خلاف جہاد اور مزاحمت سے عبارت ہے ترقی پسندی کے اساسی افکار و تصورات بعینہ وہی ہیں جو انقلابی اسلام یا اسلامی حرکیات کے ہیں۔ ترقی پسندانہ تصورات اور اسلامی افکار میں گہری مماثلتیں ہیں۔ترقی پسندوں کا جو معاشی فلسفہ ہے وہی فلسفہ حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی کا رہا ہے اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری نے اپنی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' میں اسی معاشی فلسفہ کو پیش کیا ہے۔طبقاتی مساوات کے تعلق سے جو ترقی پسندانہ فکر ہے وہی فکر اسلامی بھی ہے۔اسی لیے مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا کہ ''اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں'' اسلام کی حرکیات سے ترقی پسندی کی جدلیات کا ایک روحانی رشتہ ہے۔اس تحریک کی روح میں صوفیانہ لے اور سرمستی بھی شامل ہے۔ وہی صوفیانہ روایت جہاں تصادم کے بجائے تفاہم پر زور ہے۔الخلق عیال اللہ اسلام کا نظریہ ہے اور یہی ترقی پسندی کا منشور بھی ہے اور پوری تحریک اسی کی تفسیر وتعبیر نظر آتی ہے۔ترقی پسندی جمہور اساس ہے اور یہ انسانی بحران اور اس کے دکھ درد کے درماں کی تلاش سے عبارت ہے۔ترقی پسندی نہ ہوتی تو ہمارا ملک لسانی،مذہبی، دہشت گردی کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔محنت کشوں،مزدوروں کے لیے کوئی آواز بلند نہ ہوتی۔نہ آدمیت ہوتی نہ آدمیت کا احترام، کہ جاگیردارنہ نظام نے انسانی اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیر رکھی تھیں۔

طبقاتی امتیازات،مذہبی نرگسیت،نظری ادعائیت،صارفیت،ثقافتی لسانی استعماریت اور کارپوریٹ کلچر کے خلاف ترقی پسندی نے جس جنگ کا آغاز کیا اسی جنگ کی وجہ سے ہماری انسانی اخلاقی قدریں کسی قدر محفوظ ہیں۔گلوبلائزیشن کے اس عہد میں جب کہ نوسامراجیت ہمارے ذہن ودل کے دروازے پر مسلسل دستک دے رہی ہے اور ہمارے روزمرّہ میں شامل ہوتی جارہی ہے ایسے میں ترقی پسند تحریک کی اہمیت اور معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔عسکریت،استعماریت اور وار کلچر کے اس عہد میں جب معاشی مفادات اور جنگ زرگری کا نظارہ ہماری آنکھوں نے خود دیکھا ہے اور انسانیت کے انہدام کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے تو ایسے میں اس ترقی پسند تحریک کی ضرورت کیوں نہ محسوس ہو جو معاشی مساوات اور حریت اور شرفِ انسانیت کی بات کرتی ہے۔ترقی پسندی کوئی عقیدہ نہیں ہے،ایک تجربہ ایک طرز فکر ہے۔سقوطِ ماسکو کے تناظر میں ایک ملک یا عالمی طاقت سے مشروط کر کے ترقی پسند تحریک کو دیکھنے کا زاویہ یقیناً غلط ہے کیونکہ ترقی پسندی کوئی سیاسی تحریک نہیں،ایک جمہوری انسانی انداز فکر ہے۔امریکی استعماریت نے گو کہ اس کے خدوخال مسخ کر دیے ہیں اور کذب اور ریا کی تشہیری مشینوں کی مہم سے ترقی پسندی کی نظری بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں مگر ترقی پسندی اذیت اور ابتلا کے باوجود انسانی ذہنوں میں زندہ ہے اور اب میٹروپولیٹن شہروں سے دور قصبات اور گاؤں میں اپنی جڑیں جما رہی ہے۔گاؤں دراصل ترقی پسندانہ خرد افروزی کا گہوارہ بھی ہیں اور ترقی پسندانہ طرز معاشرت کا نمونہ بھی۔ترقی پسندانہ افکار کا علمی انعکاس گاؤں ہی میں نظر آتا ہے۔اقبال کی زبان میں انسان جب تک صیدِ زبون شہریاری اور نوع انسان کا شکاری ہے تب تک ترقی پسند فکر اور احساس کی ضرورت اس دنیا کو رہے گی اور جب تک اقبال کی یہ آواز ع ''اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' دنیائے گیتی میں گونجتی رہے گی تب ترقی پسندی کو کوئی خطرہ نہیں .... موجودہ ترقی پسندوں کے تلازمت سے قطع نظر ترقی پسند تحریک انسانی اساس ہے اور انسانیت کے لیے نفع بخش۔اس لیے بموجب آیت قرآنی انسانوں کو فائدہ پہنچانے والی چیز برقرار رہے گی۔'' 10

ڈاکٹر ریاض احمد نے لکھا ہے:

ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد ہندوستانی عوام میں ذہنی بیداری اور آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ترقی پسند تحریک کے پیش نظر سماجی ارتقا کا شعور کارفرما تھا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں کہا گیا:

''ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی اور لے جا رہے ہیں۔ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں۔'' 11

سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

''ترقی پسند تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہئے۔ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوشوں سے عوام میں شعور، حرکت جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں..... بغیر انسان دوستی، آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔اسی وجہ سے ہم اعلانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں سے جوڑنا چاہتے تھے۔ہم چاہتے تھے۔کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور کسانوں، غریب اور مظلوم عوام سے ملیں۔ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصّہ بنیں اُن کے جلسوں اور جلوسوں میں جائیں اور انہیں اپنے جلوسوں اور کانفرنسوں میں بلائیں۔اسی لیے ہم اپنی تنظیم میں اس پر زور دینا چاہتے تھے کہ دانشور کے لیے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قرب ضروری ہے۔'' 12

ڈاکٹر ریاض احمد کے مطابق اُردو ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد ہندوستانی عوام میں ذہنی بیداری اور آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا.... ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور جہالت اور توہم پرستی کو دور کرنا تھا۔ 13

یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جا چکی ہے اور خود ترقی پسند تحریک نے اس کا اعلان کیا ہے کہ اس کا مقصد ادب کے ذریعہ تعمیر جات اور انسان کے لیے نجات کا راستہ تلاش کرنا ہے۔'' 14

زبان و ادب پر ترقی پسند تحریک کا اثر:

ترقی پسند تحریک کی ابتداء 1936 میں پہلی کل ہند کانفرنس لکھنو سے ہوئی۔علیگڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک دوسری سب سے بڑی تحریک ادبی تحریک تھی۔اس تحریک کو پنڈت جواہر لال نہرو، پریم چند، ٹیگور اور عبدالحق کی نیک تمنائیں حاصل تھیں۔اس تحریک نے شعر و ادب کو ہماری سماجی و اجتماعی زندگی سے قریب تر کیا اور حقیقت نگاری کو ادب کا بنیادی وصف قرار دیا۔ڈاکٹر وسیم بیگم نے ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں ستر صفحات پر مشتمل مبسوط مضمون لکھا ہے اس میں سے تحریک کی بنیاد، اس کے مقاصد، ادب میں ادبیت کی اہمیت زبان و ادب پر تحریک کے اثرات کے بارے میں چند اقتباسات کو ذیلی عنوانات لگا کر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

1)ترقی پسند تحریک کی بنیاد مارکسی نقطہ نظر پر ہے:

''مارکس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کوئی بھی چیز خلا میں پیدا نہیں ہوتی ۔ہر کام کے پیچھے توجہ اور اس کے ساتھ محنت کارفرما ہوتی ہے مگر ہر معاشرے میں اس کا اطلاق اسی انداز سے ہوتا ہو یہ ضروری نہیں ۔محنت اور مشقت کر کے مزدور اور کسان طبقہ اپنا پیٹ پالتا ہے ۔جو ذرائع پیداوار کے مالک ہیں وہ سارا منافع کھا جاتے ہیں ۔محنت کش طبقہ کو صرف اتنا پیسہ دیا جاتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں ۔مارکس کا سوچنا یہ تھا کہ جو مزدور یا محنت کش طبقہ ہے اس کو اس کے کام کے مطابق اجرت ملنی چاہئے ۔اس نظریے کو اس نے Exploitation surplus values کا نام دیا اور اس کے خلاف احتجاج کیا۔ترقی پسند تحریک کی بنیاد مارکسی نقطہ نظر ہے''.... آزادی کے بعد اُردو غزل:تہذیبی مضمرات،ادبی تحریکات اور اہم شعراء(صفحہ 106)

2)انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقاصد:

''انجمن ترقی پسند مصنفین ادبی تحریک کو عوام سے قریب لانا چاہتی تھی ۔اس کے عملی طریقے ادیبوں کو عوام کے مسائل پر غور وفکر کرنا کہ وہ کیا ہیں اور کیوں ہیں؟اس کا استحصالی قوتوں کے رویے سے کیا رشتہ ہے ۔اس سے عوام کی قوت کارکردگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور پیداور چاہے وہ کھیت سے ہو،کارخانوں سے ہو یا تجارتی اداروں سے اس میں عوام کا،محنت کش اور مزدور طبقہ کا contribution کیا ہوتا ہے اور اس کے فوائد میں وہ کتنا شریک رہتے ہیں ۔یہ بات متوسط طبقے کے سامنے بھی آنی چاہئے اور اعلیٰ طبقے کے سامنے بھی....''

3)ادب میں ادبیت کی اہمیت بھی مسلمہ:

''.....زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ادب کے رشتے سے جو بات کہی جائے موضوع کچھ بھی ہو لیکن بیان میں ادبیت کے پرکشش اور خوش روش پہلو موجود ہوں بہ صورت دیگر وہ صحافت،اخباری سیاست اور جلسے جلوسوں کا نمائندہ ہو کر رہ جائے گا، ادب نہ رہے گا یعنی ادب کو لازمی طور پر ادب تو ہونا ہی چاہئے ۔اچھے خیالات اور زمانے،زندگی،ذہن سے وابستہ سوالات کا نمائندہ بھی ہونا چاہئے،صرف ادب نہ ہو..... آپ عوام تک اپنی بات پہنچایئے مگر ادیب ہونے کے رشتے سے ادبیت کو نظر انداز نہ کیجئے یعنی ادیب کو ادب نگار ہونا چاہئے ۔محض صحافت والا کردار اپنی تشہیر اور جماعتی غلبے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے .... حسن کا آرائشی معیار کیا ہوتا ہے اور غیر آرائشی کیا۔آرائشی معیار کو محض رد نہیں کیا جا سکتا۔سجاوٹ اپنی جگہ پر ایک پر کشش چیز ہے ۔اس سے انکار مناسب نہیں.....بنیادی خیال سے زیادہ اظہار کی قوت ہوتی ہے اور اس میں نیا پن،ندرت اور جدت پیدا کی جاتی ہے ۔اس لیے ایک زمانے کے شاعر اپنے موضوعات میں ہم رنگ اور ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہیں..... تحریروں میں اگر ہم صرف مقاصد کی ترجمانی کریں گے تو یہ ایک سماجی عمل ہو گا مگر ادب نہیں ہوگا،صحافت ہو جائے گی یا اس سے بھی کم درجہ کی کوئی ایسی تحریر جو ادب نہ ہو،صحافت بھی نہ ہو بلکہ ایک طرح کی اشتہار بازی ہو۔یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہم اپنے رشتے یا پڑھنے والے کو صرف اطلاعات نہیں دے رہے ۔چونکہ کوئی بھی ادب محض اطلاع نامہ نہیں ہوتا چونکہ اس کے ساتھ ذہنی آسودگی اور خارجی و داخلی سطح پر فکر و عمل کا وہ سلسلہ بھی وابستہ ہونا چاہیے جو

طمانیت بخش بھی ہو۔ترقی پسند ادب پر جو اعتراضات ہوئے وہ تمام تر نہیں مگر بیشتر اسی نوعیت کے تھے۔لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ آپ تو ادبیات کو حکم ناموں کے تحت تیار کراتے ہو ..... یہ ادب اور ادیب دونوں کے ساتھ ایک طرح کی نا انصافی ہے .... ادب میں خیالات اور نظریات کی اہمیت بنیادی ہو اور یہاں تک صحیح ہے۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ ادب کو ادبیت اور تخلیقی حسیت سے اگر آراستہ نہ کیا جا سکے تو پھر وہ عصری نظریات اور خیالات رہ جائیں گے' اچھا ادب نہیں بن سکتا اور ادب کا رشتہ اگر زندگی، تجربے اور تجزیے سے ٹوٹ جائے گا تو نئے خیالات نئے احساسات، نئی تشبیہیں اور نئے استعارے بھی ادب میں نہیں آئیں گے اور وہ روایت میں الجھ کر رہ جائے گا۔ظاہر ہے کہ ادب کو آگے بڑھانے اور نئی وسعتوں سے آشنا کرنے کے لیے نئے تجربے بھی ضروری ہیں اور نئے فکر و خیال تک پہنچنے کی کوشش بھی ..... اس کو شعریت، افسانویت یا انشائیت میں ڈھالنے کے لیے جمالیاتی عناصر بہر حال درکار ہیں۔موزونیت اور موسیقیت سے اس کا رشتہ ایک فطری رشتہ ہے وہ نہیں ٹوٹنا چاہئے اگر وہ ٹوٹ جائے گا تو خیالات، سوالات، جذبات اور احساسات اپنی جگہ پر رہیں گے مگر وہ تحریر، تحریر ہی رہے گی تخلیق نہیں بن سکتی..."

4) اسلوب:

.....اسلوب کا مسئلہ بہت اہم ہے۔کیا بات کی جائے یہ تو موضوع اور مواد سے متعلق صورت ہے۔اسلوب اظہار و بیان کا سلیقہ طریقہ ہے کہ وہ بات کیسے کہی جائے۔اس کے لیے کسی موزوں انداز کا اختیار کرنا خود موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔بے تکے اور بے ڈھنگے انداز سے کچھ کہنا موضوع اور مواد کے ساتھ نا انصافی ہے۔ہمارے اس وقت نئے لکھنے والے اپنے جوش اور جذبہ کا اظہار کرنے کے لیے یہ سوچتے تھے کہ ہم جن الفاظ میں چاہیں اپنی بات کہیں، اسلوب کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ہمیں تو بات کہنی ہے جبکہ عام بات اسٹیج کی بات' اخبار کی بات ایک طور الگ ہوتی ہے اور ادب کی صورت میں پیش کی ہوئی بات اس اعتبار سے الگ ہو جاتی ہے کہ وہاں اسلوب اور اس کی کشش و جاذبیت زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ادب کے ساتھ مقصد وابستہ کیا جاتا ہے اور تہذیب و تاریخ کے بعض مرحلوں میں ادب کا مقصد سے گہرا تعلق ضروری بلکہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔حالی کو اسی صورت حال سے گزرنا پڑا اور ترقی پسند تحریک کے زمانے میں زیادہ بڑے پیمانے پر ادب سے سماجی فلاح و بہبود کا کام لینے پر زور دیا گیا۔یہ سماجی نقطہ نظر سے کوئی بری بات نہیں تھی۔آخر ہم صحافت' اشتہارات' اسٹیج پر کی جانے والی تقریروں سے یہ کام لیتے ہیں۔لیکن ادب کو صرف مقصدیت کا پابند بنا دیا جائے تو اس کا خطرہ رہتا ہے کہ اس میں ادبی قدریں نمو نہیں پا سکیں گی۔جمالیاتی قدروں یا پر کشش عناصر کی اظہار و ابلاغ کی سطح پر موجودگی بہت ضروری ہے۔اسی خیال کے تحت اختر انصاری نے صحیح لکھا ہے "کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو مقصدی ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے"۔

5) مزدور اور دانشور کی باہمی زندگی میں توازن ضروری:

Consumersim دراصل ایک اصطلاح کے طور پر سامنے آنے والا نظریہ ہے کہ زیادہ پیداوار بڑھاؤ اور زیادہ منڈیاں پیدا کرو۔یہاں تک اس میں سچائی ضرور ہے کہ اس طرح لوگوں کو کام ملتا ہے۔ان کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور ان کی

زندگی مادی خوش حالی کی طرف آتی ہے لیکن اگر تمام دارومدار اسی پر رہ جائے تو پھر تصادم اور ٹکراؤ کی بھی نوبت آتی ہے اور قوموں میں شدید کشمکش پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔اس میں توازن کو برقرار رکھنا اور مال و دولت کے اصول (کذا۔حصول) کے بے پناہ خواہش کو کچھ خاص دائروں تک محدود رکھنا ہوگا۔آدمی بے تحاشا نفع نہیں کما سکتا۔فرد اپنی جگہ اعلیٰ وارفع ہوسکتا ہے لیکن سماج پر حکومت کرنے اور پنی بالادستی مسلط کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہونا چاہئے۔ایک مزدور کی صلاحیت کو یا ایک دانشور (Intellectual) کی صلاحیت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک متوازن زندگی گزارنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔یہی توازن بگڑتا ہے تو خارجیت کی لے بڑھ جاتی ہے اور داخلیت یعنی صبر،ضبط،خلوت نشینی اور اپنے اندر گم ہو جانا جیسی باتیں سماج میں زیادہ رواج پاتی ہیں اور توازن بگڑ جاتا ہے۔ان کا تعلق فرد اور جماعت کی نفسیات سے ہوتا ہے۔یوروپ میں وجودیت کی تحریک اسی کی دین ہے۔سماج سے مایوس ہو کر آدمی یا اپنے وجود سے انکار کرتا ہے یا پھر اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔دونوں صورتیں اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں کہ ان حالات میں آدمی نہ اپنے لیے کچھ ہوتا ہے نہ دوسروں کے لیے۔اگر چہ سماج کی بے حسی اور عوام کی غیر ذمہ دارانہ روش کے تحت یہ مرحلہ اکثر آجاتا ہے۔وجہ توازن کی کمی ہے اور اگر توازن باقی رہے تو قدروں کا ٹکراؤ ختم ہو اور ان کا تعاون ایک بہتر صورت کو جنم دے۔۔۔۔

6) آزادی کی جدوجہد یا مزدوروں کا استحصال وغیرہ اور پہلے سے موجود البتہ تحریک نے انھیں باقاعدہ اجتماعی شکل دے دی:

”....ترقی پسندی کے تحت جن باتوں کو لیا گیا وہ اپنی بعض صورتوں میں پہلے سے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ترقی پسندی نے اس کو ایک باقاعدہ اجتماعی نقطۂ نظر کی شکل دے دی۔ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ آزادی کی جدوجہد میں شامل ہیں وہ مزدوروں اور کسانوں کے حامی ہیں اور ان کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں۔ان کے پروگرم کا ایک اہم حصہ کارخانوں کے حالات،کارخانوں کا رویہ سماج کی ذہنی پسماندگی اور کسانوں نیز مزدوروں کا جو استحصال ہو رہا ہے اس کے خلاف آواز اٹھانا بھی ہے۔اقبال کی شاعری میں ہم جگہ جگہ اس کے عناصر دیکھ سکتے ہیں.....“

7) زبان وادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات:

i) نظم:

”غزل سے زیادہ نظم کی صورت میں نئے افکار سامنے آئے۔نظم میں ہیئت پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا موضوع اور مشمولات کو اہمیت دی گئی سے یہاں مراد ہے زمانے،زندگی اور اسی کے ساتھ کون سے ذہنی امور ہیں جو لکھنے والے شاعر کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔نئے ہیتی تجربے اس سے پیشتر بھی ہو چکے تھے اور اس عہد میں بھی ہوے لیکن ان ہیتی تجربوں کی وہ اہمیت نہیں جو اس مقصدیت سے وابستہ ہے جس کا تعلق سماج سے ہے ....ترقی پسند تحریک نے سب سے زیادہ جن اصناف کو متاثر کیا ان میں نظم زیادہ تھی۔غزل کی روایتی علامتوں میں نئے مقاصد کو پوری طرح سے سمویا نہیں جا سکتا تھا.....

ii)افسانہ اور ناول:

''ترقی پسند تحریک کا اثر سب سے زیادہ افسانہ اور ناول نے قبول کیا.... ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں افسانہ نگاری کی صنف کو بہت ترقی ہوئی۔اس دور میں ہندوستانی زندگی کی حقیقتوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور سیاسی و معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔سماج کو بدلنے کے لیے جن تخلیقی قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کو افسانہ نگار اپنے افسانوں میں پیش کرتے رہے....

iii) ڈرامہ:

''ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈرامہ کی صنف نے بھی خاصی ترقی کی۔

iv) طنز و مزاح:

ترقی پسند تحریک نے طنز و مزاح کو بھی متاثر کیا۔

v) تنقید:

ترقی پسند تحریک نے جہاں شاعری اور افسانے کو خاص طور پر متاثر کیا وہاں تنقید بھی اس کے نقطہ نظر اور طرز ادا کے اثر و تاثر سے آزاد نہیں رہی..... ہم دو طرح کے ادیب و نقاد دیکھتے ہیں۔ایک وہ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو ترقی پسندی کے ادبی دائرے یا فکری حلقے سے باقاعدہ وابستہ نہیں کیا مگر ذہنی طور پر ترقی پسند افکار و خیالات سے متاثر رہے جس کا اثر ان کی تنقیدوں میں بھی آیا۔اس کے برعکس یا مد مقابل وہ نقاد بھی ہیں جن کا تعلق بحیثیت ادیب یا ناقد یا صاحب فکر و نظر انسان کی اس تحریک سے رہا اور اس صورت میں اگر انہوں نے اس نقطہ نظر کی روشنی میں ادب کا جائزہ لیا تو ان کا یہ رجحان ادبی وفاداری کے تحت بھی تھا...'' 15

پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''ترقی پسندی ہر نوع کی استحصالی قوتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو عریاں کرتی، ان پر تبصرہ کرتی اور ان کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ترقی پسندی صرف مظلوم ہی کی حالت و کیفیات سے بحث نہیں کرتی بلکہ وہ ظالم کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے اور اس کے دل کو بھی کھول کر رکھ دیتی ہے۔'' 16

ترقی پسند تحریک کی دین: ترقی پسند تحریک نے حصول آزادی، عدل اور انصاف، حقوق نسواں اور زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور ظلم و ستم، استحصال، ہر قسم کی عصبیت اور فرقہ پرستی کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کیا۔بہت سے ادیبوں نے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔

فاطمہ تنویر لکھتی ہیں:

1) ترقی پسند تحریک کے لکھنے والوں نے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند کی۔سماج میں ظلم و جبر کی طاقتوں کو چیلنج کرنے اور جبر و استحصال کرنے والوں کا پردہ فاش کرنے کا مذاق عام ہو گیا.... انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادب اور زندگی کے رشتے کو مزید مستحکم کیا اور ادیب کو سماج کا ایک ذمہ دار فرد بنانے کی کوشش کی۔ 17

اختر حسین رائے پوری کے مطابق:

''ادیب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھلائیں۔ان جذبات پر نفریں کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو سکے۔'' 18

سجاد ظہیر نے اپنی تصنیف روشنائی میں ترقی پسند مصنّفین کے سامنے تحریک کے مقاصد اتنے واضح اور روشن انداز میں پیش کیے تھے کہ عتیق احمد''ان کے اندر بلا جھجک سماجی مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنالیا اور اپنی تخلیقی کاوشوں کو سیاسی سطح پر ادب سے باہر کی دنیا میں لڑی جانے وای جنگ آزادی میں شریک کرلیا وقت کی آواز بن گئی چنانچہ وہ بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ بر طانوی اقتدار اور مغربی سامراج کی چیرہ دستیوں کا بدلہ چکانے کے لیے صف بستہ ہو گئے۔اس دور کی ادبی اور شعری کاوشوں کا دوسرا ٹارگٹ اندرون ملک سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور راجاؤں اور مہاراجاؤں کی پھیلائی ہوئی غربت و افلاس اور سماجی استحصالی صورت حال کو مٹا کر ایک نئے متوازن اور منصف مزاج معاشرہ کی تشکیل نو بھی تھا۔'' 19

ڈاکٹر ریاض احمد نے لکھا ہے:

1۔''ترقی پسند ادبی تحریک سے آزادی نسواں کی تحریک (تانیثی تحریک) کو زیادہ تقویت ملی۔

2۔ترقی پسند ادبی تحریک نے حقیقت نگاری کو باضابطہ اُردو ادب میں روشناس کرایا۔حقیقت نگاری سے مراد ہے حقیقت بیانی سے کام لینا یعنی ادب میں حقیقت نگاری کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں اور جس شکل میں دیکھ رہے ہیں ان کی ہو بہو عکاسی کرنا۔حقیقت نگاری میں فنکار کا بنیادی مقصد زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرنا ہے۔ساتھ ہی سماج میں رونما ہونے والے مسائل کو بھی پیش کرنا ہے۔حقیقت نگاروں کا مقصد تھا کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو کسی مبالغے اور اسلوب کی فکر کیے بغیر قلم بند کیا جائے اور روزمرہ کی زندگی کو بطور خاص نمایاں کیا جائے''.....اُردو کے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں کسان،مزدور اور محنت کش طبقہ کو پہلی بار اپنا موضوع بنایا اور بھوک،افلاس اور غلامی کے خلاف تحریر کرنے گے۔'' 20

ڈاکٹر ریاض احمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس تحریک نے اس عہد کے ہندوستانی عوام اور ہندوستانی ادب کی تمام زبانوں کو متاثر کیا یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔

''ترقی پسندی ہر دہائی میں اپنا وجود منواتی رہی ہے کیوں کہ یہ عوامی تحریک ہے اور آدرش کی ترجمان بن کر زندگی اور سماج کے رشتے کی نئی معنویت سے آشنا کرا رہی ہے۔'' 21

پرفیسر رئیس انور رحمانی نے ترقی پسندی کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''کیا کوئی قلم کار ایسا بے حس ہوسکتا ہے جو سماجی بھید بھاؤ،طبقاتی کشمکش،غریبوں اور عام لوگوں کے استحصال اور مذہبی، صوبائی اور لسانی عصبیت اور اویزش کو برا نہ سمجھتا ہو اور اس کے خلاف آواز اٹھانے یا اس کی ادبی ترجمانی کرنے سے خود کو روک سکتا ہو....جب تک سماج انصاف اور مساوت کی بنیاد پر کروٹ نہیں لے گا ترقی پسندی ختم نہیں ہوگی۔ 22

کیا ترقی پسند تحریک زوال پزیر ہو چکی ہے؟ (تمثیل نو،جنوری تا جون 2006،صفحہ 27-26)

ڈاکٹر منصور عمر نے ترقی پسندی کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔

''ترقی پسند تحریک..... محض ادبی تحریک نہ تھی بلکہ اس کے ڈانڈے غلامی و محکومی، عدم مساوات اور مظلومی و استحصال سے جا ملتے ہیں۔ یہ تحریک بیک وقت ادبی تحریک بھی تھی اور سماجی و معاشی اور معاشرتی بھی اور سیاسی بھی ..... ترقی پسندی کی بنیاد اشتراکیت پر رکھی گئی تھی .... یہ تحریک عوامی تحریک بن گئی اور اس کے تحت پیدا ہونے والا ادب عوامی ادب کی صورت اختیار کر گیا..... سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے کل ہند اُردو کانفرنس حیدرآباد منعقدہ مئی 1956 میں بحث و مباحثے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ ''موجودہ حالات میں ادیبوں کے تقاضے بدل گئے ہیں اور چوں کہ ترقی پسند نظریہ ادب اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کی تشریح یا اس کے پرچار کی ضرورت باقی نہیں رہی''۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریکی سرگرمیاں جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ ترقی پسند ادبی تحریک ختم ہوگئی لیکن ترقی پسند ادب اور ادیب باقی رہے اور رہی بات ترقی پسندی کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کی تو وہ کل بھی تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی''۔ 23

پروفیسر شارب ردولوی نے ترقی پسند تحریک کی دین کے سلسلہ میں ادیب کی سماجی ذمہ داریوں، خواتین کے مسائل اور حقوق اور زبان کے فروغ کی نشاندہی کی۔

1) ''ترقی پسند شاعری نے زبان، اظہار و بیان اور فکر تینوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ترقی پسند تحریک کوئی سیاسی یا سماجی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی یا نہیں لیکن ادب میں اسے انقلاب لانے میں ضرور کامیابی ملی .... ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادیب کی انفرادیت کے ساتھ اس کی سماجی ذمہ داری کا بھی احساس دلایا اور اس نئی Aesthetics جمالیات پر زور دیا جو فن کے عصری تقاضوں پر اصرار کرتی ہے۔ اب اس شاعری میں اگر جمالیات یا تاثر کی کمی ہے یا وہ نعرہ بازی اور راست شاعری محسوس ہوتی ہے تو ہو وہ عجز شاعر ہے نہ کہ ترقی پسند شاعری کا عجز.....''

2) ''..... جوش، سردار جعفری، نیاز حیدر، کیفی اعظمی، فیض مجروح مخدوم، ظہیر کاشمیری، جاں نثار اختر، واحق جونپوری، منیب الرحمٰن، پرویز شاہدی، مطلبی فرید آبادی، حبیب جالب..... ان شعراء نے نظموں میں سماجی معنویت اور ادیب کی سماجی ذمہ داریوں پر زور دیا اور انفرادی و ذاتی شکست اور غم و مایوسی کے بجائے اجتماعی تمناؤں اور آرزوؤں میں اپنے بھی غم کا مداوا تلاش کیا.....

3) ایک اور نیا موضوع جو ترقی پسند فکر کا حصہ بنا وہ عورتوں کے مسائل تھے۔ ترقی پسند شاعری کے زیر اثر نہ صرف یہ کہ بہت بڑی تعداد میں شعر کہنے والی خواتین سامنے آئیں بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایسے مسائل اور ایسے سوالات اٹھائے جو اُردو شاعری میں اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھائے گئے تھے۔ ان سوالات میں سب سے بڑا سوال Male dominated society میں عورت کی اپنی شخصیت اور اس کے حقوق کا تھا اور دوسرا مرد کی بالادستی اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف احتجاج کا۔ ان شاعرات نے صرف احتجاج ہی نہیں کیا بلکہ اُردو شاعری کو ایک نئی زبان اور فکر دی۔ ان کی شاعری کے موضوعات بھی اُردو کے عام شعراء سے مختلف ہیں اور ان میں بڑا تنوع ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر زہرہ نگاہ، ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید، نسیم سید، حمیرا رحمٰن، بلقیس ظفیر الحسن، ساجدہ زیدی، پروین فنا سید، عشرت آفرین، ثمینہ

راجا،نزہت صدیقی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

4)ترقی پسند شعراء نے ایسے الفاظ وتراکیب کا بے محابا اور بے ساختہ استعمال کیا جن کا اس وقت تک اُردو کی شعری زبان میں استعمال غیر فصیح سمجھا جا تا تھا۔(جور، کہروا، ڈگمگ، مجور، بدروا، بجت بھینکر، تا نک دھن، کٹیا، چھپب، اتّی پتّی، پھیلا رہا۔شعراء نیاز حیدرا(نظم تانڈو) 'ساحر، مسعود اختر، وامق جونپوری) اس طرح کی بہت سی نظمیں اور گیت اس زمانے کے شاعری میں مل جائیں گے۔زبان کی اس عوامی لے کو نظیر اکبر آبادی کے عہد میں اسی مدنی تہذیب نے رد کر دیا تھا لیکن ترقی پسند شعرا نے اس کے ذریعہ آنے والے لسانی تجربوں کے لیے رہیں کھول دیں۔" 24

پرفیسر رشید احمد صدیقی نے 1953 میں پٹنہ میں منعقدہ اُردو کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

"میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد کچھ بھی رہا ہو گذشتہ پندرہ سولہ سال میں اُردو میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے نئے اور کامیاب، مفید تجربے ہوئے ہیں اتنے اُردو ادب کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے۔اس قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود میں آئیں جن کا اُردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔" 25

غریبوں پر ظلم، نابرابری، خون ناحق کے خلاف لڑائی اور احتجاج کو ڈاکٹر مسرت جہاں نے ترقی پسند تحریک کی دین بتلایا ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

"ترقی پسند تحریک کا دائرہ دہائیوں یا کسی صدی تک محدود نہیں ہے بلکہ ازل سے ابد تک لڑی جانے والی حق و باطل کی لڑائی ہے۔روئے زمین پر جب کبھی ناحق کا خون بہے گا، اس کے خلاف آواز بلند کرنے والے سامنے آئیں گے۔جب کبھی غریبوں پر ظلم ہوگا غریبوں کے حامی اور ان کے ہم نوا احتجاج کریں گے۔جب تک انسانیت باقی ہے، انسان دوست افراد باقی ہیں، اس وقت تک یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہے گی۔اس لیے یہ محض تحریک نہیں بلکہ ایک استعارہ ہے نابرابری کے خلاف دنیا میں لڑی جانے والی جنگوں کی ایک علامت ہے۔" 26

عتیق اللہ کے مطابق:

"ترقی پسند تحریک نے پہلی دفعہ فکر نہیں بلکہ نظام فکر کو ادب سے ہم آہنگ کیا۔" 27

پچھڑے ہوئے طبقے، مزدور، اور خواتین کو ان کا حق دلانے میں ترقی پسند تحریک نے آواز بلند کی۔

احسان حسن قمطراز ہیں:

"ترقی پسند نقطہ نظر کے زیر اثر سماج میں صدیوں سے پامال ہوتے آرہے طبقے کے حق و انصاف کی آوازیں بلند کی گئیں ....ترقی پسند شاعری کے تحت تانیثیت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔عورتوں کے حقوق و ان کی آزادی کے مطالبات پر تقریباً ہر بڑے ترقی پسند شاعر نے قابل قدر تخلیق پیش کی ہے ....ترقی پسند شاعری نے محنت کش مزدور طبقہ کے مقام کو بلاشبہ بلند کیا ان کے حق و انصاف کو آواز بلند کی جس سے سماج کے اس نچلے طبقے کی اہمیت و افادیت کا اعتراف لوگوں کو کرنا پڑا۔....ترقی پسند شاعری ان معنوں میں اہم ہو جاتی ہے کہ اس میں شعری ہیئت کے مختلف تجربے پیش کیے گئے۔مثلاً آزاد نظم، نظم معریٰ،

نثری نظم وغیرہ کو ان اصناف کی ابتداء تو شرر وغیرہ کے زمانے سے ہو چکی تھی، مگر ترقی پسند شاعری نے انھیں رائج کر دیا۔ اس طرح ترقی پسند شاعری میں انقلابی تبدیلیوں والی شاعری رہی اس نے سماج، سیاست، ثقافت اور معاشی معاملات تک غرض ہر شعبۂ حیات انسانی کو اپنا موضوع بنایا اور اظہار فن کے کمالات پیش کیے۔'' 28

(شاعری اور ترقی پسندی، شعاعیں، بنگلور، مئی 2010، صفحہ 9-8)

''رشید احمد صدیقی صاحب نے ترقی پسند تحریک کو اس بات کی داد دی تھی (حالاں کہ وہ اس تحریک کے بہت بڑے مخالف تھے) کہ ترقی پسند تحریک نے فرقہ پرستی کے خلاف جو کارنامہ کیا ہے وہ اُردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے۔'' 29

ترقی پسند تحریک سے علی سردار جعفری کی وابستگی اور خدمات:

commitment کے بارے میں ڈاکٹر وسیم بیگم رقمطراز ہیں:

''commitment دراصل جذباتی اور ذہنی وفاداری ہے۔ کوئی بھی کام بغیر اس وابستگی اور وفاداری کے نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ذہنی تعلق ہوتا ہے۔ اس میں ذوق وشوق بھی حصہ لیتے ہیں۔ ماحول اور حالات کے تقاضے میں بھی معذوریاں اور مجبوریاں بھی ہوتی ہیں لیکن commitment کی سوچ اس میں ہے کہ وہ آزاد خیالی، نظریاتی اور وابستگی اور وفاداری نیز فکر ونظر کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ آنکھ بند کر کے کوئی commitment نہیں ہوتا اور نہ ہی مجبوریوں کا نام commitment ہے۔ اس سے ایک نقطۂ نظر کی تائید اور تردید ہی مقصود نہیں ہوتی، زندگی اور ذہن کو اس سانچے میں ڈھالنا بھی ہوتا ہے۔ محض واقفیت کافی نہیں۔ واقفیت کے ساتھ اختیار اور اختیار کے ساتھ اعتبار بھی ضروری ہے..... جامد نقطۂ نظر جس کی بنیاد کم علمی، کم فہمی اور کم فہمی پر ہو اس کو نظریہ کہنا مشکل ہے۔ وہ کوئی وقتی فیصلہ ہوتا ہے بلکہ عمل ہوتا ہے، جب تک کہ اعلیٰ مقصد، دور اندیشی، انسانیت کی فلاح کا تصور اس میں موجود نہ ہو وہ نہ کوئی اعلیٰ انسانی نظریہ ہوتا ہے اور نہ اس طرح کی وفاداری یا commitment جس کے بغیر زندگی کے اعلیٰ تقاضوں کا احساس اور ادارک ایک بے معنی بات ہو کر رہ جاتی ہے.....

.....ترقی پسند تحریک سے وابستگی ایک ہی انداز نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ باقاعدہ اس کے رکن تھے۔ کچھ کا تعلق ذہنی روش و کشش سے تھا اور کچھ نے اس کا اثر دور رہ کر قبول کر لیا تھا۔ جن لوگوں کا نام ترقی پسندی کے سلسلہ میں آتا ہے ان کو ترقی پسند نظریہ کہ پھیلاؤ اور وسعت کے دائرہ میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مگر ان سب کا ذہن اس تحریک سے وابستہ ہو، ایسا نہیں تھا۔ وہ افسانہ نگار بھی ہو سکتے ہیں، شاعر بھی اور بڑی حد تک تنقید نگار بھی.....'' 30

ترقی پسند تحریک میں اپنی شمولیت کے بارے مس حسن عابدی کو جون/ 1991 میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے علی سردار جعفری نے کہا ''1938 میں جب کلکتہ میں ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کانفرنس ہوئی اس وقت میں اس میں شریک ہوا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔'' 31

عمر رضا رقمطراز ہیں:

''یوں تو سردار جعفری علی گڑھ ہی سے اس تحریک میں شامل تھے لیکن جب وہ لکھنؤ آئے تو پہلے سے زیادہ فعال ہو گئے اور ترقی پسند ادب پر خصوصی توجہ دینے لگے تھے۔'' 32

قیصر تمکین کے مطابق:

''علی سردار جعفری کا نام ترقی پسند ادب کی تحریک اور نئی شاعری سے اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کا ذکر دوسرے کی تفصیل بتائے بغیر نامکمل رہتا ہے''۔ (سردار جعفری: ایک نذرانہ عقیدت، کتاب نما، جون 2002 صفحہ 22)

1) علی گڑھ میں ترقی پسند مصنّفین کا پہلا جلسہ 1936 کے اوائل میں منعقد ہوا اس جلسہ میں سردار جعفری نے ایک مقالہ بعنوان ''جدید اُردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' پڑھا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ اس وقت وہ وہاں کے طالب علم تھے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں خاص طور پر اشتراکیت سے دلچسپی لینے والے طالب علم جمع ہو گئے تھے۔ جعفری اور جاں نثار اختر کے علاوہ حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ کی بدولت کئی سال پہلے ہی سے یہاں نئے ادبی رجحانات کو ترقی مل رہی تھی''۔ 33

2) لکھنو میں منعقدہ 9/10/11 اپریل 1936 کو منشی پریم چند کی صدارت میں ترقی پسندوں کی پہلی کل ہند کانفرنس میں علی سردار جعفری نے شرکت کی۔

3) مارچ 1938 میں ترقی پسند ادیبوں نے الہٰ آباد میں دوسری کانفرنس منعقد کی جس میں پنڈت نہرو نے تقریر کی اور ٹیگور کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس میں سردار جعفری بھی شریک تھے۔

4) 1938 میں دہلی میں سردار جعفری بی اے سال آخر کے طالب علم تھے۔ انہوں نے ایک مضمون ''نوجوانوں کے ادبی رجحانات'' لکھا جو عربک کالج میگزین میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے ترقی پسند ادب کی زبردست حمایت کی تھی۔

5) دسمبر 1938 کے آخری ہفتے میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ملک راج آنند نے کی تھی۔ اس میں سردار جعفری بھی شریک تھے۔

6) سردار جعفری نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا لیکن اپنا بیشتر وقت اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو دیا کرتے تھے۔

7) سردار جعفری نے سبط حسن اور مجاز کے ساتھ مل کر ایک ادبی رسالہ ''نیا ادب'' اپریل 1939 میں جاری کیا جس کی ادارت ان تینوں کے ذمہ تھی۔ یہ رسالہ بہت جلد ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کا ترجمان بن گیا۔ اس کے پہلے ہی شمارہ میں سردار جعفری نے ایک مضمون ترقی پسند مصنّفین کی تحریک شائع کیا۔

8) سردار جعفری کا افسانوی مجموعہ ''منزل'' ترقی پسند نقطہ نظر کی حمایت کرتا ہے۔ اس کا انتساب ''آنے والے انقلاب'' کے نام کیا گیا۔ ڈاکٹر عمر رضا نے لکھا ہے ''منزل'' میں شامل ڈرامہ اور دیگر تمام افسانوں کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے اعلان نامے پر کس حد تک عمل کیا اور اس کے مطابق انہوں نے اپنی تخلیقات پیش کرنے کی کوشش کی۔'' 34

9) نومبر 1940 میں سردار جعفری ایم اے سال آخر کے امتحان سے قبل جنگ کی مخالفت اور انقلابی شاعری کرنے کے

جرم میں گرفتار کے گئے اور انھیں لکھنو ڈسٹرکٹ جیل اور پھر بنارس سنٹرل جیل بھیج دیا گیا جون 1941 میں رہا ہوئے، بلرام پور پہنچے تو وہاں بھی چھ مہینے نظر بند کر دیے گئے۔ اسی سال سردار جعفری لکھنو یونیورسٹی میں ایم اے (سال آخر) کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت چاہی لیکن انھیں اجازت نہیں ملی۔

10) مئی 1942 میں جاپانیوں نے چٹ گاوں پر زبردست بمباری کر کے جنگ کو ہندوستان کے دروازے تک پہنچا دیا تھا اس میں کئی ہندوستانیوں کا خون بہا۔ اس ماحول میں مئی 1942 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ دیگر ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ علی سردار جعفری نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں اتحاد اقوام کا ساتھ دینے اور فاشزم کے خلاف متحد ہونے کا اعلان کیا گیا اور برطانوی سامراج کی مذمت کی گئی کہ ان نازک حالات میں بھی وہ ہندوستان کو آزاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

11) جون 1942 میں کمیونسٹ پارٹی نے اپنے صدر دفتر بمبئی سے ایک انگریزی ہفتہ وار "People's War" جاری کیا اور اس نے گیارہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اسے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ سردار جعفری، سجاد ظہیر کے مشورہ پر قومی جنگ میں کام کرنے کے لیے لکھنو سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ رکنیت حاصل کی۔ رفتہ رفتہ سبط حسن، مجاز، کیفی، محمد مہدی، ڈاکٹر محمد اشرف، ظ۔ انصاری اور کلیم اللہ وغیرہ بھی بمبئی آ گئے اور وہ ترقی پسند ابی تحریک کا مرکز بن گیا۔

12) مذکورہ بالا شاعروں اور ادیبوں کے لکھنؤ سے بمبئی چلے جانے کی وجہ سے لکھنؤ سے نکلنے والا رسالہ ''نیا ادب'' اپنے چند پرچوں کی اشاعت کے بعد بند ہو گیا۔ 1943 میں جب سبط حسن بمبئی آ گئے تو اسے سہ ماہی شکل میں بمبئی سے جاری کیا گیا۔

13) یہی وہ زمانہ ہے جب چٹ گاوں پر جاپانیوں کے حملوں سے متاثر ہو کر سردار جعفری نے ڈرامہ ''یہ کس کا خون ہے'' تحریر کیا جو 1943 میں شائع ہوا۔ اس ڈرامہ میں سردار جعفری نے ہندوستانیوں کی انگریزوں اور جاپانیوں کے خلاف ابھر رہی بغاوتوں کو اجاگر کیا اور ان میں حوصلہ پیدا کرنے کی سعی کی۔

14) 4 اکتوبر 1945 میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں سردار جعفری نے شرکت کی۔ اس کانفرنس سے متعلق کرشن چندر نے ایک رپورتاژ ''پودے'' لکھا اس میں بتایا گیا کہ سردار جعفری، کیفی، ساحر اور مخدوم کے کمٹمنٹ نے کس طرح ترقی پسند ادب کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد مزدوروں کے جلسے میں سردار، کیفی اور ساحر نے اپنی نظمیں سنائیں اور مزدوروں کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں یقین دلایا کہ وہ بہ نفس نفیس ان کے ساتھ ہیں۔

15) 1946 میں احمد آباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی اس میں تقریر کی اور کانفرنس کے بعد منعقدہ شاعرہ میں اپنی انقلابی نظمیں پڑھیں۔ سامعین نے بار بار پڑھوایا اور ایک سماں بندھ گیا۔

16) 1946 میں سردار جعفری نے مثنوی ''جمہور'' شائع کی۔ اس مثنوی کے ذریعے سردار جعفری نے ہندوستان نوجوانوں، مزدوروں، کسانوں بلکہ پورے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے ظلم وستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور

انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے متحد ہونے کی دعوت دی۔انہوں نے نوجوانوں کوحوصلہ دیا کہ انگریزوں کے ظلم کے شکار نوجوان دنیا میں انگریزوں کے خلاف پامردی سے بغاوتیں کررہے ہیں اوراپنا پرچم بلند رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ظلم کرنے والوں کوان کے انجام سے بھی واقف کرایا۔ ہندوستانیوں کو جمہوریت کے فوائد اور شہنشاہیت وسامراجیت کے نقصانات سے آگاہ کیا،ملک کی عظمت وسالمیت کے لیے اتحاد کی دعوت بھی دی ہے۔

17) دسمبر 1947 کے آخری ہفتہ میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی ۔اس میں سردار جعفری نے شرکت کی ۔کانفرنس کے بعد تنظیمی جلسہ میں طے کیا گیا تھا کہ بمبئی میں باقاعدہ مرکزی دفتر قائم کیا جائے سردار جعفری کوانجمن کے عارضی جنرل سکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی تھی ۔اس وقت ملک ذہنی کشمکش سے گزر رہا تھا۔قحط بنگال کے اثرات ہنوز موجودہ تھے۔تلنگانہ کے کسانوں کے ساتھ حکومت کا رویہ،اُردو ہندی مسئلہ،فرقہ وارانہ فسادات کے بعد بے یقینی اور خوف کی فضا،قیدو بند کا سلسلہ جاری تھا۔خودسردار جعفری کے حالات بھی پریشان کن تھے جیسے مکان کی تلاش اور بعدازاں ایک کمرہ کے تکلیف دہ مکان میں رہائش اختیار کرنا شامل تھا۔لیکن سردار جعفری نے ملک کے دگرگوں حالات میں تحریک کونئی روشنی دی، ترقی پسند ادیبوں کوان مسائل پر بے باکانہ انداز میں لکھنے کی ترغیب دی،خودبھی بہت لکھا۔

18) حکومت ہند نے کمیونسٹ پارٹی کوغیر قانونی قرار دے دیا تھا۔سردار جعفری 10 راپریل 1949 کوگرفتار کرلیے گئے اور ڈیڑھ سال بعد جولائی 1950 میں رہا ہوئے اس دوران بھیمڑی میں 27 تا 29 مئی 1949 میں ترقی پسند ادیبوں کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی ۔سردار جعفری گرفتاری کے سبب اس میں شریک نہ ہوسکے اس کانفرنس میں انجمن کے نئے جنرل سکریٹری کا انتخاب ہوااور ہندی کے مشہور نقادرام بلاس شرما کواس کی ذمہ داری سونپی گئی ۔اس کانفرنس میں بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پسندوں نے 1936 کے اعلان نامے کوناکافی سمجھ کرایک نیااعلان نامہ منظور کیاترقی پسندوں نے جمہوری قدروں کی حفاظت پر زوردیا،ادب میں انفرادیت،اسلوب پرستی اور رجعت پرست رجحانات سے گریز کرنے پر زوردیا گیا،سامراج اورسرمایہ داری کے خلاف جنگ میں کوئی سمجھوتہ نہ کرنے پر زوردیا گیا،ادب میں گہرائی پیدا کرنے کے لیے جدتا کے قریب آنے اورعوامی ادب کوفروغ دینے پر زوردیا گیا۔عظیم ادب کہلائے جانے اورعوام کی توجہ کوحاصل کرنے کے لیےاسے اعلیٰ سماجی مقصد کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا،ترقی پسند ادب کے لیے یہ کہا گیا کہ وہ عظیم انسانی آدرشوں سے کسب نور کرتا ہے جیسے امن،محبت،قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش،انسان دوستی، جنگ اورانسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرنا اورادب کےان عظیم اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی تحریروں میں سنجیدگی،تاثر،مقبولیت اور خوبصورتی پیدا کریں تاکہ عوام کی محبت انھیں حاصل ہوسکےاوراوران میں یہ یقین پیدا ہوسکے کہ ان کا مستقبل معتبر ہاتھوں میں ہے۔علی سردار جعفری اس اعلان نامے کے مطابق تخلیقات پیش کرنے پر زوردیتے رہےاور جہاں کہیں انھیں ابہام نظر آیا اُس پر کڑی تنقید کی اورکہا کہ شاعری کوزیادہ براہ راست اور برملا ہونا چاہئے ۔انہوں نے جذبی نظم نیا سورج اور فیض کی نظم 15 راگست کے ابہام اوراستعاروں کے پردوں پرتنقید کی اور بتایا کہ یہ شاعری کے سماجی مقصد سے دوری اور ہیت پرستی کا نتیجہ ہے۔انہوں نے عوامی ادب کی تخلیق پر زوردیا،مزدوروں اور عام انسانوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق

الفاظ،تشبیہات،استعارےاورعلامتوں کےاستعمال پرزوردیا۔

19)سردارجعفری نے آزادی کے بعدفرقہ وارانہ فسادات ، ملک کی افراتفری کے لیےحکومت پرتنقید کی،دنیا کےان ملکوں کی حوصلہ شکنی کی جو جنگ جیسے حالات پیدا کرنے کےذمہ دار تھے،پوری دنیا کےمزدوروں کواتحاد کی دعوت دی اورظلم وبربریت کےخلاف صف آراہونے کی بات کہی۔اسی طرح عالمی یکجہتی اورحب الوطنی کےجذبات کےفروغ کی بات کی۔ترقی پسندتحریک کےاغراض ومقاصدکوعام کرنے میں سردارجعفری کااہم رول رہاہے۔

20) ترقی پسندوں کی بھیمڑی کانفرنس منعقدہ مئی 1949 میں جواعلان نامہ جاری کیا گیا تھااس پرانجمن ترقی پسند مصنفین نے ادیبوں پرجابجااحتساب کرناشروع کردیا تھاجس کی وجہ سےجذبی،اختر الایمان،خلیل الرحمٰن،اعظمی اورمنٹوجیسے ادیبوں نےعلاحدگی اختیارکرلی۔اس دورمیں ترقی پسندتحریک کےرہنما کی حیثیت سےعلی سردارجعفری کوعموماًہربات کاذمہ دار ٹھہرایاجاتا۔

ترقی پسندتحریک پرجواعتراضات کیے گئےان میں دواعتراضات اورسردارجعفری کےجوابات کاذکروسیم بیگم نے کیاہے ملاحظہ کیجئے۔

''ترقی پسندتحریک پرایک بڑااعتراض یہکیا جاتاہے کہاس کےموضوعات پہلے سےطےشدہ ہیں اس لیےان عنوانات پراچھاادب تخلیق نہیں کیاجاسکتا۔ایک اوراعتراض اس پریہ بھی ہے کہ تنظیم یاجماعت ایک موضوع دےدیتی ہےاوراسی کے تحت ترقی پسندادیب یاشاعرادب یاشاعری تخلیق کرنے پرمجبورہوتاہے۔

ان اعتراضات کےحوالے سےسردارجعفری لکھتےہیں:

''ترقی پسندتحریک کاوہ ادب جوزندہ ہےاورزندہ رہےگاتاریخ ادب کاعظیم کارنامہ ہے۔اورکوئی استدلال اس کومٹانہیں سکتا۔مستقبل کی راہوں میں یہ ادب مشعل راہ ہوگا۔ 35

21) کل ہندانجمن ترقی پسند مصنّفین کی 6/7/8/مارچ 1953 کودہلی میں چھٹی کانفرنس کاانعقادعمل میں آیا۔ اس میں کرشن چندرکوانجمن کاجنرل سکریٹری منتخب کیاگیا۔پچھلےاعلان نامے پرنظرثانی کی گئی اورایک نیااعلان نامہ جاری کیا گیا۔اس اعلان نامہ میں جن باتوں پرزوردیا گیا تھاان میں دنیا کی تمام قوموں کےساتھ دوستی اوربرادرانہ امن قائم رکھنے، ادب کوانسان دوستی،زندگی پریقین،روشن مستقبل کی امیدوں کاعلمبردار بنانااوراسی کےساتھ ساتھ نسل وفرقے کی بنیادپر نفرت،بےمقصدزندگی،شکست پسندی،فناپسندی،جبرپرستی جیسے رجحانات کوروکناشامل ہے۔

سردارجعفری انجمن اوراس کےمنشور کےمطابق اپنی تخلیقات پیش کرنے پرسارازورصرف کررہے تھےوہ اپنی کمٹمنٹ کےلیے بےحدمشہورتھے۔

22) آزادی سےقبل یہ تحریک بلاشبہ ہندوستان کےتقریباً تمام زبانوں کی ایک مشترکہ تحریک تھی لیکن آزادی کےبعد بدلے ہوئے حالات میں اس میں حیرت انگیزتبدیلی آئی۔خاص طورسے یہ تحریک رفتہ رفتہ زبانوں میں بنٹ گئی جس کےنتیجے میں اُردو کی بھی ایک الگ ترقی پسندتحریک یا اُردو کےترقی پسند مصنفین کی ایک الگ انجمن قائم ہوگئی۔اگرچہ سجادظہیر نےاسے

ازسرنو منظم کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ یہ انجمن اب صرف اُردو کی ہو کر رہ گئی تھی۔البتہ اس میں درآئی انتہاپسندی کو خیرباد کہہ دیا گیا..... ڈاکٹرعبدالعلیم اور سجاد ظہیر کی درج بالا تجاویز کے بعد یہ تحریک اب ایک نئی منزل کی جانب رواں دواں ہوئی۔اس میں اگر ایک طرف سجاد ظہیر، کرشن چندر، مخدوم محی الدین اور علی سردار جعفری جیسے اشتراکی ادیب تھے تو دوسری جانب راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی اور علی جواد زیدی جیسے ادیب بھی تھے جو مارکسزم کے انقلابی نظریات میں یقین نہیں رکھتے تھے لیکن پھر بھی ترقی پسند کہلائے۔اول الذکر ادیبوں میں سردار جعفری کا نام سرفہرست ہے۔یہ دیگر بات ہے کہ بعد میں خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی سے اخراج کے بعد ان میں بھی اعتدال اور نرم رویہ در آنے لگا۔ پارٹی کی سطح پر بیزاری ضرور پیدا ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ بعد کی تخلیقات میں پارٹی کا ''پرچار'' نہیں کے برابر ہے۔البتہ ترقی پسند نظریے (مارکسی نقطۂ نظر سے) کی اشاعت کا بیڑا بہر حال انہوں نے اٹھایا اور اس زمانے میں بھی جب کہ ترقی پسند تحریک بہت سارے نشیب و فراز سے گزر رہی تھی، سردار جعفری نے اس کے میر کارواں کا رول ادا کیا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا''۔

23) دسمبر 1966 میں سردار جعفری نے ترقی پسند مصنّفین کی ایک کانفرنس بمبئی میں منعقد کی جس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی۔اس میں غلطیوں کا اعتراف بھی کیا گیا اور انجمن کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔

24) 1967 سے سردار جعفری نے اپنی ادارت میں سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' نکالنا شروع کیا جو ترقی پسند ادیبوں کی ترجمانی کرنے لگا۔اس میں تقریباً تمام نظریات کے حامل ادیبوں کی شعری و ادبی تخلیقات شائع ہونے لگیں۔

سردار جعفری کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا مختلف ادیبوں نے اعتراف کیا ہے:

ڈاکٹر عمر رضا لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک سے اپنی ابتدائی وابستگی کے بعد سے لے کر اخیر تک اس کا ساتھ دیا اور اس دوران جتنے نشیب و فراز سے یہ تحریک گزری اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔حالات کے تحت اپنے رویے میں تبدیلی بھی پیدا کی لیکن خیالات کی سطح پر وہ مستقل وابستہ رہے البتہ پیش کرنے کے ڈھنگ اور طریقۂ کار میں ضرور تبدیلی پیدا کی اور اس کی ترویج و اشاعت میں ان کے مذکورہ پرچے (گفتگو) نے اہم کردار ادا کیا.....

.....بنیادی طور پر سردار جعفری نے ان مارکسی نظریات سے آخری دم تک منہ نہیں موڑا جس کے تحت عالمی امن، اتحاد اور انسانیت کی بقا پر زور دیا جاتا ہے۔ان خیالات کو انہوں نے ایک نئے ادراک، ایک نئے یقین، ایک نئے اور قدرے نرم لب و لہجے میں ہمیشہ پیش کیا اور پیش کرنے کی وکالت کی جسے انہوں نے ترقی پسند اور ترقی پسند تحریک سے تعبیر کیا تھا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علی سردار جعفری نے ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے جس طرح اپنی وابستگی قائم کی اس پر اگرچہ اپنی عمر کے آخری ایام تک وہ قائم و دائم رہے لیکن جوں جوں وقت اور حالات میں تبدیلی آئی توں انہوں نے اپنی اصلاح بھی کی اور تحریک میں بہت سی صحتمند باتوں کو شامل کر کے اسے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جس میں بلاشبہ وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔''

اپنی کتاب ''پتھر کی دیوار'' کے دیباچہ میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''میں اپنے نالہ و بکا، آہ فریاد سے اس غموں سے بھری دنیا کو اور زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔ سماج کی انحطاطی طاقتیں تو یہ چاہتی ہیں کہ اس زہر آلود فضا کو اور زیادہ زہر آلود کیا جائے لیکن ترقی پسند طاقتوں کا نشانہ یہ ہے کہ فضا کو زہر سے صاف کر کے پاکیزہ کر دیا جائے''۔

سردار جعفری کے نزدیک زندگی کا تصور کیا تھا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سرور الہدیٰ مائل نے لکھا:

''علی سردار جعفری کے نزدیک زندگی کا جو تصور تھا وہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ ان کے نزدیک زندگی کی خوبصورتی کی تعریف یہ تھی کہ اس زمین پر بسنے والا ہر شخص عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ محبت اور رواداری کا ایسا ماحول قائم ہو کہ ہم ایک دوسرے کی خوشیاں بھی بانٹ لیں اور دکھ درد بھی۔'' 38

انور ظہیر خاں نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں سردار جعفری کی ترقی پسند تحریک کے تئیں ان کی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

''سردار جعفری ایک عالی اور غالی ترقی پسند ہیں۔ کبھی کبھی یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سردار جعفری ترقی پسند تحریک ہیں یا ترقی پسند تحریک سردار جعفری۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تحریک کے سلسلہ میں سب سے زیادہ نام سردار جعفری کا اچھلا یا اچھالا گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح چاندنی کے بغیر تاج محل کی خوبصورتی پھیکی ہے اس طرح ترقی پسند تحریک بہت کچھ ہوتے ہوئے موصوف کے بغیر نامکمل سی لگتی ہے۔ اگر ان کی ذات سے اسے منہا کر دو تو یہ بھی ادھورے ادھورے سے معلوم پڑتے ہیں لیکن آج ترقی پسند تحریک تقریباً مردہ قرار دی جا چکی ہے۔ اس تحریک کے انجر پنجر سردار جعفری کے بوڑھے کاندھوں پر دھرے ہوئے ہیں گویا دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی ہے شاید اسی کو کوکہتے ہیں ''وفاداری بشرط استواری۔'' 39

ڈاکٹر عمر رضا نے مذکورہ اقتباس درج کر کے لکھا ہے۔

''ترقی پسند تحریک سے سردار جعفری کی وابستگی کے متعلق انور ظہیر نے جو باتیں لکھی ہیں اس سے تو صد فی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ آج ترقی پسند تحریک تقریباً مردہ قرار دی جا چکی ہے غلط بیانی پر مشتمل ہے۔'' 40

ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں سردار جعفری کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا۔ سردار جعفری ساری زندگی ترقی پسند نظریۂ ادب پر قائم رہے۔

''صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے ایک جلسہ کے بارے میں رفعت سروش نے لکھا ہے:

اختر الایمان، میراجی، مدھوسودن اور ظ۔ انصاری ان چار ادیبوں کی ادارت میں ایک ماہانہ رسالہ ''خیال'' نکلا۔ خالص ادبی اور معیاری رسالہ ''نیا ادب'' نکل رہا تھا جس پر کمیونسٹ پارٹی کے نظریات کا غلبہ تھا اور دار و رسن کا بازار گرم تھا۔ جس پرچے کے ایڈیٹر میراجی ہوں اس میں جنسیات زدہ ادب کا نہ چھپنا تعجبات میں سے ہے۔ ''خیال'' ہمہ رنگ ادبی رسالہ تھا اور اس میں سیاسیات کا گزر نہیں تھا۔ پرچے کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی جو ''نیا ادب'' کی ساکھ پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ چنانچہ

دار و رسن والے خدائی فوجدار بن کر میدان میں نکل آئے“.....

”۔۔۔صدیقی انسٹی ٹیوٹ میں، جی پی او کے سامنے کوٹھاری کمیشن میں اور آخر آخر میں کمیونسٹ پارٹی کے کمیون کے ہال میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے ہفتہ وار جلسے ہوتے رہے..... صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں .... جلسہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کا۔صدارت علی سردار جعفری نے کی۔مدعی بھی وہی۔سردار نے حوالے کے لیے میز پر کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر رکھا.....اور بجائے اس کے کہ صدر آخر میں بولے، صدر صاحب بحیثیت علی سردار جعفری کے شروع ہی میں شعلہ زن ہو گئے اور حسب معمول دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ”خیال“ میں نہیں لکھنا چاہئے..... کرسی صدارت کے فیصلے کے مطابق تمام ہندوستان میں انجمن کی شاخوں کو سرکلر بھیج دیے گئے کہ ”خیال“ کے لیے کوئی نہ لکھے“۔ 41

سردار جعفری جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں، خودغرضیوں اور ناانصافیوں سے نفرت کرتے تھے اور وہ اشتراکی نظریات کے حامل تھے۔یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جاگیردارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کے بارے میں مختصر ذکر کیا جائے۔

ملاحظہ کیجئے:

جاگیردارانہ نظام میں زمین حکومت وقت کی طرف سے کسی شخص کو بطور انعام دی جاتی اس نظام میں جاگیرداروں اور زمینداروں کو بے انتہا فائدہ حاصل ہوتا لیکن محنت کش طبقہ، کسانوں اور دستکاروں وغیرہ کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔کسان اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آزادانہ طور پر آمد و رفت بھی نہیں کر سکتے۔وہ زمیندار اور جاگیردار کا ہر حکم بغیر کسی تامل کے بجا لاتے۔کسانوں کو ان کی محنت کا معاوضہ کم دیا جاتا، انھیں کبھی کبھی جاگیرداروں کے کھیتوں میں بلا معاوضہ خدمات انجام دینی ہوتیں۔کسانوں پر فرائض اور ذمہ داریوں کا ناقابل برداشت بوجھ لاد دیا جاتا۔

سید محمد قطب نے جاگیردارنہ نظام کے بارے میں لکھا ہے:

”ہر کسان کا فرض تھا کہ وہ ہفتے میں ایک پورا دن زمیندار کے کھیتوں میں بیگار دے۔فصل کی کاشت اور کٹائی جیسے مواقع پر زمیندار کی بلا معاوضہ اور جبری خدمات انجام دے۔مذہبی تہواروں اور ایسے ہی دوسرے خوشی کے مواقع پر اپنی غربت وتنگدستی کے باوجود اپنے ہر لحاظ سے خوش حال اور متمول آقا (زمیندار) کو قیمتی تحفے تحائف دے۔اپنا غلہ صرف زمیندار کی مشینوں پر پسوائے“..... زمینداروں کے۔۔۔۔اور لامحدود اختیارات جن کی رو سے وہ مختلف کسانوں کو جتنا جتنا رقبہ زمین مناسب سمجھتا تھا اپنی صوابدید سے دیتا تھا۔ان فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا تھا جو کسانوں کو انجام دینا ہوتی تھی۔ان ٹیکسوں کا تقرر کرتا تھا جو کسانوں کے لیے اسے ادا کرنا لازمی تھے۔زمیندار کے لامحدود انتظامی اور عدالتی اختیارات جنھیں وہ کسی ملکی قانون کے مطابق نہیں بلکہ جیسے چاہتا تھا استعمال کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی تھی۔جاگیرداری نظام کے دور انحطاط میں کسانوں کے لیے یہ لازمی شرط کہ اگر وہ آزادی حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے پہلے لازماً ایک مخصوص رقم زمیندار کو ادا کریں۔“ 42

اس نظام میں زمیندار کسانوں سے ذرائع پیداوار کا ایک مقرر حصہ وصول کر لیتے تھے۔عدالتی اور انتظامی اختیارات بھی

جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھے۔کسانوں خود اپنے کھیت میں دن رات محنت مزدوری کر کے فصل اگاتا ہے لیکن زمیندار اس کی حق تلفی کرتا ہے۔کسانوں کو اس بات کا بھی اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی زمینوں کو فروخت کر سکیں یا اپنی اولاد کو وراثت میں دے سکیں۔کسانوں کو زمینداروں کے لیے بھاری ٹیکس بھی دینے پڑتے تھے ایک زمیندار دوسرے زمیندار کو زمین فروخت کرتا ہے تو اسے زمین کے ساتھ اس زمین پر کام کرنے والے کسان اور مزدور بھی فروخت ہو جاتے۔زمیندار کسانوں سے کھیتوں میں کام لینے کے علاوہ اپنے گھر کے دیگر کام بھی لیا کرتے۔اس نظام میں زمینداروں اور کسانوں کی حیثیت آقا اور غلام جیسی تھی۔سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار مزدوروں کی صحیح مزدوری ادا نہیں کرتا وہ صرف اپنے سرمایہ میں اضافہ چاہتا ہے۔سرمایہ داروں کی یہی کوشش رہتی کہ کم سے کم اجرت میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کریں۔سرمایہ داری میں سودی کاروبار چلتا ہے۔ سرمایہ دار لوگ غرض مندوں کو وقت پر روپیہ دیتے ہیں اور سود کے ساتھ دوگنا وصول کر لیتے ہیں۔ضرورت مند لوگ سرمایہ داروں کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں۔یہ نظام مجبور اور مفلس طبقے کا استحصال کرنے والا نظام ہے اس کا نظام مادہ پرستانہ، منفعت پرستانہ اور ذاتی نفع کے حصول پر مبنی ہے۔اس پر اجتماعی کفالت social maintenance کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔مال و دولت، قوت و اقتدار سب کچھ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔سرمایہ دار غریبوں کا خون چوستے ہیں اور ان کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کا بڑا حصہ اڑا لے جاتے ہیں۔

اشتراکی نظام کا آغاز روسی انقلاب 1917 سے ہوتا ہے یہ کارل مارکس اور لینن کے زیر سایہ وجود میں آیا۔فاشزم اور نازی ازم کے تدارک کے لیے دنیا کا جھکاؤ مارکسزم کی طرف ہو رہا تھا۔اشتراکی نظام کا مقصد جاگیردارانہ و سرمایہ نظام کا مکمل خاتمہ ہے۔اشتراکیت میں ذرائع پیداوار عوام کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔یہ مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کرتی اور ان پر ہونے والے جبر و تشدد کو ختم کرتی ہے۔یہ ذرائع پیداوار کو عوام کے ہاتھوں بالخصوص محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔طبقاتی نا برابری کو ختم کرنے امیری غریبی کے فرق کو مٹانے اور تمام انسانوں میں مساوات پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔اشتراکی نظام عوام اور ان کی زندگی کے مسائل پر زور دیتا ہے اور سماجی، سیاسی اور معاشی ناانصافی، استحصال، ظلم و تشدد، نفرت اور تعصب کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔اس کا مقصد ملکیت میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھتا ہے۔اشتراکی نظام ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کو اہمیت دیتی ہے۔ذاتی ملکیت سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور جب اضافہ ہوتا ہے تو اقتدار رکھنے والا طبقہ اور زیادہ اقتدار حاصل کرتا ہے۔اسی اقتدار کے بل بوتے وہ لوگوں کو اپنا غلام بنا کر بے انتہا کام لے گا۔ اسی لیے اشتراکیت ذاتی ملکیت کو منسوخ کر دینا چاہتی ہے۔

سید محمد قطب رقمطراز ہیں:

''اشتراکیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اجتماع وہ اصل بنیاد ہے جس سے الگ یا آزاد فرد کا کوئی وجود نہیں۔چنانچہ اشتراکیت اجتماع کی نمائندہ ہونے کے لحاظ سے تمام حقوق ملکیت ریاست کو سونپ دیتی ہے اور افراد سے ذاتی ملکیت کے تمام حقوق چھین لیتی ہے۔''

43

اسلام نے جائز طریقہ سے کمائی ہوئی ذاتی یا انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیا۔مال و دولت کی ہوس، بے جا خرچ پر پابندی

لگادی۔ استحصال کے دروازوں کو بند کیا، دولت کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے روکا، زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض کیا۔

سید اسد گیلانی رقمطراز ہیں:

''آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو تربیت دی اور ان کو بتایا کہ اہل ایمان کے لیے دولت، سونا، چاندی جمع کرنا یا اس کی ہوس میں مبتلا ہونا تباہی ہے اور یہ کہ اس اسلامی معاشرہ دولت کو گردش میں رکھنے کا روادار ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور کوئی شخص بھی دولت پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جائے اسلام نے نظام معیشت میں بے جا خرچ پر پابندی عائد کی ہے .....اسلام کے معاشی نظام کا سنگ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وہ رقم ہے جو صاحب استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور غیر مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے...'' 44

غلام دستگیر رشید لکھتے ہیں:

''زکوٰۃ زر نقد کی محفوظ بچت پر 1/2 2 فی صدی سالانہ کا لازمی محصول ہے۔ علاوہ ازیں زرعی پیداوار، مویشی سارے اموال تجارت پر زکوٰۃ مختلف شرح سے لازمی ہے۔'' 45

پچھلے دو صفحات پر مشتمل write up جاگیردارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا مختصر تعارف تھا جس کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد یوسف ناکوا ڑی کرناٹک کی نگرانی میں داخل کیا گیا پی ایچ ڈی مقالہ بعنوان'' اُردو ادب میں اشتراکی رجحانات 1936 سے 1960 '' کے باب اول سے استفادہ کیا گیا۔

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے خاتمہ کے لیے ترقی پسند ادب اور ادیبوں کو جدوجہد کو سردار جعفری ناگزیر سمجھتے تھے تا کہ ہماری ذہنی دنیا حقیقی دنیا بن سکے۔

انہوں نے کہا ہے:

''سب سے پہلے ہم اپنے باغ کو ان گل چینوں اور صیادوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جو ہر شاخ نخل پر قابض ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری ذہنی دنیا اس وقت تک واقعی دنیا نہیں بن سکتی جب تک دنیا میں جاگیرداری کا اقتدار باقی ہے اور دنیا میں سامراج کا سکہ چل رہا ہے۔ اپنی ذہنی دنیا کو واقعی دنیا بنانے کے لیے ترقی پسند ادب اور ادیب کے لیے ان دونوں نظاموں کے خلاف ایک سازش میں متحد ہیں، جدوجہد ضروری ہے۔ ہم یہ جدوجہد اپنے ادب، اپنے دل و دماغ کی سب سے تیز تلوار سے کریں گے اور تمام ترقی پسند ادیب اس پر متفق ہیں۔ جاگیرداری کے خلاف جدوجہد ہماری تحریک کے قومی کردار کو متعین کرتی ہے اور سامراج کے خلاف جدوجہد اس کی حدود کو وسیع کر کے اسے بین الاقوامی تحریک کا ایک حصہ بنا دیتی ہے۔'' 46

پرفیسر فصیح احمد صدیقی نے لکھا ہے ''علی سردار جعفری کے مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند تحریک خالی ادبی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ ایک ایسی سیاسی تحریک بھی تھی جو پُرانے سیاسی نظاموں کی جگہ پر ایک ایسا سیاسی نظام بھی لانا چاہتی تھی جو عوام کی خواہشات کا احترام کرے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ضامن بھی ہو۔ سائنسی ایجادات اور بین الاقوامی حالات نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ دنیا سمٹتی جا رہی تھی۔ لہٰذا یہ تحریک بھی دنیا کی دوسری تحریکوں کے دوش بدوش مصروف عمل تھی اور یہ تمام تحریکیں خوشگوار نتیجہ تھیں انقلاب روس اور روس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا اور یہ تحریک جس قدر

انقلاب روس اور تصور اشتراکیت سے متاثر تھی اسی قدر اس فاشزم اور نازی ازم کے خلاف تھی جو اٹلی اور جرمنی میں اپنے رقص عریاں میں مگن تھے۔''
47

سردار جعفری اشتراکی نظریات کے حامل اور مبلغ تھے انہوں نے زندگی کے مسائل کو اشتراکیت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اشتراکیت کے تعلق سے لکھا ہے:

''اشتراکیت کو انسانیت کے سارے مسائل کا حل اور تمام دکھوں کا علاج سمجھ لینا ایک قسم کی انتہا پسندی ہے..... انسانیت، درد وغم جس کا مقدر بن چکا ہے، ان کی (سردار جعفری) کی نظر میں اہم ترین چیز ہے۔ جس کے مصائب وآلام کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور پھر اپنے نظریات کے مطابق ان مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں جو ان کی نظر میں اشتراکیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے قارئین ان کے پیش کردہ حل سے کسی حد تک مطمئن بھی نظر آتے ہیں کیوں کہ ناانصافیوں اور عدم مساوات سے بھری ہوئی اس دنیا میں اشتراکیت کے نام سے جو نظریۂ حیات سامنے آیا ہے اس میں بڑی حد تک اس کراہتی ہوئی انسانیت کے غموں کا مداوا نظر آتا ہے۔ کم از کم اصولی حد تک تو یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ اشتراکیت انسانوں کے درمیان تفریق اور عدم مساوات کو ختم کر دینے کی حامی ہے۔ سرمایہ ومحنت کے درمیان عمیق اور پُر ہول خلیج کو پاٹ دینا چاہتی ہے۔ کچلے ہوئے مظلوم اور محنت کش عوام کو اس دنیا کی آسائشوں اور نعمتوں میں برابر کا حصہ دلانا چاہتی ہے لیکن عملی طور پر یہ کوشش کس حد تک قابل عمل ہے اور اس میں کامیابی کے امکانات کہاں تک پائے جاتے ہیں، اس کا یقین دنیا کو ابھی تک نہیں ہوا ہے لیکن اس نظریاتی بحث سے قطع نظر، سردار جعفری کے نظریات میں پورا پورا خلوص ملتا ہے''..... سردار جعفری کو یقین ہے کہ اشتراکیت انسانیت کے سارے مسائل۔۔۔۔۔ راتوں رات حل کر سکتی ہے۔ اگر چہ اس میں شدید اختلاف کی گنجائش ہے۔ سردار جعفری کے لیے یہ وقت کی راگنی تھی''۔
48

ڈاکٹر سید محمد عقل رضوی نے بتایا کہ ترقی پسند شعراء نے شاعروں میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کی ایک رسم شروع کی تھی اس میں سردار جعفری بھی شامل تھے۔

عقیل صاحب لکھتے ہیں:

''اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے شعرا نے ایک اور رسم مشاعرہ میں شروع کی تھی۔ مشاعرے کے درمیان شعر خوانی چھوڑ کر شعراء مجمع میں سامعین کے درمیان اتر جاتے اور رومال پھیلا کر کمیونسٹ پارٹی کے لیے چندہ جمع کرتے۔ سردار جعفری، مجروح، وامق، راہی اور مسعود اختر جمال، سب مجمع میں اتر آئے اور انہوں نے بہت سا چندہ اکٹھا کیا اور پھر واپس آکر مشاعرہ پڑھنے لگے۔''
49

ترقی پسند تحریک کے استحکام میں سردار جعفری کے رول کی ستائش کرتے ہوئے پرفیسر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے:

''سردار جعفری ان چند فن کاروں میں ہیں جن کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کی شناخت مکمل ہوئی جن کی وجہ سے ترقی پسند مستحکم اور محکم ہوئی،..... ترقی پسند تحریک کو سردار جعفری نے اپنی شاعری دی ہے، اپنا لہو، اپنا خون جگر اپنا آپ دیا ہے''۔
50

ڈاکٹر درخشاں تاجور کے خیال کے مطابق:

''سردار جعفری کا شمار بھی ان ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے کمیونزم کے نظریے کی حمایت کی اور ہندوستان کی آزادی کے حصول پر زور دیا۔'' 51

ترقی پسند تحریک کی پرورش میں سردار جعفری کے حصّے کا ذکر کرتے ہوئے ابوذر ہاشمی لکھتے ہیں:

''سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کو اپنا خون دیا تھا۔ سردار جعفری وغیرہ نے اس کی پرورش کی۔ تنقید میں احتشام حسین نے اس کو مقام عروج تک پہنچایا۔ محمد حسن نے اس کی توسیع کی .... قمر رئیس نے ترقی پسند تنقید کو اعتدال عطا کیا۔'' 52

(ترقی پسندی کے ماورائی پہلو، تمثیل نو، جنوری تا جون 2006، صفحہ 35)

منور بیر بھائی نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کے قافلے سالار تھے۔ ان کی اس تحریک سے وابستگی کمال درجہ کی تھی۔'' 53

پروفیسر آل احمد سرور نے سردار جعفری کو ترقی پسند تحریک کا ستون قرار دیا۔

''ترقی پسند تحریک نے جو ممتاز شاعر پیدا کیے ہیں ان میں سردار جعفری کا نام بھی قابل ذکر ہے وہ نہ صرف ایک اہم ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے بلکہ تحریک کے ایک ستون کی حیثیت سے بھی یاد رکھے جائیں گے۔ 54

پروفیسر نظیر صدیقی نے بتایا کہ سردار جعفری کی تنظیمی صلاحیتوں سے ترقی پسند تحریک کو فیض پہنچا ہے۔

''ان کی (سردار جعفری) تنظیمی صلاحیتوں نے ترقی پسند تحریک کو کم از کم ساٹھ سال تک سنبھالے رکھا۔'' 55

پروفیسر سید محمود الحسن نے ترقی پسند تحریک میں سردار جعفری کے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں اس کے نظریات کی اشاعت اور نئے رجحانات کی تشکیل میں اگر سب سے پہلے سجاد ظہیر کا نام سامنے آتا ہے تو اس کے بعد دوسرا اہم نام سردار جعفری ہی کا ہے جسے اس تحریک کو ایک علامت سمجھ کر اس کی ہر خوبی اور کوتاہی کے لیے انھیں کی مثال دی جاتی ہے انھیں کو نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔'' 56

سبط حسن نے ترقی پسند ادب کے فروغ میں سردار جعفری کے رول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ (سردار جعفری) ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنی حسی ریاضتوں سے ترقی پسند ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اس میں نئے معنی اور نئی جہتیں پیدا کی ہیں''..... رسالہ ''نیا ادب'' کی لکھائی چھپائی کا بندوبست، کاغذ کی فراہمی، ادیبوں سے خط و کتابت، آمدنی و خرچ کا حساب، سب کا بوجھ انہیں کے کندھوں پر تھا۔'' 57

سردار جعفری کو ترقی پسند تحریک کا شمشیر بے نیام قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر عمر رضا رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند ادیبوں میں سردار جعفری اپنی ذہانت اور سنجیدگی سے بہت جلد ایک فعال اور دانشور ادیب کے طور پر مقبولیت حاصل کر لی اور ترقی پسند تحریک کے ''شمشیر بے نیام'' ہو گئے۔ 58

پروفیسر ضیاء (علیگ) نے سردار جعفری کے انہماک کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

ترقی پسند مصنّفین کے قیام کی گولڈن جوبلی جو لکھنو میں منائی گئی اس کے انتظامات میں منہمک تھے کیوں کہ وہ خود انتظامیہ

کمیٹی کے سربراہوں میں سے تھے۔"

کرشن چندر نے ترقی پسند تحریک کو ملک گیر پیمانے پر پھیلانے میں سردار جعفری کے رول کی ستائش کی۔ نیز سردار جعفری کی ہندی والوں سے ہم آہنگی اور یگانگت کو اُردو کی بڑی طاقت قرار دیا۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر سلطان احمد لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سردار کا ذکر ترقی پسند تحریک کے بغیر اور ترقی پسند تحریک کا ذکر سردار کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ بقول کرشن چندر "علی سردار جعفری کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ پوری تحریک کا نام ہے" سردار ترقی پسندوں کے قافلہ سالار تھے۔ اس تحریک کو ملک کے طول وعرض میں پھیلانے کی مہم میں وہ تحریک کے اولین معماروں سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند فیض احمد فیض، احتشام حسین اور مخدوم محی الدین کے شانہ بہ شانہ رہے۔ ترقی پسند تحریک دراصل جبر واستحصال کے خلاف ایک آواز تھی، سرمایہ پرستی، سامراجیت، مزدور، غربت، بھوک اور افلاس، ان موضوعات پر ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقی قوت صرف کردی۔ اس نظریے سے وابستہ شعرا میں تخلیقی مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے سردار کو عہد ساز شخصیت اور اپنے دور کی نمائندہ آواز تسلیم کیا جاتا ہے ..... کمیونسٹ پارٹی سے ان کے قریبی تعلق کی بنا پر اُردو میں ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان رشتہ کو مضبوط بنانے میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ ترقی پسندی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ اس نے ہندوستان کے عوام سے رشتہ استوار کیا جس سے اُردو کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ کمیونسٹ نظریات کے مبلغ ہونے کے سبب اُردو شاعری نے ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ہم آہنگی پیدا کی۔ سردار ذاتی طور پر ہندی والوں میں بہت مقبول ہوئے۔ یہ ہم آہنگی اور یگانگت اُردو کی بڑی طاقت تھی"۔ 60

ساجد رشید نے اپنے اداریہ میں سردار جعفری کو ترقی پسند تحریک کے لیے نقصان اور رخنہ بننے کی بات کہی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

"جعفری صاحب کی مقبولیت نے اگر شخصی سطح پر انہیں فیض پہنچایا تو ترقی پسند تحریک کو کسی حد تک نقصان بھی پہنچایا۔ جب کسی وجود کے اطراف میں ایک روشن ہالہ کھینچ جاتا ہے تو اس کی کمزوریاں اور کوتاہیاں شخصیت کی اُس خیرہ کن روشنی میں نظر نہیں آتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں جعفری صاحب تحریک کا ماحصل تھے تو آگے چل کر وہ اسی تحریک کے لیے کہیں نہ کہیں رخنہ بھی بننے لگے تھے۔" 61

مظہر امام کے خیال کے مطابق سردار جعفری کے زمانے میں تحریک انتہاپسندی کا شکار ہوئی۔

وہ لکھتے ہیں:

"اپنی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کی بناء پر انہوں نے (سردار جعفری) ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں اپنی بالادستی قائم کرلی تھی۔ ان کا شمار ترقی پسند ادبی تحریک کے نظریہ سازوں اور قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب کمیونسٹ پارٹی کے استحکام کے لیے سجاد ظہیر کو پاکستان بھیجا گیا اور جب وہاں انھیں راولپنڈی سازش کیس میں فیض کے ساتھ گرفتار کیا گیا تو ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی قیادت سردار جعفری نے ہی سنبھالی۔ ان کے زمانے میں تحریک انتہاپسندی کا شکار

ہوئی اور ایک مخصوص پارٹی کی تشہیر کا آلہ ءکار بنی جس کی وجہ سے تحریک پر منفی اثرات مرتب ہوئے اور جدیدیت کے رجحان کے لیے فضا سازگار ہوئی۔ پھر بھی اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک اور سردار جعفری لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔" 62

ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں سردار جعفری کی بیش بہا خدمات رہی ہیں جن کا ذکر مختلف ادیبوں نے کیا ہے۔

1) پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے لکھا ہے:

"ترقی پسند تحریک کے نظریے اور اغراض ومقاصد کے پرچار کی مہم میں سردار جعفری کا نہایت اہم حصّہ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی سے ان کے گہرے تعلق کی بناء پر وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اُردو میں ترقی پسند اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان رائے عامہ کو مضبوط کیا اور جس دور میں پارٹی اور ادبی تحریک باہم ایک دوسرے کے سبب قریب آ گئیں اس کی ساری کارگزاریوں کی ذمہ داری عموماً سردار جعفری کے سر ہی ڈالی گئی ہے۔ اس دور کی ادعائیت، پارٹی کی سیاسی پالیسیوں کے مطابق ترقی پسند تحریک کے منشور و کا اجراء اور ادیبوں اور شاعروں سے مخصوص موضوعات پر لکھنے پر اصرار ادبی تحریک کو ایک تنظیم کے ڈسپلن کے تحت لانے پر زور وہ چند خاص باتیں تھیں جن کی بناء پر جذبی، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن، اعظمی اور منٹو وغیرہ ترقی پسند تحریک سے دور ہو گئے۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک کے رہنماء کی حیثیت سے علی سردار جعفری کو عموماً ہر بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔" 63

حیدرآباد میں سلیمان اریب کے گھر ادیبوں کی محفل منعقد ہوئی جس کا ذکر رام لعل کے شب و روز 1953 سے، ادبی ڈائری کے اوراق مرتبہ جمال رضوی میں ملتا ہے۔ سردار جعفری بھی اس محفل میں موجود تھے۔

ان سے متعلق اقتباسات پیش ہیں:

"سردار جعفری بھی آ گئے۔ ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری پر بحث ہوتی رہی۔ کچھ لوگ ترقی پسند نظریات سے مایوس ہو رہے ہیں۔ ٹوٹ رہے ہیں۔ سلیمان اریب نے اپنے کئی ایسے اشعار سنائے جن میں تھکن اور بیزاری کا اعلان تھا۔ سردار اس کے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتے رہے۔" 64

پروفیسر محمود الحسن نے سردار جعفری کی رہنمائی اور سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب 1986 میں لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو سردار جعفری نے ہر طرح سے رہنمائی اور سرپرستی کرتے ہوئے مختلف مسائل حل کرنے میں مدد کی۔ اس موقع پر اُردو کے ترقی پسندوں کو ہندی کے بعض شدت پسند حامیوں سے شکایت بھی پیدا ہو گئی لیکن سردار جعفری نے جلد بازی یا جذبات میں کوئی قدم اٹھانے سے منع کیا اور اس طرح حالات قابو میں آ گئے۔ یہ ضرور ہوا کہ اسی موقع پر پروفیسر قمر رئیس نے اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی الگ کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ خود سردار جعفری ایسا بد دل تھے کہ اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد ہی 1987 میں لکھنو میں ترقی پسند مصنّفین اُردو کی کانفرنس کر کے اس کے سرگرمیوں اور مقاصد کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لندن کانفرنس اور گولڈن جوبلی کانفرنس کے بعد سردار جعفری کے دل میں ترقی پسند انجمن اور تحریک کی جمودی کیفیت ختم کرنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کے زیر اہتمام جہاں بھی سیمنار یا اجتماعات ہوتے وہ کسی نہ کسی طرح ضرور شرکت کرتے۔ چنانچہ جب اکتوبر 1986 میں پروفیسر فضل امام کی نگرانی میں جے پور میں کانفرنس ہوئی یا دسمبر 1986 میں دہلی میں سہ روزہ انجمن کی کانفرنس کی گئی تو

ان سب میں شرکت کر کے ہر موقع پر اپنی امتیازی شخصیت، دانشوری اور پروقار خطابت سے ایسا متاثر کر دیتے کہ کانفرنس کی کامیابی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا۔ بعض ایسے موضوعات جن کے متعلق احساس ہوتا کہ اس پر کسی تقریر یا بحث کی زیادہ گنجائش نہ ہوگی ان پر بھی نئے نئے گوشے نکال کر معلومات کا خزانہ پیش کر دیتے اور کہیں یہ نہ محسوس ہوتا کہ کوئی بات غیر متعلق ہے۔"

65

☆☆☆

252

حواشی

1۔علی سردار جعفری، ہم عصری ادبی مسائل، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر، دسمبر 1991، صفحہ 11

2۔ماہنامہ "ہنس" (ہندی) اکتوبر 1935 بحوالہ خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، صفحہ 74-75

3۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 123

4۔ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ 1936 سے 1956 تک، صفحہ 62

5۔نیا ادب جنوری 1941، بحوالہ خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، صفحہ 76

6۔خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، صفحہ 77-78

7۔سجاد ظہیر، روشنائی، صفحہ 343

8۔ہنس راج رہبر، ترقی پسند ادب: ایک جائزہ۔صفحہ 327

9۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 215-241

10۔حقانی القاسمی، تمثیل نو، جنوری تا جون 2006، صفحہ 37-39

11۔نیا ادب لکھنؤ، خاص نمبر جنوری، فروری 1941 بحوالہ اُردو کی ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا سرسری جائزہ، نوائے ادب بمبئی، اپریل 1986، صفحہ 14

12۔سجاد ظہیر، روشنائی، صفحہ 79,80,90

13۔ڈاکٹر ریاض احمد، ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول، صفحہ 13, 47

14۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اُردو شاعری میں انسان دوستی کے نقوش مشمولہ اُردو شاعری میں انسان دوستی، صفحہ 231

15۔ڈاکٹر وسیم بیگم، آزادی کے بعد اُردو غزل، تہذیبی مضمرات، ادبی تحریکات اور اہم شعراء، صفحات 106, 110, 113,114, 117, 121, 127, 128, 129, 138, 139, 147, 157, 158, 161, 162, 165 & 166

16۔پروفیسر فصیح احمد صدیقی اُردو یک بابی ڈراما، جنگ آزادی ہند 1857 تا حصول آزادی ہند 1947 تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، صفحہ 80

17۔فاطمہ تنویر، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اُردو شاعری میں انسان دوستی کے نقوش مشمولہ اُردو شاعری میں انسان دوستی، صفحہ 230, 232

18۔اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، صفحہ 28

19۔عتیق احمد، ترقی پسند ادب کا احتجاجی اور مزاحمتی لہجہ، کتاب نما، جولائی 1986، صفحہ 11-12

20۔ڈاکٹر ریاض احمد، ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول، صفحہ 43, 44, 48

21۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ترقی پسندی کیا زوال پذیر ہو چکی ہے؟ تمثیل نو، جنوری تا جون 2006، صفحہ 25
22۔ پروفیسر رئیس انور رحمٰن، کیا ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہو چکی ہے؟ تمثیل نو، جنوری تا جون 2006
23۔ ڈاکٹر منصور عمر، ترقی پسندی: کل آج اور کل، تمثیل نو، جنوری تا جون 2006 ، صفحہ 28, 29, 30
24۔ پروفیسر شارب ردولوی، ترقی پسند فکر اور اُردو شاعری آزادی کے بعد
مشمولہ آزادی کے بعد اُردو شاعری: مقالات و مباحث، صفحہ 71, 74, 78, 80, 95
25۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی صفحہ 58, 59، شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی بحوالہ ڈاکٹر وسیم بیگم،
سردار جعفری کی نثر نگاری، سہ ماہی نخلستان، جولائی تا دسمبر 2000 صفحہ 56
26۔ ڈاکٹر مسرت جہاں، کیا ترقی پسندی کا زوال ہو گیا؟ تمثیل نو، جنوری تا جون 2006، صفحہ 41
27۔ پروفیسر عتیق اللہ، قدر شناسی، صفحہ 11
28۔ احسان حسن، شاعری اور ترقی پسندی، شعاعیں، بنگلور، مئی 2010، صفحہ 8,9
29۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، انٹرویو 18/اپریل 1990 راہی معصوم رضا۔ سردار جعفری۔ ''گفتگو بند نہ ہو''
افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 78
30۔ ڈاکٹر وسیم بیگم، آزادی کے بعد اُردو غزل، تہذیبی مضمرات، ادبی تحریکات اور اہم شعراء،
صفحہ 132, 133, 135, 156۔
31۔ حسن عابدی، سویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 70
32۔ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 88
33۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، صفحہ 35
34۔ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 139
35۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی صفحہ 123 بحوالہ سردار جعفری کی نثر نگاری از وسیم بیگم،
سہ ماہی نخلستان، جے پور، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 56
36۔ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 215, 216
37۔ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 221, 222
38۔ سرور الہدیٰ مائل، کہہ رہی ہے آج لیکن چشم پرنم الوداع، سہ ماہی نخلستان، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 83
39۔ انور ظہیر خاں، مت سہل ہمیں جانو، مصنف، بمبئی دسمبر 1996، صفحہ 55
مشمولہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 221
40۔ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 222
41۔ رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 90, 91, 92

42۔سید محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات (مترجم محمد قطب) صفحہ 151 بحوالہ " اُردو ادب میں اشتراکی رجحانات 1936 تا 1960 (غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر محمد یوسف ناکوا ڑی کرناٹک) صفحہ 35

43۔سید محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات (مترجم محمد قطب) صفحہ 151 بحوالہ " اُردو ادب میں اشتراکی رجحانات 1936 تا 1960 (غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر محمد یوسف ناکوا ڑی کرناٹک) صفحہ 63

44۔رسول ﷺ کی حکمت انقلاب صفحہ 407 ,406 ,355 ,354 بحوالہ "اُردو ادب میں اشتراکی رجحانات 1936 تا 1960 (غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر محمد یوسف ناکوا ڑی کرناٹک) صفحہ 64

45۔اسلام کے معاشی تصورات، صفحہ 128 بحوالہ " اُردو ادب میں اشتراکی رجحانات 1936 تا 1960 (غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر محمد یوسف ناکوا ڑی کرناٹک) صفحہ 65

46۔ملاحظہ ہو "اُردو یک بابی ڈراما: جنگ آزادی ہند 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947 تاریخی، تحقیقی وتنقیدی جائزہ از پروفیسر فصیح احمد صدیقی، صفحہ 85

47۔پروفیسر فصیح احمد صدیقی "اُردو یک بابی ڈراما: جنگ آزادی ہند 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947 تاریخی تحقیقی وتنقیدی جائزہ از پروفیسر فصیح احمد صدیقی، صفحہ 86 ,85

48۔پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی صفحہ 26 ,17 ,16

49۔پروفیسر سید محمد عقیل، لو تم بھی گئے: سردار جعفری کا ایک سرسری جائزہ الہٰ آباد کے حوالے سے نیا سفر: علی سردار جعفری ومجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 50

50۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری، صفحہ 40

51۔ڈاکٹر درخشاں تاجور، ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اُردو شاعری کا حصّہ، صفحہ 573

52۔ابوذر ہاشمی، ترقی پسندی کے ماورائی پہلو، تمثیل نو، جنوری تا جون 2006، صفحہ 35

53۔منور پیر بھائی، اپنی بات مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 13

54۔پروفیسر آل احمد سرور، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 43

55۔پروفیسر نظیر صدیقی، علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 54

56۔پروفیسر سید محمود الحسن، علی سردار جعفری: فکر وفن کے چند پہلو مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 143

57۔سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں مشمولہ عالمی اُردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001 سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ نند کشور وکرم، صفحہ 74 ,71

58۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 89

59۔پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 صفحہ 247
60۔ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں
مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 259 ,258
61۔ساجد رشید، رومانی انقلاب کے آخری سالار کو الوداع، اداریہ، سہ ماہی نیا ورق، ممبئی 10، صفحہ 9
62۔مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، اُردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 25
63۔پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار، ماہنامہ آج کل، اکتوبر 2000
64۔رام لعل کے شب و روز 1953 سے، ادبی ڈائری کے اوراق مرتبہ ہما جمال رضوی، صفحہ 93
65۔پروفیسر محمود الحسن 'سردار جعفری: چند تاثرات' کچھ واقعات 'نیا سفر' علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر جولائی تا دسمبر 2000ء' صفحہ 99۔98

☆☆☆

باب چہارم

''شاعری''

شعراور نثر میں فرق

معید رشیدی نے شعراور نثر کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1) ''شعر کی جن تین خوبیوں کا ذکر (حالی نے) کیا وہ تخلیقی نثر پر بھی منطبق ہوسکتی ہیں۔تخیل، الفاظ کی وضاحت، بلاغت، سادگی، اصلیت، جوش، روزمرہ کی برجستگی، محاورے کی صحت۔یہ خصائص شعر کے ساتھ تخلیقی نثر میں بھی پائے جاتے ہیں''۔

(2) ''تشبیہ، استعارہ، علامت، کنایہ، مجازمرسل کا تعلق شعر کے ساتھ تخلیقی نثر سے بھی ہے۔

(3) ''جس نثر میں زبان کا تخلیقی استعمال ہو وہ تخلیقی نثر ہے مثلاً افسانہ، ناول اور انشائیہ کی نثر۔جبکہ تنقیدی، منطقی، معروضی اور سائنسی/توضیحی نثر غیر تخلیقی کہلاتی ہے''۔

(4) شعراور تخلیقی نثر میں بعض خصائص مشترک ضرور ہوسکتے ہیں لیکن دونوں کے حدود/ دائرے، مبادیات (شعر کے اجزائے ترکیبی)/شعریات (مبادیات سے آگے کی منزل جو مبادیات کو جمود سے بچاتی ہے اور نئے تجربات/ امکانات کو راہ دیتی ہے) میں بہت فرق ہے۔

شعر میں ابہام ہوتا ہے جبکہ نثر میں توضیح۔شعر میں اجمال ہوتا ہے جبکہ نثر میں وضاحت۔حتیٰ کہ تخلیقی نثر میں بھی۔نثر میں اگر ابہام/اجمال ہوتا بھی ہے تو اس میں تسلسل نہیں رہتا۔شعراور نثر کا سب سے بڑا اور بالکل سامنے کا فرق یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں نثر پیراگراف میں لکھی جاتی ہے جبکہ شعر مصرعوں میں کہے جاتے ہیں.....یہ بھی کلیہ نہیں ہوسکتا کہ نثر پیراگراف ہی میں لکھی جاسکتی ہے مصرعوں میں نہیں۔'' 1

شعر کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے معید رشیدی رقمطراز ہیں:

(1) سامنے کی تعریف ''شعر داخلی جذبات ومحسوسات کا اظہار یہ ہے لیکن ادبی تنقید میں یہ شعر کا نہایت محدود تصور ہے.....شعر کی ماہیت پر غور وفکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر الفاظ ومعانی کی بہترین تنظیم کا نام ہے جو نہایت پیچیدہ عمل سے گزرنے کے بعد وجود میں آتی ہے۔.....تخلیقی عمل نہایت پیچیدہ اور مشکل ترین مرحلہ ہے اس عمل کے دوران ہر تخلیق کار کی حالت مختلف ہوتی ہے''۔

(1) حالی نے شاعری کے لیے وزن اور ردیف وقافیہ کو ضروری قرار نہیں دیا۔ان کا خیال ہے کہ ''نفس شعر وزن کا محتاج نہیں''۔وہ صنائع بدائع کو عیب سمجھتے ہیں۔.....ان کے مطابق اگر شعر میں روزمرہ کی زبان کے ساتھ محاورے کی صحت موجود ہے تو شعر یقیناً اچھا ہوگا.....انہوں نے شاعر بننے کے لیے تین شرطیں (تخیل، مطالعہ کائنات، تفحص الفاظ) بیان کیں۔اچھے شعر کی تین خصوصیات (سادگی، اصلیت، جوش) کی نشاندہی کی۔

(2) شعر، شاعری ہی کا ایک جزو ہے۔شاعری بحر بے کراں ہے جبکہ شعر اس کا ایک قطرہ لیکن یہ قطرہ اپنے جلو میں کتنے ہی دریاؤں کو سمیٹے رکھتا ہے۔مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ شاعری کی اصناف ہیں۔

(3) ''شعر کا نمایاں وصف یہی ہے کہ دو مصرعوں پر مشتمل ہو لیکن دونوں مصرعے ہم وزن ہوں اور ارکان کی تعداد دونوں

مصرعوں میں مساوی ہوں اور دونوں مصرعوں میں ارکان کی تعداد چار سے کم نہ ہو۔

شعر کی تعریف کرتے ہوئے زار علامی رقمطراز ہیں:

''لغوی معنی جاننا۔اصطلاح میں اس کو کلام موزوں تخیل کو کہتے ہیں جس پر سامع پر تاثیر انقباض و انبساط پیدا ہو۔پہلے لوگوں نے شعر کی جو تعریف کی ہے کہ موزوں ہو، مقفٰی ہو، بامعنی ہو اور بالقصد کہا گیا ہو، ہمیں اس میں کلام ہے۔شعر کے مقتضائے معنی حال سب سے اولین شرط ہے لیکن قافیہ اور قصد کی شرطیں بالکل فضول ہیں کیونکہ نثر اور شعر میں یہی فرق ہے کہ نظم بحور اور اوزان کی قید میں ہوتی ہے اور نثر اس سے آزاد۔کلام موزوں بقصد موزوں ہوا ہو یا بلاقصد اس کو موزوں ہی کہا جائے گا(زار علامی، کلید عروض، 1993، لکشمی نگر، نئی دہلی، شیام پرنٹنگ آفسٹ پریس، صفحہ 1 بحوالہ شعر، مبادیات اور شعریات از معید رشیدی، اثبات، شمارہ 7، جلد 2، ممبئی، صفحہ 102)

(4) ''شعر کو بیت/فرد بھی کہتے ہیں۔اس لیے شعر میں ہیئتی سطح پر قافیہ/ردیف کی شرط فضول ہے۔قافیہ/ردیف کے التزام سے بیت/فرد شعر کی تعریف سے باہر ہو جائے گا۔

(5) ''ہر فن پارے کی مانند شعر کی بھی اپنی مخصوص ہیئت ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔داخلی اور خارجی''۔صنفی شناخت موضوع سے بھی ہوتی ہے۔مثلاً مرثیہ، جس کا موضوع واقعات کربلا اور ان کے متعلقات یا کسی کی موت کے رنج میں آہ و بکا کو شعری پیکر عطا کرتا ہے۔قصیدہ جس کا موضوع مدح یا ہجو ہے لیکن ایک شعر خواہ وہ مرثیہ/قصیدہ/مثنوی/غزل یا دیگر کسی بھی صنف سخن کا ہو، اپنا تنہا وجود بھی رکھتا ہے۔.....خلاصہ یہ ہے کہ ایک شعر بذات خود اپنا موضوع طے کرتا ہے۔اس کے بے شمار سیاق و سباق ہو سکتے ہیں۔شعر کی بڑائی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کو کسی ایک معنوی چوکھٹے میں مقید نہ کیا جا سکے۔.....

شعر کی ٹھوس شناخت موضوع سے نہیں بلکہ اس کی مخصوص ساخت یا خارجی ہیئت سے ہے۔موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے ہو سکتا ہے وہ شعر بلند/پست ہو لیکن اس کی اولین/معروضی/اساسی/عمومی پہچان اس کی خارجی ہیئت یا مشینی ڈھانچے سے ہے۔ہیئت ہی یہ طے کرتی ہے فن پارہ کیا ہے.....(پابند/معرا/آزاد/نثری) نظم (مسلسل/غیر مسلسل/مردف/غیر مردف) غزل، قطعہ یا رباعی؟ خارجی ہیئت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے ذہن کو جس کی تربیت روایات کی روشنی میں ہوئی ہے، فن پارے کی فوری تاثراتی شناخت کے لیے بنیاد فراہم کر دیتی ہے اور ہم متن کے خارجی سروکار سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

(6) ''شعر کی تخلیق یا قرأت دریافت (Explore) کرنے کا عمل ہے۔اس عمل میں ظہور پذیر ہونے والے چند بنیادی اجزا کو کچھ اہم ناقدین نے نشان زد کیا ہے:

(i) لفظ، وزن، معنی، قافیہ (قدامہ بن جعفر/ابن رشیق القیروانی)

(ii) تصور، تخیل، صناعی، قوت، اظہار (نظامی عروضی)

(iii) (شعر کو) مرتب، بامعنی، موزوں، متکرر، ردیتاوی اور اس کے آخری حروف کو ایک دوسرے سے مماثل ہونا چاہیے۔(شمس قیس رازی)

(iv) تخیل، مطالعہ، کائنات، تفحص الفاظ/ سادگی، اصلیت، جوش (حالی)۔

(v) الفاظ، وزن (راگ) جذبات، محاکات، تخیل (شبلی)

(vi) قافیہ، ردیف، وزن (عبدالسلام ندوی)

(vii) موزونیت (وزن، قافیہ، ردیف)، اثر/ جذبات کی تصویر کشی (سید مسعود حسن رضوی ادیب)

(viii) نقوش، الفاظ، آہنگ (وزن) لب ولہجہ (کلیم الدین احمد)

(ix) موزونیت، اجمال، جدلیاتی لفظ، ابہام (شمس الرحمٰن فاروقی)

(x) الفاظ کی مخصوص ترتیب، تمثالی پیکر (Image)، آہنگ، لے، موسیقی، وزن (شوکت سبزواری) مذکورہ عناصر خارجی، داخلی دونوں ساختوں پر محیط ہیں۔ان تمام عناصر کی منفرد/ جداگانہ حیثیت بھی ہے لیکن یہ شعر میں آنے کے بعد یوں جذب ہوجاتے ہیں کہ شعر مربوط اکائی بن جاتا ہے۔اسی گہرے تنوع کی وجہ سے شعر کو قطرے میں دجلہ کہتے ہیں۔شعر کی حیثیت ایک چھوٹی نظم کی بھی ہے جس میں مفاہیم کی کثرت کے ساتھ ہر قاری کے لیے مرکزی خیال بھی ہوتا ہے۔.....نظم/ شعر (عمارت) کی تعمیر الفاظ (اینٹوں) کے ذریعہ ہوتی ہے، لیکن یہاں معنی کی اہمیت بھی مساوی ہے جس طرح جسم کی زندگی کے لیے روح ضروری ہے ٹھیک اسی طرح الفاظ کی حیات اور نمو کے لیے معنی۔.....شعر میں الفاظ کی موزوں ترتیب (Pattern) کے ساتھ عمیق تخیل ہونی چاہیے۔کیفیت اور احساس کی فراوانی ہونی چاہیے۔شعری تجربہ ہونا چاہیے۔ شعریت ہونی چاہیے ورنہ شعر فقط الفاظ کا گورکھ دھندا ہوکر رہ جائے گا۔جسم تو ہوگا لیکن جان فنا ہوجائے گی۔'' 2

شاعر/ادیب کا انسانیت کے تئیں فرض منصبی:

انسان اشرف المخلوقات ہے۔اس کا بہت بڑا مقام ہے۔شاعر اور ادیب سماج کے حساس اور ذمہ دار افراد ہیں۔ انسانیت کے تئیں ان کے فرائض ہوتے ہیں۔

انسان پر انسان کا ظلم روز افزوں ہے ایسے میں شاعر کا فرض منصبی کیا ہوتا ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالاحد ساز لکھتے ہیں:

''ادیب و شاعر، معاشرے کا ضمیر ہوا کرتے ہیں اور ان کا قلم ان کے دور کی نفسیات اور آئندہ نسلوں کے رجحانات کو متاثر کرتا ہے.....امن عالم کی تمام تر کوششوں کے باوجود انسان پر انسان کے ظلم کا سلسلہ آج بھی دراز ہے، علامتیں بدل گئی ہیں.....گذشتہ دو دہائیوں ہی میں انسانیت نے کیا ستم جھیلے ہیں۔ویتنام، فلسطین، عراق، کشمیر، بوسنیا، کراچی اور کتنے ہی نام اس ضمن میں لیے جاسکتے ہیں۔فسادات، نسلی تشدد، علاقائیت وغیرہ کی خوں ریز داستانیں اس پر مستزاد ہیں۔ہماری حالیہ شاعری نے اس لہولہان سفر کے ہر سنگ میل پر کسی نہ کسی پیرائے میں آواز حق کی مہر ثبت کی ہے.....

آج دنیا جس بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہے، اس میں آدمی نے اپنے ضمیر کے دروازے بند کرنے سے شروع کردیے ہیں اور محض اپنے مادی وجود کی بقا کی خاطر قدم قدم پر مصلحتیں نبھا رہا ہے، سمجھوتے کر رہا ہے اور ایک بے حس، مجبور اور بے معنی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ایسے میں اگر شاعر شکایت نہ کرے، احتجاج نہ کرے، تو یہ فرض منصبی اور کون انجام دے۔آج برقی

مواصلات اور کمپیوٹر ٹکنالوجی کے عروج کے زمانے میں انفارمیشن سپر ہائی وے پر حیران کن تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی زندگی کی اس منزل پر اولاد آدم ایک فیصلہ کن آزمائش سے دو چار ہے۔ ہر چند کہ کوچہ قاتل کے سوا سارے راستے بند ہیں۔ مگر سینے میں دل کی رمق ابھی باقی ہے۔ اس دل کو جیائے رکھنا' آج کے شاعر کا منصب ہے اور اسے کارآمد بنائے رکھنا آج کے شاعر کا ہنر ہے۔ بقول علی سردار جعفری ۔

اس اندھیرے میں کہ ملتی نہیں انسان کو راہ
صرف تابندہ ہے شاعر کی نوا اے ساقی

معین الدین حسن علوی کاکوروی نے انسان کا مقام اور ادیب کا انسان اور انسانیت کے تئیں فرائض پر اپنے یک مضمون" ادب میں انسان کا تصور اور مقام" میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔

اس سے اقتباسات پیش ہیں:

(1) انسان کا مقام:

"اس معمورۂ عالم میں انسان ہی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باعث جان گیتی' روح عالم اور غایت اصلی ہے۔ اسے تمام مخلوقات سے افضل کہا گیا ہے۔ انسان سے کم تر مخلوقات کو تمام صلاحیتیں میسر ہیں جو انسان میں اور دیگر مخلوقات میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن شعور' ادراک اور امروز کے حالات کو بھانپ کر فردا کا اندازہ لگالینا اور روح کی روشنی میں مستقبل جو ابھی وجود میں نہیں آیا اس کی کیفیت اور حالت کی تصویر، تخیل کی مدد سے بنالینا صرف انسان ہی کے حصے میں آیا ہے۔ اسے دماغ عطا کیا ہے کہ وہ مشاہدات سے عبرت و سبق حاصل کرے۔ اس کی مٹی میں محبت کی چنگاریاں چھپادی ہیں..... یہ محبت صرف اپنے ذات یا اپنے کنبے یا اپنے دیس تک محدود نہیں رہی بلکہ اس محبت کی معراج یہ ہے کہ سارے عالم کی محبت اس کے دل میں سما جائے..... آدمی سے انسان بننے تک جگر خون کرنا پڑتا ہے۔ راتیں فغان و نالہ سے معور کرنا پڑتی ہیں۔ دن غم انسانیت اور دلسوزی انسانیت میں بسر کرنا پڑتے ہیں..... ادب انسان کے لیے تخلیق ہوتا ہے اور انسان ہی اس کا مرکز بنتا ہے اور اس کی اس کائنات میں کلیدی حیثیت ہوتی ہے۔ یہ ارض و سما اس کی رنگینیاں' تاروں کی تنک تابی' ماہتاب کی ٹھنڈی تراوٹ آگیں روپہلی روشنی مہر نیم روز کی درخشانی' نسیم جاں فزا کی نکہت بیزی' رنگا رنگ' پھولوں کی فراوانی سبزہ کی لہلہاہٹ' شبنم کی شادابی' نیلگوں آسمان کا دل میں کھپنے والا لاجوردی رنگ' شفق کی سرخی' موجوں کی روانی' چڑیوں کی منہ اندھیرے نغمہ سازی' ان سب سے کون لطف اندوز ہوتا ہے کون مزے مزے لے کر ساز آرزو چھیڑتا ہے۔ کون ان لطافتوں کو لطافت کے ساتھ اشعار میں رچ کر فضائے عالم کو مست و مخمور کرتا ہے۔ کون ہے کہ اپنے تبسم سے دنیا کا غنچۂ دل کھلا رہتا ہے اور اپنے غم دل سے ہنستے ہوؤں کو رلا دیتا ہے۔ بس ہر طرف انسان ہی کی خاطر یہ طلسم خانۂ ہستی میں رونق ہے۔"

(2) انسان کا استحصال بظلم و ستم:

"جب ہم حیات انسانی کا عمرانی مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صاحب اقتدار طبقہ' شاہ اور شہنشاہ اعلیٰ تبار عوام کا استحصال کرتے رہے۔ غریب طبقہ ہمیشہ کچلا جاتا رہا۔ استبدادیت نے انسان کی عزت نفس' خودداری کا گلا

گھونٹ دیا.....وہ قبیلے کے سردار ہوں کہ شاہان کج کلاہ سب نے روتی بلکتی انسانوں کی زندگی کو موت سے بدتر بنا ڈالا۔ان کا لفظ قانون رہا۔استبدادیت کے دیو نے انسانیت کے دل پر وہ بھالے تیغ و تیر چلائے کہ فضا زنجیروں کی جھنکار اور انسان خاک وخوں میں لوٹتے نظر آئے۔

(3)ادیب کے فرائض:

(i)''ایک بیدار دل اور روشن دماغ انسان جو ذہن رسا رکھتا ہے'جسے اپنے ماضی کے ورثہ کی قدر ہوتی ہے جو حال کے حالات'اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر ایک خوش آئند مستقبل کی تشکیل اور تعمیر میں کوشاں ہوتا ہے وہی عظیم دیرپا اور اثر انگیز ادب کی تخلیق کرتا ہے اور اپنے خون جگر سے ایک چمن و چمنستان'ایک گل و گلستان کی نخل بندی کرتا ہے کہ انسان اور انسانیت بلند تصورات اور پاکیزہ خیالات'سوز دروں سے معمور احساسات اور شدید جذبات سے متاثر ہو کر اس کی روح کی نورانیت اور تجلیات سے نہ صرف اپنی روح کو روشن کر سکے بلکہ پوری زندگی اور معاشرہ کو صحت مند اقتدار'اصولوں سے معمور کر کے خوش گوار اور خوش آئند زندگی کی بشارت دی جائے''۔.....

(ii)''استبدادیت نے انسان کی عزت نفس'خودداری کا گلا گھونٹ دیا.....آزاد طبع'آزاد ذہن اور ذہنیت کے دانش ور اٹھے اور انہوں نے سیف قلم سے اس ظلم کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔اپنی شعلہ فشاں تقریروں اور تحریروں سے قصر شاہی میں آگ لگا دی'جذبات میں طوفان برپا کر دیا.....انہوں نے اس نوع کی غلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا'زخمی دلوں پر مرہم رکھا۔تخت و تاج سے ٹکر لی۔قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں اور باطل کی کلائی موڑ کر رکھ دی''۔

(iii)''ایک دردمند ادیب اپنے عہد کے تقاضوں کا عرفان رکھتا ہے۔وہ اپنے دور کے منفی اور تاریک پہلوؤں کو بھی بیان کرتا ہے'وہ مثالی اور مثبت قدروں کی بھی نشان دہی کرتا ہے وہ تلخ حقائق کو پیش کرتا ہے لیکن وہ خوش آئند مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے۔وہ عین مایوسی اور افسردگی کی فضا میں بھی امید کی روشنی دکھاتا ہے۔اسے نشہ پلا کر گرانا نہیں آتا بلکہ وہ گرتے ہوئے لوگوں کو سنبھالتا ہے''۔

(iv)''ایک ادیب وہ چاہے افسانہ نگار ہو یا شاعر'وہ تاریخ داں ہو یا علم معاشیات کا ماہر اس کی نگاہ میں فلاح عوام مقدم ہوتی ہے۔اس کا قلم برائے زندگی اور مسائل زندگی اٹھتا ہے اس نے اپنے پر زور انداز بیان سے خوابیدہ ضمیر'سوئی ہوئی روحوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔اس کا ایک لفظ روح کی دنیا میں تلاطم برپا کر دیتا ہے۔وہ پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔معاشرہ کی ذہنی'فکری اور جذباتی سطح کو بلند کر کے معاشرہ کو ایک صالح اور تابندہ حیات کا حامل بناتا ہے۔اگر وہ اپنے ماحول کو ناسازگار پاتا ہے'اگر وہ دیکھتا ہے کہ فضا میں ظلم کا دھواں چھایا ہے'اگر وہ دیکھتا ہے کہ انسانیت پنجہ ظلم میں جکڑی ہوئی خوں چکاں زندگی سے لہولہان ہو رہی ہے تو وہ.....ہمت افزا الفاظ سے اس کے دل کو ڈھارس دیتا ہے۔''

(v)''وہ رشتوں میں اخوت و محبت'مروت و الفت کی کمی پاتا ہے تو اس پر اظہار رنج کرتے ہوئے محبت کو فاتح عالم بتاتا ہے۔وہ دشواریوں کا مردانہ وار مقابلے کی تلقین کرتا ہے.....وہ مختلف سماجی رشتوں اور مختلف النوع سماجی طبقات میں ہم آہنگی'صلح و آشتی کا پیغامبر بن جائے۔وہ سیاست دانوں کا خضر راہ بن کر ان کو ذاتی اغراض سے بلند ہونے کی تلقین کرتا ہے۔وہ فلاح

عام کے کار اہم میں ان کو مشغول کرتا ہے۔ان کو ترغیب دیتا ہے کہ بے لوث خدمت خلق جس میں سراسر ایثار اور قربانی کا جذبہ کارفرما ہو وہی انسان کو معتبر ،معزز اور پُروقار بنا سکتی ہے اور یہ نصیحت خشک وعظ کی طرح اکتانے والی نہیں ہوتی بلکہ دل سے نکلتی ہے اور دل کی دنیا بدل دیتی ہے۔

(VI) وہ عین عالم خزاں میں حوصلہ بڑھاتا ہے کہ اگر خزاں مسلط ہے تو آخر بہار و باراں بھی کبھی اپنا شاداب، تازہ اور ہنستا ہوا مکھڑا لیے آ پہنچے گی جو دل کو تازگی اور رزہت و نگہت گلہائے چمن سے معطر کر دے گی۔یہی رجائیت ادب کا ایک لازمی جزو ہے جہاں قنوطیت، یاس، نامرادی اور افسردگی کی کوئی جگہ نہیں!.....ایک ادیب کی آواز صور اسرافیل ہوتی ہے کہ وہ دلوں کی دنیا میں قیامت برپا کر دیتا ہے۔اس کا قلم نوائے سروش ہے کہ مردہ دل کو زندہ کر دیتا ہے، سست قدم تیز ہو جاتے ہیں۔سوتے ہوئے ذہن آنکھ ملتے ہوئے بیدار ہو جاتے ہیں۔تمنائیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتی ہیں۔ذرّہ ذرّہ درس حیات دیتا نظر آتا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ کا جلوہ دکھا کر اس کے حصول اور یافت کے لیے قلوب کو بے چین اور آمادۂ عمل کر دیتا ہے''۔

(VII) ''آج کی دنیا مادیت کے زور طوفاں اور اسلحوں کے ذخیرہ اندوزی کے باعث ایک ایسے کوہ آتش فشاں کے دہانے پر آ گئی ہے کہ ایک چنگاری بھی اس دھماکہ خیز مادہ میں اگر کسی بڑی طاقت کی ناعاقبت اندیشی سے گر گئی تو عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ہزاروں سال کی تعمیری کوشش جن سے تہذیب اس آب و تاب سے جلوہ کناں ہے، لمحوں میں خاک خاکستر کا ڈھیر بن جائے گی۔لہٰذا آج کے ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ محبت کے نغمے گا گا کر دنیا کو امن سلامت روی اور صلح جوئی کی طرف مائل کرے۔تمام دانش وروں اور ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ انسان جو غایت ہستی گیتی ہے اسے ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور یہ کام ایک بڑا ادیب بحسن و جوہ انجام دے سکتا ہے تا کہ وہ ضمیر کی اس شگفتگی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو کہ وہ اپنے معاشرہ کو ماضی سے بہتر بنا سکا اور ان مثبت اقدار کی داغ بیل ڈال گیا جو مستقبل کو خوشگوار اور خوش آئند بنانے کی ضامن ہوں گی..... ایک انسان کی زندگی کا بہترین مقصد اور افادیت یہ ہے (کہ) اپنے دل کی تجلیوں کو عام کر دے اور ہر دل کو اس کے انوار سے منور اور تاباں کر دے تا کہ یہ معمورۂ عالم نور و نورانیت سے معمور ہو جائے''۔4

ڈاکٹر محمد ذاکر نے ہمارے شعرا کے فرائض منصبی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر ایک ایسے آلہ کی مثال ہے جو ہمیشہ تھرتھراتا رہتا ہے اور سردی اور گرمی کی خفیف سے خفیف تبدیلی کو بھی فوراً محسوس کر کے ظاہر کرتا رہتا ہے۔معاشرے میں اس کی حیثیت ایسی ہے جیسی انسانی جسم میں آنکھ کی، جسم میں کہیں بھی درد ہو آنکھ آنسو بہاتی ہے۔جب ہماری قومی زندگی کا پیراہن چاک چاک ہو رہا تھا تو اس پر آنسو بہانا اور اس کے رفو کی تدبیر کی طرف متوجہ کرنا شاعر کے لیے فطری امر تھا۔اس نے صورت حال کو بہتر بنانے کی آس نہ چھوڑی۔انسانیت میں اس کا عقیدہ بحال رہا۔وہ محض اپنی قومی زندگی کے دامن کے رفو کی تدبیر ہی میں مصروف نہیں رہا۔دنیا میں اور خصوصاً ایشیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اُس سے بھی اُس نے اپنی آگاہی کا ثبوت دیا.....چین ہو یا کوریا، ایران ہو یا مصر یا انڈونیشیا شاعر نے مظلوم عوام کے دکھ درد کو محسوس کیا.....اس نے اپنی عظمت گذشتہ کا سہارا لے کر اور اپنے یقین محکم اور عمل پیہم پر بھروسا کر کے استعماریت پسند طاقتوں کو خبردار کیا کہ چین، کوریا، انڈونیشیا، ویت نام، ملایا، ایران، مصر وغیرہ ممالک سے قبضۂ غاصبانہ ہٹا لیں۔اس نے ان ملکوں کے

غداروں کی مذمت کرنا اپنا فرض سمجھا.....جیسے جیسے ایشیائی اور افریقی اقوام اپنی آزادی کی لڑائی میں کامیاب ہوتی گئیں وہ دل کھول کر ان کے ترانے گاتا رہا۔ان ملکوں کی ان تھک جدوجہد کا خیال کر کے ان کی ذلت ومحکومی سے نجات پر وہ اور زیادہ مسرور ہوا۔بقول آل احمد سرور ''ادب ترقی کے لیے جذبہ پیدا کرتا ہے اور ترقی کے نصب العین کو نوائے سینہ تاب بناتا ہے۔ اس لیے جدید شاعر کا فرض اور بھی اہم ہو جاتا ہے اسی لیے اس کی ضرورت ہے کہ وہ نور و نغمے کی دنیا چھوڑ کر اس سرزمین اور اس کے مسائل سے اپنا رشتہ مضبوط کرے اور یہاں نور و نغمے کی جنت بنائے''۔

محمد حسین پرکار نے اہل قلم کی کاوشوں کو نوع انسانی کی رہنمائی قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''تاریخ شاہد ہے کہ جب جب ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچا ہے تب تب مظلوم عوام نے اتنی ہی شدت کے ساتھ اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے اور ظلم پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ ظالم کو بھی بے بس ومجبور کر دیا ہے۔ایسی تحریکیں ہمیشہ اہل قلم کی کاوشوں کا نتیجہ رہی ہیں۔یہ اہل قلم ہر زبان اور ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی آواز اُن کا پیغام سدا آفاقی رہا ہے۔ملکوں کی سرحدیں' جغرافیائی' تقسیم اور رنگ ونسل کا امتیاز کبھی ان کی راہوں میں حائل نہیں رہے۔ان کا درد فرد واحد کا درد نہ تھا۔ان کی تڑپ نوع انسانی کی تڑپ تھی۔ان کی تحریریں کسی دور تک محدود نہ تھیں بلکہ ہر دور کے لیے تھیں تا کہ جب جب ایسا موقع آئے ان کا لکھا ایک ایک لفظ نوع انسانی کی رہنمائی کرے''۔ 6

شاعری کی وسعتوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر وارث کرمانی نے لکھا ہے:

''شاعری' رومانیت' عشق اور روحانیت کی طرف اڑان بھرتی ہے' جس کی وجہ سے اس کی اپیل اپنے زمانے کے باہر بھی پہنچ جاتی ہے۔یہ وصف محض عقل بمعنی Reasoning سے نہیں پیدا ہو سکتا۔اس کے لیے عقل کو ''نور'' ماننا ضروری ہے۔ٹی ایس ایلیٹ نے یہ لکھ کر کہ بڑا شاعر ماضی اور مستقبل دونوں طرف اثر انداز ہوتا ہے' شاعری کو غیر ارادی طور پر نور ہی سے وابستہ کر دیا ہے۔اردو شاعری میں ماضی اور مستقبل پر اثر انداز ہونے کی مثال ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے۔'' 7

سردار جعفری نے اپنے شعری مجموعے ''پیراہن شرر'' کے حرف اول میں شاعری کی سماجی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کا پیچا ننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت' ہوس' بدی' خودغرضی' غلط احساس برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل ودماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں.....خارجی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد سیاسی جماعتوں کا اجتماعی عمل ہے لیکن انسانی روح کے داخلی نظام کی ترتیب وتربیت کی جدوجہد شاعروں اور دانشوروں کے حصے میں آتی ہے۔اس میں شعروفن کی تمام اصناف کام آتی ہیں۔عشقیہ شاعری روح میں لطافت پیدا کرتی ہے اور لذت فراق کو بھی لذتِ وصال بنا کر انسانوں کو سخت سے سخت حالات میں جینا سکھاتی ہے اور سیاسی اور انقلابی شاعری روح کو صلابت عطا کرتی ہے۔ضرورت دونوں کی ہے۔اخلاقی شاعری کا بھی ایک مقام ہے لیکن شاعر کا منصب واعظ کے منصب سے بلند ہے اور انداز بیان مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ ممبر پر واعظ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن دلوں میں شاعر ابھرتا ہے''۔ 8

پروفیسر فصیح احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

''ترقی پسندی کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے جتنی حیاتِ حاضرہ وسیع ہے۔ترقی پسندی کی واقعیت صرف یہ نہیں کہ وہ بھوک' افلاس اور جنسی کمزوریوں کو پیش کردے بلکہ انسان کے پیارے جذبات اور لامحدود تخیلات کو موجودہ رنگ میں پیش کرنا سچی حقیقت نگاری ہے۔ترقی پسندی حیات کے ہر شعبے میں ترقی چاہتی ہے۔لہٰذا وہ ہر شعبے کے موجودہ انحطاط کی تصویر کشی کرتی ہے اور اس پر تنقید کرتی ہوئی مستقبل کی تبدیلی اور ارتقا کی راہ دکھلاتی ہے۔ترقی پسندی ہر نوع کی استحصالی قوتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو عریاں کرتی' ان پر تبصرہ کرتی اور ان کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ترقی پسندی صرف مظلوم ہی کی حالت و کیفیات سے بحث نہیں کرتی بلکہ وہ ظالم کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے اور اس کے دل کو بھی کھول کر رکھ دیتی ہے'' 9

ترقی پسند شاعری کے بارے میں پروفیسر کوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند شاعری کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہماری وطنیت کے دھارے وسیع بنیادوں پر استوار کیے' اسے غیر مذہبی بنیادیں اور مذہب و ملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کیا۔اس نے اپنا رشتہ محنت کش عوام اور پس ماندہ طبقے سے جوڑا۔اس کی کاوشوں سے اردو شاعری کی بساط دور تک پھیلی اور وطن سے محبت اور ماحول کی سخت گیری کے خلاف نفرت کا جذبہ گھر گھر پہنچا۔ترقی پسند شاعری نے حسن و عشق کے روایتی تصور کو بدل کر نئی زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی شاہراہ کھول دی۔اب شاعری ایک لمحۂ سرخوشی کی یادنہ رہی بلکہ دردمند دل کی فریاد بن گئی۔آزادی اور جمہوریت پر زور دیا جانے لگا اور فن میں تجربات کا دور شروع ہوا' جس سے اگر ایک طرف کچھ بے راہ روی پھیلی تو کچھ کارآمد اضافے بھی ہوئے۔ زلفوں کی گھٹا' گردن کی صراحی اور آنکھوں کے پیمانے نئی زندگی کے درد و کرب' اس کے خواب و خیال اور شکست و فتح کا ساتھ نہ دے سکے اور جدید شاعروں نے نئی قسم کی ایمائیت کو فروغ دیا۔یہ ایمائیت کلاسیکی ایمائیت سے مختلف تھی۔اس کے اثر سے زبان و بیان میں بے اعتدالیاں بھی برتی گئیں لیکن مجموعی طور پر اس دور کی نظم زبان کی سہولت اور سادگی کے اعتبار سے اہم ہے۔یہ پیچیدہ علامتوں اور ترکیبوں سے بوجھل نہیں اور اپنے زمانے کی کوکھ کی تلخیوں اور بے مہریوں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہے' نیز اپنے قاری سے جڑی ہوئی ہے'' 10

ترقی پسند شاعری کی بہتر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے احسان حسن نے لکھا ہے:

(1) ''شاعری کے لیے ضروری ہے کہ اس میں بہتر انسانی جذبات کی بہتر عکاسی ہو' نمائندگی ہو' نفرت' حسد' بغض' کینہ' خودغرضی وغیرہ کے جذبے بھی ہم انسانوں کے ہیں اور جو اکثر انسانیت کو شرمسار کرتے رہتے ہیں۔ظاہر ہے ان جذبوں کی شاعری جن میں ذاتی ترجیحات پیش پیش ہوں' بہتر شاعری نہیں کہی جاسکتی جبکہ کائناتی یعنی اجتماعی محرومیوں اور مسرتوں کی ترجمان شاعری تمام عالم انسانی کی نمائندگی کرتی ہے۔ذات پر کائنات یعنی انفرادیت پر اجتماعیت کو ترجیح دینا ہی ترقی پسندی ہے خواہ وہ شاعری کا عمل ہو یا پھر کچھ اور''۔

(2) ''ترقی پسندی ان تمام قدیم و جدید رویوں سے انحراف کا نام ہے جو انسانوں کے مابین تفریق و تعصب کا باعث بنتے ہوں غرض یہ کہ ترقی پسند نقطۂ نظر مساواتی اقدار کا حامل ہے۔یہ ایک ایسا نظریہ حیات پیش کرتا ہے جس کے تحت سماج کے

نچلے طبقے کی اہمیت کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اس سے وابستہ چھوٹے سے چھوٹے فرد کی سنگ بنیاد کی مانند موزونیت و افادیت طے ہوتی ہے۔ ان معنوں میں ترقی پسندی ایک Social Philosophy ہے جو سماج کے پسماندہ غریب، مزدور، مظلوم و محکوم طبقے کے حق و انصاف اور اس کی بہتر گذر بسر کے راستے ہموار کرتی ہے کیونکہ یہ سماجی سکون اور امن و آشتی کے لیے ضروری ہے، کیونکہ سائنس کا اصول ہے جب کوئی چیز دبائی جاتی ہے تو وہ اپنے اوپر پڑنے والے دباؤ کے خلاف سرگرم ہو جاتی ہے، جنگ چھیڑ دیتی ہے اور جس کا نتیجہ دھماکہ خیز ہوتا ہے۔ لہٰذا ترقی پسند نقطہ نظر کے زیر اثر سماج میں صدیوں سے پامال ہوتے آرہے طبقے کے حق و انصاف کی آوازیں بلند کی گئیں"۔

(3) ''ترقی پسند شاعری نے زمانے سے چلے آرہے منفی و قنوطی انداز فکر کو تبدیل کیا اور مثبت طریقہ کار کو فروغ دیا۔ عشق و محبت میں ناکامی و رونے دھونے کی بجائے کامیاب عشق اور خارزار حیات میں ہم سفر کے ساتھ ساتھ چلنے و آگے بڑھنے کا تصور پیش کیا گیا۔ ترقی پسند شاعری کے تحت تانیثیت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ عورتوں کے حقوق و ان کی آزادی کے مطالبات پر تقریباً ہر بڑے ترقی پسند شاعر نے قابل غور تخلیق پیش کی۔ البتہ تانیثیت کا تصور جدیدیت کے تحت داخل ہوا لیکن اس کے باقاعدہ نقوش ترقی پسندی میں موجود نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری نے حسن کے معیار کو تبدیل کیا اور باعمل زندگی میں محنت کے ساتھ اپنے راستے ہموار کرتی عورت کے حسن کو سراہا۔ کھیت، کھلیان، کارخانوں میں کام کرتی، پسینے بہاتی عورت میں زندگی کی جدوجہد میں شامل عورت میں حسن کی نئی جلوہ سامانیاں تلاش کی گئیں۔ ..... ترقی پسند شاعری جوش عمل کی شاعری تھی۔ لہٰذا اس کے تحت عملی زندگی کی حقیقتوں کو شاعری کا موضوع بنایا گیا نہ کہ خالی و خیالی تصوراتی باتوں کو۔ ترقی پسند شاعری نے محنت کش مزدور طبقہ کے مقام کو بلاشبہ بلند کیا۔ ان کے حق و انصاف کی آواز بلند کی جس سے سماج کے اس نچلے طبقے کی اہمیت و افادیت کا اعتراف لوگوں کو کرنا پڑا۔ ترقی پسند شاعری نے اپنے سیاسی محرکات و عوامل کو بھی اظہار فن کا وسیلہ بنایا اور مختلف سیاسی موضوعات پر ترقی پسند شعرا نے کلام پیش کیے"۔

(4) ''اسلوبیاتی نقطہ نظر سے بھی ترقی پسند شاعری ان معنوں میں اہم ہو جاتی ہے کہ اس میں شعری ہیئت کے مختلف تجربے پیش کیے گئے مثلاً آزاد نظم، نظم معریٰ، نثری نظم وغیرہ۔ گو ان اصناف کی ابتدا تو شروع وغیرہ کے زمانے سے ہو چکی تھی مگر ترقی پسند شاعری نے انہیں رائج کر دیا۔ اس طرح ترقی پسند شاعری انقلابی تبدیلیوں والی شاعری رہی۔ اس نے سماج، سیاست، ثقافت اور معاشی معاملات تک غرض ہر شعبہ حیات انسانی کو اپنا موضوع بنایا اور اظہار فن کے کمالات پیش کیے۔ چند اہم ترقی پسند شعراء کے نام ہیں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، مجروح، فراق، مخدوم، مجاز، ساحر، کیفی، جذبی، جاں نثار اختر، وامق جونپوری اور علی جواد زیدی وغیرہ۔ ترقی پسند شاعری کا سفر جو با ضابطہ طور پر 1936 سے شروع ہوا تھا 1960 تک آتے آتے بالکل مدھم ہو گیا۔ وہ شعراء جو اپنی جوانی میں تحریک سے وابستگی کے تحت ترقی پسند شاعری کر رہے تھے اب سن بزرگی کو پہنچنے لگے۔ یوں تو انفرادی و ذاتی کوششوں سے تمام ترقی پسند شعراء کا تخلیقی سفر 1960 کے بعد بھی جاری رہا لیکن تحریکی نظم و ضبط اور وہ شدت احساس باقی نہ رہا جو ترقی پسند تحریک کے دور شباب میں ترقی پسند شاعری میں نظر آتا تھا"۔ 11

کوثر مظہری رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند تحریک دراصل استحصال کے خلاف ایک آواز تھی۔کسان، دھرتی، مزدور اور یہاں کی بھوک سے نڈھال جنتا۔ ان موضوعات پر ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقی قوت صرف کی''۔ 12

ڈاکٹر سلطان احمد لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک دراصل جبر و استحصال کے خلاف آواز تھی، سرمایہ پرستی، سامراجیت، مزدور، غربت، بھوک اور افلاس ان موضوعات پر ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقی قوت صرف کردی۔اس نظریے سے وابستہ شعراء میں تخلیقی مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے سردار کو عہد ساز شخصیت اور اپنے دور کی نمائندہ آواز تسلیم کیا جاتا ہے''۔ 13

''ترقی پسند شاعری کے مخاطب کون لوگ ہیں اس بارے میں عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند نظموں کا غالب سرمایہ براہ راست طرز اظہار سے متعلق ہے۔یہ خطیبانہ شاعری ہے اس لیے عوام سے اس کا خطاب رہا ہے۔ترقی پسند شاعر عوام کو مخاطب کر کے چند مفید باتیں سناتا ہے اور خواہش کرتا ہے کہ عوام اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلیں۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں تقریر کا عنصر غالب ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شاعری کے حقیقی مخاطب کون لوگ ہیں؟ 1936ء میں ہندوستانی عوام بیرونی دشمن سے آزادی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اندرون ملک ان کے دشمن صرف وہی لوگ تھے جو انگریزی حکومت کے ہمنوا یا آلہ کار تھے۔ترقی پسند شاعروں نے انگریزی حکومت کی مخالفت کی اور اپنی شاعری کو آزادی کے حصول کے لیے استعمال کیا.....ترقی پسند شاعروں نے ملک کے اندر بھی دشمنوں کی شناخت کی۔یہ دشمن ان کے خیال میں ہندوستان کا جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ تھا جسے انہوں نے ''بورژوا'' کا لقب دیا۔ترقی پسندوں کے مطابق ہندوستانی قوم دو طبقوں میں تقسیم تھی۔ایک وہ کہ جو استحصال کرتا ہے اور اقلیت میں ہے۔دوسرا وہ طبقہ کہ جو اکثریت میں ہے لیکن جس کا استحصال کیا جاتا ہے۔پہلے طبقے میں سامراجی حکومت اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں کہ جو ذرائع پیداوار پہ قابض ہیں اور مزدوروں اور کسانوں کو معاشی طور پر اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔دوسرا طبقہ ان کے علاوہ کوئی بھی شخص ہوسکتا تھا۔مزدور، کسان، ملک کا متوسط طبقہ اور وہ بھی جو معاشی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر پہلے طبقے کے دست نگر تھے۔ترقی پسند ادیبوں نے دوسرے طبقے کے جذبات و احساسات اور ان کے معاشی مسائل سے اپنا رشتہ استوار کیا۔اس طرح ترقی پسند شاعروں کے دو مقاصد سامنے آئے۔بیرونی دشمن کے خلاف آزادی کی جدوجہد اور اندرونی دشمن سے اقتصادی آزادی۔پہلے مقصد کیلئے ہندوستان کے کل عوام مخاطب تھے لیکن دوسرے مقصد کے مخاطب صرف وہی تھے جن کا استحصال جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔گویا ترقی پسند ادیبوں نے اندرون ملک کے دشمنوں کو للکارا اور ایک مکمل معاشرتی اور معاشی انقلاب کی تمنا کی۔یہ انقلاب ان کے خیال میں اشتراکی انقلاب تھا۔اس باب میں وہ روس کے 1917 کے انقلاب سے متاثر ہوئے اور اشتراکیت کو تاریخ کی اہم ضرورت اور تاریخی ارتقا کا فطری نتیجہ قرار دیا۔یہ انقلاب ترقی پسندوں کے مطابق ملک کا مزدور طبقہ دوسرے کچلے ہوئے طبقوں کی مدد سے لاسکتا تھا جن میں کسان طبقہ سب سے اہم تھا۔اس طرح ترقی پسند شاعری کے حقیقی مخاطب مزدور، کسان اور متوسط طبقے کے افراد تھے''۔ 14

ترقی پسند شعری موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے عقیل احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

(1)''1936 سے دوسری جنگ عظیم تک ترقی پسند موضوعات آزادی جمہوریت اور مزدوروں اور کسانوں کے مسائل تھے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران مزید دو اہم موضوعات امن اور عام انسان دوستی اختیار کیے گیے۔سجاد ظہیر نے اس شاعری کو''انقلابی شاعری'' کا نام دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان موضوعات پر نظمیں لکھ کر فنکار سیاسی اور معاشی انقلاب کا جویا ہے۔ وہ قومی زندگی میں مکمل تبدیلی چاہتا ہے۔ایسی تبدیلی جس سے سماج معاشی طور پر خوشحالی ہو اور ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے۔

(2)''ترقی پسند شاعری کے عام موضوعات مجرد تصورات ہوتے ہیں جنہیں ہم نظموں کے عنوانات سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً وطن'لمحہ آزادی' آثار انقلاب (جوش) جنگ'مشرق' آزادیٔ وطن'باغی' جہان نو'مستقبل'انقلاب وغیرہ (مخدوم) سرمایہ داری'خواب سحر'انقلاب'پردہ اور عصمت (مجاز) جنگ اور انقلاب آزادی'صبح فردا'امن کا ستارہ وغیرہ (سردار جعفری) قومی حکمراں'خانہ جنگی'قومی اخبار'لال جھنڈا'یلغار' آزادی'نئی جنت وغیرہ (کیفی اعظمی)'اتحاد'بیدار ہے انسان'جذبۂ بیدار عزم'امن نامہ (جاں نثار اختر)۔ان مجرد تصورات کے علاوہ دوسرا اہم موضوع وقتی اور ہنگامی واقعات ہیں''۔

(3)''ترقی پسند ادب میں یہ بات ضروری سمجھی جاتی ہے کہ شاعر و ادیب معاصر زندگی سے علاقہ رکھے اور ان واقعات و حادثات کو بھی شعری موضوع بنائے جو عوامی زندگی کو مثبت یا منفی انداز میں متاثر کرتے ہیں۔اس مجموعے کو عصری حسیت یا'' عصری آگہی'' کا نام دیا جاتا ہے''

(4)''1936ء کے آس پاس ترقی پسند شاعری کا سب سے اہم موضوع وطن کی آزادی تھا..... 1947ء تک کا یہ پورا دور ہنگامی دور تھا۔اس لیے ہنگامی موضوعات پر لکھی گئی شاعری عوام میں سند قبولیت بھی حاصل کر لیتی تھی.....ایسی شاعری سے فن کار اپنی ملکی اور سیاسی ذمہ داری بھی پوری کر سکتا تھا۔.....ایسا کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی حادثہ جو ملک کو براہ راست یا بالواسطہ متاثر کر سکتا تھا'ترقی پسند شاعر اسے موضوع بناتے تھے مثلاً گاندھی جناح ملاقات پر'فتح برلن'.....(کیفی اعظمی) جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر'جیل میں ایک دوست کی موت کی خبر سن کر'اقبال (یوم اقبال پر) غالب (یوم غالب پر) انقلاب روس'اسٹالن وغیرہ (سردار جعفری) ہنگامی موضوعات کے علاوہ بعض ایسے مسائل بھی شعر کا موضوع بنے جن کا تعلق معاشرے کے بعض گھناؤنے حقائق سے تھا مثلاً طوائف'امیروں کی جنسی عیاشیاں اور غریبوں کی بیماریاں وغیرہ''۔

(5)ان تمام موضوعات کا تعلق انسان کی خارجی زندگی سے ہے جس سے نہ صرف عوامی زندگی بلکہ فن کار کی ذاتی زندگی بھی براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتی ہے۔موضوعات کے انتخاب میں یہ اصول کارفرما ہے کہ شاعر کو اپنے داخلی اور ذاتی احساسات و مسائل اور ذاتی خوشیوں اور غموں سے بلند ہو کر عام انسانی برادری کی خوشحالی اور مسرت کی بات کرنی چاہیے یعنی دوسرے لفظوں میں شاعر کو چاہیے کہ وہ خارجی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنائے''۔

(6)''جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اس وقت یہ شعراء شعوری طور پر عشق و محبت کے اظہار سے گریز کرنے لگے''۔

(7)''ترقی پسند شاعروں کی بیشتر توجہ کا مرکز یقیناً سیاسی اور معاشی مسائل ہیں''۔

(8) ''1936 کے بعد موضوعات میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی لیکن فن کار کا نقطہ نظر بدل گیا۔اس نقطہ نظر نے زندگی کا ایک مادی تصور دیا جو ماقبل کے اخلاقی تصور سے مختلف تھا جس کی رو سے زندگی جامد و ساکن نہیں بلکہ متحرک اور ارتقا پذیر ہے۔ زندگی میں عام انسانی رشتے کسی ماورائی طاقت کے ذریعہ نہیں بلکہ پیداواری رشتوں سے متعین ہوتے ہیں۔ترقی پسند ادیبوں نے اس روشنی میں جب عام انسانی زندگی اور باہمی رشتوں کا مطالعہ کیا تو انہیں زندگی طبقات میں تقسیم نظر آئی۔ایک طرف سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ تھا جو تمام ذرائع پیداوار پر قابض تھا اور دوسری طرف مزدور اور کسان طبقہ تھا جسے حصول معاش کے لیے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا استحصال برداشت کرنا پڑتا تھا۔عوام اس صورتحال کو ''تقدیر کا جبر'' سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس کربناک صورت حال کے لیے سماج کے روایتی فرسودہ اقدار کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اپنا قلم اس نظام اقدار سے بغاوت اور ایک نئے نظام اقدار کی تلاش و جستجو کے لیے استعمال کیا۔اس طرح انہوں نے ملک و قوم کو مجبور زندگی سے آزاد کرانے کی ذمہ داری قبول کی۔اس مقصد کے لیے انہوں نے مزدوروں' کسانوں اور ادنیٰ متوسط طبقہ کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انہیں روایتی معاشرے اور اس کے فرسودہ نظام اقتدار سے بغاوت کی تلقین کی''۔

جن موضوعات کو ترقی پسند شعرا نے اپنے لیے ''شجر ممنوعہ'' قرار دے رکھا تھا اسے عقیل احمد صدیقی نے انقلاب کے غلط ادراک اور فن شاعری کے خام شعور پر مبنی رجحان قرار دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس سے شاعری کے ضروری عنصر تخیل کی اہمیت زائل ہو جاتی ہے۔وہ رقمطراز ہیں (1) ''ترقی پسند شاعروں نے اپنی رومانی وابستگی کے سبب خود پر لازم قرار دیا کہ انہیں نجی مسائل سے بچنا چاہیے اور اپنے تمام ذاتی تقاضوں کو عوام کے بنیادی مسائل کی تکمیل کی خاطر قربان کر دینا چاہیے۔یہ رجحان انقلاب کے غلط ادراک کا نتیجہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ فن کے اس مخصوص تصور کی بدولت بھی تھا کہ خارجی زندگی کی عکاسی کرنا ادیبوں کی ذمہ داری ہے۔یہ رجحان فن شاعری کے خام شعور پر مبنی رجحان ہے۔اس لیے کہ فن شعر میں جہاں تک موضوع کا تعلق ہے' اس طرح کی کوئی بھی تقسیم بے معنی ہے۔مثلاً یہ کہ یہ خارجی موضوع ہے اور یہ داخلی موضوع اسے پیش کیا جائے۔اس رجحان سے ایک ایسی میکانکیت جنم لیتی ہے جو شاعری کو تخلیقی نہیں رہنے دیتی۔موضوع کی سطح پر بھی اور اظہار کی سطح پر بھی۔موضوع کی سطح پر اس طرح کہ اگر شاعر یہ جان لے کہ اسے صرف مخصوص موضوعات پر لکھنا ہے اور یہ بھی کہ مخصوص باتیں لکھنی ہیں تو ایسی صورت میں شاعری کے ایک ضروری عنصر ''تخیل'' کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اس کا وجود اور عدم وجود بے معنی ہو جاتا ہے یا پھر ''تخیل'' کا عمل ترتیب محض سے آگے نہیں بڑھتا جبکہ تخیل کا شاعرانہ عمل ''عمل تخلیق'' سے بامعنی ہوتا ہے۔''تخلیقیت'' طرز ادا کو بھی متاثر کرتی ہے اور فنکار اپنی تخلیق کے لیے نئے اور منفرد سانچے تلاش کرتا ہے جن میں اس کی تخلیق انفرادی وضع قطع کے ساتھ ساتھ آتی ہے۔اظہار کی ''نفرادیت'' لفظ کے استعمال' امیجری' صوتی آہنگ دوسرے لفظوں میں مجموعی پیٹرن میں اجاگر ہوتی ہے اور اس طرح فن پارہ ایلیٹ کے الفاظ میں ''نئی وحدت'' بن کر سامنے آتا ہے (2) ترقی پسند شاعروں کے ذریعہ محبت اور محبوب سے شعوری گریز تا دیر قائم نہیں رہا غالباً اس لیے کہ یہ جذبہ انسان کی ایک ایسی جبلی ضرورت ہے جو بھوک کی طرح کسی بھی فرد کا حیاتیاتی مسئلہ ہے.....مجاز اور فیض نے ترقی پسند تحریک کے ''ادعائی دور'' میں بھی خالص عشقیہ نظمیں لکھی ہیں جن میں جذبہ محبت کا اظہار کسی سماجی اور معاشی حوالے کے بغیر بھی ہوا ہے لیکن دوسرے ترقی پسند شاعروں نے یا تو عشقیہ

نظمیں لکھنے سے گریز کیا یا پھر عشقیہ احساسات کو معاشی نظام کے حوالے سے پیش کیا ہے۔البتہ سردار جعفری اور جاں نثار اختر نے بعد میں چل کر بہتر عشقیہ نظمیں لکھی ہیں''۔ 15

''ترقی پسند نظموں میں رائج موضوعات وہ ہیں جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔مثلاً آزادی' انقلاب' انسان دوستی' امن' جمہوریت وغیرہ۔ترقی پسند شاعروں نے ان مجرد تصورات کی توضیح وتعبیر اور اس کی سماجی افادیت کو شاعری کا موضوع قرار دیا ہے''۔ 16

ترقی پسندوں کے ہاں نظم کو اپنانے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے احمد محفوظ لکھتے ہیں:

(1)''ادب میں جعفری صاحب کا نظریہ افادیت پسندانہ تھا' چونکہ ترقی پسند ادیبوں کا عام خیال تھا کہ مقصدی اور افادی نقطۂ نگاہ سے نظم کی صنف' غزل کے مقابلے میں زیادہ موزوں اور کارآمد ہے لہٰذا بیشتر شاعروں نے اپنا ذریعۂ اظہار نظم ہی کو بنایا''۔

(2)''1935ء میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا تو اس نے اپنے نصب العین کے شعری اظہار کے لیے نظم کی ہیئت پر بطور خاص توجہ مرکوز کی۔ابتداء میں نظم کو ترجیحی طور پر اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزل ان کے نزدیک جاگیردارانہ ماحول کی زائیدہ اور عشق وتصوف کے ان تصورات پر مبنی تھی جو ترقی پسند مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے' ترقی پسند شعرا نے جن سماجی' سیاسی موضوعات پر لکھا وہ اردو نظم میں پہلے سے موجود تھے لیکن انہوں نے اپنے پیش روؤں کی اصلاح پسندی کے بجائے مارکسی فلسفے کی روشنی میں انقلاب پسندی کو راہ دی۔اشتراکی حقیقت نگاری کے تحت عصری مسائل کی ترجمانی میں نہ صرف سماجی برائیوں اور سامراجی ظلم وجبر کی پردہ دری بلکہ روشن مستقبل کی بشارت بھی ان کی ذمہ داری تھی۔نظریے کی ترسیل ان کا اولین مقصد تھا۔اس لیے راست تخاطب' بیانیہ اسلوب' پابند ہیئت اور مانوس لفظیات ہی کی زیادہ تر پیروی کی گئی۔

(احمد محفوظ' علی سردار جعفری کی یاد میں' جامعہ' اپریل تا جون 2000' صفحہ 8' 117)

ڈاکٹر ابن کنول لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شعراء نے غزل کی طرف خاص توجہ نہیں کی۔علاوہ چند شاعروں کے جنھوں نے غزل کو بھی نظم کی طرح عوام سے قریب کیا' عوامی اور سیاسی مسائل کو غزل میں پیش کر کے غزل کو ایک نیا رنگ وآہنگ دیا۔ان میں مجاز' جذبی' فراق' مجروح اور فیض نمایاں نظر آتے ہیں۔دراصل غزل کے مقابلے میں نظم کا دامن کچھ کہنے کے لیے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔اسی کے پیش نظر آزاد' حالی اور اقبال نے غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دی۔ترقی پسند شعرا کا نظم کو وسیلۂ اظہار بنانے کا سبب یہ تھا کہ سیاسی و سماجی حالات اور مسائل سے متعلق خیالات اور نظریات کو زیادہ واضح انداز میں نظم ہی میں پیش کیا جاسکتا ہے۔زندگی کی حقیقتوں' سچائیوں اور پیچیدگیوں کو وضاحت سے پیش کرنے کا موثر ذریعہ نظم ہی ہوسکتی ہے.....آزاد نظم ترقی پسندوں کے بیانیہ اور خطابیہ لہجے کے لیے موزوں ثابت ہوئی.....ترقی پسند شعرا کا رشتہ کیونکہ عوام سے تھا اس لیے ان شعراء نے ہر وہ انداز اختیار کیا جس سے اپنی بات عوام تک پہنچا سکیں اور ان کے درد' کسک اور مسائل کو واضح انداز میں پیش کر سکیں۔اسی کوشش میں اس طرح کی نظمیں بھی لکھی گئیں جنھوں نے گیت کی شکل اختیار کی.....ترقی پسند نظم کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ ان میں انسان کے

بنیادی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔اس کی اذیتوں اور محرومیوں کو شعوری اور فنی طور پر پیش کر کے شاعر نے خود کو عوام سے قریب کرلیا ہے۔بڑی شاعری وہ ہوتی ہے جس کا اثر دور اور دیر تک قائم رہے۔بلاشبہ ترقی پسند نظم کی معنویت اور اہمیت آج بھی باقی ہے"۔ 17

ترقی پسند شاعری میں استعارہ کا استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

(1)''استعاراتی اظہار کا بنیادی تعلق بالواسطہ اظہار سے ہے لیکن ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض استعارے کثرت استعمال کے سبب مردہ ہوجائیں اور جن کی حیثیت معروف ہونے کے سبب محض لغوی ہو۔یہ استعارے جہاں کہیں بھی استعمال ہوں گے ذہن فوری طور پر اس کے مشہور مفہوم کی طرف منتقل ہوگا۔ایسے استعاروں کو''روایتی اور تاریخی''اہمیت کے استعارے کہا جاسکتا ہے۔یعنی ادب کی تاریخ میں ان استعاروں کا ایک خاص مفہوم متعین ہوجاتا ہے۔ترقی پسند شاعروں نے اپنی براہ راست نظموں میں زیادہ تر روایتی اور تاریخی اہمیت کے مقبول عام استعاروں سے کام لیا ہے''۔

(2)ترقی پسند شاعری کا سب سے مقبول استعارہ''ظلمت''اور''سحر''ہے۔ترقی پسندوں کے خیال میں تمام انسانیت تاریکی میں ہے کہ وہ بورژوا نظام میں زندگی بسر کررہی ہے۔اس کے مدمقابل پرولتاری نظام روشنی ہے۔زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطلب''خیر زندگی''اور''شر زندگی''کے درمیان فرق کرنا ہے۔ترقی پسندوں نے اس فرق کو روشنی اور تاریکی کے استعارے میں پیش کیا ہے۔شب،رات،ظلمت،تاریکی،سیاہی وغیرہ بورژوا سماج کے لیے رائج استعارے ہیں.....ترقی پسند شاعروں نے''نظام کہنہ''کو غلامی کا دور بھی کہا ہے اور اس نظام پر قائم سماج کو قید سے تعبیر کیا ہے اور اس کے اظہار کے لیے زنجیر،سلاسل،طوق زنداں وغیرہ استعارے تخلیق کیے ہیں۔یہ استعارے سیاسی جبر اور اس کے انسانیت سوز مظالم کے اظہار کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ترقی پسند شاعروں نے استعاروں کو بمنزلہ تشبیہہ استعمال کیا ہے اور چونکہ یہ استعمال اجتماعی طور پر ہوا ہے اس لیے بہت جلد ان استعاروں کی جاذبیت ختم ہوگئی ہے''۔ 18

ترقی پسند شاعری میں پیکر تراشی پر روشنی ڈالتے ہوئے عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند براہ راست نظموں میں بہت کم شعری پیکر استعمال ہوئے ہیں اور جو ہوئے ہیں وہ زیادہ تر رائج استعاروں سے تشکیل پاتے ہیں۔اس کی وجہ ابلاغ کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ شاعر کا مقصد شعری تجربے کو بذات خود حسین بنانا اور مخصوص جمالیاتی مسرت حاصل کرنا نہیں ہوتا اس لیے وہی پیکر استعمال کیے جاتے ہیں جو قاری یا سامع کے جذبات کو براہ راست متاثر کرسکیں۔پیکر اگر انوکھے ہوں تو وہ گہری سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ان کے استعمال سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ فنکار کا ردعمل جذباتی نہیں ہے۔فیض کی نظم''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''ایک سیاسی نظم ہے۔نظم کا ایک حصہ براہ راست اظہار ہے اور دوسرا بالواسطہ۔.....نظم کے دوسرے حصہ میں فیض نے بعض ایسے پیکر استعمال کئے ہیں جن کے مفہوم کی ترسیل بآسانی نہیں ہوپاتی۔پہلا حصہ براہ راست تخاطب ہے۔اس میں کوئی استعارہ نہیں،کوئی تشبیہ نہیں۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے/بول،زباں اب تک تیری ہے/تیرا ستواں جسم ہے تیرا/بول کہ جاں اب تک تیری ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا حصہ اس طرح ہے۔

دیکھ کہ آہن گر کی دو مکاں میں/تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن/ کھلنے لگے قفلوں کے دہانے/ پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

یہ چار مصرعے بالواسطہ طور پر اپنے حقیقی مفہوم کی ترسیل کر رہے ہیں یہاں کئی استعارے مل کر ایک مکمل پیکر کی تخلیق کرتے ہیں جن سے آنے والی قید وصعوبت کی زندگی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔عام قاری کو پیکر کی معنوی تہداری تک پہنچنے کے لیے غور وفکر کی ضرورت پڑے گی۔یہ سارے استعارے نظم کے مخصوص بہاؤ میں اس طرح پیوست ہیں کہ آہنگ کے حسن کے سبب کیفیت کا بآسانی ابلاغ کرتے ہیں۔.....یہ فیض کا انفرادی رویہ ہے جسے دوسرے ترقی پسند شاعروں نے بھی برتنے کی کوشش کی ہے ورنہ عام طور پر ایسی نظموں میں خطابت اس قدر حاوی ہوتی ہے کہ 'تشبیہہ سازی''عیوب ٹھہرتی ہے اور جو پیکر استعمال ہوتے ہیں وہ بیشتر تشبیہی پیکر ہوتے ہیں جن کا مقصد اکثر خیال کی تزئین ہوتا ہے اور کبھی کبھی توضیحی پیکر''(مثال سردار جعفری کی نظم صبح فردا'') 19

عقیل احمد صدیقی نے ترقی پسند شعرا کے ڈکشن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1)''ترقی پسند شعراء ڈکشن کے انتخاب میں محتاط رہے ہیں۔انہوں نے وہی ڈکشن استعمال کیے ہیں.....جو نفرت' محبت' عداوت' صلح' اخوت' ہمدردی جیسے جذبات ابھارنے میں مدد دیں۔ان الفاظ کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے....ترقی پسند موضوعاتی نظموں میں سینکڑوں مشترک الفاظ ملتے ہیں جن کا ایک مفہوم ہوتا ہے اور جو ایک ہی مقصد کے لیے استعمال کیے گئے ہوتے ہیں۔ترقی پسند نظموں میں یکسانیت کی ایک وجہ ایک سے ڈکشن کی بار بار تکرار بھی ہے.....ڈکشن میں آتش سیال کا جوش ضرور ہے.....اور جس کا مقصد اپنی پسند کے جذبات عوام میں پیدا کرنا اور ان کو برانگیختہ کر کے بغاوت پر آمادہ کرنا رہا ہے۔ اس لیے شاعروں نے.....رائج ڈکشن کا سہارا لیا ہے تا کہ عوام کی بات عوام کی ہی زبان میں عوام تک پہنچائی جا سکے''۔

(2) لیکن جب شاعروں نے محسوس کر لیا کہ اس نوع کی ہنگامی نظمیں انہیں ادبی وقار دلانے میں ناکام رہیں گی اور یہ بھی کہ حالات کی تبدیلی کے سبب اب اس نوع کی شاعری کا کوئی جواز نہیں تو ان کے رویے میں بھی تبدیلی آئی۔انہوں نے ہنگامہ آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کو اپنایا اور تجربوں اور مشاہدوں کو زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے سے پیش کرنا شروع کیا۔ اس سے ان کے لہجہ میں یہ تبدیلی آئی کہ انہوں نے جوش کے لہجہ سے انحراف کیا۔گھن گرج اور ہیجانی لفظی کے بجائے ڈکشن کے انتخاب میں احتیاط کیا۔شعلہ فشاں الفاظ کی جگہ نسبتاً نرم اور ملائم الفاظ نے لے لی۔یہ دراصل نئی حقیقت پسندی کی طرف پیش رفت تھی۔جب عوامی مسائل نئے ڈھنگ سے پیش کیے جانے لگے تو پھر ڈکشن بھی بدلا۔یہ نیا ڈھنگ اس طرح سامنے آیا کہ زندگی کی گھناونی تصویروں کو عوام کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ ان میں زندگی کو بدلنے کی خواہش بیدار ہو۔اس مقصد کے لیے زیادہ ترحمانہ لہجہ اختیار کیا گیا تا کہ کچلے ہوئے طبقے کے لیے رحم کے جذبات پیدا ہوں۔اب مزدوروں اور کسانوں کو للکارنے کے بجائے ان کی مصیبت زدہ زندگی کا نقشہ پیش کیا جانے لگا۔اس لیے ایسے الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے جو صورت حال کی سنگینی کو ابھار سکیں اور جن میں ہمدردی کے جذبات بیدار کرنے کی صلاحیت ہو''۔(مثال۔سردار جعفری کی نظم اودھ کی خاک حسیں)''۔ 20

ترقی پسند شعرا نے اردو نظم میں جو تجربے کیے ان کے بارے میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شعراء نے اردو نظم میں جو تجربے کیے ان میں ایک اہم تجربہ نظم معرّیٰ کا ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی بے ساختہ اظہار میں مانع تھی پھر ترقی پسند شعرا نے جن مسائل کو موضوع شاعری بنایا تھا اس کے اظہار میں ردیف و قافیہ رکاوٹ تھا۔ اس لیے انہوں نے جو تجربہ کیا اسے فروغ ہوا اور مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ ترقی پسند شعراء کا دوسرا تجربہ آزاد نظم کا تھا جو نظم معرّیٰ سے ایک قدم آگے کی بات تھی جس میں کسی ایک وزن یا بحر کی پابندی لازمی نہیں تھی۔ کسی ایک نظم میں محسوسات اور کیفیات کی مختلف لہروں کو مختلف اوزان اور بحروں میں نظم کیا جاسکتا تھا جس کی ایک خوبصورت مثال ساحر کی ''پرچھائیاں'' ہے''۔ 21

ترقی پسند شاعروں نے نظم کی ساخت (Structure) کیا رکھی ہے اس کے جواب میں عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''عام رویہ یہ ہے کہ نظم میں ایک موضوع سے متعلق منتشر تاثرات کو قصیدے کی ہیئت میں یا بندوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور نظم تاثرات کا مجموعہ بن کر سامنے آتی ہے چونکہ یہ کثرت تاثر ایک ہی موضوع سے متعلق ہوتا ہے اس لیے خیال یا تاثر کا تکرار پیدا ہو جاتا ہے اور نظم جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند شاعر ٹیپ کے مصرعوں کی تکرار اسی خاطر کرتے ہیں مثلاً مجاز کی نظم ''آوارہ'' میں ہر بند کے خاتمے پر ''اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں'' کی تکرار۔ اندھیری رات کا مسافر میں ''مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں'' کی تکرار۔ مخدوم کی نظم ''مسافر'' میں چلے چل' چلے چل' چلے چل کی تکرار۔ شمیم کرمانی کی نظم ''جگاوا'' میں ''جاگ میرے نوعمر سپاہی' جاگ بھی میرے لال کی تکرار۔ سردار جعفری کی نظم ''آگے بڑھیں گے'' میں ''بڑھیں گے'' کی تکرار''۔ 22

بالواسطہ (Indirect) شاعری کے بارے میں عقیل احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''بالواسطہ شاعری میں شاعر لفظوں کا استعمال اس طرح کرتا ہے کہ مجرد الفاظ کے مجرد مفہوم سے زیادہ ان کے انسلاکاتی مفہوم کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح شعر میں مفہوم کے پھیلنے' بڑھنے اور سمٹنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ رمزیت و ایمائیت ہے جو بڑی شاعری کی بنیادی قدر ہے۔ شاعر اس مقصد کے لیے تمثیل' علامت' پیکر اور استعارے سے مدد لیتا ہے''۔ 23

☆☆☆

سردار جعفری کی شاعری کا آغاز اور ارتقا

سردار جعفری کی شاعری کا آغاز ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر شمیمہ رضوی لکھتی ہیں:

''سردار کی شاعری کے کس بال کی نشاندہی بچپن ہی سے ہو رہی تھی دو سال کی عمر سے اپنی توتلی زبان میں تک بندی کرنے لگے تھے۔ بچپن ہی سے حدیث خوانی اور اہل بیت کی شان میں قصیدہ سرائی شروع کر دی تھی۔ کسی نے بچپن میں ایک بار ان کا نام پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ۔

نور نظر احمد مختار ہوں میں/ لخت جگر حیدر کرار ہوں میں/ ہے فتح و ظفر قوت بازو سردار/ یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں''۔ 24

(احمد مختار چھوٹے چچا کا نام، حیدر کرار منجھلے چچا کا نام، ظفر عباس بھائی کا نام، جعفر طیار والد کا نام)۔

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے سردار جعفری کے شعری مذاق کے نشو و نما کے بارے میں لکھا ہے:

''سردار جعفری کے شعری مذاق کی نشو و نما اسکول جانے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی اور پھر کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران انگریزی زبان و ادب اور دوسرے علوم کے مطالعے نے ان کے فکر و خیال کو نئی جہتوں کی طرف مائل کیا۔ لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ کی فضا میں سیاسی تحریک سے دلچسپی نے شاعر کی ذات میں ایک سرگرم سیاسی کارکن کو جگا دیا، جس نے اپنے عہد کے نظام سے انحراف اور احتجاج کے ساتھ ایک متبادل نظریۂ حیات کے اثبات کو ان کی تخلیقی کائنات کا محور بنا دیا۔'' 25

پہلا شعر

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی:

ان کے (سردار جعفری) کے ذہن و مزاج کا اندازہ تو ان کے اس پہلے شعر سے ہی ہوتا ہے جو انہوں نے نہایت کمسنی میں کہا تھا ۔

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

26

پہلا شعر

''سردار جعفری عنوان شباب میں اپنے اس شعر کے ساتھ مطلع شاعری پر طلوع ہوتے ہیں ۔

دامن جھٹک کے منزل ِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد ِ سفر مجھے

یہ شعر سردار جعفری کی زندگی کا اشاریہ بھی کہا جا سکتا ہے مگر وہ غزل کے کوچے میں نہیں گئے بلکہ ان کے شعور آزادی نے

انہیں جوش کے انقلابی اور باغیانہ سخن کی طرف مائل کیا۔'' 27

پروفیسر عبدالستار دہلوی نے لکھا ہے:

''جعفری صاحب کی شاعری کا یہ زمانہ سرمایہ دارانہ ظلم واستبداد کا زمانہ تھا' سامراجی استحصال کا دور تھا۔لہٰذا اس میں ظلم و استبداد اور سامراجی استحصال کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔یہ احتجاج جس کا نقطہ آغاز انگریز سامراج کے ہندوستانی مزدور' کسان اور غریب طبقہ کے استحصال سے ہو کر اس عہد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف دعوت عمل دیتا ہے۔آہستہ آہستہ وسیع تر معنی اختیار کر لیتا ہے۔ملک وقوم پر ظلم وستم کی یہ کہانی ''ایشیا جاگ اٹھا'' کی وسیع تر سرحدوں کو چھو لیتی ہے''۔ 28

علی سردار جعفری کے شعری مجموعے حسب ذیل ہیں:

1۔ پرواز

انتساب:پورن چند جوشی　　پیش لفظ:سردار جعفری　　مقدمہ:مجنون گورکھپوری

اشاعت:اول　　سنہ اشاعت:1944ء　　ناشر:اشاعت گھر حیدرآباد دکن

2۔نئی دنیا کو سلام

پیش لفظ:سردار جعفری　　اشاعت:اول　　سنہ اشاعت:1947ء　　ناشر:کتب پبلشرز ممبئی

3۔سیاسی مثنوی ''جمہور'' مشمولہ ''نئی دنیا کو سلام''　　سنہ اشاعت: پہلی مرتبہ مارچ 1946ء میں اشاعت

4۔خون کی لکیر

انتساب:سلطانہ کے نام　　پیش لفظ:گرفتاری کے سبب ناشر کا مختصر سا معذرت نامہ　　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:1949　　ناشر:نوہند پبلشرز ممبئی

5۔امن کا ستارہ

یہ کتاب تین طویل نظموں کا مجموعہ ہے۔i۔سوویت یونین اور جنگ باز　ii۔اسٹالن کتھا　iii۔امن کا ستارہ

انتساب:امن عالم کے مجاہدوں کے نام　　پیش لفظ:سردار جعفری　　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:1950ء　　ناشر:مکتبہ پبلشرز ممبئی

6۔ایشیاء جاگ اٹھا

انتساب:کرشن چندر کی حسین وجمیل کہانیوں کے نام　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:1950　　ناشر:سردار جعفری

7۔پتھر کی دیوار

انتساب:سجاد ظہیر اور فیض کے نام　　پیش لفظ:سردار جعفری　　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:اگست 1953　　ناشر:مکتبہ شاہراہ دہلی

8۔ایک خواب اور

انتساب:سلطانہ کے نام　　پیش لفظ:سردار جعفری(چند سطریں)　　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:مارچ 1965ء　　ناشر:حلقہ ادب

9۔پیراہن شرر

انتساب:کسی کے نام نہیں　　پیش لفظ:پنڈت آنند نرائن ملا　　مقدمہ:سردار جعفری　　اشاعت:اول

سنہ اشاعت:1965ء　　ناشر:حلقہ ادب، 10 سیتا محل، بوم جی پستپ، مرپلہ

10۔لہو پکارتا ہے　　سنہ اشاعت:1978

11۔نومبر میرا گہوارہ　　منظوم خودنوشت/سوانح

نوٹ:۔کلیات علی سردار جعفری جلد اول اور دوم مرتبہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی علی الترتیب جولائی ستمبر 2004 اور جولائی ستمبر 2005 میں شائع ہوئیں۔

شین کاف نظام نے سردار جعفری کی شاعری کے دو ادوار کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے بیشتر نقاد علی سردار جعفری کی شاعری کو دو ادوار میں منقسم کرتے ہیں۔پہلا دور ''ایک خواب اور''یعنی 1965 کے پہلے کا دور ہے اور دوسرا اور اس کے بعد کا دور ہے۔پہلے دور میں جعفری وہ کہتے ہیں جو اُن کی سوچ ان سے کہلواتی ہے اور دوسرے دور میں ان کے یہاں تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن مکمل انحراف ہونا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ لمبے عرصے تک تحریک اور اس کے سیاسی کمٹمنٹ کے مبلغ رہے۔تحریک پر ہونے والے ہر حملے کا انہوں نے لینن کے ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی طرز پر جواب دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میر اور غالب کے دیوان بھی مرتب کیے۔کبیر بانی کی تدوین بھی کی۔ان کے مقدمے شاہد ہیں کہ علی سردار نے اپنی شدت پسندی اور انتہا پسندی کے عہد میں بھی اردو کے کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا''۔ 29

عمر رضا نے سردار جعفری کی ادبی و فکری زندگی کے پہلے دور ''ابتداء تا 1960'' کے بارے میں لکھا ہے:

(1)''اس میں (اس دور) سردار نے اپنا ادبی و فکری سفر رومان اور انقلاب کے سہارے طے کیا''۔

(2)''اپنی ابتدائی ادبی زندگی سے لے کر 1960 تک سردار جعفری ایک ایسے رومانی اور انقلابی شاعر و ادیب کے طور پر نظر آتے ہیں جو ادب میں صرف اظہار غم پر اکتفا کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ اسباب غم کو ختم کر دینے میں یقین رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی ان کی تخلیقات میں نہ صرف یہ کہ ظلم و جبر کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ اس سے نفرت و حقارت کے شدید اظہار کے ساتھ اسے ختم کر دینے یا بدل دینے کی خواہش بھی ہے''۔

(3)'' پہلے دور میں وہ (سردار جعفری) سیاسی جانبداری کا شکار ہو کر سکہ بند فارمولوں کے تحت ادب تخلیق کرتے ہیں جس سے اس عہد کی تخلیقات میں رومانیت اور انقلابیت حاوی ہو گئی ہے۔ 30

نند کشور وکرم نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری کی شاعری کو ناقدین عام طور پر دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلے دور میں وہ اپنی سیاسی سوچ اور کمٹمنٹ سے اس قدر مغلوب میں کہ وہ اس کے حصار سے باہر نکل ہی نہیں پائے اور نتیجتاً ان کی شاعری ان کے سیاسی نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بن کر رہ گئی لیکن دوسرے دور میں وہ آہستہ آہستہ اس حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے اور پھر ایسا دور آیا جبکہ ان کی شاعری سیاسی پروپگنڈہ کے الزام سے بری ہوگئی اور ان کی فکر و سوچ میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی گئی.....سردار جعفری کے اولین دور کی شاعری میں جوش ملیح آبادی کا رنگ صاف صاف جھلکتا ہے اور وہ ان سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ بعض مقامات پر ان کی شاعری صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ان کی نظم بغاوت ایک ایسی ہی مثال ہے۔ 31

سردار جعفری کی دور اول کی شاعری:

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی ابتدائی دور کی شاعری کا جائزہ منتخب نظموں کے حوالوں سے لیا ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

(1) سردار جعفری کی ابتدائی دور کی شاعری میں پتھر کی دیوار، اودھ کی خاک حسین، ایشیا جاگ اٹھا، غریب، نیند اور نئی دنیا کو سلام اہم اور قابل قدر تخلیقات ہیں جن میں اس دور کی فکری اور فنی خصوصیات زیادہ نمایاں طور پر عکس فگن ہیں۔پتھر کی دیوار ایک منفرد انداز کی کامیاب نظم ہے جو شروع سے آخر تک شدت فکر و احساس اور تخلیقی بالیدگی کا نمونہ ہے اور جس میں انقلابی فکر کے ساتھ پروٹسٹ کا جذبہ بھی بڑی شدت سے کارفرما ہے۔فنی اعتبار سے بھی یہ کافی جاذب توجہ ہے اور یوں تو اس کے بھی شعری پیکر منفرد اور اثر آفریں ہیں لیکن خاص طور سے شاعر نے یہاں ''پتھر'' کے امیج کی تکرار ہے جو کیفیت پیدا کی ہے وہ پروٹسٹ کے جذبے کی ایک کامیاب تجسیم ہے.....اور اس پروٹسٹ کے جذبے کے ساتھ ساتھ جسے ''پتھر'' کے امیج نے اپنے اندر جکڑ لیا ہے...اسی طرح کی ایک مثال ہمیں نئی دنیا کو سلام کے ''حرف اول'' میں بھی ملتی ہے یہاں سیاہی کے امیج کی تکرار سے سردار جعفری نے غلام ہندوستان میں عمومی صورت حال کی ایک المناک اور پریشان کن تصویر کھینچ دی ہے جو سراسر غیر فطری اور انسانیت سوز ہے.....صرف ''سیاہ'' اور ''سیہ'' کی تکرار سے ایک دل دہلا دینے والا منظر پیش کرتا ہے اور ہر شعر میں یہ امیج صورت حال کے ایک نئے پہلو کو پیش کر دیا ہے اور پیکر تراشی کی اس تہہ دار معنویت نے اس نظم کو ایک طویل استعارے میں بدل دیا ہے۔

(2) ''اس دور کی ایک اور اہم نظم 'اودھ کی خاکِ حسین'' ہے جس میں ''پتھر کی دیوار'' کے مقابلے میں جذبے کا گداز اور دردمندی کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔اس نظم کی کچھ نمایاں خصوصیات اودھ کی سرزمین سے شاعر کی والہانہ محبت، انسانوں سے گہری ہمدردی اور محبت فطرت سے والہانہ لگاؤ اور نوسٹلجیا کی کیفیت ہیں اور ہر جذبہ خوب صورت اور دلنواز شعری پیکروں میں ڈھل کر سامنے آیا ہے.....سیدھی سادی زندگی کے مانوس اور دلکش مناظر ہیں جن میں ماں کے سفید آنچل اور بہنوں کی

مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ وہ غریب کسان بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوار رہے ہیں.....ان مناظر کی دلکشی بھی شاعر کے والہانہ جذبوں اور دلفریب پیکر تراشی ہی کی مرہون منت ہے اور یہاں ورڈزورتھ کی طرح سردار جعفری نے مانوس مناظر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سادگی کے باوجود غیر معمولی تخیل آفریں اور حیرت زا معلوم ہوتی ہیں اور یہ اس نظم کی ایک مخصوص فنی جہت ہے۔نظم کے آخری حصے میں انگریزی حکومت کے مظالم اور انقلابی تحریکوں کا ذکر بھی اسی شدومد سے کیا گیا ہے.....فطرت سے والہانہ لگاؤ' انسانوں سے گہری ہمدردی' ظلم واستبداد کے خلاف پر وٹسٹ کا جذبہ اور انقلاب کا ایک والہانہ تصور نوجوان شاعر کی پرسوز شخصیت کے غماز ہیں اور ساتھ ہی یہ نظم فنی خوبیوں سے بھی آراستہ ہے اور اس کی پیکر تراشی اور استعارہ سازی بھی جاذب توجہ تخیل آفریں ہیں اور انہیں خصوصیات کے باوصف ''اودھ کی خاک حسین'' کو سردار جعفری کی شاعری کے دور اول میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔اس دور کی ایک اور بہت اہم نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' ہے جس کا کینوس زیادہ وسیع ہے....والہانہ جذبوں کے خلوص، فکری عناصر کی آمیزش، اظہار کے بے ساختہ پن' مشاہدے کی درّا کی اور پیکر تراشی کی ندرت اور معنویت نے اسے ایک یادگار نظم بنادیا ہے اور اس میں سردار جعفری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار بڑی خوبی سے ہوا ہے۔اس دور کی سب سے اہم تخلیق ''نئی دنیا کو سلام'' ہی ہے''۔ 32

''نئی دنیا کو سلام'' سے قبل کے دور کے بارے میں پروفیسر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں:

''جعفری صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ''پرواز'' شائع ہوا جس کا دیباچہ ممتاز ناقد مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا۔اس میں ان کی ابتدائی شاعری کے نمونے محفوظ ہیں۔یہ نظمیں ان کی شاعری کی اٹھان کا پتہ دیتی ہیں۔.....''پرواز'' میں ان کی نظموں میں رومان اور انقلاب کی ملی جلی کیفیتیں ہیں''۔ 33

مظہر امام:

''سردار کا پہلا مجموعہ کلام ''پرواز'' شائع ہوا۔اس وقت تک فیض' راشد' میراجی' مجاز' جذبی' جاں نثار اختر اور اختر الایمان کے مجموعے منظر عام پر آچکے تھے۔''پرواز'' ان سب کے مقابلے میں کمزور مجموعہ ہے۔اس پر جوش کا اثر حاوی ہے۔عنوانات سے ہی اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔بغاوت' سرمایہ دار لڑکیاں' دیہاتی لڑکیاں وغیرہ یا پھر اشتراکی سیاست کے تحت لکھی ہوئی نظمیں مثلاً لینن' جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر' وغیرہ۔ 34

''پرواز'' 1944 میں شائع ہوا۔جو اس عہد کی ایک انقلاب آفریں شخصیت پی سی جوشی کے نام معنون ہے اور پہلے صفحہ پر یہ شعر درج ہے۔

کھل گیا در پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے

پورا مجموعہ اس شعر کی تفصیل وتفسیر ہے۔اس مجموعہ میں شامل نظموں کے عنوان ملاحظہ کیجئے۔سماج' بغاوت' انگڑائی' مزدور لڑکیاں' اشتراکی' نیا زمانہ' تاریخ' آثار سحر' ارتقاء و انقلاب' جنگ اور انقلاب وغیرہ۔ایسا نہیں ہے کہ اس میں رومانی رنگ کی نظمیں نہیں ہیں۔''جوانی'' ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس میں بھی رنگ شباب کم اور رنگ جہاد زیادہ ہے۔

مثلاً۔

زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹوں سے سارا گلستاں میرا
زمانے بھر میں تنہا رازداں ہوں لذت غم کا
سراپا درد ہوکر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مذہب میرا مسلک نوجوانی ہے

.....جوانی کے اس اسٹیج پر سردار جعفری ملک و معاشرہ، عام انسانوں کے دکھ درد سے کس قدر گہری واقفیت اور وابستگی رکھتے تھے۔عورتوں کے حوالے سے ان کا دردمندانہ اظہار ایک نسائی آواز بن کر ابھرتا ہے۔عورتوں کے ذریعہ دنیا کے نظام کو بدلنے کا تصور پہلی بار سردار کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ ان کی شاعری اور فکر و نظر کی انفرادیت ہے۔اس مجموعہ میں 1946 سے قبل کی شاعری ہے۔ظاہر ہے یہ دور صرف سردار جعفری کی جوانی کا ہے بلکہ تحریک آزادی کی پختگی اور خاتمہ کا ہے۔لہٰذا ایسے دور میں فطری طور پر ان کی شاعری میں آزادی، انقلاب اور غلامی سے نجات کا ولولہ اور دور دورہ ہے لیکن یہ محض نعرہ بازی اور کھوکھلی خطابت نہیں بلکہ اس میں بدلے ہوئے دور، مزاج اور فکر کی بھی نمائندگی ہوتی ہے۔نئے سماج کی تلاش، نئے خواب دیکھنے کی خواہش پھر اس کی تعبیر کی تلاش وغیرہ۔ایسا صرف قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی یہی ہو رہا تھا۔اس لیے اس میں عالمیت کی گونج بھی سنائی دیتی ہے"۔

نئی دنیا کو سلام اور اس کے بعد کے دور کے بارے میں پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

"حقیقتاً ان کی (سردار جعفری) شاعری کی بلند پروازی کا دور "نئی دنیا کو سلام" اور اس کے بعد کا دور ہے۔.....شاعری کے واضح فکری عناصر ان کی بعد کی (پرواز کے بعد) شاعری کا حصہ ہیں جب ان کا اپنا رنگ و لہجہ اور فکر و آہنگ ان کے اپنے اسلوب میں بدل جاتا ہے۔ان کی اس شاعری پر اقبال اور جوش کے لہجوں کے اثرات بھی ہیں، لیکن انہیں لہجوں سے ان کا اپنا لہجہ اور رنگ ابھر کے سامنے آتا ہے اور ان کی شاعری کا رنگ و اسلوب کسی دوسرے شاعر کے رنگ و اسلوب سے دبا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔جعفری صاحب کی شاعری کا یہ زمانہ سرمایہ دارانہ ظلم و استبداد کا زمانہ تھا، سامراجی استحصال کا دور تھا۔لہٰذا اس میں ظلم و استبداد اور سامراجی استحصال کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔یہ احتجاج جس کا نقطہ آغاز انگریز سامراج کے ہندوستانی مزدور، کسان اور غریب طبقہ کے استحصال سے ہوکر اس عہد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف دعوت عمل دیتا ہے۔آہستہ آہستہ وسیع تر معنی و مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ملک و قوم پر ظلم و ستم کی یہ کہانی "ایشیا جاگ اٹھا" کی وسیع تر سرحدوں کو چھو لیتی ہے"۔ 35

مظہر امام:

"سردار جعفری کا شاعرانہ اعتبار ان کی تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" سے قائم ہوا۔ترقی پسند ادیب و شاعر 1944ء تک آزاد نظم نگاری کے مخالف تھے۔لے دے کر مخدوم نے ایک نظم اس ہیئت میں کہی تھی۔سردار جعفری نے یہ طویل نظم 1946ء کی

آخری تاریخوں میں مکمل کی۔ایک سال بعد شائع ہوئی۔انہوں نے آزاد نظم کو ایک خاص جہت سے آشنا کیا اور یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار اس صنف میں کامیابی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔اس نظم کے کئی حصے بہت خوبصورت اور اثر انگیز ہیں'' 36

سردار جعفری کے دوسرے شعری مجموعے خون کی لکیر (1949) میں جملہ 59 نظمیں' غزلیں اور 49 قطعات ہیں۔ ان میں 36 نظمیں اور غزلیں پہلے مجموعہ کلام ''پرواز'' سے اخذ کی گئی ہیں جو 1944ء میں شائع ہوا تھا۔

مجموعہ ''خون کی لکیر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''بحیثیت مجموعی ابتدائی چند نظموں کو چھوڑ کر جن میں رومانیت کا غلبہ ہے'' ''خون کی لکیر'' میں بغاوت کا عنصر حاوی ہے۔ یہ بغاوت آزادی سے قبل انگریزی حکومت کے خلاف ہے جبکہ آزادی کی حصولیابی کے بعد حکومت وقت سے ہے۔اشتراکی اور جمہوری نظام کے قیام کی بات دہراتے ہیں جس سے بقول سردار جعفری پورے عالم میں امن وامان اور اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے ۔نیز دنیا میں جہاں بھی مزدوروں' کسانوں اور بے سہاروں پر ظلم اور تشدد کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہوتا ہے' اسے تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔مجموعے کی بیشتر نظموں میں گھن گرج' بلند آہنگی' پورے شدومد کے ساتھ پائی جاتی ہے۔مایوسی کے عناصر نہ کے برابر ہیں۔رجائی فکر حاوی ہے۔ہر طرف امید اور انبساط کی کیفیت نمایاں ہے۔انسان اور انسانی زندگی سے پیار کا جذبہ شدید ہے۔اخیر میں ترقی پسند شاعری پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔سردار جعفری نے ہر گام پر مقصدی اور واضح شاعری کی حمایت کی ہے اور اپنی تمام باتوں کو عموماً واضح انداز میں پیش کیا ہے''۔ 37

سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''خون کی لکیر'' 1949 میں شائع ہوا۔

اس مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''کچھ نظموں میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے مثلاً عظمت انسان' شاعر وغیرہ ان میں نئی زندگی کی بشارت ملتی ہے۔تاریخ انسانی اور عظمت انسانی کے سراغ بھی ملتے ہیں جس کو شاعر نے برے دلنواز انداز میں پیش کیا ہے۔ان نظموں میں اوپری جوش کم' باطنی گہرائی اور گیرائی زیادہ ملتی ہے۔اس کا کینوس بھی زیادہ پھیلا ہوا ہے.....نظم شاعر کا یہ فکری آہنگ بھی دیکھئے ۔

میں ہوں صدیوں کا تفکر میں ہوں قرنوں کا خیال
میں ہوں ہم آغوش ازل سے میں ابد سے
درکنار میرے نغمے قید ماہ وسال سے آزاد ہیں
میرے ہاتھوں میں ہے لافانی تمنا کا ستار

اس پوری نظم میں صرف شاعر کا رول یا ذمہ داری ہی نہیں جھلکتی بلکہ سردار کا شعری نقطہ نظر اور شاعر کی وسعت اور کیفیت بھی جھلک اٹھتی ہے۔نظم ''خواب'' میں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اب سردار کا ذہن اور روژن اپنے ملک کی آزادی اور غلامی اور لمحاتی قومی جذباتیت کے دائرے سے نکل کر کائنات کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔وسعت مطالعہ اور بلندیٔ فکر انہیں دنیا کی تاریخ وتہذیب کی طرف لے جاتی ہے۔بہت جلد ان کی نظموں میں وسط ایشیاء' سمرقند' بخارا' یونان' مصر وغیرہ غرض کہ مشرق و

مغرب مدغم ہوکر عالم انسانیت ایک وحدت اختیار کر کے سردار کا مخصوص فکری واسلوبیاتی آہنگ بن جاتا ہے۔

شعری مجموعے ''امن کا ستارہ''(1950) اور ایشیا جاگ اٹھا(1951).....یہ دونوں مجموعے مختصر سے ہیں لیکن ان میں عالم انسانیت کی دبیز اور دردمند تاریخ چھپی ہوئی ہے۔یہ نظمیں جیل میں رہ کر لکھی گئی ہیں'' 38

سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''پتھر کی دیوار'' پہلی بار اگست 1953 میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔اس میں 29 طویل ومختصر نظمیں اور اٹھارہ غزلیں ہیں۔بیشتر کلام جیل میں لکھا گیا ہے۔

عمر رضا نے لکھا ہے:

''ابتدائی نظموں میں سردار جعفری قلم کے بجائے تلوار چلاتے نظر آتے ہیں۔لیکن وقت اور حالات نے جب کروٹ لی تو ان کا اصلی شاعر بیدار ہونے لگا تھا جس کا اندازہ ''پتھر کی دیوار'' سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔''پتھر کی دیوار'' کے بعد شائع شدہ شعری مجموعہ ''ایک خواب اور'' میں شامل کلام کا انداز مزید حسین اور لطیف ہوگیا''۔ 39

''پتھر کی دیوار'' سے سردار جعفری کی شاعری کا ایک خوبصورت موڑ نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں مظہر امام لکھتے ہیں:

''میں ''پتھر کی دیوار'' کو سردار جعفری کی شاعری کا ایک خوبصورت موڑ مانتا ہوں.....ان نظموں میں سردار جعفری کا اپنا لہجہ ابھرتا ہے جو اقبال اور جوش کے اثر سے آزاد ہے''۔ 40

عمر رضا رقمطراز ہیں:

(1)''سابقہ مجموعوں کی بہ نسبت اس میں (پتھر کی دیوار) اشتراکی نظریہ کی تبلیغ، مارکسزم، استالن ازم اور سرخ پرچم کا ذکر بھی قدرے کم ہے، کہیں ہے بھی تو بے حد شاعرانہ انداز میں۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سردار جعفری اس مجموعے میں گریز کی کیفیت سے دوچار ہیں۔سیاسی اور ملکی حالات چونکہ بدل چکے تھے۔اس لیے ان کی شاعری کا رنگ بھی اب آہستہ آہستہ نئی کروٹ لینے کو بے قرار نظر آتا ہے۔ 41

(2)''سردار جعفری کی سابقہ نظموں اور ''پتھر کی دیوار'' میں شامل نظموں کے لہجے میں کافی فرق نظر آتا ہے۔پرواز، خون کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، امن کا ستارہ اور ایشیا جاگ اٹھا میں ظلم اور سامراجیت کے خلاف سردار جعفری کی نفرت، حقارت اور ان کا غم وغصہ براہ راست بے باک اور تشدد آمیز ہے۔مثلاً

چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذرّوں کو درخشاں کردیں
مسند عیش سے شاہوں کو اٹھادیں چل کر
مور بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کردیں

(نئی شاعری، خون کی لکیر)

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لاکر تخت پر قیصر کے دہقاں کو

(جوانی، خون کی لکیر)

پھونک دو کالے فرنگی کے صنم خانے کو
کھود کر گاڑدو بزدلی کے افسانے کو
آج جاتی ہے ہر اک راہ تلنگانے کو
قافلے کر نہیں سکتے کسی منزل پہ قیام
ساتھیو لال سلام

(جشن بغاوت، خون کی لکیر)

لیکن انہیں موضوعات کو جب وہ آزادی کے ذرا بعد اختیار کرتے ہیں تو ان میں قدرے معتدل اور نرم لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً۔

آہ ان ہاتھوں سے میں ہاتھ ملاؤں کیوں کر
اپنی نفرت کو حقارت کو چھپاؤں کیوں کر

(خونیں ہاتھ، پتھر کی دیوار)

ان اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ سردار جعفری اب حالات سے کچھ کچھ سمجھوتہ کرنے لگے تھے۔ 42

عمر رضا نے علی سردار جعفری کی آزادی کے بعد سے 1960 تک کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''آزادی کے بعد سے لے کر 1960 تک کی شعری تخلیقات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی سے قبل سردار جعفری کے یہاں جس طرح کا انقلابی اور اشتراکی نظریہ کارفرما تھا، اگر چہ اب بھی موجود ہے لیکن پیش کش کی سطح پر کسی قدر تبدیلی ضرور پائی جانے لگی تھی، بالخصوص ''پتھر کی دیوار'' کی نظموں میں انقلابی اور باغیانہ عناصر قدرے کم ہیں جس سے سردار جعفری کی گریز کی کیفیت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے.....اس کے بعد کے مجموعوں میں سردار جعفری کی یہ سنبھلی ہوئی کیفیت اور نمایاں ہونے لگتی ہے جس کی بنیاد پر ان کی شاعری کے معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے''۔ 43

''ایک خواب اور''، ''پتھر کی دیوار'' (1953) کے تقریباً دس سال بعد شائع ہوا۔ اس میں 1953 تا 1964 کے آخر تک کا کلام جمع ہے۔.....سردار جعفری کے نئے مجموعے ''ایک خواب اور'' میں ان کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور زیادہ فکری پختگی کا پتہ دیتی ہیں''۔

اس شعری مجموعہ میں کل 102 مختصر نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔

بقول رفعت سروش:

''پتھر کی دیوار کے بعد ''ایک خواب اور'' (مطبوعہ مارچ 1965ء) سردار جعفری کی شاعری کا عروج ہے۔ یہاں تک

آتے آتے سردار کی شاعری کا آہنگ سڈول اور لہجہ زیادہ غنائی ہوگیا ہے۔کہیں کہیں لگتا ہے ان کی اور فیض احمد فیض کی آواز ایک جیسی ہے۔ ؎

آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش/کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گذشتہ کی کتاب/ بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں/تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب/نابش رنگِ شفق، آتش روئے خورشید/مل کے چہرے پر سحر آئی ہے خون احباب/ دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال/اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) ''اس مجموعہ کی.....نظموں کا انداز بھی شیریں،نرم اور مدھم لب ولہجہ سے عبارت ہے''

(2) ''مذکورہ مجموعہ کی نظموں کا موضوع اور اس کی پیشکش کا طریقہ کار سردار جعفری کی سابقہ شعری مجموعوں کی نظموں سے قدرے مختلف ہے.....کسی بھی فن پارے کا معیار اس کے فنکارانہ پیشکش پر منحصر کرتا ہے اور انہوں نے اس مجموعے کی نظموں میں برمحل تشبیہوں،استعاروں،علامتوں،مناسب ترکیبوں اور الفاظ کی بندش سے جو شیرینی،حلاوت،نغمگی،موزونیت اور موسیقیت پیدا کی ہے وہ بے حد دلچسپ ہے'' 44

(3) ''ایک خواب اور'' کی نظموں،غزلوں اور قطعات میں جس طرح کے مضامین کو شعری پیکر عطا کیا گیا ہے وہ تقریباً وہی مضامین وخیالات ہیں جو روایتی اور عصری تقاضوں کے ملے جلے ردعمل کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔اس میں مزدوروں اور غریبوں کا ترانہ بھی ہے،انسانیت کا پیغام بھی ہے،فلسفہ حرکت وعمل بھی ہے،انسانی سربلندی اور اس کے افتخار کا بھی ذکر ہے جس سے سردار جعفری کائنات کو مسخر کرتے نظر آتے ہیں۔زندگی کی نیرنگی اور فطرت کی رعنائیاں،شادابیاں اور مختلف جلوہ سامانیاں بھی ہیں۔مشرق ومغرب کے درمیان اتحاد،امن اور پیار پیدا کرنے کی کوشش بھی ہے۔دنیا کی تمام قوموں کے دلوں سے کدورتوں کو دور کر کے سردار جعفری ایک ایسی دنیا آباد کرتے نظر آتے ہیں جہاں ہر طرف محبت کے گیت گائے جائیں۔کمیونزم کی وضاحت بھی ہے،مے نوشی کی سرمستی بھی ہے اور معشوقہ کی اداؤں پر وہ اپنی جان بھی قربان کرتے نظر آتے ہیں۔حکومت کی بے پروائی پر طنز بھی ہے۔علاوہ ازیں ایک دوجگہ اشتراکی جمہوریت اور سرمایہ دار ومزدور کی کشاکش کا بھی ذکر ہے لیکن ڈھکے چھپے انداز میں۔غرض مضامین کا ایک انبار ہے،وسعتِ خیال کی ایک دنیا آباد ہے۔اس کے ساتھ ہی پیشکش کا جو انداز ہے وہ بھی دلفریب،حسین اور دلکش ہے۔نظم ہو،غزل ہو یا پھر قطعات ہوں،ان کی شیرینی،حلاوت،نغمگی،موسیقیت،موزونیت اور شعریت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔استعاروں،علامتوں،تشبیہوں اور محاکات کا استعمال قابل دید ہے۔اگرچہ کہیں کہیں ان کے سابقہ فرسودہ انداز کی بھی بازگشت نظر آتی ہے لیکن یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے''۔ 45

سردار جعفری کا شعری مجموعہ پیراہن شرر 1966 میں حلقۂ ادب ممبئی سے شائع ہوا۔اس میں کل انیس نظمیں،پانچ غزلیں اور ایک قطعہ شامل ہے۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

''پیراہن شرر کا زیادہ تر کلام اگرچہ سیاسی ہے لیکن اس کا انداز بے حد نرم اور معتدل ہے۔وہ شاعر جو کبھی قلم سے تلوار کا

کام لیا کرتا تھا' نظریاتی غبار کی سطح سے اوپر اٹھ کر اسی قلم کو شاخ گل بناتا نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر سردار جعفری انسان دوستی کے شاعر ہیں جس کے لیے انہوں نے تاعمر محنت کی۔ چنانچہ ان کے دیگر مجموعہ کلام کی طرح اس مجموعے میں بھی انسان دوستی نے کلیدی رول ادا کیا ہے''۔ 46

''پتھر کی دیوار'' کے تقریباً دس سال..... کے بعد ''ایک خواب اور'' 1965 میں شائع ہوا۔ پیراہن شرر 1966 میں اور لہو پکارتا ہے 1968 میں شائع ہوئے۔ سردار جعفری کے اس دور کے بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

''یہ دور سردار کی شاعری کی سنجیدگی اور گہرائی کا دور ہے۔ اس دور کی نظموں میں رومان' حقیقت' اشتراکیت' سماجیت سبھی کچھ نئے پیرایۂ اظہار' افکار و آثار میں نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں مختلف و متفرق اشعار میں بلا کی رومانیت اور کیفیت تو ہے ہی سنجیدگی اور بالیدگی بھی نظر آتی ہے۔ زندگی کا ٹھوس نظریہ جھلکتا ہے۔ فلسفیانہ گہرائی نظر آتی ہے..... اس دور میں بھی وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں ؎

میں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آب حیات
پیاس کی آگ میں ڈھلتا ہوں کہ جل جاؤں گا

وقتی ہنگامی سیاست و خطابت سے الگ اس دور کی نظمیں زندگی کی جہد مسلسل اور اس کے اسرار و رموز پیکار و آزار پر فلسفیانہ روشنی ڈالتی ہیں۔..... ان نظموں کی سنجیدگی اور بالیدگی میں سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما ضرور ہیں لیکن ان میں روح کا کرب اور دل کی تپش دکھائی دیتی ہے''۔ 47

عمر رضا نے سردار جعفری کی ادبی و فکری زندگی کے دوسرے دور ''1960 سے 1980'' کے بارے میں لکھا ہے:

(1) ''اس میں (اس دور) سردار جعفری کسی قدر نظریاتی کشمکش سے دو چار ہو کر نئے ادبی و فکری منظر نامے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس عہد میں وہ اپنے نظریہ ادب میں جلال و جمال کے توازن کو جگہ دیتے ہیں''۔

(2) ''اس عہد کے اخیر میں (پہلے دور ابتداء تا 1960) وہ (سردار جعفری) جس طرح کی نظریاتی اور فکری کشمکش سے دو چار تھے' اس کا باقاعدہ اظہار 1960 کے بعد آئی ان کی شعری و نثری تخلیقات سے ہوتا ہے جن میں اگرچہ ترقی پسند میلان کی طرف ان کے تسلسل اور انحراف کی کیفیت نظر آتی ہے لیکن وقت اور حالات کے تحت بہت جلد اپنے ادبی و فکری رویوں میں ایک خاص قسم کی تبدیلی لاتے ہوئے وہ اعتدال و توازن کی راہ اختیار کر لینے میں اپنی بھلائی سمجھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ نظریاتی اور فکری سطح پر سردار جعفری کے یہاں ستر کی دہائی میں جو ایک کشمکش یا کومگو کی کیفیت در آتی ہے وہ اسّی کی دہائی کے اخیر میں ختم ہو جاتی ہے اور اپنے ایک خاص نقطۂ نظر میں استحکام پیدا کرتے ہوئے وہ ''جدیدیت'' کی ان صحت مند روایات کو قبول کرتے ہیں جس کا ایک سماجی کردار تھا جو یاسیت' قنوطیت اور ذات کے نہاں خانے میں گم ہو جانے کی کیفیت سے مبرا تھی۔ اس عہد کی شعری تخلیقات ''ایک خواب اور'' اور ''پیراہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے''۔

(3) ''1960 سے 1980 کے دوران جبکہ ''جدیدیت'' کی لہر نے ادبی دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا' سردار جعفری اس عہد کی ابتدا میں فکری اور نظریاتی اعتبار سے اگرچہ تذبذب کا شکار ہوئے لیکن بہت جلد انہوں نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر لیا

تھا اور ایک نئے ادبی وفکری منظر نامے کی تشکیل کر لی تھی جس میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے"

(4) "اس نئے نظریہ شعر و ادب میں سردار جعفری کا وہ بنیادی ادبی نظریہ جس کی اساس مارکسزم ہے، متزلزل نہیں ہوا البتہ اس کی شدت اور انتہا پسندی یا پھر یہ کہہ لیں کہ ادعائیت پر ضرور حرف آیا جس سے ان کے ادبی نقطہ نظر میں ایک معتدل، متوازن، نرم لب ولہجہ اور جلال و جمال میں ایک خاص قسم کا توازن در آیا"۔

(5) "دوسرے دور میں اگر چہ وہ (سردار جعفری) نظریاتی اور فکری کشمکش سے دو چار نظر آتے ہیں اور ان کے ترقی پسند میلان میں تسلسل اور انحراف کی کیفیت نظر آتی ہے لیکن اس دور کے اخیر میں وہ ایک ایسا نظریہ بھی مستحکم کر لیتے ہیں جس میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی انتہا پسندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ اس میں دونوں کے صحت مند عناصر شامل ہیں جس سے ان کی شعری ونثری دونوں تخلیقات میں جلال و جمال کا حسین توازن پایا جانے لگا تھا جس کی توسیع انہوں نے اپنے تیسرے اور آخری دور میں بھی کی"۔ 48

عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) "سردار جعفری کی مذکورہ بالا تمام نظموں اور غزلوں (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں بہتر دنیا کی تمنا، مظلوم کی حالت پر افسوس اور ظلم کے خنجر کو توڑ ڈالنے کی آرزو نظر آتی ہے.....ان نظموں اور غزلوں میں پارٹی لائن کی تابعداری نہیں ہے۔ اگر چہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی ابتری، بدنظمی اور گھنونی کیفیات کو انہوں نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے لیکن وہ تیزی، تندی، جھنجھلاہٹ یا وہ باغیانہ لب ولہجہ نظر نہیں آتا جو 1950 سے قبل کی نظموں اور غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانے میں سردار جعفری ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے"۔

(2) "ایک خواب اور" اور "پیراہن شرر" اور "لہو پکارتا ہے" کی نظموں وغزلوں کے مطالعے سے یہ بات بھی کسی قدر واضح ہو جاتی ہے کہ اب ان میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی تھی.....اگر چہ موضوعات کی سطح پر اب بھی وہ اپنے سابقہ موقف پر قائم نظر آتے ہیں لیکن پیشکش یا فن میں بجا طور پر تبدیلی کے عناصر کو دیکھا جا سکتا ہے"۔

(3) "حقیقت یہ ہے کہ 1960 کے بعد جس طرح کی فکری اور نظریاتی کشمکش میں سردار جعفری مبتلا تھے اب اس سے وہ نکل چکے ہیں اور ادب کے تئیں انہوں نے اب ایک ایسا نیا نقطہ نظر حاصل کر لیا ہے جس کے تحت وہ اپنے محبوب ومرغوب موضوعات کو نرم، شیریں اور مدھم لب ولہجے میں پیش کرتے نظر آتے ہیں جس میں مختلف شعری جمالیات کا رنگ وآہنگ ہے۔ لہٰذا اب سردار جعفری کی شاعری جلال و جمال اور شعلہ وشبنم کے حسین امتزاج سے عبارت نظر آتی ہے۔ البتہ ان کا ترقی پسند نظریہ کبھی بھی متزلزل نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کی انتہا پسندی سے ضرور انحراف کیا اور ایک نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ ترقی پسند نظریے کی اشاعت میں وہ سرگرم بھی رہے"۔ 49

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کے دوسرے دور کی شاعری کا منتخب نظموں کے حوالوں سے جائزہ لیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

(1) "سردار جعفری کے دوسرے دور کی شاعری میں "ایک خواب اور"، "ہاتھوں کا ترانہ"، "قتل آفتاب"، "پیراہن شرر"

سرطور'میرا سفر''حسین تر''ہمارے نام''اور''دو چراغ''اہم اور قابل توجہ نظمیں ہیں۔۔۔''سرطور''۔۔۔یہاں خلائی پرواز میں سردار جعفری کو اپنے وژن کے اظہار کے لیے ایک Objective- Corelative مل گیا ہے جس میں ڈھل کر اس نے ایک طویل استعارے کی شکل اختیار کر لی ہے۔۔۔انہوں نے خلائی سفر کو سائنس کے معجزے کے طور پر نہیں بلکہ انسان کے عزم' تلاش' جستجو' بلند حوصلوں اور بے پایاں تخلیقیت کے مسحور کن اظہار کے طور پر پیش کیا ہے۔۔۔اس نظم پر علامہ اقبال کا اثر کافی نمایاں ہے جو یوں بھی سردار جعفری کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔۔۔نظم کے آخری شعر میں موسیٰ اور جلوہ طور کی قرآنی تلمیح نے نظم کی معنویت میں ایک اور جہت کا اضافہ کر دیا ہے۔۔۔''میرا سفر''بھی اس دور کی ایک نہایت اہم نظم ہے جو سردار جعفری کے مرکزی وژن کی تجسیم ہے۔اس میں انہوں نے کئی اہم تصورات مثلاً زندگی کی قوت نمو' تخلیقی توانائی' تسلسل حیات' زندگی اور موت کے تواتر اور وقت کے تصور کو ایک سجل اور لطیف فورم میں ڈھال دیا ہے۔۔۔اس نظم کی بڑی خوبی اس کا اختصار' ارتکاز' شعری آہنگ اور شعری پیکر ہیں جو بڑی لطافت سے گہرے اور پیچیدہ تصورات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں''۔۔۔۔۔

(2) ''نظم دو چراغ''۔۔۔ یہاں شاعر نے روشنی تاریکی اور ہوا کے استعاروں کی مدد سے نیکی اور بدی یا ظلم اور انسانی حوصلوں کی ازلی اور ابدی لڑائی کو مجسم کر دیا ہے۔نظم کا اختصار اور فنی توازن بھی متاثر کرتا ہے۔ڈرامائی عناصر کی آمیزش سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم فنی جہت اور یہ نظم اس طریقہ کار کی ایک عمدہ مثال ہے''۔۔۔۔۔علی سردار جعفری نے انڈو پاک دوستی اور امن عالم کے موضوع پر بھی متعدد نظمیں لکھیں۔۔۔مثلاً''دشمن کون ہے''اور''صبح فردا''۔۔۔۔اس موضوع پر ان کی بہترین نظم'' گفتگو'' کے ابتدائی اشعار ۔

گفتگو بند نہ ہو/بات سے بات چلے/صبح سے شام ملاقات چلے اب ہماری گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔۔۔۔نظم''حسین تر'' کا شمار نہ صرف سردار جعفری کی بہترین نظموں میں بلکہ اپنے دور کی بہترین عشقیہ نظموں میں کیا جا سکتا ہے''۔ 50

سردار جعفری کا شعری مجموعہ''لہو پکارتا ہے'' 1978 میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔اس میں 1967 سے 1978 تک کا کلام جمع ہے۔کل 84 مختصر نظمیں' غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔مجموعہ کے آخر میں یاران میکدہ کے عنوان کے تحت 1954 سے 1955 کے درمیان لکھی گئی سات نظمیں ہیں جو ان کی ہم عصر شخصیات لوئی آراگوں' پابلو نرودا' جولیو کیوری' پال روبسن' ایلیا اہرن برگ' فیض احمد فیض اور کرشن چندر پر لکھی گئی تھیں اور جو کسی اور مجموعہ میں شامل نہ ہو سکی تھیں۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) ''اس مجموعہ کی نظموں میں سردار جعفری نے عموماً سیاسی' سماجی اور معاشرتی مسائل کو ہی اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ خاص طور پر موجودہ صورتحال سے وہ بے حد برہم اور نالاں نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کہیں براہ راست' کہیں بالواسطہ' کہیں نرم اور مدھم لب و لہجہ میں تو کہیں تلخ اور تند لہجے میں انہوں نے اپنی برہمی اور افسوس کا اظہار کیا ہے''۔

(2) ''جیسا کہ اس مجموعہ کا نام ہے' اس کی نظمیں بھی لہو کی مانند ہیں اور اس میں انہوں نے ملک و بیرون ملک رہنے والے غریبوں' کسانوں' مزدوروں اور بے سہاروں پر ہو رہے ظلم و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔سردار جعفری نے ان نظموں میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ مزدور' کسان' غریب اور دیگر کمزور طبقے آواز دے رہے ہیں' فریاد کر رہے

ہیں اور پکار رہے ہیں لیکن اس طبقے کی طرف کسی کی توجہ مرکوز نہیں ہوتی۔ سیاسی رہنما ان کی حالتوں پر ترس نہیں کھاتے۔ انہیں ان کی ذرا بھی فکر نہیں ہے، وہ تو اپنے ایوانوں اور محلوں میں عیش و سرمستی اور رنگ رلیوں سے ڈوبی راتوں کو حسین سے حسین تر کرنے میں مصروف ہیں۔ سردار جعفری نے موجودہ صورتحال کو شعری پیکر عطا کرنے کے لیے مختلف طریقہ کار اختیار کیا ہے مثلاً کہیں تو اپنی مایوسی، عدم اطمینانی اور برہمی کا اظہار کیا ہے اور کہیں طنز کی کاری ضرب لگائی ہے۔ کہیں براہ راست تو کہیں بالواسطہ اور کہیں بیانیہ انداز اختیار کیا ہے جس میں نرم اور شیریں لب و لہجہ حاوی ہے۔ اگر چہ کہیں کہیں موضوع کی مناسبت سے لہجے میں تلخی اور تندی بھی پائی جاتی ہے لیکن تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور تلمیحوں کے برمحل استعمال نے کلام میں شیرینی، نغمگی، گھلاوٹ اور موسیقیت و موزونیت کی ایک فضا قائم کر دی ہے جس سے نظموں کی شعریت اور جمالیاتی شان برقرار نظر آتی ہے"۔ 51

شعری مجموعہ "لہو پکارتا ہے" (1978) کے بعد کے سردار جعفری کے شعری سفر میں کمی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) "لہو پکارتا ہے" (1978) کے بعد سے لے کر وفات تک میرے محدود علم کے مطابق انہوں نے (سردار جعفری) آٹھ غزلیں، تیس نظمیں اور پندرہ متفرق اشعار کہے تھے جو مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ اگر چہ کراچی سے نکلنے والے مجلّے "افکار" کے سردار جعفری نمبر میں اس عہد کی شعری تخلیقات کو "افکار تازہ" کے نام سے شائع کیا گیا جس میں نظم "آبلہ پا"، "کربلا" "نومبر میرا گہوارہ" "شعلۂ خورشید" "محشر" اور "الوداع" نیز دو غزلیں اور چار اشعار ہیں۔ علاوہ ازیں 1995 میں "افکار" نے نظموں کا انتخاب نمبر شائع کیا تو اس میں بھی سردار کی تین نظمیں، اقبال خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت اور "فرمان خدا" شامل ہیں لیکن ان سے سردار جعفری مطمئن نہیں تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی شعری و نثری تخلیقات کا انتخاب شائع کریں۔ مستقل ملازمت نہ ہونے کے سبب وہ کسی بھی طرح کے پنشن یا مراعات سے کوسوں دور تھے۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ مشاعرے، سمینار اور غیر ملکی دورے تھے جس کے باعث وہ ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف بیماریوں نے بھی انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ دل کا دورہ تو انہیں 1968 ہی سے پڑنا شروع ہو گیا تھا جس سے اب وہ ذہنی طور پر اگر چہ خود کو موت کے بے حد قریب متصور کرنے لگے تھے لیکن اس حقیقت سے وہ گھبرائے نہیں اور نہ ہی ان کے ادبی و فکری کاموں میں کسی قسم کی تبدیلی آئی..... 1980 کے شروع میں سردار جعفری کو Prostrate کی بیماری نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا جس کے باعث اکثر ان کا پیشاب رک جایا کرتا تھا..... یہی نہیں اب ان کی آنکھیں بھی جواب دے چکی تھیں۔ علاج و معالجات اور گھر کے اخراجات کا پورا کرنا ان کے لیے بے حد پریشان کن ثابت ہو رہا تھا۔ صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنا فلیٹ فروخت کر کے چھوٹا مکان خریدنا چاہتے تھے تا کہ بقیہ پیسوں کو بینک میں جمع کر کے اس سے حاصل انٹرسٹ سے بقیہ زندگی گزار سکیں جس کے لیے انہوں نے ایک منصوبہ بھی بنا لیا تھا یہ دیگر بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

(2) 30/ اکتوبر 1989 کے اپنے ایک خط میں زاہدہ زیدی کو وہ لکھتے ہیں:

''میری آنکھوں کا حال تمہیں سرجن کی رپورٹ سے معلوم ہوجائے گا جو وسط نومبر میں آپریشن کرے گا۔اس کے علاوہ جو تکلیفیں ہیں وہ عمر کا حصہ ہیں جن کو رقصاں اور غزل خواں ساتھ لے کر آخری دن تک چلنا چاہیے لیکن اس چلنے کے لیے کچھ سامان زندگی ضروری ہے۔میرے پاس کوئی بینک بیلنس کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔اور ہر عالم میں زندہ رہنے کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔حالاں کہ یہ عمر کی وہ منزل ہے جب مجھے اطمینان اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں وقت صرف کرنا چاہیے تھا۔ بہت جی چاہتا ہے کہ اپنی کتابوں اور دوستوں کے ساتھ زندگی کے خوشگوار بنانے کی کوشش کامیاب ہو لیکن سارا وقت مکروہات دنیا میں گزرتا ہے۔آٹھ دس آدمیوں کا گھر ہے۔سلطانہ کام سے سبکدوش ہو چکی ہیں۔پھر بھی میرے ساتھ اس جدوجہد میں شریک ہیں۔ میں 76 سال کا ہوں' وہ 72 سال کی۔اس تضیع اوقات کی وجہ سے کوئی علمی و ادبی کام نہیں کرسکتا۔فراغت بہت بڑی دولت ہے۔وہ نصیب نہیں ہے۔اب اس کو حاصل کرنے کا طریقہ سوچا جارہا ہے کہ جس گھر میں رہ رہے ہیں' اسے فروخت کر کے کوئی چھوٹا سا گھر لیں اور باقی رقم بینک میں جمع کردیں لیکن اس راہ میں بھی بہت سی مشکلات حائل ہیں''۔(بنام زاہدہ زیدی مشمولہ سردار جعفری کے خطوط ص 104)

''اس کے باوجود سردار جعفری نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں''۔

(3) ''مختلف بیماریوں اور اس طرح کی مصروفیتوں کے سبب سردار جعفری اپنی زندگی کے آخری عہد میں تخلیقی کاموں کے لیے زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔جو کچھ انہوں نے تحریر کیا تھا' اسے وہ شائع بھی نہیں کرا سکتے۔اپنی اسی سالہ جشن پیدائش کے موقع پر انہوں نے اپنے اسی مقالوں' نظموں اور غزلوں کا ایک انتخاب بھی کرلیا تھا جس کا نام انہوں نے رقص ماہ وسال رکھا تھا' وہ بھی مصروفیت کی نذر ہوگیا۔سردار جعفری بس یہی سوچتے کہ مصروفیت ختم ہو تو اپنے تمام ادھورے کاموں کو وہ مکمل کرلیں گے لیکن رفتہ رفتہ عمر کے ساتھ ان کی کمزوری روز افزوں بڑھتی ہی جارہی تھی۔قانون فطرت کے آگے اب وہ بے بس ہوتے جارہے تھے''۔

(4) ''یہ وہ زمانہ ہے جب سردار جعفری کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ اب وہ زندگی کے آخری پڑاؤ میں ہیں اور چل چلاؤ کا وقت ہے۔اس کے باوجود سردار جعفری کی فعالیت اور سرگرمی قائم تھی۔اب بھی وہ اردو زبان وادب کی خدمت اسی تندہی کے ساتھ کررہے تھے جیسا کہ پہلے۔5/جون 1998 کو وگیان بھون میں انہیں 1997 کے لیے گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تو وہاں بھی انہوں نے اردو زبان کو اس کا جائز مقام دینے کی بات دہرائی۔علاوہ ازیں فروری 2000ء میں جب اہل ممبئی نے اردو کو انصاف اور اس کا جائز حق دلانے کی غرض سے ایک جلوس کا انعقاد کیا جو چار گھنٹوں کے سفر پر مشتمل تھا تو تمام بیماریوں اور کمزوریوں کے باوجود سردار جعفری نے نہ صرف یہ کہ اس کا افتتاح کیا بلکہ وزیر اعلیٰ کو میمورنڈم بھی پیش کیا''۔

(5) ''کل تک نہایت ہی مصروف اور دن رات اردو کی ترقی وبقا کے لیے فکرمند رہنے والے اس مرد مجاہد کے اعصاب پر رفتہ رفتہ جمود طاری ہونے لگا تھا۔اب انہیں کوئی بھی بات یاد نہیں رہتی تھی۔نہرو کلچر سنٹر ممبئی کے سالانہ مشاعرہ میں اکثر وبیشتر وہ شریک ہوتے تھے۔ہر سال کی طرح 22/اپریل 2000 کو بھی علی سردار جعفری مدعو تھے لیکن اب وہ اس قابل نہیں تھے کہ اسٹیج پر بیٹھتے۔لہٰذا انہیں اسٹیج کے نیچے آرام دہ کرسی پر بٹھادیا گیا۔ناظم مشاعرہ سید محمد اشرف نے انہیں شعر پڑھنے کی درخواست

کی.....وہ میرا سفر سنانے لگے.....اس کے بعد وہ جلد ہی اسپتال میں داخل کر دیے گئے.....جون 2000 میں پتہ چلا کہ ان کے دماغ کے اگلے دونوں حصوں میں ٹیومر ہے.....بے حد کامیاب آپریشن بھی ہوا لیکن بقول ڈاکٹر نریش "مرنے سے پہلے ہی وہ خاموش ہو گئے تھے۔وہ آواز ڈوب گئی تھی جو کئی دہائیوں تک مشاعروں' سمیناروں' کانفرنسوں' جلسوں' جلوسوں میں اپنی گھن گرج کے ساتھ گونجتی رہی تھی۔وہ آواز جو کسانوں اور مزدوروں کو جگا کر ایک نئی صبح کی آمد کی امید بندھاتی رہی تھی".....سردار جعفری نے اپنی زندگی کا جو سفر 29 نومبر 1913 کو شروع کیا تھا اس کی تکمیل یکم اگست 2000ء کو ہوئی تھی"۔ 52

عمر رضا نے سردار جعفری کی ادبی و فکری زندگی کے تیسرے دور "1980 سے 2000" کے بارے میں لکھا ہے۔

(1) "دور دوم.....میں وہ اپنے نظریہ ادب میں جلال و جمال کے توازن کو جگہ دیتے ہیں جس کی توسیع وہ بعد کے دور میں بھی کرتے ہیں".....ان کی نظموں نومبر میرا گہوارہ' کربلا (ایک رجز)' آبلہ پا' الوداع' اقبال خدا کے حضور میں' فرشتوں کا گیت' فرمان خدا' شہریاراں' ایودھیا' راج نرائن اور متعدد غزلوں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے.....اس عہد کی شاعری میں جس طرح مناسب اور برمحل تشبیہات استعارات اور تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے اس سے سردار جعفری کی شاعری یقیناً تمام تر شعری لطافتوں سے مزین ہو گئی ہے۔53

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کے تیسرے اور آخری دور کی شاعری کا منتخب نظموں کے حوالوں سے جائزہ لیا ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

(1) "سردار جعفری کی آخری دور کی شاعری میں "نومبر میرا گہوارہ" "آبلہ پا" اور "برہنہ فقیر" زیادہ اہم نظمیں ہیں لیکن "نومبر میرا گہوارہ" جو ایک منظوم خودنوشت ہے' نامکمل ہے....."برہنہ فقیر" میں سردار جعفری نے وجود و عدم کے تصورات کو علامتی انداز سے پیش کیا ہے۔یہاں عدم ایک برہنہ فقیر ہے اور وجود اس کا عارضی لباس' سورج' چاند' ہوائیں اور دشائیں سبھی اسے لباس فراہم کرتے ہیں.....اور انسانی زندگی جس کے ہزاروں رنگ ہیں اسے ہر روز ایک پیراہن پہناتی ہے اور یہی وجود حکمت سادہ ہے.....آبلہ پا" اس سے زیادہ اثر انگیز اور دلکش نظم ہے جس میں انسانی زندگی کو صحرا کے سفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کو وقت کا مہمان کہا گیا ہے۔یہ سفر صعوبتوں سے پُر بھی ہے اور دلنواز بھی.....اس طرح انسانی زندگی کا پیرہن امید و بیم' نشاط و الم' خواب اور حقیقت اور فطرت کی فیاضی اور حسن کی بے ثباتی کے تار و پود سے بنا ہے اور اس کی ہر کیفیت پر اسرار ہے اور اس صحرائے بیکراں میں آواز جرس بھی بنتا ہے اور آفریں وقت کے تصور اور تسلسل حیات کو ان شعری پیکروں میں ڈھالا گیا ہے۔

کل صبح کے دامن میں/تم ہو گے نہ ہم ہوں گے/بس ریت کے سینے پر/کچھ نقش قدم ہوں گے/سائے میں درختوں کے/پھر لوگ بہم ہوں گے

یہ نظم گہرے تفکر' احساس کی شدت' اظہار کی ندرت' تہ دار معنویت' فنی وسائل کی کفایت' وژن کی وسعت اور ایک پر اسرار کیفیت کے باوصف ایک مختصر شاہکار سے کم نہیں اور اسے سردار جعفری کے فن کی معراج بھی کہا جا سکتا ہے"۔ 54

عمر رضا نے سردار جعفری کی ادبی و فکری زندگی کے تینوں ادوار (ابتدا تا 2000) پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

(1) ''اپنی ادبی وفکری زندگی کے....تینوں ادوار میں سردار جعفری نے ترقی پسند خیالات اوران مارکسی نظریات سے کبھی منہ نہیں موڑا جس کے تحت عالمی امن' اتحاد اور انسانیت کی بقاء پر زور دیا جاتا ہے۔ان خیالات کو بدلتے حالات اور ذوق کے تحت انہوں نے ایک نئے ادراک' ایک نئے یقین' ایک نئے اور قدرے نرم لب و لہجے میں ہمیشہ پیش کیا اور پیش کرنے کی وکالت کی جسے انہوں نے ترقی پسند اور ترقی پسند تحریک سے تعبیر کیا مثلاً آزادی سے قبل سیاسی اور سماجی نظریات کو تخلیق پر فوقیت دی جاتی تھی۔ادب چند سیاسی نعروں اور سماجی نظریوں کے مطابق تخلیق کیا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد یہ باتیں کسی حد تک فرسودہ سمجھی جانے لگیں۔اب تخلیق کا عمل کسی بندھے ٹکے سیاسی وسماجی نظریے یا فارمولے کا پابند نہیں رہا بلکہ ذاتی اور شخصی تجربہ تخلیق کی بنیاد بنا'' 55

نظم نگاری:

سردار جعفری نے دونوں طرح کی شاعری کی' پابند بھی اور آزاد بھی۔وہ کسی ایک ہیئت کے اسیر نہیں ہوئے۔

سردار جعفری کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں۔رومانی' سیاسی اور سماجی' ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری کی شاعری مجموعی طور پر تین فکری جہت کی کارفرمائی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔اولاً ترقی پسند یا انقلابی' دوم حب الوطنی اور سوم دردانسانی۔دیکھا جائے تو سردار جعفری کی پوری زندگی اور شعری سرمایہ انہی تین جہتوں کا منبع ہے''۔ 56

سردار جعفری نے نظموں میں جو تجربے کئے اس کے بارے میں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''ان کی (سردار جعفری) طبع بنیادی طور پر نظم کی طرف راغب تھی۔اسی لیے اپنی نظموں میں انہوں نے ہر قسم کے تجربے کیے۔پابند' معرّیٰ' آزاد نظمیں' سہ مصرعی نظمیں' کثیر البحری نظمیں' طویل نظمیں' مختصر نظمیں' تمثیلی نظمیں' سیاسی نظمیں' رومانی نظمیں' انقلابی نظمیں' امن دوست نظمیں وغیرہ وغیرہ۔57

سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات کے بارے میں کئی ادیبوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

پروفیسر دلوی لکھتے ہیں:

''جعفری صاحب کے موضوعات میں تنوع ہے' مغرب سے مشرق تک' ویتنام' کوریا' کشمیر بلکہ ساری دنیا ان کی رومان انگیز انقلابی فکر کے زیر اثر ان کی شاعری کا موضوع رہی لیکن انہوں نے ساری دنیا کے غم کو اپنے سینے میں جگہ دی' وہیں پر وہ ملکی مسائل' ہندوستان کی تہذیبی روایات اور مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری اور بھائی چارے اور صلح وآشتی کو اپنی شاعری کی ایک بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں.....ہندو پاک کی جنگوں کے پس منظر میں کہی گئی ان کی نظمیں ''کون دشمن ہے؟ اور ''صبح فردا''.....جو اُن کی حب الوطنی' وسیع المذہبی اور برصغیر کے دو مختلف سیاسی اکائیوں کے باوجود مشترکہ درد وغم اور مشترکہ تہذیبی ورثے اور ان کے لیے عزت واحترام کی علامتیں ہیں'' 58

ڈاکٹر رفعت النساء بیگم رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے اپنی شاعری میں عصر حاضر کے تقاضوں سے بحث کی ہے۔اچھی شاعری کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ اس میں عصر حاضر کی ترجمانی ہو'سردار کی شاعری ان تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ان کی شاعری میں متفرق موضوعات اور فلسفیانہ خیالات بھی ملتے ہیں۔سردار نے عوام کو بیدار کرنے کا جو عزم کیا تھا اس میں کامیاب رہے'انہوں نے نہ صرف جبر و تشدد کے خلاف آواز اٹھائی ہے بلکہ ایک بہتر سماجی نظام کا خواب دیکھا ہے۔غم دنیا سے ان کا رشتہ استوار ہے۔انہوں نے معصوم' بھولے بھالے انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ان کے ہر ایک زخم کو گویائی عطا کی ہے۔ 60

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے لکھا ہے:

سردار کے کلام کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے اور انہوں نے آزاد و پابند دونوں ہیئتوں کا استعمال یکساں کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔سردار کی نظموں کے موضوعات الگ الگ ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سب کا موضوع انسانیت ہے۔ 61

ڈاکٹر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

''دوسری جنگ عظیم' ہندوستانی آزادی کی تحریک' ملک کی تقسیم' معاشی زبوں حالی اشتراکی نظریات' انسانیت کی فلاح کا خواب ان تمام واقعات کے واضح نشانات سردار جعفری کی شاعری میں نظر آجائیں گے''۔62

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری اپنے موضوع و مواد اور لب و لہجے کے اعتبار سے انقلابی افکار اور ولولہ انگیز خیالات پر مشتمل ہے۔ان کی شاعری میں ہمارے سماج کی تصویر نظر آتی ہے۔سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ' ان کی استحصالی سرگرمیاں' دولت مند ملکوں کی جنگی تیاریاں اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی ان کی کوششیں' ملوں کے مالکوں اور زمینداروں کا محنت کشوں اور غریبوں کے دکھ درد' ان کی ذلت و بے حرمتی' ان کے بلکتے ہوئے بھوکے بچے' ان کی بیمار عورتیں' ان کے ان پڑھ نوجوان' ان کے ٹوٹے ہوئے گھر' ان کے بے رونق گاؤں اور محلے۔یہ سب سردار جعفری کی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ جعفری عشق و عاشقی کے قصے بیان نہیں کرتے۔وہ کسی معشوق فتنہ گر کے حسن و جمال اور عشوہ و ادا کا ذکر مریضانہ تکرار کے ساتھ نہیں کرتے۔وہ زندگی کے ایسے مسائل و حقائق کو بھی اپنی شاعری کا موضوع نہیں بناتے جن کی حیثیت حاشیے کی ہے۔وہ کونے کھدرے کے مسائل سے صرف نظر کرتے ہیں۔وہ روٹی بھوک' کپڑا' سماجی عزت و انصاف' انسانی حرمت و شرافت اور مساوات و برابری کا سوال پہلے اٹھاتے ہیں۔وہ امن کے گیت گاتے ہیں اور جنگ و اسلحہ سازی' قوموں کے تصادم و محاذ آرائی کو ناپسند کرتے ہیں۔وہ انسانوں کی آزادی کے مبلغ اور خوش حالی کے آرزومند ہیں۔غلامی و محکومی کی انہوں نے ہر جگہ مذمت و مخالفت کی ہے۔انہوں نے انگریزوں کے دور حکومت میں ان کے ظلم و استبداد کے خلاف لکھا اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی انسانیت کش منصوبوں اور کوششوں اور ہر طرح کے جبر و جور کے خلاف لکھا اور سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے گئے۔سردار جعفری نے دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کی آزادی و مساوات کی کوششیں ہو رہی تھیں' ان کی تعریف و توصیف کے گیت گائے۔سوویت روس کے اشتراکی انقلاب کا بھی انہوں نے بہت اثر قبول کیا۔کربلا کے

میدان میں اقتدار وقت سے ٹکر لینے والے بہادر حضرت حسینؓ کی مدح لکھنے والے شاعر نے لینن کی تعریف بھی لکھی۔اپنی مثنوی ''جمہور نامہ'' (1946ء) میں انہوں نے ہندوستان کے نوجوانوں' کسانوں اور مزدوروں کو للکارا اور انہیں غلامی کی زنجیر توڑ دینے کی دعوت دی۔ہندوستان کی جنگ آزادی کو تیز تر کرنے اور ملک کے عوام و خواص کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے کے لیے انہوں نے نظمیں لکھیں۔63

(1) ''سردار جعفری کا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے ارتقائی زمانے سے شروع ہوا۔انہوں نے آزادیٔ وطن سے پہلے کے غلام ہندوستان اور اس کے سماجی' معاشی اور سیاسی مسائل کو بڑے قریب سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا تھا۔غیر ملکی حکومت کے ظلم و ستم اور اہل وطن کی مجبوری و مظلومیت کو بھی انہوں نے گہرائی سے محسوس کیا۔علاوہ ازیں ہندوستانی سماج میں سرمایہ داروں کے غریب طبقے پر بڑھتے ہوئے استحصال اور جبر کا بھی سردار نے مشاہدہ کیا تھا۔آزادیٔ وطن کی جنگ کا منظر نامہ بھی ان کی نگاہوں میں تھا' چنانچہ ان کی شاعری میں ہمیں آزادیٔ وطن سے قبل اور بعد کے تمام معاشرتی' اقتصادی' سماجی اور سیاسی حالات و حقائق کی پیچیدگی کا موثر بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔سردار جعفری چونکہ شعر و ادب کو اپنے زمانے اور ماحول کی تاریخ' قوتوں اور کوائف کا زائدہ و پروردہ سمجھتے ہیں اس لیے ان کے شعری سرمایہ میں ہمیں اپنے ملک کے ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے انسانیت کش واقعات اور ان سے پیدا شدہ احوال کا انعکاس واضح طور پر ملتا ہے۔سردار جعفری کی شاعری میں ہمیں سماجی انصاف' انسانیت سے محبت' دیہاتی اور مزدور پیشے طبقے سے ہمدردی اور امیر و حاکم طبقے کے غاصبانہ اور استحصالی رویوں کے خلاف انقلاب و بغاوت کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔سماجی انصاف' انسانیت سے محبت ..... پر سردار جعفری کا ایمان کامل ہے۔وہ مذکورہ اقدار حیات کی ترویج و اشاعت کو ایک دیانت دار فن کار کا فرض منصبی قرار دیتے ہیں.....سردار جعفری کی شاعری میں انسان' سماج اور اس کی ہر طرح کی خوشحالی' ترقی اور قدر و منزلت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔امیری اور غریبی کی کشمکش اور سماجی نابرابری اور دوسری تمام انسانیت کش طاقتوں کو وہ عالم انسانیت کے لیے مضر سمجھتے ہیں نیز استحصالی اور ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے سخت غم و غصے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔وہ دنیا کی ایسی تمام چیزوں' قوتوں اور رویوں کے خلاف اعلان بغاوت بھی کرتے ہیں جنہوں نے سادہ دل بندگان خدا کو مجبور اور مظلوم بنا رکھا ہے' سردار کی ابتدائی دور کی شاعری میں جذبات بغاوت برملا طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔بعد کو ان کے یہاں فکری سنجیدگی اور گہرائی سرایت کرنے لگتی ہے تاہم غیر انسانی اور آدمیت کش عناصر کو وہ اپنی شاعری میں اول سے آخر تک مذموم و مردہ قرار دیتے رہے ہیں''۔

(2) ''سردار جعفری کو سماج و معاشرے میں بڑھتے ہوئے تعصب' نفرت اور بھوک' بیکاری اور مفلسی کا شدید احساس رہا ہے۔وہ عام انسان کی زندگی کو خوش حال ترقی پسند دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انسان اور فن کار دونوں کو متحرک و فعال رہنے کا پیغام دیتے ہیں''۔

(3) ''انسانوں کے درمیان خدائے تعالیٰ کی موجودگی کا احساس کرانا اور دلوں کو خدا کا گھر قرار دینے کا تصور اردو کی صوفیانہ شاعری اور کبیر اور میرا کی شاعری کا محور رہا ہے۔سردار' غالب اور میر کی طرح سے کبیر اور میرا کی شاعری کے بھی قدر داں ہیں اور انسان اور خدا کے متعلق مذکورہ شعرا کے تصورات کے اثرات بھی سردار کے شعری سرمایہ میں دیکھے جا سکتے ہیں''۔

(4) ''سردار جعفری کے نزدیک ترقی و تسلسل کی طرح سے ''تبدیلی'' بھی انسانی زندگی اور معاشرے کے لیے لازمی چیز ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اپنی ماہیت میں ارتقا پذیر ہے اور ارتقائے حیات بشری کے لیے بدلاؤ کا احساس خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سردار جعفری زندگی میں ترقی و تبدیلی کے لیے ناموافق ''نظام'' کو بدلنے یا اس کے خلاف برسر پیکار رہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے اور کرواتے ہیں کہ..... معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خودغرضی، غلط احساس برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہوسکتی ہیں (حرف اول پیراہن شرر) چنانچہ سردار جعفری دنیا سے ہوس، نفرت اور خودپروری جیسی غلط روایتوں کو ختم کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک دنیا جہاں سے مذکورہ برائیاں ختم نہ ہوں گی دنیا میں امن و اتحاد کا قائم ہونا اور ہمہ جہتی حاصل کرنا مشکل ہے۔ اپنے اس نوعیت کے احساسات کا اظہار سردار نے کئی نظموں میں کیا ہے۔ 64

موضوعات:

ڈاکٹر سلطان احمد نے سردار جعفری کی آزاد نظموں کے عام موضوعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''گو کہ ان کے (سردار جعفری) اصل شعری جوہر پابند نظموں میں کھلتے ہیں لیکن انہوں نے آزاد نظم کو بھی عوامی جدوجہد کے لیے استعمال کیا۔ عوام کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی، کسان اور جاگیردار، غلام اور آقا، مزدور اور سرمایہ دار، سامراج اور مفتوح ممالک کے تضادات جدوجہد اور امن و ترقی کی آرزو، انقلاب کا پیغام، سائنٹفک سیاسی نظریے کی ترسیل و ابلاغ ان کی آزاد نظموں کے عام موضوعات ہیں۔ ان موضوعات پر فریب، کون دشمن ہے، پتھر کی دیوار، امن کا ستارہ، خون کی لکیر، رومان سے انقلاب تک، ایشیا جاگ اٹھا، نئی دنیا کو سلام، اودھ کی خاک حسین، تجدید وفا، انتظار نہ کر، سیہ لہو، پیاس کی آگ، پیراہن شرر، میرے عزیز و میرے رفیقو اور ''ایک خواب اور'' نہ صرف ان کی بہترین نظمیں ہیں بلکہ یہ اردو ادب کی شاہکار ہیں''۔ 65

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے لکھا ہے:

''سردار نے آزاد نظم کو بھی اپنے پیرایۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا ہے اور غالباً وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے آزاد نظم کو خارجی حالات اور ماحول کی تصویر کشی کے لیے استعمال کیا'' 66

اردو میں آزاد نظم کے آغاز اور عروج کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے راشد آذر نے بتایا ہے:

''آزاد شاعری کا سب سے پہلا تجربہ..... سید حسین بلگرامی، عماد الملک کے بڑے صاحب زادے سید عابد حسین بلگرامی عابد نواز جنگ نے 1927ء میں کیا۔ انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے ہیملٹ کی خودکلامی کے ترجمے نظم میں کیے''..... اس ہیئت کو مخدوم، ن م راشد اور میراجی نے مسلمہ حیثیت دی اور سردار جعفری نے اس کو عروج پر پہنچایا'' 67

آزاد نظم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے راشد آذر رقمطراز ہیں:

''آزاد نظم کی بعض خصوصیات ہیں جو اس کو نظم کی اور ہیئتوں سے مشکل بھی بناتی ہیں اور پُراثر بھی۔ چونکہ آزاد نظم میں

مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اس لیے شاعر کے لیے مشکل ہوجاتا ہے کہ ایک مصرعہ کہاں ختم کرے اور دوسرا کہاں سے شروع کرے تاکہ نظم کا بہاؤ جو اس کی جان ہے، رکنے نہ پائے۔ اگر بہاؤ رک جائے تو نظم کا بہاؤ کم ہوجاتا ہے۔ علحدہ علیحدہ مصرعوں میں کتنا ہی بہاؤ ہو اگر مصرعے ایک دوسرے سے اس طرح نہ جڑے ہوئے ہوں جس طرح موج سے موج جڑی ہوتی ہے تو نظم ہیئت کے اعتبار سے کمزور ہوجاتی ہے۔ یہ ہیئت خطیبانہ انداز بیان کی متقاضی ہے۔ اس میں مصرعوں کو بہتے ہوئے دریا کی موجوں کی طرح آنا چاہیے۔ اس میں شوکت الفاظ اور شکوہ جذبات کی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک اس میں شعریت کی جلا رجز اور خطابت سے نہیں ہوتی تب تک اس ہیئت کی خوبی پوری طرح نہیں ابھرتی اگر اس ہیئت سے خطابت کا پہلو نکال دیا جائے تو اس کی اہمیت باقی نہیں رہتی"۔ 68

سردار جعفری ابتداء میں آزاد نظم کے شدید مخالف رہے لیکن 1947 کے آس پاس انہوں نے اپنے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" آزاد ہیئت میں لکھی۔ اس کے علاوہ شعری مجموعے "پیراہن شرر" "ایک خواب اور" "لہو پکارتا ہے" میں شامل متعدد نظمیں آزاد ہیئت میں ملتی ہیں۔ ان میں "اودھ کی خاک حسین" "انفرادی طرز احساس اور نئی امیجری کے سبب ان کی بہترین نظم ہے"۔ 69

ڈاکٹر محمد حسن نے سردار جعفری کی آزاد نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1) "سردار جعفری کی شاعری نے آزاد نظم کو داخلیت سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مایوسی اور محرومی کے بادل چھٹے۔ "بنجر زمین Waste Land کی فضا سے نکل کر آزاد نظم کو زیادہ مثبت موضوعات کا سہارا ملا۔ سردار جعفری کی آزاد نظم راشد اور میراجی کی روایت سے مختلف ہے اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اس صنف کو ان دونوں شعراء سے مختلف جذبات کا آئینہ دار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آزاد نظم کو محرومی، تنہائی اور کلیت کے مترادف سمجھ لیا جائے۔ سردار جعفری نے آزاد نظم میں وسعت پیدا کی۔ انہوں نے کوشش کی ہر موضوع پر اس صنف میں اظہار خیال کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر موضوع کو اپنانے کی خواہش جس قدر مبارک ہے اسی قدر ہر موضوع کو شعریت کے ساتھ برتنا دشوار ہے اور اس دشواری کو سردار جعفری بھی آسان نہ کرسکے"۔

(2) خارجی اور بیانیہ شاعری کے جوش میں سردار جعفری سادگی اور راست کوئی directness سے دور چلے گئے اور آزاد نظم نے سکہ بند انداز و آرائش کی طرف دوبارہ رجعت شروع کی۔ تشبیہہ و استعارہ پھر مزاج شعر بننے لگے اور سیدھی سادی باتوں کو سجانے بنانے کا رواج پھر عام ہونے لگا اس کا انجام یہ ہوا کہ خیال کی ندرت اور تابناکی سے توجہ ہٹ گئی اور انداز بیان کے خالص روایتی سجاؤ بناؤ پر ساری توجہ صرف ہونے لگی۔ ایک ہی بیان پھیل کر تین تین چار چار صفحوں کی وسعت اختیار کرگیا اور خیال کی عمومیت کو صنعت گری کے لباس پہنا کر خوبصورت بنانے کی کوشش ہونے لگی۔ اس طرح سردار جعفری کے کلام میں لفاظی، خطابت اور غیر ضروری طوالت پیدا ہوگئی اور ان کی نظموں سے وحدت تعمیر کا احساس جاتا رہا۔ (مثال سیلاب چین)"۔

(3) اس لفاظی اور بے جا طوالت کا ایک اور بھی سبب ہے۔ سردار جعفری ہنگامی واقعات سے انسانی زندگی کی عام حقیقتوں کو پہنچنے کے بجائے صرف ان کی ہنگامی نوعیت پر اکتفا کرلیتے ہیں۔ موضوع کا ہنگامی ہونا فی نفسہ بُری بات نہیں ہے

لیکن اگر اس موضوع کے سہارے سے شاعر عظیم تر اور عام انسانی سچائیوں تک نہ پہنچ سکے تو یہ ہنگامی موضوع (Topical) ادبی ہونے کے بجائے صحافتی اور سطحی ہو جاتے ہیں۔ اچھی نظم الیکشن پر بھی لکھی جا سکتی ہے اور اگر اس موضوع کے رشتے شاعر نے کائناتی مسائل سے ملا دیئے ہیں تو اس نظم میں عظمت کے نقوش بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں لیکن اگر اس نظم کا مقصد محض الیکشن جیتنا ہے اور صرف خود کو اس وقت کے ہنگامی معاملات کو سمیٹنے تک محدود کرنا ہے تو پھر اس کی ادبی عظمت کا مجروح ہونا یقینی ہے۔ صحافت اور سیاسی خطابت اسی چور دروازے سے داخل ہوتی ہیں''۔ اس کا ایک دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ سردار جعفری کی شاعری سیاسی واقعات کا آئینہ خانہ تو بن گئی لیکن اس کے رشتے فلسفیانہ فکر سے مربوط نہ ہوئے۔ اگر سردار جعفری کی شاعری میں کسی واضح نظریۂ حیات کو ڈھونڈا جائے تو اس کے نشانات مشکل سے ملیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ کائناتی مسائل سے ان کے احاطہ فکر سے دور ہیں۔

(4) مربوط نقطہ نظر کی اس کمی کی وجہ سے ان کی معرّیٰ اور آزاد نظموں میں خطابت کا لہجہ آ گیا اور اس لہجے کو بے نمکی سے بچانے کے لیے انہیں روایتی مرصع کاری سے کام لینا پڑا۔ قدیم (Imagery) پھر اختیار کی جانے لگی اور تجربے کی براہ راست اظہار کی جگہ سجاوٹ اور بناوٹ نے لے لی (مثال نظم ''غریب'')

(5) ''سردار جعفری نے معرّیٰ اور آزاد نظم کو مثبت قدر سے آشنا کیا۔ اسے ڈرائنگ روم کی گھٹن سے نکال کر کھلی فضا اور ہجوم جلسہ گاہوں میں لائے اور گو اس افراتفری میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نئی صنف کلیت، انفرادیت پرستی اور مریضانہ داخلیت کے لیے دی جا سکتی ضروری نہیں ہے کہ اس میں صرف نفسیاتی الجھنوں، لاشعور کی گتھیوں اور شکست خوردگی کے جذبات ہی نظم کیے جائیں۔ اسے فکر کی تابانی اور حوصلہ کی جلوہ سامانی کی آماجگاہ بھی بنایا جا سکتا ہے''۔ 70

انقلابی نظمیں:

انسانیت کی بقاء کے لیے احتجاج کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''انسانیت کی بقاء کے لیے یہ احتجاج بہت اہم ہے اور سردار جعفری کے ہاں اس احتجاج کی لَو کافی اونچی ہے...اور جب فریاد کی لے تیز ہو جاتی ہے تو ظالم کی شکست لازمی ہو جاتی ہے''.....یہ احتجاج ان کے ہاں بغاوت کا روپ دھار لیتا ہے۔ بغاوت فرسودہ روایات سے، رسوم کہنہ سے، بغاوت غلط اقدار سے، سماجی نشست و برخاست سے، سیاسی آقاؤں اور سماجی ٹھیکیداروں سے...اس بغاوت کو عملی (جامہ) پہنانے کے لیے انقلاب کا ظہور لازمی ہے اور اس انقلاب کے لیے خطیبانہ لہجے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے سردار جعفری کی اکثر نظموں میں ایک خطیبانہ انداز ملتا ہے.....دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ انقلابات الفاظ کے شعلوں کی گود میں پلتے ہیں۔ ''فغان زیر لبی'' کے سایے میں نہیں۔ سردار جعفری نہ صرف انقلاب سپر ہیں بلکہ عملی طور پر انقلابی ہیں۔ ان کے لہجے میں تلوار کی کاٹ، لفظوں میں شعلوں کی لپک اور آواز میں پہاڑوں کی گونج ہے کیونکہ وہ کبھی سرمایہ داروں سے مخاطب ہوتے ہیں کبھی برطانوی سامراجیوں سے کبھی مغرب کے آقاؤں سے اور کبھی ظلم و جبر کے خداؤں سے اور کبھی آزاد ہند کے بگلا بھگت رہنماؤں اور قومی حکمرانوں سے۔ ہر جگہ ان کا بے باک اور دو بنگ لہجہ پہچانا جا سکتا ہے''۔ 71

ادب زندگی کا ترجمان ہے۔زندگی کے مختلف شعبوں میں سیاست بھی ایک شعبہ ہے۔شاعر اور ادیب سماج کا حساس فرد ہوتا ہے وہ کس طرح اپنے آپ کو اس شعبہ سے الگ رکھ سکتا ہے۔سردار جعفری کا زمانہ بقول پروفیسر عبدالستار دلوی ''سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔انہوں نے ہندوستان کی غلامی کے زمانے میں نصف صدی سے کچھ کم اپنی زندگی کے سال بھی گزارے تھے اور غلامی کو برداشت بھی کیا تھا اور جس سے نجات پانے کے لیے جدوجہد بھی کی تھی اور جیل بھی گئے تھے اور اپنی اعلیٰ تعلیم سے بھی محروم کر دیئے گئے تھے۔آزادی کے ایسے ماحول میں شاعر و ادیب کا مطمح نظر فطری ہے اور اس جذبے سے ہمارے شاعر اور دانشور ضرور گزرے ہیں اور سبھی نے آزادی اور غلامی کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے لیکن سردار جعفری کے یہاں قومیت اور آزادی کے موضوع میں 'نئی دنیا کو سلام' کے بعد ایک تسلسل قائم رہا'' 72

بیشتر شاعروں اور ادیبوں بشمول سردار جعفری نے اپنی تخلیقات میں سیاسی موضوعات کو شامل کیا۔ان کے اس شعبہ ہائے زندگی میں سوچنے اور قلم اٹھانے کے سلسلہ میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

''شاعر اور ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دور اپنے عہد کی ضروریات سے واقف ہو۔وہ سیاسی رہبر نہیں ہوتا مگر سیاسی رفتار اور اس کی ضرورتوں کا احساس رکھتا ہے اور حسب ضرورت عوام کی فکر اور سوچ پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔کبھی کبھی وہ عصری سیاست کا پرچم اٹھاتا ہے اور انقلابی تحریک کی رہنمائی کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کا کام سیاسی تحریکوں کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔اردو کے شاعروں نے ہندوستانی سیاست اور تحریک آزادی کی راہیں ہموار کی ہیں اور سیاسی تحریکوں کو اپنی شاعری سے مشعل راہ دکھائی ہے اور عوام کے ذہنوں میں حق آزادی کو حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کیا اور ہندوستانی قوم کو اس مقصد کی حصولی یابی کے لیے متحد کیا ہے۔اقبال 'چکبست' جوش اور ترقی پسند شاعروں نے اس تحریک میں جو نمایاں رول ادا کیا ہے اس میں اقبال اور جوش کے بعد سردار جعفری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔سردار جعفری کی شاعرانہ انقلاب پسندی اور قومیت گہری علمیت جغرافیائی تصور وطن بین الاقوامی زندگی اور اس کے مکینوں کے لیے احترام اور انسانی محبت کا نام ہے۔وہ جغرافیائی تصور وطن کو عزیز رکھتے ہیں۔اپنی ملی جلی تہذیبی شناخت سے محبت کرتے ہیں اور احترام بھی۔تاہم جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وطنیت اور قوم پرستی کو جارحیت سے دور رکھتے ہیں۔وطن اور قوم پرستی کے نام پر جارحیت سردار جعفری کی شاعری کا موضوع نہیں.....سردار جعفری کو اس بات کا احساس تھا بلکہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ظلم و استحصال کی نفی کر کے ہندوستانیوں کو نہ صرف بلاتفریق مذہب و ملت متحد رہنا ہے بلکہ اپنے انسانی اور ذہنی و فکری رشتے دنیا کے دوسرے حصوں سے اور علم و فکر کے دیگر چشموں سے بھی وابستہ کرنے ہیں'' 73

ضیاءالدین اصلاحی نے سردار جعفری کی انقلابی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''ابتداء ہی سے وہ (سردار جعفری) مارکس کے خیالات سے متاثر تھے جو برابر ان کی شاعری پر بھی چھائے رہے 1936 میں منشی پریم چند کی سربراہی میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو وہ اس میں شامل ہو گئے اور اپنی انقلابی شاعری سے مجاہدین آزادی کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑکاتے رہے۔وہ ترقی پسند تحریک کو جنگ آزادی ہی کا ایک بازو سمجھتے تھے۔اس کے زیر اثر ان کے انقلابی خیالات اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی اور وہ

عمر بھراس تحریک کوقوت وتوانائی دیتے اوراس کے ادبی سرمایے کومالامال کرتے رہے"۔ 74

احمد محفوظ رقمطراز ہیں:

"علی سردار جعفری ترقی پسند فکر کے نمائندہ شاعر ہیں۔انسان دوستی،حریت پسندی اور وطن پرستی جیسے اقدار ان کی نظموں کے بنیادی موضوع ہیں۔شاعری کے میدان میں جعفری کا ورود باغی شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ان کے باغیانہ لہجے میں جوش اور کہیں کہیں اقبال کی گونج سنائی دیتی ہے۔پرواز(1943)اور خون کی لکیریں(1949) کی نظمیں مارکسی اصول حیات اور ہنگامی موضوعات پر مبنی صحافتی نوعیت کی ہیں جن میں تخلیقی عناصر کی کمی کھٹکتی ہے۔ان کا انداز بیان خطیبانہ،بلند آہنگی اور باغیانہ کرختگی لیے ہوئے ہے" 75

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے:

"بدلے ہوئے حالات میں سردار کی شاعری میں احتجاج اور انقلاب کا لہجہ ابھر کر سامنے آیا۔حکومت مخالف شاعری کے نتیجے میں انہیں گرفتار کرلیا گیا۔اس زمانے میں کہی گئی ان کی بہترین نظمیں " خون کی لکیر"(1949) اور پتھر کی دیوار(1953) میں شامل ہیں۔ان مجموعوں میں شامل کم وبیش سبھی نظمیں ہنگامی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان نظموں کے لہجے میں عموماً گھن گرج اور خطیبانہ آہنگ ہے۔اگر چہ "ایشیا جاگ اٹھا" جیسی طویل نظم بھی انہوں نے جیل میں لکھی تھی جوان کی شاعری میں انقلابی آہنگ کی بین مثال ہے۔"76

سردار جعفری کی انقلابی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر کوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"سردار جعفری نے انقلابی شاعری کونئی توانائی دی اور اسے ایک نئے رخ سے آشنا کیا۔وہ ہماری ان خوں گشتہ حسرتوں اور ارمانوں کے شاعر ہیں جو صدیوں کی غلامی کے خلاف دلوں میں پیدا ہوئے۔"نئی دنیا کو سلام" اختر شیرانی کی "سلمیٰ" اور مجاز کی "نورا" سے مختلف ہے۔یہ اردو شاعری کی رومانیت کے ایک نئے دور کا پتہ دیتی ہے۔سردار جعفری ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو علم اور یقین کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔انہوں نے تحریک آزادی کے عروج کے زمانے میں بڑی دلیری اور حوصلہ مندی سے اردو شاعری کو انقلابی مضامین دیے اور انہیں وقار اور حسن بخشنے کی سعی کی لیکن ان کے یہاں بھی جوش کی طرح لطیف شاعرانہ احساس کے ساتھ داخلی سوز کی کمی اور خطابت کی بہتات کھٹکتی ہے،جس کی وجہ سے ان کا نعرہ انقلاب سرود مستانہ میں کم ڈھلتا ہے اور ہنگامہ ابال بن کے شاعرانہ تناسب کے ظلم کو متاثر کرتا ہے۔" 77

ساحل احمد نے سردار جعفری کی شاعری میں انقلابی فکر وآہنگ کے ذریعہ سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کاوشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:"علی سردار جعفری کی شاعری اشتراکی فکر وفلسفہ کا واضح اشاریہ ہے۔انہوں نے حیات وکائنات کے تمام چھپے اور غیر چھپے معاملات وحالات کو مادی فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی یہ کوشش تاریخی حقائق، عمرانی شعور اور سماجی تفکرات کا احاطہ کرتی ہے جس میں طبقاتی آویزش اور تمدنی کشمکش کی نوع بہ نوع صورتیں انتہائی جسارت و بے باکی اور صفائی کے ساتھ اشتراکی فکر کی وضاحت کرتی ہیں جس کے سبب سے ایک جارحانہ کرختگی اور باغیانہ آہنگ کی کے سنائی دیتی ہے جو وقت اور حالات کی بے رحمی،بربریت اور رہبیت وہولناکی کو ظاہر کرتی ہے۔وہ اپنے اسی انقلابی فکر وآہنگ کے

ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی جہالت' بے حسی' بے ضمیری' تعصب' افلاس' غربت' کمینگی' رذالت جیسی گندگی اور خباثتوں کو ختم کردینے کی تمنا رکھتے ہیں لیکن اس تمنا کی حصولیابی میں شعریت اور شعری کیفیتیں مجروح وشکستہ ہوجاتی ہیں۔چونکہ ان کی فکر مقصدی فکر ہے اس لیے داخلی جذباتیت' خارجی جذباتیت کے دباؤ سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور شعری حسیّت' مقصدیت کے تیز بہاؤ میں ضائع ہوجاتی ہے۔مگر ''فن پر ابہام' ہیئت پرستی اور دور از کار اشاریت کا سایہ نہیں پڑتا''۔78

سردار جعفری کی احتجاجی شاعری کے بارے میں پروفیسر شارب ردلوی لکھتے ہیں:

''ان کی (سردار جعفری) کی شاعری' اردو میں احتجاجی شاعری کی ایک بہت خوبصورت مثال ہے۔احتجاج کی بھی ان کے یہاں ایک تہذیب ہے۔ان کے تقریباً ستر سال کے فکری وتخلیقی سفر نے اسے ایک تہذیب کی شکل دی ہے۔''نئی دنیا کو سلام'' سے ایک باغی شاعر کو''لہو پکارتا ہے'' تک کے طویل سفر نے اردو میں ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ اور احتجاج کی ایک زندہ علامت بنادیا ہے۔وہ انسانیت' امن اور محبت کے شاعر ہیں۔اس لیے جب کبھی انہوں نے اس پر کوئی آنچ آتے دیکھی تو اس کے خلاف آواز بلند کی۔گیان پیٹھ ایوارڈ کے موقع پر نیوکلیائی جنگ کے نتائج کا روز قیامت کے استعارے میں جس طرح انہوں نے ذکر کیا وہ بھی ''شائستگی دیدۂ تر'' کے ساتھ انسانیت کی بقاء محبت کی پاکیزگی اور پیار کی خوشبو کے لیے ایک طرح کا احتجاج ہی تھا۔یہی پیار کی خوشبو سردار جعفری کی زندگی اور ان کی شاعری کی روشنی ہے۔ان کی ایک نظم ''چھوٹا سا دل''.....میں سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری کی ایک لطیف تصویر کے ساتھ ان کے کرب کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

میں بازار مہر ووفا میں
چھوٹا سا دل بیچ رہا ہوں.....

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو/صبح تبسم عطا کرے/ پیاس کے پیلے برگ خزاں کو/فصل گل کی مے میں ڈبو دے/کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے/آنسو کے قطرے چن لے/اور موتی کر کے واپس دے دے/ جو خالی بے بس ہاتھوں کو/کام کی دولت عطا کرے/مایوسی کو کوئے تمنا میں لے جائے/شاہد فردا کے جلوؤں کی جوت جگائے/ جو دھرتی کی بھوک مٹائے/اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں سے بھر دے/انساں کی تفریق مٹا کر/کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر/میرے خوابوں کا عکس ملے/ میں اس کے قدموں میں اپنا قیمتی دل/چھوٹا سا دل/پھول کی صورت رکھ دوں گا۔ 79

عزیز قیسی نے سردار جعفری کی احتجاجی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

(1) ''جعفری صاحب نے جب شاعری شروع کی تھی تو ہندوستان کی قومی تحریک ایک ہمہ پہلو اشتعال اور اضطراب سے معمور تھی۔یہ شاعری احتجاج کی شاعری تھی۔agitational شاعری تھی اور اس وقت ایسی ہی شاعری کی ضرورت تھی۔ اس وقت جوش کے دبدبے' گھن گرج اور اقبال کے حرکت وعمل کے پیغام کا دور دورہ تھا۔چنانچہ جعفری صاحب کی شاعری میں (چاہے وہ رومانی ہو یا مسائلی انہیں موضوعات یا موضوعات کے برتاؤ لفظوں کے انتخاب) مقصدیت یا تبلیغ کا انداز تھا''۔

(2) جعفری صاحب نے اپنے ایک.....مضمون میں جو ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری کے عنوان سے چھپا ہے لکھا ہے'' ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے جنہیں رس کہا جاتا ہے ان رسوں میں غصے اور نفرت کو بھی

جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔غصے اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا، پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔ میں نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہوں گا لیکن شاعری میں اس کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں اور یہ کہ اگر اس کا ہدف ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے.....ترقی پسند شاعری میں اس کی کوئی کمی نہیں ہے.....یہ جلال کی شاعری، اس ملک کے ہیجانی دور کی شاعری سے مملو ہے اور جعفری صاحب کی شاعری کا معتد بہ حصہ اسی رس کا اظہار ہے اور ظلم اور جبر سے نفرت کا شعلہ، ان کی شاعری اور ان کی تحریروں میں جگہ جگہ زندہ و درخشندہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ظلم، نفرت اور غصے کی بنیاد، انصاف کی آرزو، محبت اور زندگی کی شدید محبت ہے۔ جعفری صاحب نے اپنی ایک نظم "میری نگہ" میں کہا ہے۔

مری نگہ میں بسے ہوئے ہیں/ ہزار اندازِ دل ربائی/ میں اپنے سینے کو چاک کر کے/ اگر تمہیں اپنا دل دکھا دوں/ تو تم کو ہر زخم کے چمن میں/ ہزار سروِ رواں ملیں گے/ اداس مغموم وادیوں میں/ ہزار ہا نغمہ خواں ملیں گے/ مرے عزیزو مرے رفیقو/ مری کمیونزم کچھ نہیں ہے/ یہ عہدِ حاضر کی آبرو ہے/ مری کمیونزم زندگی کو/ حسین بنانے کی آرزو ہے۔ 80

سردار جعفری نے بہت کم خالص رومانی شاعری کی۔ جب ہندوستان کی جدوجہد آزادی نے شدت اختیار کی تو سردار جعفری نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کے لیے انقلابی شاعری کی ضرورت تھی۔ ان کے پہلے شعری مجموعے میں رومانی نظموں کے علاوہ بیشتر انقلابی نظمیں شامل ہیں۔ عمر رضا نے ان انقلابی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔

اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

(1) ان نظموں (انقلابی نظموں) میں انقلاب اور نئی قوتوں کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں وفورِ جذبات میں اپنی بات منوانے کی غرض سے سردار جعفری نے اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ نظم پروپگنڈہ لگنے لگتی ہے۔ اگرچہ سردار جعفری نے سنبھلنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں وہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ملک اور بیرون ملک جس طرح کے حالات رونما ہو رہے تھے اس میں کسی بھی حساس شخص کا انقلابی ہو جانا فطری بات تھی۔ خاص طور پر جب کوئی کسی خاص تحریک سے وابستہ ہو تو ایسے میں اسے اسی کے مطابق اپنی بات کہنی پڑتی ہے.....جوانی، سماج، بغاوت، مزدور لڑکیاں، سرمایہ دار لڑکیاں، ارتقا و انقلاب، جنگ اور انقلاب، سامراجی لڑائی، کب تک، فاشسٹ دشمن، سپاہیوں کا گیت، بنگال، لینن، انقلاب روس، تعمیر نو ایسی نظمیں ہیں جن میں اس عہد کے اہم اور ضروری واقعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جس کی پیشکش کے لیے سردار جعفری نے انقلابی رنگ و آہنگ کا بھرپور سہارا لیا ہے۔ نظموں کے عنوانات بھی انقلاب سے سرشار نظر آتے ہیں"۔

(2) سردار جعفری نے "پرواز" کی ابتداء ایک ایسی نظم سے کی ہے جس کا اگرچہ کوئی عنوان نہیں ہے لیکن اس سے پرواز میں شامل دیگر نظموں کے انداز بیان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً۔

لے اڑا ہوں چند نغمے زندگی کی ساز سے/ چھیڑتا ہوں بربطِ دل کو نئے انداز سے/ آنسوؤں سے غم کے پیمانے کو پھر بھرتا ہوں میں/ دیدۂ پرنم کو اپنے خونفشاں کرتا ہوں میں/ ٹوٹنے والی ہے اک جھٹکے سے زنجیرِ فریب/ زیب اورنگ حکومت ہے کوئی اورنگ زیب/ جنگ کی دیوی نظر آتی ہے پھر چیں بر جبیں/ کانپتی ہے آج پھر ٹیپو کے نعروں سے زمیں/ دشمنوں کو آج پھر

للکارتے ہیں شہسوار/ اٹھ رہا ہے مغربی جادوگروں کا اقتدار۔

(3) نظم جوانی میں کچھ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں جوش، ولولہ، گھن گرج اور وہ تمام عناصر مل جائیں گے جسے ہم انقلابی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً۔

مری آواز میں لاکھوں یتیموں کی دعائیں ہیں/ مرے نغموں میں زنجیروں کے بجنے کی صدائیں ہیں/ نیا نغمہ کوئی جب سانس لے لیتا ہے سینے میں/ ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں پتھر کے کلیجے میں/ چٹانوں کا جگر پھٹتا ہے اس نغمہ سرائی سے/ پگھل جاتا ہے دل آہن کا اس آتش نوائی سے/ پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو/ بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو/ حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے/ بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے۔

سردار جعفری نے سرمایہ دار اور مزدور کے اختلافات اور فرق کو واضح کرنے کے لیے دو نظمیں ''مزدور لڑکیاں'' اور ''سرمایہ دار لڑکیاں'' رقم کیں۔ ان نظموں میں اسلوب کی پختگی اور تازگی سے ایک مستقل کشش پیدا ہوگئی ہے۔ نظم کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''مزدور لڑکیاں'' کے چند اشعار ملاحظہ کریں:۔

گردش افلاک نے کودی میں پالا ہے انہیں/ سختیٔ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انہیں/ گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہ آفتاب/ آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب/ سرسے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی/ سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی/ بے کسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب/ ساز ان کا سوز حسرت خاموشی ان کا رباب/ ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال/ زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال/ لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ/ ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ/ اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب/ ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب/ بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن/ دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن۔

چند اشعار نظم ''سرمایہ دار لڑکیاں'' کے ملاحظہ فرمائیں۔

شہر کے رنگین شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ/ نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ/ ہے انہیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار/ ہے یہی تہذیب کے آذر کدے کی شاہکار/ گردنوں کا خم، کمر کا لوچ سینے کا ابھار/ صندلی ہاتھوں سے بتخانوں کی صبحیں آشکار/ قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کے لیے/ گفتگو ہر سننے والے کو لبھانے کے لیے/ اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار/ ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار/ عشق کے ذوق نظارہ نے نکھارا ہے انہیں/ مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انہیں/ ڈوب تو سکتی ہیں لیکن پھر ابھر سکتی نہیں/ یہ کنار و بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں۔

اس طرح سردار جعفری نے پرولتاری آمریت، قومیت کے بورژوا تصور نیز مارکسی نظریے سے متاثر ہو کر سرمایہ داروں کی مذمت اور مزدوروں اور کسانوں کی حمایت سے معمور شاعری کی تھی''۔

(4) ان نظموں کے علاوہ ارتقاء و انقلاب، جنگ اور انقلاب، سامراجی لڑائی، کب تک، فاشسٹ دشمن، سپاہیوں کا گیت، لینن تو اور میں، انقلاب روس، تعمیر نو اور ''آخری خطہ'' ایسی نظمیں ہیں جن میں سردار جعفری نے کسی نہ کسی انداز میں اشتراکی

نظریے کے فروغ کی بات کہی ہے..... پرولتاری انقلاب میں تشدد کا عنصر، محنت کے عمل میں فطرت اور انسان کی باہم شراکت لیکن سرمایہ دار کا اس محنت کا صحیح بدل نہ دینا، جنگ عظیم کو اول سرمایہ داروں کا ہتھیار ماننا پھر روس کی اس میں شمولیت کے بعد اسی جنگ کو عوامی جنگ قرار دینا وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کو شیتر جگہوں پر گھن گرج اور انقلابی و بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں ایک جوش، ولولہ اور امید کا جذبہ جاگ جاتا ہے"۔

(5) دوسری عالمی جنگ (1939 تا 1945) کے دوران بنگال میں غضب کا قحط پڑا تھا....سردار جعفری نے ایک نظم "بنگال" بھی تخلیق کی....دو بند ملاحظہ کریں۔

آج ہے بدلا ہوا رنگ مزاجِ روزگار/ کرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روح انتشار/ آہ وہ بنگال وہ حسن و محبت کا دیار/ ہوگیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار/ اس مصیبت میں اگر اپنے بھی بیگانے رہے/ فائدہ پھر کیا جو گرد شمع پروانے رہے/ سینکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اٹھتا ہے بخار/ میتیں ہیں بے کفن چادر اڑھاتا ہے غبار/ چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار/ بے بسی سے آج ان کو چوستے ہیں شیر خوار/ رینگ کر لاشوں سے ہٹ جائیں یہ طاقت بھی نہیں/ ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں۔

نظم "بنگال" کے محولہ بالا اشعار میں سردار جعفری نے قحط کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بہت ہی دلدوز اور جاں بلب ہے۔ان اشعار کا مطالعہ قاری کی آنکھوں کے سامنے اس عہد کے مناظر کچھ اس طرح پیش کرتا ہے جس سے قاری کے ذہن و دل میں قحط کا بھیانک چہرہ نقش ہوجاتا ہے" 81

عمر رضا لکھتے ہیں:

سردار جعفری کے شعری مجموعے "خون کی لکیر" میں شامل نظمیں "نئی شاعری، بغاوت، جوانی، سماج، جنگ اور انقلاب، سامراجی لڑائی، انقلاب روس، تاجکستان کا ایک گیت، تعمیر نو، لینن، آخری خط، جبر، عظمت انسان، شاعر، گوالیار، بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت، گرد کارواں، خود پرستی، یہ بھی تو دیکھ، خواب، فریب، آنسوؤں کے چراغ، کشاکش، تلنگانہ، سیلاب چین، جیل، جشن بغاوت اور رومان سے انقلاب تک، ایسی نظمیں ہیں جن میں جذباتیت، انتہاپسندی، انقلابی بلند آہنگی اور گھن گرج پورے شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے۔آخری تین غزلیں اور قطعات بھی انقلابی آہنگ سے معمور ہیں۔

نئی شاعری:

آزادی سے قبل کی رقم کردہ نظم ہے۔

"جذباتیت اور انتہاپسندی سے معمور اس نظم میں رجعت پرستی سے انحراف کیا گیا۔غلاموں کی محفل میں آگ لگانے کی بات ہو یا کعبہ، دیر اور کلیسا کی قندیلوں کو بجھانے کا سوال ہو، عہد پارینہ کا خواب پریشان کرتا ہو یا پھر مسند عیش سے شاہوں کو اٹھانے کی بات ہو، غرض اس طرح کے تمام کاموں کو وہ زبردستی انجام دینا چاہتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آگ محفل میں غلاموں کی لگادیں اے دوست/ دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کردیں/ چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و

پرویں سے چمک/ہند کی خاک کے ذروں کو درخشاں کر دیں۔

بغاوت:

رسم چنگیزی' تہذیب تتاری' جبر و استبداد' سرمایہ داری' سرسوتی' لکشمن و ارجن' دیوی دیوتاؤں کے تمدن' وہم کی پابندیوں' قید ملت' موجودہ حکومت' سامراجی نظم و قانون غرض سب ہی کچھ سے بغاوت کا اظہار کیا گیا ہے۔نظم کے اخیر میں انہوں نے بغاوت کو حریت کے دیوتا کا آستانہ اور عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ قرار دیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کریں جس سے سردار جعفری کی جذباتیت اور انتہاپسندی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے/ بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے...../ بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے/ بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے/

جوانی:

سردار جعفری نے اپنے باغیانہ مسلک کا اظہار کیا ہے:

گزر جاتا ہوں طوفاں بن کے دریا کے کناروں سے/ پہاڑوں کو ہٹا دیتا ہوں آنکھوں کے اشاروں سے/ پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو/ بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو/...../ حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے/ بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے۔

سماج:(1937)

سردار جعفری نے سماج کی قلعی کھولتے ہوئے حریم زہد و تقویٰ کی مکاری' کلیسا کی بے راہ روی' پرہیز گاروں' پیر حرم اور برہمنوں کی سفاکیاں' ریاکاریاں اور تعصّبات کا پردہ فاش کیا ہے۔قومیت و ملوکیت کی نفی کی ہے۔بظاہر مہذب اور اخوت کا درس دینے والے سماج کے ان رہنماؤں پر سردار جعفری نے سخت نکتہ چینی کی ہے جو بباطن ملک ملک و قوم و ملت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے سماج میں جنگ اور افراتفری کا سا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

چھپی بیٹھی ہے مکاری حریم زہد و تقویٰ میں/ گناہوں کی جھلک ہے حسن معصوم کلیسا میں/ عیاں سفاکیاں پرہیز گاروں کی جبینوں سے/ ٹپکتا ہے لہو پیر حرم کی آستینوں سے/ نہ جانے کیوں یہ دنیا قومیت کے راگ گاتی ہے/ یہ وہ چکی ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے/ دھمک پیروں کے نیچے ہے گرج توپوں کی کانوں پر/ گھٹائیں جنگ کی منڈلا رہی ہیں آسمانوں پر/ فضا بگڑی ہوئی ہے زہر پھیلا ہے ہواؤں میں/ نئی پرخاش ہے جھوٹی سیاست کے خداؤں میں/ قیامت کب تلک ڈھائیں گے یہ آفت کے پرکالے/ یہ جمہوری کمیں گاہوں میں چھپ کر بیٹھنے والے/ تمناؤں میں کب تک مفلسی بہلائی جائے گی/ نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو/ زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

جبر:

نظم جبر (مشمولہ خون کی لکیر) میں ایک بے گھر کسان دوشیزہ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے جو سڑک کے موڑ پر زندگی کی تلاش

میں سرگرداں رہتی ہے اور ایک جیپ والا اسے اپنی ہوس کا شکار بنالیتا ہے ۔ دراصل اس واقعہ کے پس پردہ سردار جعفری نے ہندوستان کے اس وقت کے حالات کی تصویر کشی کی ہے جب ملک میں ہر طرف ایک انارکی کا ماحول تھا۔ واقعہ کے ذکر کے بعد ذیل کے چار اشعار بے حد پُراثر ہیں ۔

اب بھی اس راستے میں راتوں کو/ زخمی چیخیں سنائی دیتی ہیں/ تیرگی کے سیاہ دامن پر/ خوں کی بوندیں دکھائی دیتی ہیں/ اپنی بیٹیوں کی بے حیائی پر/ مائیں ہندوستان کی روتی ہیں/ بیٹیوں کے لہو کے دھبوں کو/ خون کے آنسوؤں سے دھوتی ہیں ۔

عظمت انسان: (مشمولہ خون کی لکیر)

مئی 1940 میں اتحادی ممالک (سوویت روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس) نے جب برلن کو فتح کرلیا تو سردار جعفری پر سرور وانبساط کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس کے اظہار کے لیے انہوں نے ایک نظم عظمت انسان لکھی تھی ۔ نظم میں فتح برلن کا سہرا دست اسٹالن، شمع لینن، سرخ پرچم اور روس کے محنت کشوں کے سر باندھا گیا ہے.....اس کے ساتھ ہی سردار جعفری نے ہندوستان کی محکومی پر اظہار افسوس کیا ہے اور یہ بشارت دی ہے کہ اب ہند کی گردن پہ جو شاہی ہاتھ ہے اس میں رعشہ طاری ہو چکا ہے ۔

دل غلامی میں سکوں کا لطف پاتا ہی نہیں/ کوئی غنچہ آرزو کا مسکراتا ہی نہیں/ ہے کچھ ایسا درد پہلو میں کہ جاتا ہی نہیں/ اب خوشی کا سانس سینے میں سماتا ہی نہیں...../ سرخ پرچم کی ہوا سے شوق لہرانے لگا/ دست استالن میں ٹوٹا ساز بھی گانے لگا...../ روس کے محنت کشوں نے کام پورا کردیا/ فتح کے پھولوں سے اک دنیا کا دامن بھر دیا/ .....اٹھ گیا ہٹلر کے ساتھ اہل ضرر کا اقتدار/ آج سے چنگیزیت کا نخل ہے بے برگ وبار/ ہوگیا ہے سرد شعلہ بجھتے جاتے ہیں شرار/ ہند کی گردن پہ ہے شاہی کا دست رعشہ دار/ ایک ہی ہلکے سے جھٹکے میں کلائی موڑ دے/ اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے/

شاعر:

نظم شاعر کے ذریعہ سردار جعفری نے اپنے نظریہ شعر/نظریہ ادب کی بھرپور وضاحت کی ہے جس کا اطلاق ان کے بیشتر ادب پر ہوتا ہے ۔

لے کے آیا ہوں زمانے کے لیے پیغام گل/ میں ہوں خوشبوئے چمن پیغمبر فصل بہار/ میں غلامی کے اندھیرے میں ہوں آزادی کا نور/ میں حق وباطل کی پیکاروں میں تیغ آب دار/ .....میرے نغمے قید ماہ وسال سے آزاد ہیں/ میرے ہاتھوں میں ہے لافانی تمنا کا ستار/ نقش مایوسی میں بھر دیتا ہوں امیدوں کا رنگ/ میں عطا کرتا ہوں شاخ آزادی کو برگ وبار/ چن لیے ہیں باغ انسانی سے ارمانوں کے پھول ۔

نظم ''رومان سے انقلاب تک'' (مشمولہ خون کی لکیر) مارچ 1949 میں لکھی گئی ہے ۔

اس نظم کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) ''اس میں سردار جعفری نے پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید کی ہے ۔ شاعروں کو رومان پرور شاعری کے

بجائے انقلابی شاعری کرنے کے لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ جب تک نغموں میں فولاد و بارود کا ساز، تلوار کی دھار اور بجلی کی سی تیزی نہیں ہوگی، اس وقت تک تبدیلی ممکن نہیں۔ سردار نے اس طرح کی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے جس میں صرف افسوس، ماتم، خواب رومان اور التجا وغیرہ پر زور دیا گیا ہے۔ روٹیوں کو کبھی چاند اور سورج سے تشبیہہ دی گئی ..... جس سے بقول سردار جعفری معاشرے کو کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوسکتا''۔

(2) سردار جعفری نے رومان اور تخیل سے پُر شاعری پر تنقید کی ہے جو اس زمانے میں بڑی تیزی سے رواج پا رہی تھی۔ ان حالات میں سردار جعفری نے شاعروں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں مزدوروں کا ساتھ دینے اور انقلابی شاعری کرنے کی بات دہرائی۔ 83

؎ میں نے اپنے تخیل میں خوابوں سے کپڑے بنے/ اور ستاروں سے آنچل بنائے/ میں نے ان کارخانوں کے نغمے سنے/ جو ابھی صرف میرے تصور میں محبوس ہیں/ اور میرا وطن چیتھڑوں ہی میں لپٹا رہا/ ریت سے میں نے کتنے گھروندے بنائے/ اور ہمالہ کی نیلی چٹانوں کے دل کو ٹٹولا/ میں نے پتھر کے سینے میں محراب و مینار کا حسن دیکھا/ اور مرا ذہن کیا جانے کتنے ستون، کتنے دیوار و در ڈھال لایا/ میں نے اپنے وطن کو سجایا/ اس کے ایک ایک ذرے کے دل میں اجنتا ایلورا بسایا/ پھر بھی میرا وطن آج ویران ہے/ اس کے محلوں میں چور اور ڈاکو بسے ہیں/ اور انسان سڑکوں پر آوارہ ہیں۔

علاوہ ازیں مبہم، غیر واضح اور بے مقصد شاعری کی نفی کرتے ہوئے سردار جعفری نے اس نظم میں شاعروں کو واضح، مقصدی اور غیر مبہم شاعری کرنے پر زور دیا ہے۔ مثلاً شاعروں سے وہ کچھ اس طرح مخاطب ہیں۔

شاعرو! ساتھیو!/ اپنے تاریک اندیش رومان کے ساز کو توڑ دو/ اپنے مضراب کو پھینک دو/ اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے/ اپنی شہرت کے اونچے میناروں سے/ نیچے اتر آؤ/ کاکلوں کی گھٹی چھاؤں سے/ سرخ پرچم کے سایے میں آؤ/ اور نئے گیت گاؤ/ گاؤ مزدور کے ساز پر/ گاؤ جمہور کے ساز پر/ ..... گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح/ گاؤں کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح/ آندھیوں کی طرح/ زلزلوں کی طرح/ گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پر برساؤ/ سارے عالم پہ چھا جاؤ .....

موت:

عمر رضا لکھتے ہیں:

نظم ''موت'' میں سردار جعفری نے موجودہ حکومت پر زبردست طنز اور اپنی شدید نفرت کا اظہار کیا ہے۔ لہجہ کافی تلخ ہے اور اسی کی مناسبت سے انہوں نے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس نظم کا انداز تحکمانہ ہے جسے خالص انقلابی کہہ سکتے ہیں۔

وارڈز/ موت سے جا کے کہہ دو کہ اس وقت فرصت نہیں/ پھر کبھی آئے/ جیلر کون ہے/ کس لیے آئی ہے/ موت کچھ اپنی بیوی، بہن دوست یا ماں نہیں/ اس پر سی آئی ڈی والوں نے/ کوئی پابندی اب تک لگائی نہیں/ اس کو ہر طرح کے اختیارات ہیں/ اور یہ موت کو خود بڑے حاکموں ہی کے احکام سے آئی ہے/ موت داخل ہوئی/ میں نے دیکھا/ رائفل کی طرح/ انگلیاں لمبی لمبی تھیں، ناخن سنگینوں کے/ جسم خاکی تھا/ چہرہ گلابی تھا/ بارود کی سانس تھی/ ہیٹ پہنے ہوئے/ اپنی موٹی کمر اور چمڑے کی پیٹی میں

پستول باندھے ہوئے/ظلم کے راج کی جے کہو/جس میں ہر شخص کے واسطے موت ہے/قیدیوں کے لیے/عورتوں اور بچوں کی معصومیت کے لیے/موت ہے موت ہے موت ہے/ ملک میں اب پولیس راج ہرگز نہیں ہے کہ وہ تو انگریز کے وقت تھا/آج کل موت کا راج ہے/موت جو سب کی ہمدرد ہے/سب کی غم خوار ہے/آج ہم قیدیوں سے ملاقات کے واسطے آئی تھی۔

مقتول مامتا:

سردار جعفری نے 17/اپریل 1949 کو کلکتہ میں شہید ہوئیں ان عورتوں کے نام اس نظم کو لکھا تھا جو سرخ پرچم تلے حکومت کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں۔مذکورہ عورتوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ امید جتائی کہ یہ خون کے تارے اور سرخ تارے ایک دن ضرور قلب بنگال میں فروزاں ہوں گے اور ظلم کی راج کو جہنم کی بستیوں میں دھکیل دیں گے۔نظم کا لہجہ تلخ' انقلابی اور باغیانہ ہے۔

میں تم کو اپنی بہن کہوں یا رفیق سمجھوں/مگر وطن کی زمین ماں کہہ کے یاد کرتی رہے گی تم کو/کہ تم نے خاک وطن کو اپنا لہو دیا ہے/تمہارے چہروں کا نور بنگال کی جبیں پر دمک رہا ہے/تم اپنے پیاروں کی بھوک سے بے قرار ہو کر/گھروں سے باہر نکل پڑی تھیں/.....تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھی/ نہ آنچلوں میں بموں کے گولے/لبوں پہ نعرے گلوں میں آنسو' دلوں میں عزم شکست زنداں/جوان شانوں پہ سرخ پرچم مچل رہے تھے/.....پولیس کی لاریوں سے لیکن تمہارے سینوں پہ آگ کے تیر چل رہے تھے/.....مگر میں جانتا ہوں میری شہید بہنو/تمہارا خون رائیگاں نہ ہوگا/یہ خوں کی گرمی سے انتقام اپنی آگ پیدا کرے گا اک دن/انہیں کی سرخی سے پھول اپنی بہار لیں گے/انہیں کی بیتابیوں انہیں کی تڑپ سے وہ سورما اٹھیں گے/جو ظلم کے راج کو جہنم کی بستیوں میں دھکیل دیں گے/.....انقلاب ساماں ہے/ہند کی فضا ساری/نزع کے ہے عالم میں/یہ نظام زرداری/وقت کے محل میں ہے/جشن نو کی تیاری/جشن عام جمہوری/اقتدار مزدوری/فرق آتش و آہن/ بے بسی و مجبوری/مفلسی و ناداری/تیرگی کے بادل سے/جگنوؤں کی بارش ہے/رقص میں شرارے ہیں/ہر طرف اندھیرا ہے/اور اس اندھیرے میں/ہر طرف شرارے ہیں/کوئی نہیں کہہ سکتا/کونسا شرارہ کب/بے قرار ہو جائے/شعلہ بار ہو جائے/انقلاب آجائے۔(پتھر کی دیوار)

سردار جعفری کی طویل نظموں کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے لکھا ہے:

''سردار کی اس طویل نظم (نئی دنیا کو سلام) کے علاوہ جمہور' ایشیا جاگ اٹھا' ہندوستان' پتھر کی دیوار وغیرہ بھی طویل نظمیں ہیں جو کہ اپنے رنگ و آہنگ' موضوعات کی اہمیت اور وسعت کے سبب اردو کی طویل نظموں میں خاص مقام رکھتی ہیں۔'' 84

حمایت علی شاعر لکھتے ہیں:

''طویل ترین نظم ایشیا جاگ اٹھا'' (776) مصرعوں پر مشتمل ہے اور ایشیائی عوام کی طویل جدوجہد کی داستان ہے جو اپنے مخصوص شعری محاسن اور اپنے اسلوب کی منفرد خوبیوں سے آراستہ ہے .....''ایشیا جاگ اٹھا'' 1950 میں سنٹرل جیل ناسک (مہاراشٹرا) میں لکھی گئی تھی۔اس زمانے میں ریاست حیدرآباد (آندھراپردیش) میں تلنگانہ تحریک جاری تھی اور مخدوم محی الدین' ڈاکٹر راج بہادر گور جیسے شاعر داور دانشور جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف مسلح کسانوں کی رہنمائی کر رہے

تھے۔ 85

رفعت سروش نے لکھا ہے:

''نئی دنیا کو سلام'' کو سردار جعفری نے 1945 میں کہنی شروع کی تھی اور 28/دسمبر 1946 کو ختم کر لی تھی۔ سردار جعفری کی یہ نظم ایک طویل تمثیلی نظم ہے جس میں (1840) مصرع ہیں۔ مریم اور جاوید اس کے بنیادی کردار ہیں۔ پھر وقت ہے' انگریز ہے' نظم کا موضوع بہتر مستقبل کی تلاش ہے۔ یہ نظم بجائے خود شعری تجربات کا نگار خانہ ہے۔ پابند' آزاد' معریٰ' قطعہ بند سب اصناف سخن موجود ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مطالعے کے بغیر نہیں کہی جا سکتی تھی' مگر یہ اقبال کی صدائے بازگشت نہیں ہے بلکہ سردار جعفری کی انفرادیت پر دلالت کرتی ہے..... سردار جعفری نے پہلی بار اس نظم میں آزاد نظم کی صنف کو اپنایا ہے اور اسے ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ راشد اور میراجی کی آزاد نظمیں رُکی تھی' دھیمی دھیمی سوچتی ہوئی شاعری کے نمونے ہیں مگر سردار نے آزاد نظم کو مکالموں کے لیے بھی استعمال کیا اور کہانی کے بیان کے لیے۔ ان کے حسن خطابت نے اس صنف میں ایک نیا رنگ بھر دیا ہے اور عوامی ذہن و فکر سے قریب تر کر دیا ہے''۔ 86

عمر رضا نے ''نئی دنیا کو سلام'' کے بارے میں لکھا ہے:

''(1840) مصرعوں پر مشتمل طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری نے 28/دسمبر 1946 کو مکمل کی تھی۔ پہلی بار مئی 1947 میں کتب پبلشرز ممبئی سے شائع ہوئی۔..... ''نئی دنیا کو سلام'' میں سردار جعفری نے جدوجہد آزادی کے سپاہیوں کے اندر یہ حوصلہ پیدا کرنے کی سعی کی ہے کہ وہ یہ جدوجہد اور جنگ جاری رکھیں خواہ اس کا پھل انہیں ان کی زندگی میں ملے یا نہ ملے کیونکہ اگر ان کی اس کوشش سے آزادی حاصل ہو گئی تو ان کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گی اور اپنے آباو اجداد کے کارناموں سے سبق حاصل کر کے اس کی دل و جان سے حفاظت کریں گی۔ اس نظم میں رجائی فکر حاوی ہے..... سردار جعفری اس امید کے ساتھ آنے والی ''نئی دنیا کو سلام'' کرتے ہیں کہ یہ دنیا ان کی ہو گی جہاں وہ خود نہیں تو ان کی نئی نسل' آزادی و حریت کے نغمے گائے گی اور پر امن زندگی گزارے گی..... سردار جعفری کی یہ سب سے طویل نظم ہے۔ اس کے ذریعے ہندوستان کی افلاس' مایوسی' فاقہ کشی' بے کاری' قحط' جہل' بیوی اور شوہر کے جذباتی رشتے' ان کی محبت' ان کا رومان' ان کی قربانیاں' انگریزوں کی ظلم و زیادتیاں اور اس کے خلاف یہاں کے عوام کی جدوجہد کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آزادی کی بشارت دی گئی ہے اور نئی نسل کو آزادی ملنے کے بعد اسے بچائے رکھنے اور وطن کی ترقی و خوش حالی کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ 87

سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں پیش کی گئی کہانی اس طرح ہے:

''نئی دنیا کو سلام' ایک باغی مرد اور اس کی بیوی مریم کی کہانی ہے جو انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ بغاوت بھی یہ کہ ہندوستان کے عوام کو ملک کی صورت حال اور انگریزی حکومت کی لوٹ کھسوٹ' ظلم و جور سے آگاہ کرتے ہیں اور ملک کے عوام کو ذہنی طور پر' حکومت سے ٹکر لینے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اس جرم میں انگریز حکومت' جاوید کو پھانسی کی سزا دیتی ہے۔ مگر مریم حاملہ ہے' اس لیے جاوید نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک خط لکھا ہے جس

میں ہندوستان کی ایک نئی دنیا کی بشارت ہے جہاں انگریزی حکومت کا یہ ظلم و جور باقی نہ رہے گا اور ملک ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوگا۔ یہ ولادت دراصل ایک نئے ہندوستان کی ولادت ہے۔ بس یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے" 88

اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل رضوی رقمطراز ہیں:

"ان اشعار میں محبت کی کتنی چمکار ہے اور جمالیات کی کتنی کروٹیں ہیں ان سب سے اوپر اٹھ کر دیکھئے تو یہ ایک طرح سے وہ تیاریاں ہیں جو محکوم ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کے لیے مرد عورت مل کر کر رہے تھے۔ 89

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس نظم کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نظم، نئی دنیا کو سلام" اس عہد کے شعری سرمایے میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثال ہمیں اس زمانے میں نہیں ملتی۔ یہاں نئی دنیا خود ایک مثالی زندگی کا استعارہ ہے۔ اس میں مریم اور جاوید کے کردار اس عہد کے عام افراد کی نمائندگی کرتے ہیں مگر وہ جن منازل سے گزرے وہ انہیں مثالی کردار بناتے ہیں۔ ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھنے والے یہ کردار اپنی تمام تر رومانیت سے آزاد ہیں جو روایتی اردو شاعری میں اس سے پہلے پائی جاتی تھی۔ یہاں عورت حسن کا پیکر اور معشوقہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بطن میں ایک بچے کو بھی پال رہی ہے جو نئی دنیا کے نئے آدرشوں کی علامت ہے اور ایک تمثیلی کردار کی تمام تر عظمت اور خوبصورتی لیے ہوئے ہے..... اپنے وسیع کینوس، تکنیکی اور شعری خوبیوں کے اعتبار سے بھی "نئی دنیا کو سلام" ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے"۔ 90

سردار جعفری نے اپنی نظم "نئی دنیا کو سلام" میں فرنگیوں کو جاوید کی زبان سے جو کہا ہے وہ ملاحظہ کیجئے۔

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں/ایک ذرہ بھی اس ملک میں اب تمہارا نہیں/ رہگزاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں سے سیلاب ابلنے لگے ہیں/ کھیتیاں خاک کی گود سے اٹھ رہی ہیں/ دیکھو کتنی ہی فوجیں افق سے/ آندھیوں کی طرح آرہی ہیں/ بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں/ یہ وہ روحیں ہیں جو رود کاویری کے ساحلوں پر/ اور پلاسی کے میدان میں سینکڑوں سال سے سو رہی ہیں/ یہ وہ اجسام ہیں غدر کے وقت جن کو/ اپنی توپوں سے باندھا تھا تم نے/ یہ وہ لاشیں ہیں جن سے ہزاروں کنوؤں اور گڑھوں کو/ پاٹا تھا تم نے

سردار جعفری کی نظم نئی دنیا کو سلام کی ابتدا میں میاں بیوی کی محبت، تکمیل شخصیت اور تسلسل حیات کے بلیغ اشاروں کو احمد ہمدانی اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حرف اول کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے جس میں پہلے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت اور مرد دونوں ملکر ایک کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ دونوں محبت کے مضبوط رشتے میں منسلک ہوں تو زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں باہمی مغائرت پیدا ہو جائے یا یہ ایک دوسرے پر فوقیت جتانے کو اپنا شیوہ بنالیں تو پھر ناکامی اور نامرادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یوں بھی تسلسل حیات کے لیے عورت اور مرد کا اتحاد لازمی ہے۔ سردار جعفری نے نظم کا آغاز کرتے ہوئے شخصیت کی تکمیل کے عمل کو ابھارا ہے جس میں عورت کی علامت مریم اور مرد کی علامت جاوید کے درمیان محبت کے جذبے کو بھی پیش کیا ہے اور ان دونوں کو میاں بیوی کے رشتے میں منسلک کر کے ایک "کنول" کی صورت گری بھی کی

ہے۔یہی ''گُل'' فردا کی امید اور انقلاب کا نقیب ہے۔نظم میں جاوید ایک انقلابی اور مریم اس کی شریک حیات کی صورت اختیار کر کے زندگی کو آگے بڑھانے اور اسے نکھارنے سنوارنے کا عمل شروع کرتے ہیں۔اس سلسلہ کا یہ شعر خاص طور پر قابل غور ہے۔

تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گل کو نسیم سحر سے

وجودگل کے لیے نسیم سحری کے جھونکوں سے ربط ایک لازمی شرط ہے چنانچہ گل کا نسیم سحری سے حجاب ایک حیرت کی بات ہے بالکل اسی طرح محبوبہ (عورت) کا اپنے محبّ (مرد) سے گریزاں رہنا تعجب خیز امر ہے۔اب ذرا مصرع کی ساخت دیکھئے۔''حجاب اور گل کو نسیم سحر سے'' یہاں فرط حیرت کو صرف ایک لفظ ''اور'' یا پھر لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر کیا گیا ہے جو تحیّر کا احساس ابھارنے کا نہایت فطری اور موثر انداز بن گیا ہے۔آگے چل کر محبوبہ کے رُخ پہ حسن ومحبت کے ہالے کو زندگی کا اجالا کہا گیا ہے اور محبوبہ کی نیچی نظر سے پھوٹتی ہوئی آنچ کو گھر کی روشنی بتایا گیا ہے جو تکمیل شخصیت اور تسلسل حیات کے بہت بلیغ اشارے ہیں''۔

برصغیر میں غلامی کے دور میں برطانوی سامراج کے ظلم وستم کو سردار جعفری نے بڑے موثر انداز سے پیش کیا تھا اسے جاگر کرتے ہوئے احمد ہمدانی رقمطراز ہیں:

''اگر کوئی معاشرہ انسان سے اس کی یہ آزادی چھین لیتا ہے تو اسے غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔برصغیر میں برطانوی سامراج ایسی ہی غلامی کا زمانہ تھا جس میں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا۔یہاں کے اصل باشندوں کو حد درجہ مفلسی کا سامنا تھا جبکہ برطانوی حکمراں یہاں کی دولت پر عیش کر رہے تھے۔سردار جعفری نے اپنی نظم میں برصغیر کی افلاس ونکبت کی صورت کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔نکبت وافلاس کی فضا زیادہ موثر بنانے کے لیے انہوں نے پابند نظم کے بجائے آزاد نظم کی ٹکنک برتی ہے جو موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتی نظر آتی ہے۔

.....برصغیر کی آبادی کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں یعنی روٹی اور کپڑے سے محروم دکھایا گیا ہے جبکہ روٹی اور کپڑے کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں تھی۔یہ تمام آفت صرف اس لیے تھی کہ انگریز نے یہاں کے لوگوں کی آزادی سلب کر لی تھی۔وہ غلام قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔سردار جعفری نے اپنی نظم کے اس حصے میں کوشش کی ہے کہ یہاں کے لوگوں کا جذبہ آزادی بیدار ہو اور وہ غیر ملکی حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔نظم کا یہ حصہ ان مصرعوں پر ختم ہوتا ہے۔

اور صناع ومعمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں/ جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی/ کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں/ اپنے دریا و دشت اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں/ یہ حسین بوستاں ہے ہمارا/ سارا ہندوستان ہے ہمارا/ ہم اس اپنے وطن/ اپنے گلزار میں اور کچھ بھی نہیں صرف جینے کا حق مانگتے ہیں۔

.....ان اقتباسات میں واقعات کی واقعیت کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان میں شعریت پیدا کر دینا نہایت مشکل کام تھا لیکن سردار جعفری نے اس مشکل کو نہایت آسان بنا کر دکھایا ہے.....شعریت پیدا کرنے کے لیے سردار جعفری نے

نہایت اچھوتی اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں..... یہاں جس طرح کے مصائب کو ابھار کر غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ پیدا کیا گیا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکے۔ نظم کے اگلے حصے میں یہ آگ بھڑکی ہوئی دکھائی گئی ہے جس کی سزا میں جاوید کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا ہے اور پھر آخر میں زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے جاوید نے .....کچھ اس طرح مخاطب کیا: ؎

رخصت اے انقلابی جوانو/ رخصت اے ہند کے باغبانو/ جب نئے خاکے میں رنگ بھرنا/ ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا 91

''نئی دنیا کو سلام'' کی ہیئت کے تعلق سے احمد ہمدانی رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے اپنی اس نظم (''نئی دنیا کو سلام'') کو منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ٹھہرایا ہے۔ لہٰذا اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ڈرامے یا تمثیل کے معیارات کے بجائے نظم ہی کے معیارات کو مدنظر رکھنا چاہیے اور اس میں صرف اس قدر ڈرامائی کیفیت تلاش کرنی چاہیے جتنی شعریت کو نمایاں کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ نظم میں جو کردار نظر آتے ہیں وہ ڈراما یا ناول کے کردار نہیں بلکہ صرف علامتیں ہیں۔ اسی طرح اس میں کوئی پلاٹ بھی نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ برصغیر میں برطانوی سامراج کی پیدا کردہ صورتحال کی ایک حسّی تصویر ہے جسے شاعرانہ آہنگ اور علامتی انداز سے ابھارا گیا ہے'' 92

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے علی سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

(1) ''سردار نے یہ نظم (نئی دنیا کو سلام) تمثیل کے طور پر لکھی ہے اس کے کردار علامت ہیں کردار نہیں ہیں۔ جاوید، مریم، فرنگی اور نامہ بر خاص علامتی کردار ہیں۔ جاوید و مریم جدوجہد کی علامت ہیں۔ فرنگی ظلم و استبداد کی نامہ بر روایتی کردار یعنی روایتی نامہ بر ہے۔ ایک پانچواں کردار وہ بچہ ہے جو جاوید اور مریم کی نشانی ہے یعنی وہ نیا نظام زندگی یا نئی دنیا جو ابھی بطن گیتی میں پوشیدہ ہے جس کے نقش و نگار تشکیل پا رہے ہیں۔ کہانی یا تمثیل کا پس منظر ہندوستان ہے''۔

(2) ''نظم کی ابتداء غلامی کے دور سے ہوتی ہے جو بلاشبہ شب یلدا کی طرح تاریک ہے اور غلامی اپنی تمام ظلمتوں کے ساتھ عریاں نظر آتی ہے۔ غلامی کی تاریک رات کا منظر ملاحظہ ہو:

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں/ کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے/ سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ/ سیاہ پھن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے۔

غلامی کی انتہا صرف یہی نہیں بلکہ ؎

سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

ایسی اندھیری اور پرہول رات میں شاعر صبح انقلاب کی روشنی تلاش کرتا ہے اور اندھیرے سے جاوید و مریم دولھا دولھن کے لباس میں نمایاں ہوتے ہیں یعنی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔''

(3) ''دوسری تصویر میں مریم جاوید سے ہم کلام ہے۔ اس ٹکڑے میں جذبات انسانی کی بہترین عکاسی موجود ہے۔

مریم کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قدرت نے اسے ماں بننے کا شرف بخش دیا ہے اور وہ اپنے پہلو میں ایک نئی زندگی کی دھڑکنیں محسوس کر رہی ہے، زندگی کی نئی تخلیق یعنی نظام نو کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی جدوجہد کے ذریعہ نئے حیات کی تشکیل کا آغاز ہوگیا ہے"۔

(4) "تیسری تصویر میں جنگ آزادی کی کشمکش پیش کی جاتی ہے۔ پس منظر سے زندگی کا لازوال ترانہ ابھر رہا ہے۔ بندوق چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جاوید انگریزوں کے مظالم کا ذکر کرتا ہے۔ مستبد حکومت کی کہانی سناتا ہے۔ مریم صرف آہ ظالم حکومت کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ جاوید انقلاب کی خوش خبری دیتا ہے"۔

(5) "چوتھی تصویر تاریخ کے ترانے سے شروع ہوئی' تاریخ عالم میں حریت اور آزادی کے اہم واقعات کی طرف اشارے ہیں جن سے کہ جذبۂ آزادی بیدار ہوتا ہے۔ تاریخ ظالم اور مظلوم طبقوں کی کشمکش کی داستان بن جاتی ہے۔ آزادی کی خواہش اور اس کا استحصال کرنے والوں کے ٹکراؤ میں ہمیشہ حریت پسند غالب آتے ہیں۔ انقلاب روس کے ذکر کے بعد وقت کا ترانہ شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان کی جنگ کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان کی جنگ آزادی کا زرّیں باب ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد کمرۂ عدالت کا منظر سامنے آتا ہے۔ جاوید و مریم انگریزی راج کے ظلم و ستم اور کالے کرتوتوں کا ذکر بڑی جرأت اور بیباکی سے کرتے ہیں۔ موت کا خوف انہیں حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ عدالت کا فیصلہ جاوید کے لیے بغاوت کے جرم میں سزائے موت ہوتا ہے لیکن مریم کو زندگی بھر رونے کی سزا ملتی ہے (مریم کو ملی ہوئی سزا کچھ کھٹکتی ہے کیونکہ قانون کی نظر میں باغی مرد اور عورت میں کوئی تفریق روا نہیں)۔

(6) "نظم کا پانچواں حصہ موت کے راگ سے شروع ہوتا ہے۔ موت کے پنجہ میں ہر کہہ و مہ اسیر و بے بس ہے۔ اس لیے موت کو سفاک کہا جاتا ہے لیکن فرنگی موت سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ اس کے مظالم سے دیوارِ زنداں سہمی ہوئی ہے اور پھانسی کے پھندے بھی فریادی ہیں۔ پس منظر سے مریم کی درد بھری آواز ابھرتی ہے زنداں کی سلاخوں کے پیچھے سے جاوید اس کا جواب دیتا ہے اور اسے انقلاب اور نئے دور کی خوشخبری سنا کر مریم کے درد کو کم کرنا چاہتا ہے لیکن مریم کا دکھ زدہ دل سکون نہیں پاتا اسے تو اپنا جاوید اپنی زندگی سے بھی پیارا ہے۔ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر تیار ہے لیکن جاوید اپنے بلند مقصد اور اپنی قربانیوں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسے زندہ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسے بھروسہ ہے کہ اس کی قربانی رائیگاں نہ جائے گی اور وہ وقت دور نہیں جب وطن میں آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور ظلمتِ شب یعنی غلامی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مریم اور جاوید جدا ہو جاتے ہیں"۔

(7) "نظم کے آخری حصہ یعنی صرف آخر میں یہی مقصد تبلیغ کی حدود میں آجاتا ہے۔ اس میں تاریخ عالم کی خالص اشتراکی تشریح پیش کی گئی ہے۔ طبقاتی کشمکش کے بعد اشتراکیت کی صبح جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ایک طرف مستبد افراد مثلاً چنگیز' نادر' تیمور' سفید قوم کے عیار تاجر اور دوسری سمت مظلوم اور محنت کش افراد ہی دونوں طبقوں کی نمائندگی کے لیے پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور مجاہدان وطن کو انہیں میں شامل ہو جانے کی ترغیب دی جاتی ہے' یعنی شاعری کے خیال کے مطابق ہندوستان کی ساری مصیبتوں کا خاتمہ اشتراکی راہوں پر چلنے میں ہی

مضمر ہے۔نظم کا یہ حصہ اگر چہ رواں دواں بحر میں ہے لیکن تبلیغ کے بوجھ سے گراں بار ہے'' 93

روشن اختر کاظمی نے اس نظم کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے ملاحظہ کیجیے:

(1)''سردار جعفری کی اس نظم کا موضوع' ٹیکنک' اسلوب' مختلف بحروں کے استعمال میں جدت نمایاں ہے اور اس سے قبل کسی بھی طویل نظم میں یہ انداز نہیں ملتا ہے۔نظم میں تاریخی حالات اور واقعات کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ان واقعات کو کبھی کردار بیان کرتے ہیں کبھی پس منظر سے آوازیں تاریخ یا وقت کا ترانہ بن کر ابھرتی ہیں۔مکالمہ کی ٹکنک کا نظم میں استعمال نیا نہیں ہے لیکن جس انداز سے سردار نے غیر مرئی چیزوں کو مرئی بنا کر بطور کرداروں کے پیش کیا ہے۔اس سے یہ نظم ایک کامیاب رمزیہ (Allegory) بن جاتی ہے۔جدید نظم میں یہ ٹکنک نسبتاً چھوٹے پیمانے پر دوسرے شعرا نے بھی برتی ہے لیکن سردار نے اسے طویل نظم میں زیادہ کامیاب طریقہ سے برتا ہے.....اس اسلوب کی وجہ سے سردار کی یہ نظم بڑی بامعنی اور زندگی سے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔اس ٹکنک کو برتنے کی وجہ سے سردار کو اس نظم میں جذبات نگاری کے بہترین مواقع حاصل ہوئے ہیں۔مثلاً جاوید اور مریم کے کرداروں میں اگر چہ جذبۂ حریت اور وطنیت قدرے مشترک ہے لیکن دونوں کے صنفی فرق کے مطابق نفسیاتی کیفیتوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کی کوشش کامیاب ہے جسے اختصار سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ عورت میں اپنے اور اپنے خاندان کے تحفظ Security کی خواہش شدید ہوتی ہے جبکہ مرد کسی بڑے آدرش یا نصب العین کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی پیش کرنے میں عورت کے مقابلہ میں غیر جذباتی ہوسکتا ہے۔ جاوید اور مریم کے مکالموں میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔اس نازک فرق کو ملحوظ رکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سردار جعفری دونوں جنسوں کے فرائض میں تفریق جائز سمجھتے ہیں۔یہاں مکمل مساویانہ حقوق کا تصور ضرور ہو جاتا ہے کیونکہ اگر فرائض میں یکسانیت نہیں ہے تو لازمی طور پر حقوق بھی مختلف ہوں گے۔اس صورت میں کسی ایسے نظام حیات کو ناقص ٹھہرانا جس نے دونوں صنفوں کے خلقی فرق کے سبب دنوں کے حقوق اور فرائض میں کسی حد تک تفریق کو اصولی حیثیت عطا کی ہے کس طرح درست ہے۔مساوات مکمل کے نظریہ سے روگردانی کر کے سردار جعفری نے حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیا۔''نئی دنیا کو سلام'' واقعی ایسی نظم ہے جس میں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے یہ نظم اپنی کردار نگاری اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی بہت اہم ہے''۔ 94

مظہر مہدی نے بتایا کہ علی سردار جعفری کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں چھوٹی چھوٹی مکمل نظمیں ملتی ہیں۔

اس سلسلہ میں انہوں نے چند دیگر ادیبوں کی آراء بھی پیش کی ہیں۔

(1)''فن پاروں کے بارے میں خود فن کاروں کے بیانات بسا اوقات قارئین اور ناقدین کے ساتھ خود ان فن پاروں کو بھی عجیب صورت حال سے دوچار کر دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے فن کار اپنے فن پاروں سے متعلق جس رائے کا اظہار کرتے ہیں اکثر اس کی توثیق یہ فن پارے کرتے نظر نہیں آتے بلکہ اس کے برعکس وہ کچھ اور ہی کہتے سنائی دیتے ہیں۔لگ بھگ یہی بات سردار جعفری اور ''نئی دنیا کو سلام'' پر صادق آتی ہے۔انہوں نے نئی دنیا کو سلام کے ''پیش لفظ'' میں یہ اعلان کیا کہ یہ ان کی سب سے طویل نظم ہے (صفحہ 7)۔شاید یہی سبب ہے کہ اس پر اب تک جتنی بھی تنقیدیں لکھی گئیں یا تبصرے کئے

گئے ان سب میں منشائے شاعر کو مقدم جان کر اس رائے سے اتفاق کیا گیا جبکہ اس متن کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر چھوٹی چھوٹی خوبصورت مکمل نظمیں بھی ہیں جن کی آزادانہ حیثیتوں پر خالق متن کی رائے کو مقدم جاننے سے آزادانہ تنقید/تبصرے کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

(2) ''وحید اختر نے سردار جعفری کے اس دعوے کو درست قرار دیا کہ ''نئی دنیا کو سلام'' ان کی سب سے طویل نظم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے قبل اردو شاعری میں نظم کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی''۔ 95

(3) ''ادیب سہیل کے خیال میں عہد جدید کی اردو شاعری میں طویل نظم نگاری کی ابتداء اسی سے ہوئی''۔ 96

(4) ''احمد ہمدانی نے ''نئی دنیا کو سلام'' کو اردو شاعری میں ہیئت کا ایک نیا روپ اور کامیاب تجربہ خیال کیا اور کہا کہ اس میں بحور کا تنوع اور مثنوی، مکالمے اور ڈرامے کے عناصر بڑی خوبصورتی سے یک جا کیے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے چند حصوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''یہ پوری نظم زندگی اور کائنات کے مثبت نظریے کی عکاسی اور شاعرانہ لطافتوں کا ایک قابل قدر نمونہ ہے''97

(5) ''زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کے دعوے کے برخلاف اس کو تمثیلی نظم تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے ''تحریری انداز کا ایک منظوم ڈراما''۔ خیال کیا 98

(6) ''پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے اسے تمثیل کہا جس میں ان کو آہنگ انقلاب بھی نظر آیا۔ اسی سبب سے انہوں نے اس کو چکبست، اقبال اور تمام وطن پرستوں کی شاعری سے آگے کی منزل جانا'' 99

(7) ''نئی دنیا کو سلام'' کا وہ معتد بہ حصہ جس کی حیثیت شاعر کے نزدیک مرکزی ہے۔ کہانی پن اور ڈرامائی عناصر کا حامل تو ہے لیکن فن کے لحاظ سے وہ مکمل ڈراما نہیں ہے۔ جاوید، مریم، فرنگی اور نامہ بر اس کے چار اہم کردار ہیں۔ ان میں سے جاوید کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کرنے کی پاداش میں سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے لیکن اس کی بیوی مریم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ رحم مادر میں پلنے والا بچہ شاعر کی آرزوؤں تمناؤں کا محور ہے۔ یہی نئی دنیا کا استعارہ ہے جس کو شاعر سلام کرتا ہے۔ سردار جعفری نے متذکرہ بالا کرداروں کے علاوہ زندگی، تاریخ، وقت اور موت کو بھی ''نئی دنیا کو سلام'' کے کرداروں میں شمار کیا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ نام نہاد کردار ڈراما میں کوئی عملی رول ادا نہیں کرتے۔ انہوں نے ان کو تیسری تصویر، چوتھی تصویر اور پانچویں تصویر میں علی الترتیب ''زندگی کا ترانہ''، ''تاریخ کا ترانہ'' اور ''وقت کا ترانہ'' اور ''موت کا راگ'' کے عنوانات کے ذیل میں مکالمہ شروع ہونے سے قبل چسپاں کیا ہے جو دراصل تجریدی تصورات کی حامل بہت ہی خوبصورت پابند اور مکمل نظمیں ہیں۔ اسی طرح حرف اول (جس سے اس مجموعے کا آغاز ہوتا ہے) اور ''حرف آخر'' (جس پر یہ اختتام کو پہنچتا ہے) جیسی نظموں کی حیثیت اس میں نگینوں کی سی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی یہ نظمیں اس مجموعہ کلام کے اس معتد بہ ڈرامائی حصے سے کہیں زیادہ خوبصورت، اثر انگیز اور معنی خیز ہیں جسے شاعر مرکزی حیثیت کا حامل تصور کرتا ہے۔ ان نظموں میں علی الخصوص حرف اول اور حرف آخر میں ان موضوعات کی طرف انتہائی بلیغ اشارے موجود ہیں جن کی وضاحت اور صراحت ڈرامائی عناصر سے مملو اس غالب حصے میں بے کیف اور حسن تاثیر سے عاری مرکب نثری جملوں، لمبی لمبی

تقریروں اور منظوم مکالموں میں کی گئی ہے'' 100؎

پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا ہے:

''نئی دنیا کو سلام'' کا بھی ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ 101؎

علی سردار جعفری: ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب عنوان کے تحت اپنے مضمون میں مظہر مہدی نے سردار جعفری کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے حرف اول اور حرف آخر کا تفصیلی جائزہ بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔حرف اول کے اشعار درج کیے جاتے ہیں اُس کے بعد مظہر مہدی کے جائزہ کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

حرف اول (عہد ظلمت):

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں/کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے/ سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ/ سیاہ پھن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے/ سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمین/ سیہ عقاب' سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے/ سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ/ سیاہ لوہے کی دیوار سی بنائے ہوئے/ سیاہ وادی وصحرا سیاہ دریا ہیں/ سیاہ دشت سیہ کھیت لہلہائے ہوئے/ سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر/ سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے/ سیہ چراغ سیہ روشنی سیاہ لویں/ سیاہ گھر میں سیہ جال سا بجھائے ہوئے/ سیاہ کیڑوں کے مانند رینگتی مخلوق/ سیاہ بھوت/ اندھیرے میں بلبلائے ہوئے/ سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر/ سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے/ سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے/ سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں/ سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے/ سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں/ سیاہ تیر سیہ زہر میں بجھائے ہوئے/ سیاہ دارُ سیہ پھانسیاں ۔سیہ پھندے/ سیاہ ہاتھ سیہ گردنیں دبائے ہوئے/ سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے/ سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے/ سیاہ جبر سیہ عصمتیں سیہ چیخیں/ سیاہ عدل سیہ کلغیاں لگائے ہوئے/ سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں/ سیہ حصار سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے/ضمیر عہد غلامی کی تیرگی ہے یہ رات/ جو پھر رہی ہے اجالے سے منھ چھپائے ہوئے/ کہاں ہے روشنی صبح انقلاب کہاں؟ضمیر حضرت انسان کا آفتاب کہاں۔

مظہر مہدی کا جائزہ ملاحظہ کیجیے:

(1) ''حرف اول'' اپنے فن اور اندرونی منطقی نظام کے لحاظ سے ایک مکمل نظم ہے۔چونکہ شاعر کے نزدیک اس کی حیثیت نئی دنیا کو سلام کے ابتدائیہ کی ہے۔اس لیے اس کا عنوان حرف اول قائم کیا گیا ہے۔ورنہ اس کا ظلمت/عہد ظلمت/ضمیر عہد غلامی کی تیرگی جیسا کوئی عنوان قائم کیا جا سکتا ہے۔یہ نظم اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں برطانوی سامراج کے ظلم وستم اور جبر واستبداد کو ضمیر عہد غلامی کی تیرگی سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کے اظہار کے لیے سولہ اشعار میں لفظ سیاہ/سیہ کو علامت اور استعارے کے طور پر انسٹھ بار انتہائی موثر اور فن کارانہ طریقے سے برتا گیا ہے۔یہ غیر معمولی بات ہے۔یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ناسخ کی تیرہ اشعار کی ایک غزل ہے جس کی ردیف ہی سیاہ ہے۔اس کے دو اشعار دیکھئے ؎

دن سیہ رات سیہ ماہ سیہ سال سیاہ
دل سیہ بخت سیہ نامہ اعمال سیاہ

ایک میں اور ہیں یہ چار بلائیں کالی
خط سیہٗ زلف سیہٗ چشم سیہٗ خال سیاہ

(دیوان ناسخ، جلد دوم، لکھنؤ، منشی نولکشور، ب۔ت)

.....اس طرح ناسخ جیسے استاد شاعر نے اپنی تمام سیاہی صرف دو اشعار میں انڈیل دی اور باقی اشعار خالی خولی قافیہ پیمائی بن کر رہ گئے۔اس کے برعکس حرف اول میں ایک ہی لفظ کو انسٹھ بار انتہائی سلیقے سے برتنا سردار جعفری کی قادرالکلامی کا وافر ثبوت ہے۔اس لفظ کی تکرار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف ظلم وستم کی کالی آندھیاں چل رہی ہیں۔اس تکرار کے مقاصد میں ظلمت کے مختلف ابعاد کا نقشہ کھینچنا اور ماحول میں تیرگی کے خلاف قاری کے جذبات کو اشتعال دینا بھی شامل ہے۔اگر اس نظم کی تعین قدر، منشائے شاعر کے برخلاف کی جائے تو یہ ثابت ہوگا یہ اپنے اندر نوآبادیاتی صورتِ حال کے علاوہ کسی بھی عہد میں ظلم اور جبر کے خلاف مزاحمت کا استعارہ بننے کا امکان بھی پوشیدہ رکھتی ہے۔علاوہ ازیں، اگر اس کی قدر و قیمت کا تعین اس کے محدود سیاق وسباق ہی میں سہی، آزادانہ طور پر کیا جائے تب بھی اردو کی مزاحمتی شاعری کی تاریخ میں یہ ایک بے مثل نظم ثابت ہوتی ہے"

(2) "شاعر کو سامراجیت کا پرچم سیاہ نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستان کی ظلمت کا سب سے بڑا نشان ہے۔کسی بھی قوم کی زندگی میں غیر ملک کی حکمرانی سے بڑھ کر کچھ اور ظلمت نہیں ہوسکتی اور یہ سامراجی حکومت جس نے ہندوستان کی زندگی میں ظلمت بکھیر دی ہے، سیاہ رات جیسی ہولناک اور خوفناک ہے اور وہ اپنے کالے کرتوتوں پر نادم بھی نہیں ہے بلکہ فخر سے سینہ تانے اور سر اٹھائے کھڑی ہے.....انہوں نے اس لفظ کے کلیدی الفاظ میں سیہ/ سیاہ سابقہ (Prefix) کے استعمال سے جو علامت خلق کی ہے اس نے ان کے تجربے کے معنی کو بہت وسعت بخشی ہے"

(3) "سردار جعفری کی اس نظم کا علامتی انداز بیان اور ایجاز واختصار بھی اس کی ایک اہم خوبی ٹھہرتی ہے۔اس نظم کے تیسرے شعر میں گھوڑا، حکومت، قوت، غلبہ، رعب داب اور شان وشوکت جیسی تمام چیزوں کی علامت ہے جو انسان کے دلوں میں خوف پیدا کرتا ہے اور خواہی نہ خواہی اپنی برتری تسلیم کرواتا ہے۔اس کی ٹاپوں کا کام روندنا ہے۔ان کے نیچے خواہ انسان آئے یا زمین۔عقاب ایک شکاری پرندہ ہے جو بہت طاقتور اور بلند پرواز ہوتا ہے۔عقاب، شکار کرنے کی غرض سے پورے آسمان پر اس طرح چھا گئے ہیں کہ آسمان بالکل سیاہ ہوگیا ہے۔چونکہ یہ عقاب سیاہ ہیں اس لیے دہشت میں اضافہ کرتے ہیں۔بہ الفاظ دیگر یہاں کے عوام کی کیفیت خوف زدہ شکار کی سی ہے۔یعنی ہندوستان پر برطانوی سامراج کی عظمت وجبروت کا سکہ اس قدر جم گیا ہے کہ اس کی دہشت سے مادر وطن کا دل دہل رہا ہے۔پہاڑ بھی ناظرین کے دلوں میں اپنی عظمت و جبروت کی ہیبت بٹھاتے ہیں اور پہاڑ پر اگر سبزہ بھی نہ ہو اور وہ سیاہ بھی ہو تو وہ اور زیادہ ہیبت ناک ہوجاتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں پہاڑوں کے ضرورت سے زیادہ استحصال over exploitation کا نتیجہ، روز شجر کاری deforestation ہے یعنی پہاڑوں کی برہنگی اور سیاہی ہے۔یہاں پہاڑ استحصال زدگی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔برہنہ، استحصال زدہ پہاڑ اپنا اجڑا ہوا سیاہ سینہ تانے لوہے کی سیاہ دیوار کی مانند کھڑا ہے۔اسی طرح دشت وصحرا، وادی و دریا بھی Over exploitation

کا استعارہ ہیں کہ دشت و وادی اپنی ہریالی، صحرا اپنی چمک اور دریا اپنی شفافیت اور نیل کوٹی کھو کر سیاہ ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے کھیت میں بھی سیاہی اگ رہی ہے اور بھوک اور قحط پیدا ہو رہے ہیں ..... سردار جعفری بھوک اور افلاس کے اسباب سے باخبر معلوم ہوتے ہیں اور اپنی باخبری سے قاری کو باور کرانے کی غرض سے اپنے اس شعر ''سیاہ وادی و صحرا، سیاہ دریا ہیں/ سیاہ دشت سیہ کھیت لہلہائے ہوئے'' کی، جو اپنے سینے میں امکانات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا، ایک سمندر لیے ہوئے ہے، قرار واقعی وضاحت و صراحت نئی دنیا کو سلام کی چوتھی تصویر میں اس جگہ پیش کرتے ہیں جہاں جاوید اور مریم فرنگی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں فرنگی کو ہندوستان کے استحصال کا ذمہ دار گردانتے ہیں اور ساتھ ہی یہ ذمہ داری بھی عائد کرتے ہیں کہ اسی کے جبر و ظلم نے ان کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا اور انقلاب کی راہ پر لگایا۔ فرنگی سے مریم کہتی ہے۔

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اٹھ گئیں ہیں/ تم نے ہندوستان کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں/ تم نے اس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی ہیں/ تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا/ تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا/ اور دریاؤں میں زہر گھولا/ کل جہاں ناچتی تھیں بہاریں/ دودھ اور شہد کی پڑ رہی تھیں پھواریں/ آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے بھوت منڈلا رہے ہیں۔

(نئی دنیا کو سلام صفحہ 105، 106)

(4) کارخانے، سرمایہ داری اور استحصال کی علامت ہیں۔ محنت کشوں کے بغیر کارخانوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن جن کے دم سے کارخانے چلتے ہیں اور سرمایہ داری روز افزوں ترقی کرتی ہے ان کی حیثیت محض ان کی ایندھن کی سی ہے۔ محنت کش زندہ رہنے کی خاطر کارخانوں میں دن رات اپنی قوت، محنت فروخت کرتے ہیں اس کے باوجود ان کی گزر اوقات بہ مشکل ہوتی ہے۔ استحصال کی علامت کارخانے کی سیاہ چمنی سے کالا دھواں جس طرح کالے بادل کی مانند تھرتھراتا ہوا نکل رہا ہے وہ سامنے کی چیز ہے ..... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کالے دھوئیں کے بادلوں میں بھی انسان جیسی حس پائی جاتی ہے۔ وہ بھی محنت کشوں ہی کی طرح سرمایہ داروں کے جبر سے خوف زدہ ہیں، لرزاں ہیں''۔ ..... سردار جعفری کا شعر

سیاہ کیڑوں کے مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے

ایک کریہہ منظر پیش کرتا ہے جو قاری کے اندر ان اسباب سے تنفر پیدا کرتا ہے جو مخلوق کو سیاہ کیڑوں کی مانند رینگنے پر مجبور کرتے ہیں ..... اس طرح سیاہ چراغ، سیاہ روشنی، سیاہ لویں سب استحصال کا زائدہ افلاس کے استعارے ہیں ..... اول انہوں نے مفلس کا چراغ اور تہی دست کا چراغ کے بجائے سیہ چراغ کہہ کر اس کو استعارہ بنا دیا جو شاعری میں یقیناً تشبیہ سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ دوم، وہ شعر کو انفس کے دائرے سے نکال کر آفاق کے دائرے میں لے آئے جو اکثر ترقی پسندوں کا شیوہ رہا ہے''۔

(5) ''روایتی معشوق روشن جبیں، زہرہ جبیں/ مہہ جبیں/ خورشید جبیں ہوتا تھا/ ہوتی تھی جسے عصمت، خوبصورتی اور پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن وہ معشوق جو اپنی مفلسی اور بے چارگی کے باعث ان تمام صفات سے محروم ہو چکی ہے اس

کی متضاد صفات کے اظہار کے لیے پہلی بار شاید علی سردار جعفری نے سیاہ جبیں کا استعمال کر کے امکانات کا ایک جہاں آباد کر دیا ہے۔ ملبوسات جن کا بنیادی رول ستر پوشی یعنی عصمت وعفت کی حفاظت ہے۔ جبر کے سامنے اپنا اصل رول ادا نہ کرنے پر بے بسی اور سوگواری کے باعث ماتمی رنگ اختیار کر چکے ہیں۔ وہ عصمت دری سے بدن پر پڑے نیلی اور داغ دار پیشانی کو چھپائے ہوئے ماتم کناں ہیں۔ سیاہ ملبوسات جبر وظلم کے خلاف خاموش احتجاج کی علامت بھی ہو سکتے ہیں۔ جبر اُبوس و کنار اور شہوت کی کثرت وشدت نے ان کے لبوں پر جو نشان چھوڑ دیا ہے وہ عیش ونشاط کی بدمستیوں کی چغلی کھا رہا ہے۔ ظلمت کی انتہا یہ ہے کہ ماں کا دودھ جو نوزائیدہ بچے کے لیے سرچشمۂ حیات ہے' سیاہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح افزائش زندگی کی علامت اور دودھ کا مخرج پستان مادر بھی اپنی فطری صفات سے محروم ہو چکا ہے یعنی یہ دونوں اپنے اوصاف حمیدہ کھو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ماں کا سینہ ہی صحت مند نہیں اور نہ اس سے نکلنے والا دودھ ہی صحت بخش ہے تو یہ بچے کی سیاہی بیماری کی علامت ہے کہ اس حالت میں جسم سیاہ ہو جاتا ہے''۔

(6) ''اس پر طرہ یہ کہ جو تیر چلایا جا رہا ہے وہ پہلے زہر میں بجھایا گیا ہے تا کہ جو تیر کھائے اس کے لیے یہ مہلک ثابت ہو اور وہ اگر صرف زخم کھائے تو بھی مارا جائے کیونکہ اس صورت میں بھی زہر اپنا اثر ضرور دکھائے گا۔ اس لیے سردار جعفری نے اس کو زہر میں بجھا ہوا سیاہ تیر کہا ہے جو پوری فضا میں سنسناتے ہوئے' تیزی سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح ایک نظام حکومت کے چند اہم ستون میں سے ایک نظام عدل بھی ایک بہت بڑا فریب اور عوام پر جبر روا رکھنے کا بہت اہم آلہ ہے۔ حکومت یوں تو عدل وانصاف کی دہائی دیتی ہے لیکن ذرا ذرا سی بات پر عوام کو دار ورسن تک پہنچا دیتی ہے۔ سردار جعفری نے اس شعر میں بار بار پھانسی کے عمل سے پیدا ہونے والی کراہت اور شدت کو پیش کرنے کی غرض سے سیاہ دار' سیہ پھانسیاں' سیاہ پھندے جیسے ہم معنی الفاظ کو برتا ہے۔ پھانسی کے بعد گردن پر نیل پڑ جانے کے بعد بھی جلاد کا ہاتھ گردن دبوچے ہوئے ہے کہ کہیں اب بھی تو اس میں جان باقی نہیں۔ اس شعر میں سیاہ ہاتھ جلاد کا ہاتھ ہے جو جابر وظالم حکومت کا استعارہ ہے۔ سامراجی' بورژوا اور بدعنوان نظام عدل پر ایسی تنقید اردو شاعری میں بے مثل ہے..... عوام کے جسم پر بے رحم کوڑے لگائے گئے جن سے ان کے بدن پر نیل پڑ گئے اور گہرے زخم بھی آئے جن کا درد اب بھی گیا نہیں ہے۔ جب گہرے پرانے زخم مندمل ہونے لگتے ہیں تو وہ اوپر سے سیاہ ہو جاتے ہیں اور ان میں ٹیس سی ہوتی ہے جو ظلم وستم کی نا خوشگوار یاد تازہ کرتی رہتی ہے۔ سیاہ نشان' سیاہ زخم' سیاہ کوڑے' ظلم وستم اور جبر واستبداد کی علامتیں ہیں۔ شعر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ درد جاگ رہا ہے۔ ممکن ہے درد کا جاگتے رہنا زخم خوردہ عوام کی بیداری یا انقلاب کا باعث بن جائے''۔

(7) ''عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کرتے وقت سفید گھنگھریالے مصنوعی بالوں کا ٹوپ یا وگ جسے ایک منصف اتھارٹی کی ایک علامت یا نشان کے طور پر پہنتا ہے اور جو اس کے منصبی لباس کا ایک جزو ہے' اس کو سردار جعفری نے سیاہ کہا ہے جو سفید کا نقیض ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس کا کام عدل وانصاف ہے وہ نا انصافی اور ظلم کی علامت بن چکا ہے۔ کلغی کے ایک معنی خاص پرند کے ان چند خوش نما پر کے بھی ہیں جنہیں بادشاہ وغیرہ اپنے تاج' ٹوپی اور پگڑی پر رزم بزم میں لگاتے تھے۔ یعنی اس معنی میں بھی یہ شئے اتھارٹی کی علامت اور نشان امتیاز سمجھی جاتی تھی لیکن یہ اب بدنما اور داغ دار معلوم ہوتی ہے۔ سردار جعفری

نے ''نئی دنیا کو سلام'' کی چوتھی تصویر میں برطانوی سامراج کے نظامِ عدل کی تصویر یوں پیش کی ہے۔ جاوید فرنگی سے کہتا ہے:

''اور پھر اپنے آئین و قانون کے نام پر/ اونچے قلعے بنائے/ فوج لائے/ میزبانوں پہ پہرے بٹھائے/ ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے/ .....تم تو خود جانتے ہو کہ جس شے کو آئین و قانون کا نام تم نے/ دیا ہے وہ کیا ہے/ یہ ہے وہ سانپ جو سینکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ/ کو ڈس رہا ہے/ جن کو لندن کے شاہی مداری/ اپنی مکاریوں کی پٹاری میں لے کر/ ایک اک ملک میں ایک اک دیس میں پھر رہے ہیں/ یہ وہ کوڑا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم انسان کے جسم/ اور روح میں سڑ رہے ہیں/ یہ وہ بجلی ہے جو سال بہ سال سے مفلسوں کے گھروں پر/ گر رہی ہے/ یہ وہ تلوار ہے جو نہتوں کی سوکھی ہوئی گردنوں پر/ ڈیڑھ سو سال سے پھر رہی ہے/ یہ وہ مخمل ہے جس میں تمہارے تشدد کے پنجے چھپے/ ہیں/ اپنے قانون کا ڈھونگ اچھار چایا ہے تم نے''

(نئی دنیا کو سلام صفحہ 103، 104)

(8) ''سردار جعفری نے .....ایک شعر میں برطانوی نوآبادیاتی صورتحال کو عہدِ غلامی کے ضمیر کی سیاہی سے موسوم کیا ہے جس کی کیفیت اس شب تار کی سی ہے جو بظاہر انتہائی مہیب نظر آتی ہے لیکن بباطن روشنی سے خوف کھاتی ہے کیونکہ وہ اس کی تاب نہیں لا سکتی، روشنی اس کے وجود کو خاک میں ملا دے گی اور غلامی کے تاریک دور کا خاتمہ ہو جائے گا.....سردار جعفری اس نظم کے آخری شعر میں روشن ضمیر انسان کو آواز دیتے ہیں جس کی روشنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اگر محکوم عوام کا ضمیر بیدار ہو جائے تو اس سے جو کرنیں پھوٹیں گی ان کی کیفیت سورج کی روشنی جیسی ہو گی جو بالآخر ظلم و جبر کی تاریک رات کو انقلاب کی صبح میں تبدیل کر دے گی۔

کہاں ہے روشنی صبح انقلاب کہاں
ضمیر حضرت انساں کا آفتاب کہاں

اگر سردار جعفری کی ایک دیگر انتہائی خوبصورت اور مشہور زمانہ نظم ''ایک خواب اور'' کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ زیر بحث نظم کی طرح اس کا پہلا شعر بھی قافیہ سے عاری ہے اور آخری شعر کے دونوں مصرعے بھی نہ صرف مقفّٰی ہیں بلکہ ان کا قافیہ بھی مختلف ہے۔ یہ ان کا مخصوص شعری اسلوب ہے۔ علاوہ ازیں، ان دونوں نظموں کے آخری دو اشعار نہ صرف رجائی لہجہ اختیار کر لیتے ہیں بلکہ دعوتِ فکر و عمل بھی دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری کا جوہر قنوطیت اور مردم بے زاری کے برعکس رجائیت اور انسان دوستی، خواب گری اور خواب فروشی قرار پاتا ہے۔ سردار کی سرداری کا راز اسی میں ہے۔ ان کی جمالیات کا نشان امتیازی بھی یہی ہے: 102

''سرکشی پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں/ میں ترا شاعر آوارہ و بے باک و خراب/ پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند/ ایک خواب اور بھی اے ہمت دشوار پسند'' (ایک خواب اور از سردار جعفری، صفحہ 18)

علی سردار جعفری کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے ''حرفِ آخر'' (شاہراہِ حیات) کے اشعار پیش ہیں:

''یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہ حیات/ ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے/ جبیں پہ کاتبِ تاریخ کی جلی تحریر/ گلے سے سینکڑوں نقشِ قدم لگائے ہوئے/ گزرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے/ حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے/ گذشتہ دور کی

تہذیب کی منازل کو/ جوان ماں کی طرح کود میں سلائے ہوئے/ یہ آدمی کی گزرگاہ شاہ راہ حیات/ ہزاروں سال کا بارگراں اٹھائے ہوئے/ ادھر سے گزرے ہیں چنگیز و ہادر و تیمور/ لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے/ غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے/ خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے/ شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے/ سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے/ جلال شیخ و شکوہ برہمنی کے جلوس/ ہوس کے سینوں میں آتش کدے چھپائے ہوئے/ جہالتوں کی طویل اور عریض پرچھائیں/ توہمات کی تاریکیاں جگائے ہوئے/ سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ/ فریب و مکر سے اپنی دکاں سجائے ہوئے/ شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم/ ادب سے ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے/ غموں سے چور مسافر تھکے ہوئے راہی/ چراغ روح کے دل کے کنول بجھائے ہوئے/ یہ آدمی کی گزرگاہ شاہ راہ حیات/ ہزاروں سال کا بارگراں اٹھائے ہوئے/ نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے/ چراغ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے/ بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر/ زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے/ غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے/ ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے/ ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب/ بغل میں کرۂ ارض حسین دبائے ہوئے/ اٹھو اور اٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ/ جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے/ قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدین وطن/ مجاہدین وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے۔

مظہر مہدی نے مذکورہ ''حرف آخر'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

اس جائزہ کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

(1) ''نئی دنیا کو سلام'' کا آخری حصہ جس کا عنوان حرف آخر' حرف اول کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور فی الحقیقت جس کا اصل عنوان ''شاہ راہ حیات'' تھا' اپنے منطقی نظام اور ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے تو مکمل نظم ہے ہی' دیگر خارجی شواہد کی روشنی میں بھی یہ ایک مکمل نظم ثابت ہوتی ہے۔ اول یہ نظم شاہ راہ حیات کے عنوان سے سویرا (مئی 1947ء) میں شائع ہوئی دوسرے یہی نظم 1947 کے بہترین ادب (مکتبہ اردو' لاہور) میں شامل ہے۔ شاہ راہ حیات تین غیر مساوی بند پر مشتمل ہے جس کے تینوں بند اس شعر سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ آدمی کی گزرگاہ شاہ راہ حیات/ ہزاروں سال کا بارگراں اٹھائے ہوئے۔ پہلا بند بشمول مذکورہ شعر چار اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے اور تیسرے بند میں متذکرہ شعر کے علاوہ علی الترتیب آٹھ اور چھ اشعار شامل ہیں یعنی کل ملا کر اٹھارہ شعر ہوئے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ ''حرف اول'' میں بھی اٹھارہ اشعار ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ایک ہی بحر' وزن اور قافیے میں ہیں۔ حرف اول کے آخری شعر کے قافیہ و ردیف مختلف ہیں جبکہ شاہ راہ حیات/ حرف آخر میں شروع سے آخر تک ایک ہی قافیہ و ردیف کی پابندی کی گئی ہے''۔

(2) ''یہ جو شاہ راہ حیات ہے جسے جرنیلی سڑک یا شارع عام کہا جا سکتا ہے جس سے انسانوں کے قافلے گزرے ہیں یعنی زندگی جس پر رواں دواں رہی ہے وہ تاریخ کا استعارہ ہے۔..... ہر بڑے شاعر کی طرح سردار جعفری نے بھی اس پوری نظم میں زبان کا تخلیقی استعمال کیا ہے..... تاریخ صرف کاروان حیات کے تاریک گوشوں' گرد و غبار کو ہی نہیں بلکہ اس کے روشن پہلوؤں کو بھی محفوظ کیے ہوئے ہے۔ اس شعر میں بھی شاعر کے لہجے کی مخصوص رجائیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ حسین جسم کی تابانی میں اشاریت اور ایمائیت ہے جس نے معنی کے امکانات کی ایک پوری دنیا آباد کر دی ہے۔ اسی طرح گذشتہ زمانوں کی

تہذیبوں کی مختلف منزلیں بھی جو اس کی اپنی ہیں اور عزیز بھی' تاریخ کے محافظ خانے میں محفوظ ہیں..... جوان ماں ازحد نگہبانی (Over Protectiveness) اور ممتا کا استعارہ ہے یعنی تاریخ نے عہد پارینہ کی تہذیبوں کی تمام منزلوں کو اس طرح محفوظ رکھا ہوا ہے جیسے کوئی جوان ماں اپنے لخت جگر کی حفاظت کرتی ہے''۔

(3) ''شاہ راہ حیات کے دوسرے حصے کا آغاز چنگیز خاں' نادر شاہ اور تیمور لنگ کی فتوحات یا غارت گری سے ہوتا ہے جن کے قافلوں کی مشعلیں لہو سے روشن ہیں۔ انہی کے ساتھ غلاموں اور کنیزوں کے قافلے بھی اپنے ہی لہو میں ''ڈوبے ہوئے' نہائے ہوئے'' جوق در جوق آئے..... وہ خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے' نہائے ہوئے ہیں' جوان کے غلام اور کنیز بنائے جانے کے عمل اور ان پر روا رکھی گئی بربریت کے مختلف ابعاد کو پیش کرتا ہے۔ تیسرا شعر ان فن کاروں' صناعوں اور کاریگروں کو عقیدت کا خراج پیش کرتا ہے جن کے ہاتھوں نے دنیا میں دیوارِ چین اور اہرام مصر جیسے عجوبے تعمیر کیے لیکن جن کے فن کی نہ خاطر خواہ ستائش ہی کی گئی اور نہ ان کو اس کا صلہ ہی ملا۔ ان کے استحصال اور اس پر شاعر کے احتجاج کا اس سے زیادہ بلیغ اظہار تقریباً ناممکن ہے..... سردار جعفری نے ان فن کاروں کے ہاتھوں کی عظمت کے باب میں ایک پوری نظم ''ہاتھوں کا ترانہ کہی ہے جس میں انہوں نے ان کی تعظیم کرنے پر زور دیا ہے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو فطرت کے شاہ کار تخلیق کرتے ہیں۔..... شاعر..... ان ہاتھوں کو ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے لیے للکارتا ہے''

(4) ''شیخ و برہمن..... کی ظاہر داری' ان کے بے احتساب اور ان کی ریا کاری کو شعرا نے ہمیشہ طنز کا نشانہ بنایا ہے اور..... ایک مضحکہ خیز کردار کے طور پر پیش کیا ہے لیکن سردار جعفری نے ان کو عوام کے مذہبی جذبات کا استحصال کرنے والا' تو ہم' جہالت اور ظلمت پھیلانے والا اور عوام کی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیا ہے..... شیخ و برہمن یا دوسرے لفظوں میں پیر و مرشد' عالم و فاضل یا شاستری و گیانی کی عظمت و بزرگی یا شان و شوکت (تکلف' دکھاوٹ) کے جلوس (نشست، بیٹھک) ریا کاری ہیں۔ مصرع اولیٰ کے کلیدی الفاظ جلال' شکوہ' جلوس..... پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق بادشاہت' سلطنت اور حکم رانی سے زیادہ ہے اور شیخ و برہمن کی بزرگی' مرتبے' ان کے علم و فضل یا ان کی نشست یا بیٹھک سے کم۔ یعنی وہ اپنا اصل کام بیمار روح کا مداوا نہیں کرتے' ریا کاری کرتے ہیں کیونکہ ان کے سینوں میں عشق کے بجائے حکومت یا جاہ و ثروت کی ہوس نے گھر کر لیا ہے۔ اس لیے وہ سوزاں نہیں ہیں بلکہ آتش کدے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں شعلہ ہے۔ وہ دہکتے ہیں ان کی لپٹوں کی زد میں آنے والا شخص جل کر راکھ ہو جائے گا..... سردار جعفری کے شیخ و برہمن انسان کے درد کا مداوا تو بھلا کیا کرتے البتہ انہوں نے اس کو بے روح کر دیا..... سردار جعفری کا انسان بھی ''محروم درماں'' ہی رہتا ہے کہ اس کے معالجوں (شیخ و برہمن) کے معالجے (درس' وعظ' اپدیش' پروچن) میں کھوٹ ہے۔ ان کا یقین اوہام میں ہے جو جہالت کی نشانی اور جس کا نتیجہ ظلمت ہے۔ ''طویل اور عریض پرچھائیں'' اور جگائے ہوئے ''اوہام' جہالت اور ظلمت کی ایسی لمبی کہانی بیان کرتے ہیں جو صدیوں پہلے شروع ہوئی تھی اور اب تک جاری ہے''۔

(5) ''سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ کا مکر و فریب سے اپنی دکان سجانا ان کے استحصال اور ان کی غارت گری کی پوری داستان بیان کر دیتا ہے۔ ان کا سامراجی کردار' ان کی عیاری و مکاری' دولت اور حکومت کے حصول کی خاطر ہندوستانی

ریاستوں پر ان کی فوج کشی، مہم جوئی، توسیع پسندی اور بالآخر ہندوستان میں برطانوی سامراجی حکومت کا قیام۔ سردار جعفری نے تقریباً اسی خیال کی وضاحت وصراحت نئی دنیا کو سلام کی چوتھی تصویر میں کی ہے۔ جاوید فرنگی سے کہتا ہے:

جب تم اس ملک میں آئے تھے ہم نے مہمان سمجھ کر/ اپنی آنکھوں پہ تم کو بٹھایا/ بھائی سے بھائی کو تم نے لڑایا/ اور پھر اپنے آئین و قانون کے نام پر/ اونچے قلعے بنائے/ فوج لائے/ میزبانوں پہ پہرے بٹھائے/ ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے/ اور ہندوستان کی بھری بستیاں لوٹ لیں/ تم ہو وہ جن کے ہاتھ اپنے محسنوں کے لہو میں بھرے ہیں۔

(نئی دنیا کو سلام، صفحہ 103)

دوسرے شعر میں ۔

شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم
ادب سے ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے

سیاسی گداگر کون ہیں؟ اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔ اس کا ابہام اس کے حسن کو بڑھا دیتا ہے.....سیاسی گداگروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں شکست کھائے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لئے وہ سیاسی گداگری یا سیاسی کرتب دکھا رہے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی گردن جھکانا بہت ہی معنی خیز اور علامت ہے کہ میدان سیاست میں ان کی گردنیں ٹوٹ گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بے ریڑھ کی ہڈی والے بزدل، نامرد لوگ ہیں جو مقابلے کی صورت میں شکست بھی کھا سکتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان میں بہت ہی لچک ہے۔ وہ موقع کے لحاظ سے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر خود کو جھکانا بھی جانتے ہیں۔ اس کا مصرعہ ثانی ادب و تعظیم اور نیز مکر و فریب کی انتہا کی علامت ہے''۔

(6) ''سردار جعفری کے شعری اسلوب کی تخصیص یہ ہے کہ ان کی نظم کے آخری حصے کا لہجہ رجائی ہو جاتا ہے یا وہ فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے یا وہ ان دونوں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے.....نظم کے آخری حصہ کا موڈ بدلا ہوا نظر آتا ہے.....وہ افق جہاں سے قافلے آتے ہوئے نظر آرہے ہیں پہلے جیسا سیاہ نہیں ہے۔ وہ نیا ہے، بدلا ہوا ہے۔ قافلے روشنی بکھیرتے ہوئے آرہے ہیں۔ چراغ جو پہلے سیاہی بکھیرتا تھا اور افلاس و ظلمت کی علامت تھا اب اس کی لو تیز ہے اور وہ بغاوت اور انقلاب کا استعارہ بن چکا ہے۔ وہ دور ظلمت کے خاتمے کی ابتداء کا اعلان کر رہا ہے۔ محکوم عوام کا ضمیر جسے شاعر ''حرف اول'' میں آواز دے رہا تھا، بیدار ہو چکا ہے۔ انقلاب کے لیے اب حالات بالکل سازگار ہو چکے ہیں۔ روشنی، صبح انقلاب، جس کی شاعری کو تلاش تھی، اب پھیل رہی ہے.....یہ قافلے ماضی کے قافلوں کے برعکس باغیوں وار انقلابیوں کے ہیں، جو نئی دنیا کی بشارت دے رہے ہیں اور انقلاب بپا کرنے چلے ہیں.....ان کے پائے ثبات میں لرزش نہیں آسکتی کیونکہ ان میں استقلال ہے، ثابت قدمی ہے۔.....ان کی نظریں فلک پر ٹھہری ہوئی ہیں جو ان کے ارادے کی پختگی کا اشاریہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فلک بھی ان کے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتا.....انقلابی اپنی ثابت قدمی اور عزم جواں کا نشاں، علم انقلاب بلند کیے ہوا میں لہراتے آرہے ہیں جبکہ پہلے سامراجیت کا پرچم لہرایا کرتا تھا۔ ان انقلابیوں کو سیاہ قوتوں پر اپنی فتح کا مکمل یقین ہے جس سے ان میں غرور کا رنگ شامل ہو چکا ہے۔.....آفتاب اور ماہ تاب جیسی چیزیں.....اب انقلابیوں کی دست رس میں ہیں.....زمین

جس کی وسعت بے پایاں ہے' اس کی حیثیت سردار جعفری کے انقلابیوں کے عزم و استقلال کے سامنے محض ایک ایسی خوبصورت گیند (کرۂ' Globe) سی ہے..... یہ کتنا بڑا اعجاز ہے کہ وہ آفتاب و ماہ تاب کو ہتھیلیوں پر اور ارضِ حسیں کو ایک گیند کی مانند اپنی بغل میں دبائے ہوئے لیے آرہے ہیں۔ یعنی انقلابیوں نے زمین و آسمان' کرۂ ارض اور کرۂ فلکی دونوں کو اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ اسی لیے وہ مظلوم عوام سے ارض و فلک' آفتاب و ماہ تاب کا وعدہ کررہے ہیں۔ ہتھیلیوں پر آفتاب اور مہتاب کا لیے ہونا' بغل میں کرۂ ارضِ حسیں کو دبائے ہونا جیسے نادر اور تازہ کار پیکروں کی مثال اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔ بہر حال انقلاب کا سارا سامان ہو چکا ہے۔ وہ آنے ہی کو ہے۔ یہی مضمون ''قتل آفتاب'' میں بھی انتہائی عمدگی کے ساتھ نہایت ہی شاعرانہ طریقے سے بیان ہوا ہے..... اور وہ دن آپہنچا۔ وہ قافلہ آپہنچا۔ اس لیے شاعر آواز دیتا ہے۔ اٹھو اور اٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ؛ جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے۔ اس شعر پر اس انتہائی خوبصورت نظم کو اپنی انتہا پر پہنچ جانا چاہیے کیونکہ منطق بھی اس کی مقتضی تھی اور اس میں سردار جعفری کا مخصوص رنگ اور اسلوب بھی شامل ہے لیکن انہوں نے اس کے بعد ایک شعر اور کہا۔ قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن؛ مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے۔ مجاہدانِ وطن کون ہیں؟ وہ جو قافلے میں شامل ہیں یا وہ جن کو قافلے میں شامل ہونے کی دعوت دی جارہی ہے؟ اس شعر میں یہ واضح نہیں۔ البتہ اس سے فوجی مارچ کی دھن ضرور نکلتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وطن کے سپاہی قواعد کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر نئے افق سے بغاوت اور انقلاب کے لشکروں کے جو قافلے کمنڈ ڈالنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ وہ یہاں پہنچ کر مجاہدانِ وطن میں تبدیل ہوتے ہوئے اور مارچ اون مارچ اون کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس شعر کی شمولیت سے اس نظم کی معنویت محدود ہوجاتی ہے ورنہ اس نظم میں اتنی قوت اور اتنے امکانات ہیں کہ یہ کسی بھی عہد میں جبر و استحصال کے خلاف احتجاج کا استعارہ بن سکتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سردار جعفری کی بعد کی شاعری میں حرف اول حرف آخر/ شاہ راہ حیات کے رنگ' آہنگ' اسلوب اور موضوعات کی مزید توسیع ہوتی ہے اور ان میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے' یہ دونوں نظمیں ترقی پسند جمالیات کے نمائندہ شاعر کی نمائندہ نظمیں قرار پاتی ہیں اور ظلم و جبر کے خلاف شعری احتجاج کا حسین استعارہ بھی''۔ 103

نظم ''نئی دنیا کو سلام'' پر مختلف نقادوں' ادیبوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور:

''سردار جعفری نے ''نئی دنیا کو سلام'' میں ایک ہیئتی تجربہ کیا ہے'' 104

حمایت علی شاعر:

''نئی دنیا کو سلام'' اردو کی پہلی تمثیلی نظم ہے جو ایک مخصوص سیاسی پس منظر رکھتی ہے اور علامتی کرداروں کی معرفت ہندوستان کی تحریک آزادی کی ترجمان ہے'' 105

پروفیسر جگن ناتھ آزاد:

اس طویل نظم (نئی دنیا کو سلام) کا کچھ حصہ پابند شاعری اور کچھ حصہ نظم آزاد پر مشتمل ہے اور یہ اسی حسن سے معمور ہے..... ادب' سیاست اور تاریخ میں جعفری کو گہری نظر حاصل تھی اور یہ تینوں موضوعات ان کے کلام میں موجود ہیں لیکن

خالص شاعرانہ انداز میں"۔ 106

ایشیاء کی آزادی:

''ایشیاء جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی طویل نظم ہے۔اسے انہوں نے سینٹرل جیل ناسک میں جون 1950 میں لکھا اور نعمانی پریس دہلی سے اکتوبر 1950 میں شائع ہوئی۔ایشیا کے ممالک نے آزادی حاصل کرنے کے خواب دیکھے تھے۔یہ نظم مظلوم انسانوں کی دبائی ہوئی مگر بلند آواز ہے اس میں ایشیا والے احتجاجی جلوس میں نعرہ لگا رہے ہیں۔ان کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ہے اور وہ ہر ظلم کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے کمر بستہ ہیں۔محمد حسین پرکار نے سردار جعفری کی اس نظم میں ایشیا کی تحریک آزادی کا پس منظر بتایا ہے:''سردار جعفری کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ کبھی ایشیا مجبور و محکوم ضرور تھا مگر آج وہ مجبور نہیں۔آج ایشیا والوں کی ناؤ کی پتوار ماؤ کے ہاتھوں میں ہے جو استالن کا بھائی اور لینن اعظم کا لال ہے۔آج ایشیا والے نہ تو ہائیڈروجن بم سے خائف ہیں اور نہ ہی ایٹم بم سے۔آج چین اور ویت نام کی فوجوں کی شان اور آن بان کچھ اور ہے۔ملایا کے حملہ آور اور شیر برما اپنی دلیری کا ثبوت دے رہے ہیں۔خاک ایران سے وہی چنگاری شعلہ بننے کو تیار ہے تو مصر، ترکی، شام و لبنان کے سپوتوں کے ابرو کا کھنچاؤ وقت کی تلوار کا خم بن گیا ہے۔تسبیح اور جینو ایک ساتھ مل گئے ہیں اور دشمن کی اسیری کا جال بننے لگ گئے ہیں۔دشمن اب بچ کر کہاں جا سکتا ہے..... یہ ایشیاء کی جنگ آزادی ہے۔یہ مشرق و مغرب کا رنگ بدل کر رکھ دے گی۔لہٰذا سامراجی حکومت کو اس کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں کہ اپنی ملوکیت کا تاج سنبھالے سرزمین ایشیاء سے بھاگ جائے'' 107

سردار جعفری سرزمین ایشیاء کی چار ہزار سالہ تاریخ اور تہذیب و تمدن کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایشیاء کی سرزمین تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔یہیں سے انسانیت کا پہلا درس دیا گیا۔اگلے یگوں میں علم و حکمت کا نور اسی سرزمین نے بانٹا تھا۔یہاں کئی ایسے بے مثل واقعات گزرے ہیں جو انسان کی عظمت کا باعث ہیں۔وید کے زمزمے، گوتم کا درس مساوات، محبت کا عدل و انصاف اور محبت کا راگ اس سرزمین کی دین ہے۔یہیں حضرت محمد مصطفیٰ رحمت للعالمین بن کر آئے ہیں۔ایشیا کا تاریخی ورثہ مہنجو داڑو سے لے کر دیوار چین تک پھیلا ہوا ہے۔ہماری چار ہزار سالہ تاریخ و تہذیب کی مثالیں تاج اور سیکری سے اہرام مصر تک منتشر ملیں گی۔ہماری روایت کے خزانے بابل، نینوا میں ملیں گے۔ہم نے وید، انجیل اور قرآن سے درس دیے۔فردوسی، سعدی، نظامی، خیام اور حافظ کی تخئیل آسمانوں کو پہنچتی ہے۔والمیکی، تلسی، کبیر اور سور کی عظمت کو کوئی نہیں پہنچ سکا۔اقبال، ٹیگور اور ناظم کی شاعری اور لوسوں کی کہانی میں پوشیدہ بجلیاں اسی فضا کی دین ہیں۔اس خاک پر نجانے کتنے حملے ہوئے۔کبھی سکندر، کبھی چنگیز، کبھی تیور، کبھی مانچو، کبھی راون، کبھی ضحاک، کبھی ہسٹنگز، کبھی کلائیو، کبھی ڈائر اور کبھی دیول، الگ الگ رنگ و روپ سے آئے مگر کوئی اس خاک حسین کی خوبصورتی کو ختم نہ کر سکا۔آج بھی ہمارے درمیان، رستم اور ارجن زندہ ہیں۔لیلیٰ، شیریں، ہیر اور شکنتلا کی موجودگی کا آج بھی احساس کیا جا سکتا ہے۔فرہاد کی کوہ کنی آج بھی زندہ و جاوید ہے۔ہم اہل ایشیا مثال خورشید جئے، ادھر ڈوبے ادھر ابھرے۔وادی خیبر سے خوشحال خاں جیسا شاعر پیدا ہوا تھا جس

نے حق کی آواز بلند کی تھی اور جب جب حق کی آواز بلند کرنی ہوگی اُس کی للکار گونج اٹھے گی' نغمے پھوٹ پڑیں گے۔سہادری کے پہاڑوں نے انگڑائی لی ہے۔اس پہاڑی سلسلہ سے تیس صدیوں سے دلیروں کے مورچے لڑتے رہے ہیں۔یہاں کی زمین' ہوا اور پانی سب کچھ امر ہے۔سینکڑوں سالوں کی غلامی نے ہم کو لڑنا سکھادیا ہے۔ہمارے اشک اب گولیوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔سوویت یونین نے سارے مشرق کو اپنی رنگین آغوش میں لے لیا' نجات کا راستہ دکھایا' بادشاہ زادوں کا سر جھکایا' غلاموں کا سر اونچا کیا اور جھنجھوڑ کر ایشیا کو بیدار کیا۔مُردوں کو زندگی کی تحریک دی۔چین کا انقلاب ایشیا کے لیے نجات کا راستہ بن کر آیا۔یوں لگتا ہے اب ایشیا کی سرزمین پر ہاتھوں کا ایک جنگل اُگ آیا ہے جس میں مزدوروں' کسانوں' شاعروں اور کہانی کاروں کے ہاتھ ہیں۔ہم سیاہ' سفید' پیلے' بھورے سب ایک ہوگئے ہیں۔سب ایک ہی دھرتی کے بسنے والے ہیں۔اب نہ کوئی پورپ ہے اور نہ کوئی پچھم۔انسانیت کی جیت ہوگئی ہے۔زندگی نغمہ زن ہے۔ 108

سردار جعفری کے اشعار صبح انقلاب بن کر آتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''آخرش صبح انقلاب آگئی ہے۔ہمارے سامنے اب حیات نو کی منزل ہے اور ہم مسکرا رہے ہیں۔ایشیا کے نوجوان گاؤں گاؤں' شہر شہر بغاوتوں کی چھاؤں میں رواں دواں ہیں۔چین کی فضا کیا بدلی سارے ایشیا میں ہوائے چین کی لہر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ہم مسلسل قدم بڑھائے جارہے ہیں اور جہاں جہاں سے ہمارے قافلے گزرتے ہیں پہاڑ اپنے سر احترام سے جھکا دیتے ہیں۔لگتا ہے اب تو موت بھی حیاتِ تیز گام سے لرزاں ہے۔ہم کہیں تند ہوا بن کر بہے جارہے ہیں تو کہیں گھٹا کی گھن گرج بن کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔کہیں ہمارا روپ آبشار کا ہوتا ہے تو کہیں خزاں و بہار کا البتہ ہم ہر حال میں' ہر رنگ میں فضا پر چھائے ہوئے ہیں اور مسلسل قدم بڑھائے جارہے ہیں 109

سردار جعفری نے سامراجی طاقتوں کے مظالم اور اہل ایشیا کے صبر و استقلال کی طویل داستان بیان کردی ہے۔

بقول محمد حسین پرکار:

''ایشیاء جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی طویل نظم نہیں بلکہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس میں سامراجی طاقتوں کے ظلم و استبداد کی طویل داستان اور اہل ایشیا کے صبر و استقلال' محنت' اپنی مٹی سے پیار اور غربت و افلاس بھری زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ظالموں کو یہ غرور رہا ہے کہ یہاں کی تہذیب اور یہاں کا تمدن اُن کی دین ہے۔اس کے برعکس مظلوموں کو یہ شکایت رہی ہے کہ صدیوں تک پشت در پشت ہماری ہڈیاں پسوائی گئیں اور ظالموں نے اپنے لیے چاندی کے ڈھیر اور سونے کے پہاڑ بنوالیے۔انہوں نے اپنی برتری کے مظاہرے' کہیں فتح صحراب' کہیں لاٹ' کہیں کانسے کے گھوڑے تو کہیں پتھر کے بت بنوا کر کیے۔شاعر کو اس بات کا دکھ کھائے جارہا ہے کہ اس ساری نمائش میں محنت والوں کے کارِ عظیم کی کہیں تصویریں نہیں ہیں۔ان محنت کشوں کی تصویروں سے تو میوزیم سج جانا چاہیے تاکہ ان کے کاموں کو اُن کی محنت کو جاودانی عطا ہو۔سردار جعفری کی یہ نظم اپنے اندر کئی رنگ لیے ہوئے ہے۔حرف اول میں وہ احتجاجی شکل لیے ہوئے ہے اور نعرہ بن کر سامنے آئی ہے۔اس کے بعد کا حصہ بیانیہ کے باوجود ایشیائی تہذیب کی غنائیہ تاریخ ہے۔آگے جاکر وہ تحریک آزادی کا راگ بن جاتی ہے اور رزمیہ کا روپ دھار لیتی ہے اور آخری حصے میں وہ محنت کشوں کی محنت کا ثمرہ ملنے کا گیت بن جاتی ہے اور اپنے ساتھ اہل ایشیا کو لے

کرمنزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نوید صبح میں کھوجاتی ہے''۔ 110

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''ایشیا جاگ اٹھا'' سردار جعفری کے تاریخی شعور سے بھرپور ایک ایسی ہی زندہ نظم ہے جس میں ہندوستان ایران عرب و عراق مصر چین اور روس وغیرہ۔ سب کی تاریخ تہذیب کا استعارہ بن کر قلم بند ہوگئی۔ 111

یہ ایشیا کی زمین تمدن کی کوکھ تہذیب کا وطن ہے/ یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی/ یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رخ سے نقاب الٹی یہیں سے اگلے یگوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا/ اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے/ یہیں سے گوتم نے آدمی کی سمانتا کا سبق پڑھایا/ یہیں سے مزدک نے عدل و انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے...../ ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سُن چکی ہیں/ ہمارا سورج محمد مصطفےٰؐ کے سر پر چمک چکا ہے/ ہمارا ورثہ موہنجوداڑو سے لے کر دیوار چین تک ہے/ ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرام مصر تک ہے۔

رفعت سروش نے لکھا ہے:

''انہوں نے ایشیا جاگ اٹھا'' طویل نظم بھی جیل ہی میں کہی جوان کی شاعری کے انقلابی آہنگ کی امین ہے''۔ 112

نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' میں (88) اشعار پر مشتمل ایک منظوم حرف اول ہے۔ اس کے بعد (775) مصرعے ہیں۔

اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) ''حرف اول میں آزادی ملنے کی خوشی انگریزوں سے خطاب اور انہیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا سے بھاگ جانے کے لیے کہا گیا ہے'۔ انگریزوں کی آمد اور ان کے تعصب اور استحصال کا ذکر ہے۔ یہاں کے عوام کا انگریزوں سے دل جگری کے ساتھ مقابلہ کرنا اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے جیسے واقعات کو بیان کیا ہے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوستان جس طرح بھوک' افلاس' قحط اور مختلف سیاسی اور سماجی استحصال سے دو چار تھا اور اس سے یہاں کے عوام جس طرح نبرد آزما ہوئے' اس کا بڑے انقلابی اور باغیانہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزوں کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ریلوے لائن اور دخانی جہاز وغیرہ کے متعلق سردار نے کہا ہے کہ یہ تمام اشیا انگریز اپنے فائدے کے لیے ہندوستان لائے تھے۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی تہذیب کو سڑا' جھوٹا' زہر اور افیون کی تجارت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آزاد ہندوستان کے ان قومی حکمرانوں کی بھی سخت نکتہ چینی کی ہے جو لندن کی ''جی حضوری'' میں لگے ہوئے تھے۔ ان تمام باتوں کے بعد سردار جعفری پھر اپنے پیارے اور محبوب موضوع سوویت یونین کی تعریف کی طرف آجاتے ہیں اور اسے تمام دنیا کے آنسوؤں کو پوچھنے والا ایسا نظام ثابت کرتے ہیں جو ظلم و ستم مٹا کر نجات کا راستہ دکھاتا ہے۔ عوام کو سوویت یونین سے سبق لینے اور پورے ایشیا کو بیدار ہونے کی تلقین کے ساتھ ساتھ ظلم و بربریت کے خلاف سرکشی پر بھی اتر آنے کی وہ دعوت دیتے ہیں۔ پرانے ظلموں کی داستاں دہرا کر پوری دنیا کو یکجہتی کی دعوت دیتے ہیں۔..... ان نوجوانوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو امن اور شانتی کے لیے اپنے قدم بڑھا رہے ہیں۔..... پوری نظم میں ایشیا کے لوگوں کو ان کی قدیم روایات سے آگاہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے انگریزوں کی ظلم و بربریت کا پردہ فاش کیا ہے۔ نیز آزادی ملنے کی خوشی کا اظہار اور اس پر فخر بھی کیا ہے۔

آزادی کے بعد بھی ہندوستان (ایشیا) پر جس طرح سے لندن، امریکہ اور فرانس کا دبدبہ قائم رہا، اس پر اظہار افسوس کیا ہے۔ پوری دنیا کے مزدوروں کو اتحاد کی دعوت دے کر ان کے خلاف صف آرا ہونے کی بات کہی ہے۔ نظم میں ظلم و بربریت کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے۔ عالمی یکجہتی اور امن کے فروغ نیز حب الوطنی کے جذبے وغیرہ کو بڑے جذباتی اور انقلابی آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے نظم میں جوش، ولولہ، احساس برتری اور پُر امید انبساط و خوشی کا احساس قاری کے دل میں موجزن ہوتا چلا جاتا ہے"۔ 113

(2) اس نظم میں انہوں نے (سردار جعفری) پورے ایشیائی خطے کو بلا تفریق مذہب و ملت اور تمدن متحد ہونے کی دعوت دی ہے تا کہ سامراجیت کے خلاف محاذ آرائی ہو سکے۔ مثلاً جہاں انہوں نے ملایا کہ دلیر حملہ آوروں کا ذکر کیا ہے، وہیں برما کے شیروں کی دہاڑ بھی سنائی ہے۔ جہاں ہندوستان اور پاکستان کے جاگ اٹھنے کی تیاریوں کا بھی ذکر کیا ہے.... یہ واضح کیا ہے کہ وہ دن گئے جب انہوں نے یہاں کا خوب استحصال کیا تھا، اب ایشیاء کے عوام جاگ اٹھے ہیں ۔

یہ ایشیاء کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے/ بڑھائیں اپنی دکان پچھم کے سارے سوداگروں سے کہہ دو/ ہمارے بازار میں لہو کا ذلیل بیوپار بند کر دیں/ کہ ان کی توپوں کے اور مشینوں کے واسطے اب یہاں سے ایندھن نہیں ملے گا/ وہ دن گئے جب/ یہاں تم آئے تھے اپنی ہستی کا کوڑھ لے کر/ زبان پر بائبل تھی ہاتھوں میں رائفل تھی/ لبوں پہ میٹھی ہنسی نگاہوں میں زہر، دل میں ہوس پرستی/ شکاری کتوں کی طرح تم ایشیاء کی بستی میں پھر رہے تھے/ ..... وہ دن گئے جب/ تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھی، ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا/ ..... مگر غلامی نے سینکڑوں سال کی غلامی نے لڑنا سکھا دیا ہے/ ہمارے اشکوں کی بوندیں اب گولیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں/ ..... کہ ایشیا اپنی نیند کی کیفیت سے بیدار ہو چکا ہے/ ہماری آنکھوں میں آگ ..... تیور میں بجلیاں ہیں/ ہمارے سینے میں درد، ہونٹوں پر گیت، ہاتھوں میں رائفل ہے۔

(3) "سردار جعفری کا ماننا ہے کہ زمین پر جو ریل کی پٹریاں بچھائی گئی ہیں اُن کے نیچے ایشیائی عوام کی لاشیں دبی ہوئی ہیں، سمندروں میں رواں دواں دخانی جہازوں میں ایشیائی عوام کی محنت اور دولت لاد لاد کر مغرب لے جایا جا رہا تھا جس سے یہاں کے عوام بھوک، افلاس اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔"

(4) انہوں نے (سردار جعفری) ..... یہاں کے عوام کی بدحالی پر اظہار افسوس کیا ہے جس کے لیے انہوں نے یہاں کے حکمراں جماعت کو ذمہ دار قرار دیا ہے کیونکہ وہ چند سکوں کی خاطر یہاں کی دولت آزادی کے بعد بھی فرانس، امریکہ اور برطانیہ بھیج رہی تھی جس سے ایشیائی عوام کے غریب بچوں کو بھوک کے ناگ ڈس رہے تھے، زبانیں گیہوں کی روٹیوں کے لیے ترس رہی تھیں۔ لوگوں کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ انگلیاں کتابوں سے مس نہیں ہوئی تھیں، سرتکیوں کی لذت سے محروم تھے۔ آزادی کے بعد بھی ہندوستان کے مذکورہ دگرگوں حالات سے سردار جعفری اس قدر خائف نظر آتے ہیں کہ وہ نہایت ہی سخت اور ثقیل الفاظ میں ایشیائی رہنماؤں کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کہاں ہو اے ایشیاء کے بیٹو/ تمہاری ماں اور اس کی عصمت/ فرانس، امریکہ اور برطانیہ کے چکلوں میں بک رہی ہیں/ تمہارے اپنے ہی گھر کے غدار آج دلال بن گئے ہیں/ وہ کون ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟/ .... میں ان کے ناپاک نام سے اپن

فن کی پاکیزگی کو ناپاک کیوں کروں گا/ انہوں نے بھی ایشیاء کی ٹھنڈی ہواؤں میں پرورش ہے پائی/ ہمارے چشموں کا میٹھا پانی پیا ہے چولھوں کی آگ تاپی ہے/مگر یہ کُتے/خود اپنے نمک سے روٹی سے اور پانی سے منحرف ہیں/.....ذلیل اور بے حیا کہ جے چند و میر جعفر کو شرم آئے/حقیر اتنے کہ گندے گھوڑے بھی دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے/ یہ ایشیا کے پرانے ناپاک دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں/تمہیں خبر بھی ہے تم غلاموں کی طرح سے بیچے جا چکے ہو/ .....زبان کھولو/ اور اپنے نیتاؤں' دیسی آقاؤں سے یہ پوچھو/ اگر تم آزاد ہو تو پھر کیوں بندھے ہو لندن کے اصطبل میں/ اگر تم آزاد ہو تو نیویارک اور پیرس کے گندے گھوروں پہ کیوں پڑے ہو؟/ ہماری دھرتی پہ آخر امریکی اور انگریزی لشکروں کے پڑاؤ کیوں ہیں؟ یہ ایشیا کے عوام پر ظلم اور جبر کیوں ہے؟.....

(4) سردار جعفری نے سوویت کمیونزم کی بنیاد پر دنیا کے تمام محنت کشوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا ہے۔

ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو سوویت کمیونزم کی بہارو/ ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو اے عوامی جمہوریت کے ہنستے ہوئے ستارو/ ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو یورپ اور امریکہ کے جواں بخت کام گارو/ہم ایک ہیں ایک ہو گئے ہیں/ سیاہ پیلے سفید بھورے/ ہم ایک فصل بہار کے پھول ایک سورج کی روشنی میں/ ہم ایک دنیا کے مختلف تاراک سمندر کے دل کی موجیں/ الگ الگ پھر بھی ایک ہیں ایک ایک دھرتی کے رہنے والے/ ہم ایک دھرتی کے بسنے والے ہیں ایک انسانیت کے قائل/ نہ کوئی پورب ہے اور نہ پچھم .....

درج بالا یکجہتی کے سبق کے بعد تمام دنیا کے مزدوروں اور کامگاروں کو متحد کر کے سرمایہ داروں اور سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ وقت' وقت سرکشی ہے سر اٹھا رہے ہیں ہم/ یہ صبح صبح انقلاب گیت گا رہے ہیں ہم/نشان فتح آسمان پر اڑا رہے ہیں ہم/ قدم بڑھا رہے ہیں....." 114

راشد آذر نے سردار جعفری کی نظم "ایشیاء جاگ اٹھا" کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"طویل نظم ایشیا جاگ اٹھا" سردار جعفری کی بہت خوبصورت نظموں میں سے ہے۔ یہ نہ صرف فنی اعتبار سے حسین ہے بلکہ صوتی اعتبار سے یہ نہ صرف فکری بلندی کی حامل ہے بلکہ بڑی شاعری کی ایک خوبصورت مثال ہے جس میں تاریخ کا ادراک فکر کی بلندی میں اضافہ کرتا ہے.....سنجیدگی سے زندگی کے نشیب و فراز کے اسباب کے تعلق سے سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے..... یہ نظم.....ہم کو تخلیقی عمل پر اکساتی ہے اور حالات کو بدلنے اور بہتر دنیا کی تعمیر اور بہتر زندگی کی تفصیل کی طرف مائل اور راغب بھی کرتی ہے اور حوصلہ بھی دیتی ہے....."ایشیا جاگ اٹھا" کئی صدیوں کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے..... یہ نظم ایک طرف دلیرانہ احتجاج ہے اس درندگی کے خلاف جس نے انسان پر انسان کے ظلم کو نہ صرف روا رکھا ہے بلکہ اس کا اخلاقی جواز ڈھونڈنے کی شرمناک کوشش کر رہی ہے اور اس کو تہذیب و تمدن کا نام دیتی ہے اور دوسری طرف یہ نظم اس درندگی کو ختم کرنے اور ایک پر امن حسین اور آزاد دنیا کو تعمیر کرنے پر ہم کو اکساتی ہے جس سماج نے انسان کو درندہ بنا دیا ہے اور جس تہذیب نے

اس درندگی کی پشت پناہی کی ہے اس کی تصویر ایسی کھینچی ہے کہ اس کو برہنہ شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے.....اس تہذیب کی تصویر دیکھئے:

تمہاری تہذیب سڑ چکی ہے/تمہارا جھوٹا ''تمدن'' اپنے فریب میں دفن ہو گیا ہے/تمہاری تہذیب قتل و غارت کا ناچ کوڑوں کی راگنی ہے/تمہاری تہذیب بھوکے بچوں کی موت ماؤں کی خودکشی ہے/تماری تہذیب دست کاروں کے خون آلود ہاتھ ٹوٹے ہوئے انگوٹھے/تمہاری تہذیب دھوپ میں سوکھتی ہوئی ہڈیوں کے پربت/تمہاری تہذیب قصر پکینگ کی جلی راکھ کا ہے غازہ/تمہاری تہذیب زہر و افیون کی تجارت/تمہاری تہذیب ایشیا کی زمیں پہ ننگی پڑی ہوئی ہے.....

کہاں ہو تہذیب اور تمدن کی روشنی لے کے آنے والو/تمہاری تہذیب کی نمائش ہے ایشیاء میں/نظر اٹھاؤ قریب آؤ/یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو/یہ دیکھو ہیضے کی قے ہے طاعون کی ہے گلٹی/یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی/جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی سپاہیوں سے/یہ پیٹھ دیکھو/یہ پیٹھ کتنی حسیں ہے جس پر/تمہارے کوڑوں کی بدّیاں ہیں/یہ پھانسیوں پر لٹکتی لاشیں/یہ جیل خانوں میں بند انساں/یہ ہاتھ لکڑی کی طرح سوکھے/یہ پیٹ مٹکوں کی طرح پھولے/دہکتے ناسور چیختے ترنم ریزگتے جسم جیسے کیڑے/تمہاری سرمایہ دار تہذیب کی کہانی سنا رہے ہیں 115

ڈاکٹر وحید اختر لکھتے ہیں:

نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' کی ابتداء اور خاتمہ نظم پابند میں ہے۔بیچ بیچ میں بھی کہیں کہیں قافیہ اور ردیف کی پابندیاں ہیں لیکن بڑا حصہ آزاد ہے۔آزاد نظم کا وہ لہجہ جو انہوں نے ''نئی دنیا کو سلام'' میں دریافت کیا تھا یہاں کچھ اور نکھر گیا ہے۔اس کا آہنگ رجزیہ ہے.....اس نظم میں جعفری نے نئی تشبیہیں اور امیجری استعمال کی ہے۔ 116

کرشن چندر نے ''ایشیا جاگ اٹھا'' کے بارے میں لکھا ہے:

''نظم ایشیاء جاگ اٹھا'' جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی جس میں اپیک کی مثالیت اور غنائی سندرتا ہے۔اس نظم میں ایشیاء کا سارا سجل روپ سمٹ کر سما گیا ہے۔اس نظم میں چار ہزار سالہ تہذیب کی تصویر ہے۔یہاں کی غریبی چیتھڑے پہنے دکھائی دے رہی ہے۔اس کے عوام کی بغاوت کا بے پناہ جذبہ قومی اور ملی احساسات کا سموتا ہوا ایک طوفانی سمندر میں تبدیل ہو گیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سن بلوغ کو پہنچتی ہے جوان ہوتی ہے اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان سربلندیوں کو چھو لیتی ہے جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں: 117

محمد ایوب واقف:

''سردار جعفری کی نظم ایشیا جاگ اٹھا.....میں اور نئی دنیا کو سلام میں فرق ہے۔''نئی دنیا کو سلام'' میں ہند اس کی عظمت اس کی غلامی اور اس کی آزادی اور سامراج کے متعلق جو بھی باتیں ہیں انہیں سردار جعفری نے دو مستقل کردار مریم اور جاوید اور کچھ ذیلی کرداروں مثلاً فرنگی اور نامہ بر وغیرہ کے ذریعہ کہلوائی ہیں اور ''ایشیا جاگ اٹھا'' میں جو کچھ ہے اسے شاعر نے کسی کے ذریعہ نہ کہلوا کر براہ راست کہا ہے....ایک میں صرف ہندوستان کی غلامی و آزادی کا احوال ہے۔دوسرے میں پورے ایشیاء کی غلامی و آزادی کو موضوع کلام بنایا گیا ہے لیکن سامراج سے نفرت حقارت کا جذبہ کم و بیش دونوں نظموں میں پوری شدت سے

جاری وساری ہے'' 118؎

نظم ''اودھ کی خاک حسیں'':

سردار جعفری نے اس نظم کو 1950 ' میں ناسک جیل کی چار دیواری کے اندر لکھی تھی۔

پروفیسر زاہدہ زیدی نے نظم ''اودھ کی خاک حسیں'' کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس نظم (اودھ کی خاک حسیں) کی کچھ نمایاں خصوصیات ''اودھ کی سرزمین'' سے شاعر کی والہانہ محبت' انسانوں سے ہمدردی اور محبت' فطرت سے والہانہ لگاؤ اور نوسٹلجیا کی کیفیت ہیں اور ہر جذبہ خوبصورت اور دلنواز شعری پیکروں میں ڈھل کر سامنے آیا ہے.....اودھ کی خاک حسیں شاعر کے لیے صرف فطرت کے حسین مناظر اور عوامل بھی شاعر کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔اس کے تصور میں ساقیوں کا خرام اور جام و مینا کی گردشیں نہیں بلکہ سیدھی سادی زندگی کے مانوس اور دلکش مناظر ہیں جن میں ماں کے سفید آنچل اور بہنوں کی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ وہ غریب کسان بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوار رہے ہیں.... یہاں ورڈزورتھ کی طرح سردار جعفری نے مانوس مناظر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سادگی کے باوجود غیر معمولی تخیل آفریں اور حیرت زا معلوم ہوتے ہیں.....نظم کے آخری حصے میں انگریزی حکومت کے مظالم اور انقلابی تحریکوں کا ذکر بھی اسی شدومد سے کیا گیا ہے....اودھ کی ''خاک حسیں'' کو سردار جعفری کی شاعری کے دور اول میں ایک خاص مقام حاصل ہے'' 119؎

زبیر رضوی نے اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ نظم (اودھ کی خاک حسیں) بیتے ہوئے میں پھر سے سفر کرنے اس کی تمام تر لطافت' حلاوت' شادابی اور رومانس کو پھر سے اپنی گرفت میں لینے کی غیر معمولی تڑپ سے عبارت ہے۔زنداں کی تنہائیوں میں اپنوں کی' اپنے اسلاف کی' یاروں کی' اپنے شہر' گاؤں کی اس کے موسموں کی' ماں باپ کی شفقتوں اور بھائی بہن کے رشتوں کی' باغی شاموں اور انقلاب آفریں راتوں کی' میخانوں اور میگساروں کی' آزادی کے سورماؤں کی یاد بے حد ستاتی ہے.....اودھ کی خاک حسین کا زندانی نظم کے آخری مصرعوں میں اپنے اس یقین کو دہراتا ہے کہ بھلے ہی سنگ و آہن نے اس کی زباں بندی کردی ہے۔اس کے آگے دیواریں اور سلاخیں گاڑ دی ہیں مگر اس کے دل میں بغاوت اور ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے مضطرب جوالا مکھی کو دبایا نہ جاسکے گا۔اپنی مجاہدانہ صلابتوں پر یہی اعتماد اس پوری نظم کا محور ہے'' 120؎

سید محمود الحسن رقمطراز ہیں:

''ان (سردار جعفری) کے یہاں ہر جگہ آہنگ کا تنوع اور نئے جمالیاتی شعور کا احساس ہوتا ہے۔ان کی اہمیت محض اس دور تک محدود نہیں ہے بلکہ شعریت کے اظہار میں فکری گہرائی کے وہ عناصر بھی شامل ہیں جنہیں آئندہ بھی مقبولیت حاصل رہے گی مثلاً اودھ کی خاک حسیں میں جہاں وہ جاڑوں کی ابتداء کو ہواؤں میں اڑتی ہوئی تتلیوں سے تعبیر کرتے ہیں' ان کی یادوں میں سیاہ رات میں تاروں کی مسکراہٹ دلکشی بکھیرتی ہے' ماں کے سفید آنچل کے سایہ کی یاد قید خانہ میں بے چین کردیتی ہے

وہیں گھروں کے چولھے، چکی، پتیلیاں، توے، آنچل کا حسن یہ سب کچھ ماضی کے جھروکے سے جھانک رہے ہیں" 121

اسلم عمادی نے لکھا ہے:

"سردار جعفری کی نظموں میں سب سے جداگانہ اور اپنے مخصوص لب ولہجہ کے سبب قابل ذکر نظموں میں 'اودھ کی خاک حسین' ممتاز نظر آتی ہے۔ یہ نظم آزاد فارم میں ہے، بلاوجہ کی قافیہ کوئی اور بے سبب وزن کے میزان سے معرا ہے..... یہ نظم ان کی طرف سے (جو قید کی حالت میں ہیں) اہل وطن کے لیے پیغام ہے، ان کی محنت کش اور انقلابی روح کو سلام ہے اور ان سے ایفائے عہد کا ایک پیمان بھی ہے.... وہ سارے سیدھے سادے نیک غریبوں کو "محنتوں کے خدا" اور "تخلیق کے پیمبر" جیسے خطابات سے نوازتا ہے اور اپنی دلیل اور ردوقدح سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ سارا نظام زندگی انہی محنت کش عوام کی ستم زدگی اور رنج ومحن کے اطراف رقصاں ہے بلکہ مرہون منت ہے" 122

راشد آذر لکھتے ہیں:

"اس نظم (اودھ کی خاک حسین) کو پڑھتے وقت ہر ایسی جدوجہد یاد آئی ہے جو مظلوم نے ظالم کے خلاف اپنی جان کی بازی لگا کر کی، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ویت نام میں، چلی میں، کیوبا میں، جنوبی آفریقہ میں اور دوسرے ملکوں میں۔ اس نظم کے تصویری پیکر حقیقت سے اتنے قریب ہیں کہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود ہم بھی اس منظر کا حصہ ہیں۔ یہ نظم یاد کے پیکروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور انتہائی خوبصورت لفظی تصویریں پیش کرتی ہے" 123

اودھ کی خاک حسین کے اشعار

؎ میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو اودھ کی مٹی بلا رہی ہے/ حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہیں/..... ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں/ قدیم گنگا کا پاک پانی زمین کے دامن کو دھو رہا ہے/ وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں/ یہ سیدھے سادے انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں/ یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر/ جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں/ .....لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے/ کمہار کا چاک چل رہا ہے/ صراحیاں رقص کر رہی ہیں/ سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے...../ چمن کے پھولو! چمن میں اک آگ سی لگا دو/ لچکتی شاخو! فضا میں زنجیر بن کے پھیلو/ زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا مکھی اچھالو/ ملوں کے بھیو! بغاوتوں کے ترانے گاؤ/ سحر کی کرنو! اندھیری راتوں کے سر پہ برسو/ عوام کے دشمنوں کا نام ونشاں مٹا دو/ .....مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو/ ابلتے جوالا مکھی کو کوئی دبا سکا ہے/ میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے/ وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے/ مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں۔

لکھنؤ سے سردار جعفری کی محبت کے بارے میں پروفیسر محمود الحسن نے لکھا ہے:

"سردار جعفری کو لکھنو سے جذباتی لگاؤ ایسی محبت تھی کہ اس کی یادوں کو ہمیشہ سینے سے لگائے رہے۔ یہاں تک کہ قید خانہ کی تنہائی میں بھی اس کے تصورات سکون دیتے تھے۔ 124

؎ میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں/ جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں/ اور اس کی شاداب لہلہاتی

ہوئی جبیں کو/ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں۔

راشد آذر رقمطراز ہیں:

''سب سے دردناک حقیقت جس کی طرف سردار جعفری نے اپنی نظم ''بمبئی'' میں اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ فرنگی سرمایہ داروں کے علاوہ ہمارے عوام ہندوستانی سرمایہ داروں کے مظالم سہہ رہے ہیں۔اگر صرف فرنگی ظالم ہوتا تو اس کو پہچاننا آسان تھا' لیکن یہاں تو ظالم کی پہچان بھی مشکل ہے کیونکہ وہ اپنوں میں سے ہے۔آج سماجی اور معاشی رشتے اتنے پُرفریب اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ظالم اور مظلوم کی صفیں مشکوک اور صف آرائی مفاہمت کی پردہ پوشی کے لیے کیا جانے والا تماشا بن کر رہ گئی ہے''۔ 125

ادیب سہیل:

''جدوجہد آزادی میں ان کا (سردار جعفری کا) قلم ہراول بنا ہوا تھا.....تحریک آزادی کے جذبے سے ان کا دل بھی سرشار تھا۔'' 126

نظم ''سامراجی لڑائی' (1940) مشمولہ خون کی لکیر میں سردار جعفری نے دوسری عالمی جنگ کا نقشہ کھینچا تھا اس وقت یہ جنگ شباب پر تھی۔اشتراکی نظریے سے متاثر ہونے کی وجہ سے سردار جعفری نے اس جنگ کو سامراجی لڑائی اور سرمایہ کے پیڑ کا پھل کہا ہے۔

چند اشعار پیش ہیں:

؎ طیارے ہیں پرفشاں ہوا میں/ بمبار گرجتے ہیں فضا میں/توپوں سے دہل رہی ہے دنیا/اک آگ میں جل رہی ہے دنیا/شائستگی حسن کھو رہی ہے/تہذیب کی آنکھ رو رہی ہے/.....میدان ہے جنگ ہے جدل ہے/سرمایے کے پیڑ کا یہ پھل ہے/ شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر/چنگیز و ہلاکو و سکندر/ دنیا ہے کہ تاجروں کی بستی/مہنگی ہے حیات موت سستی/ جاں بیچ کے لڑتے ہیں سپاہی/انسان پہ آ گئی تباہی/یہ ظلم و ستم کا راج کب تک/یہ تختِ شہی یہ تاج کب تک

ڈاکٹر اشفاق حسین نے لکھا ہے:

(1) ''علی سردار جعفری نے ایک نظم سامراجی لڑائی کے عنوان سے کہی ہے۔انہوں نے جنگ کی تصویر پیش کی ہے اس جنگ کی ابتداء سامراجیوں کے درمیان ہوئی تھی۔اس کے نتیجے میں آسمان پر جنگی طیارے منڈلا رہے ہیں۔توپوں سے گولے برسائے جا رہے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا خوفزدہ ہے۔تہذیب و تمدن کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔سامراجیوں نے جو تباہی مچا رکھی ہے اس کو دیکھ کر چنگیز' ہلاکو اور سکندر بھی شرما جائیں۔فوجی جوان اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں جس سے انسان کی جان کی قیمت کچھ بھی نہیں رہی ہے۔آگے فرماتے ہیں کہ سامراجیوں کا یہ کھیل زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے''.....

(2) اپنی ایک دوسری نظم میں جنگ کی بربادیوں اور تباہیوں کا ذکر کیا ہے۔یہ بھی دکھایا ہے کہ جنگ کی بدولت کس طرح دنیا کا امن و امان اور تحفظ جان و مال خطرے میں پڑ رہا ہے۔زندگی موت کے پنجوں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔بنی نوع انسان پر خوف و ہراس طاری ہو رہا ہے۔جنگ سرمایہ داروں اور سامراجیوں کے حرص و آز کا نتیجہ ہوا کرتی ہے جو کمزوروں پر اپنا تسلط اور اقتدار برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ ظلم و ستم کا ناچ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گا اور سامراجیت ختم ہو کر رہے گی۔ 127

؎ ویراں ہیں ساری رقص گاہیں/ چوروں سے بھری ہوئی ہیں راہیں بے رنگ/ ہے رنگ حیاتِ زندگانی/ بے کیف شباب ہے جوانی/ میدان ہے جنگ ہے جدل ہے/ سرمایے کے پیڑ کا یہ پھل ہے/ شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر/ چنگیز و ہلاکو و سکندر/ دنیا ہے کہ تاجروں کی بستی/ مہنگی ہے حیات و موت سستی/ جاں بیچ کر لڑتے ہیں سپاہی/ انساں پہ آ گئی تباہی/ یہ ظلم و ستم کا راج کب تک/ یہ تختِ شاہی یہ تاج کب تک۔

نظم ''جنگ اور انقلاب (مشمولہ خون کی لکیر) سے متعلق عمر رضا نے لکھا ہے:

''یہ ایک ایسے وقت کی تخلیق کردہ نظم ہے جب دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی شباب پر تھی اور مجاہدین آزادی کو جنگ مخالف نعروں کے سبب قید و بند کی صعوبتوں کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول تھا اور انگریزوں کی تمام تر قوت جنگ میں مصروف ہو رہی تھی۔ سردار نے اسے موقع غنیمت جان کر انگریزوں کے خلاف شدید جدوجہد کرنے کے لیے عوام کی توجہ مرکوز کی اور نظم میں اس وقت کے تمام حالات کو پیش کرتے ہوئے عوام کو انقلابی رنگ میں رنگ جانے کی دعوت دی ہے۔ 128

؎ رقص کر اے روح آزادی کہ رقصاں ہے حیات/ گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات/ زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہے/ کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے/ اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ/ چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے رنگ/ .....موت ہنس کر دیکھتی ہے آئنہ تلوار میں/ زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجدھار میں/ .....ہل چکا ہے تختِ شاہی گر چلا ہے سر سے تاج/ ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج/ ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے قاروں کی چھاؤں/ مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں/ انقلاب دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ/ وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ/ .....غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں/ خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں/ .....روح آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون/ ناچتی سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون۔

گوالیار: (مشمولہ خون کی لکیر)

جنوری 1946 کی تحریر کردہ نظم ''گوالیار'' میں بغاوت اور انقلاب کا سیلاب نظر آتا ہے۔ اس نظم کو سردار جعفری نے ایک گیارہ برس کے بچے کے نام منسوب کیا ہے جس نے پہلی گولی اپنے سینے پر کھائی تھی۔ خاص طور پر انگریزی حکومت کے تحت کام کرنے والے ان دیسی حکمرانوں سے سردار جعفری نے اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا ہے جو انگریزوں کے اشاروں پر ہندوستانیوں کا خون بہانے پر ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ نظم کے ذریعے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کو جوش و ولولہ، عزم و حوصلہ اور انقلاب و بغاوت کے لیے سرگرم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈھلے ہیں ان کے بازو کارخانوں میں بغاوت کے/ تپا کر زندگی کی آگ نے ان کو نکھارا ہے/ وہ کچلا جا نہیں سکتا تشدد کے ہتھوڑوں سے/ ہمارے جوش آزادی نے جو جذبہ ابھارا ہے/ ابھی ہندوستان میں اور انگارے دہکتے ہیں/ گوالیر میں جو بھڑکا ہے وہ پہلا شرارہ ہے/ غلامی کی اندھیری رات میں شعلہ لپکتا ہے/ شہیدوں کا لہو رنگ شفق بن کر جھلکتا ہے۔

ملاحوں کی بغاوت (مشمولہ خون کی لکیر):

فروری 1946 میں رائل انڈین نیوی کے جہازیوں نے بغاوت کردی تھی جس کے سبب انگریزی فوج اور پولیس کے ساتھ ہوئی جھڑپ میں تقریباً تین سولوگ ممبئی میں ہلاک ہوگئے تھے۔اس واقعہ سے متاثر ہوکر سردار جعفری نے اسی سال اسی مہینے میں ایک نظم ''ملاحوں کی بغاوت'' تخلیق کی جس میں عزم وحوصلے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی ظلم وزیادتیوں اور رہبر قوم کی ناکارہ سیاست پر کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کریں:

؎ بمبئی تیرے شہیدان محبت پہ سلام/مر کے جو دے گئے ہم سب کو بغاوت کا پیام/دیکھنا ہند کی تقدیر بدل جائے گی/سر بکف اترے ہیں میدان سیاست میں عوام/کوہساروں کی چٹانوں سے کہو ہٹ جائیں/تم سے رکنے کا نہیں موجۂ دریا کا خرام/مرد آزاد کو ہے جام شہادت کی تلاش/اور غلاموں کے مقدر میں فقط مرگِ دوام/...../جن میں لڑنے کی سکت ہے نہ ہے مرنے کی امنگ/وہ یہ کہتے ہیں کہ کافی ہے فقط زور کلام/رہبر قوم کی ناکارہ سیاست کے طفیل/آج بھی ہم ہیں فرنگی کی حکومت کے غلام/مل کے چہرے پہ اٹھو خون شہیدان وطن/توڑ دو بڑھ کے شہنشاہ پرستی کا نظام۔

ڈاکٹر درخشاں تاجور رقمطراز ہیں:

''نظم'' ملاحوں کی بغاوت'' میں سردار جعفری نے باغی جہازیوں اور میدان سیاست میں اترنے والے سربکف عوام سے اپنی عقیدت وارادت کا اظہار کیا ہے.....کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جہازیوں کی بغاوت پر نکتہ چینی کی تھی اور باغیوں پر ہتھیار ڈالنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔غالباً ان قائدین کو کیبنٹ مشن کی آمد کے اعلان سے امیدیں وابستہ ہوگئی تھیں جو ہندوستان کی صورت حال پر غور کرنے اور قانون ساز مجلس کے قیام اور ملک کے اہم سیاسی جماعتوں کے تعاون سے انتظامیہ کونسل (Executive Council) کی تشکیل میں مدد کرنے کی غرض سے آرہا تھا اور جس کا اعلان ممبئی میں بغاوت شروع ہونے کے دوسرے ہی دن یعنی 19 رفروری 1946 کو برطانوی پارلیمنٹ میں کیا گیا تھا۔جہازیوں کی بغاوت کے سلسلے میں قومی رہنماؤں کے اس طرز عمل کو اردو کے ان شعرا نے پسند نہیں کیا جنہیں یہ یقین تھا کہ بغاوت کا یہ طوفان برطانوی حکمرانوں کے اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا'' 129

نظم ''خواب'' (مشمولہ ''خون کی لکیر 1949) میں جدوجہد آزادی کی تاریخ' آزادی ملنے پر جشن اور قومی حکمرانوں کو شہدائے آزادی کی قربانیوں کا احساس دلایا گیا ہے۔

اس نظم کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے

(1) نظم ''خواب'' میں سردار جعفری نے مختلف تلمیحات کے سہارے ہندوستان کی جنگ آزادی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے قومی وبین الاقوامی دونوں حالات کی منظر کشی کی ہے اور جن محنتوں اور مشقتوں کے بعد ہندستان آزاد ہوا' اس کی بھی وضاحت کی ہے۔مثلاً سب سے پہلے انگریزوں کے دور حکومت میں ہوئے جبر وظلم کو بڑے موثر ڈھنگ سے

پیش کیا ہے جس کے لیے مختلف تشبیہات' استعارات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے..... پوری نظم آزادی کا جشن مناتی نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان مجاہدین آزادی کی شہادت کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے آزادی کو خون سے سینچا تھا چنانچہ قومی حکمرانوں کو ان کے خون کی یاد دلاتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں''۔

آج دلی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں۔اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا ہے/ جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے/ .....تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے' خوابوں کی تعبیر ہے/ آرزوؤں کی تصویر ہے/ تیرے چہرے پہ میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں/ جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں/ یہ اشوک اور اکبر کے عہد حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے/ بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے/ روٹیوں کے لیے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں/ کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کی خاطر کھڑے ہیں/ ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ/ یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں/ تیرے ہندوستان کے بہادر سپاہی ہیں جو/ انقلاب اور بغاوت کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں/ ..... تیری آزادی کے پاسباں ہیں/ یہ انہیں کی رگوں کا لہو ہے/ ان کے سینے کا خوں ہے/ تیرے ماتھے پہ جو آج رنگ شفق/ اور ہتھیلی پہ رنگ حنا بن گیا ہے

''سردار جعفری ہندوستانی عوام سے مخاطب ہیں۔آزادی کی خوشی سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے وہ خود بھی اپنی خوشی کا کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

جاگ ہندوستاں اپنے خواب گراں سے/ دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے/ تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آرہے ہیں/ یہ غلامی کی زنجیر توڑ آئے/ قید خانوں کے در کھول آئے/ اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھالے/ اپنے دل میں بٹھالے/ ..... پرچموں سے کہو کھل کے انگڑائیاں لیں/ فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں/ فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں/ توپیں جمہوریت کی سلامی اتاریں/ سینۂ بحر سے شاہی جھنڈے ہٹا کر/ اپنے جمہوری اور اشتراکی پھریرے اڑائیں۔

(2) ''سردار جعفری نے ہندوستان کے ذرے ذرے کو آزادی کا جشن منانے کی دعوت دی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں بچے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں/ مائیں آشکوں میں بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں/ دیویاں مانگ میں اپنی سیندور بھرلیں/ بیبیاں اپنے ماتھوں پہ افشاں لگائیں/ اجنتا کی شہزادیاں اور ایلورا کی پریاں ناچیں/ وادیاں مسکرائیں/ کھیتیاں لہلہائیں/ کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں/ کانیں اپنے خزانوں کے در کھلو دیں اور ہندوستان کے قدم پر اپنے تمام لعل و جواہر کو نچھاور کریں وغیرہ.....اس سے ماحول میں خوشی کا ایک سماں بندھ جاتا ہے۔امنگیں جوش وولولہ اور خوشی سے ناچنے لگتی ہیں۔

(3) نظم ''خواب'' میں ہندوستان کے دور غلامی سے لے کر صبح آزادی تک کی داستان کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے لیے خود کلامی کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے.....سردار جعفری نے آزادی سے قبل ڈیڑھ سو سال تک انگریزوں کے ظلم و جبر کی خون بھری داستانوں اور اس دوران دنیا میں جو نشیب و فراز آئے ان کو بیان کیا ہے مثلاً بادشاہوں کی جنگی حکایات' انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے' بابل' نینوا کے کھنڈرات' مصر کے سر پھرے اور مغرور فرعون جو خدا بن کے انسانوں کو لوٹا کرتے تھے۔ خونخوار تاتار' چنگیز و تیمور اور روس کے زار وغیرہ۔اس کے بعد ہندوستان کے سینے پر جس طرح کے ظالم فرنگی مسلط ہو گئے تھے' اس کو یاد کیا ہے جن کے سبب ہندوستان ایک زخمی پرندے کی مانند ڈیڑھ سو سال تک پھڑ پھڑاتا رہا لیکن اس کے ساتھ ہی سردار

جعفری نے یہ بھی بتایا ہے کہ اب ان سب کا خاتمہ ہو چکا ہے اور صرف ان کے مظالم کی اک خوں بھری داستان باقی رہ گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں آزادی کی خوشی اور اس کے بعد کے ہندستان کی جو خصوصیات ہونی چاہیے اس پر خامہ فرسائی کی گئی ہے..... سردار جعفری نے اس وقت کے ہندوستانی مطالبات کو بھی منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے مثلاً روٹیوں کے لیے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور کپڑوں کی خاطر ننگے بدن عوام کھڑے ہیں۔ان کے متعلق سردار جعفری کا کہنا ہے کہ انہیں نفرت اور حقارت سے مت دیکھو یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں ہندوستان کے بہادر سپاہی ہیں جو انقلاب اور بغاوت کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں۔تیسرے حصہ میں ہندوستان کو خواب گراں سے جاگنے' آزادی کی صبح کے پھیلے نور کو دیکھنے اور ان مجاہدین آزادی کو اپنے آغوش میں لینے کو کہا گیا ہے جنہوں نے اسی صبح کی خاطر قید خانوں کی صعوبتوں کو برداشت کیا تھا۔علاوہ ازیں اس نظم کے ذریعہ تقریباً تمام ہندوستان کی سیر کرائی گئی ہے جس کے تمام ذرّے ذرّوں میں اب آزادی کی خوشی کی لہر دوڑ آئی ہے.....نظم کے اخیر میں ان مزدوروں' کسانوں اور مجاہدین آزادی کی اہمیت واضح کی ہے جنہوں نے اپنے لہو کے بدلے صبح آزادی حاصل کی۔نظم میں چونکہ آزادی کی خوشی کا اظہار ہے اس لیے اس میں تلخی اور بغاوت نہیں ہے بلکہ جشن آزادی کے اظہار کے لیے سردار جعفری نے وطن کو شراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس صبح آزادی کو حاصل کیا تھا۔ 130

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''خواب سے جو نظمیں شروع ہوتی ہیں وہ تقسیم ہند اور اس کے پیدا کردہ مسائل سے متعلق ہیں۔ جب 15/ اگست 1947 کو ہندوستان تقسیم کے بعد آزاد ہوا تو لوگوں کے دلوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑی۔کانگریس چونکہ اس وقت تک بیرونی سامراج کے خلاف عوام کی تحریک آزادی کی قیادت کر رہی تھی اس لیے اس کے مختلف عناصر کا تضاد واضح نہیں ہوا تھا اور لوگوں کو اس سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔آزادی کا سب سے پہلا انعام ہمیں قتل و غارت کے ایک ہولناک سلسلے کی شکل میں ملا جس کی مثال انسانیت کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔آزادی کے جشن پر جو نظمیں عام طور پر لکھی گئی تھیں' ان میں رقص و مستی اور انبساط و نشاط کی ایک لہر تھی جو ذرا اس جشن و جلوس کے ہنگاموں سے آگے دیکھتے تھے۔ان کی نگاہیں ان تماشوں سے گزر کر ایک عوامی جنت اور صالح جمہوری نظام پر پڑتی تھیں''131

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی نے سردار جعفری کے خواب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انہوں نے (سردار جعفری) ایک نئی دنیا کا خواب دیکھا تھا۔ایسی مثالی دنیا جس میں حق و انصاف کی حکمرانی ہو جہاں جور و ستم' ظلم و جبر' استبداد و استحصال کا وجود نہ ہو' جہاں ہر طرف محبت اور خوش حالی کا دور دورہ ہو۔ان کی نظمیں ایک خواب اور نئی دنیا کو سلام' انہی جذبات کی غماز ہیں'' 132

سردار جعفری کے پہلے مجموعہ کلام ''پرواز'' (مطبوعہ 1944) میں سب سے نمایاں نظم بغاوت ہے۔

رفعت سروش کے مطابق ''اس نظم میں پرانی تہذیب' سرمایہ داری' اساطیری انسانوں' موجودہ حکومت' مسخ شدہ مذہب' ہر چیز سے بغاوت کا اعلانیہ ہے۔بغاوت صرف انسان سے نہیں ہے۔ترانۂ بغاوت کو وہ عصر حاضر کا ترانہ قرار دیتے ہیں'' 133

ڈاکٹر یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''وہ (سردار جعفری) سراپا بغاوت تھے۔ موضوعات اور اسالیب دونوں اعتبار سے ان کی بغاوت میں سرمایہ داری، سماجی نابرابری اور جبر کی طاقتوں کو پامال کرنے کا ایک تعمیری جذبہ کارفرما ہے''۔ 134

(4) نظم ''بغاوت'' میں سردار جعفری نے لفظ ''بغاوت'' کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کا ہر مصرع لفظ بغاوت سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے مذہب، دیوتا، پیغمبر اور خدا کو 'بغاوت'' سے تعبیر کیا ہے اور رسم چنگیزی، تہذیب تاتاری جبر و استبداد، سرمایہ داری، سرسوتی، لکشمی، بھیم و ارجن، دیوی دیوتاؤں کے تمدن، وہم کی پابندیوں، قید ملت ..... بوالہوس، ابلیس سیرت، پارساؤں، زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں، عہد پارینہ کی رنگین داستانوں، آزادی کی نعمت کھونے و سیاست، سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں، مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں، درد سہنے، درد اٹھانے غرض انسان کے علاوہ سارے زمانے سے وہ بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔

اس نظم کے صرف آخری چار اشعار ملاحظہ کریں:۔

بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے/ بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے/ بغاوت سخت پتھر کی طرح
بے حس خداؤں سے/ بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں سے/ بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے/ بغاوت ہاں بجز
انسان کے سارے زمانے سے/ بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے/ بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے۔

مذکورہ بالا نظم میں مارکسی اور اشتراکی نظریہ پورے شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے ..... ملک کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی اور ترقی پسند تحریک ان سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زیر اثر لکھنے والے شاعر و ادیب اپنی شعری و نثری تخلیقات کے ذریعے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ نیز اشتراکیت، مزدوروں، کسانوں اور مجاہدین آزادی کی حمایت کر رہے تھے۔

خلیق انجم رقمطراز ہیں:

''سردار کی لڑائی صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ اُن سرمایہ داروں کے خلاف تھی جو ہر زمانے اور ہر خطۂ زمین پر انسانیت کے دشمنوں کے روپ میں موجود تھے اور ان کے خلاف بغاوت سردار کا ایمان تھا۔ 135

؎ بغاوت عزت و پندار نخوت کی اداؤں سے/ بغاوت بوالہوس ابلیس صورت پارساؤں سے/ بغاوت اپنی آزادی کی نعمت
کھونے والوں سے/ بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے/ بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے/ بغاوت
ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

''ہندوستان کی تحریک آزادی کو تیز کرنے اور ملک کے عوام و خواص کے جذبات کو ابھارنے میں جہاں دوسرے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ہاتھ ہے وہیں سردار جعفری کی بھی بڑی خدمتیں ہیں۔ ان کی نظموں نے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ساتھ عام شہریوں اور باشندگان ملک کو آزادی کی اہمیت سمجھائی اور غلامی کی لعنت آشکارا کر دی۔ نتیجتاً ملک میں انقلابی

کوششیں تیز تر ہو گئیں اور ہمارا ملک انگریزوں کے سامراجی شکنجے سے آزاد ہوا اور جب ملک آزاد ہوا تو جعفری نے اس آزادی کے موقع پر بڑی ولولہ انگیز نظم لکھی۔

اس کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے:

؎ ناگہاں شور ہوا/ لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آ پہنچی/ بربطِ وطاؤس نے انگڑائی لی/ اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں/ کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول/ لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے/ راہ زن ہار گئے/ راہ رو جیت گئے 136

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے کہ ''ترقی پسند تحریک سے قبل عورت زینت بزم تھی' ترقی پسند تحریک نے اس کو رزم میں مرد کی رفیق و دمساز بنا دیا۔ عورت کا یہ کردار ہر اعتبار سے ترقی پسند شاعری کی دین ہے کیونکہ اقبال نے جہاں اپنی ترقی پسندی کے باوجود عورت کا کوئی نیا تصور پیش نہیں کیا اور جوش نے اپنی ساری ترقی پسندی کے باوصف عورت سے انصاف نہیں کیا۔ اس کا گلہ ترقی پسندوں کو ہے ہی۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض کے ہاں کسی قدر لیکن مجاز' کیفی اور سردار جعفری کے ہاں عورت کا تصور کچھ اور ہی ہے۔ قطعی نیا! سردار جعفری کا تصور عورت ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں نکھرے ستھرے روپ میں ہے۔ مریم کے روپ میں یہ ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ وہ جاوید کی صرف خلوت کی نہیں جلوت کی بھی ساتھی ہے۔ وہ محبت کی مسند پر حسن و جوانی ہے اور انگریز سامراج کے خلاف مرد کی ہم آواز ہو کر احتجاج کرنے والی وہ اپنے محبوب کی جدائی کے باوجود اس کی قربانیوں پر فخر کرتی ہے کہ وہ وطن کے حق میں انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کر کے پھانسی کی سزا پاتا ہے'' 137

ڈاکٹر شمیم رضوی رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند شعراء نے جمالیات کا ایک نیا تصور دیا۔ اردو شاعری کا مزاج بدلا' نئی پیکر تراشی اور نئی شعری جمالیات کی تشکیل کی۔ انہیں محبوب کے لب و رخسار کے بجائے وہ عورت زیادہ حسین نظر آتی ہے جو کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کو نمودے رہی ہے''۔

ڈاکٹر کوثر مظہری:

ترقی پسندوں کا نظریہ یہ تھا کہ مزدوروں کے بعد اس روئے زمین پر سب سے زیادہ مظلوم و مہتور عورت ذات رہی ہے.....ترقی پسندوں نے عورت کو اپنے حقوق اور سماجی انقلاب کے لیے تیار کیا۔ 138

سردار جعفری کی شاعری میں عورت کی تقدیس پر بہت سے نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے سردار جعفری کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''مصرع ''مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے'' کہہ کر مریم' عورت کو تقدیس کی ایک ایسی منزل میں لے جاتی ہے جہاں مرد اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ پھر مریم' عورت کی امیج کو مزید بلند کرتی ہے جو ایک کائناتی امیج بن جاتی ہے۔ عورت کی یہ تصویر ہندوستانی بھی ہے اور مدتوں تہذیب کی ہوئی زندگی سے بھی آئی ہے جس میں سامی' ایرانی اور ترک تہذیبوں کی رنگ آمیزی ہے۔ اس تصویر میں عورت پیر کی جوتی سے اوپر اٹھ کر حرم سرا کے رنگین شبستانوں سے گھومتی ہوئی' اپنے محدود احترام یافتہ تجربوں سے باہر نکلتی ہے اور مارکسی تصور کے ساتھ آ کر مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ عورت کے اس تصور میں اس

کی تاریخی اور تہذیبی دونوں تصویریں مل کر نئے ہندوستان کی نئی عورت کی .....طرف ہندوستان کی نئی بنتی ہوئی تہذیب کا تقاضہ شامل ہے.....مریم' سماجی طور پر آزاد اور سیاسی فکر سے مسلح' ایک مثالی عورت بن جاتی ہے'' 139

پروفیسر کوثر مظہری رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے عورت کی تقدیس اور حرمت کو سمجھا''..... جہاں تک عورت کی تقدیس کا سوال ہے سردار کی نظم'' نومبر میرا گہوارہ'' دیکھی جاسکتی ہے۔ماں کا تصور تو شاید انسانی تہذیب کا مرکزی کردار ہے بلکہ اساس کہنا چاہیے۔شاید اسی مناسبت سے کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔اس طرح اگر غور کریں تو سردار کی ذہنی پرداخت وساخت میں کہیں نہ کہیں اسلامی رموز وافکار کا ہاتھ بھی ضرور رہا ہے۔عورت کی تعظیم وتکریم مشرقی تہذیبی رویے کی اہم کڑی ہے۔ 140

نظم دیکھئے۔

میری ماں/اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی/ ننھے سے کھلونے کو/مری حیرت کی آنکھیں/اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں/جس آئینے میں/پہلی بار میں نے اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا/وہ چہرہ کیا تھا/سورج تھا' خدا تھا یا پیمبر تھا/کہ اس چہرے سے بڑھ کر خوبصورت/کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا/کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا/جو اپنے دل کے خوابوں/پیار کی کرنوں سے روشن تھا۔

سردار جعفری نے اپنی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں عورت کے فعال کردار کو اجاگر کیا ہے۔

اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر علی جاوید رقمطراز ہیں:

''اس نظم (نئی دنیا کو سلام) میں مریم ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو زندگی کی دوڑ میں ہر قدم پر اپنے شوہر کے ساتھ ہے.....وہ سماجی حقائق سے آنکھیں ملا کر تمام مسائل کا مقابلہ کرتی ہے۔برطانوی حکمرانوں کی طرف سے جاوید اور مریم پر بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے۔فرنگی مریم سے پوچھتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے تو وہ کہتی ہے کہ جب سے فرنگی آئے ہیں' گھر کی ساری برکتیں اٹھ گئی ہیں۔

وہ کہتی ہے۔

تم نے پھولوں کو کھلنے' ہواؤں کو چلنے سے روکا/تم نے چشموں کو بہنے سے' فواروں کو رقص کرنے سے روکا/اور دریاؤں میں زہر گھولا

جاوید کہتا ہے۔

پھر بھی تم امن وتہذیب واخلاق کا نام لے کر/اک نیا جال پھیلا رہے ہو/ساری دنیا کو بہکا رہے ہو برطانوی حکومت کی طرف سے جاوید کو پھانسی اور مریم کو قید کی سزا سنانے پر مریم کہتی ہے:

ایسے ایوان عدل وصداقت پہ لعنت/ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

جاوید کو موت کی سزا ہونے پر مریم کو اس بات کا ملال ہے کہ اس کو بھی جاوید کی طرح اپنی جاں نثار کرنے کا موقع کیوں نہیں ملا۔وہ تمنا کرتی ہے کہ کاش میرا لہو بھی کام آتا۔اس کی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں ہے بلکہ انقلاب کی خاطر قربانی کا جذبہ ہے۔کبھی جاں اور کبھی تسلیم جان ہے۔زندگی میں یقین رکھنے والا جاوید مریم کو سمجھاتا ہے۔خدمت ملک وقوم کے طریقے

صرف جان دینے کے نہیں بلکہ اور بھی ہیں۔یعنی مریم کے سامنے آج سب سے بڑا انقلابی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی کوکھ میں پل رہے اس روشن مستقبل کو جنم دے اور اس کی پرورش کرے کیونکہ ؎

کل کا انداز کچھ اور ہوگا/ بزم میں اک نیا راگ ہوگا/ جنگ ہوگی نہ پیکار ہوگی/ تو مسرت سے سرشار ہوگی وہ مستقبل کے ہندوستان میں کارخانوں سے نغموں کے طوفان کی آمد اور غریبوں کے سوکھے زرد چہروں پر زندگی اور آسودگی کا رنگ دیکھتا ہے۔ پھانسی پر چڑھتے وقت مریم کو ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے لیکن جاوید اس کو ڈھارس بندھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس اندھیرے کے پیچھے ایک نیا سویرا چھپا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ مریم اہل وطن کو یہ بتائے کہ مرتے وقت اس کے چہرے پر موت کا خوف نہیں تھا اور یہ منظر ہمیں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی یاد دلاتا ہے۔'''' 141

ڈاکٹر نیر جہاں نے علی سردار جعفری کی شاعری میں عورت کے تصور پر اظہار خیال ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

(1)''ان کے (علی سردار جعفری) کے یہاں عورت 'مرد کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا محض ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر مرحلہ اور مقام پر وہ مردوں کی ہم سفر اور شریک کار ہے۔عیش ونشاط کی گھڑیوں میں وہ بہترین رفیق ہے اور میدان کارزار میں بھی مردوں کی معین ومددگار ہے۔عورت کے بغیر مرد کی ہر کوشش' کوشش ناکام اور ہر جدوجہد خام ہے.....انہوں نے اپنی شاعری میں بیوی کا ذکر جس خوبصورت انداز میں کیا ہے اس کی مثال اس سے قبل اردو شاعری میں شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔ ان کا یہ اقرار کتنا دلچسپ ہے کہ ؎ ہر عاشق ہے سردار یہاں؛ ہر معشوقہ سلطانہ ہے''۔

(2)''سردار جعفری کی شاعری میں جہاں محبوبہ اور بیوی کی تصویر ہے' وہیں ماں کا کومل روپ بھی موجود ہے۔ان کی طویل نظم ''نومبر میرا گہوارا'' میں ماں کے لئے کتنے خوبصورت جذبات نظر آتے ہیں۔ملاحظہ فرمایئے'': ؎

وہ چہرہ کیا تھا/ اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی/ ننھے سے کھلونے کو/ مری حیرت کی آنکھیں/ اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں/ جس آئینے میں پہلی بار میں نے/ اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا/ سورج تھا' خدا تھا یا پیمبر تھا/ کہ اس چہرے سے بڑھ کر خوبصورت/ کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا/ کہ وہ ایک ماں کا چہرہ تھا/ جو اپنے دل کے خوابوں/ پیار کی کرنوں سے روشن تھا (میری ماں)

(3) ہندوستان کی تحریک آزادی میں متوسط طبقے کی عورتوں کے علاوہ کسان اور مزدور عورتیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ دوسرے ترقی پسند شعراء اور خود سردار جعفری کی ان عورتوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔گردش افلاس کی آغوش میں پلی بڑھی اور سختی آلام کے سانچے میں ڈھلی یہ مظلوم اور مقہور عورتیں پھاوڑے جن کے ساتھی اور کدال جن کی سہیلی ہے' ایک دن تاریخ کی پیشانی پر ایک نیا باب مرتب کریں گی۔

اپنی نظم ''مزدور عورتیں'' میں پورے یقین واعتماد کے ساتھ سردار جعفری کہتے ہیں:

؎ ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور/ توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے خیالوں کے غرور/ ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں کے شرار/ یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساط روزگار/ بن کے قوت ایک دن ابھرے گی صدیوں کی تھکن/ دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن۔

(4)''سردار جعفری کی طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام''ان کے عورت کے بارے میں نظریہ کی بھرپور غمازی کرتی ہے۔ وہ عورت کی عظمت اور تقدس کے دل سے قائل ہیں۔ان کے خیال میں عورت اور مرد دونوں ایک کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل کو باہمی پیار و محبت سے حل کر سکتے ہیں۔کائنات کی تمام تر رنگینیاں دونوں کے دم سے قائم ہیں۔جاوید اور مریم نظم کے مرکزی کردار ہیں۔جاوید ایک انقلابی شوہر اور مریم اس کی شریک کار بیوی ہے۔دونوں اپنی منظم اور تعمیری کوششوں سے معاشرے کے دکھ درد اور مسائل کو حل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔علی سردار جعفری مریم کی زبانی عورت کی عظمت کو سلام کرتے نظر آتے ہیں:

کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت/کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت/وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے/کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے/تبسم نہیں صرف تلوار بھی ہے/وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے/محبت کی مسند پہ حسن و جوانی /شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی /وہ شمع شبستاں ہے نور سحر ہے/وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے''

(5)''مریم کے رخ روشن سے پھوٹتی ہوئی روشنی جاوید کی دنیا میں اجالا بکھیر دیتی ہے۔گریہ وزاری اس عورت کا شیوہ نہیں،اپنی تقدیر کا ماتم اسے پسند نہیں۔اس میں ایک نئی امنگ،ایک نیا جوش ہے،اگرچہ وہ نسوانی خصوصیات کی مالک ہے لیکن سوچ انقلابی ہے،فکر روشن ہے،ذہن زرخیز ہے،حوصلے جوان ہیں اور ایک جہان نو کی تعمیر اس کا نصب العین ہے....اس پر انکشاف ہو چکا ہے کہ انسانی آزادی ایک قیمتی شئے ہے اور اس آزادی کے حصول و بقا کے لیے اسے اپنے شوہر کا ساتھ دینا ہے.....

میرے سر میں آخر بھی جنوں ہے/میری نبضوں میں بھی گرم خوں ہے/موت کا مجھ کو پیغام آنا/کاش میرا لہو کام آنا۔

جاوید اپنی وفا شعار اور وطن پرست بیوی کے جذبات سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

سرخ رو ہوگی اک روز تو بھی/کام آئے گا تیرا لہو بھی/یوں گزرنا ہی سب کچھ نہیں ہے/صرف مرنا ہی سب کچھ نہیں ہے/ اور بھی ہیں بہت سے طریقے/خدمت ملک و قوم و وطن کے۔

(6)''سردار جعفری کی شاعری میں عورت کا ایک حقیقت پسندانہ پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ان کے ہاں عورت کا تصور لبریشن کا تصور ہے۔یہاں عورت کوئی کھلونا نہیں زندہ جسم اور بیدار ذہن کی مالک ہے۔سماج کی تعمیر میں اس کا اہم حصہ ہے۔ مردوں کی کامیابی اس کی رہین منت ہے۔زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا عمل اس کے وجود کے سہارے سہل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے علی سردار جعفری عورت کو فردا کی امید اور انقلاب کی نقیب قرار دیتے ہیں'' 142

ترقی پسند شاعروں کا اپنی محبت اور محبت سے گریز کی وجوہات اور اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے عقیل احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند شاعروں نے اکثر ذاتی زندگی کے تجربات کے اظہار سے اکثر گریز اختیار کیا ہے۔مثال کے طور پر عشقیہ شاعری کو لیجئے۔بیشتر عشقیہ شاعری کا تعلق فرد کے داخلی جذبات سے ہے۔ترقی پسند شاعروں میں سے اپنے شعری سفر کے آغاز میں ہلکی پھلکی عشقیہ نظمیں لکھتے رہے ہیں.....جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اس وقت یہ شعراء شعوری طور پر عشق و محبت

کے اظہار سے گریز کرنے لگے اور اپنے محبوب سے یا تو معذرت کرلی کہ ان کے ذمہ ایسی سماجی ذمہ داریاں ہیں جو عشق سے زیادہ اہم ہیں یا پھر اپنے محبوب سے تمنا کی کہ وہ بھی سماجی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے اس کا ساتھ دے اور یہ بھی ہوا کہ محبوب کو مخاطب کر کے اس پر یہ حقیقت آشکارا کی گئی کہ زندگی کی سخت راہوں میں اس کے نازک قدم زخمی ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ وہ اس کی رفاقت سے باز آجائے'' 143

ڈاکٹر ابن کنول لکھتے ہیں:

''فیض کی شاعری کی ابتداء اگر چہ رومانیت سے ہوئی لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک کا اثر ان کے انقلابی ذہن نے قبول کیا اور معاشرے کا درد دبے پاؤں ان کی شاعری میں آگیا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجاز نے جس کی زندگی پر رومان غالب تھا کہا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

برطانوی غلامی اور سرمایہ داری کے جبر سے مجبور و بے بس ہندوستانی نجات کے لیے آخری کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ملک کی غلامی نے عشق و محبت کے جذبات اور چہروں کی مسکراہٹ معدوم کر دی تھی۔

سردار کہتے ہیں۔

''عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا/ سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا/ میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا/ میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر/ نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر (انتظار نہ کرنا۔ سردار جعفری) 144

تقسیم ہند کے بعد ہوئے فسادات سے سردار جعفری پر کیا کیفیت تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''مارچ 1947 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے کے طور پر ہندوستان آئے۔ انہوں نے ہندوستان کو دو آزاد ممالک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کر دیا۔ اسی دوران سردار جعفری کی ایک معرکتہ الآرا تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' منظر عام پر آئی جو سیاسی مثنوی ''جمہور'' کے ساتھ مئی 1947ء میں کتب پبلشرز ممبئی سے شائع ہوئی۔ اس نظم میں سردار جعفری نے آزادی کی بشارت کے ساتھ ساتھ نئے ہندوستان کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس میں ہر طرف مسرت، شادمانی کا دور دورہ نظر آتا ہے لیکن اس بشارت کو بٹوارے کے اعلان کے بعد پنجاب اور دہلی میں ہوئے زبردست فرقہ وارانہ فسادات نے جھٹلا دیا اور محض چند مہینے کے عرصے میں تقریباً پانچ لاکھ ہندو اور مسلمان ہلاک اور کروڑوں بے گھر ہو گئے۔ معصوم لوگوں کا ایسا بہیمانہ قتل عام ہوا کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہیں شرم ناک اور المناک حالات میں 15/ اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد تو نہیں البتہ دو حصوں میں منقسم ضرور ہو گیا۔ تقسیم ہند سے ہر طرف خوشی کے ساتھ ساتھ مایوسی، بیچارگی، بے سروسامانی اور درماندگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ادیب اور دانشور کا ایک طبقہ خوش تھا تو ایک طبقہ نالاں اور پریشان تھا۔ سردار جعفری اس سانحے سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور اس نے ان کے وجود کو ہلا کے رکھ دیا تھا'' 145

نظم ''آنسوؤں کے چراغ'' (مشمولہ مجموعہ خون کی لکیر 1949) میں تقسیم کے بعد ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کی دلدوز عکاسی کی گئی ہے۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد جہاں دیگر مسائل نے جنم لیا' وہیں شرنارتھیوں اور مہاجرین کے مسئلہ نے ہندو پاک کے حساس عوام کو دلبرداشتہ کر دیا تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے عوام پر جس مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا تھا' وہ نا قابل بیان ہے۔ ہر طرف سسکیاں' آہ و فغاں' چیخ و پکار' ظلم اور مصیبتوں کے طوفان کا دور دورہ تھا۔ ان حالات کی عکاسی سردار جعفری نے اپنی نظم ''آنسوؤں کے چراغ'' میں کی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے' اس کے لیے انہوں نے قومی لیڈران کو ذمہ دار قرار دیا ہے جس کی دلدوز کہانی انہوں نے اس نظم میں بیان کی ہے جسے پڑھنے کے بعد قارئین کی نظروں کے سامنے وہ مناظر اور وہ حالات آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ نظم طویل ہے۔ چند ٹکڑے ملاحظہ کریں جس سے اس نظم کی اثر پذیری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے 146

؎ میں سن رہا ہوں/ وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں/ داغ غم بن کے رہ گئی ہے/ وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے/ رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں/ وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے/ دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں/ ..... یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے/ وطن کے سینے پہ خون ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی/ یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے/ قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے ..... بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے/ ..... کٹے ہوئے ہاتھ اپنی بانہوں سے راہ روکے کھڑے ہوئے ہیں/ پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں/ چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں/ کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے رس رہا ہے/ ..... بلکتی آنکھیں' سسکتی پلکیں/ اندھیری شب میں/ کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر/ ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈتی ہیں/ مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے/ شریف بہنو/ غیور ماؤ/ تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے/ یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے/ ..... یہ کس سے فریاد کر رہی ہے ہو/ یہ کس کو آواز دے رہی ہو/ تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو/ تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں/ تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں/ یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو/ سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری/ سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں/ یہ سامراجی بساط شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر/ ہزاروں چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں/ ..... یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے/ یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے/ یہ ظالموں کا محل ہے یہ قاتلوں کا مسکن ہے' یہ لیٹروں کی انجمن/ ..... شریف بہنو غیور ماؤ/ تمہارے بھائی/ تمہارے بیٹے/ تمہاری فریاد سن رہے ہیں/ ملوں سے' کھیتوں سے' اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں/ وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں/ عدل و انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے/ .....

''نظم کے اخیر میں سردار جعفری نے ان شرنارتھیوں اور مہاجرین کو خطاب کرتے ہوئے موجودہ نظام سیاست پر کڑی تنقید کی ہے۔'' 147

ڈاکٹر اشفاق حسین لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری نے اپنی ایک نظم '' آنسوؤں کے چراغ '' میں ہندوستان کے مہاجرین اور پاکستان کے مہاجرین کے نام میں حصول آزادی کے بعد برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی تصویر کشی ہے۔ مذہب کے نام پر دو ملکوں کو وجود میں لانے کے لیے سامراجی اور سرمایہ داری قوتیں کب سے سازشیں کر رہی تھیں اور وہ لوگ کامیاب بھی ہوئے جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے عوام کو ہولناک تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سازشوں کا پردہ فاش کرنے اور ایک نئے نظام کو وجود میں لانے کی ضرورت ہے'' 148

راشد آذر لکھتے ہیں:

'' آنسوؤں کے چراغ '' بڑی دردناک نظم ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے بے خانماں غریب الوطنوں پر لکھی گئی ہے۔'' 149

میر ہاشم لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری، جنہوں نے ملک کی آزادی کے لیے عملاً جدوجہد کی، نظمیں لکھیں اور جیل جاتے رہے، ملک کو دو ٹکڑے ہو کر آزاد ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کے ساتھ ملک کے دونوں حصے وحشت، بربریت اور فرقہ واریت کا شکار ہو کر لہو لہان ہو گئے۔ سردار جعفری کی شاعری انسانی دکھ درد سے عبارت رہی ہے۔ انہوں نے اس المیہ کا اظہار اپنی نظم '' آنسوؤں کے چراغ '' میں کیا ہے جو (140) مصرعوں میں مشتمل ہے۔ اس نظم کو انہوں نے ہندوستان کے شرنارتھیوں اور پاکستان کے مہاجرین کے نام منسوب کیا ہے۔ یہ نظم ہنگامی موضوع پر ہے لیکن تقسیم ملک کے مابعد واقعات کی ایک تاریخی دستاویز ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی'' 150

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے:

'' آزادی کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ ملک میں حصول آزادی کے فوراً بعد بلکہ ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر ہندو مسلم منافرت پھیلی اور دشمنی و عداوت کے تند شعلے بلند ہونے لگے۔ فسادات پھوٹ پڑے اور ہزاروں لوگ قتل کر دیئے گئے ان گنت بستیاں اجڑ گئیں۔ خوف و ہراس، بے اعتمادی و شک کے گھنگور بادل چھا گئے۔ شاعر کا دل ان مناظر کی تاب نہ لا سکا اور وہ چیخ پڑا کہ اسے ایسی آزادی نہیں چاہیے جس میں ایک ہندوستانی دوسرے ہندوستانی کا دشمن ہو، ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے اور اس کی عزت و آبرو اور جان و مال کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو'' 152

ڈاکٹر ابن کنول لکھتے ہیں:

''آزادی کا سورج طلوع ہونے اور غلامی سے نجات پانے کے بعد جو مذہب کے نام پر لہو بہایا گیا، ملک کو تقسیم کیا گیا۔ قتل و غارتگری اور فسادات کا وحشیانہ ناچ ہوا، اس نے ترقی پسند شاعر کو حیران و پریشان کر دیا۔ کیا یہی آزادی ہے جس کے لیے جنگ لڑی تھی''۔ 153

پروفیسر شارب ردولوی رقمطراز ہیں:

آزادی کے ساتھ ملک میں جس طرح قتل و غارت گری اور تہذیبی اور سماجی بحران کا بازار گرم ہوا اس کے خلاف جنگ کی پہلی آواز ترقی پسند شعرا نے ہی اٹھائی اور اس ہیجانی فضا کو اپنی شاعری اور دوسری تحریروں کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ آزادی جس شکل میں ملی تھی، ترقی پسند شاعروں نے اس آزادی کو مانگی ہوئی رہائی کی طرح "توہین بال و پر" اور کامن ویلتھ کی غلامی قرار دیا۔ اسی لیے اس وقت کے شعرا کے یہاں جو احساس سب سے زیادہ شدت سے نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ آزادی فریب آزادی اور رہنماؤں کی سازش ہے۔ یہ وہ آزادی نہیں ہے جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا مثلاً اس عہد کے شعرا نے آزادی اور اس کے ساتھ آنے والے بھیانک طوفان پر اپنا ردعمل جس طرح ظاہر کیا..... سردار جعفری کی نظم فریب کا یہ حصہ دیکھئے۔

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر/ کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے/ چند سکوں کے عوض چند ملعنوں کے لیے/ تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا/ باغباں بن کے لٹھے اور چمن بیچ دیا/ کون آزاد ہوا؟/ کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی۔ میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا/ مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی/ خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے/ موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لیے

غرض آزادی کے بارے میں اس وقت ایک عام ردعمل یہی تھا کہ ہم نے جو خواب دیکھا تھا یہ آزادی اس خواب کی تعبیر نہیں ہے" 154

عمر رضا نظم راج نزاج کی ہیئت اور سردار جعفری کے انداز کے بارے میں رقمطراز ہیں:

(1) "ممبئی فسادات کے زمانے کی تحریر کردہ نظم "راج نزاج" میں سردار جعفری کے صبر و تحمل اور نپے تلے انداز میں اپنی بات کہنے کی یقیناً داد دی جانی چاہیے۔ وہ سردار جعفری جو اس طرح کے موضوعات پر اپنی چیخ و پکار سے زمین و آسمان ایک کر دیا کرتے تھے، اب اس طرح کے موضوعات پر وہ نرم اور مدھم لب و لہجے میں اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں..... اس نظم کی ہیئت بھی غزل کے مشابہ ہے بلکہ اس کا عنوان ہٹا دیا جائے تو یہ صرف اور صرف غزل کہلائے گی۔ اگر چہ اس میں ایک مخصوص خیال کو مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے لیکن غزل کے آہنگ نے پوری نظم کو غزل کی شیرینی اور لطافت بخش دی ہے۔ آٹھ اشعار پر مشتمل اس شعری تخلیق کو غزل کہنا زیادہ مناسب معلوم پڑتا ہے..... اگر چہ اس کا آخری شعر نظم کا سا تاثر پیدا کر دیتا ہے لیکن پھر بھی اس میں شامل غزل کی ایمائیت اور اشاریت نے اسے غزل کے زمرے میں رکھنے کے لیے اچھا خاصا جواز فراہم کر دیا ہے۔" 155

"سنا ہے بندوبست اب سب بہ انداز دگر ہوں گے/ ستم ہوگا، محافظ شہر بے دیوار و در ہوں گے/ سزائیں بے گناہوں کو ملیں گی بے گناہوں کی/ کہ فرد جرم سے مجرم کی منصف بے خبر ہوں گے...../ سجائی جائے گی بزم عزا ایزار سانوں سے/ کفن پہنائیں گے جلاد قاتل نوحہ گر ہوں گے/ فلک تھرا اٹھے گا جھوٹے ماتم کی صداؤں سے/ یتیموں اور بیواؤں کے آنسو بے اثر ہوں گے/ رسن میں ماؤں اور بہنوں کے بازو باندھے جائیں گے/ شہیدان وفا کے خوں بھرے نیزوں پر سر ہوں گے/ منایا جائے گا جشن مسرت سونے کھنڈر میں/ اندھیری رات میں روشن چراغ چشم تر ہوں گے/ جو یہ تعبیر ہوگی ہند کے دیرینہ خوابوں کی/ تو پھر ہندوستان ہوگا نہ اس کے دیدہ ور ہوں گے۔

وارث علوی لکھتے ہیں:

.....ایک خواب اور'' سے قبل کی صرف ایک نظم ایسی ہے جس پر سردار وہ سب کچھ پا سکے ہیں جو زبان اور اسلوب کی سطح پر اپنے اجتہادات کے ذریعے وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ نظم ہے ''فریب'' جو پندرہ اگست پر ہے۔ اول تو یہ کہ نظم مختصر نہ سہی بہت طویل بھی نہیں۔ فارم پر شاعر کی گرفت مضبوط ہے اور کہیں جھول نہیں پڑتا۔ دوسری بات یہ کہ پوری نظم خوبصورت تشبیہوں اور لفظی پیکروں سے مالا مال ہے۔ خطابت سنبھلی ہوئی طنز کاٹ دار اور رہ رہ وار نپا تلا ہے۔ نظم کا باغیانہ لب ولہجہ پُرعتاب اور پُر وقار ہے..... پندرہ اگست کی طرف شاعر کا رویہ حزبی نہیں بلکہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے سیاسی فریب دینے اور سیاسی فریب کھانے سے تعلق رکھتا ہے جو تاریخ کے تناظر میں اب تو ابدی نظر آنے لگا ہے یعنی آدمی کو سیاست سے نجات نہیں اور سیاست تاریخ کے ہر موڑ پر فریب دیتی رہی ہے۔'' 156

راشد آذر نے نظم کی صوتی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''نظم فریب''..... میں انہوں نے ہم آواز اور ہم قافیہ الفاظ پر جگہ جگہ مصرعے ختم کر کے صوتی جھنکار پیدا کی ہے۔ اس نظم میں مصرعے موجوں کی طرح ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ نظم کا بہاؤ کہیں رکتا نہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم قافیہ الفاظ کا استعمال بغیر کسی تکلف اور کاوش کے کیا گیا ہے اور ایسے الفاظ نظم کے بنیادی خیال کا حصہ بن کر آئے ہیں' کوشش کر کے خواہ مخواہ نہیں لگائے گئے'' 157

محمد حفظ الکبیر قریشی لکھتے ہیں:

''یہ نظم 1950 تک جو حالات پیدا ہوئے تھے اس کے پس منظر میں ایک کامیاب نظم تھی اور اس دور کی جذباتی زندگی کی بہترین عکاس۔'' 158

کوثر مظہری رقمطراز ہیں:

نظم ''فریب''.... میں انہوں نے علامتی طرز اظہار کو اپنایا ہے۔ سماج اور تہذیب کی بدہیتی اور کریہہ صورت کو اس نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں ان کی تخلیقی بصیرت اور تمثیلی تخلیقیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے''۔ 159

نظم ''فریب'' سردار جعفری کے شعری مجموعے خون کی لکیر (1949) میں شامل ہے۔

اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''نظم میں طنز کی کاٹ ہے' موجودہ حکمرانوں کے فریب اور تقسیم سے پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کی زبردست عکاسی کی گئی ہے..... آزادی پر طنز کرتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں 160

؎ ناگہاں شور ہوا/ لو شب تار غلامی کی سحر آ پہنچی/ انگلیاں جاگ اٹھیں/ بربط و طاؤس نے انگڑائی لی/ لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے/ راہزن ہار گئے/ راہرو جیت گئے/ .....ہم نشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم/ رہبر قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب/ ہم نے آزردگی شوق کو منزل جانا/ اپنی ہی گرد سراہ کو محمل جانا/ گردش حلقہ گرداب کو ساحل جانا/ اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے/ در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے/ .....اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی/ موج پایاب کا ساحل

ہے یہی/تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر/کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے/چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر/تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا/باغبان بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا.....

آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات'مزدوروں' کسانوں اور غریبوں پر جس طرح کی ظلم وزیادتیاں روا تھیں'اس کو پیش کیا گیا ہے..... 161

کون آزاد ہوا؟/کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی؟/میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا/مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی/خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے/موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لیے/.....کارخانوں پر لگا رہتا ہے/سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم/بیچ میں ان کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی/اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے/.....روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں/جن کو سرمایہ کے دلالوں نے/نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے/بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے/مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح/اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں/اور بد بخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح/اپنے افلاس میں منہ ڈھاپ کے سو جاتی ہے.....موجودہ صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے اشتراکیوں اور مزدوروں کو اٹھ کھڑے ہونے اور اس کا سدباب کرنے کی طرف ہلکا سا لطیف اور نرم لب ولہجہ سے پُر انداز میں اشارہ ملتا ہے۔یہاں کھلے عام انقلاب اور بغاوت کی بات نہیں کی گئی ہے بلکہ صرف موجودہ نظام زندگی سے ناخوشی کا اظہار ملتا ہے جس کے خلاف سردار جعفری کا ماننا ہے کہ بہت جلد مزدور اٹھ کھڑے ہوں گے۔

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا/تیرہ وتار فضاؤں سے برستا ہے لہو/راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم/تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح/شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں/پھوٹنے والی ہے مزدوروں کے ماتھے سے کرن/سرخ پرچم افق صبح پہ لہراتے ہیں۔

پروفیسر شارب ردولوی رقمطراز ہیں:

''آزادی کے ساتھ ملک میں جس طرح قتل وغارت گری اور تہذیبی اور سماجی بحران کا بازار گرم ہوا اس کے خلاف جنگ کی پہلی آواز ترقی پسند شعرا نے ہی اٹھائی اور اس ہیجانی فضا کو اپنی شاعری اور دوسری تحریروں کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ آزادی جس شکل میں ملی تھی'ترقی پسند شاعروں نے اس آزادی کو مانگی ہوئی رہائی کی طرح توہین بال وپر اور کامن ویلتھ کی غلامی قرار دیا۔اسی لیے اس وقت کے شعرا کے یہاں جو احساس سب سے زیادہ شدت سے نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ آزادی فریب آزادی اور رہنماؤں کی سازش ہے۔یہ وہ آزادی نہیں جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا اس عہد کے شعرا نے آزادی اور اس کے ساتھ آنے والے بھیانک طوفان پر اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے....نظم فریب....دیکھئے''162

ڈاکٹر اشفاق حسین لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری نے اپنی نظم ''فریب''15/اگست اور اس کے بعد میں آزادی حاصل ہونے کے موقع پر مایوسی کا اظہار کیا ہے۔اس فرسودہ نظام کی جگہ عوام جس نئے نظام کا خواب دیکھ رہے تھے وہ شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔استحصال کا وہی پرانا طریقہ رائج ہے۔اس کے علاوہ اس موقع پر خون کی ہولی کھیلی گئی۔سماج میں طرح طرح کی بدعنوانیوں کا فروغ ہوا۔گرانی اور

سیاہ بازاری بڑھی۔کارخانوں میں مزدوروں کو جائز حق دینے کے بجائے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔کسانوں کی محنت کا ثمرہ دوسرے لوگوں کو ملنے لگا اور وہ خود بھوکے رہنے لگے۔ان سب کے باوجود شاعر تلقین کرتا ہے کہ محنت کش طبقے کو آزردہ خاطر اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سرخ پرچم کے تلے جمع ہو کر استالن اور لینن کے نظریات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تگ و دو جاری رکھنا چاہیے" 163

عمر رضا لکھتے ہیں:

"1990" کے بعد ہندوستان جس طرح کی فرقہ واریت سے دوچار تھا اور خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ جس طرح کا سوتیلا رویہ اختیار کیا گیا تھا اس سے وہ بے حد نالاں تھے جس کے اظہار کے لیے انہوں نے کچھ اس طرح کا لہجہ اختیار کیا ہے جس میں سنجیدہ طنز کا احساس ہوتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں۔

اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد
رام و گوتم کی زمیں حرمت انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کے برسات کے بعد

ان اشعار میں موجود سردار جعفری کے درد اور کرب کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے جو بلاشبہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے درد و کرب کے مترادف ہے۔" 164

سردار جعفری کی نظم "ایودھیا" کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

"سردار جعفری کی نظم "ایودھیا"..... دسمبر 1992 کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اس میں ایودھیا کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے مسمار کر کے جنونیوں نے نہ صرف یہ کہ بابری مسجد کو بلکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو مسمار کر دیا تھا..... یہی نہیں اس نظم میں سردار جعفری نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہندوستان میں جس طرح کا تفاوت پایا جانے لگا تھا..... جسے اکیسویں صدی میں "سچر کمیٹی" کی رپورٹ نے ثابت بھی کر دیا ہے۔ 165

کاربد اوروں کا ہے، دل ہیں ہمارے شرمسار/ آج سے سرجوندی کا نام ہے دریائے غم/ دشت وحشت نے اتارا رام کے ماتھے کا تاج/ ہو گئیں سیتا کی آنکھیں خون کے اشکوں سے نم/ گنبدوں کے ساتھ وہ بھی ہو چکا ہے پاش پاش/ ہند کے دل میں جو تھا مہر و مروت کا صنم/..... دیس تو ہے ایک لیکن دیس میں ہیں قومیں دو/ ایک بے نام و نمک اور ایک آسودہ شکم/ ایک کی قسمت میں محنت ایک کی قسمت میں راج / ایک کی قسمت میں خوشیاں ایک کی قسمت میں غم

پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

"1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد لکھی گئی سردار جعفری کی نظم "ایودھیا" جو سرکاری انعام و اکرام کے حوالے سے کم علموں بلکہ اَن پڑھ لوگوں کی وجہ سے متنازعہ بن کر اخباروں کی زینت بنی "جنوں کی حکایت خوں چکاں" کی حالیہ تاریخ میں ایک نادر مثال ہے، جس پر ملک کے دانشور طبقے نے احتجاجاً اپنی آواز بلند کی اور ثابت کیا کہ سچائی کا نام لینے والے ابھی اس

ملک میں باقی ہیں اور ملک میں جو مایوسی کی فضا ہے وہ عارضی ہے''۔گیان پیٹھ انعام حاصل کرنے پر قومی پریس، ریڈیو اور ٹی وی نے قومی سطح پر جو جعفری صاحب کی پذیرائی کی اس سے ہندوستان کے سیکولرازم اور روشن مستقبل کے لیے بشارت ملتی ہے۔ شعر و ادب کی تفہیم کے لیے اس زبان کے شعری استعاروں سے واقفیت اور آگاہی ضروری ہے۔اردو شاعری کی تفہیم (Understanding) کے لیے اردو کے شعری استعاروں سے واقفیت کے ساتھ ہند اسلامی تاریخ کے اشاروں اور کنایوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔اردو شاعری میں جب ظالم اور مظلوم کی بات ہوتی ہے تو میدان کربلا میں یزید اور امام حسینؓ کے درمیان جنگ اور امام حسینؓ کی شہادت نیکی اور بدی کا ایک بے مثال استعارہ Metaphor بن جاتا ہے۔''ایودھیا'' اردو شاعری کے اسی استعاراتی (Symbolic) نظام سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔یہ نظم محض بابری مسجد کی شہادت کا منظوم قصہ نہیں ہے، یہ دراصل ایک ایسی حقیقت نگاری ہے جس میں ہندوستان کی مثالی آپسی محبت، بھائی چارہ، انسان دوستی کی اعلیٰ قدروں کے قتل اور خوں ریزی کا المیہ (Tragedy) ہے'' 166

پروفیسر عبدالستار دلوی نے نظم ایودھیا پر کیے گئے اعتراض اور سردار جعفری کی وضاحت کو اپنی مرتبہ تصنیف ''علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) کے حرف اول اور حرف آخر میں درج کیا ہے:

(1) حرف اول میں پروفیسر دلوی نے لکھا ہے:

''جب انہیں (سردار جعفری) 1998ء میں مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی نے اپنے سب سے بڑے انعام سنت گیانیشور ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا تو چند شر پسندوں نے واویلا مچایا اور اس انعام کے خلاف تحریک شروع کی۔اس مخالفت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ سردار جعفری فرقہ پرست شاعر ہیں اور ان کی نظم اجودھیا اس کی مثال ہے.....اپنی نظم اجودھیا کے پس منظر میں جعفری صاحب نے ایک مختصر تحریر لکھ کر مجھے عنایت فرمائی جو معترضین کا جواب ہے۔سردار جعفری کی یہ غیر مطبوعہ تحریر میرے پاس امانت تھی۔یہ دستاویزی تحریر ''حرف آخر'' کے تحت اس مجموعہ مقالات کی آخری تحریر ہے'' 167 (پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول، علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب، صفحہ 37، 38)

(2) حرف آخر: علی سردار جعفری کی تحریر:

''میری نظم اجودھیا پر اعتراض صرف دو حلقوں سے ہوسکتا ہے۔ایک وہ حلقہ جو مسجد کو مسمار کر کے خوش ہے کہ اس نے مسلمانوں سے انتقام لے لیا یا ان کو سبق سکھا دیا۔دوسرا وہ حلقہ جو اردو ادب کے شعری استعارے سے ناواقف ہے اور اسلام کی تاریخ سے ناآشنا ہے۔انہیں یہ معلوم نہیں کہ کربلا کی جنگ اور امام حسینؓ کی شہادت جدید اردو شاعری میں بہت طاقتور اور موثر استعارہ ہے۔ پہلے حلقے سے گفتگو کرنا بے کار ہے کیونکہ وہ سیاسی مصلحتوں کا شکار ہے لیکن دوسرے حلقے سے بات کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ دانشوروں کا حلقہ ہے۔ان کی غلط فہمی کی بنیاد آج کے زمانے میں ہندو اور مسلم فرقوں کی ایک دوسرے سے دوری ہے۔وہ کربلا اور شہادت حسینؓ کے استعارے سے بالکل ناواقف ہیں۔سب سے پہلے میری نظم کا موضوع بابری مسجد کا انہدام نہیں ہے بلکہ ان ہندوستانی قدروں کا قتل عام ہے جن پر ہم کو بجا طور پر ناز ہے۔ان میں سب سے زیادہ اہم باہمی رواداری اور محبت کی قدر ہے۔صوفی شاعری میں یہ عشق ہے اور بھگتی میں پریم''۔ ڈھائی اچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت

ہوئے‘‘(کبیر)۔اسی لیے میری نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

کار بداوروں کا ہے دل ہیں ہمارے شرمسار

ساحل سرجو پہ ٹوٹا ہے جو بھارت کا بھرم

دوسرا شعر صاف ہے’’ خاک وخوں میں مل گئی ہندوستاں کی آبرو‘‘جس کی وجہ سے اب سرجوندی کا نام دریائے غم ہو جائے گا۔یعنی یہ ندی ہمیشہ ان کھوئی ہوئی قدروں پہ آنسو بہاتی رہے گی۔تیسرا شعر اس خیال کو پیش کرتا ہے کہ اجودھیا میں جو بدی کے کام ہوئے ہیں وہ رام راجیہ کے اصولوں کے خلاف ہیں(میرے ذہن میں گاندھی جی کا رام راجیہ ہے)۔اس لیے رام کے سر سے تاج اتار لینے کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔اور اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ تاج ’’دستِ وحشت‘‘ نے اتارا ہے۔دست وحشت جو کاربد کا ذمہ دار ہے۔

دست وحشت نے اتارا رام کے ماتھے کا تاج

آج ہیں سیتا کی آنکھیں خون کے اشکوں سے نم

یہ رام راجیہ کے اصولوں کے خاتمے کا نتیجہ ہے کہ گنبدوں کے ساتھ مہر ومروت کا وہ بت(صنم) بھی ٹوٹ گیا جو ہندوستان کے دل میں براجمان تھا یعنی ہندوستانی جس کی پرستش کرتے تھے۔اس کے بعد کا شعر اس راز کو فاش کردیتا ہے کہ ہماری ہندوستانی اقدار کا یہ قتل نتیجہ ہے۔خون انسانی کی اس پیاس کا جو اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی بدی سے سمجھوتا کرسکتی ہے۔اقتدار کی ہوس کے مارے ہوئے لوگ(جو ظاہر ہے کہ محبِّ وطن نہیں ہوسکتے) خاکِ وطن کو اس طرح سے روند کر چل رہے ہیں جیسے روان رام کے سینے پر قدم رکھنے کی کوشش کررہا ہو یا اس کوشش میں کامیاب ہوگیا ہو۔

چل رہے ہو اس طرح خاکِ وطن کو روندکر

جس طرح ہو رام کے سینے پہ راون کا قدم

یہ اس نظم کا سب سے زیادہ طاقتور اور حیرت انگیز امیج(Image) ہے اور اتنا ہی اثر انگیز بھی۔اس میں رام نیکی کی علامت ہیں اور راون بدی کی علامت۔خاک وطن بھی رام کی طرح نیکی کی علامت ہے اور اہل ہوس کے قدم راون کی طرح بدی کی علامت۔رام کے سینے پہ راون کا قدم استعارہ ہے اور یہ استعارہ میرے دل ودماغ میں بچپن سے بسا ہوا ہے کیونکہ یہ براہ راست کربلا کی روایت سے وابستہ ہے جو اسلام کی تاریخ میں نیکی اور بدی کی سب سے بڑی جنگ ہے۔اور امام حسینؓ کی شہادت سب سے عظیم شہادت ہے۔اس کی تصویر یہ ہے کہ محرم کی دسویں تاریخ کو ظہر کے وقت امام حسینؓ اپنے(72)رفیقوں اور عزیزوں کی شہادت کے بعد جب سینکڑوں زخم کھا کر گھوڑے سے گرتے ہیں تو یزید کی فوج کا ایک سردار جس کا نام شمر تھا اپنا خنجر لے کر بڑھتا ہے اور حسینؓ کے سینے پر اپنا گھٹنا رکھ دیتا ہے اور سر کاٹ کر نیزے کی نوک پر بلند کردیتا ہے۔اس واقعہ کو جو تاریخی طور پر صحیح ہے اردو اور فارسی کے شعراء نے بار بار نظم کیا ہے۔مرثیہ کے سب سے بڑے شاعر انیس نے اس شہادت کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے۔

کہہ کے یہ غش ہوئے پھر ان میں شہنشاہِ امم/شمر اظلم نے رکھا سینۂ اقدس پہ قدم/جگر فاطمہ زہرا پہ چلی تیغ دودم/آگے

زینب کے ہوئے ذبح حسین ہائے ستم

دوسری جگہ یہ شعر ہے۔

آیا نہ رحم سینۂ شاہ ِ شہید پر
زانو رکھا شقی نے کلام مجید پر

امام حسینؓ کی بہن زینبؓ کی زبان سے انیس نے شمر کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ حسینؓ کا سر نہیں کٹ رہا تھا' محمد کا گلا کٹ رہا تھا۔

دل زہرا جگر شیر خدا کٹتا ہے
ظلم سے تیرے محمدؐ کا گلا کٹتا ہے

اگر میں اپنی کسی نظم میں نیکی اور انصاف کے خلاف ظلم اور بدی کے حملے کو یوں بیان کروں کہ شہید کربلا حسینؓ کے سینے پر شمر نے قدم رکھ دیا ہے تو کسی مسلمان کو شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ وہ فوراً اس استعارے کو سمجھ لے گا۔ ہمارے ذہن میں رام کا تصور ایک فاتح اور ایک ہیرو کا تصور ہے اور امام حسینؓ کی تصویر شہید اعظم کی تصویر ہے جس نے اپنی شہادت اور قربانی سے بدی کی طاقت پر فتح حاصل کی ہے۔ حسینؓ امام ہیں اور رام اہل ہنود کے لیے اوتار اور مسلمان کے بعض روشن خیال شعراء اور علماء کے نزدیک ایک پیغمبر ہیں۔ اقبال نے انہیں ''امام ہند'' کہا ہے۔

اسی طرح کرشن کو بھی پیغمبر کا درجہ حاصل ہے ایسی صورت میں شعر کہتے وقت امام کی شہادت کے امیج کا رام کے آدرشوں کی شہادت کے امیج میں تبدیل ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد کے اشعار اسی خیال کے پیکر ہیں کہ اصل جنگ ہندو اور مسلمان کی نہیں ہے بلکہ طبقاتی ہے جس کو مذہب اور دھرم کے نام پر مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن آخر میں فتح مظلوم کی ہوگی۔ میرے دل میں ہندوستان کے کسی فرقے اور اس کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف نفرت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میری شاعری اُن کی روایات سے بھری پڑی ہے''168

سردار جعفری کے خیال میں انسانوں انسانوں میں تفریق پیدا کرنے والی شئے دراصل دولت کی ہوس ہے اور مغرب کی مادہ پرستی نے اُس کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے۔ 169

1977 کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے جس میں اہل ہوس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

نہیں اہل ہوس کی بھوک میں کوئی کمی ممکن
کبھی بھرتا نہیں ہے پیٹ سونے کے نوالے سے

1974 میں کہے گئے دو شعر ملاحظہ ہوں جس میں سردار جعفری نے درد و غم، ظلم و ستم، مقتل و قاتل کی لافانیت کا اظہار کیا ہے۔ سردار جعفری نے کہا کہ یہ چیزیں ہر دور میں پائی جاتی ہیں، صرف چولے بدلتے رہتے ہیں۔

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں

وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

ظلم وجبر کی ایک طویل تاریخ کو ایک مختصر سی نظم ایک پرانی داستان (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں پیش کیا گیا ہے اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

یہ ظلم و جبر بھی اک پیاس ہے جو صدیوں سے/ بجھائی جاتی ہے انساں کے خون ناحق سے/.....تمام اہل ہوس پارسا ہیں' منصف ہیں/ جو بے قصور ہیں وہ عدل کے کٹہرے میں/گلیلیو کی طرح سے بلائے جاتے ہیں/بس اس خطا پہ کہ ہیں محرم رموز حیات۔

سردار الہدیٰ لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کے یہاں انسانی ہمدردی کی کئی شکلیں ہیں۔وہ ظلم کے خاف آواز بلند کرنا اور سچ کو سچ کہنا بھی انسانی ہمدردی کا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں۔چنانچہ وہ اپنی ایک نظم ''کون سچ بولے گا'' میں کہتے ہیں۔

کون اس عہد میں سچ بولے گا/حرف آتے ہیں قطاروں کی طرح/حکم شاہی کی طرح/اور پھر آتے ہیں کچھ اور بھی حرف/ صف بہ صف دست جنوں باندھے ہوئے/ایک بھی حرف نہیں جو دل وجاں بن جائے/عہد حاضر کی زباں بن جائے/سچ تو اک درد ہے اک زخم ہے اک جرأت ہے/قید وزنداں بھی ہے سچ اور رسن و دار بھی ہے/لذت شوق بھی ہے لذت اظہار بھی ہے/ کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق۔

.....سردار جعفری نے غالب کے اس ایک مصرعہ ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' کے معنوی اور صورتی دونوں پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے پوری نظم کہی ہے۔اس نظم میں علی سردار جعفری نے حرف کے کردار پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حرف سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔اگر کوئی حرف اپنے عہد کی زبان نہیں بن پاتا ہے تو وہ کس کام کا۔ان تمام باتوں کے پیچھے ایک ہی فکر ہے اور وہ ہے اپنے عہد کی سچائیوں کی نقاب کشائی۔ظاہر ہے کہ ان سچائیوں میں ایک بڑی سچائی انسانوں کے دکھ درد کا اظہار ہے۔ان کے نزدیک انسانی ہمدردی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ موجودہ عہد کی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی جائے۔اس لیے کہ ظلم کا شکار عموماً وہ طبقہ ہوتا ہے جس کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے۔دیکھئے وہ کس طرح ظالموں کو خبردار کرتے ہیں۔170

اس پہ پھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے/اس پہ پھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے/اور ہر گوشہ گلزار میں سناٹا ہے/کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی/ آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی/ وہ جواں ہو کر اگر آتش صد سالہ بنی/خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گذرے گی۔

اس نظم میں لفظ ''فغاں'' کا ایک اہم رول ہے...مگر اس نظم کا آخری مصرعہ خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی ایک واضح احتجاج بن جاتا ہے۔یہی وہ شکایت ہے جو سردار جعفری سے اکثر کی جاتی ہے مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ایسی بہت ساری

نظمیں ہیں جو احتجاج بھی ہیں اور شاعری کی اعلیٰ مثال بھی۔انہوں نے اپنے خیال کے اظہار کے لیے پیکر تراشی، خوبصورت تراکیب، استعارات، تشبیہات، الفاظ کی خوش آہنگی وغیرہ۔

12 فروری 1974 کو لکھی غزل میں بدامنی اور انتشار پھیلانے والے ظالموں کو ان کے بھیانک انجام کی تنبیہہ دی گئی ہے اور ان سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر انسانیت کو گلے لگائیں۔

خرد والو جنوں والوں کے ویرانوں میں آجاؤ
دلوں کے باغ زخموں کے گلستانوں میں آجاؤ
یہ دامان و گریباں اب سلامت رہ نہیں سکتے
ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے دیوانوں میں آجاؤ
ستم کی تیغ خود دستِ ستم کو کاٹ دیتی ہے
ستم رانو تم اب اپنے عزا خانوں میں آجاؤ
ہوا ہے سخت اب اشکوں کے پرچم اڑ نہیں سکتے
لہو کے سرخ پرچم لے کے میدانوں میں آجاؤ
زمانہ کر رہا ہے اہتمام جشنِ بیداری
گریباں چاک کر کے شعلہ دامانوں میں آجاؤ

5/نومبر 1978 کو لکھی غزل (جسے ایرانی طلبہ کے نام منسوب کیا گیا ہے) میں ظلم و جبر، سرمایہ دار اور مزدوروں کی کشاکش کا نقشہ کھینچا ہے اس میں بلند آہنگی، تیزی، تلخی بھی نظر آتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جبر کر سکتا ہے کب تک عزم و ہمت کو اسیر
ہنس پڑی دیوار زندان عجم
خرمنِ ظلم و ستم کا آخری لمحہ ہے یہ
بن چکی ہے برق زنجیرِ غلامانِ عجم
صاحب سرمایہ ہوں گے اب تہی دستانِ شرق
ہر شکستہ دل ہے اک لعل بدخشانِ عجم
رہا ہے فرق سلطان و گدا میر و فقیر
نامۂ اعمال ہے اور محشر ستانِ عجم

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''ان نظموں (لہو پکارتا ہے، پیراہن شرر، خون کی لکیر کی نظمیں، ''ایشیا جاگ اٹھا، نئی دنیا کو سلام) کے مطالعے سے ایسا

محسوس ہوتا ہے جیسے لاکھوں کا مجمع ایک بڑے سے میدان میں اکٹھا ہے مشتعل ہجوم سے ایک اونچے اسٹیج پر کھڑا ہوا انقلابی لیڈر مخاطب ہو کر جوش و خروش میں تقریر کر رہا ہے اور وہ لمحہ دور نہیں جب اس کی دھواں دھار تقریر سن کر یہ ہجوم ظالم حکومت پر ٹوٹ پڑے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے''۔

''جس نے انسانیت کے بہتے لہو کو تحفظ عطا کرنے کی جدوجہد کی ہو اس سے بچ کر کون جا سکتا ہے؟ اور کہاں؟''171

عمر رضا نے لکھا ہے:

''نظم ''ایک بات'' میں سردار جعفری ان سرکشوں سے محو گفتگو ہیں جو ظلم و جور کی تاریخیں رقم کرتے ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ انہوں نے قارئین کی توجہ اس بات پر بھی مرکوز کی ہے کہ آج اگر کسی پر ظلم ہو رہا ہے تو کل وہ بھی شعلۂ جوالہ بن کر ستم گاروں پر مصیبت کے پہاڑ توڑ سکتا ہے۔ اس خیال کو بے حد نرم اور مدھم لہجے میں پیش کیا ہے''۔ 172

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

(1) ''سردار جب دیکھتے ہیں کہ ان ہاتھوں کے حاملین کو مناسب اجرت نہیں ملتی، جب ان کا خون چوسا جاتا ہے تو وہ کراہ اٹھتے ہیں۔ ان کا دل درد سے بھر جاتا ہے۔ وہ احتجاج کرتے ہیں اور ظلم کے ٹھیکہ داروں کو للکارتے اور چیلنج کرتے ہیں۔ وہ مزدوروں اور محنت کشوں کی جانب سے ان کی خودداری، شانِ استغنا اور عزتِ نفس کا اعلان کرتے ہیں''۔ 173

؎ تمہارے تن پہ سلامت تمہارا پیراہن/ ہمارے پاس یہ دامان تار تار سہی/ تمہارے زیر قدم فرشِ گل بساط بہار/ ہمارے پانوؤں میں دشتِ جنوں کے خار سہی/ کسی کی بھوک سے بھرتے نہیں ہیں پیٹ اپنا/ کسی کی پیاس سے لب اپنے تر نہیں کرتے/ برہنگی میں کسی کا لباس کیوں لیں گے/ بہشت پر بھی ہوس کی نظر نہیں کرتے/ ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں/ ہماری تشنہ لبی مے کدے بناتی ہے/ نگاہ ساقیِ نامہرباں کا شکوہ کیا/ ہمارے نام کی صہبا چھلک ہی جاتی ہے/ تمہیں خبر بھی ہے آوارگانِ کوچۂ شوق/ شکستہ دل ہیں شکستہ دلوں کے یار بھی ہیں/ بلا کشانِ محبت کا احترام کرو/ خراب حال سہی فخرِ روزگار بھی ہیں۔

(2) '' کارخانوں اور ملوں میں کام کرنے والوں کی بھیانک تصویر دکھا کر سردار جعفری سماجی نظام کی خرابی کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کی انسانیت کش قوت کو ناکام بنا دیں اور سماج میں مزدوروں، محنت کشوں اور عام انسانوں کو جینے کا حق ملے، عزت و شرافت، تعلیم و ترقی اور خوش حالی پر سب کا حق ہو۔ اپنی نظم ''نوالا'' میں ایک کم عمر بچے کی تصویر پیش کی ہے جو کھولی میں پلتا ہے اور وہاں سے نکل کر اسکول یا کھیل کے میدان میں جانے کے بجائے سیدھے مل میں کام کرنے چلا جاتا ہے۔ اپنے جسم کی چاندی اور اپنے ہاتھ کا سونا بیچ کر کنگال ہو جاتا ہے اور وقت سے پہلے بیمار اور بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے۔ یہ مختصر لیکن موثر نظم ہے جو حساس قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کا شمار جعفری کی اعلیٰ درجے کی نظموں میں ہونا چاہیے۔ مکمل نظم ملاحظہ ہو: 174

؎ ماں ہے ریشم کے کارخانے میں/ باپ مصروف سوتی مل میں ہے/ کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے/ بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے/ جب یہاں سے نکل کے جائے گا/ کارخانوں کے کام آئے گا/ اپنے مجبور پیٹ کی خاطر/ بھوک سرمائے کی بڑھائے گا/ ہاتھ سونے کے پھول اگلیں گے/ جسم چاندی کے دھن لٹائے گا/ کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن/ خون اس کا دیئے

جلائے گا/یہ جونتھا ہے بھولا بھالا ہے/صرف سرمائے کا نوالہ ہے پوچھتی ہے یہ اس کی خاموشی/کوئی مجھ کو بچانے والا ہے۔

26/جنوری 1950 کو ملک کا دستور نافذ ہوا۔پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔بقول ڈاکٹر اشفاق حسین: ''مگر شاعر (سردار جعفری) کا دل رنجیدہ ہے کیونکہ اس آئین میں محنت کش طبقے کو نظر انداز کیا گیا ہے۔اس طرح یہ آئین عوام کے حق میں نہ ہو کر سرمایہ دار طبقے کا بن گیا 175

نظم نیا دھان کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

انہیں ہر اک حق/ہر ایک ادھیکار/اور ہمیں کوئی حق نہیں/انہیں یہ حق ہے کہ کارخانہ کو جیل خانہ بنا کے رکھ دیں/کسان کی کھیتیوں کو نیلام پر چڑھا دیں/زمیں سے انسانیت کا سارا خواب اٹھا دیں/...../یہی ہے جمہوریت تو ایسی ذلیل جمہوریت پہ لعنت/ہم آج بیدار ہو چکے ہیں/ہمارے غم ہمتوں کو تیز کر رہے ہیں/ہمارے دکھ آج ہم کو عہد عمل کے میداں میں لا رہے ہیں/...../لکھو ہمارا دھان امن اور شانتی کا دھان ہوگا/لکھو ہمارے وطن کے پرچم کا رنگ، رنگِ بہار ہوگا/لکھو کہ مزدور اور کسانوں کے سر پہ عظمت کا تاج ہوگا...../لکھو کہ تن کو لباس/سینوں کو علم/ہاتھوں کو کام ہوگا/لکھو کہ روٹی کا اور انسان کی بھوک کا احترام ہوگا۔

غموں سے نڈھال آدمی کو جب کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تو اس کے اندر کس طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے بڑے ہی خوب صورت انداز میں نظم ''آبلہ پا'' میں پیش کیا گیا ہے۔

سائے میں درختوں کے/بیٹھے ہوئے انسانو!/اے وقت کے مہمانو/کس دیس سے آئے ہو/کس دیس کو جانا ہے/اے سوختہ سامانو!/یہ وسعت میداں ہے/یا درد کا صحرا ہے/ایک دھوپ کا جنگل ہے/یا پیاس کا دریا ہے/دریا کے پرے کیا ہے/پتھر ہے کہ چشمہ ہے/نغمہ ہے کہ نالہ ہے/شبنم ہے کہ شعلہ ہے/شاید کوئی ساحر ہے/جو ڈوبتے سورج کے/دروازے پہ بیٹھا ہے/افسوں تماشا ہے.....صد قافلہ پنہاں ہے/صد قافلہ پیدا ہے/آواز جرس لیکن/اس دشت میں تنہا ہے/صدیوں سے اسی صورت/ہے حکم سفر جاری/فرمان ستم جاری/اعلان کرم جاری۔

سردار جعفری کی نظم ''تیرا خدا اور میرا خدا'' (دسمبر 1949) کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

اسی شمارے میں (عربک کالج میگزین، دہلی جلد 8 شمارہ دسمبر 1937) سردار جعفری کی ایک نظم ''تیرا خدا اور میرا خدا'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔اس میں انہوں نے نیکی و بدی کا موازنہ کیا ہے اور ایسے مذہب و ملت سے انکار کیا ہے جو رسم و رواج، رنگ و نسل اور عدم مساوات کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔یہ مختصر سی نظم چونکہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے لہٰذا یہاں پوری نقل کی جا رہی ہے تا کہ سردار جعفری کی ابتدائی شاعری نیز ان کے افکار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ 176

تیرا خدا اسیر ہے تیرے توہمات میں/میرا خدا مرا رفیق کشمکش حیات میں/تیرے خدا کی ہیں صفات جبر و غرور بے ثبات/میرے خدا کی ہیں صفات سطوت و قوت و حیات/تیرے خدا کے نام پر تفرقۂ بلند و پست/میرے خدا کے نام پر ماضی و حال کی شکست/تیرے خدا کی کائنات رسم و رواج و نسل و رنگ/میرے خدا کی کائنات شورش و انقلاب و جنگ/تیرے خدا کے ساز میں نغمۂ دیر اور حرم/میرے خدا کے ساز میں زمزمہ ہائے کیف و کم/تیرا خدا وہ خالق مذہب و ملت و وطن/میرا خدا جہاں گیر

تیرے خدا کا بیخ کن/ تیرے لیے کبھی غمی اور کبھی خوشی خدا/ میرے لیے فقط میرا مقصد زندگی خدا

محمد اجمل خاں نے لکھا ہے:

''نظم.....تیرا اور میرا خدا''.....میں نیکی اور بدی کا موازنہ کیا گیا ہے۔اس میں وہ ایسی مذہبی اور سماجی تعلیم اور ایسے لوگوں کیخلاف آواز اٹھاتے ہیں جو معاشرہ میں تفریق کے بیج بوتے ہیں۔لوگوں کو آپس میں لڑا کر سماج کا نقصان کرتے ہیں''177

نظم ساقی کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے ایک نظم ''ساقی''، تخلیق کی جو عربک کالج میگزین دہلی، دسمبر 1938 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں انہوں نے سرمایہ داری اور امارت کے خلاف احتجاج بلند کیا ہے۔علاوہ ازیں تمام معاملات کو تقدیر کے حوالے کردینے والوں پر طنز کیا ہے چونکہ یہ نظم بھی کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے اس لیے اسے یہاں مکمل پیش کیا جارہا ہے تا کہ سردار جعفری کے ابتدائی ادبی ذوق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے۔ 178

قیامت ہے بپا طوفان دار و گیر ہے ساقی/ زمانے کی ادا چلتی ہوئی شمشیر ہے ساقی/ قدم ڈولے ہوئے ہیں آج بنیاد امارت کے لیے/ ہر آہ نارسا شرمندۂ تعبیر ہے ساقی/ کوئی جنت نہیں ہے میرے دامان تخیل میں/ میرے ساغر میں تیرے عکس کی تنویر ہے ساقی/ یہ تہذیب کہن دھوکا ہے اک اقوام غالب کا/ تمدن کچھ نہیں سونے کی ایک زنجیر ہے ساقی/ بغاوت ایک ابھرتا نقش ہے قرطاس عالم پر/ سکون زندگی مٹتی ہوئی تصویر ہے ساقی/ رگِ مزدور سے چوسا لہو سرمایہ داری نے/ یہ انسانی ہوس کی آخری تعمیر ہے ساقی/ ابھی تدبیر کے ہونٹوں کی مے پی ہی نہیں اس نے/ ابھی انساں اسیر گیسوئے تقدیر ہے ساقی/ یہ میخانہ یہ مرکز انقلابی جوانوں کا/ جوانی کے سنہرے خواب کی تعبیر ہے ساقی۔

سردار جعفری نے اس نظم میں ہٹلری، قیصری، فریب، ہوس، جنگ کی زرگری، ظلم و ستم پر یلغار کرتے اور ان تمام رویوں کو مٹانے، نظام کہن کی تبدیلی، مزدوروں کی محنتوں اور کوششوں کو سراہا ہے۔یہ نظم ''یلغار'' انقلابی نظم ہے لیکن لہجہ میں کرختگی کے ساتھ ساتھ نرمی اور ملائمت بھی ہے۔نظم کے تین بند پیش ہیں۔

وہ لائیں اپنے سیہ ارادے ہم اپنے دل کی امنگ لائیں/ ہم اپنے لوح و قلم نکالیں، وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں/ ہم اپنے بربط کے تار چھیڑیں وہ شورش رعد جنگ لائیں/ ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں وہ خون ناحق کا رنگ لائیں/ لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب جو لہو کا بیوپار کررہے ہیں/ ہم آج یلغار کررہے ہیں/.....نہ ہٹلری ہی رہے گی باقی یہاں نہ اب قیصری رہے گی/ فریب کی ساحری نہ اہل ہوس کی جادوگری رہے گی/ نہ جنگ کی زرگری رہے گی نہ ظلم کی قاہری رہے گی/ بس ایک محنت کی داوری اور فن کی پیغمبری رہے گی/ ازل سے ہم تا ردِ دل سے پیدا ابد کی جھنکار کررہے ہیں/ ہم آج یلغار کررہے ہیں/.....کس نے جادو سا کردیا ہے بدل گیا اس طرح نظارا سمے نے لی اک نئی جو کروٹ تو زندگی ہوگئی گوارا/ پگھل کے فولاد و توپوں نے کارخانوں کا روپ دھارا/ ہے چمنیوں کا دھواں بھی پر پیچ کاکلوں کی طرح دل آرا/ یہ معجزے ہیں ہمارے ہاتھوں کے ہم جنہیں پیار کررہے ہیں/ ہم آج یلغار کررہے ہیں۔

سردار جعفری کسی مسیحا اور سرفروش کے منتظر نظر آتے ہیں تا کہ ظلم و بربریت ختم ہو۔

نظم لمحۂ آفتاب (مشمولہ لہو پکارتا ہے) کا شعار ملاحظہ کیجئے۔

ہر طرف گولیوں کی بارش ہے/ ہر طرف ہیں جلوس نعروں کے/ خون آلودہ ہے فضا ساری/ اڑ رہے ہیں بغاوتوں کے عقاب/ پیاس سڑکوں پہ ہے برہنہ سر/ بھوک آمادہ انتقام پہ ہے/ شب کے حلقوں میں انتشار سا ہے/ صبح کا نور بے قرار سا ہے/ وقت کروٹ بدلنے والا ہے/ لمحہ آفتاب ہے اے دل/ کیا کوئی سرفروش ہے ایسا/ شعلۂ دل کو جو بلند کرے/ اور پھر آفتاب کر کے اسے/ ابن آدم کو تاج پہنا دے/ زندگی نور میں نہا جائے۔

سردار جعفری نے اپنی نظم ''آخری رات'' (مشمولہ پتھر کی دیوار) میں کوریا کی جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے ظلم و بربریت کا پردہ فاش کیا ہے۔ اس میں حقارت اور طنز بھرا لہجہ ہے۔

''کرسیاں، میز، فانوس، رنگیں جاموں کی دلکش کھنک/ بوتلیں/ اپنی لمبی سبک گردنوں میں چھپائے ہوئے/ قہقہے ہچکیاں/ اور شرابوں کی رنگت صراحی کے شیشوں پہ بیٹھی ہوئی/ سہمی سمٹی ہوئی ہوئی/ کوریا کا لہو/ یانکی افسروں کی نگاہوں پہ چھایا ہوا/ نوجوانوں کے سینے پلیٹوں میں رکھے ہوئے/ ماؤں کی چھاتیاں/ تیز کانٹوں کے ناخونوں میں/ ننھے بچوں کے گلرنگ رخسار امریکی چھریوں کے نیچے/ اور سی یول کا دل جگر/ نوک سنگین پر/ بم کے شعلوں میں بھونا ہوا/ آنسوؤں کی شراب اور چیخوں کا سنگیت۔

ڈاکٹر رفعت النساء بیگم لکھتی ہے:

''بارود'' سردار جعفری کا بہت ہی پسندیدہ، مرغوب اور محبوب لفظ ہے جو ظلم و ستم، ہٹلر اور نازی فوجیوں کی زیادتیوں، انگریزوں کے مظالم، جنگ، ظالم حکومت، خوف اور استحصالی طاقتوں کے لیے مختلف اشعار میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔

پچھم دیس سے خون کی اور بارود کی اندھی اندھی آئی (استالن کتھا)

سویت یونین آگ بارود اور خون کو جسم سے پونچھ کر بول اٹھا (امن کا ترانہ)

جس نے اس آگ، بارود کے تند سیلاب کو غرق خود اس کے ہی خون میں کر دیا (امن کا ستارا)

موت کے بیسیوں سر تھے اور سینکڑوں ہاتھ تھے/ لاٹھیوں کی طرح/ رائفل کی طرح/ انگلیاں لمبی لمبی تھیں، ناخن سنگینوں کے/ جسم خاکی تھا/ چہرہ گلابی تھا/ بارود کی سانس تھی (پتھر کی دیوار)

کوریا کی جواں رات کا جسم بارود کی طرح جلنے لگا (پتھر کی دیوار)

کوریا غیظ میں جلتی ہوئی بارود کی رات (پتھر کی دیوار)

انہیں یہ فکر کہ بارود کا اندھیرا چھائے (پتھر کی دیوار)

نگاہ کی بجلیوں سے بارود کے خزانوں کا دل جلائیں (پتھر کی دیوار)

سیاہ بارود کے اندھیرے سے زندگی کی سحر نہ ہوگی (پتھر کی دیوار)

گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں (پیراہن شرر)

خون و بارود کی بو، کو بھی معطر سمجھو (پیراہن شرر)

بجھا سکتی نہیں بارود روشن آفتابوں کو (پیراہن شرر)

برس کے کھل گئے بارود کے سیہ بادل (پیراہن شرر)

سیاہ بارود کی لکیریں/کٹیلے کاجل، سجیلے سُرمے/بانکپن سے الجھ گئی ہیں (ایک خواب اور)

ہوائیں گرم ہیں، بارود کا اندھیرا ہے.....ہوائیں بارود بن چکی تھیں/سیاہ بارود کے اندھیرے میں/بجلیاں بن کر گر رہے ہیں (لہو پکارتا ہے) 179

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کی شاعری میں ''لہو'' کے استعمال پر روشنی ڈالی ہیں۔

اقتباسات پیش ہیں:

(1) ''لہو'' سردار جعفری کے انقلابی مزاج کی شناخت ہے۔لہو ان کے ہاں استعارہ ہے، بے گناہی کا، مظلومیت کا، حق و صداقت کا اور سماجی جبر و استحصال کا۔

(2) ''لہو'' سردار جعفری کے ہاں ایک ایسی طاقت ہے جو کہیں نہیں رکتی۔دبائے نہیں دبتی، چھپائے نہیں چھپتی، حق و انصاف اور بے گناہی کا لہو، بہر حال پکارتا ہے۔ایک بے باک اور سرکش و چالاک شئے کی مانند کبھی نہیں بجھتا۔یہ کبھی مے کے پیالے میں جاگ اٹھتا ہے، کبھی اطلس و دیبا کے لباسوں میں سرسراتا ہے اور کبھی شاہراہوں پر دامنوں کو پکڑ کے اپنا حساب مانگتا ہے۔اسی لیے وہ بہتے ہوئے لہو کے محافظ بن کر قاتلوں کے گریبان پکڑ کر کہتے ہیں۔

مگر اب اس سے ڈرو انقلاب ہے یہ لہو ہر ایک ظلم و ستم کا جواب ہے یہ لہو

(3) ''اس بہتے ہوئے لہو کی کوئی تخصیص نہیں، اس کا کوئی مذہب نہیں، کوئی ملک نہیں، کوئی نسل نہیں۔یہ تو صرف ایک رنگ ہے۔ایک احساس ہے۔ایک شعلہ ہے۔ایک آواز ہے.....یہ تو ساری انسانیت اور زندگی کی علامت ہے۔شعلۂ حرف صداقت اور کلمۂ حق کا اجالا ہے۔اس لیے اس لہو کو بہانے سے فائدہ؟ سردار جعفری اس بہتے ہوئے لہو کو اپنی دونوں مٹھیوں میں سمیٹ کر اسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ یہ گرنے نہ پائے۔یہ معصوم و بے گناہ لہو!''

(4) ''یہ لہو جب بولتا ہے تو اچھے اچھے سورماؤں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں کیونکہ اس کی آواز، حق و صداقت کی آواز ہے جسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔''

(5) ''سردار جعفری حق و صداقت کے زبردست حامی ہیں۔اور صداقت کا سبق انہوں نے بچپن ہی میں پڑھ لیا تھا اور ہوش سنبھالتے ہی لہو کے تحفظ میں جٹ گئے تھے۔''

پروفیسر کوپی چند نارنگ نے سردار جعفری کی شاعری میں خون اور لہو کے شعری تلازمات پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

(1) ''خون اور لہو کے شعری تلازمات میر و غالب و مومن سے لے کر جدید شاعری تک مشترک ہیں۔اس لیے کہ یہ غزل کی تخلیقی روایت کا وہ حصہ ہیں جو سب کی دسترس میں ہے، لیکن سردار جعفری کی امیجری اس معاملے میں خاصی حساس ہے۔انہوں نے اپنے مجموعوں کے ناموں تک میں خون اور لہو کا استعمال کیا ہے۔(خون کی لکیر، لہو پکارتا ہے) خون، خون دل، خون

تمنا، خونِ جگر، اشکِ خون، آلودۂ خون، لہو، لہولہان، قتل، مقتل، قتل گاہ، دیدۂ خونابہ فشاں، کلاسیکی روایت کی یاد دلاتے ہیں اور روایتی و معاصر دونوں معنی میں استعمال ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے برعکس لہو میں تر بہ تر، خونِ بشر، خون سے سُرخ، سیل خون، لہو کا کفن، لہو بونا، شہیدوں کا لہو، شہادت، شہادت گاہ، گنجِ شہیداں جیسی تراکیب اور کلمے اس امیجری کو دوہری کیفیت عطا کرتے ہیں۔ مزید دیکھئے:۔

دوستو پیرا ہنِ جاں خونِ دل سے سرخ تر/ یا/ بس ایک تیغ کہ پیاسی ہے جو لہو کے لیے/ یا/ لہولہان ہوا جا رہا ہے سینۂ ساز/ یا/ اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب/''

(2) ''سردار جعفری کی امیجری واضح طور پر لہو رنگ ہے۔ یہ انیس کا تحت الشعوری اثر بھی ہو سکتا ہے اور شہادت عظمیٰ کے تخلیقی فیضان کی روایت کا بھی۔ لیکن سردار جعفری کا جوشِ بیان اکثر انہیں مرکزی حوالے سے ہٹا دیتا ہے۔ ذیل کے اقتباسات میں شہادت گاہ، قتل عام، حسین اور کفن لہو کا، سے جو فضا بندی ہوتی ہے، وہ نظم کے معنیاتی ارتکاز سے الگ ہے'':۔

دنیا کی شہادت گاہ میں ہو جو اپنے لہو سے سرخ کفن/ ہے چاکِ جگر کی شرط یہاں یہ حلقۂ دل افگاراں ہے

(جشنِ بادہ گساراں)

۔ ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں/ ایک سیل رواں دردِ حیات اور دردِ کا ساحل کوئی نہیں ہر گام پہ خون کے طوفان ہیں ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں/ ہر لحظہ ہے قتلِ عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں (دو شعر)

۔ یہ ظلم و جبر بھی اک پیاس ہے جو صدیوں سے/ بجھائی جاتی ہے انساں کے خونِ ناحق سے/ کوئی حسین ہو، کوئی مسیح یا سقراط/ لہو کی پیاس انہیں ڈھونڈتی ہی رہتی ہے/ زباں نکالے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے (ایک پرانی داستان)

۔ تمام صحنِ چمن مقتلِ تمنا ہے/ کفن لہو کا ملا ذوقِ جستجو کے لیے (اہلِ درد)

(3) ''اس سلسلہ میں سردار جعفری کی قابلِ ذکر نظمیں ''قتلِ آفتاب'' اور ''یہ لہو'' ہیں۔

''قتلِ آفتاب'' کے پہلے تین بند ملاحظہ ہوں:۔

شفق کے رنگ میں ہے قتلِ آفتاب کا رنگ/ افق کے دل میں ہے خنجر لہولہان ہے شام/ سفید شیشۂ نور اور سیاہ بارش۔ سنگ/ زمیں سے تا بہ فلک ہے بلند رات کا نام۔

۔ یقین کا ذکر ہی کیا ہے کہ اب گماں بھی نہیں/ مقام درد نہیں، منزلِ فغاں بھی نہیں/ وہ بے حسی ہے کہ جو قابلِ بیاں بھی نہیں/ کوئی ترنگ ہی باقی رہی نہ کوئی امنگ/ جبینِ شوق نہیں سنگِ آستاں بھی نہیں، رقیب جیت گئے ختم ہو چکی ہے جنگ/ دلوں میں شعلۂ غم بجھ گیا ہے کیا کیجئے/ کوئی حسین نہیں کس سے اب وفا کیجئے/ سوائے اس کے کہ قاتل ہی کو دعا دیجئے۔

(4) بعد کے پانچ بندوں میں قافلۂ رنگ و نور کے نکلنے کی وہی نوید ہے جو ان کی پوری شاعری کا امتیازی نشان ہے ''یہ لہو کا پیرایۂ بیاں/ یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں/ وضاحت طلبی میں جوش کی یاد دلاتا ہے لیکن نظم کا مرکزی بند معنی خیز ہے، اور بنیادی حوالے سے گہرے طور پر مربوط ہے۔ اس میں اس روایت کی طرف اشارہ ملتا ہے جب میدانِ کرب و بلا میں امام حسینؓ نے اپنے ششماہی بچے علی اصغر کو جو پیاس کی شدت سے دم توڑ رہا تھا، اپنے ہاتھوں پر لیا اور ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر اس کی

دردناک حالت دشمنوں کو دکھائی اور فرمایا کہ یہ معصوم پیاس سے جاں بلب ہے اس کی ماں کا دودھ بھی خشک ہوگیا ہے اگر ایک قطرہ پانی اس کے حلق میں ٹپکا دو تو اس کی جان بچ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر پتھر دل دشمن بھی پسیج گئے اور بعض نے پانی دینے کا ارادہ کیا لیکن عمر بن سعد کے اشارے پر حُرملہ نے ایک سہ پہلو تیر ایسا تاک کر مارا جو بچے کی گردن اور باپ کا بازو توڑ کر نکل گیا۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ تڑپ کر ختم ہوگیا۔ روایت ہے کہ علی اصغر کا گرم سرخ خون جب دھرتی پر ٹپکنے لگا تو آواز آئی کہ اس سے زمین جل جائے گی اور کوئی دانہ نہ اُپجے گا۔ امام حسینؓ نے خون کو چلو میں لیا اور آسمان میں اچھالنا چاہا۔ آواز آئی کہ آسمان سے بھی قطرۂ رحمت نہ برسے گا۔ مجبور اُحسین نے معصوم کے خون کو گرنے نہ دیا اور اپنے چہرۂ اقدس پر مل لیا:

؎ اس لہو کا کیا کرو گے/ یہ لہو اگرم و سرخ و نوجواں/ خاک پر ٹپکے گا تو جل جائے گی دھرتی کی کوکھ/ آسماں سے قطرۂ رحمت نہ برسے گا کبھی/ کوئی دانہ پھر نہ اُپجے گا کبھی/ کوئی کونپل مسکرائے گی نہ پھر مہکے گا پھول

؎ یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو، یہ لہو نظروں کا نور/ یہ لہو عارض کی رنگت، یہ لہو دل کا سرور/ آفتابِ کوہِ فاراں، جلوۂ سیناوطور/ شعلہ حرفِ صداقت سوزِ جانِ ناصبور/ کلمۂ حق کا اجالا، یہ تجلی کا ظہور/ یہ لہو، میرا لہو، تیرا لہو، سب کا لہو۔

اس سلسلہ میں سردار جعفری کے یہ دو قطعے بھی قابلِ ذکر ہیں:

؎

دردِ دریا ہے ایک بہتا ہوا/ جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں/ وہی تلوار اور وہی مقتل/ صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں۔ ہر ایک خوشی درد کے دامن میں پلی ہے/ نسبت ہے ہر اک نغمے کو بسمل کے گلو سے/ پیراہن گل، دستِ صبا، پنجۂ گُل چیں/ رنگین ہے ہر چیز شہیدوں کے لہو سے۔ 181

نظم ''لہو پکارتا ہے'' مارچ 1967 کی لکھی ہوئی ہے۔

عمر رضا نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے:

''اس (نظم) میں موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی برائیوں کی طرف بے حد لطیف اور علامتی انداز میں اشارہ کیا گیا ہے جس میں احتجاج کا پہلو بھی کسی قدر پایا جاتا ہے۔ ''لہو'' جو مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور بے سہاروں کی علامت ہے وہ اپنی بے بسی، بے چارگی اور معاشرے کے استحصال رویے کے خلاف آواز بلند کرتا نظر آتا ہے لیکن اس کی فریاد اس کے درد کی صدا بے حس حکمرانوں اور اقتدار کے لالچیوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ انہیں تو ظلم سے مطلب ہے، مظلوموں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ 182

؎ لہو پکارتا ہے جیسے خشک صحرا میں/ پکارا کرتے تھے پیغمبرانِ اسرائیل/ زمیں کے سینے سے اور آستینِ قاتل سے/ گلوئے کشتہ سے بے حس زبانِ خنجر سے/ صدا لپکتی ہے ہر سمت حرفِ حق کی طرح/ مگر وہ کان جو بہرے ہیں سن نہیں سکتے/ مگر وہ قلب جو سنگین ہیں ہل نہیں سکتے/ کہ ان میں اہلِ ہوس کی صدا کا سیسہ ہے/ وہ جھکتے رہتے ہیں لبہائے اقتدار کی سمت/ وہ سنتے رہتے ہیں بس حکمِ حاکمانِ جہاں/ طواف کرتے ہیں اربابِ گیر و دار کے گرد/ مگر لہو تو ہے بیباک و سرکش و چالاک/ یہ شعلہ مے کے پیالے میں جاگ اٹھتا ہے/ ..... یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے۔

سردار جعفری نے ''لہو'' کو مزدوروں، کسانوں اور استحصال زدہ عوام کی علامت متصور کیا اور اسے دلنواز، حسین اور دلکش

بتایا ہے لہو ان شہیدوں کی بھی علامت ہے جنہوں نے ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کی اور اپنی قیمتی جانیں دے دیں۔ سردار جعفری نے اپنی بات کو بے حد لطیف اور نرم لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ نظم ''دلنواز لہو'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے: ؎

بہت حسین بہت دلنواز ہے یہ لہو/ کشید تم نے کیا ہے جو قلب انساں سے/ جو عارضوں سے چرایا لبوں سے چھینا ہے/ تمہارے جام میں ڈھلتا ہے موج مے بن کر/ لطیف و نرم ہے ٹیگور کی زباں جیسے/ جوان و شوخ لچکتی ہیں بجلیاں جیسے/ یہ ندیوں کی طرح سے زمیں پہ بہتا ہے/ تمہارے پاؤں کے نیچے ہمیشہ رہتا ہے/ خموش جیسے یہ منہ میں زباں نہیں رکھتا...../ بہت حسین بہت دلنواز ہے یہ لہو/ مگر اب اس سے ڈرو انقلاب ہے یہ لہو/ ہر ایک ظلم و ستم کا جواب ہے یہ لہو۔

سردار کی نظموں میں آزادی کے بعد قومی حکمرانوں کی کارکردگی پر عدم اعتماد کا اظہار ملتا ہے۔

نظم ''گرد کارواں'' شعری مجموعہ ''خون کی لکیر (1949) میں شامل ہے اس نظم میں سردار جعفری نے قومی حکمرانوں سے خطاب کیا ہے اور ان کی کارکردگی پر اپنی ناخوشی اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

''بیشتر نظموں میں آزادی کے بعد کے حالات کی عکاسی اور قومی حکمرانوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔..... جب ترقی پسندوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں ملی جو انہوں نے آزادی سے قبل دیکھی تھی تو انہیں بہت جلد اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ نظام تو وہی ہے بس حکمراں بدل گئے ہیں۔ آزادی سے قبل انگریز تھے اب قومی حکمراں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد کی نظموں میں بغاوت کا عنصر حاوی ہے..... نظم ''گرد کارواں'' میں سردار جعفری نے پہلے تو قومی حکمرانوں کو سرفراز مثل آسماں، حریت کی منزلوں کے رازداں، فخر عالم، ناز ہندوستان، گزرے ہوئے عہد طرب کی داستان، ہندوستان کے دریاؤں سے طوفان اٹھانے والا، آزادی کے راگ سکھانے والا وغیرہ بتایا ہے لیکن اس کے بعد انہیں قومی حکمرانوں پر زبردست طنز کیا ہے..... اس نظم میں انقلابی آہنگ، گھن گرج یا بغاوت نہیں بلکہ صرف اظہار افسوس ہے۔ قومی حکمرانوں کی تنقید کے لیے جذباتیت یا انتہاپسندی کو اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ خیالات کا اظہار بڑی شائستگی اور سنجیدگی سے کیا گیا ہے۔ البتہ طنز کی کاٹ ضرور ہے۔183

چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

یہ مانا آج سرفراز مثل آسماں تم ہو/ مگر گزرے ہوئے عہد طرب کی داستاں تم ہو/ تمہیں میدان میں انگڑائی پر انگڑائی آتی تھی/ تمہارے حوصلوں پر خود شجاعت مسکراتی تھی/ تمہیں نے اپنے خوں سے شمع آزادی جلائی تھی/ مگر اب شمع آزادی کے سینے کا دھواں تم ہو/ تمہیں آگے بڑھے تھے زندگی کا جام لینے کو/ تمہیں اٹھے تھے سوز عشق کا پیغام دینے کو/ تمہیں نکلے تھے کل جمہوریت کی ناؤ کھینے کو/ اسی جمہوریت سے آج لیکن بدگماں تم ہو/ کسانوں سے پریشاں ہو تو مزدوروں سے نالاں ہو/ بغاوت سے ہو خائف اشتراکیت سے لرزاں ہو/ عدو کو چھوڑ کر اپنوں ہی سے دست و گریباں ہو/ خفا ہو دوستوں سے دشمنوں پر مہرباں تم ہو/ جنہوں نے اپنے سکے چور بازاروں میں ڈھالے تھے/ یہ کیا ہے آج ان سرمایہ داروں کی زباں تم ہو۔

سردار جعفری کی قومی حکمرانوں سے شکایت کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''قومی حکمرنوں سے ان کی شکایت بجا ہے کیونکہ سرداراس زمانے میں اشترا کی نظریہ کے زبردست قائل تھے۔آزادی کے بعد جب ان کے نظریے کو ان کے قومی حکمرانوں نے ٹھکرا دیا اور ایسے نظریات کے حامل لوگوں کو زنداں میں قید کر دیا تو اس طرح کے خیالات کا منظر عام پر آنا ایک فطری امر ہے''۔ 184

عمر رضا لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد جب مزدوروں اور کسانوں کے مسائل حل نہیں ہوئے تو سردار جعفری نے قومی حکومت کے خلاف صف آرائی کے لیے مزدوروں اور کسانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔تلنگانہ کے ان چالیس لاکھ کسانوں کی حمایت میں انہوں نے ایک نظم ''تلنگانہ''(مشمولہ خون کی لکیر)تحریر کی جو اس زمانے میں اپنے حقوق کے لیے مسلح بغاوت کر رہے تھے۔ 185

اشعار ملاحظہ کیجیے:

تہلکہ رات کی سرحد پہ مچا رکھا ہے/لشکر صبح میں شب خون کی تیاری ہے/ یہ ابلتے ہوئے نعرے ہیں کہ سیلاب عظیم/ جو در و بام سے ایوانوں کے ٹکراتے ہیں/خس و خاشاک بہا جاتا ہے جاگیروں کا/ .....رات کی کود میں جلتے ہیں بغاوت کے الاؤ/ ڈالیاں کرتی ہیں تیار شگوفوں کے لباس/ فتح کے جشن منانے کے لیے/اب یہ ٹوٹے ہوئے ٹھٹھرے ہوئے جکڑے ہوئے ہاتھ/بڑھ کے محلوں کو اٹھائیں گے کھلونوں کی طرح/ ..... میں بہت دور سہی تجھ سے پر اے ارض دکن/ تیرے جذبات و خیالات سے نزدیک ہوں میں/ .....خبریں جب آتی ہیں کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے لاش/ کود سے جنگ کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار لیے/ .....اور مرے سینے میں اک آگ سی لگ جاتی ہے/مراہر قطرۂ خوں مجھ سے یہ کرتا ہے سوال/ بولو ہم جنگ کے میدان میں کب اتریں گے؟/اس بغاوت کی حسین راہ سے کب گزریں گے؟

ہر طرف ہے ریگ صحرا' ہر طرف ہے خار زار
خونِ دل دیجئے تو شاید ہے کہ آجائے بہار
رہبری میں جس کی سارے کارواں کو سونپ دیں
ہے کہاں کوئی تو بتلاؤ وہ مرد اعتبار
یوں تو کہنے کے لیے آتی ہیں صبحیں روز بروز
جانے کیوں کٹتی نہیں ہے پھر بھی شام انتظار
عارض گل ہے کہ محروم تجلی اب بھی ہے
کب سے رکھی ہے خزاں کے دل پہ تیغ نو بہار

جنوری 1974 کا یہ شعر

حرف شوق سنتے ہی حسن پر بہار آئی
لب سے اک کرن پھوٹی آنکھ میں فسوں آیا
کیا اسی کو کہتے ہیں کاروبار جمہوری
تیغ سربلند آئی صیدِ سرنگوں آیا

عمر رضا نے لکھا ہے:

''زمانے کی بے مہری ایام اور مختلف قسم کے تعصّبات سے پُر دنیا سے کسی بھی قسم کی توقعات آج کے دور میں بے کار محض کی چیز ہے۔ان حالات میں ایک سادہ لوح انسان اگر چہ ڈھیر ساری توقعات وابستہ کر لیتا ہے لیکن عموماً یہ پوری نہیں ہوتیں۔ ایسے میں سردار جعفری کا یہ کہنا یقیناً حقیقت پر مبنی ہے کہ۔

لُو کے موسم میں بہاروں کی ہوا مانگتے ہیں
ہم کف دست خزاں پر بھی حنا مانگتے ہیں
ہم نشیں سادہ دلی ہائے تمنا مت پوچھو
بے وفاؤں سے وفاؤں کا صلہ مانگتے ہیں

186

عمر رضا نے سردار جعفری کی نظم ''کشاکش'' (مشمولہ خون کی لکیر) کے بارے میں لکھا ہے:

''اس نظم میں انقلاب اور بغاوت سے پُر ادب کی وکالت کی گئی ہے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے حالات کے پیش نظر قومی حکومت کی سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔ملک میں جس طرح سے سرمایہ دارانہ عناصر نے اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی تھیں۔ اس کے مداوا یا اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے نظم میں واضح گائیڈ لائن بھی موجود ہے۔187

؎ ہڈیاں جلتی ہیں اور خوں کے ابلتے ہیں کڑھاؤ/ایک آسیب ہے سرمایہ پرستی کا سماج/سر کٹی ہاتھ کٹی پاؤں کٹی لاشوں سے/زندگی موت کے دربار کو دیتی ہے خراج/.....کاٹنا پڑتا ہے تلواروں کو تلواروں سے/اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا/ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب/جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا۔

سردار جعفری نے باغیانہ انداز میں موجودہ کانگریس کی حکومت پر' جسے انہوں نے اہنسا کے پجاری' سے تعبیر کیا ہے' کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے اس کے ذریعہ ڈھائے جا رہے ظلم و ستم اور تشدد کو مٹانے کی بات کہی ہے.....اس زمانے کی نظم'' جیل'' ہے (مشمولہ خون کی لکیر) جس میں سردار جعفری جلد ہی گرفتار ہوئے تھے اور سنٹرل جیل ناسک میں اسیری کے دن گزار رہے تھے۔ 188

؎ نالے بے سود ہیں بیکار ہے فریاد یہاں/ہم ہیں صید اور ہر اک ذرہ ہے صیاد یہاں/اپنے ہاتھوں سے تشدد کو مٹانا ہوگا/ آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا۔

نظم جشن بغاوت میں (مشمولہ خون کی لکیر) کمیونسٹ پارٹی کی زبردست تبلیغ کی گئی ہے۔اس نظم کے ذریعہ عوام کو ہر گام اور ہر سو سرخ پرچم لہرانے' استالین اور لینن کے گیت گانے اور پیشانی تاریخ پر مزدور کا نام لکھنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ آزادی سے قبل تو فرنگی اور انگریزوں کی ظلم و زیادتیاں روا تھیں لیکن اب ہند کے راج دلارے ہی اس عمل میں پیش پیش تھے۔نظم میں قومی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے' باغیوں اور انقلابیوں کو ایک بار پھر منظّم ہو کر ان قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی بات کہی گئی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی پامالی پر اتر آئے ہیں۔ 189

؎ آج ہر گام ہر سو سرخ علم لہراؤ/ گاؤ استالن و لینن کے ترانے لگاؤ/ اک ایڑ اور بھی رہوار بغاوت کو لگاؤ/ لکھ دو پیشانی تاریخ پہ مزدور کا نام/ ساتھیو لال سلام/ ڈوبتی رات کے تاروں کو کفن پہنا دو/ مارشل چیانگ کے پیاروں کو کفن پہنا دو/ ہند کے راج دلاروں کو کفن پہنا دو/ گھر میں سرمایہ کے مدت سے مچا ہے کہرام/ ساتھیو لال سلام/ پھونک دو کالے فرنگی کے صنم خانے کو/ کھود کر گاڑ دو بربردولی کے افسانے کو/ آج جاتی ہے ہر اک راہ تلنگانے کو/ قافلے کر نہیں سکتے کسی منزل پہ قیام/ ساتھیو لال سلام۔

اس نظم کے تعلق سے عمر رضا قمطراز ہیں:

''نظم خونیں ہاتھ'' میں موجودہ حکومت کو خونیں ہاتھ سے تعبیر کر کے اس شدید نفرت اور حقارت کا اظہار کیا گیا ہے جسے آزادی سے قبل کے سیہ پوشیوں سے تعبیر کیا ہے جو اس ''حسین دیس'' میں آج بھی آستینوں میں ایٹم بم چھپائے بل کھاتے پھرتے ہیں۔ آزادی کے بعد ان میں (موضوعات) قدرے معتدل اور نرم لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں'' 190

''نظم خونیں ہاتھ'' کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ وہی ہاتھ ہیں سفاک و دراز/ ہاں وہی ہاتھ ستم پیشہ و چالاک و ذلیل/ میرے پہچانے ہوئے اور ترے پہچانے ہوئے/ وہ جو مغرب کے سیہ پوش افق سے نکلے/ آگ مشرق کی بہاروں میں لگانے کے لیے/ آج بھی میرے حسین دیس میں بل کھاتے ہیں/ ..... ہاں وہی ہاتھ خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھ/ قتل و غارت کے ارادوں نے چنا ہے جن کو/ اسلحہ ساز مشینوں کے تراشے ہوئے ہاتھ/ موت کا روپ منافع نے دیا ہے جس کو/ آہ ان ہاتھوں سے میں ہاتھ ملاؤں کیونکر/ اپنی نفرت کو حقارت کو چھپاؤں کیونکر/ توڑ دو کاٹ دو یا آگ لگا دو ان کو/ بن پڑے جیسے بھی گردن سے ہٹا دو ان کو۔

سردار جعفری نے نظم نوالا (مشمولہ ایک خواب اور) میں بچہ مزدوری کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ غریب بے سہارا مزدور ماں باپ دونوں کام کرتے ہیں۔ حالات کا شکار ہو کر اپنے بچوں کو بھی مزدوری کرواتے ہیں۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

''ماں ریشم کے کارخانے میں کام کرتی ہے۔ باپ سوتی مل میں کام کرتا ہے۔ جب اس کے بچے ہوتے ہیں تو وہ بھی حالات کا شکار ہو کر بچپن ہی سے کارخانوں کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے پیٹ کی خاطر سرمایے کی بھوک کو بڑھاتے ہیں۔ اس نظم میں بچہ مزدوری کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے اور سماج کے اس گھناؤنے اور کبھی نہ ختم ہون والے عمل کی جانب عوام کی توجہ مرکوز کی ہے۔'' 191

؎ اپنے مجبور پیٹ کی خاطر/ بھوک سرمائے کی بڑھائے گا/ ہاتھ سونے کے پھول اگلیں گے/ جسم چاندنی کا دھن لٹائے گا/ کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن/ خون اس کا دیے جلائے گا/ یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے/ صرف سرمائے کا نوالا ہے/ پوچھتی ہے یہ اس کی خاموشی/ کوئی مجھ کو بچانے والا ہے۔

معز ہ ابراہیم قاضی قمطراز ہیں:

''بمبئی کی زندگی کے اپنے مسائل ہیں۔ یہاں رہائش کا مسئلہ ایک سنگین مسئلہ ہے جس میں لوگوں کی آمدنی (Income) بہت بڑا رول ادا کرتی ہے۔ عام طور سے لوگ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں گزر بسر کر لیتے ہیں۔ متوسط آمدنی

والے لوگ بھی ''کھولیوں'' یا چھوٹے چھوٹے کمروں میں زندگی کے دن کاٹ لیتے ہیں۔زندگی گزارنے کے لیے اور دو وقت کی روٹی کے لئے گھر کے سارے افراد معیشت میں روزگار تلاش کرتے ہیں۔سردار جعفری نے بمبئی کی اس زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور وہ عصری مسائل سے آگاہ ہیں۔اس عصری شعور اور مشاہدہ کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم ''نوالا'' ہے جو عصری شہری زندگی کی منہ بولتی تصویر ہونے کے ساتھ ایک خوبصورت ادبی مرقع بھی ہے.....سردار جعفری کی مذکورہ نظم صرف ممبئی ہی نہیں بلکہ بڑے شہروں بلکہ مشرقی ممالک کے معاشی اور سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے پیدا شدہ مسائل کے ادراک کی ایک خوبصورت مثال ہے اور جس شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ نظم کہی گئی ہے وہ عصری معاشی و معاشرتی شعور کی ایک علامت ہے۔'' 192

اسلم عمادی لکھتے ہیں:

''انسانیت دوستی اور دردمندی کی ایک اہم مثال ہے ان کی نظم ''نوالا'' جو ایک ایسے نوزائیدہ بچے کی دردناک صورتِ حال پیش کرتی ہے جس کے ماں اور باپ دونوں ہی محنت کش مزدور ہیں اور کارخانہ میں ہمہ وقتی طور پر مصروف ہیں اور اس وجہ سے اس نوزائیدہ کو نہ تو متوقع توجہ مل سکتی ہے نہ ہی تعلیم وتربیت۔گویا اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں کہ وہ خود بھی بڑا ہو کر ایک مظلوم، محنت کش مزدور بن چکے جو سرمایہ داروں کے سرمایہ کے فروغ کے لیے ایندھن کی طرح ہو اور اس طرح نظم کے آخری مصرعے کچھ یوں ہیں:

یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے/خونیں سرمایے کا نوالا ہے/پوچھتی ہے یہ اس کی خموشی/کوئی مجھ کو بچانے والا ہے 193

عمر رضا نے لکھا ہے:

''بھوکی ماں بھوکا بچہ'' بھی ایک انقلابی نظم ہے جس میں موجودہ کانگریسی حکومت پر زبردست طنز کیا گیا ہے۔ملک کی ماؤں اور بچوں کے بھوک وافلاس کو ظاہر کر کے آزادی کے بعد کے ہندوستان کا نقشہ کچھ یوں کھینچا گیا ہے۔

میرے ننھے مرے معصوم مرے نورِ نظر/آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو/ ..... چھاتیاں آج مری سوکھ گئی ہیں لیکن /آنکھیں سوکھی نہیں اب تک مرے لال/درد کا چشمہ بیتاب رواں ہے ان سے/مرے اشکوں ہی سے تو پیاس بجھا لے اپنی/سنتی ہوں کھیتوں میں اب اناج نہیں اگ سکتا/کانگریس راج میں سونا ہی پھلا کرتا ہے۔

اس نظم میں....سردار جعفری نے اپنے احتجاج کو بڑے نرم اور طنزیہ انداز میں درج کیا ہے۔ 194

پروفیسر وارث علوی لکھتے ہیں:

''پتھر کی دیوار میں ایک نظم ہے ''بھوکی ماں بھوکا بچہ'' ایک بھوکی ماں لوریاں دے کر اپنے بھوکے بچے کو سلانا چاہتی ہے اور جبکہ وہ سمجھتی ہے کہ وہ سو گیا ہے تو وہ دراصل دم توڑ چکا ہوتا ہے۔نظم اس قدر اذیت ناک ہے کہ اسے دوسری بار پڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا'' 195

1976 میں کہے گئے یہ تین شعر ملاحظہ ہوں ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ تھی۔چاروں طرف بے چینی کی کیفیت طاری تھی۔اس عہد کی لکھی گئی نظموں میں اس عہد کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

مژدۂ شوق ابھی با دصبا لائی ہے/ ارضِ مشرق میں نئے جشن کی تیاری ہے/ لالہ وگل سے فروزاں ہے گزرگاہ خیال/ ہر طرف خون تمنا کی جوگلکاری ہے/ قریہ وشہر میں جھنکاریں ہیں زنجیروں کی/ اور ویرانوں میں تخلیق جنوں جاری ہے۔

20 ستمبر 1972 کی لکھی گئی نظم ''کون سچ بولے گا'' میں سردار جعفری نے ملک کے ان حالات پر زبردست طنز کیا ہے جہاں سچ بولنا' بدامنیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا بھی جرم ہے ۔

کون اس عہد میں سچ بولے گا/ حرف آتے ہیں قطاروں میں سپاہی کی طرح/ حکم شاہی کی طرح/ اور پھر آتے ہیں کچھ اور بھی حرف/ صف بہ صف دستِ جنوں باندھے ہوئے/ ایک بھی حرف نہیں جو دل جاں بن جائے/ عہد حاضر کی زباں بن جائے/ سچ تو اک درد ہے اک زخم ہے اک جرأت ہے/ قید و زنداں بھی ہے سچ اور رسن و دار بھی ہے/ لذت شوق بھی ہے ندرتِ اظہار بھی ہے/ کون ہوتا ہے حرف مے مرد افگن عشق

نظم ''آرزوئے تشنہ لبی'' میں سردار جعفری نے موجودہ صورت سے اپنی عدم اطمنانی کا اظہار کیا ہے اور جو حکمراں صحت مند معاشرے کی تشکیل کے خواہاں تھے وہی عیش وعشرت میں پڑے ہوئے ہیں اور اب انہیں معاشرہ کی فکر نہیں ہے ۔

خشکی لب ہے نہ اب دیدۂ تر باقی ہے/ جانے کیا ہوگئے وہ عہد گزشتہ کے رفیق/ وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقوں کا غرور/ وہ جو اٹھے تھے زمانے کو بدلنے کے لیے/ ایسے بدلے ہیں کہ حیراں ہیں نگاہیں سب کی/ زیر پا مخمل آسودہ خرامی کا ہے فرش/ زیب تن خلعتِ پشمینۂ دریوزہ گری/ دل ہے یہ نغمہ محوں گشتۂ آواز ضمیر/ جن میں تلوار تھی ان ہاتھوں میں اب ساغر ہیں/ جن میں شفقت تھی ان آنکھوں میں رعونت اب ہے/ اور ان سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر رکھتے ہیں/ چند خیرات میں بخشی ہوئی مے کے جرعے/ چند مانگے ہوئے چھلکے ہوئے ٹوٹے ہوئے جام/ دوستو جرأت شعلہ طلبی لے کے اٹھو/ آج پھر آرزوئے تشنہ لبی لے کے اٹھو۔

1966 میں لکھی نظم ''تمہارا شہر'' میں موجودہ سیاسی سماجی اور معاشرتی صورت حال کو علامتی' استعاراتی اور طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر وارث علوی نے لکھا ہے ''سردار کی نظم'' تمہارا شہر'' اس پُرتشدد انارکی کا بیان ہے جس سے اس برصغیر کے بیشتر شہر گزرے ہیں'' 196

1966 میں لکھی نظم پھول' چاند' پرچم میں موجودہ صورت حال پر جھنجھلاہٹ اور کسی قدر تلخ لہجہ ہے حکومتوں کا جلال اہل حکم کی صولت/ سیاہ کاروں کا زور اہل ہوس کی دولت/ خبیث روحوں خبیث اعمال کی سیاست/ وہ گندگی جس کا ظاہری روپ ہے نفاست/ ابھی ہیں اس قافلے سے لرزاں/ یہ قافلہ پھول' چاند' پرچم اٹھائے صدیوں سے چل رہا ہے۔

عمر رضا نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک خواب اور'' میں شامل ''کوچۂ چاکِ گریباں' ایک مختصر سی نظم ہے جس میں موجودہ حالات پر طنز کے ساتھ ساتھ عاشق ومعشوق کے درمیان روایتی رشتوں کی جو نوعیت ہوتی ہے' اس کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف حکومت کے محض سبز باغ دکھانے اور تصورات کی دنیا کی سیر کرانے پر طنز کیا گیا ہے تو دوسری جانب روایتی عاشق کا کوچۂ یار میں مرنا' زخم سر اور زخم جگر کا بھی خواہاں ہونا' پیش کیا گیا ہے۔ کوچۂ چاکِ گریباں میں بہار کے آنے کا مطلب یہ ہے کہ حالات امید افزا نہیں ہیں۔ وہ سردار جو

کبھی اپنی زیادہ تر باتیں براہ راست کہا کرتے تھے اب وہی باتیں استعاروں کے پردوں میں کہتے نظر آتے ہیں۔ 197

؎ دل وحشی کو دیا دشتِ جنوں نے مژدہ/کوچۂ چاکِ گریباں میں بہار آئی ہے/آج دیوانوں کو ہر چیز میسر ہوگی/دردکی شمع تصور کا پری خانہ بھی/اور تمناؤں کی گل چہرہ کنیزوں کا ہجوم/زخم سر زخم جگر اب بہت ارزاں ہوں گے/وحشت دل کے لیے دشت وبیاباں ہوں گے/راہ میں دار و رسن محبس و زنداں ہوں گے/کوچۂ یار میں مر رہنے کے ساماں ہوں گے/کوچۂ چاک گریباں میں بہار آئی ہے

نظم ''اردو'' کے بارے میں عمر رضا رقمطراز ہیں:

''نظم اردو میں سردار جعفری نے اردو کی تعریف کی ہے اور اس کے خلاف بن رہی متعدد متعصّبانہ پالیسیوں کا ذکر کیا ہے۔ اردو کو نغموں کی جان' انگریز حکمرانوں کی خودسری کا جواب' زنداں کی تیرگی میں دیے جلانے والی بتانے کے بعد اردو کو اپنے ہی وطن میں جس طرح کی بے وطنی کا درد برداشت کرنا پڑ رہا ہے' اس کے خلاف زبردست احتجاج درج کیا ہے۔ بالخصوص اردو داں طبقے کو اُس کے حقوق بتاتے ہوئے اس کی آبیاری اور ترقی کے لیے کچھ مشورے دیے ہیں۔

ہمیں یہ حق ہے ہم اپنی خاک وطن میں اپنا چمن سجائیں/ ہماری ہے شاخ گل تو پھر کیوں نہ اس پہ ہم آشیاں بنائیں/ہم اپنے انداز اور اپنی زبان میں اپنے گیت گائیں/کہاں ہو متوالو آؤ بزم وطن میں ہے امتحاں ہمارا/ زبان کی زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا/ ہماری اردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستان ہمارا 198

جیل میں لکھی گئیں سردار جعفری نظموں کے بارے میں مظہر امام لکھتے ہیں:

''فیض کو زنداں کی دیواروں کے درمیان گوشۂ تنہائی میسر آیا تو ان کی شاعری پر بہار آئی.....سردار جعفری کا جیل جانا بھی ان کے حق میں فال نیک ثابت ہوا۔ وہ اپنی اشتراکی سرگرمیوں اور اشتعال انگیز نظموں کی پاداش میں 10/اپریل 1949 سے اندازاً جون 1950 تک آرتھر ڈروڈ جیل بمبئی اور سنٹرل جیل ناسک میں قید رہے۔

وہ 12 اپریل 1949 کو سلطانہ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''ہمیں اس لیے بھی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ مجھے آرام پہنچا رہی ہے تاکہ تھکے ہوئے دل و دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔ دنیا کے کئی شاہکار جیلوں میں لکھے گئے ہیں۔ میں اگر یہاں زیادہ دن رہا تو میں بھی بہت کچھ لکھوں گا جو بہت دنوں سے لکھنا چاہتا ہوں۔''

اپنی گرفتاری کے دوران میں انہوں نے چند نہایت اچھی نظموں لکھیں مثلاً پتھر کی دیوار' نیند' اودھ کی خاک حسیں' ان کے علاوہ تمہاری آنکھیں' شادی کا دن اور ''جیل کی رات'' بھی جیل میں کہی گئی تھیں۔ 199

زبیر رضوی نے قید خانے میں تخلیق پانے والے ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے فیض اور سردار جعفری کی زنداں میں لکھی گئی شعری تخلیقات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

(1) ''دنیا کی ہر زبان میں قید خانے یا زنداں میں تخلیق پانے والا ادب' گنج گراں مایہ کی صورت میں موجود ہے خواہ نثر ہو یا شاعری قید خانہ کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جو کچھ لکھا گیا اس کا چربہ بھی خوب ہوا اور اس میں کافی کچھ ایسا بھی تھا جو ادب

کی مختلف کسوٹیوں پر کھراترتا رہا۔ہندوستانی ادب میں بھی ایسے ادب کی خاص طور سے شاعری میں کمی نہیں رہی جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے احتجاج، مزاحمت اور باغیانہ جذبے کے ساتھ لکھا گیا ہو اور جو جیل سے باہر کی فضا میں جبر اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف ہندوستانی ذہن وفکر کو صف آرا ہونے اور پیکار کے محاذوں کی تشکیل کرنے کی تحریک دینے میں معاون بنا ہو۔اردو شاعری کے تین مجموعوں نے اردو شاعری کی ترقی پسند فضا کو متاثر کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔فیض کا شعری مجموعہ "دست صبا" اور "زنداں نامہ" اور علی سردار جعفری کا مجموعہ "پتھر کی دیوار" قید ہی کے دنوں میں لکھے اور ترتیب دیئے گئے.....ان دونوں شاعروں کا تعلق چونکہ ترقی پسند تحریک اور رجعت پسند طاقتوں کے خلاف صف آرائیوں سے تھا اس لیے ان کی شاعری میں انقلاب، مزاحمت اور جبر وظلم کے ماحول کو بدل دینے کی غیر معمولی خواہش اور تڑپ پائی جاتی ہے۔باغی اور انقلابی اسی لیے پس زنداں ڈال دیئے جاتے ہیں کہ چلتی پھرتی، سانس لیتی زندگی میں ان کی موجودگی آتش گرما اور بم کے دھماکے جیسی ہوتی ہے۔جبر اور استبداد کے دنوں میں سماج کے کمزور اور مزاحمت سے عاری عوام کو شاعر کی نوا غیر معمولی حوصلہ اور اور صلابت عطا کرتی ہے۔اسی لئے خوف زدہ حکمراں طبقہ زبان پر پابندی لگا دیتا ہے اور روشنی دیتی ہوئی آوازوں کی لوئیں کتر ڈالتا ہے۔ زنداں ایک باغی اور انقلابی کی پیر کی زنجیر ضرور بن جاتا ہے اور سرگرم تحریکوں اور جیالے عوام سے اس کا جسمانی ربط تو ختم کر دیتا ہے لیکن شاعر اور اس کے عوام دوست قاری کے درمیان فکری اور ذہنی سطح پر رشتہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔اسی لیے جب فیض کی کوئی نظم/غزل منٹگمری جیل سے یا سردار جعفری کی کوئی نظم ناسک جیل سے خفیہ پیاموں کے ذریعہ باہر آتی تھی تو وہ تخلیق جنگل کی آگ کی طرح میڈیا کے ذریعہ حرز جاں بنالی جاتی تھی.....

(2) "فیض کی نظم "دریچہ" اور سردار جعفری کی نظم "پتھر کی دیوار" بڑی حد تک ظلم کے خلاف ایک شدید ردعمل کی دین ہیں.....فیض کے برخلاف جعفری ایمائیت سے زیادہ وضاحت بیاں کے قائل ہیں۔....."پتھر کی دیوار"....میں ان کی سب سے خوبصورت نظم "اودھ کی خاک حسیں" ہے.....زنداں کی تنہائیوں میں اپنوں کی، اپنے اسلاف کی، یاروں کی، باغی شاموں اور انقلاب آفریں راتوں کی، میخانوں اور میکساروں کی، آزادی کے سورماؤں کی یاد بے حد ستاتی ہے اور جب یہ سارا بیتا ہوا یاد آتا ہے تو بڑی شدت سے یاد آتا ہے اور تب شعری اظہار کی توانائی بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ خیال، جذبے اور احساس کا ساتھ دیتی ہوئی دل میں اترتی چلی جاتی ہے"۔

(3) "یہ حکمراں طبقے کا بھرم ہوتا ہے کہ کسی باغی یا انقلابی کو قید میں ڈال کر وہ عوامی تحریک کو کمزور کرنے کا یقین کر لیتا ہے۔مگر زنداں کی دیواروں سے پرے انقلاب اور بغاوت کا وہ منظر آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا جس کی پاداش میں زنداں کی زنجیر مقدر بنی اس سے شاعر کا ذہنی اور جذباتی تعلق اسی طرح برقرار رہتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ کسان مزدور اپنی تحریکوں کو زندہ رکھیں.....شاعر نئی عوامی بغاوتوں کا ترجمان ہے۔وہ چاہتا ہے۔

چمن کے پھولو! چمن میں اک آگ سی لگا دو/لچکتی شاخو! فضا میں زنجیر بن کے پھیلو/ زمیں کی دھاتو! ہوا میں جوالا مکھی اچھالو/ملوں کے پہیو! بغاوتوں کے ترانے گاؤ/سحر کی کرنو! اندھیری راتوں کے سر پہ برسو/عوام کے دشمنوں کا نام ونشاں مٹا دو۔

"اودھ کی خاکِ حسیں کا شاعر زندانی نظم کے آخری مصرعوں میں اپنے اس یقین کو دہراتا ہے کہ بھلے ہی سنگ وآہن نے

اس کی زباں بندی کردی ہے۔اس کے آگے دیواریں اور سلاخیں گاڑدی ہیں مگراس کے دل میں بغاوت اور ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے مضطرب جوالا مکھی کو دبایا نہ جاسکے گا۔اپنی مجاہدانہ صلابتوں پر یہی اعتماداس پوری نظم کا محور ہے۔

مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو/ ابلتے جوالا مکھی کو کوئی دبا سکا ہے/ میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے/ وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے/مگر میں اپنے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں۔ 200

سردار جعفری کو حکومت وقت نے 20/جنوری 1949 کو گرفتار کرلیا اور آٹھ ماہ کا عرصہ انہوں نے ناسک جیل میں گزارا۔مجموعہ خون کی لکیر (1949) میں شامل نظم "جیل میں جیل کا ماحول دیکھئے:۔

جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے/ اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے/ بیڑیاں روتی ہیں' زنجیریں فغاں کرتی ہیں/کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلادوں کی خونخواری پر/کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدد کا نظام

سردار جعفری کی شاعری پر اقبال کا اثر ہے اس تعلق سے مختلف نقادوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔چند نقادوں کی آراء ملاحظہ کیجئے:

آل احمد سرور:

(1) "سردار پر شروع سے اقبال کا گہرا اثر ہے۔درمیان میں وہ جوش کے مرید ہوئے اور جوش کے ساتھ انہوں نے انقلاب کے رومانی ترانے گائے مگر یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جب ان کا شعور گہرا ہوا' ان کی فکر میں ایک بلوغت پیدا ہوئی تو مارکسیت کے فلسفے کے لیے انہوں نے اقبال کے فن کو اپنالیا۔نئی نسل میں سردار پر اقبال کا سب سے گہرا اور اچھا اثر ہوا۔ اقبال کے فن کی گرمی ان کی حیات و کائنات سے محبت' ان کی حرکت' عمل اور کشمکش سے عقیدت' نئی نسل کے دل میں فوراً اثر کرتی ہے۔اقبال کی فکر کو نہ مانتے ہوئے بھی اقبال سے وہ دوسرے بڑے شعرا کے مقابلے میں زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں چنانچہ اقبال کی ترکیبیں' ان کے مصرعے کے مصرعے' ان کے استعارے' ان کے اشعار سردار کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں..... تمہید کے اشعار سے ہی اقبال کا اثر نمایاں ہے۔آتش بجام' صہبائے حیات' شہسوار گردش ایام' کسوت مینا سے مے باہر ہے آج۔اب جرس کا حکم خاموش نہیں۔یہ ترکیبیں اقبال نے استعمال کی ہیں"۔

صدیق الرحمٰن قدوائی نے انیس' اقبال اور جوش سے سردار جعفری کی ہم آہنگی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

وہ سردار جعفری اردو شاعری کی ساری وراثت کو قبول کرتے ہوئے بھی انیس' اقبال اور جوش سے خاص طور پر متاثر ہونے والا مزاج لے کر آئے تھے۔وقت کی رفتار کی ذہنی اپج اور عملی سرگرمیوں نے اس پر اور جلا کی۔ان شاعروں سے ان کی فطری ہم آہنگی کا سبب یہ تھا کہ ان سب لوگوں نے جس مثالی زندگی کا خواب دیکھا تھا اس سے صرف اپنی آنکھوں کو روشن رکھنے کے بجائے دوسروں کو اس میں شریک کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا تھا۔انیس' اقبال اور جوش کے خواب مختلف ضرور تھے مگر انہیں اپنی اپنی مثالی دنیا پر اس قدر یقین تھا کہ وہ اس کی تمنا کو اپنی ذات کے نہاں خانوں میں قید نہیں رکھ سکتے تھے۔ان کی شاعری پیغام اور صلائے عام کی شاعری تھی۔سردار جعفری جیسا شاعر جو سرگوشیوں کا شاعر نہیں تھا' وہ ان شاعروں سے خصوصی قرب کیے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔اپنے اندر اندر گھلنے اور دل ہی دل میں رونے اور پچھتانے کے بجائے بلند آہنگی سردار جعفری کو

راس آئی۔" 202

سردار جعفری کی شاعری پر اقبال کے اثرات سے متعلق مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''سردار کے اسالیب میں جمالیاتی کیفیتیں بھرپور ہوتی ہیں اور بہت نمایاں طور پر اقبال کے مطالعہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ علی سردار جعفری اپنے اسلوب میں صرف کسی حد تک جوش سے متاثر ہیں ورنہ ننانوے فیصد ان کی شاعری اقبال کے اثر کی علامتیں لیے ہوئے ہے۔ان کے مصرعوں اور مصرعوں کے ٹکڑوں میں مدھم ہموار اور پُرسکون ترنم ہوتا ہے وہ بے اختیار اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ان کے وہاں الفاظ بے شک اکثر نئے ملتے ہیں اور ایسے کہ اس سے پہلے شاعری میں استعمال نہیں کیے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کے اسلوب اور انداز بیان میں وہی رچی ہوئی پختگی ہوتی ہے جو اقبال کے سوا کسی دوسرے نظم نگار کو میسر نہیں ہوئی۔" 203

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے:

''سردار، عمر، حالات غرض کہ زندگی کے کسی موڑ پر اقبال سے الگ نہیں ہوئے۔جلد ہی ان کی اقبال فہمی اور اُس کی انجذابی کیفیتیں اقبال شناسی میں تبدیل ہونے لگتی ہیں.....سردار کے شعری محرکات، امتزاج و انجذاب غرض کہ ہر منزل پر اقبال سردار کے ساتھ رہے بلکہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ پختہ تر اور قریب تر ہوتے گئے۔ یہ پختگی اور قربت ان کے بعد کے (پرواز کے بعد) مجموعوں میں بآسانی تلاش کی جاسکتی ہے۔نظم ''زندگی'' (مجموعہ ''ایک خواب اور'' 1964) ملاحظہ کیجئے۔اس کا ایک ایک بند خضر راہ کی زندگی والے حصہ کے رنگ و آہنگ، مزاج و مذاق بحر و زن میں ڈوبا ہوا ہے۔یہاں صرف دو بند پیش ہیں.....

صبح سے لے کے تا بہ شام/مست خرام و تیز گام/کرتی نہیں کہیں قیام/کرتی نہیں کہیں مقام/جذبہ شوق ہے تمام/منزل شوق نا تمام۔

دامنِ شش جہات میں سیل رواں ہے زندگی

کارکشا و کارساز/اس کا جوان ہات ہے/اس کی نگاہ سے حسین/عالم ممکنات ہے/بزم تغیرات میں/جان تغیرات ہے

ربطِ انقلاب پر زمزمہ خواں ہے زندگی

نظم ''تہنیت'' (مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' 1968) کے بارے میں خود سردار نے نظم سے قبل نوٹ میں لکھا....اقبال نے 1930 کے آس پاس افغانستان کو انقلاب کی دعوت دی تھی۔

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان/تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان/اپنی خودی پہچان/اے غافل افغان

سردار کی نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

تو جاگا اور جاگ اٹھے ہیں تیرے کوہستاں/تیری خودی کی بیداری سے اونچی ہوگئی شان/اے بانکے افغان۔

ناچ اٹھا چشموں کے دل میں چاندی جیسا پانی/سخت چٹانیں پہنیں گی مخمل کی قبائیں دھانی/رقص کرے گا مست ہوا میں چشموں کا طوفاں/اے بانکے افغاں

اور نظم ختم ہوتی ہے اس بند پر۔

تو اقبال کے دل کی دعا ہے میرے دل کا گیت/تیرے دیس کی جیت ہے سارے پورب دیس کی جیت/تیرا نغمہ سرکش و شیریں اونچی تیری تان/اے بانکے افغان

''ان دونوں نظموں کے نام.... محض نمونے کے طور پر لیا ہے ورنہ سردار کا ادبی نقطہ نظر اور کئی دہائیوں کا شعری سفر اقبال کا مرہون منت ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس شاندار اور کامیاب سفر کی ابتداء انیس سے ہوتی ہے۔ جوش کا بھی عمل دخل رہا ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم اور نمایاں اثرات اقبال کے ہیں'' 204

پروفیسر علیم اللہ حالی نے سردار جعفری پر اقبال کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

(1) سردار جعفری کی شاعری کا بنیادی تیور اقبال کی شاعری سے ہم آہنگ ہے..... ان کے پہلے مجموعہ کلام ''پرواز'' (1943ء) سے ہی اقبال کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے..... اقبال اور سردار جعفری کے فکر و نظر کے بہت سے خطوط یکساں ہیں..... اقبال کی طرح سردار جعفری کے یہاں بھی کمزوروں سے ہمدردی اور ظالم و جابر کے خلاف نفرت و بیزاری کے جذبے عام ہیں۔ مشرق و مغرب کے فرق و تضاد میں مشرق کی ہمنوائی اقبال کا بھی شیوۂ کار رہا ہے اور سردار کا بھی۔ سردار جعفری کے مندرجہ ذیل قطعہ میں مشرق کی بازیافت کا تصور یکسر اقبال سے ہم رشتہ ہے بلکہ لہجہ میں بھی مطابقت ہے: ؎

ہوائے صبح مشرق جاگ اٹھی ہے
چمن میں آتش گل تیز تر ہے
نگار ایشیاء ہے گل بداماں
کہ عید شعلہ و جشن شرر ہے

فکری سطح پر فرق صرف اتنا ہے کہ مشرق و مغرب کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری نے اس امر پر زور دیا ہے کہ مشرق و مغرب کا یہ سارا فرق صرف اس لیے سامنے آتا ہے کہ مغرب پر سرمایہ حاوی ہے اور یہی سرمایہ کمزور طبقے کے لیے استحصال کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

اپنی نظم ''مشرق و مغرب'' میں وہ کہتے ہیں: ؎

جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے/ارض مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایہ ہے/اور سرمایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے/یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے/تیرا قاتل بھی وہی ہے مرا قاتل بھی وہی/زیست کی جہد بھی اور جہد کا حاصل بھی وہی۔

(2) اقبال کی شاعری آقا و غلام، جابر و مجبور، حاکم و محکوم اور سرمایہ و محنت کی کشاکش سے بھرپور ہے۔ سردار کے یہاں بھی یہی خیالات انداز بدل بدل کر آتے ہیں۔ سردار کی آواز زیادہ واضح اور Straight forward ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں: ؎

گر یہی آپ کا انداز ستم رانی ہے
میرے اشعار میں تبلیغ و بغاوت ہے وہی

(3)اپنے مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے پیش لفظ میں سردار جعفری نے اپنی شاعری کا تعارف پیش کرتے ہوئے جو باتیں لکھی ہیں ان سے اقبال اور ان کے موقف کی مکمل تائید ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں ۔

''میں اپنی شاعری کو نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی نہیں بنا سکا ہوں میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں اور میرے سامنے اقبال کا پیش کیا ہوا یہ آدرش ہے: ۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفاں

اقبال نے قوم کی تقدیر بنانے کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ ۔

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے

شمشیر و سناں اول ' طاؤس و رباب آخر

اقبال کے بعد اس طریق کار پر سوچنے والے اور سنجیدگی سے عمل کرنے والوں میں سب سے اہم نام سردار جعفری کا ہے''۔

(4) سردار جعفری نے اپنی نظم ''اقبال کی آواز'' کے ذریعہ اقبال سے اپنے تاثر کا فنکارانہ اظہار کیا ہے۔اس نظم میں اقبال کا لہجہ بھی دکھائی دیتا ہے اور اقبال کی فکر کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔نظم یوں ہے۔۔

فرعون و مسولینی و ہٹلر ہیں تہہ خاک/ اے اہل نظر نشۂ قوت ہے خطرناک/ تاریخ کا یہ حرف صداقت ہے ازل سے/ مظلوم بہت جلد ہی ہو جاتے ہیں بیباک/ مجبور ہیں جو ہاتھ وہ مجبور نہیں ہیں/ کر دیتے ہیں چنگیز و ہلاکو کی قبا چاک/ یہ دیکھ کہ کس طرح بدلتا ہے زمانہ/ ہو تو بھی اگر میری طرح صاحب ادراک/ اقبال کا آہنگ ہے آہنگ بغاوت/ جاگ اٹھتے ہیں آفاق دہل جاتے ہیں افلاک

یہ محض خراج عقیدت نہیں بلکہ سردار جعفری کے ذہن و دل کی آواز ہے۔اس لیے کہ انہوں نے اقبال کے فکر و فن کی جن خوبیوں کا ذکر کا ہے اور جن سماجی اور انسانی موضوعات کی اہمیت جتائی ہے وہ خود ان کی تخلیقی شخصیت کا حصہ ہے۔

(5)اقبال کی طرح سردار جعفری بھی بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اقبال کی طرح وہ دور حاضر کے تغیرات سے آنے والے دور کی تصویر دیکھ لینے پر قادر ہیں۔جغرافیائی حیثیت سے کشمیر کا حسن و جمال ہی نہیں بلکہ وہاں عرصۂ دراز سے بھڑکنے والے شعلہ کی آنچ اقبال نے بھی بار بار محسوس کی اور سردار جعفری نے بھی اس سے گرمی حاصل کی۔

سردار کہتے ہیں: ۔

بخشا ہے انہیں جہد مسلسل کے عمل نے/ وہ ذوق لطافت کہ ہے پروردۂ طوفاں/ شاعر کو یقین ہے کہ نکھر آئے گا اک دن/ وہ حسن جو افلاس کی چادر میں ہے پنہاں

(6)افغانستان کے حوالے سے سردار جعفری نے ''تہنیت'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں اقبال پورے طور پر جھلکتے ہیں.....جو دعوت اقبال دے گئے ہیں' سردار کے یہاں اسی کی توسیع ہے۔نظم ''تہنیت'' اقبال کی ہی زمین میں لکھی گئی

ہے۔تمہید کے طور پر سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اقبال نے 1930 کے آس پاس افغانستان کو انقلاب کی دعوت دی تھی۔''

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان/تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان/اپنی خودی پہچان/اے غافل افغان

سردار جعفری نے افغانستان کی موجودہ صورت حال کی عکاسی کی ہے۔اس نظم کا ایک بند یوں ہے:

تو اقبال کے دل کی دعا ہے میرے دل کا گیت/تیرے دیس کی جیت ہے سارے پورب دیس کی جیت/تیرا نغمہ سرکش و شیریں اونچی تیری تان/اے بانکے افغان

(7) اقبال کے یہاں زندگی کے تسلسل اور اس کی قوت وتوانائی کے موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔جہد مسلسل اور تگا پوئے دمادم کی صدائیں پہلی بار اقبال کے کلام سے پیدا ہوئیں انسان کی صلاحیت اور ہنرمندی پر بھروسہ اور زمام تقدیر کو تدبیر کی گرفت میں رکھنے کا عزم وارادہ ہے۔اگر اقبال کے یہاں ان کا اختصاص بنتا ہے تو سردار جعفری نے بھی وراثت میں یہی کچھ پایا ہے۔اپنے مجموعے ''ایک خواب اور'' کی تعبیر وہ یوں کرتے ہیں:

سرکشی پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں/میں ترا شاعر آوارہ و بے باک وخراب/پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند/ایک خواب اور بھی اے ہمت دشوار پسند

(8) نظم ''زندگی'' کے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے جہاں اقبال کی فکر بھی ہے اور اس کا آہنگ بھی۔

سردار کہتے ہیں:

گردش رقص ہے کہیں جنبش گام ہے کہیں/قلزم نبات ہے کہیں تلخیٔ جام ہے کہیں/تابش صبح ہے کہیں آتش شام ہے کہیں/اپنے ہزار رنگ میں رقص کناں ہیں زندگی

کارکشاد کارساز اس کا جوان ہات ہے/اس کی نگاہ سے حسیں عالم ممکنات ہے/بزم تغیرات میں جان تغیرات ہے/ربط انقلاب پر زمزمہ خواں ہے زندگی

(9) اقبال نے انسان کو حیات تازہ بخشنے کے لیے مرد کامل مومن شاہین خودی وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ سردار جعفری اس پیغام کو مذہبی تلمیح واصطلاح کے بغیر بلا تخصیص سبھوں کے لیے عام کرتے ہیں۔اقبال نے اپنی نظم ''اسرار پیدا'' میں جوانوں کو خودی کا درس دیا ہے تا کہ وہ اس عالم مجبور میں ایک عالم آزاد کی فضا قائم کرسکیں۔وہاں حامل خودی کے نزدیک موجوں کی تپش ذوق طلب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ارادے کا استحکام اور خودی کی طاقت تمام خطرات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کردیتی ہے۔اس نظم میں اقبال کا فرمان ہے:

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

سردار جعفری اپنی نظم ''سرطور'' میں کہتے ہیں:

شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں/ہے ابھی رفعت آسماں اور بھی/ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں/کہکشاں سے پرے کہکشاں

اور بھی/جھانکتی ہیں فضاؤں کے پیچاک سے/ رنگ اور نور کی وادیاں اور بھی/ اور بھی منزلیں اور بھی مشکلیں/ ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی

سردار کے ان اشعار کے بعد لازمی طور پر اقبال کی وہ غزل یاد آجاتی ہے، جس کا مطلع یوں ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(10) کلام اقبال میں لینن جب خدا کے حضور میں اپنی معروضات پیش کرتا ہے تو تشکیک کے ضعف کے ساتھ کچھ مسائل بھی سامنے رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اور آگے چل کر:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

''کچھ یہی خیالات سردار جعفری کے یہاں بھی متعدد نظموں میں موجود ہیں۔ دو ہاتھوں کا ترانہ''''ہم نے دیکھا ہے''، ''میرا سفر''، ''آرزوئے تشنہ لبی''، اب بھی روشن ہیں''، ''کارل مارکس''، ''نئی دنیا کو سلام''اور ''نوالا''وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں سردار جعفری نے اقبال کی طرح ایک خوش وخرم معاشرے کی تعمیر کے لیے معاشی نظام کی درستگی پر اصرار کیا ہے''

(11) لہجے، فکر، موضوع، اسلوب، الفاظ کی نشست و برخاست اور آہنگ کے اعتبار سے سردار جعفری کی نظموں اور غزلوں کے متعدد اشعار کلام اقبال سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتے ہیں....

سردار کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے جن سے اقبال کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے نا تمام آئے
تیز تر گردش مئے تیز تر آہنگ نشاط
وقت کس درجہ ہے آہستہ خرام اے ساقی
اس سے ہر طرح سے تذلیل بشر ہوتی ہے
باعث فخر نہیں مفلسی و ناداری

(12) اقبال اور سردار جعفری کے کلام کی مماثلت کے متعدد پہلو ہیں.... مظلوم ومقہور طبقے کی ہمنوائی، قومی وملکی سیاست

کے علاوہ بین الاقوامی سیاسی تغیرات سے تخلیقی تحریک کا حصول، رجائی لب ولہجہ، شاعری کو مقصود بالذات نہیں سمجھنا بلکہ اسے ایک وسیلہ سمجھنا، فکر وحکمت کے موضوعات کو نظم کرنا، معاشرتی افادے کے عناصر کی تلاش، انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کی طرف مراجعت، شاعری میں مکالماتی نظام، وقت، فکر انسانی، ارتقا اور انسان دوستی کے تصورات، دنیا کو بدلنے کا خواب، وغیرہ۔

جن امور میں اقبال اور سردار میں مماثلت نہیں انہیں پروفیسر علیم اللہ حالی یوں بیان کرتے ہیں:

(الف) اقبال کی شاعری میں وقفے وقفے سے روحانی جذب وکیف اور صوفیانہ انجذاب کی خصوصیات ملتی ہیں جو سردار جعفری کا میدان نہیں ہے۔

(ب) سردار جعفری دور حاضر کی تبدیلیوں کے زیر اثر شاعری میں ہیئت کی سطح پر جدت طرازی سے کام لیتے ہیں۔ اقبال مروجہ روایتی ہیئتوں کی حدود میں رہ کر نیا شعری آہنگ پیدا کرتے ہیں۔

(ج) سردار جعفری کے یہاں شعری اظہار پر بسا اوقات خطابت کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ اس لیے تخلیقی اور فنی سطح پر اکثر وبیشتر وہ اقبال سے بہت پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔'' 205

سردار جعفری کی نظم ''ترقی پسند مصنفین'' پر اقبال کے اثر کی نشاندہی کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''پرواز'' میں سردار جعفری کی ایک نظم ''ترقی پسند مصنفین'' بھی شامل ہے۔ یہ نظم اقبال کی نظم ''یارب دل مسلم کو تو زندہ تمنا دے'' کی طرز پر ہے۔ اس نظم میں اقبال کے رنگ وآہنگ کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یوں بھی سردار کی بیشتر نظموں میں اقبال جھلکتے نظر آتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں ہوتا کہ سردار جعفری اقبال کی شاعری سے کس قدر متاثر تھے۔ جس طرح اقبال نے اپنی اس نظم میں خدا سے دعا مانگتے ہوئے مسلمانوں کے دلوں کو ایسی زندہ تمنا دینے کی بات کی ہے جس سے ان کی روح تڑپ اٹھیں اور قلوب گرم ہوجائیں۔ کچھ اس طرح کی بات سردار جعفری نے اپنی نظم ''ترقی پسند مصنفین'' کے ذریعے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں سے براہ راست کہی ہے۔ وہ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو غلاموں کی محفل میں آگ لگانے، دل کی بجھی ہوئی شمعوں کو فروزاں کرنے، کعبہ، دیر حرم اور کلیسا کی قندیلوں کو بجھا دینے اور ہر طرف (مشرق اور مغرب میں) شمع دل چراغاں کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کریں:

آگ محفل میں غلاموں کی لگادیں اے دوست/ دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کردیں/ کعبہ ودیر وکلیسا کی بجھادیں قندیل/ ہر طرف مشرق ومغرب میں چراغاں کردیں/ توڑ دیں وہم نے پہنائی تھیں جو زنجیریں/ آگیا وقت کہ اب وا در زنداں کردیں/ مسند عیش سے شاہوں کو اٹھادیں چل کر/ مور بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کردیں/ اب نظر پھیر لیں ایران کے گلزاروں سے/ لالہ شوق کو کشمیر بداماں کردیں/ عام ہو غالب واقبال کی رعنائی فکر/ بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کردیں/ کھول دیں سب کے لیے قفل در مے خانہ/ حضرت جوش کو سر حلقۂ رنداں کردیں۔

''اس نظم میں جہاں ترقی پسند مصنفین کو ادب کے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کی بات کہی گئی ہے جن کا تعلق حقیقی اور عصری زندگی سے ہے وہیں غالب، اقبال اور جوش کی رعنائی فکر اور اندازِ بیاں کو بھی اپنی تخلیقات میں شامل کرنے پر زور دیا

گیا ہے۔'' 206

اقبال کے تتبع میں سردار جعفری نے نظمیں ''اقبال خدا کے حضور میں'فرشتوں کا گیت اور فرمان خدا اپریل 1993 میں لکھیں۔ان تینوں نظموں کا اسلوب اقبال سے ماخوذ ہے۔

مذہب کے نام پر جس طرح کی فرقہ واریت کا ننگا ناچ ہوتا ہے اس حوالے سے سردار جعفری نے اپنی نظم ''اقبال خدا کے حضور میں'' لکھا ہے:

برپا ہے تیرے نام پہ دنیا میں قیامت/ ژولیدہ ہیں اربابِ بصیرت کے خیالات/ ہے دھرم سیاست کے مداری کا تماشا/مذہب کو بنا رکھا ہے یاروں نے خرافات/سینوں میں نہیں اسم محمدؐ کا اجالا/کانوں میں تو آواز اذاں آتی ہے دن رات/ جپتے ہیں بڑے دھیان سے جب رام کی مالا/کچھ اور بگڑ جاتے ہیں اس دیس کے حالات/ .....بہتی ہے گلی کوچوں میں اب خون کی گنگا/شمشیر بکف پھرتے ہیں سڑکوں پہ فسادات/فرزیں بھی انہیں کا ہے پیادے بھی انہیں کے/شہ پڑتی ہے لیکن کبھی ہوتی ہی نہیں مات/کب ڈوبے گا یہ ظلم و جہالت کا سفینہ/دنیا ہے تری منتظر روز مکافات۔

نظم ''فرشتوں کا گیت'' میں سردار جعفری نے مشرق کی بے حسی اور سرد مہری کا اسی طرح ذکر کیا ہے۔

مغرب شعلہ آرزو' کب سے ہے گرم جستجو/منزل شوق سے ہے دور مشرق سست گام ابھی/خوف سے سر جھکے ہوئے درد سے دل دکھے ہوئے/شعلہ جاں بجھے ہوئے ذوق جنوں ہے خام ابھی/ہمت کم نہ پی سکی جام شراب آرزو/روح اسیر دام جہل فکر و خرد غلام ابھی/وہم کہن میں مبتلا علم نوی سے بے نیاز/سارے جہاں میں صبح ہے ان کے دلوں میں شام ابھی

سردار جعفری نے انسانیت کا جو سبق دیا ہے ان کی نظم ''فرمان خدا میں دیکھئے۔

انسان نے انسان کا جلوہ نہیں دیکھا/انسان کو انسان کی تصویر دکھا دو/کافر ہو کہ مومن ہو وہ مخلوق خدا ہے/تقسیم جو کرتی ہے وہ دیوار گرا دو/.....نفرت کا بہت زہر پلایا ہے ابھی تک/اب پیار کی مے پیار کے ساغر سے پلا دو/مسجد ہو کہ مندر ہو فقط کعبۂ دل ہے/انسان کی تنویر کے فانوس جلا دو۔ 206

محمد ایوب واقف نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری نے نئی نسل کی تربیت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اپنی تقریر سے'اپنے مقالوں کے ذریعے اور گاہے گاہے اپنی شاعری کے وسیلے سے وہ یہ مقدس فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔اپنی ایک نظم (نئی نسل کے نام) میں انہوں نے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا ہے وہ ایک ایسا پیغام ہے جسے دور دور تک پہنچایا جانا چاہیے۔اس نظم میں ان کے دل کی دھڑکن صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ 207

درد کی شاہرہ سے گذر کر/آنسوؤں کی ندی کے کنارے/غم کی بستی میں جونور کا جھونپڑا ہے/اس میں رہتے ہو تم/میری ہی طرح خانہ خرابو/سازشیں کرگسوں کی طرح اڑ رہی ہیں/ان کے پر تھک کے گر جائیں گے/اور تمہاری بلندی نہ چھو پائیں گے/تم اسی طرح پرواز کرتے رہو گے/اور تمہارے پروں کی چمک/کہکشاں کہکشاں گیت گاتی رہے گی/اے مرے شعلہ پیکر عقابو۔

اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا/سچ کہو کیا تمہارے تراشے ہوئے لفظ میں/میری آواز کا شائبہ بھی نہیں/میری آواز جو پہلے

غالب کی آواز تھی/اور پھر روح اقبال کا زمزمہ بن گئی/آج کے نغمہ شوق میں ڈھل گئی/صبح فردا کی وادی میں جوئے رواں/میری آواز/پتھر میں شعلہ ہے/شعلہ میں شبنم/اور طوفان میں طوفاں/اور تمہارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے/سچ کہو/آنے والے زمانے کی روشن کتابو.....

سردار جعفری کا شعری لب ولہجہ بے حد نرم ہوگیا تھا جس میں جلال و جمال کی ملی جلی کیفیتیں نظر آتی ہیں۔

سردار جعفری نے نظم ''زندگی''میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی سرگرداں ہے۔اس نظم میں اقبال کے فلسفہ حرکت وعمل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

صبح سے لے کے تا بہ شام ہست خرام و تیز گام؛ کرتی نہیں کہیں قیام کرتی نہیں کہیں قیام/جذبہ شوق ہے تمام منزل شوق ناتمام/دامن شش جہات میں سیل رواں ہے زندگی/.....آپ ہی بت شکن بھی ہے آپ ہی بت تراش بھی/مرہم زخم دل بھی ہے دل کی مگر خراش بھی/آپ کو گم کیے ہوئے اپنی مگر تلاش بھی/اپنے تضاد کو لیے گرم عناں ہے زندگی/.....مالک خشک وتر بھی ہے فاتح بحر و بر بھی ہے/صاحب تاج و زر بھی ہے خالق خیر و شر بھی ہے/اشک بھی ہے گہر بھی ہے سنگ بھی ہے شرر بھی ہے/شاہ شباں ہے زندگی میر جہاں ہے زندگی/

نظم ''سرطور(مشمولہ ایک خواب اور)پر اقبال کی نظم ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں/ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں'' کا اثر نمایاں ہے۔

دل کو بے تاب رکھتی ہے اک آرزو/کم ہے یہ وسعت عالم رنگ و بو/لے چلی ہے کدھر پھر نئی جستجو/تا بہ حد نظر اڑ کے جاتے ہیں ہم/وہ جو حائل تھے راہوں میں شمس وقمر/ہم سفران کو اپنا بناتے ہیں ہم/.....شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں/ہے ابھی رفعت آسماں اور بھی/ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں/کہکشاں سے پرے کہکشاں اور بھی.....اور بھی منزلیں اور بھی مشکلیں/ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی

آج دست جنوں پر ہے شمع خرد/دو جہاں جس کے شعلے سے معمور ہیں/لے کے آئیں پیام طلوع سحر/جتنے سورج خلاؤں میں مستور ہیں/کہہ دو برق تجلی سے ہو جلوہ گر/آج موسیٰ نہیں ہم سرطور ہیں

پروفیسر سعید الظفر چغتائی لکھتے ہیں:

''سرطور.....یہ انسان کے چاند پر پہنچنے کا طربیہ ہے ہم ہمیشہ سے میدان عمل کی وسعت چاہتے ہیں۔نئے امکانات اور راستوں کی تلاش میں انسان نے کرۂ زمین کے بر و بحر چھان مارے اب یہاں ڈھونڈنے کو کچھ نہیں بچا۔آبادی روز افزوں ہے اور چند ارب سال میں آج کے حیات بخش سورج سے خطرہ ہے کہ پھول کے سیارہ مریخ تک اندرونی نظام شمسی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور زندگی کی ہر علامت کا خاتمہ کردے گا۔اس سے پہلے پہلے ہمیں فضائے بسیط میں کوئی پناہ ڈھونڈ لینی ہے۔ چاند کی سطح پر اترنے کے بعد زہرہ و مریخ سے آگے مشتری کے سیاروں سے پرے زحل اور یوری نس وغیرہ کے ماحول کا جائزہ ان کوششوں کے ابتدائی مراحل ہیں۔ 208

پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''سرطور..... جب زمین سے اڑاتے ہوئے ہوا با زچاند پر اترے تو متعدد شعرا نے اس موضوع پر نظمیں کہیں۔اس موضوع پر آل انڈیا ریڈیو پر مشاعرے بھی ہوئے لیکن جس بلندی پر سردار کی نظم ''سرطور'' پہنچی وہاں میری ناقص رائے میں کسی دوسرے شاعر کا کلام نہیں پہنچ سکا''۔ 209

سردار جعفری اقبال کے آہنگ' فلسفہ حرکت وعمل اور تیزی وتندی سے خوب استفادہ کیا ہے۔انہوں نے ایک نظم مارچ 1978 میں لکھی جس میں ''اقبال کی آواز'' کی خصوصیتوں کو بیان کیا ہے مجبور ہیں جو ہاتھ وہ مجبور نہیں ہیں/کردیتے ہیں چنگیز وہلاکو کی قباچاک/یہ دیکھ کہ کس طرح بدلتا ہے زمانہ/ہو تو بھی اگر میری طرح صاحب ادراک/اقبال کا آہنگ ہے آہنگِ بغاوت/جاگ اٹھتے ہیں آفاق دہل جاتے ہیں افلاک۔

عمر رضا نے سردار جعفری کی شاعری پر اقبال کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''جس طرح اقبال نے اپنی شاعری میں انسانی افتخار اور اس کی سربلندی کا ذکر کر کے اسے تمام تر اونچائیوں اور ترقیوں کی طرف گامزن کرنے اور خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہنے کی دعوت دی ہے۔اسی طرح سردار جعفری نے بھی اپنی نظموں اور غزلوں میں انسانی افتخار اور انسانی ترقی کی تشہیر کی ہے۔نیز اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے ایک اچھے اور کامل انسان بننے کی ترغیب دی ہے۔مثلاً یہ تین شعر ملاحظہ کریں۔ 210

؎ انقلاب کا پرچم جو اٹھا نہیں سکتے/کاسۂ گدائی ہے دستِ بے ہنران کا/آرزو سے محرومی جان ودل کا نقصاں ہے/آہ نارسا ان کی نالہ بے اثر ان کا/آسماں پر اڑنے کا حوصلہ نہیں جن کو/نامراد رہتا ہے ذوق بال وپر ان کا

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید محنت ومشقت کے عادی ہاتھوں کو اہمیت پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آدمیت کا احترام اور انسان دوستی کا یہ تصور بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک مادی تصور ہے۔انسان کی مادی زندگی کو سجانے سنوارنے کا تصور۔اُس کے مستقبل کو خوشگوار اور خوش اقبال بنانے کا تصور! یہ تصور اپنی عملی صورت گری کے لیے انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے۔ہاتھ محنت اور مشقت کا عادی ہاتھ! سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔اردو شاعری میں ہاتھ کا تصور نیا نہیں لیکن محنت کش ہاتھ کا تصور ضرور نیا ہے۔اقبال کا دیا ہوا جنہوں نے اپنے ایک شعر میں ''دست دولت آفریں'' کا تذکرہ کیا ہے جب کہ محنت کش ہاتھ کے اس تصور کو سردار جعفری نے رنگین اور ہمہ گیر بنا دیا..... ہاتھ کا یہ تصور ''پیغمبر مسیحا دست'' میں ابھرتا ہوا ملتا ہے تو ''ہاتھوں کا ترانہ'' میں گنگناتا' گاتا' جھومتا اور جھمکتا ہوا۔بے حد لالہ کار اور دلدار'' 211

محمد ایوب واقف نے انسانی ہاتھوں کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انسان کے تمام اعضائے رئیسہ یوں تو اپنی اپنی جگہ پر بے بدل ہیں۔ایک عضو کی کمی بھی انسانی جسم کو بے حس کر دیتی ہین لیکن انسانی جسم سے جڑے اس کے دو ہاتھ اس کی اتھاہ فکری قوتوں کو وہ شکل دے دیتے ہیں جس سے دھرتی کے انگ انگ میں رنگ ونکہت کا حسین وجمیل سرچشمہ جاری ہو جاتا ہے۔سردار جعفری نے ان انسانی ہاتھوں کو موضوع سخن بنا کر دراصل اپنی تعمیری اور مقصدی شاعری میں ایک انتہائی ضروری گوشے کا اضافہ کیا ہے جس طرز کی شاعری جعفری نے کی ہے کہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اس نوع کے موضوع کا بھی انتخاب کرتے انسانی ہاتھوں سے متعلق اپنی اس البیلی اور معنی

ومفہوم سے بھرپور نظم کا عنوان انہوں نے ''ہاتھوں کا ترانہ'' رکھا ہے''۔ 212

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے اپنی شاعری میں عظمتِ انسانی کا ترانہ گایا۔انہوں نے انسان کی عزت وحرمت کو مقدم رکھا اور انسانی ہاتھ کے تقدس کو خراج عقیدت پیش کیا۔وہ ہاتھ جو محنت ومشقت کرتے ہیں' جو اناج اگاتے اور کل کارخانوں کو چلاتے ہیں' جو خوب صورت کپڑے بنتے اور ریشے اور آرام دہ جوتے تیار کرتے ہیں' جو گرم گرم روٹیاں پکاتے ہیں۔انسانی ہاتھ' محنت مزدوری کرنے والے ہاتھ کو چاہے وہ سخت' بھدے اور کالے ہوں' سردار بڑی عقیدت وعزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ 213

سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' کے دو بند ہیں:

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو/ان ہاتھوں کی تکریم کرو/ دنیا کو چلانے والے ہیں/ ان ہاتھوں کو تسلیم کرو/ تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے/ دنیا کا فسانہ ان سے ہے انسان کی کہانی ان سے ہے/تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے/ ان ہاتھوں کی تعظیم کرو/ اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے/ پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں' کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے/مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے' چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے/ان ہاتھوں کی تعظیم کرو/کوثر مظہری لکھتے ہیں:

''ان دو ہاتھوں کی مدد سے دنیا کا نظام چل رہا ہے اور محنت علوم وفنون کے نمونے بھی سامنے آرہے ہیں۔ہاتھوں کا ترانہ ایک خوبصورت نظم ہے۔'' 214

سرور الہدیٰ لکھتے ہیں:

''نظم ہاتھوں کا ترانہ'' سردار جعفری کی انسان دوستی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔اس نظم میں جس ہاتھ کا ذکر ہے وہ ہاتھ کوئی نرم ونازک ہاتھ نہیں کہ جس نے سرد وگرم جھونکے برداشت نہ کیے ہوں بلکہ یہ وہ ہاتھ ہے جو محنت کشوں کا ہے جس نے دنیا میں کتنے نقش ونگار بنائے' کتنی شمعیں جلائیں' کتنے زخموں پر مرہم رکھے' اس کی تعظیم جب نہیں ہوتی تو شاعر کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ جس شخص کا ہاتھ اتنا ہنرمند اور نفع بخش ہو وہ جب بھوکا پیاسا اور پریشان حال نظر آتا ہے تو سردار تڑپ اٹھتے ہیں اور ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

اب بھی ہے اسی جسم برہنہ کی نمائش/ زخموں سے جسے پیراہن دردملا ہے/ ہونٹوں پہ وہی خشکی افلاس کے دھبے/ چہروں پہ وہی بھوک کی ٹھہری ہوئی شامیں/ ہے کوئی جو ہنگامہ فردا کو صدا دے۔

اس نظم کے یہ دو مصرعے ''ہونٹوں پہ وہی خشکی افلاس کے دھبے'' ''چہروں پہ وہی بھوک کی ٹھہری ہوئی شامیں صرف ایک لفظ ''وہی'' کے استعمال سے افلاس اور بھوک کا رشتہ ماضی سے بھی قائم ہوجاتا ہے گویا یہ لفظ بھوک اور افلاس کے ایک طویل سلسلے کو ظاہر کرتا ہے۔سردار نے ایک خواب دیکھا تھا اور یہ خواب ان کی زندگی کا سب سے اہم ترین واقعہ تھا اس کے بغیر جینا ان کے لیے زندگی کی موت تھی۔

اس خواب کی ایک تصویر اس نظم میں دیکھئے۔

پھر مرے خواب تصور کے جواں شہزادے/ مستیٔ شوق کی گل رنگ قبائیں پہنے/ بزم امروز میں پیمانہ بکف آئے ہیں/

پوچھتے ہیں کوئی پیاسا تو نہیں محفل میں/کوئی بھوکا تو سرِ راہ نہیں سوتا ہے/موج مے کس نے چھپا رکھی ہے میخانوں میں/ بجلیاں کس نے دبا رکھی ہے پیمانوں میں/ساقی خاموش ہے اور پیرِ مغاں شرمندہ 215

نظم ہاتھوں کا ترانہ مشمولہ ''ایک خواب اور'' میں مزدوروں کا ترانہ انسانیت کا پیغام جرأت' بے باکی' حوصلہ مندی اور بغاوت بھی ہے۔نظم کا انداز بڑا خوبصورت' علامتی اور استعاراتی ہے۔

تخلیق یہ سوزِ محنت کی' اور فطرت کے شہکار بھی ہیں/میدان عمل میں لیکن خود یہ خالق بھی معمار بھی ہیں/ پھولوں سے بھری یہ شاخ بھی ہیں اور چلتی ہوئی تلوار بھی ہیں/ان ہاتھوں کو تعظیم کرو۔.....تعمیر تو ان کی فطرت ہے اک اور نئی تعمیر سہی/اک اور نئی تدبیر سہی ایک اور نئی تقدیر سہی/ایک شوخ و حسیں خواب اور سہی ایک شوخ و حسیں تعبیر سہی/ان ہاتھوں کی تعظیم کرو/ دنیا کو چلانے والے ہیں/ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

نظم شہریان بھوپال گیس حادثہ 3/2 دسمبر 1984 کے شکار شہیدوں کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔حادثے کے بعد کی دردناک تصویر پیش کی گئی ہے۔یہ نظم غزل کے فارم میں ہے۔چند اشعار پیش ہیں۔

سارے شہروں میں جہاں کے شہر یاراں تھا یہ شہر/کوچہ دل دار و کوئے دل فگاراں تھا یہ شہر/شام شام نغمہ و مے شب غزل خوانی کی شب/بوستان بلبل و صوت ہزاراں تھا یہ شہر

ناگہاں برسا کہیں سے ایک ابر زہر بار/یاں سے واں تک اک ہجوم بے قراراں تھا یہ شہر/پل کے پل میں بام و در سب ہو چکے تھے سوگوار/قبر تیرہ بخت و تیرہ روزگاراں تھا یہ شہر

خاک دل اڑتی ہے اب جس طرح پروانوں کی خاک/صبح گل' روز طرب' شام بہاراں تھا یہ شہر/کون ہے فریاد رس' مانگیں گے کس سے خوں بہا/زیر پائے نخوت شکاراں تھا یہ شہر۔ 216

افغانستان کے عوام نے مجاہدین تحریک شروع کی تھی اس کی حمایت میں سردار جعفری نے جو نظم لکھی اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

''اپریل 1978 میں افغانستان میں سوویت یونین کی شہ پر مارکسٹوں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے وہاں کے حکمراں محمد داؤد خاں کو اقتدار سے ہٹا کر قتل کر ڈالا تھا اور ترا کی (Taraki) کو صدر اور کرمال کو نائب وزیر اعظم بنا دیا تھا۔علاوہ ازیں افغانستان کا نام اور جھنڈا بھی تبدیل کر دیا گیا تھا جس سے وہاں کے حالات انتہائی خراب ہونے لگے تھے۔چھ مہینے کے اندر اندر حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے تھے کہ وہاں کے عوام نے ''مجاہدین تحریک'' شروع کر دی تھی اور موجودہ صورت حال کے خلاف آواز بلند کرنے لگے تھے۔ان حالات سے سردار جعفری بے حد متاثر ہوئے اور 14/جون 1978 کو انقلابیوں کی حمایت میں اقبال کی محولہ بالا نظم کی زمین میں ایک خوب صورت نظم رقم کی جس کے آخری تیند بند ملاحظہ کریں'' 217

1930 کے آس پاس اقبال کی نظم جس میں انہوں نے افغانستان کو انقلاب کی دعوت دی تھی جس کے درج ذیل حصہ نے سردار کو متاثر کیا تھا۔

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان/تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان/ اپنی خودی پہچان/اے غافل افغان

سردار جعفری کی نظم کے آخری تین بند۔

مشرق ومغرب حیرت میں ہیں کیسے کایا پلٹی/پتھر کے سوکھے پیالوں سے کیسے صہبا چھلکی/دیکھ رہے ہیں پیار سے تجھ کو ہند اور پاکستان/اے بانکے افغان/تیرے کھیتوں تیرے باغوں پر ہے تیرا راج/تیرے سر پر تیری اپنی محنت کا ہے تاج/تیرے اس دہقانی پن پر سلطانی قربان/اے بانکے افغان/تو اقبال کے دل کی دعا ہے میرے دل کا گیت/تیرے دیس کی جیت ہے سارے پورب دیس کی جیت/تیرا نغمہ سرکش وشیریں اونچی تیری تان/اے بانکے افغان

سردار جعفری نے نظم ''افریقی لڑکی''مشمولہ ''لہو پکارتا ہے''میں افریقہ کی غربت وافلاس کا استعاراتی انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔

اسے خبر نہیں خود/کس قدر حسین ہے وہ/اسے خبر نہیں کتنا حسین جسم ہے وہ/وہ آبنوس کا جسم/اسے خبر نہیں وہ کس طرح چمکتا ہے/اگر وہ رقص کرے ناریل کے سایوں میں/برہنہ رقص کرے سبز رنگ سایوں میں/اور اپنے عکس کو دریا میں ضوفگن دیکھے/تو اس کے ننھے سے دل کو یقین آجائے/مگر یہاں تو سڑک پر کوئی درخت نہیں/کہ اس زمین پہ پتھر کے پیڑ اگتے ہیں/رکابیوں میں لرزتے غلیظ پانی میں/نہ آئنہ ہے نہ عکس جبیں نہ عکس بدن/نہ رخ کا نور نہ سینے کا نوجوان چمن/بس اس میں ڈوب کے بجھ جاتی ہے ہر ایک کرن.....

نظم ''حبشی میرا بھائی'':

27/اکتوبر 1978 کو لکھی گئی نظم ''حبشی میرا بھائی''بیسویں صدی کے پندرہ جنوری 1979 میں شائع ہوئی اس نظم میں حبشیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہاتھی دانت کے اس جنگل میں/اس کا کالا جسم/.....آگ برستی دھوپ میں چمکے/اور نیزہ بن جائے/طبل ودہل کی تال پہ ناچے/دشمن سے ٹکرائے/حبشی میرا بھائی/جنگل جنگل پھول چنے/بھائی کے پاؤں لال گلاب.....

سردار جعفری نے 12 ستمبر 1973 کو نظم ''خون کا اجالا''مشمولہ ''لہو پکارتا ہے''لکھی جس میں انہوں نے چلی کے سرخ شہیدوں کو سلام اور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وہاں کے مجاہدین کو ایک حوصلہ افزاء امید کی بشارت دی ہے۔

چلی کے سرخ شہید وسلام لو میرا/میرے عزیز نرودا کے ہم وطن یارو/تمہارے خون کی سرخی میں وہ اجالا ہے/کہ قاتل اپنے اندھیرے میں چھپ نہیں سکتے/ہزار قتل کی سازش ہزار جنگ کے وار/تمہارا خون مگر رائیگاں نہ جائے گا/زمانہ جسم سے ملبوس زخم اتارے گا/حیات پیرہن گل کے انتظار میں ہے

سردار جعفری نظم ''جشن بغاوت''میں عوام کو سرخ پرچم لہرانے'استالین اور لینن کے گیت گانے'تاریخ کی پیشانی پر مزدور کا نام لکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ہر بند پر''ساتھیو لال سلام''کی تکرار ہے۔عمر رضا کے مطابق یہ نظم پورے طور پر کمیونسٹ پارٹی کی ترجمانی کرتی ہے جس میں بلاشبہ پارٹی کا پروپگنڈہ کیا گیا ہے۔یہ نظم خاص طور پر تلنگانہ کے کسانوں کی جدوجہد کی حمایت میں ہے''۔ 218

نظم ''کارل مارکس'' (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں کارل مارکس کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے:

وہ آگ مارکس کے سینے میں جو ہوئی روشن/ وہ آگ سینۂ انسان میں آفتاب ہے آج/ وہ آگ جنبش لب جنبش قلم بھی بنی/ ہر ایک حرف نئے عہد کی کتاب ہے آج/ زمانہ گیر و خود آگاہ و سرکش و بے باک/ سرور نغمہ و سرمستی شباب ہے آج/ ہر ایک آنکھ میں رقصاں ہے کوئی منظر نو/ ہر ایک دل میں کوئی دلنواز خواب ہے آج/ وہ جلوہ جس کی تمنا تھی چشم آدم کو/ وہ جلوہ چشم تمنا میں بے نقاب ہے آج۔

جنوری 1977 میں لکھی گئی نظم ''چھوٹا سا دل'' کے بارے میں عمر رضا قمطراز ہیں:

''نظم میں سردار جعفری نے اشتراکی نظریے کو لطیف انداز میں پیش کیا ہے اور ایک ایسی دنیا آباد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جہاں ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو صبح تبسم عطا ہو، خالی بے بس ہاتھوں کو کام کی دولت عطا ہو، انسان کی تفریق مٹا کر ہر طرف مساوات کا دور دورہ ہو۔ مذکورہ تمام باتوں کو سردار جعفری نے بیانیہ اور سوالیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اخیر میں ایسی خوش حال دنیا آباد کرنے کے بدلے وہ اپنے چھوٹے سے دل کو پھول کی صورت میں پیش کرتے نظر آتے ہیں'' 219؎

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو/ صبح تبسم عطا کرے/ پیاس کے پیلے برگ خزاں کو/ فصل گل کی مے میں ڈبو دے/ کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے/ آنسو کے قطرے چن لے/ اور موتی کر کے واپس دے دے/ جو خالی بے بس ہاتھوں کو/ کام کی دولت عطا کرے/ مایوسی کو کوئے تمنا میں لے جائے/ شاہد فردا کے جلوؤں سے دل کی جوت جگائے/ جو دھرتی کی بھوک مٹائے/ اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں بھر دے/ انساں کی تفریق مٹا کر/ انسان کی تخلیق کرے/ کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر/ میرے خوابوں کا یہ عکس ملے/ میں اس کے قدموں میں اپنا قیمتی دل/ چھوٹا سا دل/ پھول کی صورت میں رکھ دوں گا۔

8/جون 1964 کی لکھی نظم ''رہبر کی موت'' مشمولہ ''ایک خواب اور'' میں سردار جعفری نے کسی اشتراکی نظریے کے حامل رہبر کی موت کا ذکر کیا ہے اور اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اپنا رہبر جنگ کے میداں میں کام آیا ہے آج/ وہ وطن کی آبرو، اہل وطن کا افتخار/ اشتراکیت کی جمہوری روایات کا نقیب/ محفل انساں میں ہے انسانیت کا تاجدار/ اس کا پرچم لے کے میدا میں نکلنا ہے ہمیں/ فرش گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں۔

سردار جعفری نے سوویت روس کے شہر استالن گراد (موجودہ والگوگراد) گئے اس وقت اس شہر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نظم نذر عقیدت لکھی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اس شہر میں بڑی خونریزی ہوئی تھی لیکن سرخ سپاہیوں نے مقابلہ کر کے فتح حاصل کی تھی اور امن و امان قائم کیا تھا۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

لیے سینے میں اپنے امن عالم کی مراد آیا/ دیار ہند سے میں سوئے استالن گراد آیا/ صدا دی والگا کی موج نے ختم مسافت پر/ ادب سے پا نور کھنا اس زمین عزم و ہمت پر/ بچھے ہیں خاک کے سینے پہ سینے سورماؤں کے/ یہاں قدموں کے نیچے دل

دھڑک اٹھتے ہیں ماؤں کے/ بہاروں کی حفاظت کی ہے جاں دے کے جیالوں نے/لہو بو کر اگائی فصلِ گل نازک خیالوں نے۔

نظم ''میرے عزیزو میرے رفیقو'':(مشمولہ ایک خواب اور)

اکتوبر 1956 میں سردار جعفری نے نظم ''میرے عزیزو میرے رفیقو مشمولہ ''ایک خواب اور''لکھی۔

اس نظم کے تعلق سے عمر رضا نے لکھا ہے:

''نظم دراصل کمیونزم سے لوگوں کی خفگی دور کرنے کے لیے سردار جعفری نے لکھی تھی۔اس میں انہوں نے ''اپنے''نظریۂ کمیونزم کی وضاحت کی ہے جس کے مطابق یہ عہد حاضر کی آبرو اور زندگی کو حسین بنانے کی آرزو ہے۔اگر چہ سردار جعفری کا یہ بے حد محبوب موضوع ہے لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر اب وہ اسے نرم اور مدھم لب و لہجے میں پیش کرتے نظر آتے ہیں جو ان کی سابقہ نظموں سے بالکل مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں شعریت نغمگی، دلبستگی اور لطافت قائم ہے۔220

؎ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا ہے/کہ دل مرا عشق سے ہے خالی/مری نظر حسن سے ہے عاری/قریب آؤ تمہیں بتاؤں/ مجھے محبت ہے آدمی سے/ مجھے محبت ہے زندگی سے/ مجھے محبت ہے مہ جبینوں سے/گلرخوں سے سمن بروں سے/.....مرے عزیزو مرے رفیقو!/مری کمیونزم کچھ نہیں ہے/یہ عہد حاضر کی آبرو ہے/مری کمیونزم زندگی کو/حسین بنانے کی آرزو ہے/.....تم اپنے شیشے اٹھا کے لاؤ/ میں لے کے اپنی کدال نکلوں/ہزار ہا سال کے مظالم/ جو روح و دل پر پہاڑ بن کر/ہزار ہا سال سے دھرے ہیں/ ہم اپنے تیشوں کی ضرب کاری/ سے ان کے سینوں کو چھید ڈالیں/ یہ صرف ہے ایک شب کی محنت/ جو عہد کر لیں تو ہم سحر تک/ حیات نو کے نئے اجنتا/ نئے ایلورا تراش ڈالیں۔

انقلاب روس کی ستائیسویں سالگرہ کے موقع پر کہی گئی نظم ''انقلاب روس''میں اس انقلاب کی سردار جعفری نے تعریف کی ہے۔پوری نظم مسرت و شادمانی لیے ہوئے ہے۔

رخ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے/بکھیر دی ہے فضاؤں میں سرخیاں تو نے/.....شگاف ڈال دیا تاج شہریاری میں/ گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تو نے/فریب زار بھی تو ڑا فسون قیصر بھی/اجاڑ دی ہیں لٹیروں کی بستیاں تو نے/.....جہان پیر کی طرح کہن بدل ڈالی/مٹائے فرقہ و طبقات کے نشاں تو نے/عنانِ وقت ہے محنت کشوں کے ہاتھوں میں/ یہ راز وہ ہے جسے کر دیا عیاں تو نے/.....بلا کا جوش ہے تیرے سبو کی مستی میں/شراب سرخ میں حل کی ہیں بجلیاں تو نے/جہاں میں دھوم ہے جمہور کے ترانوں کی/کچھ ایسے شوق سے چھیڑا ہے ساز جاں تو نے

نظم ''تعمیر نو (مشمولہ خون کی لکیر) میں سردار جعفری نے انقلاب روس کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ایشیا میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔نظم میں اشتراکی نظریہ موجود ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انقلاب روس نے چھیڑا ہے مشرق میں رباب/ ایشیا کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب/ زندہ باد اے انقلاب/ رسم پرویزی گئی آئین چنگیزی گیا/اب ہمیشہ کے لیے دستور خوں ریزی گیا/ زندہ باد اے انقلاب/عارض لعل بدخشاں پر ہے کیسی

آب و تاب/سرخ رو خونِ شہیدانِ وطن سے ہے گلاب/ زندہ باد اے انقلاب/ کیوں نہ ہوں کشت و چمن آسودہ خرمن باغ باغ / خانۂ دہقان میں روشن ہیں فراغت کے چراغ / زندہ باد اے انقلاب/ اہلِ محنت کا نہال آرزو ہے بارور/ آدمی کے دستِ قدرت میں ہیں فطرت کے ثمر/ زندہ باد اے انقلاب۔

سردار جعفری نے لینن کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نظم لینن (مشمولہ خون کی لکیر) میں ان کی ستائش کی ہے۔

؎ رگ مزدور میں خوں بن کے رواں ہے لینن/ دل پہ سرمائے کے اک سنگ گراں ہے لینن/کشتِ دہقاں کے لیے بادِ بہاری کا پیام/شہریاری کے لیے برق تپاں ہے لینن/سرخ فوجوں کے تحمل میں جھلک ہے اس کی/ نوجوانوں کے ارادوں میں جواں ہے لینن/جس نے ہر قوم کو ہر ملک کو سیراب کیا/سرخ میخانے کا وہ پیرِ مغاں ہے لینن

نظم ''آخری خط'' (مشمول خون کی لکیر) 1944ء میں لکھی گئی ہے۔یہ نظم دراصل سوویت جرمن جنگ میں جانے والے ایک سرخ سپاہی کا خط ہے جو اپنے ملک کی خاطر جان نچھاور کرنے جا رہا ہے اس طرح وہ اپنی بیوی کو آخری خط لکھ رہا ہے۔اس زمانے میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی شباب پر تھی اور ہندوستانی افواج اس جنگ میں اس شرط پر شرکت کر رہی تھیں کہ انہیں آزادی مل جائے گی۔سردار جعفری نے دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں کی عکاسی کی ہے'سرخ سپاہی کے حوصلوں کو اجاگر کر کے ہندوستانیوں میں جوش'عزم و حوصلہ کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔سرخ سپاہی اپنی بیوی کو درخشاں مستقبل کی بشارت دیتا ہے نظم میں رجائیت حاوی ہے۔

تیرے شوہر کا سلام آخری/ ہے محبت کا پیام آخری/ ملک پر اپنے فدا ہوتا ہوں میں/اب ہمیشہ کو جدا ہوتا ہوں میں/.....

الغرض ہم بے خطر لڑتے رہے/ روز و شب شام و سحر لڑتے رہے/ جنگ کا سیلاب چڑھتا ہی گیا/ دشمنوں کا زور بڑھتا ہی گیا/..... بند کر دیں وار یہ ممکن نہیں/ ڈال دیں ہتھیار یہ ممکن نہیں/ .....ہم ہیں کیسے سورما دکھلائیں گے/مرتے مرتے اک سبق دے جائیں گے/ہم جیتیں گے بھی تو اپنی آن سے/ہم مریں گے بھی تو اپنی شان سے/غول دشمن کا جب آئے گا یہاں/ خاک کے سینے سے اٹھے گا دھواں/شہر لینن کے سپوتوں کے لیے/اور کھنڈر فاشست بھوتوں کے لیے/.....جانتا ہوں وہ گھڑی بھی آئے گی/ دشمنوں کی نبض جب چھٹ جائے گی/ .....مسکرائے گی تبسم کی کلی/کونج اٹھے گی قہقہوں کی راگنی/ ریگ ساحل پر نیاں ہو جائے گی/ یہ زمیں پھر آسماں ہو جائے گی۔

نظم ''ایک خراب اور'' میں بقول عمر رضا ''اشتراکی تحریک کی انتہا پسندی اور موقع پرستانہ رویے سے سردار جعفری نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ 221

؎ خواب اب حسنِ تصور کے افق سے ہیں پرے/ دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب/اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں/تشنگی آبلہ پا شعلہ بکف موج سراب/ یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے/یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایابِ شباب/ .....تابشِ رنگِ شفق' آتشِ روئے خورشید/مل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خونِ احباب/ جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا بیتی ہے/کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب/ آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو/اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب/ دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منھ خاموشی/ جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب/ ..... پھینک پھر

جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند/ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند۔

نظم ''اسٹالن کتھا'' روس میں قائم اشترا کی نظام کی وکالت کرتی نظر آتی ہے اور ہندوستان میں بھی ایسے نظام کے قیام کے لیے ہندوستانی عوام کو لال جھنڈے تلے آنے کی دعوت دیتی ہے۔

340 اشعار پر مشتمل نظم ''استالن کتھا'' (دسمبر 1948)..... میں عام بول چال کی زبان کو کچھ زیادہ ہی جگہ دی گئی ہے۔اس کے لیے ہندی کے عام لفظوں کا بھی استعمال کیا گیا جس کی وضاحت سردار جعفری نے پیش لفظ میں کی ہے۔بنیادی طور پر یہ نظم ڈھولک پر گانے کے لیے لکھی گئی تھی۔اس نظم سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کمیونسٹ پارٹی نے سردار جعفری کو ایک پرچارک کے طور پر استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ 1942 سے لے کر 1955 کے آس پاس تک ان کی بیشتر شاعری میں پارٹی لائن کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کی عمدہ مثال ''استالن کتھا'' ہے۔

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا اسٹالن کی/سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی/جس نے نربل نردھن جن کو مکتی مارگ دکھایا ہے/جس نے جنتا کی شکتی سے جنتا راج بنایا ہے/جس نے پونجی واد کے ہتھیارے ہاتھوں کو کاٹ دیا/جس کے لوہ نے انیائے کے بھاڑ سے منہ کو پاٹ دیا۔

انقلاب روس سے قبل کے روس اور موجودہ ہندوستان کا موازنہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے۔

روس کی پرجا بھوکوں مرتی جیسے ہند کی پرجا آج

روس کا راجہ لہو کا پیاسا جیسے ہند کے نیتا آج

اس کے بعد سردار جعفری نے اس زمانے کے روس کا وہ نقشہ کھینچا ہے جب انگریزوں/امریکیوں کی دولت کا جال بچھایا ہوا تھا۔میل کے مالک' مزدوروں کا خون چوس رہے تھے' کھیت کی فصلیں پکنے سے پہلے ہی کسانوں سے چھین لی جاتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح لینن اور استالن نے ان سب کا قلع قمع کر کے مزدوروں اور کسانوں کو مکتی کی راہ دکھائی۔

ان کو مکتی راہ دکھائی لینن اور استالن نے

ان کی دنیا نئی بنائی لینن اور استالن نے

.....اسٹالن نے مزدوروں اور کسانوں کو انقلاب کے گر سکھائے اور مزدوروں کو اس کی طاقت سے آگاہ کر کے اس کا استعمال کرنے کے لیے تیار کیا۔

لال پھریرا لے کر نکلے نردھن مزدور اور کسان/مل پر دھرنا دے کر بیٹھے بانٹ لیے سارے کھلیان/ظلم کا سر اور انیائے کا پاپی سینہ پھاڑ دیا/دل پہ زمینداروں کے اپنے راج کا کھونٹا گاڑ دیا/فوج کسان اور مزدوروں کا پہلا پہلا راج آیا/لینن استالن نے دل دی روسی جنتا کی کایا۔

سردار جعفری نے دنیا کو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے خانے میں تقسیم کر کے.....موازنہ کیا۔

ہو گئے دھرتی کے دو ٹکڑے تب سے ہیں دنیائیں دو/راہیں دو ہیں' دو منزل' دو مقصد ہیں آشائیں دو/اک دنیا ہے محنت

کی‘ اور محنت کی آزادی کی/ دوسری دنیا دولت کی او ردولت کی بد ذاتی کی.....!/ اک دنیا مزدوروں کی اور وہ دنیا انسانوں کی/ دوسری دنیا سرمائے کی‘ وہ دنیا حیوانوں کی

استالن نے روس میں کس طرح کی خوش حالی قائم کی اس پر سردار جعفری نے روشنی ڈالی بیس برس میں روس نے دوسو سال کے کام کو نپٹایا/ روس کی خوش حالی سے۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

''فتح برلن کے بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔روس کے سوپر پاور بننے کے بعد امریکیوں اور انگریزوں کی تخریبی چالوں سے دنیا تیسری عالمی جنگ کی طرف چل پڑی تھی۔ان حالات کو بھی سردار جعفری نے اس نظم میں پیش کیا ہے کہ کس طرح امریکہ اور انگلینڈ اپنے ایٹمی ہتھیار کے خوف و دہشت سے دنیا کو ڈرا رہے تھے۔علاوہ ازیں انہوں نے ان ایشیائی ممالک کو بھی سخت نکتہ چینی کی ہے جو امریکیوں اور انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے 222

(عمر رضا‘ علی سردار جعفری‘ صفحہ 287)

۔ انگریزی‘ امریکی لڑائی کرنے والے اتیاچاری/ ماؤں کے آنسو انسانوں کے گرم لہو کے بیوپاری/ پھر سے اب سنسار کے سر پر جنگ کی آفت لاتے ہیں/ سونے اور چاندی کے گدھ لاشوں کے لیے منڈلاتے ہیں/ استالن اور روس کی جانب دیکھتے ہیں غرّاتے ہیں/ ایٹم بم کا نام بتا کر دنیا بھر کو ڈراتے ہیں/ پہلے جرمن پگلائے اب امریکی پگلائے ہیں/ ہٹلر کے دن بیت گئے اب ان کے بھی دن آئے ہیں/ برمی‘ ہندوستانی‘ پاکستانی نیتا بھی اترائیں/ یہ برساتی مینڈک بھی ڈالر کی برکھا میں ٹرائیں

سردار جعفری روس سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔روس کی طرف اگر ہلکی سی نگاہ بھی ڈال دے تو اسے وہ کتا اور مزدوروں کے خون سے چپڑی ہوئی روٹی کھانے والا قرار دیتے ہیں۔درج ذیل اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر روس حامی اور امریکہ مخالف تھے....اس نظم میں سردار جعفری کا جارحانہ انداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔روس‘ استالن‘ لینن‘ مارکسزم اور اشتراکیت سے ان کی گہری عقیدت و محبت واضح ہے جس کے خلاف وہ ایک لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ 223

۔ سامراج کا کتا بن کر جنگ میں جانے والا کون/ مزدوروں کے خون سے چپڑی روٹی کھانے والا کون/ کوئی نہیں ہے ایسا پاپی مزدور اور کسانوں میں/ ایسے ہتھیارے نہ ملیں گے سادھارن‘ انسانوں میں/ استالن محافظ ہے محکوموں کا مجبوروں کا/ روس کا جنتا راج ہے سارے عالم کے مزدوروں کا...../ دھن والے اپنی میا پونجی کی ارتھی آپ اٹھائیں/ ناناہرلا اور پدم پت فوج میں بھرتی ہو جائیں/ چاند کے منہ پر جوتھو کے گا اس کے منہ پر آئے گا/ جوالا مکھی پر چڑھنے والا جوالا میں بہہ جائے گا/ روس پہ حملہ کر کے بچ جانے کی کوئی تدبیر نہیں/ کوئی ان کو بتلا دو یہ روس ہے کچھ کشمیر نہیں۔

نظم کے آخر میں سردار جعفری کہتے ہیں۔

کہنے کو تو روس کے واشی مزدور اور کسان ہیں سب/ علم و ہنر کے جاننے والے سائنس کے دوان ہیں سب/ شاعر‘ گیانی‘ وید‘ کلاونت اور گوالے ایک ہوئے/ ذہنی اور جسمانی محنت کرنے والے ایک ہوئے

اسٹالن کی خوب تعریف کی گئی۔

اس کا جیون ہند میں ہے ایران میں ہے اور شام میں ہے/ اس کا جیون جنتا کی آزادی کے سنگرام میں ہے/ وہ صرف اک انسان نہیں ہے اک بڑا اسنسار ہے وہ/ ایٹم بم کی اس دنیا میں شانتی کا آدھار ہے وہ/ ...../ ہم نے استالن کے دل سے جینے کا ارمان لیا/ استالن سے شکتی لی ہے استالن ہمارا ہے/ استالن کی طرح لڑیں استالن جیسے کام کریں/ اپنے نیتا استالن کو اٹھ کر لال سلام کریں۔

سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''امن کا ستارہ (1950) میں تین طویل نظمیں ''سوویت یونین اور جنگ باز' استالن کتھا اور اس کا ستارہ ہیں۔ ان تینوں نظموں میں روس کے اشترا کی نظام کی تعریف کی گئی ہے اور ہندوستان میں بھی اس نظام کے قیام کی دعوت دی گئی ہے۔

عمر رضا نے ان نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ اقتباسات پیش ہیں:

(1) سوویت یونین اور جنگ باز میں یہ سوویت روس کی تعریف اور اس کے اتحاد کی بات کو اجاگر کر کے ہندوستانیوں کو متحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز ظلم و بربریت کے عناصر کو متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا تو وہ بھی سوویت یونین کے نازیوں کی طرح ختم کر دیے جائیں گے''۔

143 اشعار پر مشتمل اس نظم میں سوویت یونین کو محبتوں کی انجمن' فخر روزگار' عشق کی زمین اور حسن کا دیا وغیرہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد روس کی طرف ہاتھ بڑھانے والوں کے ہاتھ توڑ دینے' انہیں لہو میں ڈبونے اور ان کی قبر بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ فاشسٹ اور سامراجی طاقتوں کو برا بھلا کہتے ہیں..... ؎

یہ سوویت کی سرزمین جو فخر روزگار ہے/ محبتوں کی انجمن جو سب کی دوست دار ہے/ ..... درخت پھول پھل بہار' آدمی کے واسطے/ زمیں کھیت کوہسار آدمی کے واسطے/ یہاں ہر ایک شے پہ آدمی کا اختیار ہے/ ..... تم آنکھ اگر دکھاؤ گے تو آنکھ پھوڑ دیں گے ہم/ ہلیں گی انگلیاں تو انگلیوں کو توڑ دیں گے ہم/ تمہاری ایٹمی کلائیاں مروڑ دیں گے ہم/ تمہیں لڑائی ہم کو امن و آشتی سے پیار ہے۔

(2) نظم ''استالن کتھا'' میں سردار نے لینن کے شاگرد استالن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے روس میں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنے میں/ اسٹالن کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ نظم کے بیچ میں سردار نے ایک غزل کہی ہے جس میں ہندوستان کی آزادی کے حصول پر خوشی کا اظہار ہے۔ غزل کے آخری شعر میں ان اشعار اور غزلوں کو بے کار کہا ہے جو عوام کی سمجھ سے باہر ہوں' چنانچہ عوامی زبان کے استعمال کی وکالت کی ہے۔ نظم کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے جس میں اسٹالن کے کارناموں کا شمار کرتے ہوئے پوری دنیا کو مزدوروں اور سرمایہ داروں میں منقسم کر کے مزدوروں کی دنیا کو ''انسان'' اور سرمایہ داروں کی دنیا کو ''حیوان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بالخصوص دنیا کو مشرق اور مغرب کے خانے میں تقسیم کر کے مغربی دنیا کو زہر پھیلانے والا ثابت کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کے حالات سے عدم اطمینان' عوامی اتحاد' روس کو ایک مثالی ملک کے طور پر پیش کر کے ہندوستانیوں کو اس راہ پر چلنے کی صلاح دینا' آزادی کے بعد بنی قومی حکومت سے بیزاری' فرقہ وارانہ

فسادات اور ملک کی افراتفری کے لیے حکومت وقت (کانگریس) کو ذمہ دار ٹھہرا کر عوام کو کمیونسٹ پارٹی کے لال جھنڈے تلے آنے کی دعوت دینا' پوری دنیا کے پُر انتشار ماحول پر افسوس اور دنیا کے ان ملکوں کی حوصلہ شکنی کرنا جو جنگ جیسے حالات پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے مثلاً انگریز' امریکی' جرمن وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جسے سردار جعفری نے اس نظم میں بڑے باغیانہ انداز میں پیش کیا ہے.....اس کے بعد پھر اسٹالن کی تعریف کے پل باندھنا شروع کر دیئے ہیں اور اخیر میں کہتے ہیں ؎

اس کا جیون ہند میں ہے ایران میں ہے اور شام میں ہے/اس کا جیون جنتا کی آزادی کے سنگرام میں ہے/وہ صرف اک انسان نہیں ہے اک بڑا سنسار ہے وہ/ایٹم بم کی اس دنیا میں شانتی کا آدھار ہے وہ/استالن ایک پیڑ ہے جس کی چھایا بڑھتی جاتی ہے/اس چھایا میں دکھ کی ماری مانوتا سستاتی ہے۔

روس کی آنکھوں کا تارا ہے دنیا بھر کا سہارا ہے/ہم سب ہیں استالن کے اور استالن ہمارا ہے/استالن کی طرح لڑیں/استالن جیسے کام کریں/اپنے نیتا استالن کو اٹھ کر لال سلام کریں

(3) نظم ''امن کا ستارہ'' (460) مصرعوں پر مشتمل ہے۔اس میں بھی اسٹالن کی بھرپور تعریف کی گئی ہے۔اسٹالن' کو نور' انسانوں کی دوسری زندگی' اک نئی سانس اور ذہن و ادراک سے تعبیر کیا ہے.....سردار جعفری نے اسٹالن کی تعریف سوویت یونین' برلن' ماسکو' کھیتوں' دھرتی اور ساری انسانیت کے ذریعہ کرائی ہے۔علاوہ ازیں ان ظالموں کا بھی ذکر کیا ہے جو رہنمائی کا خول پہن کر مزدوروں اور کسانوں کا استحصال کرتے ہیں لیکن سردار جعفری کا ماننا ہے کہ استالن کی وجہ سے چونکہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے اس لیے سارے ظالم پھانسی پر لٹکائے جا چکے ہیں اور دنیا میں مختلف تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ طبقات کی تمام بندشیں توڑ ڈالی گئیں' وہم کی انگلیوں کو موڑ دیا گیا ہے۔انسان اب انسان ہو گیا اور اپنی تخلیق پر مطمئن نظر آ رہا ہے۔خوشی اور غم و دیگر نعمتوں میں اب ہر شخص ایک دوسرے کا شریک کار ہے۔اس طرح سردار جعفری کا ماننا ہے کہ مارکس کے خواب کو استالن نے شرمندۂ تعبیر کر دیا.....سردار جعفری نے....دنیا میں امن و اتحاد قائم کرنے کے استالن کے رول کو خوب سراہا ہے اور ان کی خوب جے جے کار کی ہے۔ہندوستان کو اس بات پر خوش ہونے کے لیے کہا ہے کہ اس کی سرحد ایک ایسے ملک سے ملتی ہے جہاں امن' شانتی اور خوشیاں ہیں۔نظم کا اختتام سوویت یونین کے ذرے ذروں' لینن و استالن اور ان تمام عناصر کی جے جے کار پر ہوتا ہے جو پوری دنیا میں امن' شانتی' اتحاد' حریت' محبت' انسانیت اور خوش حالی و ترقی کے لیے سرگرداں اور برسرکار ہیں'' 224

مارکس' لینن اور استالن کی تعریف میں کہے گئے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مارکس نے قبر سے اٹھ کر دنیا کو پیغمبرانہ نگاہوں سے دیکھا/سارے یورپ پہ اک خوف طاری تھا/پیرس پہ ہیبت تھی/لندن پہ لرزہ/اور سرمایہ داری کے جنگل کے سب جانور/بھیڑیئے' ریچھ' گینڈے' سور/اپنے اپنے بلوں اپنے غاروں میں سہمے ہوئے اور دبکے ہوئے...../روس میں جشن دنیا کے محنت کشوں میں خوشی...../اور وہ خواب جو اب تلک خواب تھا/اک چھٹے کرۂ ارض پر چھا گیا/زندگی پر نیا بانکپن آ گیا/.....روس آزاد ہے روس کی قوم میں آزاد ہیں/سوویت یونین مختلف رنگ پھولوں کا ایک ہار ہے/.....کھیت مزدور بھوکے کسانو/وہ زمیندار اور ان کی سرکار باقی نہیں/اپنی دھرتی پہ اپنا نیا راج قائم کرو/.....بچو یہ

پارک' اسکول' باغات' یہ پالنے اور جھولے تمہارے لیے ہیں/.....اب تمہارے مہکتے ہوئے سر پہ لینن کا شفقت بھرا مہرباں ہاتھ ہے/اور اسٹالن کے بیٹے تمہارے گھروں اور میدانوں اور سرحدوں کی حفاظت میں مصروف ہیں.....

عمر رضا لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے دنیا کی تمام قوموں کی بے بسی' بے چارگی اور ظلم وزیادتیوں کی طرف توجہ مرکوز کی ہے اور مزدوروں کو ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے لیے کہا ہے جس کے لیے بقول ان کے روس ان کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔

ساری دنیا کی قو موسنو/اپنے دل کے لہو میں بھگوئی ہوئی روٹیاں کب تلک کھاؤ گے/ سامراجی لڑائی کا جوالا مکھی پاٹ دو/ جنگ کی سازشوں کی رگیں کاٹ دو/سوویت یونین دوستی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے/.....ہٹلری فوجیں طوفان کی طرح اٹھی تھیں اور آندھیوں کی طرح آئی تھیں/ آخرش روس کی خاک پر سرنگوں ہوگئیں/ ان کے چہرے غضبناک تھے/ ہاتھ سفاک تھے/ انگلیاں عورتوں اور بچوں کی گردن دبانے میں مشاق' لاشوں سے/ کپڑے چرانے میں استاد تھیں/.....وہ جو نازی درندوں اور ایران کے بیچ میں آ کے حائل ہوا/ استالن کا ہاتھ تھا/ وہ جو ہٹلر کی فوجوں کے رستے میں دیوار بن کر کھڑا ہوگیا/ استالن کا جسم تھا/ جس نے اس آگ' بارود کے تند سیلاب کو غرق خود اس کے ہی خون میں کر دیا/ استالن کا شہر تھا/ جس نے سنسار کو امن اور شانتی بخش دی/ استالن کا وار تھا/ ساتھیو! استالن کے ہاتھ کی جے کہو.....

وہ (سردار جعفری) استالن کو 'امن کا ستارہ' تصور کرتے ہیں اور بقول ان کے اس ستارے کو دنیا کے ہر قوم و ملک میں دیکھا جاسکتا ہے جس کا رنگ اور نام ضرور بدلا ہوا ہے لیکن وہ درحقیقت امن کا ستارہ استالن ہے 225

سردار جعفری نے کسی بھی سرحد سے انکار کیا ہے اور انسانیت کو ایک کہا ہے۔

ساری انسانیت ایک ہے/ چین کے آتش افروز رخسار سے/ خون آلودہ یونان کے چاک قلب وجگر تک/ میکسکو اور اسپین کی رات سے/ ہنگری اور رومانیہ کی سحر تک/ سوویت یونین کے طرب بازار سے/ ہند و ایران کے آنسوؤں تک/ حبشیوں کی سلگتی ہوئی روح سے/ ویت نام اور برما کی بھیگی ہوئی بجلیوں تک/ ساری انسانیت ایک ہے/

عمر رضا رقمطراز ہیں:

''روس کی خصوصیات بیان کرنے کے ساتھ ہی وہ اس بات کا افسوس بھی کرتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب وہاں ظلم وستم کا راج تھا اور پچھلی صدیوں میں وہاں کی قوم فاتح بن کر ہندوستان آئی تھی جس نے ہندوستان کے چپے چپے کو خاک وخون میں ڈبو دیا تھا۔ خواہ وہ چنگیز' تیمور' ترک اور تاتاری ہی کیوں نہ ہوں لیکن اب سردار جعفری اس لیے خوش ہیں کہ اب استالن اور لینن کا زمانہ ہے جس نے ہر طرف خوشیوں کا ایک ماحول قائم کر دیا ہے.....

روس کی ترقی کو دیکھ کر سرمایہ داروں میں جس طرح کی پریشانی پائی جارہی تھی اس کو اس نظم کے آخری حصے میں پیش کیا گیا ہے۔

دیش بھگتوں میں ایک کھلبلی مچ گئی/ چور بازار میں شور پیدا ہوا/ اور وہ بھاڑے کے ٹٹو بدکنے لگے/ جن کے چوڑے دہانوں میں اٹلی' ٹرومین اور مارشل کی لگامیں لگی ہیں/ سوویت یونین میں تو تلوار و بندوق کا راج ہے/ حکمرانوں نے انسان کی

آزادیاں چھین لی ہیں/ اندھی آنکھوں کو سورج بھی اندھا نظر آیا ہے/ سوویت یونین کوئی جنگل نہیں، بھیڑیئے جن میں آزاد ہوں/ یہ لٹیروں کی اور بدمعاشوں کی جنت نہیں/ اس میں ناناؤں اور برلاؤں کو/ آدمی کا لہو چوسنے اور گلے کاٹنے کی اجازت نہیں/ یہ زمین چور بازاروں کے واسطے تنگ ہے/ ..... یہ نئی زندگی کے معمار ہیں/ ان کے سینوں میں شیروں کے دل/ ان کے ہاتھوں میں مزدور کی انگلیاں/ ان کے ماتھوں پہ لینن کے ماتھے کا نور/ انکھڑیوں میں استالن کی آنکھوں کی سنجیدگی اور گمبھیرتا/ ان کو انسانیت کے گلے کاٹنے، خوں بہانے کی فرصت نہیں/ ..... ان کو بمبار اور ٹینکوں سے زیادہ عزیز اپنے بچّی کے ہل ہیں/ ان کو جنگی محاذوں سے نفرت ہے اور تھیٹروں سے محبت/ ..... سرخ قوموں قفقاز کے پاسبانوں کی جے/ برف کے نیچے سوتے جوانوں کی جے/ ..... امن اور شانتی کے لیے لڑنے والوں کی جے/ مسکراتے ہوئے ہونٹ ہنستے ہوئے سرخ گالوں کی جے/ حریت کے چمکتے شرارے کی جے/ امن کے جگمگاتے ستارے کی جے/ ماسکو سوویت یونین اور لینن کی جے/ نوع انساں کے رہبر استالن کی جے۔ 226

نظم ''امن کا ستارہ'' کی زبان عوامی ہے۔ جابجا عوامی بول چال کے الفاظ ملتے ہیں۔

''بھوکے رہتے دھوبی موچی بنجارے اور لکڑہارے/ دھن کی ناگن روٹی پانی پر بیٹھی تھی کنڈلی مارے/ رین و نامحنت کرتے تھے سانجھ سکارے روتے تھے/ اندھوں آگے روتے تھے اپنی بھی آنکھیں کھوتے تھے۔

نظم ''الوداع'' کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''بنیادی طور پر یہ نظم روس میں کمیونزم کی ناکامی کے حوالے سے لکھی گئی ہے ..... سردار جعفری کو کمیونزم سے بے حد محبت ہے اور روس میں جس طرح سے اس کا غلط استعمال ہوا، اس سے بھی وہ خائف ہوئے تھے۔ انہوں نے کمیونزم کو کبھی غلط قرار نہیں دیا بلکہ اس کے نام پر لوگوں نے جس طرح کی بدعنوانیاں پھیلا رکھی تھیں اس سے وہ ضرور نالاں ہوئے اور یہی اس نظم کا محرک ہے۔ موضوع کی مناسبت سے پوری نظم میں یاس اور افسوس کی کیفیت ملتی ہے۔ یہ نظم بھی غزل کے فارم میں ہے۔.....

سردار جعفری نے جس فنکارانہ انداز میں سرخ پرچم (کمیونزم) کو نشان عزم مظلومان عالم، لباس آبروئے ابن آدم، ردائے سر برہنہ بنت مریم، غرور دست محنت وغیرہ کہا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ علاوہ ازیں کمیونزم سے ان کی شدید وابستگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

الوداع اے سرخ پرچم سرخ پرچم الوداع/ اے نشان عزم مظلومان عالم الوداع/ اے لباس آبروئے ابن آدم السلام/ اے ردائے سر برہنہ بنت مریم الوداع/ اے فرات تشنہ کامانِ جہاد زندگی/ قلزم تشنہ لبی کی موج برہم الوداع/ ..... اے غرورِ دست محنت اے شکوہ بے نوا/ حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع/ تو نے دیکھا ہے عروج اور تو نے دیکھا ہے زوال/ کاش پھر آئے نہ خوں باری کا موسم الوداع/ دیدۂ پرنم سے کل دل نے کہا تھا ''مرحبا''/ کہہ رہی ہے آج لیکن چشم پرنم الوداع 227

علی جواد زیدی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی فکری زندگی میں ایک المناک نازک موڑ آنا باقی رہ گیا تھا۔ وہ روس کے حالیہ واقعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ روس میں کمیونسٹ تجربے کی شکست معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مارکس اور لینن کے مجسموں کا سرنگوں ہونا اور سرخ پرچم کا

وہاں کی فضا سے غائب ہوجانا صرف سیاسی واقعات نہیں ہیں بلکہ سرداراوران کی طرح کے جذباتی طور پر وابستہ مفکرین اور تخلیقی ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک کربناک تجربہ بھی ہے۔ چنانچہ اس سیلابی رو سے متاثر ہوکر سب سے پہلے انہوں نے ''الوداع سرخ پرچم'' کے عنوان سے ایک نظم اور شائع کرائی۔ اس میں رثائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جواُن کے جذباتی تلاطم کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ اپنی مارکسیت کے باوجود اتنے جذباتی ہوسکتے ہیں شاید یہ پہلے سوچا نہیں جاسکتا تھا لیکن ان کے انقلابی تفکر میں بھی جورومانی طرز اظہار بین السطور کی طرح نمایاں ہوتا رہا ہے۔ یہ اُس کا ایک مظاہرہ تھا '' 228

''مغرب نے قوم پرستی کے نظریہ کو ہوا دے کر انسانوں کو تقسیم کرنے کا جرم بھی کیا ہے چنانچہ وہ (سردار جعفری) اس نظم میں لکھتے ہیں:

جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے؛ ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایہ ہے۔
ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہوجاتے ہیں؛ یونہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں۔ 229

سردار جعفری نے 1950 میں اپنے شعری مجموعے امن کا ستارہ کی نظم ''استالن کتھا'' میں مشرق ومغرب میں مماثلتیں بتا کر یکجہتی اور مصالحتی رویہ اپنایا ہے۔

باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو ہوا ایک سی ہے/ سرد یا گرم بہرحال فضا ایک سی ہے/ ایشیا والے سے یوروپ کی زمیں کھینچ کے نہ مل/ میری سوغات بھی دل ہے تری سوغات بھی دل/ جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے/ ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایا ہے/ اور سرمایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے/ یہ میرے اور ترے خون کی ارزانی ہے/..... خیر ہو پیرس ولندن کے ہنرداروں کی/ خیر ہو روم کے یونان کے بت کاروں کی/ تیرے بازار میں یوسف بھی زلیخائیں بھی/ تیرے ویرانوں میں مجنوں بھی ہیں لیلائیں بھی/..... ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہوجاتے ہیں/ کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھوجاتے ہیں/ زہر سا نفرت و نخوت کا پیا کرتے ہیں/ یوں ہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں/..... اصلیت نکہت گل کی نہیں گلدانوں سے/ مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے/ بوئے گل ایک سی ہے بوئے وفا ایک سی ہے/ میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

سردار جعفری نے 1954 سے جنوری فروری 1955 کے درمیان نظم ''تین شرابی'' مشمولہ ''ایک خواب اور'' لکھی۔ نظم کے کچھ حصے ماسکو اور کچھ ممبئی میں لکھے۔ عمر رضا نے لکھا ہے:

''نظم کے پس پردہ انہوں نے استعاراتی انداز میں مشرق ومغرب کے درمیان اتحاد، پیار اور امن کو فروغ دینے کی بات کی ہے''۔ 230

ذکر نہیں یہ فرزانوں کا/ قصہ ہے اک دیوانوں کا/ ماسکو پیرس اور لندن میں/ دیکھے میں نے تین شرابی/ سرخ تھیں آنکھیں روح گلابی/..... رات نے اپنی کالی زباں سے/ خون شفق کے دل کا چاٹا/ چار طرف خاموشی چھائی/ پھیل گیا ہر سو سناٹا/ جنت پیرس کے پہلو میں/ سین کی موجوں کو نیند آئی/ ڈسنے لگی مجھ کو تنہائی/ مے خانے میں جا کر میں نے/ آگ سے دل کی پیاس بجھائی/ گہرے کہرے کی لہروں میں/ سارا لندن ڈوب گیا تھا/ لمحوں کی روشن آنکھوں میں/ شام کا کاجل پھیل چکا تھا/..... دوش ہوا پر تاریکی کے/ زلفوں نے خم کھول دیے تھے/ ماسکو کی خاموش فضا میں/ رات کی آنکھوں کے کاجل نے/ کتنے

جادو گھول دیے تھے/.....میری زباں تھی اردو ہندی/اس کی زباں تھی روسی لیکن/ایک زباں تھی ایسی بھی جو/ دونوں زبانوں سے پیاری تھی/ دونوں جس کو بول رہے تھے/ چند اشارے چند تبسم/نظروں کا خاموش تکلم/حرف یہی تھے لفظ یہی تھے/..... شہد جو دل میں گھول رہے تھے/.....گرد ہمارے امن کی دیوی/گیت کی حوریں ساز کی پریاں/ نغمے اور آواز کی لڑیاں/پیرس کی بد بخت حسینہ/مغرور امریکہ کا سپاہی/لندن کا بدمست شرابی/عیش و عرب کی محبوبائیں/نشۂ مے کی دوشیزائیں/.....حافظ اور غالب کی غزلیں/پشکن اور ٹیگور کی نظمیں/ کتنے ناز اور کتنی ادائیں/کتنی شیریں اور لیلائیں/ کتنے رانجھے کتنی ہیریں/ کتنے بت کتنی تصویریں/امن کی کوشش اور تدبیریں/مشرق و مغرب کی تقدیریں/ حلقہ باندھے ناچ رہی تھیں/ میں نے اس نازک لمحے میں/روح بشر کو نازاں دیکھا/نشہ و رقص کے پیچ و خم میں/ پیار کا جذبہ رقصاں دیکھا/

سردار جعفری نے اپنی نظم ''مشرق و مغرب'' میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

کوثر مظہری نے لکھا ہے:

''اردو کے بیشتر شعرا نے مغربی تہذیب سے اختلاف کیا ہے۔اکبر الہ آبادی کی تو پوری شاعری ہی مغربی تہذیب اور فکر کے ردعمل میں وجود میں آئی۔علامہ اقبال نے بھی مغربی تہذیب کو شاخ نازک پر بنے آشیانے سے تشبیہہ دی۔مگر سردار جعفری نے یہاں وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے مشرق و مغرب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔دراصل ان کا مقصد ہمہ گیر اخوت ہے بلکہ تہذیب کی ہمہ گیری ان کے لیے اہم ہے۔انسانیت کو وہ تمام تہذیبوں کا نچوڑ تصور کرتے ہیں۔وہ ہمیشہ خیر کو شر پر فاتح دیکھنا چاہتے ہیں۔

نظم ''مشرق و مغرب'' کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے:

زندگی ایک، زمین ایک ہے انسان بھی ایک/فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک/شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک/ دل جو سینے میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک/ ہیر مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں/ جولیٹ روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں/باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو ہوا ایک سی ہے/سرد یا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے.....ٹیمس اور سین میں جمنا کی سی بیتابی ہے/موج دنیوب میں گنگا کی سی بے خوابی ہے/ دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے/ہند و ایراں کی طرح طفل جواں ہوتا ہے۔ 231

عمر رضا رقمطراز ہیں:

''مشرق و مغرب'' ایک ایسی نظم ہے جسے سردار جعفری نے 1964 میں پیرس میں رقم کی تھی۔اس میں مشرق و مغرب کی وحدت پر زور دیا گیا ہے''۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''مشرق و مغرب'' جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی جذبات و احساسات نیز زندگی کی نفسیات تمام دنیا میں ایک ہی انداز میں ملتی ہیں، تہذیبیں، ثقافتیں ہر جگہ اسی انداز میں پلتی ہیں۔انسانی رشتے ہر زمین پر قائم ہیں لیکن سیاست نے زمینوں کو تقسیم کر رکھا ہے'' 233

معترہ ابراہیم قاضی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری نے جس سرمایہ دارانہ استحصال کا مشاہدہ ''بمبئی'' کے حوالے سے اپنی نظم ''نوالا'' میں کیا ہے وہ معاشی مسئلہ مشرق و مغرب کو محیط کیے ہوئے ہے۔ یہ بات صرف ہندوستان یا ہندوستانی شہروں تک محدود نہیں۔ ان کا عصری شعور ان مسائل کو مشرق و مغرب کے مشترکہ کرب کے طور پر پیش کرتا ہے۔ انسان بحیثیت انسان ہونے کے قابل عزت و احترام ہے چاہے وہ مشرق کا رہنے والا ہو چاہے مغرب کا۔ اصل مسئلہ انسان کے استحصال کا مسئلہ ہے جسے سیاسی لیڈروں نے عالمگیر مسئلہ بنا دیا ہے اور صرف منتخب سیاسی طاقتیں عوام الناس کو پامال کرنے کے درپے ہیں۔ سردار جعفری کی ایک نظم ''مشرق و مغرب'' ان کے عصری شعور کی عمدہ مثال ہے'' 234

عبدالاحد ساز نے لکھا ہے:

''سردار جعفری مشرق و مغرب کے مابین درد کے قدر مشترک ہونے پر اصرار کرتے ہیں'' 235

پروفیسر سعید الظفر چغتائی رقمطراز ہیں:

''مشرق و مغرب..... میں عینی مشاہدوں، مربوط دلیلوں اور قوتِ فکر کے ساتھ اپنے مخصوص شاعرانہ انداز سے سردار نے وحدتِ انسانی اور بین اقوامی برادری کا اثبات کیا ہے'' 236

ساری دنیا کے عوام ایک ہیں۔ سردار جعفری کے ہاں کئی نظموں بالخصوص ''تین شرابی''، ''مشرق و مغرب'' میں یہ تصور زیادہ پُراثر ہے۔

مشرق و مغرب کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

اصلیت کھلتی گل کی نہیں گلدانوں سے
مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے
بوئے گل ایک سی ہے بُوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اپنے ایک مضمون میں سردار جعفری کی نظم ''صبح فردا'' کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

(1) ''پوری نظم سرحد پر ہونے والے حادثات و سانحات کے گرد گردش کرتی ہے اور جعفری اس کے محافظ نظر آتے ہیں۔ 1965ء میں ہند و پاک کی ہولناک جنگ کے موقع پر لکھی گئی یہ نظم بڑی معنوی تہہ داریت اور تخلیقیت رکھتی ہے۔ گویا ہندوستانی تاریخ اور سرحد کے حوالے سے کشت و خوں، نفرت و حقارت اور انسانیت سوز جنگ و جدال کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم ماضی کی کوتاہیوں، موجودہ صورت حال اور کشمکش اور مستقبل کے لائحہ عمل کی سچی تصویر دیکھ سکتے ہیں جو عبرت ناک بھی ہے اور ناقابل فراموش باب بھی۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے / اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی / یہ سرحد خون کی، اشکوں کی آہوں

کی شراروں کی/ جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں/ یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلمائے تھے/ یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے/ یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی۔

(2) ''شاعر سرحد کے اس تاریخی واقعات اور سانحات کو اس لیے بھی یاد کرتا ہے کہ یہ انسانیت کا خون، نفرت کے شعلے اور اجڑے خاندانوں کی علامت ہے، یادگار ہے اور تاریخ کا اہم باب بھی۔ سرحد کا جنم جس تاریخی تناظر میں ہوا ہے شاعر اس تاریخ کو از سر نو تازہ نہیں ہونے دینا چاہتا ہے بلکہ حال کے جنگی تیور کو بھی بدلنا چاہتا ہے اور دلوں کو بانٹنے اور خاندانوں کو تباہ و برباد کردینے والی اس سرحد پر رنگ برنگے پھول اگانا چاہتا ہے جس کی خوشبوئیں، رنگینیاں اور بہاریں دل کے زخموں کو بھر سکنے میں سودمند ثابت ہوں گی۔ نفرت وحقارت اور خوں ریزی کے نتیجے میں وجود میں آنے والی اس سرحد کو دلہن کی اس مانگ سے تشبیہہ دیتا ہے جو اس کے خوب صورت بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن مانگ میں بھرے جانے والے سیندور اور صندل اس کے حسن میں مزید اضافہ کردیتے ہیں۔ واضح رہے کہ سیندور اور صندل سہاگ کی علامت ہیں اور شاعر سرحد کو اسی روپ میں دیکھنے کا متمنی ہے۔

یہ سرحد پھول کی خوشبو کی رنگوں کی بہاروں کی/ دھنک کی طرح ہنستی ندیوں کی طرح بل کھاتی / وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی /مہکتی جگمگاتی اک دلہن کی مانگ کی صورت/ کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تو تقسیم کرتی ہے مگر سیندور کی تلوار سے صندل کی انگلی سے

(3) ''علی سردار جعفری ایسی سرحد کے محافظ ہیں جہاں انسانی ہمدردی، دل سوزی، اخوت ومحبت، بھائی چارگی اور امن و شانتی کے پرچم لہراتے ہیں۔ ہندو پاک کی عوام کو چاند اور ستاروں سے تشبیہ دیتے ہیں ..... چنانچہ ان کی نگہبانی، تحفظ اور سلامتی دونوں ملکوں کے عوامی مفادات میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سرحد پر بندوقوں، توپوں اور جنگی مشقوں کی بجائے کھیتوں میں ہریالی، عوام میں خوش حالی اور سرحد پر درختوں کی سپاہی نما قطاریں دیکھنا پسند کرتے ہیں جن کا رشتہ انسانی تہذیب سے بڑا پرانا ہے اور کونا کوں صفات کا حامل بھی۔

(4) ''علی سردار جعفری کے تصور کی سرحد بڑی پُرکشش، بڑی تہہ داریت اور معنویت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسا چمن ہے جہاں رنگ برنگے پھول اپنی رعنائیوں، خوشبوؤں اور نزاکتوں سے ہمارے حوصلہ شکن دلوں میں امید کی نئی کرن پیدا کرتے ہیں اور جہاں زندگی، نئی امنگوں کے ساتھ اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کی تکمیل کرتی نظر آتی ہے اور ماضی کی سوگوار نگاہیں مسرت سے چمک اٹھتی ہیں۔ عہد حاضر میں سرحد محض حدود ملک نہیں بلکہ افواج کی کثرت، جنگی مشقیں اور توپ اور شعلہ وبارود کے اس ڈھیر سے عبارت ہے جو انسانی وجود کو کسی لمحہ تباہ اور نیست ونابود کرنے کے درپے ہے۔ سرحد پر ہونے والی ہلچل، توپ، تفنگ کا..... انسانی جنم کے بے ترتیب ٹکڑے اور خون سے لت پت بے گناہ انسان کی لاشوں کی منظر کشی کسی خاص ملک اور خطے تک محدود نہیں بلکہ خطۂ ارض کے تمام ملکوں کی سرحدوں کی تصویر ہے اور شاعر اس انسانیت سوز اور دل دہلا دینے والے عمل سے سرحد کو پاک کرنے کا خواہش مند ہے اور وہ سرحد کو من چلوں، بانکے شہ سواروں، کج کلاہوں، کج اداؤں، ڈوبتے تاروں اور ابھرتے آفتابوں کی آماجگاہ بنانا چاہتا ہے اور امن وشانتی اور خوش حالی کی سرحد کا محافظ وامین ہے'' ۔ 237

حمید اختر لکھتے ہیں:

پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود کشیدگی پر میں نے سردار جعفری کو ہمیشہ پریشان دیکھا۔ان دونوں ہمسایہ ملکوں میں بہتر تعلقات کے لیے انہوں نے عملی کام بھی کیا اور بہت کچھ لکھا بھی.....ان کی نظم ''صبح فردا'' بلا شبہ دل کے تاروں کو چھو دینے والی تخلیق ہے۔اس نظم کی تکمیل 25/ستمبر 1965 یعنی پاک بھارت جنگ کے مہینے کے آخر میں ہوئی۔ایک بند ہے۔

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی جاں نثاروں کی/ یہ سرحد سرزمین دل کے بانکے شہسواروں کی/ یہ سرحد کجل کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی/ یہ سرحد گلشن لاہور دلی کی ہواؤں کی/ یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی/ یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی/ یہ سرحد، خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی/ میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا 238

عمر رضا قمطراز ہیں:

''25/ستمبر 1965 (ہندو پاک جنگ کے بعد) کی تخلیق کردہ نظم ''صبح فردا'' شامل مجموعہ (پیراہن شرر) ہے۔اس میں ہندو پاک کے مابین سرحد کی اہمیت اور اس کے احترام کی طرف دونوں ممالک کی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔یہی وہ سرحد ہے جہاں کل سورج کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔بیٹوں سے ماں اور بہن سے بھائی بچھڑے تھے اور اسی سرحد نے نہ جانے کتنے معصوموں کا لہو پیا تھا۔چنانچہ سردار جعفری کا کہنا ہے کہ اس کی محافظت اور اس کا احترام دونوں ملکوں پر لازم ہے تا کہ یہ سرحد بوسہ لب بن جائے۔ یہی وہ نظم ہے جس کی بازگشت بیسویں صدی کے آخر میں اس وقت بھی سنی گئی جب 20/فروری 1999ء کو اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی امن کی پیشکش کے لیے اس نظم کے ساتھ لاہور گئے تھے جو'' سرحد'' کے نام سے بار بار چھپی اور خوب پڑھی گئی تھی۔اگر چہ اس میں رومانیت کا وفور ہے لیکن اس کے بعض مصرعے تاریخی نوعیت کے حامل ہیں''۔ 239

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی/ یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے/ ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے.../خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے/ پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی/ .....وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے/ وہ دن آئے یہ سرحد بوسہ لب بن کے رہ جائے۔

محمد حسین پرکار نے سردار جعفری کی نظم ''صبح فردا'' کا جائزہ پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

(1) سردار جعفری میں چھپا ہوا شاعر جنگ کے پس منظر میں بھی مایوس نہیں ۔اسے امید ہے کہ سرحد پر صبح نو پیدا ہوگی جس کے لیے وہ ایک زمانے سے منتظر ہے۔نظم ''صبح فردا'' انہوں نے 25/ستمبر 1965 کو لکھی ہے جس میں جنگ سے پیدا شدہ حالات کا جائزہ لیا ہے، تقسیم وطن کا پس منظر ہے اور وہ احساس کارفرما ہے جس میں حساس دل شاعر نہ تو تقسیم زمین کا تصور کر سکتا ہے اور نہ ہی دلوں کے ٹوٹنے کا۔وہ کہتے ہیں یہی وہ سرحد ہے جس پر کل سورج ڈوبا تو دو ٹکڑے ہو کر ڈوبا تھا۔وہ سورج جو آزادی کی نوید لے کر آیا تھا اسے اپنی روشنی تک جو اس نے سب کے لیے سمیٹ کر رکھی تھی دو حصوں میں تقسیم کرنی پڑی اور

شام ہوتے ہوتے جب حالات بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین ہوتے گئے تو گویا وہ خود سرحد پر دو نیم ہو کر ڈوب گیا۔ حصول آزادی نے تقسیم وطن کے ساتھ اپنے معنی بھی کھو دیئے۔ گویا تقسیم وطن کے ساتھ خود آزادی بھی مجروح ہوگئی' زخمی ہوگئی۔ اسی سرحد پر خون بہایا گیا' یہیں پر اشک بہائے گئے' یہیں پر آہیں بھری گئیں' یہیں پر شرارے رونما ہوئے۔ اسی سرحد پر نفرت بوئی گئی اور اسی سرحد پر تلواریں اگائی گئیں۔ غرض سرحد کا وجود نہ جانے کتنی برائیوں کا سبب بن گیا' کتنی برائیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اسی سرحد پر جدا ہوتے ہوئے محبوب کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے جھلملائے' یہیں پر معشوقوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اسی سرحد کی وجہ سے ماں اپنے بیٹے سے' بہن اپنے بھائی سے بچھڑی تھی اور یہیں پر وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ یہ سرحد کیا بنی' ظلم و ستم کی آماجگاہ بنی۔ یہ دشمن کی نشانی بنی اور پھر اس کی حفاظت کے لیے اس کے دونوں جانب فوجیں کھڑی کر دی گئیں جو وقتاً فوقتاً گولیاں چلا کر اپنی موجودگی کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کوئی زخمی' کوئی گھائل تو کوئی لقمۂ اجل بن جاتا ہے اور جب یہ جوش جنوں نفرت کی شدت اختیار کر لیتا ہے تو بڑے پیمانے پر جنگ چھیڑ دی جاتی ہے۔ پھر یہ سرحد لہو پینے لگ جاتی ہے' شعلے اگلنے لگ جاتی ہے اور ہماری سرزمین پر ناگن بن کر چلنے لگتی ہے اور وہ سراپا جنگی ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہے۔ ان حالات کے باوجود شاعر کہتا ہے کہ میں یہاں کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا''۔

(2) شاعر کو صبح فردا کا انتظار اس لیے ہے کہ سرحد شاعر کے نزدیک منفی رجحانات و مقاصد کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کا کام مثبت اعمال' مثبت اقدام اور مثبت پہلوؤں کی حفاظت کرنا ہے' امن و آشتی کا پیغام دینا ہے' خوشیوں کی نوید سے فضاؤں میں نغمے بکھیرنا ہے۔ دراصل سرحد نام ہے پھولوں سے بھری' خوشبو سے مہکتی' رنگوں سے مزین بہاروں کی ضمانت والی شئے کا نام جس کی ہنسی میں دھنک کے رنگ ملتے ہیں۔ یہ ندیوں کی سی بل کھاتی جاتی ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ سرحد نہیں ہے وطن کے گالوں پر لہراتی ہوئی زلف ہے۔ اس میں دلہن کے مانگ کی سی مہک ہے۔ جگمگاہٹ ہے جس طرح مانگ بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے بالکل اسی طرح سرحد بھی دو ملکوں کے درمیان تقسیم کا کام کرتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بالوں کی مانگ سیندور اور صندل سے بھری ہوتی ہے جبکہ دو ملکوں کے درمیان یہ سرحد کی مانگ کچھ اور ہی رنگ پیش کرتی ہے۔ یہ سرحد دلبروں' عاشقوں اور بے قراروں کو جدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ یہیں پر بھائی' دوست اور غمگسار ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور کبھی زندگی میں مل بھی جائیں تو یہی جائے ملاقات' یہی جائے ملاپ کا رول ادا کرتی ہے۔ اس سرحد کی پاسبانی سورج اپنی درخشندگی سے کرتا ہے تو رات میں تارے اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔ مگر جب حملہ ہوتا ہے کھیت پامال ہو جاتے ہیں۔ سپاہی درختوں کی قطاروں کی مانند بڑی تعداد میں آ کر حملہ کرتے ہیں جس سے اُن کے وجود کو بھی خطرہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ خدا انہیں نگاہ غیر سے محفوظ رکھے۔ اُن پر خون کے تاجداروں کی نظر نہ پڑ جائے۔ کہیں اسے مشینیں اپنی جسامت اور وزن سے کچل نہ ڈالیں۔ اس پر دستکاری کے سے نمونے بن جائیں' پتھروں سے جب چنگاریاں نکلیں تو پھول کی مانند ہوں۔ تیشوں سے کوہساروں کو تراشا جائے۔ اپنے ساقی ہوں اور اپنے پیمانے' یہ تشنگی دور کرنے کا سامان پیدا کریں۔ جہاں اب تک صف ماتم بچھی ہوئی تھی وہاں اب محبت کا راج ہو' حسن قاتل بن جائے' دل مسیحا بنے اور چمن میں جو آگ ہے وہ گل عذاروں کی ہو۔ خدا کرے وہ دن آئے جب نفرت دل سے آنسو بن کر بہہ جائے اور وہ دن نصیب ہو جب یہ سرحد بوسہ گہ بن کر رہ جائے۔ یہ سرحد منچلوں کی

سرحد ہے' دل والوں کی سرحد ہے۔ جاں نثاروں کی سرحد ہے' یہ زمین دل کی سرحد' بانکے شہسواروں کی سرحد ہے۔ یہ سرحد کج کلاہوں' کج اداؤں کی سرحد ہے۔ یہ سرحد لاہور اور دلّی کی ہواؤں سے بھری سرحد ہے۔ یہ سرحد امن اور آزادی کے دل افروز خوابوں کی سرحد ہے۔ یہ ڈوبتے ہوئے تاروں' ابھرتے ہوئے آفتابوں کی سرحد ہے۔ یہ سرحد خون میں لتھڑے ہوئے گلابوں کی سرحد ہے۔ میں اس سرحد پہ کب سے صبح فردا کا منتظر ہوں'' 240

محمد حسین پرکار نے سردار جعفری کی اس نظم ''صبح فردا'' کے بارے میں لکھا ہے:

''شاعر کے نزدیک صبح فردا وہ صبح ہے جو دونوں ممالک اپنی اپنی جگہ پر ترقی و کامرانی کی طرف گامزن ہو جائیں۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جذبہ محبت پیدا ہو جائے۔ ہر ترقی ہر محاذ پر ہو۔ وہ اپنے گھر میں مسرور و خوشحال رہیں تو ہم اپنے گھر میں شاداں و فرحاں زندگی گزاریں۔ یہی زندگی کی معراج ہے۔ اس میں انسانی اقدار کی بقا ہے۔ یہی زندگی دنیا والوں کے لیے مشعل راہ ہوگی۔ یہی وہ صبح فردا ہوگی جس کا ہر کسی کو بے صبری سے انتظار ہے۔ یہی شاعر کے دل کی دعا اور اس کے قلم کی سرگوشی ہے'' 241

ڈاکٹر ظلِ انجم نے سردار جعفری کے خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انقلاب مثبت تبدیلی کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ جعفری کے ہاں اس تبدیلی کا اشاریہ ان کے خواب ہیں۔ انصاف کے خواب' مظلوموں کی قسمت بدلنے کے خواب' امن کی دوستی اور آشتی کے خواب..... سردار جعفری نے صبح فردا کا خواب دیکھا تھا۔ یہ ''صبح فردا'' عالمی سطح کا سرخ سویرا نہیں تھا بلکہ وہ یہ خواب تھا جو انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا'' 242

رفعت سروش لکھتے ہیں:

''1965 کی ہند و پاک جنگ کے موقع پر ان کی نظم ''صبح فردا'' محبت کی نئی کرن کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ وہ نظم ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور گذشتہ پینتیس سال سے عوام کی فرمائش پر انہوں نے یہ نظم سینکڑوں بار سنائی ہوگی۔ اس نظم کی مقبولیت کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے دل سے نکلی جس نے جنگ آزادی میں قربانیاں دیں اور اپنی زندگی کو امن و محبت کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔

..... تقسیم وطن کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نظم ہند و پاک کے عوام کے دلوں کی ترجمانی اس طرح کرتی ہے کہ آج جب یہ تقسیم تاریخی حقیقت بن چکی ہے تو یہ تقسیم اب ایسی ہے جیسے سیندور کی لکیر بالوں کو دو حصوں میں بانٹتی ہے۔ باہمی محبت کا اظہار اس سے خوبصورت ممکن نہیں ہے..... یہ صبح فردا ضرور طلوع ہوگی اس صبح فردا کا سورج سردار جعفری کی روح کو صحیح خراج عقیدت ہوگا'' 243

پروفیسر عبدالستار ردلوی نے لکھا ہے:

''جنگ کسی بھی شکل میں کسی بھی بنیاد پر اور دنیا کے کسی بھی مقام پر ہو' سردار جعفری نے اس سے نفرت کی ہے۔ اس کا اظہار ان کی نظم دعا میں کیا ہے'' 244

سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پیراہن شرر'' کی نظمیں اور غزلیں ہند و پاک کے درمیان 1965 جنگ کے زمانے میں لکھی گئیں۔

عمر رضا نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے 14/اگست 1965 کو ویت نام سے کشمیر تک خون آلود افق کے نام ایک ''دعا'' رقم کی ہے اس نظم میں ستمبر 1965 میں ہونے والی ہند پاک جنگ کے لیے جس طرح کے حالات پیدا ہو رہے تھے اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور آنے والے خطرات سے آگاہی اور اس کے نقصانات کو اجاگر کر کے اس سے بچنے اور مل کر محبت کو آواز دینے کی بات کی گئی ہے۔'' 245

؎ پھر چلا جنگ کا دیوتا/سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے/خون کی پیاس سے/کوشت کی بھوک سے/چیختا اور چنگھاڑتا ہوا/آسمانوں پہ عفریت کی طرح اڑتا ہوا/موت کی طرح دھرتی پہ جلتا ہوا/.....اس کا آغاز سب کچھ ہے/انجام کچھ بھی نہیں/ حاصل قتل و غارت ہے کیا؟/چند اجڑے ہوئے شہر جھلسے ہوئے راستے/سرنگوں بیوگی/اشک آلودہ و زخم خوردہ یتیمی/.....گیت کے دل میں خنجر ہے/الفاظ ہیں سربریدہ/اپنے قبضے میں ایک بے بسی کے سوا کچھ نہیں/نالے بیکار فریاد بے سود ہے/آؤ مل کر محبت آواز دیں/نیکیوں کو پکاریں/.....

3/ستمبر 1965 کی تخلیق کردہ نظم ''جنگ بازوں کا فرمان'' میں سردار جعفری نے اپنی خفگی کا یوں اظہار کیا ہے۔؎

خون و بارود کی بو کو بھی معطر سمجھو/حکم اب یہ ہے کہ زخموں کو گل تر سمجھو/موت کی گود سے لو لذتِ ہم آغوشی/خم تلوار کو محبوب کا پیکر سمجھو/جنگ کو امن کہو امن کو دو جنگ کا نام/نشتر خار کو پھولوں کے برابر سمجھو/دولتِ دیدۂ تر چار طرف عام ہوئی/آنسوؤں کو بھی مئے ناب کو ساغر سمجھو/روح ابلیس کو دو حضرتِ جبریل کا نام/جھوٹ کو حکم خدا حرف پیمبر سمجھو۔

13/ستمبر 1965 کی رقم کردہ نظم ''شہر تمنا'' کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''بنیادی طور پر اس نظم میں ہند و پاک کے درمیان چل رہی جنگ میں ہندوستان کی فتح و نصرت کی تمنا کی گئی ہے۔اگر چہ ابتداء میں جنگ کے مختلف خطرات پر اندیشوں کا اظہار کیا گیا ہے....لیکن اس کے ساتھ ہی امید کی کرن بھی دکھائی گئی ہے۔ سردار جعفری بنیادی طور پر رجائی شاعر ہیں وہ ہر لمحہ پُر امید رہتے ہیں اور ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتے ہیں۔چنانچہ یہاں بھی انہیں جشن مسرت کا انتظار ہے اور.....دعا گو ہیں۔ 246

؎ اے دیار دست اے شہر تمنا آج کیوں/آرہی ہے یاد تیری دلبری کی بار بار/دردل کی کیفیت پہلے کبھی ایسی نہ تھی/روح شاعر یوں تو رہتی ہے ہمیشہ بے قرار/جنگ کی تاریک شب ہے اور بلاؤں کا نزول/ہو نہ جائیں یک بہ یک تیری فضائیں شعلہ بار/لٹ نہ جائے یہ ضیاء یہ رونق دیوار و در/راکھ ہو جائے نہ جل کر تیرے کوچوں کی بہار...../تیری دیواروں سے ٹکرائیں بلائیں اپنا سر/تیرے دروازے سے جائے ہو کے آفت شرمسار/.....تیری پیشانی کو چومے فتح و نصرت کی کرن/تیرے قدموں پر ہو قرباں گردش لیل و نہار۔

نظمیں ''دستِ فریاد'' اور ''اشکِ ندامت'' کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''دست فریاد'' اور ''اشک ندامت'' یکے بعد دیگرے 15 اور 14 ستمبر 1965 کی رقم کردہ شامل مجموعہ ہیں۔ان دونوں نظموں میں جنگی فضا قائم ہے اور لہجہ بھی تلخ ہے.....سردار جنگ کے زبردست مخالف تھے اور جنگ جیسے حالات پیدا کرنے والوں کو لعنت ملامت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔کچھ اسی طرح کا رنگ ان نظموں میں بھی غالب ہے۔'' 247

نظم ''دست فریاد'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

''چھاؤں ہے جنگ کے میدان میں تلواروں کی/ دل ہلا دیتی ہے للکار جگرداروں کی/ ایک بھی دشمن جاں بچ کے نہ جانے پائے/ وہ جو ہتھیار لیے آتے ہیں سب دشمن ہیں/ جس نے ہتھیار دیے وہ بھی تو دشمن ہوگا/ آج ہی کل میں مگر آنے کو ہے روز حساب/ دست فریاد میں کس کس کا نہ دامن ہوگا۔

نظم ''اشک ندامت'' کے اشعار:

کہاں ہیں اشک ندامت کہ دھوئیں دامن سے/ لہو کا داغ دلوں سے کدورتوں کا غبار/ یہ اشک ہوں تو ابھی روح پر جلا ہو جائے/ یہ آدمی جو ہوا و ہوس کے دام میں ہے/ شکار اپنی بنائی ہوئی سیاست کا/ مقام عشق پہ فائز ہو اور خدا ہو جائے۔

20 ستمبر 1965 کو لکھی گئی نظم ''ہمارے نام'' میں امن' پیار اور محبت کے پیغام کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سردار جعفری کہتے ہیں کہ جنگوں کی آگ انہیں جلا نہیں سکتی۔الفاظ کا دروبست' تشبیہات' استعارات کے برملا استعمال نے نظم کو دلکش بنا دیا ہے۔

زمیں پر میں بھی تنہا ہوں زمیں پر تم بھی تنہا ہو/ ہجوم بزم یاراں میں ہجوم غم گساراں میں/ ہزاروں فاصلے ہیں منزلوں کے رہگزاروں کے/ ہزاروں فاصلے دریاؤں کے اور کوہساروں کے/ ہزاروں فاصلے ایسے کہ ناپے جا نہیں سکتے/ مگر نیلی فضا میں آسمانوں کی بلندی پر/ ہمارے نام ہیں دو دوست دو معشوق دو عاشق/ جنہوں نے پیار سے بانہوں میں باہیں ڈال رکھی ہیں/.....کبھی دہلی کبھی شیراز پر جگمگاتے ہیں/ کبھی لندن کبھی نیویارک پر یہ مسکراتے ہیں/ کبھی یہ ماسکو کے سر پہ تاج نور رکھتے ہیں/ کبھی یہ دشمنوں کی سرحدوں کو پار کرتے ہیں/ کبھی چشموں کبھی باغوں کو جھک کر پیار کرتے ہیں/.....جلا سکتی نہیں جنگوں کی آگ ان ماہتابوں کو/ بجھا سکتی نہیں بارود روشن آفتابوں کو/ ہمارے نام حرف خیر و برکت نور و نزہت ہیں/ ہمارے نام امن و دوستی عشق و شرافت ہیں/ ہمارے نام جنگ آلودہ و خونخوار دنیا میں/ اشارہ آدمیت کا ہیں نیکی کی ضمانت ہیں۔

پروفیسر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں:

''حالات حاضرہ پر کہی ہوئی ان کی (سردار جعفری) نظموں میں سے ''کون دشمن ہے'' ایک معرکتہ الآرا نظم ہے۔یہ نظم 1965 کے اواخر میں ہند و پاک جنگ کے دوران کہی گئی تھی جس میں شاعر نے سرحد پار رہنے والے اپنے ''دشمنوں'' کو جو ایک تلخ حقیقت کی روشنی میں ''وہ سب جو غیر نظر آرہے ہیں اپنے ہیں'' یہ پیغام دیا تھا کہ ''تم نے یہ لشکر کشی کس کے خلاف کی ہے؟ کس کے مقابل یہ تلوار اٹھائی ہے۔'' 248

ڈاکٹر اشفاق حسین لکھتے ہیں:

''کل تک پاکستان اور ہندوستان ایک تھے مگر آج الگ الگ دو ملک بن گئے۔یہ ایک سیاسی تقسیم تھی، سیاست،

جذبات، تہذیب اور زبان کو تقسیم کرنہ سکی۔ کہنے کو تو جسمانی طور پر اعزا تقسیم کر دیے گئے مگر ان کے رشتوں کو تقسیم نہ کیا جا سکا۔ اب بھی دونوں میں خون کا رشتہ اور جذباتی رشتہ ہنوز باقی ہے۔ طرفین کے یہاں جو اولیائے دین اور دوسرے بزرگوں کے مقبرے ہیں ان کو تقسیم نہ کیا جا سکا۔ اب بھی اسی طرح احترام و عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ جنگ اپنی زمیں پر واقع ہوئی ہے اور اپنا ہی خون بہا گیا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے اس حادثے سے متاثر ہو کر اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اس سلسلے کی سردار جعفری کی نظمیں ''کون دشمن ہے'' اور ''صبح فردا'' ہیں''۔249

معزہ ابراہیم قاضی لکھتی ہیں:

''ہندوستان اور پاکستان تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے 1947ء تک ایک ہی ملک تھا، جو فرقہ وارانہ سیاست کی وجہ سے تقسیم ہو کر دو ملکوں میں بٹ گیا۔ یہ تقسیم ایک غلط تقسیم تھی۔ خون ایک، نفسیات ایک، رہن سہن ایک، زندگی گزارنے کے طریقے، سوچنے سمجھنے کے طریقے، رسم و رواج، غربت و مفلسی سب میں دونوں ملک برابر کے شریک، پھر بھی سیاست کی وجہ سے آپسی ٹکراؤ ایک ایسا المیہ تھا کہ وہ لوگ، وہ شاعر اور ادیب جو ان دونوں ملکوں کی مشترکہ کہانی سے واقف تھے، آپسی جنگ سے دہل گئے۔ سردار ان میں پیش پیش تھے۔ آزادی کی خاطر اس ملک کے سبھی عوام سامراج سے صبح فردا کی خاطر لڑ رہے تھے کہ انہیں ایک روشن صبح نصیب ہو''۔ 250

نظم ''کون دشمن ہے'' کے دو بند ملاحظہ کیجیے

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار آگ بندوقیں
کہاں سے لاتے ہو، کس کی طرف ہے رخ ان کا
دیار وارث و اقبال کا یہ تحفہ ہے؟
جگا کے جنگ کے طوفان زمین نانک سے
اٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر

(1) ''سردار جعفری پوچھتے ہیں'' کون دشمن ہے؟ ہم تمہارے یا تم ہمارے، تم ٹینک، توپ، بمبار اور بندقیں لیے آگے بڑھ رہے ہو لیکن تم کیا یہ بھول گئے کہ سرحد کے دونوں طرف عظیم ہستیوں کی جائے رہائش ہے۔ جس طرح سے تم یہ جنگی اسلحہ لے کر نکلے ہو وہ وارث اور اقبال کا دیار ہے۔ کیا یہ جنگی اسلحہ ان عظیم ہستیوں کی طرف سے تحفہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ بھول گئے کہ جہاں سے تم یہ جنگ کا طوفان اٹھائے ہوئے نکلے ہو وہ نانک کی سرزمین ہے۔ جنھوں نے درس محبت دیا۔ کیا اُس سرزمین کی سرحد کے اس پار جہاں کبیر کا گھر ہے جو خود انسانیت کے علمبردار تھے، اس زمین پر برق گرائی جا سکتی ہے؟ کیا دونوں زمینوں کے حصوں کی تقدیس کے لیے یہ نا زیبا نہیں ہوگا کہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں اور اپنے شاندار ماضی کو داغدار کریں۔ کیا تم نے اتنی جلد بھلا دیا کہ آج سے لگ بھگ دو دہائی پہلے تم اور ہم دونوں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ آزادی (1947ء) جو نصیب ہوئی ہے ہمیں تحفے میں نہیں ملی ہے بلکہ ہم نے مشترکہ طور پر اس کے لیے کوشش کی تھی اور اس کے حصول میں ہم سب کا خون بہا ہے تبھی تو فصل آزادی ہمارا حصہ بنی۔ ہمیں آزادی حاصل کر کے بہت بڑا عرصہ نہیں ہوا ہے۔ بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ابھی ابھی صبح کی پہلی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ یہ عرصہ اتنا قلیل اور اتنا مختصر ہے کہ ان ہواؤں کے چلنے سے شگوفوں نے اپنی آنکھ تک نہیں کھولی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد دونوں طرف فسادات کا بازار گرم رہا۔ لہٰذا حالات سے نپٹنے اور سنبھلنے میں کافی وقت گزرا۔ حالات سازگار ہوتے ہوئے، صرف یہ کہہ سکتے ہیں، وہ وقت آ گیا ہے جیسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی ابھی بادِ صبا چلی اور شگوفے کھلنے کے منتظر ہیں۔ ابھی بہار کھل کر نہیں آئی ہے کہ ہم یہ بھی کہہ سکیں کہ اس کے لب پر ہنسی ہے۔ وہ کسی کے انتظار میں لگی آنکھیں، وہ ہاتھ جو رنگ حنا کے لیے ترس رہے تھے، ہنوز وہ حصول مقصد میں ناکام ہیں اور ایسے میں تم ہو کہ تم نے ہم پر نظر غنیم اٹھائی ہے۔ یہ بڑا دردناک لمحہ ہے۔"

(2) "بجائے اس کے تم جنگ چھیڑتے تمہیں چاہئے تھا کہ تم پیار کی سوغات لے کر آتے۔ اگر یوں ہوتا تو ہم اور تم اپنے اپنے غم بھلا دیتے۔ آخر کہنے کو تمہارے اور ہمارے پاس ایک دردِ مشترک کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟ تم اور ہم گلے ملتے تو سارے گلے جاتے رہتے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ تم اور ہم مل کر اپنے اپنے غموں کا مداوا کرتے اور وہ گلستان جو نظرِ بد سے تباہ ہو گیا تھا اس کی تعمیرِ نو میں لگ جاتے۔ ہم ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے تو پھر آشیاں یابی کا جشن مناتے۔ ہم اپنے اپنے آشیانوں میں رہ کر آزادی کی سانس لے سکیں یہ کیا کم خوشی کا مقام تھا۔"

(3) "ہم بصد افسوس یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ تمہاری آنکھوں سے کچھ اور ہی جھلک رہا ہے۔ تمہارے تیور کسی اور بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور تمہارے قدموں میں وہ ثبات نہیں ہے جس کے ہم متمنی تھے۔ انہیں ہم بہکے بہکے سے پا رہے ہیں؟ بات بالکل واضح ہے کہ تم تیغ زنی کے لیے نکلے ہو۔ آخر تمہاری اس شمشیر کی آزمائش کس پر ہوگی؟ تمہاری سمجھ کس قدر ناقص ہے۔ جسے تم ملک کی سرحد سمجھ بیٹھے ہو وہ ملکوں کی تقسیم کرنے والی سرحد نہیں ہے بلکہ وہ ہمارا جسم ہے۔ وہ ہمارے دل و جان کی سرحد ہے۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کی تقسیم کر ڈالی ہے۔ یہ سرحد دل و جان حسین ہے، بلند مقام ہے، تقدیر بھری ہے، جوان ہے اور پاکیزگی کا مجسمہ ہے۔ اسے ہم نہ جانے کتنے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کبھی ہم اسے خیابانِ جنت کشمیر کہتے ہیں تو کبھی گلستان دلی و پنجاب کے نام سے یاد کرتے ہیں تو کبھی پیار سے اسے لکھنو بھی کہہ لیتے ہیں"۔

(4) "تمہیں آنا ہے تو انتہائی ادب سے آؤ۔ اسے تلوار کے ہونٹوں سے چھونا تو درکنار تم یہاں حدودِ ادب سے باہر جا کر قدم تک نہیں رکھ سکتے۔ یہ سرزمین غالب کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین پر میر کا مزار ہے۔ اس سرزمین پر نظام الدین اولیاء "حضرت کاکی" اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانے ہیں۔ یہاں تمہیں ادب سے اپنے تیغوں کے سر جھکانے ہوں گے کیوں کہ یہ بارگاہِ رحمت ہیں۔ جہاں رحمت ہی رحمت برستی ہے وہاں شمشیر و سناں کا کیا کام؟"۔

(5) "اگرچہ تم اظہارِ نفرت کی غرض سے آ رہے ہو لیکن ہم تمہیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دل میں تمہارے لیے جذبۂ رفاقت، پیار کا امڈتا سیلاب ہے۔ دل تو آخر دل ہے، روح تک تمہارے لیے بے چین و بے قرار ہے اور اسی جذبۂ محبت سے ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں ہے کہ کوئی نظرِ بد ہماری جانب اٹھائے تو اس کا جواب بھی تیغ آب دار کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے"۔

(6) "زمین تو بٹ گئی ہے لیکن رشتے بٹ نہ سکے۔ آج بھی ادھر ہماری کوئی بہن ہے، کوئی بھائی ہے، کوئی عزیز ہے تو کوئی

یارو حبیب، ہم پیالہ ہم مشرب جو بیتے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔کوئی قید و بند کے دنوں کے ساتھی ہیں، کوئی رفیق دار بھی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے اٹوٹ رشتوں سے بندھے ہوئے ہیں۔انہیں میں کوئی ہم جیسے کوئے یار کے ٹھکرائے ہوئے اور غریب الوطن بھی ہیں لیکن آج بھی اُن کے لبوں پہ بیتے ہوئے زمانے کا تبسم جھلکتا ہے، جن کی نظروں سے بیتے ہوئے زمانے کے خواب عیاں ہیں اور دلوں میں صبح فردا کے چراغ امید کا نور بسا ہوا ہے۔ گو آج وہ ہمارے لیے اجنبی ہیں لیکن وہ کوئی غیر نہیں ہیں ہمارے اپنے ہیں"۔

(7) ''سرحد کے اس پار بھی یاروں کا ایک خاصہ حلقہ ہے۔ چاہنے والوں کا ہجوم سا ہے جو ملنے کو بے قرار ہے۔ .....اس کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے بیچ پیار کے ساگر نہیں آگ کے دریا حائل ہیں۔لہو کے ساگر راستہ روکے ہوئے ہیں۔یہ سب کس کے کھڑے کیے ہوئے ہیں؟ تمہارے اور صرف تمہارے۔نفرتوں نے اتنی شدت اختیار کی کہ وہ ہمارے بیچ بلند دیوار بن کر حائل ہو گئیں۔ ہمارا جذبۂ رُفاقت ہماری محبت ان نفرتوں کو بھلا بھی سکتی ہے۔اس دیوار کو نظروں سے گرا بھی سکتی ہے، تمام ظلم کی باتیں بھلائی بھی جا سکتی ہیں اور ایک بار پھر تم سے گلے لگ جانے، تمہیں اپنا کہنے اور اپنا ہونے کا ثبوت بھی دے سکتی ہیں لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے تم نے جو تیغیں اٹھائی ہیں انہیں توڑنا ہوگا اور دامن جو لہو سے بھرا ہوا ہے اُس کو نچوڑنا ہوگا۔اگر تم نے یہ کر دکھایا تو پھر تم نہ ہمارے لیے غیر ہو اور نہ ہم تمہارے لیے غیر رہیں گے۔تم گلشن لاہور سے اور اپنے کاندھوں پر چمن محبت اٹھائے ہوئے ہماری طرف بڑھو۔ہم بھی صبح بنارس کی روشنی لے کر تمہاری جانب بڑھیں گے۔ہمارے ساتھ ہمالیہ کے ہواؤں کی تازگی ہوگی اور پھر جب ہم ملیں گے تو ہر طرف خوشبو ہی خوشبو کا سماں ہوگا۔فضاء پیار سے مہک اٹھے گی۔پھر اس کے بعد ہم اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے سے پوچھیں کہ ہم میں دشمن کون ہے''۔251

سردار جعفری کی اس نظم ''کون دشمن ہے؟'' پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد حسین پرکار لکھتے ہیں:

''۱۱ر ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوران جنگ پر لکھی ہوئی یہ نظم نہ صرف تعلقات کی استواری کی جانب پر خلوص کوشش ہے بلکہ ارباب حل وعقد کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ بحیثیت انسان ہمارے لیے کونسی چیز عزیز ہے۔اخلاقی قدریں یا سیاسی ضد، خون کے اٹوٹ رشتے یا خون کی ہولی۔دلوں میں گھر یا زمین پر قبضہ۔نفرت یا پیار۔آبادی یا بربادی۔ترقی یا تنزل۔استحکام یا ناپائیداری۔انہیں بنیادوں پر دونوں ملکوں نے اگر مثبت پہلوؤں کو اپنایا اور منفی پہلوؤں کو بھلا دیا تو وہ وقت دور نہیں جب دونوں ملکوں میں وہ پرانا دور لوٹ آئے گا، اُس تہذیب و تمدن کو نئی زندگی عطاء ہوگی جس کے ہم کبھی مشترکہ امین تھے''۔

عقیل احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی نظموں میں بھی رجم طلبی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔سردار نے آخر آخر تک جوش کے لہجہ سے کلی انحراف نہیں کیا۔نظم ''کون دشمن ہے'' کا یہ ٹکڑا دیکھئے:

ادھر بھی ہے کوئی، کوئی بھائی کوئی عزیز/گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار کوئی/رفیق محبس و زنداں، رفیق دار کوئی/لبوں پہ جن کے تبسم ہے عہد رفتہ کا/نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے/دلوں میں نور چراغ امید فردا کا/وہ سب جو غیر نظر

آرہے ہیں اپنے ہیں۔

''عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970، صفحہ 113

نظم کون دشمن ہے؟ کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ بندوقیں/کہاں سے لائے ہو کس کی طرف ہے رخ ان کا/ دیار وارث و اقبال کا یہ تحفہ ہے؟/ رجگا کے جنگ کے طوفان زمین نانک سے/ اٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر/ غلام تم بھی تھے کل تک غلام ہم بھی تھے/ نہا کے خون میں آئی تھی فصلِ آزادی/ ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سنکی ہیں/ ابھی شگوفوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی۔

مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور
یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب؟
سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحد ِ دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ
تم اس کو تیغ کے ہونٹوں سے چھو نہیں سکتے
ادب سے آؤ کہ غالب کی سرزمیں ہے یہ
ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے
تمہارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے
ہزاروں سال کی تاریخ ہے ثبوت اس کا
کھڑے ہیں سینے پہ زخموں کے گل کھلائے ہوئے

بہت بلند سیہ نفرتوں کی دیواریں/ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں/ تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں/ تمہیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں/ مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا/ لہو ابھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا/ پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم/ تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش/ ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر/ ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر/ اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

حبیب الرحمٰن چغانی قمطراز ہیں:

''کون، دشمن ہے'' جعفری کی یہ نظم ہند و پاک میں دوستی کا پیغام ہے۔ ملک ضرور تقسیم ہوا، سرحدوں نے صرف جغرافیہ بدلا ہے، تاریخ نہیں بدل سکی ہیں، عوام کے دلوں کو جدا نہیں کر سکی ہیں۔ یہ امن و آشتی کا پیغام ہے جو دونوں ملکوں کی ترقی کا ضامن ہے۔ یہ دشمن ختم ہو اور دوستی شروع۔ اس نظم میں بڑا درد اور اشتیاق ہے، پسند بھی بہت کی گئی ہے۔ 253

مزا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے/ خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے/ ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم شریک ہوتے تو پھر جشن آشیاں کرتے/ مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور/ یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب؟/ کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟/ سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد/ وہ سرحد دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ/ حسیں، بلند، مقدس،

جوان، پاکیزہ رہے اس کا نام خیابانِ جنت کشمیر رہے اس کا نام گلستانِ دلی و پنجاب رہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنؤ بھی کبھی۔

عمر رضا نے اس نظم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''12 رستمبر 1965 کی تحریر کردہ نظم کون دشمن ہے'' کے ذریعہ سردار جعفری نے ہندو پاک رشتوں میں آئی دراڑ کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔اس میں انہوں نے دونوں ملکوں کی تہذیبی وراثت اور ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے دونوں کی کوششوں کا حوالہ دیا ہے۔سرحد پار ملک پاکستان کے طور طریقوں اور اس کی نفرت آمیز باتوں پر حیرانی و پریشانی کا اظہار کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ان تمام باتوں کو ختم کر کے امن کی فضاء قائم کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔نظم کا عنوان ''کون دشمن ہے؟'' اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، البتہ کچھ ایسے عناصر ضرور ہیں جو نفرتوں کی دیواریں تعمیر کرنے میں مصروف ہیں جسے مسمار کرنے کے لیے دونوں ملکوں کے عوام کو متحد ہونے کی ضرورت ہے۔سردار جعفری نے ان تمام خیالات کو جو شعری پیکر عطا کیا ہے، وہ بیحد دلکش اور حسین ہے.....اس نظم میں اگر چہ صراحت اور وضاحت نمایاں ہے لیکن اس کے باوجود سردار نے جس فنکارانہ انداز میں اپنی بات کہی ہے وہ بیحد پر لطف ہے۔اس طرح کے حالات میں سردار جعفری اپنے خیالات کو جب شعری پیکر بخشتے ہیں تو ان کے لب و لہجے میں عموماً تیزی و تندی شامل ہو جاتی ہے اور جب تلخی شامل ہوئی ہے تو وہ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے پھیر میں زیادہ نہیں پڑتے۔یہ عمل آزادی سے قبل اور اس کے ذرا بعد کی شاعری میں زیادہ ہے لیکن اس عہد میں مخصوص حالات میں کہی گئی نظموں اور غزلوں میں جس طرح کی تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا انہوں نے استعمال کیا ہے اس سے ان کی نظموں میں ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔254

مجموعہ ''پیراہن شرر'' 1966 کے اوائل میں 10 رجنوری 1966ء کو تاشقند میں شاستری جی کے انتقال کے بعد نظم ''تاشقند کی شام'' کے ساتھ شائع ہوا۔سردار جعفری نے لکھا ہے۔

''جب میں نے 2 رجنوری 1966ء کو شام سات بجے شاستری جی کو اپنی نظم ''کون دشمن ہے'' دوسری بار سنائی تو مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ ان کی زندگی کی آخری نظم ہوگی۔اس وقت میرے دل سے تاشقند ملاقات کی کامیابی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں اور 10 رجنوری کو رات کو امید و بیم کی بہت سی منزلوں سے گذرنے کے بعد میں نے دلی کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ معاہدۂ تاشقند کا جشن منایا لیکن 11 رجنوری کی صبح یہ معلوم ہوا کہ پردہ گرنے سے پہلے اس المیے کا آخری سین باقی تھا جس نے پاک۔ہند جنگ کی شکل اختیار کی تھی اور معاہدۂ تاشقند پر ختم ہو رہا تھا۔شاستری جی نے جان دے کر اس معاہدے پر اپنے خون کی مہر لگا دی ہے''۔ 255

نظم ''تاشقند کی شام'' کے تعلق سے عمر رضا نے لکھا ہے:

''نظم کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاہدۂ تاشقند کے جشن کو انہوں نے کس حسن و خوبی سے منایا تھا۔پوری نظم میں سرشاری اور سرمستی ہے۔پر امن فضاء اور بہتر مستقبل کی تمنا ہے۔ظاہر ہے جب معاملہ جشن کا ہو تو الفاظ کی شیشہ گری اور شعری لطافتوں کا عمل دخل بھی خوب ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ نظم میں دلکشی، رعنائی، نغمگی، موسیقیت اور موزونیت بدرجہ اتم ہے۔ 256

؎ مناؤ جشنِ محبت کہ خوں کی بو نہ رہے/برس کے کھل گئے بارود کے سیہ بادل/بجھی بجھی سی ہے جنگوں کی آخری بجلی/مہک رہی ہے گلابوں سے تاشقند کی شام/جگاؤ گیسوئے جاناں کی عنبریں راتیں/جلاؤ ساعدِ سیمیں کی شمع کافوری/طویل بوسوں کے گل رنگ جام چھلکاؤ/یہ سرخ جام ہے خوبانِ تاشقند کے نام/یہ سبز جام ہے لاہور کے حسینوں کے نام/سفید جام ہے دلی کے دلبروں کے لیے/گھلا ہے جس میں محبت کے آفتاب کا رنگ/کسی کی زلف نہ اب شامِ غم میں بکھرے گی/جوان خوف کی وادی سے اب نہ گزریں گے/جیالے موت کے ساحل پہ اب نہ اتریں گے/بھری نہ جائے گی اب خاک وخوں سے مانگ کبھی/ملے گی ماں کو نہ مرگِ پسر کی "خوش خبری"/کوئی نہ دے گا یتیموں کو اب "مبارکباد"/کھلیں پھول بہت سرحدِ تمنا پر/خبر نہ ہوگی کہ نرگس ہے کس کی آنکھوں میں.....۔ یہ سرزمین ہے محبت کے خواستگاروں کی/جو گل پہ مرتے تھے شبنم سے پیار کرتے تھے/خدا کرے کہ یہ شبنم یونہی برستی رہے/زمیں ہمیشہ لہو کے لیے ترستی رہے۔

ہندوستان پاکستان میں دوستی کے فروغ کے سلسلہ میں سردار جعفری کی مساعی پر بہت سے ادیبوں نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

"1965 کی ہند۔پاک جنگ ایک روح فرسا واقعہ تھا۔ایک بھیانک رات! لیکن اس کے بعد ہی معاہدۂ تاشقند ایک تبسم سویرے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی اختلافات سے بالاتر ہوکر سردار جعفری نے معاہدۂ تاشقند کا جشن منایا گویا کبھی جنگ ہوئی ہی نہ تھی، کتنا دلنواز انداز ہے۔ 257

پروفیسر عبدالستار دلوی:

(1) "تقسیم ہند کے سیاق میں جب ایک ملک، سیاسی جبر کے تحت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے تو سردار جعفری انہیں دو سیاسی ملکوں کی حیثیت سے تو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن وہ تہذیبی وفکری لحاظ سے ایک متحدہ قومیت ہی سمجھتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنی دو معروف نظموں "کون دشمن ہے؟ اور "صبح فردا" میں کیا ہے"۔

(2) وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے/وہ دن آئے کہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے۔

ہندوستان اور پاکستان کے مابین "بوسۂ لب" بن کے رہ جانے کی بات ایک شاعرانہ پیرایۂ بیان ہے جس (صبح فردا) میں ہندوستان کی تہذیبی ونسلی تاریخ کے سیاق میں ایک دفتر معنی پوشیدہ ہے۔یہ ایک مشترکہ تہذیبی قومی نظریہ (Cultural Nationalism) کی نفی کرتا ہے جو فاشست سیاسی رویہ ہے۔258

ضیاءالدین اصلاحی:

"ہند و پاک دوستی ان کی شاعری کا اہم موضوع تھا، اپنی مشہور نظم "سرحد" میں بتایا کہ سرحد مصنوعی اور انسان کی خود ساختہ ہے، اس سے ہمیں کیا غرض؟ ہمارا تو پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

"1980ء میں وزیر اعظم باجپائی بس سے لاہور گئے تو اس نظم کو بھی ساتھ لے گئے"۔.....

1998ء میں دونوں ملکوں میں ایٹمی دھماکے ہوئے تو ان کی امن وآشتی پسند طبیعت کو بڑا دھکا لگا اور انہوں نے اس کی شدید مذمت کی۔" 259

سردار جعفری تنازعات کے حل کے سلسلہ میں بات چیت کی اہمیت میں ایقان رکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے اور مسائل حل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد نے سردار جعفری کی خیر سگالی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے اپنی شاعری سے عالمی امن، دوستی اور خیر سگالی کا پیغام بھی دیا ہے۔انہوں نے ہندو پاک اور دیگر قوموں اور ملکوں کے درمیان جنگ وجدل اور دشمنی وعداوت کو ناپسند کیا اور گفتگو اور مصالحت کی ترغیب دی ہے۔ان کا خیال ہے کہ آپس کے تمام جھگڑے اور جملہ تنازعات آپسی بات چیت سے ختم ہوسکتے ہیں۔جنگ مسئلوں کا حل نہیں، جنگ خود ایک مسئلہ اور لعنت ہے۔یہ مسئلوں کو اور بھی پیچیدہ بناتی ہے۔اس لیے جعفری کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے اور گفت وشنید کی محفلیں اور نشستیں منعقد کرنی چاہئیں۔اس طرح غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملتا ہے''۔

؎ گفتگو بند نہ ہو رات سے بات چلے صبح تک شام ملاقات چلے رہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے ریگ زاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے رخوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے۔ 260

پروفیسر وارث کرمانی نے سردار جعفری کی نظم ''گفتگو بند نہ ہو'' کی خوبصورتی کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

نظم ''گفتگو بند نہ ہو''.....اس کی خوبی یہ ہے کہ سیدھی سادی بات کو نہایت فنکارانہ اور موثر لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔.....اس میں سردار کا آرائشی انداز بیان جس میں استعاروں اور تشبیہوں سے تاثیر پیدا کی جاتی ہے نہیں ملتا بلکہ اس کے بجائے ایک تحت نغمہ کی کیفیت ہے جسے مصرعوں کے آہنگ اور اندرونی موسیقی سے سنوارا گیا ہے۔ہر مصرع میر کی شاعری کی طرح سادہ اور عام فہم ہے،اس کا اثر پوشیدہ طور سے دلوں پر پڑتا ہے''۔ 261

نظم ''گفتگو'' (مشمولہ لہو پکارتا ہے) کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''ہند پاک دوستی کے نام اگست 1966 کی رقم کردہ نظم ''گفتگو'' میں 1965 میں ہندو پاک کے درمیان ہوئے جنگ کے بعد 4 رجنوری 1966 میں سوویت یونین کے شہر تاشقند میں دونوں ملکوں کے درمیان امن کی کوششوں کے حوالے سے ہوئی ملاقات ہے جس طرح کے پرامن اور دوستانہ ماحول کے لیے راہ ہموار ہورہی تھی،اسی کو وسعت دینے کی سعی کی گئی ہے۔مذکورہ نظم میں سردار جعفری نے ہندو پاک کے درمیان دوستی، اتحاد اور پیار ومحبت کے دیے جلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔جس کے لیے دونوں ملکوں کے درمیان گفتگو، بات چیت اور ملاقات کو انہوں نے ضروری قرار دیا ہے چنانچہ انہیں سب چیزوں کو انہوں نے پیارے انداز میں شعری پیکر عطاء کردیا ہے۔ 262

؎ گفتگو بند نہ ہو رات سے بات چلے صبح تک شام ملاقات چلے رہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے.....رصبح تک ڈھل کے کوئی حرف وفا آئے گا رعشق آئے گا بصد لغزش پا آئے گا رنظریں جھک جائیں گی دل دھڑکیں گے لب کانپیں گے رخامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی رصرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی راور پھر حرف ونوا کی نہ ضرورت ہوگی رچشم وابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی رنفرت اٹھ جائے گی مہمان مروت ہوگی رہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے رتحفہ درد لیے

پیار کی سوغات لیے ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے۔

سرور الہدیٰ لکھتے ہیں:

''اس نظم میں کون سی وقتی اور عصری حقیقت ہے جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ بات سے بات چلے، صبح تک شام چلے، ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے کیا یہ باتیں ختم ہو جانے والی ہیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو سردار کے یہاں بظاہر وقتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ان پر عنوانات قائم ہیں مگر ان کو پڑھنے کے بعد وسعت اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ سردار کی باتوں کی اہمیت اس لیے بھی باقی رہے گی کہ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں اور غزلوں میں انسان کی بنیادی ضرورتوں اور تمناؤں کا اظہار کیا ہے''۔ 263

حبیب الرحمٰن چغانی نے لکھا ہے:

''ان کی .....معرکہ آرا نظم ''گفتگو'' زبان زد خاص و عام ہے۔ یہ بھی دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور دوستی کا پیغام ہے''۔ 264

پروفیسر وارث کرمانی لکھتے ہیں:

''اس (نظم) میں سردار کا آرائشی انداز بیان جس میں استعاروں اور تشبیہوں سے تاثیر پیدا کی جاتی ہے نہیں ملتا بلکہ اس کے بجائے ایک تحت نغمہ کی کیفیت ہے جسے مصرعوں کے آہنگ اور اندرونی موسیقی سے سنوارا گیا ہے۔ ہر مصرع میر کی شاعری کی طرح سادہ اور عام فہم ہے، ان کا اثر پوشیدہ طور سے دلوں پر پڑتا ہے''۔265

ڈاکٹر سلطان احمد لکھتے ہیں:

''سردار بنیادی طور پر انقلابی اور احتجاجی شاعر تھے۔ اپنے وطن سے انہیں اشد محبت تھی اور عالمی امن کے بھی بڑے علمبردار تھے اور ہر اس جنگ سے نفرت کرتے تھے جس کی بنیاد تعصب اور نفاق پر ہو۔ وہ تقسیم ملک کے سخت مخالف تھے لیکن جب یہ تقسیم نا قابل تردید حقیقت کی صورت اختیار کر گئی تو انہوں نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ دونوں ملکوں کی سالمیت اور امن و آشتی کی جستجو اور کوشش میں قلمی جہاد سے کام لیا۔ وہ ہندو پاک میں خوشگوار تعلقات اور دوستانہ مراسم کے حق میں تھے لیکن 1965 میں ہندو پاک جنگ سے ان کے اس جذبے کو شدید جھٹکا لگا۔ جنگ سے اثر پذیری کے نتیجے میں انہوں نے نظم ''صبح فردا'' لکھی۔ تقسیم ہند کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نظم دونوں ہم سایہ ملکوں کے عوام کی ترجمانی اس طرح کرتی ہے کہ یہ تقسیم تاریخی حقیقت بن گئی ہے۔ اس کی اہمیت اور مقبولیت میں اس وقت اور اضافہ ہوا جب دو سال قبل ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے اپنے پاکستانی ہم منصب میاں نواز شریف کو لاہور ملاقات میں اسے بطور تحفہ پیش کیا۔ یہ نظم سردار کی شاعرانہ عظمت اور مقصدیت کے امتزاج کا خوبصورت اظہار ہے.....اس کے علاوہ ہندو پاک جنگوں کے پس منظر اور صلح و آشتی کی جستجو میں کہی گئی نظمیں ''کون دشمن ہے؟'' اور ''گفتگو'' کو اہمیت حاصل ہے''۔ 266

سردار جعفری نے سمرتھ بالی کے ساتھ اپنی گفتگو میں کہا تھا:

''میرے لیے ملک کی تقسیم بڑا دردناک سانحہ رہا۔ جس نے میرے وجود کو ہلا کے رکھ دیا۔ میرے کئی عزیز و اقارب نے

پاکستان ہجرت کی۔انہوں نے مجھ سے اصرار کیا لیکن میں نے ان سے انکار کر دیا۔میں ذاتی طور پر اس تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ اب میں پاکستان کا منکر تو نہیں لیکن پھر بھی دونوں ملکوں کے بیچ امن واتحاد کا خواہاں ہوں"۔ 267

عمر رضا رقمطراز ہیں:

سردار جعفری تقسیم ہند کے بالکل خلاف تھے لیکن جب تقسیم کا عمل وجود میں آ گیا اور ایک عظیم ملک دو مختلف ملکوں میں تبدیل کر دیا گیا تو ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ دونوں کے مابین اتحاد اور بھائی چارہ قائم رہے"۔ 268

پروفیسر مظہر امام نے فرحت احساس کے حوالے سے سردار جعفری کی ہند پاک دوستی کے فروغ میں لکھی گئی نظموں کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"ہمارے ایک معتبر شاعر اور صحافی فرحت احساس نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے کہ آج سردار جعفری کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد ان کا اصل شعری اظہار نہیں بلکہ وہ موضوعات نظمیں ہیں جو ہند پاک دوستی کے فروغ اور جنگ کے خلاف ماحول سازی کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں.....ان کے ذریعے ہمارے ملک اور برصغیر کے بعض اہم سیاسی اور تہذیبی معاملات میں اردو زبان وادب کی سرگرم مداخلت درج ہوئی"۔269

"پیراہن شرر" کے دیباچے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"عشقیہ شاعری روح میں لطافت پیدا کرتی ہے اور لذت فراق کو بھی لذت وصال بنا کر انسانوں کو سخت سے سخت حالات میں جینا سکھاتی ہے، سیاسی اور انقلابی شاعری روح کو صلابت عطا کرتی ہے، ضرورت دونوں کی ہے۔اخلاقی شاعری کا بھی ایک مقام ہے لیکن شاعر کا منصب واعظ کے منصب سے بلند ہے اور انداز بیان مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ منبر پر واعظ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن دلوں میں شاعر ابھرتا ہے"۔

(پیراہن شرر، صفحہ 20)

"سردار جعفری نے خوب صورت روحانی شاعری بھی کی ہے۔غزلوں میں کہیں عشقیہ اور روحانی مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ 270

رومانی نظمیں:

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

"اس تحریک (ترقی پسند تحریک) میں بھی ایک رومانیت کی لے تھی۔271

کلاسیکی اور ترقی پسند شاعری میں رومانیت اور عورت کے بارے میں نادیہ اتم نے تفصیل سے لکھا ہے۔چند اقتباسات پیش ہیں، ملاحظہ کیجئے:

(1) "ترقی پسندوں میں جہاں سماجی انقلاب کو پائیدار بنانے کے لیے بہت ہی جاندار شاعری نظر آتی ہے وہیں ان کی شاعری میں تصور شباب بھی کافی نمایاں ہے.....ایک ایسی عورت.....جو ان کے اپنے سماج میں سانسیں لیتی ہے اور ان کے

دوش بدوش ان کی تحریکات ذہنی میں ان کا ساتھ دیتی ہے اس لیے وہ اس تخلیقی محبوب سے بھی مختلف بن جاتی ہے جو اردو کی کلاسیکی شاعری اور خصوصاً اردو غزل میں برسوں تک موجود رہی نیز اس کی شکل میں ان رومان پرور شعرا کی شاعری میں ابھرے محبوب سے جدا نظر آتی ہے جو اسے قدرت کا شاہکار تسلیم کرتے ہوئے اس کے جمالیاتی پہلوؤں میں ڈوب جاتے ہیں''۔

(2) ''ترقی پسند نقطۂ نگاہ کا شاعر جب بھی عورت کا ذکر کرتا ہے وہ اسے رومان پرور انداز سے انقلاب کے تصور سے نزدیک لے جاتے ہیں وہ اسے اپنے اس تصور کی تکمیل کرنے کے لیے اپنا رفیق اپنا ہم دم قرار دیتے ہیں وہ اس عورت سے عشق بھی کرتے ہیں لیکن ان کا عشق محض تخلیقی اور تصوراتی نہیں بلکہ اس میں اپنے عہد کے سماجی حالات کا واضح اور حقیقت پسندانہ شعور بھی شامل رہتا ہے۔ وہ عورت کی قربت کو سماجی بصیرت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا عشق اس رومان سے کافی مختلف ہے جو سماجی پس منظر سے عاری ہے۔ اس لیے وہ نہ تو فرضی محبوبہ کی صورت میں عورت کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور نہ وہ ان محبوبہ کو کسی خیالی بستی میں آباد کرتے ہیں بلکہ وہ زندگی کی سنگلاخ راہوں میں اسے اپنے ساتھ چلتے رہنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ وہ حسن کی رنگینی اور مستی کے سیلاب میں بہہ جانا نہیں چاہتے بلکہ محبوب (عورت) کو کارگہہ عمل میں اتر کر اپنے دوش بدوش چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ .....وہ عورت کو اس دنیا کی ایک شئے سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے رشتہ استوار کرتے وقت اپنی کشاکش میں اپنا رفیق بنا لیتے ہیں۔ محض اس کی زلف پیچاں کے اسیر ہو کر آہ سرد ابھرنا انہیں نہیں آتا''۔

(3) ''عورت ان شعرا (ترقی پسند) کے لیے وجہ تسلی بھی ہے اور غم دوراں کا مداوا بھی۔ اس لیے عورت کو وہ اپن رفیق کار اور ہم نفس و ہمدم سمجھتے ہیں اور اس کے وجد آفریں تصور کو دکھوں سے نجات کا اہم وسیلہ مانتے ہیں۔ عورت ان کے نزدیک زندگی کے رجائی پہلوؤں کو تقویت پہنچانے کا ایک بہت ہی مضبوط وسیلہ رہا ہے۔ انہوں نے غم دوراں کی سختیوں کو کم کرنے کے لیے عورت کی قربت کو بھی ضروری سمجھا.....ان کی نگاہ میں عورت محض جنسی لطافتوں کا ذریعہ بھی نہیں بنی بلکہ انہوں نے اسے اپنی رفیق ہمدم و ہم نفس سمجھا۔ اس کے حسن و جمال سے متعلق جہاں کہیں بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کی عظمتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن عورت کی رفاقت کو وہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں زیادہ پسند نہیں کرتے۔

حسن و جمال کی عظمتوں کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ پھر بھی اس کی یاد کو وہ اپنے دل سے نہیں نکال سکتے۔ اس لیے وہ عورت کو محض حسن و جمال کا پیکر یا ناز و ادا کا مجسمہ بنا کر پیش کرنے کے کبھی قائل نہیں رہے''۔

(4) ''ترقی پسندوں میں سے بعض شعرا نے عورت کی نزاکت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اسے زندگی کے کٹھن راستوں پر اپنے ساتھ نہ چلنے کا مشورہ بھی دیا ہے''۔

(5) ''ترقی پسند شعرا نے عورت سے مخاطب ہوتے وقت یا اس کے تصور کو پیش کرتے وقت عشق کی جذباتیت یا حسن کی تصنع آمیز لطافت سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان کے جذبۂ عشق میں بھی زندگی کے حقائق مضمر ہوتے ہیں .....انہوں نے عورت کو زندگی کی مسرتوں کے حصول کا ایک وسیلہ بھی بنا دیا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں جہاں بھی عورت کا ذکر آیا ہے اس میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے جس نے زندگی کے رجائی پہلوؤں کو ہمیشہ جلا بخشی اور دل میں عشق کا ہلکا ہلکا سا سوز اور حسن کا صاف ستھرا

تصور ضرور پیدا کیا ہے۔ان کے اس سوزو درد میں ناکامی اور مایوسی کی فضا نہیں ملتی بلکہ عورت کو چوں کہ انہوں نے انسانیت کی تکمیل کا درجہ دیا ہے۔اس سے ان کا سوزو درد بھی انسانیت کے سوزو درد میں تبدیل ہو جاتا ہے''۔

(6)غم عشق ان کے (ترقی پسند شعرا) یہاں رومانیت کی ان سطحوں کو نہیں چھوتا جہاں پہنچ کر ذہن انسانی غم دوراں کے تصور سے دور ہو جائے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان دونوں جذبوں میں ایک توازن اور ایک معیار قائم رکھنے میں (کامیاب) ہو جاتے ہیں۔اور اسی لیے وہ حالات کے پیش نظر دونوں جذبوں کو اختیار کرنے میں اپنے شعوری عمل کو تیز تر بنا لیتے ہیں۔ حالات کی سختیوں اور زمانے کی پیچیدگیوں میں وہ تصور جاناں میں ڈوب کر خاموش نہیں بیٹھتے اور ایسے میں اکثر وہ غم عشق سے کسی حد تک گریز بھی کر لیتے ہیں۔اس کی بہت اعلیٰ اور موثر مثالیں فیض احمد فیض کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔اس سلسلہ میں ان کی نظم ''چند روز اور میری جان''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''''تمہارے حسن کے نام''، ''دو عشق''وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے''۔

(7)''ترقی پسند نقطہ نگاہ نے عورت کو میدان عمل میں سرگرم جدوجہد دیکھنا چاہا۔اس نقطۂ نگاہ کو تسلیم کرنے والے عورت کی اداؤں کا شکار ہو کر اس کی مخمور نگاہی کا خود کو شکار نہیں کرتے رہے۔انہوں نے عورت کی عشوہ طرازی کو تسکین قلب و نظر نہیں سمجھا۔اسے پردے میں چھپانے یا چلمن سے لگے رہنے پر بھی مجبور نہیں کیا۔اس کے حسن کو ذہنی لذتیت اور دماغی لطافت کا اسباب بھی بننے دیا نہ اسے پگھلتی ہوئی شمع بنا کر رونق محفل میں نور بن جانے پر اکسایا بلکہ اسے اپنا ہم نفس اپنا ہمراز اور اپنا ہمدم بنا کر اپنے کاندھوں سے کاندھا ملا کر کارزار حیات میں سرگرم عمل ہونے کی دعوت دی.....اس طرح انہوں نے رومان کو حقیقت کے سانچوں میں ڈھال کر اجتماعی زندگی کے مسائل کی جانب عورت کو متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ان شعرا کے ذہن میں سماجی نظام کے بے ترتیبی اور انتشار کے خلاف جو جذبہ بغاوت پرورش پا رہا تھا اس کا ایک اہم حصہ دار عورت کو بنا کر اسے بھی سماجی نظام کو خوشگوار بنانے اور سماج میں مساوات لانے کے لیے اپنی ہی طرح سرگرم عمل ہونے کی جانب متوجہ کرانا چاہتے تھے۔اسی لیے انہوں نے عورت کے اندر مضمر تمام تر صلاحیتوں اور عمل کے تیز جذبوں کی قدر کرتے ہوئے اسے اپنے دوش بدوش چلنے کی دعوت دی۔ان شعرا نے عورت کو اس کے اندر مضمر صلاحیتوں کو.....ابھارنے کی پوری کوشش کی.....انہوں نے عورت کو سماج میں ایک آئینی حیثیت بھی دینا چاہی اور اس کے حقوقِ مساوی کے لیے احساس کمتری کا کبھی شکار نہیں ہونے دیا۔اس سلسلہ میں جن شعرا نے خصوصی توجہ دی ان میں سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبی، مجاز، ساحر اور مجروح کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں''۔ 272

عمر رضا نے سردار جعفری کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے:

''جدوجہد آزادی اپنے شباب پر تھی جس میں وہ (سردار جعفری) خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے.....اس کے باوجود انہوں نے اس طرح کے رومانی اشعار تخلیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ شعریت اور ادبیت کے بھی قائل ہیں۔البتہ موجودہ حالات کے پیش نظر وقتی اور ہنگامی شاعری بھی کی جس کی بنیاد پر انہیں محض ایک جذباتی، انقلابی یا انتہا پسند شاعر نہیں کہا جا سکتا''۔ 273

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے سردار جعفری کی رومانیت کے بارے میں لکھا ہے:

''سردار جعفری اردو شاعری کے اس دور کی پیداوار ہیں جو رومان اور انقلاب کے امتزاج کا دور تھا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور ترقی پسند تحریک کے باعث اردو شاعری نے چولا ضرور بدلا تھا لیکن کسی بھی شاعر کو رومانیت سے دامن چھڑانے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سردار جعفری اور ان کے رفقاء، فیض، مخدو، ساحر، جاں نثار اختر، مجاز، جذبی، کیفی اعظمی ان سب کی شاعرانہ زندگی کا آغاز رومانیت ہی سے ہوا ہے۔ ان کے پیشرو شاعروں میں حتیٰ کہ جوش بھی جو ''انقلاب و انقلاب'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور بعض حلقوں میں شاعر انقلاب قرار دیئے جاتے ہیں، بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں.....ان (سردار جعفری) کا مزاج تو وہاں حقیقی خدوخال میں ابھر آتا ہے۔ جہاں رومان اور انقلاب شیر و شکر ہو جاتے ہیں مثلاً ان اشعار میں۔

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم/اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم/تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو/لیکن کسی کا روئے حسیں درمیاں ہے آج/حکایت دل کی کیا دار و رسن کی اک کہانی ہے/قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے!

رومان اور انقلاب کے امتزاج کی یہ کیفیت ''شادی کا دن''، ''جیل کی رات''، ''تمہاری آنکھیں'' کے علاوہ خصوصاً ''ایک خواب اور'' اور ''پیراہن شرر'' کی کئی نظموں میں ملتی ہے۔ ایک جان دو قالب کی صورت میں۔ سردار جعفری کے رومانیت پسند ہونے کا ایک اور ثبوت بھی ہے! خواب! خواب، ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے''۔ 274

سردار جعفری کی رومانی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر رفعت النساء بیگم نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری کا بڑا حصہ بھی رومانیت اور انقلاب کا حسین امتزاج ہے.....سردار جعفری کے یہاں رومانی اور عشقیہ منظومات، غزلوں اور قطعات کی بھی کمی نہیں.....سردار جعفری کی رومانی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ان کا لہجہ موضوع کی مناسبت سے خنک، شیریں اور سبک ہو جاتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ اشعار احتجاج، انقلاب اور طوفان برپا کرنے والے شاعر کے ہیں''۔ 275

حمایت علی شاعر کہتے ہیں:

''سردار جعفری نے.....بیشتر ایسے موضوعات کو اپنایا جن پر دوسروں نے نہیں لکھا مثلاً محبوب.....کے بالوں کی سفیدی اور اس کے چہروں کی جھریوں کا حسن کسی نے تلاش نہیں کیا عمر رسیدگی کے باوجود محبوب سے شدید محبت کا احساس صرف سردار جعفری کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔

ہماری عمر رواں کی شبنم/تری سیہ کاکلوں کی راتوں میں تار چاندی کے گوندھ دے گی/ترے حسین عارضوں کے رنگین گلاب بیلے کے پھول ہوں گے/شفق کا ہر رنگ غرق ہوگا لطیف و پر کیف چاندنی میں۔

فراق صاحب نے بھی ہندوستانی معاشرت کے حوالے سے ''روپ'' کی رباعیات میں کہیں کہیں عورت کو اس زاویے سے دیکھا ہے۔ کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر نے بھی اپنی نظموں میں سماجی عورت کی جھلکیاں دکھائیں مگر حسن شناسی کا یہ زاویہ جو سردار جعفری کی اس نظم میں نمایاں ہوا ہے پہلے کہیں نظر نہیں آتا''۔ 276

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں:

''انہوں نے (سردار جعفری) سرمایہ دار لڑکیاں ''مزدور لڑکیاں'' قسم کی نظمیں بھی کہہ لی تھیں۔عمر کے تقاضے کے سبب اس وقت ان کی شاعری میں رومانی رنگ موجود تھا مگر اس رنگ میں انقلاب کی ہلکی سی آمیزش بھی ہوتی جارہی تھی۔''لکھنو کی ایک شام'' انتظار نہ کر، محبت کا فسوں، حسن تمام جیسی رومانی نظموں کے علاوہ 'جوانی'، 'بغاوت'، 'سماج'، 'بنگال' جیسی نظمیں بھی وہ کہہ رہے تھے جن میں اشتراکی و مارکسی نظریات کی تبلیغ و تشہیر ملتی ہے۔عمر اور فکر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی ایک زبردست انقلاب آچکا تھا۔ 277

سردار جعفری کے شعری مجموعے ''ایک خواب اور'' کی مختصر نظمیں مثلاً مرے خواب، ایک پھول، ترے پیار کا نام، جب ترا نام لیا، درد ایک چاند ہے، غم کا ہیرا، اجنبی آنکھیں، شعلہ لبی، پیاس بھی ایک سمندر ہے، شعلہ و شبنم، یاقوت لبی، چاند کو رخصت کردو، ایسی نظمیں ہیں جن میں رومان کی زیریں لہریں نمایاں ہیں۔طویل نظمیں ''آرزو کے صنم خانے'' تم نہیں آئے تھے جب، تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ، بہت قریب ہو تم، تمہارے ہاتھ، نسیم تیری قبا، پیاس کی آگ، قتالۂ عالم تن کی چاندی من کا سونا، شام غم، لطف سخن، سناٹا، خنجروں کی روشنی، جب صبا آئے گی، قتل آفتاب، برہنہ پا ہے بہار، پیغمبر مسیحا دست، رہبر کی موت، صندل و گلاب کی راکھ اور فاصلے ایسی نظمیں ہیں جن میں وہ اپنی معشوقہ سے محبت کا اظہار کررہا ہے۔اس کے گیسو، بند کی خوشبو، ہاتھوں کی نرمی، حیا کے رنگ، گزشتہ اٹکھیلیوں اور شکوۂ جور و وفا، شکریہ لطف و کرم کو یاد کررہا ہے۔رومان پرور مضامین کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی موضوعات کو بھی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔شعریت اور خیالات کی ترسیل دونوں برقرار ہیں۔

آرزو کی ہتھیلی پہ جلتا رہے/شوخی حسن رنگِ حنا کا کنول/بس تمنا کا ساغر چھلکتا رہے/مل ہی جائے گا نا کامیوں کا بدل
(شام غم)

مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن/دل میں ہو جرأت انکار تو ہے/لطفِ سخن/ظلم کے خوف کے اور موت کے سناٹے میں/ایک اک حرف ہو بیدار تو ہے/لطف سخن
(لطف سخن)

تیرگی کی سازشیں، بدبختیوں کا اژدھام/کوچۂ احساس میں ہنگامۂ شور نشور/ہر طرف پھیلی ہوئی ہے خنجروں کی روشنی/ہر طرف بکھرا ہوا ہے ایک خون آلودہ نور/رنگ رخ کے آئینے آنکھوں کے ساغر چور چور/پھر بھی دھڑکے ہی چلا جاتا ہے قلب ناصبور
(خنجروں کی روشنی)

رومانی اشعار:

مارچ 1973ء کا شعر

ایک بھی ان میں نہ تھا اس رخِ روشن کا جواب
کتنے خورشید مری تابشِ خوں تک آئے

درج ذیل ''دوشعر''میں سردار جعفری نے غم دوراں کو زائل کرنے کے لئے تصور جاناں کا سہارا لیا ہے۔

شب ہجر صبح وصال ہے ترا عکس جب بھی جگالیا
تری یاد دل کا چراغ ہے، سرشام ہی سے جلالیا
غمِ زندگانی تھا تلخ تر غم عشق اس کو بنالیا
یہ امانت غم دوست ہے اسے طاق دل میں سجالیا

فیض الرحمٰن اعظمی کا ایک مضمون ''سردار جعفری کے سماجی شعور کا تجزیہ''جو ماہنامہ نگار اگست 1951ء میں شائع ہوا۔

اس میں سردار جعفری کی رومانی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

(1) ''سردار کی ابتدائی نظمیں مثلاً بغاوت، جوانی، انتظار نہ کر، لکھنو کی ایک شام، محبت کا خون اور حسن ناتمام وغیرہ میں یہ انقلابی رومانیت کارفرما نظر آتی ہے۔ان نظموں کا جو میدان ہے وہ خالص حسن وعشق کا میلان نہیں ہے۔ان کے اندر وہ مغلوبیت اور سپردگی نہیں ملتی بلکہ اس کے برخلاف ایک حوصلہ انگیز انبساط اور عمل اور انقلاب کی طرف ذوق انگیز اشارے ملتے ہیں.....اور''انتظار نہ کر''میں سردار اپنے محبوب کو بھولتا نہیں لیکن اس سے اتنا ضرور کہتا ہے کہ تم اس وقت میرا انتظار نہ کرو۔یہ عجب گھڑی ہے میں سرورِ عشق کی دنیا نہیں بسا سکتا.....اردو شاعری کے اندر حسن وعشق کا اتنا سا تنفک تصور انہیں شاعروں کی وجہ سے وجود میں آیا۔اس سے پہلے حسن وعشق کا تصور مریضانہ تھا۔وہ ہم سے زندگی تاب اور توانائی چھین لیتا تھا لیکن ان شاعروں نے اس ارضیت Worldiness اور انسانی محبت سے ہمکنار کیا اور یہ تصور انفرادیت اور داخلیت کے محدود حلقے سے نکل کر کائنات پر محیط ہوگیا اور اردو شاعری عشق کے ایک ایسے تصور سے آشنا ہوئی جو بدلے ہوئے ماحول اور سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ تھی.....ان کا تصور عشق محض خیالی اور روایتی نہیں ہے بلکہ اس میں غم جاناں وسیع ہوکر غم دوراں سے مل گیا۔مجاز نے اپنی محبوبہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے سرخ آنچل سے ایک پرچم بنالے تو اور اچھا ہو۔احمد ندیم قاسمی نے شاہراہ حیات کو فن سے آلودہ دیکھ کر سرے سے حکایت عشق و جمال ہی سننے سے انکار کردیا اور ساحر تو محبت ہی نہیں کرنا چاہتا.....غرض سماجی حالات کی ناسازگاریاں اور فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ان کی محبت کی راہ میں پہاڑ کھڑا کردیتا ہے اور زندگی کی تلخیاں قدم قدم پر ان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔وہ عشق کے معاملے میں محض جذباتیت ہی کے دھارے پر نہیں بہتے بلکہ عقل وشعور کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں''۔

(2) سردار کی ابتدائی نظموں میں مزدور لڑکیاں اور سرمایہ دار لڑکیاں بہت اچھی نظمیں ہیں، ان نظموں میں حسن وعشق کا طبقاتی تجزیہ ہے، جب وہ سرمایہ دار لڑکیوں کے لیے کہتے ہیں:

عشق کے ذوق نظارا نے نکھارا ہے انہیں رمرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انہیں رڈوب تو سکتی ہیں لیکن یہ ابھر سکتی نہیں رہ یہ کتا روبوس کی حد گزر سکتی نہیں۔

اور مزدور لڑکیوں کیلئے یہ لکھتے ہیں:

گردش افلاک نے کودی میں پالا ہے انہیں رسختی ٔ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انہیں رہیکسی ان کی جوانی مفلسی ان

کاشباب رسازان کا سوزِ حسرت خامشی ان کا رباب راپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب ران کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب رٹھوکروں پر ان کے جھک سکتے ہیں ایوان وقصور رتوڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور رہن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن رد یکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

ان کے بڑھتے ہوئے شعور کو ظاہر کرتا ہے..... مختصر یہ کہ سردار جعفری ''رومان سے انقلاب'' تک کی منزل طے کرنے میں کہیں بھی روح عصر سے الگ نہیں ہوئے، ان کا شعور مریضانہ رومانیت اور مقصدیت کے دلدل میں کبھی بھی نہیں پھنسا بلکہ مارکسزم کی روشنی میں انہوں نے طبقاتی جدوجہد میں عوام کے ساتھ ہو کر اپنے شعور کو اور زیادہ گہرائی اور انقلابی قدروں سے وابستہ کرلیا''۔278

ساجد رشید نے لکھا ہے:

''جعفری صاحب دراصل ایک رومانی انقلابی تھے۔ان کی رومانیت انہیں ابتداء میں مارکس کے فلسفے تک لے گئی، پھر وہ نہرو کے سوشلزم میں اس انقلاب کو تلاش کرتے رہے، اس کے بعد اندرا گاندھی کے پرکشش نعروں میں انہیں انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی تھیں۔وہ اسی رومانی انقلاب کے تعاقب میں چلتے رہے جو ریگزار میں سراب ہی دکھاتا ہے، اس کے باوجود اردو ادب میں ان جیسا بلند قامت ادیب اب کوئی دوسرا نہیں رہا''۔ 279

سردار جعفری کی رومانی نظموں کے بارے میں پروفیسر وارث علوی نے لکھا ہے:

(1) ''عام ترقی پسند شاعر کا سفر رومان سے انقلاب کی طرف رہا ہے لیکن ''ایک خواب اور'' میں سردار انقلاب سے رومان کی طرف پلٹتے نظر آتے ہیں۔ویسے سردار نے نومشقی کے زمانے میں ''حسن سوگوار''، ''خیر مقدم''، ''لکھنو کی شام''، ''غم کا ستارہ''، ''حسن ناتمام'' جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں لیکن یہاں تخیل پامال موضوعات اور فرسودہ اسلوب میں قید ہے جب کہ ''ایک خواب اور'' کی رومانی نظمیں ایک ایسے تخلیقی سفر کی نشاندہی کرتی ہیں جو کشادگی، تازگی، ندرت اور انفرادیت کی منزلوں کو طے کرتا ہے۔اب رومانیت سردار کے یہاں رسمیہ چیز نہیں رہی بلکہ قوت حیات کی مظہر ہے جو موت اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔انقلابی جنگ تو محض ایک پہلو ہے اس عظیم پیکار کا جو موت اور زندگی کی قوتوں کے درمیان کائنات میں ازل سے جاری ہے۔لہٰذا زندگی کے حسن ونشاط کے عرفان کا مطلب ہے انقلابی جنگ کے انسانی سرچشموں کا اثبات۔ سردار کی رومانیت کا دھارا اس طرح قوت حیات سے پھوٹتا ہے اور حسن وشباب، عشق ومحبت اور کیفیت ونشاط کی منزلوں سے گزر کر اس رزم گاہ میں پہنچتا ہے جہاں اس کا سیدھا مقابلہ حیات دشمن طاقتوں سے ہے۔یہ طاقتیں عبارت ہیں جنگ ظلم، تشدد اور استحصال سے اور یہ جنگ کڑی جنگ ہے۔حوصلہ آزما بھی اور حوصلہ شکن بھی''۔

(2) ''ایک خواب اور'' کی رومانیت کا دائرہ بہت وسیع پہلودار اور تہہ دار ہے۔رومانیت یہاں محض حسن وعشق کی واردات تک محدود نہیں (گو وہ بھی) محض خارجی دنیا کے ظلم وتشدد کا جواب اور ردِعمل بھی نہیں (گو وہ بھی) بلکہ اس سے کہیں زیادہ زندگی کی تخلیقی قوتوں کا اثبات بھی ہے۔رومانیت یہاں ایروز سے ہاتھ ملاتی ہے۔احساس کی سطح پر سردار یہاں منٹو کے قریب آجاتے ہیں جس کے یہاں ایروز کے مظاہر تشدد اور ستم شاعری کا جواب ہیں۔اس معنی میں سردار کے یہاں رومانی

جذبہ ایک انقلابی کے اس احساس گناہ سے پاک ہے (مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ) جو جہد حیات سے فرار اور زلفوں کی نرم چھاؤں میں پناہ لینے سے پیدا ہوتا ہے۔سردار کے یہاں عشق اپنی اصل میں قوت حیات یعنی ایروز کا مظہر ہے۔ اسی سبب سے سردار ایک خالص عشقیہ نظموں میں جذبہ عشق کی پاکیزگی کی نگہ بانی کرتے ہیں۔عشقیہ جذبہ ان کے یہاں انقلاب کی سیڑھیاں چڑھنے کے پائیدان کے طور پر کام میں نہیں لایا گیا۔سردار عشق کو عشق کی سطح پر برت سکتے ہیں"۔

(3) "سردار کی رومانی نظموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ لجلجے اسلوب، موہوم احساس اور دھواں دھواں افسردہ فضاء آفرینی کا سہارا نہیں لیتے جو نومشقوں کی رومانی نظموں کا عام وطیرہ ہے۔سردار کی رومانی نظموں میں جذباتی ڈراما اپنی ایک واضح شکل رکھتا ہے مثلاً ان کی نظم ہے "تم نہیں آئے تھے جب" اس نظم میں ڈرامائی حرکت کے چار مراکز ہیں (۱) تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو موجود تھے تم (۲) تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو تم آئے تھے (۳) تم نہیں آؤ گے جب تب بھی تو تم آؤ گے (۴) آؤ آنے کی کریں بات کہ تم آئے ہو۔نظم کے مختلف چھوٹے بڑے بند ان مصرعوں کی خوب صورت تفسیریں ہیں۔فطری طور پر بیان استعاراتی ہے کیوں کہ احساس کا آبگینہ اتنا نازک ہے کہ استعارہ ہی اسے سنبھال سکتا ہے۔گویا استعارہ نہیں تو جذبے کا بیان بھی نہیں۔یعنی نظمیں استعارہ جذبے کے وجود کا برہان بنتا ہے" .....

"حسین تر" اردو کی چند بے مثال نظموں میں سے ہے آج حسن و شباب ہے کل قائم نہیں رہے گا لیکن شاعر کے لیے تو محبوب کا چہرہ آج سے بھی حسین تر ہوگا کیوں کہ آج کی مسرتیں مستقبل میں ماضی کی سہانی یادوں میں بدل جائیں گی اور محبوب کے چہرے کی جھریوں میں آج کے بوسوں کی تابناکیاں لہرا اٹھیں گی .....

جعفری کی روایت چوں کہ نشاط دشمن نہیں درد عشق ہی کی لذت عشق کا سرچشمہ بناتی ہے۔اسی لیے سردار کے یہاں جدائی کبھی روگ نہیں بنتی۔تکمیل آرزو میں رہی ہوئی تشنہ لبی انسان کا مقدر ہے اور اسی لیے درد عشق ہی شاید لذت عشق کا سرچشمہ ہے"۔ 280

عمر رضا نے سردار جعفری کے مجموعہ "پرواز" میں شامل رومانی نظموں کا ذکر کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

(1) "1936 کی تخلیق کردہ نظم "انگڑائی" میں سردار جعفری کے رومانی لب ولہجہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ کریں ۔

مسکرا کر ہاتھ اٹھا کر یوں نہ لے انگڑائیاں/دامن ہستی کی ہو جائیں گی لاکھوں دھجیاں/کھینچ کے آجائے گی نیچے آسماں کی انجمن/چھوڑ دیں گی بجلیاں گھبرا کے اپنا بانکپن/رقص اپنا بھول جائے گا سنہرا آفتاب/گر پڑے گا چھوٹ کر زہرہ کے ہاتھوں سے رباب/کوئی کونپل پھر حیا سے سر اٹھا سکتی نہیں/پھر کلی بھی گلستاں میں مسکرا سکتی نہیں/۔

(2) 1939 کی تحریر کردہ نظم "لکھنو کی ایک شام" بھی رومانی نظم کی ایک اچھی مثال ہے۔اس میں سردار جعفری نے شام اودھ کی بے حد جاندار اور خوبصورت عکاسی کی ہے۔اس زمانے میں وہ لکھنو یونیورسٹی میں ایم اے (سال اول) کے طالب علم تھے۔انہوں نے شام کے وقت کی چہل پہل اور پھر اس اژدھام میں حسیناؤں کا اٹھلانا، بل کھانا، شوخی انداز، لغزش پا، غرض ہر ان اداؤں کو شعری پیکر عطا کرنے کی سعی کی ہے جن جن اداؤں سے ایک حساس اور رومان پرور شاعر محظوظ ہو سکتا

ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا رفو رجلوۂ دیدار عام کیا کہنا رکشیدہ قامت و گل پیکر و سبک اندام رغزال وحشت و آہو خرام کیا کہنا رکسی کی شوخی انداز و لغزش پا میں رہزار ناز و نیاز و پیام کیا کہنا رکسی کی آنکھ کے ہلکے سے اک اشارے میں رشکستِ شیشہ و مینا و جام کیا کہنا۔

(3) 1940ء کی رقم کردہ نظم ''فراموش کردند عشق'' میں محبوب کی دل کھول کر تعریف کی گئی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سردار جعفری سلطانہ کے عشق میں گرفتار ہوئے تھے۔ نظم میں لب و لہجے کی تقریباً وہ ساری نرمیاں و خوبیاں موجود ہیں جن کو رومانیت اور تغزل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دزدیدہ نگاہوں میں محبت کی چمک ہے رقائل ہوں ہمیشہ سے ترے کیفِ نظر کا رسینے کے تلاطم سے ابلتی ہے جوانی رد رکھول دیا کس نے خمستانِ سحر کا رہونٹوں پہ ہے بہکا ہوا ہلکا سا تبسم راک پھول ہے شاعر کے گلستان ہنر کا رزلفوں کی گرہ رات کے آنچل کی شکن ہے رماتھے پہ ہے ٹیکا کہ ستارہ ہے سحر کا رکیا مستی رفتار ہے کیا لغزش پا ہے رقصاں ہے ہر ایک ذرہ تری راہ گذر کا راس جنت نظارہ کو آباد کرے کون؟ رغمگین ہو جب روح تو دل شاد کرے کون؟

(4) اسی طرح کی ایک نظم ''حسن ناتمام'' ہے جس میں محبوب کی بے پناہ تعریف کی گئی ہے۔ اس میں بھی اسلوب کی تقریباً تمام لطافتیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں تشبیہ و استعارے کے حسین اور برمحل استعمال نے نظم کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کریں:

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن ناتمام رجس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام رجس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ افق رجس کے سینے سے ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں رجس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی رجس کے دامن تک ابھی بادِ سحر پہونچی نہیں رجس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب رجو ابھی مچلی نہیں چھلکی نہیں ابلی نہیں رجس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں رجو ابھی تڑپی نہیں چمکی نہیں ٹوٹی نہیں۔

(5) کسی حسین دوشیزہ کی ایک جھلک سے شاعر جس طرح متاثر ہوتا ہے اور ان محسوسات کو وہ رومانی انداز میں جس طرح شعری پیکر عطا کر سکتا ہے اسے دیکھنا ہو تو 1944ء کی رقم کردہ نظم ''جھلک'' ملاحظہ کریں۔ رومانیت سے معمور اس نظم میں سردار جعفری نے اپنے رومانی جذبات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے

صرف لہرا کے رہ گیا آنچل رنگ بن کر بکھر گیا کوئی رگردشِ خوں رگوں میں تیز ہوئی ردل کو چھو کر گزر گیا کوئی رپھول سے کھل گئے تصور میں رداماں شوق بھر گیا کوئی۔

(6) ''غرض سردار جعفری نے ابتداء میں خالص رومانی شاعری بھی کی جس میں انقلابی آہنگ بالکل نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ بات صرف ان کی ابتدائی شاعری پر صادق آتی ہے جو بہت مختصر ہے۔ بہت جلد انہوں نے اپنی شاعری کا رخ موڑ دیا تھا اور جب ہندوستان کی جدوجہد آزادی نے شدت اختیار کی تو سردار جعفری نے اپنی شاعری کے ذریعے اس میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جس کے لیے انقلابی رنگ و آہنگ کی شاعری ناگزیر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا رومانی نظموں کے

علاوہ پرواز میں شامل بیشتر نظمیں انقلابی ہیں"۔ 281

شعری مجموعہ خون کی لکیر میں شامل رومانی نظمیں ملاحظہ کیجیے:

نظم "ایک جھلک" رومانی نظم ہے جس میں عشق کی لطافتوں اور صنف نازک کے حسن کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

صرف لہرا کے رہ گیا آنچل رنگ بن کر بکھر گیا کوئی گردش خوں رگوں میں تیز ہوئی پھول سے کھل گئے تصور میں دامن شوق بھر گیا کوئی

نظم "غم کا ستارہ" ایک رومانی نظم ہے جس میں محبوب کے وصال اور ہجر کا لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

میری وادی میں وہ ایک دن یوں ہی آنکلی تھی حسن اور نور کا بہتا ہوا دھارا بن کر محفل شوق میں اک دھوم مچا دی اس نے خلوت دل میں رہی انجمن آرا بن کر شعلۂ عشق سر عرش کو جب چھونے لگا اڑ گئی وہ مرے سینے سے شرارہ بن کر اور اب میرے تصور کا افق روشن ہے وہ چمکتی ہے جہاں غم کا ستارہ بن کر۔

نظم "حسن سوگوار" میں صنف نازک کے حسن کا خوبصورت بیان ہے۔ نظم کا ردم، لے، نغمگی اور غنائیت نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔

کیا کہوں کیا ہے وہ حسن سوگوار جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار خال و خد میں رس، نگاہوں میں شراب مہکی مہکی سانس میں روح گلاب انکھڑیوں میں خواب و بیداری لیے زلف کے ہر خم میں دلداری لیے بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول ..... ادھ کھلے مخمور آنکھوں کے کنول ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش ..... رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی حلقۂ تقدیر میں جکڑی ہوئی لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں دل میں کڑھتی ہے مگر کہتی نہیں ..... اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں اس کے غم اتنے ہی دلآویز ہیں۔

نظم "حسن ناتمام" کے بارے میں عمر رضا نے لکھا:

"حسن ناتمام خالص رومانی نظم ہے۔ حسن کی رنگینی، شادابی، دلکشی، شوخی، دوشیزگی اور شگفتگی کو نہایت ہی رنگین اور حسین تشبیہ و استعارے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ محبوب کی محبوبیت اور اس کی پائیداری و ناتمامی کا ذکر تمام تر شعری لطافتوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ 282

چند اشعار ملاحظہ کریں۔

کس قدر شاداب و دلکش ہے حسن ناتمام جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام جس کے سینے سے ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں جس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی جس کے دامن تک ابھی باد سحر پہنچی نہیں برگ گل پر جس طرح شبنم کی اک ننھی سی بوند جو شعاع مہر تاباں سے ابھی الجھی نہیں ..... جس طرح گیسوئے پیچاں جیسے زلف خم بہ خم جو ابھی کھل کر ہوا کے دوش پر مہکی نہیں ..... جس طرح آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی جھلک جو کرن بن کر لب و رخسار پر بکھری نہیں اب تلک یوں بھی اچھوتا ہے وہ حسن ناتمام جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام۔

نظم ''لکھنو کی ایک شام'' خالص رومانی ہے جس میں سردار جعفری نے شام اودھ کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔283

؎ یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا رو فور جلوۂ دیدار عام کیا کہنا رسا طِ ارض پہ عرش بریں کے مہہ پارے رزمیں کی گود میں ماہ تمام کیا کہنا رلہن کی طرح سے آراستہ دکانوں پر رجوانیوں کا حسین اژدہام کیا کہنا رکشیدہ قامت دگل پیکر و سبک اندام رغزالِ وحشت و آہو خرام کیا کہنا رکسی کی شوخی انداز و لغزش پا میں رہزار ناز و نیاز و پیام کیا کہنا رکسی کی آنکھ کے ہلکے سے اک اشارے میں رشکست شیشہ و بینا و جام کیا کہنا رفضاء میں رات کی پرچھائیوں کی بے تابی رزمیں پہ رقص کناں روح شام کیا کہنا رمچل رہی ہے جوانی ابل رہی ہے شراب رنگاہ شوق ہے پھر تشنہ کام کیا کہنا۔

''الفاظ کے دروبست' اتار چڑھاؤ' سلاست' روانی' رنگینی اور سرمستی سے سرشار اس نظم کی تخلیق سردار جعفری نے اس زمانے میں کی تھی جب وہ لکھنو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور جدوجہد آزادی اپنے شباب پر تھی جس میں وہ خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے..... نظم ''خیر مقدم'' ایک خالص رومانی نظم ہے جس میں سردار جعفری نے اپنے محبوب کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے حسن کی کچھ یوں تعریف کی ہے۔ 284

؎ نگار نو بہار و نو بہار گل عذار آیا رچمن ہے رنگ سامانِ بہار آیا رعنا دل سے کہو گائیں ترانے خیر مقدم کے رہواروں کو خبر دو مطرب ساز بہار آیا رادا کی برق چمکی زلف پیچاں کی گھٹا برسی راودھ کے میکدے پر گھر کے ابر کوہسار آیا رہوائے شوق سے کھلنے لگیں کلیاں تبسم کی رگوں میں خون بن کر لذتوں کی بجلیاں دوڑیں ر.....سنا کرتے تھے حسن و نیس و ہیلن کے افسانے رجمال و نیس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا۔

سردار جعفری نے نظم ''دکن کی شہزادی'' میں ممبئی کو تجسیم عطا کر کے اس سے اپنی گہری محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔اس کی خوبصورتی کو دلکش انداز میں پیش کیا

؎

بمبئی اے دکن کی شہزادی رنیلگوں سندری اجنتا کی راپنی اونچی چٹان سے نیچے راپنے بالوں کو دھونے آئی ہے رپنڈلیاں مچھلیاں ہیں چاندی کی رپاؤں ڈوبے ہوئے سمندر میں رانگلیاں کھیلتی ہیں پانی سے رجلتے ہیروں کی لال آنکھوں سے رپگھلے نیلم کے نیلے ہونٹوں سے رمرے خوابوں میں مسکراتی ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ان حسین خوابوں کا ذکر کیا ہے جو دوران قید ان کے ذہن میں آتے جاتے تھے۔سردار جعفری نے ان خوابوں کو بڑے ہی دلکش اور رومانی انداز میں بیان کیا ہے۔

نظم ''میرے خواب'' کے اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

اے مرے حسیں خوابو رتم کہاں سے آئے ہو رکس افق سے ابھرے ہو رکس شفق سے نکھرے ہو ر.....جیل تو بھیانک ہے رس ذلیل دنیا میں رحسن کا گزر کیسا رنگ ہے نہ نکہت ہے رنور ہے نہ جلوہ ہے رجبر کی حکومت ہے رمیں نے تم کو دیکھا ہے ریاد اب نہیں آتا رشاید ایک لڑکی کی رتھرتھراتی پلکوں میں رجگمگاتی آنکھوں میں ریا کسی تبسم میں رجو نہا کے نکلا ہو رآنسوؤں کے شبنم سے رایک ہمکتے بچے کی رمٹھیوں کے پھولوں پر رتتلیوں کی یورش سی راور ماں کی نظروں میں رسیکڑوں امیدوں کے رشوخ رنگ گلدستے ر.....ایک کارخانے میں رچند نوجوانوں نے رانجمن بنائی ہے راور اس میں لینن کی راک کتاب پڑھتے ہیں رسن رہی

ہیں دیواریں/ہنس رہی ہے تاریکی/.....گیسوؤں کی نکہت سے/جب ہوا مہکتی ہے/جب فضاء چہکتی ہے/میرے گرم ہونٹوں پر/پیار تھرتھراتے ہیں/اور میری محبوبہ/اپنے رنگ عارض سے/بجلیاں بناتی ہیں/اور میری نظروں میں/اک جہان مٹتا ہے/اک جہان بنتا ہے.....مرے دل کی دنیا میں/یوں ہی جگمگائے جاؤ/قید و بند کے جلاد/تم کو پا نہیں سکتے/لمبے لمبے ظالم ہاتھ/تم چھو نہیں سکتے/اے مرے حسین خوابو/.....۔

30/جنوری 1950ء کو قید کے دوران ناسک جیل میں سردار جعفری نے اپنی شادی کی دوسری سالگرہ کے روز نظم ''شادی کا دن لکھی اور حسین لمحوں کی یاد تازہ کی۔

نظم میں رومانی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

سفید بادل/لرزتے آنچل/بلند و بالا حسین نیلاہٹوں کے سر سے ڈھلک گئے تھے۔فضاء کے چہرے پہ مست ہو کر/ہزاروں کرنیں بکھر گئی تھیں/ہرے بھرے پیڑ/روشنی/روشنی کے جھولے/ہوا کی پینگیں/.....یہ دن بہت ہی حسین دن تھا/جسے تمہارے حسین اقرار عشق نے اور خوبصورت بنا دیا تھا/یہ دن اسی طرح سج کے پھر آج آ گیا ہے/.....وہی تبسم وہی تمہارا سا شوخ انداز دلربائی/.....مری نگاہوں میں میری محبوب تیری صورت رچی ہوئی ہے/یہ چاند میری حسین یادوں کے آسماں پر کھلا ہوا ہے/ترے تصور سے میرے سینے میں چاندنی ہے۔

جنوری 1950ء میں ناسک جیل میں سردار جعفری نے اپنی بیوی کی یاد میں نظم ''تمہاری آنکھیں''، لکھی جو ان کے شعری مجموعہ پتھر کی دیوار میں شامل ہے۔

میں لکھ رہا ہوں/تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پر/اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں/میں پڑھ رہا ہوں/تمہاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھنوؤں کے نیچے/لرز رہی ہیں/میں سو رہا ہوں/تمہاری آنکھیں تمہاری پلکیں کہانیاں سی سنا رہی ہیں۔

تمہاری آنکھیں/حسین، شفاف، مسکراتی جوان آنکھیں/لرزتی پلکوں کی چلمنوں میں/شہابی چہرے پہ ابروؤں کی کماں کے نیچے/تمہاری آنکھیں/وہ جن کی نظروں کے ٹھنڈے سایے میں میری الفت/میں لکھ رہا ہوں، تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پر/اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں/میں پڑھ رہا ہوں/تمہاری آنکھیں ہر ایک سطر کی بھنوؤں کے نیچے/لرز رہی ہیں۔

یوسف ناظم نے مذکورہ اشعار کے بارے میں لکھا ہے:

''جعفری صاحب نے رنگ و رامش میں نہائے ہوئے یہ اشعار اس وقت کہے تھے جب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی سرگرمیوں کا تاوان ادا کر رہے تھے۔ان کی 'عصری حسیت'' نے انہیں وہاں پہنچایا تھا لیکن اس اسیری نے ان کے محسوسات میں براقی یوں پیدا کر دی کہ عصری حسیت کے علاوہ ان کی بصری حسیت میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا۔جن کی آنکھوں کا والہانہ ذکر انہوں نے مندرجہ بالا اشعار میں کیا ہے وہ آنکھیں کاغذ میں پیوست ہو کر رہ گئی ہیں اور کاغذ بجائے خود قرطاس ابیض ہو گیا ہے۔ان اشعار میں چھپی اور بسی امیجری نے میں کہہ سکتا ہوں کہ جیل کی آہنی سلاخوں کو پھولوں کی لڑیوں میں بدل دیا ہو گا اور علی سردار جعفری کے مزاج کی نرمی زندانی ہواؤں میں بھی سراہت کر گئی ہو گی۔شاعر کو اپنی زندگی کے ہر لمحے اور ہر ثانیے کو پر مسرت بنانے کا ہوشربا فن آتا تھا۔سردار جعفری نے اپنے رویے سے آسودہ خیالی ہی کو آسودہ حالی کی شکل دے دی تھی''۔ 285

ڈاکٹر سلطان احمد نے سردار جعفری کی جیل میں لکھی گئی نظموں کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے۔

''ناسک جیل میں اپنی بیگم اور بچے کی یاد میں جو نظمیں کہی تھیں ان سے ان کی شاعری میں نئی جہت اور نئی سمت کا اضافہ ہوا۔ان نظموں میں ''جیل کی رات'(خون کی لکیر) ''نیند'' اور ''تمہاری آنکھیں'' (پتھر کی دیوار) قابل ذکر ہیں۔ان نظموں کے حوالے سے پیکر تراشی کے نہایت خوبصورت نمونے سامنے آئے ہیں۔علاوہ ازیں تشبیہات اور علامات کا بھی برجستہ اور فطری استعمال ہوا ہے۔ان نظموں میں سردار کا رنگ ولہجہ اور فکر و آہنگ ان کے اپنے اسلوب میں بدل جاتا ہے اور اندازہ ہونے لگتا ہے کہ یہ آواز اقبال اور جوش کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ سردار کی اپنی آواز ہے جس میں اسلوب کی پختہ کاری نمایاں ہے''۔ 286

''تمہاری آنکھیں'' بڑی خوبصورت رومانی آزاد نظم ہے۔دیگر نظموں میں ''سلام'' ''ایک پھول'' ''ترے پیار کے نام'' ''جب ترا نام لیا'' ''شعلہ و شبنم'' تمہارے ہاتھ شامل ہیں۔

تمہارے نرم، حسین دل نواز ہاتھ نہیں/ چمک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ/لپک رہی ہیں ہتھیلی میں انگلیوں کی لویں/تڑپتی نبض کہے جاری ہے پیار کی بات/پگھل رہی ہے رخِ آتشیں پہ ہجر کی رات/نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات .....(تمہارے ہاتھ) جب ترا نام لیا دل نے تو دل سے میرے/جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں/اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ/سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گزریں .....(جب ترا نام لیا)

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے نظم ''گفتگو'' سیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ عشقیہ بھی ہے۔عشقیہ شاعری بھی سردار کے شعری سرمایے کا ایک قابل لحاظ حصہ ہے۔ 287

رومانی نظمیں:

پتھر کی دیوار

جنوری 1950ء میں لکھی گئی اس نظم میں محبوب کی تعریف اور محبوب کے لیے محبت کا گیت گایا گیا ہے۔''تجدید وفا'' خالص رومانی نظم ہے۔پھول تھے۔سرخ بہاریں تھیں جواں/وہ مہکتی ہوئی بانہیں وہ مہکتے ہوئے ہونٹ/وہ تبسم کہ شفق شرمائے/قہقہے راگنی جس طرح فضاء میں لہرائے/جسم پاکیزہ و شاداب و جواں/چاندنی جیسے مجسم ہو جائے/.....ڈوبتی شام کے سورج کی سنہری کرنیں/تیرے کاکل ترے رخسار پہ سو جاتی تھیں/اور ہوائیں ترے آنچل کو ترے شانوں کو/شوق سے چوم کے دیوانی سی ہو جاتی تھیں/اور میں اپنے رقیبوں پہ ہنسا کرتا تھا/اپنی وارفتگی شوق کا عالم ہے وہی/دل بیتاب وہی دیدۂ پرنم ہے وہی۔

قید کے دوران سردار جعفری نے اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر نظم نیند لکھی۔اس نظم کا اسلوب رنگین اور رومانی ہے۔

نیلگوں جواں سینہ/نیلگوں جواں بانہیں/کہکشاں کی پیشانی/نیم چاند کا جوڑا/مخملیں اندھیرے کا/پیرہن لرزتا ہے/وقت کی سیہ زلفیں/خامشی کے شانوں پر/.....روز رات کو یونہی/نیند میری آنکھوں سے/بیوفائی کرتی ہے/مجھ کو چھوڑ کر تنہا/جیل سے نکلتی ہے/بمبئی کی بستی میں/میرے گھر کا دروازہ/جا کے کھٹکھٹاتی ہے/ایک ننھے بچے کی/انگڑیوں کے بچپن میں/میٹھے میٹھے

خوابوں کا رشہد گھول دیتی ہے/اک حسیں پری بن کر/لوریاں سناتی ہے/ پالنا ہلاتی ہے/

نظم ''ذوق طلب'' کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے اپنی زندگی کے مختلف نشیب و فراز بالخصوص لکھنو اور بنارس سے بمبئی تک کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ بمبئی سے اپنی محبت اور اس کی اس انجانی کشش کا بھی ذکر کیا ہے جس نے انہیں دلکش شام اودھ اور صبح بنارس چھوڑنے پر مجبور کر دیا جہاں پپیہے بولتے ہیں، کوئلیں کوکتی ہیں اور خوابوں میں ہوائیں شب کو ستار بجاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے بمبئی میں گزارے اپنے ان لمحات کو بھی یاد کیا ہے جس کے طفیل میں انہیں ادائے سرکشی ہوئی تھی۔ پوری نظم شعریت اور نغمگی سے لبریز ہے۔ 288

ہم اس دنیائے رنگ و بو کے طوفانوں سے گزرے ہیں/صنم خانوں سے اٹھے ہیں پری خانوں سے گزرے ہیں/ بڑھا کر تشنگی سے لذت ذوق طلب اپنی/بھری مینا کو ٹھکرایا ہے پیمانوں سے گزرے ہیں/قدم اب کھینچ کر اس دشت اس وادی میں لائے ہیں/ جہاں پر حوصلوں نے اپنے بازو آزمائے ہیں/نہ جانے کیا کشش ہے بمبئی تیرے شبستاں میں/کہ ہم شام اودھ صبح بنارس چھوڑ آئے ہیں/پپیہے بولتے ہیں کوکتی ہیں کوئلیں جن میں/ہمارے دل پہ ان گاتے ہوئے باغوں کے سائے میں/بجاتی ہیں ہوائیں شب کو خوابوں میں ستار اپنا/نشیمن شاخ گل پر سبزہ زاروں کے بنائے ہیں/کبھی اشکوں کے تارے یاس کے پلکوں سے ٹوٹے ہیں/کبھی امید کے دامن میں موتی جگمگائے ہیں۔

''نومبر میرا گہوارہ''، سردار جعفری کی آپ بیتی ہے۔ اس میں سردار جعفری نے اپنی زندگی کے ابتدائی اور خوبصورت لمحات کو بیان کیا ہے، دنیا کی خوبصورتی پر رشک کیا ہے، اپنے پہلے سبق اقرأ کو تحسین قلم، تکریم قلم، تحریک ربانی، تخلیق انسانی اور تہذیب روحانی بتلایا ہے۔ پری وش کا بیان ہے ؎

جب کہیں پھول ہنسے/جب کوئی طفل سر راہ ملے/رات کی شاخ سیہ رنگ پہ جب رات کھلے/دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا/چیتھڑوں میں ہی سہی/ ماہ جبیں ہے دنیا/ دست صیاد بھی ہے ازوئے جلاد بھی ہے/ رقص تخلیق جہانِ گزراں جاری ہے.....رنومبر میرا گہوارہ ہے، یہ میرا مہینہ ہے/اسی ماہ منور میں/مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی/ میرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی/مرے تار نفس میں جنبش باد صبا آئی/مشام روح میں/مٹی کے خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی/لہو نے گیت گایا/شمع ہستی جگمگا اٹھی/یہ لمحہ لمحہ میلاد آدم تھا/.....مرا پہلا سبق اقرأ ہے تحسین قلم جس میں/ہے تکریم قلم جس میں/قلم تحریک ربانی/قلم تخلیق انسانی/قلم تہذیب روحانی/قلم شاخ طوبیٰ بھی ہے انگشت حنائی بھی/مرے ہاتھوں میں آخر رقص کرتی ہے/ ہزاروں دائروں میں چاند اور سورج کی محرابیں/ درخشاں علم اور حکمت کی قندیلیں.....رمیں خود فطرت تھا فطرت میری ہستی تھی/اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں/مسیں بھیگیں رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا/ میرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چمن آیا/ ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا.....رکہاں سے آئی ہو/کون ہو تم/نہ گل نہ خوشبو/مگر تمہارا وجود روح گلستاں ہے/وہ کائنات سرور جس کا/.....تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو لفظ بن رہے ہیں/وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں/تمہاری ''ہاں'' ایک گلاب ہے تازہ و شگفتہ/کہ جس سے ایوانِ جاں معطر/''نہیں'' بھی

ننھی سی اک کلی ہے، جو دل کی نازک سی شاخ میں سو رہی ہے، خواب بہار بن کر، یہ خواب تعبیر کے گلستاں کا منتظر ہے، تمہارے دلکش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے، تمہاری آنکھوں سے جھانکتا ہے، تمہاری سانسوں میں کانپتا ہے، مجھے "نہیں" کی کلی عطا ہو، کہ جس سے "ہاں" کا گلاب مہکے،

عمر رضا اس نظم کی خوبصورتی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری کی شعری جمالیات اب اپنے عروج پر ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد میں انہوں نے اپنی شاعری میں داخلیت کو بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے، جس سے ان کی شاعری اب دل کی آواز لگتی ہے، جس میں ایک خاص قسم کی امنگ اور تلاطم ہے۔ اس میں جوش اور جذبوں سے لبریز ایسی دنیا آباد ہے جو دلوں کو گرماتی ہے، گدگداتی ہے اور بے پناہ شاعرانہ حظ عطا کرتی ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست، اس کی بندش، موضوعات کی سطح پر گہرائی، گیرائی اور وسعت ان کی نظموں میں ایک نئی جان پیدا کرتی نظر آتی ہے"..... افسوس کہ اتنی عمدہ نظم وہ مکمل نہیں کر پائے جب کہ 1991ء ہی میں انہوں نے اس نظم کی تخلیق شروع کی تھی۔ اس کے بعد وہ بہ مشکل 9 سال دنیا میں رہے لیکن اس میں بھی وہ اس قدر مصروف رہے اور اخیر اخیر بیماریوں نے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ اسے مکمل نہیں کر پائے۔ پھر بھی یہ نظم ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، جس میں جلال و جمال کا حسین امتزاج نظر آتا ہے"۔ 289

نظم کا آخری ٹکڑا "قاتل کی شکست" میں سردار جعفری کا مخصوص لب و لہجہ ملاحظہ کیجئے۔

ابن مریم نہ حسین ابن علی ہوں لیکن، رخوں میں ہے خون شہادت کی حرارت پنہاں، وہ صدیوں سے دہکتا ہوا انگارہ ہے، اور سینے میں مرے، ایک نہیں سینکڑوں لاکھوں دل ہیں، وہ کسی دیس کا دل ہو کہ کسی قوم کا دل، وہ کسی فرد بشر کا دل ہو، زخم خوردہ ہو کہ نغموں سے بھرا، میرے سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل بن کر، کتنے دل قتل کرو گے آخر، کتنے جلتے ہوئے تاروں کو بجھا سکتے ہو، کتنے خورشیدوں کو نیزوں پہ اٹھا سکتے ہو، قتل کرتے کرتے خود تم کو جنوں ہو جائے گا.....

راشد آذر نے سردار جعفری کی نظم "نومبر میرا گیارہ" کے بارے میں لکھا ہے:

"کسی شاعر کے لیے اپنی خودنوشت سوانح عمری کو ایک ایسی نظم کی شکل میں پیش کرنا جو بیک وقت آپ بیتی بھی لگے اور جگ بیتی بھی بڑی جاں کاوی کا کام ہے۔ یہ نظم نامکمل ہے لیکن اس نظم کا جتنا حصہ لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کی وہ چھوٹی چھوٹی باریکیاں اپنے مشاہدے کے خزانے سے نکال کر شعری سانچے میں ڈھال دیں جن کو اکثر یا تو عام طور پر کم تر صلاحیت رکھنے والے شعرا نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو شعری سانچے میں ڈھال نہیں پاتے اور وہ نظم زبیان ہو کر رہ جاتی ہے لیکن سردار جعفری کی اس نظم کو ہم ایک عمدہ شعری تخلیق کہہ سکتے ہیں..... سردار جعفری نے بچے کو موسم کی خنکی اور گرمی سے بچانے کے لیے ماں کے فطری جذبے اور محبت کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے مصرعے دیے ہیں کہ اس جذبے کی پاکیزہ شدت سے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

بھری برسات میں بارش کے چھینٹے، گرمیوں میں لو کے جھونکے، مجھ سے ملنے کے لیے آتے، وہ کہتے تھے ہمارے ساتھ آؤ، چل کے کھیلیں باغ و صحرا میں، مری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو، مری حیرت کی آنکھیں، اس محبت

سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں، جس آئینے میں پہلی بار میں نے اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا، وہ چہرہ کیا تھا، سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا، وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوبصورت، کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا، کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا، جو اپنے دل کے خوابوں پیار کی کرنوں سے روشن تھا۔ 290

پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''اپنی منظوم خودنوشت میں سردار جعفری نے خوبصورت تراکیب، دلکش الفاظ اور نرم و لطیف لہجے سے جو فضاء بندی کی ہے وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی''۔ 291

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری اپنی منظوم خودنوشت تحریر کر رہے ہیں جس کے تقریباً دس ذیلی عنوانات وہ مکمل کر چکے ہیں جو اس طرح ہیں:۔

1. رقص تخلیق (کائنات کے نظام تخلیق اور ارتقائے انسانی کا اشاریہ)
2. کھول آنکھ، زمیں دیکھ (اپنی پیدائش کے متعلق)
3. اقرأ (حصول علم کا آغاز)
4. فطرت کی فیاضیاں (بچپن کا وہ معصوم زمانہ جو فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے میں گزرا)
5. ذکر اس پری وش کا (ہوش سنبھالنے کی منزل۔ الھڑ جوانی اور عشق کی معصوم جذباتیت اور حسن پرستی)
6. ورقِ ناخواندہ (ادبی زندگی کا آغاز اور مطالعہ کا شوق)
7. صحیفہ کائنات (تجربات و مشاہدات، شعور کی بیداری، فن کی پختگی)
8. حرف بد (مقبولیت اور اس کے زیر اثر رقابت، شماتت اور حریفائی کے واقعات)
9. حسد (بڑھتی ہوئی رقابت کا ایک تلخ تجربہ اور خود اعتمادی و خود شناسی کی منزل)
10. قاتل کی شکست (حریفوں کی پسپائی) 292

نظم سورنگ مشمولہ ایک خواب اور میں سردار جعفری کی نیرنگی مزاج ملاحظہ ہو ۔

اس محفل صد رنگ میں سو رنگ ہیں میرے / ہر رنگ میں رقصاں ہوں گلستانِ جہاں میں / خوشبو کی طرح کاکلِ پیچاں کی گلی میں / شعلے کی طرح انجمن شعلہ رخاں میں / ..... کانٹے کی طرح دیدۂ ارباب ستم میں / سرمے کی طرح چشم حسینانِ جہاں میں / خورشید جہاں تاب کا ساغر بھی پگھل جائے / وہ آتشِ سیال ہے پیمانۂ جاں میں / ہوں بت خانۂ عالم میں ہوں مصروف پرستش / جس طرح برہمن ہو کوئی کوئے بتاں میں۔

نظم 'لمحوں کا چراغ'' (مشمولہ ایک خواب اور) کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

نظم لمحوں کے چراغ میں سردار جعفری کی رجائی فکر پر لطف تشبیہاتی و استعاراتی انداز میں جلوہ گر ہے۔ لمحہ انسان کے لیے بے حد قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے انسان اسے حسین، جاوداں اور عظیم بنانے کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ سردار

جعفری نے اس نظم میں لمحہ کو نیند کی طرح نرم، خوابوں کی طرح رمیدہ، پھولوں کی طرح شگفتہ، خوشبو کی طرح لطیف، کرنوں کی طرح جواں، شعلے کی طرح دہکتی خواہش اور ساغر کی طرح چھلکتا سینہ کہا ہے"۔ 293

سب قافلۂ عدم کے راہی وادیِ عدم میں چل رہے ہیں/تاریکیوں کے کھلے ہیں پرچم/لمحوں نے چراغ جل رہے ہیں/ہر لمحہ حسین اور جواں ہے/ہر لمحہ فروغ جسم و جاں ہے/ہر لمحہ عظیم و جاوداں ہے نظم "یہ زندگی ہے"۔(مشمولہ ایک خواب اور)

اس نظم میں سردار جعفری نے زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر کیا ہے جیسے یہاں شب ہجر تو کبھی وصال محبوب، کبھی خزاں، کبھی انتظارِ بہار غرض یہاں مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔

کبھی مسرت کے ایک لمحے/میں جنبش چشم یار جیسے/کبھی روش ہے چمن کی لیکن/کبھی یہ صحرا کی رہ گذر ہے/یہ زندگی ہے طویل کتنی/یہ زندگی کتنی مختصر ہے۔

نظم "حسین تر" (مشمولہ ایک خواب اور) میں سردار جعفری نے معشوق کی تعریف بہت ہی رنگین پیرائے میں کی ہے۔ انہوں نے اپنے معشوق کی ڈھلتی عمر میں بھی حسن تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے دور شباب سے بھی حسین تر قرار دیا ہے۔

"ہماری عمر رواں کی شبنم/تری سیہ کاکلوں کی راتوں/میں تار چاندی کے گوندھ دے گی/ترے حسیں عارضوں کے رنگیں/گلاب بیلے کے پھول ہوں گے/شفق کا ہر رنگ غرق ہوگا/لطیف و پرکیف چاندنی میں/.....ہوس کی نظروں کو تیرے رخ پر/جمالِ نو کا گماں نہ ہوگا/فقط مری حسنِ آزمودہ/نظر یہ تجھ کو بتا سکے گی/کہ تیری پیری کا حسن تیرے/شباب سے بھی حسین تر ہے۔

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے "نظم حسین تر کا شمار نہ صرف سردار کی خوبصورت نظموں میں بلکہ اپنے دور کی بہترین عشقیہ نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ 294

نظم "حسین تر" کے بارے میں پروفیسر وارث علوی نے لکھا ہے:

"حسین تر" اردو کی چند بے مثال نظموں میں سے ہے۔ یہ محبوب سے وفاداری کی روایتی انداز کی نظم نہیں بلکہ عاشق کے جذبۂ شوق کی اس توانائی کا نغمہ ہے جو حسن و شباب کے فطری زوال اور وقت کی چیرہ دستیوں پر ظفریاب ہوتا ہے۔ آج حسن و شباب ہے، کل قائم نہیں رہے گا لیکن شاعر کے لیے تو محبوب کا چہرہ آج سے بھی حسین تر ہوگا کیوں کہ آج کی مسرتیں مستقبل میں ماضی کی سہانی یادوں میں بدل جائیں گی اور محبوب کے چہرے کی جھریوں میں آج کے بوسوں کی تابناکیاں لہرا اٹھیں گی .....نظم میں نہ رقیب سے نفرت ہے نہ وقت سے خوف بلکہ دونوں کا بیان ایک قدرتی فینومنیا کے طور پر ہوا ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ رقیب محبوب کے جمال نو کی طرف کشش محسوس کرے اور عمر گریزاں کی چاپ کی آواز پر نو دو گیارہ ہو جائے۔ رقیب نے حسن کی وہی جھلک دیکھی جو ہوس کی آنکھ کو بھاتی ہے جب کہ عاشق جو حسن کا مزاج داں ہے ان رعنائیوں کا بھی ادراک کرتا ہے جن کی ستم پیشگی جذبۂ شوق کی آزمائش ہے اور رقیب آزمائشوں کا خوگر نہیں۔ وہ ہمیشہ امتحان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ رقیب محبوب کے چہرے پر وقت کے دست غارت گر کے نشانات کی تاب نہیں لاتا کیوں کہ ہوس کو حسن تازہ کی تلاش رہتی ہے۔ عشق خزاں میں بیتی ہوئی بہاروں کا حسن دیکھنے کی نظر رکھتا ہے.....نظم میں سردار نے ان استعاروں

سے کام لیا ہے جو تبدیلی کو ایک مقام حسن سے دوسرے مقام حسن کی طرف سفر کا عمل بتاتے ہیں۔ 295

(پروفیسر وارث علوی، علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری، شخصی، شاعر اور ادیب، مرتبہ عبدالستار دلوی۔
صفحہ 169 '170)

نظم ''سرراہ'' (1942 مشمولہ پرواز) کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یہ کون ہے جس کی زلفوں سے گھنگھور گھٹائیں لپٹی ہیں/بجلی سی چمکتی ہے لیکن بجلی سی حیائیں لپٹی ہیں/اک لرزش سی ہے قامت میں اک شعلہ سا تھراتا ہے/ہر گام پہ عشوے رقصاں ہیں عشوں سے ادائیں لپٹی ہیں/مشرق سے نکلتے سورج کا ہوتا ہے گماں پیشانی پر/اس تابش رخ کا کیا کہنا آنچل سے شعاعیں لپٹی ہیں/یہ جسم کی خوشبو ہے کہ مہک بیلے کی چٹکتی کلیوں کی/پیرا ہن رنگیں سے شاید جنت کی ہوائیں لپٹی ہیں/ابرو کی کمانیں کھینچتی ہیں جنبش سی ہے تیر مژگاں میں/اس تیر سے کس کس کے دل کی مایوس دعائیں لپٹی ہیں۔

18/جولائی 1965ء کی لکھی نظم ''جرعہ جرعہ قطرہ قطرہ'' میں حسن و محبت اور پرامن حال و مستقبل کی امید کا گیت گایا ہے۔سردار جعفری نے ہمیشہ بہتر مستقبل کی تمنا کی ہے۔

انجم و مہتاب کے سائے میں جب آئے گی رات/نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائے گی رات/مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح/آنچلوں کی ریشمی شکنوں میں لہرائے گی رات/مطربِ رنگیں نوا کے ساتھ ہوگی نغمہ سنج/ساقی کا فرادا کے ساتھ اٹھلائے گی رات/شعلہ پیکر قامتوں کے حلقہ آغوش میں/کہکشاں در کہکشاں پھر رقص میں آئے گی رات/چھیڑ دے گی جنبش مژگاں کا ساز دلبری/عارض و لب کے مہکتے پھول برسائے گی رات/عشق کے ہونٹوں سے پی کر جرعہ آب حیات/حسن کے پیمانۂ سیمیں کو چھلکائے گی رات۔

سردار جعفری نے نظم موسموں کا گیت 12/اکتوبر 1965 کو لکھی۔اس میں گرمی، برسات، خزاں، فصل زمستاں، موسم بہار اور موسم گل یعنی بسنت کو سردار نے دلکش اور پرکشش انداز میں لکھا۔محبوب کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔نظم کا آخری حصہ جو موسم گل یعنی بسنت رتو پر مشتمل ہے اس سے سردار جعفری کی فطرت سے جذباتی وابستگی اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

گرمیاں آئی ہیں برساتی ہوئی انگارے/دیکھنا شعلہ بدن دھوپ پہ آیا ہے شباب/لوگ تالابوں میں اترے ہیں نہانے کے لیے/تہہ نشیں ہوتی چلی جاتی ہے ہر چادر آب/.....میری جاں اے مرے نغموں کی جواں شہزادی/فصل گرما سحر و شام تجھے راس آئے/چاندنی رات سجائے تری مہکی ہوئی سیج/جسم سیمیں کے لیے پھولوں کے تحفے لائے/.....تجھ کو اے نور کی تصویر مبارک ہو یہ دن/لے کے آئے ہیں جو گھنگھور گھٹاؤں کا پیام/آتش شوق میں جل جائے جوانی تیری/نوعروسی کو تری عیش و مسرت کا سلام/زندگی جس سے تر و تازہ ہے اس بارش سے/سبز بیلوں کی طرح تو بھی تر و تازہ رہے/میری محبوبہ پہ ہو رحمتِ حق کی بارش/جگمگاتا ہوا رخسار رہے غازہ رہے.....بیلا پھولا ہے کہ جلتے ہیں خیاباں میں چراغ/نور کا کنج نظر آتا ہے مدھ بن جیسے/جس طرح عشق میں ہنستی ہے حسینہ کوئی/جگمگا اٹھتے ہیں رخساروں کے گلشن جیسے/زاہد خشک کی بھی خیر نہیں ہے کہ رواں/ہر طرف حسن کی اور عشق کی تنویریں ہیں/نوجواں سینوں میں جذبات ہیں آویزاں/وصل کے خوابوں کی ہنستی ہوئی تصویریں ہیں/

فصل گل آئی ہے یا فصل وصال آئی ہے/ایک معشوقہ خورشید جمال آئی ہے۔

نظم ''کرشمہ'' کے اشعار دیکھئے ۔

کسی نرگسی آنکھوں کا نرگسی چہرہ/مری نظر کو عطا کر رہا ہے بینائی/نگاہ شوق کی ہیں بے قراریاں کیا کیا/طلوعِ مہر کی ہیں نقش کاریاں کیا کیا/مہ و نجوم کی ہیں جلوہ باریاں کیا کیا/زمیں سے تا بہ فلک رقص میں ہیں لیلائیں/شگفتہ صورتِ گل ہر طرف تمنائیں۔

نظمیں ''پروین شاکر صفات خانۂ جاں، نذر اختر الایمان، احمد فراز کے نام، وید مقدس اور چنڈالکا میں سردار جعفری کی شعری جمالیات بہت خوب ہیں۔

نظم ''دل اور شکست دل'' کی ہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''دل اور شکست دل'' ایک ایسی نظم ہے جو ہیتی اعتبار سے دو غزلوں اور ایک نظم پر مشتمل ہے۔ نظم کے ابتدائی اور اخیر کے آٹھ اشعار دو الگ الگ غزلیں متصور کی جا سکتی ہیں کیوں کہ دونوں غزل کی ہیت میں ہیں اور مختلف خیالات کو متعدد اشعار میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے جب کہ درمیان کے تین اشعار تین الگ الگ ردیف و قافیہ پر مشتمل ہیں اگر چہ اس کے خیالات میں بھی ربط نہیں ہیں بلکہ غزل کی سی بے ربطی پائی جاتی ہے۔ سترہ اشعار کو ایک ہی جگہ یکجا کر کے اور اس کا عنوان قائم کر کے نظم کے زمرے میں رکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس نظم کا انداز بے حد دلفریب اور دلنشیں ہے۔

عمر رضا علی سردار جعفری، صفحہ 619

؎ وفا کیسی، کہاں کی بے وفائی، عشق کی منزل/تھی مقتل گاہ جس میں حسن کی تیغ ادا نکلی/یہ سارا کھیل تھا جو وقت کے شاطر نے کھیلا تھا/نہ کچھ اس کی خطا نکلی نہ کچھ اپنی خطا نکلی/.....کوئی تو زخم دل پر مرحم مہر و وفا رکھے/کوئی تو درد کے رخسار پر دست شفا رکھے/.....تمام کیفیت جسم و جاں تمام ہوئی/کسی کا پیار نہیں اس کی دلبری کی طرح۔

نظم ''موسموں کا گیت'' پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''اسے (موسموں کا گیت) سردار جعفری نے 12 اکتوبر 1965 کو رقم کیا تھا.....نظم میں ہندوستان کے چھ موسموں کا ذکر کیا گیا ہے.....گرمی، برسات، موسم خزاں، فصل زمستاں، موسم بہار اور موسم گل یعنی بسنت کو سردار نے بے حد دلکشی اور پر کشش انداز میں شعری پیکر عطا کیا ہے.....موسموں کے ذکر کے ساتھ ساتھ محبوب کا بھی ذکر ہے۔ 296

؎ گرمیاں آئی ہیں برساتی ہوئی انگارے/دیکھنا شعلہ بدن دھوپ پہ آیا ہے شباب/.....میری جاں اے مرے نغموں کی جواں شہزادی/فصل گرما سحر و شام تجھے راس آئے/چاندنی رات سجائے تری مہکی ہوئی سیج/جسم سیمیں کے لیے پھولوں کے تحفے لائے/.....تجھ کو اے نور کی تصویر مبارک ہو یہ دن/لے کے آئے ہیں جو گھنگھور گھٹاؤں کا پیام/.....میری محبوبہ پہ ہو رحمتِ حق کی بارش/جگمگاتا ہوا رخسار رہے غازہ رہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا ہے کہ سردار جعفری کی نظم موسموں کا گیت کالہراس کی رتو سینہار (رتو سیوہاد) سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نظم نہ صرف کالی داس کا ترجمہ ہے بلکہ یہ جعفری صاحب کے دل کا صاف و شفاف آئینہ بھی

ہے۔ 297

اس نظم کا پہلا بند ہے۔

کتنے دل کش ہیں میرے ملک کے موسم ان میں رحسن کی بات کریں، عشق پہ اصرار کریں رنورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ رپھول کی طرح سے ذکر لب و رخسار کریں رمصحف حق کی طرح کھولیں کتاب دل کو رجس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں رفصل گل فصل خزاں، فصل زمستاں ہے مگر رموسم جنگ نہیں، موسم ویرانہ نہیں۔

جوشِ گل یہ ہے کہ شاخوں کی جھکی ہے گردن راور ہوا چلتی ہے لہکی ہوئی اتراتی ہوئی رجھیلیں ہیں سرخ کٹوروں سے کنول کے روشن رعورتیں عشق کی کرنوں سے ہیں گدرائی ہوئی ردن سبک، نرم، رواں، شام حسین وشاداب ردل کے لے لینے کا انداز نہیں آتا ہے رجو بھی اس فصل میں بالیدہ وروئیدہ ہے ربوئے گل رنگِ بہاراں میں بدل جاتا ہے۔

پروفیسر وارث علوی نے لکھا ہے:

موسموں کا گیت کالی داس کی نظم ''رتو سیوہار'' سے ماخوذ ہے۔بس یوں سمجھئے کہ نظم کا خیال کالی داس سے آیا ورنہ پوری نظم سردار کے ذہن کی پرداخت ہے ..... ہمارے یہاں بارہ ماسہ سے لے کر کلاسکی شاعری میں موسموں کی شاعری کی جو روایت ہے اس کا گہرا اثر سردار کی نظم پر ہے۔اس کے سبب ڈکشن اور امیجری قدرے Archaic ہوجاتی ہے جو نظم کے حسن میں اضافے کا سبب بنتی ہے کیوں کہ اس سے نظم میں وقت کی طنابیں دور تک پھیل جاتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ موسم زماں ومکاں سے ماورا ایک سی کیفیتیں رکھتے ہیں''۔ 298

نظم اعلکچول (مشمولہ پیراہن شرر) کے بارے میں عمر رضا رقمطراز ہیں:

''یکم جون 1965 کی رقم کردہ نظم ''اعلکچول'' میں سردار جعفری نے ''جدیدیوں'' پر تیکھا وار کیا ہے۔اس کے زیر اثر جس طرح کی تخلیقات سامنے آرہی تھیں، ادیب و قاری کے درمیان جس طرح کا ترسیلی خلا قائم ہورہا تھا اسے انہوں نے خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے''۔299

؎ اور یہ ٹوٹا ہوا سر اینٹھے ہوئے ہاتھ اور پاؤں رسات آنکھوں کا فریب رگیارہ ہونٹوں کا طلسم رایک تصویر ہے، مقصد ہے نہ مطلب کوئی رصرف اک لذت اظہار کا آئینہ ہے رکس کو نہیں معلوم حسیں کیا ہے، بھیانک کیا ہے رایک ہی شئے ہے جسے کہتے ہیں احساس نشاط ریا نشاطِ احساس رنہ تو اظہار ہی ممکن ہے نہ ترسیل اس کی ر.....اور یہ لمحہ کہ ازل ہے نہ ابد روقت کی جنبش پر کایہ گریزاں سایہ رآتشیں بوسۂ لب ماضی و مستقبل کا ریاس وامید کی ہم آغوشی رموت اور زیست کا وصل رہی انسان کی حقیقت یہی انسان کی اصل۔

درج ذیل تین شعر (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں سردار جعفری نے کشمیر کے موسم سرما کی ایک شام کا ذکر کیا ہے ؎

موسم زمستاں پھر دولت بہاراں دے رخشک کوہساروں کو ذوق آبشاراں دے رخنکی خزاں کو پھر حکم شعلہ باری ہو رسرد برف زاروں کو آتش چناراں دے رتہنیت گل تر کو حسن و رنگ ونکہت کی رخار وخس، کو گلشن کے مرگِ کم عیاراں دے۔

پنڈت نہرو کی وفات پر نظم صندل وگلاب کی راکھ لکھ کر پنڈت نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ؎

سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے/ وہ فصل گل کا پیمبر تھا عہد نو کا رسول/ سکھایا کش مکش جنگ و امن میں اس نے/ جراحتوں کو چمن بندی جہاں کا اصول/ وہ برہمن کہ جسے مسجدوں نے پیار کیا/ وہ بت شکن کہ جو بزم بتاں میں تھا مقبول/ وہ جسم آج ہے جو صندل و گلاب کی راکھ/ وطن کی خاک کے سجدوں میں اب بھی ہے مشغول/ اب اس کے فیض سے بنجر بھی لہلہائیں گے/ کھلیں گے خار بیاباں سے بھی بہار کے پھول۔

لال بہادر شاستری کی یاد میں نظم امانت غم لکھی گئی ہے۔

یہ نظم ''آج کل'' مارچ 1966ء میں شائع ہوئی۔اس میں شاستری جی کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور ان کی انکساری، خلوص، شرافت، امن کی مساعی کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انہیں جاہ و حشمت اور دولت دنیا سے سروکار نہ تھا

وہ جب تلک تھا افق پر ہمیں خیال نہ تھا/ کہ روشنی کی کرن بھی ہے اس اندھیرے میں/ یہ نفرتوں کا اندھیرا جو دل کا دشمن ہے/ ہزاروں لاکھوں ستارے طلوع ہوتے ہیں/ سیاہ راتوں کے سینے پر تیرنے کے لیے/ اور اس کے بعد وہ سیلاب صبح میں جا کر/ جو ڈوبتے ہیں تو ان کا پتہ نہیں چلتا/ مگر یہ ننھا ستارہ یہ نور کا نقطہ/ غروب ہو کے جو چمکا تو آفتاب بنا/ غریب و عاجز و مسکین و بے زر و نادار/ وہ انکسار میں ڈوبا خلوص کا پیکر/ ملی تھی اس کو شرافت دکھے ہوئے دل کی/ نہ جاہ و حشمت حاکم نہ دولت دنیا/ عطا ہوا تھا اسے صرف مفلسی کا غرور/ وہ ایک اشک کا قطرہ تھا اس کا سرمایہ/ بس ایک درد محبت بس ایک دولتِ غم/ اور اس کا آخری تحفہ امانتِ غم ہے/ یہ بار اٹھے گا اسی عجز و انکسار کے ساتھ/ امانت غم انساں امانتِ غم دل/ یہ اک چراغ ہے قندیل مہر و مہ کی طرح/ جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو/ یہ ایک پھول ہے جو زخم کے گلستاں میں/ کھلا نہایا شہیدوں کے خوں کی بارش میں/ نہایا خواہش امن و اماں کی شبنم میں/ یہ تاشقند کے سینے کا سرخ پھول بھی ہے/ اسی کو کہتے ہیں لاہور کی جبیں کا گلاب/ مہک رہا ہے جو دلی کے اب گریباں میں/ اٹھو کہ جشن دل و جاں منایا جائے گا/ ہر اک چمن میں یہی گل کھلایا جائے گا/ یہ گل جو درد محبت امانت غم ہے/ یہ گل جو شوخ بھی خون گشتہ بھی طول بھی ہے/ خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

سردار جعفری کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ اس نے اپنے کلام میں صرف فیض، سجاد ظہیر اور کرشن چندر کو خطاب کرتے ہوئے نظمیں نہیں کہیں بلکہ اپنے ہم خیال غیر ملکی شعرا اور غیر ملکی احباب کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔فرانس کا عظیم شاعر لوئی آراگوں، اسپین کا عظیم شاعر پابلو نرودا، فرانس کا مشہور عالم ایٹمی سائنس داں جولیو کیوری، امریکہ کے مشہور عالم حبشی موسیقار پال رابسن اور سوویت یونین کا بزرگ ایلیا ہرن برگ۔یہ سب علی سردار جعفری کا حیطۂ شاعری میں موجود ہیں۔ 300

1954-1995 کے دوران یاران میکدہ کے عنوان کے تحت سردار جعفری نے سات شخصیات پر نظمیں لکھیں جو مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' میں شامل ہے۔

نظم ''آراگوں'' پیرس میں لکھی گئی تھی۔لوئی آراگو فرانس کا عظیم شاعر اور ناول نگار تھا۔اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانسیسی ادیبوں کو منظم کیا تھا۔سردار جعفری اس سے بہت متاثر تھے۔

ایک تبسم شعلہ ہائے گل کو شرماتا ہوا/ایک شعلہ مسکراتا ناچتا گاتا ہوا/ایک نغمہ تیغ کی جھنکار میں ڈھلتا ہوا/ایک نعرہ لوریوں کے بادباں کھولے ہوئے/ایک ساحل اپنے طوفانوں سے ٹکراتا ہوا/نوعروس رنگ ونکہت دل میں مانند گلاب/ارض پیرس کی طرح لیکن سراپا انقلاب۔

پابلونرودا چلی (جنوبی امریکہ) کا ہسپانوی زباں کا سب سے بڑا شاعر تھا (وفات 1973)۔اس نے چلی کے انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ اسے برسوں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ 1950ء میں یہ شاعر ہندوستان آیا تھا۔ اسے 1951ء میں لینن اور 1971ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔نظم پابلونرودا کے اشعار پیش ہیں۔

ارضِ مشرق کا کنول وادیِ مغرب کا گلاب/سوز میں ڈوبا ہوا تارِ رگِ جاں کا رباب/دشت وکہسار کا شہزادہ گلستاں کا امیر/محفل انجم ومہتاب میں انساں کا سفیر/شب تاریک کے سینے سے ابھرنے والا/اس کو معلوم ہے دریا کی روانی کیا ہے/عشق کیا چیز ہے مئے کیا ہے جوانی کیا ہے/آسماں پر کبھی بادل ہے کبھی تارا ہے/سطح گیتی پہ نئی صبح کا نظارا ہے/ایک شمشیر بھی اک جام بھی اک ساز بھی ہے/اور پرستانوں میں کھوئی ہوئی آواز بھی ہے/بارِ غم سب کا اٹھاتا ہے سفینے کی طرح/دل انسان میں دمکتا ہے نگینے کی طرح/دوست روٹی کا چمکتے ہوئے پانی کا رفیق/اپنی نفرت میں عمیق اپنی محبت میں شفیق/لرزہ گل چینوں پہ طاری ہے وہ گلشن ہے یہی/بجلیوں سے جو بنا ہے وہ نشیمن ہے یہی۔تو وہ بہت متاثر ہوئے اور ایک نظم لکھ دی۔

اپنے نغمے پہ کوئی ناز تجھے ہو کہ نہ ہو/نغمہ اس بات پہ نازاں ہے کہ ہے فن تیرا/.....اپنی پلکوں سے چنا خونِ شہیدانِ حبش/کتنے گلزاروں سے گلرنگ ہے دامن تیرا/تیری آواز بلالِ حبشی کی ہے نوا/نور سے دل کے ترے حرف ہے روشن تیرا/بوئے گل رہ نہ سکی قید گلستاں میں اسیر/سرحدیں توڑ کے سب پھیل گیا فن تیرا/کرشن کا گیت ہے کوکل کی حسیں شام ہے تو/آ کلیجے سے لگالیں کہ سیہ فام ہے تو۔

سوویت یونین کے ادیب، صحافی اور بین الاقوامی امن تحریک کے زبردست رہنما تھے۔سردار جعفری ماسکو گئے ہوئے تھے اسی زمانے میں انہوں نے نظم ''ایلیا اہرن برگ'' لکھی۔

جنگ کی بے یقین دنیا میں/امن کا اک یقین محکم ہے/اک ضعیف ونحیف پیکر میں/ساری انسانیت مجسم ہے/ایک محشر جلو میں ہے اس کی/انجمن ایک اس کی ذات میں ہے/اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے/میری ہی بات اس کی بات میں ہے۔

فرانس کا مشہور عام ایٹمی سائنس داں تھا۔وہ آخری عمر تک عالمی امن کانفرنس کا صدر تھا۔وہ نوبل انعام یافتہ تھا۔

نظم ''جولیو کیوری'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

جان کر رازستاروں کی گزرگاہوں کا/آرزو خاک پہ مصروف سفر ہوتی ہے/فکر چالاک میں سورج کی شعاعیں ہیں اسیر/وہ تجلی کہ جو ذروں میں نہاں تھی اب تک/صرف تعمیر گلستانِ ہنر ہوتی ہے/مے دانش کا نشہ رند کی اوقات پہ ہے/خیر ہوتی ہے حقیقت میں نہ شر ہوتی ہے/اپنا سر شر کے قدم پر نہ جھکایا تو نے/علم کو خیر کی تفسیر بنایا تو نے۔

سردار جعفری امریکہ کے مشہور عالم حبشی موسیقار پال روبسن کی موسیقی سے متاثر تھے۔اس پر انہوں نے ایک نظم پال روبسن لندن میں لکھی جس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ پوچھا میں نے ایک دن بلبل شاہین سطوت سے/میری آواز سے صیاد پر کیوں خوف طاری ہے/محبت تیرا نغمہ حسن انسانی نواتیری/مگر سرمایہ داری کے جگر سے خون جاری ہے۔

جنوری 1960 میں جب سردار جعفری نے ماسکو میں ''پال روبسن'' سے ملاقات کی اور اس کا نغمہ سنا پہلے مجموعہ ''پرواز'' میں سردار جعفری کی تین بڑے اشخاص پر نظمیں ہیں ان میں لینن۔ غالب کے ساتھ اقبال پر بھی ایک نظم شامل ہے۔(23) اشعار پر مشتمل یہ نظم 1944ء میں کہی گئی ہے۔ دو بند پیش ہیں۔

ناتوانوں کو عطا کی قوتِ ضرب کلیم/تو نے بخشے ملت بے پر کو بال جبرئیل/رند کیا ساقی بھی جس محفل میں پیاسا تھا وہاں/ بھر کے لایا دل کے پیمانے میں موج سلسبیل/کچھ نہیں تھا جس بیاباں میں بجز موج سراب/آج وہ ہے رہگذر دجلہ و دینوب ونیل/آذران عصر حاضر کے صنم خانوں میں آج/کو بختا ہے تیرے دم سے نغمہ ساز خلیل/زندگی دشوار تر کر دی غلامی کے لیے/کھینچ دی اس طرح آزادی کی تصویر جمیل/خواب کی آغوش سے بیداریاں پیدا ہوئیں/ زندگی کی راکھ سے چنگاریاں پیدا ہوئیں .....

کتنے آنسو بہہ چکے ہیں زندگی کی آنکھ سے/آج ان اشکوں کا ہر قطرہ گہر ہونے کو ہے/ارتقاء ہے اس کا جادہ اس کی منزل انقلاب/کاروانِ شوق سرگرم سفر ہونے کو ہے/سبز پرچم کے افق پر مسکراتا ہے ہلال/باعث صد نازش شمس وقمر ہونے کو ہے/ سرخ شعلہ ہوگیا ہے آسمانوں تک بلند/فاش رازِ شوخیٔ برق وشرر ہونے کو ہے/جس کا چہرہ تھا غریبوں کے لہو سے تابناک/وہ نظام کہنہ اب زیر وزبر ہونے کو ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

''یہ نظم اقبال کے تئیں ان کی (سردار جعفری) محبت وعقیدت کا ہی اظہار نہیں کرتی بلکہ ان کے فکر وخیال یہاں تک کہ اسلوب وآہنگ کو بھی کور کرتی ہے''۔ 301

نظم ''کرشن چندر'' کے اشعار پیش ہیں

کتنا خوش رنگ ہے یہ وادیٔ کشمیر کا پھول/اپنے سینے میں لیے سارے جہاں کی خوشبو/ بال جبرئیل کی جنبش ہے قلم کی رفتار/حرف ہے شعر تر احرف ترا ہے جادو/تتلیاں لفظوں کی صفحات پہ اڑتی دیکھیں/دوڑتے دیکھے تخلیل کے سنہری آہو/سطریں اس طرح سے کرتی ہیں ترنم ریزی/عالم نغمہ میں جس طرح مغنی کا گلو/ظلم وافلاس میں جاگا ہوا انساں کا ضمیر/تیرہ وتار فضاؤں میں ستاروں کا نمو/کبھی للکار کے سانچے میں ڈھلی ہے فریاد/بن کے شعلہ کبھی چمکا ہے غریبوں کا لہو/درد کو دل کے لیے شمع بنایا تو نے/روحِ انسان کو نیا خواب دکھایا تو نے۔

فیض اور سجاد ظہیر جب گرفتار ہوئے تو سردار جعفری نے دونوں پر نظمیں کہیں۔ فیض پر نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:

کل تھا جب میں جیل میں تنہا/پتھر کے تابوت کے اندر/خاموشی کے سرد کفن میں/لیٹے ہوئے تھے نغمے میرے/تیرے نغمے ساتھ تھے میرے/آج ہے جب تو جیل میں تنہا/میں اپنی آواز کا شعلہ/اور اپنی للکار کی بجلی/گیتوں کے ریشم میں رکھ کر/تیری خاطر بھیج رہا ہوں/یہ میری آواز ہے لیکن/صرف مری آواز نہیں ہے/جوش، فراق، آنند اور بیدی/عصمت، ساحر کرشن اور کیفی/

میری زبان سے بول رہے ہیں.....ر

؎ سوز ہے دل میں نگاہوں میں محبت کا گداز/ایک بجلی ہے کہ جو شعلہ فشاں ساز میں/کاٹ تلوار کی شعروں کو عطا کرتی ہے/ وہ کسک درد کی جو فیض کی آواز میں ہے۔

اس نظم میں سردار جعفری نے فیض کی اسیری پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ یہ نظم اپریل 1951ء میں لکھی گئی ہے۔ سردار جعفری نے فیض کو اپنا ہم مقصد بتایا ہے۔ نظم میں پاکستانی حکومت پر طنز کیا گیا ہے ؎

کس کی گردن میں ڈالر کے/سونے کی زنجیر پڑی ہے/کس نے امریکہ کے ہاتھوں/خاک وطن کو بیچ دیا ہے/بیٹی اور بہن کے آنچل/ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے/کون ہے جو جنگی شعلوں میں/پاکستان کو جھونک رہا ہے/کون ہے جو اقبال کے دل میں/ظلم کی کیلیں ٹھونک رہا ہے۔

نظم ''سجاد ظہیر کے نام'':

سجاد ظہیر کی اسیری کے زمانہ مئی 1951ء میں سردار جعفری نے نظم ''سجاد ظہیر کے نام'' لکھی۔ اس نظم میں سجاد ظہیر کی انقلابی کوششوں پر سرمایہ داروں کی برہمی اور پریشانی، سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کو اجاگر کیا ہے۔ ؎

دشمنوں کے واسطے جو آہن و فولاد تھا

دوستوں کے واسطے تھا قطرۂ شبنم کا دل

سردار جعفری کی ایک نظم پاکستان کی جواں مرگ شاعرہ پروین شاکر کی ناگہانی موت پر ہے۔

اس نظم کے بارے میں پروفیسر وارث علوی رقمطراز ہیں:

''اسے پڑھ کر سردار کے بدلے ہوئے طرز سخن اور ان کے ذہنی رویے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اول تو سردار نے اپنے قبیلہ کے باہر ایک شاعرہ کی تحسین کی ہے جو مبالغہ آمیز سہی لیکن موقع کے لحاظ سے جائز ہے۔ یہ نظم سرتاپا اشارات و تلمیحات میں ملفوف ہے اور شاعر کے ذہنی سفر کا پتہ دیتی ہے جس میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ بنیادی تبدیلی آئی ہے اور شروع زمانے کا بلند آہنگ لہجہ اور خطیبانہ شاعری کا اکہرا پن ختم ہو گیا ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

وہ ودیاپتی کی شاعری کی/معصوم و حسیں و شوخ رادھا/وہ اپنے خیال کا کنھیا/ان شہروں میں ڈھونڈھنے گئی تھی/دستور تھا جن کا سنگ باری/وہ فیض و فراق سے زیادہ/تقدیس بدن کی نغمہ خواں تھی/تہذیب بدن کی راز داں تھی/لفظوں کی ہتھیلیاں حنائی/تشبیہوں کی انگلیاں گلابی/سرسبز خیال کا گلستاں/مبہم سے کچھ آنسوؤں کے چشمے/آہوں کی وہ ہلکی سی ہوائیں/صد برگ ہوا میں منتشر تھے/تتلی تھی کہ رقص کر رہی تھی۔

اور یہ آخری بند اقبال کے جاوید نامہ کی یاد دلا رہا ہے جس میں عالم بالا کی سیر کرتے وقت مشاہیر عالم سے گفتگو کی گئی ہے:

؎ جنت میں ہے جشن نو کا ساماں/محفل میں مجاز و بائرن ہیں/موجود ہیں کیٹس اور شیلی/یہ مرگ جواں کے سارے عاشق/خوش ہیں کہ زمین پاک سے اک/نو مرگ بہار آ گئی ہے/لپٹی ہوئی خاک کی ہے خوشبو/اور سایہ فگن ہے ابر رحمت

پروفیسر محمد حسن نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" کے بارے میں لکھا ہے:

"پابلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی (سردار جعفری) نظم میرا سفر لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اردو میں بے حد مقبول ہوئی"۔ 303

پروفیسر کوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

"میرا سفر" جو رومی کے مصرع "ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، زندگی کے اس لامختتم Continuum تسلسل یا Cyclic تصور کو پیش کرتی ہے جس میں ہندوستانی روح کی تڑپ موجود ہے.....

علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی کا یہ اثبات اور زندگی کے تسلسل پر یہ ایقان اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ان کا ایمان ایسی میراث ہے جس کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر ان کا نام روشن رہے گا۔ 304

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے:

"نظم میرا سفر"..... میں شاعر نے زندگی کی قوت نمو، تسلسل حیات، موت کے تواتر اور وقت جیسے تصورات کو پیش کیا ہے۔ نظم کا آغاز موت کے تصور سے ہوتا ہے..... پھر حیات نو کی بشارت دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎ لیکن میں یہاں پھر آؤں گا.....

ان مصرعوں کا حسن، سادگی، روانی، لطافت سب ایک بڑی شاعری کی بین دلیل ہیں۔ زندگی کی لطافت اور حسن سے بھر پور یہ نظم حیات انسانی کی اس حقیقت کے اظہار پر ختم ہوتی ہے ؎

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں .....

سردار کی شاعری میں زندگی کا یہ اثبات اور زندگی کے ارتقاء پذیر ہونے پر ایقان اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ان کا ایمان ان کی لافانی میراث ہے جس کے سبب شعر و ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ 305

رفعت شروش نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: ؎

"سردار جعفری کی اہم اور دیرپا نظموں میں میرا سفر ہے..... یہ نظم دراصل کسی ایک انسان کی نہیں، زندگی کی نظم ہے، جو کبھی نہیں مرتی، زندگی جو اپنا روپ بدلتی رہتی ہے.....

"پھر اک دن ایسا آئے گا/ آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے/ ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے/ اور برگِ زبان سے نطق و صدا کی ہر تتلی اڑ جائے گی۔

ان مصرعوں میں موت کو کتنا خوبصورت اور ہلکا پھلکا بنا دیا ہے۔ پھر موت کے بعد بھلا دیئے جانے کی منزل کا ذکر کرتے ہوئے سردار حیاتِ نو کی بشارت دیتے ہیں۔ ان مصرعوں کا حسن، روانی، سادگی، لطافت، سب کچھ ایک بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ ؎

"لیکن میں یہاں پھر آؤں گا/ بچوں کے دہن سے بولوں گا/ چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا/ جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں/ اور کونپلیں اپنی انگلی سے/ مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی/ میں پتی پتی کلی کلی/ اپنی آنکھیوں پھر کھولوں گا/ سرسبز ہتھیلی پر لے کر/ شبنم

کے قطرے تو لوں گا/ میں رنگِ حنا، آہنگ غزل/ انداز سخن بن جاؤں گا/ رخسار عروس نو کی طرح/ پھر آنچل سے چھن جاؤں گا/ ہر عاشق ہے سردار یہاں/ معشوقہ سلطانہ ہے۔

کتنا حسن اور رومانس ہے مرنے کے بعد اس طرح دوبارہ جینے میں۔ زندگی کے حسن سے بھرپور یہ نظم حیات انسانی کی اس حقیقت کے اظہار کے بعد ختم ہوتی ہے۔

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں/ ایام کے افسوں خانے میں/ میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں/ مصروف سفر جو رہتا ہوں/ ماضی کی صراحی کے دل سے/ مستقبل کے پیمانے میں/ میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں/ اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں/ صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں/ میں مر کے امر ہو جاتا ہوں اگر سردار جعفری یہی ایک نظم لکھتے تو بھی وہ اردو شاعری کے نگارخانے میں امر ہو جاتے۔ مگر ایسی خوبصورت اور بصیرت افروز نظم لکھنے کے لیے زندگی کا وہ سفر ضروری ہے جو سردار جعفری نے سرانجام دیا"۔ 306

شین کاف نظام نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بغاوت" ہی کو سب کچھ قرار دینے والا فطرت کے اسرار میں اپنی ذات کا اظہار کرنے لگا.....

یہ انقلاب سے رومانیت اور رومانیت سے تصوف اور ویدانت کی طرف کا سفر ہے۔ اب تخریب کا طنطنہ ہے۔ نہ بغاوت کی کاذب للکار بلکہ ایک نیا علی سردار ہے اپنے ہونے کا احساس و اعتراف یوں کرتا ہے:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں/ ایام کے افسوں خانے میں/ میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں/ اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں/ صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں/ میں مر کے امر ہو جاتا ہوں۔ 307

سردار جعفری نے لکھا ہے:

"میرا سفر" میری محبوب نظم ہے: 308

ڈاکٹر خورشید احمد نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" کا جائزہ لیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1. "میرا سفر" ان کی (سردار جعفری) معدودے چند ایسی تخلیقات میں سے ہے جس میں اشتراکی اور انقلابی مسائل کا ذکر بالکل نہیں۔ اس میں جن تصورات کا بیان ہے وہ ہیں موت، حیات و وجود، عدم، وقت اور تسلسل حیات۔ ان تصورات کو شعری تجربے میں تبدیل کرتے ہوئے سردار کے لیے انقلابی سروکار بے مصرف تھے۔ اگر موضوع کا تقاضا نہ ہو تو سردار بلاوجہ اپنی اشتراکیت کو نظم میں نہیں ڈالتے۔ ان کی ایک اور خوبصورت نظم "طحوں کے چراغ" اشتراکی حوالے سے بالکل خالی ہے اس لیے کہ وہاں بھی نظم کا بنیادی موضوع اس کا تقاضا نہیں کرتا"۔

2. "اس نظم کا جو سب سے توجہ انگیز پہلو ہے وہ ہے اس کا مخصوص شعری طریق کار۔ یہ ایک خاص طرح کا بدیعیاتی معنی Rhetorical طریق کار ہے جو Empathy کے اصول پر قائم ہے۔ Empathy سے مراد ہے کسی غیر وجود میں خود کو تحلیل کر کے اس کی صفات اپنے اوپر وارد کر لینا ہمارے ہاں اس کی بہترین مثال منصور حلاج کا قول "انا الحق" ہے۔ یہ منصور

کے لیے حال تھا مگر اس کی ایک لسانی سطح بھی ہے۔یعنی یہ ایک انداز گفتار بھی ہے۔اسے Rhetoric of Empathy کا نام دیا جاسکتا ہے۔اس کی دوسری مثال مادام بواری کے بارے میں فلوبیر کا وہ مشہور فقرہ بھی ہے کہ مادام بواری میں خود ہوں۔یہ مثالیں جملوں تک محدود تھیں۔مگر امریکی شاعر وہٹ مین نے اسے شعری طریق کار کے طور پر استعمال کیا ہے۔مثلاً اس کی مشہور فلم Song of Myself کا یہ مصرعہ I was the man, I suffered, i was there یہ بہت دلکش انداز بیان ہے۔اردو میں سردار جعفری نے اس طرز کو اپنایا ہے۔غالب امکان ہے کہ یہ طریق کار انہوں نے وہٹ مین سے سیکھا ہو اس لیے کہ ایام اسیری میں اس امریکی شاعر کی نظمیں ان کے زیر مطالعہ رہیں.....اس شعری طریق کو سردار نے متعدد بار استعمال کیا ہے۔جو فن کار خود کو اجتماع سے یا فطرت کے مظاہر سے identify کرے گا۔اس کے لیے یہ طریق کار معاون ثابت ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ جدید حسیت کی ترجمانی کرنے والے شاعروں کے ہاں یہ طرز مقبول نہیں ہوسکتا لیکن اجتماعیت اور تقلید پر اصرار کرنے والے شعرا کے لیے یہ ایک کارآمد انداز بیان ہے''۔ اس نظم کا اختتام یاسیت اور رجائیت سے پرے کسی اور عالم کی چیز ہے۔ یہ لمحہ عرفان کا ثمرہ ہے۔''میں مر کے امر ہوجاتا ہوں'' جیسا سچا کھرا Paradoxical end سردار کو کسی اور نظم میں نصیب نہ ہوا''۔309

نظم برہنہ فقیر (مشمولہ لہو پکارتا ہے) کے بارے میں عمر رضا رقمطراز ہیں:

''برہنہ فقیر''میں سردار جعفری نے عدم کو''برہنہ فقیر'' سے تعبیر کیا ہے۔انسانی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور پیچ و خم کو پیش کرنے کی سعی کی ہے جہاں پر شخص کی زندگی مختلف خطرات متعدد قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے گھری ہوئی ہے۔کوئی اشک سے تو کوئی آہ سے،کوئی خون سے تو کوئی گناہ سے،غرض ہر شخص کی زندگی مختلف پیچیدگیوں سے دوچار ہے''۔ 310

پروفیسر زاہدہ زیدی رقمطراز ہیں:

''برہنہ فقیر میں سردار جعفری نے وجود و عدم کے تصورات کو علامتی انداز سے پیش کیا ہے۔یہاں عدم ایک برہنہ فقیر ہے اور وجود اس کا عارضی لباس۔سورج،چاند،ہوائیں اور دشائیں سبھی اسے لباس فراہم کرتے ہیں لیکن ؎

قبائے ظلمت و نور میں
کچھ چھپ سکا نہ وہ ہے بدن

اور انسانی زندگی جس کے ہزاروں رنگ ہیں اسے ہر روز ایک نیا پیراہن پہناتی ہے اور یہی''وجود حکمت سادہ ہے''۔ یہاں سردار جعفری کا وجود و عدم کا تصور خاصا پیچیدہ ہے اور میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں وہ کسی خاص فلسفہ حیات سے متاثر ہوئے ہیں یا یہ مخصوص تصورات اور شعری پیکران کی ذاتی فکر کا نتیجہ ہیں''۔ 311

سردار جعفری نے رام لعل صاحب کو 1984ء میں خدا بخش نیشنل اورینٹل لائبریری پٹنہ میں انٹرویو دیتے ہوئے اپنی نظم برہنہ فقیر کے بارے میں بتایا:

''آبلہ پا میں ریگستان عدم کی علامت ہے اور انساں وجود کی.....اور یہ (برہنہ فقیر) دوسری نظم ہے۔اس میں میں نے عدم کو''برہنہ فقیر'' کہا ہے۔نظم کا عنوان ہی ہے''برہنہ فقیر'' یہ میرے آخری مجموعہ میں ہے جو چھپا ہے''لہو پکارتا ہے''۔

یہاں سے شروع ہوتی ہے نظم۔ بالکل فلسفیانہ نظم ہے۔ میں اسے Cosmic Poems میں شمار کرتا ہوں ۔اپنی Cosmic Conciousness کی نظم ہے۔ 312

مری زندگی تری زندگی/یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے/رہے کشیدہ اس پر ہزار گل/کوئی اشک سے کوئی آہ سے/کوئی خوف اور گناہ سے/کوئی ایک تبسم زیر لب/کوئی عرف نیم نگاہ سے/کوئی کم یہاں نہ زیادہ ہے/مری زندگی تری زندگی/یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے/ عدم ایک برہنہ فقیر ہے/کہ لباس جس کا دشائیں ہیں/کبھی چاند کو وہ پہنتا ہے/کبھی ڈھانکتا ہے بدن کو وہ/نئے آفتاب کے نور سے/یونہی گھومتا ہے برہنہ تن/کہ لباس ذوالقباء میں/کبھی چھپ سکا نہ وہ بے بدن/مری زندگی تری زندگی/اسے دیتی ہے کیا پیرہن/یہ وجود حکمت سادہ ہے/جو ہر ہنگی عدم کو روز/نیا لباس پہناتا ہے۔

نظم سیلاب چین میں سردار جعفری نے چین وسکون، امن وامان کو مختلف اشیاء سے تشبیہ دیتے ہوئے بتایا ہے ؎

''چین کیا چیز ہے بے قراری سے پوچھو/چین کیا چیز ہے غم کے ماروں سے پوچھو/چین بھوکوں کی روٹی ہے/ننگوں کا کپڑا ہے/بے گھر کا گھر ہے/چین مفلس کے زخموں کا مرہم/امیروں کا زخم جگر/چین لاکھوں کروڑوں غلامی کی آزادی/اور قیدیوں کی رہائی کا اعلان/چین سرمایہ داری کی جلتی ہوئی دھوپ میں/اک گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے/چین چرچل پٹیل اور نہرو ٹرومین اور مارشل کے لیے/چیانک اور چیانگ کی طرح کے ڈاکوؤں کی سیہ کاری کے لیے/زہر اور موت کا جام ہے.....

عمر رضا لکھتے ہیں:

1. سردار جعفری چین کو انسانیت کا نام دیتے ہیں لیکن جب ماضی کو یاد کرتے ہیں تو انہیں بے حد افسوس ہوتا ہے کہ یہی چین کبھی ایک لاش تھی جس پر انگریز، امریکی اور دوسرے سامراجی طاقتیں گدھوں کی طرح سالہا سال منڈلاتے رہے۔ البتہ اب حالات بدل گئے ہیں اور چین کا سیلاب ہر جگہ امڈتا نظر آرہا ہے، ہر طرف خوش حالی، امن وامان اور سکون کا دور دورہ ہے۔

؎ کل تلک چین ایک شمع بے نور تھا/نغمہ بے صدا تھا/ایک بے رنگ تصویر، اک بے اثر بددعا تھا/اور اب چین اک کارخانہ ہے/جس میں/بجلیاں بن رہی ہیں/اور بم ڈھل رہے ہیں/جس کے کھیتوں میں دل اگ رہے ہیں/جس کی شاخوں میں گیہوں کے خوشے لگے ہیں/دھان کی بالیاں پھل رہی ہیں .....

2. ''سردار جعفری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ چین کی جو دیوار قائم ہوئی ہے اسے کسی کی ہمت نہیں ہے کہ مسمار کردے اور پیچھے ہٹادے بلکہ ان کو اس بات پر کامل یقین ہے کہ یہ دیوار بڑھتی ہی جائے گی اور پوری دنیا پر چھا جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سردار مذکورہ افواج کو آگے بڑھنے اور کامیابی کے منازل طے کرنے کی بات کہتے ہیں اور یہ حوصلہ دیتے ہیں کہ ''اور آگے بڑھو اور آگے بڑھو/وار پر وار کرتے چلو/دشت وکہسار کو اپنے دامن میں بھرتے چلو/موت اور خون کو فتح کرتے چلو۔

''سب تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے لیے لڑ رہے ہیں ؎

دور تم سے بہت دور بنگال کے ایک گمنام سے گاؤں میں/ایک ماں ہے/اس کے آنچل میں اک لال ہے/جو ہمک کر تمہیں دیکھتا ہے/اور پیرس کے باغات کے ایک حسین کنج میں/دو دھڑکتے ہوئے دل تمہاری/فتح کے منتظر ہیں/اور افریقہ کے جنگلوں کی گھنی چھاؤں میں/اک حبشی حسینہ/اپنے محبوب کی یاد میں گارہی ہے/اور اسپین میں/ایک دہتاں زیتوں کے باغ میں

سورہا ہے/اور جوہو پہ نیلے سمندر کی موجیں/اپنے چاندی کے پانی سے ساحل کا منہ دھورہی ہے/ساتھیو! آج یہ سب تمہارے طرفدار ہیں/سب تمہارے مددگار ہیں/سب تمہارے لیے لڑ رہے ہیں/اور میں گارہا ہوں/اور مرے ساتھ پبلو نرودا چلی کا جواں سال شاعر/.....پیرس کا آتش نفس آراگوں ہے/سوویت یونین کا جوالامکھی مایا کاؤسکی ہے/لورکا والٹ وہٹ مین/گورکی اور یشکن/دانتے اور ہومر/سب ہم آواز ہیں۔

3. 1945 میں دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔اس کے بعد پوری دنیا کا سیاسی منظر نامہ، رفتہ رفتہ تبدیل ہورہا تھا۔برطانیہ کی عظیم الشان سلطنت اب اپنی حیثیت کھو چکی تھی۔سوویت روس سب سے طاقت ور ملک کے طور پر ابھر چکا تھا اور امریکہ دوسرے سب سے بڑے طاقتور ملک کے طور پر۔جنگ عظیم چوں کہ آزادی اور جمہوریت کے نام پر لڑی گئی تھی اور فاشست قوتوں کو شکست بھی ہوئی تھی اس لیے مشرقی یورپ کے بہت سے ملک سوشلسٹ بن گئے تھے اور تمام سامراجی ممالک کی بین الاقوامی حیثیت کمزور ہوگئی تھی۔ایشیا اور افریقہ میں ہر طرف آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوگئی تھی اور دھیرے دھیرے ملک آزاد ہورہے تھے۔غرض ہر طرف ایک چین وسکون کا ماحول نظر آرہا تھا۔اس سے متاثر ہوکر سردار جعفری نے نظم ''سیلاب چین'' تحریر کی۔مکالماتی انداز کی اس آزاد نظم میں سردار جعفری نے روس اور مشرقی یورپ میں چین وسکون کے امنڈتے سیلاب کی اگرچہ بڑی جاندار تصویر پیش کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں اس کی عدم موجودگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے سرخ انقلابیوں کو اسے حاصل کرنے کے لیے برسر پیکار ہونے کی بھی دعوت دی ہے.....اس نظم میں اشتراکی نظریے اور کمیونسٹ پارٹی کی زبردست تبلیغ کی گئی ہے۔ 313

غلامی کے زمانے میں ہندوستانیوں کے آپس میں دست وگریباں اور افتراق دیکھ کر علی سردار جعفری رنجیدہ تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی: ؎

کدورت ہے سینوں میں اور افتراق/نگاہوں میں نفرت دلوں میں نفاق/چلاتا ہے خود بھائی بھائی پر تیر/غلامی نے بدلا ہمارا ضمیر/بس آپس میں دست وگریباں ہیں ہم/خود اپنے ہی ہاتھوں پریشاں ہیں ہم

(نئی دنیا کو سلام اور جمہور از سردار جعفری صفحہ 191)

نظم ''تم بھی آؤ'' (مشمولہ پیرہن شرر)

15 جولائی 1965 کو لکھی گئی۔نظم ''تم بھی آؤ'' (مشمولہ پیرہن شرر) میں سردار جعفری نے منزل کے حصول کے لیے اتحاد اور اجتماعیت کی اہمیت اجاگر کی ہے۔انہوں نے استعاراتی انداز اختیار کیا ہے ؎

تمہارا ہیں کٹ نہ سکیں گی/تنہا منزل مل نہ سکے گی/پاؤں کے چھالے/دشت کے دل میں/پھول کی صورت کھل نہ سکیں گے/خون کی بارش رک نہ سکے گی/سناٹوں کے ہاتھ کے پتھر/ختم نہ ہوں گے/میں تنہا ہوں، تم بھی تنہا/تنہا تنہا مر جائیں گے/میں آتا ہوں/تم بھی آؤ۔

سرور الہدیٰ لکھتے ہیں:

''سردار کے خواب زندگی کی جن اعلیٰ قدروں سے وابستہ تھے وہ ہمارے ہی خواب تھے مگر ہم لوگوں نے انہیں صرف

سردار کا خواب سمجھ لیا مگر یہ کیا کم ہے کہ سردار نے جیتے جی اپنی آنکھوں کو بے خواب نہیں ہونے دیا۔اس زمین پر جب کبھی جہاں کہیں محبت، خلوص، امن، مساوات اور انسان دوستی کی فضاء قائم ہوگی علی سردار جعفری بہت یاد آئیں گے"۔ 314

سردار جعفری نے 1955ء میں ایک چھوٹی سی نظم "محفل یاراں" (مشمولہ ایک خواب اور) لکھی جس میں امن کے ادیبوں کو ہمیشہ یوں ہی اپنا سفر جاری رکھنے کی تمنا اور آرزو کی ہے۔

برگ گل ہیں کفِ پائے نگاراں ساقی رہیں حنائی قدم بادِ بہاراں ساقی رلے کے آئی ہے صبا تہنیت جشن وصال رہے
جواں نکہت فردوس کناراں ساقی رماہ روہوں افق ساغر و مینا سے طلوع رجگمگاتی رہے یہ محفل یاراں ساقی

انسان کی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے محمد ایوب واقف نے لکھا ہے:

"انسان اس کائنات کی سب سے خوبصورت اور اہم تخلیق ہے۔انسان کو تخلیق کر کے خدا نے اپنی سوچ کا سارا زور صرف کر دیا۔انسان زمین پر خدا کا نائب بھی ہے انسان کی یہ خصوصیت خدا نے اپنی ہزار ہا مخلوقات میں کسی اور کو نہیں دی۔یہ انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ 315

شارب ردولوی نے بجا طور پر سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور انسان دوستی قرار دیا ہے۔انہوں نے سردار جعفری کی شاعری میں انسان دوستی کا جائزہ اپنے ایک مضمون میں لیا ہے۔

اس کے چند اقتباسات پیش ہیں:

1. سردار کی میر اور کبیر پسندی کے پس پردہ بھی وہی انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے جو ان کی شاعری کا جزو لازم ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں انسان کا تصور بالعموم ایک مجبور اور بے بس انسان کا تصور ہے۔جسے کوئی اختیار نہیں ہے اور جو مجبور محض ہے، وہ صرف زندگی کا بوجھ اٹھا کر چلنے والا ایک بے بس انسان ہے۔لیکن ترقی پسند فکر نے اس نئے انسان کا تصور دیا جو مجبور ہونے کے ساتھ باغی بھی ہے اور اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کو زیادہ خوبصورت زیادہ دلکش اور زیادہ حسین بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔یہی انسان سردار کی فکر کا محور ہے"۔

2. "سردار جعفری کے پہلے مجموعہ کلام "پرواز" سے لے کر "نومبر میرا گہوارہ" تک نصف صدی سے زائد کے شعری سفر میں ایک ہی جذبہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ انسان، اس کے کرب اور اس کے مسائل سے ہمدردی اور جذبہ ٔ انسانیت ہے.....سردار جعفری نے تسلسل کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔اس نے اسے ان کے کلام کا بنیادی محور بنا دیا ہے۔وہ اپنی ابتدائی شاعری میں ایک باغی نوجوان نظر آتے ہیں جو عہد پارینہ کی داستانوں سے بھی بغاوت کرتا ہے اور عظمت رفتہ پر رونے والوں سے بھی، جو حکومت سے بھی بغاوت کرتا ہے اور "سامراجی نظم و قانون و سیاست" سے بھی، جو دکھ درد کو برداشت کرنے والے جذبے سے بھی بغاوت کرتا ہے لیکن صرف ایک انسان ہے جس سے بغاوت نہیں کرتا .....دراصل انسان کی یہ بغاوت بھی ان کی انسانیت اور انسانوں سے محبت کی علامت ہے۔اس لیے کہ جن باتوں سے وہ بغاوت کرتے ہیں انہوں نے ہی انسان کو مجبور و معذور بنا رکھا ہے اور اس سے ایک باعزت زندگی گزارنے کا حق چھین لیا ہے۔یہ بغاوت بھی برائے بغاوت یا صرف ایک نعرہ نہیں بلکہ انسان کے دکھ درد سے ہمدردی کا جذبہ ہے"۔

3. ''ان کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' بھی بنیادی طور پر انسان کے فکر و عمل کی آزادی اور انسانیت کی بلند مثالی کو پیش کرتی ہے.....سردار انسانیت پر زبردست یقین رکھنے والے شاعر ہیں، وہ کبھی کسی عالم میں مایوسی یا ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے ۔

ہم ہیں معمار انسانیت کے/اپنے آباواجداد معمار تھے.....کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر زندگی مسکراتی رہے گی.....ان کا یقین ہے کہ زندگی اور انسانیت کل بھی رنگ و نور کی دلکشی کی طرح یوں ہی باقی رہے گی اور اگر اس میں کوئی فرق آئے گا تو یہ آئے گا کہ آج جو غریبی کی ذلت، مصیبت، جہالت، عداوت کی زنجیریں انسان کو جکڑے ہوئے ہیں وہ ٹوٹ جائیں گی اور زندگی کی مغموم آنکھوں میں خوشیوں کی روشنی چمکنے لگے گی''۔

4۔''سردار موت کی حقیقت سے انکار نہیں کرتے لیکن تسلسل زندگی کا تصور دے کر اور بار بار اس کا ذکر کر کے وہ ذہنوں پر حاوی تصور مرگ اور خوف مرگ کو پسپا کرنا چاہتے ہیں۔اس طرح وہ ایک نئے انداز میں زندگی کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں''۔

موت جب آکے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

زندگی کے لامتناہی سلسلہ کو یہ استعاراتی زبان اور یہ تشبیہیں سردار ہی دے سکتے تھے۔

میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں

5. ''سردار کے لیے سب سے عظیم چیزیں انسان اور انسانیت ہیں۔وہ اسی کے نغمہ خواں ہیں اور اسی کی زندگی کی بات کرتے ہیں جو محرومیوں کا شکار ایک عام انسان ہے۔وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی اس وقت تک حسین کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک عام انسان کو مظلومی اور جبر سے چھٹکارا نہیں ملتا۔''امن کا ستارہ''میں وہ اسی انسان کو اپنا ''آدرش''اور دین و ایمان بناتے ہیں۔ان کی وہ نظمیں جن میں براہ راست اس موضوع کا ذکر نہیں ہے ان میں بھی استعارات اور علامتیں اسی انسانیت، محبت، صلح جوئی کی خواہش کی طرف اشارہ ہیں اور اسی کے لیے وہ اس ''صبح فردا'' کے منتظر ہیں جو صرف محبت کا پیغام سنائے اور جو بارود کی بو کے بجائے پھولوں کی خوشبو بکھیر دے..... یہ سرحد صرف گلشن لاہور و دلی کی سرحد نہیں بلکہ اس میں ہر اس سرحد کا درد پوشیدہ ہے جس پر ہر روز نوجوانوں کے تازہ خون سے رنگ بھرا جاتا ہے اور یہ نظم انسان دوستی اور محبت کی وہ آرزو ہے جو سرحدوں کو پھول کی خوشبو اور رنگوں کی بہاروں سے بھر دے اور اس کو کج اداؤں، کج کلاہوں، منچلوں، دلبروں اور عاشقوں کی سرحد بنا دے۔انسانیت کا یہ نغمہ خواں سرحدوں پر کب سے اس صبح کا انتظار کر رہا ہے۔

6. ''سردار جعفری کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب و آلام کا شکار رہنا ہے جس کا سبب سماجی اور معاشی نابرابری، ناانصافی اور ہوس ہے۔انسان کا انسان پر یہ جبر صرف کسی نظام حکومت کی بات نہیں ہے اور نہ اس کے بدل جانے سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انسان کی تقدیر بدل جائے گی۔کسی نظام کی تبدیلی سے کچھ نا انصافیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے، اس کی زندگی نہیں بدل

سکتی۔ ہمارے سامنے ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کی پچاس سالہ تاریخ ہے۔اس عرصہ میں مجبوروں کے لیے استعمال ہونے والی بعض اصطلاحات ضرور بدل گئیں لیکن ان کی حالت نہیں بدلی۔آج سردی ہو یا گرمی فٹ پاتھ پر سونے والوں کی تعداد پہلے سے کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔آج رنگ و نسل اور ذات پات کے جھگڑوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے۔آج ظلم کے حربے اور زیادہ سخت ہوگئے ہیں۔سردار انسان کی اس بے بسی کے خلاف آواز کا نام ہے جو انسان کی افسردہ شاموں کو خوشگوار بنادینے والے کو اپنا دل نذر کرنے کو تیار ہے۔

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو صبح تبسم عطا کرے/ پیاس کے پیلے برگ خزاں کو فصل گل کی مئے میں ڈبودے/کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے/آنسو کے قطرے چن لے/جو دھرتی کی بھوک مٹائے/اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں سے بھردے/انسان کی تخلیق کرے/کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر/میرے خوابوں کا یہ عکس ملے"۔

(چھوٹا سا دل لہو پکارتا ہے)

7. ''زندگی اور انسان سے یہی محبت سردار کی شاعری میں دلنوازی کی نہ جانے کتنی شکلوں میں دکھائی دیتی ہے۔''اودھ کی خاک حسیں''میں یہی محبت کہیں سیاہ چکی سے سفید آٹے کے لاگ بن کر نکلتی ہے اور کہیں سنہری چولہوں میں آگ کے پھول کھلنے میں نظر آتی ہے.....زندگی سے ایسی والہانہ محبت اور اس کے رنگوں کی ایسی تصویر کشی، ایسی زندہ متحرک اور دلکش امیجری اردو شاعری میں کمیاب نہیں نایاب ہے۔سردار جعفری کو اپنے موضوع کے اظہار پر جو قدرت اور اظہار کی جمالیات پر جو گرفت ہے وہ ان کی نظموں کو ایک نازک اور لطیف احساس میں تبدیلی کردیتی ہے"۔ 316

پروفیسر شارب ردولوی نے سردار جعفری کی انسان دوستی کے بارے میں لکھا ہے۔

''سردار جعفری ایک انسان دوست تحریک کے علمبردار ہیں اور ساری زندگی اپنی تحریروں اور اپنی شاعری کے ذریعہ اسی انسان دوستی کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ان کے لیے انسان دوستی ہر طرح کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔وہ زبان کی قید و بند کو توڑ کر موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔وہ عطار، رومی، حافظ اور کبیر، میرا، میر، غالب اور اقبال کے فرق اور لسانی امتیازات کو نہیں جانتی۔وہ نسلوں اور رنگوں کے فرق سے بھی نہیں واقف ہے۔وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے اور مشترک اقدار کے درمیان پل بناتی چلی جاتی ہے۔317

سرور الہدیٰ لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کی شاعری میں انسان دوستی اور محبت کے مضامین بکھرے پڑے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک شاعر اپنے تخلیقی سفر میں اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ امن دوستی خلوص و رواداری جیسی زندگی کی بنیادی قدروں سے اس کی شاعری دور نہ ہو۔اردو شاعری میں اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے"۔ 318

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

''آج سردار جعفری کی آواز صوفیانہ انسان دوستی سے زیادہ قریب ہے۔انسان دوستی پر تو ان کا عقیدہ مارکسزم کی بین الاقوامیت اور پھر اسی کے زیر اثر امن عالم کی تحریک کے ذریعے مضبوط ہوا تھا۔پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خصوصاً کمیونزم

سے نظریاتی بکھراؤ کے بعد ان کے پاس تصوف کا لہجہ نمایاں ہونے لگا"۔ 319

نظم "جامِ محبت" (مشمولہ ایک خواب اور) کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں۔

"جامِ محبت" میں پیار اور محبت کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ قابلِ ذکر اور دلچسپ ہے۔ نظم پیار و محبت سے اس قدر سرشار ہے کہ محبت سے محبت ہو جاتی ہے اور تمام کدورتوں کو دور کر کے ایک ایسی دنیا آباد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے جہاں ہر طرف محبت کے گیت گائے جائیں۔ (عمر رضا، علی سردار جعفری) صفحہ 409

بزمِ احباب ہے پیمانہ بگلرنگ اٹھائیں/شکوۂ جور و جفا غرقِ مئے ناب کریں/بادۂ سرخ کے خورشیدِ درخشاں کو جگائیں/آج ہر ساغرِ بلور کو مہتاب کریں/ایک ہی گھونٹ میں چہروں کے کنول کھل جائیں/رات کے سیل سیہ رنگ کو شاداب کریں/پیاس کے دشتِ جگرتاب میں دل جلتا ہے/دوستو آؤ علاجِ دلِ بیتاب کریں/لطف تو جب ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل جڑ جائیں/آج اس طرح سے کچھ خاطرِ احباب کریں/چند جام اور ابھی روح کے تر ہونے تک/چند جام اور شبِ غم کی سحر ہونے تک

عمر رضا نے لکھا ہے:

نظم "شعور" کے ذریعہ انسانی شعور کو گویائی عطا کر کے سردار جعفری نے اس کی مختلف خصوصیات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پس پردہ سردار کا مزاج، ذہن اور ان کا اپنا نقطۂ نظر کارفرما ہے جس کے مطابق انسانی افتخار اور بلندی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ 320

ہے کائنات مرے دل کی دھڑکنوں میں اسیر/میں ایک ذرہ بساطِ نظامِ شمسی پر/میں ایک نقطہ کائنات وہم و شعور میں/ایک قطرہ انا البحر ہے صدا میری/میں کائنات میں تنہا ہوں آفتاب کی طرح/مرے لہو میں رواں وید بھی ہیں قرآں بھی/شجر حجر بھی ہیں صحرا بھی ہیں عصرِ انسانی/قدم قدم پہ جہنم قدم قدم پہ بہشت۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے سردار جعفری کی انسان دوستی کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

"انہوں نے (سردار جعفری) ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ حب الوطنی ان کا شعار ہے لیکن یہ وطن دوستی ان کی عالمی اخوت کی راہ میں حائل نہیں بلکہ اس کو تقویت پہنچاتی ہے۔ وہ صرف ہندوستانیوں کی بہبود کے خواہاں نہیں مجموعی طور پر کل انسانیت کے مسرت بخش مستقبل کے متلاشی ہیں خواہ رنگ، نسل، مذہب، زبان اور علاقے کے امتیازات کیسے ہی کیوں نہ ہوں"۔ 321

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی:

"سردار نے ساری عمر اپنے قلم سے امنِ عالم اور انسانیت کی آفاقی اقدار کے لیے مخالفین سے جنگ کی ہے۔ (یہاں پر جنگ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا گیا ہے۔ پھر اگر اس صورتِ حال کے سبب ہم ان کے لہجہ کی خطابت بھی نہ برداشت کر سکیں تو قصور کس کا ہے؟) 322

ڈاکٹر سلطان احمد:

"ان کی (سردار جعفری) شاعری محبت، زندگی کی اعلیٰ قدروں، مستقبل اور کامیابی پر یقین کی شاعری ہے۔ وہ اپنی ادبی

زندگی کے آغاز سے آخرعمر تک الفاظ کے ذریعہ انسان دوستی، روشن خیالی، امن ومحبت، رواداری اور زندگی کے خوبصورت تصور کی مصوری کرتے رہے۔ وہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کے علمبردار تھے"۔ 323

محمد ایوب واقف نے سردار جعفری کے مشن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"شاعری کا یہ کس بل سردار جعفری کو آسانی سے حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس کس بل کو پانے میں ان کے فطری ادراک نے جو کردار ادا کیا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن دیش بدیش کے علوم وفنون کے ذخائر کے گہرے اور گمبھیر مطالعہ نے انہیں فکر ونظر کو جو وسعت اور آگہی عطاء کی کہ اس کی مثال ان کے معاصرین میں کسی اور کے ہاں کم ملتی ہے۔ مطالعہ کی اس بے پناہ وسعت اور غور وفکر کے محیطی Circumferential عوامل نے ان کے ذہن کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نسلی اور فرقہ وارانہ امتیاز اور کشمکش سے اپنے آپ کو آزاد رکھا اور انسانیت، عالمی اخوت اور مساوات کے لیے لڑنے والے بین الاقوامی سطح کے شاعروں اور ادیبوں کی صف میں شامل ہو کر خدمت انسانیت کے لیے لکھنا اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ 342

کوثر مظہری:

"اخوت، مساوات اور انسانیت ایسے عوامل ہیں جو سردار کو اسلامی تعلیمات کے قریب کر دیتے ہیں۔ مسلم معاشرے کی تہذیبی شناخت انہی عوامل سے قائم ہے..... سردار جعفری انسان اور انسانیت کی بقاء کو ضروری سمجھتے رہے"۔ 325

پروفیسر عبدالستار دلوی:

"شعر وادب کے سماجی تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان سماجی وعصری ضروریات کے لیے شعر وادب سے بہتر وسیلہ اظہار ملنا مشکل ہے..... معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ (شاعر/ادیب) سماجی تقاضوں کو ضروری محسوس کرتے ہیں..... شاعر کا قلم انعام واکرام کے لیے نہیں لکھتا، وہ اپنی آزادانہ رائے اور آزادیٔ فکر کو ہی اپنے قلم کی آبرو سمجھتا ہے۔ یہی اس کا انعام ہوتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ عصری سیاست کے آگے سپر نہیں ڈالتا، نہ اسے اسیری کی فکر ہوتی ہے اور نہ تونگری کی، اس کے خیال کو بیڑی نہیں پہنائی جاسکتی۔ وہ جب لکھتا ہے اپنی انگلیاں خونِ دل میں ڈبو کر لکھتا ہے، جو درد وہ محسوس کرتا ہے اسے وہ اپنی فگار انگلیوں سے اور خوں چکاں خامہ سے زیبِ قرطاس کرتا ہے"۔ 326

پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون میں کلاسیکی اور ترقی پسند شاعری میں انسان کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری کی انسانی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری کی شاعری کلاسیکی اقدار اور ترقی پسند فکر کے خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کی ادبی وشعری فکر کے بارے میں کوئی فیصلہ ان زاویوں کو نگاہ میں رکھے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ ہماری کلاسیکی روایت میں ایک بڑی روایت تصوف کی روایت رہی ہے جس کا بنیادی محور وہ مثلث ہے جس میں ایک زاویہ خالق کائنات، دوسرا کائنات اور تیسرا زاویہ انسان ہے۔ فارسی کی وہ شاعری جو ہم نے ادبی اور تہذیبی روایت کے طور پر پائی اس میں بھی اس مثلث کی بڑی اہمیت ہے جس نے انسان دوستی، محبت اور مساوات کو عقائد اور مذہبی روایات نے زیادہ اہمیت دی اور انسان سے محبت اور اس

کے جذبات کے احترام کو ہی بہترین عبادت قرار دیا.....ہماری کلاسیکی شاعری میں انسان کا تصور بالعموم ایک مجبور اور بے بس انسان کا تصور ہے جسے کوئی اختیار نہیں ہے اور جو مجبور محض ہے۔وہ صرف زندگی کا بوجھ اٹھا کر چلنے والا ایک بے بس انسان ہے لیکن ترقی پسند فکر نے اس نئے انسان کا تصور دیا جو مجبور ہونے کے ساتھ باغی بھی ہے اور اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے، جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کو زیادہ خوبصورت زیادہ دلکش اور زیادہ حسین بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔یہی انسان سردار کی فکر کا مرکز و محور ہے۔آج انسان علم کے نئے نئے دروازے وا کرتا جا رہا ہے اور رازہائے تخلیق سے ہر روز نئے پردے اٹھاتا جا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی جو خدا کے قائل نہیں ہیں خالق کائنات کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور ساتھ ہی انسان کی ہنرمندی کا پرچم بلند کر رہا ہے۔سردار انسان کی اسی عظمت کے نغمہ خواں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ''اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیوں کہ نا تمامی فطرت کا اٹل قانون ہے لیکن اس منزل کا تصور، شوق کو مہمیز کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا''۔سردار کے تصور انسان کو ان کے اس اقتباس سے بڑی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔وہ تکمیل کائنات کے قائل نہیں۔اس لیے کہ تکمیل ارتقاء کی دشمن اور اختتام کی علامت ہے اور کائنات ارتقاء کا نام ہے۔'' 327

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کے ہاں انسان کی عظمت کو اجاگر کیا ہے:

1. ''تاریخ عالم کا مطالعہ انہیں (سردار جعفری) اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے، اور یہ زمین رہنماؤں اور سورماؤں سے خالی نہیں ہے۔طبقات کی کشمکش وقت کے سینے پر زلزلہ بن کر چلتی ہے۔انقلاب کے جوالا مکھی آتے رہتے ہیں لیکن آدمیت ہر دور میں گرنے کے بعد سنبھل جاتی ہے اور انسان کبھی نہیں مرتا۔یہ سفر یوں ہی جاری رہتا ہے۔اسی لیے انسان اس کائنات میں سب سے عظیم ہے۔دنیا کی تاریخ انسان کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

سردار جعفری کی شاعری میں یہ تاریخی شعور عظمت انسان کا رجز اور قصیدہ بن جاتا ہے: ؎

درخت، پھول، پھل، بہار آدمی کے واسطے/ زمین، کھیت، کوہسار آدمی کے واسطے/ شکوہ و عظمت و وقار آدمی کے واسطے/ یہاں ہر ایک شئے پہ آدمی کا اختیار ہے (امن کا ستارہ/

ڈاکٹر فاطمہ تنویر نے سردار جعفری کی شاعری میں انسان دوستی، انسان مساوات کی نشاندہی کی ہے۔

وہ لکھتی ہیں:

1. ''ترقی پسند تحریک کا جب اردو شاعری میں آغاز ہوا تو انسان دوستی کی لے اور تیز ہوگئی۔اس تحریک کے قلم کاروں نے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند کی۔سماج میں ظلم و جبر کی طاقتوں کو چیالنج کرنے اور جبر و استحصال کرنے والوں کا پردہ فاش کرنے کا مذاق عام ہوگیا.....ان اہل قلم نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ وہ اپنے ادب کے ذریعے بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں.....علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ممتاز شاعر ہیں۔ان کا کلام اس تحریک کے نظریات اور افکار کا بھرپور ترجمان ہے۔وہ اپنی ایک مشہور نظم ''مشرق و مغرب'' میں انسانی وحدت اور آفاق گیر انسانی محبت کے اس پیام کو بہ طریق احسن پیش کرتے ہیں جو اس تحریک کا بنیادی اصول تھا یعنی رنگ و نسل اور ذات و فرقہ کی

حدود سے نکل کر ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے۔اس لیے کہ خواہ ہندوستان میں خواہ یورپ وامریکہ میں ہواس کی فطرت،اس کی جبلت،اس کامذاق اوراس کی خواہشات یکساں ہیں .....وہ اپنی نظم کا آغازان اشعار سے کرتے ہیں:۔

زندگی ایک زمین ایک ہے انسان بھی ایک/فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک/وہی سورج ہے وہی چاند ہے تارے ہیں وہی/نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی/شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک/دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک/باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو ہوا ایک سی ہے/سرد یا گرم بہر حال فضاء ایک سی ہے/دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے/ہند وایراں کی طرح طفل جواں ہوتا ہے/راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں/بچے پھولوں کی طرح گھاس میں کھل جاتے ہیں/حرف حق بھی ہے یہاں اور رسن و دار بھی ہے/لذت شوق بھی ہے جرأت کردار بھی ہے اصلیت نکہت گل کی نہیں گلدانوں میں: مئے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں میں/بوئے گل ایک سی ہے بوئے وفا ایک سی ہے/میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے۔ 328

نظم ''یہ لہو'' کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

10/اگست 1965ء کی تحریر کردہ نظم ''یہ لہو'' میں سردار جعفری نے قتل و غارت گری، خوں ریزی اور دیگر انسانیت پامال عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے اور تمام انسانیت کے خون کو ایک ہی طرح کا خون متصور کر کے ظالموں، سفاکوں اور قاتلوں سے اسے نہ بہانے کے لیے ایک دردمندانہ اپیل کی ہے۔پوری نظم میں انسانیت کی زبردست فضاء قائم ہے جو دلوں میں گرمی پیدا کرتی ہے۔نفرت سے نفرت کا جذبہ بھی بیدار کرتی ہے۔مختلف تشبیہات واستعارات اور تلمیحات نے نظم کو بے حد حسین اور دلکش بنا دیا ہے''۔329

۔ اس لہو کا کیا کرو گے/یہ لہو گرم جیسے بوسۂ لب سرخ جیسے رنگ گل/ننھے بچوں کا تبسم، بوڑھے ہونٹوں کی دعا/نیم وا آنکھوں کا کاجل نرم ہاتھوں کی حنا/بربط مطرب کا نغمہ سازِ شاعر کی نوا/عشق کا عہد وفا/یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں/وید و گیتا کا ترنم، مصحف یزداں کا لحن/یہ کتاب زندگی کا پہلا حرف دل نواز/آرزو کی سب سے پہلی راگنی/روح انجیل مقدس/جان توریت و زبور/خنجروں کی پیاس اس شعلے سے بجھ سکتی نہیں/.....خاک پر ٹپکے گا تو جل جائے گی دھرتی کی کوکھ/آسماں سے قطرۂ رحمت نہ برسے گا کبھی/کوئی دانہ پھر نہ اپجے گا کبھی/.....یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو یہ لہو نظروں کا نور/یہ لہو عارض کی رنگت، یہ لہو دل کا سرور/.....کلمۂ حق کا اجالا یہ تجلی کا ظہور/یہ لہو میرا لہو سب کا لہو/

سردار جعفری نے نظم ''نفرتوں کی سیر'' میں نفرت کے بیج بونے والوں کا ذکر کیا ہے جو نہ صرف یہ کہ بے باکی اور بے رحمی سے نفرت پھیلاتے ہیں بلکہ اس کا بیان بھی فخریہ اور مسکراتے ہوئے انداز میں کرتے ہیں۔ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

بس اپنا جوہر تیغ زباں دکھاتے ہیں
بہائے خون و کفن کر کے مسکراتے ہیں

28/فروری 1971ء کو لکھی گئی نظم ''جشن دلداری'' میں سردار جعفری نے نفرتوں کی آگ بجھانے کے لیے پیار و محبت، امن و عاشقی کے پروانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی ہے۔

ریگزاروں میں جلائیں عشق و مستی کے چراغ/روح کے یخ بستہ کوشوں میں شرر باری کریں/آبنوسی، صندلیں، سیمیں تنوں کے رقص سے/ساری دنیا پر جنوں کی کیفیت طاری کریں/جشن بیزاری منائیں ظلم و نخوت کے خلاف/قریہ قریہ شہر شہر آوارہ رفتاری کریں/لذت شہد و شکر ہو خوش بیانی میں مگر/اہلکارانِ ستم سے تلخ گفتاری کریں .....ساری دنیا جل رہی ہے نفرتوں کی آگ میں/عشق والے آئیں اب دنیا کی سرداری کریں/مشرق و مغرب میں جا کر خون انساں کیوں بہائیں/اس سے بہتر ہے کہ میخوانوں میں میخواری کریں۔

رومان و انقلاب کے امتزاج والی نظمیں

عمر رضا نے ترقی پسند شعرا کے ہاں رومان اور انقلاب کی ہم آہنگی پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''اردو شعر و ادب کا دامن ہر دور میں رومان کے رنگ سے رنگین و پر کیف نظر آتا ہے.....ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے انقلاب کی جو دنیا آباد کی تھی اس کی آرائش و زیبائش انہوں نے جمال رخِ یار ہی سے کی تھی۔فیض احمد فیض، جذبی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز اور سردار جعفری وغیرہ اسی قبیل کے شاعر و ادیب ہیں۔یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے کبھی بھی رومان اور انقلاب کو دو الگ الگ رخ کے طور پر اپنی تخلیقات میں پیش نہیں کیا، بلکہ ان دونوں کو انہوں نے کچھ اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ان کا الگ سے تصور کر پانا مشکل ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں فیض احمد فیض کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔جنہوں نے اپنی شاعری میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں اسرار الحق مجاز کی شاعری اگر چہ پوری کی پوری رومان کی حسین دنیا میں تھرکتی نظر آتی ہے اور وہ حسن و ناز ادا کی پیکر محبوبہ سے جنون کی حد تک اپنی محبت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ''انقلاب'' اور ''خواب سحر'' کے ذریعے حقائق کی جوت بھی جگاتے ہیں۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اگر چہ اپنی تخلیقات میں رومان و انقلاب کا حسین امتزاج پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن اس میں کامیابی کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی۔بیشتر ادیبوں کے یہاں رومان اور انقلاب پر ور تخلیقات علاحدہ علاحدہ پائی جاتی ہیں''۔

330

عمر رضا نے لفظ ''رومان'' اور ''انقلاب'' پر روشنی ڈالی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

1. لفظ رومان اپنے اندر بڑی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے۔اس میں عام طور پر روایت سے انحراف، وفور جذبات، حسن فطرت، حسن پرستی اور خواب آفرینی کا عمل پایا جاتا ہے۔مغرب میں رومانی تحریک اٹھارویں صدی کے آخیر اور انیسویں صدی کے شروع میں کلاسکیت کے خلاف وجود میں آئی تھی۔دراصل یہ ادب کے بندھے ٹکے اصول و ضوابط اور مروجہ ادبی اصول کے خلاف ایک بغاوت کے طور پر ابھری تھی .....

پروفیسر احتشام حسین نے نیاز فتح پوری کے ساتھ اپنی ایک گفتگو کے دوران کہا تھا:

''رومان سے مراد حسن و عشق کا افلاطونی اور تخیلی بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، وفورِ تخیل اور وفورِ جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادی خیال، حسن سے تابمقدور لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اور اس کا کرب، میں ان سب کو رومانیت کہتا ہوں۔ رومان اسے بھی کہتا ہوں جو حقائق کی جستجو مادی اسباب سے زیادہ خیالات و تصورات کی رنگین دنیا آباد کرتا ہے''۔ 331

مغرب کی رومانی تحریک اور اردو کی رومانی تحریک میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ یورپ میں یہ تحریک اس وقت کے بندھے ٹکے سیاسی، سماجی اور ادبی اصولوں کے خلاف ایک بغاوت کے طور پر ابھری تھی جس میں سرکشی اور شکست و ریخت کے عناصر زیادہ تھے، بعد میں ردِ عمل کے طور پر جمالیت پرستی کی تحریک ابھری تھی جب کہ اردو میں رومانی تحریک جلال و جمال دونوں عناصر کو تقریباً سمیٹ کر آگے بڑھی.....''

.....علی سردار جعفری چوں کہ خود بھی اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں رومان پرور اور انقلاب پسند تھے، اس لیے انہوں نے بھی جابجا رومان و انقلاب پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اپنے ایک مکتوب بعنوان ''جوش کی معنونیت'' میں وہ رومانیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''رومانیت کی بہت سی قسمیں ہیں، بہت سے انداز ہیں۔ ایک طرح کی رومانیت وہ ہوتی ہے جس کو موت، گندگی اور دوسری قبیح چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک دوسری طرح کی رومانیت وہ ہوتی ہے جو زندگی کو اور اس کی بالیدگی کو حسن کارانہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور تصور و تخیل کو حسن اور نور عطا کرتی ہے۔ ایک رومانیت حقیقت کے چہرے کا غازہ ہوتی ہے اور دوسری مردے کے کفن میں کافور کی بو، ایک رومانیت حال سے بے زار ہو کر ماضی کی طرف دیکھتی ہے اور دوسری مستقبل کی طرف۔ ماضی پرست رومانیت کے لہجے میں غم کی لہر ہوتی ہے اور مستقبل کی بشارت دینے والی رومانیت میں رجز خوانی کا آہنگ آجاتا ہے''۔ 332

2. ''انقلاب'' کا تصور عموماً طاقت کے استعمال اور خوں ریزی جیسی شدت پسندی اور انتہاپسندی کے طور پر ابھرتا ہے کیوں کہ زیادہ تر حکمراں افراد یا طبقے آسانی سے اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کے پاس چوں کہ طاقت ہوتی ہے اس لیے اس کا غلط استعمال کر کے عوام کا استحصال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں عوام متحد ہو کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کا تختہ پلٹنے کے لیے اس کے خلاف مختلف پرتشدد حربے استعمال کرتے ہیں.....دراصل مذکورہ بالا باتیں جو انقلاب کے تعلق سے کہی گئی ہیں وہ کسی حد تک سیاسی معاملات کے لیے تو درست ہیں لیکن ادب میں اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ خاص طور پر تشدد کی بنیاد پر تبدیلی ادب برداشت نہیں کرتا۔ لیکن یہ نظریہ، ایسے وقت میں جب کہ کسی ملک کی ناکارہ حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے وہاں کے عوام کمربستہ ہو جائیں تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیق کا ذریعہ ضرور بن جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے حوالے سے یوروپ کی بیشتر شاعری میں خون بہانے کا ذکر ہے اور اردو میں بھی دورانِ جنگ آزادی کچھ یہی حال رہا۔ اس کے باوجود ادب ایک نئے توازن کی تلاش کا نام ہے۔ بنیادی طور پر ادیب تعمیر کا حامی ہوتا ہے۔ اس لیے

اس میں تشدد کی دعوت دینا، اسے کمزور، ناپائیدار اور صرف ہنگامی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کا اپنا ایک مقصد ہوتا ہے لیکن اس مقصد کو کسی پر زبردستی اور تشدد کے سہارے تھوپنا درست نہیں .....لہٰذا ادب میں انقلاب کا اصل مفہوم خوں ریزی اور تخریب کاری کے ذریعہ تبدیلی کا نام نہیں بلکہ فرسودہ اور ناکارہ ہو چکے نظام زندگی کا بغیر کسی تشدد کے بدل جانے سے ہے اور اس کی جگہ نئے اور صحت مند نظام کو لانے سے ہے جو نئے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اصل انقلاب محض سیاسی اور معاشی نہیں بلکہ اقدار اور نفسیات کا ہوتا ہے جس کی ضرورت زندگی کے تمام تر شعبوں میں ہر لمحہ پیش آتی ہے اور اسی کی عکاسی ادب کرتا ہے''۔ 333

عمر رضا نے علی سردار جعفری کی شاعری میں رومانیت اور انقلاب کی نشاندہی کی ہے۔

اقتباسات پیش ہیں:

1. رومان سے مراد کلاسکیت اور روایت سے انحراف ہے۔ رومان میں وفور جذبات، حسن فطرت، حسن پرستی اور خواب آفرینی، نئی دنیا کی تلاش، آزادی خیال اور روایت سے بغاوت جیسے عناصر پورے شدومد کے ساتھ پائے جاتے ہیں جب کہ انقلاب سے مراد وہ نظام زندگی جو ناکارہ ہو چکا ہے اسے بدلنے کی کوشش ہے۔ اس عمل میں اگر چہ وقتاً فوقتاً تشدد کا بھی سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن تبدیلی لانے کے لئے تشدد اور تخریب کاری سے حتی الامکان گریز کیا جانا چاہئے۔ گویا عام حالات میں انقلاب سے مراد ناکارہ ہو چکے نظام زندگی کا بغیر کسی تشدد اور تخریب کاری کے بدلنے سے ہے اور اسکی جگہ ایک ایسے نظام کے قیام سے ہے جو بدلے ہوئے حالات سے مثبت مطابقت رکھے۔ اس طرح انقلاب میں تبدیلی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے''۔

2. علی سردار جعفری اپنی ادبی زندگی کے بالخصوص ابتدائی دور میں کافی حد تک رومان پرور اور انقلاب پسند نظر آتے ہیں جو ان کی ابتدائی تخلیقات سے لے کر 1960ء کے آس پاس تک کی تخلیقات پر مشتمل ہے.....علی سردار جعفری کی تخلیقات میں یوں تو رومانی اور انقلابی دونوں پہلو ملتے ہیں لیکن مذکورہ عہد میں انہوں نے انقلابی رویے پر نسبتاً زیادہ زور دیا تھا۔ اس عہد کی بیشتر تخلیقات میں انہوں نے معاشی عدم مساوات اور اس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی سماجی ناانصافیوں کے خلاف علم احتجاج بلند کیا۔ بالخصوص ترقی پسند جھنڈے تلے انہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جدوجہد آزادی میں توانائی بخشنے کے لیے نثر کے ساتھ ساتھ نظم کا بھی سہارا لیا۔ علاوہ ازیں عملی طور پر انگریزوں کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں انہیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی بیشتر تخلیقات انقلابی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے یہاں رومان کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ نیز ان کی ایسی تخلیقات بھی ملتی ہیں جن میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔''

3. ''عام طور پر جن شاعروں اور ادیبوں نے رومانی قسم کی تخلیقات پیش کی ہیں ان میں وہ کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں اگر چہ ان میں ایک حوصلہ افزا انبساط، سعی و عمل اور انقلاب و ترقی کی طرف ذوق انگیز اشارے بھی ملتے ہیں لیکن سردار جعفری کا انقلابی آہنگ رومانی آہنگ پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس عہد کی شاعری میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج نہیں پایا جاتا۔ مثلاً پرواز میں کچھ خالص رومانی نظمیں ہیں تو کچھ خالص انقلابی۔ انگڑائی، لکھنو کی ایک شام، انتظار نہ کر، فراموش کردہ عشق، ایک

خط کا جواب، اکیلا ستارہ، سرراہ، خوشی، حسن ناتمام، جھلک، عورت، محبت کا فسوں، غم کا ستارہ، حسن سوگوار، ایسی نظمیں ہیں جن میں رومانیت کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے"۔ 334

شعری مجموعہ خون کی لکیر میں شامل رومان اور انقلاب کے امتزاج والی نظموں کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے۔

"تمہید" میں آزادی کی خوشی کا اظہار اگرچہ انہوں نے کسی قدر رزم، لیف اور رومانی انداز میں کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انقلابی آہنگ بھی حاوی ہے جس سے قاری لطف وانبساط کی کیفیت کے ساتھ ساتھ جوش وحوصلے کی امنگ سے بھی سرشار ہونے لگا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کریں

زندگانی کی اندھیری رات میں/ درد اور دکھ کی بھری برسات میں/ رلے کے اک ماہ تمام آیا ہوں میں/ میکش آتش بجام آیا ہوں میں/ میرے پیمانے میں گم ہے کائنات/ میرے میخانے میں صہبائے حیات/ میرے آئینے میں عکس صبح نور/ آفتاب عہد آزادی کی ضو ہے/ مری چشم تخیل پر عیاں/ اک نئے میلاد آدم کا سماں/ حلقہ زنجیر گلنے ہی کو ہے/ زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے"۔

نظم "تذبذب" کا انداز بھی رومانی ہے لیکن یہاں نرم لب ولہجے کے ساتھ ساتھ انقلابی آہنگ اور خطیبانہ انداز بھی حاوی ہے۔ نظم میں ضمیر کی کشمکش، ناکامی، کامیابی، اندھیرے اجالے اور نفرت ومحبت کی خوبیوں وخامیوں کی طرف لطیف اشارے ملتے ہیں۔ اخیر میں کامیابی، اجالے اور محبت سے پوری دنیا کی روشن کرنے کے لیے عوام سے خطاب ہے۔ اس نظم میں عوام کو سردار جعفری نے چاند سے تعبیر کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آج تو شوق کے ساحل پہ کھڑی ہے خاموش/ موج کا رقص جنوں پاس بلاتا ہے تجھے/ تھپکیاں دے کے سلا دیتی ہے ساحل کی ہوا/ اور اٹھتا ہوا طوفان جگاتا ہے تجھے/ ڈوبتی شام کے ماتھے کا چمکتا تارا/ زندگانی کا نیا خواب دکھاتا ہے تجھے/ شب کا بڑھتا ہوا پرہول سیہ رنگ فسوں/ اک المناک اندھیرے سے ڈراتا ہے تجھے/.....اے "میرے چاند" محبت کے افق سے ہو طلوع/ جگمگا آج فروغ مہتاباں ہو کر/ نور ہی نور سے اطراف جہاں کو بھر دے/ پھیل جا جلوۂ بیباک وفراواں ہو کر/ پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں/ پھیل جا نکہت گل، رنگ بہاراں ہو کر/ دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دے/ تابش رخ سے اندھیروں میں چراغاں کر دے۔

سید عاشور کاظمی نے سردار جعفری کی رومانی شاعری کی خصوصیات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"سردار جعفری کی رومانی شاعری الف لیلیٰ کی داستان یا گل وبلبل کے افسانے نہیں بلکہ اس میں بھی جیتے جاگتے کردار ملتے ہیں، زندگی کی حقیقتوں سے آشنا.....سردار جعفری کھوکھلے نعروں کے قائل نہیں۔ انہوں نے بھرپور رومانی شاعری بھی کی ہے اس لیے زندگی کا ایک ناقابل تردید پہلو یہ بھی ہے لیکن جہاں زندگی کی تلخیوں پر نظر پڑتی ہے سردار جعفری کا قلم انگارے برساتا ہے"۔ 335

دو نظمیں سرمایہ دار لڑکیاں اور مزدور لڑکیاں سردار جعفری کے شعری مجموعہ خون کی لکیر (1949) میں شامل ہیں۔ ان نظموں پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

''دو نظم ''سرمایہ دار لڑکیاں'' اور ''مزدور لڑکیاں'' میں سردار جعفری نے اشتراکی نظریے کی وکالت کی ہے نیز اس کی خوبیاں گنائی ہیں۔ان دونوں نظموں میں اگر چہ سرمایہ دار اور مزدور کا موازنہ کیا گیا ہے لیکن ان نظموں کو پیش کرتے وقت انہوں نے قدرے نرم لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔البتہ اول الذکر نظم میں طنز کی کاٹ بدرجہ اتم موجود ہے۔دونوں نظموں کو ایک ساتھ پڑھنا زیادہ دلچسپی کا باعث ہے۔لہٰذا دونوں نظموں کے چند حصے ملاحظہ کریں ؎

''سرمایہ دار لڑکیاں'' کے اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ!/نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ/ہے انہیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار/ہیں یہی تہذیب کے آذر کدے کی شاہکار/دیدہ ہی ان کی بہشت کیف وفردوس نشاط/خوش رخ وخوش پیرہن خوش پیکر وخوش اختلاط/.....گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینوں کا ابھار/صندلی ماتھوں سے بت خانوں کی صبحیں آشکار/قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کے لیے/ہر سننے والے کو لبھانے کے لیے/بیقرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی/نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی/.....اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار/ان کا ہر انداز تاجر ہرا داسرمایہ دار/ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں/یہ کنار وبوس کی حد سے گزر سکتی نہیں۔

مزدور لڑکیاں کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

گردش افلاک نے گودی میں پالا ہے انہیں/سخت آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انہیں/گھورتی ہے گرمی میں نگاہ آفتاب/آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب/سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی/سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی/بیکسی ان کی جوانی، مفلسی ان کا شباب/سازان کا سوز حسرت، خامشی ان کا رباب/.....لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ/ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ/اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب/ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب/ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور/توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کے غرور/ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار/یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار/بن کے قوت ایک دن ابھرے گی صدیوں کی تھکن/دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن۔مذکورہ نظموں میں.....جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ بے حد حسین اور لطیف ہے۔کہیں بھی جذباتیت یا انتہا پسندی نہیں جھلکتی بلکہ دونوں کی جن خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے، وہ حقیقت سے بالکل قریب ہے.....اس میں رومان بھی ہے، انقلاب بھی ہے، بغاوت بھی ہے، طنز بھی ہے، لیکن ان تمام چیزوں کو انہوں نے جس متوازن انداز میں پیش کیا ہے وہ بس سردار جعفری کا ہی خاصہ ہے۔'' 336

نظم انتظار نہ کر، عہد حاضر، ایک سوال، ایک خط کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

1. ''1939 کی تخلیق کردہ نظم ''انتظار نہ کر'' میں سردار جعفری اپنے محبوب سے مخاطب ہیں اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر اگر چہ انہوں نے محبوب سے ان کا انتظار نہ کرنے کی بات کہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پردے میں انہوں نے رومانی دنیا چھوڑ کر حقیقی اور زمینی سچائیوں پر توجہ دینے کی طرف اشارہ کیا ہے.....فیض احمد فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کے طرز پر تحریر کردہ اس نظم میں اگر چہ سردار جعفری نے فیض کی تقلید کی ہے لیکن

فیض کے یہاں جو شعریت اور ادبیت ہے وہ ان کے یہاں کم ہے۔چند بند ملاحظہ کریں

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر/مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر/عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا/سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا/میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا/میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر/نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر/عذار زم پہ رنگ بہار رہنے دے/نگاہ شوق میں برق و شرار رہنے دے/لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے/متاع حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر/نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر/شکستہ ساز کے ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم/دھڑکتے دل کے ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم/تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم/اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر/نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر۔

2. ''سردار جعفری نے اس وقت کے ہندوستان کی زبردست تصویر کشی کی ہے جس میں جدوجہد آزادی اپنے شباب پر تھی لیکن رہنماؤں کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا اور ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔سردار جعفری خود بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔اگر چہ عوام میں انگریزوں کے خلاف شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا لیکن رہنماؤں کی عدم موجودگی میں عوام صرف اندر ہی اندر بوکھلا کر رہ جاتے تھے۔اسی صورت حال کو سردار جعفری نے شعری پیکر عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ انداز قدرے سخت ہے،غم و غصہ اور مایوسی بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں امید اور حوصلے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر/تھرتھرا سکتا ہے عارضی پر ٹپک سکتا نہیں/عمر کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو/دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر چھلک سکتا نہیں/تاج انگریزی میں اک ہیرا ہے مثل آفتاب/ہند کے بے نور ماتھے پر چمک سکتا نہیں/چپکے چپکے کھل رہا ہے عہد نو کا سرخ پھول/مسکرا سکتا ہے زیر لب مہک سکتا نہیں/ایک انگارہ چھپا ہے زندگی کی راکھ میں/راکھ کے نیچے سلگتا ہے دہک سکتا نہیں۔

3. نظم ''ایک سوال'' کو اگر آزادی سے ذرا پہلے کے تناظر میں دیکھیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ نظم آزادی کے تعلق سے سوال کرتی ہے کہ کیا وہ دن آئے گا جب امیدوں کا سرسبز چمن لہلہائے گا لیکن اگر آزادی کے بعد کے حالات کے پیش نظر اس نظم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ نظم آزادی کے بعد کے جو دگرگوں حالات تھے اور قومی حکمراں جس طرح کی ظلم و زیادتیاں مزدوروں اور کسانوں پر ڈھا رہے تھے ان کو بھی یہ نظم پیش کرتی ہے۔مذکورہ خیالات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جس سے یہ نظم زماں و مکاں کی قید و بند سے آزاد نظر آتی ہے۔البتہ نظم سے اشتراکی نظریہ ضرور مترشح ہوتا ہے

معلوم نہیں ذہن کی پرواز کی زد میں/سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے/لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا/طوفان گرو کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے/سرمایے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم/مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے/وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی/ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے/پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے/اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے۔

نظم نیا زمانہ،اختلاف رائے،ٹوٹا ہوا ستارہ،وہم و خیال، غالب اور موت اور زندگی ایسی نظمیں ہیں جن میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔اگر چہ کہیں کہیں باغیانہ لہجہ حاوی ہے لیکن بیشتر جگہوں پر نرم،حسین اور پر کیف لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اسلوب کی لطافت اور شعریت بھی پائی جاتی ہے.....مذکورہ نظموں کے علاوہ سال نو، آتشیں

ستارہ، ایک خط، موت، رہائی وغیرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جن میں رومانی انداز حاوی ہے۔مثلاً بارہ اشعار پر مشتمل نظم، سال نو میں 9 اشعار ایسے ہیں جن میں تمنا کا رقص، تخیل کا گنگنانا، ثریا کی جبیں، شہرہ کا عارضی، شفق کا نور اور مسرت کے جواں ملاح نظر آتے ہیں۔البتہ اخیر کے تین اشعار میں دورِ محکومی کا بڑھنا، غلامی کے زمانے میں اضافہ اور اپنی سست گامی، بے پروائی پر افسوس کیا گیا ہے.....ان تمام باتوں کو سردار جعفری نے بڑے نرم اور حسین انداز سے پیش کیا ہے۔کسی طرح کی جذباتیت یا انتہا پسندی نہیں ہے اور نہ ہی اشتراکیت کی تبلیغ کی گئی ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

تصور اک نئے احساس کی جنت میں لے آیا
نگاہوں میں کوئی رنگین چہرہ مسکراتا ہے
جبیں کا عکس پڑتا ہے فلک کے ماہ پاروں پر
ضیا پھیلی ہوئی ہے سارا عالم جگمگاتا ہے

نظم ''آتشیں ستارہ'' کا موضوع اگر چہ انقلابی ہے لیکن اس کا انداز اور لہجہ رومانی ہے۔اس نظم میں اشتراکی نظریے اور کمیونسٹ پارٹی کی تبلیغ استعاروں کے پردوں میں کی گئی ہے۔

دوشیزہ ایک آئی نظر ریگزار میں/کو یا اٹی ہوئی تھی شفق کے غبار میں/نور سحر سے لوحِ جبیں تھی دھلی ہوئی/چہرے کی آب و تاب میں شبنم گھلی ہوئی/پارہ بدن میں برق کی لہریں نگاہ میں/اک ''آتشیں ستارہ'' تھا زلفِ سیاہ میں/پوچھا یہ میں نے آئی ہے تو کس جہاں سے؟/کس طرح پھول توڑ لیا ہے آسماں سے؟/یوں مسکرائی وہ کہ کرن سے بکھر گئی/اک موج نور تھی کہ افق سے گزر گئی/کہنے لگی کہ دختر ہندوستان ہوں میں/خود کارواں نہیں جرس کارواں ہوں میں/سینے میں سرخ آگ دبی ہے شباب کی/شعلے میں روح کے ہے تڑپ انقلاب کی/یہ اتحاد قوم و وطن کا رسول ہے/آزادی، امن اور ترقی کا پھول ہے۔

4. سردار جعفری جس زمانے میں بنارس سنٹرل جیل میں اسیری کے دن گزار رہے تھے، ان کے کسی دوست نے انہیں ایک خاص خط لکھا تھا جس کا جواب انہوں نے نظم ''ایک خط'' کے ذریعے دیا تھا۔جنوری 1942ء کی تخلیق کردہ اس نظم میں انہوں نے اپنی مسرت اور پرامیدی کا اظہار بے حد خوبصورت انداز میں کیا ہے۔نظم اگر چہ مختصر سی ہے لیکن پر تاثیر ہے۔

یہ ترا چھوٹا سا خط تیری محبت کا پیام/کر رہا ہے دل سے سرگوشی نگاہوں سے کلام/اس کی خاموشی میں ہے تیرے تکلم کی نمود/توڑ ڈالا اس نے آ کر قید خانے کا سکوت/آرزوئیں ناچ اٹھی ہیں دلِ بے تاب میں/کتنی قندیلیں ہیں روشن وقت کی محراب میں/جھلملاتے ہیں پرانی زندگی کے ماہ و سال/مسکراتی ہے تمنا رقص کرتا ہے خیال/آج روح شادمانی کس قدر مخمور ہے/آج دل احساس ناکامی سے کوسوں دور ہے۔ 337

سردار جعفری کی نظم ''خود پرستی'' ان کے شعری مجموعے خون کی لکیر 1949 میں شامل ہے۔

عمر رضا نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے:

نظم ''خود پرستی'' میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔اگر چہ پوری نظم آزادی کی خوشی سے شرابور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس خوشی کو حاصل کرنے کے لیے کتنی قربانیاں دی گئی ہیں ان پر انہوں نے آنسو بھی بہائے ہیں۔نرم لب

ولہجہ اور انقلابی آہنگ نے مل کر نظم میں ایک عجیب وغریب ادبی چاشنی پیدا کردی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کریں:

چلمنیں اٹھتی ہیں مشرق کی حریم ناز سے رمنتظر تھیں جس کی آنکھیں جلوہ گر ہونے کو ہے رخون شب سے گل بداماں ہے شفق زار و جو در آسماں پر نور پھیلا سحر ہونے کو ہے رکتنے آنسو بہہ چکے ہیں زندگی کی آنکھ سے رآج ان اشکوں کا ہر قطرہ گہر ہونے کو ہے رگلشن ہندوستاں میں لوٹ آئی ہے بہار رآرزو کی شاخ نازک بارور ہونے کو ہے رکھل گیا در پڑ گیا دیوار زنداں میں شگاف ر اب قفس میں جنبش صد بال و پر ہونے کو ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے نظم "رومان سے انقلاب تک" کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

"خون کی لکیر" کی آخری نظم "رومان سے انقلاب تک" بعض حیثیتوں سے بہت اہم ہے اور خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس سے جہاں ایک طرف جعفری کے ارتقائے ذہن اور ترقی پسند تحریک کی رفتار ترقی کی وضاحت ہوتی ہے وہاں دوسری طرف اس منزل کا بھی پتہ چلتا ہے جہاں آج کا ترقی پسند ادب جا رہا ہے، ادب اور زندگی کا نیا تعلق عوامی جدوجہد میں حصہ لینے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اس نظم کا موضوع ہے ..... جہاں تک فن کار اور عوام کے تعلق کا سوال ہے ترقی پسند ادیبوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ طبقاتی جدوجہد میں اسے کدھر جانا چاہئے اس پر بھی بحث نہیں، بحث صرف اس پر ہے کہ اس تعلق کی نوعیت اور طریق کار کیا ہو؟ فن کاری ترک کر کے میدان جنگ میں چلے جانا اور قلم پھینک کر تلوار اٹھالینا؟ یہ خیال رومانی وفور کا نتیجہ ہو تو فنی اور انقلابی شعور کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ جعفری کے دو مصرعے ہیں

میرے ہاتھ سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جعفری جس ذریعہ سے عوام کی خدمت کر رہے ہیں وہ غیر ضروری ہے؟ کیا صرف بندوق اور تلوار ہی سے عوامی جدوجہد کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے؟ کیا شاعر اور ادیب انسانی شعور میں اضافہ نہیں کرتے؟ کیا ادب خود طبقاتی جنگ میں ایک منزل پر زبردست حربہ نہیں بن جاتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ایک سپاہی کی یہ غلطی ہوگی کہ وہ بندوق پھینک کر قلم اٹھالے اور یہ سمجھے کہ اس کا پہلا حربہ بے اثر تھا، اسی طرح ایک شاعر کا یہ جذبہ بھی درست نہیں کہ وہ قلم پھینک کر تلوار ہاتھ میں لے لے۔ دونوں اپنے اپنے طور پر اس بیداری میں اضافہ اور شعور کے اس افق کی توسیع کر رہے ہیں جس سے لڑائی جیتی جاتی ہے۔ دانشوروں کا عوامی جدوجہد سے الگ رہنا درست نہیں لیکن اپنے طریق کار اور اپنے ذرائع سے ان کا عوام کے شعور کو تیز کرتے رہنا خود ایک بڑا کام ہے ..... جب تک کسی شاعر کی شاعری یہ کام انجام دے رہی ہے اس وقت تک اس کا قلم چھیننا مقصد حیات کے خلاف ہے۔ ہر شخص اپنے کمال اور ہنر کے مطابق ہی سماجی ارتقاء میں مددگار ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جعفری کا یہ مقصد ہو بھی نہیں سکتا کہ وہ خود قلم پھینک دینے پر تیار ہیں یا دوسرے فن کاروں کو اس پر تیار کر رہے ہیں کیوں کہ نظم کی آخری سطروں میں انہوں نے اپنے ساتھی شاعروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے۔

گاؤ مزدور کے ساز پر رگاؤ جمہور کے ساز پر رگاؤ جس طرح میدان میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو رگاؤ جیسے سمندر میں طوفان

کا دیوتا چڑھ رہا ہو/ گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پہ برساؤ/ سارے عالم پہ چھا جاؤ۔

یہاں شاعر کے حربے پھر اس کے گیت اور الفاظ ہی رہ جاتے ہیں۔ تلوار نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نظم میں بندوق جدوجہد کی شدت کی علامت ہے اور کچھ نہیں، اس میں عوامی جدوجہد میں زیادہ جوش کے ساتھ شریک ہونے اور شاعری کو اتنا ہی موثر حربہ بنا لینے کی تلقین ہے جتنا موثر سپاہی کا حربہ ہوتا ہے"۔ 339

اپریل 1950ء میں اپنی اسیری کے ایک سال مکمل ہونے پر سردار جعفری نے نظم ایک سال لکھی۔ اس میں زنداں کی تلخیوں، سختیوں، ناانصافیوں کو پیش کیا اور یہ بتایا کہ زندگی میں مصیبتیں آتی جاتی رہتی ہیں انسان کو ان کا پامردی سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ ان پر جتنی مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے اتنے زیادہ ان کے حوصلے بلند ہوتے۔ انہوں نے شاعروں اور افسانہ نگار قیدیوں کا ذکر کیا جن کی تحریروں سے روح کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ جرأت کا درس دیتا ہے۔ نظم شعری لطافتوں، خوبصورت تشبیہات و استعارات سے مزین ہے ۔

حلقے حلقے میں لیے اپنی اہنسا کا فریب/ اپنے دامن کو بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے/ کینچلی سانپ کی ہر سال بدل جاتی ہے/ عدل و انصاف مداری کے پٹارے جن میں/ ناگ بیٹھے ہیں قوانین کے پھن پھیلائے ...../ پھر بھی قربانی و ایثار کا دل زندہ ہے/ جہد و پیکار کی نبضوں کی دھمک جاری ہے/ ...../ اور وہ شعلہ نفس شاعر و افسانہ نگار/ اپنے نغموں کی حرارت سے گلا دیتے ہیں/ روح کے بوجھ کو افکار کی زنجیروں کو/ ان کا ہر شعر رجز پڑھتا ہے/ ہر سطر کہتی ہے جرأت کی کہانی ہم سے/ ان کے ہر گیت سے دل ہلتا ہے دیواروں کا/ جیسے بڑھتی ہوئی فوجوں کی دھمک/ شعلے آواز کے اس شان سے ہوتے ہیں بلند/ آگ لگ جاتی ہے زندان کے سیہ خانے میں/ اور منزل کی جبیں وقت کی محرابوں میں/ جگمگا اٹھتی ہے رنگین شعاعوں کی طرح/ میرے احساس و تصور کو ہزاروں سورج/ لاکھوں چاند اور کروڑوں تارے/ رنگ اور نور کی بارش میں بھگو دیتے ہیں/ ہم سفر یہ ہوں تو پھر عزم سفر کیا کہنا/ رنگ شب یہ ہو تو پھر رنگ سحر کیا کہنا۔

شعری مجموعہ "پتھر کی دیوار" کی آخری نظم "جہلم کا ترانہ" ہے۔

اس نظم کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

"جہلم کا ترانہ" میں جہد و عمل کا فلسفہ موجزن نظر آتا ہے۔ خاص طور پر اس سے علامہ اقبال کے فلسفہ حرکت و عمل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ نظم کے عنوان ہی سے دریا کی روانی کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ دریا کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے سردار نے اس کا مچلنا، اچھلنا، اٹھلانا، آزادی اور سرکشی کو خوبصورت اور دلکش پیرایے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں رومان بھی ہے، انقلاب بھی ہے اور ساتھ ہی باغیانہ عناصر بھی ہیں، لیکن حسن و دلکشی کی رعنائیاں و سرمستیاں بھی بدرجہ اتم ہیں۔ اس نظم کے درج ذیل دو بند سے مذکورہ خصوصیات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں/ ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں/ وادی میں لہراتا ہوا/ سبزے سے اٹھلاتا ہوا/ سو پیچ و خم کھاتا ہوا/ ہنستا ہوا گاتا ہوا/ ...../ ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں رہتا ہوں میں/ مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں/ فطرت مری وارفتگی/ آزادگی و سرکشی/ طوفاں سے ملتا ہوں گلے/ ساحل سے ٹکراتا ہوا/

ہردم رواں ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں رمانند جوئے زندگی شام وسحر بہتا ہوں میں 340

نظم اناج انقلابی نظم ہے۔اس کا لہجہ نرم اور معتدل ہے۔اناج کی پیداور میں کسان کی محنت اور مختلف مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔چور بازاروں اور ذخیرہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں اناج چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے خود کسان اناج کے دانے دانے کو محتاج ہو جاتا ہے اس کو بڑے دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

میری عاشق ہیں کسانوں کی حسین کنیائیں رکود سے ان کی کوئی چھین کے لایا مجھ کو رہوس زر نے مجھے آگ میں پھونکا ہے کبھی رکبھی بازار میں نیلام چڑھایا مجھ کو رقید رکھا کبھی لوہے میں کبھی پتھر میں رکبھی کوداموں کی قبروں میں دبایا مجھ کو رسی کے بوروں میں مجھے پھینکا ہے تہہ خانوں میں رچور بازار کبھی راس نہ آیا مجھ کو رکیا ہوئے آج میرے ناز اٹھانے والے رہیں کہاں قید غلامی سے چھڑانے والے۔

عمر رضا نے لکھا ہے:

"کشمیر سے متعلق ایک غزل اور دو نظمیں تہنیت اور حسن کشمیر شامل مجموعہ (پتھر کی دیوار) ہیں جہاں اس میں کشمیر کی پر بہار وادیوں اور اس کی خوبصورتی کا ذکر ہے وہیں وہاں کی بے چارگی، مفلسی اور افراتفری پر اظہار افسوس بھی کیا گیا ہے۔ دراصل موضوع کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں رومان کے ساتھ انقلاب اور جلال کے ساتھ جمال کا در آنا ایک فطری امر ہے لیکن سردار جعفری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان دونوں کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے جس سے دونوں شیر وشکر ہوتے نظر آتے ہیں اور قاری نظم کی لطافت، شعریت اور رنگینی سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے مثلاً حسن کشمیر کا منظر ملاحظہ کریں۔ 341

آباد رہے خوابوں کی طرح وادی کشمیر
فانوس ہیں تاروں کے تو پھولوں کے چراغاں
دامن میں پہاڑوں کے لہکتی ہیں بہاریں
پتھر کی ہتھیلی پہ مہکتا ہے گلستاں
سنتور بجائی ہوئی پھرتی ہیں ہوائیں
ہر باغ میں آوارہ و سرمست و غزل خواں
اڑتی ہوئی آتی ہیں پرستانِ افق سے
ملبوس شفق پہنے ہوئے صبح کی پریاں
ہر وادی شاداب ہے محبوبہ گلفام
معشوقہ نوخیز ہے ہر جوے کہستان
جھیلیں ہیں کہ نیلم کے تراشے ہوئے پیالے
فوارے ہیں یا کوہر و الماس ہیں رقصاں

اخلاص و محبت کی وہ گوندھی ہوئی مٹی
اخلاق و مروت کے وہ ڈھالے ہوئے انسان
بخشا ہے انہیں جہد مسلسل کے عمل نے
وہ ذوق لطافت کہ ہے پروردہ طوفاں
شاعر کو یقیں ہے کہ نکھر آئے گا اک روز
وہ حسن جو افلاس کی چادر میں ہے پنہاں

برج پریمی نے لکھا ہے:

ڈوگرہ شاہی کے جھلسے ہوئے کشمیر میں کشمیر کے جیالوں کے عزم بغاوت کی ایک تصویر ملاحظہ ہو:

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے/آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں/..... فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے/اگ رہی ہے بغاوتوں کی سیاہ/جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر/مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ/مجھ سے کیوں پوچھتا ہے اے سیاح/باغ کشمیر کا ہے تحفہ کیا/اس دہکتے ہوئے گلستان سے/ایک دو سرخ پھول لیتا جا (کشمیر) 342

عمر رضا رقمطراز ہیں:

پتھر کی دیوار کی کچھ نظمیں اگر چہ خالص رومانی اور خالص انقلابی کے زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں لیکن مجموعہ کا بیشتر کلام رومان و انقلاب دونوں کے حسین امتزاج پر مشتمل ہے اس لیے اس میں شامل نظموں کو خانوں میں تقسیم کرنا مناسب معلوم نہیں پڑتا کیوں کہ رومانی نظموں میں انقلاب کی آمیزش ہے تو انقلابی نظموں میں رومانیت کی آمیزش ہے۔ بیشتر نظموں کا لہجہ نرم اور معتدل ہے۔ انتہا پسندی یا تشدد کی کیفیت تقریباً صفر ہے" 343

عمر رضا لکھتے ہیں:

"نظم پتھر کی دیوار میں جیل کے در و دیوار، کھانے، رہن سہن، قیدیوں کی حسرتوں، تمناؤں، آرزوؤں اور امیدوں کے خون، قیدیوں کے ظلم سہنے، پھر بھی مسکرانے، ظالم کے چیخنے چلانے اور انقلابی قیدیوں کے انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرنے کو سردار جعفری نے کسی قدر نرم اور مدھم لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ غرض نظم کافی معتدل اور سنبھلی ہوئی ہے جس میں رومانیت اور انقلابیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ چند حصے ملاحظہ کریں

کیا کہوں بھیانک ہے/یا حسیں ہے یہ منظر/خواب ہے کہ بیداری/کچھ پتا نہیں چلتا/پھول بھی ہیں سایے بھی/خاک بھی ہے پانی بھی/آدمی بھی محنت بھی/گیت بھی ہیں آنسو بھی/مسکراتے ہیں تارے/چاند کے کٹورے سے/چاندنی چھلکتی ہے/جیل کی فضاؤں میں/پھر بھی اک اندھیرا ہے/.....

رومان اور انقلاب جلال اور جمال دونوں کی کرشمہ سازیاں دیکھنی ہوں تو سردار جعفری کی نظم "بمبئی" کا .....مطالعہ کیا جانا چاہئے۔ اس نظم میں جہاں بمبئی کی تعریف میں رومانی انداز اختیار کیا گیا ہے وہیں موجودہ حکومت کی لاپروائیوں اور بے اعتنائیوں کے سبب اس کی خوبصورتی اور لطافت میں جس طرح کی گندگی اور غلاظت سرایت کرتی جا رہی تھی، اس کو منظر عام

پر لاتے ہوئے حکومت وقت اور سرمایہ داروں سے انہوں نے اپنی شدید نفرت وحقارت کا بھی اظہار کیا ہے.....اس نظم میں طنز کی کاٹ بھی موجود ہے۔لہجہ بے حد انقلابی ہے۔ 344

؎ سبز و شاداب ساحل/ ریت کے اور پانی کے گیت/ مسکراتے سمندر کا سیال چہرہ/ چاند سورج کے ٹکڑے/ لاکھوں آئینے موجوں میں بکھرے ہوے/.....راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے/ شامیں نیلی ہوا کی نمی میں نہائی ہوئی/ صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے/.....وہ چٹانوں پہ رکھے ہوئے اونچے اونچے محل/ چکنی دیواروں پر/ قتل غارت گری، بزدلی، نفع خوری کی پرچھائیاں/ ریشمی ساڑیاں/ محفلیں جسم، زہریلے ناخنوں کی بلیاں/.....خون کی پیاسی کھادی کے پیراہنوں میں/ .....چالیں، افلاس کی گرد تاریکیاں/ گندگی اور عفونت/ گھورے سڑتے ہوئے/ رہ گزاروں پہ سوتے ہوئے آدمی/ ٹاٹ پر اور کاغذ کے ٹکڑوں پہ پھیلے ہوئے جسم سوکھے ہوئے ہاتھ/.....چمنیاں بھٹنیوں کی طرح بال کھولے ہوئے/ کارخانے گرجتے ہوئے/ خون اور پسینے کی بو میں شرابور/ خون سرمایہ داری کے نالوں میں بہتا ہوا/.....یہ ہے ہندوستان کی عروس البلاد/ سرزمین دکن کی دلہن بمبئی/.....

سردار جعفری کو ان کی اسیری کے دوران اپنے وطن بلرام پور کی یاد ستائی تو انہوں نے نظم ''اودھ کی خاک حسیں'' لکھی اور وہاں کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا جیسے وہاں کی مٹی کی خوشبو، مٹی کی رنگت، کھیت کھلیان، جھیل، شفاف پانی، گڑیوں کے بچوں کا کھیلنا، لوہار کے گھن، کمہار کے چاک، ترکاریوں کی بیلیں، وہاں کی بھوک سے بلکتی کانپتی مفلسی، غم، مصیبتیں، خباثتیں، نفع خوروں کے استحصال کا شکار غریب کسان مزدور وغیرہ۔نظم میں رومان و انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے ؎

میں قید خانے میں عشق پیچاں کے سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں/ جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر/ کہاں ہیں وہ دلنواز بانہیں/ وہ شاخِ صندل/ کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لیے ہیں/ میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں.....اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں/ وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں/ جہاں کے بچے پرانے کپڑوں کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں/.....کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جھکے ہیں/ وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں/ جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں/.....یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں/ جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں/ یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر/ یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں/ جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اگا رہے ہیں/.....اودھ کی خاک حسیں کے ذرے بگولے بن کر مچل رہے ہیں/ اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں/ بغاوتیں جو ہر اک شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں/ بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں/ یہی پرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں/.....صدا قتو! آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو/ حیات کی تیز و تند موجو! فنا کے خاشاک کو بہا دو/ سحر کی کرنوں اندھیری راتوں کے سر پہ برسو/ عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو۔

اپریل 1950ء میں اپنی اسیری کے ایک سال مکمل ہونے پر سردار جعفری نے اس نظم ''ایک سال'' لکھی۔اس میں قید خانے کا حال، وہاں کی سختیوں، عدل و انصاف کے نام پر کی جانے والی ناانصافیوں کا دنیا کے محنت کشوں اور امن پسندوں کی

قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔انہوں نے اپنے عزم وحوصلہ، ایثار وقربانی، جہد و پیکار کو روشن رکھنے، مصیبتوں کے پہاڑ سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اپنے منزل مقصود کو پانے کے لیے آگے بڑھتے رہنے کی اہمیت اجاگر کی اور یہ بتایا کہ زندگی میں مصیبتوں اور آزمائشوں سے گزرنا فطری ہے اور یہ آتی جاتی رہتی ہیں۔انہوں نے قید خانے کے ساتھی قیدیوں کا ذکر کیا جن میں شاعر، افسانہ نگار کسان مزدور ہڑتالی موجود تھے جن کے حوصلے بلند تھے ان پر مصیبت کی پہاڑ جتنے بلند کئے جاتے اتنی ہی ان کی ہمتیں بلند ہوتی جاتیں۔نظم میں سردار جعفری نے خوبصورت تشبیہات واستعارات استعمال کئے ہیں۔

زہر آلودہ وہ بیتے ہوئے لمحات کے ڈنگ/خون میں ڈوبی ہوئی صبح کی تلوار کی دھار/شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر/.....پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو/رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام/گولیاں کرتی ہیں سینے کی زباں سے باتیں/اور وہ قانون وہ سرمائے کی زنجیر گراں/.....حلقے حلقے میں لیے اپنی اہنسا کا فریب/اپنے دامن کو بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے/کینچلی سانپ کی ہر سال بدل جاتی ہے/عدل و انصاف مداری کے پٹارے جن میں/ناگ بیٹھے ہیں قوانین کے پھن پھیلائے.....پھر بھی قربانی وایثار کا دل زندہ ہے/جہد و پیکار کی نبضوں کی دھمک جاری ہے.....اور وہ شعلہ نفس شاعر وافسانہ نگار/اپنے نغموں کی حرارت سے گلا دیتے ہیں/روح کے بوجھ کو افکار کی زنجیروں کو/ان کا ہر شعر رجز پڑھتا ہے/ہر سطر کہتی ہے جرأت کی کہانی ہم سے/ان کے ہر گیت سے دل ہلتا ہے دیواروں کا/جیسے بڑھتی ہوئی فوجوں کی دھمک/شعلے آواز کے اس شان سے ہوتے ہیں بلند/آگ لگ جاتی ہے زنداں کے سیہ خانے میں/اور منزل کی جبیں وقت کی محرابوں میں/جگمگا اٹھتی ہے رنگین شعاعوں کی طرح/میرے احساس وتصور کو ہزاروں سورج/لاکھوں چاند اور کروڑوں تارے/رنگ اور نور کی بارش میں بھگو دیتے ہیں/ہم سفر یہ ہوں تو پھر عزم سفر کیا کہنا/رنگ شب یہ ہو تو پھر رنگ سحر کیا کہنا۔

نظم ''زنداں بدزنداں''میں ترکی کے شاعر اعظم ناظم حکمت کی انقلابی شاعری کی ستائش کی گئی ہے۔نظم کا موضوع انقلابی ہے لیکن لہجہ نرم اور معتدل ہے۔

سردار جعفری کی شاعری میں امید ویقین، رجائیت پسندی:

سردار جعفری فطرتاً امید و یقین اور رجائیت پسند تھے۔ان کی شاعری میں رجائیت نمایاں ہے جس کا اظہار بہت سے ادیبوں نے کیا ہے۔

چند ادیبوں کے اقتباسات پیش ہیں:

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

1. سردار جعفری فطرتاً یاس پسند اور قنوطی نہیں ہیں۔وہ امید و یقین کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہتے ہیں لیکن بعض اوقات حالات انہیں جھنجھوڑ کر اور ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔وہ اپنے ملک میں اور ملک سے باہر ظلم وستم کے کاروبار کو ختم ہوتا ہوا نہیں دیکھتے، تو تڑپ اٹھتے ہیں۔روس میں جہاں ان کے عقیدے اور توقع کے مطابق اشتراکی نظام حکومت قائم ہوئی تھی، وہاں بھی حکام اور افسران بالا نے عوام اور خواص کو سخت اندھیرے اور شدید مغالطے میں رکھا۔وہاں قومی سرمائے کی مساویانہ تقسیم نہیں

ہوئی۔اسلحہ سازی اور اسلحہ فروشی کا کاروبار چلتا رہا۔دنیا کے غریب و پسماندہ ملکوں کے انسانوں کی بے لوث خدمت اور بھلائی کے بجائے ان پر حملے کیے گئے۔کم عمر نوجوانوں کو جبراً جنگی تیاریوں میں ملوث کیا گیا۔بالآخر عوام اور حکام کی کشمکش نے روس کی اشتراکی حکومت کی چولیں ہلا دیں اور کمیونزم تو کجا، عام قسم کا سماجی انصاف اور معاشی مساوات بھی قائم نہ ہو سکا۔سردار جعفری نے سوویت روس میں اس کھلی شکست کو دیکھا۔خود ہندوستان میں اشتراکیت کے جو امکانات تھے وہ مسدود ہوتے ہوئے نظر آئے .....اپنی نظم ''ایک خواب'' اور میں سردار جعفری نے بڑے بلیغ انداز اور درد بھرے لہجے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان لوگوں نے ایک مثالی سماج، ایک خوش حال اور خوبصورت سماج کا جو خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔اور آج بھی وہی پیاس وہی درد اور وہی زخم ہیں، جن کا علاج نہیں۔وہی سوالات ہیں جن کا جواب دینا کسی کے بس کی بات نہیں:

؎ دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی/ جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب/ در بہ در ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال/ اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب

لیکن سردار اپنے مخصوص رجائیت پسند مزاج کے سبب ناامید نہیں ہوتے۔ان کا خیال ہے کہ ایک خواب کے ٹوٹنے یا بکھرنے سے مقاصد نہیں مر جاتے، دوسرا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔اپنی اسی نظم کے آخری دو شعروں میں اسی احساس اور عزم کا اظہار ہے۔ ؎

سرکشی! پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں/ میں ترا شاعر آوارہ و بے باک و خراب/ پھینک پھر جذبِ بے تاب کی عالم پہ کمند/ ایک خواب اور بھی، اے ہمتِ دشوار پسند!

2. اپنی نظم ''تن کی چاندی من کا سونا'' میں اپنے اس یقین و اعتماد کا انہوں نے واضح طور پر اظہار کیا ہے۔ہم نے بیچی تن کی چاندی/ ہم نے بیچا من کا سونا/ آنکھ کے ہیرے/ ہاتھ کے دریا/ بازاروں میں لے کے نکلے/ پھر بھی مفلس اور کنگال/ اور انہوں نے/ ہم سے خریدی تن کی چاندی/ ہم سے خریدا من کا سونا/ لوٹ لیے آنکھوں کے ہیرے/ پی لیے ہاتھوں کے دریا/ اور کہلائے صاحب دولت صاحب کمال/ لیکن اک دن/ تن کی چاندی، من کا سونا/ آنکھ کے ہیرے، ہاتھ کے دریا/ سب واپس آجائیں گے/ اور زمانہ ہوگا نہال/ اور دنیا ہوگی خوش حال/ کوئی نہ ہوگا صاحب دولت/ کوئی نہ ہوگا صاحب مال/ کوئی نہ رہ جائے گا مفلس/ کوئی نہ ہوگا پھر کنگال

3. جعفری کی نظم ''قتل آفتاب'' میں بھی اسی تلخ حقیقت کا اعلان و اعتراف ہے کہ روس میں اشتراکیت ناکام ہوگئی اور اس ناکامی کو شاعر نے آفتاب کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔لیکن اس نظم میں بھی وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔وہ ظلم و جور کے آگے سپر انداز ہونے اور نظام جبر و استبداد کے غلبہ و تسلط کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ یہ سیاہ و سفید، حق و باطل اور خیر و شر کی آویزش چلتی رہے گی۔اس کا یقین ہے کہ ناکامی کی کوکھ سے ایک نیا انقلاب جنم لے گا اور سیاہ رات کی تاریکی اور مایوسی کی گھنگھور گھٹا سے ایک تازہ آفتاب ابھرے گا، اس لیے ایک آفتاب کے قتل کا ماتم درست نہیں۔ اصل اہمیت فتح و شکست اور ہار جیت کی نہیں ہوتی بلکہ اصل اہمیت تو کشمکش انقلاب کی ہے۔سب سے اہم اور قابل قدر بات ظلم و جور اور استبداد و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا اور سینہ سپر ہونا ہے''۔ 345

ڈاکٹر شمیم رضوی:

''سردار کی شاعری نالہ و بکا، آہ و فریاد نہیں بلکہ تاریکی، افلاس، درندگی اور غلاظت کے خلاف جدوجہد ہے۔ با الفاظ دیگر ان کے یہاں قنوطیت نہیں، رجائیت ہے اور جہاں رجائیت ہو وہاں فریاد للکار بن جایا کرتی ہے۔ ایک ایسی للکار جس میں شاندار مستقبل کی بشارت کے ستارے جگمگاتے نظر آئیں گے۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی شعری تخلیقات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اٹھو کہ جشن دل و جاں منایا جائے گا/ ہر اک چمن میں یہی گل کھلایا جائے گا/ یہ گل جو شاخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے/ خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے۔

وارث علوی نے اس نظم میں استعاروں کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کا تخلیقی تخیل اپنی نظم قتل آفتاب میں سورج، شام، شفق اور رات سے مستعار استعاروں کے ذریعہ اپنے شعری تجربے کو ایک منفرد اور تازہ کار پیرایۂ اظہار بخشتا ہے۔ رات، صبح، سورج، ترقی پسند شاعری کے رائج الوقت استعارے تھے اور کثرت استعمال سے اپنی ندرت اور تازگی کھو بیٹھے تھے۔ سردار کا تخیل ان گھسے پٹے استعاروں میں ایک نئی روح پھونکتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تخیل کا اعجاز روایتی استعاروں میں معمولی سی تبدیلی کے ذریعہ بڑے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ سردار کی چشم تخیل کے سامنے شفق کی سرخی لہولہان شام کا منظر پیش کرتی ہے جو قتل آفتاب کا علامیہ ہے..... شام سردار کے یہاں لہولہان ہے کیوں کہ آفتاب قتل ہو گیا ہے اور جس روشنی سے وہ عبارت تھا اپنی سفید شیشہ نور اس پر رات کے اندھیرے کے بڑھتے ہوئے سایوں کی سیاہ بارش سنگ ہے۔ آفتاب قتل ہوا تو رات کا نام بلند ہوا۔ اس مقام پر سردار کی فکر کا وہ روشن پہلو اجاگر ہوتا ہے جو پیچ در پیچ استعاروں سے کھیلتا ہے اور ان استعاروں کا سرچشمہ فطرت کے وہ مناظر ہیں جو رات کی تاریک حکمرانی میں شگاف ڈالتے ہیں۔ رات کا نام بلند سہی لیکن رات میں شمع روشن ہوتی ہے۔ کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ شاخ گل لچکتی ہے۔ بلبل چہکتی ہے۔ نسیم اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ سردار انہیں مناظر کو رات کے بطن میں جاری آزادی اور انقلابی جدوجہد کے استعاروں میں بدل دیتے ہیں۔ آفتاب قتل ہوا ہے لیکن خون آفتاب سے شمع نے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ قتل آفتاب کے غم میں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں لیکن شاعرانہ تخیل ان آنسوؤں کو بھی چراغ میں بدل دیتا ہے.....اور پھر انقلابی تخیل شاخ، ہوا، بلبل اور نسیم کو رجائیت کے استعاروں میں ڈھال دیتا ہے اور ایک نئے سورج کے طلوع کا مژدہ سناتا ہے۔ 347

شفق کے رنگ میں ہے قتل آفتاب کا رنگ/ افق کے دل میں ہے خنجر لہولہان ہے شام/ سفید شیشہ نور اور سیاہ بارش سنگ/ زمیں سے تا بہ فلک ہے بلند رات کا نام/.....وہ پہنا شمع نے پھر خون آفتاب کا تاج...../ پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ...../ ہزار لب سے زمین کہہ رہی ہے قصہ درد/ ہزار کوشِ جنوں سن رہے ہیں افسانہ...../ لچک رہی ہیں کہیں شاخ گل کی تلواریں/ سنک رہی ہے کہیں دشتِ سرکشی میں ہوا/ چہک رہی ہے کہیں بلبل بہارنوا/ جوان خوابوں کے جنگل سے آ رہی ہے نسیم/ نفس میں نکہت پیغام انقلاب لیے/ خبر ہے قافلہ رنگ و نور نکلے گا/ سحر کے دوش پہ ایک تازہ آفتاب لئے۔

مجنوں گورکھپوری نے سردار جعفری کے پہلے شعری مجموعہ پرواز کے مقدمے میں سردار جعفری کی رجائیت کو اجاگر کیا۔

وہ رقمطراز ہیں:

''علی سردار جعفری اور دوسرے نوجوان شاعروں میں مجھے جو ایک اور نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے اکثر نئے شاعر اب بھی صرف حسرت و محرومی کے شاعر ہیں۔ وہ ہمارے اندر نامرادی کا شدید احساس پیدا کر کے ہم کو اپنی موجودہ زندگی سے بددل تو کر دیتے ہیں لیکن ان کے لہجوں میں مستقبل کی بشارت کا خفیف سا خفیف بھی کوئی ارتعاش محسوس نہیں ہوتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان شاعروں کے سامنے مستقبل کا کوئی واضح تصور نہیں لیکن علی سردار، حسرت و حرماں کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ ماضی اور حال کو سمجھے ہوئے ہیں اور مستقبل کا صحیح ادراک رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری مستقبل کی بشارت لیے ہوئے ہوتی ہے اور ہماری رگوں میں امید کا انبساط اور حوصلہ کا جوش پیدا کرتی ہے۔ 348

ڈاکٹر علی جاوید نے سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں رجائیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نامہ بر (مریم کے پاس) آتا ہے جس کے پاس جاوید کا آخری پیغام ہے جو اس بچے کے نام ہے جو ابھی بھی مریم کے بطن میں ہے۔ نامہ بر کہتا ہے کہ وہ بچہ جو اس کے پہلو میں نہاں ہے وہی عہد نو کا مبارک نشان ہے، جو آنے والے ہندوستان کی نئی نسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کے شوہر نے مرتے مرتے اس کا نام لیا پھانسی کی رسّی کو چوم کر آنے والی سحر کی خبر بھی دی۔ وہ پریشان نہیں تھا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کیوں کہ اس کا دل امیدوں اور امنگوں سے لبریز تھا اور روشن مستقبل پر یقین کامل رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ظلم کی رات ختم ہوگی اور نیا سویرا، نئی خوشیاں لے کر آئے گا اور تمام محنت کش اور امن پسند لوگ آزاد ہندوستان کی ہوا میں سانس لیں گے۔ اس میں تھوڑی دیر ہو سکتی ہے کیوں کہ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں اور جس کا سارا زمانہ انتظار کر رہا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہے کہ اس کا بچہ وہ سب کچھ حاصل کرے گا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے ؎

جہان کہن کا یہ دستور ہے، رسیاہی کے آغوش میں نور ہے
اگر دل میں ہے آرزو کا سرور، تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور

سردار جعفری کا مستقبل میں یقین جاوید کی شکل میں کسی بھی قیمت پر آدمی کو ہار ماننے سے روکتا ہے اور اس کی ہمت کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی محرومیوں سے مایوس نہیں ہوتا اور ہر دور کے انسان کو سعی پیہم کے لیے آمادہ کرتا ہے..... شاعر کا یہ خواب سردار جعفری کا اپنا خواب ہے، جو انسان اور انسانیت کو ہمیشہ کامیاب اور شادماں دیکھتے ہیں۔ فطری طور پر کبھی بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور نہ ہی مستقبل سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں..... انہوں نے اپنی عمر کے طویل سفر میں ہمیشہ جدید خیالات اور ایجادات کا احترام کیا۔ ان کی یہی ذہنی تازگی اور کشادگی تھی کہ وہ ہر دور میں نئی نسل کے آئیڈیل رہے''۔ 349

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے سردار جعفری کی رجائیت کے بارے میں لکھا ہے:

''نظریاتی وابستگی اور اس کی بناء پر عملی طور پر سے سرگرم شاعر کی زندگی اور شخصیت کے ساتھ اس کی شاعری کا بھی نشیب و فراز سے گزرنا لازم تھا۔ آزادی کی جدوجہد ہو یا اشتراکیت کی راہ، یقین اور امید کا دامن تھامے ہوئے بھی ان پر چلنے والے ناکامیوں اور شکستوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ افسردہ بھی ہوتے ہیں جو حیرت کی بات نہیں..... سردار جعفری

کی شاعری میں یہ نشیب و فراز نظر آتے ہیں مگر وہ کسی خواب کے ٹوٹنے پر کبھی سپر ڈال کر اپنی ذات کے اندر سمٹ کر غائب نہیں ہو جاتے بلکہ اسے جدوجہد کی ایک لازمی منزل سمجھتے ہیں جس کی انتہا کامرانی ہے۔ یہ رجائیت ان کے یہاں حاوی ہے۔ اس کا بہت اچھا اظہار ان کی نظم پتھر کی دیوار ہے۔ نظم کا اختتام سردار جعفری کے شعری اسلوب کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

تیرگی کے بادل سے/ جگنوؤں کی بارش ہے/ رقص میں شرارے ہیں/ ہر طرف اندھیرا ہے/ اور اس اندھیرے میں ہر طرف شرارے ہیں/ کوئی کہہ نہیں سکتا/ کون سا شرارہ کب/ بے قرار ہو جائے/ شعلہ بار ہو جائے/ انقلاب آ جائے 350

سردار جعفری کی نظم ''دو چراغ'' (مشمولہ ایک خواب اور) کے بارے میں عمر رضا رقمطراز ہیں:

نظم ''دو چراغ میں''.....اگر چہ ایک غریب دوشیزہ کے حوالے سے غریبوں اور مزدوروں کی بدحالی اور معاشرے کے استحصالی رویوں کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے لیکن جس استعاراتی اور علامتی انداز کو اختیار کیا گیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ سردار جعفری نے اس نظم میں ایک میلی اور تیرہ و تار دوکان کا نقشہ کھینچا ہے جس میں ایک دوشیزہ فضاء میں پھیلے تیرگی اور اندھیرے کو کاٹنے کی خاطر ایک چراغ روشن کرتی ہے لیکن موسم کا مزاج بدلا ہوا ہے اور ہواؤں کے ہاتھ گستاخ ہوتے جا رہے ہیں جس سے چراغ کے بجھ جانے کا امکان نظر آتا ہے جس طرح وہ دوشیزہ بجھی بجھی، اداس اور مغموم ہے اسی طرح چراغ بھی جھلملا رہا ہے۔ ان حالات سے سردار جعفری نے جن حوصلہ مند خیالات کو اخذ کیا ہے وہ بے حد دلچسپ ہے۔ 351

؎ تیرگی اب سیہ سمندر ہے/ اور ہوا ہو گئی ہے دیوانی/ یا تو دونوں چراغ گل ہوں گے/ یا کریں گے وہ شعلہ افشانی/ پھونک ڈالیں گے تیرگی کی متاع/ پر مجھے اعتماد ہے ان پر/ کو غریب اور بے زبان سے ہیں/ دونوں ہیں آگ دونوں ہیں شعلہ/ دونوں بجلی کے خاندان سے ہیں۔

پروفیسر زاہدہ زیدی نے لکھا ہے:

یہاں شاعر نے روشنی تاریکی اور ہوا کے استعاروں کی مدد سے نیکی اور بدی یا ظلم اور انسانی حوصلوں کی ازلی اور ابدی لڑائی کو مجسم کر دیا ہے۔ 352

سردار جعفری کی نظم اہل درد (مشمولہ ایک خواب اور) کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

نظم اہل درد میں سردار جعفری کا دل ٹوٹا ٹوٹا سا نظر آتا ہے حرف شکایات، دوستوں کی بے وفائیاں اور بے پروائیاں سبھی کچھ نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی نظم کے اخیر میں ایک حوصلہ افزا اور پر امید خیال پیش کر کے انفرادی احساسات اور ذاتی غم کو وہ اجتماعی غم میں بدل دیتے ہیں۔ 353

؎ کوئی مقام نہیں اہل درد کے قابل/ کوئی بہشت نہیں اہل آرزو کے لیے/ تمام صحن چمن مقتل تمنا ہے/ کن لہو کا ملا ذوق جستجو کے لیے/ رہے شکار کبھی تیغ دوست کی خاطر/ ہدف بنے ہیں کبھی ناوک عدو کے لیے/ لیا ہے ہنس کے کبھی سنگ محتسب سر پر/ سپر ہوئے ہیں کبھی ساغر و سبو کے لیے/.....وفائے عشق سے کوئی خفا نہیں لیکن/ بس ایک تیغ کہ پیاسی ہے جو لہو کے لیے/ اب آج پھرتے ہیں بے آبرو تو غم کیا ہے/ وطن، عزیز وطن تیری آبرو کے لیے

پروفیسر وارث علوی نے لکھا ہے:

سردار کے یہاں دردوغم کے روایتی تصورات انفرادی لمس پا کر ایک نئی تازگی حاصل کرتے ہیں۔دورجدید کی ہولنا کیوں اورنامرادیوں کوسہارنے کے لیے بھی دردوغم کے ان بڑے اور مستحکم جذبات کی ضرورت تھی جن میں شکستہ دلی، مایوسی، نامرادی اورنا رسیدگی کے چھوٹے جذبات شانت سمندر جیسا گمبھیر اور بڑا اجذبہ پیدا کرتے ہیں۔جعفری کی نظم اہل درد ایسے ہی جذبہ کا اظہار ہے۔ 354

سردار جعفری نے نظم کا سہ سُر ''میں موجودہ صورت حال سے نبرآزما انقلابی اور مجاہدین کی کوششوں سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نہیں لیا ہے۔یہ نظم حافظ شیرازی کے اشعار کی تضمین ہے۔

لرز رہے ہیں درو بام قصر پرویزی/جواں ہے ضربت پیہم سے تیشۂ فرہاد/نہ اس کا خوف ہے باقی نہ ہے طلب اس کی/حقیر آتشِ نمرود وجذبِ شداد/تڑپ سے مرغِ چمن کی شکستہ حلقہ دام/نہ زور پنجہ گل چیں نہ بازوئے صیاد/بدل رہی ہے فضا نرم ہوگئی ہے ہوا/دلوں کے باغ میں چلنے لگی ہے بادِ مراد۔

مجموعہ لہو پکارتا ہے 1978ء کے بارے میں رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''اس مجموعہ (لہو پکارتا ہے) کی نظمیں عالمی مسائل کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں اور امن اور انسان دوستی کا پیغام دیتی ہیں..... یہاں شاعر کی نگاہ اپنی زمین سے اٹھ کر عالمی منظر ناموں پر جاتی ہے مثلاً بدی تسے (چکوسلواکیہ کے ایک باغ امن کا نام ہے جس میں ساری دنیا کے گلاب ہیں۔وہاں پہلے اسی نام کا ایک گاؤں تھا جسے جرمن نازیوں نے جلا کر خاک کر دیا تھا) خون کا اجالا (چلی کے شہیدوں کے نام) تہنیت (افغان کے لیے) افریقی لڑکی، حبشی میرا بھائی وغیرہ ان سبھی میں ایک ہی حقیقت کارفرما ہے۔

یہی مظلوموں کی جیت اور یہی ظالم کی شکست..... 355

یکم دسمبر 1975 کو لکھی گئی نظم صبح نوا (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں حالات کے بہتر ہونے، ہر طرف امن و امان قائم ہونے کی امید ملاحظہ ہو۔

اگر چہ دشتِ خموشی بہت ہے تیرہ وتار/لباس نور میں صبح نوا بھی آئے گی/فراز شوق سے اترے گی آبجوئے کلام/لبوں پہ پہنے ہوئے رنگ آرزومندی/نہ جانے کتنے خداوندگانِ دور سیاہ/پناہ مانگیں گے لفظوں کی تیز کرنوں سے/سحر کی زد میں ہے شانِ شب خداوندی

نظم سناٹا کے اشعار پیش ہیں:

رواں ہیں وقت کے پرہول رہ گزاروں پر/ہزاروں سال کے درماندہ رہروانِ حیات/نہ کوئی منزل آسودگی نہ راہ نجات/طویل نظم کا صحرا طویل جبر کا دشت/یہ آفتاب سر آسماں پہ آگ کا طشت/افق سے تا بہ افق ہے ہوائے گرم کا گشت/نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پرچھائیں/شجر ہوا میں اڑے جاتے ہیں دھواں ہو کر/ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سناٹے/خموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہو کر

وارث علوی نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے:

1. سناٹا کو میں سردار کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں۔اس نظم میں سردار انسان کو تاریخ ہی میں نہیں بلکہ وقت کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور فطری طور پر سفر، رہ گزر اور منزل کے استعارے اظہار کا پیرایہ بنتے ہیں۔یہ استعارے مانوس ہی نہیں بلکہ فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہیں لیکن جیسا کہ ایک خواب اور میں سردار نے خواب کے ساتھ جذبہ معصوم کی صفت کے ذریعے گہرے معنوی ابعاد پیدا کیے تھے، یہاں بھی وقت کے ساتھ پرہول اور رہروان حیات کے ساتھ درماندہ کے اسمائے صفات کے ذریعہ نہ صرف استعاروں کو گنجینہ معنی بنایا ہے بلکہ نظم کی حرماں نصیب فضاء کو ویران تر بنایا ہے۔وقت کی پرہول رہ گزاروں میں ہزاروں سال سے جو رہروان حیات رواں ہیں وہ درماندہ ہیں، تھکے ہوئے ہیں، ایک مخالف کائنات میں ہزاروں سال سے جو رہروان حیات رواں ہیں وہ درماندہ ہیں، تھکے ہوئے ہیں، ایک مخالف کائنات میں جہاں فطرت خون آشام اور سفاک ہے۔انسان کی زندگی روندی اور کچلی ہوئی ہے"۔

2. وقت اور تاریخ کے تناظر میں جہاں چنگیز و ہلاکو کے ہاتھوں انسانیت کی قباء چاک ہوتی رہی ہے۔مظلوم انسانیت کے زخموں کا کوئی شمار نہیں۔بے شک جہانِ مکافات میں زندگی موت کی گھات میں رہی ہے اور گل اس شاخ سے ٹوٹتے رہے ہیں تو پھوٹتے بھی رہے ہیں اور اس طرح تسلسل حیات قوت حیات کا ثبوت بھی ہے اور رجائیت کا یہ فلسفہ سردار کو اقبال سے ورثہ میں ملا ہے۔لیکن تخلیق شعر کا وہ ایک لمحہ جس میں دل شکستگی کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں انسانی ارتقاء سے وابستہ اس کے رجائی پہلو کی زائدہ امید کی لو بجھتی نظر آتی ہے۔اس لمحہ کی صداقت کو شعری اظہار میں لازوال کر دینا بڑی شاعری کا تخلیقی منصب ہے۔اور سردار نے سناٹا میں یہی کام کیا ہے۔

3. سناٹا کو جو چیز اعصابی اضمحلال اور مایوسی کی تاریک فضاؤں میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔وہ نظم کے استعارے ہیں۔سناٹا بذات خود ایک بڑا قدر رتی فینومینا ہے۔جس کا تعلق وسیع میدانوں، رہ گزاروں اور لق و دق صحراؤں سے ہے۔ہزاروں سال پر پھیلا ہوا وقت کا پرہول ریگزار، ظلم کا صحرا، جبر کا دشت اور آفتاب آگ کا طشت اور افق سے تا بہ افق ہوائے گرم کا گشت، ان استعاروں کا تاثر احساس کی خستگی، زبونی اور پژمردگی کا نہیں بلکہ حیرت اور ہیبت کا ہے جو اپنی پوری شدت اور شاعرانہ حسن آفرینی کے ساتھ نظم کے آخری بند میں ظاہر ہوتی ہے۔یہ بند صحرا کی بھی اتنی ہی چوکھی تصویر ہے جتنی کہ اس اندرونی خلا کی جو ایک آفاقی سیاسی صورتِ حال کا پیدا کردہ ہے۔خموشی بولتی ہے خوف کی زبان ہو کر ایک ایسا استعارہ ہے جس میں آمریت اور نراجیت کی تمام ہولناک پنہاں ہو گئی ہیں۔ 356

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کی نظم کربلا کے بارے میں لکھا ہے:

کربلا ان کے لیے (سردار جعفری) کسی مسلک یا مذہب کا نشان امتیاز نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت میں معرکہ خیر و شر کی علامت ہے۔چوں کہ سردار جعفری انسانیت اور انسانیت دوستی کے شاعر ہیں اس لیے انہیں عالمی انتشار بھی ایک نئی کربلا کا منظر دکھاتا ہے.....ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ کربلا ایک عالمی استعارہ ہے۔شر پر خیر کی فتح کا۔لہٰذا اسی نسبت سے دیکھیے تو سردار جعفری کی تمام شاعری جو شر پر خیر کی فتح کی داستان سناتی ہے۔وقتی اور واقعاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ 357

نظم دولت دنیا کا حساب کا شعار ملاحظہ کیجیے:

تم کہ ہو محتسب سیم و زر و لعل و گہر، ہم سے کیا مانگتے ہو دولت دنیا کا حساب/ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط/ چند ناکردہ گناہوں کے سلگتے ہوئے خواب/ ہاں مگر اپنی فقیری میں غنی ہیں ہم لوگ/ دولت درد دل و درد جگر رکھتے ہیں/ خشکی لب ہے تو کیا دیدۂ تر رکھتے ہیں/ اپنے قبضے میں نہیں اطلس و سنجاب و سمور/ جسم پر پیرہن شمس و قمر رکھتے ہیں/ گھر تو روشن نہیں الماس کے فانوسوں سے/ قصر و ایواں پہ جو برسے وہ شرر رکھتے ہیں/ جو زمانے کو بدل دے وہ نظر رکھتے ہیں۔

غزل، مرثیہ، مثنوی، قطعہ

ڈاکٹر وزیر آغا نے غزل اور نظم کے بنیادی فرق کی وضاحت کی۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

1. غزل مشرق کی پیداوار ہے۔ مغرب کی ادبیات میں اس کے نقوش مشکل ہی سے نظر آئیں گے وہاں دوسری اصناف شعر بالخصوص نظم کو فروغ ملا۔ غزل کی امتیازی خصوصیت تجرباتی مطالعہ نہیں بلکہ اجتماعی محاکمہ ہے اور اس ضمن میں غزل نے جس خوبی اور نفاست سے شعر کے مختصر پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے، شاعری کے کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں نظم کا طرۂ امتیاز اس کی گہرائی ہے اور غزل کی امتیازی خصوصیت اس کی وسعت!

2. غزل میں محبت کا تجربہ ایک اجتماعی اور عمومی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے..... شعرا کے ردعمل میں بھی بیشتر اوقات یکسانیت اور مماثلت نظر آنے لگی ہے۔ گویا غزل کا محبوب اپنے زمانے کے غزل شعرا کی مشترکہ میراث ہے اور اس میں زمانے کی مقبول عام عورت کے خصائص مرتکز ہو گئے ہیں..... دراصل غزل کا مزاج اس بات کا متقاضی رہا ہے کہ محبت کی انفرادی کیفیت عشق کی وسیع تر کیفیات میں بدل جائیں اور محبت کا انفرادی غم یا مسرت زندگی کے بنیادی غم یا مسرت سے ہم آہنگ ہو جائے..... دوسری طرف نظم فرد کی بھرپور انفرادیت کی غماز ہے..... نظم فرد کے ذہنی اور احساسی سفر کی ایک داستان ہے۔ 358

محمد عمر رضا نے سردار جعفری کی غزل کوئی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

1. علی سردار جعفری ایک نظم کو شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں اور ایک خاص عہد تک عالی قسم کے ترقی پسند ہونے کے سبب انہوں نے غزل کی پرزور مخالفت بھی کی۔ ابہام کو شاعر کے لیے سم قاتل قرار دیا۔ فنی لوازم کو ثانوی حیثیت دی اور مقصد کو اولیت بخشی۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل سے ہی غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں جن میں داخلیت و دروں بینی، رمزیت و اشاریت، معنوی تہہ داری اور کسی قدر پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا رشتہ اردو غزل کی روایت سے کافی مضبوط ہے۔

2. علی سردار جعفری نے اپنی غزلوں کو محض سیاسی، سماجی اور تہذیبی مقاصد کی تشریح و تبلیغ تک ہی محدود نہیں رکھا اور ان موضوعات کو پیش کیا تو ان میں جمالیاتی کیف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بیشتر غزلوں میں انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایات اور اس کی چاشنی و لطافت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سردار جعفری طبعاً حسن و عشق کے دلدادہ تھے۔ جس کے اظہار کے

لیے انہوں نے اس زمانے میں بھی غزلوں کا سہارا لیا جب وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے غزل کی مخالفت کر رہے تھے۔ اپنے پہلے مجموعہ کلام ''پرواز'' (1944ء) میں سردار نے اگرچہ تین غزلیں ہی شامل کی ہیں لیکن ان میں غنائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ نمونے کے طور پر 1939 میں کہی گئی شامل مجموعہ یہ غزل ملاحظہ فرمائیں۔

حسن کی رنگین ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوتی گئیں
یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور زیادہ معتبر ہوتی گئیں

3. پرواز میں شامل نظمیں بھی کچھ اس انداز کی ہیں کہ ان کے عنوانات ہٹا دیئے جائیں تو وہ غزل یا مسلسل غزل کے زمرے میں آجائیں گی مثلاً لکھنو کی ایک شام، نیا زمانہ، متاع ہنر، عہد حاضر، جواہر لال نہرو کے نام، عورت کا احترام، لکھنو کے دوستوں کے نام، ترقی پسند مصنفین، اکیلا ستارہ، خیر مقدم، سر راہ، جھلک، محبّ کا فسوں، تذبذب اور غم کا ستارہ، یہ تمام نظمیں غزل کی ہیئت میں ہیں اور بیشتر نظموں کا داخلی و خارجی نظام غزل کے مطابق ہے۔ مزید براں سردار جعفری نے تشبیہ، استعارہ، علامت، رمزیت، اشاریت اور دیگر شعری لوازمات کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ ان نظموں میں غزل کا روایتی حسن پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثلاً سر راہ میں سردار جعفری نے محبوب کا سراپا کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ کون ہے جس کی زلفوں سے گھنگھور گھٹائیں لپٹی ہیں/ بجلی سی چمکتی ہے لیکن بجلی سے حیائیں لپٹی ہیں/ اک لرزش سی ہے قامت میں، اک شعلہ سا تھراتا ہے/ ہر گام پہ عشوے رقصاں ہیں، عشووں سے ادائیں لپٹی ہیں/ مشرق سے نکلتے سورج کا ہوتا ہے گماں پیشانی پر/ اس تابش رخ کا کیا کہنا آنچل سے شعاعیں لپٹی ہیں۔

4. ترقی پسندوں نے جب غزل کو قبول کر لیا تو سردار نے بھی غزل کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس کی رمزیت، اشاریت، معنوی تہہ داری اور دروں بینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور حالات حاضرہ پر بھی کامیاب غزلیں پیش کیں۔ مثلاً آزادی کے فوراً بعد شائع شدہ ان کے مجموعہ کلام ''خون کی لکیر'' 1949 کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیں:

تری ادائیں ہیں ساحرانہ، ہیں تیرے انداز دلربانہ/ تو ہی بتا دے کہاں سے آئیں گے مجھ کو آداب عاشقانہ.....
مرے لیے ایک سے ہیں دونوں وہ کوئی صیاد ہو کہ گل چیں/ نظام گلشن میں شاخ گل سے الگ نہیں شاخ آشیانہ فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے/ ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ/ خلیق بھی ہے شفیق بھی ہے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا/ بس اک شکایت یہ ہے کہ پیر مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ۔

اس غزل میں سردار جعفری نے آزادی کے بعد تبدیلی اقتدار پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے..... نئے اقتدار سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار سردار نے بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانی عوام کی حالت میں کسی طرح کی مثبت تبدیلی نہ ہونے کے سبب ان کے دل و دماغ میں جو اضطرابی کیفیت اور غم و غصہ ہے، اسے انہوں نے بڑے شاعرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ بیان کیا ہے..... محبوب کے پردے میں حکومت وقت پر طنز کرنے کا انداز بڑا نرالا ہے۔ صیاد، گل، گلشن، گل چیں

اور پیر مغاں جیسے روایتی استعاروں کو سردار جعفری نے جس طرح عصری معنویت عطا کی ہے اور جس فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ اشعار میں ڈھالا ہے وہ داد طلب ہے ۔اس طرح اشعار کسی بھی عہد اور کسی بھی نظام اقتدار کی لاپروائیوں اور بے اعتنائیوں کے خلاف بے اطمینانی کا اظہار موثر طور پر کر سکتے ہیں ۔

5. سردار جعفری نے حسن و عشق کی جس وادی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا، اسے انہوں نے ترقی پسند تحریک کی سخت گیری کے زمانے میں بھی کلیتاً خیر باد نہیں کہا۔البتہ مجازی عشق کے ساتھ ساتھ عام انسانی محبت کے جذبے کو بھی فروغ دینے کی کوشش کی ۔انہوں نے اقبال کی طرح غزل سے عورت کو خارج نہیں کیا اور نہ ہی جنسی تلذذ میں مبتلا ہوئے ۔انہوں نے کوشت پوست کی عورت کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے لیکن اس کی صنفی پاکیزگی کا لحاظ رکھا:

مئے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے
تیرے قامت کی لرزش سے موج مئے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے

(پتھر کی دیوار میں شامل غزل)

یہاں سردار جعفری نے محبوب کے حسن کی تعریف جس دلکش انداز میں کی ہے، وہ داد طلب ہے ۔محبوب کی آنکھوں کی دو مختلف حالتوں کو دیکھ کر عاشق پر جس طرح کی کیفیت طاری ہوتی ہے اسے پیش کرنے کے لیے سردار جعفری نے مناسبت لفظی اور استعاروں کا خلاقانہ استعمال کیا ہے مثلاً مئے کی مناسبت سے نشہ اور نیند کی مناسبت سے خواب کا استعمال ۔اسی طرح دوسرا شعر بھی شعریت سے لبریز ہے مثلاً قامت کی لرزش سے موج مئے میں لرزش پیدا کرنا اور نگاہوں کی مستی سے پیمانوں کو چھلکانے کا انداز بڑا پر لطف ہے ۔

6. ان اشعار میں سردار جعفری نے جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ نہایت نرم اور مدھم ہے ۔اس طرح کے مواقع پر وہ سردار جعفری جو کبھی اپنی نظموں میں جذبات کے وفور میں بہہ جایا کرتے تھے، قدرے سنبھلتے نظر آتے ہیں اور بدلے ہوئے حالات کا سنجیدہ پروقار انداز میں اظہار کرتے ہیں ۔سردار جعفری کی اس طرح کی غزلوں میں رجائیت اور پرامیدی شدومد کے ساتھ پائی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مواقع پر سردار جعفری شعر کی شعریت کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں: ۔

گزر چمن سے مثال نسیم صبح بہار/گلوں کو چھیڑ کے کانٹوں کو گدگدا تا جا
جو ہو سکے تو بدل زندگی کو خود ورنہ/رشا دنو کو طریق جنوں سکھا تا جا (پتھر کی دیوار میں شامل غزل صفحہ 108)

ہجوم یاس میں ذوق فراواں ہم نے دیکھا ہے/کف صحرا پہ بھی رقص گلستاں ہم نے دیکھا ہے
(مجموعہ ایک خواب اور صفحہ 35)

یہ نیا زمانہ اے دل جو قار کھو چکا ہے/اسے اپنا بانکپن دیں (مجموعہ پیرہن شرر صفحہ 47)

اسی امید میں بے تابی جاں بڑھتی جاتی ہے/سکون دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے (لہو پکارتا ہے صفحہ 73)

زندگی کیا ہے بس اک گردش پیانہ رنگ رصبح بھی آئے گی آئی ہے جو شام اے ساقی (لہو پکارتا ہے صفحہ 75)

یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے ہم نفس رستارہ بن کے جلے بجھ گئے شرر کی طرح (لہو پکارتا ہے صفحہ 93)

سر بکف چلنے کی عادت میں نہ فرق آجائے رکو چہ دار میں سرمست وغر لخواں چلئے (میرا سفر ہندی صفحہ 133)

7. سردار جعفری کی غزلوں میں تنہائی و گمشدگی کے عناصر بھی مل جائیں گے کیوں کہ سردار کی ادبی زندگی ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ انہوں نے اپنا ادبی سفر بعد کے ادبی رجحانات تک جاری رکھا۔اس لیے ان رجحانات کو نظر انداز کرتے ہوئے سردار جعفری کی شاعری یا غزلوں کا مطالعہ کرنا اور ان کی پوری شاعری کو ہنگامی و انقلابی (خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک رایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1996ء صحہ 143) قرار دینا اور انہیں تین نظموں اور غزل کے تین اشعار کا شاعر کہنا درست نہیں۔جدیدیت کے زمانے میں سردار جعفری نے اس طرح کی غزلیں بھی کہیں۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا
باعث رشک ہے تنہا روی رہرو عشق
ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شئے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامہ محفل کے سوا
تیغ منصف ہو جہاں دارو رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا

(ایک خواب اور صفحہ 82)

یہاں سردار جعفری نے موجودہ عہد کی سیاست پر طنز کیا ہے لیکن اس میں تنہائی گمشدگی اور بے بسی کا احساس حاوی ہے۔ وہ شاعر جو کبھی ہمہ وقت رجائیت کے نغمے گاتا تھا، اب اسے دوریِ منزل کے سوا کوئی دوسرا ہم سفر نظر نہیں آتا''

8. غزل عام طور پر ذاتی واردات و جذبات کے لیے مختص رہی ہے اور سردار نے اپنی غزلوں میں اس انداز کو بھی برتا ہے، لیکن سیاسی و سماجی مقاصد کے لیے انہوں نے اس کا نسبتاً زیادہ استعمال کیا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود سردار جعفری نے غزل کی داخلیت اور دروں بینی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔1990 کے بعد ہندوستان جب فرقہ وارانہ کشیدگی کا شکار ہوا تو سردار جعفری نے بے ساختہ کہا۔

اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے
بارش ِ سنگِ ستم، جامِ مدارات کے بعد

(میرا سفر (ہندی) صفحہ 104)

لو کے موسم میں بہاروں کی ہوا مانگتے ہیں
ہم کفِ دستِ خزاں پر بھی حنا مانگتے ہیں
کاش کر لیتے کبھی کعبہ دل کا بھی طواف
وہ جو پتھر کے مکانوں سے خدا مانگتے ہیں

(میرا سفر ہندی صفحہ 134)

ان اشعار میں فسادات کا عکس واثر ہوتے ہوئے بھی معنی ومفہوم کی وہ سطح بھی موجود ہے جو عام انسانی زندگی کی ایک ایسی عمومی صورتِ حال کو پیش کرتی ہے جس میں قاری اپنی زندگی کے کسی خاص تجربے کا عکس دیکھنے لگتا ہے۔

(9) ''سردار جعفری نے نظموں میں تو ڈرامائیت پیدا کی ہی ہے' غزلوں میں بھی انہوں نے اس فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ خاص طور پر استعجابی' استفہامی اور سوالیہ لب ولہجے نے ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی لطافت پیدا کر دی ہے:۔

معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے

(پرواز صفحہ 50)

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجوم رنج ومحن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگر چہ قاتل' نظام دار ورسن وہی ہے

(خون کی لکیر صفحہ 181)

دیکھنا پھول سے کھلتے ہوئے ہونٹوں پہ مرے
غنچۂ دل کے چٹکنے کی صدا ہے کہ نہیں

(ایک خواب اور صفحہ 166)

وہی ہے وحشت وہی ہے نفرت آخر اس کا کیا ہے سبب
انساں انساں بہت رہا ہے انساں انساں بنے گا کب

(پیراہن شرر صفحہ 49)

(10) ''پیکر تراشی میں سردار جعفری کو کمال حاصل ہے۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی انہوں نے دو دو مصرعوں میں ایسی تصویر کشی کی ہے جو دیکھتے ہی بنتی ہے:

شمع کا مے کا شفق زار کا گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے اب دلدار کا رنگ

ان کے آنے کو چھپاوں تو چھپاوں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے درودیوار کا رنگ

(لہو پکارتا ہے صفحہ 39)

صبح کے اجالے پر رات کا گماں کیوں ہے
جل رہی ہے کیا دنیا چرخ پر دھواں کیوں ہے
قطرہ ہائے شبنم ہیں یا لہو کی بوندیں ہیں
رنگ و نور کا دامن آج خوں چکاں کیوں ہے

(لہو پکارتا ہے صفحہ 66)

اس باغ میں آئی ہے اک محبوبۂ گل پیرہن
شیریں نواشیریں ادا شیریں سخن شیریں دہن
پیشانی سیمیں ہے یا صبح تخیل کی چمک
شائستگی فکر و فن اس کے تبسم کی کرن

(لہو پکارتا ہے صفحہ 97)

(11) ''علی سردار جعفری نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق سے لے کر سیاسی افکار فلسفیانہ خیالات اور سماجی رجحانات کو رمزیت' اشاریت' ابہام' تخیل کی بلندی' احساس کی شدت' پیرایۂ بیان کی دلاویزی کے ساتھ پیش کر کے اردو غزل میں تنوع پیدا کیا ہے۔ انہوں نے اقبال اور جوش کی طرح بلند آہنگ اور بارعب الفاظ کا بھی سہارا لیا ہے۔ تسلسل بیان کے ساتھ ساتھ غزل کی ریزہ خیالی کو بھی برتا اور غیر مردّف غزلیں بھی کہیں۔ خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت اور دروں بینی' اجتماعیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت اور اپنے اس خاص لب و لہجے کو بیان غالب اور زبان میر سے ہم آہنگ کر کے سردار جعفری نے اپنی غزلوں میں ایک خاص قسم کی نئی جمالیاتی شان پیدا کی جس سے یقیناً ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے.....انہوں نے کہا ۔

سنواریے غزل اپنی بیان غالب سے
زبان میر میں بھی ہاں کبھو کبھو کہیے

(ایک خواب اور صفحہ 38)

سردار جعفری کی غزلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

''سردار جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں بالخصوص آزاد نظموں میں ان کے جوہر خوب نمودار ہوئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی دور میں انہوں نے غزلوں پر توجہ نہیں دی اور جو غزلیں کہیں ان میں بھوک' افلاس' مساوات' مظلوم و جابر حکمراں طبقے کے خلاف جارحانہ انداز' غلامی کا کرب' آزادی و امن کی خواہش جیسے موضوعات ہی کو پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پیار' محبت' عشق و عاشقی' محبوب کے سراپا اور اس کے ناز و ادا کا بھی ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خطابیہ' بیانیہ اور باغیانہ انداز بھی حاوی

ہے لیکن آزادی کے بعد نرم لب ولہجہ در آیا تھا۔اس عہد کی غزلوں میں بھی انہوں نے اگر چہ عصری اور ہنگامی موضوعات کو جگہ دی ہے لیکن اب انداز پیشکش میں ایک رچاؤ اور سلیقہ مندی بھی آ گئی ہے۔اب وہ لفظیات کے استعمال میں کلاسیکی اور روایتی انداز کو اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔البتہ نظم کا سا تسلسل اور کسی ایک خاص مرکزی احساس یا فکر کی اتباع ضرور نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ غزلیں 'نظم نما ہیں جس کی با قاعدہ ابتداء اقبال کر چکے تھے"۔ 360

عمر رضا لکھتے ہیں:

(1) ''جس زمانے میں وہ (سردار جعفری) اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ غزل پر آنکھیں نکالتے تھے۔اس وقت بھی وہ غزلوں سے دوری اختیار نہیں کر پائے تھے۔پہلے مجموعۂ کلام ''پرواز'' میں تین غزلوں کی موجودگی اس بات کی غماز ہے .....ان غزلوں کا موضوع خالص روایتی حسن وعشق ہے۔علاوہ ازیں ''پرواز'' میں شامل نظمیں 'لکھنو کی ایک شام' نیا زمانہ' متاع ہنر' عہد حاضر' جواہر لعل نہرو کے نام' عورت کا احترام' لکھنو کے دوستوں کے نام' ترقی پسند مصنفین' اکیلا ستارہ' خیر مقدم' سر راہ' لینن' جھلک' محبت کا فسوں' تذبذب اور غم کا ستارہ' بھی ہیئتی اعتبار سے غزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ان میں سے بیشتر نظموں کا داخلی اور خارجی نظام بھی غزل کے مطابق ہے''۔

(2) ''سردار جعفری نے غزلیں کہی ہیں اور خوب صورت غزلیں کہی ہیں۔غزل سے ان کی وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 1978 میں انہوں نے اپنی 34 غزلوں کا ایک مجموعہ ''غزل'' کے نام سے سنگھم پبلشرز لاہور سے شائع کروایا تھا۔اگر چہ نظموں کی طرح انہوں نے غزلوں میں بھی زیادہ تر سیاسی وسماجی موضوعات ہی کو پیش کیا ہے''۔

(3) اپنی غزلوں میں عہد کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنے کے باوجود انہوں (سردار جعفری) نے اس کی غنائیت' رمزیت اشاریت اور ریزہ خیالی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ جس طرح ان کی نظموں میں نکھار آتا گیا اسی طرح ان کی غزلیں بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ حسین اور دلنشین ہونے لگی تھیں بلکہ نظموں کی بہ نسبت ان کی غزلوں میں جلال و جمال کا توازن زیادہ نظر آتا ہے۔ستر کی دہائی میں اپنے شعری مجموعے ''ایک خواب اور'' میں انہوں نے کہا تھا۔

سنواریے غزل اپنی بیان غالب سے
زبان میر میں بھی ہاں کبھو کبھو کہئے

361

سردار جعفری کی غزل کوئی کا پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے جائزہ لیا ہے۔

چند اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

(1) ''سردار جعفری کی پوری شاعری مقصدی وتبلیغی شاعری ہے۔لہٰذا وہ اپنی طبع رواں کو غزل کے مزاج سے منطبق نہیں کر پاتے تھے۔اُن کے مطابق کبھی کبھی ایک خیال صرف ایک مصرعے میں مکمل ہو جاتا ہے اور کبھی ایک خیال کئی مصرعوں کا متقاضی ہوتا ہے۔پس شاعری خیال کی تکمیل کا نام ہے اور نظم اس تکمیل میں شاعر کی مدد کرتی ہے''۔

(2) سردار جعفری نے اپنی غزلوں میں اپنے خیالات ونظریات کو اہمیت دی اور نظموں ہی کی طرح ان کی اکثر غزلیں بھی

ایک مرکزی خیال کی حامل ہیں۔مثلاً ایرانی طلبا کے نام جو 1978 امن و آشتی کے لیے شہید ہوئے' انہوں نے ایک پوری غزل کہی جسے پابند نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔

خونِ ناحق سے ہوا رنگیں گلستانِ عجم
مشعلوں کی طرح روشن ہیں جوانانِ عجم

(3)''وہ انسان دوستی کے زبردست مبلغ تھے اور انسانی اقدار انہیں ہمیشہ عزیز رہیں۔ہندو پاک تنازعے کو بھی جس امن پسندانہ انداز سے انہوں نے اپنی شاعری میں برتا برصغیر کے کسی اور شاعر کے ہاں سوائے ساحر کے نظر نہیں آتا۔ایک مسلسل غزل وہ ہندو پاک مشاعرے کے لیے شعراء کے نام اس طرح کہتے ہیں'':۔

پھر اٹھا ہے وادی گنگا سے ابر نوبہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج

(4)''سردار جعفری کی غزلوں میں عصری مسائل' سیاسی موضوعات' سماجی سروکار یہاں تک کہ معاشی مسائل نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔خاص طور پر اپنے سیاسی و ادبی مسلک سے وہ لمحہ بھر بھی بے خبر نہیں رہتے۔ان کے ہاں ترقی پسند افکار غزلوں کا موضوع بن کر اکثر اشعار سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔مثلاً جبر و تشدد' استحصال' ظالم و مظلوم کی کشاکش' انقلاب کی خواہش' ایک نئی دنیا کی امید' سرمایہ داری سے نفرت' ضمیر فروشوں پر لعنت وغیرہ''۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

بس اسی کو توڑنا ہے یہ جنونِ نفع خوری
یہی ایک سرد خنجر دلِ روزگار میں ہے
مقتولوں کا قحط پڑ نہ جائے
قاتل کی کہیں کمی نہیں ہے

(5)سردار جعفری کی غزلوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کے بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جن پر اقبال کا اثر صاف پہچانا جا سکتا ہے۔کہیں کہیں تو زمین بھی اقبال کی ہے' کہیں قافیے' کہیں موضوع' اکثر تراکیب اور لفظیات بھی اقبال ہی کی ملتی ہیں۔

یہی میرا شعر و نغمہ
یہی میری فکر و حکمت ہے
جو سرور و درد مندی
دلِ بے قرار میں ہے

.....اقبال ہی کی طرح سردار جعفری کی اکثر غزلوں کا لہجہ خطیبانہ ہے۔

(6)''سردار جعفری کا مزاج غزل کی پابندیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔وہ خیال کی رو کے ساتھ لفظوں اور بحروں کے انتخاب کی آزادی چاہتے تھے۔''

(7)''سردار جعفری نے اپنی نظموں میں تو زبان کے تجربے کیے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں وہی کلاسیکی لفظیات ملتی

ہیں۔استعارے بھی وہی ہیں۔علامتیں بھی وہی ہیں مثلاً ترقی پسندوں کے عام استعارات وعلامات مثلاً جنون، ستم، خنجر، تیغ، رات، زنجیر، پیاس صحرا، چمن، قفس، زخم، آتش، آہن، راہ، راہبر، طوفان، ساحل، زنداں وغیرہ۔یہ تمام استعارات وعلامات سردار جعفری کے ہاں موجود ہیں اور عصری مسائل اور حالات کے پس منظر کے ساتھ ان کے مفاہیم میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔''

(8) ''غزل میں ضائع بدائع کی اہمیت اپنی جگہ پر، لیکن سردار جعفری اس قسم کی آرائش کے قائل نہیں۔وہ فکر کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ''اس آرائشی حصے کی وجہ سے ہم بعض اوقات افکار کی بلندی اور وسعت تک نہیں پہنچ پاتے ہیں اور انہیں لفظوں میں سے ہم وسیع تر معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔(کتاب نما خصوصی شمارہ صفحہ 16)

(9) ''سردار جعفری کے ہاں خواب کبھی نہیں مرتے۔وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔اس لیے نظمیں ہوں یا غزلیں ہر جگہ امید فردا کا یہ شاعر رجائی فکر کے موتی بکھیرتا نظر آتا ہے۔زندگی ان کے لیے جینے کا ایک ہنر ہے''۔

کیا حسن ہے دنیا میں کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا اندازِ نظر لے کر

(10) ''کچھ اشعار جو عصری حالات کا احاطہ کرتے ہیں، ان میں طنز کی نشتریت اور تلخی لطیف انداز میں شامل ہوگئی ہے''۔

اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

(11) حیرت ہے کہ سردار جعفری جیسا کٹر مارکس وادی جو اپنی تقریروں میں، تنقیدوں میں نظموں میں اشتراکیت کا راگ الاپتا ہے، اس کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار نہیں ملتے اور نہ ہی ایسی مسلسل غزلیں ہیں جو اشتراکی نظریات کا صاف اعلان کر رہی ہوں۔

(12) غزل میں سردار جعفری وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو صدیوں سے غزل کی میراث ہے۔

(13) ''ویسے بھی سوز وگداز، درد انگیزی حزن وحرماں داخلیت وغیرہ جو غزل کی بنیادی خصوصیات ہیں سردار جعفری کی غزلوں میں مفقود ہیں۔ان کے ہاں ''دل پُرخون'' بہت کم نظر آتا ہے اور اگر آتا بھی ہے تو اس میں ''گلابی'' اور ''دیوانگی'' دکھائی نہیں دیتی۔بس چند گنے چنے اشعار ہیں جن سے دھڑکنے کی صدا آتی ہے۔تڑپنے کی نہیں۔تڑپ ہے بھی تو درد سے خالی۔ان کا دل جذبے کا نہیں، فکر کا مرکز نظر آتا ہے۔اسی لیے وہ ویران وخانہ خراب نہیں ہے۔

(14) ''سردار جعفری اپنی پہلی غزل سے آخری غزل تک کلاسیکی روایات سے اپنا دامن بچا نہیں سکے۔لیکن اپنی نظموں میں انہوں نے لفظوں کی، استعاروں کی، علامتوں کی اور پیکر تراشی اور تجسیم کاری کی جو خوب صورت تصویریں تخلیق کی ہیں وہ ان کی غزلوں میں شاذ ہی ملیں گی۔.....

انہوں نے.....اپنی نظموں میں.....ہر قسم کے تجربے کیے.....لیکن ان کی غزل برائے غزل محسوس ہوتی ہے۔سوائے چند ایک غزلوں کے اور چند گنے چنے اشعار کے، سردار جعفری کی غزلیں وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکیں جو اُن کے ہمعصروں میں خصوصی طور پر فیض اور مجروح کی غزلوں نے حاصل کیں۔.....سردار جعفری کی غزلوں میں ڈھونڈنے سے بھی ایسے خوبصورت

شعر نہیں ملتے جو فیض اور مجروح کے شعروں کی طرح دل میں جاگزیں ہوں، روح میں اتر جائیں اور رگ و پے میں سما جائیں۔ نہ حزن، نہ سوز، نہ گداز، نہ جذبے کی شدت، نہ احساس کی تپش نہ دل کی آگ ان تمام خصوصیات سے سردار جعفری کی غزل محروم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس میدان میں فیض اور مجروح تو دور کی بات ہے سردار جعفری، مخدوم، اختر سعید خاں اور وامق جون پوری تک بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔ سردار جعفری کی نظموں کے بند کے بند بلکہ پوری پوری نظمیں زبان زد خاص و عام لیکن غزلوں کے اشعار بہت کم یاد رکھے جاسکتے ہیں اور ایسی غزلیں تو غالباً وہ ایک ہی ہوں گی جو پوری پوری یاد رکھی جاسکیں۔

مثلاً۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد
ستاروں کے پیام آئے بہاروں کے سلام آئے
ہزاروں نامہ ہائے شوق ..... اہل دل کے نام آئے

(15) غزل کا فن پردے میں رہنے کا فن ہے جذبے کا براہ راست اظہار غزل کے فن کو مجروح کر دیتا ہے۔ سردار جعفری کی خطیبانہ طبع اس کی متحمل نہیں ہوتی۔ ان کی غزلیں زیادہ تر اکہری ہیں۔ تہہ داری کا فقدان ہے۔ اس لیے تاثیر اور سوز و گداز کی کمی ہے۔ ان کی لفظیات وہی ہیں جو اقبال و حافظ کی ہیں لیکن فکر و فلسفے کی جو بلندی ان کی نظموں میں ہیں وہ غزلوں میں اس سطح پر نہیں دکھائی دیتی بلکہ ان کی غزلوں میں ایک مخصوص آہنگ بھی نہیں ملتا جسے سردار جعفری کا اپنا آہنگ کہا جاسکے کہیں اقبال کا رنگ ہے۔ کہیں جوش کا اور کہیں فیض کا۔ کہیں فارسی ڈکشن ہے اور کہیں ہندی کا۔ اس کے باوجود بھی ایک بہت بڑی خوبی جو سردار جعفری کی غزلوں میں موجود ہے وہ یہ کہ تلاش کے باوجود بھی زبان و بیان کی کوئی غلطی نہیں ملتی جو فیض کی غزلوں میں قدم قدم پر مل جاتی ہے" 362

عمر رضا نے سردار جعفری کے شعری مجموعے 'ایک خواب اور' میں شامل غزلوں کا جائزہ لیا ہے اقتباسات پیش ہیں:

(1) ''مجموعہ (ایک خواب اور) میں کل اٹھارہ غزلیں ہیں جو سابقہ غزلوں سے بالکل مختلف ہیں جن میں بھوک، افلاس، فسادات، مظلوم و جابر حکمراں طبقے کے خلاف جارحانہ انداز، غلامی کا کرب، آزادی کی خواہش، امن کا خواب جیسے مضامین کو انقلابی، خطیبانہ اور بیانیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جبکہ 'ایک خواب اور' میں شامل غزلیں موضوع اور فن دونوں اعتبار سے تغزل کا شاہکار ہیں۔"

(2) ایک غزل میں شکست شوق کو تکمیل آرزو، خیال یار کو وصال یار، شب فراق کو گیسوئے مشک بو کہا گیا ہے اور غزل کو بیان غالب اور زبان میر سے سنوارنے کی بات کی گئی ہے۔ غرض اب سردار جعفری کے یہاں کلاسیکی روایات کی طرف مراجعت یا اس سے بھرپور استفادہ کا رجحان نظر آتا ہے۔

شکست شوق کو تکمیل آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ ٔ سبو کہیے
خیال یار کو دیجئے وصال یار کا نام
شب ِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے
شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے
سنواریے غزل اپنی بیان غالب سے
زبان میر میں بھی ہاں کبھو کبھو کہیے

(3)وہ (سردار جعفری) ایک رجائی اور حوصلہ سے پُر شاعری کے طرفدار ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں اگر مایوسی کی جھلک ملتی بھی ہے تو اس کا اختتام امید وانبساط اور حوصلہ مند فکر پر ہوتا ہے۔ ؎

لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

(4)''اب سردار جعفری کی غزلوں میں کلاسیکی روایات، روایتی عشق اور عصری حسیت کا ملا جلا ردعمل پایا جانے لگا تھا جو بے حد دلفریب، حسین اور دلکش ہے۔لغزشِ مستانہ، جرأت رندانہ، ساقی و مینا کا ہجوم، رونق میخانہ، وصل کی صبح، شب ہجر، رعنائی خیال، رعنائی جمال، التفات گل عذاراں اور آفتاب رخ محبوب وغیرہ کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی مختلف سیاسی و سماجی صورت حال پر طنز اور استعاراتی و علامتی انداز میں جس طرح سماجی و سیاسی شعبدہ بازیوں پر انہوں نے کاری ضرب لگائی ہے وہ یقیناً قابل ذکر ہے۔بقیہ غزلوں کے کچھ نمائندہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں..... ؎

وصل کی صبح شب ہجر کے بعد آئی ہے
آفتاب رخ محبوب کا نذرانہ لیے
عصر حاضر کو مبارک ہو نیا دور ِ عوام
اپنی ٹھوکر میں سر ِ شوکت شاہانہ لیے
تیغ منصف ہو جہاں دارورسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
ظلم کی کچھ میعاد نہیں ہے
داد نہیں فریاد نہیں ہے
قتل ہوئے اب تک کتنے
کوئے ستم کو یاد نہیں ہے

آخر روئیں کس کس کو
کون ہے جو برباد نہیں ہے
اسی لیے تو ہے زنداں کو جستجو میری
کہ مفلسی کو سکھائی ہے سرکشی میں نے

363

پیراہن شرر میں شامل ہند پاک تعلقات (1965 جنگ سے قبل اور بعد) سے متعلق غزلوں کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''چار غزلیں یکے بعد دیگرے 18/ 28/ 29/ اور 30/ اگست 1965 کی رقم کردہ ہیں۔ ان غزلوں میں سردار جعفری نے اپنے انہیں مرغوب موضوعات کو تغزل بخشا ہے جس کے ذریعہ وہ امن، محبت اور جنگ سے پاک دنیا کا تصور کرتے ہیں.....اس مجموعے کی نظمیں و غزلیں اس زمانے کی پیداوار ہیں جب ہندو پاک کے درمیان جنگ جیسے حالات پیدا ہو رہے تھے اور دونوں بہت جلد خون کی ہولی کھیلنے والے تھے۔ اس کے لیے دونوں کو معصوم انسانوں کے خون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سے سردار جعفری بے حد فکرمند ہوئے جس کا اظہار انہوں نے مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ ان موضوعات کو انہوں نے نظموں میں تو قدرے وضاحت سے پیش کیا ہے لیکن غزلوں میں انہیں موضوعات کو خوبصورت علامتی و استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے.....ہندو پاک کے درمیان تعلقات میں جوں جوں تلخی آتی گئی توں توں سردار جعفری کا لہجہ بھی تلخ اور واضح ہوتا گیا۔ چنانچہ.....غزلوں میں ان حالات کی عکاسی انہوں نے کسی قدر صراحت اور وضاحت کے ساتھ کی ہے.....لیکن تمام کوششوں کے باوجود یکم ستمبر 1965 کو پاکستان ہندوستان پر حملہ کر ہی دیتا ہے اور ہندوستان بھی اپنی دفاع میں کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کا نقارہ بج جاتا ہے اور خون و بارود کی بو فضا کو ایک خاص قسم کی کیفیت سے دوچار کرنے لگتی ہے۔ ایسے میں سردار کا لہجہ.....تلخ و تند اور طنزیہ ہو جایا کرتا ہے۔ (عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 431 تا 433)

پہلی غزل کے چند اشعار۔

ابر نیساں کی نہ برکت ہے نہ فیضان بہار
قطرے گم ہوگئے تعمیر گہر سے پہلے
جم گیا دل میں لہو، سوکھ گئے آنکھ میں اشک
تھم گیا درد جگر، رنگ سحر سے پہلے
قافلے آئے تو تھے نعروں کے پرچم لے کر
سرنگوں ہوگئی ہر آہ اثر سے پہلے
خون سر بہہ گیا موت آگئی دیوانوں کو
بارش سنگ سے طوفان شرر سے پہلے

دوسری غزل کے اشعار

جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے جو ہیں ساقی بہکے بہکے
انہیں درسِ میکدہ دیں' انہیں ذوقِ انجمن دیں
بڑی دیر ہوچکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے
چلو اب شب سیہ کو نئی صبح کا کفن دیں
لب تیغ پر لہو ہے' لب زخم پر تبسم
یہ حیاتِ تن برہنہ' اسے کیسا پیرہن دیں

تیسری غزل کے اشعار

وہی ہے وحشت وہی ہے نفرت' آخر اس کا کیا ہے سبب
انساں انساں بہت رہا ہے' انساں انساں بنے گا کب
جس کی تیغ ہے دنیا اس کی جس کی لاٹھی اس کی بھینس سب قاتل
ہیں سب مقتول ہیں سب مظلوم ہیں ظالم سب
دیکھئے دن پھرتے ہیں کب تک دیکھئے پھر کب ملتے ہیں
دل سے دل آنکھوں سے آنکھیں ہاتھ سے ہاتھ اور لب سے لب
زخمی سرحد زخمی قومیں زخمی انساں زخمی ملک
حرفِ حق کی صلیب اٹھائے کوئی مسیح تو آئے اب

چوتھی غزل کے اشعار

کس سے پوچھیں کون بتائے صبح کی کب پھوٹے گی کرن
رات کی سرحد مقتل مقتل باندھ کے نکلو سر سے کفن
لے کر پھر قندیل محبت اترو دل کے اندھیرے میں
روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن
جشن ستم ہے ناچ رہے ہیں خنجر تیغیں گاتی ہیں
خون آلودہ شام کے گیسو زخم رسیدہ صبح بدن
کعبۂ دل میں بیٹھے ہیں اب بھی صدیوں کے فرسودہ بت
رنگ و نسل و شیخ و برہمن مذہب و ملت ملک و وطن

عمر رضا نے شعری مجموعہ پیراہن شرر کی پانچویں غزل کے بارے میں لکھا ہے:

''مجموعہ کی پانچویں اور آخری غزل 30 ستمبر 1965 کی تخلیق کردہ ہے.....اب جبکہ جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے' سردار جعفری کے لہجے کی تلخی بھی چھٹتی نظر آتی ہے مثلاً جنگ کے دوران یا اس سے قبل جنگ جیسے حالات کے پیش نظر ان کی نظموں کو تو چھوڑیے غزلوں میں بھی جس تلخی کا احساس ملتا ہے' وہ قابل دید ہے جسے سردار جعفری کے فطری مزاج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن اب جب کہ حالات معمول پر ہیں' ان میں ایک خاص قسم کی سرمستی اور سرشاری آ گئی ہے جس کا اظہار انہوں نے اس غزل میں بخوبی کیا ہے۔ پُرمسرت حالات کی عکاسی کے لیے سردار جعفری نے اسی کی مناسبت سے الفاظ' تشبیہات' استعارات اور علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس سے غزل میں تغزل' شعریت' لطافت' موسیقیت' نغمگی اور وہ تمام شعری لطافتیں در آئی ہیں جس سے شاعری اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ 364

کیا حسن ہے دنیا میں کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا انداز نظر لے کر
ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی
نکلو تو ذرا گھر سے اک ذوقِ سفر لے کر
راہیں چمک اٹھیں گی خورشید کی مشعل سے
ہمراہ صبا ہوگی خوشبوئے سحر لے کر
مخمل سی بچھا دیں گے قدموں کے تلے ساحل
دریا امڈ آئیں صد موج گہر لے کر

سردار جعفری کی غزلوں کے بارے میں ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''رعنائی خیال اور ذوق جمال کی کارفرمائی کے باوجود ان کی غزلیں حسن و عشق کی فرسودہ داستان نہیں بلکہ انسانی زندگی کے مسائل و مشکلات کی ترجمان ہیں' انہوں نے اردو کی کلاسیکی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں اپنے انقلابی افکار کو بڑی خوبصورتی سے سمو دیا ہے'' 365

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے:

انہوں نے (سردار جعفری) اپنی غزلوں میں بھی زندگی کے ٹھوس حقائق کا دوٹوک اظہار کیا ہے' محبت کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا ہے۔ خوابوں کے طلسم کو توڑا اور زندگی کے بے معنی اور غیر حقیقی رشتوں کو مسترد کیا اور غربت' افلاس' بھوک اور ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کے ساتھ ساتھ غلامی کا کرب' آزادی کی تمنا اور امن کا خواب جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔'' 366

سردار جعفری کی غزل گوئی کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز الحق رقمطراز ہیں:

(1) ''سردار جعفری نے ابتدائی دور میں غزلیں کم کہیں۔ ان غزلوں میں بھی خطابت کا جوش اور بیانیہ انداز نظر آتا ہے۔

ان کی غزلوں میں قوت اور توانائی ہے۔وہ ہر فرسودہ روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔اسی لیے اس میں بلا کی سرکشی ہے"۔

(2) خون کی لکیر (1949) میں چار غزلیں "پیراہن شرر (1965) میں چھ غزلیں لہو پکارتا ہے (1978) میں سولہ غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں۔ 1978 میں ہی لاہور سے چونتیس غزلوں کا ایک مجموعہ "غزلیں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ابتدائی دور کی غزلوں میں نظم کا انداز حاوی ہے۔ان میں تفصیل، تسلسل بیان اور براہ راست گفتگو کی خوبیاں ہیں۔1949 کی ایک غزل کا موضوع یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی وہ تبدیلی نہ آسکی جس کے ہم خواہاں تھے"۔غزل کا مطلع یہ ہے۔

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظام دار و رسن وہی ہے

ایک دوسری غزل کا یہ شعر بھی اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے۔

فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے، اگر یہی ہے نیا زمانہ

(3) "ترقی پسند ادب میں فن کے متعلق فارمولے، بے لچک نظریات اور بندھے ٹکے موضوعات کی وجہ سے بڑی یکسانیت اور تکرار پیدا ہوگئی تھی۔اس کی وافر مثالیں سردار جعفری کی غزلوں میں بھی ملتی ہیں۔1974 کا یہ شعر دیکھیں۔ مندرجہ بالا مطلع اور اس شعر میں کس قدر یکسانیت ہے۔"

وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

(4) "سردار کی غزلوں میں مرد مومن کی حق گوئی و بیباکی، بلند آہنگی، روانی اور ترنم اقبال کے اثرات کا پتہ دیتے ہیں"۔

یہی میرا شعر و نغمہ یہی میری فکر و حکمت
جو سرور و درد مندی دل بے قرار میں ہے

(5) "سردار جعفری نے اپنی ایک غزل کے دو شعر میں اپنے شعری مزاج کی نشاندہی کی ہے۔"

حرف سردار میں پوشیدہ ہے اسرار حیات
شعر سردار میں ہے سرکشی و سرشاری
شعر سردار میں ہے شعلۂ بیباک کا رنگ
حرف سردار میں حق گوئی و خوش گفتاری

(6) "اس دردمندی، سرور و سرشاری اور خوش گفتاری کے باوجود ان کی انقلابی روح ان کے اشعار میں پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔وہ ایک بہتر دنیا کے متمنی ہیں۔ان سے مظلوم کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔اس لیے وہ ظلم کے خنجر کو تو ڑ ڈالنا

چاہتے ہیں۔وہ سیلاب بلا سے اس لیے خوش ہیں کہ وہ صدیوں کی غلاظت کو بہالے جائے گا۔شاخ گل نے بھی ظلم کے خلاف تلوار کھینچ لی ہے۔وہ راتوں کی سیاہی کو دور کرنے کے لیے اپنے اشعار میں شعلۂ بیباک کا رنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں"۔

توڑ کر ظلم کے خنجر کو زمیں پر پھینکیں
کردیں محروم ستم دست ستم کوشی کو
کاش صدیوں کی غلاظت کو بہالے جائے
عصر نو ہم ترے سیلاب بلا سے خوش ہیں
شاخ گل ہے کہ یہ تلوار کھنچی ہے یارو
باغ میں کیسی ہوا آج چلی ہے یارو
بہت سیاہ ہیں راتیں بہت اندھیرا ہے
کوئی بھی حرف بجز شعلہ ٔ نوانہ کہو

(7)"فقر بھی انقلابی روح کے بغیر ان کے یہاں قابل قبول نہیں"۔

انقلابی ہو تو ہے فقر بھی توقیر حیات
ورنہ ہے عاجزی و بے کسی و عیاری

(8)"انسانی عظمت کے اعتراف، خودداری اور اپنے قوت بازو پر اعتماد کے ذریعہ ہی وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں"۔

یہ اپنا جام ہے جام سفائیں ہو کہ چلّو ہو
کبھی پیتے نہیں مانگے ہوئے زریں پیالے سے
ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغ کہکشاں ہیں
یہ ہجوم ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے
اک دھوپ سی ہے جو زیر مژگاں
وہ آنکھ ابھی اٹھی نہیں ہے
دیکھتے رہئے کہ ہوجائے نہ کم شان جنون
آئنہ بن کے خود اپنے ہی مقابل رہئے

(10)اس میں دو رائیں نہیں کہ سردار جعفری کے یہاں توانائی اور مردانگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔وہ ہر فرسودہ روایت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔اسی لیے ان کے یہاں بلا کی سرکشی آجاتی ہے اور کبھی کبھی یہ سرکشی یہ رخ بھی اختیار کرلیتی ہے"۔

کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا
سرکشی دل کو نیا ذوق گنہگاری دے

(11) کاش سردار اپنی شاعری کو اس خنجر عیاری کی کاٹ سے بچا لیتے تو ہمیں ان کی قادرالکلامی اور تنقیدی شعور کی بدولت غزل کے اچھے اشعار وافر مقدار میں مل جاتے۔''

تم تو گھر سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا
تیغ ہاتھ میں کیوں ہے دوش پہ کماں کیوں ہے

367

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے علی سردار جعفری کی غزل کوئی کا جائزہ لیا ہے۔اُس سے چند اقتباسات پیش ہیں:

(1) ''بنیادی طور پر ان کا طبعی میلان نظم کی طرف تھا لیکن انہوں نے غزل کو بھی لائق اعتنا سمجھا۔ان کی غزلوں میں زندگی کی سچائیوں کا دوٹوک اظہار ہوا ہے۔سردار نے محبت کو ارضی روپ میں پیش کیا۔خوابوں کے طلسم کو توڑا' زندگی کے غیر حقیقی رشتوں سے اجتناب کیا اور بھوک' افلاس' مساوات' مظلوم و جابر حکمراں طبقے کے خلاف بغاوت' غلامی کا کرب' آزادی کی خواہش' امن کا خواب جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں میں برتا۔انہوں نے اپنی غزلوں سے وہی کام لیا ہے جو وہ نظموں سے لیتے رہے ہیں''۔

(2) ''انہوں نے زنداں' دار و رسن' رات' قفس' لہو' صبح شہادت' شور سلاسل' ظلم اور جور' مقتل جیسے استعاروں کو صدیوں پرانے مفاہیم سے ہٹا کر نئے معنیاتی نظام کے لیے برتا ہے جس سے ان کی معنویت میں جدت اور ہمہ جہتی پیدا ہو گئی ہے۔ بطور مثال چند اشعار دیکھئے۔

صبح زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا ہجوم
شمع کی طرح فروزاں سر دیوار آنکھیں
کام اب کوئی نہ آئے گا اس ایک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ ٔ قاتل کے سوا
تیغ منصب ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا
وطن سے دور یاران وطن کی یاد آتی ہے
قفس میں ہم نوایان چمن کی یاد آتی ہے

(3) ''کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بعض غزلیں کسی ایک مرکزی احساس یا فکر کی تابع ہیں۔ایسی غزلوں کو ''نظم نما غزل'' کہہ سکتے ہیں:۔

امتحاں بزم وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے' اسے یزداں کہئے

''پتھر کی دیوار'' تک آتے آتے مزید کچھ رچاؤ آجاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سردار جعفری کو احساس تھا کہ پرانا سماج اور نظام اب مر رہا ہے اور اس کے بطن سے نیا سماج پیدا ہو رہا ہے۔پھر انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کی شاعری نالۂ نیم شبی ہے اور آہ سحر گاہی نہیں ہے..... ''پتھر کی دیوار'' میں مشمولہ یہ غزل ملاحظہ فرمائیں:۔

گرم ہے اب کی بہت گرم ہوائے کشمیر
دہکی دہکی نظر آتی ہے فضائے کشمیر
جانے کس پر یہ نگاہ غلط انداز پڑے
بہکی بہکی سی ہے کچھ دن سے ادائے کشمیر

کشمیر کی تکرار نے اسے ایک پس منظر دے دیا ہے۔فضائے کشمیر' ادائے کشمیر' بہائے کشمیر' خدائے کشمیر' ردائے کشمیر' عطائے کشمیر' نوائے کشمیر اور ہوائے کشمیر۔صاف پتہ چلتا ہے کہ اصلاً شاعر نظم کا ہے اور وہ نظم کے ڈھانچے میں غزل لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ویسے ''نظم نما غزل'' لکھنے کی یہ کوئی نئی روایت نہیں۔غالب اور اس کے بعد اقبال کی بیشتر ایسی غزلوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے''۔

(4) ''ہند و پاک مشاعرے کے موقع پر کہی گئی غزل' کلاسیکی سج دھج رکھتی ہے۔بیس اشعار پر مشتمل اس غزل میں الفاظ وہی استعمال ہوئے ہیں جو ہماری کلاسیکی شاعری کے جانے بوجھے الفاظ ہیں مثلاً شمیم گل' بہار رفتہ' ابر نو بہار' محفل رنداں' جشن بادہ پیمائی' چشم ساقی' قامت رعنا' کوئے دوست' ضبط غم' سرفروشی' زخم دل' خون ناحق' لالہ و گل' تیشہ زن' فصل گل' روز محشر' روز حساب' گنبد سرنگوں' جہان نو' تقدیر عالم' رنگ مئے' حسن نگاراں' جشن گل' شاعر آتش نوا وغیرہ لیکن ایسی ترکیبوں اور الفاظ کے باوجود غزل کے مزاج کی تبدیلی کا احساس بخوبی ہو جاتا ہے۔

(5) ''ایک خواب اور'' تک پہنچتے پہنچتے دارورسن کے گیت' غزل میں کچھ نئے انداز میں ڈھلنے لگتے ہیں..... ''ایک خواب اور'' کی تمام غزلوں میں ایک خاص قسم کا رچاؤ' ایک خاص قسم کی عظمت' ایک خاص قسم کا وقار اور ایک خاص قسم کی سج دھج ہے۔ایک ایسا رچاؤ' ایک ایسا قطار' ایسی شائستگی' ایسی عظمت اور ایسا آہنگ جو واقعتاً غزل کو غزل بناتی ہے مثلاً یہ غزل:۔

خیال یار کو دیجئے وصال یار کا نام
شب فراق کو گیسوئے مشک بو کہئے

(6) ایسے اشعار بھی اس مجموعے میں مل جاتے ہیں جس سے سردار جعفری کی ترقی پسندی پوری پوری ابھر جاتی ہے۔

ظلم کی کچھ میعاد نہیں ہے
داد نہیں فریاد نہیں ہے
قید چمن بھی بن جاتا ہے
مرغ چمن آزاد نہیں ہے
سب ہوں شاداں سب ہوں خنداں
تنہا کوئی شاد نہیں ہے

تر ہوگی زمیں اور ابھی خون بشر سے
روئے گا ابھی دیدۂ خونابہ فشاں اور

ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

دست غیب کی طرح چھپا ہے ظلم کا ہاتھ ستم کا دار
خنک لہو کی بارش دیکھی ہم نے کوچہ و برزن میں

(7) ''اس مجموعے میں ایک ایسی غزل بھی ہے جو ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است'' کی مصداق کہی جا سکتی ہے۔ وہ غزل یہ ہے''۔

خزاں ہے چار دن کی پھر بہاراں
چمن، محبوب، جشن مے گساراں
کڑی ہے زندگی کی دھوپ لیکن
ہری شاخ نہال یاد یاراں

(9) ''سردار غزل کوئی میں نامانوس الفاظ، تشبیہات و استعارات سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے روایتی تشبیہہ و استعاروں کو ہی ترجیح دی ہے۔'' 368

اپنے ایک دوسرے مضمون میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے یہ بھی لکھا ہے:

''ان کی (سردار جعفری) غزلوں میں ایک Protest کا احساس ہوتا ہے اور یہ کلاسیکی لفظیات کو نئے معنی میں پرونے سے پیدا ہوا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

تمام دولت کونین ہے خراج اس کا
یہ دل نہیں کسی ٹوٹے ہوئے نگر کی طرح
عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم
اسی دنیا میں دکھادیں تمہیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی کبھی کوئے بتاں میں آؤ
صحن زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا ہجوم
شمع کی طرح فروزاں سر دیوار آنکھیں

راہ میں فوجوں کے پہرے سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکت شاہانہ ہم
حماقتوں کی سیاست ہے جن کا فن سردار
اب ان سے کہیے تو کیا حاجت رفو کہیے

369

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں "ترقی پسند تحریک کے بعض شاعروں نے ایک عرصہ تک غزل کی ہزل گوئی میں کسر اٹھا نہ رکھی لیکن انہوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس سے غزل کی آبرو میں کمی تو نہیں ہو رہی ہے۔ وہ خود بے آبرو ہو رہے ہیں تو ان کو یہ رویہ مجبوراً ترک کرنا پڑا اور پھر غزل ایسے شاعروں کی بھی محبوب بن گئی۔ سردار جعفری نے ابتداً غزلیں کم کہیں، لیکن غزل کے تعلق سے ان کا موقف ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا..... اچھی غزل کی پہچان بھی یہی ہے اور ہونی چاہیے کہ غم عشق اور غم روزگار ہم آہنگ ہو جائیں۔ سردار جعفری کے ہاں غزل نہ غم عشق کے لیے مخصوص ہے اور نہ غم روزگار کے لئے۔ ان کے ہاں غزل ہر رنگ اور ہر روپ میں ملتی ہے۔ تغزل سے بھرپور بھی۔" 370

بکل اتساہی نے لکھا ہے:

"ان کی (سردار جعفری) کی غزلیہ شاعری میں رومی، حافظ اور میر تقی میر کے فکر و فن کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکی شاعری کے رموز و علائم بھی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مذہبی روایات و تلمیحات بڑی احتیاط کے ساتھ اپنایا ہے مذہبی اور سماجی ریاکاری سے انحراف کیا ہے اور ملک و سماج کی معیشت کو زوال کی طرف جاتے دیکھا وہیں ان کا قلم چیخ اٹھا۔" 371

سردار جعفری نے اپنی بعض غزلوں میں اپنی شاعری پر خود تبصرہ بھی کیا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

حرف سردار میں پوشیدہ ہیں اسرار حیات
شعر سردار میں ہے سرکشی و سرشاری
شعرِ سردار میں ہے شعلۂ بیباک کا رنگ
حرف سردار میں حق گوئی و خوش گفتاری
گلشن کہو تم یا چمن ہے اہل دل کی انجمن
صد بلبل شوریدہ سر، صد لالۂ خونیں کفن
وہ گل بھی ہے سورج بھی ہے بجلی بھی ہے بادل بھی ہے
دیکھا نہ تھا پہلے کبھی ایسا حسیں بانکا سجن
پیکر کو اس کے شعر کے پیکر میں کیوں کر ڈھالیے
خاموش ہیں حیراں ہیں سب شہر یاران سخن
آؤ چلیں دیکھیں ذرا وہ جانِ عالم کون ہے
سردار کے شعروں میں ہے زلفِ معنبر کی شکن

عقیدے بجھ رہے ہیں شمع جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوق جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی
خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمین کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی
اگر یوں ہے تو کیوں ہے یوں نہیں تو کیوں نہیں آخر
یقیں محکم ہے لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی
لہو جتنا تھا سارا صرف مقتل ہوگیا لیکن
شہیدان وفا کے رخ کی تابانی نہیں جاتی
پریشاں روزگار آشفتہ حالاں کا مقدر ہے
کہ اس زلف پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی
ہر اک شئے اور مہنگی اور مہنگی ہوتی جاتی ہے
بس اک خون بشر ہے جس کی ارزانی نہیں جاتی

عمر رضا لکھتے ہیں:

''محولہ بالا اشعار میں جن خیالات وافکار کو سردار جعفری نے پیش کیا ہے، وہ آج بھی صد فیصد درست اور دنیا کی ایک تلخ حقیقت ہے جس سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پوری دنیا میں جس طرح سے آج انسانی خون کی ارزانی ہو رہی ہے اس سے کوئی بھی فرد نابلد نہیں۔ 372

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے کہ سردار جعفری کے شعری مجموعہ ''خون کی لکیر (1949ء) میں غزلیں بھی ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی وسماجی شعور بسا ہوا ہے جو خالص ترقی پسند ذہن وفکر کی دین ہے۔

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظام داورسن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے ساز کہن وہی ہے
حقیر ہو کر نہ رہ سکے گی تری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدے سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آشیانہ
خلیق بھی ہے شفیق بھی ہے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیر مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

373

نظموں کی طرح غزلوں میں بھی آزادی کے بعد قومی حکمرانوں کی کارکردگی پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا۔
آزادی کے بعد جس طرح کے حالات رونما ہوئے اس سے سردار جعفری نے اسی عدم اطمینانی اور ناخوشی کا اظہار نظموں کی طرح غزلوں میں بھی کیا ہے اور حکومت وقت کی نکتہ چینی کی ہے مجموعہ ''خون کی لکیر'' میں شامل یہ غزلیں ملاحظہ کیجئے۔

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظام دار و رسن وہی ہے
فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حریت کی برات آئی
ترنگی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکر و فن وہی ہے

ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمہ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے ساز کہن وہی ہے
وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

مرے لیے ایک سے ہیں دونوں وہ کوئی صیاد ہو کہ گل چیں
نظام گلشن میں شاخ گل سے الگ نہیں شاخ آشیانہ
فریب دے کر حیاتِ نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ
خلیق بھی ہے شفیق بھی ہے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیر مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

1948 کو لکھی گئی سردار جعفری کی غزل میں عمر رضا نے طنز کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''25 ستمبر 1948' رقم کردہ شامل مجموعہ (خون کی لکیر) غزل میں بھی حکومت وقت پر طنز کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اب تو بزم وطن میں وفاداری کا امتحان دینا پڑ رہا ہے جس کے کچھ ایسے اصول مقرر کیے گئے ہیں جس کے تحت اہرمن جو تخت نشیں ہے اسے یزداں کہنا پڑ رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے شاعروں اور ادیبوں کو ان کے مطابق اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لیے فرمان جاری کیے جا رہے ہیں۔ درندوں کو انسان کا لباس پہنانا' انسانوں کو جی کھول کر حیوان ثابت کرنا عام بات ہے۔ حد تو یہ

ہے کہ اگر آپ کو خاک وطن سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کرنا ہے تو خس و خار کو بھی رشک گلستاں کہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ 374
اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

امتحاں بزم وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے، اسے یزداں کہئے
کیجئے روح کو تیار غلامی کے لیے
شوق آزادی انساں کو گریزاں کہیے

یہ نہ کہئے کہ حکومت ہے مصائب کا سبب
گردش ِ چرخ ِ کہن، گردش ِ دوراں کہیے
کیجئے شاعری اس طرح کہ سمجھے نہ کوئی
ظلم اور جور کو بھی نازحسیناں کہیے

ہر درندے کو پہنا دیجئے انساں کا لباس
اور جی کھول کے انساں کو حیوان کہیے

کیجئے کو چہ و بازار میں لاشوں کا شمار
اور پھر ہند کو فردوس ِ بداماں کہیے
چارہ گر جانیے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو اور درد کو درماں کہیے
تن سے چھن جائے تو رہزن کو دعائیں دیجئے
چاک ہو جائے تو دامن کو گریباں کہیے

مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' میں شامل اس غزل میں سیاسی و سماجی صورتحال پر اپنی عدم اطمینانی کا اظہار استعاراتی اور علامتی انداز میں کیا ہے۔

شاخ گل ہے کہ یہ تلوار کھنچی ہے یارو
باغ میں کیسی ہوا آج چلی ہے یارو
کون ہے خوف زدہ جشن ِ سحر سے پوچھو
رات کی نبض تو اب چھوٹ چلی ہے یارو

بوئے خوں آتی ہے ملتا ہے بہاروں کا سراغ
جانے کس شوخ ستمگر کی گلی ہے یارو
یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کا عروج
یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو

7رمئی 1974 کو لکھی گئی غزل میں سردار جعفری نے موجودہ ملکی حالات کے غیر جمہوری رویے پر طنز کیا ہے: ؎

وہ صبح گل وہ جوشِ شام بادہ ہے کہاں ساقی
نہ جشن دل نہ فصل روئے سادہ ہے یہاں ساقی
مذاقِ عاشقی اک جرم ہے ان کی سیاست میں
متاع دلبری ہے تیغ و شمشیر و سناں ساقی
خبر ہے زخم کا ہے نام تمغائے وفاداری
سنا ہے تیغ ہے پیغمبر امن و اماں ساقی
یہ محفل ہے کہ مقتل گاہ ہے اہل تمنا کی
یہاں تو بات کرنے پر بھی کٹتی ہے زباں ساقی

ذیل کی غزل میں بھی موجودہ صورتحال سے اپنی عدم اطمینانی کا اظہار کیا ہے لیکن لہجہ میں جھنجھلاہٹ یا تیزی نہیں بلکہ نرم و مدھم لب ولہجہ میں طنز ہے۔

اک صبح ہے جو ہوئی نہیں ہے
اک رات ہے جو کٹی نہیں ہے
مقتولوں کا قحط پڑ نہ جائے
قاتل کی کہیں کمی نہیں ہے
بھوکوں کی نگاہ میں ہے بجلی
یہ برق ابھی گری نہیں ہے
دل میں جو جلائی تھی کسی نے
وہ شمع طرب بجھی نہیں ہے
ہیں کام بہت ابھی کہ دنیا میں
شائستہ آدمی نہیں ہے

13رفروری 1974 کی لکھی ہوئی غزل میں موجودہ صورتحال کی ابتری کا ذکر: استعاروں اور علامتوں میں کیا گیا ہے۔

صبح کے اجالے پر رات کا گماں کیوں ہے
جل رہی ہے کیا دنیا چرخ پہ دھواں کیوں ہے

قافلے بھٹکتے ہیں منزل تمنا پر
عشق کیوں ہے سرگرداں حسن بے نشاں کیوں ہے
تم تو گھر سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا
تیغ ہاتھ میں کیوں ہے دوش پہ کماں کیوں ہے
اک جہاں میں شہرت ہے تم بڑے مسیحا ہو
پھر یہ شاہراہوں پر درد کی دکاں کیوں ہے
قتل کر کے آئے ہیں اور تن کے بیٹھے ہیں
پوچھتے ہیں حیرت سے نالہ و فغاں کیوں ہے

ایک غزل (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں سردار جعفری نے انسان کی بے حسی اور سرد مہری کو دور کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

سرد ہیں دل آتش ِ روئے نگاراں چاہیے
شعلہ ٔ رنگ ِ بہار گل عذاراں چاہیے
منزل ِ عشق و جنوں کے قافلے ہیں سربکف
ان کٹھن راہوں میں لطف دست یاراں چاہیے

سردار جعفری نے دنیا میں بھوک، افلاس اور ظلم و استحصال اور خاص طور پر ایشیا اور افریقہ کے عوام کی بے بسی اور بے قراری کا نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ کیجیے۔

یہ بے کس و بے قرار چہرے
صدیوں کے یہ سوگوار چہرے
مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہیروں کی طرح ہزار چہرے
لے جا کے انہیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شاہکار چہرے
افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادر ِ روزگار چہرے
کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث
کل رات کے یادگار چہرے

کوئی ہو موسم تھم نہیں سکتا رقص جنوں دیوانوں کا
زنجیروں کی جھنکاروں میں شور بہاراں باقی ہے
عشق کے مجرم نے یہ منظر اوج دار سے دیکھا ہے
زنداں زنداں محبس محبس حلقہ یاراں باقی ہے
برگ زرد کے سایے میں بھی جوئے ترنم جاری ہے
یہ تو شکست فصل خزاں ہے صوت ہزاراں باقی ہے

مذکورہ بالا غزل میں سردار جعفری کی بے چینی اور بے قراری کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنی غزل کے ایک شعر میں Sadist یعنی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں دوسروں کو دکھ زدہ دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔

نغمہ بن جاتا ہے نالہ ان کی بزم ناز میں
ان کے خوش رکھنے کو شور سوگواراں چاہیے

سردار جعفری نے ہندو پاک مشاعرے کے موقع پر ایک غزل کہی جس میں دوستانہ ماحول کو فروغ دینے اور اتحاد کی شمع جلانے پر زور دیا گیا ہے۔اس میں دلکش رومانی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے غزل کے ابتدائی تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

پھر شمیم گل نوید جانفزا لائی ہے آج
میرے گلشن میں بہار رفتہ پھر آئی ہے آج
پھر اٹھا ہے وادیِ گنگا سے ابر نو بہار
سمت راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج
آج پھر ہے اتحاد شیشہ و ساغر کا دور
محفل رنداں میں جشن بادہ پیمائی ہے آج

سردار جعفری کے شعری مجموعہ ''خون کی لکیر'' میں چار غزلیں بھی شامل ہیں۔ان میں پہلی غزل کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''پہلی غزل کا انداز غزل کی مناسبت سے رومانی ہے۔اس میں سردار جعفری نے اپنے والہانہ عشق کے جذبات کو پیش کرتے ہوئے محبوب اور محبوب سے اپنی محبت کی تمام تر کیفیتوں کا بڑا ہی دلفریب لیکن غیر مبہم انداز میں ذکر کیا ہے۔خاص طور پر ابتدائے عشق میں معشوق جس طرح کی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے اس کا ذکر انہوں نے مختلف تشبیہوں' استعاروں اور علامتوں کے سہارے کیا ہے۔البتہ یہ استعارے اور علامتیں ابہام پیدا نہیں کرتیں' کیونکہ سردار جعفری ادب میں ابہام کو زہر قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ایسی وضاحت ضروری ہے جو سنتے ہی سمجھ میں آجائے مذکورہ غزل میں اس کی شدید پیروی کی گئی ہے۔

حسن کی رنگین ادائیں کار گر ہوتی گئیں
عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوتی گئیں
یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں
زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی
ان کی نظریں بخیۂ چاکِ جگر ہوتی گئیں
لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں
آرزوئیں نارسائی کا گلہ کرتی رہیں
اور وہ لغزیں زینتِ دوش و کمر ہوتی گئیں

محولہ بالا غزل میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ سے محبت و التفات اور ہجر و وصال کی باتیں کی گئی ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے جو غزل کے روایتی فن و اسلوب مثلاً ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ، مجاز و تمثیل، استعارہ و تشبیہہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ابہام نہیں ہے۔

''سردار جعفری کے شعری مجموعے'' خون کی لکیر'' میں نظمیں (ایک جھلک) غم کا ستارہ، حسن سوگوار، تذبذب، حسن ناتمام، لکھنو کی ایک شام، خیر مقدم، اکیلا ستارہ، سرمایہ دار لڑکیاں، مزدور لڑکیاں، انتظار نہ کر، عہد حاضر، ایک سوال، وہم و خیال، نیا زمانہ، آتشیں ستارہ، ایک خط اور ایک غزل) کہیں تو خالص رومانی دنیا آباد ہے اور کہیں رومان و انقلاب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے لیکن بنیادی طور پر ان میں سردار جعفری نے جس طرح کا لہجہ اختیار کیا ہے، اسے رومانی کہنا زیادہ مناسب معلوم پڑتا ہے کیونکہ بیشتر نظموں میں حسن و عشق کی رعنائیوں، دل فریبیوں اور مچلتی جوانیوں کا ذکر ہے''۔ 375

سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' میں متفرقات کے تحت کچھ خالص رومانی غزلیں ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تمہارے اعجاز حسن کی میرے دل پہ لاکھوں عنایتیں ہیں
تمہاری ہی دین میرے ذوق نظر کی ساری لطافتیں
میں جن بہاروں کی پرورش کر رہا ہوں زندان غم میں عدم
کسی کے گیسو چشم و رخسار و لب کی رنگیں حکایتیں ہیں
یہ شاعری عصر نو کی پیغمبری زمانے کی داوری ہے
لبوں پہ میرے صحیفۂ انقلاب کی سرخ آیتیں ہیں

دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے
بہے پسینہ مکھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے
من اک ننھا سا بالک ہے ہمک ہمک' رہ جائے ہے
دور سے مکھ کا چاند دکھا کر کون اسے للچائے ہے
مئے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے
تیرے قامت کی لرزش سے موج مے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے

سردار جعفری نے محبوب کی آمد پر عاشق کی کیفیات کا خوب صورت نقشہ کھینچا ہے۔

شمع کاے کا شفق زار کا گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ
نہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطف اقرار ہے یا شوخیِ انکار کا رنگ
آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ
عکس ساقی سے دمک اٹھی ہے ساغر کی جبیں
اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلنار کا رنگ
ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے درو دیوار کا رنگ
وصال و ہجر کی راہوں میں روشنی ہوگی
دلوں میں لے کے چراغِ جمالِ یار چلو
اس باغ میں آئی ہے اک محبوبۂ گل پیرہن
شیریں نوا' شیریں ادا' شیریں سخن' شیریں دہن
وہ گل بھی ہے' سورج بھی ہے' بجلی بھی ہے' بادل بھی ہے
دیکھا نہ تھا پہلے کبھی' ایسا حسیں ' بانکا سجن
پیکر کو اس کے' شعر کے پیکر میں' کیونکر ڈھالیئے
خاموش ہیں' حیران ہیں' سب شہریاران سخن

زبان تیغ سے کرتے ہیں پرسشِ احوال
اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے
جہاں جہاں بھی خزاں ہے، وہیں وہیں ہے بہار
چمن چمن یہی افسانۂ نمو کہیے
کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
تیغِ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
گزرتا رہتا ہے یادوں کی کہکشاں سے کوئی
مگر کسی کا ہر اک لمحہ انتظار بھی ہے
ہم نے دنیا کی ہر اک شئے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

24، 25 فروری 1971 کو لکھی گئی ایک غزل میں محبوب کی خوبصورتی کی استعاراتی انداز میں تعریف کی گئی ہے۔ چند اشعار میں سیاسی و سماجی حالات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

شمع کا مئے کا شفق زار کا گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ
تہہ عارضِ جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطفِ اقرار ہے یا شوخیِ انکار کا رنگ
آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ
شفقِ صبحِ شہادت سے ہے تابندہ جبیں
ورنہ آلودۂ خوں تھا افقِ دار کا رنگ

سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' میں متفرقات کے تحت کچھ غزلیں رومان اور انقلاب کے حسین امتزاج سے معمور نظر آتی ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

بھٹک رہی ہے اندھیرے میں زندگی کی برات
کوئی چراغ سرِ رہ گزر جلاتا جا
گزر چمن سے مثالِ نسیمِ صبحِ بہار
گلوں کو چھیڑ کے کانٹوں کو گدگداتا جا

رہ دراز ہے اور دور شوق کی منزل
گراں ہے مرحلہ ٔ عمر گیت گاتا جا
بلا سے بزم میں گر ذوق نغمگی کم ہے
نوائے تلخ کو کچھ تلخ تر بناتا جا
جو ہوسکے تو بدل زندگی کو خود ورنہ
نژاد نو کو طریق جنوں سکھاتا جا

آندھیاں چلتی رہیں افلاک تھراتے رہے
اپنا پرچم ہم بھی طوفانوں میں لہراتے رہے
کاٹ کر راتوں کے پربت عصر نو کے تیشہ زن
جوئے و چشمہ نور سحر لاتے رہے
کاروان ہمت جمہور بڑھتا ہی گیا ہے
شہر یار و حکمراں آتے رہے جاتے رہے
رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مدعا
قافلوں کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے جس قدر
بڑھتا گیا ظالم ہواؤں کا خروش
اس کے کاکل اور بھی عارض پہ لہراتے رہے
پھانسیاں اگتی رہیں زنداں ابھرتے ہی رہے
چند دیوانے جنوں کے زمزمے گاتے رہے

سردار جعفری رجائی شاعر ہیں، وہ ہمیشہ پُرامید اور حوصلہ مند رہنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔

ذوق ِ آرائش و گل کاری اشک خوں سے
کوئی بھی فصل ہو فردوس بداماں چلئے
آسمانوں سے برستا ہے اندھیرا کیسا
اپنی پلکوں پہ لیے جشن ِ چراغاں چلئے
شعلہ ٔ جاں کو ہوا دیتی ہے خود باد سموم
شعلہ ٔ جاں کی طرح چاک گریباں چلئے
غم نئی صبح کے تارے کا بہت ہے لیکن
لے کے اب پرچم خورشید زر افشاں چلئے

سربکف چلنے کی عادت میں نہ فرق آجائے
کوچہ ٔ دار میں سرمست و غزلخواں چلئے

1966 میں لکھی غزل (مشمولہ لہو پکارتا ہے) میں سردار جعفری نے انسان کو ہر حال میں خوش وخرم رہنے، زندگی کے نشیب وفراز سے محتاط رہنے کی بات کہی ہے:

فصل گل، فصل خزاں جو بھی ہو خوش دل رہئے
کوئی موسم ہو، ہر اک رنگ میں کامل رہیے
موج و گرداب و تلاطم کا تقاضا ہے کچھ اور
رہئے محتاط تو بس تالب ساحل رہیے
دیکھتے رہیے کہ ہوجائے نہ کم شان جنوں
آئنہ بن کے خود اپنے ہی مقابل رہیے
ان کی نظروں کے سوا سب کی نگاہیں اٹھیں
محفل یار میں بھی زینت محفل رہیے
جانئے دولت کونین کو بھی جنس حقیر
اور دربار پہ اک بوسے کے سائل رہیے

لہو پکارتا ہے میں شامل غزلوں کے اشعار میں رجائیت ملاحظہ ہو ۔

انہیں سے پھول کھلیں گے لہو لہان ہیں پاؤں
ابھی تو دشت ِ طلب میں بہت ہیں خار چلو
عدو کے تیغ ستم سے مقابلہ ہے ابھی
بھلا کے ظلم رفیقان ِ کم عیار چلو
اسی امید میں بیتابی جاں بڑھتی جاتی ہے
سکون دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے
نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے نا تمام آئے

(فروری1975)

زندگی کیا ہے بس اک گردش ِ پیمانۂ رنگ
صبح بھی آئی ہے آئی ہے جو شام اے ساقی

جس میں شوخی بھی، شرارت بھی، رفاقت بھی ہو
ایک بار اور وہی طرزِ کلام اے ساقی

(14/اگست 1975)

ابھی زندگی حسین ہے ابھی ذکر موت کیسا
ابھی پھول کھل رہے ہیں ابھی تو کنار میں ہے
ابھی میکدہ جواں ہے ابھی موج میں ہے ساقی
ابھی جام رقص میں ہے ابھی مے بہار میں ہے

(اگست 1977)

مرثیہ نگاری:

سرداری جعفری نے خودنوشت میں اپنی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھا:

(1) ''سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔ مولانا سید حسن کی خطابت بے پناہ تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا.....اس کے علاوہ انیس کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے''۔

(2) شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ ان کی زبان، تشبیہ، استعارے ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لیے یہ بند کافی تھے۔

(3) جب میں نے پہلا مرثیہ کہا۔

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے مجھے گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیہ کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ اور کہہ لیا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا تھا۔

آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمین درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بہت داد ملی لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر پڑھتا ہوں۔ یہ بات مجھے اتنی ناگوار گزری کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا۔

اے بلبل ریاض بیاں نغمہ یار ہو
اے نو عروسِ طبع جواں ہمکنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسد دریدہ دہاں شرم سار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچ مداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمت ِ رب ِ غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا۔

اک خوشہ چیں ہوں باغ جناب انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں۔

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ 376

سردار جعفری نے اپنے پہلے مرثیہ کے بارے میں لکھا ہے۔

''غالباً یہ میرا پہلا مرثیہ ہے جو میں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں 1928 یا 1929 میں کہا تھا۔'' 377

مرثیہ کا پہلا اور آخری بند پیش ہے:

پہلا بند:

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنے جلو میں فوج ہدایت لیے ہوئے

ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخشش امت لیے ہوئے
پھیلی ہے بو فضا میں شہ مشرقین کی
آتی ہے کربلا میں سواری حسین کی

آخری بند:

تیار ہوں لہو میں نہانے کے واسطے
ناپوں کے زخم سینے پہ کھانے کے واسطے
کوئی نہ ہو جو قبر بنانے کے واسطے
موجود ہوں میں لاش اٹھانے کے واسطے
اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

سردار جعفری نے لکھا ہے:

''میں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ان کی زبان، تشبیہہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ویسے مجلس میں پڑھنے کے لیے یہ بند کافی تھے''۔ 378

حمایت علی شاعر کہتے ہیں:

''ان کی (سردار جعفری) کی شعری تربیت مرثیہ نگاری کے ماحول میں ہوئی تھی۔مرثیے میں لسانی رشتوں کے احترام اور کسی بڑے مقصد کی خاطر شہادت کا جو رجائی تصور پنہاں ہے وہی انہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر گیا۔..... 1930 میں انہوں نے مرثیے لکھے۔ 379

سردار جعفری کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

''(1) جب ہم سردار جعفری کی مرثیہ گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو صرف ان کے پہلے مرثیے پر ہی غور کیا جا سکتا ہے۔وہ بھی مکمل مرثیہ نہیں ہے۔صرف 32 بندوں پر مشتمل ہے۔لہٰذا اس میں مرثیے کے تمام فنی اجزاء موجود نہیں ہیں۔سب سے پہلا مرثیہ جو انہوں نے باقاعدہ منبر پر بیٹھ کر پڑھا اس کا آغاز اس گھڑی سے ہوتا ہے جب کربلا کی سرزمین پر امام حسینؓ کی آمد آمد ہے۔مطلع کچھ اس طرح ہے۔

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوج ِ ہدایت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جام ِ سرخ ِ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخشش ِ امت لیے ہوئے

پھیلی ہے بُو فضا میں شہِ مشرقین کی
آتی ہے کربلا میں سواری حسین کی

.....سردار جعفری کی شاعری کی ابتدائی منزلوں ہی میں انیس اور جوش کے ملے جلے اثرات صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں.....انہوں نے پندرہ بیس دن کی قلیل عرصے میں ایک اور مرثیہ کہہ لیا اور پھر تھوڑے تھوڑے سے وقفے سے چھ سات مرثیے کہہ ڈالے"۔

(2) "ان کے پہلے ہی مرثیے میں غضب کی خود اعتمادی کا احساس ملتا ہے اور مرثیے کے بعض لوازمات تو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیے ہیں۔مثلاً۔

بَر میں قبائیں سر پہ عمامے بندھے ہوئے
تیغیں کمر میں پہلو میں خنجر لگے ہوئے
دانتوں میں ہونٹ رانوں میں گھوڑے دبے ہوئے
بازو بھرے بھرے ہوئے سینے تنے ہوئے
کمسن ہیں کچھ ضعیف ہیں کچھ نوجوان ہیں
پیشانیوں پہ سجدۂ حق کے نشان ہیں

ان کے جوش وخروش کا یہ عالم ہے کہ۔

غازی ہیں سب سروں کے کٹانے کا شوق ہے
نیزوں کا شوق برچھیاں کھانے کا شوق ہے
پردیس میں گھروں کے لٹانے کا شوق ہے
راہِ خدا میں خوں میں نہانے کا شوق ہے
ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں کہ منزل قریب ہے
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں، ساحل قریب ہے

(3) دبستان انیس اور دبستان عشق دونوں کے ہاں بہاریہ مضامین کی کمی نہیں .....سردار جعفری بھی اس روایت کی تقلید کرتے ہیں۔ان کے ہاں بہار کے مرقع ملاحظہ ہوں۔

پہنچے جو کربلا کی زمیں پر شہِ امام
دیکھا کہ ہے یہ ایک عجب پر فضا مقام
پُر کیف وہ ہوائیں وہ سبزے کا اہتمام
ساحل بنا تھا تختۂ باغِ ارم تمام
چشمہ رواں تھا دشت میں آبِ حیات کا
رہ رہ کے موجیں لیتا تھا پانی فرات کا

اور بہار کا اس سے خوبصورت منظر نہیں ہوسکتا کہ۔

پھیلے ہوئے تمام گلستاں میں پھول تھے
صحرا کی آستین و گریباں میں پھول تھے
میداں میں پھول کوہ کے داماں میں پھول تھے
وادی میں پھول، دشت و بیاباں میں پھول تھے

اور اس منظر کو بہشت سے اس طرح ملاتے ہیں: ۔

چاروں طرف کھلے تھے شگوفے بہشت کے
کلیاں تھیں سب بہشت کی، غنچے بہشت کے
کیاری ہر اک بہشت کی، پودے بہشت کے
شاخوں پہ گا رہے تھے پرندے بہشت کے

(4) اپنے ایک اور مرثیے میں سردار جعفری ہواؤں کی خنکی کو اس طرح پیکر میں ڈھالتے ہیں۔

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

سردار جعفری کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت پیکر تراشی ہے۔ وہ لفظوں سے ایسے خوبصورت سمعی، بصری، لمسی اور حرکی پیکر تراشتے ہیں .....

یہ حسن ان کی ابتدائی شاعری اور وہ بھی پہلے ہی مرثیے میں فن کارانہ انداز میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے حرکی پیکر تراشی اور تجسیم کاری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ساحل جو کر رہا تھا اشارہ حسین کو
موجوں نے ہاتھ اٹھا کے پکارا حسین کو
چہرے پہ خون سرخ شہیداں ملے ہوئے
آئے گی صبح چاک گریباں کیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہ تاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

یہاں موجوں کا ہاتھ اٹھا کے پکارنا، صبح کا گریباں چاک کر کے آنا اور نور آفتاب کا ذرّوں میں چھپتے پھرنا بہترین مرقعے ہیں۔

اسی طرح صنائع بدائع جو کلام کا زیور تصور کیے جاتے ہیں ..... سردار جعفری کے ہاں بھی اپنا رنگ دکھاتے ہیں مثلاً تشبیہات و استعارات کا حسن دیکھئے۔

یہ گل نہیں تھے ٹکڑے تھے یاقوتِ خام کے
جلوے بکھر گئے تھے کسی لالہ فام کے

جناب قاسم کے بیان میں: ؎

عارض کے بو سے لیتا ہے نور آفتاب کا
چہرہ نہیں ہے پھول کھلا ہے گلاب کا

حسینی جوانوں کی تعریف میں: ؎

نقشے ہیں اک مصورِ زرّیں نگار کے
بکھرے ورق ہیں مصحف پروردگار کے

گھوڑے کی تعریف میں: ؎

ناپوں کے زیرِ عکس جو دشت و جبل ہیں
بکھرے ہوئے زمین پہ لاکھوں ہلال ہیں

حسن تعلیل جو ایک لطیف صنعت ہے، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار جعفری دشت کربلا کے ایک خوبصورت منظر کو حسینی قافلے کے پاکیزہ پس منظر میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

کونپل نے سر اٹھایا شوقِ نمود میں
کلیوں نے آنکھ کھولی تھی بزمِ وجود میں
پتے تھے مست حمدِ خدائے ودود میں
شاخیں جھکی ہوئی تھیں رکوع و سجود میں
سجادے گل کے فرشِ زمیں پر بچھے ہوئے
لاکھوں تھے سبز پوش نمازی کھڑے ہوئے

بلاغت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ حسب مراتب کا خیال رکھ کر یا انسانی نفسیات کے اعتبار سے مضامین باندھے جائیں اور اسی اعتبار سے الفاظ کا انتخاب ہو۔ سردار جعفری کے ہاں یہ بند ملاحظہ ہو۔

زینب کے دونوں لال تھے خوش کوہسار سے
قاسم تھے باغ باغ گلوں کے نکھار سے
اکبر نہالِ مستیِ سرو بہار سے
عباس کی لڑی ہوئی آنکھیں کچھار سے

(5) ایک اور جگہ سردار جعفری ہر شہید کے لیے اسی کی مناسبت سے صفتی کلمات کا استعمال کرتے ہیں مثلاً ؎

ہوگا شہید اکبر شیریں سخن یہیں

پامال ہوگا قاسمِ گُل پیرہن یہیں
کھائے گا تیر اصغر تشنہ دہن یہیں.....

یہاں اکبر کے لیے شیریں سخن، قاسم کے لیے گل پیرہن اور اصغر کے لیے غنچہ دہن کی جو صفات استعمال ہوئی ہیں ان سے سردار جعفری کے شعور سخن گوئی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

(6) سردار جعفری.....امام کی آمد پر بہار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ۔

پانی پہ سبز سبز وہ شاخیں جھکی ہوئی
نرگس کی تھیں امام پہ آنکھیں لگی ہوئی
لالے کے ہر مقام پہ روشن چراغ تھے
کلیاں کھلیں تھیں غنچوں کے دل باغ باغ تھے

(7) جعفری صاحب کے ہاں ''آمد'' میں وہی جوش وخروش پایا جاتا ہے جو اساتذہ کے ہاں موجود ہے.....ظاہر ہے سردار جعفری اسی رتبے کو تو نہیں پہنچ سکے ہیں۔ پھر بھی انہوں نے اس آمد کو پُر جلال بنانے کی اتنی ہی کوشش کی ہے اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کے ایک مرثیے کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

آتا ہے ابنِ فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برجِ زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

380

نظم کربلا کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''کلیات (کلیات علی سردار جعفری) میں شامل پہلی نظم کربلا (ایک رجز) بنیادی طور پر مرثیے کی ایک شکل ہے۔ اس میں عہد جدید کے ان حالات کا مرثیہ پڑھا گیا ہے جس میں بے پناہ ترقیات کے باوجود ہر طرف غارت گری اور تباہی و بربادی کا دورہ دورہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دور کو ''کربلا'' سے تعبیر کیا ہے اور بریکٹ میں ''رجز'' لکھا ہے جس کے معانی وہ اشعار جو میدان جنگ میں خود پڑھے جائیں۔ ناقدین نے اکثر شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی آواز جس میں شاعر خود سے کہتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ دوسری وہ آواز ہوتی ہے جس میں وہ کسی کردار کی زبانی کچھ کہتا ہے۔ تیسری وہ آواز کہلاتی ہے جس میں شاعر براہ راست کسی سے مخاطب ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے یہاں یوں تو یہ تینوں آوازیں جدا جدا اور بیک وقت ساتھ ساتھ ملتی ہیں لیکن زیادہ تر جگہوں پر وہ خود سے کچھ کہتے نظر آتے ہیں اور کربلا کچھ اسی طرح کی نظم ہے جس میں صرف اور

صرف شاعر نظر آتا ہے۔وہ کس سے مخاطب ہے۔اس کا پتہ نہیں چلتا۔ظاہر ہے ایسے میں شاعر کے احساسات وجذبات بڑے فن کارانہ انداز میں واضح ہوتے چلے جاتے ہیں.....اس نظم میں سردار جعفری نے حالات کی ابتری سے اپنی بے چینی و بے قراری کا اظہار کیا ہے لیکن نرم اور مدھم لب و لہجے نے نظم کو بے حد خوبصورت بنا دیا ہے۔یہ نظم بنیادی طور پر سات نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے منطقی طور پر مربوط ہیں۔.....نظم میں رعب و دبدبہ اور ایک خاص قسم کا جلال نظر آئے گا لیکن اس کے ساتھ ہی جمال کی وہ ساری کیفیتیں بھی ملیں گی....ترکیبیں' ایسے استعارے' ایسی تشبیہیں' ایسی علامتیں اور ایسی تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔نہر فرات سے کربلا کے اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس کے پانی پر یزید نے امام علیؓ کے خاندان کے لیے پابندی عائد کردی تھی۔سردار جعفری چونکہ ایک رجائی شاعر ہیں لہٰذا وہ ہمہ وقت پُرامید نظر آتے ہیں اور انہیں اس بات پر کامل یقین ہے کہ ظلم وستم کے بادل چھٹنے کا وقت قریب ہے' روزِ حساب آیا چاہتا ہے اور بہت جلد یہ فیصلہ سنایا جائے گا کہ ان ظالموں کا سینہ چاک کر کے انہیں نیست و نابود کردیا جائے.....نظم کی شعریت قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے۔تشبیہہ' استعارہ' تلمیح اور مختلف علامتوں کے برمحل استعمال نے موضوع اور ہیئت میں خوبصورت امتزاج پیدا کردیا ہے" 381

؎ پھر العطش کی صدا/ جیسے رجز کا زمزمہ/ پھر ریگ صحرا پر رواں/ یہ اہل دل کا کارواں/ نہر فرات آتش بجاں/ راوی وگنگا خوں چکاں/ کوئی یزید وقت ہو/ یا شہر ہو یا حرملہ/ اس کو خبر ہو یا نہ ہو/ روز حساب آنے کو ہے؛ نزدیک ہے روز جزا/ اے کربلا اے کربلا...../صدیوں کی سفا کی سہی/ انسان اب بھی زندہ ہے/ یہ جہل کی پرچھائیاں/ لیتی ہوئی انگڑائیاں/ زندہ ہے اعجاز فغاں

سردار جعفری کی نظم "موت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے کہ اس نظم پر مرثیہ کا رنگ حاوی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری نے جیل میں جب ایک دوست کی موت کی خبر سنی تو وہ تڑپ اٹھے اور اظہار تعزیت نیز خراج عقیدت کے لیے انہوں نے اس زمانے میں ایک اہم نظم "موت" لکھی جس کے ہر شعر سے سوز و گداز' آہ و تڑپ اور افسوس کا اظہار ہوتا ہے۔نظم میں اپنی دوستی کا ذکر' ماضی کے دنوں کی یاد اور دیگر باتوں کو انہوں نے بے حد غم ناک اور پُر درد انداز میں پیش کیا ہے۔ موضوع کے مطابق سردار جعفری نے لفظوں کا جو انتخاب کیا ہے.....اس سے نظم کی شدت اور تاثیر میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نظم پر مرثیہ کا رنگ حاوی ہے۔ 382 چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اک شرر کی طرح گزرا عمر کی منزل سے تو/ ہم نشیں کیا بات تھی کیوں اٹھ گیا محفل سے تو/ ہم سنوں کی انجمن کس واسطے بھائی نہیں/ راس کیوں آب و ہوائے زندگی آئی نہیں/ دل کی جمعیت ترے جانے سے برہم ہو گئی/ دم کے دم میں بزم عشرت بزم ماتم ہو گئی/.....اے انیس برق فطرت اے رفیق تیز گام/ مڑ کے لیتا جا اسیران محبت کا سلام/ میرے طاق دل میں اک رنگین گلدستہ ہے تو/ بچپنے کی سینکڑوں یادوں سے وابستہ ہے تو/ زندگی کے مکتب دل میں سبق لیتے تھے ہم/ ناؤ طفلی کی جوانی کی طرف کھیتے تھے ہم/ قید کی تنہائیوں میں یاد آتی ہے تری/ بجلیاں سی کوند جاتی ہیں نگاہوں میں مری/ دل دعائیں دے رہا ہے جیل کی دیوار کو/ رہ گئیں آنکھیں ترس کر آخری دیدار کو/ یوں تو ہے بزم جہاں میں موت قانون حیات/ ہے تغیر ہی سے روح

زندگانی کوثبات/موت ہی سے زندگی کارقص دنیا کاوجود/موت کیا ہے ایک تغیر عناصر کی نمود/ .....موت کاغم کرکے کوئی شخص جی سکتانہیں/موت سے گھبراکے کوئی زہر پی سکتانہیں/ دل مگر ٹکڑے ترے ناوقت مرجانے سے ہے/غم یہ نوآراستہ زلفیں بکھرجانے سے ہے/پھول تو دو دن بہارجانفزا دکھلاگئے/حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھاگئے۔

یوسف ناظم رقمطراز ہیں:

''صحت مند تنقید ان کے لیے شربت روح افزاء کاجُرعہ تھااور وہ دشنام وتنقیص کوبھی طاقت بخش دوا کی ایک خوراک سمجھتے تھے۔کہتے ضرور تھے کہ:

کم ظرفی گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگی دیدۂ تر ہے

لیکن یہ شعرانہوں نے اپنے معترضین کے لیے نہیں کہاتھا.....انہوں نے اپنے اردگرد اُٹھنے بیٹھنے والوں کوسمجھاہی نہیں تھا، خوب اچھی طرح سمجھاتھالیکن ان کی زبان پر یہ کبھی نہیں آیا کہ اچھامیں سمجھلوں گا۔

گزرے ہیں نگاہ و دل سے ہوکر/ ہرطرح کے بے شمار چہرے/ بیٹھے ہیں کم عیار چہرے/سونے کا چڑھاہوا ہے پانی/ پیتل کے یہ شاندار چہرے

''بے تکلف دوستوں کی بے ریاصحبت میں انہیں لطیفے سنتے' پرمذاق باتیں کرتے اور بے ساختہ ہنستے اور بے محابا قہقہے لگاتے بھی پایا گیا ہے۔ان کی پیشانی پر بل بھی آئے ہیں لیکن صرف اس وقت جب وہ لوگ جوان کی خوشہ چینی سے مستفید ہونے کے بعدان کی نکتہ چیں بنتے تھے۔روشنی ان کے چراغ سے حاصل کرتے تھےاور پھراندھیرے میں چھپ کرانہیں کی طرف تیر پھینکتے تھے۔وہ اتناہی کہتے کہ۔

مرے خلاف اٹھایاقلم حریفوں نے
مراغرور بڑھااور سربلند ہوا
یہی سلیقہ ہے بس فرت بد سے بچنے کا
کہ اپنی ذات کواتنی بلندیاں دے دو
کسی کاسنگ ملامت وہاں تک آنہ سکے

لیکن یہاں ذکر حریفوں کاہے۔حلیفوں کانہیں اور جب حلیفوں کارویہ بھی حریفانہ اور عامیانہ ہوجائے تو ظاہر ہے جعفری صاحب جیسے متحمل شخص کامکدّر اور منغّص ہونا فطرت انسانی کا تقاضا ہےاور جعفری صاحب جنہیں ابتدائے عمری سے مرثیے کہنے کی مشق تھی حاسد شخص کامرثیہ دو مصرعوں میں یوں کہتے ہیں۔

حسد کا مارا ہوا یہ بندہ غریب شہر دیار خود ہے
شرافت نفس مرچکی ہے بچارہ خویش آشنا نہیں ہے

383

سردار جعفری نے اپنی بہن رباب جعفری کی رحلت پر یہ مرثیہ لکھا ہے۔

رباب درد ہے خاموش دل کے تاروں میں/ نہ کوئی نغمۂ جانکاہ ہے نہ شعلۂ آہ/ بس ایک اشک کا قطرہ ہے بھیگی پلکوں پر/ تمہارے کربِ مسلسل کے خاتمے کا گواہ/ سکون کہتا ہے چہرے کا باغِ جنت سے/ جنابِ فاطمہ زہراؑ کی پڑ رہی ہے نگاہ/ تمہارا زادِ سفر عشقِ اہل بیت رسولؐ/ تمہاری دولتِ ایماں تمہارا توشۂ راہ/ جوارِ رحمتِ حق میں ملے جگہ تم کو/ بحق **اشھد ان لا اِلٰہ اِلا اللہ**۔

یوسف ناظم نے بتایا:

جعفری صاحب نے اپنی بہن رباب جعفری کی رحلت پر جو اشعار کہے تھے وہ اشعار نہیں ان کے دل سے نکلی ہوئی آہیں اور آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو تھے.....جس دن دل گرفتہ شاعر نے یہ مرثیہ کہا میں (یوسف ناظم) ان کے گھر پر موجود تھا اور میں ہی پہلا شخص تھا جسے جعفری صاحب نے اپنی بھرائی ہوئی آواز میں یہ اشعار سنائے" 384

سردار جعفری نے مرثیہ گوئی میں مستقل طور پر قدم رکھنا مناسب نہ سمجھا۔

اس سلسلہ میں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری کے ہاں جتنی خود اعتمادی تھی، اتنی ہی خود احتسابی بھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ مرثیہ نگاری محض شاعری نہیں بلکہ فن کاری اور صناعی ہے اور یہ سپہر سخن کا وہ سدرۃ المنتہا ہے جہاں غالب جیسے اچھے اچھے بلند پروازوں کے پر جلنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں کے باوجود انہوں نے مستقل طور پر اس کوچے میں قدم رکھنا مناسب نہ سمجھا اور انقلابی نظموں کے میدان میں چلے آئے اور وہ موضوع جو انہوں نے مرثیے سے حاصل کیا تھا اپنی انقلابی شاعری میں علامت کے طور پر استعمال کیا.....

.....اپنی شاعری کے آغاز کے بعد مختصر سے عرصے میں سردار جعفری کا منبر چھوڑ کر عوامی جلسوں کے اسٹیج تک پہنچنا اور جامِ سرخ شہادت، اور "خونِ سرخِ شہیداں" سے بچ کر "سرخ پرچم" "سرخ سپاہی" اور "لال سلام" کی طرف رخ کرنا نیز کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت میں لڑنا، اس بات کا غماز ہے کہ سردار جعفری کی انقلاب پسند طبیعت کا اس قسم کا رویہ اختیار کرنا خلاف از فطرت نہ تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کربلا کے میدان سے انہوں نے لہو کی جو سرخی حاصل کی تھی وہ ان کے کلام میں عمر بھر باقی رہی چاہے وہ مارکسیت کا دم کیوں نہ بھرتے رہے ہوں لیکن مظلوم کے لہو کی پکار کو وہ کبھی نہیں بھول سکے لہو پکارتا ہے ہر طرف پکارتا ہے/ سحر ہو شام ہو خاموشی ہو کہ ہنگامہ/ جلوس غم ہو کہ بزم نشاط آرائی/ لہو پکارتا ہے۔

یہ نظم بھی دراصل ہر عہد کا مرثیہ ہے جو شاید اس وقت تک مکمل نہ ہو پائے گا جب تک اس دنیا میں جبر و تشدد کا نظام باقی ہے۔" 385

مثنوی "جمہور":

سردار جعفری کی مثنوی "جمہور" کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

(1) "جمہور" سردار جعفری کی ایک سیاسی مثنوی ہے جو پہلی بار مارچ 1946 میں کتب پبلشر نے ممبئی سے شائع ہوئی

تھی ۔اس مثنوی کے ذریعہ سردار جعفری نے ہندوستان کے نوجوانوں، مزدوروں، کسانوں بلکہ پورے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے ظلم واستبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی ہے اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے متحد ہونے کی دعوت دی ہے۔اصل مثنوی سے قبل حرف اول میں وہ لکھتے ہیں:

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو/ اٹھو انقلابی جوانو اٹھو/ کسانو اٹھو کامگارو اٹھو/ نئی زندگی کے شرارو اٹھو/ اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے/ اٹھو مالوے اور میوات سے/ مہاراشٹر اور گجرات سے/ اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو/ گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو/ اٹھو کھل گیا پرچم انقلاب/ نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب/ غلامی کی زنجیر کو توڑ دو/ زمانے کی رفتار کو موڑ دو۔

(2) جمہور (147) اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں سردار جعفری نے ہندوستان کی مختلف خوبیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارا ملک قدرتی وسائل سے کتنا مالا مال ہے۔

یہ ہندوستاں رشک خلد بریں/ اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں/ کہیں کوئلے اور لوہے کی کان/ کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان/ کہیں سنگ مرمر کی شفاف سل/ پھسلتا ہے جس کی صفائی پہ دل/ بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں/ ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں/ یہ گنگا کا آنچل یہ جمنا کی ریت/ یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت۔

لیکن دوسرے بند میں وہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ یہ تمام خزانے ہمارے تمہارے نہیں بلکہ یہاں کا ہر خزانہ انگلینڈ چلا جا رہا ہے۔ہمارے مقدر میں تو بس افلاس ہے۔حد یہ ہے کہ ہم گنگا کے ساحل پر بھی پیاسے مرنے کو مجبور ہیں۔

یہاں سے جو اٹھتی ہے لے کر گہر/ گھٹا وہ برستی ہے انگلینڈ پر/ ہمارے مقدر میں افلاس ہے/ غلامی کی ہر جسم میں باس ہے/ ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے/ وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے

(علی سردار جعفری، نئی دنیا کو سلام اور جمہور، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1972 صفحہ 188، 189)

(3) تیسرے بند میں سردار جعفری نے اپنی قدروں کے پامال ہونے، آپسی نااتفاقیوں، نفرتوں اور کدورتوں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے اس کے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔نیز انگریزی حکومت کے ہاتھوں پوری دنیا میں ہو رہے ظلم وستم کی طرف عوام کی توجہ مرکوز کرتے ہوئے انہوں نے انگریزوں کی کچھ اس طرح قلعی کھولی ہے۔

جو چنگیز سے بڑھ کے سفاک ہیں/ جو دجال کی طرح ناپاک ہیں/ جو بدکیش و بدذات و بدکار ہیں/ ہم ان سے کرم کے طلب گار ہیں/ وہ قاتل فلسطین و یونان کے/ وہ دشمن ہیں جاوا کے ایران کے/ وہ سینے پہ ہیں ایشیا کے سوار/ وہ انسان کا کھیلتے ہیں شکار۔

(4) اس کے ساتھ وہ زمین وطن کو یہ حوصلہ بھی عطا کرتے ہیں۔

مگر غم نہ کر اے زمین وطن/ اندھیرے کے سینے سے پھوٹی کرن/ اب اٹھتے ہیں ہندوستاں کے سپوت/ لرزتا ہے جن سے حکومت کا بھوت/ کسان اور مزدور گاتے ہوئے/ اٹھے اپنا پرچم اڑاتے ہوئے/ یہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی/ یہ دریا بھی ہیں اور طغیان بھی/ ہر ایک ان میں کمزور و نادار ہے/ مگر اتحاد ان کی تلوار ہے/ بڑی سخت راہوں سے گزرے ہیں یہ/ بڑے جوش کے ساتھ ابھرے ہیں یہ/ وطن کے شہیدوں کی روحیں ہیں ساتھ/ سروں پر ہے جھانسی کی رانی کا ہاتھ۔

(5)اس مثنوی میں سردار جعفری نے ایک عنوان ''جمہور کا اعلان نامہ'' قائم کیا ہے.....

سردار جعفری نے ظلم کرنے والوں کو ان کے انجام سے بھی آگاہ کیا ہے۔

بڑا ناز تھا جن کو تلوار پر/ جو سوتے تھے لاشوں کے انبار پر/ جو کرتے تھے دنیا کو زیر و زبر/ وہ جن کی کنیزیں تھیں فتح و ظفر/ انہیں کھا گئے آسمان و زمیں/ نشاں ان کی قبروں کے ملتے نہیں/ کہاں ہیں وہ فرعون و ہامان اب/ کہاں ہیں وہ خونخوار سلطان اب/ وہ نادر کہاں ہے سکندر کہاں/ کہاں ہے مسولینی ہٹلر کہاں/ وہ چین اور تاتار کے کج کلاہ/ جو بیٹھے تھے بن بن کے عالم پناہ/ درندے جو دشمن تھے انسان کے/ جو پھوڑے تھے طاعون و سرطان کے/ وہ سب موت کی گود میں سو گئے/ وہ سب وقت کی گرد میں کھو گئے/ نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے/ جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے 386

(6)اس کے بعد سردار جعفری نے بڑی خوبصورتی سے اپنے ملک کی تہذیب و تمدن اور انسانیت پر فخر محسوس کیا ہے اور اس کی عظمت بیان کر کے یہاں کے عوام کو یہ یقین بھی دلایا ہے۔

سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم/ لگا دیں گے دولت کے انبار ہم/ پنھائیں گے بچوں کو رخت حریر/ ہمالہ سے لائیں گے ہم جوئے شیر/ سنہرے دوپٹے اڑھائیں گے ہم/ ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم/ پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ/ جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ/ کریں گے یہاں رقص حسن و شباب/ زمیں پر اتر آئے گا آفتاب/ وہ شاداب چہروں پہ ہوگا نکھار/ کہ جھینپیں اجنتا کے نقش و نگار/ نئی دیں گے ماتھوں کو تنویر ہم/ بدل دیں گے انسان کی تقدیر ہم

(7)''اس مثنوی کے ذریعہ سردار جعفری نے ہندوستانیوں کو وطن میں جمہوریت کے قیام کے لیے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ جمہوریت کے فوائد اور شہنشاہیت و سامراجیت کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا ہے' انگریزوں کے ظلم و بربریت سے ہندوستانی عوام کو انہوں نے باخبر کیا ہے اور ہندوستان کی عظمت سے روشناس کر کے ملک کی عظمت و سالمیت کے لیے متحد ہونے کی دعوت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی میں انقلابی آہنگ اور بغاوت کا رنگ غالب نظر آتا ہے جو روایتی مثنویوں سے بالکل الگ ہے۔'' 387

مثنوی ''جمہور'' میں سردار جعفری نے مظلوم و محکوم ہندوستانیوں کو غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی ترغیب دی ہے۔

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو/ اٹھو انقلابی جوانو اٹھو/ کسانو اٹھو کامگارو اٹھو/ نئی زندگی کے شرارو اٹھو/ اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے/ اٹھو خاک بنگال و کشمیر سے/ اٹھو وادی و دشت و کہسار سے/ اٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے/ اٹھو مالوے اور میوات سے/ مہاراشٹر اور گجرات سے/ اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو/ گلو کی طرح سے مہکتے اٹھو.....غلامی کی زنجیر کو توڑ دو/ زمانے کی رفتار کی موڑ دو۔

انگریز حکمرانوں کے استبداد کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت کی آگ کو شعلہ جوالا بنانے اور آزادی کی چنگاری کو بھڑکانے والے سردار جعفری کے اشعار دیکھئے۔

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو؟/ عصر حاضر کے فرعون ہو/ تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی/ ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خوں ہے/ تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے.....تم نے ہندوستانیوں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں

سے ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں...../ اور دریاؤں میں زہر گھولا...../ آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے بھوت منڈلا رہے ہیں...../ ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے/ ایک بھی ذرّہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں ہے...../ بھاگو بھاگو/ اپنا جسم' اپنی جان' اپنا من' اپنا اخلاق و تہذیب و قانون سب لے کے بھاگو/ اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی بساط اب اٹھالو۔

ڈاکٹر علی جاوید "نئی دنیا کو سلام" کے جائزہ میں لکھتے ہیں:

"اس مایوسی کے عالم میں امید کی کرن نظر آتی ہے اور جاوید کہتا ہے۔

گولیاں سنسناتی ہیں اڑتے ہیں پرچم/ بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم/ موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے/

اور مریم مرحبا کہتی ہے۔ جاوید عہد نو کا اعلان کرتا ہے جو دولتیں' برکتیں' راحتیں اور لذتیں لے کر آ رہا ہے۔ انقلابیوں کے نعرے فضا کو معطر کر رہے ہیں اور سب کے دلوں میں ایک نئے سویرے کا خواب مچل رہا ہے اور ملک کے سنگ و خشت میں' سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں' کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ہندوستانی عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ حسین بوستاں ہمارا ہے اور ہمیں جینے کا حق یعنی آزادی چاہیے" 388

نسیم سید قمطراز ہیں:

"نئی دنیا کو سلام" میں ایک مثنوی "جمہور"..... شامل ہے..... عشقیہ مثنویاں تو بہت لکھی گئیں لیکن "جمہور" سے پہلے سیاسی موضوعات پر مثنوی نہیں لکھی گئی تھی۔ اقبال نے جو سیاسی مثنویاں لکھیں وہ بلاشبہ سیاسی فکر و آگہی عطا کرتی ہیں لیکن چونکہ وہ فارسی زبان میں ہیں لہٰذا ان سے صرف فارسی سے واقفیت رکھنے والے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن سردار صاحب کی "جمہور" اپنے عہد کی وہ تخلیق ہے جو مثنوی کو نئی فکر عطا کرتی ہے۔ کیفی اعظمی کی سیاسی مثنوی "خانہ جنگی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 389

قطعات:

پروفیسر شہپر رسول نے قطعہ کے بارے میں بتایا ہے:

قطعہ دراصل فارسی اور اردو شعری ادب کی ایک باضابطہ قسم ہے جس کی اپنی ایک تعریف بھی ہے اور تاریخ بھی۔ اس ادبی اصطلاح پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ اصل میں وہ شعری تخلیق ہے جو دو یا دو سے زیادہ ایسے اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جن میں مضمون یا خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے جہاں تک قطعہ کی ہیئت کا سوال ہے وہ قصیدے' غزل یا غزل نما نظم سے بہت مشابہ ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس میں مطلع نہیں ہوتا اور قافیے کا تعین پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے قافیہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ گویا تمام اشعار پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں"۔ 390

سردار جعفری کے شعری مجموعے "ایک خواب اور" میں ایک قطعہ ہے جس میں سردار جعفری نے دارورسن کی شکست کے ذکر کے ساتھ اپنی سرمستی و شادابی کا ذکر پیارے انداز میں کیا ہے۔

تبسم لب ساقی چمن کھلا ہی گیا

نشاطِ فصلِ بہاراں دلوں پہ چھا ہی گیا
کہو حکایتِ گیسو فسانۂ قدیار
شکستِ دار و رسن کا زمانہ آ ہی گیا

1968 میں ویت نام کی جنگ کے دوران ایک قطعہ میں ظلم و بربریت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

سرفروشانِ محبت کے جنوں کے آگے/سرِ قاتل بھی سردار بھی خم ہوتا ہے/ دستِ جلاد سے گر جاتی ہے شمشیرِ ستم/حرفِ حق سینۂ باطل پہ رقم ہوتا ہے

میری آنکھوں کو ترے حسن نے ٹھنڈک بخشی
زندگی جلتی رہی دھوپ کی صورت جن میں
اب کبھی کھلتے ہیں فردوسِ بریں کے غنچے
اتر آتے ہیں کبھی چاند ستارے اِن میں

ستمبر 1978ء میں رقم کردہ قطعہ میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا گیا ہے۔

نئی کوہِ الوند کی ہوا میں
دماوند سے آ رہی ہے صدائیں
کہ ہر چیز فانی ہے ہر چیز فانی
وہ ہو تاجِ کسریٰ کہ تختِ کیانی

سردار جعفری کے شعری مجموعے ''خون کی لکیر'' 1949 میں 49 قطعات شامل ہیں۔

ان قطعات کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''مجموعہ (خون کی لکیر) کے آخر میں شامل ان قطعات ..... میں سردار جعفری نے اپنی شاعری کے تمام تر جواہر کو یکجا کر دیا ہے۔اس میں رومان بھی ہے' انقلاب بھی ہے اور رومان و انقلاب کا حسین امتزاج بھی ہے۔سرمایہ دار اور مزدور کی کشاکش بھی ہے۔حکومتِ وقت کی نکتہ چینی بھی ہے اور مارکس کے اشتراکی نظریہ کی تبلیغ بھی ہے لیکن مذکورہ تمام باتوں کو پیش کرنے کے لیے سردار جعفری نے جو طریقہ' جو اسلوب اور جو انداز اختیار کیا ہے وہ بڑا ہی دلفریب ہے۔ان قطعات میں ادبیت اور شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔چند قطعات ملاحظہ کریں۔

آزمائش ہے تری جرأتِ رندانہ کی
آب ہے موجِ مے ناب میں تلواروں کی
چشمِ ساقی میں ہے اب ہوش و خرد کا پیغام
آج پرسش نہیں بہکے ہوئے میخانوں کی

تو حقیقت کو سمجھتا ہے طلسمی تصویر
تیرے نزدیک یہ احساس کی رعنائی ہے
تو یہ کہتا ہے مرے دل میں ہے بے جان بہار
میں یہ کہتا ہوں " گلستان میں بہار آئی ہے"

حسن ہی حسن ہے فطرت کے صنم خانے میں
نور ہی نور ہے اس "خاک" کے کاشانے میں رات
آتی ہے ستاروں کی ردا اوڑھے ہوئے
صبح پیتی ہے خورشید کے پیمانے میں

391

سردار جعفری کا شعری اسلوب:

عبدالاحد ساز نے شعری اسلوب کی اہمیت اور سردار جعفری کے اسلوب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"کسی بھی اہم شاعر کو پڑھنے کا ادعا اس کے افکار و نظریات اور موضوعات بھی ہو سکتے ہیں، مگر یہ ادعا پیدا تب ہی ہوتا ہے جب اس کا کلام قاری کو پہلی قرأت میں باندھ سکے اور اپنا سکے۔ یہ معاملہ طرز ادا یا کرافٹ کا ہے..... الفاظ و معانی کا رشتہ بدن اور پیراہن کا نہیں بلکہ جسم اور روح کا ہوتا ہے۔ فن پارہ اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب "کیا کہا گیا" اور کیسا کہا گیا" ایک دوسرے کے ساتھ محض آمیزے کی شکل میں شامل نہ ہوں بلکہ ایک ہی تخلیقی تجربے کے سیال مرکب میں تبدیل ہو جائیں۔ سردار اس کیمیاوی عمل میں اکثر کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ اپنے لطیف ذوق جمال اور نفیس غنائی شعور کی بناء پر ترسیل کی ایک ایسی فریکوینسی (Frequency) اخذ کر لیتے ہیں جو شاعر کے قلم سے قاری کے دل و دماغ تک تنے ہوئے غیر مرئی تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے۔ ان مرتعش لہریوں میں وہ اپنے افکار و خیالات کی رو بڑی آسانی سے دوڑا دیتے ہیں اور نظمیں اپنے پورے کرافٹ کے ساتھ قرأت یا سماعت میں جذب ہونے لگتی ہیں۔ اس دل پذیری کی ایک بہت اہم وجہ اُن کی نظموں کی ایک خاص جمالیاتی فضا بھی ہے۔ یہ فضا کاری شاید شاعر کی مظاہر فطرت سے گہری وابستگی، وقت اور تاریخ کی گزران کے جمالیاتی ادراک اور زندگی کے مثبت اور رجائی رویے کے ایک داخلی، ارتباط سے عبارت ہے۔ یوں تو یہ فضا غیر مرئی ہے لیکن اگر ہم جعفری صاحب کی شعری فضا کو چند لمحوں کے لیے ذہن پر طاری کر لیں تو کچھ Visuals سے ابھر آتے ہیں۔ جس طرح فیض احمد فیض کی شعری فضا کو یک لخت سوچتے ہوئے تصور میں شہر کی شام چاندنی، در و بام فیصل، مغموم و دلگیر حسن وغیرہ کا ماحول ابھرتا ہے۔ اس طرح سردار جعفری کی شاعری تحت الشعوری طور پر آسمان کی نیلاہٹوں، چڑھتے ہوئے دن، سمندر کے دن تک پھیلے ہوئے ساحل، لہلہاتے ہوئے پودے اور آفتاب کی سنہری شعاعوں کی چمکیلی مسرتوں کا کیف پیدا کرتی ہے۔ اُن کی شاعری سے

ہم جس پہلو سے اک قربت یا intimacy محسوس کرتے ہیں۔اس کی وجہ صوتی وسمعی تشکیل کے علاوہ منظر اور مفہوم کی بصری پیکر تراشی بھی ہے۔موضوع اُن کے یہاں بسا اوقات اپنے جمالیاتی پس منظر ہی میں کھیلتا اور پھلتا ہے۔فکر کی تابندگی اور جذبے کی گرمی حسّی و بصری کیف کے ساتھ گھل مل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ایسی امیجری کی مثالیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔(مثلاً نظم حسین تر'میرا سفر'پتھر کی دیوار وغیرہ)۔ 392

ترقی پسند شاعری میں طرز ادا پر عقیل احمد صدیقی نے روشنی ڈالی ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

(1)''ترقی پسند شاعری میں طرز ادا کو ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔

ترقی پسند شاعروں نے .....طرز اظہار میں وضاحت وصراحت اور براہ راست طرز اظہار اختیار کیا ہے۔براہ راست طرز اظہار کا یہ مطلب ہے کہ جو بات پیش کی جائے فن کے پردے میں چھپا کر پیش نہ کی جائے۔ایسی شاعری میں لفظ اپنے لغوی مفہوم سے آگے نہیں بڑھتا اور شاعر لفظ کو ہر ممکن اشاریت اور رمزیت سے بچاتا ہے کہ یہ ایک استعاراتی عمل ہے اور استعارہ خیال کے لیے پردہ ہوتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے استعلاتی زبان کو شجر ممنوعہ قرار دیا ہو البتہ یہ بات لازم رکھی ہے کہ استعارے عام فہم ہوں یعنی فن کار اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے ذاتی استعارے یا علامت تخلیق نہ کرے اور رائج استعاروں اور علامتوں سے ہی اپنا کام نکالے.....ترقی پسند شاعری ان فنی لوازمات کے استعمال کے باوجود وضاحت کے سبب ''براہ راست شاعری'' کے ذیل میں آتی ہے۔

(2)''بہت سے ترقی پسند شاعروں نے اپنی خالص نظریاتی شاعری میں بھی ہمیشہ ان اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا ہے اور تخلیق کے انفرادی لمحات میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ترقی پسند رائج اصولوں سے انحراف کیا ہے۔انحراف کی یہ شکل موضوعات اور اظہار دونوں میں سامنے آتی ہے۔مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری اور معروضیت کو بنیادی اصول کی حیثیت دی ہے.....معروضیت کا مطلب یہ ہے کہ تجربے یا خیال کو اس کے خارجی رشتوں کے حوالے سے غیر شخصی انداز میں دیکھا اور برتا جائے۔اردو میں ترقی پسند تحریک نے بھی حقیقت نگاری پر زور دیا.....لیکن شاعروں نے معروضیت اپنانے کے بجائے رومانی رجحان کو ہی مزید آگے بڑھایا اور حتی الامکان حقیقت نگاری سے پہلو بچاتے رہے.....فکشن میں حقیقت نگاری کا تجربہ بہت حد تک کامیاب رہا لیکن شاعری میں اس طرح کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔یہاں تک کہ ترقی پسندوں کا اشتراکی انقلاب یعنی محض ''رومانی خواب'' بن کر رہ گیا۔

(3)''براہ راست طرز اظہار کی حامل نظمیں دو طرح کی ہیں۔یہ دو نظمیں لہجے کے اعتبار سے ہیں۔ایک قسم ان لفظوں کی ہے جن کے لہجہ میں گھن گرج ہے اور جن میں زورِ خطابت کی داد دی گئی ہے.....موقع محل کے مطابق لہجہ میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے.....لیکن مجموعی طور پر بلند آہنگی اور پُرشکوہ الفاظ کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔دوسری قسم ان نظموں کی ہے جن میں ملائم اور نسبتاً دھیما لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ایسی نظمیں بالعموم عشقیہ ہیں یا جن میں ''محبت اور سیاست'' کا امتزاج ہوا ہے اس کی بہتر مثال فیض کی شاعری ہے۔''

(4)''رفتہ رفتہ ترقی پسند شاعری سے دہشت انگیزی کا عنصر کم ہونے لگا اور جذباتیت پرستی میں کمی آئی لیکن سرے سے پھر بھی ختم نہیں ہوئی۔دہشت پسندی کی جگہ رحم طلبی اور رقت انگیزی نے لے لی اور یہ بھی ایک طرح کی جذباتیت پرستی تھی جس میں ضبط وتوازن کا عنصر غالب تھا۔اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند شعرا رقت انگیزی اور خود ترحمی کو بھی اصل مقصد سمجھتے تھے''۔

(5)''لیکن شاعری جماعت کے ذریعے تخلیق نہیں ہوتی ،تخلیق کرنے والے افراد ہوتے ہیں اور فرد کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ جماعت کے قوانین توڑتا ہے اور اپنے لیے ایک الگ راستہ بناتا ہے۔ترقی پسند شاعروں نے بھی بعض انفرادی لمحات میں اپنے اندر کے شاعر کی آواز سنی ہے اور شاعری کو اپنی اصل شاعرانہ شخصیت سے آمیز کیا ہے۔براہ راست اظہار میں بھی اپنے انفرادی محسوسات کو جگہ دی ہے اور اپنی حقیقی آواز کو اجاگر کیا ہے۔زیادہ تر شاعروں کے یہاں یہ تبدیلی 1947 کے بعد پیدا ہوئی ہے لیکن چند شاعروں نے ابتداء میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے مثال کے لیے مجاز کی نظم آوارہ دیکھئے۔نظم میں ٹیپ کے مصرعے''اے غم دل کیا کروں'اے وحشت دل کیا کروں نے نظم کی خارجی تصویروں کو داخلی آہنگ عطا کیا۔اس مصرعے سے فنکار نے اس اندرونی کرب کا اظہار کیا جو خود اس تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دور کے عام نوجوانوں کا کرب ہے۔ان نوجوانوں کا جو ایک نئے مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے اور اپنا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا ہوا دیکھ کر ذہنی اور اعصابی تشنج کا شکار تھے.....جاں نثار اختر کی نظم'' آخری ملاقات''.....شخصی واردات کے براہِ راست اظہار کی کامیاب مثال ہے''۔

(6)''1947 کے بعد کی سماجی صورتحال نے جہاں نئی ادبی اور سماجی تحریکوں کے لیے راہیں ہموار کیں وہیں ترقی پسندوں کو بھی متاثر کیا۔ترقی پسند ادیبوں نے اپنے فکری اور فنی رویوں میں تبدیلی پیدا کی اور وہ زیادہ حقیقت پسند بنے۔یوں تو ابتداء میں بھی ترقی پسند تحریک کا نمایاں مقصد''حقیقت نگاری''تھا لیکن نظریے کی ادعائیت نے ادیبوں سے پارٹی اصول کے مطابق ادب لکھوایا جو ہنگامی اہمیت کا حامل ضرور تھا لیکن ان میں ادبیت' کی کمی تھی۔1947 کے بعد فکری طور پر حقیقت نگاری کو رواج ملا اور شعراء اپنے انفرادی ویژن کی روشنی میں حالات کا جائزہ لینے لگے اور فن میں نئی راہیں تلاش کرنے لگے''۔

(7)''اگر کوئی بات رمز وایما میں پیش کی جائے تو اس کے مفہوم تک رسائی آسان نہیں ہوتی' ذہنی جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے مقابلہ میں وضاحت سے پیش کی گئی بات جلد سمجھ میں آتی ہے اور اگر وہ بات اچھی ہے تو اس سے ذہنی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن مسرت دیرپا نہیں ہوتی کہ ذہن جلد ہی اسے بھول جاتا ہے۔دیر سے سمجھ میں آنے والی بات سے مسرت الگ حاصل ہوتی ہے اور حافظہ اسے زیادہ دنوں تک محفوظ رکھتا ہے۔شاعر یہی چاہتا ہے کہ اس کی بات دیرپا اور مسرت انگیز بھی ہو۔اس مقصد کے لیے وہ حقیقت کو فن کے پردوں میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔اس کے لیے وہ اپنی قوتِ متخیلہ کو استعمال میں لاتا ہے اور اپنی بات استعاروں' کنایوں' پیکروں' تمثیل اور علامتوں میں پیش کرتا ہے۔عام ترقی پسند شعری رویہ اس کے برخلاف ہے۔ترقی پسندی کی مقصدیت نے شاعروں پر ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنی بات وضاحت کے ساتھ پیش کریں تا کہ لوگ سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔یہی سبب ہے کہ وہ لفظ کو اکثر لغوی مفہوم میں استعمال کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔اس

لیے کہ ان کے نزدیک شاعری بھی علوم کی ایک شاخ ہے اور جس طرح دوسرے علوم کا مقصد معلومات بہم پہنچانا ہے، شاعری یا ادب کا بھی یہی مقصد ہے لیکن وہ شاعری سے جذبے کو الگ نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں جذبہ موجود ہوتا ہے مگر وہ اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ جذباتیت میں بدل جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ترقی پسند شعراء تشبیہات، استعاروں اور علامتوں کے استعمال کے منکر ہوں۔ یہ فنی لوازمات ترقی پسند شاعری میں بھی موجود ہیں لیکن یہاں بھی اصرار اس بات پر ہوتا ہے کہ شاعر استعاروں اور علامتوں کی تخلیق میں جہاں تک ممکن ہو جدت اور ایجاد سے پرہیز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روایتی استعاروں اور علامتوں سے ہی کام نکالتے ہیں اور اگر ان میں نیا مفہوم داخل بھی کرتے ہیں تو وہ تقریباً واضح ہوتا ہے۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض نے شروع سے ہی اس اصول سے انحراف کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر محسوسات کے شاعر ہیں، تصورات کے نہیں۔ یعنی انہوں نے اپنی شاعری میں تصورات کی توضیح و تعبیر نہیں کی۔ ہر چند کہ ان کی شاعری سے ہم تصور اخذ کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں لیکن یہ تصور سطح پر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ فن کے پردوں میں چھپا ہوتا ہے۔ فیض کے نزدیک بنیادی اہمیت ''احساس'' کو حاصل ہے لیکن وہ احساس کو مجرد لفظوں میں پیش نہیں کرتے بلکہ ٹھوس حسی پیکروں کا سہارا لیتے ہیں..... فیض نے اپنے انفرادی محسوسات پر زیادہ اعتماد کیا اور جو کچھ پیش کیا اپنے تجربے کے حوالے سے پیش کیا۔..... فیض نے ہمیشہ کوشش کی کہ ان کی شاعری پروپگنڈہ نہ بننے پائے اس مقصد کے لیے بالواسطہ طرز اظہار کا سہارا لیا ہے..... مثال کے لیے ان کی تین نظمیں لی جا سکتی ہیں۔ تنہائی، ملاقات اور ''ایک منظر''..... سردار جعفری نے بھی اپنی بعد کی نظموں کو داخلی کرب کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے جس میں ''ایک خواب اور'' کی نظمیں اہم ہیں۔ دوسرے شاعروں میں سلام مچھلی شہری، احمد ندیم قاسمی اور کسی حد تک ساحر لدھیانوی کو اہمیت حاصل ہے لیکن ان تمام شاعروں نے اپنی شاعری کو بعض داخلی محسوسات سے قریب کرنے اور اپنی تجربہ پسندی کے باوجود جذباتیت پر قابو نہیں پایا ہے۔ بالخصوص ان نظموں میں جن کا موضوع کوئی سیاسی مسئلہ ہے۔ البتہ عشقیہ نظموں میں ان تمام حضرات نے بشمول سردار جعفری نظموں کی تعمیر ٹھوس فنی بنیادوں پر کی ہے مثلاً احمد ندیم قاسمی کی نظم ''عنفوان شباب'' دیکھئے۔ اس نظم میں قاسمی نے جوانی کی آمد کو کلی کے غنچہ بننے کی تمثیل سے ظاہر کیا ہے'' 393

عبدالاحد ساز نے سردار جعفری کے شعری اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یوں تو اُن کا بنیادی اسلوب، زبان کی وضاحت و روانی، الفاظ کی سیال نغمہ ریزی، مصرعوں کی منضبط دروبست، نظم آرائی کے خوبصورت قرینوں اور فنی و معنوی ہم آہنگی کی بناء پر دور سے پہچانا جاتا ہے، لیکن اس بنیادی اسلوب کے دو قابل امتیاز حصے ہیں:

(1) پہلا وہ ہے جو فارسی تراکیب اور لفظیات سے مزین ہے جس میں روایتی شاعری کے مسلمات بڑی قدرت کے ساتھ انقلابی و عصری معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لب و لہجے میں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ انیس، اقبال، جوش اور کہیں کہیں فیض کے قبیل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

(2)۔ دوسرا اسلوب وہ ہے جس کے خطوط قوسین اور زاویے ہمیں بڑے مانوس اور اپنے سے لگتے ہیں۔ یہاں الفاظ میں ایک دھیما بہاؤ، نرم روشگفتگی، تازگی اور سہانا پن ہے۔ فارسی تراکیب اور مسلمات سخن کے بجائے اپنی بات انوکھی اور اچھوتی

امیجری کے ذریعے کہی گئی ہے۔نظموں کی ہیئت اور ڈرافٹ میں ایک غنائی اثر آفرینی ہے۔مفاہیم کی رو سے بھی یہ نظمیں ہمیں اپنی عصری فضا میں رچی بسی لگتی ہیں۔

یہ دونوں پیرایۂ بیان سردار جعفری کے کلام میں آغاز ہی سے ملتے ہیں۔ابتداءتو روایتی آب و رنگ ہی سے ہوئی تھی مگر بہت جلد انہوں نے موثر الذکر اسلوب کو بھی اپنالیا تھا۔چنانچہ پتھر کی دیوار کی زیادہ تر نظمیں ''نئی دنیا کو سلام'' اور ''ایشیا جاگ اٹھا'' ہمیں اسی اسلوب میں ملتی ہیں۔بعد کی شاعری میں کافی عرصے تک اول الذکر یعنی فارسی آمیز اسلوب نمایاں ہے لیکن دوسرا پیرایہ بھی گاہے گاہے متوازی خطوط پر کھینچتا چلا آتا ہے خصوصاً ''ایک خواب اور'' کی نظموں میں ان دونوں اسالیب کو متبادل تواتر کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔..... ''پیراہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' میں بھی اسالیب کا یہی متبادل التزام ہے اگرچہ فارسی آمیز اسلوب کا رنگ غالب ہے۔.....اس کے بعد سے اب تک جو تازہ نظمیں ہیں اور جو ابھی کسی مجموعے کی شکل میں یکجا نہیں ہوئیں صرف رسائل اور شاعروں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اُن میں اُن کا وہی خوبصورت پیرایۂ اظہار نئی توانائی اور کشش کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔اس باب میں نظم ''کربلا'' ''آبلہ پا'' ''دولت دنیا کا حساب''..... ''نومبر میرا گہوارہ'' اور چند ایک نظموں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔''394

سردار جعفری کے شعری اسلوب کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کا شعری اسلوب خوبصورت تراکیب، دلکش استعارات اور فصاحتِ الفاظ سے نمو پاتا ہے۔ان کی شروع کی نظمیں ہوں یا آخری زمانے کی نظمیں، ان سب میں ایک گہرا تاثر، زندگی سے گہری محبت، رجائیت سے بھرپور آواز اور بے پناہ محبت کا جذبہ ہے.....سردار جعفری کی ایک خصوصیت ان کی شاعری کا استعاراتی نظام ہے۔سردار جعفری خود کلاسیکی شاعری کے بہت بڑے مداح ہیں لیکن اگر ان کے کلام کے استعاراتی نظام پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کلاسیکی استعارات سے معنیاتی سطح پر مختلف ہیں۔سردار جعفری اپنے پیکر Images کے لیے نئے استعارے تخلیق کرتے ہیں اور قدیم تشبیہات و استعارات کو نئے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔اپنی منظوم خودنوشت میں سردار جعفری نے خوبصورت تراکیب، دلکش الفاظ اور نرم و لطیف لہجے سے جو فضابندی کی ہے وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی۔اس نظم میں کتنے ہی استعارات اور تراکیب ایسی ہیں جو اردو میں پہلی بار استعمال ہوئی ہیں۔سردار جعفری کی پوری شاعری نئے الفاظ و تراکیب اور نئے استعاروں سے عبارت ہے۔اردو میں نئے الفاظ و تراکیب بہت سے شعراء کے یہاں مل جائیں گی لیکن سردار جعفری کے یہاں زبان کا یہ استعمال بالکل منفرد ہے۔ان کی نظموں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میرے تصور کے زخم خوردہ/ افق کے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں/ کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے/ چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں/ میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں/ جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر.....

ان کی منظوم خودنوشت کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

مرا پہلا سبق اقراء/ ہے تحسین قلم جس میں/ ہے تکریم قلم جس میں/ قلم تحریک ربانی/ قلم تخلیق انسانی/ قلم تہذیب روحانی/

قلم میں شاخ طوبیٰ بھی ہے انگشت حنائی بھی/ مرے ہاتھوں میں آ کر رقص کرتی ہے/ ہزاروں دائروں میں چاند اور سورج کی محرابیں/ درخشاں علم اور حکمت کی قندیلیں/ ہلال نو کا سینہ ماہ کامل کا خزینہ ہے/ مری انگلی نے پہلے خاک کے سینے پہ حرف اولین لکھا/ پھر اس کے بعد تختی پر قلم کا نقش ثانی تھا/ قلم انگشت انسانی کا جلوہ ہے/ عروج آدم خاکی کا دلکش استعارہ ہے 395

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کے بیانیہ شعری اسلوب پر اظہار خیال کیا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

(1) ''اردو کی کلاسیکی شعری روایت میں جس طرح میر اور غالب کی روایت استعاراتی بیان اور ایجازی طریقہ کار پر استوار ہوئی ہے، بالکل اسی طرح ایک ایسی روایت بھی اس کے متوازی چلتی ہے جس میں استعارے اور ایجاز کا جزوی عمل دخل تو ضرور ملتا ہے مگر بنیادی طور پر اسے وضاحتی اور بیانیہ اسلوب کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا.....سردار جعفری اپنے مزاج' افتاد طبع اور اسالیب اظہار کے اعتبار سے اس موخر الذکر روایت کے شاعر قرار پاتے ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری میں بالواسطہ اظہار کے وسائل کا سہارا یقیناً لیا گیا ہے' ان کے یہاں تشبیہ اور تمثیل سازی کا رجحان بھی جگہ جگہ ملتا ہے اور بسا اوقات نئی ہیئتوں کو اپنا کر انہوں نے آہنگ اور تاثر کی نئی جہات بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے' مگر اس قسم کے تمام فنی وسائل ان کی شاعری میں ضمنی اور جزوی وسائل کی حدوں سے آگے نہیں جاتے۔ ان کا بنیادی اسلوب براہ راست تخاطب' وضاحت اور بلند آہنگی سے مرتب ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو اور فارسی کی شعری روایت کے غیر معمولی رچاؤ اور کلاسیکی طرز تخاطب کی تہہ داری سے استفادے نے ان کی نظموں کو محض وضاحتی اور بیانیہ نہیں رہنے دیا ہے''.....سردار کا اصلی شعری اسلوب استعارہ سازی یا بالواسطہ اظہار کا اسلوب نہیں ہے.....سردار کا بنیادی اسلوب بیانیہ اور خطابیہ اسلوب ہے۔

(2) ''سردار جعفری کے خطابیہ لہجے میں جن تشکیلی عناصر نے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں تفصیلات کا جمع کرنا' بلند آہنگ الفاظ کا انتخاب اور بعض لفظوں کی تکرار سے نظم کے آہنگ اور تاثر کو زیادہ بھرپور بنانا بھی ہے''۔

(3) ''سردار جعفری کی نظموں سے اگر آپ یہ توقع وابستہ کریں کہ ان میں ذو معنویت اور علامتی تہہ داری بھی ہوگی تو یہ توقع بہت زیادہ مناسب اس لیے نہیں ہوگی کہ سردار جعفری نے ابتداء سے ہی اپنا اسلوب علامتی نہیں رکھا۔ ان کا شعری طریقہ کار ترقی پسند جمالیات پر استوار ہوا ہے اس لیے ان کی شاعری کا رجحان عوامی مقبولیت کا رجحان رہا ہے اور اس عوامی مقبولیت کے رجحان میں علامتوں اور استعاروں کو سیال بنا کر قابل فہم بنانے کا ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ استعارے اور امیجری کی تلاش و جستجو میں انسلا کی سہاروں پر انحصار نہیں کرتے اس لیے ان کے یہاں نہ تو ارادی طور پر ابہام پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے اور نہ ان کی شاعری کی تحسین یا تفہیم میں ابلاغ کے زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ سردار کے یہاں اگر تفصیلی بیان ملتا ہے تو وہ ایک ایک منظر کی کئی کئی تشبیہوں اور بعض لفظوں اور پیکروں کی تکرار سے اپنا مخصوص آہنگ ترتیب دینے اور رجز کی کیفیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کے باعث ہے۔ سردار جعفری کی پوری شاعری ترقی پسند جمالیات کی شاعری ہے اور اس جمالیات کے اپنے کچھ اصول ہیں' جن کا تتبع کر کے سردار اپنے توانا اور حرکی اسلوب کا احساس دلاتے ہیں اور اردو کے عام نظم کو شعراء میں ہی نہیں ترقی پسند شعراء میں بھی اپنی شناخت قائم کرتے اور اپنا امتیاز برقرار رکھتے ہیں'' 396

عقیل احمد صدیقی نے سردار جعفری کی نظموں میں طرز اظہار کی خصوصیات اجاگر کی ہیں۔

وہ رقمطراز ہیں:

(1) ''سردار جعفری نے 1947 کے بعد جذباتیت پر قابو پانے کی کوشش کی۔انہیں تقریر سے خاص رغبت ہے۔اس لیے ان کے لہجے میں زور خطابت کی بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔1947 کے بعد ''لوئی آراگان'' اور پبلو نرودا'' کے اثر سے ان کی شاعری میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔بلند آہنگی تو اب بھی باقی رہی لیکن انہوں نے اپنے تصورات و جذبات کو ٹھوس حسّی پیکروں سے پیش کرنا شروع کیا۔پتھر کی دیوار'ایک خواب اور'پیرہن شرر میں شامل نظمیں ان کے بدلے ہوئے لہجے کی عکاس ہیں۔ان میں نئی امیجری اور نئی لفظیات نے گہری جاذبیت پیدا کی ہے۔پھر بھی ان کی اکثر نظمیں بالواسطہ شاعری کی ذیل میں نہیں آتیں۔اس لیے کہ بالواسطہ شاعری میں شاعر لفظوں کا استعمال اس طرح کرتا ہے کہ مجرد مفہوم کے پھیلنے'بڑھنے اور سمٹنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔یہی وہ رمزیت اور ایمائیت ہے جو بڑی شاعری کی بنیادی قدر ہے۔شاعر اس مقصد کے لیے تمثیل'علامت'پیکر اور استعارے سے مدد لیتا ہے۔سردار جعفری بھی حسّی پیکر خوب استعمال کرتے ہیں۔بالخصوص 1947 کے بعد کی نظموں میں ان کے یہاں تجریدی بیان کی کمی آئی ہے لیکن ان کی شاعری پھر بھی گہری رمزیت سے عاری ہے۔سردار شاعری میں وضاحت وصراحت کے قائل ہیں اور شعوری طور پر وہ اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

(2) سردار جعفری نے 1947 کے بعد بالواسطہ طرز اظہار اختیار کیا ہے اور اپنے خیالات کو محسوس طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس باب میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن کا موضوع سماجی اور سیاسی ہے۔ان کی مختصر نظمیں اظہار کی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ کامیاب ہیں لیکن طویل نظموں میں سردار جعفری نظم کی اساس حسی پیکروں پر رکھتے ضرور ہیں لیکن بہت جلد خطابت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں نظم ''پتھر کی دیوار'' بھی اس عیب سے خالی نہیں ہے۔یہ ایک کامیاب نظم ہے۔اس میں آغاز ہی سے ایک استعاراتی فضا بنتی ہے اور کئی ٹھوس پیکر'منفرد اور انوکھے استعاروں کی مدد سے بنائے ہوئے ملتے ہیں۔

؎ ایک طویل سناٹا/ جیسے سانپ لہرائے/ .....ماہ وسال آتے ہیں/ اور دن نکلتے ہیں/ جیسے دل کی بستی سے/ اجنبی گزرتے ہیں.....چیختی ہوئی گھڑیاں/ زخم خوردہ طائر ہیں.....نرم رو سبک لمحے/ منجمد ستارے ہیں.....رینگتی ہیں تاریخیں/ روز و شب کی راہوں پر.....پتیوں کی پلکوں پر/ اوس جگمگاتی ہے/ املیوں کی پیڑوں پر/ دھوپ پر سکھاتی ہے/ .....چاند کے کٹورے/ چاندنی چھلکتی ہے.....روشنی کے گالوں پر/ تیرگی کے ناخن کی/ سینکڑوں خراشیں ہیں۔

اس ایک نظم میں اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے اچھوتے پیکر ہیں جن پر شاعر نے اپنے محسوسات کی بنیاد رکھی ہے۔ان کی ایک نظم سناٹا دیکھئے.....اس نظم میں وقت کا پُر ہول رہ گزر'ظلم کا صحرا'جبر کا دشت'آگ کا طشت'شجر کا دھواں ہو کر اڑنا' سناٹے کی صدا سب ہی ٹھوس استعارے ہیں جن کی مدد سے شاعر نے سناٹے کی تصویر بنائی ہے۔یہ نظم استعاراتی ہوتے ہوئے بھی مبہم نہیں ہے۔تصویر صاف اور واضح ہے لیکن نظم بالواسطہ طرز اظہار نہیں اپناتی بلکہ اس میں استعمال ہونے والے الفاظ یا استعارے انسلاکاتی مفہوم سے عاری ہیں اور ہر لفظ کا مفہوم وہیں ہے جہاں پر وہ لفظ مستعمل ہے۔سردار جعفری کی شاید ہی کوئی نظم مکمل طور پر بالواسطہ ہو۔ایک حصہ امیجر کے سبب بالواسطہ ہوتا ہے دوسرا براہ راست۔دراصل سردار جعفری کی

خاص تیکنک وضاحت ہے۔وہ اپنے استعاروں کی توضیح بھی کر دیتے ہیں۔ایسا کرنا ان کے مخصوص شعری رجحان کی مجبوری بھی ہے۔ایک اور مختصر نظم دیکھئے:۔

پیاس بھی ایک سمندر ہے سمندر کی طرح/جس میں ہر درد کی دھار/جس میں ہر غم کی ندی ملتی ہے/اور ہر موج/لپکتی ہے کسی چاند سے چہرے کی طرف (پیاس بھی ایک سمندر ہے)

نظم میں پیاس کو سمندر کہا گیا ہے اور اس کے بعد سمندر ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔پیاس ایک ایسا سمندر ہے جس میں ہر درد کی دھار، ہر غم کی ندی آکر ملتی ہے اور جس کی ہر موج کسی چاند سے چہرے کی طرف لپکتی ہے۔غرض سمندر اور پیاس کی نوعیت ایک سی ہے۔نظم میں الفاظ انسلاکاتی مفہوم بھی رکھتے ہیں یعنی ذہن الفاظ کے رشتوں کی تلاش کرتا ہے اور تب ایک مفہوم متعین ہو پاتا ہے۔یہ نظم بالواسطہ طرز اظہار رکھتی ہے۔اس طرح کی مثالیں سردار جعفری کی شاعری میں خال خال ملتی ہیں ورنہ ان کا مجموعی رویہ وضاحت وصراحت کا ہے" 397

پروفیسر علیم اللہ حالی نے سردار جعفری کے شعری اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1) ''شعری اظہار بیان خارجی حقائق کی خوبصورت اور دلکش ترجمانی کا متقاضی ہوتا ہے۔سردار جعفری نے اپنی طویل ومختصر نظموں میں جگہ جگہ بیان کے اس حسن کا مظاہرہ کیا ہے۔بنیادی طور پر وہ طویل نظموں کے شاعر ہیں اور طویل نظموں میں شعری حسن کا اظہار جستہ جستہ ہوتا ہے۔یہ ٹھہر ٹھہر کر وقفے کے بعد دلکشی پیدا کرتی ہے۔

(2) سردار جعفری کے یہاں شعری حسن طاقتور اظہار سے بھی پیدا ہوتا ہے۔سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا لفظوں کا طوفان قاری کو اظہار کے اتار چڑھاؤ کا حسن بخشتا ہے.....نظم ''بمبئی'' کے یہ مصرعے دیکھئے۔روانی نے کیسی جادو بیانی دکھائی ہے''۔

پھر بھی اے بمبئی نو مرا شہر ہے/تیرے باغات میں میری یادوں کے کتنے ہی رم خوردہ آہو/میں نے تیرے پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کھائی ہے/تیری شفاف جھیلوں کا پانی پیا ہے/تیرے ساحل کی ہنستی ہوئی سیپیاں مجھ کو پہچانتی ہیں/ناریل کے درختوں کی لمبی قطاریں/تیرے نیلے سمندر کے طوفان اور قہقہے/تیرے دلکش مضافات کے سبزہ زاروں کی خاموشیاں/رنگتیں، نکہتیں سب مجھے جانتی ہیں/اس جگہ میرے خوابوں کو آنکھیں ملیں/اور میری محبت کے بوسوں نے اپنے حسین ہونٹ حاصل کیے۔

(3) ''انہوں نے شعری محاسن کے نت نئے تجربات پیش کیے ہیں اور نئے الفاظ ولغات کو زینت سخن بنایا ہے۔ 398

ڈاکٹر محمد فیروز نے سردار جعفری کے بیانیہ رنگ سخن کا یوں ذکر کیا ہے:

''سردار جعفری کے افکار ونظریات واضح اور بھرپور طور پر بیان ہوئے ہیں اور جس سے ان کی شاعرانہ عظمت اور شناخت قائم ہوتی ہے۔وہ دراصل صنف نظم ہے۔سردار کی شاعری کا آغاز چونکہ عزاداری اور مرثیہ خوانی کے ماحول میں ہوا۔چنانچہ انیس کے بیانیہ انداز سے وہ قدرتی طور پر متاثر ہوئے۔بعد کو اقبال اور جوش سے بھی متاثر ہوئے۔خاص طور پر جوش ملیح آبادی کے اثرات تو سردار کی شاعری میں اول سے آخر تک نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔انیس، اقبال اور جوش تینوں شعرا بنیادی طور پر بیانیہ اور نظمیہ شاعری کے نمائندہ فن کار رہے ہیں۔لہٰذا ان شعرا سے اثر پذیری کے باعث سردار جعفری کے شعری سفر میں

شروع ہی سے بیانیہ رنگ سخن نمایاں ہوگیا اور بعد میں یہی شعری اسلوب ان کی خاص پہچان بن گیا۔شروع میں وہ آزاد نظم سے متفق نہیں تھے مگر بعد میں اس صنف کو بھی انہوں نے وسیلۂ اظہار بنایا اور اس صنف کے امکانات روشن کیے'' 399

سردار جعفری کے شعری اسلوب میں ابہام سے گریز اور وضاحت، صراحت اور تکرار کی موجودگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ وہ شاعری میں اشکال و ابہام اور پیچ در پیچ معانی آفرینی سے قصداً گریزاں تھے، علاوہ ازیں ان کا سماجی و سیاسی شعور و مسلک بھی انہیں جادۂ اعتدال سے ہٹنے کی اجازت نہ دیتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں مروجہ وہ تمام ضروری حربے یعنی خطابت، بلند آہنگی، وضاحت و صراحت اور تکرار خیال موجود ہیں جن سے ترسیل خیال میں زبان دانی کے سبب دشواری نہ حائل ہو، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس وضع احتیاط کے باوجود بھی کہیں کہیں ڈوران کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے اور شاعرانہ تخیل نے ایسی جوالانیاں دکھائی ہیں جو دید کے قابل ہیں۔علامتوں کو تو راہ نہیں مل سکی ہے لیکن تشبیہہ، تمثیل اور استعاروں نے اکثر مشترکہ تہذیبی و تاریخی حقائق کے بیان میں بھی اپنے جادو جگائے ہیں اور اس طرح بعض نایاب شعری مرقعے سامنے آگئے ہیں۔ 400

سردار جعفری نے اپنی نظم ''استالن کتھا (دسمبر 1948 مشمولہ خون کی لکیر) کے درمیان ایک غزل پیش کی تھی اس میں انہوں نے اپنے نظریہ شعر کی وضاحت کی ہے۔

جو سب کی سمجھ میں آ نہ سکیں بیکار ہیں سب وہ شعر و غزل
جنتا کی زبان میں کہنا ہے جنتا کو سنانا ہے ساتھی

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے سردار جعفری کے شعری سرمایہ کی عام فہم سلیس زبان پر روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس مقصد (ادب کو عوام کے قریب لانا، زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر) کے حصول کے لیے موضوعات کی اہمیت کو کون رد کرسکتا ہے لیکن موضوعات سے اہم زبان ہے تا آنکہ وسیلہ ہی واضح اور عوامی نہ ہو، مقصد کا حصول سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔زبان کے استعمال میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کی ترجمانی من و عن کی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کی زبان کو عوامی حلقوں سے ماخوذ کیا ہے اس لیے ان کی شاعری عوام سے قریب ہوگئی ہے۔انہوں نے ارادتاً اس کی کوشش کی ہے اور اس احساس کے ساتھ کہ ان کو عوام کے لیے شاعری کرنا ہے خواص کے لیے نہیں.....ان کے ہاں عام فہم، سیدھے سادے اور سلیس الفاظ کی بہتات ہے، کسانوں اور کلرکوں کی رمزانہ زندگی ہے، گاؤں ہے، چوپال ہے، کارخانہ ہے، میلے تماشے ہیں، عورتوں کے جمگھٹے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اور وہ اتنی آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ یہی عام الفاظ جو اپنے طور پر بے جان یا کم از کم غیر شاعرانہ ہوتے ہیں۔ان کے کلام میں زندگی دوست اور شعریت سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ایک نہیں ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی۔

بھوک کا بھیانک روپ/ چکیوں کے بھدّے راگ/ روٹیوں کے دانتوں میں/ ریت اور کنکر ہیں/ دال کے پیالوں میں/ زرد زرد پانی ہے/ چاولوں کی صورت پر/ مفلسی برستی ہے/ سبزیوں کے زخموں سے/ پیپ سی ٹپکتی ہے (پتھر کی دیوار)۔

ملوں میں کھیتوں میں محنتوں کی حکمرانیاں/لڑکڑوں کے گردناچتی ہوئی جوانیاں/سرور کیف شعر نغمہ داستان کہانیاں/
خزاں کا نام بھی نہیں بہار ہی بہار ہے (سویت یونین اور جنگ باز) 401

عمر رضا نے سردار جعفری کے بیسویں صدی کی اسّی کے دہائی کے نزم اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

(1) ''سردار جعفری نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا اور طرح طرح کے مظالم سے دوچار ہندوستانی عوام آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں و پریشاں تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے آزادی کے بعد کا بھی زمانہ دیکھا۔علاوہ ازیں بیسویں صدی کے اخیر تک ہندوستان کے حالات وواقعات کے وہ چشم دید گواہ رہے ہیں۔اس عہد میں کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات بھی ہوئے جن سے متاثر ہوکر وہ آزادی سے قبل کے اپنے انقلابی اور باغیانہ لب ولہجے کو پھر سے اختیار کرسکتے تھے لیکن اب ان پر یہ فلسفہ آشکارا ہوگیا تھا کہ شاعری میں ابہام استعارہ اور علامت بیحد ضروری ہے نیز کسی بھی خیال یا واقعہ کو نزم اور مدھم لب ولہجہ میں ہی کہنا شاعری ہے لہٰذا دور حاضر کے سنگین اور پُرخوں حالات کے اظہار کے لیے سردار جعفری نے اسی طرح کا انداز اختیار کیا۔

(2) ''اس عہد کی نظموں اور غزلوں میں سردار جعفری نے جلال اور جمال دونوں کو کچھ اس طرح برتا ہے جس سے ان کی شاعری مزید نکھر گئی ہے۔گویا اسّی کی دہائی میں انہوں نے جس نظریۂ شعروادب کو مستحکم کیا اس عہد میں انہوں نے اس کی توسیع کی۔یہی وجہ ہے کہ اب سردار جعفری کی ادبی وفکری زندگی بھرپور جمالیات سے عبارت نظر آتی ہے۔اس عہد کی شاعری میں انہوں نے جس طرح سے نزم اور مدھم لب ولہجے کو اختیار کیا ہے وہ بے حد دلچسپ اور دل نشیں ہے۔مناسب اور برمحل تشبیہات استعارات اور تلمیحات کے استعمال نے ان کی شاعری کو تمام تر شعری لطافتوں سے مزین کردیا ہے جو دلوں کو گرماتی ہے اور شعری حظ بھی عطا کرتی ہے۔'' 402

پروفیسر مظہر امام نے سردار جعفری کے آخری دور کی نظموں کے شعری اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''جعفری کی تازہ ترین نظمیں جو اب سے کم وبیش پندرہ بیس سال پرانی ہیں ان میں ایک بار پھر ان کے بدلے ہوئے مزاج اور شعری اسلوب کا واضح عکس ملتا ہے۔ان میں طرز اظہار کی خوبصورتی اور نفاست زیادہ ہے اور الفاظ کے دلکش دروبست سے ایک خاص طرح کے جھنکار کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔'' 403

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے مطابق سردار جعفری کی شاعری میں اشاریت نہیں ہے لیکن کچھ نظموں میں اشاریتی فضا ضرور ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''امیجری اور اشاریت وغیرہ نئی باتیں نہیں لیکن جدیدیت میں ان کا روپ بدلا ہوا ضرور ہے''۔

''سردار جعفری کے ہاں اشاریت نہیں ملتی۔ان کی شاعری مقصدی شاعری ہے اور ان کے مخاطب ہیں عوام۔اشاریت اور ابہام ایسی مقصدی شاعری کے لیے مناسب نہیں لیکن ''ایک خواب اور'' اور اس کے بعد کی چند منظومات سے پہلو تہی نہیں کرسکے ہیں مگر ابہام کی سرحدوں سے دور ہی ہیں۔نظم ''اناج'' میں اشارات نہ سہی اشاریتی فضا ضرور ہے۔ہندوستانی

کاشتکار کی بے بسی، افلاس اور بھوک کی تصویر اشاریتی انداز میں ملتی ہے (اناج کی زبان)۔

وہ ترستے ہیں مجھے اور میں ترستا ہوں انہیں/ جن کے ہاتھوں کی حرارت نے اگایا مجھ کو/ کیا ہوئے آج مرے ناز اٹھانے والے/ ہیں کہاں قید غلامی سے چھڑانے والے۔

''میرا سفر'' اور ''قتل آفتاب'' ان کی خاصی معروف نظمیں ہیں جن میں ''ایک کالے سمندر کی تہہ میں'' اور ''نیلی فضا کی مخمل پر'' جیسے مصرعے مل جاتے ہیں جن میں اشاریت کا جدید روپ مل جاتا ہے'' 404

نظم ''اکیلا ستارہ'' (مشمولہ مجموعہ خون کی لکیر) کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

نظم ''اکیلا ستارہ'' ابہام کے پردے میں لپٹی ایک ایسی نظم ہے جس میں سردار جعفری نے ہندوستان کی محکومی، غلامی اور اس کے ساتھ ہو رہی ظلم و زیادتیوں کو برمحل استعاروں کے ذریعہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ نظم صرف اسی خاص موقع سے کہی گئی ہے۔

ملاحظہ کریں۔

افق کے کونے میں اک اکیلا ستارہ یوں جگمگا رہا ہے!/ کہ کوئی جیسے غموں کی یورش میں زیر لب مسکرا رہا ہے/ فضاؤں کے سرمئی دھندلکے میں شام تحلیل ہو رہی ہے/ ہوا میں اڑتا ہے شب کا آنچل اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے/ ٹپک پڑا ہے سیاہ شب کی سیاہ پلکوں سے ایک آنسو/ شفق کے رخسار سے ڈھلک کر زمیں کے دامن میں آ رہا ہے۔ 405

سردار جعفری کی شاعری میں جہاں وضاحت اور قطعیت ہے وہیں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جہاں اشاریتی انداز بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے ان دونوں خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

(1) ''سردار جعفری کی شاعری وضاحت اور قطعیت کی شاعری ہے۔ قطعی وضاحت کی اور واضح قطعیت کی۔ اپنے غیر معمولی تاریخی اور تہذیبی شعور، اردو شعر و ادب کے ورثے کے کما حقہٗ احساس، عصری سیاسی، معاشی اور ادبی تحریکات کے گہرے مطالعے اور زبان و بیان پر بے پناہ عبور نے سردار جعفری کی شاعری کو نکھارا اور نکھار دیا ہے۔ سردار جعفری مارکسی فلسفۂ حیات سے متاثر ہیں، اس قدر کہ اس کی خاطر وہ شعر و ادب کے بیشتر تقاضوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں و نیز ارادی طور پر جب کسی فلسفۂ حیات کو موضوع شاعری بنانے کی سعی کی جاتی ہے شعری حسن اور ادبی اقدار پر جو اثر مرتب ہوتا ہے سردار جعفری کی شاعری پر بھی موجود ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ سردار جعفری کی ترقی پسند تحریک کو بہت زیادہ دین ہے۔ وضاحت اور قطعیت کے باعث سردار جعفری کے کلام میں استعارات اور اشارات کی تصویر مدھم ہے وہ مافی الضمیر کے دوٹوک اور بلا تکلف اظہار پر زور دیتے ہیں۔ ان کے اپنے موقف کی روشنی میں ایسا ضروری بھی ہے''۔

(2) البتہ ان کی مثنوی نئی دنیا کو سلام بنیادی طور پر ایک اشاریتی نظم ہے جو گہری اور زیادہ معنی خیز نہ سہی اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ خود سردار جعفری نے ''نئی دنیا کو سلام'' کے اشارات کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کے (نئی دنیا کو سلام) کردار، کردار نہیں علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں صرف مبہم سا خاکہ ہے جس کو میں نے رنگ

بھرنے کے لیے بنایا ہے۔واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات' تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔نامہ بر روایتی کردار ہے جس کے فرائض اس نظم میں بدلے ہوئے نظر آئیں گے۔سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں۔وہ نئی دنیا کی علامت ہے۔اس کی حسین اور معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے''۔

(سردار جعفری ''نئی دنیا کو سلام اور جمہور' کتب پبلشرز' ممبئی' مئی 1947 'طبع اول' صفحہ 8'9 بحوالہ اردو شاعری میں اشاریت از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید' صفحہ 223)

(3) ''سردار جعفری کی ایک اور نظم ''پتھر کی دیوار'' میں بھی قدرے اشاریتی انداز ملتا ہے لیکن یہاں اشاریت موضوع سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتی ہے۔

''پتھر کی دیوار'' کے بارے میں حامدی کاشمیری نے صحیح لکھا ہے:

''اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کی روحانی گھٹن' تنہائی اور ویرانی کا اظہار کرتا ہے لیکن آخری بند میں نظم کا اسلوب شعریت اور رمزیت سے عاری اور برہنہ ہو کر تک بندی بن کر رہ جاتا ہے اور نظم کے مجموعی تاثر کو نقصان پہنچاتا ہے''

(حامدی کاشمیری' جدید اردو نظم اور یورپی اثرات'' مجلس اشاعت ادب' دہلی' مارچ 1968' صفحہ 335 بحوالہ اردو شاعری میں اشاریت از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید' صفحہ 224)

(4) ''یوں بھی سردار جعفری کے ہاں انفرادی طور پر اشارات کم ملتے ہیں۔ادھر بعد کی منظومات میں انہوں نے عام طور پر اشاریتی فضا سے کام لیا ہے۔مثلاً پیغمبر مسیحا دست ''قتل آفتاب'' اور ''میر اسفر'' میں۔ان میں خاص طور پر ''قتل آفتاب'' اور ''میر اسفر'' سردار جعفری کی اہم ترین منظومات ہیں جن میں اُن کا فن اپنے عروج سے ہمکنار ہے اور اشاریت نکھری ستھری اور دلنواز! ''قتل آفتاب'' کا موضوع عوامی انقلاب اس کی جدوجہد' اس جدوجہد کی راہ میں حائل ہونے والے مواقع۔اس کی بے حاصلی اور پھر ایک نیا جذبہ اور نئی امنگ ہے جو بڑھنے بڑھنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے اور مایوسی سے دور اور امید و رجائیت سے ہمکنار کرتی ہے۔''شفق کے رنگ میں ہے قتل آفتاب کا رنگ'' سے آغاز ہونے والی نظم یوں اشاریتی انداز میں رجائیت سے بھرپور آہنگ پر ختم ہوتی ہے:

چمک رہی ہیں کہیں تیرگی کی دیواریں
لچک رہی ہیں کہیں شاخ گل کی تلواریں
سنک رہی ہے کہیں دشت سرکشی میں ہوا
چہک رہی ہے کہیں بلبل بہار نوا
مہک رہا ہے وفا کے چمن میں دل کا گلاب
چھلک رہی ہے لب وعارض ونظر کی شراب

''میرا سفر'' کا موضوع بے حد ہمہ گیر ہے۔یہ صرف شاعر کا سفر نہیں' ابن آدم کا سفر بھی ہے۔ازل سے ابد تک۔کبھی نہ ختم ہونے والا سفر۔سفر' ہمیشہ جاری رہنے والا سفر۔اس طرح سردار جعفری نے انسان اور انسانیت پر اپنے اٹل' غیر متزلزل اور محکم ایقان کا اظہار کیا ہے کہ انسان مر نہیں سکتا۔انسانیت مر نہیں سکتی۔اشارے کم سہی لیکن اشاریت سے یہ نظم مملو ہے۔اس میں از ابتدا تا انتہاء اشاریتی فضا جاری وساری ہے۔ویسے اس خوبصورت نظم کا اہم اشارہ ''کالا سمندر'' ہے۔'' 406

علامتیں:

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

''وہ (سردار جعفری) ایسی مبہم علامتوں کا جال نہیں بچھاتے کہ ان کی شاعری معمہ و چیستاں ہو جائے۔ان کی علامتیں قابل فہم ہوتی ہیں۔ 407

راشد انور راشد:

(1) ''ان کے (سردار جعفری) ذہن کی تشکیل میں کلاسیکی مزاج اور معیار کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔''

(2) ''سردار جعفری نے اپنی شاعری میں مخصوص کیفیات کی تصویر کشی کے لیے جو علامتیں استعمال کی ہیں' جن استعاروں کا سہارا لیا ہے' اور ذہن میں پوشیدہ منظر کی ہو بہو عکاسی کے لیے لفظیات کا تانا بانا جس طرح بنا ہے' اس سے کائنات کا ایک وسیع منظر نامہ پوری طرح روشن ہو جاتا ہے۔فطرت سے انہیں گہرا لگاؤ ہے جس کا اظہار اپنی نظموں میں انہوں نے مختلف شکلوں میں کیا ہے۔ 408

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی لکھتے ہیں:

''سردار کی نظمیں ان کے بیدار شعور اور دردمند دل کی عکاسی کرتی ہیں۔الفاظ کا فنکارانہ انتخاب' خوبصورت اور نئی تشبیہات و استعارات' علائم کا بر موقع استعمال ان کے نظموں کے ظاہری حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ 409

ڈاکٹر غ۔ع۔شیخ نے سردار جعفری کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

(1) ''جعفری ترقی پسند شاعر ہیں وہ اپنے کلام میں بلا جھجک نئے تشبیہات و استعارات کا استعمال کیے ہیں اور نئی امیجری بھی۔وہ اپنے اصول کے بہت پابند ہیں۔تشبیہہ و استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایسے مصرعے زیادہ پڑھنے کو ملتے ہیں''۔

پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں
شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر
چاولوں کی صورت میں مفلسی برستی ہے

(2) ''علی سردار جعفری زنداں و قفس کہنے کے حامی نہیں ہیں۔ وہ جیل اور قید خانے کے لفظوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ پہرہ دار اور پاسبان ہی نہیں بلکہ واڈر اور نمبردار کے الفاظ کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ عام استعمال کے الفاظ ہیں اور جیل میں ان ہی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ان اصولوں کی خوبی کی وجہ سے انداز بیان میں تنوع کے بڑے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور دوسری یہ کہ جدید زندگی اور اس کی شیطانیت اور آدمیت دونوں اپنے لوازمات کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں جو حقیقت کے لیے ضروری ہوتے ہیں''۔ 410

عمر رضا کے مطابق ''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری کی ایک کامیاب نظم ہے جو نہ صرف یہ کہ موضوعات کی سطح پر بھی اپنے جلوے بکھیرتی ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ 411

ڈاکٹر شمیم رضوی لکھتی ہیں:

''علی سردار جعفری کی شعری جمالیات کی تشکیل تیل کے چشموں، کوئلے کی کانوں اور سوت کے کارخانوں سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس قسم کی لفظیات زیادہ نظر آتی ہیں۔ سیاہ ہیرا (کوئلہ)، پگھلے ہوئے ستارے (چشموں کا تیل)، کپاس کی چاندنی (روئی)، سورج کی رنگین کرنوں کی لچکتی ہوئی انگلیاں (رات کے تار) وغیرہ۔ 412

سردار جعفری نے فیض کے ڈکشن کو اپنی شاعری میں برتا۔ یہ ساری کشادہ ظرفی کی باتیں ہیں۔'' 413

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے لکھا ہے:

''ان کی (سردار جعفری) کی زبان پر جہاں ہندوستان کے عوام کی بولی کے الفاظ ہیں وہیں فارسی کی خوب صورت ترکیبیں بھی ہیں۔..... انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ جنتا کی زبان میں جنتا کو سنانے کے لیے شاعری کریں گے اور شاعری کو اونچے سنگھاسن سے نیچا تاریں گے تا کہ ہندوستان کی عام جنتا سمجھے۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''میری شاعری خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے ہے اور میری یہ خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سمجھیں، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان۔

(پیش لفظ۔ امن کا ستارہ/ 1950)

حالاں کہ یہ بات بھی درست ہے کہ سردار جعفری ہر جگہ جنتا کی زبان میں نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری عوام و خواص دونوں میں پسند کی جاتی ہے۔ ان کی نظمیں جب مجمعوں اور مشاعروں میں پڑھی جاتی ہیں تو سارے لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہیں اور سب ان سے محظوظ ہوتے ہیں''۔ 414

جذبات:

عمر رضا لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات و احساسات کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جس سے

نظم میں شدت اور تاثیر بھر جاتی ہے"۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" میں جذبات کی شمولیت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے جمالیاتی انبساط کا ذکر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

"نئی دنیا کو سلام ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ یہ تمثیلی نظم غلام ہندوستان کے حالات اور ان حالات میں عوام کی آرزوؤں اور تمناؤں کو جذب کیے ہوئے شدید جمالیاتی ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ جدید اردو شاعری میں یہ پہلی تمثیلی نظم ہے جو ڈرامائی شاعری کی خصوصیات لے کر آئی ہے۔ اچھی ڈرامائی شاعری جذبات اور جذبات کے مختلف رنگوں کو پیش کرتی ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" میں جذبات اہم ہیں۔ جذبوں کی بنیاد ہی پر اس تمثیلی نظم کے موضوعات اور واقعات ابھرتے ہیں، متاثر کرتے ہیں اور جمالیاتی انبساط عطا کرتے ہیں۔ نئی دنیا کو سلام جدید اور اردو شاعری کی پہلی تمثیلی نظم ہے کہ جس میں آٹھ رس ..... ملتے ہیں" 416

پروفیسر کوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

علی سردار جعفری کا معاملہ مخدوم سے مختلف ہے۔ وہ خاصے پُر آہنگ اور پُر گو شاعر ہیں اور ان کے موضوعات میں تنوع بھی زیادہ ہے۔ مخدوم جس طرح اپنے رمزیہ انداز بیان اور جمالیاتی رچاؤ سے فیض کی یاد دلاتے ہیں، سردار جعفری اپنے زور بیاں اور جوش خطابت سے جوش ملیح آبادی کی یاد دلاتے ہیں: 417

سردار جعفری کے خطیبانہ لہجہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

"ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں سردار جعفری بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا لہجہ خطیبانہ ہے اس لیے وہ اقبال کے آہنگ کے قریب ترین نظر آتے ہیں"۔ 418

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

وہ (سردار جعفری) اقبال سے اتنے متاثر رہے کہ اقبال کی فکری عظمت کو پہچانے بغیر ان کے خطیبانہ لہجے کی تقلید کرتے رہے۔ نئی شاعری کو خطابت سے بیر ہے۔ حال ہی میں ان کے لہجے میں تبدیلی ہوئی ہیں"۔ 419

رفعت سروش:

"سردار جعفری نے اپنے حسن خطابت کے جواہر پاروں کو جہاں جہاں ضرورت ہوئی اپنی شاعری میں بھی سجایا اور اس طرح اپنا ایک الگ رنگ سخن اردو شاعری کو دیا۔" 420

ڈاکٹر علی احمد فاطمی:

"صحیح بات یہ ہے کہ سردار جعفری کی بڑی شاعری وہیں جنم لیتی ہے جہاں وہ جوش خطابت، انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں اور یہ لہجہ ان کے فکر و فلسفہ کا اصل روپ اختیار کر لیتا ہے جس کے بطن سے انسان دوستی کی اعلیٰ و ارفع قدریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ علمیت سے پُر ایک مخصوص قسم کی بڑی شاعری، انقلابی شاعری کے بنیادی عناصر اور سردار کی شاعری کی اولین شناخت کا حوالہ تو یہی عناصر ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا خطیبانہ شاعری یا انقلابی شاعری بڑی نہیں ہوتی؟ آخر بڑی شاعری

کے اصول اور پیمانے کیا ہیں۔ کیا دھیمے لہجے کی رومانی، نفسیاتی، پیچیدہ شاعری ہی بڑی ہو سکتی ہے۔ اگر صرف یہی سچ ہے کہ دنیا کی وہ تمام بڑی شاعری جو خطابت سے وابستہ ہے خواہ وہ مولانا روم کی مثنوی ہو یا اقبال کی نظم نگاری۔ آپ اسے کس خانے میں رکھیں گے۔'' 421

سرور الہدیٰ نے سردار جعفری کی شاعری میں ان کے انداز گفتگو کا فیض اور اقبال سے تقابل کیا اور بتایا ہے کہ یہ اقبال سے قریب ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کیے بغیر وہی باتیں کہی ہیں جو انہیں کہنی تھیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سردار جعفری کی شاعری میں گفتگو کا وہ انداز نہیں جو ہمیں فیض کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ فیض کی آہستگی، دھیمی دھیمی پکار قاری کو دلاویز معلوم ہوتی ہے۔ سردار جعفری اپنی گفتگو کو باوقار اور باوزن بنانے کے لیے الفاظ کی بندش کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں تیزی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے جہاں تک آواز کی بلند آہنگی کا سوال ہے تو اس معاملے میں سردار اقبال سے قریب نظر آتے ہیں۔ ایک بات جو دونوں میں مشترک ہے وہ ہے شاعری کا افادی اور تعمیری پہلو۔ دونوں کی نظر میں یہ بات زیادہ اہم تھی کہ بات کو پوری قوت سے پیش کیا جائے۔ سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' جس میں گفتگو کا وہی بولتا ہوا انداز ہے میرا خیال ہے سردار جعفری کی شاعری میں گفتگو کا یہ انداز ان کے اسلوب کا حصہ بن چکا ہے''۔ 422

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کے ہاں جوش و جذبہ، ولولہ اور ہمہمہ بے حد زیادہ ہے۔ بعض اوقات تو جذبات کی روانی صورتِ سیل اس قدر تیز رہتی ہے کہ ان کا قلم بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ آزاد نظموں میں یہ کیفیت بے اندازہ، بے پناہ اور بیکراں ہوتی ہے۔'' '' امن کا ستارہ'' ایک شاعرانہ تقریر میں جذبات کا سیلاب اپنی مثال آپ ہے لیکن جہاں کہیں خطابت اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے، شعریت مجروح ہوئی ہے۔ اگرچہ انہوں نے کہا ہے کہ ''خطابت کی بھی شاعری میں جگہ ہے بشرطیکہ وہ شاعرانہ حدود کے اندر رہو'' (ترقی پسند ادب، صفحہ 146) لیکن سردار جعفری نے خطابت کے تعلق سے شاعرانہ حدود کو جہاں تہاں نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ کیفیت خصوصاً ''امن کا ستارہ'' کی تمام منظومات میں ملتی ہے۔ 423

سردار جعفری کی شاعری میں منظر نگاری کے بارے میں ریوتی لال شاہ نے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری فطرت کے ساتھ ایک ہونا ضروری محسوس کرتے ہیں۔ لگتا ہے عالم طفلی میں سرزمین اودھ کے بھرپور قدرتی نظاروں سے حاصل کیے ہوئے تجربات ان کے حافظے میں جیوں کے تیوں سنبھال کر رکھے ہوتے ہیں''۔

ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں/ پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں/ ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں...../ حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں/ فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں/ نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر/ گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی/ گھیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر/ خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں/ ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں/ قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو

رہا ہے/ وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں/ جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں/ ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں/ ان آسماں بوس چوٹیوں کو/ سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے۔ 424

ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے سردار جعفری کی شاعری میں منظر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''حسن موسم کا ہو یا مناظر کا' اودھ کی خاک حسیں کا ہو یا ممبئی کے بے رونق سڑکوں کا یا جیل کی تنہا شاموں کا' یہ سب کچھ جس شدت کے ساتھ انہیں متاثر کرتا ہے' اس کا اظہار اس نادر امیجری سے ہوتا ہے جو ان کے کلام میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ یہ امیجری ان کے راست' بلند بانگ اور خطابیہ انداز بیان میں جو رنگ بھرتی ہے' اس سے ان کی آواز کا تاثر دوچند ہو جاتا ہے۔ حسن اس کی آنکھوں کا رنگین پردہ بن کر ان کی نگاہ کو روکتا نہیں ہے' نہ وہ انہیں کسی خواب ناک وادی میں لے جا کر کھو دیتا ہے' بلکہ اس کی بدولت حیات و کائنات سے پیار اور امید و یقین کی راہ اور زیادہ روشن ہوتی ہے۔ فطرت کا حسن ان کے لیے خاص طور سے کشش رکھتا ہے۔ ان کا زندہ و بالیدہ احساس خود ان کی ذات کو اس منظر میں ضم کر دیتا ہے۔ وہ خود کو فطرت کے پر اسرار اور دلکش مظاہرے سے الگ نہیں پاتے۔ چنانچہ ''میرا سفر'' کے علاوہ ان کی .....نظموں میں سوانحی نظم ''نومبر میرا گہوارہ'' اور ''آبلہ پا'' میں ان کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچتا ہے جہاں وہ بے مثال مرقعے تراشتے ہیں مثلاً۔

مجھے سورج نے پالا/ چاند کی کرنوں نے نہلایا/ ہر اک شئے مجھ سے تھی مانوس/ مجھ سے بات کرتی تھی/ درختوں کی زباں/ چڑیوں کے نغمے میں سمجھتا تھا/ ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں/ میں ان کے ساتھ اڑتا تھا/ مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے/ میں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا

اور پھر آگے چل کر اس نظم میں کہتے ہیں:

میں خود فطرت تھا' فطرت میری ہستی تھی/ اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں/ مسیں بھیگیں رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا/ مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چلن آیا/ ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا 425

ڈاکٹر شمیم رضوی لکھتی ہیں:

''مناظر فطرت کی عکاسی میں میر انیس اور جوش کے بعد اگر پورے اعتماد کے ساتھ کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ علی سردار جعفری ہیں''۔426

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے پیکر تراشی کی تعریف اور اس کی اقسام بیان کی ہیں' ملاحظہ فرمایئے:

پیکر تراشی:

پیکر دراصل وہ ذہنی تصویریں ہیں جو ہمارے تحت الشعور میں بس جاتی ہیں۔ شاعر اس ذہنی تصویر کو لفظوں کا پیراہن پہناتا ہے تو وہ پیکر کہلاتا ہے۔

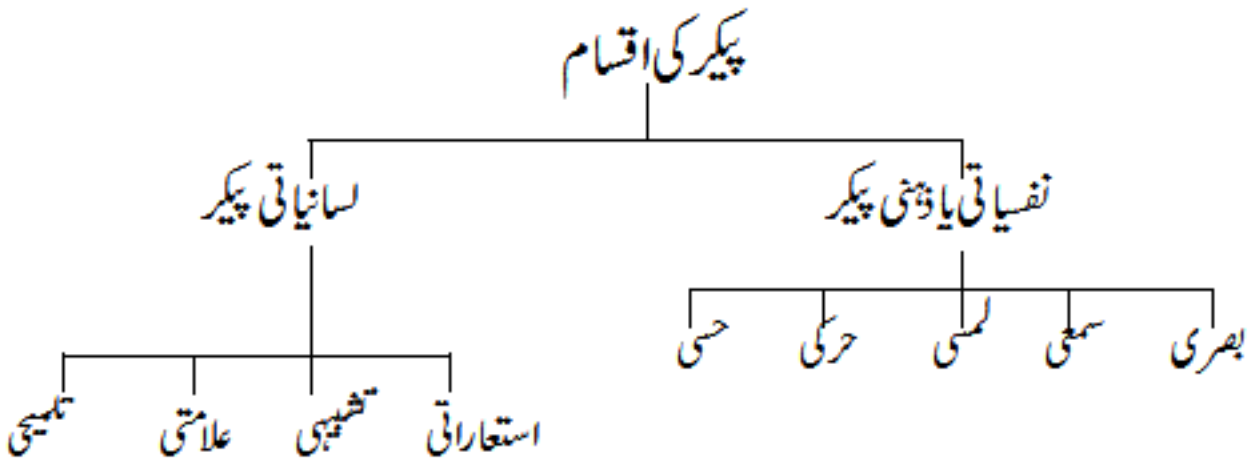
پیکر کی اقسام:

پردۂ ذہن پر بننے والی یہ تصویریں رنگین بھی ہو سکتی ہیں' دلکش بھی' روح کو پگھلا دینے والی بھی' نغمگی سے بھرپور بھی' ملائم

بھی اور روشنی سے مملو بھی ۔اس لحاظ سے پیکر کی مختلف قسمیں کی جاسکتی ہیں:

نفسیاتی یا ذہنی پیکر:

جب انسانی ذہن کسی شئے کے بصری احساس سے آشنا ہوتا ہے تو اس سے ایک اثر قبول کرتا ہے اور اس اثر کے نتیجہ میں اس شئے کا ایک مخصوص تاثر یا عکس ذہن میں بنتا ہے ۔گویا یہ نفسیاتی یا ذہنی پیکر ہے لیکن جب ذہنی یا نفسیاتی پیکر لفظوں میں ڈھل جاتا ہے تو لفظی پیکر کہلاتا ہے جو اس خمسہ نفسیاتی پیکروں کی تشکیل میں ایک زبردست رول ادا کرتے ہیں۔



بصری، سمعی، لمسی پیکر:

کسی شئے کو دیکھ کر، کسی آواز کو سن کر یا کسی چیز کو چھو کر جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بالترتیب بصری، سمعی یا لمسی کہلا سکتا ہے۔

حسی پیکر:

نفسیات کا تعلق بذات خود حس سے ہے اور حسی قوت میں تمام حواس خمسہ شامل ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی حسی پیکر کی اپنی ایک الگ نوعیت ہے حواس خمسہ کی بجائے محض جذبات و احساسات یعنی feeling یا واردات قلبی سے تعلق رکھتی ہے ۔اس میں ذہن و قلب کی داخلی کیفیات اور خارجی احساسات دونوں کو دخل حاصل ہے۔بعض احساسات معروضی ہوتے ہیں ۔بعض اشیاء غیر مرئی ہوتی ہیں ۔انہیں نہ چھوا جاسکتا ہے ۔نہ دیکھا جاسکتا ہے ۔صرف محسوس کیا جاسکتا ہے ۔جیسے ہواؤں کی خنکی ۔اس کو نہ دیکھا جاسکتا ہے نہ سنا جاسکتا ہے ۔ہاں محسوس کیا جاسکتا ہے۔خنکی کا یہ احساس جب ذہن سے ٹکراتا ہے تو اپنا ایک مخصوص امیج بناتا ہے اور جب ہم دوبارہ کہیں اس قسم کی خنکی سے دوچار ہوتے ہیں تو تحت الشعور میں بسے پچھلے احساس کی مدد سے ایک نیا پیکر ہمارے ذہن میں بنتا ہے وہ حسی پیکر ہوتا ہے ۔اس میں صرف جذبے یا احساس کو دخل ہوتا ہے ۔جب کسی خارجی شئے سے ہمارا اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے تو اعصاب متحرک ہو جاتے ہیں اور دماغ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے ۔اس کا اثر دل تک بھی پہنچتا ہے ۔لہٰذا اس کے نتیجے میں جذبہ یا احساس پیدا ہوتا ہے ۔جذبہ یا احساس ذہن میں کوئی پیکر بناتا ہے ۔مثال کے طور پر نیند کی کیفیت بھی دراصل اعصاب ہی سے تعلق رکھتی ہے ۔نیند کا دھیرے دھیرے ہمارے اعصاب پر چھا جانا اور پھر آدمی کا مکمل طور پر غافل ہو جانا محض ایک اعصابی عمل ہے ۔نیند کو نہ دیکھا جاسکتا ہے نہ سنا جاسکتا ہے نہ چھوا جاسکتا ہے۔

نفسیاتی پیکروں کے علاوہ پیکر سازی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے لسانیاتی پہلو کہا جاتا ہے ۔اس پہلو سے پیکر کے ضمن

میں تشبیہات، استعارات، علامات اور تلمیحات وغیرہ آجاتے ہیں۔ استعارہ اپنی جگہ ایک صفت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی پیکر تراشی سے اس کا بہت ہی گہرا قریبی تعلق ہے..... استعارہ یقیناً کسی بھی طرح پیکر کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بغیر استعاروں کے پیکر کا تشکیل پانا بھی بہت حد تک ناممکن ہے۔

لمسی پیکر:

''یہ ذہنی تصویریں ان اشیا کے احساس سے بنتی ہیں جنہیں چھوا جا سکتا ہے محوس کیا جا سکتا ہے۔ دو لمسی احساسات مل کر ایک لمسی پیکر بناتے ہیں یا پھر بصری احساس اور لمسی احساس کے امتزاج سے یا سماجی احساس اور لمسی احساس کے ملاپ سے بھی لمسی پیکر تخلیق ہو سکتے ہیں۔

حرکی یا متحرک پیکر:

''حرکت کرتے اشیاء سے جو پیکر بنتے ہیں وہ متحرک پیکر ہیں''۔

استعاراتی پیکر:

''ایسے پیکر جو خالصتاً استعاروں سے تشکیل پاتے ہیں استعاراتی پیکر کہلاتے ہیں''۔

تشبیہی پیکر:

''تشبیہات بھی ذہن میں پیکر در پیکر ایک سلسلہ بناتی ہیں۔ تشبیہہ کے چار لوازمات ہیں۔ مشبہ جس سے تشبیہہ دی جائے۔ مشبہ بہ جس کو تشبیہہ دی جائے۔ وجہ تشبیہ اور حرف تشبیہ۔ مشبہ اور مشبہ بہ کی لازمی شرط اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک دو اشیاء میں مماثلت نہ ہو یا یہ کہ جب تک شاعر کا ذہن دونوں اشیا سے اثر قبول نہ کرے مشابہت کا احساس پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً محبوب کے چہرے کو چاند سے تشبیہہ دیتے وقت شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے چاند کے وجود سے متاثر ہوا ہو اور پھر اس کا امیج اس کے ذہن میں موجود ہو کر وہ کتنا حسین اور کتنا روشن ہوتا ہے اور اس کے بعد جب وہ محبوب کا چہرہ دیکھے تو تحت الشعور میں بسا ہوا چاند کا وہ عکس بیدار ہو کر محبوب کے عکس میں گڈمڈ ہو جائے اور تب شاعر سوچے کہ واقعی محبوب چاند کی طرح ہے..... لہٰذا ایسے پیکر جو تشبیہوں کے سہارے ذہن میں بنتے ہیں تشبیہی پیکر کہلائے جا سکتے ہیں۔

علامتی پیکر:

''لسانیاتی پیکر کی ایک شکل علامتی پیکر ہے۔ یوں تو علامت نگاری کو ایک الگ خصوصیت سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ پیکر سازی ہی کی توسیعی شکل ہے..... اردو شاعری میں علامتوں کی کمی نہیں۔ ابتداء میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساغر و مینا، بادہ و جام، موسیٰ و طور، فرہاد و بے ستون، مجنوں و صحرا علامتوں کی صورت میں استعمال ہوتے رہے۔ پھر اقبال نے نئی علامتیں مثلاً بانگ درا، رحیل کارواں، شاہین، فقر، قلندر، مرد کامل، مرد مومن، آتش نمرود، خیمہ، شبنم وغیرہ وضع کیں۔ اس کے بعد ترقی پسندوں کے ہاں ایک بار علامتوں کی تبدیلی نظر آتی ہے اور سحر، سورج، سرخ سویرا، کدال، پھاوڑے، ہتھوڑے، پرچم، ہاتھ وغیرہ جیسی علامتیں شاعری میں در آتی ہیں۔''

تلمیحی پیکر:

''علامتیں اکثر تلمیحات سے جنم لیتی ہیں اور تلمیحات کسی خاص واقعہ پر مبنی ہوتی ہیں۔کبھی کبھی خالص تلمیحات کی مدد سے بھی پیکر تشکیل دیے جاتے ہیں۔ایسے پیکر تلمیحی پیکر کہے جاسکتے ہیں۔کوئی خاص تاریخی' سیاسی' سماجی یا مذہبی واقعے کی طرف لطیف اشارہ تلمیح کہلاتا ہے''۔ 427

تصویری یا عکسی پیکر:

''زبان وبیان کی ایک خوبی حقیقت نگاری اور منظر نگاری بھی ہے.....میر انیس نے میدان جنگ ہو یا یا قیام حسینی کا منظر' حقیقت نگاری کے ذریعہ وہ وہ تصویریں کھینچی ہیں کہ قاری خود بھی اس رزمیہ میں ایک کردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔وہ آنکھوں کے سامنے تیر چلاتے ہوئے نیزے پھینکتے ہوئے' تلواریں چلتی ہوئی' گھوڑے دوڑتے ہوئے' علم لچکتے ہوئے' صفیں پٹھتی ہوئی' نقارے بجتے ہوئے اور خیمے جلتے ہوئے دیکھتا ہے۔یہ وہ ذہنی تصویریں ہیں جنہیں صفحۂ قرطاس میں بآسانی قید کیا جاسکتا ہے.....یہ وہ تصویریں ہیں جنہیں مصور بآسانی کینوس پر اتار سکتا ہے.....ایسے پیکر جو با قاعدہ مصوری یا تصویر کشی کے خوبصورت نمونے پیش کرتے ہیں۔تصویری یا عکسی پیکر کہے جاسکتے ہیں''۔

نظریاتی یا تصوراتی پیکر:

''پیکروں کے سلسلہ میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی پیکر تراشی کا تذکرہ ہوتا ہے محض ان پیکروں کو مدنظر رکھا جاتا ہے جن میں لفظی ولسانی حسن ہوتا ہے۔ایسے پیکر جو سماجی یا سیاسی شعور کا اظہار کرتے ہیں اکثر اور یکسر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں لیکن.....ایسے پیکر بھی قابل اعتنا ہیں جن میں شاعر کسی مخصوص نظریہ حیات سماجی یا سیاسی نظریہ کا اظہار کرتا ہے.....ان پیکروں کو.....نظریاتی یا تصوراتی پیکر کہہ سکتے ہیں''۔ 428

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے سردار جعفری کی شاعری میں مختلف اقسام کی پیکر تراشی کا جائزہ لیا ہے۔

ہر قسم کی پیکر تراشی سے متعلق اقتباسات پیش ہیں:

بصری پیکر:

''شام کے مختلف رنگ بصری پیکروں کے روپ میں ان کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں اور لفظی تصویریں بن کر یوں متحرک ہو جاتے ہیں'':

شفق کے رنگ میں ہے قتل آفتاب کا رنگ/افق کے دل میں ہے خنجر لہولہان ہے شام/وہ پہنا شمع نے پھر خون آفتاب کا تاج/پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ/لویں چمکتی ہیں یا بجلیاں چمکتی ہیں/تمام پیرہن شب میں بھر گئے ہیں شرار(قتل آفتاب)

''شفق کی سرخی کو آفتاب کے قتل سے موسوم کرنا اور پھر افق کے دل میں خنجر کا بھونکا جانا' شام کا لہولہان ہو جانا' بصری تصویریں ہیں.....شاعر نے شمع کے سر پر خون آفتاب کا تاج دکھا کر اس پیکر کو مزید حسن بخشا ہے۔اس قتل کی خوشی میں ظالم اور سفاک قاتل کی محفل میں عیش وعشرت کی خاطر مے و مینا کا اہتمام ضروری ہے۔اس لیے ستارے نورِ آفتاب کا جام لے کر

اٹھے ہیں۔چونکہ ماحول خونیں ہوگیا۔لہٰذا خوف وہراس اورحزن ویاس کا پھیل جانا بھی یقینی ہے۔شاید اسی لیے شمع کی چمکتی ہوئی لویں ایسی نظر آرہی ہیں جیسے بجلیاں چمک رہی ہیں (یا قہر خداوندی نازل ہورہا ہو۔ماحول خون سسپنس اورایڈونچر اور ٹریجڈی سے بھرا ہوا ہے)۔ستاروں کی جھلملاہٹ کو یہ کہنا کہ ''پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ''۔بصری رنگ آمیزی کی خوبصورت مثال ہے۔بے گناہ کے قتل یا خونِ مظلوم نے ساری فضا میں گویا آگ لگادی ہے۔اس لیے تمام پیرہن شب میں شرارے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔یوں بھی رات میں حدِنظر تک لاتعداد ستاروں اور سیاروں کا جگمگانا شراروں سے کم نہیں۔بصری پیکرتراشی کا یہ بہت اچھوتا نمونہ ہے''۔

سماعی پیکر:

''نئی دنیا کوسلام'' کا ہیرو جاوید جب انقلاب کی حسین خواب آلود سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو جعفری صاحب وہاں سماعی پیکروں کا ڈھیر لگادیتے ہیں''۔

کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں/ اک رقص تھا' اک عجب زمزمہ تھا/ ساغروں کی کھنک' بانسری کی پگھلتی ہوئی ہواؤں کی/ سرگوشیاں/ دوب کے فرش پر شبنم آلود ملبوس کی سرسر آہٹ/ وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ.....

سب کے سب ایک پرکیف نغمے میں حل ہوگئی تھیں۔

''خاموشی کے ساز آوازوں کا پھوٹنا' ساغروں کی کھنک' بانسری کی پگھلتی ہوئی لے' ہواؤں کی سرگوشیاں' شبنم آلود ملبوس کی سرسر آہٹ اور وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ اور پرکیف نغمے۔سب کے سب سماعی پیکر تشکیل کرتے ہیں لیکن یہ پیکر سرتاسر سماعی نہیں ہیں۔ان میں شاعر کی لمسی حس کو بھی دخل ہے۔اس نے ساغر چھوئے ہیں۔بانسری سے نغمہ پیدا کیا ہے۔ہواؤں کو محسوس کیا ہے۔دوب کے فرش پر چل کے دیکھا ہے۔لہٰذا نظم کے اس ٹکڑے میں سماعی ولمسی دونوں احساسات اس حسین انداز میں گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ رنگین پیکریت کا سلسلہ دور تک پھیل گیا ہے''۔

لمسی پیکر:

''نئی دنیا کوسلام'' میں..... لمسی پیکر جابجا نظر آتے ہیں۔جاوید اور مریم جو انقلاب کے نقیب کی حیثیت سے نظم کے پس منظر سے جلوہ گر ہوتے ہیں..... لمسی پیکروں کے مظہر ہیں۔ابتداء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک دونوں کے باہمی ارتباط کے نتیجے میں سردار جعفری عورت کی عظمت اور تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے جاوید کی زبان سے اپنے ہونے والے بچے کی ماں کے لیے جو رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی بےخبر سورہی ہے' اس قسم کے مکالمے ادا کرواتے ہیں''۔

دیکھ اس ننھی منی سی جان کو/ جو تیرے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں بےخبر سورہی ہے..... تیرے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں/ جو محبت کی راتوں میں کھل اٹھتی تھیں پھول بن کر/ نور سے جن کے دیوار و در جگمگا جاتے تھے/ اب انہیں چھاتیوں میں تری مامتا کلبلائے گی اور تو محبت/ سے بچے کو آغوش میں بھینچ لے گی/ اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی بانہیں اٹھا کر/ ڈال دے گا تیرے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم/ بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔

حرکی یا متحرک پیکر:

''انسانی قوت تسخیر وتعمیر کا احساس دلاتے ہوئے جعفری صاحب نے جو پیکر تراشے ہیں وہ سر تا سر حرکی ہیں۔قوت بجائے خود ایک تحریک کا حرکت کا نام ہے اور انسانی قوت عمل میں آتی ہے تو ساری کائنات مسخر ہو جاتی ہے۔اقبال کے بعد جعفری صاحب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انسانی قوتوں کی عظمت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔دراصل وہ ان ہاتھوں کی تعظیم وتکریم کرنے کا پیغام دیتے ہیں جو دنیا کو سنوارتے ہیں،سجاتے ہیں اور تعمیر کرتے ہیں۔ساری کائنات اور کائنات کی ساری اشیاء ان ہاتھوں کی قوتوں کی منتظر ہیں،انہیں کے لیے حرکت کر رہی ہیں،جنبش میں ہیں۔''

اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر/کئی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں/ان کے جوہر میں جنبش ہیں اور دل میں ارمان یہ ہے/کوئی اگر ہمیں قید فطرت سے آزاد کر دے/ہم مشینوں کی صورت میں انسان کی خدمت کریں گے/ان کی آنکھوں میں ایک خواب لہرا رہا ہے/ریشم اور سوت کے کارخانے/ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے/ناچتی چرخیاں،گنگناتی ہوئی تکلیاں/سینکڑوں رنگ/کے تانے بانے/جیسے سورج کی رنگین کرنیں/اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی انگلیوں سے/آسمانوں پر قوس قزح کی حسیں چادریں بن رہی ہوں/ملک کے سنگ اور خشت میں/سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں/کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں/کتنے دیوار ودَ،کتنے مینار جو سنگ مرمر کے سینے میں سوئے/ہوئے ہیں.....آج انسان کے دست تعمیر کے منتظر ہیں۔

مندرجہ بالا ٹکڑے میں ایک متحرک دنیا کا نقشہ بڑے خوبصورت پیکروں میں کھینچا گیا ہے۔

حسی پیکر:

حسی پیکر کی ایک مثال مریم کے کردار میں ملتی ہے جب وہ ماں بننے والی ہے۔دوران حمل میں عورتوں کے دل و دماغ پر کس قسم کے اثرات غلبہ کیے رہتے ہیں اور وہ کسی قسم کے جذبات واحساسات کا شکار ہوتی ہے ان کو جعفری صاحب نے پیکروں کی شکل میں یوں نمایاں کیا ہے:''

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہو جیسے/مری سانس میں دل دھڑکتا ہو جیسے/بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ/رگوں میں ہے ہلکی سی ایک گنگناہٹ/لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں/مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں/خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی/کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی/جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں/جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں/یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی/جیسے بیتاب رگ رگ میں ہو نوجوانی/سنسنی جسم میں چیونٹیاں جیسے رینگیں/درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں (نئی دنیا کو سلام)

بصری،سماعی،لمسی،حسی اور حرکی تمام پیکروں کا ایک امتزاج:

رواں ہیں وقت کے پُر ہول رہ گزاروں پر/ہزاروں سال کے درماندہ رہ روان حیات/نہ کوئی منزل آسودگی نہ.....راہِ نجات/طویل ظلم کا صحرا،طویل جبر کا دشت/یہ آفتاب سر آسماں پہ آگ کا طشت/نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پرچھائیں/شجر ہوا

میں اڑے جاتے ہیں دھواں ہوکر/ ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سناٹے/خموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہوکر

استعاراتی پیکر:

سردار جعفری نظم ''میرا سفر'' بھی استعاراتی پیکر تراشی کی ایسی ہی مثال ہے.....جعفری صاحب نے استعاروں کے ذریعہ بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔افراد پیدا ہوتے ہیں اور مرتے رہیں گے لیکن انسان ہمیشہ زندہ رہے گا۔کائنات کبھی انسان کے وجود سے خالی نہیں ہوسکتی:

پھر اک دن ایسا آئے گا/ آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے/ ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے/ اور برگ زباں سے نطق و صدا/ کی ہر تتلی اڑ جائے گی/ اک کالے سمندر کی تہ میں/ کلیوں کی طرح سے ہنستی ہوئی/ ساری شکلیں کھو جائیں گی .....

جب بیج بنیں گے دھرتی میں/ اور کونپلیں اپنی انگلی سے/ مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی/ میں پتی پتی کلی کلی/ اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

آنکھوں کے دیے، ہاتھوں کے کنول، برگ زباں اور نطق وصدا کی تتلی خوبصورت استعارے ہیں۔موت کو کالے سمندر سے تشبیہہ دینا اور تخلیق انسان کو بچوں کے ہنستے اور کونپلوں کا اپنی انگلیوں سے مٹی کی تہوں کو چھیڑنے سے منسوب کرنا ایک اچھوتا خیال ہے۔

تشبیہی پیکر:

''کہیں کہیں تشبیہ در تشبیہہ، پیکر در پیکر یا دوہری تشبیہ اور دوہرے پیکر سے کام لیا ہے۔'' مثلاً:

اس محفل صد رنگ میں سو رنگ ہیں میرے/ ہر رنگ میں رقصاں ہوں گلستان جہاں میں/ خوشبو کی طرح کاکل پیچاں کی گلی میں/ شعلے کی طرح انجمن شعلہ رخساں میں/ تلوار کے آغوش میں فولاد کے مانند/ تیشے کی طرح کارگہ شیشہ گراں میں/ نشتر کی طرح تیز دل اہل ہوس میں/ مانند شرر گرم رگ سنگ گراں میں/ کانٹے کی طرح دیدۂ ارباب ستم میں/ سرمے کی طرح چشم حسینان جہاں میں (سو رنگ)۔

علامتی پیکر:

''سردار جعفری کے ہاں بھی اشتراکی علامتیں پیکروں میں ڈھل گئی ہیں:

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر/ .....آج کی طرح کل بھی زمیں/ چشمۂ نور میں غسل کر کے/ سرخ سورج کے آئنے میں اپنی زلفیں سنوارا کرے گی (نئی دنیا کو سلام)

زمین کا چشمۂ نور میں غسل کرنا دراصل ایک انقلابی سحر اور خوشحال مستقبل کی طرف اشارہ ہے جو سرخ سورج کے طلوع ہونے سے پیدا ہوگی اور سرخ سورج اشتراکی نظام زندگی کی علامت ہے ایک موقع پر جاوید (نئی دنیا کو سلام) مزدوروں کی طاقت کا اظہار علامتی انداز میں یوں کرتا ہے

کھیتیاں خاک کی کود میں اٹھ رہی ہیں/ اب کے سال ان کی شاخوں میں ہنسیے پھلے ہیں/ کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے اٹھائے ہوئے ہیں/ ہتھوڑے اور ہنسیے مزدوروں کی طاقت کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔انقلاب اور خون شہیداں سے شاداب سرزمین کے خوش آئند مستقبل کی طرف سردار جعفری یوں اشارہ کرتے ہیں:

؎ لیکن اب وہ گھڑی آ گئی ہے کہ ہر زخم سے ہوں گی پیدا/ ہزاروں زبانیں جو دریا کو، وادی کو، کوہسار کو دشت کو پیغام دیں گی (بغاوت)

تلمیحی پیکر:

''سردار جعفری کے ہاں تلمیحات کی مدد سے بڑے خوبصورت پیکر نظر آتے ہیں:

حضرت عیسیٰ اور امام حسین یہ دو کردار وہ ہیں جو سردار جعفری کے ہاں اکثر تلمیحی پیکروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ واقعۂ کربلا کی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ خیر و شر اور حق و باطل کا جو تصادم اس میدان کارزار میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ تمام عالم انسانیت کے لیے مشعل راہ کا کام کر رہا ہے۔ صداقت کی شمعوں کی روشنی سے دنیائے انسانیت کو منور کیے ہوئے ہیں۔ شہیدوں کے لہو نے جو پھول کھلائے، جو چراغ روشن کیے ان سے سردار جعفری نے اپنی شاعری میں تلمیحی پیکر تراشے ہیں۔ ہر ایک خوشی درد کے دامن میں پلی ہے/ نسبت ہے ہر ایک نغمے کو بسمل کے گلو سے/ پیراہن گل، دست صبا پنجہ گل چیں/ رنگیں ہے ہر اک چیز شہیدوں کے لہو سے

ایک اور جگہ پیکریت اور واضح طریقے سے سامنے آتی ہے۔

؎ کس قدر سفاک ہیں ان قاتلوں کے خط و خال/ کتنی تابندہ شہیدان وفا کی ہے جبیں/ شوخ اور بے باک کتنا بے گناہوں کا لہو (خنجروں کی روشنی میں)

نظریاتی یا تصوراتی پیکر:

''جعفری صاحب کے یہاں نظریاتی یا تصوراتی پیکر نظر آتے ہیں''..... ''اپنے وقت کا مشہور مصور حسین، جعفری صاحب کے پیراہن شرر کو کاغذ پر پھیلا دینے میں کامیاب ہے۔ جعفری صاحب کی بعض نظمیں تو خالص Paintings کے موے ہیں۔ خاص طور پر تحریری آرٹ کے شعری نمونے ان کے ہاں بے شمار ہیں۔ رومانی شکست خوردگی، فراق کے جذبات اور حسین یادوں کی کیفیت کا تصویری پیکر یوں بنایا ہے۔ دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش/ سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں/ پھیل جاتی ہے تری حرف وفا کی خوشبو/ کوئی کہتا ہے مگر روح کی گہرائی سے/ شدت تشنہ لبی بھی ہے تیرے پیار کا نام.....

سیاسی احساس کے ساتھ ساتھ ویت نام سے کشمیر تک کے خون آلودہ افق کو اپنی آنکھ کے کیمرے میں قید کر کے لفظوں سے جو تصویر بناتے ہیں وہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے اور وہ بھی جدید مصوری کا''۔

؎ پھر چلا جنگ کا دیوتا/ سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے/ خون کی پیاس سے/ گوشت کی بھوک سے/ چیختا اور چنگھاڑتا/ آسمانوں پہ عفریت کی طرح اڑتا ہوا/ موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا.....

؎ فصلیں سہمی ہوئی/ کھیت گھبرائے گھبرائے سے/ جو فضائیں نئی کونپلوں کی مہک سے معطر تھیں وہ/ گندی بارودگی بو سے سرشار ہیں/ خون کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں میں پر/ مندروں، مسجدوں ان کلیساؤں کے دامنوں پر (دعا)

''جعفری صاحب چونکہ اشتراکی نظام حیات کے حامی ہیں لہٰذا ان کے ہاں جو سماجی نظریہ ملتا ہے وہ نظام زروسیم کے

خلاف ہے وہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کی حمایت کرتے ہیں اور جہاں کہیں کسی پر ظلم ہوتا ہے دیکھتے ہیں۔اسے اپنے لفظی پیکروں میں قید کر دیتے ہیں۔ان کی نظم ''میر عزیز و میرے رفیقو'' ایسے ہی نظریاتی پیکروں میں مزین ہے۔

.....میں اپنے سینے کو چاک کر کے/ اگر تمہیں اپنا دل دکھاؤں/ تو تم کو ہر زخم کے چمن میں/ ہزار سرو رواں ملیں گے.....مگر کوئی توڑے دے رہا ہے/ لرزتی مژگاں کے نشتروں کو/ دلوں کے اندر اتارتا ہے/ کوئی سیاست کے جنجروں کو/ کسی کے زہریلے تیز ناخن/ عقاب کے پنجہ ہائے۔خونیں/ کی طرح آنکھوں پہ آرہے ہیں/ گلاب سے تن مثال بسمل/ زمین پر تلملا رہے ہیں/ جو پیاس پانی کی منتظر تھی/ وہ سولیوں پر ٹنگی ہوئی ہے/ وہ بھوک روٹی جو مانگتی تھی/ صلیب زر پر چڑھی ہوئی ہے/ سیاہ بارود کی لکیریں/ کٹیلے کاجل سجیلے سر ے/ کے بانکپن سے الجھ گئی ہیں/ خزاں کے کانٹوں کی انگلیاں کیوں/ ہر اک چمن سے الجھ گئی ہیں/ مجھے بتاؤ لہو نے کیسے/ حنا کے جادو کو دھو دیا ہے/ حیات کے پیرہن کو انسان/ کے آنسوؤں نے بھگو دیا ہے۔

تاریخ اور وقت کا انقلابی تصور سردار جعفری نے جن پیکروں میں پیش کیا ہے وہ مظلوموں کو انقلاب کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

تم اپنے تیشے اٹھا کے لاؤ/ میں لے کے اپنی کدال نکلوں/ ہزار ہا سال کے مصائب/ ہزار ہا سال کے مظالم/ جو روح و دل پر پہاڑ بن کر/ ہزار ہا سال سے دھرے ہیں/ ہم اپنے تیشوں کی ضرب کاری/ سے ان کے سینوں کو چھید ڈالیں/ یہ صرف ہے ایک شب کی محنت/ جو عہد کر لیں تو ہم سحر تک/ حیات نو کے نئے اجنتا/ نئے ایلورا تراش ڈالیں

ایک اور جگہ طبقاتی استحصال کا تصور پیکروں میں یوں پیش کرتے ہیں۔

دیکھ کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی ہی کھال پہنے/ ہوئے پھر رہے ہیں/ صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے اندھیر سے بلوں/ سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جا کر/ اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کر کے/ خون آشام سرمائے کے جام میں ڈالتے ہیں/ شام کو کارخانے اگل دیتے ہیں ان کو جھلسی ہوئی راکھ کا ڈھیر/ کر کے/ اور پھر رات کے وقت طاعون/ دق اور سل کے یہ بھوت/ موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوکے دلوں اور سوکھی/ ہوئی ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں۔

''ان تمام پیکروں کے علاوہ اور بھی بے شمار پیکر مثلاً آنکھ کے ہیرے یا ہاتھ دریا' من کا سونا' تن کی چاندی آرزو کی ہتھیلی پر جلتے ہوئے چراغ' رنگ حنا کے پھول' تمنا کے ساغر' ہجر کے درد کا چاند' وصل محبوب کا سرخ خورشید' تصور کا پری خانہ درد کی شمع' یادوں کی کہکشاں' تمناؤں کی گل چہرہ' کنیزوں کا ہجوم وغیرہ وغیرہ جعفری صاحب کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔مختصر یہ ہے کہ سردار جعفری نے پیکر سازی کی مختلف شکلوں کو نئے نئے انداز میں یوں برتا ہے کہ ان کی شاعری ایک آئنہ خانہ بن گئی ہے جس نے نہ صرف ان کے فن کو شگفتہ بنا دیا ہے بلکہ اس خصوصیت کی بنا پر انہوں نے ترقی پسند گروپ سے منسلک ہونے کے باوجود جدید شاعروں کے لیے ایک ذہنی و ادبی شاہراہ کھول دی ہے''۔ 429

سردار جعفری کی شاعری کی ترسیل اور پیکر تراشی پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالاحد ساز رقمطراز ہیں:

''وہ (سردار جعفری) اپنے لطیف ذوق جمال اور نفیس غنائی شعور کی بنا پر ترسیل کی اک ایسی فریکونسی (Frequency)

اخذ کر لیتے ہیں جو شاعر کے قلم سے قاری کے دل و دماغ تک رابطے کے غیر مرئی تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے۔ان مرتعش لہریوں میں وہ اپنے افکار و خیالات کی رو بڑی آسانی سے دوڑا دیتے ہیں اور نظمیں اپنے پورے ڈرافٹ کے ساتھ قرأت یا سماعت میں اتر جاتی ہیں۔ ذرا اور ڈوب کر پڑھیں تو ان نظموں کے پیچھے ایک غیر مرئی حسی و بصری فضا کا بھی احساس ہوتا ہے..... سردار جعفری کی شاعری ہمارے تحت الشعور میں چند ثانیوں کے لیے آسمان کی نیلاہٹوں، سمندر کے دور تک پھیلے ہوئے ساحل، لہلہاتے ہوئے کھیت اور آفتاب کی سنہری شعاعوں کی چمکیلی مسرت کا کیف پیدا کرتی ہے۔جعفری صاحب کی نظموں سے ہم جو اک خاص قربت محسوس کرتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ صوتی و سمعی تشکیل کے ساتھ منظر اور مفہوم کی بصری و حسی پیکر تراشی بھی ہے۔موضوع بسا اوقات اپنے جمالیاتی پس منظر ہی میں کھلتا اور پھلتا ہے۔فکر کی تابندگی اور جذبے کی گرمی حسی و بصری کیف کے ساتھ گھل مل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ایسی امیجری کی مثالیں ان کی نظموں میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں"۔ 430

سردار جعفری کے یہاں احساس کی شدت اور خوبصورت پیکر تراشی ان مصرعوں میں دیکھئے:۔

تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو موجود تھے تم/ آنکھ میں نور کی اور دل میں لہو کی صورت/ درد کے لو کی طرح پیار کی خوشبو کی طرح/ بے وفا وعدوں کی دلداری کا انداز لیے

تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو تم آئے تھے/ رات کے سینہ میں مہتاب کے خنجر کی طرح/ صبح کے ہاتھ میں خورشید کے ساغر کی طرح/ شاخ خوں رنگ تمنا میں گل تر کی طرح

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی پیکر تراشی کا جائزہ لیا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

(1) ''سردار جعفری کی پیکر تراشی میں زمین سے لے کر آسمان تک سبھی مظاہر یعنی نظام فلکی، نظام شمسی، چاند، سورج، ستارے، بادل، ہوا، سمندر، آبشار، دریا، شفق اور انسانی زندگی کے سبھی پہلو یعنی کھیت کھلیان، کارخانے، مسجد، مندر، گردوارے، کسان، مزدور، مرد، عورتیں، بچے، چرند، پرند، چکی، چولہے یہاں تک کہ سانپ بچھو اور کیڑے مکوڑے، تتلیاں، بھی اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔''نئی دنیا کو سلام'' میں غلام ہندوستان میں عام انسانوں کی بدحالی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا .....ہیرو جاوید کہتا ہے۔

ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے/ ان کے سر پر ہری گھاس کے سائباں ہیں/ سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں/ طائروں کے حسین آشیاں ہیں''۔

یہاں کیڑوں کے سر پر ''ہری گھاس کے سائباں'' ایک خوبصورت Composite image ہے۔

(2) مذکورہ نظم کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو:

ناگہاں شور ہوا/ لو شب تار غلامی کی سحر آ پہنچی/ انگلیاں جاگ اٹھیں/ بربط و طاؤس نے انگڑائی لی/ اور مطرب کی ہتھیلی سے شعائیں پھوٹیں/ کھل اٹھے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول

''.....شور ایک سمعی امیج ہے اور ناگہاں سے حیرت اور استعجاب کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور ''لو'' کا لفظ ایک ڈرامائی

تاثر پیدا کرتا ہے اور شب تارغلامی کی ترکیب..... منفی کیفیت کی شدت کو شدید تر کرتی ہے..... ''سحر'' کا پیکر یکا یک حیرت اور انبساط کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے..... انگلیوں کا جاگ اٹھنا' بربط و طاؤس کا انگڑائی لینا اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹنا سبھی نادر اور متحرک بصری پیکر ہیں..... کھل اٹھے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول میں بصری' سمعی' شامی اور حرکی عناصر یکجا ہو گئے ہیں اور ہمارے سبھی حواس کو بیک وقت متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ابتدائی بند Synesthetic امیجری کی ایک تابناک مثال ہے جس میں ڈرامائی تخیل بھی بڑی لطافت سے کارفرما ہے۔ اس تجربے کا نیا موڑ ؎

قافلے دور تھے منزل سے بہت دور مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے

(3) نظم اودھ کی خاک حسین'' میں گاؤں کی زندگی کا یہ منظر دیکھئے۔ ؎

''لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے/ کمہار کا چاک چل رہا ہے/ صراحیاں رقص کر رہی ہیں/ سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے/ سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں/ دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں۔

''اس ٹکڑے میں صراحیوں کا چاک پر رقص کرنا' آٹے کا راگ بن کر چکی سے نکلنا' چولہوں میں آگ کے پھول کھلنا اور توے کا چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنسنا کچھ ایسے حرکی' بصری اور سماعی پیکر ہیں جو نہ صرف ہمارے حواس کو بیک وقت متاثر کرتے ہیں بلکہ اس مانوس منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں''۔

(4) ''بمبئی'' نام کی ایک نظم کے یہ چند مصرعے ملاحظہ کیجئے: ؎

راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے/ شامیں نیلی ہوا کی نمی میں نہائی ہوئی/ صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے/ پتھروں کی چٹانیں/ اپنی باہوں میں بحر عرب کو سمیٹے ہوئے..... یہ سبھی شعری پیکر دلکش اور جاذب توجہ ہیں جن کے وسیلے سے اس شہر کی مثالی خوبصورتی شعریت کے سانچے میں ڈھل گئی ہے لیکن اس حسین شہر کے تاریک پہلو بھی شاعر کی نظر سے پوشیدہ نہیں جس کا اظہار نظم کے دوسرے حصے میں ہوا ہے اور یہاں شدت احساس نے کچھ انوکھے اور سفاک شعری پیکر تخلیق کیے مثلاً: ؎

چمنیاں بھٹنیوں کی طرح بال کھولے ہوئے/ کارخانے گرجتے ہوئے/ خون سرمایہ داری کے نالوں میں بہتا ہوا/ سرد سکوں کی صورت میں جمتا ہوا/ ایک اک چیز بکتی ہوئی/ انکھڑیوں اور ہونٹوں کے نیلام گھر/ عارضوں کی دکانیں/ بازوؤں اور سینوں کے بازار۔

یہ شعری پیکر اپنی سفاکی اور بے باکی میں ناقابل برداشت ہیں اور پروٹسٹ کا جذبہ ہر شعری پیکر سے چھلک رہا ہے۔ دیگر پروٹسٹ پوئٹری بھی سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم پہلو ہے جسے انہوں نے عام طور پر منفرد اور معنی خیز شعری پیکروں میں ڈھالا ہے''۔

(5) نظم پتھر کی دیوار کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے: ؎

پتیوں کی پلکوں پر/ اوس جگمگاتی ہے/ املیوں کے پیڑوں پر/ دھوپ پر سکھاتی ہے/ چاند کے کٹورے سے/ چاندنی چھلکتی ہے/ جیل کی فضاؤں میں/ پھر بھی اک اندھیرا ہے/ جیسے ریت میں گر کر/ دودھ جذب ہو جائے/ روشنی کے گالوں پر/ تیرگی کے ناخن کی/ سینکڑوں خراشیں ہیں/

۔ پتیوں کی پلکوں پر اوس کا جگمگانا' پیڑوں پر دھوپ کا پر سکھانا' چاند کے کٹورے سے چاندنی کا چھلکنا اور پھر ریت میں گرے ہوئے دودھ کی طرح برباد ہو جانا اور روشنی کے گالوں پر تیرگی کے ناخن کی خراشیں کچھ ایسے نادر شعری پیکر ہیں جو اظہاریت سے بھرپور ہیں۔

۔ پتھروں کی دیواریں/ بھوک کا بھیانک روپ/ روٹیوں کے دانتوں میں/ ریت اور کنکر ہیں/ دال کے پیالوں میں/ زرد زرد پانی ہے/ چاولوں کی صورت پر/ مفلسی برستی ہے/ سبزیوں کے زخموں سے/ پیپ سے ٹپکتی ہے۔

(6) نظم "شرق و مغرب" کے یہ اشعار: ۔

صبح در کھلتے ہیں محبوب کی باہوں کی طرح/ راہرو ملتے ہیں راہوں میں نگاہوں کی طرح/ دن کے نظاروں کو آنکھوں میں چھپا لیتی ہیں/ کھڑکیاں رات کو پلکوں کو جھکا لیتی ہیں۔

یہاں پیکر تراشی کی تازہ کاری اور ان میں بصری اور حرکی پیکروں کا توازن اور سرشاری اور ڈرامائی عناصر کا امتزاج وضاحت کے محتاج نہیں۔

(7) "ہاتھوں کا ترانہ" ایک بہت اہم اور منفرد انداز کی نظم ہے جس میں سردار جعفری کا مخصوص شعری اسلوب اور پیکر تراشی کا انداز کافی تابناک ہے۔ اس والہانہ انداز کی نظم میں شاعر نے نہ صرف انسان کی محنت' کاوش اور تخلیقیت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ ایک انوکھے انداز میں تہذیب و تمدن کے ارتقا کی کہانی بھی بڑے اختصار کے ساتھ سنا دی ہے۔ اس کی پیکر تراشی بھی مناسب اور اظہاریت سے بھرپور ہے۔ ۔

خاموش ہیں یہ خاموشی سے سو بربط و چنگ بناتے ہیں/ تاروں میں راگ سلاتے ہیں طبلوں میں بول چھپاتے ہیں/ جب ساز میں جنبش ہوتی ہے تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں

۔ اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے/ پتھر کو چھوئیں تو بت کردیں کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے/ مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے/ بہتی ہوئی بجلی کی لہریں سمٹے ہوئے گنگا کے دھارے/ دھرتی کے مقدر کے مالک محنت کے افق کے سیارے/ یہ چارہ گران درد جہاں صدیوں سے مگر خود بے چارے

یہ سب شعری پیکر کلاسیکی رنگ و آہنگ کے باوجود منفرد اور معنی خیز ہیں اور یہ خوبی جذبے کے خلوص اور ندرتِ خیال کا عکس جمیل ہے"۔

(8) "ایک خواب اور" میں "ایک پھول' شعلہ لبی' چاند کو رخصت کردو' آرزو کے صنم خانے' بہت قریب ہو تم' پیاس کی آگ وغیرہ عشقیہ انداز کی اچھی نظمیں ہیں جن میں پیکر تراشی کے بھی کچھ اچھے نمونے مل جاتے ہیں..... نظم "حسن تر"..... میں شاعر حسن پرستی سے نکل کر حسن شناسی کی منزل میں داخل ہو گیا ہے اور جس میں عشق کا تجربہ اپنے پورے سوز و گداز کے ساتھ

ایک معنی خیز وجودی تجربے میں ڈھل گیا۔اس نظم میں شاعر کی مخاطب اس کی محبوبہ اور شریک حیات ہے اور اس کے شعری پیکر بھی منفرد اور اثر انگیز ہیں:

ہماری عمر رواں کی شبنم/تیری سیہ کاکلوں کی راتوں/ میں تار چاندی کے گوندھ دے گی/ترے حسیں عارضوں کے رنگیں/ گلاب بیلے کے پھول ہوں گے/شفق کا ہر رنگ غرق ہوگا/لطیف و پر کیف چاندنی میں/تری کتاب رخ جواں پر/کہ جو غزل کی کتاب ہے اب/ زمانہ لکھے گا اک کہانی /اور ان گنت جھریوں کے اندر/مری محبت کے سارے بوسے/ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے/ہم اپنے عہد طرب کی شام و/سحر کی رعنائیوں کو لے کر/پرانی یادوں کے جسم عریاں/ کے واسطے پیرہن بنیں گے۔یہ سب شعری پیکر نہ صرف منفرد اور تابناک ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں'' 431

ڈاکٹر شمیم رضوی لکھتی ہیں:

''علی سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت پیکر تراشی یا تجسیم کاری کے لیے نئی تراکیب و اصطلاحات کا استعمال ہے۔نئی زندگی نئی حقیقتیں' نئے طریق اظہار کا مطالبہ کرتی ہیں۔تشبیہ' استعارے اور امیجری اگر اس وقت کے موجودہ ماحول سے حاصل کئے جائیں' تو وہ یقیناً زیادہ متاثر کن ثابت ہوتے ہیں۔وہ لفظیات جو ترقی پسند شاعری کے حوالے سے شدت سے دہرائے گئے مثلاً زنداں و قفس' دار و رسن وغیرہ سردار کے یہاں ان کا استعمال ہوا ہے۔لیکن وہ جیل و قید خانے جیسے عام الفاظ کا استعمال بھی جائز سمجھتے ہیں۔

انہوں نے شاعری کو ابہام سے پاک رکھا کیونکہ ان کا رجحان عوام ہے۔چنانچہ عام فہم الفاظ کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ ہے.....وارڈر۔جیلر اور سی آئی ڈی جیسے الفاظ کا استعمال وہ بے دھڑک کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں ان کی ایک مختصر طنزیہ نظم'' موت'' ملاحظہ کیجئے۔

موت سے جا کے کہہ دو اس وقت فرصت نہیں/پھر کبھی آئے/جیلر کو درخواست دے/تا کہ سی آئی ڈی والے تحقیق کر لیں کہ یہ کون ہے/کس لیے آئی ہے۔

پرانی تشبیہات' استعارات بلاشبہ کلاسیکی ادب کا بڑا خزانہ ہیں لیکن اس پر قناعت کر لینا دانائی نہیں۔بلاشبہ سردار جعفری نے بلا جھجھک نئی تشبیہہ' استعارے استعمال کیے ہیں۔.....ممکن ہے ناقدین کو روٹی' چاول جیسے الفاظ غیر شاعرانہ نظر آئیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی لفظ بجائے خود شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں ہوتا بلکہ یہ تو شاعر کی اپنی صلاحیت پر مبنی ہے کہ وہ الفاظ کب' کیسے اور کیوں کر استعمال کرتا ہے۔مثال کے طور پر میر انیس کے یہاں شبنم اور اوس دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں.....ہم شبنم کے مقابلے میں اوس کے استعمال کو غیر فصیح یا نامانوس ہرگز قرار نہیں دے سکتے۔

سردار جعفری کو بھی الفاظ کے محل استعمال پر بلا کا عبور حاصل ہے۔ان کے یہاں بظاہر غیر فصیح نظر آنے والا لفظ محل استعمال سے منہ سے بول پڑتا ہے''۔ 432

سردار جعفری کی نظموں پتھر کی آواز اور نیند کے چند اشعار پیش ہیں:

پتیوں کی پلکوں پر/اوس جگمگاتی ہے...../چاند کے کٹورے سے/چاندنی چھلکتی ہے(پتھر کی آواز)

مخملیں اندھیرے کا/ پیراہن لرزتا ہے...../وقت کی سیہ زلفیں/ خامشی کے شانوں پر/غم بہ غم مہکتی ہیں/ اور زمیں کے ہونٹوں پر (نیند)

محمد ایوب واقف لکھتے ہیں:

''شاعری کو شادابی اور خوشبو سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ان کے پاس (سردار جعفری) الفاظ اور تراکیب کا جو خزانہ ہے وہ اپنے آپ میں بہت بھرپور ہے۔ ''پتیوں کی پلکیں'' ''چاندی کے کٹورے'' ''روشنی کے گال'' ''مخملیں اندھیرے'' ''خامشی کے شانے'' ''زمین کے ہونٹ'' ''موتیوں کے دانت'' سے جو امیجری انہوں نے بنائی ہے اور معنی و مفہوم کی جو دنیا آباد کی ہے اس میں حسن ہی حسن ہے۔ 433

سردار جعفری کی نظموں کی ہیئتوں کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں رقمطراز ہیں:

(1) ''سردار جعفری نے بہت لکھا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں، جہاں اعلیٰ درجے کی نظمیں ہیں، وہیں ادنیٰ درجے کی نظمیں بھی ہیں۔ ان کے قارئین و ناقدین کو چاہیے کہ ان کی نسبتاً کمزور نظموں کو سامنے رکھ کر ان کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں اور نہ فیصلہ کریں۔ ان کی اچھی اور اعلیٰ درجے کی نظموں کی تعداد کم تو نہیں ہے۔.....سردار آزاد اور معرّا نظم کی ہیئتوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں، گرچہ ان کی متعدد اچھی نظمیں روایتی پابند سانچوں اور فارموں میں بھی ملتی ہیں۔ اردو میں آزاد نظم کو مقبول بنانے اور مروج کرنے میں جعفری کا بڑا رول ہے۔ اس سلسلہ میں اردو کے مشہور شاعر و ناقد پروفیسر وحید اختر نے بہت درست لکھا ہے:

''سردار کی آزاد نظمیں نہ ہوتیں تو آزادی کے بعد کی جدید نظم کو آج کی زبان میں بات کرنے کا سلیقہ نہ آتا''۔

یہ بات سچ ہے کہ سردار جعفری نے بڑی کامیابی سے آزاد نظم کے فارم کو اردو نظموں کے لیے برتا۔ اسی طرح بلینک ورس کو بھی انہوں نے اردو میں مقبول و معتبر بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' اور ''میرے خواب'' بلینک ورس ہی میں ہیں۔

(2) ''طویل نظموں کے علاوہ مختصر اور مختصر ترین نظمیں بھی ان کے یہاں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے زبان، ہیئت، فارم اور اسٹائل کی سطح پر کئی تجربے کیے۔ نہایت مختصر نظمیں بھی لکھیں جو تین چار سطروں یا مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں.....سردار جعفری نے ایسی نظموں میں بھی اعلیٰ فنکاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ 433

کوثر مظہری رقمطراز ہیں:

''اردو نظم نگاری میں سردار نے کئی اہم کامیاب تجربے بھی کیے۔ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ مستعار اور مانگے کا اجالا پر ان کا ایمان نہیں تھا''۔ 434

☆☆☆

حواشی

1 معید رشیدی،شعر،مبادیات اور شعریات،رسالہ اثبات،جلد 2،شمارہ 7،صفحہ 99

2 معید رشیدی،شعر: مبادیات اور شعریات،رسالہ اثبات،جلد 2،شمارہ 7،صفحہ 96 تا 107

3 عبدالاحد ساز،اردو شاعری اور انسانیت کا سفر،سہ ماہی ''ازکار''بنگلور،صفحہ 198،120،122،129

4 معین الدین حسن علوی کاکوروی،ادبی نگارشات،صفحہ 178 تا 190

5 ڈاکٹر محمد ذاکر،آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب 1947 تا 1962: رجحانات اور تجزیہ،صفحہ 140،141،142،153

6 محمد حسین پرکار،سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا،کون دشمن ہے،صبح فردا مشمولہ علی سردار جعفری، شخص،شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 312

7 پروفیسر وارث کرمانی،ملک الشعراء سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)صفحہ 105،106

8 سردار جعفری،پیراہن شرر،حلقہ ادب،ممبئی،1966،صفحہ 18،19،20

9 پروفیسر فصیح احمد،اردو یک بابی ڈراما،جنگ آزادیٔ ہند 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947: تاریخی،تحقیقی وتنقیدی جائزہ،صفحہ 80

10 پروفیسر کوپی چند نارنگ،ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری،صفحہ 407،408

11 احسان حسن،شاعری اور ترقی پسندی،شعاعیں،بنگلور،مئی 2010،صفحہ 8،9

12 کوثر مظہری،سردار جعفری کی نظمیں:تہذیبی سروکار،ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 93

13 ڈاکٹر سلطان احمد،علی سردار جعفری:شخصیت اور فن کے آئینے میں،سردار جعفری:شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)صفحہ 258

14 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970،صفحہ 104،105

15 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970،صفحہ 91،92،93،95 تا 98

16 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970 صفحہ 106

17 ڈاکٹر ابن کنول،ترقی پسند نظم مشمولہ تنقید وتحسین (مجموعۂ مضامین)،صفحہ 110،111،115،116

18 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970،صفحہ 126،127

19 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970،صفحہ 124،125

20 عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ وعمل 1936 تا 1970،صفحہ 121 تا 123

21 پروفیسر شارب ردولوی‘ ترقی پسند فکر اور اردو شاعری‘ آزادی کے بعد مشمولہ آزادی کے بعد اردو شاعری (مقالات ومباحث) مرتبہ شہزاد انجم‘ صفحہ 77

22 عقیل احمد صدیقی‘ جدید اردو نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970‘ صفحہ 128

23 عقیل احمد صدیقی‘ جدید اردو نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970‘ صفحہ 118

24 ڈاکٹر شمیم رضوی‘ قطرے سے گہر ہونے تک‘ ہماری زبان‘ یکم تا 21/ اکتوبر 2000‘ صفحہ 28

25 صدیق الرحمٰن قدوائی‘ عہد عزم و پیکار کی یادگار‘ آج کل‘ اکتوبر 2000‘ صفحہ 20

26 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی‘ سردار جعفری کو گیان پیٹھ‘ اردو دنیا‘ جولائی تا ستمبر 1998

27 رفعت سروش‘ درد کا ساحل (بیاد علی سردار جعفری)‘ ایوان اردو‘ ستمبر 2000‘ صفحہ 36

28 پروفیسر عبدالستار دلوی‘ ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری: شخص‘ شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی‘ صفحہ 271

29 شین کاف نظام‘ ثقافت کا سفیر علی سردار جعفری‘ عالمی اردو ادب 2001‘ جلد 19‘ سردار جعفری نمبر‘ صفحہ 325

30 عمر رضا‘ علی سردار جعفری‘ صفحہ 635‘ 636‘ 638

31 نند کشور وکرم‘ پیش لفظ‘ عالمی اردو ادب 2001 (جلد 19) سردار جعفری نمبر‘ (سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 10

32 پروفیسر زاہدہ زیدی‘ علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)‘ ایوان اردو‘ ستمبر 2000‘ صفحہ 50 تا 52

33 پروفیسر عبدالستار دلوی‘ ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری‘ ایوان اردو‘ ستمبر 2000‘ صفحہ 27‘ 28

34 مظہر امام‘ شعری اظہار اور سردار جعفری‘ ایوان اردو‘ ستمبر 2000‘ صفحہ 41

35 پروفیسر عبدالستار دلوی‘ ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری‘ ایوان اردو ستمبر 2000‘ صفحہ 28

36 مظہر امام‘ شعری اظہار اور سردار جعفری‘ ایوان اردو‘ ستمبر 2000‘ صفحہ 41

37 عمر رضا‘ علی سردار جعفری‘ صفحہ 193

38 ڈاکٹر علی احمد فاطمی‘ علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند شاعر: سردار‘ مجروح‘ کیفی‘ صفحہ 18 تا 20

39 عمر رضا‘ علی سردار جعفری‘ صفحہ 424

40 مظہر امام‘ شعری اظہار اور سردار جعفری‘ ایوان اردو‘ صفحہ 42

41 عمر رضا‘ علی سردار جعفری‘ صفحہ 304

42 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 317

43 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 325

44 عمر رضا،علی سردار جعفری صفحہ 413،419

45 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 413،419،423،424

46 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 445،446

47 ڈاکٹر علی احمد فاطمی،علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند شاعر،سردار،مجروح،کیفی،صفحہ 23،24

48 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 635 تا 638

49 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 483،484

50 پروفیسر زاہدہ زیدی،علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)'
ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 53،54

51 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 463،476

52 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 595،596،597،600،602،603،606

53 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 635،637،638

54 پروفیسر زاہدہ زیدی،علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے) ایوان اردو،
ستمبر 2000،صفحہ 54،55

55 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 635

56 ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی،سرحد کا محافظ علی سردار جعفری،ہماری زبان،یکم تا 21/اکتوبر 2000،صفحہ 8

57 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کی غزل مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ از رفیعہ شبنم عابدی،صفحہ 174

58 پروفیسر عبدالستار دلوی،ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری،صفحہ 272،273

59 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کا شعری سفر مشمولہ علی سردار جعفری:شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 369

60 ڈاکٹر رفعت النساء بیگم،سردار جعفری کی شاعرانہ مرتبت مشمولہ طرز نگارش از رفعت انساء بیگم،صفحہ 12

61 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی،اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء،صفحہ 241

62 ڈاکٹر نصرت چودھری،فیض کی شاعری (ایک مطالعہ) صفحہ 161

63 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،سردار جعفری کی شاعری،ہماری زبان،یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 3

64 ڈاکٹر فیروز،علی سردار جعفری کی حقیقت نگاری،ہندوستانی زبان،جنوری تا مارچ 2008،صفحہ 57 تا 60

65 ڈاکٹر سلطان احمد علی سردار جعفری، شخصیت اور فن مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 261

66 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، صفحہ 241

67 راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 583

68 راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 582

69 عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ اور عمل 1936 تا 1970، صفحہ 87

70 ڈاکٹر محمد حسن، معرّی اور آزاد نظم کا ارتقاء مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، صفحہ 153 تا 156

71 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں لہو کا تلازمہ مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ از رفیعہ شبنم عابدی، صفحہ 275، 276

72 پروفیسر عبدالستار دلوی، سردار جعفری اور قومی شعور، کتاب نما، جنوری 2003، صفحہ 35

73 پروفیسر عبدالستار دلوی، سردار جعفری اور قومی شعور، کتاب نما، جنوری 2003، صفحہ 37، 38

74 ضیاء الدین اصلاحی، اردو کا سردار چلا گیا (وفیات)، معارف، اگست 2000، صفحہ 145

75 احمد محفوظ، علی سردار جعفری کی یاد میں، جامعہ، اپریل تا جون 2000، صفحہ 121

76 ڈاکٹر سلطان احمد علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)، صفحہ 261

77 پروفیسر گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، صفحہ 410

78 ساحل احمد، غزل: پس منظر، پیش منظر، صفحہ 250، 251 اور احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، صفحہ 262

79 پروفیسر شارب ردولوی، کلیدی خطبہ، سردار جعفری: ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ، مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن۔ مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 28، 29

80 عزیز قیسی، سردار جعفری کی نظمیں، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 474 تا 476

81 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 153 تا 160

82 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 248 تا 252، 259 تا 262

83 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 191، 276، 277

84 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، صفحہ 245

85 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری، کتاب نما، اپریل 2003، صفحہ 12، 13

86 رفعت سروش، درد کا ساحل، بیاد علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 37

87 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 166، 167، 173

88 پروفیسر سید محمد عقیل، نئی دنیا کو سلام: ایک تجزیاتی مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 207

89 پروفیسر سید محمد عقیل، نئی دنیا کو سلام: ایک تجزیاتی مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 210

90 ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19، سردار جعفری نمبر صفحہ 339

91 احمد ہمدانی، نئی دنیا کو سلام، ہیئت کا ایک نیا تجربہ، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 488 تا 492

92 احمد ہمدانی، نئی دنیا کو سلام: ہیئت کا ایک نیا تجربہ، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 487

93 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء صفحہ 242 تا 244

94 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، صفحہ 244 تا 245

95 وحید اختر، سردار جعفری: خواب اور شکست خواب، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 443، 444

96 ادیب سہیل، نئی دنیا کو سلام، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 493

97 احمد ہمدانی، نئی دنیا کو سلام، ہیئت کا ایک نیا تجربہ، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 486، 492

98 پروفیسر زاہدہ زیدی، نئی دنیا کو سلام: ایک تجزیاتی مطالعہ، نیا سفر، شمارہ 16 (جولائی تا دسمبر 2000)، صفحہ 57

99 پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، نئی دنیا کو سلام: ایک تجزیاتی مطالعہ، نخلستان (علی سردار جعفری نمبر) جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 20

100 مظہر مہدی، علی سردار جعفری: ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب، شعر و حکمت، حیدرآباد، دور سوم، کتاب 3، 4، صفحہ 100 تا 102

101 پروفیسر عبدالستار دلوی، ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 27

102 مظہر مہدی، علی سردار جعفری: ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب، شعر و حکمت، حیدرآباد، دور سوم، کتاب 3، 4، صفحہ 104 تا 116

103 مظہر مہدی، علی سردار جعفری: ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب، شعر و حکمت، دور سوم، کتاب 3، 4 صفحہ 116 تا 127

104 پروفیسر آل احمد سرور، مسرت سے بصیرت تک، صفحہ 276

105 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری، کتاب نما، اپریل 2003، صفحہ 12

106 پروفیسر جگن ناتھ آزاد'سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر مشمولہ سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر اور دیگر مشمولات'صفحہ 13

107 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اوران کی تین نظمیں'ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعراور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 313'314

108 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اوران کی تین نظمیں'ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا مشمولہ علی سردار جعفری' شخص'شاعراور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 314'315

109 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اوران کی تین نظمیں'ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعراور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 315

110 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اوران کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعراور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 315'316

111 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی'سردار جعفری: تاریخی شعور کا زندہ استعارہ'فکر وتحقیق'اکتوبر تا دسمبر 2002'صفحہ 135

112 رفعت سروش'درد کا رساحل بیاد علی سردار جعفری'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 37

113 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 204 تا 206

114 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 295'297 تا 300

115 راشد آذر'سردار جعفری کی آزاد نظم'افکار سردار جعفری نمبر'صفحہ 589'590

116 ڈاکٹر وحید اختر'سردار جعفری: خواب اور شکست خواب مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعراور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 194

117 ڈاکٹر علی احمد فاطمی'علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند شاعر: سردار'مجروح' کیفی'صفحہ 21

118 محمد ایوب واقف'علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری'فروغ اردو'لکھنؤ'1984'صفحہ 110'111 بحوالہ عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 294

119 پروفیسر زاہدہ زیدی'علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 51'52

120 زبیر رضوی'اودھ کی خاک حسین (ایام اسیری کی ایک خوبصورت نظم)'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 63'64

121 سید محمود الحسن'علی سردار جعفری: فکر وفن کے چند پہلو مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس' صفحہ 146

122 اسلم عمادی: ادبی گفتگو (نثری تحریروں کا انتخاب)'صفحہ 185'186

123 راشد آذر'سردار جعفری کی آزاد نظم'افکار'سردار جعفری نمبر'نومبر دسمبر 1991'صفحہ 591

124 پروفیسر محمود الحسن، سردار جعفری: چند تاثرات، کچھ واقعات، نیا سفر (16)، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 102

125 راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 342

126 ادیب سہیل، نئی دنیا کو سلام، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 493، 494

127 ڈاکٹر اشفاق حسین، اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی)، صفحہ 99، 100

128 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 252، 253

129 ڈاکٹر درخشاں تاجور، ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، صفحہ 565

130 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 181 تا 183، 267، 268

131 پروفیسر آل احمد سرور، آل احمد سرور کے تبصرے ''خون کی لکیر'' مرتبہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، صفحہ 84

132 ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی، علی سردار جعفری اور مرثیہ نگاری، نیا دور، دسمبر 2009، صفحہ 39

133 رفعت سروش، درد کا ساحل: بیاد علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 36

134 ڈاکٹر یعقوب یاور، ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری صفحہ 213 بحوالہ لکھنو کے ادب کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر 1857 تا 1947، صفحہ 295

135 ڈاکٹر خلیق انجم، سردار جعفری: انقلاب خواب تک، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19، سردار جعفری نمبر (سردار جعفری: فن اور شخصیت)، صفحہ 286

136 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 97، 98

137 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل، صفحہ 108

138 ڈاکٹر کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000

139 پروفیسر سید محمد عقیل، نئی دنیا کو سلام: ایک تجزیاتی مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 211

140 کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 91، 92

141 ڈاکٹر علی جاوید، نئی دنیا کو سلام اور علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 80

142 ڈاکٹر نیر جہاں، علی سردار جعفری کی شاعری میں عورت کا تصور مشمولہ تنقیحات، صفحہ 143 تا 147

143 عقیل احمد صدیقی، جدید نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970

144 ڈاکٹر ابن کنول، تنقید و تحسین (مجموعہ مضامین)، صفحہ 109 تا 112

145 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 100، 101

146 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 185

147 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 186

148 ڈاکٹر اشفاق حسین، اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی) صفحہ 145، 146

149 راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم، مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 331

150 میر ہاشم، نقیب صبح فردا: علی سردار جعفری، ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، ستمبر 2007، صفحہ 20

151 پروفیسر شمیم حنفی، تقسیم کا ادب اور تشدد کی شعریات، سہ ماہی اردو ادب، اپریل، مئی، جون 2007، صفحہ 274

152 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، سردار جعفری کی شاعری، ہماری زبان یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 3

153 ڈاکٹر ابن کنول، ترقی پسند نظم مشمولہ تنقید و تحسین (مجموعہ مضامین)، صفحہ 113

154 پروفیسر شارب ردولوی، ترقی پسند فکر اور اردو شاعری: آزادی کے بعد مشمولہ آزادی کے بعد اردو شاعری
(مقالات و مباحث) مرتبہ شہزاد انجم، صفحہ 71، 72، 74

155 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 620، 621

156 وارث علوی، علی سردار جعفری کی شاعری، مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 153، 154

157 راشد آذر، سردار جعفری کی آزاد نظم مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 330، 331

158 محمد حفیظ الکبیر قریشی، علی سردار جعفری مشمولہ افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 601

159 کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 92

160 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 183

161 عمر رضا، علی سردار جعفری صفحہ 184

162 پروفیسر شارب ردولوی، آزادی کے بعد اردو شاعری مشمولہ آزادی کے بعد اردو شاعری:
مقالات و مباحث مرتبہ شہزاد انجم، صفحہ 71، 72

163 ڈاکٹر اشفاق حسین، اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی)، صفحہ 157

164 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 629

165 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 625، 626

166 پروفیسر عبدالستار دلوی، ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری، صفحہ 29، 30

167 پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول، علی سردار جعفری، شخص، شاعر اور ادیب، صفحہ 37، 38

168 علی سردار جعفری، حرف آخر: ایودھیا مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب
مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 490 تا 493

169 ڈاکٹر فاطمہ تنویر، اردو شاعری میں انسان دوستی کے نقوش، صفحہ 234

170 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 104

171 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں اہو کا تلازمہ مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ
از رفیعہ شبنم عابدی، صفحہ 277، 283

172 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 413

173 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 99

174 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 100

175 ڈاکٹر اشفاق حسین، اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی)، صفحہ 159

176 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 85

177 محمد اجمل خاں، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی 2010، صفحہ 27

178 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 86، 87

179 ڈاکٹر رفعت النساء بیگم، سردار جعفری کی شاعرانہ مرتبت مشمولہ طرز نگارش از رفعت النساء بیگم، صفحہ 27 تا 29

180 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں اہو کا تلازمہ، صفحہ 272، 273، 274

181 پروفیسر گوپی چند نارنگ، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان، صفحہ 45 تا 48

182 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 450

183 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 265، 266

184 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 180

185 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 185

186 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 631، 632

187 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 270

188 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 274

189 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 275

190 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 316، 317

191 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 413، 414

192 معزہ ابراہیم قاضی'سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور'مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 378'279

193 اسلم عمادی'علی سردار جعفری: اردو شعر و ادب کا ایک معتبر نام مشمولہ ادبی گفتگو (نثری تحریروں کا انتخاب)
از اسلم عمادی'صفحہ 185

194 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 317'318

195 پروفیسر وارث علوی'علی سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر'ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 155

196 پروفیسر وارث علوی'علی سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 175

197 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 413

198 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 322

199 مظہر امام'شعری اظہار اور سردار جعفری'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 42

200 زبیر رضوی'اودھ کی خاک حسین: ایام اسیری کی ایک خوبصورت نظم'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 62تا64

201 آل احمد سرور'آل احمد سرور کے تبصرے (خون کی لکیر از سردار جعفری)
مرتبہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری'صفحہ 79'80

202 صدیق الرحمٰن قدوائی'عہد عزم و پیکار کی یادگار'عالمی اردو ادب 2001'جلد 19 سردار جعفری نمبر'صفحہ 336

203 مجنوں گورکھپوری'مقدمہ'پرواز بحوالہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی'اقبال اور سردار کے فکری و تخلیقی رشتے'
مشمولہ تین ترقی پسند شاعر: سردار'مجروح'کیفی'صفحہ 50'51

204 ڈاکٹر علی احمد فاطمی'اقبال اور سردار کے فکری و تخلیقی رشتے مشمولہ تین ترقی پسند شاعر: سردار'مجروح'کیفی'
صفحہ 50تا53

205 پروفیسر علیم اللہ حالی'سردار جعفری پر اقبال کے اثرات مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 269تا279

206 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 158'159

206\1 افکار منتخب منظومات نمبر (کراچی) جلد 50'شمارہ 3000 مارچ 1995 صفحہ 152'153

207 محمد ایوب واقف'تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر)
سہ ماہی ترسیل'جنوری تا جون 1998'صفحہ 38'39

208 پروفیسر سعید الظفر چغتائی، دانشور شاعر سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 146

209 پروفیسر جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر، صفحہ 13

210 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 467، 468

211 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار جعفری کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 106، 107

212 محمد ایوب واقف، تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر) سہ ماہی ترسیل،
جنوری تا جون 1998، صفحہ 36

213 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 99

214 کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 93

215 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 105

216 علی سردار جعفری، میرا سفر (ہندی) بھارتیہ گیان پیٹھ، نئی دہلی، 2004، صفحہ 135، 136

217 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 468، 469

218 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 191

219 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 466

220 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 408

221 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 400

222 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 287

223 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 288

224 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 203، 204

225 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 291

226 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 290 تا 293

227 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 623

228 علی جواد زیدی، رفیق زنداں سردار، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری: فن اور شخصیت)، صفحہ 87

229 ڈاکٹر فاطمہ تنویر، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں انسان دوستی کے نقوش، صفحہ 234

230 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 406

231 کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں: تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 94، 95

232 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 404

233 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کا شعری سفر، مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 267

234 معزہ ابراہیم قاضی، سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب، صفحہ 379، 380

235 عبدالاحد ساز، اردو شاعری اور انسانیت کا سفر، سہ ماہی اذکار، کرناٹک اردو اکیڈیمی، بنگلور، صفحہ 112

236 پروفیسر سعید الظفر چغتائی، دانش ور شاعر سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن، مرتبہ اصغر عباس: صفحہ 137

237 ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، سرحد کا محافظ علی سردار جعفری، ہماری زبان، یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 8

238 حمید اختر، ایک چراغ اور بجھا، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19، سردار جعفری نمبر، (سردار جعفری: فن اور شخصیت)، صفحہ 111

239 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 437

240 محمد حسین پرکار، سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا، کون دشمن ہے، صبح فردا، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 322 تا 324

241 محمد حسین پرکار، سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا، کون دشمن ہے، صبح فردا، مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 324

242 ڈاکٹر خلیق انجم، سردار جعفری: انقلاب سے خواب تک، عالمی اردو ادب، جلد 19، سردار جعفری نمبر (سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 291

243 رفعت سروش، درد کا ساحل بیاد علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 40

244 پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول مشمولہ علی سردار جعفری، شخص، شاعر اور ادیب، صفحہ 20

245 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 430

246 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 435، 436

247 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 247

248 پروفیسر عبدالستار دلوی، حرف اول، علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب، مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 18

249 ڈاکٹر اشفاق حسین، اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی)، صفحہ 203

250 معزہ ابراہیم قاضی'سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور'مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 382'383

251 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا'مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 319 تا 322

252 محمد حسین پرکار'سردار جعفری اور ان کی تین نظمیں ایشیا جاگ اٹھا'کون دشمن ہے'صبح فردا'مشمولہ علی سردار جعفری: شخص'شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی'صفحہ 322

253 حبیب الرحمٰن چغانی'علی سردار جعفری: شخصیت و شاعری'جرنل'121'ستمبر 2000'صفحہ 66

254 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 433 تا 435

255 سردار جعفری: پیراہن شرر'حلقہ ادب'ممبئی'1966'صفحہ 92

256 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 444

257 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید'سردار جعفری کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل از سلیمان اطہر جاوید'صفحہ 105

258 پروفیسر عبدالستار دلوی'سردار جعفری اور قومی شعور'کتاب نما'جنوری 2003'صفحہ 38'39

259 ضیاء الدین اصلاحی'اردو کا سردار چلا گیا (وفیات)'معارف'اگست 2000'صفحہ 147'148

260 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں'علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری'جرنل'ستمبر 1999'صفحہ 104'105

261 پروفیسر وارث کرمانی'ملک الشعراء'سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)'صفحہ 113

262 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 451'452

263 سرور الہدیٰ'امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری'ایوان اردو'دہلی'ستمبر 2000'صفحہ 103

264 حبیب الرحمٰن چغانی'علی سردار جعفری'مریخ'پٹنہ'ستمبر/اکتوبر 2000'صفحہ 14

265 پروفیسر وارث کرمانی'ملک الشعراء سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس'صفحہ 113

266 ڈاکٹر سلطان احمد'علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)'صفحہ 263'264

267 سمرتھ باقی'لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں مشمولہ کتاب نما'سردار جعفری نمبر'دہلی'جلد 30'شمارہ 11'نومبر 1990'صفحہ 60

268 عمر رضا'علی سردار جعفری'صفحہ 451

269 مظہر امام'شعری اظہار اور سردار جعفری'ایوان اردو'دہلی'ستمبر 2000'صفحہ 44

270 میر ہاشم‘نقیب صبح فردا علی سردار جعفری‘ماہنامہ سب رس‘حیدرآباد‘ستمبر 2007‘صفحہ 19

271 پروفیسر آل احمد سرور‘پہچان اور پرکھ‘صفحہ 75

272 نادیہ انجم‘اردو شاعری میں عورت کا تصور‘صفحہ 130 تا 133‘135‘تا 140

273 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 235

274 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید‘سردار جعفری کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
ازسلیمان اطہر جاوید‘صفحہ 96‘99

275 ڈاکٹر رفعت النساء بیگم‘سردار جعفری کی شاعرانہ مرتبت مشمولہ طرز نگارش از رفعت النساء بیگم‘صفحہ 23‘25

276 حمایت علی شاعر‘علی سردار جعفری‘کتاب نما‘اپریل 2003‘صفحہ 13‘14

277 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی‘سردار جعفری کو گیان پیٹ‘اردو دنیا جولائی تا ستمبر 1998‘صفحہ 171

278 فیض الرحمٰن اعظمی‘سردار جعفری کے سماجی شعور کا تجزیہ‘ماہنامہ نگار‘اگست 1951‘صفحہ 21 تا 23

279 ساجد رشید‘رومانی انقلاب کا آخری سالار‘عالمی اردو ادب 2001‘جلد 19‘سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری:فن اور شخصیت صفحہ 116)

280 پروفیسر وارث علوی‘علی سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری:شخص‘شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی‘صفحہ 163‘167‘168‘169‘171

281 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 150 تا 153

282 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 234

283 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 234‘235

284 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 235

285 یوسف ناظم‘علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو‘نیا سفر (16)‘
علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر‘جولائی تا دسمبر 2000‘صفحہ 42

286 ڈاکٹر سلطان احمد‘علی سردار جعفری:شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 262

287 ڈاکٹر سلطان احمد‘علی سردار جعفری:شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 264

288 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 403‘404

289 عمر رضا‘علی سردار جعفری‘صفحہ 618‘619

290 راشد آذر،سردار جعفری کی آزاد نظم،مشمولہ علی سردار جعفری: شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 342 تا 344

291 پروفیسر شارب ردولوی،سردار جعفری: ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 30،31

292 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کا شعری سفر،مشمولہ علی سردار جعفری: شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 372،373

293 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 410

294 ڈاکٹر سلطان احمد،علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 265

295 پروفیسر وارث علوی،علی سردار جعفری مشمولہ علی سردار جعفری: شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 169،170

296 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 441،442

297 پروفیسر عبدالستار دلوی،ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری،ایوان اردو،
ستمبر 2000،صفحہ 28

298 پروفیسر وارث علوی،علی سردار جعفری کی شاعری،مشمولہ علی سردار جعفری: شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 176،177

299 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 429

300 پروفیسر جگن ناتھ آزاد،سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر مشمولہ سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر
اور دیگر مشمولات،صفحہ 160

301 ڈاکٹر علی احمد فاطمی،اقبال اور سردار کے فکری و تخلیقی رشتے مشمولہ تین ترقی پسند شاعر: سردار،مجروح،کیفی صفحہ 48

302 پروفیسر وارث کرمانی،ملک الشعراء سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 113 تا 115

303 پروفیسر محمد حسن،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام،
ماہنامہ ایوان اردو،دہلی،ستمبر 2000،صفحہ 10

304 پروفیسر گوپی چند نارنگ،علی سردار جعفری: ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ،ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 14

305 ڈاکٹر سلطان احمد،علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 262،263

306 رفعت سروش، درد کا ساحل (بیاد علی سردار جعفری)، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 38، 39

307 شین کاف نظام، ثقافت کا سفیر علی سردار جعفری، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر، صفحہ 323

308 رام لال، سردار جعفری سے گفتگو (1984)، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 143

309 ڈاکٹر خورشید احمد، سردار جعفری کی نظم "میرا سفر"، مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 205 تا 207، صفحہ 209

310 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 459

311 پروفیسر زاہدہ زیدی، علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات: منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے، صفحہ 54، 55

312 رام لعل، سردار جعفری سے گفتگو، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 141، 142

313 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 189 تا 191، 272 تا 273

314 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 106

315 محمد ایوب واقف، تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر) سہ ماہی ترسیل،
جنوری تا جون 1990، صفحہ 36

316 پروفیسر شارب ردولوی، انسان دوستی: سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور، نیا سفر (16) علی سردار جعفری و
مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 86 تا 94

317 پروفیسر شارب ردولوی، سردار جعفری اور نقد شعر، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 13، 14

318 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 105، 106

319 ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19، سردار جعفری نمبر،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 341

320 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 459

321 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار جعفری کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 104

322 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، صفحہ 241

323 ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب) صفحہ 259

324 محمد ایوب واقف، تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ، سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر)
سہ ماہی ترسیل جنوری تا جون 1998، صفحہ 35

325 کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 93

326 پروفیسر عبدالستار دلوی، ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 25، 29

327 پروفیسر شارب ردولوی، انسان دوستی: سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 57

328 ڈاکٹر فاطمہ تنویر، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں انسان دوستی کے نقوش، صفحہ 233، 234

329 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 430

330 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 106، 107

331 پروفیسر احتشام حسین اور نیاز فتح پوری، یلدرم۔ان کے ساتھ اور رومانی افسانہ نگار (انٹرویو) مشمولہ پگڈنڈی، سجاد حیدر یلدرم نمبر (امرتسر) جلد 9 شمارہ 5 (اپریل 1961) صفحہ 116
بحوالہ عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 108

332 نیا سفر، جوش ملیح آبادی، خصوصی مطالعہ (دہلی) جلد 1، شمارہ 2 (جون 1993) صفحہ 147

333 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 107 تا 111

334 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 105، 111، 112، 150

335 سید عاشور کاظمی، لندن کی ایک شام (علی سردار جعفری کے نام) مشمولہ سخن گسترانہ بات، صفحہ 29

336 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 236 تا 238

337 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 236 تا 241، 243، 245، 246

338 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 180، 181

339 پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری: رومان سے انقلاب تک مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 146 تا 148

340 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 324، 325

341 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 323، 324

342 برج پریمی، ذوق نظر، صفحہ 78

343 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 304

344 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 344

345 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری، شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 99 تا 104

346 ڈاکٹر شمیمہ رضوی، قطرے سے گہر ہونے تک، ہماری زبان، یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 26، 28

347 وارث علوی، سردار جعفری کی شاعری کا استعاراتی نظام مشمولہ سرزمیں خارا زوارث علوی، صفحہ 15، 16

348 مجنوں گورکھپوری، مقدمہ، پرواز از سردار جعفری، اشاعت گھر، حیدرآباد، صفحہ 14

349 ڈاکٹرعلی جاوید'نئی دنیا کوسلام اورعلی سردارجعفری'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 80'81

350 ڈاکٹرصدیق الرحمٰن قدوائی'عہدعزم و پیکار کی آواز'عالمی اردوادب 2001'سردارجعفری نمبر 337

351 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 414

352 پروفیسر زاہدہ زیدی'علی سردارجعفری کی فکری اورفنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)
مشمولہ سردارجعفری:شخصیت اورفن مرتبہ اصغرعباس'صفحہ 125

353 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 415

354 پروفیسر وارث علوی'علی سردارجعفری کی شاعری مشمولہ علی سردارجعفری (شخص'شاعراورادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار ردلوی'صفحہ 174

355 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی'سردارجعفری کاشعری سفر'جامعہ'اپریل تا جون 1998'صفحہ 148'149

356 وارث علوی'سردارجعفری کی شاعری کا استعاراتی نظام مشمولہ سرنشن خارازوارث علوی'صفحہ 12'13

357 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی'سردارجعفری کاشعری سفرمشمولہ علی سردارجعفری:شخص'شاعراورادیب
مرتبہ عبدالستار دلوی'صفحہ 369'372

358 ڈاکٹروزیرآغا'غزل اورنظم کابنیادی فرق مشمولہ اردوشاعری کافنی ارتقاءازڈاکٹرفرمان فتح پوری'
صفحہ 160'161'163

359 عمر رضا'علی سردارجعفری کی غزل گوئی'سہ ماہی فکروتحقیق'اپریل مئی جون 2007'صفحہ 141 تا 153

360 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 480

361 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 627'628

362 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی'سردارجعفری کی غزل مشمولہ علی سردارجعفری:ایک مطالعہ ازرفیعہ شبنم عابدی'
صفحہ 161 تا 164'166'167'169'170'172 تا 175

363 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 420 تا 423

364 عمر رضا'علی سردارجعفری'صفحہ 439'440

365 ضیاءالدین اصلاحی'اردو کا سردار چلا گیا (وفیات)'معارف'اگست 2000'صفحہ 148

366 ڈاکٹرسلطان احمد'علی سردارجعفری:شخصیت اورفن کے آئینے میں مشمولہ سردارجعفری:شخصیت اورفن
ازاصغرعباس (مرتب)'صفحہ 259

367 ڈاکٹرممتازالحق'اردوغزل کی روایت اورترقی پسندغزل'صفحہ 220'246 تا 248

368 ڈاکٹرہمایوں اشرف'سردارجعفری'سردارجعفری کی غزل گوئی'جنل 124'جون 2001'
صفحہ 176'182'183'184'186 تا 188

369 ڈاکٹر ہمایوں اشرف، حرکت و انقلاب کا استعارہ علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 89

370 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 110

371 بیکل اتساہی، وطن گلاب، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 66

372 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 630

373 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند شاعر، سردار، مجروح، کیفی، صفحہ 19

374 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 188، 189

375 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 247، 248

376 سردار جعفری، خودنوشت: بچپن اور جوانی، افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 642، 643

377 سردار جعفری، ایک غیر مطبوعہ مرثیہ مشمولہ آج کل (دہلی)، جلد 33 شمارہ 12، جولائی 1975 صفحہ 13
بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 62

378 سردار جعفری، خودنوشت، (بچپن اور جوانی کے حالات)، عالمی اردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر،
جلد 19، صفحہ 33

379 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری، کتاب نما، اپریل 2003، صفحہ 10

380 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی مرثیہ گوئی مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ
از رفیعہ شبنم عابدی، صفحہ 222 تا 229

381 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 613 تا 615

382 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 246

383 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو، نیا سفر (16)، علی سردار جعفری و
مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 40، 41

384 یوسف ناظم، علی سردار جعفری کی پہلو دار شخصیت کے کچھ پہلو، نیا سفر (16)، علی سردار جعفری و
مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 44، 45

385 پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی مرثیہ گوئی مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ
از رفیعہ شبنم عابدی صفحہ 230، 231

386 علی سردار جعفری، نئی دنیا کو سلام اور جمہور صفحہ 196، 197

387 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 163 تا 166

388 ڈاکٹر علی جاوید، نئی دنیا کو سلام، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 79، 80

389 نسیم سید، لکھنو کی پانچ راتیں، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 629

390 پروفیسر شہپر رسول، شبلی کی قطعات نگاری، کتاب نما، مارچ 2011 مکتبہ جامعہ دہلی، صفحہ 20

391 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 279، 280

392 عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم نئے ہم عصر شعراء کی نظر میں مشمولہ علی سردار جعفری: شخص، شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 291، 292

393 عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم، نظریہ و عمل: 1936 تا 1970،
صفحہ 106 تا 110، 112، 114، 115 تا 117، 130، 131، 137

394 عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم نئی ساعتوں کے درمیان، کتاب نما، مارچ 1998، صفحہ 17 تا 19

395 پروفیسر شارب ردولوی، کلیدی خطبہ، سردار جعفری: ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ مشمولہ سردار جعفری:
شخصیت اور فن از ڈاکٹر اصغر عباس (مرتب) صفحہ 29 تا 32

396 ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، نظم کو شعراء میں سردار جعفری کا امتیاز، آج کل، اپریل 1998، صفحہ 23 تا 27

397 عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970، صفحہ 117، 118، 139، 140، 141

398 پروفیسر علیم اللہ حالی، روح عصر کا شاعر، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 25، 26

399 ڈاکٹر محمد فیروز، سردار جعفری کی حقیقت نگاری، ہندوستانی زبان، جنوری تا مارچ 2008، صفحہ 57

400 قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، سردار جعفری کی تہذیبی ترجیحات (نظموں کے حوالے سے)، آج کل،
اگست 2003، صفحہ 17

401 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 114 تا 116

402 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 630، 632، 633

403 مظہر امام، شعری اظہار اور سردار جعفری، ایوان اردو، دہلی ستمبر 2000، صفحہ 44

404 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 111، 112

405 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 236

406 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، اردو شاعری میں اشاریت، صفحہ 222 تا 225

407 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 112

408 راشد انور راشد، علی سردار جعفری: چند تاثرات، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 98، 100

409 ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، صفحہ 241

410 ڈاکٹر غ۔ع۔شیخ، بیسویں صدی کا انوکھا شاعر علی سردار جعفری، ہماری زبان، یکم تا 21/اکتوبر 2000، صفحہ 17

411 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 176

412 ڈاکٹر شمیمہ رضوی، قطرے سے گہر ہونے تک، ہماری زبان، حکم تا 21/اکتوبر 2000، صفحہ 27

413 حمایت علی شاعر، علی سردار جعفری، کتاب نما، اپریل 2003، صفحہ 9

414 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری، شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 112، 113

415 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 245

416 شکیل الرحمٰن، نئی دنیا کو سلام: جمالیاتی جہتیں، فکر و تحقیق، دہلی، جلد 4، شمارہ 4، اکتوبر تا دسمبر 2001، صفحہ 7

417 پروفیسر گوپی چند نارنگ، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ: اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان، صفحہ 44، 45

418 ڈاکٹر نصرت چودھری، فیض کی شاعری (ایک مطالعہ)، صفحہ 161

419 پروفیسر آل احمد سرور، مسرت سے بصیرت تک، صفحہ 276

420 رفعت سروش، درد کا ساحل (بیاد علی سردار جعفری)، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 36

421 ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 83

422 سرور الہدیٰ، امید فردا کا شاعر علی سردار جعفری، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 104، 105

423 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 116

424 ریوتی لال شاہ، علی سردار جعفری، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 550

425 ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، عہد عزم و پیکار کی یادگار، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19 سردار جعفری نمبر، صفحہ 338، 339

426 ڈاکٹر شمیمہ رضوی، قطرے سے گہر ہونے تک، ہماری زبان، یکم تا 21/اکتوبر 2000، صفحہ 27

427 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 500، 508، 511، 512، 516، 520، 521، 524، 526

428 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 529، 531

429 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 501، 502، 507 تا 509، 511، 512، 516، 520، 523 تا 527

430 عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم نئی سماعتوں کے درمیان، کتاب نما، مارچ 1998، صفحہ 20

431 پروفیسر زاہدہ زیدی، سردار جعفری کی پیکر تراشی، آج کل، دسمبر 1999، صفحہ 13 تا 18

432 ڈاکٹر شمیمہ رضوی، قطرے سے گہر ہونے تک، ہماری زبان، یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 26

433 محمد ایوب واقف، تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ (گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر) سہ ماہی ترسیل، جنوری تا جون 1998، صفحہ 35

434 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 105، 112

435 کوثر مظہری۔ سردار جعفری کی نظمیں تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 95

☆☆☆

بابِ پنجم

”تنقید نگاری“

تنقید نگاری

لفظ تنقید عربی مادہ نقد سے مشتق ہے جس کے معنی کھرے کھوٹے کو الگ کرنا ہے۔ ویبسٹر انٹرنیشنل ڈکشنری میں تنقید کی تعریف یہ بتلائی گئی ہے کہ تنقید کامل بصیرت وعلم کے ساتھ موزوں ومناسب طریقہ سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے معائب ومحاسن کی قدر شناسی یا اس کے بارے میں حکم لگانا یا فیصلہ صادر کرنا ہے۔ نیو انگلش ڈکشنری کے بموجب ''کسی ادب پارے یا فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا تنقید ہے۔ آئی اے رچرڈز کے خیال کے مطابق تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح اور بالآخر اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے۔ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری کیا نظم اچھی ہے یا بری ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق تنقید کا کام فیصلہ ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے،۔۔۔۔۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ اور جھوٹ اور سچ، پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔۔۔۔۔''

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے مطابق صحیح، غلط، اچھے برے، حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے، صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کا نام تنقید ہے۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر تنقید دراصل بے لاگ جانچ پڑتال اور امتیازات کے جذبے سے بلند ہو کر تعین قدر و مقام کا نام ہے۔ تنقید تحلیل، تجزیہ، ترجمانی، تفسیر، ادراک، حقیقت اور ادبی محاسبہ ہے۔ وہ آرٹ کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے صادر کرنے اور جچے تلے محاکمہ کا نام ہے۔ ہڈسن کے مطابق تنقید میں ترجمانی، تشریح اور تجزیہ شامل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے فن پارہ کو جانچنے، پرکھنے، اس کی اہمیت کا پتہ لگانے اور اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کو تنقید کا نام دیا ہے۔ تنقید نگار رہبری کرتا ہے، رہبر ہمدرد ہوتا ہے اور ہمدرد تضحیک نہیں کر سکتا اور جو لوگ فنکاروں کی تضحیک کرتے ہیں انہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں صحیح معنوں میں تنقید نگار کہا ہی نہیں جا سکتا۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ تنقید کو محض کھرے کھوٹے کی جانچ کا آلہ تصور نہیں کرتے بلکہ تنقید کو ادب میں اصلاح کردار اور اخلاق کو استوار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے ''تنقید کا مقصد ادب کے صرف معائب اور محاسن کو اجاگر کرنا نہیں معاشرتی اقدار کو بہتر بنانا، تہذیب کو مثبت راہوں پر لگانا اور اس کو نکھارنا بھی ہے۔۔۔ تنقید کا منصب۔۔۔ اس کو (ادب کو) انسانی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا وارث بنانا ہوتا ہے۔ انہوں نے میتھیو ارنلڈ کے اس قول کا بھی حوالہ دیا کہ فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے نقاد کو اس کے تہذیبی ماحول پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے جس میں کہ وہ فن پارہ وجود میں آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس کے مطابق تنقید کسی ادب پارے کا وہ مطالعہ ہے جو ہمیں کسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ اس میں تشریح، تجزیہ، توضیح، تصفیہ (محاکمے)، تحسین، تقابل، تقدیر (قدر شناسی)، ترتیب، تدریج، توسیع، تحقیق اور تخلیق یہ سارے پہلو اور تمام زاویے شامل ہیں۔ 1

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے مطابق ادبی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فنکار اور اس کے مخاطبین کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کی سب سے موثر، قابل اعتبار اور قابل وقعت تدبیر ہے۔ اعلیٰ فنکار جن نازک اشاروں، جن لطیف استعاروں، جن معنی خیز ایجاز و اختصار، جس اندرونی تخیلی ارتباط اور جس سخت گیر تنظیم و تطابق سے کام لیتا ہے وہ بسا اوقات عام قاری کے لئے ناقابل فہم ہوتا ہے اور تاوقتیکہ نقاد ان تمام محاسن اور خوبیوں کو پڑھنے والوں کے لئے نمایاں نہ کرے، فنی کارنامہ اپنے اصل مقصد یعنی ابلاغ کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ دراصل معیاری تنقید ادبی کارناموں کو حیات و دوام بخشتی اور ان کے خلاقین کو ان کے صحیح منصب پر سرفراز کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، تنقید مستقبل کی تخلیق کو بے لگام ہونے سے بچاتی ہے یعنی تنقیدی عمل ماضی یا حال تک محدود نہیں ہوتا بلکہ مستقبل کے فنکاروں کے معیارات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

نقطہ نظر کے اختلاف کی وجہ سے تنقید کے متعدد دبستان وجود میں آئے۔ مثلاً جمالیاتی تنقید ادبی فن پاروں میں مسرت اور حسن کے اجزاء تلاش کرتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں تنقید نگار ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے جو کسی تخلیق کے مطالعہ سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں۔

اس کے سامنے کوئی متعین اصول نہیں ہوتے۔ وہ محض اپنے انفرادی شعور اور وجدان کی رہنمائی میں کسی ادب پارے کو پرکھتے ہیں۔ نفسیاتی نقاد مطالعہ فن کے لئے فن کار کی شخصیت، وراثت اور ماحول کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان عناصر کے امتزاج سے فن کار کی ذہنی تشکیل ہوتی ہے۔

ترقی پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''ترقی پسندی حیات کے ہر شعبہ میں ترقی چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ ہر شعبہ کے موجودہ انحطاط کی تصویر کشی کرتی ہے اور اس پر تنقید کرتی ہوئی مستقبل کی تبدیلی اور ارتقاء کی راہ دکھلاتی ہے۔ ترقی پسندی ہر نوع کی استحصالی قوتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو عریاں کرتی، ان پر تبصرہ کرتی اور ان کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ ترقی پسندی صرف مظلوم ہی کی حالت و کیفیات سے بحث نہیں کرتی بلکہ وہ ظالم کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے اور اس کے دل کو بھی کھول کر رکھ دیتی ہے''۔2

ترقی پسند تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر سید محمود الحسن نے فنکار پر سماج اور اس کے ماحول کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور ترقی پسند نقادوں نے ادب سے زندگی کی بہتری کے لئے جو کام لیا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔ ترقی پسند تنقید کے نظریات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ادیب و شاعر کے جذبات کسی الہامی طاقت کا عطیہ نہیں بلکہ ان کے سارے احساسات، تاثرات اور شعور و ادراک کی تخلیق سماج اور ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے''۔

2۔۔۔۔۔ادب سے ان نقادوں نے یہ کام لیا کہ اس کے ذریعہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے جس کے لئے اس بات پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی گئی کہ سماجی زندگی کی ہر کمزوری، اس کی تلخی، گھناؤنے پن کی ہر بنیاد اور طبقاتی کشمکش کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے تاکہ زندگی کی ان کجرویوں کو پیش کر کے ان میں افادیت اور اعلیٰ مقاصد شامل کئے جائیں۔ اس طرح ایک طرف اس تنقید میں فن کو محض داخلی کیفیات کے اظہار تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ خارجی مسائل بنیادی شکل اختیار کر گئے۔

دوسری طرف اس میں حقیقت پسندی اور افادیت کو زیادہ جگہ دی گئی جسے ان لوگوں نے فن کے ذریعہ زندگی کی تنقید کا ایک آلہ بنایا''۔۔۔۔۔

3۔۔۔۔۔اسی نظریہ کی روشنی میں ادب برائے ادب کے پیروؤں کی شدید مخالفت بھی کی''۔۔۔۔۔۔

4۔۔۔۔۔''ان نقادوں نے جب تخلیق کو اپنے دور کی سماجی زندگی سے گہرے طور پر مربوط ہونے پر زور دیا تو اس کے پیش نظر مقصدیت اور افادیت کی طرف بھی توجہ دلائی۔انہوں نے بتایا کہ جب ادب سماجی ضرورت کی عکاسی کے لئے استعمال کیا گیا تو اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کی طرح اسے بھی بغیر مقصد کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ محض حسن آفرینی یا ذاتی تراثرات کا اظہار ہی ادب نہیں ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ سماجی زندگی کو متاثر بھی کر سکے۔''

پروفیسر احتشام حسین نے بتایا کہ ترقی پسند نقاد سماجی مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ،طبقاتی کشمکش کی پیشکش اور انسانیت کی بہتری کے راستوں کو ادب کا مقصد قرار دیتے ہیں۔انہوں نے لکھا:

وہ (ترقی پسند نقاد) یہ دکھانا چاہتا ہے کہ کتاب سماج کی کن اچھائیوں اور برائیوں کی آئینہ دار ہے۔ان میں زندگی کے کن حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتنی گہری نظر سے۔جب ترقی پسند نقاد کتاب کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے تو وہ ان باتوں کو بھی کھول کر رکھ دیتا ہے جنہیں لوگ سننا گوارہ نہیں کرتے تو غصہ کا اظہار کیا جاتا ہے حالانکہ نقاد نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ اس نے سماج کی ان بیماریوں کی تشخیص کر دی ہے جن کا شکار یا تو مصنف تھا یا پورا سماج''۔۔احتشام صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا انہی کے لحاظ سے ترقی پسند ناقدین ادب میں حقیقت نگاری کی تخلیق پر زیادہ زور دیتے ہیں اور سماجی زندگی کے ہر طبقہ کے مسائل کو ادب کے موضوع کی حیثیت سے شامل کرتے ہیں۔جس ادبی تخلیق میں زندگی کے مسائل کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے وہ ترقی پسند نقادوں کے مطابق معیار پر پوری نہیں اترے گی۔۔۔۔وہ عام انسانی زندگی کے مسائل سے ادیب کی تخلیقات کو قریب رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے انداز بیان اور ہیئت کے مقابلہ میں وہ مواد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ شعر و ادب میں طبقاتی کشمکش مزدوروں اور سرمایہ داروں کے تصادم اور گرد و پیش کے حالات کی آئینہ داری کرنے کے ساتھ سماج کی بہت سی برائیوں کو سامنے لا کر انسانیت کی بہتری کے لئے راستے بنائے جا سکتے ہیں اور یہی ادبی تخلیق کا سب سے بڑا مقصد اور موضوع ہونا چاہئے۔۔۔۔۔۔ 3

مارکسی فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے ظہیر احمد صدیقی نے بتایا کہ اس میں تمام انسانی اعمال بشمول وجدان، روحانی تجربہ اور تصور اقدار پر ماحول کے اثرات اور معاشی عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

انہوں نے لکھا:

''مارکس کے فلسفہ کی رو سے انسانی زندگی کے تمام شعبے حتیٰ کہ مذہب اور اخلاق، رسم و رواج، کلچر اور آرٹ کلیتاً مادی اور معاشی عوامل کے تابع ہیں۔اس فلسفہ کے نزدیک افادیت (فرد کی ذاتی تسکین اور معاشرہ کی اجتماعی بہبود) سے ماورا کسی جمالیاتی قدر کا کوئی وجود نہیں۔مارکس کی نظر میں 'انسانی شعور انسان کے اپنے ماحول سے تعلق ہی کا نام ہے' اور جس طرح انسان کے تمام اعمال ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح اس کا وجدان روحانی تجربہ اور تصور اقدار بھی اسی مادی ماحول کی

پیداوار ہیں۔مارکسی فکر کے معذرت خواہ حامیوں (Appologists) کی تمام تاویلات کے باوجود ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس نظام فکر میں جمالیاتی تجربہ کی مستقل بالذات حیثیت کا جسے جمالیاتی افکار میں ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے کوئی مقام نہیں ہے۔اسی لئے مارکسیت پر راسخ عقیدہ رکھنے والوں کا یہ اصرار کہ ادب اور صحافت یا فن اور پروپگنڈہ میں بھی کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں اور اس نظام میں صرف اسی ادب اور فن کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو اس کے تصورات 'افکار اور اجتماعی مقاصد کی تفسیر و تبلیغ کر سکے۔ 4

خالد علوی نے مارکسی نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس نظریہ میں انسانی زندگی میں مادیت کی اہمیت اور ادب میں سماجی استحصال کی مخالفت کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

''مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور ذہنی زندگی کو عام طور پر مادی زندگی کے طریقے اور آداب مقرر کرتے ہیں۔ ہمارا تمام ادب اور فنون لطیفہ ہماری مادی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں۔مارکسی نظریہ ادب میں حقائق ہی اہم ہیں اور تخئیل کی گنجائش نہیں ہے۔مارکسی حقیقت نگاری میں سماجی رشتوں کی کشمکش میں ہمیشہ اپنے نقاط نظر کی عکاسی کرنا پڑتی ہے۔زندگی جیسی ہے بالکل ویسی تصویر کشی کر دینے سے گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے بلکہ ایسی معنی خیز ہو جو انقلاب کے لئے ممد و معاون ثابت ہو۔ اس حقیقت نگاری میں بورژوائی محبت اور عشق بیان کرنا بے معنی ہے بلکہ سماجی کشمکش کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ہندوستانی ترقی پسند اس ادبی نظریئے کے مبلغ تھے اور ادب کے افادی پہلو پر زور دیتے تھے۔ان کے نزدیک اچھے ادب کی پہچان یہ تھی کہ وہ سماجی استحصال کے خلاف تحریک دیتا ہو''۔ 5

خالد علوی نے یہ بھی لکھا ہے:

''مارکسی نظریات، ترقی پسندوں کے آدرش تھے۔۔۔۔۔جس سوشلزم کی تبلیغ ترقی پسند کرنا چاہتے تھے وہ مارکس کے خیالات سے ماخوذ تھا۔ 6

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے مارکسی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس نظریہ میں ادیب کی عصری آگہی اور ادب میں تاریخ اور حالات کی اہمیت اور سماجی مفاد پر زور ملتا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔ہر دور کا ادب اپنی زندگی کا تضاد بھی رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کرتا ہے جو لوگ ادب کے مارکسی نظریہ کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ مارکسزم ادب کی جہت کو کم کر کے اسے صرف ایک رخ میں بڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور اس میں انفرادی کوششوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع نہیں ہوتے۔ایسے لوگ یا تو مارکسزم کو سمجھتے نہیں یا اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔اس لئے اس حلقے سے اعتراض ہوتا ہے کہ جب ایک ہی سماجی، تہذیبی اور اقتصادی پس منظر میں ادب کی بارآوری ہوتی ہے تو تمام ادیب ایک ہی طرح کیوں نہیں سوچتے۔ایک طرح کی چیزیں کیوں نہیں لکھتے۔ان کا اسٹائل ایک ہی کیوں نہیں ہوتا اور چونکہ ایسا عملی طور پر نہیں ہوتا، اس لئے کسی ادب کی تفہیم میں سماجی اور تہذیبی ونشیب و فراز یا تاریخی تجزیے کی بات بیکار کا عمل ہے۔ایسے معترض ادب کی تخلیق اور انسانی ذہن کی پسند ناپسند اور اس کے طریق کار کی انفرادیت کو پس پشت ڈال کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سب

حالات ایک جیسے ہیں تو ہر تخلیق مشین سے نکلتے ہوئے بٹن یا سوئی کی طرح برابر ہونی چاہئے اور چونکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے ادب کو سماجی، اقتصادی یا تاریخی حالات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ادب تو ادیب کی صرف انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔۔۔۔

2۔''۔۔۔۔۔مارکسی نقطہ نظر تاریخ اور حالات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ کسی فرد واحد یا ادیب کا کوئی محاکمہ اس کے حالات سے اسے کاٹ کر نہیں کیا جاتا، وقت اور تاریخ ادیب کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں تب جا کر تخلیق صورت پذیر ہوتی ہے۔ پھر ادیب خود بھی حالات کے تحت بدلتا جاتا ہے۔

3۔تخلیق کی سطح اگر ترسیل سے ہمکنار نہیں ہوئی تو ادب کی تخلیق ایک لایعنی عمل بن جاتی ہے۔ مارکسی ادیبوں نے اس نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، احمد ندیم قاسمی، فیض، سردار جعفری، محمد حسن اور قاضی عبدالستار سب کی تخلیقات یہی نتیجے برآمد کرتی ہیں۔ پھر مارکسی نقطہ نظر قدیم ادب کی تفہیم کے لئے بھی انہیں معیاروں پر اصرار کرتا ہے۔ مارکسی نقطہ نظر طبقاتی طرف داری کا بھی قائل ہے، اگر اس سے سماجی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ وہ غیر مارکسی ادیبوں کی ادبی خوبیوں کو بھی سراہتا ہے، اگر ان سے زندگی کا کوئی گوشہ منور ہوتا نظر آتا ہے۔''

4۔''جو ادیب سڑک پر چلنے والوں کی آوازوں، اپنے دور کی روحوں کے اندرونی خلفشار اور عصری آگہی سے بے خبر ہے، وہ کبھی ادب کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ پھر اسے ادب کے منبر سے نیچے اترنا چاہئے کہ وہ اس عظیم منصب کا حقدار نہیں ہے۔ ادب کا مقصد صرف جذبات کی بازآفرینی نہیں ہے نہ اس کا منصب صرف حظ اور تزئین ہے۔ اگر ادب نے اپنا رشتہ اپنے گردوپیش سے توڑ لیا ہے تو یہ ایسا نامناسب، غیر حقیقی اور گمراہ کن ادب ہے جو انسانوں کو Organic Wholeness سمیت ان کی دانشورانہ طاقت کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ادب زندگی کی تہذیب ہے اسے صرف تحیر زا اور بے مقصد سمجھنا، کم نظری اور ادب کے صحیح منصب سے بے خبری کی دلیل ہے''۔ 7

شارب ردولوی نے مارکسی نظریہ تنقید کے آغاز، اس کی غایت اور مارکسی ناقدین کے بارے میں لکھا ہے:

''جب تخلیق کا موضوع خیال سے نکل کر حقیقت ہوا، جب ہیئت کے بجائے مواد کسی فن پارے کی اہمیت کی بنیاد قرار پایا جب صرف گل و بلبل، عارض و رخسار یا دہان و کمر کے بیان کے بجائے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا جانے لگا جب زندگی کے خالص رومانوی تصور کے بجائے سماجی حقیقت نگاری ادب کا موضوع بنی اور بات تسلیم کر لی گئی کہ ادب زندگی اور سماج سے توانائی اور دلکشی حاصل کرتا ہے اور اسی حسن و دلکشی کو پیش کرتا ہے جو ہمارے ماحول، سماج اور زندگی کی دین ہے تو اس وقت تنقید کا پرانا انداز اور فنی پرکھ کا نظریہ بھی تبدیل ہوا۔ یہ نیا نظریہ تنقید وہی تھا جس نظریہ کے تحت نیا ادب تخلیق ہو رہا تھا اور جس کی بنیاد تاریخ، روح عصر اور جدلیاتی مادیت پر تھی''۔۔۔ 8

مارکسی ناقدین کے بارے میں انہوں نے لکھا:

''اردو ادب میں جن ناقدین نے مارکسی نظریات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھی ان میں اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، احتشام حسین، اختر انصاری، سردار جعفری، ممتاز حسین اور محمد حسن، سید محمد عقیل کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناقدین کا ایک اور بڑا حلقہ مارکسی نظریات سے متاثر رہا ہے جس میں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر آل احمد سرور، اختر اورینوی اور

سید محمد عبداللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں"۔

"ترقی پسند ناقدین میں دو طرح کے نقاد ملتے ہیں۔ایک وہ جنہوں نے سختی سے جدلیاتی مادیت اور مارکسی فلسفہ پر عمل کیا دوسرے وہ جو مارکسی نظریات کو وسیع پس منظر میں رکھتے ہوئے ادبی تخلیقات کو اعتدال وتوازن کے ساتھ جانچنے و پرکھنے کے قائل ہیں۔درحقیقت انتہاپسند نقطہ نظر کے ردعمل ہی نے اعتدال پسند تنقید کو جنم دیا جسے سائنٹفک نظریہ تنقید سے تعبیر کیا گیا ہے۔9

بقول شارب ردولوی:

تنقید کے اسالیب میں ادب کا سماجی نظریہ بھی تھا۔ابتداء میں خالص طبقاتی کشمکش، ذرائع پیداوار اور اقتصادی و مادی میکانیت کی شکل میں ابھرا جو ادب کی اقدار معین کرنے کے سلسلہ میں اتنا ہی ناقص تھا جتنا دوسرے متذکرہ اسالیب لیکن کچھ آزمائشوں سے گذر کر اس نے ایک سائنٹفک نظریہ تنقید کو جنم دیا"۔ 10

مزید وضاحت کے ساتھ شارب صاحب لکھتے ہیں:

"مارکسی، سماجی یا عمرانی تنقید اپنی ابتداء میں نظریاتی طور پر خام ہونے کی وجہ سے انتہاپسندی کا شکار رہی۔ادیبوں نے طبقاتی کشمکش کو پروپگنڈہ جنس کو حقیقت نگاری اور مزدور کو فیشن کے طور پر استعمال کیا اور نقادوں نے انہیں بندھے ٹکے اصولوں پر ان کی عظمت کا حکم دیا لیکن رفتہ رفتہ اس میں اعتدال آتا گیا اور وہ سائنٹفک تنقید کی طرف بڑھتی گئی۔ادب پارے کا اندرونی تجزیہ تفہیم اور بازآفرینی، جمالیاتی قدروں کا احساس، ماضی کی صحت مند روایات کا احترام زندگی اور عہد کی تصویر کشی، مادی، تاریخی اور جمالیاتی حقیقتوں اور فنی قدروں کے شعور نے اسے سائنٹفک تنقید کا درجہ دے دیا"۔ 11

بقول شارب ردولوی:

"سائنٹفک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جمالیاتی اور نفسیاتی پہلو بھی نظر انداز نہ ہوں۔سائنٹفک تنقید ادبی تخلیقات اور فنکار سے متعلق تمام مباحث کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی اور مروجہ خیالات کی روشنی میں فنی تخلیق کی اہمیت کا پتہ لگاتی ہے۔ 12

فدا المصطفیٰ فدوی کے مطابق مارکسی تنقید کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1۔"انسان فطری طور پر اقتصادی ضروریات کا پابند ہے اور اس کی ضروریات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔لہٰذا وہی ادب اچھا ادب ہے جو حیات انسانی کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو اور معاشی و اقتصادی مسائل کا حل پیش کرے"۔

2۔مارکسی تنقید فرد کے بجائے جماعت پر زور دیتی ہے اور مارکسی نقاد ادب میں معاشی و معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرتا ہے"۔

3۔مارکسی ادب وتنقید کا انحصار مادیت پر ہونے کی وجہ سے اس میں مذہب، روحانیت اور ماوٗرائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اس میں ہیئت اور اسلوب سے زیادہ مواد کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے اور ادب کے جمالیاتی عناصر سے بھی ایک حد تک چشم پوشی کی جاتی ہے۔اشتراکی تنقید ادب کو پرکھنے کے لئے داخلی اصولوں کو بڑی حد تک نظر انداز کرتے ہوئے خارجی اصولوں سے کام لیتی ہے"۔

4۔مارکس کی جدلیاتی مادیت کے فلسفے پر مبنی یہ مارکسی ادب اور تنقید انسانی ذہن کو ماوٗرائیت کے طلسم سے نجات دلا کر مادی حقائق تک محدود کر دیتے ہیں''۔ 13

شعروادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے تنقیدی اصول ونظریات کا استعمال عملی تنقید کہلاتا ہے۔

عبدالمغنی نے لکھا ہے:

''تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ایک نظری تنقید اور دوسرے عملی تنقید۔نظری تنقید وہ ہے جس میں اصول تنقید سے بحث ہوتی ہے اور ایک ناقد کے تصور ادب اور نظریہ تنقید پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔پھر ادب وفن کے عام اصول وقواعد اور افکار وتصورات پر گفتگو کی جاتی ہے۔ادیب اور شاعر کے عمومی مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔عملی تنقید وہ ہے جس میں ادب اور تنقید کے اصول و تصورات اور نظریات وافکار کا اطلاق ادبی تخلیقات کے نمونوں پر کیا جاتا ہے اور تجزیہ وتبصرہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ نمونے کن اوصاف اور اقدار ومعیار کے حامل ہیں اور تاریخ ادب میں ان کی کیا قیمت وحیثیت متعین ہوتی ہے۔

---آئی اے چرڈس نے اپنی تنقیدی تصنیف پریکٹیکل کریٹی سزم یعنی عملی تنقید میں اس عملی تنقید کے باضابطہ نمونے پیش کئے ہیں جو منفرد ادب پاروں کے تجزیہ پر مبنی ہیں''۔ 14

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے اپنے ایک مضمون ''عملی تنقید: ایک مطالعہ'' میں عملی تنقید کے ان رہنمایانہ اصولوں سے بحث کی ہے جو مغرب میں رائج ہیں۔

اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

1۔''عملی تنقید میں فن پارے کے تھیم (Theme) پر غور کیا جاتا ہے۔عملی تنقید میں اس مرکزی خیال تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ادیب زندگی کی صداقتوں کا تجربہ کر کے اس کی قدریں تخلیق کرتا ہے۔نقاد کا کام ان قدروں کو سمجھنا اور ترتیب دینا ہوتا ہے''۔

2۔زندگی حادثات وتغیرات سے عبارت ہے جو زماں ومکاں کے پردے پر رونما ہوتے ہیں۔یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وقوعہ (Juncture) کس وقت ہوا؟ کس جگہ ہوا؟ کب ہوا اور اس کے محرکات کیا تھے یعنی اس میں واقعات کا زمانی و مکانی پس منظر اور پیش منظر دونوں دیکھے جاتے ہیں۔

3۔زیر نظر فن پارے میں کس پہلو، کس حقیقت یا زندگی کے کس رخ کو اجاگر کیا گیا ہے۔کس چیز پر بل دیا گیا ہے، کس امر کی صراحت کی گئی ہے۔مثلاً اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی عملی تنقید کے دوران ہم یہ دیکھتے ہیں۔اس نظم میں شاعر نے مسجد قرطبہ پر Stress نہیں دیا ہے بلکہ اس کا Stress فن اور عشق پر ہے جس کا ایک مظہر مسجد قرطبہ ہے۔اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آہنگ صرف شعر میں ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آہنگ کا وصف نثر میں بھی ہوتا ہے۔تخلیق کار الفاظ کی نشست کے ذریعہ آہنگ پیدا کرتا ہے۔اس نشست اور الفاظ کو قواعد کے اعتبار سے بھی درست ہونا چاہئے۔شاعر جس طرح کا تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اس تاثر کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔آہنگ، اوزان، بحور، قوافی، تکرار قوافی، انفی آواز، مصوتوں اور مصمتوں کے استعمال سے پیدا کیا جاتا ہے۔منظر، موضوع، کردار اور جذبات وغیرہ سے آہنگ کا مطابقت رکھنا ضروری

ہے"۔

4۔"قواعد لفظ کے صرفی اور نحوی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔لغت الفاظ کے معنی کا تعین کرتی ہے لیکن لفظ میں کتنی وسعت، پھیلاؤ، گہرائی، گیرائی، تاثیر ہے اور الفاظ کا باہمی ربط کیا ہے یہ ہمیں Lexics سے پتہ چلتا ہے"۔

5۔"یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادب پارے میں جو لفظ یا الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے کس قسم کا لہجہ Tone ترتیب پاتا ہے۔لہجہ کئی قسم کا ہوتا ہے جیسے استفہامی/استعجابی/طنزیہ/فریادی/اشاراتی/رمزیہ/بیانیہ اور ڈرامائی وغیرہ۔عملی تنقید میں ہم کسی فن پارے میں فن کار کے لہجہ کا بھی تجزیہ کرتے ہیں"۔

6۔تخلیق کے پیچھے خالق کا کوئی نہ کوئی قصد یا Intention ضرور ہوتا ہے۔اذیت رسانی یا جذبات کو مشتعل کرنا زیادہ اچھا قصد نہیں ہے البتہ جذبات کی تطہیر یا جذبات کا تزکیہ کرنا (Catharsis) اعلی درجہ کا قصد ہے"۔

7۔"ڈکشن Diction میں شاعر و ادیب کی لفظیات سے بحث کی جاتی ہے۔لفظوں کی انتخابیت Diction کہلاتی ہے۔اس پر تجسس اور Feeling کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ڈکشن کے ذریعہ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جس شاعر یا ادیب کا ڈکشن ہے اس کی حس کیسی ہے؟ قوت حاسہ کتنی تیز ہے؟ لطیف ہے یا کثیف ہے؟ محسوسات کس انداز کے ہیں؟ Perverted حس کی انتخابیت Perverted ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی کجروی کا پتہ چل سکتا ہے۔ڈکشن میں الفاظ کی انتخابیت کے علاوہ شاعر/ادیب کی لفظیات میں پھیلاؤ Extention، عمق Depth، تناؤ Tention پیدا کرنے کے طریقوں اور لفظ کی حالتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ہر لفظ یا تو سکونی حالت Synchronic ہوگا یا متحرک Diachronic۔خود اپنی جگہ معنی دیتا ہے یا معنی کے لئے دوسرے لفظ کا محتاج ہے۔ڈکشن میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو لفظ استعمال ہو رہا ہے وہ تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔پھر اس کے ساتھ لفظوں کی گونج اور ارتعاش Echo اور لفظوں کی تجسیم Body Images اور تمثال اور پیکریت کا بھی تجزیہ اور تشریح کی جاتی ہے۔

8۔عملی تنقید میں نثری تخلیقات کے لئے جملہ Sentence کو اکائی/وحدت بنا کر ان کا بھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔جملوں کے تجزیہ میں جملوں کی ترتیب/جملوں کا دروبست/جملوں کا نظم اور ان کی موزونیت کو پرکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ جملوں میں خیالات کی ترتیب و تشکیل اور ان کی تنظیم پر بھی نظر کی جاتی ہے"۔

9۔"عملی تنقید کے مغربی اصولوں میں ایک اصول نہیں ملتا وہ ہے صنفی خصوصیات کا مطالعہ جو کہ اردو ادب پاروں کی عملی تنقید میں ناگزیر ہے یعنی اگر ہم غزل کی عملی تنقید کر رہے ہوں تو صنف غزل کی روایات اور خصوصیات بھی پیش نظر رکھیں گے۔اسی طرح مرثیہ یا نثر میں افسانہ یا ناول وغیرہ کی منفرد و مخصوص صنفی خصوصیات ہوتی ہیں۔عملی تنقید میں ان صنفی خصوصیات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔صنفی خصوصیات کے تحت مواد اور ہیئت کی بحثوں کو سمیٹنا ہوتا ہے"۔ 15

مذکورہ بالا عملی تنقید کے رہنمایانہ اصولوں کی وضاحت کے بعد ڈاکٹر محمد نسیم الدین نے ایک بہت اہم بات کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ فن پارے کو ہر پہلو اور ہر زاویہ نظر سے دیکھا جائے تا کہ اس کا کلی وجود اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے۔وہ رقمطراز ہیں:

''جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی ایک کلی وجود ہے اس کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا تو پھر ہم یہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ تنقید کا کوئی دبستان کسی تخلیق یا فن پارے کی مکمل تنقید نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ادب زندگی کا آئنہ ہے تو زندگی کی طرح اس کو بھی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی جس طرح زندگی صرف روحانیت یا مادیات نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ زندگی صرف عقلیات سے، صرف جذبات، صرف معاشیات،، صرف جمالیات، صرف نفسیات نہیں ہے بلکہ ان سب کا مجموعہ ہے۔ بعینہ ادب ہو یا کوئی اور فن پارہ کسی ایک دبستان تنقید کے اصولوں سے اس کا مطالعہ اور تنقید ناقص ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر پہلو اور ہر زاویہ نظر سے اس کو دیکھا جائے اور ہر سمت سے اس پر روشنی ڈالی جائے تا کہ اس کا وجود خانوں میں نہ بٹ جائے بلکہ اس کا کلی وجود اپنی تمام تر صداقتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے۔ 16

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے آئی اے رچرڈز کے تنقیدی نظریہ کلی تنقید Total Criticism کی وضاحت کرتے ہوئے اسے فن پارے ہی کی تنقید نہیں بلکہ زندگی کی تنقید بتلایا۔ وہ رقمطراز ہیں:

''آئی اے رچرڈز کے عملی تنقید کے تصور سے تنقید کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے وہ ہے کلی تنقید Total Criticism کا تصور۔ یعنی کسی ادب پارے کی عملی تنقید میں دبستان انتقاد کے اصولوں کو پیش نظر رکھیں اس میں کلاسیکی روایات بھی ہوں، رومانی آزادی، فکر و انفرادیت بھی، جمالیاتی جذبہ بنشاطِ حسن بھی ہو اور تاثراتی اثر پذیری بھی۔ مارکسی طبقاتی کشمکش پر بھی نگاہ ہو تو تحلیل نفسی کے اصولوں کے تحت فن کار کی نفسیات کی گرہ کشائی بھی کی جائے۔ اس طرح جو تنقید وجود میں آئے گی وہ واقعتاً ادب کی تنقید نہیں بلکہ زندگی کی تنقید ثابت ہوگی''۔ 17

آئی اے رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔ پہلی خوبی اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ دوسری خوبی ہے تجربات اور احساسات میں امتیاز کرنا تا کہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، جبکہ تیسری آخری خوبی ہے قدروں کا انباض ہونا۔ 18

سردار جعفری نے اپنے نقاد نہ ہونے کا اعتراف کیا:

''حقیقتاً میں نے نقاد کی فرائض انجام نہیں دیئے ہیں کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعوی نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے قریبی تعلق رہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کردیا ہے''۔ (سردار جعفری، ترقی پسند ادب)

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے۔ میرے لئے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے''۔

میں جس نظریہ جمال اور نظریہ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گذشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے میں نے اسی نظریہ سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں''۔ 19

''نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور پر یوروپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر، وہ میری تربیت نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ رومی بھی ہیں، حافظ بھی ہیں ۔۔۔۔ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکوں، تلاش کر سکوں، اپنی شاعری کی تربیت کے لئے''۔

(افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر)

18 اپریل 1990 کو ممبئی میں راہی معصوم رضا کو انٹرویو دیتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے بڑے شعراء کا جائزہ اس لئے لیا کہ وہ اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکیں۔

''میں ہمیشہ، بار بار یہ لکھتا رہا ہوں، کہتا رہا ہوں، پھر کہہ رہا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں۔ اس لئے کہ نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور سے یوروپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ وہ میری تربیت میں نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ میرا بائی بھی ہے۔ رومی بھی ہیں، حافظ شیرازی بھی ہیں۔ میں نے بار بار لکھا کہ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لئے معیار بنا سکوں۔ تلاش کر سکوں اپنی شاعری کی تربیت کے لئے''۔ 20

سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضمون ''کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت'' کی شروعات ہی ایک ایسے اعتراف سے کی ہے اور پھر اپنے تنقیدی مطالعوں کی غرض و غائت بھی بیان کی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

''پہلے تمہید کے طور پر ایک حرف معذرت۔ میں اپنا شمار نقادوں میں نہیں کرتا۔

میں اس ڈسپلن اور اس ٹریننگ سے بے بہرہ ہوں۔ بعض مغربی نقادوں کو پڑھا ضرور ہے جن کے حوالہ اکثر ہمارے نقادوں کی تحریروں میں بھی عام ہیں۔ اگر میں نے کبھی کوئی ایسی چیز لکھی ہے جس پر تنقید کا شبہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے شاعرانہ ورثہ کو خود تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔ میں نے آج تک کسی ناول نویس یا افسانہ نگار پر ایسے مضامین نہیں لکھے جیسے اپنے بزرگ شعراء پر لکھ چکا ہوں جن کا مقصد ان کے فن کے آئنہ میں اپنے فن کی صورت دیکھنے کوشش کی ہے۔ 21

محمد ایوب واقف نے سردار جعفری کی قابلیت کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری کے مطالعہ کی وسعت اور گیرائی و گہرائی کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف اردو شعر و ادب کا ہی عمیق مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ عالمی ادب پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ادب کے علاوہ مذہبیات، سیاسیات، عمرانیات، سماجیات اور اقتصادیات سے متعلق امور میں بھی وہ درک رکھتے تھے۔ ان کے مطالعہ اور حافظہ کا زور (Pursuance) واقعتاً اپنے آپ میں بے نظیر تھا۔ اس کے باوجود اپنے بعض احباب میں بلاشبہ کوپی چندنا رنگ شامل تھے''۔ 22

تصانیف

1۔مخدوم محی الدین:

سردار جعفری نے 64 صفحات پر مشتمل کتاب ’مخدوم محی الدین‘‘ لکھی جسے 1948ء میں پہلی بار کتب پبلشرز ممبئی نے شائع کیا۔ پہلے حصہ میں مخدوم سے متعلق ’’مخدوم سرخ سویرے کا شاعر‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون ہے اور دوسرے حصہ میں مخدوم کی چھ نظمیں اندھیرا، جنگ، آزادی، اسٹالن، انقلاب، ٹوٹے ہوئے تارے اور حویلی شامل ہیں۔اس کتاب کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

’’34 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پہلے حصہ میں سردار جعفری نے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے جس میں انہوں نے مخدوم کی شاعری، قومی و بین الاقوامی صورتحال نیز تحریک آزادی کی سمت و رفتار پر روشنی ڈالی ہے۔مخدوم کی رومانیت سے انقلابیت تک کے سفر اور حیدرآباد تحریک سے ان کی وابستگی کا بھی ذکر کیا ہے۔

اقبال، ٹیگور اور مخدوم کا موازنہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

’’اقبال اور ٹیگور کے مقابلہ میں مخدوم کی شاعرانہ حیثیت کچھ بھی نہیں۔۔۔پھر بھی اقبال اور ٹیگور کی نظم اور گیت کا ہندوستان چھوٹا اور محدود ہے۔وہ دنیا کے نقشہ میں ایک الگ جغرافیائی وحدت ہے لیکن مخدوم کی ’’جنگ آزادی‘‘ کا ہندوستان وسیع اور بے کنار ہے۔اس کی سرحدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔اس کی آزادی کے سپاہی صرف ہندوستانی نہیں بلکہ امریکی، فرنگی، چینی، روسی بھی ہیں اور اس کی آزادی کے سرخ سویرے کا گلنار پرچم مشرق و مغرب میں ایک ساتھ لہراتا ہے۔اقبال اور ٹیگور کی نظموں کی محرک ہندوستان کی قومی آزادی تھی، مخدوم کی نظم کی محرک ساری انسانیت کی بین الاقوامی جدوجہد ہے‘‘۔

عمر رضا نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’مضمون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ 1937ء میں اسپین کی خانہ جنگی میں رالف فوکس اور کرسٹوفر کاڈویل نے عوامی لڑائی میں لڑتے ہوئے فرانکو کی فاشزم کی قربان گاہ میں جس طرح اپنی جان دے دی تھی اس سے سردار جعفری کس قدر متاثر تھے اور کس طرح ان کے دل میں ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربیت کے خلاف لڑ کر جان دینے کی امنگیں بار بار جوان ہو رہی تھیں۔۔۔

انہوں نے لکھا:

’’ہمارا پورا نیا ادب گروپ اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ہم نے اسی زمانہ میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل، ریلف فاکس اور جان کرافورڈ کے حالات پڑھے تھے اور ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں‘‘۔ 24

2۔دراصل اس زمانہ میں سردار جعفری بیحد جذباتی تھے اور ظلم و ستم کے خلاف بغاوت کر کے اسے نیست و نابود کرنے کی

مختلف تدابیر پیش کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ادب میں مایوسی اور بے چارگی کے اظہار کو برداشت نہیں کرتے تھے۔اس زمانہ میں کئی اچھے شاعر وادیب ان کے اس عتاب کا شکار ہوئے مثلاً اقبال،فیض،فراق اور منٹو وغیرہ۔اس زمانہ میں سردار جعفری نے ان شاعروں اور ادیبوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جن کے کلام میں انقلابیت،گھن گرج،ظلم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اور اسے نیست ونابود کردینے کا عزم پایا جاتا تھا۔

چنانچہ مخدوم کو مذکورہ پس منظر ہی میں دیکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''اس دنیا کے مظلوم محنت کشوں کے جھنڈے کے نیچے آکر دم لیا ہے جس کی چھاؤں میں وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ایک نئی زندگی کی تعمیر کررہا ہے''۔ 25

3۔''۔۔۔لیکن اس کے ساتھ ہی سردار جعفری نے مخدوم کی جگہ جگہ نکتہ چینی بھی کی ہے اور ان کی شاعری پر بہت سے سوالات قائم کئے ہیں مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ مخدوم نے سامراجی جنگ پر کوئی نظم نہیں کہی اور کہی ہے تو اس میں اداسی اور افتادگی ہے۔اس میں انقلابی آگ نہیں ہے،محض خواہش ہے کہ سویرا ہوجائے ورنہ ابھی تو کہیں سویرے کے آثار نظر نہیں آتے۔درد ہے،دکھ ہے،تکلیف کا احساس ہے لیکن وہ اعتماد ویقین اور حوصلہ نہیں،وہ آن بان اور جوش وخروش نہیں جو انقلابی شاعری کی شان ہے۔۔۔''

4۔''۔۔۔مضمون میں جو بھی بحث کی گئی ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سردار جعفری اس زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی کے مبلغ تھے اور مارکس،انگلز،لینن،اسٹالن،اشتراکیت اور روس سے وہ گہری محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ان تمام چیزوں نے مل کر سردار کے مزاج کو انقلابی اور باغیانہ قسم کا بنادیا تھا۔نہ صرف یہ کہ وہ انقلاب پسند تھے بلکہ ایسے ادب کی وکالت کرتے تھے جو ظلم وناانصافی کو ختم کردینے کا عزم وحوصلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ جب مخدوم کی نظموں میں انہیں ایسے عزائم اور حوصلہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو مخدوم پر بھی وہ نکتہ چینی کرنے سے گریز نہیں کرتے''۔

5۔''۔۔۔کتاب کے دوسرے حصہ میں مخدوم کی تقریباً ان انقلابی نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا جن میں آزادی کا جذبہ،ظلم وبے انصافی سے نفرت اور اس کو ختم کردینے کا عزم پایا جاتا ہے۔مثلاً ''اندھیرا'' میں سرمایہ دارانہ قوتوں کے سبب پیدا ہوئے ایسے سماج کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں خندقیں ہیں،باڑ کے تاروں میں الجھے ہوئے ہاتھ،پاؤں،کٹی انسانوں کی لاشیں ہیں،جن پر گدھ منڈلا رہے ہیں،شب کے سناٹے میں بچوں اور ماؤں کے رونے کی صدائیں ہیں،غرض ہر طرف نوحہ ونالہ وفریاد ہے اور ماتم کی صدا گونج رہی ہے۔۔۔۔نظم ''جنگ آزادی'' میں آزادی کی جنگ کو دہقانوں،مزدوروں،محکوموں اور مجبوروں کی جنگ بتا کر انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔نیز دنیا کے تمام مزدوروں کو متحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور ایسی دنیا پر سوالیہ نشان لگادیا گیا ہے جس میں مزدوروں کی حکومت نہ ہو''۔۔۔ 26

(عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 331 تا 336)

ترقی پسند ادب

سردار جعفری کی تنقید نگاری کے آغاز اور ان کی پہلی با قاعدہ تنقیدی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' (پہلا ایڈیشن 1951) کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری یوں تو زمانہ طالب علمی سے ہی ادبی مسائل پر سوچنے اور لکھنے لگے تھے لیکن ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز 1950ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے اولین سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی اور خود سردار جعفری اس کے ایک نمائندہ اور ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے تھے''۔۔۔۔

2۔ ''۔۔۔۔جب ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' شائع ہوئی تو اگر ایک طرف ترقی پسند حلقہ سے باہر اسے ترقی پسند تحریک اور نظریات کا ترجمان سمجھا گیا تو دوسری طرف خود ترقی پسندوں کے مخصوص حلقہ میں اسے متنازعہ دستاویز کا درجہ حاصل ہوا اور یہ فطری بھی تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک ترقی پسند ادبی نظریات کے خط و خال واضح نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے تصورات سیال اور اختلافی تھے اور ان پر غور و خوض اور بحث کا سلسلہ جاری تھی لیکن تحریک کی شیرازہ بندی اور اشاعت کی خاطر یہ خطرہ تو کسی نہ کسی کو مول لینا ہی تھا۔ سردار جعفری چونکہ ابتداء ہی سے اس تحریک کے فعال رکن تھے اور اس کی دستاویزوں اور جرائد کی تسوید و ترتیب میں وہ اہم رول ادا کرتے تھے۔ اس لئے یہ قرعہ فال ان کے نام ہی پڑا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ترقی پسند ادب و تحریک کے بنیادی کلیدی تصورات کی تفہیم و تعبیر کا سوال تھا انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے''۔۔۔

3۔ اس تصنیف کے محرکات خود جعفری کے نزدیک کیا رہے ہیں؟

''میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے اس لئے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے''۔

''اس وقت تک (ترقی پسند ادب کی اشاعت) سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین میں جس نئے تنقیدی شعور کے نقوش ابھارے تھے سردار جعفری نے اسی کو ایک واضح تر اور اصولی نظم و ضبط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی''۔۔۔27

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ''ترقی پسند ادب'' کے محرکات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی یہ کتاب ایک حلقہ میں متنازعہ فیہ رہی ہے۔ کہا گیا کہ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کا غیر جانبداری سے نہیں ایک طرفہ اور سفارتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے کسی جج کے نہیں وکیل کے فرائض انجام دیئے۔ یہ بات کسی حد تک درست سہی لیکن ایسا ضروری بھی تھا کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد تحریک کو عوام سے متعارف کرانا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا تھا۔ ویسے اس پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہئے کہ لکھنے والا کٹر ترقی پسند ہے''۔۔۔۔ 28

سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب کے بارے میں محمد اجمل خاں نے لکھا ہے:

1۔ ''یہ کتاب سردار جعفری کے تنقیدی نظر اور شعور کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے''۔

اس کتاب کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد اجمل خاں نے لکھا ہے:

2۔انہوں (سردار جعفری) نے یہ نثری کتاب اس وقت تحریر کی جب ترقی پسند تحریک پر مختلف سمتوں سے حملے شروع ہوئے تھے۔ ہر اچھے اور برے ادب کو ترقی پسند ادب سمجھ لیا گیا تھا۔ نیا ادب اور ترقی پسند ادب ہم معنی سمجھے جانے لگے تھے۔ اس پر فحش نگاری اور بے معنی پروپگنڈہ کا بھی الزام تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا تھا۔اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ عوام کو ترقی پسند تحریک کے بارے میں بتایا جائے۔ ترقی پسند تحریک پر اعتراضات اور مخالفت کے جوابات سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، سبط حسن، فیض احمد فیض اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین کے ذریعہ دیئے اور ترقی پسند ادب کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی۔عزیز احمد نے ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔اس کے علاوہ پنڈت کشن پرشاد کول کی کتاب ''نیا ادب'' بھی شائع ہوئی۔لیکن سردار جعفری جو کہ ان سب سے زیادہ فعال اور سنجیدہ لگن رکھنے والے ترقی پسند شاعر اور ادیب تھے اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کے بھی ماہر تھے اور بحث ومباحثہ کے بھی عادی تھے اور اپنی بات کو دلائل پیش کر کے دوسروں کو منوانے کے بھی ماہر تھے، دوسرے لوگوں کے مضامین سے انہیں اطمینان نہیں ہوا اور خود ہی ''ترقی پسند ادب'' لکھنے کا فیصلہ کیا۔یہ نثری کتاب پڑھ کر ان کے تنقیدی نقطہ نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے ترقی پسند ادب کی ابتداء، ارتقاء، خامیاں، خوبیاں، اس کی ضرورت اور اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ترقی پسند ادیبوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔زیادہ تر سے کچھ معاملوں میں اختلاف بھی کیا جن میں جوش اور اقبال بھی شامل ہیں جس کے لئے ان پر سخت تنقید کی گئی۔بعد میں 'اقبال شناسی'' کتاب میں اپنی تنقید پر نظر ثانی کر کے اس کا ازالہ بھی کیا۔سردار جعفری نے اس کتاب کا خاکہ 1949ء میں سنٹرل جیل ناسک میں بنایا تھا۔بعد میں اسے ستمبر 1950ء میں قاضی عبدالغفار کے کہنے پر لکھنا شروع کیا اور ڈیڑھ برس میں اسے پورا کرلیا''۔۔۔

3۔ترقی پسند تحریک میں شمولیت کے لئے وہ ایک اصول وضع کرتے ہیں اور وہ ہے ادب میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنا''۔

4۔اس کتاب کے بعد انہوں نے دوسری جلد ترقی پسند شاعری، تیسری جلد ترقی پسند افسانہ اور چوتھی جلد ترقی پسند تنقید کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن بعد میں یہ ارادہ ختم کردیا۔29

ترقی پسند ادب کے حرف اول میں سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد اور اس تحریک کے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔انہوں نے انسانوں اور انسانیت سے بے پناہ خلوص ومحبت کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے موجودہ حقیقت کا مطالعہ ضروری ہے جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔سماجی کشمکش اور اس کی جڑوں تک پہنچنا ضروری ہے اور ان عوام کے ہاتھ دینا ضروری ہے جو ہمارے خوابوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے

تراش کر حقیقت کا حسین اور پرشکوہ مجسمہ تیار کریں گے۔اور یہ کام بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔اس کے لئے اس سوز و گداز کی ضرورت ہے جو انسانوں سے بے پناہ محبت اور خلوص پیدا ہوتا ہے جو عوام کے دلوں کی دھڑکنوں میں کھو جانے کے بعد بھی حاصل ہوتا ہے۔اس کے لئے اپنے کتب خانوں، شیش محلوں سے باہر نکلنے اور شہرت اور عظمت کے بلند میناروں سے نیچے اتر کر انسانیت کے وسیع سمندر میں تیرنا ضروری ہے۔ 30

سردار جعفری نے مزدوروں کے مسائل پر لکھنے کے لئے اسلوب، موضوع، ہیئت کی اہمیت اجاگر کی اور مظلومی، مفلسی، ناداری کے اسباب کا پتہ لگانے پر زور دیا۔

''ہمیں مزدوں کے مسائل کے بارے میں لکھنا ہے لیکن اس طرح کہ ادب اور فن کی بلند سطح باقی رہے۔۔۔۔ہم ادیب ہیں اور ہمارا کام ادب کی تخلیق کرنا ہے۔اگر ادب میں فن ہی ہاتھ سے چلا گیا تو کیا باقی رہ جائے گا؟ محض برہنہ موضوع، نعرہ بازی اور پروپگنڈا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب غیر شعوری طور سے اس ہیئت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے جس کے لئے ہم رجعت پرستوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں''۔۔۔یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ تم مظلوم ہو، ان کی مظلومی، مفلسی اور ناداری کے اسباب کا پتہ لگانا پڑے گا۔۔۔۔سماج کی پوری ساخت، اس کی حرکت اور جنبش کو سمجھنا ضروری ہے۔۔۔۔تب ہم وہ ادب پیدا کر سکیں گے جو مزدوروں کے لئے ہوگا جس کی زبان آسان اور عام فہم، انداز بیان سیدھا سادا اور پرجوش، ہیئت خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ہوگی''۔ 31

علی رضا نے سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

1۔یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے منٹو کو رجعت پسند اور حسن عسکری کو فاشسٹ قرار دیا ہے اور جوش، جگر مرادآبادی، مجروح سلطان پوری، نیاز حیدر اور کرشن چندر وغیرہ کی تخلیقات کو عوام سے قریب تر بتایا ہے۔۔۔علاوہ ازیں اس زمانہ میں ترقی پسندوں پر پروپگنڈہ کا جو الزام عائد کیا جا رہا تھا اس کا بھی انہوں نے دفاع کیا''۔۔۔۔جہاں انہوں نے موضوع کی اہمیت کو سراہا ہے وہیں ہیئت کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔۔۔۔ماضی کے ادب اور بیرونی ممالک کے ادب کے مطالعہ کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔مزید اس سے استفادہ کرنے پر زور دیا گیا ہے جس سے بقول سردار جعفری ''نظر میں گہرائی اور علم میں وسعت پیدا ہوتی ہے''۔بالخصوص ماضی کے ادب کو انہوں نے بہت بڑا خزانہ قرار دیا ہے''۔ 32

2۔تیسرے باب میں ترقی پسند تحریک کے تاریخی پس منظر کو پیش کیا گیا۔اس کے تحت 1857ء کے بعد کے ان ادبی حالات و رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے جو ترقی پسند تحریک کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئی تھیں۔۔۔۔ترقی پسند ادب میں اقبال سے متعلق سردار جعفری نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔''اقبال کی شاعری سرسید، حالی اور شبلی کی روایات کا امتزاج ہے لیکن علم و فن کی سطح زیادہ بلند ہے۔اقبال کے نزدیک وہ شاعری مہمل اور بے معنی ہے جو کوئی پیام لے کر نہ آئی ہو، اقبال کا پیام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے الجھاؤ سے آزاد نہ ہو سکا۔اس لئے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا ہو۔اقبال کی شاعری کی ابتداء حب وطن اور سامراج دشمنی کے جذبہ سے ہوئی ہے اور یہ جذبہ آخر وقت تک باقی رہتا ہے۔خودی کی بنیاد، عینیت کے فلسفے اور ہیگل کی

جدلیت (Dialectics) پر ہے جس کو اقبال نے اسلامی فلسفہ اور روایات سے تقویت پہنچائی۔ اقبال نے اس خودی کو مردِ قلندر اور شاہین کا پیکر محسوس کیا ہے اور ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی ساری خصوصیات اس کے اندر بھر دی ہیں لیکن انقلابی طبقہ سے علیحدگی کی وجہ سے جو سنہ 1920ء کے بعد سے تحریک آزادی کا سب سے بڑا اہم حصہ بن گیا تھا۔ یہ دونوں علامتیں ابھرتے ہوئے بورژوا کی خصوصیات سے پاک نہیں رہ سکیں۔ اقبال نے اپنے اس شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی حالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ و ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ اقبال کا مستقل تضاد ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جس حسین و جمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ان کا فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد کرتا ہے۔ اس لئے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ان فلسفیانہ شخصیت سے الگ کر کے کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں اور فلسفی چھوٹے"۔ 33

سردار کی اقبال سے متعلق مذکورہ بالا رائے پر عمر رضا نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

3۔ "تیسرے باب کا زیادہ حصہ اگر چہ اقبال کے لئے وقف ہے اور اقبال کی شاعری پر بہت ہی تفصیل سے بحث کی گئی ہے لیکن اقبال کے متعلق کچھ ایسی باتیں بھی رقم کر دی گئی ہیں جس سے سردار جعفری کی ناپختہ تنقید کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں مختلف نقادوں نے اقبال کے حوالہ سے ان کی اس طرح کی بچکانہ اور مفتیانہ تنقید کی خوب مذمت کی تھی جس کا بعد میں سردار جعفری کو بخوبی احساس ہوا اور انہوں نے اقبال کا از سر نو مطالعہ اپنی ایک اہم کتاب "اقبال شناسی" میں پیش کیا۔۔۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ تیکھی اور بچکانہ باتوں کے باوجود سردار جعفری نے اقبال کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان مباحث کے بعد ان کی شاعری کے ترقی پسند پہلوؤں کی بھرپور نشاندہی کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

اقبال نے فن برائے فن کے رجعت پرست نظریہ کی بڑی شدت سے مذمت کی اور اسے افیون کی چسکی قرار دیا اور کہا کہ یہ ہم سے زندگی اور قوت چھین لینے کا ایک عیارانہ حیلہ ہے۔ اقبال نے آرٹ اور شاعری پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ جد و جہد حیات میں ہمارا ساتھ دے اور جس وقت ہمارے قویٰ کمزور ہو رہے ہوں ہمارے اندر ولولہ اور امنگ پیدا کرے۔

ہیئت پرستی کے بھی سخت دشمن تھے۔ ان کے نزدیک زبان صرف معنی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے اصل اہمیت موضوع کی ہے اور سب سے اچھی وہ ہیئت ہے جو موضوع کو موثر طریقہ سے ادا کر سکے۔ موضوع کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ صحت مند ہو اور قوم اور معاشرہ کے لئے مفید ہو۔ اقبال نے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا اور انسان کا جو عظیم الشان تصور دیا ہے وہ پہلے کے اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا۔ 34

"یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے اقبال کی شاعری کو عظیم اور اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچانے والا بتایا اور اخیر میں یہ لکھا کہ "اقبال نے۔۔۔ اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعری کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں"۔ 35

4۔ پانچویں باب کے آخر میں انہوں نے ترقی پسند مصنفوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''یہ کامیابیاں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی ہیں۔اس کے لئے ترقی پسند مصنفوں نے دکھ جھیل کر، افلاس کی مصیبتیں برداشت کر کے اور قربانیاں دے کر جدوجہد کی ہے۔کتنے ہی ادیبوں کی کتابیں اور تحریریں ضبط ہوئی ہیں۔کتنے ہی رسائل پر پابندیاں لگائی گئی ہیں۔کتنے ہی ادیبوں نے لاٹھیاں کھائی ہیں۔بندوقوں کی گولیوں کا مقابلہ کیا ہے اور جیل خانوں میں دن گذارے ہیں۔سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، رشید جہاں، سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، ممتاز حسین، غلام ربانی تاباں، خلیل الرحمٰن اعظمی، ہنس راج رہبر، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری، سلیمان اریب، سید مطلبی فرید آبادی، علی جواد زیدی، ظہیر بابر، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، پرویز شاہدی، عبداللہ ملک اور بہت سے دوسرے ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے عقائد کی وجہ سے برسوں جیلوں میں پڑے رہے ہیں تب کہیں جا کر وہ ادب پیدا ہوا ہے جس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں، عوام کے جذبات اور تاریخ کا خون ہے''۔ 36

ترقی پسند ادب میں ترقی پسند تحریک کی پندرہ سالہ کارکردگی اور کتاب کی اشاعت 1951ء تک تخلیق کردہ ادب پر بحث کی گئی ہے۔سردار جعفری کی عوامی ادب کی ضرورت، ابہام سے گریز، عام فہم اسلوب کی ضرورت، حالی، شبلی کے تنقیدی کارناموں کی ستائش پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

1۔ترقی پسند تحریک کے تحت لکھنے والے ادیبوں کا سردار جعفری نے میکانکی انداز میں جائزہ لیا ہے۔اس کے لئے انہوں نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد ''انسانیت اور آزادی کی جدوجہد'' کو پیش نظر رکھا ہے۔بالخصوص عوامی ادب کی تخلیق پر زور دیا ہے اور ابہام کو زہر قرار دیا ہے۔اس بات پر سب سے زیادہ زور صرف کیا گیا ہے کہ محض مزدوروں کے مسائل کے متعلق لکھا جانے والا ادب ہی کافی نہیں بلکہ مزدوروں کے لئے لکھنا بھی ضروری ہے۔اس کے لئے مزدوروں اور عام انسانوں کی فہم کے مطابق الفاظ، تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کا استعمال ترقی پسند ادب کی بنیادی شرط ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس ادیب میں بھی سردار جعفری کو ابہام نظر آیا، اس پر سخت تنقید کی۔مثلاً منٹو، عصمت، حسن عسکری جیسے ادیب۔علاوہ ازیں ترقی پسندوں پر پروپگنڈہ کا جو الزام عائد کیا جارہا تھا اس کا بھی دفاع کیا۔۔۔۔''

2۔''۔۔۔سردار جعفری نے اپنی کتاب میں حالی، شبلی اور اقبال کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرنے بعد انہیں ترقی پسند کہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے لئے خام مواد فراہم کیا۔بالخصوص اقبال کے تصورات کی خوب تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ''اقبال نے ان تصورات سے اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعر کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ہم اس سرمایہ کی قدر کرتے ہیں اور اس کے لئے اقبال کا بے انتہا احترام ہمارے دل میں ہے۔اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔۔ 37

چنانچہ پوری کتاب میں پندرہ سال کے دوران لکھے گئے ادب اور ترقی پسند تحریک کی سمت و رفتار کا بڑے میکانکی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے اور ترقی پسند ادیبوں کو وہ ہدایتیں بھی جاری کی گئی ہیں جن کے تحت انہیں اپنی تخلیقات پیش کرنا چاہئے۔ایسے میں کہیں کہیں تنگ نظری کا بھی احساس ہوتا ہے۔دراصل ترقی پسند ادب میں سردار جعفری کا جس طرح کا تنقیدی رویہ نظر آتا ہے وہ سردار کے تخلیقی رویہ کا جواز فراہم کرتا ہے اور وہ رویہ تھا انجمن سے وفاداری بشرط استواری''۔ 38

سردار جعفری نے شعرالعجم جلد چہارم اور مقدمہ شعروشاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''حالی اور شبلی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بار ادب اور تنقید کی بنیاد مادی حالات پر رکھی۔انہوں نے بتایا کہ ادب مادی حالات کے مطابق اپنا چولا بدلتا ہے اور مواد اور ہیئت دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔شبلی نے تو تشبیہوں اور استعاروں کی تبدیلی کے بھی مادی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی (شعرالعجم جلد چہارم)۔اس اعتبار سے حالی کا ''مقدمہ شعروشاعری'' اور شبلی کی شعرالعجم بہت بڑے کارنامے ہیں اور ابھی تک اردو تنقید کی کوئی کتاب ان سے آگے بڑھنا تو درکنار ان کے قریب بھی نہیں آسکی۔ 39

سردار جعفری نے منٹو کے بارے میں لکھا ہے:

''منٹو کے ہیرو مسخ شدہ انسان ہیں اس لئے وہ نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ زندگی کے ارتقاء کی نمائندگی نہیں کرسکتے''۔ 40

ڈاکٹر صادق نے مذکورہ رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

1۔''منٹو کے افسانوں کے بارے میں دونوں ترقی پسند ناقدین (عزیز احمد اور سردار جعفری) کی رائیں مبنی بر حقیقت نہیں ہیں بلکہ ان کے پس پشت ایک خاص قسم کا ذہنی تعصب کارفرما نظر آتا ہے۔منٹو کو پرکھنے کے لئے انہوں نے جو کسوٹی تیار کی ہے اس پر تو ''پوس کی رات'' اور ''کفن'' جیسے پریم چند کے شاہکار افسانے بھی کھرے نہیں اترتے کیونکہ ان کے کردار بھی مسخ شدہ انسان ہیں جو زندگی کے ارتقاء کی نمائندگی نہیں کرتے اور ان کے یہاں بھی انسانیت کا وہ راسخ عقیدہ جس پر بقول عزیز احمد ہر اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے کہیں نظر نہیں آتا''۔

2۔منٹو کے افسانے حقیقت نگاری کی اس روایت کا ایک لاینفک جزو ہیں جو ترقی پسندی کی روایت کے نام سے موسوم ہے''۔

3۔''منٹو نے ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہئے۔ویشیا کو مٹایئے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا''۔ 41

4۔''وہ (منٹو) اپنے گردوپیش کی باریک سے باریک چیزوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے افسانوں میں تاثر پیدا کرنے کے لئے معمولی سے معمولی بات اور انتہائی غیر اہم واقعات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ان سے اپنے افسانوں میں وقت ضرورت کام لیتے ہیں۔ 42

شافع قدوائی نے سردار جعفری کی منٹو پر تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''معاصر ادب کی بارے میں سردار جعفری کے تنقیدی محاکمہ پر بسا اوقات مناظرہ کا گمان ہوتا ہے۔منٹو کی افسانہ نگاری سے متعلق اظہار خیال سردار جعفری کے یک رخی تنقیدی نقطہ نظر کی عبرت ناک مثال ہے۔سردار جعفری نے نہ صرف منٹو کو غلاظت نگار ٹھہرایا بلکہ ان کے افسانوں کو کرشن چندر کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور بے مایہ قرار دیا۔''منٹو اور کرشن کی کہانیوں کا بنیادی فرق یہی ہے کہ منٹو کے ہیرو مسخ شدہ انسان ہیں اس لئے وہ نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ زندگی کے ارتقاء کی

نمائندگی نہیں کرتے۔کرشن چندر کے ہیرو سماج کے ہوشمند اور باشعور معمار ہیں وہ ارتقاء کی ترجمانی کرتے ہیں اس لئے نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں"۔(ترقی پسند ادب صفحہ 16)

منٹو نے مزدوروں کے مسائل پر واشگاف صحافتی اظہار سے گریز کیا نیز اپنے کرداروں کے جنسی افعال واعمال کو وسیع تر انسانی سیاق وسباق میں پیش کیا۔اس ضمن میں سردار جعفری کی رائے ملاحظہ فرمائیں:''مزدور ایک ایسی قوت ہے جو بیسویں صدی کے ہندوستان میں ابھری ہے۔یہ قوت زندگی کے بنیادی حقوق (معاشی اور سیاسی مطالبات) کے ساتھ ادب وتہذیب میں بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے اور سماج اور تاریخ میں اس مطالبہ کو ٹھکرانے کی قوت نہیں ہے اور جو ادیب اس مطالبہ کو ٹھکرانے کی کوشش کرے اس کا وہی حشر ہوگا جو منٹو کا ہو رہا ہے''(ترقی پسند ادب صفحہ 65)۔سردار جعفری کی متذکرہ پیش قیاسی کو ان کی پیشتر پیش گوئیوں کی طرح وقت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔اب منٹو کے افسانوں اور اس کے فنی شعور کی عام طور پر پذیرائی ہو رہی ہے اور کرشن چندر کے نیم رومانی اسلوب پر فراموش کاری کی گہری دھند مستولی ہے"۔ 43

ن۔م۔راشد،میراجی اور اختر الایمان پر سردار جعفری کی تنقید پر شافع قدوائی نے اظہار خیال کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''ن م راشد،میراجی اور اختر الایمان کی شاعری کے بارے میں یہ رائے کہ ان کی شاعری قنوطیت اور کلیت کی مظہر ہے، خامی یک رخی ہے۔ویسے کلیت بھی سماج سے برگشتگی کے اظہار کی ایک شکل ہے جو اکثر صورتوں میں واشگاف اظہار سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے"۔ 44

حسرت موہانی نے آزادی کی جدوجہد میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ان کی شاعری میں ان کے سیاسی عقائد اور جیل کی تکالیف کا عکس نمایاں نہیں ہے۔

علی سردار جعفری نے حسرت موہانی کی شاعری پر تنقید کی۔

اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں انہوں نے لکھا:

''ان (حسرت) کی شاعری پر ان کے سیاسی معتقدات کا اثر بہت کم پڑا۔انہوں نے اپنی شاعری کو غزل تک اور غزل کو زیادہ تر عشقیہ مضامین تک محدود رکھا۔شاذ ونادر ہی انہوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جن میں سماجی زندگی یا سیاسی تصورات کی جھلک ہو اور یہ اشعار بھی ان کے فنی معیار کے مطابق بلند پایہ نہیں ہیں۔

ان میں سب سے اچھی غزل وہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن محو خواب دیکھے کب تک رہے

45

پروفیسر کوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''مزے کی بات ہے کہ سردار جعفری نے حسرت سے زیادہ اہمیت جگر کو دی جن کی شاعری کو اگرچہ انہوں نے سطحی کہا لیکن

جہاں انہوں نے حسرت کا ایک شعر نقل کیا وہاں غزل میں سیاسی عنصر کے ضمن میں جگر کے آٹھ اشعار پیش کیے۔ 46

ہماری تنقید نے حسرت کی سیاسی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین میں بے توجہی سے کام لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسرت نے نہ صرف عاشقانہ شاعری میں تہذیب عاشقی کو زندہ کیا بلکہ باغیانہ شاعری کو بھی تہذیب عاشقی کے آداب سے روشناس کرایا اور غزل کی فضا میں بھرپور طور پر غیر ملکی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ البتہ اس میدان میں ان کا کوئی حریف ہے تو وہ بھی ایسا جس کی غزلیہ شاعری کے سیاسی احساس کو اب تک اسی طرح نظر انداز کیا گیا ہے جس طرح حسرت کو اور وہ ہیں مولانا محمد علی جوہر۔۔۔ان (جوہر) کی غزلوں میں اکثر بیشتر جذبہ حریت اور سیاسی احساس جاری و ساری ہے۔ مولانا اگرچہ بڑے رہنما تھے لیکن حسرت ان سے بڑے شاعر تھے۔ مولانا کا بیشتر کلام بھی زمانہ قید فرنگ کا ہے۔۔۔گمان غالب ہے کہ حسرت کے باغیانہ کلام کی چھوٹ مولانا پر بھی پڑی ہو اور تغزل کے پیرائے میں حب وطن اور تحریک آزادی کی حمایت کا اظہار مولانا کے یہاں حسرت کے اثر سے آیا ہو۔" 47

کلیم الدین احمد نے اپنے ایک مضمون "ترقی پسند ادب پر دو کتابیں" میں علی سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" میں خامیوں کی نشاندہی کی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ "علی سردار جعفری نقاد نہیں ہیں۔ وہ سائنٹفک اور علمی ہونا چاہتے ہیں لیکن جو وہ لکھتے ہیں وہ تنقید نہیں، ایک شاعر کے تاثرات ہیں اس لئے ان کی تنقید افراط و تفریط کا شکار ہو گئی ہے"۔۔۔۔

2۔ "جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی"۔ یہ بھی عام غلط فہمی ہے۔۔۔۔

کمہار مٹی کے برتن بناتا ہے، یہ برتن مفید ہے۔ پھر وہ اس برتن پر کچھ لکیریں بناتا ہے، کچھ نقش و نگار بھی بناتا ہے۔ یہ لکیریں یہ نقش و نگار اس برتن کی افادیت میں اضافہ نہیں کرتے لیکن وہ کمہار ایک اندرونی جذبہ سے مجبور ہو کر ایسا کرتا ہے۔ اس کے جمالیاتی احساس کی تسکین ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کے جمالیاتی احساس کی بھی تسکین ہوتی ہے۔ یہ لکیریں، یہ نقش و نگار مفید نہیں حسین ضرور ہیں"۔

3۔ "وہ شاعر ہیں، نقاد نہیں" وہ کبھی کبھار اپنے تاثرات کو زور و شور سے بیان کرتے ہیں اور اس بیان میں خطابت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو مربوط و مسلسل کر کے کوئی نظام تنقید مرتب نہیں کرتے۔ ترقی پسند تنقید نے تنقید کے فن کو سائنس بنا دیا ہو لیکن "ترقی پسند ادب" میں تنقید نہ تو فن بن پائی اور نہ سائنس۔ اس کتاب میں کام کی باتیں مفید باتیں نہیں ملتی ہیں"۔ 48

سردار جعفری کا خیال ہے ترقی پسند نظریہ شعر اس تصور پر قائم ہے کہ جو چیز مفید نہیں وہ حسین بھی نہیں ہو سکتی۔

سردار جعفری اس جملے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میری مراد حسین موضوع سے وہ موضوع ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی زندگی کو خوبصورت بنایا جا سکے۔ جس کا کوئی سماجی مقصد ہو۔ اسے میں موضوع کی معنویت کہوں گا۔ معنویت حسین نہیں ہوگی تو موضوع حسین نہیں ہوگا اور موضوع حسین نہیں ہوگا تو ادب حسین نہیں ہو سکتا۔ 49

1948-49 میں ترقی پسند تحریک انتہاپسندی کا شکار ہوگئی ۔یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ کون ترقی پسند مصنف ہے اور کون نہیں ۔

سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھا ہے:

''سنہ 49-1948ء کی تنگ نظری اور انتہاپسندی بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ تحریک کے ابتدائی زمانہ میں جب ایک طرح کا رومانی ابال تھا اس میں مختلف قسم کے رجحانات اور نظریات شامل ہو گئے ہیں جن میں بعض قطعاً رجعت پرست اور غیر صحت مند تھے لیکن دس بارہ برس کے دوران سماجی حالات کی پیچیدگی، عوامی تحریکوں کی وسعت اور انقلابی ابال کے ساتھ ساتھ رومانیت کی جگہ حقیقت نگاری آنے لگی تھی اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تحریک میں نظریاتی صفائی پیدا ہو اور غیر ترقی پسند رجحانات اس سے خارج کئے جائیں''۔ 50

بیگ احساس نے لکھا:

''چنانچہ سردار جعفری نے ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، صمد شاہین، ن م راشد، حسن عسکری، ممتاز مفتی، یوسف ظفر، مختار صدا قی وغیرہ پر تنقید کی ۔سعادت حسن منٹو پر خصوصیت سے تنقید کی ۔کرشن چندر، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، رشید جہاں، سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، ممتاز حسین، ہنس راج رہبر، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری، علی جواد زیدی اور عصمت و عباس کو سراہا''۔ 51

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر ڈاکٹر محمد حسن نے اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کے سخت گیر رویہ کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعد میں اتنے شدت پسند نہیں رہے ۔

وہ لکھتے ہیں:

''انہوں (سردار جعفری) نے اسی زمانہ میں ''ترقی پسند ادب'' نام کی کتاب لکھی جو اس دور کی ترقی پسندی کو تقریباً سبھی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے ۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان دونوں نے بڑھ چڑھ کر خود سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری نے کبھی ترقی پسند تحریک پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ۔سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' لکھی بھی تو محض تحریک کے تنظیمی پہلو کو پیش نظر رکھا باقی باتیں ضمنی طور پر تھیں ۔ہاں عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کے نظریہ اور تحریک پر پہلی مستقل کتاب لکھی تھی اور آج بھی اس تحریک پر کسی جائزہ کو منصفانہ اور غیر جانبدانہ کہا جا سکتا ہے تو عزیز احمد کی کتاب ہے ۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند نقادوں کے برعکس ترقی پسندی کا خاصہ سخت گیر رویہ اپنایا ۔حد یہ ہے کہ پریم چند، راشد اور سعادت حسن منٹو بھی ان کی ضرب کلیمی سے نہ بچے ۔بعد کو سردار خود بھی شاید اتنے شدت پسند نہیں رہے تھے جو اقبال سے ان کی غیر معمولی عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے''۔52

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے علی سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر اعتراضات کئے ۔ان اعتراضات پر بہت سے نقادوں نے تبصرے بھی کئے ۔

چند مبصرین کی آراء پیش خدمت ہیں ۔ملاحظہ کیجئے:

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے تبصرے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعتراضات کو معاندانہ رویہ کا غماز اور عصبیت اور جارحیت کی

دلیل بتایا ہے۔

''اس کتاب (ترقی پسند ادب از سردار جعفری) پر سب سے شدید اعتراضات ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے کئے جو 1948ء تک خود بڑے جوشیلے ترقی پسند تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ سردار جعفری کے شعری اسلوب کے سب سے بڑے مقلد بھی تھے جس کا ثبوت ان کی طویل سیاسی نظم ''آئنہ خانہ'' ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ 50-1949ء میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی قید سے رہا ہوئے تو بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی ترقی پسند خیالات سے منحرف اور تائب ہو گئے۔ یہاں یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ڈاکٹر اعظمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں سردار جعفری پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں بیشتر ان دو مضامین کے حوالے سے کئے گئے ہیں جو جعفری نے زمانہ طالب علمی میں یعنی 1936 تا 1939 کے دوران لکھے تھے اور جن میں اختر حسین رائے پوری کی طرح ایک انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اس لئے ان اعتراضات کی نوعیت ایسی ہے جیسے آج ڈاکٹر اعظمی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ان کی طالب علمی کے زمانہ کی سطحی اور جذباتی شاعری کی مثالیں دی جائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ جہاں تک جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کا تعلق ہے ڈاکٹر اعظمی کے اعتراضات ایک سوچے سمجھے معاندانہ رویہ کے غماز ہیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے سردار جعفری کے بعض بیانات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظمی لکھتے ہیں:

''جعفری نے اپنی ذات کا جو طلسم تیار کیا ہے وہ اس خود پسندی اور خود فریبی کو اور بھی آگے لے جاتا ہے۔ چونکہ وہ عوام کے لئے عوام ہی کی زبان سے براہ راست شاعری کرتے ہیں اس لئے ان کو محض فیض ہی پر فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ ہم اپنے بزرگ اساتذہ سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے سننے اور پڑھنے والوں کا حلقہ زیادہ ہے اور آج ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ آرٹ اور ادب زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ سکتا ہے''۔ 53

''جعفری نے اس اقتباس میں ان نئے مادی حالات، تعلیم اور اشاعت اور نئے ذرائع ترسیل کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ادبی تخلیقات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں لیکن ڈاکٹر اعظمی نے اسے جعفری کی نیت اور ذات پر حملہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ کچھ یہی نوعیت ان کے دوسرے اعتراضات کی ہے''۔۔۔ جعفری کے تنقیدی مسلک کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ بیان بھی عصبیت اور جارحیت کی دلیل ہے کہ ''یہ تنقید ترقی پسندی اور شاعری دونوں کو اپنے معیار پر لانا چاہتی ہے تا کہ سب سے اونچے منصب پر جعفری کو فائز کر دیا جائے۔ اس لئے صحت مند سماجی اور نظریاتی رویوں پر اصرار صرف جعفری کی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہ ادعائیت اس زمانہ کی عالمی ترقی پسند تنقید کا عام انداز تھا''۔ 54

سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کو شافع قدوائی نے تعصب پر مبنی قرار دیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب (ترقی پسند ادب) کو قبول عام حاصل ہونے کے باوجود معطون بھی کیا گیا۔ کلیم الدین احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے اس کے مشمولات کو برملا ہدف ملامت بنایا۔ کلیم الدین احمد نے اپنی مخصوص انتہا پسندی اور جارحانہ تنقیدی نقطہ

نظر کے پیش نظر لکھا ''اس میں کوئی خاص نئی بات نہیں ہے۔ مارکسی رنگ کے خیالات ہیں جو کاڈول اور دو تین روسی لکھنے والوں سے مستعار لئے گئے ہیں اور انہی مستعار باتوں کے سہارے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ خیالات صاف نہیں، وہ ٹھیک سے ہضم نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے کتاب نہیں، بدہضمی کی لمبی ڈکار ہے''۔ (اردو تنقید پر ایک نظر صفحہ 366)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو ترقی پسند ادب میں سردار جعفری کی شعری شخصیت کا پرتو دیکھا اور انہیں یہ پوری کتاب جعفری کی شاعری کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتی نظر آئی۔ مذکورہ نقادوں کے محاکمہ کا اگر معروضی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ صاف نظر آئے گا کہ کلیم الدین احمد کی رائے ان کے تعصب کی چغلی کھاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سردار جعفری نے روسی مفکرین کے حوالے سے مارکسی تنقید کے اصولوں کی منطقی تشریح کی ہے اور اس تعبیر و تشریح پر اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد اور احتشام حسین کا پرتو نظر آتا ہے لیکن اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مارکسی اصولوں کی وضاحت میں یکسانیت کا پیدا ہونا لابدی ہے۔ ویسے بھی سردار جعفری نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیئے کیوں کہ مجھے نقاد ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ 55

''ترقی پسند ادب'' میں پائے جانے والے تضادات کی نشاندہی کرتے ہوئے شافع قدوائی لکھتے ہیں:

1۔ ''سردار جعفری ادب کے عوامی کردار کے سب سے بڑے نقیب نہیں ہیں اور وہ ترسیل کو مقصد اولین قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فنی امور کی شعوری پاسداری اور فارسی تراکیب کا استعمال انہیں گراں محسوس ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ترقی پسند ادیبوں کے سامعین اور قارئین میں مزدوروں کی کافی بڑی تعداد ہے اور چونکہ وہ ادب کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں اس لئے انہیں سیدھے سادے ادب میں مزہ آتا ہے۔۔۔ ادب کے عوامی کردار کے پیش نظر جب فراق گورکھپوری نے بالکل براہ راست انداز میں کچھ نظمیں اور امریکی بنجارہ نامہ کی قسم کی نظمیں لکھیں تو سردار جعفری نے لکھا ''آسان شاعری اور جنتا کے لئے شاعری کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شاعری کے سارے لوازمات اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیئے جائیں''۔ اس نوع کے متعدد تضادات سردار جعفری کی تنقید میں نمایاں ہیں''۔

2۔ ''سردار جعفری نے اپنی کتاب تحریک شروع ہونے کے 15 سال بعد لکھی جب ان کے بقول تحریک سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی لیکن کتاب کے صفحہ 268 پر یہ جملہ بھی درج ہے ''آج ترقی پسند ادب پر ایک جمود سا طاری ہے''۔ 56

سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں اقبال پر جو رائے پیش کی تھی اس پر سید فضل امام رضوی نے تبصرہ کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

انہوں نے سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' سے حسب ذیل میں اقتباسات نوٹ کرنے سے پہلے یہ لکھا ہے کہ ''اقبال کی شاعری کے بارے میں بھی سردار جعفری کا انتقادی انداز بالکل مختلف ہے اور عدم توازن کی اعلیٰ مثال ہے۔

اقتباسات یہ ہیں:

1۔ اقبال کا پیام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے الجھاؤں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس لئے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا یا پانی میں رنگ گھول دیا گیا ہے۔۔۔۔

اقبال کی شاعری میں دونوں قسم کے رجحانات آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت کہیں ریشم کے ساتھ سوت کا بھی کوئی تار نہ کھنچ آئے۔ 57

2۔اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور ان کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ کا روپ دھار لیتی ہے'' 58

3۔پھر بپھرے ہوئے انداز میں اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں''۔بقول فضل امام''ظاہر ہے کہ یہ درویشی اور قلندری، شاہینی اور انفرادیت پرستی تجدید مذہب اور احیائیت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں کیونکہ ان سے آج عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ 59

سردار جعفری کے مذکورہ بالا اقتباسات کے بعد پروفیسر سید فضل امام رضوی نے سردار جعفری سے اختلاف کرتے ہوئے دلائل پیش کئے البتہ سردار جعفری کی بعد کی لکھی ہوئی کتاب (اقبال شناسی 1976 کو پہلی کتاب ترقی پسند ادب کا ایک حد تک کفارہ قرار دیا۔

''ظاہر ہے کہ اقبال کی شاعری کے متعلق ان کا یہ انداز نظر قطعی مناسب نہیں۔کلام اقبال کی تفہیم کے لئے قرآن وحدیث کا غائر مطالعہ ضروری ہے اور اس کے لئے قلب مومن لازمی ہے جو ایمان ویقین کی شمعوں سے قلب ونظر کو منور کر سکے۔ہر کس و ناکس اور خاص طور سے وجود خدا اور رسول کا منکر کبھی بھی کلام اقبال کی عظمتوں اور اس کی گہرائیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔اقبال کا شاہین دراصل وہ مرد مومن ہے جو تسخیر قلوب میں یقین رکھتا ہے تسخیر ممالک میں نہیں۔۔وہ روحانی صداقتوں کا حامل ہے۔شاہین کا فلسفہ اقتدار پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ رفعت انسانی کا اشاریہ ہے۔یہ خود اعتمادی کا درس دیتا ہے۔مغربی تمدن پر ضرب کاری لگاتا ہے اور وجود خداوندی کا دلیل محکم ہے۔اقبال منکر خدا نہیں تھے اس لئے کچھ کٹر اور تنگ نظر انہیں فاشسٹ قرار دیتے ہیں۔یہ دراصل کلام اقبال کے مختلف عظیم جہات سے عدم معرفت کی دلیل ہے، جو دلیل کم نظری کہی جاسکتی ہے۔درحقیقت اقبال کے لاشعور میں شاہین کے صفات مرتسم ہیں جس کا اعلان اس کی روح ارتقائی طور پر کررہی اور جس پر شعریت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔اقبال کا شاہین ہمہ تن سرگرم عمل اور سرگرم پرواز ہے۔آشیانے یا ساز وسامان کی حرص وآز سے بے نیاز ہے۔وہ قصر سلطانی یا سیاست کے مراکز سے وابستہ نہیں۔اس کی صفات اور اصول پرستی چٹانوں کی طرح اس کی رفیق ہیں۔ اقبال نے شاہین کے تصور کو مرد مومن، صاحب فقر، صاحب عشق، صاحب سیف، صاحب قلم، قوی بازو، جاں باز اور صاحب تسخیر کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ہاں 1976 میں ان کی ایک مختصر کتاب''اقبال شناسی''منظر عام پر آئی جو کل 111 صفحات پر مشتمل ہے جسے ان کی گذشتہ تحریروں کا ایک حد تک کفارہ کہا جاسکتا ہے جس میں وہ معترف ہیں''اقبال کو ان کے عہد نے پیدا کیا تھا لیکن وہ اپنے عہد سے بڑے تھے۔وہ مہاتما گاندھی، ٹیگور اور جواہر لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ان چاروں کی بلند قامت پرچھائیاں مستقبل کی صدیوں پر پڑ رہی ہیں۔ 60

ضرورت اس بات کی تھی کہ پروفیسر سید فضل امام رضوی، اقبال شناسی کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتے۔

عمر رضا نے لکھا ہے:

''قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسا نہیں کہ سردار جعفری، اقبال کے معترف نہیں تھے، لیکن 1960 کے بعد اقبال کے تعلق سے ان کے یہاں جو نظریہ قائم ہوا، اس میں اور 1960ء سے قبل کے نظریہ میں جو کافی فرق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ترقی پسند ادب'' میں بھی سردار جعفری نے اقبال پر جو تنقید کی ہے وہ بعد کی تحریروں مثلاً ''اقبال شناسی'' کے بیان سے فرسودہ ہو جاتی ہے''۔ 61

''ترقی پسند ادب'' میں سردار جعفری نے اقبال پر جو کچھ لکھا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

1۔ ''سردار جعفری نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اقبال کی اہمیت اور اس کے اثر کو قبول کرنے کی تین اہم وجوہات ظاہر کی ہیں سب سے پہلی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ''اقبال نے آرٹ اور شاعری پر فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ جد وجہد حیات میں ہمارا ساتھ دے'' دوسری وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ''اقبال نے سامراج اور سرمایہ دار کے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کے اردو ادب میں نہیں ملتی''۔ سردار جعفری نے اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ان کا عقیدہ ان کو دوسرے راستے پر ڈال دیتا ہے وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس کا علاج اقبال نے ''انقلاب'' تجویز کیا ہے جو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ساتھ اقبال نے انقلاب کے بعد جو راستہ دکھایا ہے وہ چونکہ مارکسی راستے سے علیحدہ ہے لہٰذا وہ ان کے نزدیک قدامت پرستی ہے اور سرمایہ داری کو ہی زندگی عطا کرنے والا ہے''۔

2۔ ''سردار جعفری نے اقبال کی شاعری کو ان کے فلسفہ فکر سے الگ کر کے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کیونکہ سردار جعفری نے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے اقبال کے پیام اور فکر میں ''زہر'' گھلا ہوا پا رہے تھے۔ یہاں سردار جعفری نے ایسی مثالیں دی ہیں جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی پوری شاعری زہریلی تھی کو شعوری طور پر ان کا یہ مقصد نہیں۔ لیکن اپنی عقیدہ پرستی کو تنقید میں لازمی طور پر سامنے رکھنے کی وجہ سے وہ ایسے غلط نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس لئے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں ہم آہنگی نہیں اور ان کے پیام اور فلسفہ کی وجہ سے ان کی شاعری کو نقصان پہنچا ہے''۔

3۔ ''اقبال نے جہاں مسولینی، نپولین اور تیمور وغیرہ کی شخصیت کی بعض صفات کی تعریف کی ہے وہیں کسی بناء پر مارکس، لینن کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ 62

اقبال پر مذکورہ بالا تبصرہ سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر مبنی ہے۔ اس کے بعد ''اقبال شناسی'' میں سردار جعفری نے اقبال سے متعلق اپنی رائے الگ دی ہے۔ پروفیسر یوسف سرمست نے بھی اسی کا اظہار کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''گو وہ (سردار جعفری) آج اس کشمکش سے نکل چکے ہیں۔ ''اقبال شناسی'' میں انہوں نے اپنے معتقدات کی روشنی میں اقبال کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ عمل غیر شعوری رہا ہے۔ وہ اپنے عقیدے کو اب بھی عزیز رکھتے ہیں لیکن اب وہ اسے اقبال کے عقیدے سے متصادم ہونے نہیں دیتے۔ بلکہ صرف ادبی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں

اہم رول ادا کررہے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے زور کے زمانہ میں ان کا رویہ اقبال کے ساتھ کچھ اور رہا ہے۔"(ایضاً صفحہ 35)

شافع قدوائی نے اقبال پر سردار جعفری کی رائے جو انہوں نے "ترقی پسند ادب" میں دی تھی، اس کا تقابل اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور عزیز احمد سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تین ناقدین کے مقابلے میں سردار جعفری نے پھر بھی اقبال کی شاعری کے پس منظر کی وضاحت میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے:

"ترقی پسند ادب کے پیش لفظ میں سردار جعفری نے کتاب کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "چند سال پہلے عزیز احمد کی ترقی پسند ادب شائع ہوئی تھی مجھے ان کے نقطہ نگاہ کے بعض زاویہ ٹیڑھے معلوم ہوتے ہیں"۔مصنف نے عزیز احمد کی وضع کردہ بعض تنقیدی اصطلاحوں اور اقداری فیصلوں سے برملا اور مدلل اختلاف کیا۔اقبال کی شاعرانہ عظمت ترقی پسند نقادوں کی نگاہ میں متنازعہ فیہ رہی ہے۔اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ نے اقبال پر فاشسٹ ہونے کا الزام لگایا اور عزیز احمد نے اقبال کی شاعری کو اسلامی اشتراکیت کی رہین منت قرار دیا۔اقبال کی ماضی پرستی اور احیاء پرستی کو بھی ہدف ملامت بنایا گیا۔سردار جعفری بھی اقبال کی تعین قدر میں اس افراط و تفریط سے بچ نہیں سکے،لیکن انہوں نے کہیں کہیں اقبال کی شاعری کے پس منظر کی وضاحت میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔مثلاً اقبال کی ماضی پرستی کا ذکر کرتے ہوئے وہ عزیز احمد کی اصطلاح اسلامی اشتراکیت کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔سردار جعفری کا خیال ہے کہ "اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا وہ ہمہ گیری اور وسعت بھی ابھی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے"۔(ترقی پسند ادب صفحہ 102)۔سردار جعفری نے اقبال کی سامراج اور انگریز دشمنی کی داد دینے کے علاوہ حرکت اور تغیر کو ان کی شاعری کا شناس نامہ قرار دیا اور لکھا "یہ صرف موضوع کی حد تک نہیں بلکہ ہیئت میں بھی بلا کا جادو اور بیان میں بھی تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔پرانی بحریں جنہیں فارسی اور اردو کے اساتذہ استعمال کر چکے ہیں اقبال کی شاعری میں نیا ترنم اور آہنگ اختیار کر لیتی ہیں جیسے کہ نفس نے ان کے اندر کوئی کیمیاوی تبدیلی پیدا کر دی ہو۔انہی سے حفیظ جالندھری کے گیت نما نظموں کے لئے راستے کھلتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم نے سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" پر ایک مضمون قلمبند کیا ہے جس میں انہوں نے کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

1۔"اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اشتراکیت کے فلسفہ کو ادبی روایات اور تجربات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔جعفری صاحب اشتراکیت کے راستہ سے بنی نوع انسان کی تکالیف اور سماجی کشمکش کا علاج تلاش کرنے میں منہمک ہیں"۔

2۔"سرسید کا زمانہ بڑی الجھنوں کا زمانہ تھا۔ہر طرف انتشار،قدامت پرستی، جہالت اور تعصب عام تھا۔زندگی کے تقاضے کچھ اور تھے۔لوگ دوسری طرف جا رہے تھے۔اس افراتفری کے زمانہ میں علم و عمل میں یکسوئی پیدا کرنا صرف سرسید کا کام تھا۔اس مشکل کام میں انہیں مصلحتوں سے بھی کام لینا پڑا۔کبھی دب کر صلح کی یہاں تک کہ انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ

بڑھانا پڑا۔سردار جعفری نے سرسید کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ان پر مغرب پرستی کا الزام لگایا ہے۔یہ الزام سراسر غلط ہے۔۔۔۔سرسید مغرب پرست نہیں تھے بلکہ مجبوراً مغرب دوست ضرور بن گئے تھے''۔

3۔''اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ اقبال کے شاہین کا تصور دنیا کے غارت گروں (مسولینی) کو مدد دیتا ہے حالانکہ یہ شاہین کا کردار اقبال کا ایک مثالی کردار ہے جو مضبوط اور طاقتور ہونے کے باوجود ظالم نہیں۔انہوں نے شاہین کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے صفات فقر، خودداری، علوے ہمتی، انسانی زندگی کی ضمانت ہیں۔یہی توازن قوت مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا جائے گا۔بدگمانیاں دور ہوتی جائیں گی۔اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فارسی میں جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے کام کا نہیں۔اقبال کے مخاطب صرف اہل ہند ہی نہیں تھے۔ساری دنیائے انسانیت خاص اور خاص کر دنیائے اسلام کے مسلمان تھے۔اس لئے انہوں نے فارسی زبان کو اختیار کیا ہے۔یہ ایک مجبوری تھی''۔

4۔''جگر صاحب کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی کہ وہ مشاعرہ کے شاعر ہیں ان کے یہاں سماجی احساس بعض مخصوص حالات کے علاوہ نہیں ملتا۔یہ صحیح نہیں ہے۔انہوں نے انسان دوستی، خلوص، جذبہ حریت اور خودداری کو ہمیشہ برقرار رکھا۔وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں لیکن ان کے یہاں سماجی احساس ملتا ہے اور آزادی کی لگن کی اچھی مثال ساقی نامہ ہے۔غزل کے شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں مسائل زندگی اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوتے ہیں''۔

5۔''سردار صاحب کا خیال ہے کہ کیفی اور ساحر کی شاعری انتہاپسندی کا شکار ہے۔انہوں نے ترقی پسندی کے زعم میں فنون لطیفہ کا مذاق اڑایا ہے اور تاج محل کی تخلیق کو نہ صرف بے کار بلکہ مضحکہ خیز بتایا ہے۔جعفری صاحب نے یہ کہہ کر کہ ان حضرات میں تاریخی بصیرت کی کمی ہے تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہنی پس منظر میں نفرت شبہ اور تلخی کا شدید جذبہ کارفرما ہے۔انہیں ماضی سے نفرت اور قدیم زندگی سے بیزاری ہے۔ان کا تاریخی شعور نہ صرف ناقص بلکہ خطرناک بھی ہے۔ان کی یہ زہرناکی زندگی کے تسلسل کو منقطع کر دیتی ہے اور تعمیر کے بجائے نفرت اور انتشار کی طرف لے جاتی ہے۔یہ حضرات ہر دور کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کی ذاتی پسند و ناپسند ہر جگہ چھائی ہوتی ہے۔انہیں ماحول، حالات اور زمانہ کا بالکل لحاظ نہیں ہے۔یہ لوگ شاعر سے زیادہ پروپگنڈسٹ ہیں''۔

6۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تک ترقی پسند ادب پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان میں یہ کتاب سب سے بہتر ہے لیکن بعض بڑی بے اعتدالیاں بھی موجود ہیں''۔64

ڈاکٹر قمر رئیس نے سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی مدلل انداز میں کی ہے:

1۔''سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' زیادہ نزاعی اس لئے ٹھہری کہ انہوں نے مثالیں اپنے معاصرین سے دی تھیں اور ''ترقی پسند ادب'' کے جائزہ میں بڑی سفاکی سے بعض کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ان کے بعض فیصلے اگر صحیح ہیں تو بعض جارحانہ رویہ کی غمازی کرتے ہیں مثلاً سعادت حسن منٹو کی کچھ کہانیوں کو اگر فحش اور مریضانہ مان لیا جائے تب بھی انہیں

غلاظت نگار کہنا یا انہیں بنیادی طور پر انسانوں کی محبت سے عاری بتانا تنقید کا بڑا ادعائی انداز تھا جو جعفری نے روا رکھا"۔۔۔

2۔"۔۔۔سردار جعفری نے بلنسکی گورکی مورس ڈاب اور خود لینن کے ادبی نظریات سے استفادہ کیا ہے"۔۔۔

3۔"۔۔۔انہوں نے بیسویں صدی کے سیاسی اور تاریخی عوامل کے تجزیہ سے جن ذہنی اور ادبی رجحانات کی نشاندہی کی ہے اس میں ایک صاف منطقی ذہن کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔۔۔

4۔"۔۔۔یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی جمالیاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی یا کم از کم اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرائی۔۔۔

5۔"۔۔۔سردار جعفری نے پلیخانوف کے حوالہ سے انسان کے ذوق و جمال کے ارتقاء اور سرچشموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔تہذیبی ارتقاء کی مختلف سطحوں اور سماج کے مختلف طبقوں کے ذوق جمال کے فرق کی نشاندہی بھی انہوں نے کی ہے۔ذوق جمال کے اجتماعی یا طبقاتی کردار پر زور دینے کے باوجود انہوں نے اس کے انفرادی پہلو کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔لکھتے ہیں "تہذیب وتمدن کی ایک سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں"۔ احساس جمال کی اس انفرادی شناخت کو انہوں نے متضاد سماجی عوامل میں تلاش کیا ہے۔۔۔

6۔"۔۔۔اسی طرح سردار جعفری کا یہ خیال بھی ہے کہ ذوق صحیح کا غماز ہے کہ "جب تک ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان مشترک جمالیاتی قدریں نہ ہوں گی ان دونوں کے جمالیاتی ذوق کی قدریں ملیں گی نہیں، تب تک نہ ادب سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے نہ اسے سمجھا جاسکتا ہے۔۔۔

7۔"۔۔۔جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" کم از کم دو دہوں تک ترقی پسند ادبی نظریات کی تفہیم اور فروغ میں موثر رول ادا کیا ہے۔35 سال قبل لکھی ہوئی اس کتاب میں آج اگر گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ آج کی مارکسی تنقید میں زیادہ دقت نظر اور حکیمانہ بصیرت پیدا ہوگئی ہے۔مارکسی تنقید اب بڑی حد تک مارکسی تصورات کے ایک رخے میکانکی اطلاق سے آزاد ہوگئی ہے۔۔۔خود جعفری کے شعور اور تنقیدی رویوں میں گذشتہ پندرہ برسوں میں نتیجہ خیز اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ہر چند کہ اس دور میں انہوں نے تنقید کم لکھی ہے اور انہیں نقاد ہونے کا دعوی بھی نہیں لیکن اقبال اور بعض کلاسیکی شعرا کے بارے میں انہوں نے جو مقالات، دیباچے لکھے ہیں وہ نئی بصیرت کا ثبوت ہیں۔

65

اقبال شناسی

ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے 1976ء میں شائع کیا۔ سردار جعفری نے اقبال صدی 1977 کے خیر مقدم کے لئے اس کتاب کو لکھا تھا۔

سردار جعفری نے اپنی تصنیف "اقبال شناسی" میں اقبال کے فکر و شعر کا جائزہ "شاعر مشرق"، "اقبال اور فرنگی" اور "اقبال کا تصور وقت" کے تحت لیا ہے۔بقول سردار جعفری "تین مقالات میں اقبال کی فکر و شعر کے ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بغیر اقبال کی عظمت کا پورا راز سمجھ میں نہیں آسکتا"۔ (اقبال شناسی صفحہ 11، 12)

1۔"اس کتاب میں سردار جعفری نے اقبال کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ "ترقی پسند ادب" میں کہی گئی باتوں سے بالکل مختلف ہیں"۔ 66

"اقبال شناسی" کے دیباچہ میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے۔اس میں ایشیائی بیداری شامل ہے۔اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے۔ اس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے اور اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے۔صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ ۔۔۔۔ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خون بہا کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خوان تھے۔ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرہ میں سانس نہیں لے سکتا"۔۔۔۔

سردار جعفری نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اقبال سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا لفظ قابل احترام نہیں تھا۔پرانے شعراء خودی کے خلاف تھے۔ 67

عمر رضا نے لکھا ہے:

"اس کے ثبوت کے لئے سردار جعفری نے حافظ، میر، سودا اور اکبر الہ آبادی کے اشعار پیش کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال بیچارگی کے قائل نہیں۔اقبال پر جس طرح کی فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس مقالہ میں اس کی نفی کی گئی ہے اور اقبال کو ایک سیکولر اور عالمی شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔سردار جعفری نے اقبال کی خودی کو انقلاب، سرمایہ پرستی کے خلاف احتجاج اور اشتراکیت میں تلاش کیا ہے۔(ضرب کلیم 1936)۔فرشتوں کا گیت، فرمان خدا، فرشتوں کے نام جیسی نظموں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ 68

اقبال شناسی میں شامل سردار جعفری کے مضمون شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں) پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

"اول الذکر مقالہ (شاعر مشرق) میں اقبال کے فلسفہ خودی کو تحریک آزادی کے پس منظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اقبال پر جس طرح کی فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس مقالہ میں اس کی نفی کی گئی ہے اور اقبال کو ایک سیکولر عالمی شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔مقالہ میں اقبال کے فلسفہ حرکت و عمل، تسلسل حیات اور خودی کو بھی اقبال کے اردو اور فارسی اشعار کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے۔خصوصاً فلسفہ خودی میں تحریک آزادی اور اشتراکیت کو تلاش کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ" اقبال کا فلسفہ خودی ہندوستان کی تحریک آزادی کی عطا کی ہوئی بیداری سے ہم آہنگ تھا"۔ 69

علی سردار جعفری کا مضمون "اقبال اور فرنگی" فکر اقبال، مقالات حیدر آباد سمینار مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری و ڈاکٹر مغنی تبسم (جنوری 1977) میں شائع ہوا۔

کولونیل ازم (Colonialism) کی وضاحت اور اس کی مخالفت میں پیدا ہونے والی دو طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''جدید شہنشاہیت جس کے لئے اردو میں عام اور مقبول لفظ سامراج ہے، سرمایہ دارانہ نظام کا آخری نقطہ عروج تھا۔ جب مغربی ممالک کا بینکی سرمایہ فائی نمس بن کر اپنی ملکی اور قومی سرحدوں سے باہر نکلا اور دور دراز فاصلے طے کرتا ہوا غیر ممالک کی صنعتوں پر قابض ہو گیا تا کہ سستے کچے مال اور سستی مزدوری سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے اور اس کی حفاظت کے لئے فوجوں اور حکومتوں کی ضرورت پڑی۔ اس سرمایہ داری شہنشاہیت کا نظام غلامی وجود میں آیا اس کو انگریزی میں کولونیل ازم کہتے ہیں۔ اردو میں کوئی معقول لفظ نہیں ہے۔ اس نظام نے دو سطحوں پر اپنی مخالف طاقتوں کو جنم دیا قومی اور ملکی سطح پر مزدور تحریک اور بین الاقوامی سطح پر غلام ممالک کی تحریک آزادی کو۔ 19 ویں صدی کے اختتام اور 20 صدی کی ابتداء عالمی سرمایہ داری نظام کا آخری نقطہ عروج بھی ہے۔ عروج کا عمل ختم ہو کر زوال کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ عمل زوال کے ساتھ ساتھ کسی نئے طلوع کی بشارت بھی لے کر آتا ہے۔ تاریخی، معاشی اور سیاسی سطح پر اس نئی طلوع ہوتی ہوئی حقیقت کا نام اشتراکیت ہے''۔۔ 70

سردار جعفری نے بتایا ہے کہ اقبال نے تین لفظ فرنگ، مغرب اور یوروپ ایک ہی معنوں میں استعمال کئے ہیں یعنی ایشیاء کے مغرب میں واقع وہ ممالک ہیں جن میں صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ داری نظام اپنی ترقی کی آخری منزل یعنی سامراج تک پہنچ گیا اور اب اس سامراج کی شکست کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ فرنگ فرانس کی فارسی شکل ہے جس سے فرنگی بنا ہے یوروپ کے ہر رہنے والے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے لکھا ہے کہ فرنگ اور فرنگی کی طرف اقبال کے دو رویے تھے۔ ایک عقیدت کا دوسرا مخالفت کا۔

(الف) اپنی عقیدت کے رویے کے سلسلہ میں اقبال نے چند فرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے زمانہ میں اقبال آرنلڈ سے متاثر ہوئے۔ بانگ درا کے ابتدائی کلام میں 1905 سے پہلے کے حصہ میں نو نظمیں انگریزی شعرا کی نظموں کے تخلیقی ترجمے ہیں جن پر اقبال نے ماخوذ کا لفظ لکھ دیا ہے۔ ان میں ایمرسن، ولیم کوپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے نام شامل ہیں۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال کے فلسفہ خودی میں عشق کا جو مقام ہے اس کے ابتدائی نقوش ٹینی سن سے ماخوذ نظم ''عشق اور موت'' سے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس نظم کو پوری کی پوری درج کیا ہے۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ فرنگی شاعر گوئٹے نے اقبال کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اقبال نے گوئٹے کو حکیم حیات کا خطاب دیا ہے۔ اقبال کی تربیت میں اسلامی علوم اور روایات کے ساتھ ساتھ جرمن فکر و ادب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ وہ کانٹ، ہیگل، فشٹے اور نٹشے کے فلسفوں سے سیراب ہوئے۔ ''پیام مشرق'' میں زیادہ تر چیزیں طبع زاد ہیں لیکن گوئٹے کی بعض تخلیقات یا تو ترجمہ کی شکل میں یا تخلیق نو کی شکل میں پیش کی گئی ہیں جن سے گوئٹے اور اقبال کے نقطہ ہائے نگاہ کی مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے اور اقبال کے فلسفہ خودی اور حرکت اور ارتقاء کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ ''جوئے آب'' کو گوئٹے کی ایک مشہور نظم ''نغمہ محمدؐ'' کا آزاد ترجمہ بتایا گیا ہے۔ نظم ''حور و شاعر'' گوئٹے کی اس عنوان کی ایک نظم کی آزاد تخلیق نو ہے جس میں اسلامی تخئیل حیات اور اقبال کا فلسفہ حرکت و ارتقاء نئے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اپنے تصور ابلیس و آدم کو اقبال نے اپنی نظم جبریل و ابلیس میں پیش کیا ہے جس کا مقدمہ فاؤسٹ کے ابتدائی حصہ سے لیا گیا ہے۔

ب۔ دوسرا رویہ اقبال کی فرنگیوں سے مخالفت کا ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال کے شعری مجموعہ ''پیام مشرق'' کی

بہت سی نظمیں فرنگی سیاست اور معاشرت پر بھرپور تنقید ہیں۔پہلی بار اس تصنیف میں انقلاب روس،کمیونزم کا ذکر آتا ہے اور کارل مارکس اور لینن کے نام شعر کا حصہ بنتے ہیں۔فرنگی کے خلاف اقبال کے رویے کی ابتداء 1908ء کے آس پاس بتلائی گئی ہے۔سردار جعفری نے اقبال کے اس رویہ کے کئی پہلو بتلائے ہیں جیسے! جن کے الفاظ میں

1۔فرنگی یا مغربی معیشت و سیاست اور اس سے پیدا ہونے والی تہذیب کی مخالفانہ تنقید جسے شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔

2۔اس نظام کے یقینی زوال کی پیش گوئی اور اس کے معاشی اسباب۔

3۔مسلمانوں اور محکوم قوموں کی بیداری جو براہ راست اس نظام پر ضرب لگا رہی تھی۔

4۔مشرق کی آزادی کے ساتھ نئے نظام کی بشارت۔

5۔اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم،لیکن اشتراکی نظام کی مادیت کی تنقید اور مادیت میں روحانیت کی آمیزش کا نظریہ جسے اقبال نے اسلام کا جدید معاشی نظام تصور کہا ہے۔71

1905 اور 1908 کے درمیان اقبال کے سفر یوروپ کا زمانہ ہے۔بحر روم سے گزرتے ہوئے اقبال نے سسلی کے جزیرہ کا نظارہ کیا تو بقول سردار جعفری اقبال کو ملت اسلامی کا پرانا جاہ و جلال یاد آ گیا اور عہد حاضر کی بدحالی کی تصویر کھنچ گئی۔یوروپ جا کر اقبال نے وہاں کی تہذیب و معاشرت پر گہری نظر ڈالی اور اپنی غزل میں ان کی تہذیب کو ہدف تنقید بنایا۔ 1923ء میں شائع ہونے والی کتاب پیام مشرق میں پورا ایک حصہ نقش فرنگ کے نام سے ہے۔ایک نظم ''پیام'' کی طرف سردار جعفری نے متوجہ کیا ہے جس کی ابتداء میں اقبال نے بتایا کہ علم و عقل کا استعمال اگر انسان کی بہبود کے لئے نہ ہوگا اور صرف منافع خوروں کے لئے ہوگا تو عشق انسانی سے محروم ہو کر عقل و علم لعنت بن جائیں گے۔اس نظم کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال نے عشق کو عقل سے زیادہ اہم بتایا ہے۔اقبال نے مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اور عقل کی نشاندہی کی جو خود بیں نہیں ہے بلکہ جہاں بیں ہے یعنی عشق سے تربیت حاصل کی ہے،اس عقل کے ساتھ فرشتے کا نور اور آدم کے دل کا سوز و گداز ہے اور کہا کہ اس عقل کو ترک کر کے فرنگی نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ انسانی تباہی کا راستہ ہے۔ اس کا باعث بالادستوں کی ہوس ہے جو زیردستوں کا معاشی استحصال کرتی ہے اور اس استحصال کے لئے جنگ کا سامان کرتی ہے اور اپنی رہزنی کو جہاں بینی کا نام دیتی ہے۔اس سے پیدا ہونے والی تہذیب بے حیائی سکھاتی ہے اور کم مایہ عزیزوں کے خون کے جام چھلکاتی ہے۔اب جب استحصال اور خون آشامی اپنی آخری حد پر پہنچ گئی ہے تو نئے نظام کی بشارت کا وقت ہے۔ اقبال کو انقلاب آتا دکھائی دے رہا ہے۔

سردار جعفری نے پیام مشرق کے ایک سال بعد شائع ہونے والے شعری مجموعہ بانگ درا (1924) میں شامل تین نظموں شمع اور شاعر،خضر راہ اور طلوع اسلام کا حوالہ دیا۔شمع اور شاعر 1919 کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ اور بیداری کا مژدہ بتایا ہے اور مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ انہیں خوف باطل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ غارت گر باطل ہیں،مسلمانوں کی بیداری اشیاء کے لئے اور ساری بنی نوع انسانی کے لئے سامانِ نور بننے کی پیشین گوئی کی۔

سردار جعفری کے الفاظ میں:

''اور واقعی دنیا چند سالوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ ہندوستان سے طرابلس تک ایشیاء کی زمین ہل گئی۔

تین تاریخی واقعات نے مغربی سامراج پر کاری ضرب لگائی۔ ہندوستان کی سیاست میں مہاتما گاندھی کی آمد نے صدیوں کے سوئے ہوئے کسانوں کو جگا دیا۔ روس کے انقلاب نے بین الاقوامی سامراج کے قلعے میں شگاف ڈال دیا اور ترکی میں انگریزوں کی شکست نے مسلمانان عالم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ ان تینوں سے پیدا ہونے والے جذباتی اور ذہنی انقلاب کو شاعر مشرق نے اپنی نظم خضر راہ میں سمیٹ لیا ہے اور ایشیاء کی نئی بیداری کا جشن طلوع اسلام میں منایا ہے۔

اب فرنگی اقبال کی زد پر تھا۔ اس کی سیاست، معیشت، معاشرت، تہذیب، تمدن کوئی چیز نہیں تھی جو شاعر مشرق کا ہدف نہ ہو۔ اس معاشرت کی ظاہری چمک دمک اور حسن کے اعتراف کے باوجود شکایت یہ ہے کہ روح میں گرمی اور دل میں حرارت نہیں ہے۔ اس انداز کی بنیاد پیام مشرق میں رکھی گئی ہے۔ اب اقبال نے غزل کی قدیم روایت کے مطابق فرنگی کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جو ساتذہ نے زاہد، محتسب، ملا اور قاضی کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ فرنگی، فرنگ، مغرب اور یوروپ کے الفاظ بال جبریل کی غزلوں میں کردار بن گئے اور ایک ہی غزل میں جہاں حکیمانہ اور عارفانہ مضامین کے اشعار ہیں وہیں وہ اشعار بھی ہیں جن میں فرنگی ہدف ملامت ہے لیکن غزل کی نرم گفتاری کے ساتھ غزل کے رمز اور کنایہ کے ساتھ، غزل کی روایت کے ساتھ''۔ 72

اقبال شناسی کا تیسرا مقالہ ''اقبال کا تصور وقت'' ہے۔ اس میں اقبال کے اردو فارسی اشعار اور انگریزی اردو کی نثری تحریروں کے حوالہ سے اقبال کے تصور وقت کو واضح کیا گیا ہے۔ مقالہ کی ابتداء میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''تصور وقت فلسفہ اور سائنس کا مسئلہ ہے جسے اقبال نے شعر کے سانچے میں ڈھال کر جمالیاتی احساس دے دیا ہے اور نہایت خوبصورت اشعار کی تخلیق کی ہے۔ وہ وقت کا ایک نیا اور حسین احساس پیدا کر کے بیدار ہوتی ہوئی انسانی زندگی کی پیچیدہ راہوں پر خود اعتمادی سے چلنے کی تعلیم دینا چاہتے تھے''۔ 73

سردار کے مقالہ اقبال اور تصور وقت کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری نے اگر چہ خود کے ذہن کو وقت کی فلسفیانہ تربیت سے محروم قرار دیا ہے لیکن پھر بھی ہندو تصور وقت پر بحوالہ خامہ فرسائی کی ہے جس کی رو سے وشنو کے ایک خواب کے ساتھ ایک دنیا بیدار ہوتی ہے اور اپنی بیداری کے چکر کو ختم کرنے کے بعد خود بھی ختم ہو جاتی ہے اور دوسری دنیا بیدار ہوتی ہے۔ ایک برھما کے بعد دوسرا برھما آتا ہے، ایک آدم کے بعد دوسرا آدم پیدا ہوتا ہے۔ یہی وشنو کا خواب ہے، یہی مایا ہے، یہی وقت ہے اور تمام انسان اس کے دائرے میں اسیر ہیں۔ اپنے آخری تجزیہ میں یہ مادے کی حرکت ہے جو تخلیق، تخریب اور تخلیق نو کی شکل میں نگاہوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ 74

سردار جعفری نے ہندو تصور وقت کے مذکورہ فلسفیانہ تصور کو غیر حقیقی اور خواب و خیال سے پُر بتایا ہے جسے اقبال نے قبول نہیں کیا تھا۔ بقول ان کے ''اس ابتدائی فلسفیانہ تصور میں دنیا کے مایا ہونے کا، غیر حقیقی اور خواب و خیال ہونے کا تصور بھی پنہاں ہے جو فلسفہ خودی کی نفی کرتا ہے۔ اس لئے یہ تصور اقبال کے لئے قابل قبول نہیں ہے''۔ 75

یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری نے ایسے بہت سے حوالے دیئے ہیں جہاں اقبال نے منصور حلاج اور شنکر اچاریہ دونوں کو وحدۃ الوجودی قرار دیا ہے۔ چونکہ یہ ایسے تصورات ونظریات ہیں جو خودی کے راستے میں حائل نظر آتے ہیں۔ اس لئے اقبال، حافظ شیرازی پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ ہندو تصور وقت کے ساتھ مایا کا جو تصور ہے اس کی وضاحت سردار جعفری نے "پُران" کے حوالے سے کی ہے اور لکھا ہے:

"ایک طرف یہ خالص وحدانیت، خالص ادویت واد کی طرف لے جاتا ہے جو شنکر اچاریہ کے یہاں کوندم بھج کوندم کے نغمے میں ڈھل جاتا ہے اور اقبال کے یہاں "زماں ہے نہ مکاں لا الہ الا اللہ" بن جاتا ہے۔ لیکن دوسری سطح پر دنیا کو ہیچ اور بے معنی غیر حقیقی قرار دے کر انسانوں سے ان کی قوت عمل چھین لیتا ہے۔ 76

2۔ "اسلامی دنیا کے انحطاط کے بعد گذشتہ تین چار سو سال سے تصوف اور وحدۃ الوجود نے جس طرح امنگوں، آرزوؤں اور جستجوؤں کو چھین لیا تھا، اس کا بھی سردار جعفری نے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں حافظ، بیدل، ذوق اور غالب کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جن میں وقت کے غیر حقیقی ہونے کا ثبوت اور انسان کی بے بسی کا اظہار ملتا ہے جسے اقبال نے ناپسند کیا تھا"۔

3۔ "سردار جعفری نے اقبال کے تصور وقت کو ان کے چند اقتباسات اور اردو فارسی اشعار کے حوالوں سے واضح کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے یہاں "تصور وقت" کے تین عناصر ترکیبی ہیں۔ پہلی اسلامی جس کی بنیاد امام شافعی کے مقولے (وقت تلوار ہے) اور رسول کریمؐ کی دو حدیثوں (لی مع اللہ وقت، لاتسبو الدھر) پر ہے۔ دوسرا عنصر قدیم ایرانی ہے جسے زروانیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ زروان دنیا کا اور دنیا کی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اور وہ خود زندگی اور موت ہے۔ تیسرا عنصر وہ ہے جس پر "برگساں" کے فلسفہ کا اثر ہے۔ برگساں کے مطابق حقیقت اپنی بنیادی فطرت میں تخلیقی ارتقاء ہے اور یہ ساری کیفیتیں اقبال کی شاعری میں نظر آتی ہیں جسے سردار جعفری نے جدلی مادیت سے قریب پایا ہے اور لکھا کہ:

"یہ انداز فکر جدلی مادیت سے بہت قریب ہے جو حرکت اور تغیر کا سائنٹفک نظریہ ہے۔ اس کے اعتبار سے خارجی حقیقت ہمارے وجود سے آزاد اپنا وجود رکھتی ہے اور ہمارے ادراک وشعور کے آئنہ میں منعکس ہوتی ہے۔ یہ حقیقت مادہ ہے جو حرکت کے بغیر وجود پذیر اور ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ نہ مادہ کا وجود بغیر حرکت کے ممکن ہے اور نہ حرکت کا وجود مادے کے بغیر۔ زماں و مکاں متحرک مادے کے وجود کی شکلیں ہیں۔ کوئی دنیا میں مادے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ کوئی مادے کی تخریب نہیں کر سکتا۔ وہ خود تخلیق کار ہے اور اپنی شکلیں بدلتا ہے۔ اسی طرح زماں و مکاں کی بھی تخلیق وتخریب ممکن نہیں ہے۔ مذہبی زبان میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے مادے کو قوت تخلیق ودیعت فرمائی ہے۔ بیج میں درخت اور پھول بننے کی اور پھول میں پھل بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ قوت تخلیق حرکت کی کی پابند ہے۔ اس لئے اس کی ایک شکل جسے وقت کہتے ہیں وہ بھی خلاق نظر آتا ہے۔ اسلام جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس مادے کو رد نہیں کرتا اور نہ اسے غیر حقیقی قرار دیتا ہے، صرف اس کی پرستش حرام ہے۔ زمین و آسمان حیوان وانسان، چاند، ستارے، درخت اور پہاڑ، دشت و دریا سب حقیقت ہیں جن کی تخلیق مادہ نے کی ہے اور مضمر طاقتیں ودیعت کی ہیں اور دنیا قرآن کے اعتبار سے ناتمام ہے"۔ 77

4۔ ''اقبال کے یہاں برگساں کا جو تصور وقت پایا جاتا ہے، اس کی نشاندہی کے لئے سردار جعفری نے پہلے برگساں کے تصور وقت کی دونوں قسموں ''پیمائشی وقت'' (Serial Time) جسے سکنڈ، گھنٹے، رات، دن، ہفتہ، مہینہ اور سال میں ناپا جاتا ہے اور دوران خالص (Pure Duration) کا ذکر کیا ہے جسے اقبال نے ''زمانے کی رَو'' کہا ہے۔ غرض سردار جعفری نے یہ بھی واضح کیا کہ اقبال نے کس طرح برگساں کے تصور وقت کو اپنے اشعار میں ڈھالا''۔

5۔ ''سردار جعفری نے اقبال کے تصور وقت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بھی دیکھنے کی سعی کی ہے اور دوران خالص (Pure Duration) کو ایک حدیث لاتسبو الدھر کی روشنی میں پیش کیا ہے جس کی تصدیق کے لئے اقبال کے اس اقتباس کو نقل کیا ہے جس میں انہوں نے برگساں سے اس حدیث کا جب ذکر کیا تو وہ اچھل پڑا تھا۔ سردار جعفری کا ماننا ہے کہ ''خالص وقت'' یا ''دوران'' ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں ہوسکتا کیونکہ مستقبل ایک لمحے میں حال بن جاتا ہے اور حال ایک لمحے میں ماضی میں تبدیل ہوجاتا ہے جس میں بے پناہ تسلسل ہے، وہ بے نیاز ہے اور مستقل آگے بڑھتا چلا جارہا ہے چنانچہ اقبال کے اس تصور وقت کے متعلق سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اقبال کے یہاں وقت ایک جابر اور قاہر مگر خلاق طاقت ہے۔ ایک بے پناہ تسلسل، ایک بہتے ہوئے طاقتور دریا کی طرح ڈوبنے اور تیرنے والوں سے بے نیاز، آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کسی کے لئے رات کی شراب بچا کر نہیں رکھتا۔ تمام حادثات، وقت کے اس تسلسل اور بہاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ موت اور زندگی کی ساری حقیقت یہی تسلسل ہے۔ یہ روح انسانی سے پیدا ہوتا ہے اور روح انسانی میں گم ہوجاتا ہے۔ اگر ایک جگہ اسے پیراہن یزداں کہا ہے تو دوسری جگہ اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وقت کا سلسلہ ذات مطلق کی قبائے صفات بناتا ہے۔ یہ بے پناہ بہاؤ سب کو موت کی طرف بہائے لئے جارہا ہے کوئی اس پر قابو حاصل نہیں کرسکتا لیکن وہ ''مرد خدا'' جو عشق سے سرشار ہے''۔ 78

اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں وقت اور انسان کے مابین رشتوں کی جو نوعیت ہے، اسے بھی سردار جعفری نے تلاش کیا ہے۔ **اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:**

''اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں وقت اور انسان کا رشتہ بڑا معنی خیز اور دلچسپ ہے۔ اگر انسان عقل کے ساتھ عشق سے بھی سرشار ہے جس کے معنی تخلیق کے جذبے، کردار کی مستی اور تکمیل انسانیت کی امنگ سے سرشار ہونا تو وقت کارا کب ہے اور وقت اس کا مرکب ہے۔ بصورت دیگر وہ اگر صرف آب وگل کی تخلیق ہے اور عقل وعشق سے بے نیاز ہے تو وقت اس کا را کب اور وہ وقت کا مرکب۔ اور اگر صرف عقل رکھتا ہے اور عشق بیگانہ سے ہے تو وقت اس کے لئے عبرت کا تازیانہ ہے''۔ 79

سردار جعفری نے اقبال کے شعر وفکر میں تین ''خالق''، ''خدا'' (خالق کائنات)، ''وقت'' اور ''انسان'' کو بھی تلاش کیا ہے جس کی وضاحت کے لئے انہوں نے اقبال کے درج ذیل اشعار پیش کئے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے یہاں وقت اور زندگی کس طرح یکجا نظر آتے ہیں۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

درج بالا اشعار میں زندگی، وقت، خودی سب ایک ہوتے نظر آتے ہیں۔سردار جعفری نے اقبال کے اردو فارسی اشعار اور انگریزی اقتباسات سے یہ بھی ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اقبال کی شاعری میں تیسرے خالق ''انسان'' کی بے حد اہمیت ہے اور لکھتے ہیں کہ ''تیسرا خالق انسان ہے جس کے ہنر میں ایک تازہ جہاں آباد ہے جو بخشے ہوئے فردوس کی خاطر میں نہیں لاتا۔لیکن اپنی جنت اپنے خون جگر سے تعمیر کرتا ہے۔(روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے) یہ انسان اقبال کی فکر کا مرکزی نقطہ ہے۔اقبال کا تصور وقت اس خلاق انسان کے لئے ایک چیلنج ہے۔مسجد قرطبہ میں انسان نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔یہ وقت سے بڑا خالق ہے اس لئے کہ باشعور خالق ہے''۔ 80

5۔''ان مباحث کے بعد سردار جعفری نے اس مقالہ کا اختتام کچھ اس طرح کیا ہے کہ ''اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیونکہ ناتمامی فطرت کا اٹل قانون ہے۔لیکن اس منزل کا تصور شوق کو ہمیشہ ضرور کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا''۔ 81

6۔اس طرح سردار جعفری نے اس مضمون میں اقبال کے ''تصور وقت'' کو پیش کرتے ہوئے اپنے نظریۂ ادب کی بھی جابجا وضاحت کی ہے جس میں انسانیت کی بقاء، مارکس کا نظریہ (جدلی مادیت)، رجائی نقطہ نظر اور عہد کا عکس سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ 82

مظہر جمیل نے سردار جعفری کی تصنیف ''اقبال شناسی'' میں شامل تینوں مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔اس سے پہلے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں شامل اقبال کی فکر و شعر پر تبصرہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ اس میں تجزیاتی عنصر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔یہ صورت حال غالباً اس لئے پیدا ہوئی کہ یہاں فکر اقبال کا تفصیلی مطالعہ مقصود نہ تھا بلکہ اقبال کے ان ترقی پسند نظریات کا جائزہ پیش نظر تھا جن کے اثرات نے اردو شاعری اور فکریات کو نئے امکانات سے روشناس کرایا تھا''۔ 83

2۔پہلے مقالے ''شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں) گذشتہ تین صدیوں میں ہندوستانی معاشرے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ان کے (اقبال) کے سامنے ہندوستان کی غلامی اور آزادی کے سوال کے ساتھ سب سے اہم مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی بیداری اور احیائے اسلام کی نئی صورت تھی، لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ بیداری تحریک آزادی کا حصہ تھی اور اقبال کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کے خلاف ایک حرف نہیں لکھا اور مسلمانوں کی روحانی نشاۃ ثانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے الگ نہیں کیا۔اقبال کے ہاں اسلامی استعارے کے جواز میں سردار جعفری کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اقبال نے اسلامی استعاروں میں آفاقی حقیقتیں پیش کی ہیں جنہیں کسی ایک قوم یا گروہ تک

محدود نہیں کیا جاسکتا۔اقبال کی سامراج دشمنی دراصل ان کی حب الوطنی کا پرتو ہے۔۔۔۔۔

3۔اقبال شناسی کا دوسرا مضمون ''اقبال اور فرنگی'' دراصل اقبال کے تصور انقلاب سے بحث کرتا ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ اقبال ہماری شاعری کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انقلاب کی اصطلاح کو اس وسیع تر معاشی،سماجی،سیاسی تبدیلی کے معنی میں استعمال کیا ہے جو بین الاقوامی استحصالی نظام کے خلاف قوموں کی جدوجہد آزادی اور ظالمانہ طبقاتی جبر کے مدمقابل مجبور لوگوں کے جہاد سے معنون ہے۔۔۔بقول سردار جعفری،یہ لفظ اقبال کے ہاں پہلی بار 1917ء کے روسی انقلاب کے بعد آیا''۔۔۔سردار جعفری بتاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اقبال دو رویوں کے حامل تھے۔ایک عقیدت اور دوسرا مخاصمت کا۔پہلے رویے کے تحت وہ حکیمان فرنگ کی دانائی،تحریک پذیری،عمل آفرینی اور تخلیقی تلاش وجستجو پر وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔اس ضمن میں سردار جعفری نے اقبال کی نظموں سے ایسے اقتباسات پیش کئے ہیں جن میں مغربی دانشوروں،شاعروں،سائنس دانوں اور مفکروں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور ان کے انقلاب آفریں تصورات کا خیر مقدم کیا ہے۔ان میں مارکس،لینن بھی شامل رہے ہیں اور کانٹ وہیگل بھی،نٹشے اور گوئٹے بھی اور ایمرسن وٹینی سن بھی۔۔۔۔اقبال کی تربیت میں اسلامی علوم اور روایات کے ساتھ ساتھ جرمن فکر وادب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔سردار جعفری نے اقبال پر مغربی دنیا اور مفکرین کے اثرات کا جائزہ لینے میں ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ بعض نثری تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے خاص طور پر پیام مشرق کے دیباچے سے۔۔۔

مغربی دنیا کی طرف اقبال کا دوسرا رویہ ناقدانہ ہے جس کے تحت وہ مغرب کے سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کو برہنہ دیکھتے ہیں۔پیام مشرق جو 1923 میں شائع ہوئی تھی اقبال کے دونوں رویوں کو پیش کرتی ہے۔اقبال کا تنقیدی رویہ جہاں مغربی نظام معیشت وسیاست،اس سے پیدا ہونے والی تہذیب،سرمایہ داری اور شہنشاہیت کی خامیوں کی نشاندہی اور اشتراکی نظام کے زوال کی پیشین گوئی کرتا ہے وہیں مشرق کی آزادی کے ساتھ نئے نظام کی بشارت بھی دیتا ہے جہاں شتراکی انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہے وہیں اشتراکی مادیت کی نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔سردار جعفری کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اقبال کے ان دونوں رویوں کو اس وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ فکر اقبال کا یہ اہم گوشہ بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کتاب (اقبال شناسی) کا تیسرا مضمون ''اقبال کا تصور وقت'' اقبال کی شاعری میں وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا نظری تجزیہ پیش کرتا ہے۔سردار جعفری نے اس تجزیہ میں ہندوستانی تصور وقت،مغربی تصور وقت اور اسلامی تصور وقت کی تکون کے حوالے سے اقبال کے تصور وقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مطالعہ اقبال میں ایک نیا،اہم اور زیادہ موثر طریقہ کار ثابت ہوا ہے۔۔۔ان مضامین کے علاوہ ماہنامہ کتاب نما دہلی میں اقبال پر مختلف زاویوں سے چار اداریے (دیکھ تو کس منزل طوفان سے آتی ہے حیات) بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جس کی چوتھی قسط میں ''جاوید نامہ'' پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔اسی طرح ایک اور مقالہ ''چراغ لالہ'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔سردار جعفری کی تمام تحریریں تفہیم اقبال کے سلسلہ میں ایک نقطہ نظر فراہم کرتی ہیں جو اقبال کو بے پناہ صلاحیتوں کا حامل،وسیع النظر،تاریخی شعور وادراک کا مالک دانشور ثابت کرتی ہیں''۔84

ترقی پسند ادب کے بعد کے عرصہ میں اقبال پر تنقید کے سلسلہ میں سردار جعفری کے رویہ میں تبدیلی آئی۔اس تبدیلی کی

نشاندہی کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''پیغمبران سخن کی طرح سردار جعفری نے اقبال شناسی کے مضامین میں بھی اپنے پختہ کار اور تجزیاتی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہی اقبال جو اشتراکیت سے متاثر، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور حرکت و عمل کے فلسفے کے علمبردار ہونے کے باعث اپنی ابتدائی شاعری کے حوالے سے ان کے تعریف کے مستحق ٹھہرے تھے قدرے بعد کی شاعری میں مردکامل کے لئے شاہین کی علامت کے استعمال کے سبب ان کے معتوب ہوگئے تھے اور انہوں نے ترقی پسند ادب میں لکھا تھا کہ ''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسی ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے''۔ اقبال شناسی کے مضامین میں جلال کو جمال اور عقل کو دل سے الگ کر کے دیکھنے کا انداز نہیں ملتا اور وہ اقبال کے مختلف ادوار کے کلام کو ایک ہی سلسلہ کی کڑی تصور کرتے ہیں۔ ان کو خودی کے استحکام کے سارے عناصر ہندوستان اور ایشیاء کی مسلم بیداری کے وسائل دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسلم بیداری ان کے نزدیک دراصل عالم انسانیت کی بیداری کا حصہ ٹھہرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنل ازم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا، اس لئے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے''۔ 85

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا ہے کہ اقبال شناسی میں انہوں نے اقبال پر اپنی پہلی رائے کی بھرپور تلافی کر دی ہے اور اقبال کی نئے انداز میں بازیافت بھی کی ہے۔

''جب سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب شائع ہوئی تھی تو اس میں بھی اقبال کے تعلق سے منٹو کے تعلق سے اور ایسے ہی بعض دوسرے ادبی مسائل پر کسی قدر شدت پسندی کا اظہار ہوا تھا لیکن ۔۔۔ اس کے فوراً ہی بعد سردار جعفری نے اپنے اس رویہ کی بھرپور تلافی بھی کر دی اور اقبال کے سلسلہ میں مستقل نوعیت کا عظیم الشان کام کیا ہے۔ اقبال صدی کے سلسلہ میں انہوں نے جو کام کیا ہے وہ دراصل اقبال کی نئے انداز سے بازیافت کا کام تھا''۔ 86

پیغمبران سخن

پیغمبران سخن سردار جعفری کی مرتب کردہ تین کتابوں، کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے جو 1958 اور 1965 کے درمیان لکھے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے ان تینوں مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں ''پیغمبران سخن'' کے نام سے شائع کرا دیا۔ ہر دیباچہ بجائے خود ایک مکمل مقالہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1970 میں مکتبہ گفتگو سے شائع

ہوئی۔اس میں سب سے پہلا مقالہ کبیر پر ''حرف محبت'' کے عنوان سے ہے۔دوسرا میر تقی میرؔ پر ''صبا در بدر'' کے عنوان سے اور تیسرا اور آخری مقالہ مرزا غالبؔ پر ''تمنا کا دوسرا قدم'' کے عنوان سے ہے۔

اس کتاب کے دیباچے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی اختیار نہیں کیا ہے۔میرے لئے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے۔میں جس نظریۂ جمال اور نظریۂ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔وقت کی وہ روانی جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک بہتے ہوئے دریا کی شکل میں پیش کرتی ہے اس کی موجوں میں شعر و فن بھی شامل ہیں۔ان مضامین میں اس مشکل سوال کا جواب مل جائے گا کہ صدیاں گذر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ان بزرگ شعراء کا کلام ہمارے ذوق کی تسکین کا باعث کیسے بن سکتا ہے۔عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔

سردار جعفری نے کبیر (پندرھویں صدی)، میر (اٹھارویں صدی) اور غالب (انیسویں صدی) کی بازیافت اپنے خاص نقطۂ نظر سے کی ہے۔ان شعراء کی شاعری کو انہوں نے ان کے عہد اور حالات کے پیش نظر دیکھا اور اس کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی اور شاعری میں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کو حق بجانب بتلایا ہے۔

علی سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبران سخن'' میں حرف محبت کے عنوان کے تحت کبیر پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔انسانی مساوات، تصوف، بھکتی کا ذکر کیا گیا ہے۔رومی، شنکر اچاریہ، کبیر، رامانند، ڈاکٹر تاراچند اور اقبال کے حوالے دیئے گئے ہیں اور آخر میں سردار جعفری نے لکھا ہے ''یہ کبیر کی، رومی کی غرض تمام سنتوں اور صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لئے ہوئے ہے۔

صبا در بدر عنوان کے تحت میر پر لکھا گیا ہے۔سردار جعفری نے بتایا کہ میر کا مقام شاعری ہی نہیں بلکہ زبان کے ارتقاء کی تاریخ میں بھی بہت اہم ہے۔ان کی شاعری اس عہد کی ترجمان ہے۔ان کا دیوان ان کے اپنے نہیں بلکہ سارے زمانے کی درد و غم کا مجموعہ ہے۔انہوں نے دنیا کے مال و دولت سے زیادہ اخلاقی قدروں کو قیمتی سمجھا۔میر نے اپنی غزل کو اپنے عہد کا آئینہ بنا دیا۔سردار جعفری نے میر کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا اور کہا کہ زمانہ کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔

تمنا کا دوسرا قدم کے عنوان کے تحت سردار جعفری نے غالب کو موضوع بنایا ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ غالب اردو کا محبوب ترین شاعر ہے۔وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی جی کھول کر ہنسنا جانتا ہے۔غالب کے غم دل آویز ہیں اور ان میں بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے پاس نہیں۔وہ بلاؤں سے دست و گریباں ہو کر سامان طرب حاصل کرتا ہے۔غالب کے پاس انسان کائنات کا محور ہے۔غالب شوق اور طلب کی راہ میں ایک لمحے کے لئے بھی آسودہ نہیں ہونا

چاہتا۔منزل سے کہیں زیادہ لذت منزل کی جستجو میں ہے کیونکہ منزل آسودگی ہے اور آسودگی روح و دل کی موت۔

سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبران سخن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شافع قدوائی نے سردار جعفری کے تنقیدی موقف میں تبدیلی اور ان کی وسیع النظری پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔''علی سردار جعفری کی تنقیدی بصیرت کا اصل ثبوت 1970 میں شائع ہونے والی ان کی کتاب پیغمبران سخن ہے جو اصلاً ان کی مرتبہ تین کتابوں کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے۔مصنف کے مطابق یہ دیباچے 1958 اور 1965 کے درمیان لکھے گئے تھے۔سردار جعفری نے دیباچہ نگاری کے روایتی تصور سے انحراف کرتے ہوئے زیر مطالعہ شعراء کی مدلل مدح سرائی نہیں کی بلکہ زیر بحث شاعروں کے موضوعاتی شعور اور فنی حسن و قبح پر بھی دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔یہ دیباچے ایک نئی تنقیدی فضاء کا احساس کراتے ہیں اور ان میں ادب کے افادی اور سماجی کردار اور موضوع پر بیجا اصرار نہیں ملتا بلکہ شاعری کے مطالعے کے دوران موضوعاتی تشریح میں نظری اور فکری سرچشموں، روایتی اور تہذیبی ماخذوں اور فنی، لسانی اور اسلوبیاتی خصائص پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔اس نوع کے مباحث سے ترقی پسند ادب کے صفحات تہی ہیں''۔

2۔پیغمبران سخن کے مطالعہ سے صاف طور پر منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری نے اپنے تنقیدی نقطہ نظر میں خاصی لچک پیدا کرلی ہے۔ترقی پسند ادب میں اقبال اور اصغر کے تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا گیا تھا کہ اس میں عوام کی بھلائی کا کوئی تصور موجود نہیں اور یہ بھی باور کرلیا گیا تھا کہ درویشی اور قلندری کی فی زمانہ کوئی وقعت نہیں ہے۔تاہم پیغمبران سخن کے دیباچہ میں سردار جعفری اپنے تنقیدی موقف میں واضح تبدیلی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لئے قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہئے۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لئے اہم ہیں''۔

3۔ادب کے سماجی کردار کی اشاعت و ترویج کو تنقید کا اولین فریضہ نیز دوسرے تمام تنقیدی نقطہ ہائے نظر کو رجعت پسندانہ قرار دینے والے سردار جعفری اب اعتراف کرتے ہیں کہ تنقید بھی ہزار شیوہ فن ہے اور ہر لکھنے والا ایک نئے نقطہ نگاہ سے پرانے سے پرانے شاعر کی طرف توجہ کرسکتا ہے۔یہ وسیع النظری ایک نئے تنقیدی محاورہ کی جستجو کی غماز ہے''۔ 88

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کے کبیر پر تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار نے کبیر کا مطالعہ ایک پیغام انسانیت کا مطالعہ ہے جو سردار نے اپنی تقویت کے لئے بھی لیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

''کبیر داس کا مطالعہ محض ایک شاعری کا مطالعہ نہیں ہے۔ایک پیغام انسانیت، ایک مشترکہ تہذیب کا مطالعہ ہے۔اپنی تہذیبی آمیزش کی روح کی تلاش ہے۔دیگر تہذیبوں کے اثرات کی جستجو ہے۔پیغمبران سخن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''کبیر داس کی عظمت ہندو بھگتی اور مسلم تصوف کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور یہ امتزاج نہایت خوبصورت ہے۔

2۔''ان کا خیال ہے کہ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھل اور پھول عہد کی حدوں کو توڑ

کرنکل جاتے ہیں۔وہ پھل پھول کومحسوس کرنے کے بعد ان کی جڑوں کو بھی تلاش کرتے ہیں جہاں سے شاعری کے چشمے پھوٹتے ہیں۔چنانچہ کبیر پر بات کرتے وقت وہ جس طرح بھگتی،تصوف اور خود کبیر کی خاندانی زندگی، جولاہوں اور کوریوں کی ذات پات،ان کا پھیلاؤ اس طرح پیش کرتے چلے جاتے ہیں جس طرف ان کا علم ہی نہیں بلکہ انسانوں کے تئیں ان کی محبت و قربت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ہندوستان کی سیاسی وسماجی صورت حال اور اس کے بطن سے کبیر کا جنم، رامانند کی شاگردی، فاقہ مستی، انسان دوستی نے کبیر کے تصوف کو جس بلند مقام پر پہنچادیا تھا وہ سردار جعفری کے مطابق کئی بھگتوں،صوفیوں،شاعروں کی ایک آواز بن کر ابھرتا ہے۔وہ اس آواز کو کہاں کہاں سے ملاتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے:

''بعض مقامات پر منصور کی اناالحق کی گونج کے علاوہ کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے جسے انہوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے۔وہی جاہ وجلال، وہی بے تابی اور بے قراری جو رومی کی خصوصیت ہے کبیر کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے جہاں عجز وانکسار،خشوع وخضوع ہے اور مسلم تصور مقام بقا پر پہنچاتا ہے جہاں قوت،عظمت،جلال و جمال، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں۔۔۔گرونانک اور ٹیگور میں تو اس کے اثرات ملتے ہیں ہی۔وہ میر، غالب اور اقبال کی شاعری میں بھی ان صداؤں کو سنتے ہیں اور ان کا تجزیہ بھی اسی انداز سے کرتے ہیں۔اقبال کے بارے میں تو وہ بطور خاص کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ کبیر، رومی غرض یہ کہ تمام سنتوں،صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لئے ہوئے ہے۔وہ کبیر کا مطالعہ محض اپنے نقطہ نظر کی تسکین کے لئے نہیں تقویت کے لئے بھی کرتے ہیں اور اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس صوفی سنت کے دل سے پیدا ہوئی۔کبیر کا تجزیہ ان کے دل ودماغ کی نکلی ہوئی آواز ہے جہاں فکر پر جذبہ غالب ہے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں جذبہ کم،فکر زیادہ کام کرنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ میر، غالب کا تجزیہ کرتے ہیں تو صوفی اور شاعر کے فرق کے پیش نظر ان کی نگاہیں باریک اور دوربین ہوتی جاتی ہیں لیکن زاویہ نظر وہی ہے جو کبیر سے متعلق تھا''۔ 89

ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کے کبیر کے مطالعہ میں انسان دوستی کی تلاش کو اجاگر کیا۔سردار جعفری نے کبیر کا موازنہ علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے۔

پیغمبران سخن دراصل کبیر،میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے جن میں بقول ابوالکلام قاسمی ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورتحال اور ادبی روایت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کتاب میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ قرار دینے اور انسان دوستی یا ہمہ گیر عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب دکھایا گیا ہے۔کبیر کی شاعری کے اس تجزیہ میں بھگتی،ویدانت اور متصوفانہ فکر کے یکساں سرچشموں کا سراغ لگاتے ہوئے انہوں نے کبیر کا موازنہ جلال الدین رومی اور دوسرے صوفی شعراء کے افکار سے علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے''۔ 90

ڈاکٹر قمر رئیس نے سردار جعفری کے مطالعہ کبیر میں انسانی مساوات،انسانی وحدت،انسانی ہمدردی کی تلاش کو اجاگر کیا۔

''سردار جعفری نے کبیر اور میر کی شاعری میں بھگتی اور تصوف کے مسلک کا مطالعہ تاریخی حوالوں سے کر کے انسانی مساوات کے تصور پر زور دیا ہے۔ذات پات رنگ و نسل اور سماجی اونچ نیچ کی تفریق کے مقابلہ میں کبیر نے انسانی وحدت، انسانی دردمندی اور عالمگیر محبت کی تبلیغ کی جس کے اثرات ہندوستانی سماج اور اس سے زیادہ ہندوستانی فکر کے ارتقاء میں نمایاں رہے۔سردار جعفری کہتے ہیں ''ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی''۔ 91

شافع قدوائی نے کبیر پر سردار جعفری کی تنقید کی ستائش کرتے ہوئے کبیر کے کلام کا رومی سے موازنہ کو قابل قدر تنقیدی کارنامہ قرار دیا۔کبیر کے کلام کا رومی سے موازنہ بھی سردار جعفری کا قابل قدر تنقیدی کارنامہ ہے کہ کبیر اور رومی کے تقابلی مطالعے کی کوئی روایت نہیں ملی۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے جسے انہوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے وہی جاہ و جلال، وہی بیتابی، وہی بیقراری جو رومی کی غزلوں کی خصوصیت ہے، کبیر کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے جہاں عجز و انکسار، خشوع و خضوع ہے اور مسلم تصوف مقام بقا پر پہنچاتا ہے جہاں قوت و عظمت، جلال و عظمت، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں''۔ 92

عمر رضا نے کبیر پر سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں کبیر کی شاعری میں انسانیت، یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کی گئی ہے۔کبیر کے ہاں ترک دنیا کے تصور کی خوبصورت وضاحت کی گئی ہے۔حقوق اللہ اور بالخصوص حقوق العباد کے اسلامی تصور کو اجاگر کرتے ہوئے ان حقوق کی ادائیگی کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

1۔''پیغمبران سخن کے پہلے مقالہ بعنوان ''حرف محبت'' میں سردار جعفری نے کبیر کی شاعری کے بالخصوص پریم، انسانیت، یکجہتی اور کثرت میں وحدت جیسے تصورات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔علاوہ ازیں کبیر کے مذہبی تصورات، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان یگانگت، نظریہ طبقاتی اور ذاتی تقسیم وغیرہ پر مختصراً لیکن جامع روشنی ڈالی ہے۔سردار جعفری نے رومی، شنکر اچاریہ، اقبال، ٹیگور اور تاراچند کے حوالے سے کبیر کے مختلف تصورات کی وضاحت کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کبیر کی تعلیمات میں ہندو مسلم اتحاد، انسانیت، مساوات (ذات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر) اور ہندوستان کی جو ملی جلی تہذیب ہے، اس کی اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا''۔۔۔

2۔''کبیر کے یہاں ترک دنیا کا جو تصور ملتا ہے اس سے بھی بحث کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کبیر کے یہاں ترک دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی ذات میں گم ہو جائے اور اپنی نجات کے لئے مراقبے میں کھو جائے۔وہ خود شادی شدہ آدمی تھے اور صاحب اولاد تھے، کرگھے پر خود کپڑا بنتے تھے اور پھیری لگا کر اسے بیچتے تھے اور اس کی آمدنی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ان کی مادی اور جسمانی محنت ان کے روحانی نغموں کی تخلیق میں حائل نہیں ہوتی تھی بلکہ شاید اس میں مدد دیتی تھی''۔ 93

3۔''کبیر کے یہاں موجود اس اسلامی تصور کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کی رو سے انسان کے دو حقوق، حقوق اللہ اور حقوق

العباد کی بات کی جاتی ہے۔اول الذکر کی عدم توجہی یا عدم پابندی کو خدا معاف کرسکتا ہے لیکن آخر الذکر کا تعلق سماجی ذمہ داریوں اور بندوں کے حقوق سے ہے اس لئے جب تک عزیز و اقارب، پڑوسی، ہم وطن اور اہل دنیا کا حق ادا نہیں کر دیا جاتا، خدا معاف نہیں کرسکتا۔۔۔"

4۔"کبیر کی تعلیمات میں جو ہمیں دوہوں اور پدوں کی شکل میں ملتی ہیں مختلف صوفی شعراء کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے مثلاً بابا فرید، جلال الدین رومی اور شیخ سعدی وغیرہ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اردو اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں۔۔۔"

5۔"سردار جعفری نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ آج جب کہ ہر طرف شکست وریخت، فرقہ وارانہ نفاق اور مذہبی بیگانگی پیدا ہو رہی ہے، ایسے میں کبیر کی تعلیمات سے سبق لے کر ایک اچھے اور بہتر معاشرے کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔

بقول ان کے:

"ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی۔آج دنیا آزاد ہو رہی ہے۔سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھایا ہے۔صنعتوں نے اس کے دست و بازو کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔پھر بھی حقیر ہے، مصیبت زدہ ہے، دردمند ہے۔وہ رنگوں میں بٹا ہوا ہے۔قوموں میں تقسیم ہے۔اس کے درمیان مذہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں۔طبقاتی کشمکش کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں۔بادشاہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیوروکریسی لے رہا ہے۔دلوں کے اندر اندھیرے ہیں۔چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں اور رعونتیں ہیں جو انسان کو انسان کا دشمن بنا رہی ہیں۔جب وہ حکومت، شہنشاہیت اور اقتدار سے آزاد ہوتا ہے تو خود اپنی بدی کا غلام بن جاتا ہے۔اس لئے اس کو ایک نئے یقین، نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کبیر کی آواز اور اس کی صدائے بازگشت اس عہد کی آواز بن کر سنائی دیتی ہے۔

(علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، صفحہ 55-54)

6۔"اس طرح سردار جعفری نے مذکورہ مقالہ میں کبیر کی گنگا جمنی روایات اور ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کی وکالت کی ہے۔مساوات کا درس، مذہب سے بالاتر انسانیت کی بازیافت اور بالخصوص "حرف محبت" (ڈھائی اکشر پریم کے) کا خلاصہ بیان کیا ہے جس کا براہ راست اور بالواسطہ فارسی روایات اور مسلم صوفیا سے رشتہ جوڑ کر سردار جعفری نے ایک نئے تناظر میں کبیر کی اہمیت اجاگر کی۔بالخصوص اس کے ذریعہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد، یگانگت اور بھائی چارا پیدا کرنے کی سعی کی ہے"۔ 94

سردار جعفری نے میر کی شاعری کو تاریخی حالات و حادثات کے پس منظر میں بھی دیکھا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی وضاحت ملاحظہ کیجئے:

"میر کی شاعری کو وہ (سردار جعفری) تاریخی حالات و حادثات کے پس منظر میں ایک زخم خوردہ شاعر کی آواز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب جب انسان کے دماغ پر ضربیں لگی ہیں، اس نے زخم کھائے ہیں، میر کے دیوان کو کلیجے سے لگایا ہے۔

آخر کوئی تو بات ہے کہ 1947 کے حادثات کے بعد لہولہان ہندوستان پاکستان نے سب سے زیادہ کلیات میر میں اپنے زخموں کا مرہم تلاش کیا۔غالب، اقبال، جوش وغیرہ کا دامن چھوڑ کر میرؔ کے دامن میں پناہ لی۔انسان اور انسانیت کے حوالے سے میرؔ کو یاد کرنا اور نہایت مدلل، منطقی انداز میں غم ذات کو غم کائنات بنا کر پیش کرنا سردار جعفری کا نظریہ تنقید ہے اور ایک وسیع انداز ترقی پسندی بھی۔میر کی شاعری پر بات کرتے کرتے جب وہ میر کی آپ بیتی پر آتے ہیں تو ایک بار پھر تاریخ و تہذیب کے گل کھلنے لگتے ہیں اور ایک نئے میر کی دریافت ہونے لگتی ہے جہاں سے میر کی انسانیت اور مساوات کے دروازے کھلتے ہیں جو اس سے قبل ذرا مشکل سے ہی نظر آتے ہیں''۔ 95

دیباچہ، دیوان میر میں سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری کی تمام جہتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''میرؔ کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، بلبل بھی اور صیاد بھی، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانہ کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے''۔

عمر رضا نے میر تقی میر پر سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے میرؔ کے کلام میں حوصلہ مندی عصری حسیت، انسان دوستی، معاشی حالات، سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج کی نشاندہی کی ستائش کی ہے:

1۔سردار جعفری نے میرؔ کے کلام میں غم کو رجائیت اور حوصلہ مندی سے تعبیر کیا ہے۔

2۔سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

3۔سردار جعفری نے میرؔ کی عشقیہ شاعری میں تصوف کو تلاشنے کی سعی کی ہے۔

4۔سردار جعفری لکھتے ہیں:

انہوں نے (میر) نے اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ بتایا ہے اور یہ درد و غم صرف ذاتی نہیں ہے کیونکہ جہاں سارا عالم خاک ہو چکا وہاں صرف اپنے آپ پر رونا بے سود ہے۔اس لئے میرؔ کے یہاں دل اور دہلی کی خرابی (نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے) کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور عاشق اور آدم ہم معنی الفاظ ہیں۔(سردار جعفری پیغمبران سخن 122)

عمر رضا لکھتے ہیں:

محولہ بالا اقتباس میں سردار جعفری کی اجتماعیت پسندی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ترقی پسندی کی شناخت ہے۔چنانچہ انہوں نے میر کی غزلوں کے ایسے متعدد اشعار نقل کئے ہیں جن میں میرؔ نے براہ راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔

علاوہ ازیں ایسے اشعار بھی نقل کئے ہیں جن میں میرؔ نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے۔یہی محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ان باتوں کی وضاحت کے لئے سردار جعفری نے میرؔ کے ڈھیر سارے اشعار نقل کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ محبوب

کے اس تصور کے پیچھے حالات زمانہ کا ایک سماجی شعور ہے اور ان بظاہر سادہ شعروں کی تہہ میں دبا ہوا ایک احتجاج ہے۔

5۔ ''سردار جعفری کو میرؔ کی شاعری میں ایک ایسا محبوب بھی نظر آتا ہے جو میر کا ذاتی محبوب ہے''۔۔۔

6۔ ''سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں انسان دوستی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی عکاسی اور موجودہ عہد کی مختلف خرابیوں کے خلاف ان کے یہاں جس طرح کا صدائے احتجاج پایا جاتا ہے اس کی طرف توجہ مرکوز کر کے اپنے نظریہ شعر کے جواز کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ انہوں نے وقت اور حالات کے مطابق کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ انداز بیان اختیار کیا ہے''۔ 96

میرؔ کے کلام پر سردار جعفری کی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے شافع قدوائی نے کھڑی بولی کے نکھرے روپ موضوع اور اسلوب کی وسعت اور بالخصوص میرؔ اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی تعریف کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

1۔ ''سردار جعفری کے نزدیک میرؔ کی عظمت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ان کا کلام موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے تمام رنگوں کو محیط ہے اور لسانی اعتبار سے میر کا مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ کھڑی بولی جس پر جدید ہندی اور اردو زبان کی بنیاد ہے اتنے نکھرے ہوئے روپ میں میرؔ کے ہاں نظر آتی ہے کہ اس کے بعد ہر کسی کا روپ میرؔ کی دین معلوم ہوتا ہے۔ اسلوب اور انداز کے اعتبار سے بھی میرؔ کی حیثیت ایک ایسے شاعرانہ سرچشمے کی سی ہے جس سے تمام ندیاں پھوٹتی ہیں۔ وہاں غالب کے رنگ کے ساتھ ساتھ خارجیت کا وہ انداز بھی ملتا ہے جسے لکھنو سے منسوب کیا جاتا ہے''۔

2۔ ''میرؔ اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی اولین کوشش کا سہرا بھی سردار جعفری کے سر ہے:

''لطف یہ ہے کہ جس کو آج اقبال کی غزل کا نیا اسلوب سمجھا جاتا ہے اور جس کی روانی میں فکر کی عظمت کی وجہ سے ایک بھاری پن آ گیا ہے اور گمبھیر کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس کے نشانات بھی میرؔ کے یہاں موجود ہیں اور بعض مقامات پر علامتوں ہی کی نہیں بلکہ خیالات کی حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ حالانکہ فکری اور جذباتی اعتبار سے میرؔ اور اقبال کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ حائل ہے''۔ 97

بقول شافع قدوائی ''کیا ہی اچھا ہوتا اگر سردار جعفری میرؔ اور اقبال کے کلام کے متعین حوالوں سے اس نکتہ کو مزید Develop کرتے تو ان کا یہ Thesis اردو تنقید میں سنگ میل ثابت ہوتا''۔

3۔ سردار جعفری نے میر کی غزل کا مابہ الامتیاز عنصر Conversational Style قرار دیا ہے۔ فارسی الفاظ کے استعمال میں بھی میرؔ ہندوستانی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ سردار جعفری نے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے متعین مثالیں بھی پیش کیں۔ ''فارسی الفاظ کے استعمال میں بھی میرؔ نے ہندوستانی لب ولہجہ کو فارسی لب ولہجہ پر ترجیح دی ہے مثلاً وہ خیال اور پیار کی ''ی'' کو ظاہر نہیں کرتے۔ میرؔ کی غزلوں کا ترنم بھی عوامی لب ولہجہ سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی غزلوں میں فارسی غزل کی نفاست سے زیادہ ہندی شاعری کی ارضی کیفیات ہیں۔ تشبیہوں اور لفظی تصویروں کے معاملہ میں بھی وہ مروجہ فارسی خزانہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے گرد و پیش سے تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ 98

دیوان غالب کے دیباچہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب علی نے لکھا ہے کہ یہ کلام غالب کی نئی تعبیر و توجیہہ پیش کرتا ہے۔

تاراچن رستوگی کے قول کے مطابق ''یہ اہم تنقیدی ہوش وخرد کی آئنہ داری کرتا ہے۔دیباچے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں سردار نے غالب کو ایک آفاقی شاعر قرار دیا:

''غالب کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے نیا اضطراب پیدا کیا۔اس کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔اس نے اپنے ہر تجربے کو جو ایک انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق رکھنے والے ذہن کی کارفرمائی تھی انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلایا ہے۔کلیئے کی کسوٹی پر کسا ہے اور پھر شعر کی شکل میں ڈھالا ہے۔تب اس کے یہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبہ کا شاعر بن گیا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب علی لکھتے ہیں:

''ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں ہوتی ہیں اور بے شمار مسائل ہوتے ہیں مگر ان سب کا پرتو غالب کے کلام میں ملتا ہے۔اس طرح غالب کے اشعار ہمارے دل و دماغ کو تازگی اور آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔اسی باعث غالب کے بہت سے اشعار جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہو کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں''۔ 99

مرزا غالب کی شاعری میں اس دور کا عہد،غم میں نشاط کی کیفیت،انسانی عظمت،منزل کی جستجو،حرکت وعمل کی نشاندہی اور سردار جعفری کا اس نتیجہ پر پہنچنا کہ غالب کی شاعری بھی اس عہد کے سیاسی،معاشی اور اخلاقی حالات سے متاثر تھی ان سب باتوں کا ذکر عمر رضا نے کیا ہے:

1۔''پیغمبران سخن میں غالب کی شاعری پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔علاوہ ازیں انیسویں صدی کے اس عہد کا بھی ذکر ہے جس میں مغل تہذیب دم توڑ رہی تھی اور نئی صنعتی تہذیب کے نقوش ابھر رہے تھے۔سردار جعفری کا ماننا ہے کہ ان سب نے مل کر غالب کی شخصیت اور شاعری پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔یہی جہہ ہے کہ اس مضمون میں انہوں نے غالب کی شاعری کو غالب کے عہد اور مزاج اور شخصیت کے مطابق جانچا اور پرکھا ہے''۔۔۔۔غالب کے یہاں غم میں بھی نشاط کی کیفیت پائی جاتی ہے''۔۔۔

2۔''سردار جعفری نے غالب کی کائنات میں انسان کی حیثیت اور جگہ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''غالب کی نظروں میں ایک انسان کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ وہ اسے کائنات کا محور سمجھتا ہے اور دنیا کی تخلیق کا باعث قرار دیتا ہے''۔ 100

3۔''شوق تو غالب کا محبوب لفظ ہے۔شوق وطلب کی راہ میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی آسودہ ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ منزل کی جستجو میں لذت محسوس کرتے ہیں۔غالب کی شاعری میں حرکت وعمل کے تصورات بھی در آئے ہیں جس کا اظہار انہوں نے موج،تلاطم،طوفان،شعلہ،سیماب،برق اور پروانہ جیسے الفاظ سے کیا ہے اور ان کی شاعری میں اس طرح کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔اگر چہ غالب کی ان تمام خصوصیتوں کو سردار جعفری نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کی شاعری کو ان کے عہد،گرد وپیش میں ہونے والے حالات وواقعات اور دیگر امور سے جس طرح انہوں نے جوڑ کر دیکھنے کی سعی کی ہے وہ

قابل غور ہے''۔۔۔

4۔''سردار جعفری نے غالب کی اس شاعری کا بطور خاص جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جس میں غالب کا پورا عہد جھلکتا ہے۔سردار جعفری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی شاعری بھی اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات سے متاثر ہے۔ اس میں ان کے عہد کا خمار اور نشہ ہے، جاتی ہوئی رات کا کرب اور آتی ہوئی سحر کا نشاط بھی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے ظاہری اور باطنی اضطراب کو کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری عہد کے شکنجوں کو توڑتی اور ماضی و مستقبل کی وسعتوں میں پھیلتی نظر آتی ہے۔انتہائی نشاط ہو یا انتہائی مایوسی، تشکیک کا عالم ہو یا پھر تصور کی کرشمہ سازی، ہر کیفیت کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ظاہر ہے اس مضمون میں بھی سردار جعفری کا ترقی پسند نظریہ ادب پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے جس میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے''۔ 101

پیغمبران سخن میں سردار جعفری نے غالب کے سلسلہ میں لکھا ہے:

''غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری تصویر گری کی معراج ہے۔جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک لفظ حرکت کرنے لگتا ہے۔ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں اور خیال ایک پیکر نور بن کر سامنے آجاتا ہے''۔

اس اقتباس پر ابوالکلام قاسمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کے پہلے اور دوسرے دور کے تنقیدی رویہ میں تبدیلی کی نشاندہی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو نشان زد کیا گیا ہے وہیں استعارہ سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا گیا ہے۔یہ وہی استعارہ سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری اپنی ابتدائی تنقید میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنا چکے ہیں''۔ 102

سردار جعفری نے غالب کے ہاں جن چیزوں کی تلاش کی ان میں کائنات اور فرد، تصوف، ان کے دل آویز غم جسے نشاط غم کہا گیا، شوق، آرزو، حرکت و عمل، انسانی عظمت، انسان دوستی، کائنات کو سماج کی فلاح و بہبود کی نظر سے دیکھنا شامل ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے غالب کے ہاں سردار جعفری کی ان دریافتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''غالب جیسے رنگا رنگ، متضاد اور مختلف جہات شاعر کے تجزیہ میں ہی وہ (سردار جعفری) سب سے پہلے کائنات اور فرد سے متعلق غالب کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر تصور کی طرف چلے جاتے ہیں۔وہ غالب کو ہیگل وغیرہ کے قریب پاتے ہیں۔ ویدانت، ایرانی و تاری پیکن ازم کی آمیزش تلاش کرتے ہوئے غالب کی شاعری میں اقبال کے فلسفہ خودی کے ابتدائی نقوش تلاش کر لیتے ہیں۔سردار کا کمال یہ ہے کہ وہ نہایت فکری و استدلالی انداز میں غالب کے رنج و غم میں تجدید طرب کی بنیادیں تلاش کر لیتے ہیں اور تفہیم غالب و تفسیر غالب کی ایک نئی امیج پیش کرتے ہیں۔وہ غالب کی دلآویزی پر کھل کر باتیں کرتے ہیں اور اس میں امید و نشاط کی کیفیتیں محسوس کرنے کے بعد لکھتے ہیں''غالب کے غم اتنے دل آویز ہیں ان میں جو بھرپور نشاط کی

کیفیت ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملے گی ۔۔۔غالب کی شاعری میں غم ونشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔وہ دراصل نشاطِ غم کا شاعر ہے یعنی وہ بلاؤں سے دست وگریباں ہوکر سامان طرب حاصل کرتا ہے"۔تجسس وتفحص کی راہ سے گذرتے ہوئے وہ (سردار جعفری) غالب کے ذہن میں بسے ہوئے انسان کے تصور کو تلاش کر لیتے ہیں۔وہ غالب کی شاعری میں انسانی آرزوؤں، جذبہ وشوق سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جہاں غالب کی نظر میں یہ پوری کائنات انسانی تمناؤں کا صرف ایک قدم بن کر رہ جاتا ہے۔سردار جعفری نے اقبال کی طرح غالب کے شوق کو بھی جس طرح تلاش اور پیش کیا ہے اس سے بھی غالب کی نئی جہتیں کھلتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ شوق اور آرزو کی لذت ہی راہگذروں کو لذت سے آشنا کرتی ہے اور اسی چیز نے غالب کی شاعری کو حرکت کے تصور سے سرشار کر دیا ہے جس کا اظہار موج ،تلاطم،طوفان،شعلہ، سیماب، برق اور پروانہ کے الفاظ کی بہتات سے ہوتا ہے۔یہی ساری اشیاء مل جل کر غالب کے جمالیاتی ذوق کی تعمیر کرتی ہیں اور ان کے معشوق کو بھی برق وشرر کی طرح پیش کرتی ہیں اور طرح طرح کی امیجری بھی پیش کرتی ہیں۔مجموعی طور پر سردار جعفری غالب کی شاعری میں ایک نئے انسان اور ایک نئی دنیا تلاش کرتے نظر آتے ہیں ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اور اس حسرت تعمیر کے حوالہ سے سردار جعفری نے غالب کے عہد کو چھوتے ہوئے تاریخ وتہذیب کی تبدیلی ،قدامت وجدیدیت کے تصادمات پر جو فکر انگیز بحثیں کی ہیں وہ ان کی تجزیاتی فکر اور ترقی پسندانہ نقطہ نظر کا ایک مخصوص حصہ ہیں اور نہایت منطقی وپرکشش انداز واسلوب۔۔۔۔۔سردار جعفری کبیر،میرؔ اور غالبؔ کو عام روش، عام ڈگر پر کھڑے ہوکر دیکھ سکتے تھے لیکن شاعری،فنون لطیفہ،ادب، آرٹ غرض یہ کہ ساری کائنات کو انسان اور انسانی سماج کی فلاح وبہبود کی نظر سے،تہذیب وتمدن، انسانی بقا ایک مخصوص زاویہ نظر سے دیکھنا سردار جعفری کا اپنا ایک مخصوص ومنفرد اور وسیع نقطہ نظر ہے"۔103

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے غالب پر سردار جعفری کی تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار جعفری نے حافظ کے بعد کا مقام (بالخصوص غزل میں) بتلایا ہے اور انہیں شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور یہ کہ سردار جعفری نے غالب کے سماجی حالات اور مسائل،سماج کی خوشیوں غموں کے حوالے سے غالب کے کلام کی جہات کا تعین کیا ہے:

1۔سردار جعفری نے غالب کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت دیتے ہوئے غالب کی غزل کے آہنگ کو میرؔ کے آہنگ سے اونچا قرار دیا ہے لیکن یہی نہیں وہ تو غالب کی غزل کے اس قدر ستائش گر ہیں کہ اردو شاعری ہی میں نہیں، فارسی شاعری میں بھی غالب کو امتیازی حیثیت کا مالک قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک غالب کا درجہ حافظ کے بعد ہے بالخصوص غزل میں۔۔۔۔

"اتنی حسین غزلیں حافظ کے بعد صرف غالب نے کہی ہیں اور آج تک کوئی اور شاعر اس کیفیت ونشاط ،لطف وسرور کو الفاظ میں اتنی شدت اور حسن کا اسیر نہیں کر سکا"۔ 104

2۔۔۔۔سردار جعفری نے غالب کو شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا ہے کہ ان کے کلام میں اتنی وسعت اور تہہ داری ہوتی ہے کہ ان کا ایک ایک مصرعہ ہزار مواقع پر ہزار معنی پیدا کر سکتا ہے۔۔۔

3۔سردار جعفری، غالب سے اگر چہ ایک تعلق خاطر محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں غالب پرستی نہیں۔ وہ نہایت معروضی انداز میں اور تنقید کے وزن ووقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

4۔سردار جعفری اس نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ غالب کے ہاں خوشی اور غم کے جذبات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ گویا غالب نے غم کو نشاط اور نشاط کو غم میں تحلیل کر دیا۔

''غالب کے غم اتنے دلآویز ہیں کہ ان میں جو بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔۔۔غالب کی شاعری میں غم ونشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ 105

5۔وہ (سردار جعفری) غالب کے سماجی حالات، ان کی ضرورتوں، ان کے مسائل اور مصائب، ان کی خوشیوں اور مسرتوں اور غموں اور دکھوں کو اہمیت دیتے ہیں اور انہی کے حوالے سے غالب کے کلام کی جہات کا تعین کرتے ہیں۔106

غزل سے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں:

''غزل غنائی اور داخلی شاعری کی معراج ہے۔اس لئے اس کے اشعار میں ذاتی جذبے اور سماجی اضطراب کے درمیان حد کھینچنا مشکل ہے''۔ 107

سردار جعفری کے کبیر، غالب، میر اور اقبال کی شاعری پر کئے گئے مطالعوں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے بتایا کہ سردار جعفری نے اپنی تنقیدوں میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب اور انسانی دوستی کو ملحوظ رکھا ہے۔

پروفیسر شارب ردولوی نے ایک بہت اہم بات بھی بتلادی ہے کہ یہ مطالعہ تفہیم وتعبیر شعر کے معیار کا بھی تعین کرتے ہیں:

''سردار جعفری کے ان مطالعوں میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان میں کسی طرح کی نظریہ سازی سے کام نہیں لیا۔انہوں نے سارے کام میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب کو سامنے رکھا ہے۔اس لئے یہ مطالعے صرف کبیر، میر، غالب اور اقبال کی ہی تفہیم میں مدد نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور پر تفہیم وتعبیر شعر کے معیار کا تعین کرتے ہیں''۔108

ایک دوسرے مضمون میں شارب ردولوی نے سردار جعفری کے کبیر، میرابائی، میر اور غالب اور اقبال پر کئے گئے مطالعوں کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے شاعری کے علاوہ اردو تنقید میں بھی اپنے لئے ایک منفرد مقام بنایا ہے۔''ترقی پسند ادب'' کی اشاعت کے بعد اس کے بعض حصوں پر شدید اعتراضات ہوئے اور بہت دنوں تک بلکہ آج بھی جب کسی کو ان کے خلاف لکھنا ہوتا ہے تو ترقی پسند ادب کے حوالے سے ہی گفتگو کرتا ہے لیکن کبیر، میرابائی، میر اور غالب کے انتخاب اور ان کے مقدمات نے ہر شخص کو ان کی تنقیدی بصیرت، کلاسیکی آگہی اور ادبی دروں بینی کا قائل کر دیا ہے۔دوسرے اس کام نے کلاسیکی شعر وادب کے بارے میں ترقی پسند ناقدین کے رویے کو بھی واضح کیا اور اس بدگمانی کو دور کیا کہ ترقی پسند قدیم شاعری، غزل اور تصوف کو رجعت پسندی اور زندگی سے فرار قرار دیتے ہیں۔سردار جعفری نے ان شاعروں کا جس طرح تجزیہ کیا، اسے اردو میں ایک اچھے سماجیاتی مطالعے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔سردار جعفری نے جن شعراء کا انتخاب کیا، ان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان سب میں اور سردار جعفری کے نظریات میں ایک قدر مشترک ہے۔اس لئے کہ کبیر ہوں، میرا ہوں یا میر اور غالب، ان

سب کے یہاں ایک وسیع انسان دوستی کا تصور، محبت اور زندگی سے پیار اور برائیوں اور زاہد و ناصح، شیخ و برہمن کی پر تصنع مذہبیت سے بیزاری قدر اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کہتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ ایک شطرنجی، سوت کی ڈوری اور لوٹا لے کر ایسی جگہ نکل جاؤں جہاں کوئی بھوکا ننگا نہ دکھائی دے اور سردار جعفری اسی کے مداوے کے لئے ''ہر شام سیہ'' کو ''صبح نو'' میں بدلنے کی کوشش کرتے رہے۔ کبیر، میرا اور غالب کے بعد انہوں نے اقبال شناسی کا جو کام کیا وہ بھی تاریخ ساز کام ہے۔ یہ کام انہوں نے اس وقت کیا جب اقبال کا نام برصغیر کی سیاست میں ہندوستان کے لئے ''ناپسندیدہ'' قرار پا چکا تھا۔ سردار جعفری نے اپنے مضامین کے ذریعہ ان بدگمانیوں کو دور کیا اور ترقی پسند نقطہ نظر سے فکر اقبال اور کلام اقبال کا تجزیہ کر کے اقبال شناسی میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا۔ اسی لئے اردو تنقید ہو یا شاعری اپنی فکری بصیرت اور اپنے شعری اسلوب کی وجہ سے ادبی تاریخ میں ہمیشہ انہیں ایک منفرد مقام حاصل رہے گا۔ 109

علی سردار جعفری نے جہاں ماضی کے ادبی ورثے کی قدر کی وہیں روح عصر کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے سردار جعفری کی تصنیف پیغمبران سخن اور ان کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے حرف اول سے اس بات کو پیش کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''ادیب کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول، وراثت اور سرشت یہ تینوں عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی نظریہ کے حامی شاعر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ سردار جعفری نے ماضی کے ادبی ورثے کو نہ صرف یہ کہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے بلکہ کبیر، میرا، غالب اور میر کی سطح پر اس کی بازیافت کی کوشش بھی کی ہے لیکن آج اور کل کی شعری حقیقتوں کا تذکرہ ''پتھر کی دیوار'' کے حرف اول میں انہوں نے ایک طرح کے ہیجانی انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے ممکن ہے کہ کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہی سمجھتا ہوں اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سرے ہو جائیں گے۔ آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں''۔

پھر آگے چل کر دوسرے ہی سانس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہو رہی ہے۔ کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔ اس کے اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے نغموں میں کل کی کچھ دیر پا قدریں پائی جائیں گی''۔

لیکن گھوم پھر کر ان کا سارا زور پھر روح عصر پر ہی ہوتا ہے اور ہنگامی ادب ان کے نزدیک روح عصر قرار پاتا ہے:

''اس تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آ کر عدم میں کھو جاتی ہے ابدی چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں شاعری میں آج کی حقیقت یا روح عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں''۔ 110

(گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، صفحہ 94,95)

ادب میں تسلسل کا عمل، نیا تخلیقی عمل اور ماضی

ادب میں تسلسل کا عمل، نیا تخلیقی عمل اور ماضی میں تعلق کو علی سردار جعفری نے پریم چند کی مثال سے واضح کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''آج جو نقاد پریم چند کی عصری معنویت سے انکار کر رہے ہیں وہ ادب میں تسلسل کے عمل سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ادب اور تہذیب میں نیا تخلیقی عمل ماضی کی معنویت کا ضامن ہوتا ہے''۔ 111

خالد علوی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے ترقی پسند نقادوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے قدیم ادبی سرمائے سے انحراف نہ کرتے ہوئے ماضی کے پتھروں سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالنے کی بات کہی جن سے صدیوں تک ہمارے کشت ادب کی آبیاری ہوئی''۔112

پروفیسر نظیر صدیقی نے سردار جعفری کی تنقیدی تصانیف ''ترقی پسند ادب'' اور ''پیغمبران سخن'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری کے دل و دماغ پر اشتراکیت بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے اس حد تک حاوی ہوگئی کہ وہ اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مجروح سلطان پوری کی اس قسم کی شاعری کو سراہے بغیر نہ رہ سکے جس میں مجروح، لینن کے پیغام کی جئے ہو، اسٹالن کے نام کی جئے ہو، یہ بھی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے، قسم کے شعر کہنے لگے تھے۔ میں نے (نظیر صدیقی) اپنے کسی مضمون میں مجروح کے ہاں صحیح قسم کی شاعرانہ صلاحیت کی تعریف کرتے ہوئے اشتراکی نعرہ بازی والی شاعری کی مذمت بھی کی تھی۔ 1963ء میں جب میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تاثرات و تعصّبات'' چھپا تو نہ جانے کس طرح اس کی ایک جلد بمبئی ترقی پسند حلقے میں پہنچ گئی اور مجروح کی نظر سے گذری۔ مجروح نے میری کتاب پڑھ کر مجھے ایک نیازمندانہ خط لکھا اور اپنی اس شاعری پر جسے میں رد کر چکا تھا، بڑی شرمندگی کا اظہار کیا اور اس کی ذمہ داری سردار جعفری کی غلط حوصلہ افزائی پر رکھی''۔۔۔۔

نثر میں ان کی کتاب کبیر، میر اور غالب مدتوں زندہ رہنے والی کتاب ہے۔'' 113

پیغمبران سخن میں شامل مقدمات پر مختلف ادیبوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ مظہر امام نے انہیں عالمانہ مقدمات قرار دیا اور سردار جعفری کی کلاسیکی روایات، تصوف وغیرہ پر ان کی گہری نظر اور شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت کی ستائش کی:

''سردار جعفری نے کبیر (کبیر بانی)، میرا بائی (پریم وانی) اور میر کے انتخابات اسی طرح دونوں رسم خط میں شائع کئے۔ ان سب پر انہوں نے بڑے دلکش انداز میں عالمانہ مقدمے لکھے جو کلاسیکی روایت، تصوف اور مابعد الطبیعات پر ان کی گہری نظر اور شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ چاروں دیباچے بعد میں ''پیغمبران سخن'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ انتخابات ہندی اور اردو قاری کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں معاون

ہوئے"۔ 114

پروفیسر کوپی چند نارنگ نے ان مقدمات میں سردار جعفری کی تنقید کی ستائش کی:

"سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں ہیں۔انہوں نے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعہ پرکھنے کی کوشش کی۔ان کی بعض تحریریں تحریک میں زبردست اعتراض اور بحث کا موضوع بنیں۔قدیم ادب، کلاسیکی ادبی قدروں اور ترقی پسندی کے مفہوم کے بارے میں ان کے رویے پر شدید اعتراضات ہوئے ہیں جو وقتی جوش اور انقلاب کی جذباتی تاویل کا نتیجہ تھا لیکن ان کی تنقید کی اہمیت ان کے مضامین یا ترقی پسند تحریک کی تاریخ نہیں بلکہ کبیر بانی، میر اور دیوان غالب میں دیباچے کی شکل میں شامل ان کے مضامین اور ان کے بعد کے دوسرے مضامین سے ہے جو یقیناً اردو تنقید میں کلاسیکی ادب کے تجزیے کے ترقی پسند معیار کو پیش کرتے ہیں"۔ 115

سرمایہ سخن (جلد اول)

سردار جعفری کی کتاب "سرمایہ سخن" جلد اول جولائی 2001 میں مکتبہ جامعہ نے شائع کی۔اس کے مشمولات پیش گفتار دیباچہ (پہلا حصہ دسمبر 1969 کا تحریر کردہ اور دوسرا حصہ مئی 1996 کے بعد کا تحری کردہ اور ان کے علاوہ تیسرا حصہ بھی موجود ہے)، ذوق جمال لحن داؤدی "مقبول استعاروں کا خزانہ" ہیں۔

اس کے پیش گفتار میں سید شاہد مہدی نے لکھا ہے:

"اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب وہ مئی جون 1968ء میں علاج کے سلسلہ میں ایک ہسپتال میں داخل ہوئے۔کچھ دنوں بعد وہ گھر لوٹ آئے لیکن ڈاکٹروں نے دو تین مہینے آرام کی سخت ہدایت کی۔اس وقفہ کا استعمال انہوں نے "سرمایہ سخن" کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا۔اپنی یادداشت کے سہارے ان تمام اشعار کو رفتہ رفتہ کاغذ پر منتقل کرنے لگے جو ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں موجود تھے۔اس اشعار میں محسوسات کی ایک دنیا آباد تھی۔گنجینۂ معنی کا طلسم ذہن و دل کو استعجاب اور غور فکر میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھا۔اسی دوران سردار جعفری کو اردو اشعار کی ایک لغت تیار کرنے کا خیال آیا تا کہ مستند اشعار کی لذت کو مخصوص سیاق و سباق میں سمجھنے کا موقع ملے۔اتفاق سے انہیں دو سال کے لئے جواہر لال نہرو فیلوشپ بھی مل گئی۔لہٰذا پہلی جنوری 1969ء کو اس لغت کا پہلا لفظ لکھا گیا۔بدقسمتی سے زندگی نے آخری لفظ لکھنے کا موقع نہیں دیا اور یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔سرمایہ سخن کی پہلی جلد مکمل کرنے کے بعد وہ دوسری جلد کی تیاری میں مصروف تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحے انہوں نے لکھ بھی لئے تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی اور ہم مکمل طور پر ایک عمدہ کام سے محروم رہ گئے"۔ 116

سرمایہ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

1۔سرمایہ سخن ایک عمدہ اور بہت ہی کارآمد کتاب ہے جس میں کلاسیکی اور جدید شاعری کی فہم پیدا کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کی ایک بامعنی کوشش کی گئی ہے دراصل یہ شاعری کی ایک ایسی لغت ہے جو لغت نویسی اور تذکرہ نگاری سے مختلف ہے۔اس کے ذریعہ سردار جعفری نے اردو شاعری کے اس ملکہ کو اجاگر کیا ہے جس میں ایک لفظ کو نا کوں معنی عطا کرنے کا ایسا

ہنر ہے جس کی کشش وقت گذرنے کے ساتھ مزید نکھرتی چلی جاتی ہے۔ 117

2۔دیباچے کے دوسرے حصہ میں جو کہ مئی 1996ء کے بعد تحریر کردہ ہے سردار جعفری نے سرمایۂ سخن کی اہمیت افادیت پر روشنی ڈالی ہے جس کے لئے پہلے تو اردو زبان کے شاعرانہ الفاظ، تراکیب اور امیجری یا پیکر تراشی کے خزانوں کا ذکر کیا ہے جو قدیم اور جدید شعرا کے تخئیل نے تراشا ہے۔اس کی تعداد کے متعلق سردار جعفری کا کہنا ہے کہ چار سے پانچ لاکھ تک جاسکتی ہے۔بقول ان کے اردو زبان کے پاس ایک خزانہ ہے جو پوری طرح دریافت نہیں کیا گیا ہے۔یہ ان جواہر پاروں سے بھرا پڑا ہے جنہیں شاعرانہ الفاظ اور تراکیب کہتے ہیں۔اردو شاعری کی امیجری (یہ الفاظ اساتذہ استعمال نہیں کرتے تھے) یا پیکر تراشی کی یہ نادر مثالیں ہیں۔ان کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے جہاں تک میرا علم ہے اردو شاعری کی کوئی الگ لغت نہیں ہے۔ سرمایۂ سخن ایک مختصر لغت ہے۔ایک بڑے کام کی چھوٹی سی ابتداء۔اس میں تقریباً بیس ہزار الفاظ اور ترکیبیں چند شعراء کے منتخب کلام سے جمع کی گئی ہیں لیکن اگر پوری اردو شاعری سے انتخاب کیا جائے تو ان کی تعداد چار پانچ لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔ سردار جعفری نے قدیم اور جدید دونوں شاعری کے اشعار کا حوالہ دیا ہے اور شاعری میں علامات، تلمیحات، استعارات اور دیگر شعری وفنی لوازمات کی اہمیت واضح کی ہے جس سے ان کے شعری ذوق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔۔۔۔ 118

سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس کتاب میں لغت نویسی کے آداب کی پوری پابندی نہیں کی گئی ہے کیونکہ یہ کسی فرہنگ نویس کی نہیں بلکہ ایک شاعر کی لکھی ہوئی لغت ہے جو اپنے ذوق سخن کے باہر نہیں نکل سکتا۔سرمایۂ سخن میں الفاظ اور تراکیب کو حرف تہجی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے۔سیدھے سادھے معنی کے ساتھ اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں اور حسب ضرورت ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری لطف اندوز ہوسکے۔پہلی منزل شعرفہمی ہے۔لطف اندوزی آگے کی منزل ہے۔جس طرح محبوب کے حسن کو بیان نہیں کیا جاسکتا اسی طرح شعرفہمی اور لطف اندوزی کو بھی بیان کرنا مشکل ہے۔شعر کی تقطیع کی جاسکتی ہے اور عروض کے رموز ونکات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔رعایت لفظی کو سمجھا جاسکتا ہے۔تشبیہ، استعارے اور کنایہ کے فرق کو ظاہر کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد شعر کے معنی گذر کر حسن معنی تک پہنچنا ایک عمل ہے جس کے لئے ذہنی تربیت ضروری ہے۔اس تربیت کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اساتذہ کا اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں اشعار کا ورد۔ 119

سردار جعفری کی شعری وفکری اظہار میں ہوئی تبدیلی پر اشارہ کرتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری نے مختلف قدیم وجدید شعرا کے اشعار میں مستعمل تشبیہات، تراکیب، پیکر تراشی اور دیگر شعری خصوصیات پر جو خامہ فرسائی کی ہے، یقیناً قابل غور ہے جس سے سردار جعفری کی شعری وفکری اظہار میں تبدیلی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ وہ شخص جو کبھی صرف موضوع اور مواد کے پیچھے بھاگا کرتا تھا، اب وہ شعر کے فنی، لفظی، صناعی اور دیگر شعری خصوصیات پر بے حد دلنشین اور خوبصورت انداز میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔

سرمایۂ سخن کے دیباچے کے آخری جملے بھی غور طلب ہیں جو سردار جعفری کی شعری جمالیات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں:

''اردو شاعری اور خاص طور سے غزل کے استعاراتی نظام کو مغرب کی یلغار کے زیر اثر گل وبلبل کی شاعری کہہ کر حقیر قرار

دینے کا رویہ تقریباً سو سال سے جاری ہے۔ یہ الفاظ کلیشے بھی ہیں اور اہم تخلیقی سہارے بھی۔ یہ تخئیل کو مہمیز بھی کرتے ہیں اور فکر کے پیروں میں زنجیریں بھی ڈال دیتے ہیں۔ غالب اور میر کے ہاتھ میں گنجینۂ معنی ہیں اور کمتر شاعروں کے ہاتھ میں کھوکھلے الفاظ۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے اندر ہوگی لیکن تلازمات کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اگر انگریزی زبان کے چھبیس حروف میں پورا شیکسپیئر لکھا جا سکتا ہے تو ایک ہزار مقررہ استعاروں میں ایک پوری کائنات کو سمیٹا جا سکتا ہے لیکن انسانی ذہن و فکر اس پر اکتفا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس کا نعرہ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب"۔ اس استعاراتی نظام سے باہر نکل کر ایک اور استعاراتی دنیا کی تخلیق کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ہماری نئی شاعری کی پیکر تراشی کا نظام ہے۔ اس لغت میں دونوں کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ چونکہ کلاسیکی خزانہ زیادہ بڑا ہے اس لئے اس کے الفاظ زیادہ ہیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جدید ذہن اور مزاج آہستہ آہستہ اس سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے۔ سرمایۂ سخن اس سرمایہ کی حفاظت کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے"۔ 120

سردار جعفری نے "مقبول استعاروں کا خزانہ" کے تحت میر، سودا، مصحفی، غالب، مرزا ثاقب لکھنوی، آتش، ناسخ، حالی، اقبال، جگر، حسرت، مجاز، مجروح، جانثار اختر اور خود اپنے متعدد اشعار میں پائے جانے والے تقریباً دو سو سے زائد استعاروں کو پہلے تو یکجا کیا ہے، اس کے بعد ہر ایک شعری استعمال کی وضاحت کے لئے اشعار بھی پیش کئے ہیں جس سے استعاروں کی اہمیت و افادیت اور ان سے لطف اندوز ہونے کے عمل سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ گل، گلستاں، گلزار، گل چیں، قمری، دشت، بیاباں، جرس، دریا، ساحل، گرداب، ناخدا، صبا، شراب، میکدہ، پیر مغاں، فانوس، چراغ، شعلہ، پیراہن، آرسی، خورشید، ستارے، قوس قزح، شفق، جنت، کوثر اور تسنیم وغیرہ۔

سرمایۂ سخن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

سرمایۂ سخن سردار جعفری کی فنکارانہ شخصیت کے لسانی، تجرباتی اور معنی خیز ذہن کا عملی ثبوت پیش کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کتاب کے اصل سرمایہ ضمیمہ سے قبل سردار جعفری کی جو مختصر مختصر تحریریں بالترتیب بعنوان دیباچہ، ذوق جمال، لحن داؤدی، مقبول استعاروں کا خزانہ اور استفادہ شامل کتاب ہیں۔ اس سے سردار جعفری کے شعری و فکری اظہار میں ہوئی تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 1960 سے 1980 کے دوران جبکہ 'جدیدیت' کی لہر نے ادبی دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا، اس زمانہ میں اگرچہ وہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے قدرے تذبذب کا شکار ہوئے جس میں انہوں نے بہت سے ادبی و فکری سمجھوتے بھی کئے لیکن اسّی کی دہائی میں انہوں نے ایک ایسا نظریہ ادب ضرور قائم کر لیا تھا جس میں اعتدال و توازن کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اس نئے نظریہ شعر و ادب میں سردار جعفری کا وہ بنیادی ادبی نظریہ جس کی اساس مارکسزم ہے، قطعی متزلزل نہیں ہوا۔ البتہ اس کی شدت اور انتہا پسندی یا پھر یہ کہہ لیں کہ ادعائیت پر ضرور حرف آیا۔ لہٰذا اب سردار جعفری کے ادبی نقطہ نظر میں اعتدال، توازن، نرم لب و لہجہ اور جلال و جمال میں ایک خاص قسم کا توازن پایا جانے لگا تھا جس کی توسیع 1980ء کے بعد کی شعری و نثری تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے۔ بالخصوص "سرمایۂ سخن" میں شامل ذوق جمال، اور لحن داؤدی کے زیر عنوان تحریروں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں مارکسزم، اجتماعیت اور خارجیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت اور داخلیت کو بھی اہمیت حاصل ہے"۔ 121

سردار جعفری کا تنقیدی مضمون ''ذوق جمال'' افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 میں شائع ہوا۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ آرٹ اور ادب کا استعمال انسان نے ہمیشہ حقیقت کو بدلنے کے لئے کیا ہے۔ یہ ادب کا سماجی کردار ہے اور جب کبھی ادب سے اس کا یہ سماجی کردار چھیننے کی کوشش کی گئی، اس نے اپنا حسن اور زور کھودیا۔ سردار جعفری نے بتایا کہ ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا، جذبات و احساسات سے نئی نئی تصویریں بناتا ہے، پہلے انسانوں کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے اور پھر انسان کے ذریعہ سے ماحول اور سماج کو تبدیل کرتا ہے۔ وہ انسان کو بہتر انسان بناتا ہے۔ اسے طاقت اور ہمت عطا کرتا ہے۔ اس طرح ادب کا براہ راست تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ادب کا سب سے بڑا کام انسان کے جذبات کو منظم کر کے نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

ذوق جمال اور اس کے سماجی اور تہذیبی ماحول پر بحث کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ ''شعور کی تبدیلی اور ہمارے احساس حسن اور ذوق جمال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور جمالیاتی قدریں بدل جاتی ہیں۔ دراصل احساس حسن اور ذوق جمال شعور کی ایک قسم ہے جو زباں مکاں کی قیود سے آزاد نہیں ہے۔ سماجی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے کوئی مخصوص ذوق لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے اعصاب میں محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو خود صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہ صلاحیت ترقی کر کے ذوق اس وقت بنتی ہے جب وہ تاریخی حالات کے دائرے میں زندگی اور سماج کے حقائق سے دوچار ہوتی ہے۔۔۔۔''

2۔ ''ذوق جمال کا فرق تہذیب تمدن کی مختلف سطحوں پر نظر آتا ہے جو سماجی ماحول کے ساتھ بدلتی ہیں۔ ہم موٹے طریقہ سے انسانی تہذیب کے چار دور قرار دے سکتے ہیں جو ذرائع پیداوار، طریق پیداوار اور سماجی تنظیم کے چار دور ہیں اور ہر دور اپنے ساتھ اپنا مخصوص نظام سیاست، اخلاقیات، آرٹ اور ادب لے کر آیا ہے۔ ابتدائی قبائلی دور کے بعد جب انسان طبقوں میں تقسیم نہیں تھا، غلام داری کا دور آیا جس میں انسانیت آقاؤں اور غلاموں میں بٹ گئی۔ (ہندوستان میں اس کی شکل یونانی شکل سے مختلف تھی)۔ پھر جاگیرداری کا دور آیا اور انسانیت جاگیردار اور کسان میں تقسیم ہوگئی۔ (اس کی بھی شکل ہندوستان میں یوروپ سے کسی قدر مختلف تھی)۔ تیسرا دور سرمایہ داری کا ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور متضاد طبقے ہیں۔ اب انسانیت اور سماج اپنی تہذیب کے چوتھے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب طبقات کی تقسیم ختم ہو رہی ہے اور ایک متحدہ منظم انسانیت پیدا ہو رہی ہے۔ ہر دور کا اپنا اپنا ذوق جمال ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ ایک دور اور دوسرے دور کے ذوق جمال میں فرق ضرور ہوتا ہے لیکن دونوں کے درمیان لوہے کی دیوار نہیں کھڑی ہوتی۔ ہر دور کا ذوق جمال پچھلے دور کی بہترین قدروں کا حامل ہوتا ہے اور ان میں نئے اضافے کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یکساں سماجی اور تہذیبی ماحول کے تمام انسانوں کا ذوق جمال یکساں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی ایک سماجی اور تہذیبی ماحول کے انسانوں کا ذوق جمال مجموعی اعتبار سے یکساں کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی ہر شخص کے احساس اور ذوق کی انفرادی خصوصیات الگ الگ ہوں گی۔

تہذیب وتمدن کی ایک سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں۔سماجی مخلوق کی حیثیت سے ہر فرد ماحول کے مختلف عناصر (Factors) کا ڈھالا ہوا ہے جو برابر ایک دوسرے کو کاٹتے رہتے ہیں اور آپس میں خلط ملط ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ ہر انسان کے احساس کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کا اپنا انفرادی ذوق ہوتا ہے"۔ 122

سردار جعفری کا لکھا "لحن داؤدی" سہ ماہی گفتگو شمارہ 3 (1967) اداریے پر مشتمل ہے۔

اس کا جائزہ لیتے ہوئے عمر رضا قمطراز ہیں:

"اس طرح یہ فکر بھی ستر کی دہائی کی ہے۔اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے مخصوص شعری وادبی نقطہ نگاہ کی مزید وضاحت کی ہے جس میں انتہا پسندی یا ادعائیت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ستر کی دہائی میں سردار جعفری نے جلال اور جمال میں جس طرح کا توازن برقرار رکھنے کی سعی کی تھی، یہ مضمون اسی کی توسیع کرتا نظر آتا ہے۔اگر چہ بنیادی نظریہ وہی ہے جو انہوں نے "ترقی پسند ادب" میں پیش کیا تھا لیکن یہاں اس کی شکل قدرے بدلی ہوئی ہے۔اس میں سردار جعفری نے شاعری کو بنیادی طور پر گانے، سننے اور سنانے کی چیز سے تعبیر کیا ہے اور شروع ہی میں شاعری کو "لحن داؤدی" کہا ہے۔اس کے لئے انہوں نے زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر دور جدید تک کا حوالہ دیا ہے۔مثلاً زمانہ قبل از تاریخ کے دھندلکوں میں انسان نے شعر لکھنے کے بجائے بولنا اور گانا شروع کیا۔قدیم ترین الحانی صحیفوں وید، مہابھارت، ژنداوستھا اور انجیل وغیرہ کی زبان یا تو شاعری ہے یا شاعری کا درجہ رکھتی ہے اور صحیفے بھی بولے یا گائے جاتے تھے۔علاوہ ازیں ہومر کی نظم ساز پر گائے جانے، فردوسی کے شاہنامے کو محفلوں میں سنانے، کالی داس کی شکنتلا، شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو جولیٹ، اوتھیلو، میک بتھ، ہیملٹ، مرچنٹ آف وینس کو اسٹیج کے ذریعہ جس طرح پیش کیا گیا، اس کا بھی ذکر کیا ہے۔رومی اور عطار کے کلام، حافظ اور سعدی کی غزلوں کے بارے میں بھی انہوں نے لکھا ہے کہ "انہوں نے دلوں میں پہلے گھر کیا، کاغذ پر بعد میں منتقل کی گئیں۔(سرمایہ سخن صفحہ 66)۔علاوہ ازیں سردار جعفری نے ہندی اور اردو کی روایت سے بھی مثالیں دی ہیں۔مثلاً ہندی میں کبیر، میرابائی، سورداس اور تلسی داس کی شاعری پہلے کروڑوں انسانوں تک صرف سننے سنانے سے پہنچی۔اردو کے بیشتر شعرا صاحب دیوان بننے سے قبل مشاعروں میں سند حاصل کرتے تھے۔مثلاً میر، غالب، انیس اور دبیر، داغ، امیر مینائی، اقبال، حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ۔دراصل ان تمام باتوں کو پیش کر کے سردار جعفری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاعری کا رشتہ جب تک عام انسانوں اور زندگی سے نہیں ہوگا تب تک وہ معیاری یا قابل قبول نہیں ہوگی۔اس ضمن میں انہوں نے سہل ممتنع کو عظیم شاعری سے تعبیر کیا ہے۔مشاعروں کی مخالفت کرنے والوں انحطاطی قرار دیا ہے جس سے نئے شاعروں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔اب سردار جعفری ایسی شاعری کی بات کرتے ہیں جس میں اعتدال ہو، توازن ہو اور اس کا لب ولہجہ شیریں، نرم اور مدھم ہو جو بلاشبہ روایت اور جدت کی ہم آہنگی اور انفرادیت واجتماعیت کی ملی جلی کیفیت سے عبارت ہو"۔ 123

جذبات اور شعور کے تعلق کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

1۔"جذبات کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے اور شعور کو دماغ سے۔۔۔"

2۔ ''شعور کے بغیر جذبہ محض جبلت رہ جاتا ہے اور انسانیت حیوانیت بن جاتی ہے۔۔۔۔''

3۔ ''شبلی نے اپنی شاندار تصنیف ''شعرالعجم'' میں ایک بڑا اچھا اور مفید نکتہ پیدا کیا ہے کہ شعر کا لفظ شعور سے بنا ہے۔ غرض ادب میں شعور کی اہمیت کسی طرح جذبات سے کم نہیں ہے۔اس لئے ادب جذبات ہی کی نہیں انسانی شعور کی بھی تنظیم کرتا ہے اور اسے بدلتا ہے''۔

4۔ ''جذبے کے شعور کے بغیر گہرائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور جذبے کی گہرائی کے بغیر ادب، ادب نہیں رہ سکتا۔جذبہ خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔تخئیل بھی شعور کا محتاج ہے۔جذبے کی شدت اور گہرائی میں شعور کی شدت اور گہرائی جھلکتی ہے لیکن کبھی کبھی جذبہ غلط بھی ہوتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی رچا ہوا اور شدید کیوں نہ معلوم ہو۔اس کی یہ شدت، جو جھوٹی شدت ہوتی ہے دراصل ہیجان ہے جو شعور کی خامی کا نتیجہ ہے۔آرٹ اور ادب میں شعور کی یہ خامی جذبے کی ''گہرائی'' اور ''شدت'' کے نام پر معاف نہیں کی جاسکتی۔دراصل جذبے اور ہیجان میں فرق کرنا ضروری ہے۔شعور وہ کسوٹی ہے جس پر سچے جذبے اور جھوٹے جذبے کو پرکھا اور ہیجان کو پہچانا جاسکتا ہے۔۔۔۔''

5۔ ''شعور کو تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔اس کا تاریخی ارتقاء ہوا ہے اور وہ تغیر کی بہت سی منزلوں سے گذرا ہے اور گذر رہا ہے۔ہر چیز کی طرح انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی۔انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے۔شعور اور جذبات بھی ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔یہ ارتقاء کا عمل ہے جس نے غاروں میں بسنے والے درندے کو انسان بنایا ہے۔اس لئے شعور کی تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔اگر شعور ناپختہ ہے تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے''۔ 124

سرمایہ سخن پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی کا تبصرہ آج کل اکتوبر 2001ء میں شائع ہوا ہے۔

اس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''سردار جعفری نے شاعری کو انسانی فطرت اور انسانی تہذیب کا جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے اس کی تاریخ اور تفصیل پیش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کیفیت ہے جس سے شاعر دوچار ہوتا ہے۔انہوں نے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے اردو زبان اور اردو شاعری میں جو خصوصیت پائی جاتی ہے وہ دنیا کی دیگر زبانوں میں عنقا ہے۔اس طرح جو لوگ اردو زبان کو ہندوستانی شیلی میں لکھنے کی بات کرتے ہیں ان کا حتمی جواب بھی دے دیا ہے ایسا کرنے سے اردو زبان کی اپنی خصوصیت مجروح ہو جائے گی اور اس کی شناخت بھی باقی نہیں رہے گی۔ضمیمہ میں انہوں نے میر، غالب سے لے کر اقبال اور تمام دوسرے مشہور شعرا کے اشعار کی جمالیاتی تشریح پیش کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ذوق جمال اس شاعری کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے جس میں ذوق جمال کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ 125

محمد اجمل خان نے سردار جعفری کی کتاب سرمایہ سخن کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔''اس کے ذریعہ ان کے (سردار جعفری) مطالعہ ان کی زبان کے بارے میں معلومات، تجزیہ کرنے کا انداز، ایک ٹھہرے ہوئے اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاسی اور مدلل انداز بیان پر روشنی پڑتی ہے۔۔۔۔1960 سے 1980 کے درمیان وہ ادب کے نئے رجحانات سے متاثر ہوئے تھے جس کے تحت انہوں نے کئی ادبی اور فکری تبدیلیاں کیں لیکن اسّی کی دہائی میں انہوں نے ایک ایسا ادبی نظریہ مستحکم کرلیا تھا جو معتدل اور متوازن تھا۔ان کے بنیادی نظریات جو ترقی پسند رجحانات یا مارکسزم پر مبنی تھے، بدستور ویسے ہی رہے لیکن ان کی شدت اور انتہا پسندی سے سردار جعفری نے اپنے آپ کو الگ کرلیا تھا اور مارکسزم کے حامی ہونے کے باوجود انہوں نے کلاسیکی شاعری کی طرف رجوع کیا۔ایک ترقی پسند ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود سرمایہ سخن میں سردار جعفری نے کہیں اپنے مارکسی نظریہ کو آڑے نہیں آنے دیا۔اس کتاب میں وہ ایک ماہر زبان کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جنہیں شعری الفاظ کی نزاکتوں اور ان کی باریکیوں کا بخوبی علم ہے۔اس کے علاوہ تخلیقی زبان کا وہ ایک خاص تصور بھی رکھتے ہیں کہ کوئی بھی لفظ جب شاعری میں اپنی جگہ بناتا ہے تو وہ مروجہ معنی کے برخلاف ایک تازہ معنی کا انکشاف کرتا ہے''۔126

2۔''اس سے (سرمایہ سخن) شعرفہمی میں یقیناً مدد ملے گی۔اس میں وہ ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شعری اصطلاحوں اور محاوروں کے معنی دیئے ہیں اس کے بعد ایک ہی اصطلاح کی کئی شعراء کے اشعار کے ذریعے مثالیں دی ہیں کہ مختلف شعراء نے ان ہی الفاظ کو کس کس طرح برتا ہے اور اس سے معنی کی کون کون سی جہتیں نمایاں ہوئی ہیں کیونکہ ہر شاعر کا رنگ، اسلوب، نقطہ نظر اور چیزوں کو سمجھنے کا ایک الگ نظریہ ہوتا ہے جو اس کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔اس لئے ایک ہی لفظ مختلف شعراء کے معنی کے مختلف جواز نمایاں کرتا ہے''۔ 127

پروفیسر محمد حسن نے سردار جعفری دوروزہ قومی سمینار شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ 25/ 26/نومبر 2000 میں اپنے خطبہ صدارت میں سردار جعفری کی کتاب سرمایہ سخن کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''انہوں (سردار جعفری) نے ان الفاظ کی لغت تیار کرنا شروع کی جو اردو شاعری میں بہت مقبول اور مروج رہے ہیں لیکن ہر دور میں ان میں معنوی اور تلمیحی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مثلاً رقیب کا لفظ رائج تو ہوا تھا محبوب کے ساتھ مگر اس کا استعمال مختلف مرحلوں سے گذرا، حد یہ ہے کہ فیض کے ہاں بالکل ہی مختلف معنوں میں برتا گیا۔یہی حال محتسب کا ہوا، یہی تبدیلی شراب شیشہ و پیمانہ کے معنوں میں ہوئی۔سردار جعفری اس کام کو پورا نہ کرسکے لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا واقعی بصیرت افروز ہے''۔ 128

مرتبہ دواوین

علی سردار جعفری نے غالب، میر، کبیر اور میرابائی کے دواوین مرتب کئے۔ان دواوین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب علی نے ایک مضمون ''علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین'' لکھا۔اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں جن سے سردار جعفری کی تنقید پر روشنی پڑتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

1۔''دیوان غالبؔ جولائی 1958 میں شائع ہوا۔یہ دیوان بیک وقت دو زبانوں اردو دیوناگری رسم الخط میں چھپا

ہے۔کتاب کا ایک صفحہ اردو زبان میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔اردو اور ہندی بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کے درمیان یگانگت، ہم آہنگی پیدا کرنے اور مرزا غالب کو غیر اردو داں سے تعارف کرانے کے مقصد سے سردار جعفری نے ''دیوان غالب'' مرتب کیا۔ بقول سردار جعفری ''خدا کرے اس دیوان کی اشاعت سے ہندی والوں اور اردو والوں کے دلوں میں محبت کے نئے پھول کھلیں اور ہمارے وطن اور ہماری زبان ان کی خوشبو سے مہک اٹھے''۔

2۔''علی سردار جعفری کے مزاج کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی تہذیب و روایت اور معیار کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔اس لئے ان کے دل میں کلاسیکی شعر و ادب کے لئے ایک وقعت اور اہمیت موجزن تھی۔چنانچہ انہوں نے اہم کلاسیکی شعرا کے کلام کا مطالعہ بڑی کاوشوں اور دقت نظر سے کیا اور کلام میں کلاسیکی تہذیب و روایت اور تصوف کے وہ تمام عناصر ڈھونڈھ نکالنے میں کامیابی حاصل کی، جس سے شاعر کا کلام آفاقیت اور عالمگیریت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور لوگوں کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتا ہے''۔

3۔''سردار جعفری کا دوسرا منتخبہ کلاسیکی کام ''دیوان میر'' ہے۔علی سردار جعفری نے اسے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کیا تا کہ اردو اور ہندی والے اردو کے اس عظیم شاعر سے بخوبی واقف ہو سکیں۔دیوان میر کو ہندوستانی بک ٹرسٹ نے پہلی بار 1960ء میں شائع کیا۔علی سردار جعفری کا رقم کیا ہوا عالمانہ اور مبسوط دیباچہ 57 صفحات پر مشتمل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی و تنقیدی ہے۔شاعری کے عنوان کے لئے (21) صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ان صفحات میں علی سردار جعفری نے اپنے منتخبہ کلام ''دیوان میر'' کے حوالے سے میر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔میر کا یہ کمال کم توجہ کا مستحق نہیں ہے کہ انہوں نے فنی نزاکتوں اور جذبہ خلوص سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ابتر معاشی حالات کو غزل جیسی طبع نازک صنف میں کہیں براہ راست اور کہیں غیر براہ راست انداز میں پرو دیا ہے۔جہاں راست انداز بیاں اختیار نہیں کیا ہے وہاں اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے اور ایسے موقعوں پر میر نے محبوب کو بہت سخت و سست کہا ہے۔سردار جعفری کا یہ مرتبہ دیوان، میر کے کلام کا صرف انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت، ان کے عہد کے حالات و ماحول اور فن کا آئینہ بھی ہے''۔

4۔''سردار جعفری نے کبیر کی (128) نظموں (پدوں) کا انتخاب ''کبیر بانی'' کے نام سے کیا اور 1965ء میں شائع کروایا۔یہ کتاب بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپی گئی ہے یعنی ایک صفحہ اردو میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔۔۔۔پہلا حصہ 64 صفحات پر مشتمل ایک طویل اور جامع دیباچہ ہے۔۔۔دوسرا کبیر کی (128) نظموں (پدوں) وغیرہ کا انتخاب اور ان کی مختصر تشریح ہے اور یہ سو صفحات پر محیط ہے۔حواشی کے ضمن میں (121) الفاظ کی شرح قدرے تفصیل سے ہے۔گیتا، مہابھارت اور مقدس بید کے علاوہ فارسی اور اردو کے شعرا مثلاً رومی، سعدی، میر، غالب اور سودا وغیرہ کے اشعار سے لفظوں کی تشریح میں مدد لی گئی ہے۔کبیر کی شخصیت اور ان کے افکار کو سمجھنے کے لئے یہ ایک منفرد اور جامع کتاب ہے''

5۔''پریم وانی''میرابائی کی 152 نظموں (بھجنوں) کا انتخاب ہے جسے علی سردار جعفری نے ترتیب دیا ہے۔پریم وانی

کوہندوستانی بک ٹرسٹ ممبئی نے بڑے سلیقے سے 1970ء میں شائع کیا۔ پریم وانی بھی بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھپی ہے۔ ایک صفحہ اردو میں ہے تو دوسرا دیوناگری میں۔۔۔علی سردار جعفری نے (335) صفحاتی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ (12) صفحات پر مشتمل مبسوط دیباچہ ہے جسے ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری نے بڑی کاوش سے تحریر کیا ہے۔۔۔(146) گیتوں کا اردو ترجمہ، میراں کے گیت کے عنوان سے جسے کرشن چودھری نے بڑی خوبی سے کیا ہے جسے ادارہ انیس اردو الہ آباد نے پہلی بار 1959 میں شائع کیا ہے۔ علی سردار جعفری نے برگزیدہ شعرا کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع کر کے محبت اور یگانگت کی فضاء عام کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش سے جہاں ایک طرف ادبی لین دین کی روایت کو تقویت ملی وہیں دوسری طرف منافرت اور مغائرت کے زہر کو بیکار کرنے کا حوصلہ بھی ملا۔ اس کام کے انجام پانے سے مذکورہ شعرا کی مقبولیت میں تو چار چاند لگے ہی، سردار جعفری کی تنقید، تحقیق اور تدوین بھی چمک اٹھی''۔۔۔129

(ڈاکٹر صاحب علی، علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب)

مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 468, 464, 463, 460, 456, 453)

تنقیدی مضامین

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلہ میں ان کی تنقیدی تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔

ذیل میں دستیاب تنقیدی مضامین کا جائزہ پیش خدمت ہے:

سردار جعفری کا مضمون ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' جولائی 1936 میں شائع ہوا۔

سردار جعفری ایف اے پاس کر کے بی اے سال اول کے طالب علم تھے۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ خواجہ منظور حسین کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں سردار جعفری نے شرکت کی اور ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' کے عنوان سے اپنا پہلا تنقیدی مضمون پڑھا۔ یہ مضمون علی گڑھ میگزین کے تیسرے شمارے (جولائی 1936) میں شائع ہوا۔

اس مضمون کے بارے میں عمر رضا لکھتے ہیں:

''اس مضمون پر اختر حسین رائے پوری کے مضمون ''ادب اور زندگی'' کی گہری چھاپ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے ماضی کے ورثے کو جاگیردارانہ تمدن کا عطیہ قرار دینے کے باوجود روایت، قافیہ اور بحر کو ایشیائی شاعری کا حسن قرار دیا ہے اور بلینک ورس (آزاد نظم) کی مخالفت کی۔

بقول سردار جعفری:

''روایت، قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعری میں ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے لیکن بعض نوجوان اسے بے جا قیود کا نام دے کر مغرب کی تقلید میں بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیزیں پیش کر رہے

ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں"۔ 130

عمر رضا لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی جنگ آزادی اگر چہ عروج پر تھی لیکن ترقی پسند تحریک نے اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔خاص طور پر اپریل 1936 کی کانفرنس میں پریم چند نے جو صدارتی خطبہ دیا تھا، اس نے نوجوان ادیبوں کو بے حد متاثر کیا اور وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ ہندوستان کے سیاسی وسماجی مسائل پر روشنی ڈالنے لگے تھے۔۔۔۔(مضمون)۔جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات میں انہوں نے مغرب کی تقلید میں آزاد نظم کا تجربہ کرنے والوں پر نکتہ چینی کی ہے"۔ 131

عمر رضا نے علی سردار جعفری کے دو انگریزی مضامین کے بارے میں لکھا ہے:

"دو انگریزی مضامین یکے بعد دیگرے The Importance of India in European Politics (یوروپی سیاست میں ہندوستان کی اہمیت دسمبر 1937) اور Life Sketch of Lenaine (لینن کا خاکہ حیات مارچ 1938) بھی شائع ہوئے۔اول الذکر انگریزی مضمون میں اگر چہ سردار جعفری نے ایسے وقت میں جبکہ ہندوستانی عوام برطانوی اقتدار کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے، ہندوستانیوں کے جذبات کو نظر انداز کر کے کسی بھی قسم کے یوروپی فیصلے کو یوروپی سیاست کے لئے خطرناک قرار دیا ہے لیکن خاص طور پر انہوں نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشاکش کو واضح کرنے کی سعی کی ہے اور یہ امید جتائی ہے کہ بہت جلد سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اور محنت کشوں کی حکومت قائم ہوگی کیونکہ بقول سردار جعفری "سرمایہ دارانہ نظام اپنی عمر سے زیادہ جی چکا ہے"۔ ثانی الذکر میں لینن (1870 تا 21 جنوری 1924) کا مختصر سوانحی خاکہ بیان کیا گیا ہے جس میں ان کے سیاسی اور انقلابی کارناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے لینن کو کارل مارکس کے خوابوں کو ٹھوس حقائق میں تبدیل کرنے والا ثابت کیا گیا ہے"۔ 132

سردار جعفری نے 1938 میں لکھے مضمون "نوجوانوں کے ادبی رجحانات" میں پرانے اور نئے مصنفین کے ادبی رجحانات کا تقابل کیا ہے۔نئے مصنفین کے ادب میں عصری حسیت کو محسوس کرتے ہوئے سردار جعفری نے نئے مصنفین کو کئی منزل آگے بتایا ہے۔

1۔"نوجوان بجائے اس ادب کے جو اعلیٰ طبقہ کی زندگی پیش کرتا ہے ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں جس کی تعمیر ادبی طبقہ کی مصیبتوں پر، درمیانی طبقہ کی معاشرتی کمزوریوں پر اور اعلیٰ طبقہ کی سیاہ کاریوں پر ہوئی ہے"۔۔

2۔"دن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے مزدوروں کو ہنستے ہوئے سب نے دیکھا ہے لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ ان کے قہقہوں میں، جن میں ہزاروں غمگین آہیں دبی ہوئی ہیں، ایک ادبی شاہکار کا مواد موجود ہے۔کھیتوں میں کام کرنے والی دیہاتی عورتوں کے گیت محض سامعہ نوازی ہی نہیں کر سکتے بلکہ وہ ہمارے ادبی ذوق کی بھی پیاس بجھا سکتے ہیں لیکن ان کے سمجھنے کی کوشش کون کرتا ہے"۔۔۔۔

3۔"اس لحاظ سے اردو کے نئے مصنفین پرانے مصنفین سے کئی منزل آگے ہیں۔ان کی پیشانیوں پر زمانے کی بڑھتی ہوئی مشکلات نے غور وفکر کی گہری شکنیں ڈال دی ہیں اور یہ ارادی اور غیر ارادی طور پر ایک نیا رنگ اختیار کر رہے ہیں۔

جوادب یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہ نتیجہ ہے اس ہیجانی کیفیت کا جوان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے''۔۔۔

4۔''واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سوسائٹی کی حالت بالکل اس پھوڑے کی سی ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہو۔جب کوئی اسے نشتر سے چھونا چاہتا ہے تو سوسائٹی چیخنے لگتی ہے، ورنہ اسے اپنا جزو بدن بنائے پھرتی ہے''۔۔

5۔اردو مصنّفین کا بیدار مغز گروہ رومان سے گریز کر کے معاشرتی مسائل کی طرف آ گیا ہے، چنانچہ پریم چند ساری عمر یہی لکھتے رہے''۔ 133

مارچ 1938ء کے عربک کالج میگزین میں سردار جعفری کا ایک تنقیدی مضمون بعنوان ''نوجوانوں کے ادبی رجحانات'' شائع ہوا۔

اس مضمون کے بارے میں عمر رضا بتاتے ہیں:

''نوجوانوں کے ادبی رجحانات''میں سردار جعفری نے موجودہ ادبی رجحانات پر جو کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا نتیجہ تھیں، خامہ فرسائی کی ہے۔اس مضمون میں پریم چند کے اس صدارتی خطبہ کا واضح اثر ہے جسے انہوں نے اپریل 1936 کے ترقی پسند مصنّفین کانفرنس میں پیش کیا تھا۔اشتراکیت سے معمور اس تنقیدی مضمون میں سردار جعفری نے دنیا کی تمام ترقیوں کے باوجود انسانیت کی کمی پر اظہار افسوس کیا ہے۔البتہ اب وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ نوجوان ادیب (ترقی پسند ادیب) اب اپنے ادب میں نہ صرف یہ کہ حریر و دیبا کے بجائے چیتھڑوں، محلوں کے بجائے جھونپڑوں کا اور بربط و رباب کے بجائے بانسریوں کا ذکر کرنے لگے ہیں بلکہ تشبیہات و استعارات بھی اسی کے مطابق استعمال کر رہے ہیں۔دراصل اس زمانہ میں جس طرح کے ادب کی وکالت ترقی پسند مصنفین کر رہے تھے، اسی کی وہ تائید کرتے نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''دعوتوں سے دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑے لے جانے والوں کو سڑکوں پر برہنہ پھرنے والے بچوں کے افسردہ چہروں کو بے خانماں فقیروں کے تبسم زیر لب کو، گھروں کے اندر معمولی معمولی چیزیں چرانے والے نوکروں کو، صرف دیکھئے ہی مت بلکہ اوروں کو بھی دکھایئے اور اس طرح کہ ان باتوں کی اصلی وجہ معلوم ہو سکے''۔ 134

عمر رضا مزید لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے اس مضمون میں جوش اور مجاز کی نظموں اور قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا حوالہ دے کر انہیں اچھا ادیب کہا ہے کیونکہ اس میں انہیں اشتراکیت کی حقیقت نگاری کی دبی ہوئی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس مضمون کے اخیر میں لکھا ہے کہ:

''وہ زمانہ ختم ہو چکا جب پیٹ بھرنے کے لئے آسانیاں تھیں اور سوچنے کے لئے وقت بھی۔تخیلات پر ادب کی پوری عمارت کھڑی ہوئی تھی۔اب کہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں، تن ڈھکنے کے لئے ایک چیتھڑا نہیں جڑتا، دن رات کے دھندوں سے اتنی فرصت کہاں کہ پرواز تخئیل دکھائیں اور ''داستان امیر حمزہ''اور ''طلسم ہوش ربا''لکھیں۔مجبوراً روزمرہ کے واقعات سے اپنے ادب کی تعمیر کر رہے ہیں اور صحیح معنوں میں ادب ہے بھی یہی کہ یہ ہماری زندگی کا ترجمان ہے''۔ 135

''اسی طرح اس مضمون میں اشترا کی حقیقت نگاری پر زور دیا گیا ہے اور کسی بھی ادب کو اسی پیمانے پر جانچنے اور پرکھنے کی بات کہی گئی ہے''۔ 136

پریم چند پر تنقید کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ان (پریم چند) کے ناولوں اور کہانیوں کا بنیادی نقطہ کوئی سماجی یا معاشی مسئلہ ہوتا ہے لیکن اس کا حل سماجی اور معاشی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی ہوتا ہے۔ وہ انقلاب کے بجائے انفرادی اور روحانی سدھار کی طرف چلے جاتے ہیں اور ایک ایسا آدرش وادی طریقہ پیش کرتے ہیں جو ممکن العمل نہیں ہے''۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک طرح سے Committed قسم کے ترقی پسند تخلیق کار تھے اور شعر و ادب سے متعلق بڑا سماجی، انقلابی نظریہ رکھتے تھے اور اپنے میدان کے شہسوار تھے۔۔۔ مثلاً پریم چند جن کی سماجی حقیقت نگاری اور اس میں معمولی انسان بالخصوص کسان کی پیشکش اس قدر لاجواب ہے کہ بعض وقت معمولی سے کردار لافانی بن کر ابھرتے ہیں۔ یہ وہ معمولی کردار ہیں جو ظلم و تشدد کے باوجود آگے بڑھ رہے ہیں۔ انسانیت کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ ایک نئی دنیا کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔۔۔۔ پریم چند کسانوں کے مسائل سے تو واقف ہیں، مزدوروں سے نسبتاً دور ہیں۔ دیہات سے واقف ہیں تو شہر سے دور ہیں۔ اس لئے متحدہ تصور پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اکثر یک رُخے انداز میں آدرشوں کی باتیں کرتے ہیں مثالیت و تصوریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سردار جعفری، پریم چند کی حقیقت نگاری کے معترف ہیں جس کے ذریعہ وہ زندگی کی از سر نو تعمیر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ان خوابوں کا دیکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ وہ پریم چند کے اس لئے بھی قائل ہیں کہ ان کی تحریریں ظلم اور بے انصافی سے نفرت اور آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہمارے دل میں انسان کی عظمت اور وقار کو بڑھاتی ہیں''۔ 137

علی سردار جعفری نے پریم چند کی عالمگیر شہرت کی وجہ یہ بتائی کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں تاریخ کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیت رکھنے والے محنت کش عوام، جن کے ہاتھوں میں مٹی کی سوندھی مہک تھی، نظر آئے تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''اگر ہاتھوں کو علامت بنا کر بات کی جائے تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پریم چند سے پہلے سارے ہاتھ دست حنائی تھے، جو عاشق کے دل خون کرنا جانتے تھے، یا عاشق کے دست جنوں تھے، جو اپنا گریبان چاک کرنے کا فن جانتے تھے۔ ان سے الگ قاتلوں کے خون آلودہ ہاتھ تھے یا دعا یا بد دعا کے لئے بلند ہونے والے مظلوموں کے ہاتھ یا بھیک مانگنے والے ہاتھ، مگر وہ محنت کش ہاتھ جن کو اقبال نے ''دست دولت آفریں'' کہا اور ''کارکشا و کارساز'' قرار دیا جن میں عطر و حنا کی خوشبو کے بجائے مٹی کی سوندھی مہک تھی، جو کدال اور ہل کو چھونے کی وجہ سے سخت ہو گئے تھے، لیکن جن میں تاریخ کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیت تھی، پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند اپنے عالم فاضل ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ کر عالمگیر شہرت کے مالک بن گئے''۔ ۱۳۸

پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کے بارے میں سردار جعفری کا یہ حوالہ ''انہوں (پریم چند) نے فرد کو سماج اور سماجی مسائل سے الگ نہیں کیا اور یہ ان کی حقیقت نگاری کا سب سے اہم پہلو ہے۔ انہوں نے حقیقت کو بکھرے ہوئے مظاہر کی بے ترتیبی

میں نہیں دیکھا بلکہ ان رشتوں کی شکل میں دیکھا جو ایک مظہر کو دوسرے مظہر سے جوڑتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بناتے ہیں''۔(ترقی پسند ادب صفحہ 125) کا حوالہ دیتے ہوئے شافع قدوائی نے اس میں سردار جعفری کی بتائی ہوئی ایک نئی بات اجاگر کی ہے اور ان کے وژن کی ستائش کی ہے۔

شافع قدوائی لکھتے ہیں:

''پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کے ضمن میں سردار جعفری نے محض سوسائٹی کو، جس سے عموماً ایک مربوط اور ہم آہنگ وجود مراد ہوتا ہے، موضوع گفتگو نہیں بنایا بلکہ یہ باور کرایا ہے کہ ناول نگار نے سماجی تشکیل، انسانی رشتوں اور ان کے باہمی ربط اور اثرات کی پیچیدگیوں کو اپنے لافانی کرداروں کے حوالے سے پیش کیا۔ سماج کی طے شدہ اور متعین تعریف سے صرف نظر کرتے ہوئے کرداروں کے مطالعے میں سماج کے بجائے Social Formation یعنی سماجی تشکیل کا ذکر یقیناً نئی بات ہے۔ یہ تحریر 1951ء کی ہے۔ اس کے خاصے عرصے بعد ساختیاتی فکر نے سوسائٹی کے بجائے سماجی تشکیل پر اصرار کرنا شروع کیا''۔ 139

علی سردار جعفری نے 1944ء میں انگریزی میں مجروح سلطان پوری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون کلکتہ کے سنڈے ٹیلی گراف میں شائع ہوا تھا۔ یوسف ناظم نے اس مضمون کے بارے میں لکھا ہے:

''ان (سردار جعفری) کی اجازت سے میں نے اس کا ترجمہ کتاب نما کے لئے کیا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا مجروح، رزم اور بزم کا ساتھی ۔۔۔۔ مجروح اس وقت غزل کے سب سے زیادہ شائستہ، تربیت یافتہ اور مقبول شاعر ہیں ۔۔۔ جعفری صاحب مجروح کی نغمہ نگاری کی بھی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ''خود مجروح کے معاملے میں ان کی فلمی نغمہ نگاری ان کی شاعرانہ مہارت اور خلاقی کا حصہ ہے۔ یہ گیت نگاری مجروح کی فن کارانہ شخصیت کا دوسرا روپ ہے اور اس کا ان کی غزلیہ شاعری سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اپنی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کو روبہ عمل لائے بغیر مجروح ایسے خوبصورت نغمے فلم کو نہیں دے سکتے تھے اور وہ بھی 50 سال کی لمبی مدت تک ۔۔۔

مجروح کی غزلیہ شاعری کے نمونے درج کرتے ہوئے جعفری صاحب نے لکھا ہے:

''نئی غزل کو مجروح کا یہ تحفہ ان کی دوسری غزلوں میں یہی تیور لئے ہوئے ہے لیکن روایت سے مربوط اور منسلک۔ اس کے نقوش بلکہ جڑیں میر تقی میر کے یہاں ملتی ہیں جیسا کہ انہوں نے کہا ہے ۔

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میر
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

میر کے یہاں قرون وسطیٰ کے احتجاج کا لہجہ ہے۔ مجروح کا شعور دور جدید کے طبقاتی شعور سے ہم آہنگ ہے۔ 140

منٹو کی وفات کے بعد سردار جعفری نے منٹو پر ''بدزبان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو افکار کراچی منٹو نمبر 1945ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں منٹو کی شخصیت، اس زمانے کے عالمی حالات، سماجی کیفیت اور منٹو کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

منٹو کی بدزبانی پر سردار جعفری نے لکھا ہے:

''وہ ایسا بدزبان تھا جس پر خوش زبانوں اور پاکیزہ بیانوں کو رشک آسکتا تھا۔ بدزبان بہت ہوئے ہیں۔۔۔لیکن منٹو کو جو سلیقہ آتا تھا وہ کسی کو نصیب نہیں۔اس نے کانٹوں سے پھول کھلائے تھے۔اس نے بدزبانی کو ادب اور فن کا درجہ دے دیا تھا۔یہ بدزبانی خال خال اردو اساتذہ کے یہاں بھی مل جاتی ہے اور بعض ادیبوں کا طرہ امتیاز ہے لیکن منٹو نے اسے اس بلند سطح پر پہنچا دیا تھا جہاں سے اس نے اردو ادب کے بعض ایسے لافانی انسانوں کی تخلیق کی جن کا جواب کبھی نہیں پیدا ہو سکے گا''۔ 141

منٹو پر کن ادیبوں کا اثر رہا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''منٹو نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے ترجموں سے کی جن کا اسلوب اور انداز فکر اس کی ابتدائی تحریروں میں نمایاں ہے۔منٹو کی اس وقت کی ذہنی تشکیل میں جب آج سے بیس برس پہلے میں اس سے پہلی بار علی گڑھ میں ملا تھا، سب سے زیادہ اہم انقلاب روس، جلیاں والا باغ، بھگت سنگھ، کروپاٹکن، وکٹر ہیوگو، گورکی اور رومونا ف کی ایک کتاب Without Cherry Blossom تھی اور گورکی کا اثر اس کے ابتدائی آوارہ گرد کرداروں کی حد تک تھا۔(شاید کچھ چیزیں اور رہی ہوں جس کا مجھے علم نہیں)۔۔۔بعد کے بیس سالوں میں نئے نئے اثرات آتے گئے۔حالات کی پرچھائیاں پڑتی رہیں۔گورکی، انقلاب روس، وکٹر ہیوگو اور جلیاں والا باغ دبتے گئے، بھگت سنگھ، کروپاٹکن اور رومونوف ابھرنے لگے جن میں 1940 کے بعد سومرسٹ نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ 142

منٹو نے سماج کی جو تصویر کشی کی اس کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

''آپ منٹو سے ادبی اور نظریاتی اختلاف کتنا ہی رکھیں، اس کے خلوص، دیانتداری، انسانیت دوستی، حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔اس کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی کہ منٹو اپنے سماج کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا، اس کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔۔۔اسے دکھیاروں سے زیادہ مسخ شدہ روحوں سے دلچسپی تھی، صحت مندوں سے زیادہ مریضوں اور بیماروں کے دل ٹٹولنے میں مزا آتا تھا۔آورہ گردوں سے زیادہ اس کے ہیرو غنڈے اور لفنگے ہوتے تھے اور ان سب کو اٹھا کر وہ سماج کے سر پر انڈیل دیتا تھا اور پھر تلخ ہنسی ہنستا تھا اور اگر کہیں اسے زہد و تقویٰ کا لبادہ نظر آجاتا تھا تو اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کا پہننے والا جھوٹا ہے اور وہ اس لبادے کو پاش پاش کر کے اس آدمی کو ننگا کر دیتا تھا۔منٹو کے ہاتھ میں یہ سماج سڑی ہوئی پیاز کی گانٹھ کی طرح تھا جس کے چھلکے وہ بڑی نزاکت اور چابک دستی سے اتارتا جاتا تھا اور یہ کہہ کہہ کر ہنستا جاتا تھا کہ دیکھو تمہارا سماج پیاز کے بدبودار چھلکوں کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ گانٹھ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔اس کے کچھ چھینٹے ابھی تک باقی ہیں اور سخت اور ٹھوس چیز ہونے کا دھوکا دے رہے ہیں۔منٹو کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے اس سماج کے سامنے اس کی ننگی تصویر لا کر کھڑی کر دی۔اس نے چکلوں سے، بازاروں سے، شراب خانوں سے، گھروں کی چار دیواری اور دفتروں سے سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظر عام پر کھڑے ہو کر کہا ''دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے''لیکن منٹو کی ٹریجڈی اس میں تھی کہ وہ ان شکلوں کو نہ دیکھ سکا، جنہیں منظر عام پر لا کر وہ یہ کہہ سکتا ''دیکھو یہ وہ انسان ہیں جو کبھی جانور تھے''۔وہ حقیقت کو اس کی مکمل اور اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکا۔صرف ایک مسخ شدہ پہلو کو دیکھ کر احتجاج کر کے رہ گیا۔143

منٹو کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فنی اعتبار سے منٹو اپنا جواب آپ تھا۔اس کی زبان میں جو سادگی اور پرکاری تھی، جو اثر تھا، کردار نگاری میں جو تیکھا پن اور نوک پلک تک کا احساس تھا، پلاٹ میں جو گٹھاؤ تھا اور کہانی میں جو کہانی پن تھا اور اسٹائل میں بلا کے طنز کی تلخی کے ساتھ جو شاعرانہ مٹھاس تھی وہ کسی کے پاس نہیں۔وہ دو جملوں میں کردار بنا کر کھڑے کر دیتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کہانی کہتا تھا۔۔۔فن کار تھا اس لئے مر کے بھی زندہ ہے۔آپ آخر میں پوچھیں گے وہ بدزبان کیوں تھا؟ اس لئے کہ اس سماج نے اس سے بدزبانی کی تھی اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں انسانوں سے بدزبانی کی تھی۔اس کی بدزبانی سے نقصان کم پہنچا ہے فائدہ زیادہ ہوا ہے۔منٹو کی بدزبانی ہمارے ادب کی عزیز متاع ہے جسے ہم زندہ رکھیں گے اور جو ہمیں زندہ رکھے گی''۔144

شاہرہ (دہلی) کے دوسرے شمارے فروری 1949 میں سردار جعفری کا 49 صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون بعنوان ''ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل'' شائع ہوا جس میں ترقی پسند ادب کے خدوخال کی وضاحت اور ترقی پسندی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ترقی پسند ادیبوں کی ان تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ابہام کے عناصر تھے۔اس مضمون میں سردار جعفری نے جن تنقیدی نظریات کو پیش کیا تھا اس کے خاص خاص نکات عبدالشکور نے یوں بیان کئے ہیں:

1۔''کسی بھی زمانہ کی شاعری پر اس وقت کی زندگی، سماج اور ادب کے دھاروں سے واقف ہوئے بغیر تنقید نہیں کی جاسکتی''۔

2۔''جو شاعر زمانہ حال کے جذبات واحساسات کی ترجمانی نہیں کرسکتا اس کے الفاظ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں اس کی شاعری میں اثر کا پیدا ہونا محال ہے''۔

3۔''محبت سماجی زندگی سے وابستہ ہے اور اس کو سماجی زندگی سے الگ کر کے عشق کا کوئی مطلق اور مجرد تصور قائم نہیں کیا جاسکتا''۔

4۔''شاعر کا فرض ہے کہ وہ سماجی زندگی کو سنوارنے میں پوری کوشش کرے''۔

5۔''ہمیں پرانی امیجری اور ڈکشن کو ترک نہ کر دینا چاہئے۔اصل میں ہمارا کام یہ ہے کہ ہم احتیاط اور سلیقہ سے پرانی امیجری اور ڈکشن کو استعمال کریں اور اس میں حسب ضرورت اضافے کرتے جائیں''۔

6۔''خارجی حقائق اور انسانی شعور کو نظر انداز کر کے ادب اور آرٹ کا کوئی نظریہ، کوئی کسوٹی نہیں بنائی جاسکتی۔ادب کو زندگی اور نمو کی ترجمانی کرنی چاہئے''۔

7۔''سماج، زندگی اور کائنات کے حقائق کو جذبات اور تخئیل کے سانچے میں ڈھال دینے کا نام آرٹ ہے۔ادب کا خام مواد زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں۔اچھا آرٹ وہ ہے جس میں شعور کی گہرائی، جذبات کی شدت اور تخئیل کی بلندی ہو، وہ شعور جو سماجی حقائق کا صحیح ادراک نہ کرسکتا ہو سچے جذبات پیدا نہیں کرسکتا''۔

8۔''ہر شاعر کا انداز بیاں انفرادی ہونا چاہئے۔یہ انفرادیت آرٹ کے لئے بہت اہم ہے۔فن کار حقیقت کے رنگوں کے مختلف امتزاج سے حقیقت کو نئی شکلیں دیتا ہے''۔۔۔

عبدالشکور نے ترقی پسند نقاد کے بارے میں لکھا ہے:

---''ترقی پسند نقاد الہام یا القا (Inspiration) کے منکر ہیں۔ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی روحانی یا ماورائی قوت پر ایمان لائیں، وہ سماجی اور تہذیبی نشو ونما اور طبقاتی جدوجہد ہی کو ادب اور تنقیدی نظریات کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ شاعر کی روحانیت اور تصوف کی ان کے نظام میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔اگر کسی دور کے ادب کا جائزہ لینا ہو تو یہ جائزہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم پہلے اس دور کے سماجی پس منظر کا غور وتامل سے مطالعہ کریں اور اس کی روشنی میں اس دور کے ادب کو دیکھیں اور سمجھیں''۔ 145

فیض کی نظم پر سردار جعفری نے جو تنقید کی تھی اس کے بارے میں ای اے حیدری نے لکھا ہے:

''ترقی پسند شعرا میں براہ راست پیرائے کے علمبردار علی سردار جعفری ہیں۔

انہوں نے فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کو ترقی پسند شاعری کے زمرے سے خارج کردیا۔ان کا کہنا تھا کہ یہ نظم ترقی پسند نظم نہیں ہے اس لئے کہ رمزیاتی واستعاراتی انداز ترقی پسندی نہیں ہے۔ترقی پسندی اظہار کے براہ راست پیرایہ کی متقاضی ہے جب کہ خود علی سردار جعفری کے یہاں دونوں اسالیب پائے جاتے ہیں۔سردار جعفری کے یہاں بالواسطہ پیرائے والے اشعار خال خال نظر آتے ہیں''۔ 146

فیض نے اپنی غزلیہ اور غیر غزلیہ دونوں قسم کی شاعری میں پرانی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں جو پرانی علامتیں استعمال ہوئیں ان میں گل وبلبل، گلشن، بہار، خزاں، آشیاں، قفس، صیاد، نشیمن، ساقی، میخانہ، جام، میخوار، سبو، شمع اور پروانہ وغیرہ بہت زیادہ مستعمل ہیں۔فیض کی اسی پرانے طرز کی علامتی شاعری کی بناء پر انہیں سردار جعفری نے ترقی پسند شعرا کی نہج سے الگ قرار دیا۔جب ان کی یہ نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' منظر عام پر آئی تو سردار نے کہا کہ یہ ترقی پسند شاعری نہیں ہے''۔ 147

فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر سردار جعفری کی تنقید ملاحظہ کیجئے:

''فیض نے صبح آزادی میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیئے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں۔اور آخری مصرعہ ہے۔چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔لیکن یہ بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں۔اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ ہے، حسینان نور کا دامن ہے، فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا دور اور اس کا مداوا۔ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔یہ شاعری کی سماجی مقصدیت سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے''۔ (ترقی پسند شاعری کے بنیادی عناصر۔شاہراہ)

فیض کی نظم صبح آزادی پر سردار جعفری کی مذکورہ بالا تنقید پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

''عوامی ادب اور عوامی انقلاب کا یہ مطالبہ فیض ہی کیا خود جعفری کی متعدد نظموں میں مثلاً میرا سفر، تخلیق کا کرب اور شاعر

وغیرہ کے لئے درست نہیں معلوم ہوتا۔فیض کی فنی ہنرمندی، ڈکشن کہ تہہ داری اور استعاراتی جہات نے جس طرح اردو کے جدید نظم کو شعرا میں ان کو ممتاز اور سربرآوردہ بنادیا ہے، اس کی وجہ سوائے اس کے اور نہیں کہ انہوں نے سردار جعفری کی ہدایات اور ان جیسے انتہاپسند ادیبوں کی ضابطہ بندی کو ہمیشہ نا قابل اعتناء تصور کیا۔اگر سردار جعفری کو فیض کے یہاں غلامی کے احساس اور اس کے مداوا ہی کی تلاش تھی تو انہیں راشد کی نظم انتقام یا سماجی اور انسانی معاملات و مسائل سے گہرا سروکار رکھنے والی دوسری نظموں کو مسترد کرنے کے بجائے ترقی پسندی کا نمونہ قرار دینا چاہئے۔ 148

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کے پس منظر پر اجمالی نظر ڈالی اور اس میں بات کے صاف اور واضح ہونے کو اجاگر کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''اس ملک (پاکستان) میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کے بول بالا کے لئے فیض احمد فیض اور حمید نظامی نے شانہ بہ شانہ انتہائی نامساعد ابتدائی حالات میں صحافتی محاذ پر علم بلند کیا۔حکومت وقت غیر جمہوری حرکات پر انگلی اٹھانے والے کو غدار وطن قرار دے کر اس کی گردن مار دینے کی کھلی دھمکیاں دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔یہ عام رواج ہو چکا تھا۔مگر فیض اور نظامی جمہوریت کی خیر اور ملک کی سلامتی کی خاطر اس محاذ پر بے خوف و خطر ڈٹے رہے۔

فیض پکار اٹھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔۔۔۔

اس نظم پر خاصا واویلا ہوا۔بائیں اور دائیں بازو کے دھڑوں نے فیض کو آڑے ہاتھوں لیا۔کئی ترقی پسندوں (علی سردار جعفری) نے کہا یہ تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔دوسری جانب اندھیرے کے پجاریوں اور ابن الوقت بددیانت سیاسی لٹیروں اور ان کے گماشتوں نے فیض کے خلاف مسموم پروپگنڈے کی یلغار کردی کہ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے فیض نے پاکستان کی تخلیق کو سرے سے قبول ہی نہیں کیا۔نظم میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں تھا۔بات صاف اور واضح تھی۔لٹے پٹے لوگ، لاتعداد لاوارث بھٹکتے ہوئے مہاجر عوام اور دانشور حیران تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔انہوں نے تو پاکستان کے قیام کی خاطر جان کی بازی لگادی تھی۔یہی لوگ فیض کی نظم کے گرد ہالہ بن گئے۔یہ ان کے دل کی آواز تھی۔وہ پاکستان کی بقاء کے لئے کمربستہ ہونا شروع ہو گئے۔فیض کی یہ نظم مجبور و مظلوم عوام کے دکھی دلوں میں گھر کر چکی تھی۔وہ فیض کے گرویدہ ہو گئے۔فیض نے کہا''آزادی محض ایک سراب ثابت ہوئی اور اس لئے اس سے حاصل ہونے والی خوشی بہت عارضی تھی۔وہ لوگ جو آزاد پاکستان میں سیاسی اور سماجی انصاف کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اپنی تحریروں میں انہی رجحانات کا اظہار کرتے تھے بتدریج طور پر اکثریت کو متاثر کرتے تھے۔آزادی کے بعد وہ سب باطل ثابت ہوا اور جھوٹ نکلا''۔ 149

سردار جعفری کی تاویل کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نے اس نظم کی یہ جو تاویل کی ہے اس کا سبب اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ مارکس کے زیر اثر ترقی پسندوں کے نزدیک اشارتی انداز بیان کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس سے عوام سے آسانی کے ساتھ ربط پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ تفہیم دشوار ہو جاتی ہے اور ابلاغ کا مقصد و تکمیل نہیں پاتا ورنہ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ فیض کی یہ نظم اپنے اشاریتی انداز حسن کے اعتبار سے لاجواب ہے اور یہی فیض جنہوں نے کئی خوبصورت اور کامیاب اشاریتی نظمیں کہیں ہیں اور اشارے استعمال کئے ہیں ----

----چنانچہ تشبیہ و استعارہ (اور ظاہر ہے اسی ذیل میں اشارہ بھی آتا ہے) کو عجز کا اظہار قرار دیتے ہیں''۔ 150

فیض کے الفاظ یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں چیز ایسی ہے وہ یہ کہتا ہے فلاں چیز فلاں چیز جیسی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ قدرت کلام کے مظاہر نہیں، عجز کا اظہار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لکھنے والا اپنے مضمون کی تمام تفصیلات کو چند الفاظ کے جامہ میں سمیٹ نہیں سکا یا ان کے اظہار کے لئے اسے الفاظ نہیں ملے۔ مجبوراً اسے راہ راست کی بجائے تشبیہ استعارے کی پگڈنڈی یا شارٹ کٹ اختیار کرنا پڑا۔ پہلا راستہ طویل بھی تھا دشوار بھی۔ دوسرا مختصر بھی ہے سہل بھی۔ اس عمل میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تشبیہ یا استعارہ منزل نہیں راستہ ہے اور راستہ کی اہمیت محض منزل کی وجہ سے ہوتی ہے''۔ 151

ڈاکٹر سلیمان اطہر نے وضاحت کو جاری رکھتے ہوئے لکھا ہے:

''1947ء میں تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے بعد پاکستان میں ایسا دور کم آیا کہ اظہار رائے کی آزادی ہو۔ آزادئ وطن کے جو خواب برصغیر کے عوام نے یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے دیکھے تھے، وہ بکھر بکھر سے گئے، بے منزل سے ہو گئے۔ ہندو پاکستان میں شاعروں نے کہیں تو دوٹوک اور کہیں کم یا زیادہ اشاریتی انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

سردار جعفری نے اس نظم کے بارے میں خواہ کیسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہو لیکن فیض کی نظم ''صبح آزادی'' (اگست 1947) کا یہ پہلا شعر اس عنوان پر ہمارے فنکاروں کے جذبات و احساسات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ فیض نے اس نظم میں ''داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر'' کے علاوہ ''فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل'' ''شب سست موج کا ساحل''، ''بے صبر خواب گاہوں''، ''چارہ گراں''، ''نگار صبا'' اور ''گرانی شب'' جیسے دل آویز اشارات کے ذریعہ آزادی کے بعد کے حالات اور ان حالات سے عوام کا بے بہرہ ہونا، دانشوروں کی سعی مسلسل اور لاحاصل، کرب، ذہنی انتشار اور تہی دستی کی فنکارانہ مرقع کشی کی ہے---فیض کی لفظیات کا سرمایہ اور ترکیبوں وغیرہ کی کثرت ہماری کلاسیکی شاعری سے ماخوذ ہے لیکن ان کا اشاریتی مفہوم روایتی معنوں سے قطعی مختلف اور بہت دور ہوتا ہے۔ کلاسیکی شاعری سے استوار رشتے کے باعث فیض نے جتنی خوبصورت غزلیں کہیں ہیں، بہت کم ترقی پسند شاعروں کے ہاں یہ بات پائی جاتی ہے اور پھر یہ بھی کہ غزل کی اشاریتی روح ان کی منظومات میں بھی کارفرما ہے۔ قاتل، مقتول، دل فگار، داغ داغ اجالا، شب گزیدہ سحر، محتسب، پیر مغاں، اہل ستم، چارہ گر، بت، شام، سحر، قفس، بہار، خزاں، صیاد، گلشن، وصل اور ہجر جیسے الفاظ کو جو ایک طرح غزل کے الفاظ بن گئے، فیض نے

اپنی منظومات میں بھی بطور اشارات کے بار بار استعمال کیا ہے اور پھر اس ہنرمندی کے ساتھ کہ یہ عصری معاشرے اور سیاست کے پس منظر میں اجنبی محسوس نہیں ہوتے"۔ 152

سردار جعفری نے عوامی ادب کے لئے رمزیت اور علامت کے گہرے پن کی مخالفت کی ہے۔انہوں نے دہلی میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں کہا:

"اگر ادب کو عوام تک لے جانا ہے تو اس کی سطح دوسری ہوگی۔اس میں رمزی اور علامتی اظہار کا رنگ گہرا نہیں ہوسکتا۔ ترقی پسندوں نے ایسی شاعری کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔انقلابی شاعروں میں پبلو نرودا، مایاکوفسکی اور نذرالاسلام کی شاعری بھی بڑی حد تک راست اظہار کی شاعری ہے جسے عوام سمجھتے آئے ہیں"۔ 153

سردار جعفری نے فیض کی نظم "صبح آزادی" کے متعلق کہا کہ "فیض نے اپنی پندرہ اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیئے ہیں جن کے پیچھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے"۔عقیل احمد صدیقی کے مطابق اس سے سردار جعفری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ طریق اظہار واضح اور براہ راست ہو نہ یہ کہ استعاروں اور پیکروں میں چھپا ہوا۔یہی اصل عوامی ادب کی روح ہے۔ 154

سردار جعفری نے فیض کی نظم صبح آزادی کے ان اشعار

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہی بات تو مسلم لیگ اور مہاسبھا والے بھی کہہ سکتے ہیں۔فیض کو چاہئے تھا کہ ان کا مقصود جس سحر سے ہے اس کی طرف واضح اشارہ کرتے۔

علی سردار جعفری کی اس تنقید پر اپنی رائے دیتے ہوئے نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری پر محمد اسحاق اور سردار جعفری کے جو اعتراضات نقل کئے گئے ہیں اس میں تغزل کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا لیکن غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ دونوں کے اعتراضات خصوصاً سردار جعفری کے اعتراض کا ہدف فیض کا وہی تغزل ہے جو ان کی شاعری کے محاسن کا سرچشمہ ہے۔فیض کے ترقی پسندی یا ترقی زدہ احباب اور نقاد چاہتے ہیں کہ فیض ایک شاعر کی حیثیت سے شاعری نہ کریں بلکہ اشتراکی جماعت کے رکن کی حیثیت سے شعر کہیں۔سحر اور انقلاب کے الفاظ استعمال کریں تو ان کے ساتھ سرخ کی صفت ضرور استعمال کریں۔مزدوروں اور مظلوموں پر نظمیں لکھیں تو اس انداز میں لکھیں۔

دیکھو دور افق کی صنو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو اٹھو اے مظلوم انسانو

ظاہر ہے کہ یہ وضاحت، یہ صراحت، یہ خطابت تغزل کے منافی ہے۔فیض نے تغزل کا سہارا لے کر اپنے آپ کو اس

انجام سے بچالیا ہے جس سے خود سردار جعفری کی شاعری دوچار ہے۔آج ترقی پسند شاعری کے بیشتر حصے کی طرح سردار جعفری کی شاعری کو بھی بڑی حد تک صحافت پر محمول کیا جارہا ہے"۔ 155

غزل کو فیض، مجروح، مجاز اور جذبی نے کیا دیا اس تعلق سے سردار جعفری لکھتے ہیں:

"غزل کو عصر حاضر میں لانے کا کام فیض اور مجروح نے انجام دیا ہے۔۔۔غزل کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں فیض کے ساتھ مجروح کا بھی بڑا ہاتھ Contribution ہے۔اس میں مجاز اور جذبی بھی شامل ہیں گو ان کا حصہ فیض اور مجروح سے کم ہے"۔ 156

فیض کی شاعری سے متعلق ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے بتایا:

1۔"فیض شروع سے ہی لطیف لہجہ کے شاعر رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے لطیف لہجہ میں مزید چاشنی، مزید لطافت، حسن اور نغمگی پیدا ہوتی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انتساب جیسی نظم بھی کہی۔کلرکوں، پوسٹ مینوں اور گاڑی بانوں جیسے الفاظ میں۔اور پھر فیض کی آخری دور کی نظمیں جو انہوں نے فلسطینی نعرے پر لکھی ہیں کہ "حقا کہ ہم جیتیں گے" یہ لہجہ یہ ڈکشن فیض کے ہاں پہلے نہیں تھا لیکن آخر آخر میں ان کے ہاں بھی یہ بلند بانگ احتجاجی لہجہ آیا۔

فیض کی ایک غزل نما نظم ہے کہ:

"جب مزدور، کسان جاگیں گے تو ایک کھیت نہیں، ایک دیس نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے ہم ہر پرچم پر اک لال ستارہ مانگیں گے"۔بات دراصل یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں دونوں چیزیں شامل ہیں۔اگر کوئی بلند آہنگی کو بہانہ بنا کر فیض کی پوری شاعری میں معترض ہو تو کیا آپ اسے ادبی دیانت کہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔فیض کا جو لطیف تر لہجہ تھا وہ وقت کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتا گیا، فیض تو آخر وقت تک ارتقاء پذیر رہے ہیں اور ان کا خلاقانہ ذہن آخر وقت تک کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہا ہے۔ان کی نغمگی جو رومانی نظموں میں تھی وہ بعد کی رجزیہ نظموں میں زیادہ اعلی سطح پر نظر آتی ہے۔لہٰذا شاعری کو لطیف لہجے اور بلند آہنگ میں تقسیم کر دینا، ہے ہی غلط بات۔لہجہ اور آہنگ تو موضوع سے بنتا ہے"۔۔۔۔

2۔ہمارے ہاں دو لہجے ملتے ہیں۔ایک لہجے کو آپ غنائی یا بزمیہ اور دوسرے کو رزمیہ یعنی رزم کا لہجہ (کہہ سکتے ہیں)۔ترقی پسند شاعری میں دونوں لہجے ساتھ ساتھ سفر کرتے ملیں گے۔فیض کے ہاں غنائی لہجہ میں جو نہایت خوبصورت اور موثر ہے اور اس کا بڑا اثر اپنے عہد کی شاعری پر پڑ رہا ہے میرے ہاں بھی اس کا اثر ہے۔مخدوم کے ہاں بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں جو رزمیہ لہجہ ہے اس کا اثر بھی فیض کے ہاں موجود ہے۔مجاز کے مصرعے ؎

ہاں ہم نے کمندیں پھینکی ہیں۔۔۔

یہ لہجہ رزمیہ لہجہ ہے اور فیض کے ہاں آیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ ؎

جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

تو اس طرح ہم عصر شعرا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔فیض نے تو اس معاملہ میں ہمیشہ ہی بڑی فیاضی

اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے۔فیض نے وضاحت کے ساتھ نام لے لے کر بتایا کہ میں نے اس سے اثر لیا، اس سے اثر لیا اور جب میں لکھنو گیا تو مجاز، سردار، جاں نثار اختر سے اثر لیا تو اس معاملہ میں فیض نسبتاً بہت فیاض اور کشادہ دل انسان تھے اور ہمیں یعنی ترقی پسند شعراء کو تو کشادہ دل ہونا ہی چاہئے۔میں نے فیض سے اثر قبول کیا ہے۔فیض شروع ہی سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے کے آدمی تھے۔یہ دھیما پن ان کا مزاج تھا، غنائیت ان کی شخصیت میں شامل تھی۔میرا اپنا مزاج بالکل الگ رہا ہے۔لہٰذا لہجوں کا فرق مزاج اور افتادِ طبع کے فرق سے ظہور میں آیا ہے۔ہمارا مقبول ترین اور نمائندہ شاعر تو فیض ہے نا؟ اس سے زیادہ مقبولیت تو اس عہد میں کسی اور شاعر کو ملی ہی نہیں۔ہم سب فیض کے ہم عصر ہیں، لیکن فیض کی مقبولیت کو خود اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں اور ان کی مقبولیت کو اپنی مقبولیت جانتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی قبیلے کے آدمی تھے اور انہیں جو مقبولیت ملی ہے میں تو ایسا سمجھتا ہوں گویا وہ مقبولیت خود مجھے ملی ہے اور یہی ایک امتیازی فرق ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں ہے۔فیض کے ہاں رزمیہ لہجہ کس بلند آہنگی کے ساتھ آیا ہے بلکہ آخر آخر میں تو انقلابی نعرہ کی گونج ان کے ہاں سنائی دیتی ہے تو کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کو کسی ایک آہنگ یا لہجے سے مخصوص کر دینا یقیناً درست نہ ہوگا"۔ 157

سردار جعفری کی فراق پر تنقید کے سلسلہ میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا:

"ان (فراق) کا ایک مضمون شاہراہ میں چھپا تھا جس میں شاعر اور دانشوروں کی آزاد روی کے ضمن میں امرد پرستی کا بھی جواز پیش کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں دورِ قدیم کے یونانی فلسفیوں سے لے کر آسکر وائلڈ تک کا ذکر تھا کہ جنسی عمل کی ضابطہ بندی کے اعتبار سے بھی یہ ادیب اور دانشور گویا ان بندشوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔"یہ ترقی پسندی نہیں ہے" کے عنوان سے اس کے جواب میں بھی سردار جعفری نے سخت مضمون لکھا۔یہ تینوں مضامین (معین احسن جذبی، فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر اور فراق کے مضمون کے جواب میں یہ ترقی پسندی نہیں ہے) کی اشاعت سے سردار جعفری کی حیثیت ادبی محتسب کی ہوگئی گو اس وقت تک ترقی پسند ادیب اپنا پیر مغاں جوش ہی کو تسلیم کرتے تھے مگر عملاً یہ منصب سردار نے اختیار کرلیا تھا"۔ 158

سردار جعفری کی جذبی پر تنقید کے سلسلہ میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا:

"سردار جعفری نے ۔۔۔شاہراہ دہلی (پہلا شمارہ جنوری 1949) میں معین احسن جذبی کے نام ایک طویل خط چھپوایا جس میں ان کی نظموں کے ابہام پر اعتراض کیا گیا تھا۔بقول ان کے جذبی کی نظم "نیا سورج" میں جو ارمان کیا گیا تھا وہ ارمان تو کوئی رجعت پسند بھی سیاسی آزادی کے حصول پر کرسکتا ہے کہ آخر اس آزادی سے حاصل ہی کیا ہوا؟ جو دبے کچلے تھے وہ تو آج بھی اسی طرح دبے کچلے ہوئے ہیں اور پھر اس پر بحث کی کہ شاعری کو زیادہ براہ راست اور برملا ہونا چاہئے"۔ 159

پروفیسر وارث کرمانی لکھا ہے:

"سردار جعفری کے معتوب شاعروں میں معین احسن جذبی کی مثال بہت نمایاں ہے جن کی قنوطیت زدہ غزلوں پر سردار نے انہیں خط لکھ کر سخت تنبیہ کی تھی اور ترقی پسندانہ نظمیں لکھنے کی ہدایت کی تھی لیکن جذبی نے سرتابی کی اور اپنی روش پر قائم رہے۔جذبی کی بعض تخلیقات سردار جعفری کی آمریت کے خلاف ایک کراہتی ہوئی آواز بن گئی مثال کے طور پر ان کی نظم "اپنے

نقاد سے پیش کی جا سکتی ہے"۔160

سردار جعفری کا ایک مضمون "ادب میں تنگ نظری" شاہراہ دہلی کے فروری، مارچ 1952 کے شمارے میں شائع ہوا۔

مضمون شروع ہونے سے پہلے قوسین میں ادارہ شاہراہ نے لکھا ہے:

"یہ مختصر مگر اہم مضمون ادارہ شاہراہ کے نام سردار جعفری کے ایک خط کا اقتباس ہے۔ ہم اپنے ترقی پسند نقادوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ادب میں تنگ نظری اور ادب میں متحدہ محاذ کے موضوعات پر خاص توجہ دیں کہ اس وقت ادب کا یہ سب سے اہم تقاضا ہے"۔

اس مضمون کے لکھنے کا مقصد دراصل ترقی پسندی کی وضاحت ہے۔

سردار جعفری نے کچھ لوگوں کے اعتراضات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ادھر کچھ دنوں سے یہ ہوا چلی ہے کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق بالکل نظر انداز کر دیا جائے بعض حضرات کا خیال ہے کہ ترقی پسندی کے مفہوم کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی جدوجہد کی ترجمان انتہا پسندی ہے۔ جب سے ہم نے یہ کہا کہ ترقی پسند مصنفین تنگ نظری کا شکار ہو گئے تھے تب سے ہم پر حملہ اور زور شور سے ہونے لگا ہے اور لوگوں نے وسیع النظری کا یہ مقصد قرار دے دیا ہے کہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا فرق اٹھا دیا جائے اور صرف اچھے اور برے ادب کا فرق باقی رکھا جائے"۔

علی سردار جعفری نے مذکورہ بالا اعتراضات کے جوابات دیتے ہوئے لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔"ہم تنگ نظر ان معنوں میں تھے کہ ہم میں سے بہت سے ترقی پسندوں نے احمد عباس اور جذبی ایسے ترقی پسندوں کو بھی برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر ہم اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اس پر شرمندہ ہوتے ہیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ترقی پسند اور رجعت پسند میں تمیز نہ کریں اور صرف یہ کہیں کہ ادب اچھا ہوتا ہے یا برا اور اچھا ادب ترقی پسند اور رجعت پرست سب لکھتے ہیں۔ یہ نظریہ "ادب برائے ادب" کا نظریہ ہے جس کے خلاف ہم پندرہ بیس برس سے جدوجہد کر رہے ہیں۔۔۔"

2۔"ویسے میں بھی یہ قبول کرنے کو تیار ہوں کہ ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا برا۔ لیکن اچھے اور برے میں فرق کیا ہے۔ میں سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ ہر ادب کا مواد Content کیسا ہے۔ اچھا یا برا۔ اچھا مواد میں اس کہتا ہوں جو صحتمند، مفید اور حوصلہ بخش ہو۔ برا مواد وہ ہے جو بیمار، غیر مفید، مایوس کن، تاریک اندیش یا گندہ ہو۔ سیاسی جدوجہد سے لے کر حسن و عشق کے موضوعات تک اچھے اور برے کی جستجو کی جا سکتی ہے۔ برے مواد کی ہیئت بظاہر جتنی خوبصورت ہو، اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدت ہو اس ادب کو میں اتنا ہی برا اور خطرناک سمجھتا ہوں کیونکہ اس کا زہر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے۔

۔۔۔ اچھا ادب وہ ہے جو اظہار و بیان میں حسین اور موثر ہو لیکن اس سے پہلے اس کے مواد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ صحت مند مواد کا انتخاب کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں اظہار و بیان کا کتنا حسن، کتنا خلوص اور کتنی

شدت ہے۔ممکن ہے کہ اس کے پرکھنے میں مجھ سے غلطی ہوجائے اور بعض ایسی چیزیں چھوٹ جائیں جو انتخاب میں شامل ہونے کے قابل ہوں اور بعض ایسی آجائیں جو اس قابل نہ ہوں۔اس غلطی کا اعتراف اور تدارک کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے اس معیار کو ''وسیع النظری'' کے نام پر ترک کردوں۔میں چاہتا ہوں کہ کبھی ہمارا کوئی صاحب فکر نقاد یہ بھی لکھے کہ ہماری روایات میں عوامی قدریں کیا ہیں اور جاگیرداری اور سامراجی قدریں کیا ہیں، کن قدروں کو لے کر آگے بڑھنا ہے اور کن قدروں کو ترک کرنا ہے''۔ 161

علی سردار جعفری کا مضمون ''عوامی شاعری اور عوامی زبان'' شاہراہ، دہلی کے اکتوبر 1952 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے وامق جونپوری کے جولائی اگست 1952 کے شاہراہ میں شائع شدہ پرکاش پنڈت کے نام خط کا حوالہ دیا ہے جس میں وامق نے ایک اہم بحث کا آغاز کیا تھا۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اس سوال پر غور کرنا بہت ضروری ہے کہ عوامی شاعری کیا ہے کیونکہ ترقی پسند شاعر عوامی شاعری کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔

وامق جونپوری کے خط کے اقتباسات پیش ہیں:

1۔''موجودہ زندگی کا دور جمہوری ہے جو عوامی جدوجہد کی آغوش میں پرورش پا رہا ہے۔وہ چیز ہرگز عوامی نہیں کہی جاسکتی جس سے عوام کو فائدہ نہ پہنچ سکے یا جس کو عوام اپنا نہ سکیں۔اس لئے آج کے معیار پر اصلی ترقی پسند شاعری ہے جو عوامی شاعری کہی جاسکے، عوامی شاعری وہی شاعری ہے جس کو عوام سمجھیں سکیں، جس کو عوام گاسکیں جس میں عوام کو اپنی زندگی دکھائی دے تاکہ وہ اس کی روشنی میں ترقی کرسکیں''۔۔۔

2۔''اس وقت تک عوامی شاعری نہیں کہی جاسکتی جب تک اس میں عوامی زبان کا استعمال ایک تحریک کی صورت میں نہ آجائے۔آج عوام کے متعلق شعر کہنے سے زیادہ عوام کے لئے شعر کہنا ضروری اور اہم ہے''۔۔۔

3۔''ترقی پسند تحریک کے گذشتہ دور میں شاعروں کو اپنے ہم دوش ساتھیوں کی نشوونما اور دوسرے متوسط اور اونچے طبقے کی ہمدردی حاصل کرنا مقصود تھا تاکہ اس کی مدد سے عوامی تحریک کامیابی کے ساتھ آگے بڑھائی جاسکے۔اس لئے اس دور میں متوسط طبقے ہی کی زبان کا استعمال صحیح تھا، اور اب عوام کے لئے شعر کہنے میں عوام ہی کی زبان کا استعمال ہوسکتا ہے''۔

4۔''جس زبان میں متوسط طبقے کا ادیب شاعری کرتا ہے وہ اس کو اپنے اجداد سے ترکہ میں ملی ہے۔متوسط طبقہ اپنے کلچر اور کردار کے اعتبار سے بنیادی طور سے لاشعوری انداز میں رجعت پسند ہوتا ہے۔وہ ترقی پسندی اور عوامی جدوجہد کا نعرہ تو ضرور لگاتا ہے مگر عوامی زبان کے مسئلے میں آکر اس کے اصل روپ کا انکشاف ہوجاتا ہے''۔

5۔''عوامی زبان وہ ہے جس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک کے عوام اگر اچھی طرح بول نہ سکتے ہوں تو کم از کم سمجھتے ضرور ہوں۔اور وہ زبان وامق کے نزدیک فلمی گیتوں کی زبان ہے۔1936 سے آج تک اردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جن کو قبول عام کی سند حاصل ہوسکی ہے مثلاً مخدوم کی نظم ''جنگ آزادی''، میرا (یعنی وامق کا) گیت بھوکا بنگال اور عمر شیخ کا ''نیا ترانہ''۔

علی سردار جعفری نے جو جوابات دیئے اور وضاحتیں پیش کیں ان کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

(الف) ''واحق کے تمام مفروضات غلط ہیں۔پہلی اور اہم چیز یہ ہے کہ زبان قومی ہوتی ہے طبقاتی نہیں ہوتی اور قومی زبان ہی عوامی زبان ہے۔اسے ان تمام طبقوں (جاگیردار، سرمایہ دار، درمیانی طبقہ، مزدور اور کسان) نے مل کر کئی صدیوں سے بنایا ہے۔اس قوم کے تمام لوگ عوام اور غیر عوام بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں۔یہ تعریف گمراہ کن ہے کہ 'عوام اگر اچھی بول نہ سکتے ہوں تو سمجھتے ضرور ہیں۔ذرا سوچئے وہ کیسی ''عوامی زبان'' ہوگی جسے عوام اچھی طرح بول نہ سکتے ہوں۔

---اس میں کچھ الفاظ متروک ہو جاتے ہیں یا کچھ نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن زبان بنیادی طور سے نہیں بدلتی ہے۔واحق درمیانی طبقے کی زبان کو عوام کی زبان سے الگ بتاتے ہیں اور اسے یہ کہہ کر متروک قرار دینا چاہتے ہیں کہ متوسط طبقہ اپنے کلچر اور کردار کے اعتبار سے بنیادی طور پر لاشعوری انداز میں رجعت پرست ہوتا ہے۔معلوم نہیں وہ عوام کا لفظ کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔عوام کوئی طبقاتی وحدت نہیں ہیں۔ان میں مزدور اور کسان کے ساتھ درمیانی طبقہ بھی شامل ہے۔رہ گیا رجعت پرست ہونے کا سوال تو کسانوں کا طبقہ بھی بنیادی طور سے رجعت پرست ہوتا ہے اور خود عوام بھی بنیادی طور سے ترقی پسند نہیں ہوتے کیونکہ ان میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ہر قسم کے طبقے ملے ہوتے ہیں۔

(ب)۔''واحق نے عوامی شاعری کے لئے یہ شرط لگا دی ہے کہ ''جس کو عوام گا سکیں''۔یہ گیت کی خصوصیت ہے جس کی بنیاد جن گان (Folk Song) پر ہوتی ہے اور نظم کی لازمی خصوصیت نہیں ہے۔نظم دونوں طرح کی ہوتی ہے جو گائی جا سکے اور وہ جو تحت اللفظ پڑھی جا سکے، سنائی جا سکے، خطیبانہ انداز سے پیش کی جا سکے۔والٹ وہٹ مین، مایا کوفسکی، پبلو نرودا کسی کی نظمیں گائی نہیں جا سکتیں اور ان کے عوامی شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔---پھر ہندوستان کی شاعری میں بھی کتنی مثالیں ملیں گی جو گائی نہیں جاتیں یا گائی نہیں جا سکتیں مثلاً کیفی کی نظمیں اور خود مخدوم کی نظم اسٹالن کی آواز جسے مخدوم ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن ترنم سے پڑھنے اور گائے جانے میں فرق ہے۔اس کے بعد اس بیان کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جنہیں قبول عام کی سند حاصل ہو سکتی ہے''۔

نظموں کو عوامی شاعری سے خارج کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

(ج)۔''عوامی شاعری کیا ہے؟ یہ محض زبان یا ہیئت کا سوال نہیں ہے بلکہ بنیادی طور سے موضوع اور حقیقت نگاری کا سوال ہے---عوامی شاعری کے لئے عوام کی زندگی اور جدوجہد کی ترجمانی اس طرح کرنا ضروری ہے کہ انہیں اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے اور زندگی کے بدلنے میں مدد ملے۔اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوام کی سمجھ میں آ سکے۔عوام کی سمجھ میں آ سکنے کا مسئلہ محض آسان زبان کا مسئلہ نہیں ہے۔بعض اوقات تصورات مشکل ہوتے ہیں اور آسان زبان کے باوجود بھی ان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔سب سے پہلا سوال موضوع کے انتخاب کا ہے۔اگر موضوع عوام کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے سمجھنے میں انہیں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کو پہچانتے ہیں۔اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ شاعر عوام کی زندگی میں برابر کا شریک ہو''۔

(د)۔''آخر میں چند الفاظ پچھلے سترہ برس کی عوامی نظموں کے بارے میں---مجھے ایسے دو تین درجن گیت یاد ہیں جو اپنی مقبولیت میں ان تین گیتوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں جن میں لینن کا وردان، چل پڑا کارواں لینن کا۔مزدوروں نے

ملکوں ملکوں۔ بھاگو لندن جاؤ۔ اب ناگاڑی چالے۔ چرچل کی چھوری۔ جاگا تلنگانہ اس بار لڑائی لانے والا۔ ٹرومن چاچا وغیرہ شامل ہیں۔ پھر مجاز کی نظم لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں۔۔۔ پھر یہ گیت ہی تو سارا سرمایہ نہیں۔ ترقی پسند شاعروں نے اچھی انقلابی نظمیں بھی کہی ہیں جنہیں کوئی شخص عوامی شاعری سے خارج نہیں کرسکتا۔ انہیں بھی قبول عام کی سند ملی ہے..... مخدوم ہی کو لیجئے۔ اس نے صرف ''جنگ آزادی'' نہیں کہی ہے بلکہ اسٹالن کی آواز، اندھیرا، سپاہی، انقلاب اور تلنگانہ بھی کہی ہیں اور یہ سب عوامی نظمیں ہیں''۔

(ہ)۔ ''لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وامق نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بہت اہم ہے اور ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو اس پر بحث کرنی چاہئے۔ میں نے انتہائی مصروفیت کے عالم میں ذرا سا وقت نکال کر یہ چند ورق لکھ ڈالے ہیں''۔ 162

سردار جعفری کا مضمون ''یہ ترقی پسندی نہیں ہے'' شاہراہ دہلی کے ستمبر اکتوبر 1954 کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس کی ابتداء میں سردار جعفری نے فراق کا غزل پر مضمون اور خطوط کا حوالہ دیا ہے جو اگست 1954 کے نقوش (لاہور) میں شائع ہوئے ہیں۔ بقول سردار جعفری ان میں فراق نے نظریہ شاعری کو بیان کیا ہے۔ اپنی خودستائی بھی کی ہے اور اپنے آپ کو میر، غالب، اقبال، جوش سے بڑا شاعر بتایا ہے اور کہیں کہیں شیکسپیئر اور ملٹن کا ہم پلہ ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اپنے مضمون میں سردار جعفری نے فراق کے مضمون اور خطوط کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے فراق کے نظریہ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان سب باتوں سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(الف) فراق کے نزدیک عشق جو جنسیت کی ترقی یافتہ اور روحانی شکل ہے یعنی جنسی عشق شاعری ہی کا نہیں بلکہ تمام فنون لطیفہ، ساری تہذیب زندگی اور اس کے عوامل کا خالق ہے۔

(ب) اس عشق میں امرد پرستی۔۔۔۔ کا بھی ایک جمالیاتی مقام ہے۔

(ج) فراق نظم کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن غزل کو سب سے بڑی صنف سمجھتے ہیں جس کے ''مرکزی موضوعات حسن و عشق ہیں اور زندگی کے مرکزی حقائق و احساسات''۔

(د) نظم کے لئے مقصدی ہونا ٹھیک ہے لیکن غزل کو مقصد یا افادی پہلو سے ترقی پسندی کا مرض لاحق ہوجاتا ہے اور وہ چھوئی موئی شاخ مرجھا جاتی ہے جیسے فیض اور مجروح کی غزل۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اس نظریے کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو پہلے بھی رجعت پرست حلقوں میں اچھالے جاچکے ہیں اور جن کے خلاف ترقی پسند تحریک جدوجہد کرتی رہی ہے''۔

دس گیارہ صفحات پر مشتمل بحث کے آخر میں سردار جعفری نے فراق کو اپنے نظریہ خصوصاً نظریہ شاعری پر نظر ثانی کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فراق اگر ان حالات کی روشنی میں اور ترقی پسندی کے ہوشیار مخالفین کی کوششوں کے پہلو بہ پہلو اپنے خطوط اور غزل اور اپنے مضمون کو جانچنے کی زحمت گوارا کریں تو وہ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ غلط نظریات کی تاویل کرنے میں ایسا پھنسے ہیں کہ اسی رجعت پرستی کے ہاتھوں میں کھیل گئے۔جس کے وہ شعوری طور سے مخالفت ہیں اور جس کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری کے بہتر حصے کو استعمال کرنا چاہا ہے۔یہ تنہا فراق کی کوتاہی نہیں ہے بلکہ طبقاتی سماج کے ان الجھے ہوئے حالات میں بہت سے لوگوں کے یہاں نظریے اور عمل کا، تاویل اور برتاؤ کا یہ تضاد ملتا ہے۔بڑے بڑے شاعروں کی شاعری اور نظریۂ شاعری کے تضاد کی شکل میں یہ دورخی نظر آتی ہے۔فراق کی شاعری کا بہترین حصہ بھی اتفاق سے وہی ہے جو ان کے نظریہ کے خلاف جاتا ہے اور جس شاعری کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔فراق ہمارے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔اس لحاظ سے جہاں ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ان کے ہم عصروں اور نوخیز ادیبوں اور ترقی پسند ادب کو فیض پہنچا سکتے ہیں، قوت عطا کرسکتے ہیں وہیں اس کا بھی اندیشہ ہے کہ وہ گمراہی پھیلانے میں بے اندازہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ فراق اپنے نظریہ پر اور خصوصاً نظریہ شاعری پر نظر ثانی کریں''۔ 163

سردار جعفری کا مضمون ''وجد کی شاعری''، ''آج کل'' دسمبر 1956ء میں شائع ہوا۔وجد حیدرآباد کی سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوکر لکھنؤ ٹریننگ لینے گئے۔وہاں ان کی ملاقات سردار جعفری سے ہوئی۔سردار جعفری نے وجد کی نظم اجنتا کو ایک خوبصورت نظم کہا اور بتایا کہ یہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور اس کے ہر مصرعے میں وجد کا دل دھڑک رہا ہے۔

اجنتا کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اجنتا ہندوستانی تہذیب اور فن کا وہ لافانی کارنامہ ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی ملک نہیں پیش کرسکتا۔بیرونی اقتدار نے ہمارے ماضی پر پردے ڈال رکھے تھے ہماری تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ پردوں کو اٹھانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک کوشش وجد کی یہ نظم ہے۔یہ نظم اور وجد کی بعض دوسری نظمیں ان لوگوں کے لئے بھی ایک مسکت جواب کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اردو شاعری کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے''۔ 164

وجد کی نظموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔''ایک خصوصیت جو مجھے وجد کی اس قسم کی نظموں میں نظر آتی ہے اس کا ذکر کردینا مناسب ہے۔قدیم ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ایک بہت بڑے نقاد عالم کمارسوامی نے کسی جگہ ایک بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ قدیم ہندوستان میں فنکار اور دستکار اور محنت کش اور معمار میں کوئی فرق نہیں تھا۔یہ دونوں روحیں ایک ہی جسم میں رہتی تھیں۔گذشتہ چند صدیوں میں سرمایہ داری اور تجارتی سماج نے ان دونوں روحوں کو الگ الگ کردیا جس کی وجہ سے محنت کش کو بھدا اور غیر فنکار سمجھا جاتا ہے اور فنکار کو مزدوروں سے الگ کرکے غیر مفید سمجھا جاتا ہے جس کا کام جی کو خوش کرنا ہے۔سماجی افادیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ نکتہ وجد کی شاعری میں بھی موجود ہے۔وہ اہل ہنر مزدوروں کو بھی اہل ہنر کہتا ہے بلکہ ان کا ذکر اتنی ہی محبت اور عقیدت سے کرتا ہے جس کا اظہار اجنتا اور ایلورا کی نظموں میں ہوتا ہے۔اس کا عنوان ہے ''مزدوروں کا پیغام''۔جامعہ عثمانیہ کے محنت کش معمار ہوں یا اجنتا کے فنکار اور ایلورا کے بت کار سب نے کام چھوڑا ہے نام کسی نے نہیں چھوڑا۔وجد کی شاعری بار بار یہی

پیغام دیتی ہے"۔

2۔"وجد کی شاعری کے اور بھی کئی پہلو ہیں ۔ان میں سب سے زیادہ نمایاں حب الوطنی اور جذبہ آزادی کا پہلو ہے۔ وجد کی شاعری میں "کسان اور ترانہ دکن" جیسی حب الوطنی اور آزادی سے سرشار نظمیں ہیں ۔پہلی پر جوش کا اثر اور دوسری پر اقبال کا اثر ان نظموں کی معنوی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔ ہر نیا شاعر ابتداء میں اپنے پیش رو شعراء سے متاثر ہوتا ہے پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز پیدا کر لیتا ہے اور وجد کی یہ اپنی آواز "لہو ترنگ" کے بعد "آفتاب تازہ" میں زیادہ آسانی سے پہچانی جاتی ہے"۔

3۔"سرکاری ملازمت کے باوجود انہوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ رکھا۔چنانچہ ان کی 1942ء کی ایک نظم "نیا گیت" خاص طور سے قابل توجہ ہے"۔

4۔"نظم "کاروان زندگی" ..... میں بڑی وسعت ہے اور اس کے مصرعے صدیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں ۔اس نظم کی سرحدیں ہندوستان کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ شاعر ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ ساری انسانی دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور صرف ایک ملک ایک قوم کی نہیں بلکہ اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دے رہا ہے"۔

5۔"تغزل اور رومانیت ..... یہ دونوں چیزیں اس کی شاعری کی جان ہیں"۔

6۔"خاک دکن کو یہ اپنا نیا شاعر مبارک ہو جسے ہم پورے ہندوستان کا شاعر سمجھتے ہیں"۔ 165

مجاز کا انتقال 5/دسمبر 1955ء کو ہوا۔سردار جعفری نے اپنے مضمون "کفن بر دوش" میں مجاز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مجاز نے اپنے محبوب شعراء سے جو تاثر لیا اس بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"اس وقت مجاز کے محبوب شاعر، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی تھے۔جوش کی رندی اور بے باکی، اختر کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس رندی اور بے باکی، معصومیت اور رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی جس نے وقت کی ساری فضا کو سرشار کر دیا"۔ 166

مجاز کی شاعری کا جذبی اور فیض کی شاعری سے تقابل کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا کہ مجاز کی شاعری میں شروع سے آخر تک نشاط ہی نشاط ہے، اس کے یہاں غم بھی شعر کا جامہ پہن کر نشاط اور کیفیت پیدا کرتا ہے، جذبی اور فیض نے عشق کے غم کو محسوس کیا اور مجاز نے عشق کے نشاط کو۔فیض کے یہاں حسن خواب آلود، خاموش اور دردمند ہے لیکن مجاز کے یہاں حسن تیز، طرار اور شوخ ہے، فیض اپنے دل سے باتیں کرتا ہے اور مجاز سماج سے، فیض گنگناتا ہے اور مجاز گاتا ہے اور اس کے گیت میں بغاوت کا آہنگ سب سے زیادہ بلند ہے۔اس کے ساز کی لے میں ہمیشہ شمشیر کی تیزی ملے گی۔

کارزار زندگی میں عورت کی شمولیت کے بارے میں مجاز کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

"مجاز غالباً اپنے عہد کے شعراء میں وہ تنہا شاعر ہے جس نے عورت کو کارزار زندگی میں پیچھے رکھنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

اس نے آزادیٔ نسواں کے مقابلے میں زمرد کے گلوبند کو پیش کیا اور نہ علم کو عورت کے حسن کی توہین سمجھا۔اس نے آزادی اور انقلاب کے نام پر عورت کو محبت دینے سے کبھی انکار نہیں کیا.....اُس نے ہمیشہ حسن کو مشن کے ساتھ میدان میں اترنے اور جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔اس لیے اس کے یہاں اکثر مشن اور بغاوت ہم معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔یہ جذبہ صرف اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب عورت کو مرد کی عیش وعشرت کا کھلونا یا محض بچہ پیدا کرنے کی مشین نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی سماجی حیثیت اور انسانیت کو بھی تسلیم کیا جائے تب وہ اچھی معشوقہ بھی بن سکتی ہے اور پروقار ماں بھی۔اور شاعری میں یہ عشق کا ایک نیا تصور تھا اور یہ تصور اس تحریک آزادی کے ساتھ پیدا ہوا تھا جس نے جھانسی کی رانی سے لے کر سروجنی نائیڈو تک بے شمار ہندوستانی ہیروئین پیدا کی تھیں۔اسی لیے مجاز اپنی نظم ''نوجوان خاتون'' میں جب جدید عورت کا تصور پیش کرتا ہے تو اسے آزادی کی جدوجہد سے الگ نہیں کرتا' بلکہ ایک قدم آگے جا کر یہ بھی کہتا ہے کہ ہندوستان کی نئی عورت کا حسن تحریکِ آزادی کی آگ میں پک کر ہی نکھر سکتا ہے'' 167

مجاز کے سماجی شعور کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''مجاز کی ذاتی زندگی مسلسل محرومی اور ناکامی' افلاس اور بدنصیبی کی زندگی تھی اور اس کی تلخی کہیں کہیں جھلک اٹھتی ہے.....وہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کے نظام کو بدل دینے کو زیادہ شاعرانہ سمجھتا ہے۔وہ اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈالتا ہے۔حقیقت کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی باغی فطرت اسے اصل دشمن کا پتہ لگانے پر مجبور کرتی ہے اور اسے سماج کے کتنے ہی حجابوں کے بیچ سے باہر گھسیٹ لاتا ہے اور وہ شبستانوں میں بھی جھانکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں بھی.....اس نظم میں' جو نومبر یا دسمبر 1938 کی تخلیق ہے' مجاز کا سماجی شعور رومانیت کے تمام پردوں کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے' یہ شاعر صرف رومان پرست نہیں ہے بلکہ بغاوت کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہے۔اس لیے وہ انسانی ادراک پر سے تعصب اور جہالت کے تاریک جالوں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔وہ حرکت' ارتقا اور تغیر کے ساز پر گانا زیادہ پسند کرتا ہے' اس کا انداز اب بھی رومانی ہے لیکن وہ زندگی کے حقائق سے دست وگریبان ہے۔'' 168

مجاز کی مشہور اور نمائندہ نظموں ''آوارہ'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' میں عصری حسیت حوصلہ مندی کی تعریف کی' انگریزی سامراج اور اس کے نظام کی مخالفت کی شمولیت کو بھی اجاگر کیا۔''اس دور کی دو سب سے زیادہ اہم اور مجاز کی نمائندہ نظمیں '' آوارہ'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' ہیں۔ان دونوں کی تخلیق کے درمیان صرف چند مہینوں کا وقفہ حائل ہے۔ ''آوارہ'' داخلیت اور خارجیت کا بڑا حسین امتزاج ہے اور اس میں ''ذاتی مسرتیں'' اور رنج وکاوش وسیع تر حقائق کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔اس نظم میں اس عہد کی کیفیت بھرپور طریقے سے آئی ہے۔یہ اس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو سرمایہ داری کے بنائے ہوئے شہروں میں بے روزگار پھر رہا ہے اور جس کی بے روزگاری کو آوارگی کا نام دیا جاتا ہے۔اس کے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں' آرزوئیں اور حسرتیں ہیں لیکن یہ بستی جو اس کی اپنی بستی ہے' اسے غیر کی معلوم ہوتی ہے' اور وہ اپنے آپ کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔اسے معلوم نہیں کہ کیا کرے پھر بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دل میں باقی ہے اور یہی حوصلہ مندی اس نظم کی اہمیت اور اثر آفرینی کو بڑھا دیتی ہے۔''اندھیری رات کا مسافر'' میرے نزدیک ''آوارہ'' کے آخری حصے کا پھیلاؤ

ہے....مجاز سب کو آزادی کے لیے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔اپنے آپ کو نوجوان مرد کو نوجوان خاتون کو کارخانے کے مزدور کو سارے ہندوستان کے باشندوں کو لیکن وہ دشمن کے خدوخال کو مبہم نہیں چھوڑتا۔وہ دشمن ایک بیرونی سامراج اور اس کا لایا ہوا نظام اور ایک ایسی حکومت ہے جس کی مخالفت ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کر رہی تھی، جس کے لیے بچے بچے کے دل میں حقارت کا جذبہ تھا"۔ 169

سردار جعفری کا مضمون "میر تقی میر کی شاعری" رسالہ شاہکار الٰہ آباد 1961 میں شائع ہوا۔

میرؔ نے اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ کیوں بتایا ہے یا میر کے یہاں دل اور دلی کی خرابی کا ذکر ایک ساتھ کیوں آیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا:

"ان کا (میر تقی میر) کا اپنا بیان یہ ہے کہ "میری شاعری خواص کی پسند کی ہے پر مجھے گفتگو عوام سے ہے" انہوں نے (میر تقی میر) اپنے دیوان کو درد و غم کا مجموعہ بتایا ہے کیونکہ جہاں سارا عالم خاک ہو چکا ہو وہاں صرف اپنے آپ پر رونا بے سود ہے۔اس لیے میر کے یہاں دل اور دلی کی خرابی کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور عاشق اور آدمی ہم معنی الفاظ ہیں"۔ 170

غالب اور میر میں جو فرق ہے اس کی وضاحت سردار جعفری نے اس طرح کی ہے:

"میر کے زمانے کی طرح میر کی شاعری کا عاشق بھی ایک کچلی ہوئی شخصیت ہے جو اپنا کھویا ہوا وقار واپس مانگ رہی ہے۔اس میں انانیت کا دور دور پتہ نہیں ہے۔صرف بے دماغی ہے۔انانیت، دولت، طاقت یا صلاحیت کے غرور سے پیدا ہوتی ہے اور بے دماغی سب کچھ کھونے کے بعد آتی ہے (غالب اور میر میں یہی فرق ہے)۔حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ میر کی شاعری کا عاشق محبوب سے محبت کا طالب نہیں۔بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے۔اس کے عالم و فاضل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان ہونے کی وجہ سے۔(دیباچہ گل نغمہ: فراق گورکھپور)۔اس تصور میں میر کا بچپن، جوانی اور دلی کی تباہی اور بربادی ایک ہی تصویر کے کئی رخ ہیں اور میر نے اس تصویر میں اتنے ہی مختلف انداز سے رنگ بھرا ہے"۔ 171

میرؔ کی عصری حسیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

"میرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں انہوں نے راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے.....اس براہ راست انداز بیان کے علاوہ میر کے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے اور اس پردے کو اٹھانے کی خود ہی ترغیب بھی دی ہے.....اس طرح کی شاعری میں انہوں نے محبوب کو ظالم، سفاک، گھٹیا، کمینہ اور اوباش، بدمعاش، خوں خوار، خوں ریز، جھوٹا، مکار سبھی کچھ کہا ہے۔محبوب کی کالی آنکھوں کی سبھی نے تعریف کی ہے لیکن میر نے ان کو "سیہ رو" اور سیہ کاسہ کہہ کر گالی بھی دی ہے۔سیہ رو کے معنی بدچلن اور سیہ کار کنجوس کو کہتے ہیں.....اور پھر یہی محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اب اس کی آمد تباہی کا باعث ہوتی ہے۔اس کی راہوں میں خون کے دریا موجیں مارتے ہیں، لاشیں پڑی رہتی ہیں اور دھرتی کے سینے پر فوجوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے.....یہ بات اہم ہے کہ اردو میں واسوخت کی ابتداء میر نے کی ہے"۔ 172

میر کے ذاتی محبوب کا جہاں ذکر ہے اس کیفیت کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''میر کی شاعری میں دو اور محبوب جھلکتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ایک تو میر کا ذاتی محبوب معلوم ہوتا ہے۔اس کا نام انہوں نے کہیں نہیں لیا اور کبھی کبھی وہ ان اشعار میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے جن میں بظاہر محبوب کا کوئی ذکر بھی نہیں ہے یا تو محبوب کی آمد ہے یا رخصت ہے، عاشق کا اس کی گلی سے نکلنا ہے یا اس کی محفل میں پہنچنا ہے۔ان شعروں میں وہ کیفیت ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے۔ایک مہذب درد، ایک لذت سے بھری ہوئی کسک اور دل کی ایک ایسی دھڑکن جو لفظوں سے منتقل ہو جاتی ہے'' 173

عظیم شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''دنیا کی عظیم شاعری سہل ممتنع ہے، جو شاعری یہ کیفیت حاصل کر لیتی ہے وہ تمام تاریخی، قومی، لسانی سرحدوں کو توڑ دیتی ہے اور بنی آدم کی میراث بن جاتی ہے۔اس کی شہادت شیکسپیئر، حافظ، سعدی، خیام، پشکن، غالب، ٹیگور سب دے سکتے ہیں۔ 174

''تازہ کاری'' کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اگر اردو کی نئی شاعری اپنی روایت کے احترام کے ساتھ نئی تکنیک اور جدت کی طرف قدم بڑھائے گی اور آج کے اجتماعی عرفان کو اپنے ذاتی عقیدے سے ہم آہنگ کرے گی تو وہ شاعری پیدا ہو سکے گی جو بیک وقت زمانے کی طرح بوڑھی اور جوان ہوگی۔تازہ کاری وہی قابل قدر ہوتی ہے جس میں صدیوں کی صداقت کی روح ہوتی ہے۔غالب اور شیکسپیئر آج بھی جدید اور تازہ کار ہیں اور آج کے عہد میں عظیم شعرا، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں شعر کہہ رہے ہوں، اپنی تازہ کاری کے ساتھ ساتھ غالب اور شیکسپیئر کے ہم عصر ہیں۔انسانی جذبات اور احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔غصہ غصہ ہے رشک رشک ہے۔محبت محبت ہے۔لیکن ان کے پس منظر اور وقتی محرکات بدلتے ہیں اور اسی تبدیلی میں شاعری کی تازہ کاری کی داستان پوشیدہ ہے''۔ 175

(سردار جعفری، میر تقی میر کی شاعری مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں)

سردار جعفری نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے شعری مجموعے ''نیا عہدنامہ'' پر اسی عنوان سے ایک تنقیدی مضمون قلمبند کیا ہے جسے انہوں نے رسالہ گفتگو ممبئی 1967 میں شائع کیا ہے۔خلیل صاحب کے شعری مجموعہ کے اس عنوان کے بارے میں سردار جعفری نے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ شاعر نے ''عہدنامہ'' کو پیمان وفا کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔اس عنوان کی نظم پڑھ کر یہی اثر پڑتا ہے۔چونکہ دیباچے میں انہوں نے اپنے پرانے مسلک ترقی پسندی سے برأت کا اعلان کیا ہے، اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ نئے عہدنامے کا مطلب نیا پیمان وفا بھی ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا نیا پیمان وفا کس کے ساتھ''۔ 176

سردار جعفری نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کے بارے میں لکھا ہے:

(1) خلیل الرحمٰن میرے نزدیک جدید شاعر نہیں (اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا) وہ صرف جدید عہد کے شاعر

ہیں۔انہوں نے اپنا سارا انداز کلاسیکی شاعری اور خاص طور سے غزل سے لیا ہے۔اس میں جو بھی جدت ہے وہ ترقی پسند مدرسہ فکر کی دین ہے اور یہ خلیل کی اپنی شاعری کا ماضی ہے.....''۔

(2)''.....خلیل کی غزلیں پڑھ کر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ماضی اور حال کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ جس ماضی سے رشتہ توڑ آئے ہیں' یا رشتہ توڑ لینے پر مجبور کر دیے گئے ہیں' وہ انہیں بری طرح یاد آتا ہے اور انہیں بار بار آواز دیتا ہے۔انہیں خود اپنے کھو جانے کا احساس ہے۔آج کے آئینے میں وہ اپنی شکل تک نہیں پہنچان سکتے۔نام تک بھولے جا رہے ہیں۔37 غزلوں اور چند نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں ایک ہی خیال ایک ہی جذبے کی تکرار ہے.....غرض آدھی سے زیادہ غزلیں ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہیں۔ان میں یکساں جذبے اور خیال کے باوجود حسن اور تاثیر ہے۔ان کے لہجے میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے اور آوازوں کی تہوں کے اندر اس کی اپنی آواز کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔یہ خلوص اور صداقت کے بغیر ممکن نہیں.....ٹکنیک کے اعتبار سے ان اشعار میں میر اور فراق کی سی پرکاری ہے'' 177

سردار جعفری کا مضمون ''لمحوں کے چراغ'' (موت زندگی کے آئنے میں)'' چار قسطوں میں آج کل کے شمارے جنوری 1996' فروری 1996' مارچ 1996 اور اپریل 1996 میں شائع ہوا۔مضمون کے محرکات کے بارے میں سردار جعفری کا 5/اگست 1995 کو تحریر کردہ نوٹ مضمون کے شروع ہونے سے پہلے درج کیا گیا ہے۔

نوٹ ملاحظہ کیجیے:

یہ مضمون ''لمحوں کے چراغ'' چار قسطوں پر مشتمل ہے۔1968 میں جب میں دل کے دورے کے بعد اسپتال سے گھر آیا تو میرے دوست خوشونت سنگھ نے جو انگریزی ہفتہ وار ''السٹریٹیڈ ویکلی'' کے ایڈیٹر تھے' موت کے موضوع پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھنے کی فرمائش کی۔ان کا اصرار تھا کہ اسپتال میں موت کا خیال ضرور آیا ہوگا۔اس وقت میں بہت کمزور تھا اس لیے سال بھر بعد یہ مضمون '' آج کل''میں شائع ہو رہا ہے۔چونکہ یہ مضمون ہندی میں بھی شائع کرنے کا ارادہ تھا' اس لیے اس کی زبان بہت آسان اور سیدھی سادی ہے۔ادبی عبارت آرائی کا ہندی ترجمہ بعض اوقات مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔''

سردار جعفری نے زندگی کے دو واقعات کا ذکر کیا جب بقول ان کے انہیں موت کا خیال آنا چاہیے تھا لیکن نہیں آیا اور تین واقعات کا ذکر کیا جب انہیں موت کا خیال آیا تھا۔

یہ واقعات اُن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

(1)''موت کا خیال مجھے بارہا آیا ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے اس خیال نے کبھی نہ کبھی نہ ستایا ہو۔ماں باپ کی انتہائی کوشش اور احتیاط کے بعد بھی گوتم بدھ کو اس خیال سے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔کبھی کسی کے مرنے کی خبر اس خیال کو زندہ کر دیتی ہے کبھی کسی گذرتے ہوئے جنازے پر نظر پڑ جاتی ہے.....میں تقریباً دس سال ایک اسپتال کے پیچھے ایک ایسے کمرے میں رہ چکا ہوں جس کے نیچے وارثوں کو اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں دی جاتی تھیں۔جنازے وہیں تیار ہوتے تھے۔بہت سوں کی مذہبی رسمیں وہیں ہوتی تھیں۔کبھی صبح کبھی شام کبھی آدھی رات کو شور ماتم بلند ہوتا تھا۔''

(2)''بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ جب موت کا خیال آنا چاہئے تھا اور نہیں آیا۔میں ناسک (مہاراشٹرا) جیل میں تھا اور

میرے ساتھ تقریباً دوسو سیاسی قیدی تھے۔ایک بار دس گز کے فاصلے پر پولیس نے سیاسی قیدیوں پر گولی چلائی تو ایک لمحے یہ محسوس ہوا کہ میرا دل سینے سے پھسل کر زمین پر گر گیا اور پھر واپس آ کر دھڑکنے لگا۔ ہمارے ساتھیوں میں کئی زخمی ہوئے اور ایک کی جان گئی۔موت کا خیال بارک کے اندھیرے میں اس واقعے کے بعد آیا جب چاروں طرف تالے پڑ چکے تھے اور ہم سب بیٹھے ہوئے آپس میں اس واقعے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔اس وقت کی ہیجانی کیفیت نے موت کے خیال کو قریب نہیں آنے دیا۔شاید میدان جنگ میں فوجی سپاہیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے''۔

(3)''دوسرا حادثہ اس واقعے کے چند سال بعد اسٹاک ہوم (سویڈن) میں پیش آیا۔میں ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ایک پارک سے گزرتے ہوئے میں نے پہلی بار زمین پر جمی ہوئی برف دیکھی۔پیروں کے نیچے برف کے آنے کا احساس بہت عجیب وغریب تھا۔ذرا سے فاصلے پر ایک چوکور ٹکڑا دکھائی دیا جس پر برف کی تہہ ذرا زیادہ دبیز تھی میں نے بڑے شوق سے بڑھ کر اپنا پاؤں اس پر رکھ دیا اور ایک لمحے میں' میں پانی کے اندر تھا۔خیریت یہ ہوئی کہ اس زمین کی سطح کے برابر حوض میں اندر سے کوئی پائپ گزر رہا تھا۔میرا پیر اتفاق سے اس پر ٹک گیا اور میں گلے گلے پانی میں کھڑا ہو گیا۔موت کا خیال تو درکنار' میرے جسم نے برف کے پانی کی ٹھنڈک کو محسوس نہیں کیا۔قبل اس کے کہ اس ٹھنڈک سے خون جم جاتا' میرے دوستوں نے مجھے باہر نکال لیا۔.....موت کا خیال اس شکل میں آیا کہ اگر حوض کے اندر پائپ نہ ہوتا تو کیا ہوتا''۔

(4)''مجھے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موت کا خیال 1940 میں آیا' جب لکھنو ڈسٹرکٹ جیل میں ایک صبح بارک کے دروازے اس لیے تاخیر سے کھولے گئے کہ ایک مجرم کو پھانسی دی گئی تھی۔اس کے بعد جب میں بنارس سنٹرل جیل میں تھا تو ایک رات کو ایک قیدی نے ہمارے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔اس وقت میں نے موت پر پہلی نظم کہی۔ چند سال بعد بمبئی میں ایک عزیز دوست کی بیوی کے انتقال نے موت کے احساس کو پھر شدید کر دیا۔ایک اور نظم کہنے کے بعد میں نے اس احساس سے نجات پائی''۔

(5)''1968ء میں میرے دل نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا اور موت کا خیال زیادہ شدت کے ساتھ واپس آیا''۔ 178

سردار جعفری نے قرآن شریف کی آیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے کان بچپن سے ان الفاظ کے عادی ہیں کہ موت برحق ہے' قبر برحق ہے' قیامت برحق ہے' حساب کتاب برحق ہے۔زندگی خدا کی نعمت ہے اور موت بھی خدا کی نعمت ہے اور کفران نعمت گناہ۔قرآن شریف کی یہ خوبصورت آیت جو میں نے بچپن میں لکھنو کے نہایت خوش الحان قاریوں سے سنی ہے اور بار بار پڑھی ہے اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔(ترجمہ: جو مخلوق زمین پر ہے وہ سب فنا ہونے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات جو عظمت اور کرامت والی ہے باقی رہے گی۔تو اپنے مالک کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے۔)۔میرے حافظے میں یہ بات کہیں محفوظ نہیں ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ یہ کہا گیا ہو کہ زندگی کی طرح موت بھی خدا کی نعمت ہے'' 179

سردار جعفری نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم سے لڑنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم سے لڑنے والے بے شمار سورماؤں کی داستانیں ہیں جن کے دلوں میں زندگی اور

انسانیت کی محبت اتنی زیادہ تھی کہ موت کے لیے ایک حقارت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جب چیکوسلواکیہ پر جولیس فیوچک کو قتل کرنے سے پہلے پراگ شہر کی ایک پہاڑی سے چاروں طرف ہنستی ہوئی بہار کا موسم دکھایا گیا جس کا فیوچک عاشق تھا اور وہ اپنا ضمیر فروخت کر کے باقی زندگی بھر اس بہار سے لطف اندوز ہوسکتا تھا تو اس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا''۔ 180

سردار جعفری نے اپنے مضمون میں کئی ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، صوفی، سنت، فلسفیوں اور مفکروں کے حوالے دیے جن میں یہ ہستیاں شامل ہیں۔ اکبرالہ آبادی، ذوق، فانی، قرۃالعین حیدر، مولانا ابوالکلام آزاد، گرونانک، اقبال، خواجہ فریدالدین عطار، صوفی سرمد، سردار بھگت سنگھ، بسمل عظیم آبادی، ٹیگور، لینن، مولانا حسرت موہانی، میر تقی میر، مصحفی، آئن سٹائن، حافظ، ابراہیم بن ادھم، غالب، جوش، مولانا جلال الدین رومی۔

سردار جعفری نے بزرگوں، صوفیوں کے پاس دنیا کی زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے ابراہیم بن ادھم کے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔

وہ رقمطراز ہیں:

''ان بزرگوں نے دنیا کو کارواں سرائے تعبیر کیا جس کے ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے ہیں اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صوفی ہونے سے پہلے ابراہیم بن ادہم اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت و اعلان کے اندر داخل ہوگیا۔ ابراہیم نے پوچھا ''کہاں آئے ہو'' اس نے کہا ''کارواں سرائے میں''۔ ابراہیم نے اسے بتایا کہ ''یہ کارواں سرائے نہیں میرا محل ہے'' اس نے سوال کیا ''تم سے پہلے اس مکان میں کون رہتا تھا''؟'' میرا باپ''۔ ابراہیم نے جواب دیا۔ ''اور اس سے پہلے''؟ بوڑھے نے پھر پوچھا اور ابراہیم نے اپنے دادا اور پردادا کا نام بتادیا۔ اجنبی ہنسنے لگا ''جس محل میں اتنے لوگ آتے جاتے رہے ہیں وہ ''کارواں سرائے نہیں ہے تو کیا ہے''۔ 181

صوفیوں کے حوالے سے انسانی مساوات کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا:

''موت کا یہ پہلو بھی صوفیوں اور شاعروں کے لیے بے حد دلنواز تھا کہ اس کی بارگاہ میں وہ طبقاتی تفریق نہیں رہتی جو اس دنیا میں انسانوں کو انسانوں سے علیحدہ کرتی ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

مضمون کی چوتھی اور آخری قسط کے آخر میں سردار جعفری نے انسان کے ذوق جستجو اور اس کی عظیم کامیابیوں کا ذکر کیا اور اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ وقت کی روانی دلفریب ہے اور درد غم فراق، وصال، خواہش، تپش کسک کوئی کیفیت لذت سے خالی نہیں۔

وہ رقمطراز ہیں:

''انسان میں بہت سی خوبیاں ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں اس کا ذوق جستجو ہے۔ پردے اٹھانے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں وہ کبھی کبھی بال کی کھال بھی نکالنے لگتا ہے مثلاً پہلے وہ فاصلے کو پہچاننا شروع کرتا ہے پھر اسے ناپتا ہے..... یہاں تک کہ زمین سے چاند کے فاصلے کو اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے کے فاصلے کو ناپ لیتا ہے۔ اسی طرح وہ وقت کو پہچانتا ہے اور اسے بھی ناپتا ہے اور ان دونوں کا نام عطا کرتا ہے۔ پھر ہوائی جہاز اور راکٹوں کے ذریعہ سے اس زماں ومکاں میں سفر کرتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر لاکھوں میل کے فاصلے پر آسمان میں راکٹوں کی سمتیں بدلتا ہے۔ چاند پر اترتا ہے اور واپس آجاتا ہے.....

میرے نزدیک وقت اور انسان کے درمیان کسی قسم کی دوئی نہیں ہے۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ شاعروں کی زبان میں انسان بھی وقت کا ایک لمحہ ہے' اس دریا کی ایک موج ہے' بے قرار اور مضطرب لیکن باشعور اور حساس' صاحب ادراک' دردمند اور دانش مند۔ اس طرح وقت اگر ایک بے شعور خلاق ہے تو انسان بیدار مغز خلاق..... ہر انسان چھوٹے سے پیمانے پر ایک خالق ہے اور اس کی ہر تخلیق فطرت پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قوت تخلیق سے انسان نے ہزاروں سال میں اپنے ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔ جب زندگی کے دوسرے مظاہر ادنیٰ درجے کے جانوروں کو موت نے نیست ونابود کر دیا تو انسان نے ہر منزل پر اپنی قوت تخلیق سے کام لے کر موت کو شکست دی ہے اور آج اس بلند مقام پر پہنچا ہے جہاں وہ چاند تاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے' کرہ ارض پر انسانی زندگی لامتناہی اور لافانی کائنات کا سب سے بڑا اور سب سے اہم واقعہ ہے۔ ایسی صورت میں میرے لیے وقت کا تسلسل خوفناک نہیں ہوسکتا۔ وہ حسین ہے اور اس کی روانی دلفریب ہے۔ درد' غم' فراق' وصال' خواہش' تپش' کسک کوئی کیفیت لذت سے خالی نہیں''۔ 182

علی سردار جعفری نے مراٹھی زبان کے ایک انقلابی شاعر نارائن سروپ کی شاعری پر ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''نارائن سروپ کی شاعری مراٹھی زبان کی شاعری میں ایک نیا موڑ ہے۔ اس میں مہاراشٹرا کی زمین کی خوشبو ہے لیکن ساری دنیا کے انسانوں کا دل دھڑک رہا ہے..... پرانی مراٹھی شاعری زیادہ تر مذہبی تھی اور قدیم سنتوں کی دین تھی۔ اس میں اعلیٰ درجے کی انسانیت تھی۔ یہ انسانیت دوستی سروپ کا انقلابی ورثہ ہے۔ جدید عہد میں مزدور طبقے نے انا بھوسا ٹھے اور امر شیخ جیسے مقبول شاعر پیدا کیے لیکن درمیانی طبقے کے نقاد ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ پھر نارائن سروپ آیا۔ اپنی ساری طاقت' ساری پتھریلی خوبصورتی کے ساتھ مہاراشٹرا کے عوام نے اس کا استقبال کیا جیسے وہ برسوں سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ شہر شہر' گاؤں گاؤں گھوم کر اپنا مترنم کلام سناتا ہے۔ پتھر گانے لگتے ہیں۔ پانچ پانچ دس دس ہزار مزدوروں اور کسانوں کا مجمع نارائن سروپ کی نظمیں گھنٹوں بیٹھ کر سنتا ہے۔ درمیانی طبقے کے سفید پوش نقاد اب اس انقلابی شاعر کو نظر انداز نہیں کر پا رہے ہیں۔ وہ مراٹھی ادب کے محل میں داخل ہوگیا ہے اور اپنے میلے پاؤں سمیٹ کر قیمتی قالینوں پر بیٹھ گیا ہے..... نارائن سروپ کے سامنے زندگی کے گمبھیر مسائل ہیں' اپنے نچلے کچلے ہوئے طبقے کی مصیبتیں ہیں' مزدور طبقے کا عزم اور جلال ہے۔ اس سارے بوجھ کو اٹھائے ہوئے اس کی شاعری تھرکتی اور ناچتی ہے..... وہ خود اپنی نظمیں کبھی تحت لفظ اور کبھی گا کر سناتا ہے اور عوام اس کی نظمیں

گاتے ہیں۔اس کی ایک نہایت مقبول نظم گرنی چی لاؤن (کارخانے کا گیت) ہے۔یہ نظم لاؤنی کے انداز میں مہاراشٹرا کے طول وعرض میں گونج رہی ہے.....سروپ کی نظموں کے انتخاب کا ایک انگریزی ترجمہ چند ماہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔اس نے شاعری 1962ء میں شروع کی ہے۔ابھی سفر کا آغاز ہے۔ایک شاندار مستقبل اس انقلابی شاعر کا انتظار کر رہا ہے۔یہ مقبولیت ناکافی ہے۔ابھی اسے بلندی کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں۔ 183

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کی اختر شیرانی کے بارے میں دی گئی رائے پر تبصرہ کیا ہے۔

فاطمی رقمطراز ہیں:

''ان کی (علی سردار جعفری) ترقی پسندی اختر شیرانی کی شاعری میں ایک معنی خیز اور کارآمد نکتہ تلاش کر لیتی ہے۔اہل علم واقف ہیں کہ اردو شاعری میں اختر شیرانی کا مقام ایک خالص رومانی شاعر کا ہے اور کسی بھی طرح سماجی احساس ان کی شاعری میں ناپید ہے لیکن اس رومانی شاعری سے ترقی پسند شاعری کو جو فیض پہنچا' سردار کی باریک نگاہیں بڑی ذہانت سے اس پہلو کو تلاش کر لیتی ہیں۔

وہ اختر شیرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر شیرانی نے اردو شاعری میں کوشت پوست کی عورت' معشوقہ اور محبوبہ کی تخلیق کی ہے۔پرانی شاعری میں عورت کے لیے غزل میں جگہ نہیں تھی حالاں کہ اس کا حسن جابجا جھلک اٹھتا تھا۔اس کی بہت سی تاویلیں کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ ہماری تہذیب مانع تھی کہ کھل کر عورت کا ذکر کیا جاتا۔اس لیے ہمیشہ مذکر فعل استعمال کیا گیا۔دوسری اس سے زیادہ ذہین تاویل یہ ہے کہ مونث فعل لانے سے جذبہ عشق اور جمال محبوب کی اہمیت اور لطافت کو ٹھیس لگے گی' کیونکہ اردو غزل میں عاشق و معشوق نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ محض عاشق اور محض معشوق یا ''ٹھیٹھ انسان'' ہے''۔

''اور انسان کا ذکر ہو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو سردار جعفری اس شاعر و شاعری کو عزیز رکھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اختر کی شاعری نے یہ اہم کام اس وقت انجام دیا جب جوش و اقبال جیسے شاعر بھی عورت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں اختر شیرانی کا یہ برملا و بے ساختہ اظہار ترقی پسند شاعری کو کس طرح رد کرتا ہے۔سردار کے لفظوں میں:

''ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی اس روایت کو آگے بڑھا کر اردو شاعری کو زیادہ فطری بنا دیا اور اب ترقی پسند شاعری میں عورت معشوقہ' بیوی' ماں' مجاہدہ ہر روپ میں نظر آتی ہے''۔ 184

علی سردار جعفری کا تنقیدی مضمون'' غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ اور جمالیاتی فضا کی بازیافت'' نقوش غالب نمبر 3' شمارہ 116' 1971 میں شائع ہوا۔

بارہ صفحات پر مشتمل اس مضمون میں منظوم ترجمے کی مشکلات بیان کرتے ہوئے سردار جعفری نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔

لکھتے ہیں:

''نثر کے برعکس شعر میں الفاظ کی حیثیت منطقی نہیں بلکہ جذباتی ہوتی ہے بعض اوقات لفظ اپنے معنی سے بھی زیادہ حسین

ہو جاتا ہے.... یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے شاعرانہ الفاظ کا ترجمہ قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہی ایک لفظ اگر نثر میں آئے تو ترجمے کا متحمل ہوسکتا ہے لیکن نظم میں آکر اتنا نازک بن جاتا ہے کہ اس کو ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ان شاعرانہ لفظوں کا جذباتی اور وجدانی مفہوم کتابی ترجمے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور جمالیاتی احساس کے حدود کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے.... اردو میں ذوق، شوق، رشک، حسد، ہوس، حسرت، آرزو، تمنا، خواہش، ناز، انداز، ادا، شوخی، تکلف، فتنہ، بلا، غنیمت، کیفیت، جوش، مفرح، مجلس، محفل وغیرہ معمولی بول چال کے الفاظ ہیں جن کا ہندی بدل تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے پھر یہی الفاظ جب اپنی شکلیں بدلتے ہیں تو ترجمے کی مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں۔ آرزو کا ترجمہ اچھیلا شا اور آرزومند کا ترجمہ اچھیلاش کیا جاسکتا ہے لیکن جب ہم آرزو مندی پر آتے ہیں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں..... آرزومندی آرزومند ہونے کی کیفیت کا نام ہے یعنی آرزو کرنے سے انسان کے اندر جو جذباتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے آرزومندی کا لفظ استعمال کیا جائے گا.... پیکر اور قامت میں فرق ہے لیکن مجبوراً دونوں کے لیے آکار استعمال کرنا پڑتا ہے..... تشبیہ استعارہ ترجمہ ہونے کے بعد بھی تشبیہ اور استعارہ باقی رہتا ہے لیکن رمز صرف اصل لفظ کے ساتھ محدود ہے ترجمے میں اس کا جادو ٹوٹ جاتا ہے قفس جب پنجرہ ہو جائے اور دار و رسن پھانسی تو اچھے سے اچھا شعر بُری نثر میں تبدیل ہو جائے گا..... اضافت سے بنی ہوئی ترکیبوں کا ترجمہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سنگم پر گنگا اور جمنا کی لہروں کو الگ الگ کرنے کی کوشش..... اشعار میں جو ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں مثلاً آئنہ خانۂ ہوا، دیدار، مغنی آتش نفس، جلوہ برق فنا، دود شعلہ، آواز، غبار صدا، جادۂ راہ فنا، اجزائے پریشان، ..... تنک آبی.... وغیرہ ان کے ہندی مترادفات کے بغیر شعروں میں وہ محاکاتی کیفیت باقی نہیں رہ سکتی جس نے ان اشعار کو حسن بخشا ہے۔ ان میں سے بعض کے ترجمے ممکن ہیں اور بعض کے نہیں..... بعض اوقات شاعری میں فاضل الفاظ بھی ملتے ہیں جو ترجمے کی گرفت میں نہیں آتے..... اور جو بات ''ماورائے سخن'' یا ''ورائے شاعری ہوتی ہے اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی لذت کو صرف روح چکھ سکتی ہے، ذہن محسوس کرسکتا ہے اور اس کے لیے کام و دہن کی تربیت ضروری ہے۔ لفظ صرف پڑھے نہیں جاتے بلکہ چکھے بھی جاتے ہیں اور سونگھے بھی جاتے ہیں اور سنگیت کی طرح سنے بھی جاتے ہیں''۔

مضمون کے آخر میں سردار جعفری نے ہندی کے لیے اردو سے ترجمہ کو گائیڈ کی حیثیت دیتے ہوئے اصل شاعری کی جمالیاتی فضا کی بازیافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''جن زبانوں میں اتنا بُعد ہو جتنا انگریزی اور اردو میں ہے ان میں ترجمہ ایک ایسی مجبوری ہے جس سے نجات ممکن نہیں لیکن ہندی کے لیے اردو سے ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک گائیڈ کی حیثیت رکھتا ہے جو اس وقت تک اہم ہے جب تک سیاح تاج محل تک پہنچا نہیں ہے۔ اس کے بعد گائیڈ مٹ جاتا ہے اور تاج محل اپنی ساری نزاکت سارے حسن کے ساتھ سیاح کی روح سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ دراصل یہ مسئلہ اصل شاعری کی جمالیاتی فضا کی بازیافت کا مسئلہ ہے'' 185

سجاد ظہیر پر سردار جعفری کا یہ مضمون ''رقص و شرر'' ماہنامہ ''گنگ و جمن'' کانپور، سجاد ظہیر نمبر 1976 میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے کچھ اشعار لکھے۔ اس کے بعد لکھا کہ سجاد ظہیر ایک ایسی ہی چنگاری تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں دفن ہیں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خواجہ غلام السیدین جیسے ممتاز اہل علم اور وطن دوست ابدی نیند سو رہے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ برطانوی حکومت نے رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے دباؤ میں آکر ''انگارے'' کو ضبط کرلیا تھا پھر بھی افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے ادب کا ایک موڑ بن گیا تھا۔سردار جعفری نے بتایا کہ سجاد ظہیر کا ان پر پہلا تاثر بہت خوشگوار تھا وہ پر خلوص، محنتی اور نرم گفتار نوجوان نظر آئے۔

سجاد ظہیر کے مشن اور ان کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''بنّے بھائی کے سارے بھائی خوب پیسہ کمارہے تھے لیکن بنے بھائی نے سیاسی اور تہذیبی کاموں کو ترجیح دی اور انہیں سرگرمیوں کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔اُن دنوں کمیونسٹوں کو نئے زمانہ کا اولیا سمجھا جاتا جنہیں اپنی مفلسی پر ناز تھا۔'' 186

ترقی پسند تحریک کی سراہنا کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''1942 سے 1948 تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا دور تھا جو ساری زبانوں پر محیط تھی اور اس نے ادب کا بہت بڑا اور بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا۔ہندوستان میں اتنی زبردست تہذیبی تحریک اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ہماری تحریک آزادی سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ترقی پسند کا لفظ باعث افتخار بن گیا'' 187

''ن۔م۔راشد'' عنوان سے سردار جعفری کا مضمون رسالہ گفتگو ممبئی 1976 میں شائع ہوا۔

ن۔م۔راشد کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''9/اکتوبر 1975 کو لندن میں ن۔م۔راشد کا انتقال ہوگیا (اخبارات میں 11/اکتوبر کی تاریخ چھپی ہے)۔میں نظریاتی اختلاف کے باوجود راشد کا شمار اس عہد کے اہم بزرگ شعرا میں کرتا ہوں۔وہ اردو شاعری کی تاریخ میں آزاد نظم کے خالق کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔راشد انقلابی شاعر نہیں تھے باغی تھے۔مذہب کے معاملے میں لاادریت کے قائل تھے۔انتقال کے بعد ان کی لاش دفن نہیں کی گئی بلکہ وصیت کے مطابق نذر آتش کی گئی۔وہ کمیونزم کے مخالف تھے۔(لیکن 1947ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران کمیونسٹوں کے رویے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی)۔انہوں نے چند نظمیں کمیونزم کے خلاف لکھیں جو ان کی دوسری کتاب ''ایران میں اجنبی'' کے صفحات کی زینت ہیں (اس کے لیے ان کو رجعت پسند کہا گیا)''۔ 188

ن۔م۔راشد کے تین شعری مجموعوں ''ماورا'' ''ایران میں اجنبی'' اور ''لا=انسان'' میں ان کے تصور انسان کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''راشد کی شاعری کا سفر راشد کے تصور انسان کا سفر ہے۔''ماورا'' کا انسان شکست خوردہ ہے، رومانیت زدہ ہے۔فرار، سیاسی غلامی کے لیے عورت کے جسم سے انتقام اور خودکشی کے عذاب میں مبتلا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لفظ اور استعارہ میں تازگی ہے اور شعری آہنگ میں ایک نشاطیہ کیفیت ہے۔ان لفظوں میں بعض نہایت خوبصورت مصرعے اور نہایت خوب صورت بند ہیں۔شاید یہ خوب صورتی راشد کے دل میں بیٹھے ہوئے انسان کے نشاط تصور سے پیدا ہوئی ہے۔یہ انسان 'ایران میں اجنبی'' میں انگڑائی لیتا ہے اور ''لا=انسان'' میں اپنے حسن کے بعض گوشوں سے نقاب اٹھاتا دکھائی دیتا ہے۔آخری

مجموعے کا انسان نہ تو شکست خوردہ ہے، نہ رومانیت زدہ، نہ فرار اور خودکشی کے عذاب میں مبتلا۔ وہ ایک پُرکیف شخصیت ہے جو زندگی کے رنگ و نور میں نہا رہی ہے اور مستقبل کے بہتر انسانوں کے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے..... راشد کی شاعری میں اقبال کی طرح فکر جذبے پر حاوی ہے۔ ان کی شاعری بہت زیادہ فارسی آمیز ہے لیکن انہوں نے لفظوں کا ایک نیا احساس اور آہنگ کا ایک نیا شعور دیا ہے۔ یہ آہنگ بلند اور پروقار ہے"۔ 189

جی شیشندر شرما مشہور تلگو شاعر ہیں ان کی نظم "نا دیشو ناپر جلو" کا اردو ترجمہ اختر حسن نے کیا۔ سردار جعفری نے اردو ترجمہ کا مطالعہ "میری دھرتی میرے لوگ" پیش کیا جو ماہنامہ پونم، حیدرآباد کے اگست 1977 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

جی شیشندر شرما کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

"ایک بلند قامت شاعر کی بلند قامت تخلیق میرے سامنے ہے یہ بات قابل رشک ہے کہ تلگو زبان میں ایسی دولت ہے اور اس حقیقت میں میرے لیے ایک حیرت ناک مسرت ہے کہ تلگو زبان کا یہ حساس اور جمال پرست شاعر جو انقلابی جلال کی بلندی تک جاتا ہے اور جس کا دل انسانی محبت کے نور سے جگمگا رہا ہے میرا ہمعصر ہے۔ شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ میں اس کا ہمعصر ہوں"۔

شیشندر شرما کی مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"یہ نظم رنگ و آہنگ کا ایک خوبصورت آبشار ہے..... نادر تشبیہوں، اچھوتے استعاروں اور بے مثال لفظی پیکروں کا ایک جلوس ہے جس کو ساتھ لیے شاعر شہر سے گاؤں سے، زمین سے، آسمان سے گزر رہا ہے..... اس کی یہ ساری شاعرانہ فوج جس میں مزدور، کسان، عاشق بھی شامل ہیں عصر حاضر کی بے انصافیوں اور انسان کی تذلیل کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے وجود کے میدان میں اتری ہے۔ یہ نظم غنائی کیفیات سے مالا مال ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس میں ایک رزمیہ انداز بھی ہے۔ میں اس کو مکمل طور سے رزمیہ نہیں کہہ سکتا..... یہ والٹ وھٹ من کی شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ہندوستان کا رزمیہ ہے جو اپنی شاعرانہ بلندی کو چھوتے چھوتے عہد حاضر کی ساری دنیا کا رزمیہ بن جاتا ہے۔" 190

نظم میں غذا کے تعلق سے اشعار پیش کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں: "یہ ابدی حقیقت ایک سطح پر مادہ اور شکتی ہے جو مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ ایک چیز سے دوسری چیز پیدا ہوتی ہے۔ یہ تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی، ختم نہیں ہوتی۔ دوسری سطح پر یہ ایک اخلاقی قانون کا اعلان ہے جو دوسرے کو غذا دیتا ہے وہ اپنے لیے غذا محفوظ کرتا ہے۔ غذا ساری انسانیت کی ملکیت ہے، غذا ساری انسانیت میں تقسیم ہونی چاہیے۔" 191

سردار جعفری نے لکھا ہے کہ شاعر شیشندر شرما نے اس خوبصورت نظم کو صرف نو دن میں لکھا ہے۔ آخر میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی زبانوں کے درمیان براہ راست ترجمے کے ذریعے سے یہ لین دین اگر اور بڑھے گا تو ہمارے ادب و شعر کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

سردار جعفری نے ایک مضمون "اقبال کی غزل" 1977 میں لکھا جس میں انہوں نے اقبال کی غزلوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، اقبال کی غزلوں اور حافظ، غالب اور رومی کی غزلوں میں مماثلتوں کا ذکر کیا، تشبیہات، استعارے، تلمیحات، بلند

آہنگی، نئی فکر، نیا آہنگ کی ستائش کی۔انہوں نے اس بات کی بھی ستائش کی کہ اقبال کی غزل عام فہم ہے اور اس میں قنوطیت نہیں ہے۔سردار جعفری نے ایک بہت ہی اہم بات کا بھی ذکر کیا کہ اقبال نے اپنی غزل سے عہد نو کی تنقید کا کام لیا ہے۔

''اقبال کی غزل میں حافظ کی سرشاری، غالب کی بلندی فکر اور رومی کے دل کی بیتابی ہے.....بلند آہنگی ہے، براہ راست گفتگو ہے، نئی فکر ہے، نیا آہنگ ہے جس کی مثال اردو اور فارسی شاعری کی ایک ہزار برس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔یہی اقبال کی غزل کا اعجاز ہے۔یہ تصورات کی شاعری ہے، ایسے تصورات جن کی گرمی لفظوں کو پگھلا دیتی ہے اور یہ الفاظ قاری کے دل و دماغ پر ایک عظیم فکری آبشار بن کر گرتے ہیں.....اقبال کی دوسرے قسم کی غزل وہ ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح وغیرہ سے حسن معنی کی مزید آرائش کی گئی ہے.....اقبال کی بعض غزلوں میں ایک ہی مرکزی خیال مختلف اشعار کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً اپنی بال جبریل کی ایک غزل میں انہوں نے اپنے فلسفۂ خودی کو اس طرح پیش کیا ہے جس سے مرد کامل کے خد و خال ابھرتے ہیں، ان اشعار میں انداز بیان براہ راست ہے اور معنوی حسن کے علاوہ کسی اور آرائش سے کام نہیں لیا گیا ہے.....

اقبال کی غزل کی ایک قسم وہ ہے جسے دعائیہ غزل کہنا چاہیے۔اس میں شاعر خدا سے ہم کلام ہوتا ہے.....خودی انسان کی تخلیقی قوتوں کی بیداری ہے جو خدا کی ناتمام دنیا کو تکمیل کی منزل کی طرف لے جاتی ہے.....اقبال کو انسان کی عظمت کا پورا احساس ہے یہ دعائیہ غزلیں اردو شاعری میں ایک عظیم الشان اضافہ ہیں.....ان غزلوں میں اور بانگ درا کی غزلوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔بانگ درا کی غزلوں کا لہجہ زیادہ سے زیادہ شاعرانہ ہے لیکن بال جبریل کی غزلوں کا لہجہ پیغمبرانہ ہے۔دونوں کتابوں کی اشاعت میں تقریباً دس سال کا فرق ہے۔ان دس سالوں میں اقبال نے اپنی غزل گوئی کی تربیت دراصل فارسی غزل گوئی کے ذریعہ سے کی ہے۔ان کا شاعرانہ ارتقا زبور عجم میں تلاش کیا جاسکتا ہے جس کی اشاعت 1927 میں ہوئی تھی۔غزلوں کا یہ آہنگ جو بانگ درا میں تقریباً ناپید ہے، سب سے پہلے زبور عجم کی غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے۔اقبال نے اپنی غزل سے عہد نو کی تنقید کا بھی کام لیا ہے اور نہایت بے تکلفی سے فرنگی فرنگ اور یورپ کے الفاظ غزل کے سانچے میں ڈھال دیئے ہیں.....اقبال کی غزل میں نہ قنوطیت ہے، نہ ابہام، نہ عدم وضاحت۔یہ بلند آہنگ اور بے باک غزل ہے۔اس میں مائیکل انجلو کے فن کی طاقت ہے''۔ 192

علی سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانہ ''کالو بھنگی'' کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

اس کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

(1) ''میں آج پریم چند کے تسلسل کی ایک کڑی کرشن چندر کے ایک افسانے ''کالو بھنگی'' کو بنیاد بنا کر بات کروں گا جس کے ادبی پرچم پر پریم چند کا یہ مقولہ ہے کہ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا.....''۔

(2) ''کالو بھنگی ایک ایسی کہانی ہے جس میں نہ کردار ہے نہ پلاٹ۔اس کے بعد بھی وہ کہانی ہے۔کامیاب کہانی ہے اور پریم چند کی پوری روایت کی وارث ہے۔یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں کچھ نہیں ہوتا۔وہ کرشن چندر کے اعتراف شکست سے شروع ہوتی ہے اور اعتراف شکست پر ختم ہوتی ہے کہ میں کالو بھنگی پر کوئی کہانی نہیں لکھ سکتا۔یہ شخص کالو بھنگی کرشن چندر کی زندگی سے لے کر موت تک ایک آسیب کی طرح اس کے شعور پر سوار رہتا ہے اور اب کرشن چندر کے مرجانے کے بعد بھی اپنی

جھاڑو ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور زبان بے زبانی سے کہہ رہا ہے کہ مجھ پر کہانی لکھ دو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کرشن چندر آنے والی نسلوں سے کہہ رہا ہے کہ کالو بھنگی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اگر کہانی لکھ دو گے تو یہ اپنی جھاڑو لے کر چلا جائے گا لیکن تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکو گے جیسے میں نہیں لکھ سکا کیونکہ آٹھ روپے کی آمدنی پر کہانی نہیں لکھی جا سکتی اور پھر کالو بھنگی کی زندگی میں کچھ ہوتا بھی تو نہیں ہے۔ اس نے عمر بھر کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی کام کیا ہے۔ اسپتال کی گندگی اٹھانا اور صفائی کرنا اور پھر اپنی جھاڑو لے کر کرشن چندر کے سامنے آجانا اور ہونٹ ہلائے اور زبان چلائے بغیر یہ مطالبہ کرنا کہ چھوٹے صاحب ہم پر کہانی لکھ دو..... کالو بھنگی آخری دن تک وہی کالو بھنگی ہے جو پہلے دن تھا.....''۔

(3)''.....اپنی کہانی کالو بھنگی میں کرشن چندر نے کوئی فضا بھی تخلیق نہیں کی صرف کالو بھنگی کا جغرافیائی ماحول بیان کر دیا ہے اور چند لوگوں کے بارے میں اطلاع دی ہے جو اسپتال میں کالو بھنگی سے ذرا اونچے درجے کے ہیں..... کالو بھنگی کا حلیہ یہ ہے۔ بڑے بڑے ننگے گھٹنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں سوکھی ٹانگوں پر ابھری ہوئی دریدیں' بھوکے پیٹ کی سیاہ جلد پر سلوٹیں' مرجھائے ہوئے' سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں' ناک کے نتھنے پھیلے پھیلے' گالوں پر جھریاں' آنکھیں نیم تاریک گڑھے اور سر کی جگہ ننگی چندیا۔ انداز گفتگو بے حد پھیکا سیٹھا''۔

(4)''.....آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے.....چار روپے کا آٹا' ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار آنے کا گڑ' چار آنے کا مصالحہ،.....ایک روپے بنئے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں.....بڑے صاحب ایک روپے تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے.....گھی کھاؤں گا ایک روپے کا اور مکئی کے پراٹھے کھاؤں گا' کبھی پراٹھے نہیں کھائے۔ مالک بڑا جی چاہتا ہے.....کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا' نہیں چھوٹے صاحب.....اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے.....پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے.....''

(5)''.....اس مکالمے سے جو کردار ابھرتا ہے وہ ایک دبے اور پسے ہوئے مظلوم انسان کا کردار ہے جو اتنا مظلوم ہے کہ اس کو اپنی مظلومیت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اتنا کچلا ہوا ہے کہ اس کے دل میں کوئی تمنا' کوئی آرزو نہیں ہے۔ زندگی میں صرف کام ہے اور وہ بھی انتہائی غیر دلچسپ اور گندہ کام۔ کوئی سکون کوئی راحت نہیں۔ اس کے تمام احساسات مر چکے ہیں۔ یہاں تک مر چکے ہیں کہ جب وہ اسپتال کے کمپاؤنڈ کو جو اس سے درجے میں بڑا ہے بیمار لڑکیوں سے عشق و محبت کا اظہار کرتے دیکھتا ہے تب بھی اس کے دل میں عشق و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ رشک' حسد' نفرت' کچھ نہیں۔ یہ ساری باتیں کرشن چندر نے ان الفاظ میں نہیں کہی ہیں لیکن نہایت چابکدستی سے کہانی کے تانے بانے میں پرو دی ہیں۔ کالو بھنگی کا کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی ساتھی نہیں ہے.....'' اسپتال میں بیمار آتے ہیں' اچھے بھی ہو جاتے ہیں' مر بھی جاتے ہیں لیکن یہ کالو بھنگی' بے حس اور بے معنی کالو بھنگی ایسے ہی اپنی جھاڑو لیے کھڑا رہتا ہے.....''

(6)''.....مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کالو بھنگی کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ ہماری سماجی زندگی اور معاشرتی وجود کی بدصورتی کی علامت ہے جس کو بیان کرنے کی طاقت کسی ادیب کے قلم میں نہیں ہے۔ اس کا خاموش وجود ہندوستان اور دنیا کے مظلوم انسان کی معکوس تمنا ہے جیسے وہ ایک گالی ہے جو بدسلوکی کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ یہ علامتی کردار

زمانے کے صدیوں پرانے ظلم کی تخلیق ہے اور اس ظلم کو بھی کوئی تنہا ادیب ختم نہیں کرسکتا اور خود کرشن چندر نے اس افسانے کے خاتمے پر اپنے حسین و جمیل انداز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تنہا ادب سماجی حقیقت کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ ادب اس سماجی آسیب اس کابوس کو محسوس کرسکتا ہے، دیکھ سکتا ہے اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ تبدیلی لانے کیلئے ادب کو اپنا رشتہ سماج کے تانے بانے سے جوڑنا ہوگا۔ ادب وقت اور تاریخ کی راہوں سے بے نیازانہ نہیں گزر سکتا..... یہ ایک با مقصد اور Committed ادیب کا نظریہ ہے.....''

(7)''.....میں اس مقالے کو کرشن چندر کی کہانی کے ایک طویل اقتباس پر ختم کروں گا جو کالو بھنگی کی تمنا ہے جس سے وہ خود ناواقف ہے اور افسانہ نگار اس تمنا میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اقتباس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ افسانہ نگار کالو بھنگی کے وجود ہی کو ختم کردینا چاہتا ہے اور اس کے لیے تنہا افسانہ نگار کافی نہیں ہے بلکہ ساری انسانی دنیا کی شرکت ضروری ہے۔

''(اقتباس).....اور تو اسی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا، جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے، اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کرسکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھولے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پنہائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔ یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے۔ اچھا ہے کھڑا رہ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے گا کہ تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو زمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے''۔

(8)''.....لیجئے کرشن چندر کا اقتباس ختم ہوا اور اس کی یوتو پیا کا پورا خواب آپ کے سامنے ہے.....کرشن سے پہلے غالب نے اپنے عاشقانہ خواب کو اس طرح بے کم و کاست بیان کیا ہے.....اور کرشن چندر میں غالب کی جرأت رندانہ ہے کیونکہ اس کو حسن کا معیار تبدیل کرنا ہے جس سے یہ سماج تبدیل ہوگا اور یہ بغیر جرأت رندانہ کے ممکن نہیں ہے اور یہ پریم چند کا ورثہ ہے۔ یہی اس کا نو بہار ناز ہے اور یہی وہ غنچۂ ناشگفتہ جس کو وہ پھول بنادینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا پڑے گا کالو بھنگی اردو افسانے میں سب سے بڑا کنایہ ہے سب سے بڑی علامت ہے''۔ 193

سردار جعفری نے فن اور ٹیکنیک کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صرف ٹیکنیک خوبی بڑے فن کی ضامن نہیں ہے۔ فن اور ٹکنک میں یہ فرق ہے کہ فن لفظ و معنی، جسم و جان دونوں کا ارتباط ہے جبکہ ٹکنک صرف جسم ہی جسم ہے''۔ 194

سردار جعفری نے تخلیقی فن کار کو نقاد سے زیادہ تنقیدی صلاحیت کا حامل قرار دیا ہے۔

انہوں نے مثالوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1)''ہر سنجیدہ شاعر اور ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ادبی ماضی کی بازیافت خود کرے اور پیشہ ور نقادوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس سے حتی الامکان گریز کرے ورنہ میر تقی میر کے بہتر نشتروں کو میر کی کل کائنات سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے گا''۔

(2) ''میں نقاد کو کم تر یا حقیر نہیں سمجھتا ہوں۔ بعض نقادوں کے لیے میرے دل میں بڑا احترام ہے جیسے لیو کاش یا آنند کمار سوامی۔ ایک مارکسی نقطہ نگاہ کا حامل ہے اور دوسرا مابعد الطبیعیاتی نقطہ نگاہ اور عینیت کے فلسفے کا علمبردار۔ لیکن دونوں میری نظر میں عظیم ہیں اور ان کی تحریریں پڑھنا لذت سے خالی نہیں۔ پھر بھی میں یقین رکھتا ہوں کہ ادب اور شعر کا معیار نقاد مقرر نہیں کرتا اور نہ وہ ادب کے دھارے کا رخ پھیر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود آنند کمار سوامی نے جنہوں نے ہندوستانی اور ایشیائی فنون لطیفہ کے اسرار و رموز سے مغرب کو آشنا کرنے کی کوشش کی ایک جگہ یہ مزے کی بات لکھی ہے کہ جب اجنتا اور ایلورا کی تخلیق ہو رہی تھی تو ان کو راہ دکھانے والا کوئی نقاد نہیں تھا۔ حافظ شیرازی اور میر تقی میر کے عہد میں بھی پیشہ ور نقاد نہیں تھے۔ تذکرہ نگار تھے جو سخن فہم بھی ہوتے تھے اور طرفدار بھی۔ ان کے ہم عصروں کی رائیں تنقید سے زیادہ جذباتی ردعمل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ادب اور فن کے جتنے اصول تھے وہ سب تخلیقی فن کاروں کی کاوش کا نتیجہ تھے۔ ہمارے ادب کا یہ کردار جس کو پیشہ ور نقاد کہتے ہیں۔ جدید مغربی ادب کی دین ہے۔ ادب کا معیار خود ادیب اور شاعر مقرر کرتا ہے اور بعض عظیم تخلیق کار ادب کا معیار بھی بدل دیتے ہیں۔ لفظوں کے معنی اور مفہوم تک کو بدل دیتے ہیں جیسے اقبال نے خودی کا مفہوم بدل دیا چنانچہ پریم چند نے بھی اپنے ادب کا معیار خود مقرر کیا تھا''۔ 195

سردار جعفری نے عشق کے بارے میں بتایا کہ ''عشق سب سے زیادہ لطیف چیز ہے اور اشارے اور کنائے تو اس کا سب سے بڑا حسن ہے۔ اس کی جان ہیں''۔ 196

سردار جعفری کے مطابق ''پریم چند کی روایت زیادہ جاندار ثابت ہوئی اور یہ سماجی حقیقت نگاری کی روایت ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تمام افسانہ نگار اس روایت کو لے کر آگے بڑھے ہیں اور اس صدی (بیسویں صدی) کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے چار بڑے ستون' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی ہیں۔ اس کارواں میں اور بھی بہت سے نہایت اہم افسانہ نگار شامل ہیں جن کی تعداد ستر اسی تک پہنچتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے تجربات کے مطابق موضوعات میں نیا تنوع پیدا کیا ہے اور اپنی بصیرت کے مطابق نئے نئے اسالیب اور نئی نئی تکنک بھی استعمال کی اور افسانے کی دنیا میں بہار آ گئی۔ وہ اہم افسانہ نگار بھی جو براہ راست پریم چند کی وراثت لے کر نہیں آئے ہیں جیسے قرۃ العین حیدر وہ بھی پریم چند سے کترا کر نہیں گذرے ہیں'' 197

کرشن چندر نے اپنی کہانیوں کی تکنک میں جو تجربے کیے اس کی ستائش کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اپنے ہم عصروں میں کرشن چندر نے سب سے زیادہ کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کا قلم ایک آبشار کی طرح گیت گاتا رہا ہے۔ ان میں کمزور کہانیاں بھی ہیں اور ایسی کہانیاں بھی جو شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں اور عہد حاضر کی کلاسیکی کہانیوں میں شمار کی جائیں گی۔ اس بسیار نویس سے کم لکھنے والوں کے یہاں بھی رطب و یابس موجود ہے۔ یہ تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔ درخت کی کوئی بھی شاخ جب درجنوں پتیاں پیدا کرتی ہے تو ایک پھول کھلاتی ہے۔ کرشن چندر کی دوسری خصوصیت یہ ہے' جس میں کوئی ہم عصر اس کے قریب نہیں پہنچتا کہ اس نے کہانی کی تکنک میں بے شمار تجربے کیے ہیں۔ اس میں بھی اس کو کامیابی اور ناکامی دونوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بالکونی' زندگی کے موڑ پر' ان داتا' بہت جاگتے ہیں' تین غنڈے' پشاور ایکسپریس' برہم پترا' کالو بھنگی'

غالیچہ صرف چند کہانیوں کا نام ہیں جن میں ہر ایک کی تکنیک الگ الگ ہے۔آج سے تیس پینتیس برس پہلے وہ Abstract کہانی کا تجربہ کر چکا تھا۔بغیر کردار کی کہانی کا تصور دے چکا تھا''۔ 198

سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں کرشن چندر کی کہانیوں کی ستائش کی:

(1) ''اس نے قحط بنگال کے بعد سے جیسے مورچہ بنا کر کہانیاں لکھنا شروع کیں اور ایک سے ایک بہتر کہانی لکھی''۔

(2) کرشن چندر نے اپنے خوبصورت افسانے ''کہانی کی کہانی'' میں کہنے کو تو اپنے ادبی سفر کی مختلف منزلیں ہیں جو رومان سے انقلاب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ہر منزل اور ہر موڑ پر ترقی پسند ادب کا کارواں چلتا ہے''۔ 199

پروفیسر محمد بیگ احساس نے اپنی تصنیف ''کرشن چندر ''شخصیت اور فن'' میں لکھا ہے کہ کرشن چندر نے فسادات پر کہانیاں لکھی ہیں۔انہوں نے سردار جعفری کا لکھا ایک دیباچہ کا حوالہ دیا جس میں فسادات پر لکھنے کی درخواست کی گئی ہے۔

''اگست 1946 میں ملک کے مختلف مقامات پر فسادات ہوئے۔کلکتہ' نواکھالی' بہار' راولپنڈی' امرتسر' لاہور' ممبئی' دہلی' میوات اور پورا پنجاب اس آگ کی لپیٹ میں جلنے لگتا ہے۔کرشن چندر نے 1948 تک صرف فسادات پر ہی کہانیاں لکھیں اور اپنا فرض ادا کیا۔پنجاب اور بنگال تقسیم ہوا اور کرشن چندر کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے انہیں فطری طور پر ان فسادات سے بہت دکھ پہنچا۔ترقی پسندوں نے ان فسادات کے خلاف لکھنے کی اپنے ادیبوں سے درخواست کی۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن کا جلوس نکالا۔پاکستان کے ادیب اپنی کانفرنس کر رہے ہیں لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ان کے قلم خاموش ہیں۔جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اوپندر ناتھ اشک' عصمت چغتائی' احمد عباس' کیفی اعظمی' یوسف ظفر' فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا''۔ 200

علی سردار جعفری کا لکھا تنقیدی مضمون کیفی اعظمی کا انگریزی سے اردو ترجمہ ڈاکٹر شمشاد بھٹناگر نے کیا اور یہ ''کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں'' مرتبہ شاہد ماہلی میں شامل ہے۔اس مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے بتایا کہ اطہر حسین جو کیفی اعظمی کے نام سے مشہور ہیں۔اعظم گڑھ کے گاؤں ''مجواں'' میں پیدا ہوئے بچپن میں انہوں نے اردو اور فارسی پڑھی' باضابطہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے ہی انہیں کچھ چیدہ چیدہ اشعار زبانی یاد تھے' بیت بازی کے کھیل میں وہ بہت ماہر تھے۔بڑے ہوئے تو انہوں نے حافظ' سعدی' میر' غالب کو پڑھا' اعلیٰ شاعری کو جذب کرنے کے اس تجربے نے ان کی روح کو بالیدگی بخشی اور ذہن کو آزاد کیا۔1943 میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مرکزی دفتر کی راہ پکڑی اور ایک اخبار نویس بن گئے۔تہذیب و ادب کی عظیم ہستیوں سے تعلقات سے کس قدر علمی و ادبی فیض حاصل ہو سکتا ہے۔اس کا ذکر سردار جعفری نے کیفی کے حوالہ سے کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''یہاں (ممبئی میں) انہیں (کیفی اعظمی) ہندوستانی تہذیب اور ادب کی عظیم ہستیوں سے ملنے کا موقع ملا جیسے ہندی شاعر سمترانندن پنت اردو شاعر جوش ملیح آبادی' ملیالم کے شاعر اور کتھاکلی کے ترجمان وئے تول' مراٹھی ڈرامہ نویس ماما وریکر' مقبول رقاص اودے شنکر' فلم اداکار کے ایل سہگل اور پرتھوی راج کپور اور ان جیسی بہت سی ہستیاں جو پارٹی کے مرکزی ہیڈ

کوارٹر میں برابر آیا کرتے تھے جسے ''راج بھون'' کہا جاتا تھا۔ان تعلقات سے کیفی صاحب کی شاعری کو ایک اچھوتی تازگی اور خیالات کو بلندی عطا کی''۔ 201

سردار جعفری نے بتایا کہ کیفی ناگپاڑہ ممبئی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے تھے۔انہیں اپنی بیٹی شبانہ اعظمی کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنے کیلئے بہت سی ذاتی قربانیاں کرنی پڑیں۔اسی دوران کیفی ایک فلم رائٹر کی حیثیت سے ابھرے انہوں نے فلموں کے لیے ڈائیلاگ اور گیت لکھے اور چیتن آنند کی فلم ہیر رانجھا کی مکمل اسکرپٹ منظوم لکھی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کی جوشؔ کے بارے میں رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

جوشؔ کے سلسلہ میں سردار جعفری کی رائے ہے کہ وہ انقلابی سے زیادہ رومانی شاعر ہیں۔وہ جوش کو پورے طور پر انقلابی شاعر تسلیم کرنے میں تکلف کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ سب سے پہلے اقبال نے استعمال کیا ہے۔سرمایہ دار' مزدور' زمیندار' کسان' آقا' غلام' حاکم اور محکوم کی باہمی کشاکش کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبالؔ نے نظمیں کہی ہیں۔پھر جوش کو ''شاعر انقلاب'' کا خطاب کیوں دیا گیا۔وہ جوش کو محض ایک ایجی ٹیشنل شاعر تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی اس قسم کی شاعری میں بھی آزادی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بڑے کام کی چیز ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی شاعری سماج کے ظلم' فریب اور ریاکاری کا پردہ چاک کرتی ہیں۔عدل وانصاف' محبت کی ترغیب دیتی ہیں اور پھر انسان دوستی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہیں جہاں شاعر کہہ اٹھتا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

وہ جوشؔ کو سوفی صدی رومانی شاعر تصور کرتے ہیں اور ان کے انقلاب کو بھی رومان کے حوالے سے دیکھتے ہیں جس کے زیر اثر وہ بہت جلد جذبات وہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جوش کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے اور وطن کی آزادی کے لیے وہ اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ واقعات اور حالات کی رفتار میں اپنے تخیل کی سرعت پرواز نہ پا کر مایوس ہونے لگتے ہیں۔ایک طرف ایسی سبک رومانیت وجذباتیت جو جوش کی شاعری کا حصہ ہے تو دوسری طرف وہ جوش کی عقل پرستی کے اس قدر قائل ہیں کہ اس ضمن میں سردار' جوشؔ کو حالیؔ اور اقبالؔ سے آگے بڑھا دیتے ہیں۔شاید اس لیے کہ جوش کی عقل پرستی میں ایک باغیانہ لہر ہے۔سردار نے جوش کی منظر نگاری کو بھی ان کی عقل پرستی سے وابستہ کیا ہے لیکن کہیں بھی انہوں نے عقل پرستی کی وضاحت نہیں کی ہے۔سچ یہ ہے کہ جو الزام پریم چند کی تخلیقات پر لگتے ہیں جوش اس سے الگ نہیں ہیں۔جوش کسی منضبط فکر اور منظم نقطہ نظر کے حامل نہ تھے۔ان کی رومانی فطرت انہیں ایسا کرنے بھی نہیں دے سکتی تھی۔وہ سماج کے طبقاتی نظام کا تربیت یافتہ تصور نہ رکھتے تھے۔ایک طرف وہ عورت کو صرف حسن کی دیوی سمجھتے ہیں اور اس کے لیے محنت بری چیز سمجھتے ہیں۔دوسری طرف محنت زدہ عورت کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔

آخر سردار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

''نظریاتی اعتبار سے جوش نے ایک ایسے بے بنیاد فلسفہ کو اپنا رکھا ہے جو کسی طرح ترقی پسند نہیں کہا جا سکتا ہے۔ایک

طرف تو وہ خدا، مذہب اور تقدیر کے قائل نہیں ہیں لیکن دوسری طرف وہ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے افعال پر قادر نہیں ہے جو کچھ کرتا ہے اس کے کرنے پر مجبور ہوتا ہے''۔

اس کے باوجود جوش کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ انگریز حاکم کے خلاف تھے، ساتھ میں وہ جہالت، توہم پرستی وغیرہ کے بھی خلاف تھے۔ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے وطن، اپنی قوم، اپنی تہذیب وتمدن سے محبت بڑھ جاتی ہے۔جوش نے ان تضادات کے باوجود پوری نسل کو متاثر کیا اور بقول سردار ترقی پسند شاعر جوش کے اس ورثے کو لے کر ہی شاعری کر رہے ہیں۔یہیں سے پوری ترقی پسند شاعری، جس میں خود سردار جعفری کی شاعری بھی شامل ہے، کے جوش و جذبہ، رجحانات اور بعض تضادات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے''۔ 202

جوش پر سردار جعفری کی تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے شافع قدوائی نے لکھا:

(1) ''جوش ملیح آبادی کو ان کی بعض واشگاف انقلابی نظموں کے باعث شاعر انقلاب کے لقب سے نوازا گیا اور بعض سرکردہ ترقی پسند نقادوں نے بھی جوش کی شاعری کی تعین قدر میں تصور انقلاب کو اساسی حوالہ بنایا تاہم سردار جعفری نے پہلی بار یہ باور کرایا کہ جوش کی نظمیں انقلابی نہیں بلکہ براہ راست سیدھی سادی ایجی ٹیشنل نظمیں ہیں جو اردو شاعری میں ایک اضافہ ہیں۔جوش کی افتاد طبع کا اور ان کے شعری اکتسابات کا محاسبہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے مدلل طور پر لکھا ''جوش سو فیصد رومانی شاعر ہیں اور ان کا انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے جس کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں اور مجاہد کی شان سے نیزہ ہلاتے اور تلوار چلاتے میدان میں اتر آتے ہیں۔یہ جوش کی رومانی فطرت ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ کبھی ان کا انقلاب مٹھیوں میں افشاں بھر کر چلتا ہے اور کبھی سرمایہ داروں کی ہڈیاں چباتا ہوا۔کبھی وہ نئی دلہن کی طرح خوبصورت ہوتا ہے اور کبھی دیو کی طرح مہیب و دہشت ناک۔اسی رومانی انقلاب پرستی کے زیر اثر وہ کبھی کبھی اپنے ابنائے وطن سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ نفرت وحقارت کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ پوری ہندوستانی قوم کا نامرد، ذلیل روسیاہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں.....اصل میں ان کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے اور وطن کی آزادی کے لیے وہ اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ واقعات و حالات کی رفتار میں اپنے تخیل کی سرعت پرواز نہ پا کر مایوس ہونے لگتے ہیں''۔ 203

(2) ''سردار جعفری نے جوش کی طویل نظموں پر داد کے خوب ڈونگرے برسائے ہیں اور لکھا کہ وہ ان میں علمی سنجیدگی فلسفیانہ وقار، تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت، پرسکون ترنم اور پُرعظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کے امتزاج کا وہ معجزہ ہے جو اردو شاعری اس سے پہلے پیش نہیں کر سکی۔الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر کبھی پہلے پیدا ہی نہیں ہوا''۔ 204

(3) جوش کے رومانی ہونے کے بارے میں سردار جعفری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شافع قدوائی نے بتایا کہ جوش کے بیشتر ناقدین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔

''مذکورہ تنقیدی رائے کی صلابت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جوش کے بیشتر ناقدین نے سردار جعفری کے بنیادی نکتہ یعنی جوش انقلابی نہیں بلکہ رومانی شاعر ہیں، کی محض تفصیل مرتب کی ہے۔سردار جعفری نے جوش کے اسلوبیاتی خصائص اور ڈکشن

وغیرہ کی طرف مجمل اشارے کیے ہیں اور بعد کے نقادوں نے موضوع سے قطع نظر زبان و بیان کے حوالے سے شاعر انقلاب و رومان کی نظموں کا جو جائزہ لیا ہے اس کی اساس سردار جعفری کے محاکمہ پر قائم ہے"۔ 205

سردار جعفری کا مضمون "قتیل شفائی" رسالہ فن اور شخصیت قتیل شفائی نمبر 1981 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں سردار جعفری نے بتایا کہ قتیل شفائی نے شفا کانپوری (اصل نام حکیم محمد یحییٰ خاں شفا' راولپنڈی) سے شروع شروع میں اصلاح لی اور اپنا قلمی نام قتیل شفائی رکھا۔

قتیل شفائی کی شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

"قتیل حسن و عشق کی ہلکی پھلکی مہک' لطیف کیفیات کے شاعر ہیں۔ان کا آہنگ نرم اور نغمہ ریز ہے۔الفاظ تتلیوں کی طرح اڑتے ہیں.....انہوں نے تجارت بھی کی اور ملازمت بھی لیکن قبل اس کے کہ ان کے وجود میں چھپا ہوا شاعر دم توڑ دیتا وہ ان جھمیلوں سے باہر نکل آئے اور تقریباً چالیس سال سے دلوں میں مسرت کا چراغ روشن کر رہے ہیں۔قتیل کی محبوب اصناف میں ہیں گیت' غزل اور نظم۔اس ترتیب سے ان کی اہمیت ہے۔حفیظ جالندھری کے بعد اردو زبان کو سب سے دل فریب گیت قتیل نے عطا کیے ہیں۔یہ اردو زبان کی نئی دولت ہے۔غزلوں اور نظموں میں قتیل حسن و عشق کی منزلوں سے گذر کر سیاسی اور سماجی دنیا میں بھی داخل ہو جاتے ہیں لیکن اپنے البیلے انداز کے ساتھ.....ان غزلوں کی خصوصیت پیچیدہ ترکیبوں سے دور ایک آسان اور سبک زبان ہے۔قتیل کی اسی ادا نے ان کو سب کا محبوب بنا رکھا ہے" 206

سردار جعفری نے قتیل کی کتاب "آموختہ" کے اس شعر۔

یا میرا دل پتھر کردے
یا دھرتی کے زخموں پر مرہم رکھ دے

شاعر کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ یہ شاعر کی انسان دوستی کی پہچان ہے"۔ 207

راحت اندوری کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

"راحت اندوری کو میں نے ملک اور بیرون ملک کے مشاعروں میں متعدد بار سنا ہے۔انہوں نے اردو شاعری کو عوام میں مقبول بنایا ہے۔مسقط سے کراچی کے سفر میں ان کا خوش گوار ساتھ رہا۔ان سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ شعر و ادب کے رخ و رفتار سے باخبر ہیں۔اس نوجوان شاعر کا شعری رشتہ قرون وسطی کی روایات سے ملتا ہے"۔ 208

سردار جعفری نے انگریزی میں لکھا اپنا مقالہ بعنوان:

"Progressive movement and its influence on Urdu Poetry" سردار جعفری نے ٹورنٹو یونیورسٹی کے ہال میں منعقدہ 25 اور 26 دسمبر 1982 کو منعقدہ کانفرنس میں پیش کیا۔اردو سوسائٹی نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔

اس مضمون کے تعلق سے پروفیسر ضیاء (علیگ) نے لکھا ہے:

"یہ مضمون تحقیقی بھی تھا اور معلوماتی بھی۔ذہن اور فکر کو سوچنے کی طرف بھی راغب کرتا تھا اور ترقی پسند تحریک نے ہماری

زندگی، ہمارے ادب اور ہمارے رجحانات کو کس طرح متاثر کیا ہے اس کا بھرپور جائزہ بھی لیا تھا.....ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے میں جو ترقی پسندیت کو دخل ہے اس کا پرخلوص احاطہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کیا گیا تھا۔ یہ مضمون اس بات کی ضمانت تھا کہ جعفری صاحب کی ذہنی تربیت بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر عمل میں آئی ہے۔ بعد میں یہی مضمون تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ رسالہ Urdu Canda میں جس کی ادارت ولی عالم شاہین کرتے ہیں اس کے پہلے شمارے میں شائع ہو کر خاصا مقبول ہوا"۔ 209

سردار جعفری نے "عندلیب گلشن نا آفریدہ" مضمون میں غالب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مضمون مجلّہ "غالب نامہ" نئی دہلی جنوری 1983 میں شائع ہوا۔ مضمون کے ابتداء میں غالب کی اردو غزل کے چند اشعار سے بحث کی اس کے بعد زیادہ تر فارسی غزلوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کی شاعری میں عصری حسیت کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

"اس نے (غالب) اپنے عہد کے واقعات پر بہت کم اشعار کہے ہیں مگر اس عہد کا پیش منظر اس عظیم شاعر میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہے جیسے بہتے ہوئے پانی میں درختوں کا مرتعش عکس۔ بہت سی غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور قصائد سے بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ غالب کو قدروں کے زوال کا غم زیادہ تھا نظام کی موت کا غم کم۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نظر تغیر پر تھی۔.....غالب کی نگاہ میں ایک پورے نظام زندگی اور آئین حیات کی تبدیلی تھی"۔ 210

علی سردار جعفری کا مضمون "ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری" کا انگریزی سے اردو ترجمہ ریحان احمد عباسی نے کیا اور یہ تین قسطوں میں کتاب نما میں شائع ہوا۔ قسط نمبر ا، کتاب نما جولائی 1983ء کے مارے میں دوسری قسط اگست 1983 اور تیسری اور آخری قسط ستمبر 1983ء میں شائع ہوا۔

پہلی قسط میں سردار جعفری نے اردو شاعری کو ترقی پسند تحریک کی دین کے بارے میں بتلایا کہ تحریک نے اس کے افق کو وسعت دی، ماضی کے پر تصنع استعارے کو جدید حسی پیکر عطا کیے، آزاد نظم ڈرامائی نظم اور تمثیلی نظم کو فروغ دیا اور ان نظموں میں بحروں کے نئے تجربے کیے، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ شعری زبان کو مایہ دار بنایا، عام اور عوامی الفاظ کو استعمال کیا اور اس طرح ترقی پسند شاعری کو عوام سے قریب کیا، اردو شاعری اور ادب میں فنی اضافے کیے۔ پرانی تلمیحات کو نئے معانی اور مفاہیم سے آشنا کیا، نئی علامتیں اور نئے شعری پیکر عطا کئے جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور جن پر تحقیقی کام کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ سردار جعفری نے بتایا کہ شاعری کا بنیادی اور واحد موضوع تمام دوسرے فنون اور ادب کی طرح انسان اور صرف انسان ہے۔ ترقی پسند شعراء کے ان کارناموں کا بھی ذکر کیا کہ انھوں نے چند ترقی پسند شعراء کے حوالے بھی دیئے۔

دوسری قسط میں سال 1936 کو سردار جعفری نے بہت اہم سال قرار دیا اور اس میں انھوں نے امریکن شاعر کارل سینڈبرگ کی نظموں کا مجموعہ the people yes کا حوالہ دیا جو اسی سال شائع ہوا اس مجموعہ کی ایک طویل نظم کا اقتباس اور اس کا منظوم ترجمہ بھی پیش کیا۔ اسی طرح لینن انعام یافتہ اور نوبل انعام یافتہ شاعر پابلو نرودا کی نظم کا حوالہ دیا جو 1936 یں لکھی گئی اس نظم کے ساتھ اس کا بھی منظوم اردو ترجمہ دیا گیا اور اسی زمانے کی مشہور تصویر اور مشہور ناول کا بھی تذکرہ کیا اور اقبال

کی آخری تصنیف ''ضربِ کلیم'' کا حوالہ بھی دیا جو 1936ء میں شائع ہوئی۔علی سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال نے اپنی تخلیقی زندگی کے ہر مرحلے پر فن برائے فن کے نظریے کی مذمت کی تھی، انھیں فن برائے زندگی پر یقین تھا اور وہ چاہتے تھے کہ شاعری انسان اور کائنات کے رشتے کو سمجھنے کی ذمہ داری قبول کرے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال کا سب سے قیمتی ورثہ انسانی عظمت اور اس بات پر اعتماد ہے کہ وہ اپنی قسمت بدل سکتا ہے۔

تیسری قسط کی ابتداء میں جمالیات سے بحث کی گئی ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے جن میں غصہ اور نفرت بھی شامل ہیں اور شاعری میں ان کی جگہ ہے۔انھوں نے کہا کہ وہ نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہتے لیکن اس کا ہدف اگر ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' میں لکھا ہے:

''ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے۔جنھیں رس کہا جاتا ہے۔ان رسوں میں غصے اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔غصے اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔میں نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہوں گا لیکن شاعری میں اس کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں اور یہ کہ اگر اس کا ہدف ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے۔نفرت کا یہ شعلہ مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔ترقی پسند شاعری میں اس کی کوئی کمی نہیں ہے''۔211

پاکستان کی شاعرہ پروین فنا کے مجموعہ کلام ''تمنا کا دوسرا قدم'' پر سردار جعفری نے کراچی میں 8 مئی 1984ء، اپنے تنقیدی مضمون ''حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔سردار جعفری نے پروین فنا کو باشعور شاعرہ کہا ہے۔

ان کی شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''آج کل جو خواتین شاعری کر رہی ہیں ان میں چند ایسے نام ہیں جن کے پاس پیکر تراشی کا خاص فن ہے اور ان میں ایک معتبر اور منفرد نام پروین فنا کا ہے۔میں ان کی شاعری کو محض موضوعات کی شاعری نہیں سمجھتا۔میرے نزدیک یہ محسوسات کی شاعری ہے لیکن ان کا احساس بیدار اور باشعور ہے۔اگر ایک طرف ذاتی غموں اور ناکامیوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی غموں کو بھی اپنی خوب صورت گرفت میں لے لیتا ہے۔یہ شاعری زندگی سے بیزاری کی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی سے محبت کی شاعری اور حرف حق کی بے باکی کی شاعری ہے اور یہ حرف حق فلسطین کی خون آلودہ سرزمین سے لے کر پروین فنا کے دل تک وسیع ہے۔ان کی نظم ''لہو بول اٹھے گا'' (نذر فلسطین) اس اعتبار سے ایک بھرپور اظہار ہے۔ایک فقرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین کی شاعری حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری ہے۔میں پروین فنا کے مجموعہ کلام کا خیر مقدم کرتا ہوں جس کا مطالعہ روحانی بالیدگی کا سامان ہے اور غنائی کیفیات سے معمور ہے۔212

آزاد نظم کے مستقبل کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''کہنے کو تو اردو میں غزل کی تاریخ ڈھائی تین سو برس ہے لیکن فارسی غزل کی روایت اس کی عمر بڑھا دیتی ہے۔اس

عرصے میں غزل اپنے امکانات ختم کر چکی ہے۔نظم جو صحیح معنوں میں 1857ء کے بعد پیدا ہوئی، اقبال اور جوش تک آتے آتے اپنی معراج کو پہنچ گئی اور پابند نظم پر ردیف اور قافیے کی قید کے ساتھ اقبال اور جوش نے آخری مہر لگادی۔اس کے بعد سے غزل بھی کہی جارہی ہے اور پابند نظم بھی اور دونوں میں اچھی خاصی شاعری ہورہی ہے۔لیکن یہ شاعری اپنے آسمان ہنر سے محروم ہے حالانکہ ابھی تک آزاد نظم قبول عام کی وہ سند حاصل نہ کرسکی ہے جو غزل اور نظم کو حاصل ہے۔پھر بھی میرے نزدیک اردو شاعری کا مستقبل آزاد نظم کے ساتھ وابستہ ہے۔213

(سردار جعفری: حرفِ حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)

''پابند نظم میں ردیف اور قافیے کی جھنکار ایک مخصوص حسن پیدا کرتی ہے اور آزاد نظم کو شعری پیکروں کا آہنگ نئی کیفیت عطا کرتا ہے''۔214

سردار جعفری نے ''انیس کی معجز بیانی'' عنوان سے ایک مقالہ انیس پر منعقدہ ایک سینار میں پیش کیا۔مضمون میں سردار جعفری نے انیس سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا ان کے ذوق کی تربیت میں سب سے زیادہ انیس کی آواز ہے اور یہ کہ مرثیے سے نظم نگاری تک سفر میں انیس کی شاعری نے ان کی بہت رہنمائی کی ہے۔انھوں نے بتایا کہ انیس کے اثرات جوش کے یہاں بہت واضح ہیں اور اقبال کے کے یہاں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے کہ وہ انیس کا شمار اردو کے چار عظیم شعرا میں کرتے ہیں باقی تین میرؔ، غالب اور اقبالؔ ہیں۔انھوں نے انیس کے موضوع کو دنیا کا عظیم ترین موضوع شجاعت اور قربانی بتایا ہے۔

انیس کی منظر کشی پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے مجھے انیس کی شاعری کے جن حصوں نے متاثر کیا وہ صبح کی منظر کشی سے متعلق تھے اور اس کی وجہ میرا ذوق آوارگی تھا۔میں ترائی کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت گھوما ہوں اور میں نے ترائی کے میدانوں سے ہی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے اور آسمان پر تاروں کو بجھتے ہوئے دیکھا تو ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انیس کے یہاں یہ منظر نگاری تخیلی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔میرے نزدیک مثنویوں کے بعد اسکو اردو شاعری میں فطری منظر نگاری کی ابتداء کہا جاسکتا ہے۔جوش کی شاعری میں صبح کی منظر نگاری اس کا تسلسل ہے۔صبح کی جس نرم ہوا کا ذکر انیس نے کیا ہے اس کے جھونکوں سے میرے بچپن نے فرحت حاصل کی ہے اور طلوع آفتاب سے میری آنکھیں روشن ہوئی ہیں ان مرثیوں میں طلوع ہی طلوع ہے۔غروب آفتاب کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح عاشورہ، صبح شہادت صبح سعادت ہے۔ان مراثی میں جہاں رات آئی ہے وہ اپنی تمام ہولنا کی کے باوجود اس صبح شہادت لے کر آئی ہے۔215

انیس کے مراثی کی فنی خوبیوں سے بحث کرتے ہوئے سردار جعفری نے کئی اشعار پیش کیے ہیں۔

چند اقتباسات پیش ہیں:

انیس نے ان تمام ادبی اور شاعرانہ حربوں سے کام لیا ہے جو اس وقت کے لکھنو میں رائج تھے۔ہر طرح کے صنائع، بدائع، تشبیہہ، استعارے، مبالغے لیکن اتنی فصاحت، بلاغت اور لطافت کے ساتھ کہ ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتے.....مثال

کے طور پر انیس نے مبالغہ آرائی اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والا لطف لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بات دور از کار نہیں معلوم ہوتی۔ کربلا میں گرمی کی شدت کو بیان کرنے کے لیے یہ مصرع کہنا کہ ''بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر'' اعجاز سخن کی مثال ہے.....صنعت ایہام کا استعمال انیس کے یہاں بہت زیادہ ہے لیکن ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتا بلکہ لطف میں اضافہ کر دیتا ہے .....انیس نے بہت سی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور ان میں تخیل کی بلندی، ندرت اور ذوق کی لطافت سے کام لیا ہے۔ انیس کی یہ تشبیہیں صرف نئی نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری میں اضافے ہیں۔ انیس کے مراثی میں کئی ہزار تشبیہیں اور استعارے ہیں جو انسان کو حیران کر دیتے ہیں۔216

سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضمون ''چراغ لالہ'' میں اقبال کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مضمون افکار کراچی سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر، 1991ء میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء میں سردار جعفری نے بتایا کہ انہوں نے اقبال پر جو ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے اس میں تین علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ آبجو کو پیغمبری اور شاعری کی علامت، لالے کا پھول خودی کا، عظم جمال اور شاہین کو خودی کا مظہر جلال کے طور پر استعمال کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ:

پہلی علامت جوئے آب کی شکل میں گوئٹے کے یہاں سے آئی ہے اور پیام مشرق کی نظم نغمہ محمدی کے ترجمے میں ظاہر ہوئی ہے۔

سردار جعفری نے شاعری کی ایرانی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعری کی ایرانی روایت میں بھی حسن و عشق کے اسرار کے لیے ایک پھول اور ایک طائر کو اہمیت دی گئی ہے..... شاعری کی ایرانی روایت میں گلاب کا پھول حسن ہے اور بلبل عشق۔ محبوب باغ اور پھول کی صفات سے آراستہ ہے اور عاشق بلبل کے دل کی بے تابی اور اس کے نغمہ و فریاد کا پیکر۔ پھول میں ایک شان بے نیازی ہے اور مکمل سکوت اور بلبل میں انداز نیاز مندی ہے اور مسلسل ترنم۔ یہاں لذت وصل خواب و خیال ہے اور لذت فراق حقیقت.....فراق جو طلب آرزو کو زندہ رکھتا ہے، نغمے کو سرعطا کرتا ہے اور عشق کو یکتائی بخشتا ہے۔ اقبال لذت وصال سے زیادہ لذت فراق کا شاعر ہے اور عالم فراق میں اس کے نغمے کا تلاطم بڑھ جاتا ہے''۔217

سردار جعفری نے ''لالہ'' کے مفاہیم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''لالہ نور کی علامت ہے، رنگ کی علامت ہے، الہامی کیفیت کی علامت ہے۔ شہادت اور قربانی کی علامت ہے، الہامی کیفیت کی علامت ہے۔ شہادت اور قربانی کی علامت ہے، آزادی کی علامت ہے اور اس انسان کامل کی علامت ہے جس میں خدائی صفات ہوں۔ اپنی نظم ''طلوع اسلام'' میں جو ترکوں کو فتح اور برطانیہ کی شکست پر کہی گئی ہے۔ اقبال نے لالے کے پھول کا بہت خوب صورت استعمال کیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں لالے کا پھول ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ انسان تکمیل خودی کی منزل میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرتا ہے اور اس طرح خدا کو اپنی ذات کی تکمیل سے آشنا کرتا ہے''۔218

شاعرانہ الہام کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

1۔یہ علم اب تک کسی کو نہیں، بڑے سے بڑے شاعر اور ماہر نفسیات کو بھی نہیں کہ تخلیقی شعر کا کارخانہ اندرون ذات کس طرح کام کرتا ہے۔شعور اور احساس میں وہ کیفیاتی تبدیلی کس طرح ہوتی ہے اسے شاعرانہ الہام کہتے ہیں۔کوئی شاعر تخلیق شعر کے آخری لمحے تک اس سے واقف نہیں ہوتا کہ کس طرح کا مصرعہ کن الفاظ اور کن استعاروں کے پیراہن پہن کر نازل ہو رہا ہے اور جب وہ ذہن و دل سے زبان اور کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت ناک مسرت کے ساتھ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔جو کم تر درجے کے شاعر مشق سخن کے زور پر ٹھوک بجا کر شعر کہتے ہیں وہ اس لذت تخلیق سے محروم ہیں.....''

2۔''کبھی کبھی بڑے شاعر بھی الہام کے کمزور لمحوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان لمحوں میں معمولی قسم کا شعر کہتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عظیم تخلیق کے دوران شدید لمحے اور کمزور لمحے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔طویل نظموں میں یہ زیادہ ہوتا ہے۔اس قسم کی تخلیق میں شاعر ترمیم اور اصلاح کرتا ہے۔گویا الہام کے ساتھ ریاض بھی ضروری ہے''۔

3۔ ''شاعرانہ الہام غیر مشروط اور لامحدود نہیں ہوتا۔اس میں اکتسابی علوم کا پرتو ہوتا ہے اور معاشرتی حالات اور ذاتی تجربات کی پرچھائیاں''۔

4۔ ''الہام اس زبان میں ہوتا ہے جس سے شاعر واقف ہے۔اور انہیں علوم کے دائرے میں جو شاعر نے حاصل کیے ہیں (اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام ذہنی اور روحانی کیفیات اور باطنی طاقت کے باوجود الہام ماحول اور تاریخ سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

5۔ایک شاعر کا الہام دوسرے شاعر کے الہام سے مختلف شکل اختیار کرتا ہے۔

6۔ 'ایک ہی وقت میں دو بڑے شاعر دو مختلف معاشروں میں رہ کر دو بالکل مختلف اور بعض اوقات متضاد کیفیات کا اظہار کرتے ہیں اور ایک ہی واقعے کے زیر اثر ایک دوسرے کے برعکس استعارے اور علامتیں تراشتے ہیں کیوں کہ دونوں کی نفسیاتی کیفیات اپنے اپنے معاشرے میں زیر اثر ہوتی ہے (ایک ہی معاشرے میں دو اور دو سے زیادہ نفسیاتی کیفیات ممکن ہیں) اگر ہم اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کے شعری عمل پر ایک نظر ڈالیں تو اس نکتے کی وضاحت میں مدد ملے گی۔دونوں بڑے شاعر ہیں اور ہم عصر ہیں دونوں اعلیٰ درجے کے خلاق ہیں۔دونوں اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے علوم پر حاوی ہیں۔دونوں مغرب کی مادیت پرستی سے نالاں ہیں۔دونوں کے پاس مذہبی اقدار اور روحانی علاج ہیں پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے اتنے الگ ہیں کہ میرے خیال میں اقبال نے کبھی ایلیٹ کو گوئٹے کی طرح اپنا ہم نوا سمجھا ہوگا۔ایلیٹ کی 1917 کی نظم the love song شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے۔تقریباً اسی زمانے میں اقبال نے ایک نظم ''بزم انجم'' کہی وہ بھی شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے لیکن اس میں شام کا رنگ کچھ اور ہے۔اقبال کے یہاں شام دولہن کی طرح سجی ہوئی ہے اور ایلیٹ کے یہاں اس پر موت کی پرچھائیں ہے۔وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک بے ہوش مریض کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔اقبال کی نظم کی لالہ رنگ شام صبح عیش کی تمہید ہے۔ایلیٹ کی نظم کی شام اس کیفیت سے محروم ہے۔219۔

پابلو نرودا کی شاعری اور شخصیت پر علی سردار جعفری کا یہ مضمون ''پابلو نرودا'' پہلے افکار، نومبر دسمبر 1991 اور پھر نیا ورق،

فروری تا جولائی 2004 میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء سے پہلے ادارہ نیا ورق نے اپنے نوٹ میں یہ وضاحت کی ہے کہ سردار جعفری کا یہ مضمون تقریباً دو دہائی قبل رسالہ گفتگو میں شائع ہوا تھا۔ پابلو نرودا کا یوم پیدائش 12 جولائی 1904 ہے۔ اور صد سالہ جشن کے موقع کی مناسبت سے اسے 2004 میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مضمون میں سردار جعفری نے بتایا کہ 1947ء میں ایک مکان میں انگریزی کتاب Residence on Earth مصنف پابلو نرودا دیکھی جس میں اصل نظمیں ہسپانوی زبان میں تھیں اور سامنے کے صفحے پر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں دیا گیا تھا۔ اس کتاب میں انہیں لورکا کی نظم دیکھی جو بقول سردار جعفری ان کا بڑا محبوب شاعر تھا۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران فرانکو کے فاشسٹ سپاہیوں کے ہاتھوں غرناطہ میں قتل کیا گیا تھا۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ لورکا اور پابلو نرودا ہسپانوی خانہ جنگی کے زمانے میں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے تھے۔ یہیں سے پابلو نرودا کی شاعری میں نیا موڑ آیا اور وہ انقلابی اور عوامی آہنگ پیدا ہوا جو نرودا کا طرۂ امتیاز ہے۔ پابلو نرودا کے بارے میں سردار جعفری نے یہ بھی بتایا کہ وہ صرف ایک شاعر اور مغنی ہی نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی سپاہی اور مجاہد تھا جو پورے امریکی خطے کا ضمیر بن چکا تھا اور انسانیت کے ضمیر کو بیدار کر رہا تھا۔

سردار جعفری نے نرودا سے اپنا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے اور پابلو نرودا کے قد و قامت میں فرق تھا۔ وہ مجھ سے بہت بڑا شاعر تھا۔ جو فرق اقبال نے اپنی ذات میں اور گوئٹے کی ذات میں محسوس کیا تھا، وہی فرق میں نے اپنے اور نرودا کے درمیان پایا لیکن میری اور چلی کے اس دلنواز شاعر کی دھڑکنیں ایک تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان مشترکہ قدر صرف اسپین اور چین کی تحریک آزادی اور فاشسٹ دشمنی ہی نہیں ہے جس کا بھرپور احساس جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو دلایا تھا، صرف سوویت یونین اور کمیونزم کی محبت ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان شاعری کی ایک مشترکہ روایت بھی ہے۔ یعنی والٹ ہٹ مین اور مایا کوسکی کی وراثت جن سے دونوں نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض حاصل کیا ہے''۔220

سردار جعفری نے بتایا کہ پابلو نرودا کی طویل نظم ''امن آنے والی شفق کے نام'' نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ یہ امن عالم کا ایک شاندار قصیدہ ہے، جلاوطن شاعر کی حب الوطنی سے سرشار ہے اور پھر یہ حب الوطنی ساری دنیا کی محبت کے سمندر کی ایک لہر بن جاتی ہے۔ سردار جعفری کے مطابق نرودا ایک نہایت منجھا ہوا ڈپلومیٹ اور بہت سنجیدہ شاعر ہونے کے باوجود سینے میں ایک معصوم دل رکھتا تھا۔ سردار جعفری نے اپنی نظم 'پابلو نرودا'' میں اس کی دلنواز شخصیت اور شاعری کے تاثرات کو محفوظ کیا۔

پابلو نرودا کی مقبولیت کے بارے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:

''نرودا کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی گئی اور یہ بے پناہ تھی۔ وہ 1934 میں چلی کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بنا اور آخر دم تک پارٹی کا ممبر رہا۔ سامراجی حکمراں اور لیڈر اس سے ڈرتے تھے لیکن اسکی شاعری کا معجزہ یہ تھا کہ ان ملکوں کے ادیب اور شاعر نرودا سے انسپریشن حاصل کر رہے تھے۔ عمر کی ترقی اور بیماری کے باوجود اس کی تخلیقی قوتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آخر تک شعر کہتا رہا اور آخری تک انقلاب کے لیے لڑتا رہا۔ چلی میں الندے کی صدارت ایک طرح سے نرودا کی شاعری کی جیت تھی اور وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے دوست الندے اور انقلاب کی خاطر پھر سے سفیر بن کر فرانس چلا گیا۔ اس زمانے میں

نرودا کی شاعری اوراس کی عظمت کا سب سے بڑا اعتراف نوبل انعام کی شکل میں کیا گیا'۔221

علی سردار جعفری کا مضمون ''اقبال اور کمیونزم'' آل احمد سرور کی مرتبہ کتاب ''اقبال اور مغرب'' میں شامل ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال مارکسزم اور کمیونزم کو اپنی ناقدانہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ان کی شعری تخلیقات پیام مشرق (1923)، بانگ درا (1924)، زبور عجم (1927)، جاوید نامہ (1931)، بال جبریل (1935) اور ضرب کلیم (1936ء) میں انقلاب اور کمیونزم کا ذکر ملتا ہے۔

مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

1۔ بانگ درا میں اقبال کی فکر نے سرمایہ داری نظام کو قطعی طور سے رد کر دیا جس پر طلوع اسلام کے یہ اشعار شاہد ہیں۔''

2۔اقبال نے ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت اور ان کے استعمال سے انسانی استحصال کو حرام قرار دیا ہے۔یہ کمیونزم کا بنیادی اصول ہے۔کارخانے اور زمین دو سب سے بڑے ذرائع پیداوار ہیں اور ان پر انفرادی قبضے کو حرام قرار دے کر اقبال نے کمیونزم کے بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا ہے''۔

3۔اقبال نے بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ کمیونزم میں روحانیت کی آمیزش ضروری ہے۔

4۔وہ یہ بھی محسوس کرتے رہے کہ اشتراکی جمہوریت اسلام کے اصولوں سے بہت قریب ہے۔

5۔بال جبریل کی پہلی نظم میں لینن کی زبان سے خدا کے وجود کی شہادت دینے کے بعد اقبال سرمایہ داری نظام اور ملوکیت پر بھرپور تنقید کرتے ہیں اور اس زبان میں اسکی دھجیاں اڑاتے ہیں جو مارکس نے استعمال کی ہے۔یہاں اشارے اور کنایہ کو نظر انداز کر کے شاعر نے اس برہنہ گفتاری سے کام لیا ہے جو رزمیہ شاعری کے فکری حصوں میں ہوتی ہے''۔

6۔یہ نظام جس کو ہم غیر طبقاتی نظام کہہ سکتے ہیں، مذہب اور روحانیت سے عاری نہیں ہونا چاہئے۔

7۔نظم ''اشتراکیت'' کا آخری شعر

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان جدت کردار کے ساتھ قرآن میں غوطہ زن ہو کر کن رموز و اسرار کو بے نقاب کر سکتا ہے۔یہ رموز و اسرار قرآن کی ایک آیت قل العفو میں پوشیدہ ہیں جس کا یہ ذاتی مفہوم ہے کہ مسلمان کے پاس اس کی ذاتی ضرورت کے بعد جو دولت بچ جائے وہ راہ خدا میں یعنی عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کی جائے۔دیکھئے یہ نکتہ کمیونزم کی اس تعلیم سے کتنا قریب ہے کہ انسانیت اپنی صلاحیت کے مطابق محنت کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق محنت کی پیداوار یا دولت کو استعمال کرے۔

8۔ابلیس کی مجلس شوریٰ، کو جو اقبال کے انتقال کے بعد ارمغان حجاز میں شائع ہوئی بعض لوگ کمیونسٹ دشمن نظم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔یہ صحیح نہیں ہے۔اس نظم میں چار سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پیش کیے گئے ہیں۔سرمایہ داری ملوکیت،

فاشزم، کمیونزم اور اسلام ۔ پہلے دو نظام سرمایہ داری ملوکیت اور فاشزم، شیطانی نظام ہیں ۔تیسرا انسانی نظام ہے اور چوتھا اسلامی، اقبال پہلے دو شیطانی نظاموں پر تیسرے انسانی نظام کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اسلامی نظام کو تیسرے نظام سے بہتر سمجھتے ہیں"۔

9۔نظم کارل مارکس کی آواز، میں مغربی نظام معیشت کو علم وحکمت کی مہرے بازی کہا گیا ہے۔

10 ۔اشعار.....مساوات شکم کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو دو دو چار چار روٹیاں برابر تقسیم کی جائیں گی اور انسان حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے گا۔اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ معاشی نظام اس نہج پر ہونا چاہئے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کا معاشی استحصال نہ کر سکے۔ جب خوشہ گندم دہقان کی روزی یا روٹی میں تبدیل ہوتا ہے تو مساوات شکم کی بنیاد پڑتی ہے ۔کیا اسلام کی تعلیم میں یہ سبق موجود نہیں ہے کہ جب تم پیٹ بھر کے کھاؤ تو یہ دیکھ لو کہ تمہارا کوئی ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ ہم مارکسزم کی بنیاد مساوات شکم پر قائم ہے۔مساوات شکم اس کا صرف ایک پہلو ہے جس کو اقبال کے ایک فقرے سے واضح کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے گاندھی جی کو 29 نومبر 1920 میں لکھا تھا" سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے"۔

11 ۔اقبال کا آئیڈیل اسلام تھا۔قرآن اور مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی ان کا انسپریشن اور انقلاب آنے کا پیغام، ان کے تصور انقلاب میں روحانی اقدار کے ساتھ کموزم کے بعض عناصر کی آمیزش ہے۔ان کے فلسفے وفکر کی سب سے بڑی دین ان کا تصور انسان ہے جس کی روشنی سے ان کی شاعری جگمگا رہی ہے۔خود خدا کا بنایا ہوا جہاں اس کو کب کی تابانی سے روشن ہے۔ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔ (فیضان اقبال۔مرتبہ شورش کاشمیری صفحہ 230) ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ "میری نظر میں ایک بڑھئی کے ہاتھ جو آرے کے مسلسل استعمال سے کھردرے ہوگئے ہیں اس دانشور کے نرم و نازک ہاتھوں کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورت اور کارآمد ہیں جس نے قلم کے سوا کوئی دوسرا وزن نہیں اٹھایا"۔

(اقبال پوئٹ فلاسفر آف پاکستان ۔انگریزی۔مرتبہ حفیظ ملک کولمبیا یونیورسٹی پریس، امریکہ)

اقبال کا اسلام ملا کے اسلام سے مختلف ہے۔ شاعر مشرق کو صرف شاعر ملت بنا کر ان کی جدید ذہنی کیفیت (Modernism) کو نظر انداز کرنا خطرناک ہے۔222

سردار جعفری کا مضمون "کمیونزم کی ناکامی" ستمبر 1991ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ افکار (کراچی) سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 میں شائع ہوا ہے۔روس میں کمیونزم پوری طرح درہم برہم ہوگیا۔اس حوالے سے سردار جعفری نے مدلل اور جامع مضمون تحریر کیا ہے۔

مضمون کی ابتداء میں انھوں نے لکھا ہے:

"کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے۔ہمارے ہاں نہیں ۔کمیونزم دراصل ایک تصور ہے بہتر زندگی کا۔جو کچھ سوویت یونین میں تھا وہ کمیونزم نہیں تھا بلکہ کمیونزم کی طرف جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ 1919 میں انقلاب روس نے سامراجی طاقتوں کو

ہلا دیا تھا اور پھر روس ایک نئے نظام زندگی کی طرف گامزن ہوا جس میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ 1924ء کے بعد سے تعمیر شروع ہوئی۔ اس نظام کو بہتر اور زیادہ خوبصورت نظام زندگی دیا۔ بھوک کا علاج کیا۔ موٹی جھوٹی روٹی سب کو ملنے لگی۔ موٹا ہی سہی لیکن کپڑا بھی ملنے لگا۔ تعلیم عام ہوئی اور حفظان صحت کا سب کے لیے انتظام ہوا۔ 223

روس میں کمیونزم کے استحکام کے ساتھ ساتھ جو منفی حالات پیدا ہو رہے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''پارٹی کی جو تنظیم بنائی گئی تھی وہ ژارشاہی دور کی تھی۔ اس میں کمیونزم پارٹی کے ممبروں کو اکثریت کی رائے سے مخالفت کرنے کا حق نہیں تھا۔ تمام اخبارات پارٹی کے تھے۔ اس طرح تحریر اور تقریر کی آزادی پر پابندی کی وجہ سے جو مظالم اس اسٹالنی وفد میں ہو رہے تھے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جا سکی اور چیزیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ ایک جبر اور خوف کا نظام بن گیا اور وہ نظام جو ایک برکت بن کر آیا تھا اپنی سیاسی، تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے لعنت میں تبدیل ہو گیا۔ 224۔

سردار جعفری نے سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی کی وجوہات پر روشنی ڈالی جن میں مغربی طاقتوں اور نیشنلزم کی انتہا پسندی کو شامل بتایا۔

وہ رقمطراز ہیں:

''گورباچوف سوویت سماج کو مغربی سامراجی یلغار سے بچانے میں ناکام ہو گیا اور اس وقت جو بحران ہے وہ اتنا خطرناک ہے کہ سوویت یونین میں خانہ جنگی بھی شروع ہو سکتی ہے اور مغربی طاقتوں کی اس وقت نظر سوویت یونین کی ایٹمی طاقت پر ہے جس کو وہ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح عراق میں انھوں نے ایٹمی طاقت کو تباہ کیا، سوویت یونین میں اس طرح تو نہیں کر سکتے لیکن مغربی سامراجی نیت صاف نہیں ہے اور سوویت یونین اس اعتبار سے کمزور ہو گیا اور روسی آسانی سے اپنی مدافعت نہ کر سکے۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمارے سامنے افلاس، جہالت، بے روزگاری، تعلیم جیسے مسائل ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنے میں ہمیں اپنے آپ کو ان غلطیوں سے بچانا پڑے گا جو سوویت یونین کے دور میں ہوئیں۔ اشتراکی نظام نے جو خواب دیکھے تھے ان میں سے کچھ خوابوں کو سرمایہ داری نظام نے اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ آج خلائی ریاست کا تصور ہے وہ سوشلسٹ نظام کی دین ہے۔ صارفین کی سوسائٹی ایک طرح کا سرطانی مزاج رکھتی ہے۔ سوویت کے اندر جو اقتدار کی کشمکش ہے اس میں گورباچوف کا ہاتھ مضبوط رہے۔ ان کے مقابلے میں جو لیڈر شپ ہے وہ قابل اعتبار نہیں۔ سوویت یونین سے سرخ پرچم کو اتار دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے پر زار کے زمانے کا ترنگا لہرایا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نیشنلزم کی انتہا پسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے''۔ 225

ڈاکٹر تاج پیامی نے جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکیت کی تفہیم کرتے ہوئے سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی پر اظہار خیال کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''جاگیردارانہ نظام میں زمین کے مالک اور اس میں کام کرنے والے مزدور دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جاگیردار مزدوروں کا استحصال کرتا ہے۔ بقول مارکس مزدور جتنا پیدا کرتا ہے اس سے کم استعمال کرتا ہے۔ مارکس کی یہ بات سرمایہ دارانہ

نظام پر بھی لاگو ہوتی ہے۔سائنس اور صنعت کی ترقی کے سبب جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوااور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔دولت سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھوں میں آگئی۔غریب مزدوروں کا ایک بڑا طبقہ اس آرام اور آسائش سے محروم رہا جس سے سرمایہ دار لطف اندوز ہو رہے تھے۔اشتراکیت کی تان دولت کی مساویانہ تقسیم پر ٹوٹتی ہے۔شخصی ملکیت ختم کر کے دولت کی پیدائش سے وسائل کو جماعتی ملکیت بنا دیا جاتا ہے اور ضرورت زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت یا ریاست کے ذمہ ہے۔اشتراکی روسیوں نے روس میں اشتراکی نظم قائم کر کے یہ سمجھا کہ انھوں نے وہاں طبقاتی فرق کو مٹا کر ایک مثالی معاشرہ Ideal society قائم کر دیا ہے۔وہاں نہ کوئی جاگیردار تھا اور نہ کوئی سرمایہ دار لیکن یہاں بھی جب مزدور طبقہ حکمراں بن گیا تو اپنی من مانی کرنے لگا۔اب اشتراکی سوویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا ہے''۔226

سردار جعفری کے مضمون کمیونزم کی ناکامی؟ سے عمر رضا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سردار جعفری کو اشتراکی نظام سے بہت سی خوش آئند اُمیدیں وابستہ ہیں۔

عمر رضا لکھتے ہیں:

مضمون کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بطور نظام سردار جعفری نے کمیونزم کی حمایت کی ہے اور اس کی رحمتوں پر آمنا وصدقنا کیا ہے لیکن اسکے استعمال کرنے والوں پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو عنوان قائم کیا ہے،اس میں ابہام اور استفہام پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔کمیونزم کی ناکامی کے بعد سوالیہ نشان اور مضمون کی ابتداء میں ہی یہ لکھنا کہ کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے،ہمارے یہاں نہیں اور تمام باتوں کے بعد مضمون کے آخر میں یہ کہنا کہ ''نیشنلزم کی انتہا پسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے''اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اشتراکی نظام سے سردار جعفری کی بہت سی خوش آئند امیدیں اب بھی وابستہ ہیں جس میں انھیں ایک بہترین سماج کی تعبیر نظر آتی ہے''۔227

سردار جعفری کمیونزم کے زبردست حامی رہے ہیں اور اخیر دم تک انھوں نے اس کی حمایت کی ہے۔عمر رضا نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''مناسب معلوم پڑتا ہے کہ اس اہم نظریے پر بھی مختصراً غور کرتے چلیں تا کہ اس بات کی قدرے وضاحت ہو جائے کہ اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے باعث سردار جعفری اس نظریے سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں۔خصوصاً ایسے وقت میں بھی انھوں نے اس کا دامن نہیں چھوڑا جب روس میں اس کا عملی نمونہ ناکام ہو گیا تھا۔228

کمیونزم کی تفہیم کرتے ہوئے عمر رضا لکھتے ہیں:

1) کمیونزم، مارکسزم نظریہ کے فکر کی پیداوار ہے جو انسان اور انسانی سماج کے تاریخی واقعات و حالات جاننے اور انہیں بہتر بنانے کے اصولوں کو بتاتا ہے۔دونوں (مارکس اور اینگلز) نے انسانی سماج کے موجودہ ڈھانچے پر کافی غور و فکر کیا اور وہ اس میں مستقل مستغرق رہے کہ معاشرہ بدلتا کیوں ہے؟ مستقبل میں اور کیا تبدیلیاں آسکتی ہیں۔لینن نے اکتوبر 1917ء میں زار روس میں محنت کش عوام اور غریب کسانوں کی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی چین کے ماؤسی تنگ، ویت نام کے ہو چی منہ اور کیوبا کے چی گوارا وغیرہ نے مارکس کے نظریے کو عام کیا جو رفتہ رفتہ مارکسزم کے نام سے مشہور ہو گئی۔

2۔ کارل مارکس کا ماننا تھا کہ آج تک تمام انسانی سماج کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے اور اس نظریے کا بنیادی

خیال یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک دنیا کے ہر سماج کا ڈھانچہ اقتصادی بنیاد متعین کرتا ہے اور اس سماج میں رہنے والے تمام لوگوں کا طرز فکر و عمل اسی بنیاد پر بنتا ہے اور ہر سماج کی تاریخ کے اقتصادی بنیاد میں تبدیلیوں کی وجہ سے مبنی بگڑتی ہے۔علاوہ ازیں مارکس نے یہ بھی کہا ہے کہ طبقاتی اختلاف کی بنیاد ذرائع پیداوار کا ذاتی ملکیت ہونا ہے اور استحصال اس کی شاخیں ہیں جب تک یہ بنیاد جڑ سے نہیں اکھاڑی جائے گی، استحصال کا عمل جاری رہے گا اور طبقاتی اختلاف کا وجود برقرار رہے گا۔

3۔ مارکس نے کافی غور و فکر کے بعد اب تک کے سماج کے بارے میں یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ابتداء میں یہ سماج قبائلی (Trible era) تھا۔اس کے بعد غلامی کا دور آیا، غلامی کے دور کے بعد جاگیرداری نظام (feudalism) قائم ہوا۔ جاگیرداری نظام کے بعد جدید سرمایہ دارانہ نظام (capitalism) قائم ہوا جس کی ابتداء انگلینڈ سے ہوئی تھی جسے مارکس نے بورژوا جمہوری سماج سے تعبیر کیا تھا۔سامراجیت (imperialism) کو آخری نظام بتایا۔مذکورہ تمام نظاموں میں اس نے استحصال کے عمل دخل کی نشاندہی کی جس کے خاتمہ کے بعد ہی سوشلسٹ جمہوریت، کے قیام کی بات کہی جس میں رفتہ رفتہ اشترا کی نظام کا عمل دخل ناگزیر ہے۔اس میں پیداوار خواہ زراعتی ہو یا صنعتی، استحصال کے لیے نہیں کی جائے گی بلکہ انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہوگی۔ذاتی جائیداد، نجی ملکیت اور دولت جمع کرنے کو اس استحصال کی بنیاد قرار دیا۔مارکس کا ماننا تھا کہ جتنے بھی قدرتی وسائل ہیں ان پر تمام انسانوں کا برابر حق حاصل ہونا چاہئے۔لہٰذا وہ کسی ایک کی جائیداد یا جاگیر بن کر نہیں رہ سکتے بلکہ اس سے سبھی کو فائدہ پہنچنا چاہئے تب ہی دنیا سے عدم مساوات، طبقاتی کشمکش اور استحال کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ جسے سوشلسٹ نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

4۔سوشلسٹ نظام کے متعلق ظفر امام لکھتے ہیں:

''سوشلسٹ نظام سے مراد وہ سماج ہے جہاں اشیاء کی پیداوار کے ذرائع اور پیداوار کی تقسیم اور مبادلہ کے تمام ذرائع ذاتی ملکیت میں نہ ہوں بلکہ پورے سماج کی ملکیت میں ہوں۔چنانچہ اس نظام کی سب سے اہم اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اشیاء کی پیداوار کے تمام ذرائع کا مالک چند ایک سرمایہ داروں کے بجائے سماج کا ہر فرد ہوتا ہے۔اشیاء کی پیداوار محض ذاتی منافع کمانے کا وسیلہ نہیں رہتی بلکہ یہ منافع سارے سماج کی مادی زندگی کو بہتر بنانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ایسے سماج میں دوسروں کی محنت پر صرف چند لوگوں کے پلنے کی گنجائش نہیں رہتی۔نہ کوئی سرمایہ دار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مظلوم اور بے آسرا۔سماج کا ہر فرد مل جل کر اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔229

5۔مارکس نے جس کمیونسٹ نظام کا خواب دیکھا تھا، اسے حقیقی شکل دینے کے لیے اس نے سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے اور اس کے بعد سوشلسٹ نظام کے قیام کی بات کہی تھی جس کے ذریعہ ایسے سماج کی تشکیل کرنا مقصود تھی جس کی بنیاد ٹھوس اقتصادی بنیادوں پر تھی اول: ذرائع پیداوار کا ذاتی ملکیت نہ ہونا۔دوم تعلقات پیداوار میں ہم آہنگی۔اس کا ماننا تھا کہ سیاسی اقتدار محنت کش عوام کے ہاتھ میں آتے ہی سوشلسٹ نظام خود بخود قائم ہوجائے گا۔اسے پہلا اور ابتدائی قدم کہا ہے۔اس نظام کی تعمیر سے پہلے اس نے ایک عبوری دور کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مارکس اور لینن دونوں نے محنت کش عوام

کی آمرانہ حکومت (Dictatoriship of the protiteriat) قائم کرنے پر زور دیا ہے تا کہ محنت کش عوام اپنے سیاسی اقتدار کا استعمال کرتے ہوئے سابقہ فرسودہ نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی تمام نشانیوں اور اس کے مضر اثرات کو ہمیشہ ہمیسہ کے لیے ختم کر دیں اور نئے ابھرتے نظام کی تمام نشانیوں اور اس کے مضر اثرات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور نئے ابھرتے نظام میں کسی بھی طرح کے سرمایہ دارانہ تضادات باقی نہ رہ جائیں۔ سوشلسٹ نظام کی تعمیر میں طاقت کا استعمال اصولاً غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ تمام ذرائع پیداوار کا سماج کی ملکیت میں آجانا اور اس نئے سماج کے اندر طبقاتی کشمکش کا مفقود ہو جانا دراصل سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کی تعمیر کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تعمیری دور میں سب سے پہلے محنت کش عوام کی مادی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ جس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اس نظام میں مساوات یہ ہے کہ ہر فرد سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی محنت کے تناسب سے معاوضہ دیا جائے۔

6۔ لیکن یہ نظام جب اپنی ساخت اور بناوٹ کی بناء پر بلا کسی اقتصادی بحران کے تیزی کے ساتھ بتدریج بہتر ہوتا جائے اور اشیاء کے ذرائع پیداوار میں مستقل ترقی و توسیع ہوتی رہے نت نئے سائنسی ایجادات اور تکنک کا استعمال بڑھتا جائے، عوام کی معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا معیار بلند ہو، ہر فرد کو پہلے سے بہتر بننے کے وسیع تر مواقع ملنے لگیں، پورے سماج میں ہنر مند وغیر ہنر مند، جاہل و تعلیم یافتہ، بے کار اور با کار کی تفریق کسی حد تک ختم ہو جائے تو جلد ہی ایک ایسا دور آجائے گا جہاں اشیاء کے پیداوار کی تقسیم کو مقررہ مقدار اور معیار تک محدود رکھنا بے معنی ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہر فرد کے لیے اپنی تمام تر ضروریات کو پورا کرنے کی وافر آسانیاں حاصل ہو جائیں گی وہ اپنی ضرورت کے مطابق ہر ایک چیز سماج سے بہ آسانی حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی تمام اشیاء کی پوری پیداوار اور ان کی تقسیم کا قانون اب تبدیل ہو کر یہ ہو جائے گا کہ ہر فرد سے اس کی اہلیت کے مطابق کام لیا جائے جس کے عوض اس کی تمام ضروریات پوری کی جائیں۔ یہی سوشلسٹ نظام کے ارتقاء کی ایک بلند تر اور نئی منزل کمیونزم ہے۔230

روس میں اس نظام کا تجربہ ہوا اور ایک زمانے میں وہاں کمیونزم اپنے بال و پر مضبوط کر رہا تھا۔

1971ء میں ظفر امام نے اس سلسلہ میں لکھا تھا:

سوویت روس میں 1917ء کے بعد 1961ء تک سوشلسٹ نظام کی بنیادیں پورے طور پر مضبوط ہو چکی ہیں اور یہ نظام کم و بیش اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں 1961 کے بعد کمیونسٹ نظام کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

چنانچہ آج سوویت روس کمیونسٹ نظام کی تعمیر میں مشغول ہے۔ یہ یقین ہے کہ اس صدی کے ختم ہونے تک اس تعمیر کا کام مکمل ہوگا۔ پھر اس نئے نظام کے بارے میں ہم پوری واقفیت حاصل کر سکیں گے۔231

عمر رضا نے 1991 میں اس نظام کے ناکام ہو جانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

"لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور 1991 میں یہ نظام پوری طرح درہم برہم ہو گیا جس کے مختلف اسباب بیان

کیے جاتے ہیں۔

اول: وہاں انفرادی آزادی ختم ہوگئی۔دوئم: پرولتاری ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی تھی جس سے یہ نظام برکت کے بجائے جبر اور خوف کا نظام بن گیا تھا۔بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا لیکن بباطن معاشی طور پر روس کھوکھلا ہوتا گیا جس سے عوام میں معاشی آسودگی کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔علاوہ ازیں علاقائی نیشنلزم نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا جسے مغربی سامراجیت نے مزید ہوا دے رکھی تھی۔نتیجتاً ایک خاص وقت کے بعد یہ نظام ناکام ہوگیا۔

یہ تھا کمیونزم کے بارے میں ایک مختصر سا تعارف، اس کے ارتقاء سوویت روس میں عروج اور زوال کے اسباب۔اب اس کے بعد دیکھیں کہ ان تمام واقعات کے باوجود سردار جعفری کو اس نظام میں انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکل آنے کی قوی امید کیوں کر وابستہ رہی ہے۔اس پر عمر رضا نے روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔سردار جعفری اس نظام (کمیونزم) کے کٹر حمایتی ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی کے اخیر لمحوں تک اس کا خواب دیکھا اور انہیں اس بات کا کامل یقین رہا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جہاں ادنی اور اعلیٰ کی تفریق ختم ہو جائے گی۔اگر چہ روس میں اس کا زبردست تجربہ ہوا۔

2۔علی سردار جعفری ایک سیاسی مزاج رکھتے تھے اور وہ کسی بھی نظریے پر یونہی عمل پیرا نہیں ہوتے تھے بلکہ بدلے ہوئے حالات کے تحت کسی بھی نظریے کو قبول کرنے میں یقین رکھتے تھے۔7 جون 1991 کو انھوں نے سوویت نظام کے ابتدائی دور میں ہی جس طرح کے منفی کردار در آنے لگے تھے، علاوہ ازیں وہاں جس طرح کی افسر شاہی حاوی ہوگئی تھی، اس کی سردار جعفری نے سخت نکتہ چینی کی تھی اور اس بات کی بھی نشاندہی کی تھی کہ اس زمانے میں سوویت انتظامیہ کی ادبی وثقافتی پالیسی کے خلاف ادیبوں اور دانشوروں میں کسی طرح کا احتجاج پایا جاتا تھا۔اس انٹرویو میں انھوں نے صاف طور پر کہا تھا:

مارکسزم کوئی کلیہ نہیں ہے۔یہ ایک سائنس ہے۔چنانچہ کمیونسٹ مینی فسٹو کی اشاعت کے بعد سے اب تک حالات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ہمیں مارکسزم کے اصولوں کی تفسیر ان ہی بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں کرنی ہوگی۔

ہمارے درمیان دو طرح کے ادیب تھے۔ادیبوں کا ایک گروہ تو وہ تھا جو ادب کی تخلیق میں ہمہ تن اور پوری یکسوئی سے مصروف تھا اور دوسرے گروہ میں جن کے درمیان میں خود کو بھی شامل کرتا ہوں وہ ادیب تھے جن کی وابستگی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھی اور جو کہانیاں لکھنے اور ادب تخلیق کرنے کے علاوہ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔232

3۔ سردار جعفری ادبی زندگی کے آخری مرحلے میں بھی ادب کو سیاست سے الگ نہیں کر پائے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس پارٹی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے اور اس کے مطابق انھوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔خاص طور سے وہ کمیونسٹ پارٹی کے بہی خواہ تھے، درمیان میں کچھ ان بن ضرور ہوگئی تھی لیکن پھر وہ اپنے پرانے نظریات کو قدرے معتدل انداز میں قبول کرنے لگے تھے۔یہی وجہ ہے کہ روس کے ابتدائی سوشلسٹ نظام سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔اس سے اثر پذیری کا عالم یہ تھا کہ روس میں کمیونزم کی ناکامی کے باوجود وہ اس کا خواب اخیر تک سجائے رکھے۔کیوں کہ بقول ان کے

خواب کبھی پورے نہیں ہوتے، پیغمبروں کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو خواب دیکھتے رہنا چاہیے۔اس سے زندگی میں بہتری کی صورت نکلتی ہے۔اگر تمہارے کچھ خواب ہیں، زندگی میں کچھ مقاصد ہیں تو انھیں تازہ رکھو اوران کے حصول کی جدوجہد کرتے رہو۔خواب تمہیں پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں۔ان سے تمہاری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا ہوگا۔

4۔سردار جعفری نے روس میں کمیونزم کی ناکامی کا اعتراف تو کیا ہے لیکن ہندوستان میں اسے وہ ناکام نہیں بتاتے بلکہ اس کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہنے کی وہ صلاح دیتے ہیں کیونکہ انھیں یہ کامل یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکل آئے گی جو صرف اور صرف کمیونزم میں مضمر ہے۔یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری کی ادبی وفکری جمالیات انھیں خیالات سے مبنی اور بگڑتی نظر آتی ہے۔233

علی سردار جعفری نے غالب کو مشترکہ تہذیب کی علامت قرار دیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''غالب جو انیسویں صدی کی مشترکہ تہذیب کی ایک شان دار علامت تھے۔1827ء میں جب وہ تیس برس کے تھے کلکتہ گئے۔اس وقت بطور شاعر انھیں شہرت مل چکی تھی۔غیر معمولی فہم وفراست اور ماورائی دوراندیشی سے بہرہ مند اس شاعر کی نظروں میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔مثالی انسان کا ان کا تصور ان کی شاعری میں جگہ جگہ عیاں ہے۔ایک فارسی نظم میں انھوں نے ناقابل تقسیم انسانیت کا اپنا تصور پیش کیا ہے۔234

جاوید اختر کے پہلے مجموعہ کلام ''ترکش'' تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے ایک مضمون ''شہری کلچر کا پہلا شاعر'' سہ ماہی بزم فکروفن، ممبئی اکتوبر 1996ء میں شائع ہوا سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں شامل کلام میں ناچتی گاتی نہایت مترنم بحرین کم ہیں اور ایسی بحرین زیادہ ہیں جو گفتگو کی سطح پر اپنا جادو جگا سکیں اور نثر سے قریب تر رہیں۔

جاوید اختر کے پہلے مجموعہ کلام ''ترکش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ترکش کی شاعری کلچر کے علاوہ عصر حاضر کے کرائسس کی جھلک رہی ہے۔جو لہجے اور ڈکشن میں بہت نمایاں ہے۔اکثر وبیشتر دنیا کی عظیم ترین اور حسین ترین شاعری کرائسس کی آغوش میں پلی ہے۔تاریخ کا کوئی دور اس سے خالی نہیں ہے۔جاوید اختر نے ایک مصرع میں اپنے عہد کو سمیٹ لیا ہے۔وہ عصر حاضر کے کرائسس میں حوصلہ منداور سربلند ہے۔قتل وغارت گری کے اندھیرے میں یہ اشعار روشنی کی کرنوں کی طرح چمکتے ہیں۔

2۔جاوید اختر کی شاعری میں شہری زندگی اور آج کا اربن کلچر پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔تیشہ وسنگ وآہن کے بنے ہوئے ان شہروں میں ہر انسان ہجوم میں رہتے ہوئے بھی بے انتہا تنہا ہے، اور مکمل طور سے بے گانہ پن کا شکار ہے۔یہ سرمایہ داری نظام کا تحفہ ہے جو Alienation صنعتی انقلاب کی برکتوں کا پروردہ ہے۔آج کا شہر زیادہ سفاک ہے، کسی کو کسی پر رحم نہیں آتا۔تجارتی مقابلہ آرائی میں لوگ زیادہ سے زیادہ سنگ دل ہو گئے ہیں۔

3۔ایک اور قابل ذکر نظم ''الجھن'' ہے۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ شہر کی اس بھیڑ بھاڑ میں یا تو دوسروں کو کچل کر آگے

بڑھ جاؤیا پیچھے آنے والے تم کو کچل دیں گے۔ان کے برعکس ایک اور نظم ہے وہ کمر ہیا دآتا ہے۔اس شائستہ تہذیب کی علامت ہے جواب زیبِ طاق نسیاں ہو چکی ہے۔یہ مجموعہ اس اعتبار سے عصر حاضر کی دستاویز بھی ہے کہ اس میں فسادات اور ان سے ملتے ہوئے موضوعات پر اچھی اثر انگیز نظمیں شامل ہیں۔آخر میں یہ کہنا کہ میرے نزدیک اردو شاعری میں جاوید اختر شہری زندگی اور اربن کلچر کا پہلا شاعر ہے۔شہری اور مشینی کلچر کی جھلکیاں میری اور کیفی کی شاعری میں بھی مل جائیں گی۔ندا فاضلی اور دوسرے نوجوان شعراء کے یہاں بھی شہری زندگی سے متعلق نظمیں ملیں گی۔لیکن ہم اور وہ شہری کلچر سے اس طرح وابستہ نہیں ہیں جیسے جاوید اختر ،عینی نے ان کو بجا طور سے پاپ کلچر کا معمار کہا ہے۔235۔

بہار قانون ساز کونسل کے شعبہ اردو کی جانب سے 1997ء میں دو سو سالہ تقریبات غالب کا اہتمام کیا گیا۔جابر حسین کی خواہش پر علی سردار جعفری نے ''غالب کا سومنات خیال'' کے زیر عنوان مقالہ تحریر کیا جس میں غالب کی مثنوی ''چراغ دیر کا ترجمہ شامل ہے۔کتابی شکل میں اسے اردو مرکز عظیم آباد پٹنہ نے 1997ء میں شائع کیا۔

اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

بنیادی طور پر یہ مقالہ غالب کی مثنوی چراغ دیر کے ترجمے سے پہلے ایک نوٹ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سردار جعفری نے اس مثنوی کی شان نزول بیان کی ہے۔شان نزول بیان کرنے کے لیے انھوں نے جو فضا قائم کی ہے اس سے ان کے اس عہد کے شعری طریقۂ کار اور نظریۂ ادب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مثلاً غالب کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے انھوں نے جو باتیں کہی ہیں اس سے ان کے نظریہ ادب کی عکاسی ہوتی ہے جس میں جلال و جمال کے توازن پر زور دیا گیا ہے۔

2۔سردار جعفری نے اس بات کی بھی تشریح و توضیح کی ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا تھا؟اس کے لیے انھوں نے ریاست گجرات کے کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں سومنات کے مندر کا ذکر کیا ہے جسے 1024ء میں محمود غزنوی نے لوٹ لیا تھا جس سے ہندوؤں کے دل پر ایک گہرا زخم ابھر آیا تھا جس پر بقول سردار جعفری صوفیوں اور شاعروں نے مرہم رکھا اور ایک بڑی عبادت گاہ کی حیثیت سے اس کا ذکر کعبے کے ساتھ کیا(غالب کا سومنات خیال صفحہ 21)۔غالب نے اسے اپنی شاعری کا سومنات خیال کہہ کر جو وقار بخشا ہے وہ سردار کے لیے قابل توجہ ہے اور سردار جعفری نے اسی کو مقالے کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:''غالب نے اس عبادت گاہ کو اپنی شاعری کا سومنات خیال کہہ کر اس کو صوفیانہ فکر کے دائرے سے بھی باہر نکال لیا اور ایک نیا وقار عطا کیا ہے۔اس میں عقیدے کا دخل نہیں ہے۔بلکہ ایک غیر مذہبی فکر کی کارفرمائی ہے۔(غالب کا سومنات خیال،ص 21)غالب نے اپنی شاعری کو جس انداز میں سومناتِ خیال سے تعبیر کیا ہے اس پر مزید جستجو کرتے ہوئے سردار جعفری نے انیسویں صدی (اگر چہ کتاب میں اٹھارویں صدی تحریر ہے لیکن یہ کمپوزنگ کی غلطی نظر آتی ہے) کے وسط تک ہندوستان کی فضا کو فرقہ وارانہ کشمکش سے پاک بتلایا ہے جس کے لیے انھوں نے بطور خاص دہلی کا ذکر کیا ہے جہاں غالب قیام پذیر تھے۔غالب کے حلقہ احباب میں جس طرح مسلمانوں کے علاوہ ہندو برادران بھی شامل تھے۔مثلاً ان کے عزیز ترین شاگرد ہرگوپال تفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جس طرح کے تہذیبی روابط تھے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔علاوہ ازیں قلعہ معلّٰی میں دیوالی اور دسہرے کا اہتمام،نظام الدین اولیاء کے مزار پر ہر سال بسنت کا تہوار منایا جانا،جس کا

سلسلہ ہنوز جاری ہے اور پھولوں والوں کی سیر وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔غرض انیسویں صدی کے وسط میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس طرح کی مشترکہ تہذیب کوفروغ دیا تھا جس سے ہندوستانی معاشرے میں بھائی چارگی اورامن وامان قائم تھا،اس کی روشنی میں سردارجعفری نے غالب کے سومنات خیال کوتلاشنے کی سعی کی ہے۔غالب نے ایک غیرایرانی استعارہ سومنات خیال،تخلیق کیا تھا۔بقول سردارجعفری میرا قیاس ہے کہ جب غالب نے اپنی شاعری کوفارسی شعرا کی شاعری سے الگ کرنے کی کوشش کی تو اس کے لیے ایک ایسا غیرایرانی استعارہ استعمال کیا جس میں ان شاعرانہ پیکروں کوآراستہ کرنے کی گنجائش ہو۔اس لیے سومنات خیال سے بہترکوئی دوسرا استعارہ ممکن نہیں تھا۔

(علی سردارجعفری،غالب کا سومنات خیال،مرتبہ جابرحسین،ص23)

2۔غالب کوجس قدرایرانی فارسی شاعری سے محبت تھی اسی قدر اپنے وطن ہندوستان سے بھی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کوسومنات خیال کہا ہے جس کی دلکش مثنوی چراغ دیر ہے۔غالب نے یہ مثنوی چوں کہ سفر کلکتہ کے دوران تخلیق کی تھی اس لیے سردارجعفری نے دلی سے کلکتہ کے سفر کی مختصر داستان بھی بیان کی ہے جو بنیادی طور غالب نے موروثی پنشن کے قضیہ کوحل کرنے کے لیے کیا تھا۔

3۔اس عہد کی ابتداء میں سردارجعفری کے شعری وفکری اظہار میں جوصحت مند تبدیلی آئی اور جس طرح سے وہ اعتدال اورتوازن کواہمیت دینے لگے تھے،اس پر اب وہ نہ صرف یہ کہ قائم ودائم نظر آتے ہیں بلکہ اس کی توسیع بھی کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی ان کی شاعری بھی جلال وجمال کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔236

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کے بارے میں علی سردارجعفری نے لکھا ہے:

''جگن ناتھ آزاد کوشاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہا۔اس نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اورنکھارا ہے اوراس میں اپنے خون جگر کا اضافہ کیا ہے۔اس کی شاعری میں ماضی کی بہترین فنی روایات، نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔آزاد کا موضوع دکھیا انسانیت اوراس کی تمنائیں ہیں،اس کے ہرہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس ہے جس نے اس کی شاعری کوگمبھیر بنا دیا ہے۔لیکن اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش نے اس کی شاعری میں تڑپ اورحوصلہ مندی پیدا کی ہے۔اس لیے اس کی شاعری ایک زخمی دل کی پکار ہی نہیں بلکہ عہد حاضر کے انسان کی للکار ہے۔کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ درد،تپش،امنگ اورحوصلہ مندی کے امتزاج نے اس کی شاعری کوبہت خوشگوار بنا دیا ہے۔237

سردارجعفری کا مضمون ''میرا نغرہ روٹی اور کتاب ہے'' اردو دنیا جولائی 1998 میں شائع ہوا اردو شاعری کی اہمیت اور وسعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی سردارجعفری رقمطراز ہیں:

اردو نہایت خوبصورت اور دل آویز زبان ہے۔اس کے ہزار بارہ سو کلاسیکی اشعار میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معانی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع،ہر محفل،ہر کیفیت،ہر مزاج کا شعر زبان پر آجاتا ہے اور انسانی جذبات کی کہکشاں میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کرلیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

میری گرفتاری پر اس طرح صادق آئے ہیں جیسے اس موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور اقوام کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بے گانگی کا انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔اس کے پاس صوفیانہ روایت کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیاوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے۔شیخ ،ناصح ،واعظ،زاہد،محتسب،ملا اور اس قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ان کی تنگ نظری،انتہاپسندی،ظاہرداری،مکاری اور خودپسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ان کے تصور مذہب اور تصور جنت و دوزخ،عذاب وثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ان کے مقابل پرندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جن کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔خدا تک پہنچنے کے لے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔سب سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں۔238

دیباچے اور تبصرے

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلے میں ان کی تصانیف اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے لکھے دیباچے اور پیش لفظ کو بھی دیکھنا ہوگا۔

ذیل میں ان کے لکھے چند دستیاب دیباچوں اور پیش لفظ کا مطالعہ پیش خدمت ہے:

سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' کا دیباچہ 16 نومبر 1947ء کو لکھا تھا۔اس میں آزادی کے بعد ہونے والے خونی فسادات اور خانہ جنگی کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر کیا۔اسکے بعد ادیبوں کو اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے کہا۔

ہمیں ادیبوں کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ادیب جاگ رہے ہیں اور وہ اس وحشت،درندگی اور روح کے گھٹنے پن کو محسوس کر رہے ہیں جس نے ہندوستانی زندگی کو روک لگا دیا ہے۔بمبئی کے ادیبوں اور فن کاروں نے امن جلوس نکالا۔پاکستان کے ادیب اپنی کانفرنس کر رہے ہیں،لیکن اکثریت کی زبانیں ابھی گنگ ہیں۔ان کے قلم خاموش ہیں۔جہاں تک مجھے معلوم ہے اوپندر ناتھ اشک،عصمت چغتائی،احمد عباس،کیفی اعظمی،یوسف ظفر، فکر تونسوی اور کرشن چندر کے علاوہ کسی ادیب نے فساد پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔اب تک جو لکھا گیا ہے وہ بہت اچھا ہے،لیکن کافی نہیں ہے۔یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر ہے۔غنڈوں کے چھرے قلم سے زیادہ تیز چل رہے ہیں۔ان کی بندوقوں کی آوازیں،شاعروں کی آواز سے زیادہ بلند ہیں۔انسانی خون کا سیلاب ان ادب پاروں کو بہا لے جائے گا۔ہمیں ابھی اتنی

کتابیں لکھنی ہیں کہ ہم ان کے ڈھیر سے بند باندھ سکیں، پشتے بنا سکیں۔اس کو ہنگامی ادب کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئی ہیں اور شعر و فن کے چشمے خشک ہو گئے ہیں۔آج چالیس کروڑ ہندوستانی اور پاکستانی ایک ایک ادیب اور ایک ایک شاعر کو نام لے کے آواز دے رہے ہیں۔تم نے ہمارے گونگے جذبات کو زبان عطا کی تھی، آؤ اور ہمارے دلوں کے نئے زخم دیکھو، اپنے چاروں طرف مڑ کر دیکھو، تمہیں بے شمار سہمی ہوئی آنکھیں نظر آئیں گی۔سنو ہمارے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر کون سے لفظ تڑپ رہے ہیں۔ہمارے سینوں میں کیسے نعرے جکڑے ہوئے ہیں جو نکل آنے کے لیے بے تاب ہیں۔تم ان گیتوں کو گا سکتے ہو ہم گانا چاہتے تھے اور نہیں گا سکے۔تم ان کہانیوں کو سنا سکتے ہو جو لہولہان ہو گئی ہیں۔ان ادھورے خوابوں کو پورا کر سکتے ہو جن کے تار و پود بکھر گئے ہیں۔239

سردار جعفری نے سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعہ ''چغد'' کا دیباچہ اپریل 1948ء میں لکھا۔سردار جعفری نے بتایا کہ ''منٹو کی افسانہ نگاری ہندوستان کے درمیانی طبقے کے مجرم ضمیر کی فریاد ہے۔اسی لیے منٹو اردو کا سب سے زیادہ بدنام افسانہ نگار ہے اور وہ بدنامی جو منٹو کو نصیب ہوئی ہے، مقبولیت اور شہرت کی طرح صرف کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔اس کے لیے فن کار میں اصلی جوہر ہونا چاہئے اور منٹو کا جوہر اسکے قلم کی نوک پر نگینے کی طرح چمکتا ہے۔

منٹو کے کرداروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

منٹو نے ان کرداروں کی تصویر کشی کی ہے جن سے سرمایہ داری نظام نے ان کی انسانیت چھین لی ہے۔یہ سب پہلے بھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی لیکن اس سماج نے جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے، ان سب کو جانور بنا دیا ہے۔وہ جانور جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن پھر بھی انسان نہیں ہیں۔منٹو جھنجھلا جاتا ہے۔وہ ان کی روح کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے سینوں کے اندر انسانی دل دھڑک رہے ہیں۔240

منٹو نے اپنے افسانوی مجموعہ ''چغد'' میں اصلی دشمن کو پہچان کر گولی مارنے کی بات کہی تھی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''منٹو کو یہ نہیں معلوم کہ اس کا پستول اس کا قلم ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وار گولیوں سے بھی زیادہ کارگر ہے۔241

سردار جعفری نے منٹو کی اس صلاحیت کا ذکر کیا جس سے وہ سماج کی گندگی سماجی اور سیاسی مظالم کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

منٹو نے سماج کی گندگی کو دیکھا ہے۔وہ انسانوں سے محبت کرتا ہے، اس میں سماجی اور سیاسی مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی قوت ہے۔وہ ترقی پسند قبرستان، میں سرمایہ دار سماج کے خلاف بڑا تلخ طنز کر سکتا ہے۔242

سردار جعفری نے اپنی تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا پیش لفظ لکھا ہے۔

اس میں سردار جعفری نے اس نظم کے تعلق سے وضاحت کی:

یہ ایک منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اسکے کردار کردار نہیں بلکہ صرف علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں صرف مبہم سا خاکہ ہے جسے میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور وہ نئی دنیا کی علامت ہے اور اس کی معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔243

مذکورہ بالا بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری نے اپنے اس بیان میں اپنی اس تخلیق پر جو روشنی ڈالی ہے اس کی معنویت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ منظوم ڈرامہ نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے کیونکہ بیشتر سنجیدہ اور معنی آفریں ڈراموں میں احساسات، تاثرات اور داخلی کیفیات خارجی واقعات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں اور واقعات اور کرداروں کی علامتی معنویت یا ان میں ایک علامتی بعد تو دنیا کے اہم ترین ڈراموں کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔244

اپنے پیش لفظ میں سردار جعفری نے اس تخلیق کے مرکزی موضوع اور وزن کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کو شکست ہوئی ہو، افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی لیکن انسان نا قابل شکست ہے کیوں کہ اس کی محنت عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ اس کے ماحول کی بھی خالق ہے اور یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے اور میں اسے ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں، سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ عظیم المرتبت سب سے زیادہ حسین انسان ہے۔245

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی تخلیق ''نئی دنیا کو سلام'' کو تمثیلی نظم تسلیم کرنے سے اختلاف کیا ہے اور اس تجریدی قسم کا منظوم ڈرامہ قرار دیا ہے۔

ان کے دلائل کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

سردار جعفری نے اس تخلیق کو تمثیلی نظم کہا ہے اور ان کے بعد ہر قسم کے نقاد بھی اسے تمثیلی نظم ہی کہتے رہے ہیں۔ اس لیے میرا کام کچھ دشوار ہو گیا ہے اور مجھے یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ یہ ایک تمثیلی نظم نہیں بلکہ تجریدی قسم کا منظوم ڈرامہ ہے جس کی علامتی معنویت بھی اہم ہے اور اس سلسلہ میں میں صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گی۔

1) سب سے پہلے تو یہ کہ اسے اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے اور کیا جا چکا ہے یعنی خود میں اس کے چار مناظر کو ڈرامے کے طور پر اسٹیج پر پیش کر چکی ہوں اور اس پیشکش میں مریم کا رول بھی میں نے خود ہی ادا کیا تھا۔

2۔ دوسرے یہ کہ اس تخلیق کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ایک ڈرامے کے لیے لازمی ہیں۔ یعنی ایک مربوط کہانی اور ڈرامائی قسم کے مانوس کردار جن کی علامتی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن وہ حقیقت کی کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ اس ڈرامے کی کہانی جاوید اور مریم کی شادی اور رومانس سے شروع ہو کر مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اور وسیع تر مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی جاوید کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔

3۔ اس ڈرامے میں چار ایسے کرداروں یعنی جاوید، مریم، فرنگی اور نامہ بر کے علاوہ جو ڈرامے کے ایکشن میں براہ

راست حصہ لیتے ہیں، چار نیم ڈرامائی کردار یعنی ''زندگی، موت، وقت، اور تاریخ بھی ہیں جو مجرد تصورات کی ڈرامائی تجسیم ہیں۔ یہ علامتی کردار ڈرامے کے ایکشن میں براہِ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ اس کے بنیادی اور مرکزی تصورات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے ترانے اور منظوم بیانات ڈرامے کے ایکشن کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے ان نیم ڈرامائی کرداروں کو بھی اس ڈرامے کے کورس سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس کو اس کی مناسب اور تخیل آفرین پیشکش ڈرامے کی معنویت اور اثر انگیزی میں اضافہ کر سکتی ہے۔ نئی دنیا کو سلام، کورس کی نوعیت سمجھنے کے لیے ہمیں جدید منظوم ڈرامے پر نظر ڈالنی ہوگی جس کا احیا انگلستان اور امریکہ میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا۔ اس دور کے منظوم ڈراموں میں کورس کا استعمال کافی تخیل آفریں انداز سے کیا گیا جس کی ایک تابناک مثال ایلیٹ کے شہرہ آفاق ڈرامے 'مرڈران دی کیتھڈرل'' یعنی کلیسا میں قتل کا کورس ہے۔ مختصر یہ کہ نئی دنیا کو سلام میں کورس کی شمولیت اس کی ڈرامائیت میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اسے جدید تجریدی ڈرامے کی صنف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

4۔ اب رہا حرفِ اول اور حرف آخر کا سوال تو اسے انگریزی زبان میں Prologue اور Epilogue کہا جا سکتا ہے اور یہ اگر ڈرامے کا لازمی حصہ نہیں تو ایک جائز حصہ تو ضرور ہیں اور نئی دنیا کو سلام میں یہ دونوں منظوم بیانات خوبصورت اور معنی خیز ہیں۔ حرف اول ڈرامے کی پیشکش کے لیے ایک مناسب فضا تشکیل کرتا ہے اور حرف آخر اس کے مرکزی خیال کو نہایت اختصار اور قطعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ان اشاروں کے بعد جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی دنیا کو سلام ایک جدید منظوم ڈراما ہے سردار جعفری نے اس ڈرامے کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جنھیں انھوں نے تصویر میں کہا ہے۔ مثلاً پہلی تصویر، دوسری تصویر وغیرہ۔ لیکن ہم انھیں منظر کہیں گے، اور کیوں کہ ڈرامے کی بنیادی اکائی ایک متحرک منظر ہے۔ حرف اول میں ڈرامے کے پس منظر اور صورت حال کے المناک پہلو ان کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا گیا ہے اور یہ ظلم، دہشت، بربریت، عوامی استحصال، بے بسی، بے کسی اور اخلاق کنفیوژن کا منظر نامہ ہے۔

5) میرے خیال کے مطابق اس ڈرامے کا طرز اظہار علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ وضاحتی بھی ہے۔ ایک علامتی اور وژنری ڈرامے کی حیثیت سے اس کی معنویت کی کئی سطحیں ہیں جو اس کی ساخت میں پیوست اور شعری اسلوب میں منکشف ہیں۔ پہلی سطح پر یہ ڈرامے جاویداور مریم کی زندگی کی داستان ہے جو ان کی شادی سے شروع ہو کر جاوید کی موت پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری سطح پر نئی دنیا کو سلام، ہندوستان کی جنگ آزادی کی کہانی ہے۔ جو شاعر کی انقلابی فکر کی تجسیم ہے اور اس تاریخی تناظر میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کی تصویر کشی کی گئی ہے اور انگریزوں کے ظلم، استحصال اور استبداد کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور عوامی بیداری اور انقلابی جدوجہد کے واضح اشارے بھی ملتے ہیں اور قانون، عدل، انصاف اور انسانی حقوق پر فکر انگیز مباحث بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس سطح پر جاوید اور مریم جنگ آزادی کے سپاہی ہیں اور ان کی جدوجہد کا نقطۂ عروج جاوید کی شہادت ہے۔ معنویت کی اس سطح پر ان کا بچہ ہندوستان کے روشن مستقبل اور آزادی کے وسیع تر امکانات کا

استعارہ ہے۔تیسری اوراعلیٰ ترین سطح پر یہ ڈرامہ شاعر کی آفاقی وژن کی تجسیم ہے اور یہاں شاعر ڈرامہ نگار نے وقت کے تصور، زندگی کی تخلیقی توانائی اوراس کے نقوش کا مٹ مٹ کر ابھرتے رہنا انسان کی عظمت، سربلندی، تلاش، جستجو، انسان اور فطرت کے باہمی تعلق تہذیب، اور تمدن کی نوعیت، سربلندی، تلاش، جستجو، انسان اور فطرت کے باہمی تعلق تہذیب، اور تمدن کی نوعیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس سطح پر مرکزی ڈرامائی کردار یعنی جاوید اور مریم اور نیم ڈرامائی کردار یعنی زندگی، موت، تاریخ اور وقت سبھی علامتی اور تمثیلی نوعیت کے کردار ہیں اور جاوید اور مریم کا بچہ زندگی کی تڑپ، ذوق، نمو، تخلیقی توانائی، تسلسل حیات اور ارتقاء کے تصورات کا استعارہ ہے اور اس سطح پر اس کی علامتی معنویت بہت گہری اور ہمہ گیر ہے اور خود سردار جعفری کے الفاظ میں اس کی معصوم روح پوری نظم (ڈرامے) پر حاوی ہے اور معنویت کی ان تینوں سطحوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سردار جعفری نے ڈرامے کے تقریباً سبھی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے وسیع اور کثیر الجہت ورژن کو فن کے قالب میں ڈھالنے اور ڈرامے کی ساخت میں پیوست کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ سردار جعفری کو اردو میں جدید منظوم ڈرامے کا پیش رو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔246

سردار جعفری نے 12 فروری 1952ء کو کرشن چندر کے ناول ''جب کھیت جاگے'' کا دیباچہ تحریر کیا۔ یہ دیباچہ دس صفحات پر محیط ہے۔ابتداء میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ کرشن چندر اردو کا سب سے بلند قامت افسانہ نگار ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

کرشن چندر کی نظر میں گہرائی اور تخیل میں بلا کی اڑان ہے۔تحریر میں سیلاب کا سا بہاؤ ہے اور اثر انگیزی بے پناہ ہے۔ دشمن اور نکتہ چیں بھی اس کے قائل ہیں۔میں اس کی تحریر کو ''سیلاب حسن'' کہتا ہوں۔جسے ڈاکٹر ملک راج آنند نے شاعرانہ حقیقت نگاری کا خوبصورت نام دیا ہے اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ جو حسن کرشن چندر کی کہانیوں میں ہے کہیں پایا نہیں جاتا۔

شاعرانہ تخلیق کے یہی معنی ہیں جیسے چاندنی ہر چیز کو پراسرار اور حسین بنادیتی ہے۔ویسے ہی کرشن اپنے تخیل کے نور سے حقیقت میں ایسا پراسرار حسن پیدا کردیتا ہے جس کا طلسم ٹوٹتا ہی نہیں۔فطرت کے حسن پر یہ اضافہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔247

افسانے میں شاعرانہ انداز کی اہمیت، شاعری اور افسانوں میں الفاظ کی الگ الگ اہمیت اور کرشن چندر نے الفاظ سے کیا کیا کام لیا ہے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا ہے:

میں اُن لوگوں سے متفق نہیں ہوں، جن کا یہ خیال ہے کہ کرشن کا شاعرانہ انداز بیان افسانے کو افسانہ نہیں رہنے دیتا۔میرا خیال یہ ہے کہ اس سے اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے اور یہ انداز بیان اس کی کہانیوں کے مواد اور موضوع کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ، اور رنگ کے بغیر پھول کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔یہ صحیح ہے کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت افسانے سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کی موسیقی اور معنویت براہ راست جذبات کو متحرک کرتی ہے جب کہ افسانے میں الفاظ سے واقعات اور کرداروں کی تخلیق کی جاتی ہے اور پھر وہ واقعات اور کردار جذبات کو متحرک کرتے ہیں اس طرح افسانے میں الفاظ کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔یعنی شاعری میں الفاظ کی ترتیب جذباتی ہوتی ہے اور افسانے اور نثر کی دوسری تحریروں میں

منطقی ،لیکن کرشن چندر الفاظ سے بہ یک وقت دونوں کام لیتا ہے اور افسانے کے منطقی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے جذبات کے تاروں کو بھی چھیڑ جاتا ہے۔اس طرح کرداروں کی روح کی گہرائی نظر آجاتی ہے اور حقیقت ے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں عصری حسیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری رقمطراز ہیں:

''اس کی (کرشن چندر) افسانہ نگاری نے ہندوستان میں سامراجی تشدد، جاگیرداری، ظلم اور غلامانہ بربریت دیکھی، افلاس، جہالت وہم اور دیوانگی دیکھی، کہیں اس نے آنسو بہائے اور کہیں طنز کے تیز تیر چلائے اور کہیں زمین کے پھولوں اور آسمان کے ستاروں کو چنتی ہوئی گزر گئی۔اس نے لاہور، دہلی اور لکھنو کی گلیوں میں آوارہ گردی کی۔بمبئی کے کام گار میدان میں مزدوروں کے جلوسوں میں شرکت کی۔اس نے ہڑتالوں میں لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔فرقہ وارانہ فسادات میں وہ چھروں سے زخمی ہوئی، قحط میں بھوکی مری، جیل خانوں میں بند رہی، پھانسی کے تختوں پر چڑھی اور افق دار کی اس بلندی سے اس نے ہمالیہ کے اسپارلینن اور راسٹالن اور گورکی اور ایلیا اہرن برگ کی وہ شفق رنگ سرزمین دیکھی جہاں انسان پہلی بار مکمل طور پر سے آزاد ہوا ہے۔اس نے تاریخ کے چہرے سے ماہ وسال کی نقابیں اٹھائیں، وقت کی رفتار کو پرکھا اور زمانے کے سینے میں انسان کے سینے کا سوز ڈھونڈ نکالا۔

کرشن کی کہانی میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے جہاں سے اس نے اپنا خمیر حاصل کیا ہے۔اس کی رگوں میں وقت اور تاریخ کا خون ہے اور دل مین عوام کے دل کی دھڑکن۔اس طرح کرشن نے اس جمہوری حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا ہے جس کی بنیاد پر پریم چند نے ڈالی تھی۔پریم چند کی جولاں گاہ ماضی سے حال تک تھی اور کرشن کی جولاں گاہ حال سے مستقبل تک ہے''۔248

صدیوں سے کسانوں کی بدحالی کی داستان بتاتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''کسان صدیوں سے زمین میں بیج بو رہا ہے اور فصل اُگا رہا ہے۔جب چمکتی ہوئی تیز دھوپ پڑتی ہے اور زمین کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔جب اسمیں ہل چلایا جاتا ہے اور بیج بویا جاتا ہے جب پانی برستا ہے آندھی آتی ہے، طوفان اٹھتا ہے تو کسان کھیت یں اکیلا ہوتا ہے لیکن جب پودے بڑے ہوجاتے ہیں اور بالیاں پھلنے لگتی ہیں اور کھلیان لگ جاتے ہیں تو زمین دار، ساہوکار اور نہ جانے کون کون کہاں کہاں سے آجاتا ہے اور کھیت کی کوکھ اجڑ جاتی ہے اور کھلیانوں کے سینے ویران ہوجاتے ہیں اور بھوکا کسان اور اس کے بلکتے بچے اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سوجاتے ہیں۔249

1952ء میں لکھے گئے اس دیباچہ میں سردار جعفری نے ہندوستان کی معیشت اور سیاست میں زرعی مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

آج ہندوستان کی معیشت اور سیاست میں زرعی مسئلہ نے مرکزی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔سارے ملک میں قحط اور بے روزگاری کی پرچھائیں منڈلا رہی ہیں۔زیادہ غذا پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنائے ہیں جن پر کروڑوں

روپئے صرف کیا جارہا ہے لیکن یہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور الجھتا جارہا ہے کیوں کہ مسئلے کی اصلی نوعیت یہ ہے کہ کسان کے پاس زمین نہیں ہے۔ پچاس سے پچھتّر فی صد تک کسان کھیت مزدور ہیں۔ جاگیرداری نظام معیشت نے ہندوستان کی زرخیز زمین کی وافر پیداوار کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں اور جب تک کسان کو زمین نہیں دی جاتی اس کے قرضے معاف نہیں کیے جاتے، لگان میں کمی نہیں کی جاتی اور اسے زراعت کے لیے سرکاری زمین نہیں دی جاتی اس وقت تک غذا، روزگار اور خوش حالی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ بدحال کسان جو دو وقت پیٹ بھی نہیں بھر سکتا اور جو ملک کی آبادی کی سب سے بڑی اکثریت ہے، اگر بدحال رہے گا تو شہر سے سامان نہیں خرید سکتا، اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو تجارت چل سکتی ہے اور نہ کارخانے۔ جب مال بکے گا نہیں تو کارخانے مال تیار کر کے کیا کریں گے۔ جب کارخانے مال تیار نہیں کرتے تو چھٹی ہوتی ہے اور بے روزگاری پھیلتی ہے۔ پھر جرائم بڑھتے ہیں۔ بداخلاقی بڑھتی ہے اور ادب اور تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچتا ہے۔ ادیب کی کتابیں نہیں بکتیں۔ وہ بھی بھوکے مرتے ہیں لیکن اس کے برعکس خوش حال کسان شہر کو غلہ اور غذا دے گا اور اس کے بدلے میں شہر سے مال خریدے گا جس سے تجارت کو فروغ ہوگا۔ کارخانوں کی پیداوار بڑھے گی۔ نئی صنعتیں ترقی کریں گی۔ بے روزگاری ختم ہوگی۔ تعلیم بڑھے گی۔ تہذیب و تمدن کا معیار اونچا ہوگا۔ ادیبوں کی کتابیں بکیں گی۔ ادب اور فن کا فروغ ہوگا۔ اس لیے آج ادیبوں کے ادبی اور فنی مسائل بھی کسانوں کے مسائل سے وابستہ ہو گئے ہیں اور زرعی سوال نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کے ایک قدم کا نام تلنگانہ کی جدوجہد ہے۔..... یہ ایک بائیس سال کے کسان راگھو راؤ کی کہانی نہیں ہے، بلکہ تلنگانہ کی عظمت، آبرو اور وقار کی کہانی ہے۔ یہ ہندوستان کی موجودہ جمہوری تحریک آزادی کے حال و مستقبل کی کہانی ہے۔ کرشن نے اپنے ہیرو کی معصومیت اور پاکیزگی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔250

آخر میں سردار جعفری نے کرشن چندر کی ناول جب کھیت جاگے کا ایک اقتباس پیش کیا جس کا ایک جملہ یہ ہے:

اگر ظلم سے مدافعت کرنا تشدد ہے، اگر اپنی جان کی حفاظت کرنا، اپنی ماؤں کی عزت بچانا، اپنے گاؤں کے کھیتوں کی سنہری بالیوں کی حفاظت کرنا تشدد ہے تو پھر خود جینا بھی تشدد ہے اور سانس لینا بھی تشدد ہے اور دل کا دھڑکنا بھی تشدد ہے۔251

مجروح سلطان پوری کا منتخب شعری مجموعہ ''غزل'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کا تعارف جنوری 1953 میں سردار جعفری نے لکھا۔

اردو غزل کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو غزل محض فارسی کی نقالی ہے حالاں کہ نقالی کی گئی ہے لیکن اردو غزل نے بحیثیت مجموعی اپنا الگ راستہ بنایا ہے جس پر اساتذہ کلام شاہد ہے۔ میرؔ اور غالبؔ خصوصیت کے ساتھ۔ موجودہ زمانے میں جن شعرا نے خاص طور سے غزل کو سنوارا ہے ان میں اقبال، جوش، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض اور مجروح سلطان پوری کے نام سب سے زیادہ روشن ہیں۔252

مجروح کی غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔ مجروح نے اپنی غزل کو نئے خیالات اور احساسات اور سماجی کشمکش اور انقلاب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ سب

سے پہلے عشق ہی کے موضوع کو لیجیے جو ابدی سمجھا جاتا ہے۔مجروح کے یہاں اس کا روپ اس اعتبار سے نیا ہے کہ انھوں نے معشوق کو دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح رفیق زندگی اور رفیق سفر بنا کر پیش کیا ہے۔

اس تصویر کے پیچھے سماجی شعور کا ایک کارواں ہے۔اس طرح مجروح نے عشق کو اپنے ترقی پسند شعور کا رنگ دے کر مزید زندگی دی ہے۔

2۔مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملا دیا ہے اور پھر اس سمندر سے اپنے شاعری کے جام بھرے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجروح کا ہر شعر بیک وقت ان کے اپنے دل کی آواز بھی ہے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی.....

3۔انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرایہ میں ڈھال لیا۔253

مجروح کے منتخب شعری مجموعہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے سردار جعفری نے مجروح کو مشوروں سے نوازا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

سردار جعفری رقمطراز ہیں:

مجروح کو بڑا شاعر بننے کے لیے اس آہنگ کو اور زیادہ بلند کرنا ہے اور یہ ہو کے رہے گا۔کیوں کہ دور وسطی کے شعرا نے جس جنگ کی ابتداء کی تھی آج کے ترقی پسند شاعر اس کی انتہا کر رہے ہیں۔ان کی لڑائی جاگیردار ذہنیت کے خلاف تھی، ہماری لڑائی جاگیرداری اور سامراجی ذہنیت کے خلاف ہے۔اس لیے ہم کو اپنی نوا اور زیادہ تلخ و تیز کرنی پڑتی ہے۔اب نئی منزلیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ان کے گرد و پیش بکھرے ہوئے ہزاروں موضوع مجروح کے تغزل کا لباس پہننے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہزاروں ناآفریدہ نغمے تلوار بننے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔254

سردار جعفری نے یہ لکھا ہے کہ ”ہر اچھی شاعری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں بات سب کی نکلتی ہو لیکن انداز شاعر کا ہونا یہی وہ انفرادیت اور اجتماعیت ہے جو شاعر کو عظمت بخشتی ہے۔255

علی سردار جعفری نے 23 نومبر 1955ء کو ساحر لدھیانوی کی نظم ”پرچھائیاں“ کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔اسے ڈاکٹر محمد فیروز نے اپنی مرتبہ کتاب ”سردار جعفری کی نادر تحریریں، میں شامل کیا ہے۔

ابتداء میں سردار جعفری نے غالب کا حوالہ دیا کہ حسن کی کیفیت کے لیے سادگی و پرکاری، بے خودی اور ہوشیاری درکار ہے۔سردار جعفری نے غالب سے اتفاق کرتے ہوئے نظم کے مکمل پیکر حسن بننے کے لیے ان ہی چار کیفیات کے امتزاج کو ضروری قرار دیا۔

سردار جعفری نے ساحر لدھیانوی کی شاعری میں ان کیفیات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

ساحر نے ایک سادہ سی کہانی کو جو بارہا ہم نے سنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے، اپنی رنگین بیانی اور آتش بیانی سے پرکیف بنا دیا ہے۔اس کی سادگی، اس کے موضوع اور مواد میں ہے اور پرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔بے خودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے اور اس بے خودی کے عالم میں

بھی اس کے سماجی شعور نے اسے ہوشیار رکھا ہے۔اگر یہ ہوشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہوسکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔256

سردار جعفری نے بتایا کہ ساحر لدھیانوی کی اس نظم کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں جس کی دو وجہیں ہیں۔پہلی وجہ تو اس کا موضوع اس کا سب سے اہم سوال ہے۔دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امن عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔دوسری وجہ نظم ''پرچھائیاں'' اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی،اس کے نوے فی صد سے بھی زیادہ الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔

سردار جعفری نے اس کی تکنیک کے بارے میں لکھا ہے:

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔یہ تکنیک ساحر نے براہ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ کئی سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب ''پرچھائیاں'' نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔257

نظم پرچھائیاں کے آخری حصے میں پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگوں کا جو تقابل کیا گیا ہے

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''نظم کا یہ خاتمہ بے حد خوبصورت اور موثر ہے،ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعہ اردو کی طویل نظموں اور امن عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ ساحر کی نظم امن عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔258

ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' کے دیباچہ میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس منزل میں ساحر کی شاعری مکمل طور پر اجتماعی شعور کی حامل ہوئی ہے اور احساس تشکیک اور نا آسودگی حالات نے انقلاب کی راہیں ڈھونڈلی ہیں۔اس لیے انھوں نے محسوساتی کیفیات کا جرأت مندانہ اظہار بھی کیا ہے اور اس نظام کو بدلنے کے لیے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیام بھی دیا ہے۔259

ڈاکٹر انور ظہیر خان نے لکھا ہے:

''ساحر چوں کہ نظریاتی طور پر انسانی عظمت،سماجی مساوات اور عدل و انصاف کے حامی ہیں لہٰذا امن و تہذیب کی بقاء

اور انسانی زندگی کے تحفظ کی خاطر متحد ہو کر غور و فکر کا پیغام بھی دیتے ہیں اور عالمی امن کے قیام کا احساس بھی جگاتے ہیں۔ان کی نظم۔

چلو کہ چل کے سیاسی مقاموں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے
کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاک داں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسمان کی خیر نہیں
گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

مذکورہ نظم کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر انور ظہیر خان نے لکھا ہے کہ یہ نظم صرف دوسری عالمگیر جنگ کی قیامت خیزیوں اور تباہ کاریوں کا منظر نامہ ہی نہیں، جس میں گرد و پیش کی زندگی جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے۔260

بلکہ اس دکھی دل کی پکار بھی ہے جس کے محبوب کی عصمت و عفت، جس کی فہم و فراست، جس کا سرمایۂ محبت اور جس کی عظمت و شہرت سب کچھ اس جنگ کی نذر ہو جاتا ہے لہٰذا اس نظم کے ذریعے ساحر نے ساری دنیا کو نہ صرف تیسری عالمی ایٹمی جنگ کے خطرات سے آگاہ کیا ہے بلکہ اس منحوس جنگ کے خلاف امن و آشتی کی بحالی کے لیے منظم ہونے کی تلقین بھی کی ہے۔261

سردار جعفری نے اچھی نظم کی خصوصیات بیان کی ہیں، ملاحظہ ہو:

''ایک اچھی نظم کی خصوصیات وہی ہیں جنھیں غالب نے حسن کی کیفیت کو چار لفظوں میں ادا کیا ہے: ''سادگی و پرکاری، بے خودی و ہوشیاری، ان چاروں کیفیات کا امتزاج مشکل ہے لیکن جب یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے تو نظم ایک مکمل پیکر حسن بن کر سامنے آتی ہے اور دل کو موہ لیتی ہے''۔262

حرف آغاز: آتش تر: خمار بارہ بنکوی

خمار بارہ بنکوی کے شعری مجموعہ ''آتش تر'' کا حرف آغاز سردار جعفری نے اگست 1964 میں لکھا۔خمار کی غزل کے بارے میں سردار نے لکھا ''غزل جس کا ہر شعر ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے کی طرح آئے اور گزر جائے اور دل میں تازگی کی

ایک کیفیت پیدا کر جائے ..... یہ ہے خمار کی شاعری"۔سردار جعفری نے خمار کے شعری مجموعہ سے چند اشعار کا انتخاب بغیر کاوش سے کیا اور اس کے بعد لکھا "محبوب کی دلبری اور عاشق کی غم آشنا دل نوازی دونوں کا امتزاج ہے۔محبوب پر طنز خمار کی فطرت میں نہیں ہے۔اس شاعری میں وہی محبوب نوازی ہے جو دکن کے ولی کی خصوصیت ہے ان کے یہاں زندہ رہنے کا حوصلہ ہے جس کا اظہار وہ بہت کھلے الفاظ میں نہیں کرتے ، یہ کیفیت بہت رچی ہوئی ہے اس مزاج کے شاعر کے لیے زندگی کبھی لطف سے خالی نہیں ہوسکتی۔خمار کی غزلوں کی ایک خصوصیت ان کی بے پناہ نغمگی ہے.....خمار کے ترنم میں ایک نشاط انگیز سوز ہے۔یہی نشاط انگیز سوز ان کے شعروں میں بھی ہے"۔263

علی سردار جعفری نے کیفی اعظمی کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس" کا پیش لفظ 1977ء میں لکھا۔اس میں انھوں نے بتایا کہ کیفی کی یہ نظم اور اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ"۔یہ دونوں نظمیں اپنی عصری معنویت اور تاریخی بلاغت کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اقبال نے انقلاب روس کے بعد اشتراکیت میں بے انتہا کشش محسوس کی جس کا اظہار بھی ہوا جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اشتراکیت کے بعض پہلو قبول کرنے سے جھجک رہے ہیں۔

ایسی کیفیات کی وضاحت کے لیے سردار جعفری نے شیکسپیئر کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ وہ کیفیت ہے جس کو شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کردار میں مجسم کر دیا ہے یعنی صحیح اقدام کی بے پناہ خواہش بھی اور پھر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے گریز بھی۔

اس کیفیت کو شیکسپیئر نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے

To be or not to be that is the question

شہزادہ ہیملٹ کی اس نفسیاتی کیفیت میں سیاسی سطح پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شاعرانہ اور مفکرانہ سطح پر اقبال شریک ہیں۔یہ تذبذب ہی ابلیس کی مجلس شوریٰ کی تخلیق کا باعث ہے ورنہ وہ (اقبال) ابلیس کی مجلس شوریٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔"264

علی سردار جعفری نے اقبال اور کیفی اعظمی دونوں کی شاعری میں ابلیس کے کردار کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

اقبال کی پوری شاعری میں ابلیس کا کردار ایک انقلابی کردار ہے۔وہ فطرت کے جدلیاتی نظام میں اثبات کے مقابلے پر نفی کی طاقت ہے اور ان کے باہمی ردعمل سے ارتقا اور انقلاب کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔یہ مولوی کے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" والا ابلیس نہیں ہے بلکہ وہ ابلیس ہے جو "پیام مشرق" میں اس شان سے اظہار ہوتا ہے کہ آدم کو تخلیق خدا نے کیا ہے لیکن وہ جوان ابلیس کو کود میں ہوا ہے اور اس طرح ابلہ جنت، دانائے راز، بنا ہے اور نیک و بد میں تمیز کر کے اپنی انسانی صفات کو خدائی صفات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ ایک فلسفیانہ توجیہ ہے لیکن ابلیس کی مجلس شوریٰ کے دوسرے اجلاس کا ابلیس کی ایک رجعت پسند کردار ہے جو سامراج شاہی شہنشاہیت اور فاشزم کا خالق ہے اور اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا نظارہ کر رہا ہے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شکست اشتراکیت کے ہاتھوں ہوگی یا اسلام کے ہاتھوں یا دونوں کے انقلابی

اشتراک سے۔اقبال کی نظم کے بعد کیفی کی نظم اس صورت حال کی نشاندہی کرتی ہے۔265

پیش لفظ کے آخر میں علی سردار جعفری نے بتایا ہے کہ کیفی کی نظم، اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''لیکن اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اقبال کی تاریخی بصیرت نے 1936ء کے آس پاس یہ محسوس کرلیا تھا کہ ایشیائی میں سرمایہ داری ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے اور آخری بات یہ ہوگی کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے لیکن خود اقبال کی تعلیمات اور افکار میں یہ چیز موجود ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا جواز اسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔دراصل کیفی کی نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔آج عالم اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔اقبال کی یہ بشارت پوری ہوگی۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

سردار جعفری نے پروین شاکر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پروین کی شاعری کا محور عشق ہے۔اس کی تشبیہیں اور استعارے زیادہ تر فطرت سے لیے گئے ہیں۔دھوپ، سورج، چاند، روشنی، پھول، بادل، پانی، ہوائیں۔انھیں سے مل کر اس کی امیجری کی تعمیر ہوئی ہے لیکن اس کے عشق کے گرد شعور کا ایک خوبصورت ہالہ ہے۔سماجی اور سیاسی احساس کا پرتو ہے۔اسکی شاعری حسن صورت، حسن سیرت، حسن زبان اور حسن بیان سے آراستہ ہے۔اس لیے اس میں دور دور تک کہیں اس عہد کی مردم بیزاری نہیں ہے۔وہ بصیرت ہے جو زندگی کو شائستہ بناتی ہے اور انسانی تہذیب کو وقار بخشتی ہے۔لہجے کی تازگی میں بلا کی کشش ہے۔پروین آہستہ اور مہذب آواز میں پڑھتی ہے اور یہ آواز اس کی شاعری کے لیے ترنم سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ہندوستان پاکستانی میں لتا منگیشکر پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔لیکن پروین شاکر نے اس کو امن کی علامت بنا دیا ہے۔ہند پاک دوستی کا سمبل .....وہ شاعری کے مستقبل کے لیے ایک خوبصورت بشارت ہے۔266

علی سردار جعفری نے رفعت سروش کے غنائیہ ''ساون بھادوں'' پر 7 ستمبر 1980ء کو دیباچہ لکھا:

راگ رنگ کا نیا غنایہ ''ساون بھادوں'' ایک خوشگوار تخلیق ہے جس میں رفعت سروش کی شاعرانہ اور فنی صلاحیت اپنے عروج پر ہیں۔بیان کی دلاویزی، شاعری کی رنگارنگی اور موسیقی کا تنوع مسرت اور انبساط کی کیفیت سے سرشار ہے۔جس طرح بارش کا پہلا چھینٹا مٹی کی سوندھی خوشبو کو بیدار کر دیتا ہے اور ساون کی جھڑی سوکھے کھیتوں کو سبز پیرہن عطا کرتی ہے اسی طرح یہ غنایہ اپنے رنگ اور نغموں کی بارش سے ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ دلوں میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔یہ نغمہ ہندوستان کی صدیوں کی روایت کے تانے بانے سے تیار کیا گیا ہے اور ایک مشترکہ تہذیب کا کارنامہ ہے۔اس وقت ہمارے ملک میں

محبت کی ندیاں سوکھ رہی ہیں اور باہمی رفاقت اور ہمدردی کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ریگ زاروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔اس عالم میں ساون بھادوں جیسا غنائیہ باران رحمت سے کم نہیں۔اس کا ہر بول، ہر سر، ہر گیت، ہر شعر یہ یاد دلاتا ہے کہ ہم ایک اور مشترکہ تہذیب کے وارث ہیں۔ہمارا آرٹ اور ادب کسی ایک فرقے کی جائیداد نہیں ہے اور جب تک ہم مل کر زندہ رہنے کا ہنر نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ہمارے دل سرسبز و شاداب نہیں ہوں گے۔میری دلی تمنا ہے کہ راگ رنگ کا یہ غنائیہ ہمارے دیس کے کونے کونے میں جا کر اپنے ساون بھادوں، کی بارش کرے اور اپنے سیلاب میں نفرت اور عداوت کے خس و خاشاک کو بہا لے جائے۔267

سردار جعفری نے اختر سعید خان کی غزلوں کے مجموعہ ''نگاہ'' کا دیباچہ جون 1984ء کو لکھا۔علی سردار جعفری نے اختر سعید خان کی غزلوں کے اشعار کے آہنگ کو بلند آہنگ قرار دیا۔

ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اختر سعید خان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے۔اس میں پرانی زمینیں بھی ہیں اور نئی زمینیں بھی۔اجتماعی غموں کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذاتی غم بھی ہیں۔جمالیاتی کیفیات میں بڑی عاشقانہ معصومیت اور سادگی ہے''۔268

پاکستان کی نوعمر شاعرہ عشرت آفریں کے پہلے مجموعے ''کنج پیلے پھولوں کا'' کا دیباچہ سردار جعفری نے 15 اگست 1984ء کو لکھا۔اس شاعرہ سے سردار جعفری کی ملاقات 5 مئی 1984ء کو کراچی میں ہوئی۔یہ دیباچہ سردار کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز میں شامل کیا گیا ہے۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ اردو شاعری میں صرف بہار کا سرخ رنگ ہی نہیں ہے بلکہ زرد اور پیلے پھولوں کی بھی ایک روایت ہے۔سردار جعفری نے پیلے رنگ کی علامتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پیلا رنگ مسرت شادمانی ہے جیسے ہندو دلہن کے ہاتھ ہلدی سے پیلے کے جاتے ہیں، پیلا رنگ خوف کا بھی مظہر ہے۔ہجر و غم کی بھی یہ علامت ہے جیسے پریتم کی راہ تکتے تکتے گوری پیلی پڑ جاتی ہے۔خزاں کے رنگ کی حیثیت سے یہ تجدید بہار کا رنگ ہے۔ عشرت آفریں کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1۔اس کا طبقاتی شعور بیدار ہوتا ہے اور اب اس کو کھیتوں میں کپاس چنتی ہوئی اور کرگھوں یا کارخانوں میں لباس بنتی ہوئی لڑکیاں فن کارہ کے روپ میں نظر آتی ہیں۔(نذرانہ) اور وہ نہایت سادگی سے محنت کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔

2۔اس کی شاعری کی نادر شاعرانہ پیکر تشبیہوں استعارے کو بھی جو ترقی پسند عہد اور شاعری کا نہایت پامال موضوع بن چکا ہے۔تازہ اور اثر آفریں استعاروں میں شعر کا پیکر عطا کرتا ہے۔

3۔عشرت آفریں کی زبان ساقی، مینا، ساغر سے بے نیاز ہے۔اپنے موضوعات کے اعتبار سے اس میں جنگلی پھولوں کی سی تازگی ہے۔ابھی اس کی شاعری صرف محسوسات کی سطح پر ہے، تخیل اور فکر کی بلندی تک نہیں گئی ہے۔جب وہاں پہنچے گی تو اس میں نئی توانائی اور نئی دھار کی ضرورت ہوگی۔

4۔اس شاعری میں کوئی انفعالی کیفیت نہیں ہے۔زندگی کو اس کے تمام تضادوں کے ساتھ قبول کرنے اور زندگی سے محبت کرنے کا جذبہ ہے۔زندگی کی سختیوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ ہے۔اس کی تلوار اس کی سپر اس کی انا ہے۔جہاں تک میری

نگاہ ہے کسی شاعر نے اس طرح اپنی انا کا اظہار برملا اور فخریہ نہیں کیا ہے۔ یہ انا اپنی شاعری کا رشتہ روشن فکر کی روایت سے منقطع نہیں کرتی۔ شعور اور احساس کو ظلمت پسندی اور عقل دشمنی کے غاروں میں بند نہیں کرتی۔ اسی لیے انانیت میں تبدیل نہیں ہوتی جو ایک قبیح چیز ہے۔ عشرت آفریں کی انا اپنے آباء و اجداد کی انا سے مختلف ہے جس کے مدفن اجڑے باغات اور ٹوٹے کھنڈرات ہیں۔ یہ ایک باغیانہ رویہ ہے اور حفظ ذات کا حربہ، ورنہ اس انا کی کوئی فلسفیانہ سطح نہیں ہے لیکن اس کا رشتہ اقبال کی خودی سے ملتا ہے۔ اقبال کے ساتھ ساتھ ناظم حکمت اور پابلو نرودا اور اس عہد کے دوسرے مجاہد شعرا بھی اس کے شعور کا حصہ ہیں۔

5۔ نظم ''زہر'' میں استحصال کے خلاف خاموش احتجاج ہے لیکن بیک وقت دو استحصالی کیفیتیں موجود ہیں۔ ایک محنت کش کا استحصال اور دوسرے عورت کا استحصال، عورت ہمیشہ سے دوہرے مظالم کا شکار رہی ہے۔ سماجی نظام کا جبر اور مرد کا جبر۔

6۔ عشرت آفریں کی سب سے بڑی دولت محبت ہے۔ دھرتی سے محبت، زندگی سے محبت، انسان سے محبت، اس کی نظم ''میں مطمئن ہوں'' اسی محبت کی داستاں ہے۔

7۔ اردو ادب کی تاریخ میں کسی بڑی شاعرہ کا نام نہیں ملتا۔ گذشتہ پچاس سال میں آٹھ دس نام روشن امکانات کی بشارت لے کر ابھرے ہیں اور انھیں میں ایک نام عشرت آفریں کا ہے۔ 269

سردار جعفری نے قاضی جلیل عباسی کی تصنیف کیا دن تھے، کا پیش لفظ 22 اکتوبر 1984ء کو لکھا۔

اس میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

آپ کو اس کتاب میں وہ گذرا ہوا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوگا، جلیل کی زندگی کے تجربات کی روشنی میں آپ اس گذرے ہوئے عہد کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکیں گے اور یہ اس کتاب کی اہمیت ہے اور یہی اس کا جواز۔ 270

صنف ''رپورتاژ'' کی افادیت اجاگر کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں:

'یہ صنف ادب (رپورتاژ) بالکل نئی ہے لیکن بے انتہا اہم ہے۔ یہ صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی ہے اور اس سے ہمارے ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ رپورتاژ ہمارے مقاصد کے لیے بہت ضروری ہے اس کے ذریعے سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔ اردو میں اب تک جو اچھے رپورتاژ لکھے گئے ہیں ان میں خاص طور سے قابل ذکر سجاد ظہیر کا رپورتاژ ''یادیں'' اور کرشن چندر کا ''پودے'' ہے۔ 271

ڈاکٹر اس ام زیڈ کوہر نے مذکورہ بالا اقتباس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

سردار جعفری کا یہ خیال کہ رپورتاژ سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں اور یہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کا ایک اہم وسیلہ بن سکتا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے رپورتاژ کے صنفی ارتقا پر بطور خاص دھیان دیا۔ اس کے لیے ان کے پاس معقول اور واضح سبب بھی تھا۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں رپورتاژ مفید و موثر ثابت ہوا۔ 272

قاضی جلیل عباسی کی تصنیف کیا دن تھے۔ (اشاعت دسمبر 1985) کا پیش لفظ سردار جعفری نے لکھا ہے۔

اس میں انھوں نے جلیل عباسی اور کتاب کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

وہ (قاضی جلیل عباسی) ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک نڈر اور بے باک سپاہی حوصلہ منداور پر جوش۔ان کا جوش و خروش جب جلال پر ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔جلیل نے جس زمانے کی کہانی لکھی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ پر جوش اور طوفانی دور تھا۔تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور ہم چھوٹے چھوٹے معمولی طالب علم مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی تاریخ ساز شخصیتوں کے نابالغ ہم عصر تھے لیکن ہم عصر تھے اور ان کے قریب جاسکتے تھے اور ان سے بات کرسکتے تھے۔آپ کو اس کتاب میں وہ گزرا ہوا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوگا۔جلیل کی زندگی کے تجربات کی روشنی میں آپ اس گذرے ہوئے عہد کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکیں گے اور یہی اس کتاب کی اہمیت ہے اور یہی اس کا جواز۔273

شکیل الرحمٰن کی کتاب "مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات" کی ستائش کرتے ہوئے علی سردار جعفری رقمطراز ہیں:

"شکیل الرحمٰن کی تخلیق اور تحریر کی رفتار میرے پڑھنے کی رفتار سے زیادہ ہے۔اتفاق سے آج کل ان کی پرانی کتاب "مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات زیر مطالعہ ہے۔ان کا قلم نہایت خوبصورت الفاظ کا ایک آبشار نغمہ ہے۔جب دس پندرہ صفحات پڑھ کر بالکل شرابور ہو جاتا ہوں تو کتاب بند کر کے گوہر ہائے معانی کی تلاش شروع کرتا ہوں۔چند موتی ہاتھ آتے ہیں انھیں سنبھال کر رکھ لیتا ہوں۔یہ 1986 کی تصنیف ہے۔میرا خیال تھا کہ لندن میں منعقد ہونے والے غالب سمینار میں اسی کتاب پر مقالہ پیش کروں لیکن انگریزی میں لکھنا بہت دشوار ہے۔غالب کے شعر اور شکیل الرحمٰن کی نثر کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں۔نہایت اعلی درجے کی تخلیق ہے۔یہ کام شاعری کی طرح تخلیقی ہے جس میں خون جگر صرف ہوا۔"مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات" کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو جس مقام سے پڑھئے دلکش ہے۔میں اس کو دیوان غالب اور دیوان حافظ کی طرح بھی پڑھتا ہوں۔(1987ء)۔274

مجاز کی نظم "آوارہ" پر سردار جعفری تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"مجاز کی نظم "آوارہ" کو میں اس عہد کی نہیں بلکہ پوری ترقی پسند تحریک کی بڑی نمائندہ نظم سمجھتا ہوں اور یہ بڑی نظم ہے۔ اس کا شمار بڑی شاعری میں ہوتا ہے.....مجاز کے ہاں سہولتِ اظہار کے ساتھ ساتھ ندرتِ اظہار کا بھی استعمال کیا گیا ہے اور اس میں فکر کی ایک نئی نہج ہے۔275

رفیعہ شبنم عابدی کے سات مضامین کا مجموعہ "نظر نظر کے چراغ" پر تبصرہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

"رفیعہ شبنم کے سات مضامین کا چھوٹا سا مجموعہ ہمارے تنقیدی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔آج کے زمانے میں اردو کے زیادہ تر نقاد اساتذہ کی صفوں سے آتے ہیں۔دانش گاہوں سے تنقید کا ظہور اس اعتبار سے مبارک ہے لیکن کبھی کبھی اس پر درس و تدریس کی پرچھائیاں سی منڈلاتی نظر آتی ہیں۔رفیعہ شبنم کے مضامین ان پرچھائیوں سے پاک ہیں۔اس مجموعے کا سب سے اچھا اور سب سے طویل مضمون اتفاق سے میری شاعری کی پیکر تراشی پر ہے۔اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اکثر مضامین میں پیکر تراشی کا ذکر آجاتا ہے.....رفیعہ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔میں ادب کی محفل میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔(10 جولائی 1980)276

بکل اتساہی کے نظم نما گیتوں کی تکنیک کے عنوان سے علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

بکل اتساہی میرے ہم وطن خوش کلام شاعر ہیں۔میرے دوست بھی اور میرے چھوٹے بھائی بھی ہیں: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔خیال کتنا ہی مجرد (abstract) ہو، آدمی جب سوچتا ہے تو لفظوں اور الفاظ کا تعلق آواز کے ساتھ ہوتا ہے میں خود بکل کی طرح شعر نہیں کہہ سکتا۔ہم ترقی پسند ادیب رہے ہیں مگر بکل نے یہ کام ہم سے پہلے کر دیا۔ ہماری صفوں میں ساغر نظامی، حفیظ جالندھری گیت کو مشاعروں میں نظم کہہ کر سناتے رہے مگر یہ جرأت بکل کی ہے کہ انھوں نے مشاعرے میں گیتوں کا رواج تمام مخالفت کے باوجود قائم کیا اور آخر کار سے اردو شاعری میں ایک اہم اور لافانی مقام دلایا ہے۔تمام نظم نما گیتوں کو جن شاعروں نے انتہا سمجھا بکل اتساہی کی وہاں سے ابتداء ہوتی ہے۔بکل اتساہی نے گاؤں کے عوام کی زندگی اور دبی کچلی مظلوم انسانیت کے کرب سے اردو شاعری کو روشناس کرایا ہے۔یہ سب سے بڑا معیاری کام ہے۔آج کے ناقد بھلے ہی بکل اتساہی کو اپنی کج فہمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیں مگر مستقبل کی نقد و نظر انہیں خسرو اور نظیر اکبر آبادی کی عوامی روایت کو عظیم علمبردار ماننے پر مجبور ہوگی۔277

سردار جعفری نے دیباچہ ''نگاہ: اختر سعید خان'' جون 1984ء میں لکھا۔

اچھا شعر اور اچھی شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا:

معنی اور مفہوم کے بغیر شعر کچھ بھی نہیں ہے۔لیکن شعر معنی و مفہوم سے کچھ زیادہ بھی ہے اور یہی اچھا شعر ہے۔اس کو بزرگوں نے ''ماورائے سخن بھی ہے اک بات'' کہہ کر واضح کیا ہے۔اس اچھے شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ لمحاتی کیفیت سے بلند ہو کر وقت کی قید سے بے نیاز ہو جاتا ہے جسے ہم ہر زمانہ کی سچائی کہیں اور اسی کے ساتھ آج کی سچائی میں ظاہر ہو۔278

بھوپال کے شاعر اختر سعید کی شاعرانہ تربیت میں سارے ہندوستان کے شاعروں کا حصہ ہے جو ان کے والد محترم حامد سعید خان صاحب کے گھر مہمان ہوتے تھے اور اختر کی روح شعروں کے پھولوں سے بھر جاتی تھی۔279

عبدالاحد ساز کے مجموعہ کلام ''خموشی بول اٹھی ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے:

ہمارے عبدالاحد ساز اچھے شاعر ہیں۔جب میں نے پہلی بار انھیں سنا تھا تو یہ توقع ظاہر کی تھی کہ وہ جلد ہی ایک اچھی کتاب اردو شاعری کے پڑھنے والوں کے لیے پیش کر سکیں گے۔آج یہ کتاب ''خموشی بول اٹھی ہے'' ہمارے سامنے ہے۔ساز کے یہاں لطافت ہے، نرمی ہے، جمالیاتی کیف بھی ہے اور تلخ کلامی بھی۔میں نے ساز کی کتاب اس عالم میں پڑھی کہ میں فردوسی پر کام کر رہا تھا اور درمیان میں جستہ جستہ ''خموشی بول اٹھی ہے'' دیکھ لیتا تھا۔لطف کی بات یہ ہے کہ فردوسی کو پڑھتے ہوئے ساز کو پڑھنا مجھے برا نہیں لگا۔280

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے لکھا ہے کہ جب ایک مشاعرے میں راحت اندوری نے اپنا معرکۃ الآرا یہ شعر پڑھا۔

پھر ایک بچے نے لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر
یہ کہہ دیا کہ ابھی خاندان باقی ہے

تو علی سردار جعفری کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی۔انھوں نے سراپا داد بن کر میری طرف دیکھا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر نوٹ کرلیا۔281

جوشؔ نے کیا دیا، اس سلسلہ میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

جوشؔ کی دین بہت بڑی ہے انھوں نے جمالیاتی اعتبار سے اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔انھوں نے گری پڑی چیزوں کو بھی اس طرح شاعری میں جگہ دی ہے کہ حسن پیدا ہوگیا ہے اور یہ ان کا فنکارانہ اعجاز ہے۔ان کے ہاں کیسے کیسے لفظ آتے ہیں، کیسے استعارے اور علامتیں ہیں۔ان کے ہاں دونے کے پتے، جامن، اور جوہی کی کلیوں کا ذکر ملے گا ورنہ اس سے پہلے تو گل و لالہ ہی سے کام چل رہا تھا اور یہ نئے الفاظ، استعارے اور علامتیں جو آئی ہیں وہ جوش کے واسطے سے آئی ہیں اور انہیں جوش کی دین سمجھنا چاہئے۔ہم ترقی پسندوں نے شعوری طور پر جوش سے اکتساب کیا ہے اور اس کا اعتراف ضروری ہے۔جوش میرا جی سے پہلے تھے۔اختر الایمان سے پہلے تھے اور ان کے ہاں جوش کے اثرات موجود ہیں۔282

شکیل الرحمٰن کی تصنیف ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' عصمت پبلی کیشنز نے شائع کیا تھا۔

اس کتاب کو سردار جعفری نے بہت پسند کیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

نہایت اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے۔یہ کام شاعری کی طرح تخلیقی ہے جس میں خون جگر صرف ہوا ہے۔''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو جس مقام سے پڑھئے، دلکش ہے۔میں اس کو دیوان غالب اور دیوان حافظ کی طرح بھی پڑھتا ہوں۔(بمبئی 3 جولائی 1987ء)283

ہندی کے کملیشور کے بارے میں سردار جعفری نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

کملیشور ہندی زبان کے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔وہ روشن خیال ہیں، ترقی پسند ہیں اور فنی اعتبار سے ہندوستان کو ادیبوں کی صف اول میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ان کی تخلیقات اس قابل ہیں کہ ان کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے۔اسی طرح دوسری زبانوں کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہندی اور اردو میں آنی چاہئیں۔ 284

جعفری صاحب نے ہندوستان کے ہر شہر میں اسٹیشنوں، شاہراہوں وغیرہ کو وہاں کے مشہور شاعروں کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز پیش کی جنھوں نے ملک کے ثقافتی ورثے کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا وہ لکھتے ہیں: ''ہندوستان کے ہر شہر سے کسی نہ کسی بڑے شاعر کا تعلق رہا ہے۔اگر مراد آباد کو جگر مراد آبادی پر اور گورکھپور کو فراق گورکھپوری پر ناز ہے تو دہلی کے پاس ایسے لجنڈری شعرا کی پوری فہرست ہے۔جنھوں نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔دہلی کی اندرون و بیرون ملک شہرت یہاں کے بادشاہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ غالب، میر، مومن اور ذوق سے ہے۔

محبت کاظمی نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

جعفری صاحب کی تجویز یہ ہے کہ تقریباً ایسے سو شہر جن سے معروف شعرا کے نام وابستہ ہیں، منتخب کر کے ان ریلوے

اسٹیشنوں، ایرپورٹوں، شاہراہوں اور چوراہوں کو ان شاعروں کے نام سے منسوب کیا جائے اور ان کے اشعار بھی عوامی مقبولیت کی غرض سے ایسی جگہوں پر درج کیے جائیں۔انھوں نے جگر مرادآبادی کے مشہور شعر کے حوالے سے کہا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر کے اس مشہور شعر مین آج کے پرآشوب دور میں ہر فرد کی شخصی ذمے داریوں کی بہترین نمائندگی ہے تو پھر یہ شعر مراد آباد کے ریلوے اسٹیشن پر جلی حروف میں کیوں نہ لکھا جائے؟

مقصد بالکل سادہ ہے: تیزی سے زوال آمادہ ماضی کی درخشندگی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ وہ آئندہ نسلوں کو اس کی جڑوں سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے خیال میں ماضی کی تردید ممکن نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فوری طور پر اس کی بازیافت کریں۔285

مکاتیب:

ڈاکٹر محمد نسیم فریس نے سردار جعفری کے مکتوبات کے بارے میں لکھا:

سردار جعفری کے مکتوبات مختلف شخصیتوں پر ان کے Remarks مختلف سیاسی واقعات اور ادبی صورت حال پر ان کے comments مختلف موضوعات پر ان کے افکار اور مختلف مسائل پر ان کے موقف کا آئنہ ہیں اور ان میں جعفری صاحب کے وسیع علم و مطالعہ کے علاوہ عمیق غور و فکر اور برسوں کا تجربہ و مشاہدہ شامل ہے۔286

سردار جعفری کے دستیاب مکاتیب سے ایسے چند مکاتیب کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

سلطانہ جعفری کے نام اپنے ایک خط مورخہ 6 اکتوبر 1949ء میں موضوع اور ہیت کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا:

''یونانی آرٹ کے موضوع (content) اور ہیئت (form) کو الگ الگ کر دیا گیا ہے حالاں کہ content اور form الگ الگ نہیں کیے جاسکتے۔form بغیر content کے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا اور content بغیر form کے ظاہر نہیں ہوسکتا۔بغیر لفظوں کے ہم سوچ نہیں سکتے اور معنی کے بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا نہیں ہوسکتا۔پھر وہ جانور کی آواز ہوگا، انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہوگا۔287

سلطانہ جعفری کے نام اپنے مکتوب مورخہ 13 مارچ 1950ء میں سردار جعفری نے آزاد نظم کی تکنیک کی وضاحت کی۔

وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے بہت سے دوستوں نے ابھی آزاد نظم کی تکنیک کو سمجھا نہیں ہے۔مشق اور تجربے سے یہ تکنیک سمجھ میں آجائے گی۔آزاد نظم سے قافیہ اور ردیف نکل جاتا ہے۔مصرعے بھی نپے تلے برابر کے مصرعے نہیں رہ جاتے، شعر کی جگہ بند لے لیتا

ہے۔اس لیے نئے آہنگ اور ترنم، نئی تال اور نئے سر کی ضرورت ہے جو قافیہ کی جھنکار کا بدل بن سکے۔بند (stanza) چوں کہ شعر سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے اس لیے معنوی وسعت اور تخیل کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔معنوی وسعت اور تخئیل کے اس پھیلاؤ کو شاعر بہت اچھی اور بھرپور امیجری (imagery) کے بغیر نہیں سنبھال سکتا۔ورنہ پورا بند غارت ہو جائے گا۔اس طرح آزاد نظم کا ہر بند ایک مکمل تصویر ہوتا ہے (اور آزاد نظم ان تصویروں کا البم) جس کے خط و خال ہر مصرعے کے ساتھ زیادہ واضح اور روشن ہوتے جاتے ہیں اور آخری مصرعہ اسے مکمل کر کے climax پر پہنچا دیتا ہے۔پابند نظم کی طرح ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کی علیحدگی آزاد نظم برداشت نہیں کر سکتی۔ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑا ہونا چاہئے۔جہاں پر کڑی الگ ہونے کی بعد بھی دوسرے کڑی سے الگ نہیں ہوتی۔288

سلطانہ جعفری کے نام اپنے ایک خط مورخہ 17 مئی 1950ء میں

سردار جعفری نے رومانیت کے بارے میں وضاحت کی:

رومانیت کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے وہ بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا ہے۔اسی وجہ سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ میرے سر یہ الزام آ گیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ سلا کی ساری شاعری کو رومانی شاعری کہہ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔میں رومانیت کے خلاف نہیں ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ بغیر رومانیت کے شاعری ممکن نہیں۔خود میری شاعری میں بہت کافی رومانیت ہے۔میں دراصل obscore romantism کے خلاف ہوں۔289

علی سردار جعفری نے 16 اگست 1956 کو ماہنامہ صبا کو ایک خط لکھا جو سبا کے دسمبر 1956ء کے شمارے میں بازگشت کے عنوان سے شائع ہوا۔اس میں سردار جعفری نے ادبی مباحث کی رپورٹ لکھنے میں احتیاط کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے اور غلطیوں کی صورت میں مفہوم کے مسخ ہونے اور نئی شکایتوں کے دفتر کھل جانے کے خدشہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔خط کا متن اہمیت کا حامل ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

''صبا کا تازہ شمارہ (جون، جولائی 1956) ملا۔شکریہ۔جہاں تک مجھے یاد ہے طے ہوا تھا کہ انجمن کی تنظیم کے مباحثے کی رپورٹ لکھتے وقت احتیاط سے کام لیا جائے گا اور بحث کے نکات پیش کیے جائیں گے۔ناموں کا حوالہ نہیں دیا جائے گا کیوں کہ رپورٹ لکھتے وقت بعض اوقات اصل فقرے یاد نہیں رہتے اور ان سے ملتے جلتے فرے ایک لفظ کی تبدیلی کی وجہ سے کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں لیکن آپ نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں یہ احتیاط نہیں برتی گئی۔میں صرف ایک مثال دوں گا۔میں نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ ادیبوں کی شہرت اور مقبولتی میں بعض اوقات غیر ادبی عناصر ہی کام کرتے ہیں۔مثلاً سجاد ظہیر، مخدوم اور فیض کی شہرت اور مقبولیت میں ان کی ادبی کاوشوں کے ساتھ ان کے سیاسی مقام کو بھی دخل ہے۔آج سے پچاس یا سو برس بعد ان کے متعلق جو رائے قائم کی جائے گی وہ صرف اس کی ادبی تخلیقات پر مبنی ہوگی آج یہ ممکن نہیں ہے۔اس لیے نئے ادیبوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے۔وغیرہ لیکن آپ کی رپورٹ میں ''غیر ادبی عناصر'' کے بجائے لکھا ہے۔جھوٹے عناصر، جس سے سارا مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔اس قسم کی اور غلطیاں بھی ہیں۔ادبی مباحث کی

رپورٹ .....اگر شارٹ ہینڈ میں نہ لکھی گی ہواور چھپانے سے پہلے بولنے والوں سے اس کی تصدیق نہ کرالی گئی ہوتو بعض اوقات اس سے نقصان پہنچ جاتا ہےاوراصل بحث سے ہٹ کرنئی شکایتیں شروع ہوجاتی ہیں۔آپ آئندہ شمارے میں یہ بات صاف کردیں تو بہتر ہے۔290

پروفیسر گیان چند جین جب جموں یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھےتو انھوں نے سردار جعفری کودوتوسیعی لیکچر کے لیے مدعو کیا تھا۔

جین صاحب کے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے ایک خط مورخہ 10دسمبر 1969ء میں لکھا ہے:

''توسیعی لیکچروں کے لیے.....اپنی شاعری کے بعض پہلو بھی لے سکتا ہون جن کی طرف ہمارے نقاداب تک توجہ نہیں کرسکتے ہیں مثلاً محنت کا عمل اور محنت کی عظمت۔اس کے لیے مجھے نئے امیج تراشنے پڑے ہیں۔مثلاً ہاتھوں کا ترانہ''میں۔

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کردیں کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
سمٹی ہوئی گنا کی لہریں، بہتے ہوئے بکلی کے دھارے
دھرتی کے مقدر کے مالک، محنت کے افق کے سیارے
یہ چارہ گران درد جہاں صدیوں سے مگر خود بے چارے

دوسرا پہلو میری شاعری میں وقت کا تصور ہے جو اقبال کے تصور وقت سے مختلف ہے۔مختلف کا عمل بھی میرے تصور وقت میں شامل ہے۔وقت کی حرکت میں مادے کی جنبش وحرکت شامل ہےاور خود انسان ایک مادی طاقت ہے لیکن باشعور۔یہ مارکسی نقطہ نگاہ ہے اس کے ابتدائی نقوش ہندو تصور وقت میں ملتے ہین۔اگر آپ ایک خواب اور، میں میری نظم ''میرا سفر'' دیکھیں نظم 'برہنہ فقیر'' یا ''شعور'' پر نظر ڈالیں تو میرے تصور وقت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔مٹی دنیا کو سلام، میں میں نے پہلی بار اس تصور کو ذرا پھیلا کر پیش کیا تھا۔291

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے لکھا ہے ''علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں اور اساس گزاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اس تحریک کے اصولوں کے مطابق شاعری بھی کی اور تنقید بھی لکھی۔اپنی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے ترقی پسند تحریک پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا اور پوری شدومد کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی مدافعت کی۔وہ ترقی کے رنگ مین اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مکتوبات میں بھی وہ حسب موقع اس تحریک کے وکیل دفاع کا رول انجام دیتے نظر اتے ہیں۔

ایک مرتبہ مظہر امام نے جعفری صاحب کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

''میرے نزدیک ترقی پسند چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہونے کا نام نہیں۔

مظہر امام کے اشارے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے جعفری صاحب انھیں جواب دیتے ہیں:

''مجھے آپ کے اس رویے سے بالکل اختلاف نہیں، لیکن اگر اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ ترقی پسند شعراء چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہیں تو مجھے شدید اختلاف ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی کی شاعری سکہ بند تصورات میں محصور ہے؟''

آگے وہ جدیدیت کے علمبرداروں کو ہدف تعریض بناتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ذرا فرصت ملے تو میں اس پر ذرا تفصیل سے بات کروں گا اور ان سکہ بند تصورات کی فہرست پیش کروں گا جو ہر جدیدیت کے حامی شاعر کے یہاں دوہرائے جارہے ہیں اور بری اور کمزور شاعری کی شکل میں دوہرائے جارہے ہیں''۔292

مکتوب سردار جعفری بنام راج بہادر گوڑ مورخہ 9 جنوری 1975 میں جعفری صاحب نے اقبال اور سوامی وویکانند کی شخصیتوں اور ان کے افکار کا تقابل کیا ہے:

''سوامی وویکانند اور اقبال میں عجیب وغریب مماثلت ہے۔ وہ محترم (یعنی وویکانند) آزادی کے پروانے مگر ہندو احیاء پرست (hindu revivalist) تھے۔ اقبال مسلم احیاء پرست تھے۔ یہ احیاء پرستی انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے میں بھی مل جائے گی اور سرسید میں بھی۔ پہلے کلکتہ میں ہندو کالج بنا پھر علی گڑھ میں مسلم اورینٹل کالج۔ پہلے بنارس میں ہندو یونیورسٹی قائم ہوئی پھر علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی اور بنارس کی یونیورسٹی کے ساتھ ہندو کے لفظ پر ٹیگور نے اصرار کیا لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندو احیاء پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور مسلم احیاء پرستی نمایاں ہوجاتی ہے۔ اقبال مسلم بیداری کا شاعر ہے۔ اشتراکیت کے معاشی نظام میں اسلامی رومانیت کی آمیزش کے ساتھ۔ سوامی وویکانند ہندو بیداری کے نقیب ہیں۔ ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ ہندوستان کی بیداری کے نقیب ہیں۔ حب الوطنی اور ماضی پرستی کے ساتھ جس میں مسلمان کی سمائی نہیں ہے اور عالمگیر انسانیت کی بیداری کے نقیب ہیں۔ ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ لیکن اشتراکیت یا معاشی نظام کا کوئی انقلابی پہلو ان کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن ان کی یادگار آزاد ہندوستان میں بڑے شاندار طریقے سے قائم کی گئی ہے اور اقبال کو گزشتہ ستائیس سال سے راندۂ درگاہ بنا کر رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے لکھا ہے:

مندرجہ بالا مکتوب میں سردار جعفری کا یہ تجزیہ کہ اکثریتی فرقہ پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور اقلیتی احیاء پرستی نمایاں ہوجاتی ہے کس قدر صائب اور درست ہے! جعفری صاحب نے یہ رائے یوں ہی قائم نہیں کی ہے۔ اس کے پیچھے موجودہ تاریخی صورت حال اور دونوں فرقوں کی نفسیات سے گہری آگہی کارفرما ہے۔ 293

سردار جعفری جدیدیت اور جدیدیت سے متاثر فن کاروں سے ناراض رہتے تھے۔ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کھلے طور پر کردیا کرتے۔ اپنے مکتوب بنام پروفیسر سید محمد عقیل رضوی مورخہ 10 نومبر 1979ء کو جدید افسانہ نگاروں کے متعلق اپنی رائے سے مطلع کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پنجرے کا آدمی (رتن سنگھ) چوراہے پر ٹنگا ہوا آدمی (انور قمر) سواری (خالدہ اصغر) دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) اور کالے ناگ کے پجاری (سلام بن رزاق) میرے نزدیک خراب افسانے ہیں۔ یہ جدیدیت کے اس نقطہ نگاہ کی ترجمانی

کرتے ہیں کہ انسان ازلی اور ابدی طور پر بے بس ہے۔ظالم اور مظلوم کا فرق نمایاں کرنا ترقی پسندی اور پروپگنڈہ ہے اور جدید افسانہ اس سے بے نیاز ہے۔زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانے کمزور ہیں۔جہاں تک سمبالک افسانہ نگاری کا تعقل ہے اس کی بہترین مثالیں ہمارے انتخاب میں شامل ہیں جیسے کشتی (انتظار حسین) کونپل (انور سجاد) اور بجوکا (سریندر پرکاش) اس بات کی ابتداء کہ ظالم اور مظلوم کا فرق ضروری نہیں ہے حسن عسکری نے پاکستان بننے کے بعد کی تھی اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن کے اعتبار سے زمانہ ظالم اور جاہل ہے۔اس بیان کو میں قرآن کی غلط تاویل سمجھتا ہوں۔رتن سنگھ، انور قمر، خالدہ اصغر، اقبال مجید اور سلام بن رزاق نے جس ذہنیت کا اظہار ان افسانوں میں کیا ہے۔اس کی تشکیل 1930 کے بعد کالنک ووڈ نے اپنی کتاب the principle of Art میں کی تھی۔جن افسانوں کا میں نے اوپر نام لیا ہے وہ اسی قسم کی ذہنیت کے ترجمان ہیں لیکن ن کے مصنف باشعور رجعت پرست نہیں ہیں وہ سب کے سب جدیدیت کے پروپگنڈے کا شکار ہیں۔فی الحال ان کو ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے۔

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے لکھا لطف یہ ہے کہ جدیدیت سے اس ابا اور جدیدیت پسندوں سے اس ابکار کے باوجود سوائے خالدہ اصغر کے مذکورہ بالا تمام افسانہ نگاروں کے افسانے جعفری صاحب نے گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کئے ہیں۔

294

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے سردار جعفری کے نام اپنے خط میں فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' کو رنگائی ادب میں شامل کیا تھا۔

سردار جعفری نے فیض کو اپنے خط مورخہ 3 مئی 1991 میں لکھا:

''آپ نے فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' کا ذکر کیا ہے۔میرے نزدیک وہ جدید مرثیہ نہیں ہے بلکہ مرثیہ ایک سرے سے ہے ہی نہیں۔اس میں مست، رقصاں اور دست افشاں قسم کے الفاظ بھی ہیں۔فیض کے آہنگ میں ان اشعار کا گاتا اور گنگناتا ہوا رقص الفاظ نہیں ہے۔تالیاں بجانے کی آواز اچھی نظم ہے۔صرف ایک مصرعہ کھٹکتا ہے۔

دست ِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
یہ غالب کے مصرعے کی نئی تشکیل ہے
مرنے کی دل اب اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازو سے قاتل نہیں رہا

غالب الفاظ کا بہتر مزاج داں ہے اس لیے شایان کا لفظ بغیر اضافت کے استعمال نہیں کیا ہے۔شایان دست و بازوے قاتل، کا ایک اپنا حسن ہے۔ 295

بقول ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس، اس خط میں اس فقرے، غالب الفاظ کا بہتر مزاج داں ہے کی بلاغت قابل داد ہے۔

سردار جعفری نے اپنے مکتوب مورخہ 23 اپریل 1996 بنام عادل اسیر دہلوی میں عادل اسیر کی کتاب ''بچوں کی رباعیات'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

آپ کی چھوٹی سی کتاب ''بچوں کی رباعیاں'' ملی۔رباعیات اچھی ہیں۔زبان سادہ ہے لیکن تین رباعیوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔صفحہ 6 پر دوسری رباعی میں یہ مصرعہ ہے ؎

بہتر نہیں اسلام سے مذہب کوئی یقیناً مسلمان کے لیے اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے،لیکن عیسائی اور اہل ہنود اس عقیدے کو کیوں تسلیم کریں گے۔اس مصرعے کو بدل دیجئے تو بہتر ہے اور یہ اسلامی روح کے مطابق ہے ؎

اللہ نے پورا کیا اپنا انعام
قائم ہوا دنیا نظام اسلام

ہر قوم میں بھیجے ہیں پیمبر اس نے (یعنی خدا نے) قرآن نے دنیا کو دیا ہے۔پیغام اب یہ رباعی ہر مذہب کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔پوری رباعی قرآن شریف کی آیات کے مطابق ہے پھر بھی سب کے لیے ہے۔اسی طرح صفحہ 7 کی دوسری رباعی کے آخری دو مصرعے بھی نظر ثانی کے محتاج ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ: ؎

اللہ کے حق سے جو رہے گا غافل
ہے انسان کے حق بھی نہ کرے گا پورے

اسے یوں لکھنا بہتر ہوگا۔ ؎

انسان کے حق سے جو رہے گا غافل
اللہ کے حق بھی نہ کرے گا پورے

ہمارے بزرگ صوفیائے کرام کا ارشاد ہیکہ دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے یہ حق تعالیٰ اور حق العباد کا مسئلہ ہے۔ آٹھویں صفحے کی دوسری رباعی نشتر رگ جان کی ترکیب خوب صورت ہے لیکن زبان بچوں کے لیے مشکل ہے۔اسے درست کیجئے۔296

علی سردار جعفری نے جان نثار اختر کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

1۔ تمہاری شاعری (جاں نثار اختر کی شاعری) ہمعصر شعراء کی طرح چالیس سالوں کے طوفان سے گزری ہے۔مگر تمہاری آواز کی کھنک آج بھی باقی ہے تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ تمہاری شاعری سچی ہے جیسے گنگا اپنی روانی میں ہر طرح کے ندی نالوں کا پانی سمیٹتی جاتی ہے لیکن اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھتی ہے اسی طرح تمہاری شاعری نے ہر قسم کی نظریاتی اور غیر نظریاتی آلائشوں اور لطافتوں دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اس کے بعد بھی پاکیزہ ہے۔یہ بہت بڑی بات ہے۔وہ شاعر جن کے پیش نظر کوئی نصب العین ہوتا ہے وہ ان طوفانوں سے گزرنے پر مجبور ہیں۔

2۔مجموعی طور سے تم نے اور میں نے ترقی پسند تحریک کے نظریہ ادب کو قبول کیا اور اپنی شاعری کو تحریک آزادی کے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔اس کے بعد بھی داخلی طور سے میرے اور تمہارے نظریۂ شعر میں اختلاف مل جائے گا۔یہ اختلاف اس مزاج کی دین ہے جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کرتا ہے۔تمہارے نظریۂ ادب میں عاشقانہ شاعری کا بھی ایک

بلند مقام ہے اور نظریاتی شاعری کا بھی، جس نے تمہاری شاعری کو شعلوں کی آغوش میں کھلے ہوئے پھلوں کی طرح بنا دیا ہے۔ اس میں لطافت بھی ہے اور حرارت بھی اور یہ امتزاج فن کو بلند تر سطح پر لے جاتا ہے۔تم نے ظلم اور غلامی کے خلاف احتجاج کیا اور انسان کی عظمت کی سربلندی کے لیے قربانیاں دیں۔اسکی آنچ تمہارے شعر میں ہے.....تم نے اپنی شاعری کو جس مقصد کے لیے نذر کیا اس کی تپش تم سے ایسے اشعار بھی کہلواتی رہی جن میں زمانے کے درد و غم کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش ہے۔اس کی بڑی حسین مثال تمہاری نظم ''ایک زخم تمنا اور سہی ہے.....''ایک خاک دل، خاموش آواز، ان نظموں میں زندگی کا مثبت تصور ہے جو غم کو غم تو سمجھتا ہے لیکن دنیا کے مسائل سے چشم پوشی نہیں سکھاتا۔آخری لمحہ یہ ایسی نظم ہے کہ جس پر کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔297

شاعری کا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہوتا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا ہے،، میں برسوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاعری کا کوئی ایسا ہمہ گیر نظریہ نہیں ہے جو ہر طرح کی ترجمانی کر سکے مثلاً کارل مارکس نے لکھا 'ادیب اپنی تخلیق کو (کسی مقصد کا) ذریعہ ہرگز نہیں سمجھتا۔اس کی تخلیق بجائے خود (آخری) مقصد ہے''۔298

سردار جعفری نے اپنے مکاتب میں بعض ادیبوں اور موضوعات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں۔

1۔جوش صاحب توجہ کے مستحق ہیں۔ان کی عظمت سے انکار کر کے ترقی پسند ادب اور تحریک کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

299

2۔ سجاد ظہیر کی خدمات یادگار اور بے مثال ہیں۔وہ ہمارے لیڈر رہتے اور بہت اچھے انسان اور دوست۔انھوں نے کئی اصناف میں بڑے کامیاب تجربے کیے۔تحریک کے لیے جو انھوں نے کیا اس کو سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔300

3۔غزل: اردو کا نظام شاعری غزل کا پروردہ ہے۔اس لیے شاعری کے نئے مزاج سے نا آشنائی عام ہے۔میں غزل کا عاشق ہوں لیکن غزل زدہ ہونے کو نیک فال نہیں سمجھتا''301

خطبات و تقاریر:

سردار جعفری کی تنقید کے سلسلہ میں ان کے خطبات اور تقاریر بھی اہم ذرائع ہیں۔چند دستیاب خطبات و تقاریر میں سردار جعفری کی تنقید پیش کی جا رہی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ نظام خطبات کے لیے لکھے گئے مقالوں پر مشتمل ہے۔اسے سردار جعفری نے اکتوبر 1984 میں پیش کیا تھا اور جنوری 1985ء میں نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے از سر نو تیار کیا۔شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے اسے پہلی بار 1987 میں شائع کیا تھا۔اس کتاب میں دو خطبے شامل ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا استقبالیہ۔ پروفیسر آباد احمد کے کلمات صدر، سردار جعفری کا بایو ڈاٹا اور علی سردار جعفری کا تحریر کردہ حرف آغاز میں انھوں نے خطبوں کے بارے میں لکھا ہے:

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے مجھ سے نظام خطابت کی فرمائش کر کے میری عزت افزائی کی۔ میرے پاس فیض احمد فیض اور سبط حسن کے دو انٹرویو تھے۔ ان کے اہم اقتباسات دوسرے خطبے میں حواشی کے طور پر شامل کر لئے گئے ہیں۔

سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے قومی اور بین الاقوامی اسباب پر توجہ مرکوز کی گئی۔ مجاز کی شاعری کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا بھی ایک خاکہ کھینچا گیا۔

سردار جعفر نے ترقی پسند تحریک، تنظیم اور تخلیق کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے انسان کے بیدار ضمیر کی صدائے بازگشت ہے۔

تنظیم تحریک کی کامیابی کے لیے آسانیاں فراہم کرتی ہے اور تخلیق تحریک کا حاصل ہے کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیق اور تھریک ساتھ ساتھ چلتی ہے اور تنظیم کے بغیر بھی کامیاب ہوتی ہیں۔ البتہ تنظیم بہتر کامیابیوں کی ضمانت فراہم کر سکتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ادبی اور فکری تحریکوں میں تنظیم وہ کردار ادا نہیں کرتی جو سیاسی تحریکوں میں ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ادبی تنظیمیں ڈھیلی ڈھالی رہی لیکن تنظیم کی کمی کو تحریک کے شباب کے زمانہ مین ادیبوں کے جوش وخروش نے پورا کیا ہے۔ تخلیق کی شدت اور حرارت نے کسی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔302

سردار جعفری نے اپنے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کے تحت وہ دسمبر 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکالے جانے لگے اور اس شرط پر یونیورسٹی نے انھیں رہنے کی اجازت دینے کا وعدہ کیا کہ اگر یونیورسٹی کا کوئی استاد ان کے اخلاق و کردار کی ذمہ داری لے لے تو وہ یونیورسٹی میں رہ سکتے ہین۔ ان حالات میں سردار جعفری اگر چہ بڑے اعتماد کے ساتھ رشید صاحب کے پاس گئے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔303

پہلے مقالے کے آخر میں رشید احمد صدیقی کے مئی 1953 میں منعقد بہار اردو کانفرنس (پٹنہ) کے خطبہ صدارت کے یہ کلمات درج کئے گئے جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی خدمات کی ستائش کی تھی۔

تقسیم ملک کے بعد جو قیامت مچی اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکرا لینے میں ترقی پسند مصنفین کا قلمی جہاد صرف اردو ادب میں نہیں بلکہ اس دیس کی تاریخ میں شکر گذاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ ان قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود مین آئی جن کا اردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔304

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، کے دوسرے خطبے میں سردار جعفری کے تنقیدی مطالعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا نے لکھا ہے:

1۔ 1980ء کے آتے آتے ان (سردار جعفری) پر یہی آشکار ہو گیا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی انتہا پسندی ادب کے لیے مضر ہے۔ لیکن انھوں نے ترقی پسندی میں در آئی انتہا پسندی کو ختم کر کے معتدل اور متوازن ترقی پسندی کی بات کی۔ انھوں نے بنیادی طور پر ترقی پسند ادب ہی کو اعلیٰ ادب تصور کیا ہے۔ یہاں تک کہ مذکورہ کتاب میں اگر چہ ترقی پسند تحریک

میں درآئی انتاپسندی کا اعتراف کیا ہے لیکن اس پر عائد کیے گئے تمام الزامات کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے مدلل انداز میں رد بھی کیا ہے جس سے ترقی پسند تحریک سے ان کی گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ اب وہ جمالیاتی اقدار کی اہمیت کو کھلے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔305

ترقی پسند ادب ہندوستان کی تحریک آزادی اور سامراجی استحصال کے خلاف عالمگیر جدوجہد کا حصہ بتاتے ہوئے ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔

انھوں نے بتایا:

ترقی پسند ادب تحریک آزادی سے واضح وابستگی رکھتا تھا، سامراجی استحصال کے خلاف، اس میں جغرافیائی، نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ہماری ہمدردیاں، دنیا بھر میں برپا ہونے والی ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں۔ ایک طرف ملکی اور مقامی سطح پر ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہا جاسکتا تھا اور دوسری طرف کرہ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں سے اغماض ممکن نہ تھا۔ یہ تھا پس منظر جس میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس میں دو عالمی جنگیں اور قحط بنگال کی ہولناکیاں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب میں اس صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے ثبوت فراہم کردیئے ہیں۔ 306

10 تا 12 جنوری 1992ء کو دہلی اردو اکادمی نے عصمت کی یاد میں بعنوان ''عصمت چغتائی اور نیا اردو افسانہ'' سہ روزہ سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ اس سیمینار کے اختتامی اجلاس میں سردار جعفری نے شرکت کی اور اپنی تقریر میں کہا:

''عصمت سے متعلق میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے''۔

میری ان کی دوستی اور رفاقت کا سلسلہ تقریباً پچاس سالوں پر محیط ہے۔ لیکن میں یہاں کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا اور نہ ہی اختتامی اجلاس میں اس کا موقع ہے۔ میں صرف دو باتیں اٹھانا چاہوں گا جن کو پڑھ کر مجھے تکلیف پہنچتی ہے پہلی تو ان کی زبان کے بارے میں ایک بزرگ نے لکھا کہ وہ نقل کرتی ہیں۔ دہلی کی کرخنداری زبان کی دوسرا الزام ان پر جنس کے حوالے سے لگایا جاتا ہے۔ 1939ء میں ان کی پہلی کہانی گیندا، نیا ادب یا ساقی میں شائع ہوئی اور آخری کہانی تھی ننھی کی نانی۔ دونوں کے درمیان ان کے یہاں جو جنسی مسائل ہیں وہ محض چٹخارے کے لیے نہیں ہیں بلکہ پورا سماجی شعور کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسکے پیچھے جو نظام اور خاص طور پر مردانہ نظام کام کرتا ہے، عصمت اس پر چوٹیں کستی ہیں۔

زبان کے متعلق انھوں نے کہا کہ ''آپ غالب کی نقل کرسکتے ہیں لیکن گھروں میں بولی جانے والی بولیوں کی نقل کرنا مشکل کام ہے اور عصمت نے یہ مشکل کام کر دکھایا ہے۔ انھوں نے گھریلوں زبان کو تخلیقی اعجاز عطا کیا۔ عصمت پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لکھتی ہیں۔ بڑے مسائل ان کی نظر میں نہیں تھے جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں انھیں نہیں معلوم کہ زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہی بڑی بنتی ہے۔ تاج محل اپنے آپ بڑا نہیں بن گیا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے تراشا گیا تب جا کر فن کا ایک شاہکار بنا۔ عصمت کا وژن، سطح بہت بلند ہے اور بلند رہے گی۔ میں عصمت کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہا رکرتا ہوں۔ 307

23 نومبر 1993 کو اپنی ایک تقریر میں سردار جعفری نے میر، غالب کے بعد اقبال کا درجہ بتلایا ہے۔ سردار جعفری، اقبال کی شاعری میں انسانی عظمت کی بات سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے اعتراف میں کوتاہیوں پر افسوس کا اظہار کیا۔

اردو میں میر، غالب کے بعد اقبال کو میں سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ ابھی تک اقبال کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ حسرت، یگانہ، فانی وغیرہ سبھی اقبال کے اعتراف میں کوتاہی برتتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اقبال کا اعتراف ایک عالمی ذہن کے شاعر کا اعتراف نہیں ہے۔ ہندوستان میں ان کا سارے جہاں سے اچھا تک کا ہی اعتراف ہے۔ پہلی بار ترقی پسندوں نے اقبال کا اعتراف کیا۔ اگر چہ وہ بھی محدود ہے۔ مجھے یاد ہے غالباً پہلی بار 1964 میں اقبال پر پہلا عالمی سمینار کیا گیا۔ اس میں میں نے صاف محسوس کیا کہ پروفیسر نورالحسن اور بنے بھائی جیسے ترقی پسند حضرات بھی اقبال کے بارے میں اپنے تحفظات رکھتے تھے۔ اصل میں یہ حضرات لکھنوی تہذیب کے تربیت یافتہ تھے اور مشکل سے اقبال کو قبول کر پاتے تھے لیکن آہست آہستہ تبدیلی آرہی ہے۔ بڑا شاعر کئی طرح کے تجربے کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی تمام شاعری ایک طرح کی ہو۔ اقبال کے ہزاروں اشعار ایسے ہیں جن میں آہنگ نہیں ہے شکوہ میں بھی زیادہ آہنگ نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں انسانی عظمت کو للکارا ہے۔ 308

اردو اور غالب کو گھر چاہئے۔ اس عنوان کے تحت علی سردار جعفری کا خطبہ کتاب نما جولائی 1998ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کی ابتداء میں ادارہ کتاب نما نے یہ نوٹ درج کیا ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے 5 جون 1998 کو مشہور و معروف اردو شاعر علی سردار جعفری کو 1997 کا گیان پیٹھ انعام پیش کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جعفری صاحب کو یہ انعام دے کر ہم خود اپنی عزت بڑھا رہے ہیں۔ جعفری صاحب نے اپنے خطبے میں اردو شاعری کی سیکولر سرشت ہند اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اردو کے کردار، تقسیم ہند کے ہاتھوں اردو کو پہنچنے والے نقصان، فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت، اردو اور غالب کی بے گھری اور نیوکلیر جنگ کے خطرات جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس خطبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے:

اردو زبان کی وسعت کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

اردو نہایت خوب صورت اور دل آویز زبان ہے۔ اس کے ہزار بارہ سو کلاسیکی استعاروں میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معنی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع، ہر محل، ہر کیفیت، ہر مزاج کا شعر زبان پر آہی جاتا ہے اور انسانی جذبات کی کہکشاں میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر میری گرفتاری (دسمبر 1945 میں جنگ کے خلاف شاعری کرنے کے جرم میں) پر اسی طرح صادق آئے جیسے اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرادیں گے کیا

اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور قوم کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بیگانگی کا انداز ہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے پاس صوفیانہ روایت کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے۔ شیخ، ناصح، واعظ، زاہد، محتسب، ملا اور اسی قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ ان کی تنگ نظری، انتہاپسندی، ظاہرداری، مکاری اور خودپسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ ان کے تصور مذہب اور تصور جنت و دوزخ، عذاب و ثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں رندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جس کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔ اللہ حسین ہے اور حسن سے محبت کرتا ہے اور حسن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں۔309

جدید دور کی ابتداء ہندوستان کے دور غلامی میں اردو کا سیاسی کردار، اردو کے مجاہد آزادی کے بارے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:

میرے نزدیک جدید دور کی ابتداء غالب کی پیدائش سے چالیس سال پہلے 1757ء تھی جب کہ پٹنہ کے شاعر راجا رام موزوںؔ نے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایک شعر میں نہایت دل سوز مرثیہ کہا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ ہندوستان کی غلامی کی ابتداء تھی جس کی تکمیل 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہوئی اور ملکہ وکٹوریا قیصر ہند کا لقب اختیار کرتے ہوئے ہندوستان کی مہارانی بن گئی۔ 1757ء سے 1947ء تک 190 برس اردو شعر و ادب کے سب سے زیادہ زریں سال ہیں۔ اس زمانے میں اردو نے اپنا جمالیاتی کردار بھی ادا کیا ہے اور سیاسی کردار بھی۔ اردو کے بے شمار ادیب اور شاعر جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ادیب اور عالم بھی شامل ہیں جنھیں اخبار شائع کرنے کے جرم میں قتل کردیا گیا یا جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام ہیں جو اپنے وقت کے بڑے عالم اور غالب کے گہرے دوست تھے۔

تقسیم ہند کے ہاتھوں اردو کو پہنچنے والے نقصان اور اردو اور غالبؔ کی بے گھری، فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت اور نیوکلیر جنگ کے خطرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں:

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں۔ اردو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہوگئی۔ تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دوسو سالہ جشن اور آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندوستان میں اپنا علاقہ جہاں سے وہ

ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔اس کی مثال بہار کی ریاست میں موجود ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔اس کے بعد ہی ہم وسیع تر قومی اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں اور حب الوطن کے چمن میں مختلف تہذیبوں مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔میرے ذہن میں اتحاد اور دوستی کا جو تصور ہے وہ بہت حسین ہے۔میں اس خیال سے خوف زدہ ہوں کہ اگر خدانخواستہ نیوکلیر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا۔میری پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔کسی کو نہیں معلوم کہ قیام کب آئے گی۔مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اتر کر سوا نیزے کے فاصلہ پر آجائے گا۔میں سوچتا ہوں کہ کیا نیوکلیر جنگ اس سے کم بھیانک ہوگی۔310

سردار جعفری نے اپنے ایک خطبہ میں غالب کی عظمت اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ غالب کا کلام اداسی مایوسی، دکھوں سے نکلنے اور نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔غالب پورے عہد پر حاوی تھے اور ان کے مختصر دیوان میں ساری کائنات کی جھلکیاں موجود ہیں:

1۔ہم نے موضوع سخن آج کی شام کے لیے یہ رکھا تھا کہ غالب کی کہانی سردار جعفری کی زبانی،اس میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ میں غالب کو کس نقطہ نگاہ سے آپ سب کے سامنے پیش کروں کیوں کہ یہ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم اور الہام پورے عہد پر حاوی ہوتا ہے اور عہد ماضی حال اور مستقبل میں تبدیل نہیں ہوتا ہے۔تقسیم بھی نہیں ہوتا ہے وہ تقسیم ہم کر لیتے ہیں، اپنی سہولت کے لیے ورنہ وہ پورے عہد پر حاوی ہوتے ہیں۔غالب پورے عہد پر حاوی ہیں۔وہ عہد جوان کے زمانے میں ختم ہو رہا تھا۔وہ ایک پوری تہذیب تھی۔کئی ہزار سال کی پرانی تہذیب جس کے پاس علم کی، سائنس کی فلسفہ کی، شاعری کی بہت بڑی دولت تھی۔اس دولت سے استفادہ کرنا، اس کو پہچاننا بھی ضروری تھا۔اس عہد کے انسانوں کے لیے اور بعد کے انسانوں کے لیے ہم لوگوں کے لیے بھی اس عہد کو سمجھنا بہت ضروری تھا۔آج ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں اس میں پرانی قدریں یا تو پامال کر دی گئی ہیں یا پامال ہو گئی ہیں یا فرسودہ ہو گئی ہیں لیکن ہم ان قدروں کے لیے ترستے ہیں۔غالب کے عہد میں جو تہذیب ختم ہو رہی تھی اس کا غالب نے ماتم کیا ہے اور وہ تہذیب جو غالب کے شعور و احساس کا حصہ تھی جس کو غالب چاہتے تھے کہ وہ آئے اور ہندوستان کی برکت کا باعث بنے۔غالب آج زندہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں شریک ہیں۔ہم لوگ اردو والے ہمارے یہاں کی ایک تہذیب ہے۔ہم لوگ اسکا حصہ ہیں اور وہ تہذیب یہ ہے کہ ہمارے سینہ میں ہمارے شاعر زندہ ہیں۔ہم اپنے تمام گزرے ہوئے شاعروں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی شاعری سے کام لیتے ہیں اور لذت بھی حاصل کرتے ہوئے شاعروں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی شاعری سے کام لیتے ہیں اور لذت بھی حاصل کرتے ہیں، سکون بھی حاصل کرتے ہیں اور نجات بھی حاصل کرتے ہیں۔کوئی بہت ہی ظالم اور سفاک آدمی ہو اس کے لیے ہم کافر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔کافر کا مطلب ہے سچائی اور حقیقت سے انکار کرنے والا اور کلام مجید میں کافر کا لفظ جب آیا ہے تو وہاں کے حالات کے مطابق تھا۔ہندوستان کے بارے میں نہیں تھا۔یہ فتویٰ میں دے سکتا ہوں بغیر عربی پڑھے

ہوئے لیکن ہم اب اپنے محبوب کو بھی کافر کہتے ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

یہاں اس منزل پر پہنچ کر کوئی شاعر ہمیں غالب کے قریب کھڑا نظر نہیں آتا کہ جس کے یہاں وسعت اتنی زیادہ ہو اور دس بارہ سو شعر میں یا چودہ پندرہ سو شعر سولہ سو شعر دیوان غالب جو مرتبہ دیوان غالب ہے اس میں یہ ساری کائنات موجود ہے۔

2۔ ہمیں غالب کی شاعری میں بھی پست اور خشک اور تر اشعار ملیں گے جو بے شمار ہیں اور ہماری زندگی میں کام کرتے ہیں رہنمائی کا۔ اداسی کی گھڑیوں سے باہر نکلنے میں مدد دیتے ہیں۔ مایوسی سے نکالنے میں مدد دیتے ہیں اور نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمیں ان دکھوں سے بھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کا علاج نہ تو اس شاعر کے پاس ہے اور نہ ہمارے پاس اور نہ کسی اور کے پاس۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس کے علاوہ غالب کی زندگی میں ہمیں اور بہت سارے سبق ملتے ہیں کہ بدی کے اس عالم میں زندگی کیسے بسر کی جائے"۔311

اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں سردار جعفری نے بتایا کہ شاعری نہ صرف سامع اور قاری کے لیے باعث تسکین ہے بلکہ شاعر کے لیے بھی۔

سردار جعفری نے کہا: میں شاعری کو بنیادی طور سے گانے کی چیز یا بلند آواز میں پڑھنے اور سنانے کی چیز سمجھتا ہوں۔ شاعری کے جوہر اس کے بغیر نہیں کھل سکتے۔لیلکن اس کے باوجود شاعری کو اس قدر ہونا چاہئے کہ کاغذ کے صفحہ پر چھپ سکے اور خاموشی سے پڑھی جا سکے اور صدیوں کا سفر طے کر سکے لیکن کاغذ پر پڑھنے میں بھی الفاظ کا آہنگ اور لحن تخلیق کا صوتی تلاطم اور ترنم روح کو محسوس ہوتا ہے۔خاموشی سے پڑھنے پر بھی انسان کے دل و دماغ لفظ کی آواز کو سنتے ہیں۔شاعری اس حد تک مقصود بالذات ہے کہ اس کی تخلیق میں کرب کے باوجود ایک لذت ہے اور یہ لذت شاعر کے لیے تسکین کا باعث ہے اور اسے معاوضے اور انعام سے بے نیاز کر دیتی ہے۔312

شاعر کی ذات اور معاشرے اور کائنات میں تعلق کے بارے میں سردار جعفری نے کہا:

"الفاظ معنی کی علامتیں ہوتے ہیں۔یہ معنی لغوی بھی ہو سکتے ہیں اور خلاقانہ بھی جنھیں شاعری کی شاعرانہ بصیرت نے نیا رنگ دیا ہے۔اس سے شاعر اور قاری شاعر اور سامعین کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے شاعری سماجی کردار حاصل کر لیتی ہے اور اس میں ایک مقصد شامل ہو جاتا ہے۔اس طرح شاعر کی ذات تنہا نہیں رہ جاتی بلکہ معاشرے اور کائنات کا ایک حصہ بن کر ابھرتی ہے۔شاعر کا موضوع زندگی کا کرب و نشاط ہے۔انسانی دکھ اور سکھ ہیں۔اسکی ذاتی خوشیاں اور محرومیاں بھی عام عالم انسانی کی خوشیوں اور محرومیوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔وصل کی لذت اور ہجر کا درد بھی محسوس کرتے ہیں۔ظلم سے

نفرت اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ ہر دل میں ہوتا ہے لیکن شاعر اپنے انفرادی تجربے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کو وہ بات اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ہر شخص اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ لحن و آہنگ الفاظ کو نئی خوبصورتی عطا کرتے ہیں جو سامع اور قاری کے لیے دلکشی کا باعث ہوتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے نئی معنوی تہیں پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح شعر کی معنوی کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ پڑھنے اور سننے والے شعر کی فنی خصوصیات سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شعر کہنے کی طرح شعر کو سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس طرح دونوں اس تخلیقی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ شاعر اور معاشرے کا رشتہ ہے۔313

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پچیسویں کل ہند کانفرنس 10 مارچ سے 12 مارچ منعقد ہوئی۔ اس کے تحت یک کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین سمینار ہوا جس کا موضوع ادب، زندگی اور نظریہ تھا۔ اس میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ایک مقالہ ادیب کا منصب اور ترقی پسند احساس پیش کیا۔ اس پر رضی الرحمٰن اور حفیظ اللہ نے ایک سوال نظریہ سے سے متعلق کیا۔ مقالہ نگار نے جواب دیا۔ سردار جعفری نے مداخلت کی اور نظریہ کیا ہے،۔ اس پر مختصر اُروشنی ڈالی۔ اس کے بعد کمال احمد صدیقی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ پر فرزان کیفی نے ایک سوال پوچھا ''آپ نے اپنے مقالے میں بار بار بنیاد پرستی کا لفظ استعمال کیا تو آپ بنیاد پرستی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ وضاحت فرمایئے۔ کمال صاحب کے جواب سے فرزان صاحب مطمئن نہیں ہوئے اور کچھ اور پوچھنے لگے۔ سردار جعفری نے پھر مداخلت کی اور لفظ بنیاد پرستی پر روشنی ڈالی۔ ساجدہ زیدی کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے سردار جعفری نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی اہمیت اور حفاظت کی ضرورت پر زور دیا۔ سردار جعفری کی وضاحتیں پیش ہیں:

1)نظریہ:

سردار جعفری نے کہا:نظریہ تو دراصل فلسفہ حیات ہوتا ہے۔ جو ادب میں داخل ہوتا ہے اور ہر ادیب کا ہوتا ہے۔

2فن:

فن کیا ہوتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا جواب تو ارسطو سے آج تک کوئی نہ لے سکا۔ فن وہ ہے جو دل کو چھو لے۔ بس اس کے علاوہ کوئی بھی جواب مشکل ہے۔

3۔بنیاد پرستی:

یہ بنیاد پرستی کا لفظ جو ان دنوں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے، یہ دراصل ہمارا لفظ نہیں ہے۔ یہ امریکہ کا دیا ہوا لفظ ہے ا س سے مراد انتہاپسندی ہے۔ مذہب خواہ کوئی بھی ہو اس کی انتہاپسندی خود اس مذہب کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ جو مذہبی ہے یا جس نے مارکس کو نہیں پڑھا ہے وہ اچھا ادب نہیں پیش کرسکتا۔ ٹیگور، قرۃ العین حیدر وغیرہ مارکسٹ نہیں ہیں لیکن انھوں نے بہت اچھا لکھا۔ اصل مسئلہ تو اقدار کا ہے۔ ترقی پسند اقدار تو صوفیوں میں بھی تھے۔ مارکس نے ان اقدار کو ایک سائنسی نظر دے دی۔ بس اتنا ہی ہوا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک چیچنیا کیا اور بھی مثالیں ہیں۔ اس سوال کو مذہب کے حوالے سے نہیں لینا چاہئے۔ عالم انسانیت پر جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے اس کے خلاف آواز اٹھنی چاہئے۔ ہم میں سے مارکس کے

ماننے والے ہوسکتے ہیں اور نہ ماننے والے بھی۔آپ اسلام کے راستہ سے آیئے یا مارکسزم کے راستہ سے اچھا ادب تخلیق کیجئے۔اچھے ادب کو کسی ایک نام سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔میں مارکسسٹ ہوں۔میرا عقیدہ ہے کہ مارکس نے اچھا نظریہ دیا ہے۔آپ یقین نہیں رکھتے نہ رکھیئے لیکن خدارا اسے جذباتی نہ لیجئے۔

(4)مشترکہ تہذیب:

یہاں ابھی ساجدہ زیدی نے مغربی کلچر کے یلغار کی بات کی۔یقیناً یہ بہت خطرناک بات ہے لیکن آپ ذرا غور کیجئے خود ہمارے ملک میں کیا کم قیامت برپا ہے۔گزشتہ دنوں بابری مسجد پر حملہ ہوا تو کیا یہ محض اینٹ گارے کی مسجد پر حملہ تھا۔دراصل یہ ایک مخصوص تہذیبی دین پر حملہ ہے جسے مغلوں نے دیا ہے۔خود اردو زبان پر بھی حملے ہورہے ہیں۔وہ اسی تہذیب پر حملے ہیں لیکن یہ لوگ بھول رہے ہیں کہ اگر یہ تہذیبیں ختم ہوگئیں تو ہندوستان ویران ہوکر رہ جائے گا۔یہ ہماری ذہنی لڑائی ہے۔روحانی لڑائی ہے۔یہ ایک طویل جنگ ہے جو چلے گی۔ہم ہندوستانی تہذیب میں جیتے ہیں۔میں اس کی مثال کنول کے پھول سے دینا چاہتا ہوں جسے غلطی سے ہندو پھول سمجھ لیا گیا ہے۔کنول کا پھول سب سے پہلے بدھزم میں آیا۔یہیں سے وہ اجنتا کی آرٹ میں پہنچا۔پھر ہندوستان سے مشرق کی طرف چلا گیا۔ادب میں مصوری میں استعاروں میں رچ بس گیا اور پھر سفر کرتے ہوئے مسجدوں کے مینار ومحراب میں پہنچ گیا۔گولکنڈہ کی مسجدوں میں آپ کو کنول کا پھول ملے گا۔یہ ہے ہماری مشترکہ تہذیب کی دین جو پانچ ہزار سال کی دین ہے۔آخر میں انہوں نے کہا:

''تو یہ ہے ہماری تہذیب جس کی ہم کو حفاظت کرنی ہے اور اس یلغار کو روکنا ہے اور اس روک میں سب سے بڑے سپاہی ہیں ادیب اور ترقی پسند ادیب،ادیبوں کا نام آتے ہی سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔پورے ماحول میں ایک حرارت سی دوڑ گئی۔تالیوں کی گونج میں بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ہم ہندوستانی ہیں ہم ہندوستانی مسلمان ہیں اور ہمارا حق اس تہذیب کی حفاظت ہے جو ہندوستان کی تہذیب ہے اور ہماری تہذیب بھی ہے۔314

نئی تشبیہات،نئے استعارے،نئی امیجری کو عصری ضرورت بتاتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

''پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کرلینا نادانی ہے کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہوجاتا ہے،،لیکن وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں کیوں کہ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے طریق اظہار اور انداز بیان کا مطالبہ کرتی ہیں۔اس لیے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہ اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں اور نئی امیجری بھی۔میں نے اس اصول کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں۔یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں گل وبلبل،شمع،پروانہ،دریا،ساحل،کشتی،.....رہزن،منزل،جادہ، سینا،ساغر،تیغ تفنگ ہی نہیں ملتے بلکہ روٹی،چاول،دنے،گیہوں،.....ریل،مشین،مزدور،رائفل،ٹینک،بمبار،چولہا،پتیلی اور اس قسم کے دوسرے عام الفاظ کی بہتات ہے۔315

انٹرویو اور ملاقاتیں

انٹرویو میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات میں سردار جعفری کی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں۔یہی چیز ملاقاتوں اور بات چیت میں بھی نظر آتی ہیں۔دستیاب انٹرویو اور ملاقاتوں کے حوالوں سے سردار جعفری کی تنقیدی آرا،تبصرے،وضاحتیں اور افکار ،وغیرہ پیش کیے جارہے ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

اگست 1985ء میں ایک انٹرویو میں سردار جعفری نے عصری آگہی کو تخلیق کی طاقت اور بنیاد بتلایا ہے۔

حسن عابدی نے اگست 1985ء میں سردار جعفری سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال یہ بھی کیا ''جعفری صاحب ترقی پسند تحریک نے جو منشور دیا تھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کے مختلف حالات میں وہ کافی ہے یا ہمیں کسی نئے منشور کی ضرورت ہوگی .....''سردار جعفری نے جواب دیا:

برنارڈ شاہ نے ایک مرتبہ بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ ''میرا درزی ہر سال آکے میرا ناپ لے جاتا ہے''تو یہ بات حالات اور ہمارے باہمی رشتے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔یہ بات تو یقیناً غیر متنازعہ ہے کہ ہمیں یعنی لکھنے والوں کو اپنے معروضی حالات کو جانچتے پرکھتے رہنا چاہئے کہ یہی عصری شعور کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے''۔اب جہاں تک 1936ء کے منشور کا حوالہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس منشور میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ بڑی حد تک اب بھی باقی ہیں لیکن جزئیات میں نئے رویے ہمارے متعین ہوئے اور ہو رہے ہیں۔کم از کم ہندوستان میں اس بات کو محسوس کرلیا گیا ہے اگر حالات سے بے بہرہ اور لاتعلق رہ کر کوئی ادب تخلیق کیا گیا تو وہ یقیناً نہ صرف اپنی طاقت سے محروم ہوگا بلکہ اپنی بنیاد سے بھی،اب جو عالمی صورت حال ہے اور دنیا کا دائرہ جس تیزی سے تنگ ہوتا جارہا ہے اور فاصلے جس سرعت سے اپنی طنابیں کھینچے جاتے ہیں تو یہ صورت حال بھی ہمارے لیے معروضی حالات کا حصہ بن جاتی ہے اور ان سب کا اپنے اپنے طور پر جائزہ لیا جاتا رہنا چاہئے .....اپنے ماحول اور اپنے عصری حالات سے لاتعلق ہوکر کوئی زندہ اور متحرک ادب پیدا نہیں ہوسکتا''۔316

حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک سے متعلق مشاہیرین ادب سے بات چیت میں کہا:

(1)''حلقہ ارباب ذوق کے ساتھیوں نے اردو نظم کو ہیتی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔نئی نئی فارمز کے تجربے جوان لوگوں نے کیے ہیں ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔نئی لفظیات کے سلسلہ میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابل تحسین رہا ہے''۔ 317

(2)''حلقہ ارباب ذوق کے لکھنے والوں سے فکری اعتبار سے نہ سہی تو اسلوبی اعتبار سے ترقی پسندوں نے اثرات یقیناً قبول کیے ہیں اور ترقی پسندوں کے اثرات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جن کا اعتراف ہر دو جانب سے کھلے طور پر ہونا چاہئے''۔318

ہندوستان اور پاکستان کی اردو شاعری کے اسلوب اور لہجے میں فرق کے سلسلہ میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے جہاں اپنے خیالات کا اظہار کیا وہیں سردار جعفری سے بھی ان کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر رہی معصوم رضا نے سردار جعفری سے 18/اپریل 1990ء کو انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا ''پاکستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اور ہندوستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اس میں میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان میں لہجے، زبان یا استعارے کی بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ انہیں استعاروں کو جو 1936ء سے چلے آ رہے ہیں اور لگ بھگ اسی زبان کو جو 1936ء سے چلی آ رہی تھی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، مگر ہماری شاعری میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہے .....ہمارے شاعر نئے طریقے کی زبان بنانے کی کوشش، نئے استعارے تلاش کرنے کی کوشش، اور نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ کوشش ہمارے ہاں جاری ہیں۔ یہ جو فرق ہے ہندوستان اور پاکستان کے اسلوب اور لہجے میں یہ فرق کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں سردار جعفری نے کہا:

''میرا خیال یہ ہے کہ فیض کو الگ کر دیجئے کیوں کہ وہ ایک طرز ہی الگ ہے لیکن ان کے بعد کے جو شعرا ہیں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں .....پاکستان کے .....ان کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے۔ ہمارے ہاں ایک نشاط کی لہر ہے جواب بھی باقی ہے۔ یہ چیز پاکستان کی شاعری میں مفقود ہے.....اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ آزادی سے پہلے تو روایت ایک ہی تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے ہاں باوجود تمام باتوں کے جمہوری مزاج ہے جو پاکستان کے ہاں نہیں مل سکتا۔ اس لیے ان کے ہاں غم اور احتجاج ہے۔ یہ ابھی تک چل رہا ہے۔ ایک اور چیز پاکستان کی شاعری میں در آتی ہے وہ ہے ہجرت۔ اور وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب جو لوگ اپنے پیٹ کی خاطر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو مہاجر کہلاتے ہیں .....اور اب تو ان کے ہاں یہ تین چیزیں ہیں غم کا لہجہ، احتجاج اور ہجرت کا تصور ہمارے ہاں احتجاج بہت ہے لیکن غم کے لہجے کے ساتھ نہیں اور ہجرت بھی نہیں ہے۔ راہی صاحب نے کہا ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں .....لیکن یہ شعراء ہندوستان اور پاکستان کے لڑکے جو اس وقت امریکہ اور کنیڈا میں جا کے بس گئے ہیں اور جو شاعری کر رہے ہیں اور صاحب دیوان شاعر بھی ہو گئے ہیں۔.....وہ پاکستان کی شاعری کی زبان سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اس پر جعفری صاحب نے کہا۔ ظاہر ہے کیوں کہ وہ پاکستانی ہیں اور ان کا مسئلہ پاکستان ہی ہے۔ آتے جاتے بھی رہتے ہیں تو وہ اس سے آزاد ہو بھی نہیں سکتے۔ البتہ اب ان کے ہاں کچھ تازہ کاری بھی آئی ہے۔ ایک اچھی شاعرہ ہے، عرفانہ عزیز۔ ایک تو وہ فیضؔ سے متاثر ہے۔ ترقی پسند شعرا سے متاثر ہے۔ اس کے پاس اپنی ایک آواز ہے۔ لہجہ ہے اور دانشوری ہے۔ اور یہ جو دانشوری ہے یہ نہ تو ہندوستان ابھی قبول کر رہا ہے۔ شاعری میں اور نہ پاکستان .....اس وقت پاکستان کی شاعری ذاتی کوائف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں بھی کیفیات کے ساتھ کہیے تو قبول کرتے ہیں اور جہاں دانشوری آئی اور ذاتی سطح سے جہاں ذرا بلند ہوئے، اس کو وہ نا قبول کرتے ہیں۔ ایک دوسری شاعرہ ہیں پاکستان کی عشرت آفریں۔ اس کے ہاں بھی بڑی نئی چیزیں ہیں .....اس میں دانشوری بھی ہے''۔ 319

راہی صاحب نے 18/اپریل 1990ء کو سردار جعفری سے انٹرویو لیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہماری شاعری بڑی اچھی ہے۔

اس کی تائید کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا تھا:

''بڑی اچھی ہے اور بہت بلند ہے۔ میں اس کی داد بھی دوں گا۔ تو بھئی ہم تو اپنے ادب سے مطمئن ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اصناف جو ہیں کسی زبان میں ایک صنف ترقی کرتی ہے کسی میں دوسری۔ کہوں کہ کلچر کی جو فضا ہوتی ہے وہ اس کے لیے ہموار نہیں ہوتی۔ شاعری میں انگلستان کو جو درجہ حاصل ہے وہ یورپ کی کسی زبان کو حاصل نہیں۔ جو درجہ ناول میں روس کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔ موسیقی میں جو درجہ جرمنی کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ اسی طرح جو مقام اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی زبان کی شاعری کو حاصل نہیں۔ ناول میں ہم ان سے پیچھے ہیں۔ افسانے میں ہم بہت ترقی کر گئے تھے، مگر اب جو یہ زوال آیا ہے تو یہ آیا نہیں، لایا گیا''۔320

18/اپریل 1990ء کو راہی معصوم رضا کو دیے گئے انٹرویو میں سردار جعفری نے اچھے شاعر کی پہچان بتائی ہے:

''علی سردار جعفری نے کہا ''اچھے شاعر یا اچھے ادیب کا کام داد حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس کا کام ہے، راستے بنانا''..... اچھے شاعر کے ہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ۔ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا''۔ 321

ادب زندہ کب رہتا ہے:

سردار جعفری نے بتایا کہ جو شاعری اپنے عہد کی پوری بصیرت کے لیے ہو اور جس میں ماضی و حال کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے وہ زندہ رہتی ہے۔ 322

نثری نظم کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''اس سلسلہ میں صرف ایک جملے میں یہ بات کہوں گا کہ نثری نظم کے امکان ہو سکتے ہیں شرط یہ کہ لکھنے والا اتنا ہی بڑا شاعر ہو جتنا Walt Whitman تھا کیوں کہ اس میں دراصل فکر کا Raythem ہوتا ہے محض فارمز کے ذریعے نثری نظم کا حقیقی ردھم (Rhythm) پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے نئی زبان اور استعارے کی تخلیق بھی ضروری ہوگی۔ ایک مرتبہ ناظم حکمت نے فیض سے گفتگو کرتے ہوئے .....کہا تھا کہ ''بری شاعری زبان کے مروجہ ردم Rhythm کو توڑ کر پیدا ہوتی ہے آپ عربی زبان کے اوزان کیوں استعمال کرتے ہیں؟ عربی اوزان تو عربی مزاج کو پیش کرتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان کا ایک ردم ہے جسے میں نے اکثر و بیشتر توڑنے کی کوشش کی ہے''۔ اب یہ کوشش آپ کو فیض کے آخری زمانے کی بعض نظموں میں بھی ملے گی''۔323

1857ء کے بعد کے ادب کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا ہے:

''جدید اردو ادب جس کا آغاز 1857ء کے بعد ہوا، عقل پسندی، حب الوطنی، انسان دوستی اور سامراج دشمنی کی منزلوں سے گزرتا ہوا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد انقلاب کے موڑ پر آیا تو اس میں بحران پیدا ہو گیا۔ اس عقل پسندی پر مذہب کی پرچھائیں تھی۔ حب الوطنی پر ماضی پرستی چھائی ہوئی تھی۔ انسان دوستی طبقاتی حدوں میں اسیر تھی اور سامراج دشمنی میں سمجھوتے بازی کی آمیزش تھی زنجیروں نے انقلاب کی منزل پر جدید ادب کو جکڑ لیا''۔ 324

استعارہ دار و رسن غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں جو آتا ہے اس کی مثالیں فیض، مخدوم کے اشعار سے دینے

کے بعد سردار جعفری ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

''اس طرح کے سیکڑوں شعر ہیں جنہیں آپ آج کے عہد کیساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی پس منظر میں ،..... یہ اشعار ہندوستان کے لیے ہیں، پاکستان کے لیے ہیں، ترکی کے لیے ہیں یا فلسطین کے لیے ہیں۔ جہاں جہاں صورت حال تظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی کے ساتھ جلوہ سامان ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شاعر کے کلام کا پرتو مستقبل پر بھی پڑ رہا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ غزل اپنے تمام تر امکانات غالب کے ہاں ختم کر چلی تھی اور اسی لیے آنے والے شعرا کو جن میں آزاد، حالی اور شبلی شامل تھے غزل سے گریز اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی''۔ 325

تشبیہ و استعارات سے سماجی تنقید کا کام کے تعلق سے سردار جعفری نے کہا:

''تشبیہ اور استعاروں سے ہم نے سماجی تنقید کا کام لیا ہے..... جوش کا ایک شعر ؎

تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خوروں کی نگاہ
دھوپ کی تیزی کہ جیسے روح پر عکس گناہ

''روح پر عکس گناہ'' اور ''بوڑھے سود خوروں کی نگاہ'' اس میں پوری سماجی تنقید ہے مجاز کی نظم ''آوارہ'' میں ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

ان تشبیہوں میں پورا سماجی شعور جلوہ گر ہے اور محل اور اس کا جو پورا رشتہ ہے بنیے کے ساتھ، بیوہ کے ساتھ اور مفلس کے ساتھ۔ 326

شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت پر پوچھے گئے ایک سوال پر سردار جعفری نے ندا فاضلی کو جواب دیا اور لب و لہجہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

''جعفری صاحب! اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مواد کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور ہیئت پرستی پر کڑی تنقید بھی کی ہے اور مواد کی بھی آپ کے یہاں ایک بندھی ٹکی تعریف ہے.....''

''میں مواد کو ہیئت سے الگ نہیں سمجھتا۔ ہر خیال اپنا لباس ساتھ لے کر آتا ہے.....''۔

لب و لہجہ عہد بہ عہد بھی بدلتا ہے اور موضوع سے بھی اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے''۔ 327

آج کے دور میں غالب کی اہمیت کیا ہے؟

اس سوال کے پوچھے جانے پر سردار جعفری نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''غالب آج بھی اتنے ہی عظیم شاعر ہیں جتنے اپنے دور میں تھے۔ غالب کو ہم اردو کا گوئٹے کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری

میں ایک طرف پیار کی مہک ہے تو دوسری جانب فلسفہ ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے کرشن کے ساتھ گیتا اور رادھا دونوں ہیں"۔

328

سردار جعفری نے بتایا کہ استعارہ "دار و رسن" کس کس انداز میں استعمال ہوا ہے۔

غالب کے ہاں دار و رسن کا استعارہ پہلی بار نئے معنوں اور نئی امیج کے ساتھ آتا ہے۔میر تک تو یہ استعارہ یعنی صوفیانہ انداز میں آتا ہے.....میر کا شعر ؎

فصل آئی کو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

یہ بھی صوفیانہ انداز ہے۔غالب کے یہاں کس انداز میں جدید عہد جھلکتا ہے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یہ صرف 1857ء کے قتل و غارت گری کا ہی نوحہ نہیں ہے بلکہ پوری انیسویں صدی کے قتل و غارت گری کا اشارہ ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ اور بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ قد و گیسو میں تو قیس و کوہکن کی آزمائش ہو رہی ہے لیکن جہان دار و رسن کا معاملہ ہے وہاں مجاہد و شہید کی آزمائش درپیش نہیں ہے بلکہ خود دار و رسن آزمائش سے دوچار ہیں یہ غالب کی بلاغت کی مثال ہے.....یہ دار و رسن کا استعارہ غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آتا ہے.....مجروحؔ نے کہا ہے ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

تو یہاں دوئی ختم ہو جاتی ہے۔یہ امیج Image ہر ترقی پسند شاعر کے ہاں اس کے اپنے انداز میں موجود ہے۔فیض کے ہاں، مخدوم کے ہاں، مجروح کے ہاں اور میرے ہاں ؎

حکایت دل کی کیا دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

سب کے ہاں الگ الگ انداز میں یہ بات ملے گی.....اس طرح سیکڑوں شعر ہیں جنہیں آپ آج کے عہد کے ساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی پس منظر میں..... یہ اشعار ہندوستان کے لیے ہیں، پاکستان کے لیے ہیں یا فلسطین کے لیے ہیں۔جہاں جہاں صورت حال تظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی کے ساتھ جلوہ سامان ہوتے ہیں"۔329

لمحاتی، وقتی ہنگامی نوعیت یا فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری کی جاتی ہے اس کی بھی اپنی اہمیت ہے۔

سردار جعفری نے ایسی شاعری کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے:

"ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحہ کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی

سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت حاصل کر سکے۔ میں اب بھی یہ بات کہتا ہوں کہ فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری پیدا ہوتی ہے وہ بالکل ہی بے معنی نہیں ہوتی ..... اس وقت ہم ایک ہیجانی صورت حال سے دوچار تھے، ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی، بنگال کے قحط کی ہولناکیاں تھیں، بحریہ کی ہڑتال تھی۔ کسانوں، مزدوروں اور نچلے طبقوں کی جدوجہد تھی، غرض حوادث و واقعات کا ایک سیل تھا، جو ہمارے چاروں طرف امڈا ہوا تھا۔ کیا ترقی پسند ادیب کے لیے جو اپنا راستہ عوام سے استوار رکھتا ہو اور جو تخلیق ادب کو ایک سماجی ذمہ داری بھی جانتا ہو، ان بدلتے ہوئے حالات سے چشم پوشی ممکن ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے نہیں۔ لہٰذا انہوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت بھی شاعری کی ہے اور اردگرد ہونے والے واقعات پر بے شمار نظمیں بھی لکھی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب میں بیشتر مثالیں مجروح کی شاعری سے پیش کی تھیں .....''۔

(2) ''..... اگر کوئی نظم ہزاروں مزدوروں کے سامنے پڑھی جائے اور وہ ان کے خون میں شامل ہو کر ان کی جدوجہد میں تعاون کرے تو اس میں قباحت کیا ہے ..... ٹیگور کو جن کی عظمت سے شاید ہی کسی صحیح الدماغ شخص کو انکار ہو، کیا انہوں نے پارٹیشن آف بنگال کے سلسلہ میں چلنے والی تحریک اور جلوس میں شامل ہو کر نظمیں نہیں پڑھیں؟ ..... کیا پابلو نرودا نے ہنگامی نوعیت کی نظمیں نہیں لکھیں اور بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے نہیں پڑھی ہیں؟ اور کیا ایسا کرنے سے ان حضرات کا اثاثہ شعری کیا قابل دریا برد ٹھہرے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، سردار جعفری، وامق جونپوری، نیاز حیدر جذبی اور اس قسم کے دوسرے ..... نے ایجی ٹیشنل Agitational احتجاجی شاعری دانستہ اور شعوری طور پر کی تھی کیوں کہ ہم اس قسم کی شاعری کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے تھے۔ اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری بے اثر تھی اور اس نے کوئی کام سرانجام نہیں دیا ..... ہم نے احتجاجی شاعر ضرور کی ہے لیکن ساتھ ہی ہم نے دائمی قدروں کی شاعری ..... کی ہے .....''۔

(3) وہ لمحاتی اور وقتی شاعری تھی اور اس قسم کی شاعری کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا ..... ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ لمحاتی اور وقتی شاعری میں بھی اکثر ایسی لافانی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہاید و شاید ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ میں آپ کو اقبال کے طلوع اسلام سے مثال دے کر سمجھاتا ہوں، شعر ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

یہ مصرع ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ جو دوسرا مصرع آیا ہے وہ اپنے حسن اور قوت کے اعتبار سے دائمی چیز بن گیا ہے۔

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

دوسری مثال۔ مظفر شاہجہاں پوری کے ہاں سے ..... پہلا مصرع ہے۔

اس طرف روس ادھر چین ملایا برما
اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

میراجی، ن م راشد اور حلقہ ارباب ذوق کے کاموں کے بارے میں سردار جعفری نے بتایا:

''میراجی جو ایک بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اس وقت ترقی پسندوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور اسی طرح ''حلقہ'' کے اجلاس میں شرکت سے ترقی پسندوں کو کوئی عار نہ تھا۔ میراجی کا یک بہت بڑا Contribution اس عہد میں جو تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربی ادب خصوصاً مغربی شاعری سے بہت خوبصورت ترجمے اردو میں کیے۔ ان ترجموں کی صورت میں اردو میں نئی فارم آئی، نئی ہوا آئی.....

ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آزاد شاعری کا جو نمونہ راشد اور میراجی نے قائم کیا تھا وہ آگے چلا نہیں۔ ان کے مقابلے میں ترقی پسندوں نے بھی آزاد شاعری کی جو آج بھی چل رہی ہے.....لیکن راشد اور میراجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے بات یوں ہے کہ فارم بغیر فکر اچھی اور زندہ رہنے والی شاعری پیدا نہیں کر سکتی اور وقت نے اس کلیہ کو ثابت کر دیا.....

میراجی شعور اور ادراک کو ادب کے لیے غیر ضروری عنصر جانتے تھے۔ انہوں نے شعر کا تعلق شعور سے کاٹا اور یہی ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی اختلاف رہا ہے۔ شعور کو شعر سے کاٹنے کی کوشش میں میراجی نے انتہائی گنجلک، مبہم اور بے مقصد شاعری کو فروغ دیا جس کا اثر حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ بہت سے لوگوں پر پڑا لیکن اس حلقے میں اور لوگ بھی تھے جن کے ہاں ابہام اور گنجلک فضا کو نسبتاً کم ہے لیکن مقصدیت پھر بھی عنقا رہی کیونکہ وہ لوگ ادب میں مقصدیت کے بھی قائل نہیں ہوئے تھے لیکن ان سب اعتراضات کے باوجود ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ حلقہ ارباب کے ساتھیوں نے اردو نظم کو فنی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔ نئی نئی فارم کے تجربے جوان لوگوں نے کیے ہیں، ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔ نئی لفظیات کے سلسلہ میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابل تحسین رہا ہے۔ ان میں سب سے بڑا نام جو سامنے آیا ہے وہ ن۔م۔راشد ہیں جن کی شاعری مختلف مراحل سے گزرتی رہی.....اردو نظم میں ہیئتی تجربوں کا کام حلقۂ ارباب ذوق کے لوگوں نے خاصا کیا ہے ترقی پسندوں کے مقابلے میں''۔ 331

1857ء کو جدید ادب کا نقطۂ آغاز بتاتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

''ہمارے ہاں جدید ادب ایک واضح رجحان کے طور پر 1957ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور یہ صورت حال صرف ہمارے اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کم و بیش تمام بڑی زبانوں میں ایسا ہی ہوا ہے..... 1957ء کے بعد ادبی تنقید کا ایک باقاعدہ نظام کے طور پر رواج پانا.....دوسری تبدیلی جو 1857ء کے لگ بھگ ہمارے ہاں محسوس ہوتی ہے وہ ہے غزل کے تعلق سے.....غزل اپنے تمام تر کلاسیکل امکانات غالب کی شکل میں پورے کر چکی تھی اور جب میں یہ بات کہتا ہوں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ غالب اپنی پیش رو غزل کی روایت کو سمیٹتے ہوئے ایک ایسا منفرد لہجہ اور صرف لہجہ ہی نہیں بلکہ انداز نظر دیتے ہیں جو اردو ادب میں قطعی نیا تھا اور جسے میں جدید ادب کے لیے ایک نقطۂ آغاز خیال کرتا ہوں''۔ 332

اقبال سے ترقی پسندوں نے کیا لیا ہے اس تعلق سے سردار جعفری نے لکھا ہے:

1)۔ہم نے اقبال سے تصور انسانیت لیا ہے اور انسانی خلاقی، انسان کی تخلیقی قوت اور انسانی ہاتھوں کی عظمت کا تصور لیا ہے ''دستِ دولت آفریں'' اقبال ہی کے ہاں آیا''۔

2)۔''پھر ہم نے اقبال کے ہاں سے نظریہ کائنات لیا ہے کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون''یعنی تخلیق کا عمل ایک جاری وساری عمل ہے۔ہر دم ایک نئی دنیا تخلیق پا رہی ہے جس میں لمحہ گزشتہ کا عکس بھی شامل ہوتا ہے تو اس طرح ادب کی تخلیق کا عمل بھی ایک مسلسل جاری وساری عمل ہے''۔

3) کلاسیکیت کی تخلیق بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ہر دور اپنی قدریں ساتھ لاتا ہے اور اس طرح روایت کی تخلیق کا عمل بھی جاری رہتا ہے.....ترقی پسند ادب یا ترقی پسند ادیب کوئی آسمان سے نہیں اتر آیا بلکہ اس کے پیچھے روایت کا ایک عظیم سلسلہ ہے اور اب خود ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہماری ادبی روایت کا ایک زندہ اور فعال حصہ بن چکا ہے.....میں روایت کو ایک جاری وساری عمل سمجھتا ہوں۔آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کل روایت کا حصہ بن جائے گا بشرط یہ کہ اس میں زندہ رہنے کی قوت ہوئی ورنہ اپنا وقتی کردار ادا کر کے ختم ہو جائے گا''۔

4)۔''ہم نے اقبال سے آہنگ بھی لیا ہے.....اقبال کے آہنگ سے کوئی باشعور شاعر بچا ہی نہیں۔وہ بھی جو مخالفین تھے وہ بھی نہیں بچے کیوں کہ میں اقبال کے آہنگ کو بیسویں صدی کا آہنگ سمجھتا ہوں اور بیسویں صدی دراصل اقبال کی صدی ہے''۔

5)۔''نظم جدید کی جو عظیم الشان عمارت اقبال اور جوش نے تعمیر کر دی تھی وہ ترقی پسندوں تک پہنچتی ہے اور ترقی پسند شعرا نے اس کو نہ صرف استحکام دیا ہے بلکہ مقدور بھر اسے آگے بڑھانے کا فریضہ بھی ادا کیا۔333

اقبال پر علی سردار جعفری کے مطالعے پر قمر رئیس نے اظہار خیال کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''جشن اقبال کے موقع پر سردار جعفری نے اقبال کے بارے میں اردو اور انگریزی میں کئی مضامین لکھے.....جعفری نے اقبال کی بین الاقوامیت پر اپنے مضامین میں خاص طور پر زور دیا ہے۔اقبال نے تیسری دنیا اور خاص کر اردو اور فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبردار اور بیدار ہونے کا جو پیغام دیا تھا اس کی معنویت اور ہمہ گیر اثرات کا اعتراف جعفری نے کھل کر کیا ہے''۔ 334

اعلیٰ تعلیم کی زبان کے سلسلہ میں سردار جعفری نے کہا:

''حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے کہا''میرا خیال تو یہ ہے کہ درس وتدریس میں اولیت مادری زبان کو ملنی چاہیے۔جعفری صاحب نے برجستہ جواب دیا''کوئی ضروری نہیں۔ٹھیک ہے اگر کسی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے تو یہ بہت اچھا ہے،لیکن اعلیٰ تعلیم کا نقصان کر کے مادری زبان کو استعمال میں لانا درست نہیں ہوگا۔میں اس سلسلے میں اپنے زمانے کے چند اعلیٰ ترین دانشوروں اور عالموں کی مثالیں پیش کروں گا جنہوں نے تعلیم اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ اجنبی زبانوں میں حاصل کی۔میں اور بہت سے لوگوں کے نام لے سکتا ہوں۔علامہ اقبال کی ہی مثال ہے جو ایک بڑے شاعر اور مفکر تھے لیکن ان کی ساری ذہنی نشو ونما اور روحانی تہذیب وتعلیم ان کی اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی،عربی اور بعد ازاں انگریزی میں ہوئی''۔ 335

ادیب وشاعر کی تخلیقات میں تکرار کے بارے میں سردار نے کہا:

حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے سوال کیا "کیا یہ درست ہے کہ برصغیر میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ اس لیے حاصل ہوا کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے آپ کو دہرانے لگے تھے" سردار جعفری نے زور دے کر کہا "ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تکرار، ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت ہے۔ اردو غزل کی ہی مثال موجود ہے، جس میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو دہرایا ہوگا۔ علامہ اقبال نے فلسفہ خودی پر کس قدر زور دیا اور پھر اپنے اشعار میں فلسفہ خودی کو مختلف پیرایوں سے برابر پیش کرتے رہے۔ اس کے باوجود اقبال کی عظمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ 336

7/جون 1991ء کو لیے گئے انٹرویو میں حسن عابدی نے سردار جعفری سے سوال کیا "آپ کے ایک مجموعے کا نام ہی "ایک خواب اور" ہے۔ کیا آپ ہمیں یہ بتائیں گے کہ آیا آپ کے کسی خواب نے حقیقت کا قالب اختیار کیا؟

سردار جعفری نے جواب دیا "ایک بھی نہیں۔ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ پیغمبروں کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو خواب دیکھتے رہنا چاہئے۔ اس سے انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکلتی ہے۔ اگر تمہارے کچھ خواب ہیں۔ زندگی میں کچھ مقاصد ہیں تو انھیں تازہ رکھو اور ان کے حصول کی جدوجہد کرتے رہو۔ خواب تمہیں پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں۔ ان سے تمہاری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا ہوگا۔

سردار جعفری نے اپنے مجموعے "ایک خواب اور" کے دیباچے میں لکھا ہے:

خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کرسکتا اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔ 337

ادیبوں کی باہم ملاقاتوں اور انجمنوں کی ضرورت اجاگر کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا:

حسن عابدی نے اپنے انٹرویو میں سردار جعفری سے سوال کیا "ترقی پسند تحریک، برصغیر پاک و ہند میں نصب صدی پرانی ہے اور ادیبوں اور مفکروں میں ترقی پسندانہ افکار بہت مقبول ہیں۔ ایسے میں کیا ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ جعفری صاحب نے جواب دیا "جی ہاں۔ ایسی کسی انجمن کی موجودگی کی ضرورت بہر حال رہتی ہے۔ ادیبوں کو مسائل پر غور و بحث کرنے کے لیے اور تبادلۂ افکار کے لیے ملتے رہنا چاہئے۔ 338

سردار جعفری نے ادب میں آمریت کی گنجائش کے نہ ہونے کی بات کی ہے۔

آمریت دنیا میں چاہے جہاں بھی اپنی گرفت قائم کرے لیکن ادب میں آمریت نہیں چلتی۔

جلد یا بدیر اسے بہر طور ختم کرنا ہوگا۔ 339

ادب میں سوشلزم کے روشن مستقبل کے بارے میں سردار جعفری کہتے ہیں:

معاشرے میں جب تک نابرابری اور بے انصافی موجود رہے گی، سوشلزم کا خواب ایک زندہ حقیقت کے طور پر باقی رہے گا، اور ادب میں اس خواب کی تعبیر کے لیے اپنی مدد فراہم کرتا رہے گا۔ 340

ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں فرق کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا ہے:

ایک بات جو ہم ترقی پسندوں کو غیر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ہم فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، ہمارے ہاتھوں یہ تینوں قدریں کسی کامیاب فن پارے کے ضروری اجزاء ہیں جب کہ ان کے ہاں فن اور حسن کاری پر اصرار تو ہے لیکن افادیت کی آمیزش کو نہ صرف غیر قانونی جانتے ہیں بلکہ اسے مہلک تک کہتے رہے ہیں اور یہی ہمارا اور انکا بنیادی اختلاف رہا ہے۔341

ڈاکٹر اسلم پرویز نے سردار جعفری کے ہاں کمٹ منٹ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

جہاں تک کمٹ منٹ کی بات ہے ادب ہو یا زندگی ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طرح کی اقدار سے وابستہ ہوتا ہے۔ محض زندگی کی حد تک یہ اقدار اچھی بری کسی بھی طرح کی ہو سکتی ہیں لیکن ادب میں عام طور پر صالح اقدار ہی کا علم بلند کیا جاتا ہے۔ غیر شعوری طور پر ادیب کا کسی نہ کسی نوعیت کا کمٹمنٹ ہوتا ہے اس لیے ادب پر بہر حال زندگی کا عکس ہوتا ہے اور یہ عکاسی ادیب کے ہاں کسی نظام قدر کے حوالے سے ہوتی ہے۔ زندگی کے واضح نظریات اور فلسفے کی صورت میں یہ کمٹ منٹ شعوری ہو جاتا ہے جو کبھی کبھی hyperbole کی شکل بھی اختیار لیتا ہے۔ یہ صورتحال سردار جعفری کے ہاں بیشتر جگہوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔342

اوائل 1966 میں احمد جلیس سے بات چیت کرتے ہوئے سردار جعفری نے تخلیق کار اور قاری کے رشتہ پر روشنی ڈالی۔

حالی، سرسید اور شبلی کو اس قدر مقبولیت اس لیے حاصل رہی ہے کہ ان کی آواز عوام پہچانتے تھے اور خود وہ اپنے عوام سے اچھی طرح متعارف تھے، پھر جب ہم لوگ آئے تو ہمارے سامنے بھی قارئین موجود تھے۔ ہم ان کے دکھ درد اور ان کے مطالبوں سے واقف تھے۔ ہر زمانے میں شعر و ادب کی مقبولیت کا سبب یہی رہا ہے کہ ادیب اور قاری ایک دوسرے سے قریب رہے۔ آج سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ آج کل کے لکھنے والوں کے سامنے ان کا مخاطب متعین اور واضح نہیں ہے۔ 343

عظمیٰ ناز سے ایک ملاقات میں سردار جعفری نے شاعر کے فرائض اور معاشرے کو دین کے تعلق سے کہا:

شاعر دراصل معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے اور ان ساری کیفیات کو جو سارا معاشرہ دیکھتا ہے ان کو لفظوں کے پیکر دے کر ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ شاعر احساس جمال کو عام کرتا ہے اور اس طرح اپنے معاشرے کو زبان بنانے میں مدد دیتا ہے۔ وہ معاشرے کے لیے صرف خیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کاروبار سے زندگی کی سخت جدوجہد سے محنت و مشقت سے تھک جانے کے بعد روحانی سکون اور بالیدگی کے لیے شاعری ضروری ہے اور اس عمل میں شاعر نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے، خواہ وہ ذاتی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا غیر سیاسی اور اس طرح انسانوں کو جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ معاشرے سے الگ ہو کر اور بے نیاز ہو کر وہ شاعری نہیں کر سکتا وہ ایک حد تک معاشرے کا مقروض ہوتا ہے۔ زبان کا خالق نہیں ہوتا وہ اسے معاشرے سے ملتی ہے لیکن وہ زبان کا معمار ہوتا ہے۔344

آزاد شاعری کے تعلق سے سردار جعفری کہتے ہیں:

ہمارے یہاں پابند شاعری زیادہ تر غزل کی نہج پر ہے پورا پورا خیال دو مصرعوں میں ادا ہو جاتا ہے اور اس میں قافیے اور ردیف کی جھنکار بہت مدد دیتی ہے۔ مقبولیت کے لئے بھی اور اثر آفرینی کے لیے بھی! آزاد شاعری میں مصرعوں کی تعمیر ایک

پورے بند کی تعمیر ہوتی ہے اور خیال پورے چار چار، پانچ پانچ مصروں میں مکمل ہوتا ہے۔اس طرح مسلسل فکر اور خیال کا ارتقاء ساتھ ساتھ چلتا ہے۔آزاد شاعری کے اندر ایک اندرونی آہنگ کی ضرورت پڑتی ہے اور شعری تشبیہیں اور پیکر تراشی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔مثلاً میری ایک نظم ہے "نیند" جو میں نے جیل میں کہی تھی، اس میں رات کا سراپا ہے۔وہ اس طرح کہ۔

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی
شب کی شوخ دوشیزہ
خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے دامن میں
جنگلوں کی خوشبو اور
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے
نیل گوں جوان سینہ
نیل گوں جواں بانہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمین کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیے کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں

آزاد نظم کہنا زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ ہماری ادبی تاریخ میں اس کی کوئی روایت نہیں ہے۔345

عظمیٰ ناز سے اسی ملاقات میں سردار جعفری نے نو جذبات "نورس" کے بارے میں بتایا:

جو بنیادی جذبات ہیں وہ گنے ہوئے تو جذبات ہیں۔اس کو ہندوستان میں "نورس" کہا جاتا ہے نفرت، محبت، غصہ، شجاعت، رحم وغیرہ اور ساری شاعری انھیں جذبات میں ہوتی ہے۔شاعری بھی انھیں نو جذبات کے پس منظر اور پیش نظر سے منتج ہے، کہی اور لکھی جاتی ہے۔346

سردار جعفری نے اچھی شاعری کے لیے جن چیزوں کی اہمیت بتلائی ان میں عقیدت بھی شامل ہے۔انھوں نے کہا اچھی شاعری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر اپنے عہد کے مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو کیونکہ ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شاعری نہیں کی جا سکتی۔شاعری کے لیے یہ بھی ضروری ہے ک ہشاعر اپنے عہد کے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سن سکے۔ محسوس کر سکے اور ان سے بات ان کی زبان میں کر سکے۔وہی زبان جو عوام بولتے ہیں۔شاعر جب ان کے مسائل کو تخلیقی شکل دیتا ہے تو اس تخلیقی کیفیت کے کارن ان کے شعری پیکر بن جاتے ہیں۔تشبیہیں اور استعارے آجاتے ہیں۔یہ جتنے سلیس اور عام فہم ہو سکتے ہیں اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔شعر کی سچائی خود بخود سامنے آجاتی ہے شاعر کائنات کے سمندر کا ایک قطرہ ہے جو اپنے اندر اس سمندر کو سمیٹے ہوئے ہے۔یہ سب چیزیں جن سے مل کر اچھی شاعری منتج ہے۔یہ سارا مواد ہے اور اس کو تخلیقی پیکر شاعر جو پیدا کرتا ہے اور اس میں اپنی ذات کا اضافہ کر دیتا ہے اور ذات کا یہ اضافہ ہی شاعری کو بہتر اور کمتر بناتا ہے اور شاعری کو خوبصورت بناتا ہے۔کمزور تخلیق کے شاعر کا شعر کمتر ہو جائے گا اور بہتر شاعر کا شعر بہتر اور خوب صورت ہوگا۔347

بڑی شاعری:

سردار جعفری نے بڑی شاعری کے سلسلہ میں لکھا ہے:

میں بڑی شاعری کے لیے تین چار چیزیں استعمال کرتا ہوں، سہولت اظہار، (فارسی کے اعتبار سے یہ ترکیب غلط ہے لیکن میں استعمال کرنا چاہتا ہوں اس کے ساتھ 2 ندرت اظہار کہ جو تخئیل کی کارفرمائی ہے اور اس کے بعد 3 عظمت اظہار، جو فکر کی کارفرمائی ہے۔اس کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

سردار جعفری کی تنقید نگاری اور اسلوب پر دوسرے نقادوں کی آراء:

متعدد نقادوں اور ادیبوں نے سردار جعفری کی تنقید نگاری اور ان کی تنقید کے اسلوب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں چند نقادوں اور ادیبوں کی آراء پیش کی جا رہی ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

ڈاکٹر انیس اشفاق نے سردار جعفری کے تنقیدی اصولوں اور زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سردار اپنے سیاسی اور سماجی معتقدات کی بناء پر اپنے زمانے کے ادب سے کس نوع کے تخلیقی جوہر کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس جوہر کا مطالبہ کرنے کی غرض سے انھوں نے ادب کو پرکھنے کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں کیا وہ ان کے زمانے کے اعتبار سے اپنا کوئی جواز رکھتے ہیں اور کیا ان کے معاصرین میں کسی دوسرے شخص نے اتنے

گہرے ادبی اور سماجی شعور کے ساتھ اتنی منظم اور مرتب شعریات وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

(ڈاکٹر انیس اشفاق، سردار جعفری کی شعریات، مشمولہ علی سردار جعفری:

ایک مطالعہ، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی ص 115-114

سردار جعفری کی شعریات کی اصل روح کے اجزاء کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انیس اشفاق لکھتے ہیں :

1۔ترقی پسند تحریک ادب کو تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کے ساتھ دیکھتی ہے اور ادب کو بھی تاریخ کی جنبش اور سماج کا آلہ کار سمجھتی ہے یعنی یہ تحریک مادی، تاریخی اور عمرانی نقطہ نظر سے ادب کا جائزہ لیتی ہے۔

2۔ترقی پسند ادب کا تعلق چوں کہ مقصدی اور عوامی ادب سے ہے اور اس کے مخاطب چوں کہ مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں اس لیے ادب کی زبان آسان، عام فہم، انداز بیان سیدھا سادھا اور پر جوش، ہیئت خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ہونا چاہئے۔

3۔چونکہ موضوع پہلے بدلتا ہے اور ہیئت بعد میں، اس اعتبار سے موضوع کو ہیئت پر اولیت حاصل ہے کیوں کہ ہیئت موضوع کے اظہار کی شکل ہوتی ہے۔

4۔اقبال بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن ان کی عظمت کا راز ان ترقی پسند اور مفید عناصر میں ہے جو باقی رہ جائیں گے۔(باقی تاریخ اور وقت کے طاق نسیاں میں رکھ دیئے جائیں گے)

5۔بہ زبان گور کی حقیقت نگاری کا مطلب ہے عوام کی زندگی اور ان کے حالات کی سچی اور ملمع کاری سے پاک تصویر کشی اور رومانیت سے مراد وہ انقلابی احساس ہے جو انسان کو زندہ رہنے کی خواہش کو تقویت پہنچائے اور اسے حقیقت اور اس کے مسائل کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرے۔

اس کے بعد ڈاکٹر انیس اشفاق لکھتے ہیں:

سردار جعفری نے انھیں اصول و نظریات کی روشنی میں ادب کو دیکھا اور انھیں اصولوں کی رہنمائی میں ادب کی تخلیق کا مطالبہ کیا۔انھوں نے ترقی پسند ادب کو پرکھنے کے لیے شروع سے جس نقطہ نگاہ کو مناسب اور جس طریقہ کار کو موزوں سمجھا، آخر تک وہ اس پر قائم رہے۔

2۔لیکن ان کی شعریات سازی کا مطالعہ کرتے وقت ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوتا ہے۔ جب وہ دلیلوں سے اپنے مباحث کی وضاحت کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے موقف کی مجبوری کی وجہ سے بعض ایسے حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں جنھیں ان کا آفاقی شعور تسلیم کر لینے پر مائل کر رہا ہے۔ جب وہ میر، غالب اور پریم چند وغیرہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے مطلوبہ عناصر کے علاوہ ہمیں دوسرے ادبی اور شعری زاویے بھی روشن ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن ایسے موقعوں پر سردار جعفری اپنے مباحث اور نتائج کے آئینہ کا رخ بدل دیتے ہیں اور ہمیں پھر وہی عکس نظر آنے لگتا ہے جو انھیں اس آئینے سے مطلوب ہے۔ وہ متقدمین کا مطالعہ کریں یا معاصرین کا محاکمہ، اس عمل میں وہ اپنے موقف سے ہٹ کر دوسرے امکانات کی جستجو کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں یعنی وہ جس قلم سے اپنا میر، اپنا غالب اور اپنا اقبال تراش کر سامنے لاتے ہیں، اسی

قلم سے وہ ہمارا میر، ہمارا غالب اور ہمارا اقبال بھی سامنے لاسکتے ہیں لیکن مادی، تاریخی اور عمرانی اقدار پر ایمان رکھنے والا ان کا ادبی مسلک انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ یہی نہیں وہ اپنی شعریات کو نافذ کرنے کے سلسلے میں اتنے حساس ہین کہ انھیں ہر موقع پر اپنے موقف کی تائید اور تکرار ضروری معلوم ہوتی ہے۔

3۔ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ اسی عمل کو دہراتے ہیں ایک طرف وہ اقبال کی ہمہ گیری اور وسعت کے قائل ہیں اور دوسری طرف وہ ان کی شاعری میں صرف ترقی پسند اور مفید عناصر کے باقی رہ جانے کی بات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اقبال کی وسعت اور ہمہ گیری میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جن کا اعتراف سردار اپنے موقف کے باطل ہو جانے کے خوف سے نہیں کرتے لیکن اس موقف پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود کبھی کبھی سردار اس راہ پر نکل ہی آتے ہیں جس کی طرف وہ جان بوجھ کر آنا نہیں چاہتے۔

4۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سردار کی مختلف الجہات ادبی شخصیت میں نتائج اخذ کرنے کی وہ صلاحیت موجود ہے جو ان کی اصل شعریات کے علاوہ ایک اور شعریات بھی مرتب کرسکتی ہے۔ ایک ایسی شعریات جو ان کے نظریات پر یقین نہ رکھنے والوں کے لیے بھی قابل قبول ہو لیکن اپنے سماجی نقطہ نظر کی بندش کی بنا پر انہوں نے وہ شعریات مرتب کیں جو ان کے عہد کے ادبی اور سماجی تقاضوں کے عین مطابق تھی اور جس کا مرتب کرنا ان کا سماجی فریضہ تھا۔

5۔ سردار نے اپنی شعریات مرتب کرتے وقت اسی نکتے کو نگاہ میں رکھا تھا کہ ان سے پہلے کے اصول و نظریات ان کے ادب کی تفہیم و توسیع کے لیے بے معنی ہو چکے ہیں۔ ادب کے نئے تقاضوں کے پیش نظر نئی تنقید نے سردار کی اصول سازی پر سوالیہ نشان قائم کیا اور اب ادب کے نئے منظر نامے کی روشنی میں نئی تنقید کے نظریوں پر نظر ثانی کی جارہی ہے۔ گویا ادب کے مخصوص مطالبوں کی بناء پر ایک عہد کی وضع کی ہوئی شعریات کی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ سردار نے حرف آخر میں اس عمل کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور اپنی شعریات سے اختلاف کے دروازے کھلے رکھے ہین۔ اپنی گفتگو ختم کرتے کرتے انھوں نے لکھا ہے کہ ''نقطہ نظر جتنا حقیقت پسندانہ ہوگا اتنا ہی صحیح ہوگا اور سردار کے عہد کے سماجی مطالبوں کے اعتبار سے ان کا نقطۂ نظر جتنا حقیقت پسند ہے واقعی وہ اتنا صحیح بھی ہے اور یہی سردار کی شعریات کا کمال ہے۔ 348

ڈاکٹر سید محمود الحسن رقمطراز ہیں:

''کسی شاعر و ادیب کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے نفسیاتی تنقید کے پہلوؤں کی طرف بہت کم جگہوں پر اشارہ کیا ہے۔ خاص کر عملی تنقید کی طرف ان کی توجہ بہت کم رہی ہے۔ ان کا تنقیدی سرمایہ زیادہ تر اسی مقصد کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ترقی پسند نظریات کی وضاحت کر کے انھیں اصولوں کی روشنی میں فنی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیں اور اپنے اس مقصد میں وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شاعری و ادب میں ان کے پیش نظر یہی رہا ہے کہ وہ کہاں تک اپنے سماجی مسائل کی ترجمان ہے۔ کہاں تک اس میں زندگی کے مقاصد شامل ہیں اور کہاں تک اس میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتی ہے اور ان مبادیات کی روشنی میں سردار جعفری نے ادبی تخلیق کا جو تجزیہ کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 349

سردار جعفری کی تنقید نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا دور:

ابتداء اور اس کے بعد بیس پچیس برس

(۲) دوسرا دور:

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی (مصنف سردار جعفری) کی اشاعت دوم (1957) کے بعد یعنی بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے آغاز سے ان کی وفات (2009) تک۔ اس دور میں سردار جعفری کی تصانیف پیغمبران سخن اور اقبال شناسی اور اردو اور انگریزی میں شائع شدہ تنقیدی مضامین اور ان کا لیکچر ترقی پسند تحریک کی نصف صدی جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

ادوار کی تقسیم کا جواز یہ ہے کہ سردار جعفری کی ایک ہی موضوع پر لکھی گئی دو کتابوں "ترقی پسند ادب اور (2) ترقی پسند تحریک کی نصب صدی کا موازنہ کریں تو دونوں کے درمیان سردار جعفری کے تنقیدی رویے کا نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے بڑے فن کار کے ہاں تضادات کو تبدیلی قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

ہر بڑے فن کار کے ہاں تضادات کا ہونا ایک لازمی سی بات ہے۔ آپ جتنا زیادہ لکھیں گے، جتنا طرح طرح کا لکھیں گے جتنے طویل عرصے تک لکھتے رہیں گے اس میں آپ کے ہاں تضادات رونما ہونے کے امکانات وخدشات اسی قدر زیادہ ہوں گے۔ سردار جعفری کا میدان شاعری کے علاوہ تنقید، صحافت، مکتوب نگاری، رپورتاژ نگار، تقریریں، مباحث، ریڈیو، ٹی وی، فلم سبھی کچھ رہے ہیں۔ ان تمام شعبوں میں فکر کی یکسانیت کا مظاہرہ یوں بھی اسٹیریو یونائپ ہو جاتا ہے۔ پھر تضاد تکرار سے بہتر ہے کہ یہ تبدیلی کی علامت ہے۔ ان کے ہاں گفتگو کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ 350

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کی تنقید کے پہلے دور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

(1) سردار جعفری کے پہلے دور کی تقریباً تمام تنقیدی تحریریں "ترقی پسند ادب" (مصنف سردار جعفری) میں شامل تصورات کا واضح عکس معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان تحریروں میں ان کا ناقدانہ کردار انفرادی ہونے سے کہیں زیادہ تحریک کی مدافعت یا وکالت کا تنظیمی انداز لیے ہوئے ہے۔ جب تنقید دفاع یا وکالت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس کو سب سے پہلے معروضیت اور غیر جانبداری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کے دور اول کی تنقیدی تحریروں میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ انھوں نے انفرادی انداز میں تعین قدر کرنے کے بجائے اپنی تنقید میں اجتماعی اور سیاسی قدروں پر زور دیا، پرانی شعری، حتی کہ اخلاقی اقدار کو سامنتی اقدار سے تعبیر کیا، ادب کی ماہیت کو اس کی افادیت پر قربان کیا اور اپنے ادبی سرمایے کے بارے میں جانبدارانہ تنظیمی نوعیت کے فیصلے صادر کیے اور اس ضمن میں ان کا عام رویہ پرانے اسالیب پر تنقید اور نئے اسالیب کی تقلیل کا رہا مگر تضاد کی صورت وہاں نمایاں ہوتی ہے جب وہ اس عمومی رویے کے باوجود ابتدائی تحریروں میں نئی ہیتی تبدیلی اور تجربے کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ انھوں نے نظم کی آزاد ہیئت یا بلینک ورس کو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ قرار دیا تھا۔

(2) سردار جعفری، ادب کی ماہیت کا تعین کیوں کر کرتے ہیں اور ترقی پسند شعریات کے لازمی عناصر کن چیزوں کو شمار کرتے ہیں، اس کا ایک خاکہ مندرجہ ذیل بیانات سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(i) میرے نقطہ نگاہ کی بنیاد یہ ہے کہ وہ کسی داخلی تعصب کے بجائے مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر مبنی ہے۔

(ii) جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی، داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں وہ خیال پرستی، تصوریت، عینیت اور مادرائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لیے راستے کھولتے ہیں جن کے پیچ و خم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں بہر حال ہوتے ہیں خطرناک۔

(iii) ہر دور کا عظیم ادب وہی ہے جس میں عوامی سچائی اور عوامی قدریں ہیں۔

(iv) آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے بنیادی سوال عوامی ادب کی تخلیق کا سوال ہے۔ دنیا کا بہترین ادب ہمیشہ عوامی رہا ہے۔ عوامی قدروں کے بغیر ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

(v) اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔

(vi) اردو کی پرانی غزل جو اپنا رشتہ عوام سے نہیں جوڑ سکی اس کے بھی شاہکار اپنے عہد کی ایک دل دوز تنقید ہیں، خواہ ان کی لے میں میر کے سوز و گداز، تڑپ اور ٹیس ہو، خواہ غالب کا نشاط انگیز حزن و ملال۔

ان بیانات میں سردار جعفری ایک آزاد قاری یا تنقید نگار کے بجائے ایک مخصوص تنظیم کے ترجمان اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ یوں تو سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لیے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے لیکن جب وہ (سردار جعفری) ادیبوں اور شاعروں کا انفرادی جائزہ لیتے ہیں تو ان کی رائے تجزیاتی سے زیادہ مفتیانہ اور ضمنی سے زیادہ بنیادی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ ترقی پسند ادب میں راشد، اختر الایمان، حتی کہ فیض اور مخدوم پر جس طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں یا منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں جس طرح کی رائے کا اظہار کیا گیا ہے، ان کو خود ترقی پسند حلقوں میں قبول نہیں کیا جا سکا اور ان ادیبوں اور شاعروں کی فنی اور جمالیاتی قدروں نے اس طرح کی کسی رائے کو رائج ہونے کا موقع نہیں دیا۔

ترقی پسند ادب کے ساتھ سردار جعفری کی تنقید نگاری کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔351

ابوالکلام قاسمی نے سردار جعفری کی تنقید کے دوسرے دور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی دو کتابوں پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں میں مصنف کا زاویہ نظر نسبتاً لچکدار قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔ پیغمبران سخن، دراصل کبیر، میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے جن مین ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورت حال اور ادبی روایات کے تناظر میں

سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ترقی پسند ادب میں انھوں نے تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ تصوف میں عوامی بھلائی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔مگر جب وہ کبیر یا میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے ہیں تو تصوف، قرون وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے۔انکا خیال ہے کہ ''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر، اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں۔ سردار جعفری کی اس فکر میں تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی روایات کے تئیں رویے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ایک طرف ادب فہمی کے معاملے میں سردار کی ان کے پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ان کے پہلے دور کی تنقید میں شاعری کی تہ داری، تفہیم اور ہمہ گیری سے صرف نظر کرنے کا انداز صحیح معنوں میں ان کے مزاج سے زیادہ تنظیمی ضرورتوں کا تابع تھا۔پیغمبران سخن کی طرح سردار جفری نے اقبال شناسی کے مضامین میں بھی اپنی پختہ کار اور تجزیاتی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔سردار جعفری کی تنقیدی فکر اور نقاد کی حیثیت سے ان کے تغیر پذیر تنقیدی شعور کی روشنی میں اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ ان کی ابتدائی زمانے کی تنقید دراصل ترقی پسند جمالیات کی ترتیب وتدوین کے باعث قابل قدر ہے اور قدرے بعد کی تنقیدی تحریرون میں انھوں نے شعر وادب کے محاسن و معائب کو ایک کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے دیکھا ہے اور یہی تنقید ان کے تنقیدی رویوں کی معراج ہے۔

ان کی (سردار جعفری) ناقدانہ فکر کے ارتقا اور تبدیلی کا سلسلہ پیغمبرانہ سخن کے ابتدائی صفحات سے شروع ہو جاتا ہے۔

شافع قدوائی نے لکھا ہے:

ترقی پسند ادب کی حد تک تو سردار جعفری کا تنقیدی نقطہ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے مگر پیغمبران سخن میں شامل دیباچوں اور بعض دیگر مضامین کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری کے تنقیدی نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔353

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اور اس سے قبل کی تحریروں پر تنقید نگاری کا تقابل بعد میں لکھی گئیں، ان کی کتابیں پیغمبران سخن اور اقبال شناسی سے عمر رضا نے کیا ہے اور دونوں کے فرق کی وضاحت کی ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں سردار کی تنقید نگاری:

1۔ترقی پسند ادب سردار جعفری کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب ہے جو 1951ء میں شائع ہوئی۔

2۔(i) اس زمانے میں سردار جعفری ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔

(ii) سردار جعفری نے ترقی پسند ادب میں جو جائزہ لیا ہے وہ ان کے اپنے نقطۂ نگاہ سے لیا ہے جس کی بنیاد مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر ہے۔انہوں نے وضاحت بھی کی کہ ان کی ذاتی رائے کو پوری تحریک کی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔

(iii) سردار جعفری نے ادبی، فنی اور جمالیاتی ضرورتوں کو قدرے نظر انداز کرتے ہوئے سماجی، معاشی، اور سیاسی ذمہ

داریوں کی طرف توجہ مرکوز کی ہے۔

3۔(i) ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں انہوں نے تصوف کو جاگیر دارانہ معاشرے کی فرسودہ اقدار اور مابعدالطبیعاتی حوالوں کے باعث وجدان اور درون بینی کا زائیدہ کہا ہے۔

(ii) ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے لکھا ہے درویشی اور قلندری، شاہ پرستی اور انفرادیت پرستی، تجدید مذہب اور احیائیت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں کیوں کہ ان سے آج عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

4۔ترقی پسند ادب میں بولی ٹھولی اور عوامی زبان کو شاعری کے لیے آئیڈیل قرار دیا ہے۔

5)۔غالب کے معاملے میں سردار جعفری نے شروع ہی سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور غالب کو ہندوستان اور یونانی فلسفے کی روایت کے ساتھ غیر عوامی لسانی ساخت کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں امیجری اور حرکی پیکروں کی تخلیق اور حواس کو متحرک کرنے والی لفظیات اور تراکیب کا انہوں نے جس طرح جائزہ لیا ہے وہ قابل ذکر ہے کیوں کہ اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو انہوں نے نشان زد کیا ہے وہیں اشعار سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا ہے۔یہ وہی اشعار سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری نے اپنی ابتدائی تحریروں میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا ہے۔

6)۔ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے اقبال کے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے''۔

(علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ:108)

پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں سردار جعفری کی تنقید نگاری:

1۔پیغمبران سخن سردار جعفری کی مرتب کردہ تین کتابوں کبیر بانی، دیون میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے جو 1958ء اور 1965ء کے درمیان تحریر کیے گئے تھے، بعد میں انہوں نے ان تینوں مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیغمبران سخن کے نام سے 1970ء میں شائع کرادیا۔

2۔پیغمبران سخن اور اقبال شناسی میں سردار جعفری کا نظری ادب قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

3۔اس عہد میں وہی تصوف مذکورہ شعراء کے حوالے سے عوامی اقدار کی بنیاد بن جاتا ہے اور تصوف کے عوامی پہلوؤں پر سردار جعفری نے بعض مذہبی حوالوں سے بحث کی ہے مثلاً پیغمبران سخن میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ اور انسان دوستی یا ہمہ گیر

عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب تر دکھایا ہے۔کبیر اور میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے وقت سردار جعفری کو تصوف قرون وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے اور لکھتے ہیں ''جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے''۔اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں۔

4۔اس عہد میں جب وہ میر کی زبان پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں کہ ''میر اور ان کے ہم عصر شعرا ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعروں میں ڈھال کر خوبصورت اور ادبی بنا رہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر اظہار و بیان کے لیے وسعتیں پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ کر رہے تھے اور محاوروں کا اردو ترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جاتے تھے۔(علی سردار جعفری، پیغمبران سخن، صفحہ 73)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب سردار جعفری کو عام بول چال کی زبان اور اسے قبول عام کی سطح تک لانے کے لیے ترکیبوں کی تراش خراش اور مقامی زبان سے فارسی کی ہم آہنگی کی صورتوں کا بخوبی اندازہ ہو چلا تھا۔

5)۔اقبال شناسی میں سردار جعفری نے اقبال کو مسلم بیداری اور ایشیائی بیداری، ہندوستان کی بیداری، عالم انسانیت کی بیداری اور صحیح معنوں میں عالمی شاعر ثابت کیا ہے جن کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس کتاب کے دیباچے میں انہوں نے اقبال کے متعلق پہلے ہی یہ وضاحت کر دی ہے کہ:

''چوں کی اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور قوم پرستی (نیشلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا اس لیے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا خون بہا کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خواں تھے۔ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرے میں سانس نہیں لے سکتا''۔

(علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:11)

مذکورہ بالا (۱) تا (۵) بحوالہ عمر رضا، علی سردار جعفری صفحہ:335,533, 534, 535

علی سردار جعفری کو اپنے پہلے دور کی تنقید (''ترقی پسند ادب'') میں تبدیلی کا اعتراف ہے۔

ندا فاضلی سے بات چیت کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''جعفری صاحب! آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اصغر، یگانہ، فانی کے مقابلے میں جگر کی شاعری سے زیادہ بحث کی ہے۔جگر ان تینوں میں کمزور شاعر بھی ہیں اور پھر جن شعروں میں آپ نے سماجی شعور کو تلاش کیا ہے وہ بھی جگر کی شاعری میں کچھ زیادہ اہم نہیں''۔

''یہ صحیح ہے۔حسرت'' یگانہ اور اصغر کا ذکر بھی وضاحت سے ہونا چاہئے تھا۔کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھوں گا۔جگر کی شاعری زیادہ سطحی ہے ''ترقی پسند ادب'' سے اب تک میری سوچ کی بنیادی سطح تو وہی ہے، ہاں! اس کے

اطلاق میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔میرا جی کے بارے میں میری جو رائے پہلے تھی، وہی اب بھی ہے۔منٹو نے کچھ بڑی کہانیاں بھی لکھی ہیں جیسے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' وغیرہ۔ یہاں وہ اپنے کرافٹ میں دوسروں کو اپنے قریب تک نہیں بھٹکنے دیتا۔یہ عالمی معیار کی کہانیاں ہیں۔مگر ''سرکنڈوں کے پیچھے'' اور ''بو'' گھٹیا کہانیاں ہیں۔مجھے آج بھی یہ کہانیاں بری لگتی ہیں''۔ 354

سردار جعفری کی تنقید پر لکھی گئی کتابوں ''ترقی پسند ادب (1951) اور پیغمبران سخن (1958 اور 1965ء کے درمیان لکھے گئے مقدمے) کے تعلق سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے کہ دونوں کتابوں کا مزاج کئی مماثلتوں کے باوجود مختلف ہے۔

انہوں نے دونوں کتابوں کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے لیے کبیر، میر، غالب شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے'' اسی لیے انہوں نے ان مقدموں میں پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ اختیار نہیں کیا۔لیکن ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' ایک پیشہ ور نقاد کے قلم سے نکلی ہوئی فکر و خیال کا نتیجہ لگتی ہے۔شاید اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی۔ جہاں ترقی پسندی ایک ضرورت تو تھی ہی اس سے زیادہ ایک بحث تھی۔اسلیے اس کتاب میں جتنی بحثیں ہیں کم و بیش اس کتاب کو لے کر ہوئیں جس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہی کہ یہ کتاب ترقی پسندی کی طرح خوب مقبول ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ان دونوں کے مابین ایک فرق یہ بھی تھا کہ ان تینوں شاعروں کی انسان دوستی، ترقی پسندی ایک فارمولے، ایک نظریہ سے زیادہ ایک جذبہ، ایک فطرت کا درجہ رکھتی تھی اور بیسویں صدی کے بیشتر فن کاروں میں بالعموم اور ترقی پسند فنکاروں میں بالخصوص ایک سوچا سمجھا اور کبھی کبھی اوڑھا ہوا فلسفہ اور فیشن زدہ فکر کا درجہ رکھتی تھی اس لیے بحث طلب تھی اور تحقیق و توجہ طلب تھی۔پھر بھی اس رجحان اور اس کتاب کی تاریخی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے''۔ 355

سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اور ''پیغمبران سخن'' کے تعلق سے مختلف ادیبوں اور نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی:

''سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اسی دور کی یادگار ہے۔ان سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ایک عہد کی اہم ترین دستاویزات میں ہے جس کے بغیر اس عہد کی ادبی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا''.....

سردار جعفری نے ان ادبی شخصیات (کبیر داس، غالب، میر، کبیر، میرابائی) کے کلام کو نہ صرف دونوں زبانوں (ہندی اور اردو) میں بیک وقت شائع کیا بلکہ ان پر جو تفصیلی مقدمے لکھے وہ خیالات، تجزیے اور سخن فہمی اور اسلوب غرض کہ ہر اعتبار سے نہایت اہم ہیں''۔ 356

پروفیسر سید محمد عقیل:

''میر غالب میرابائی اور کبیر کا اردو ہندی میں ایسا محاسبہ کیا جو کم از کم اردو کے کسی ادیب سے ممکن نہ ہو سکا''۔ 357

''سردار نے اپنی نثری تحریروں کے توسط سے اردو تنقید میں بھی اپنے لیے ایک منفرد اور نمایاں مقام پیدا کیا۔ ''ترقی پسند ادب'' ''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'' اور انگریزی اور اردو میں شائع شدہ متعدد مضامین کے علاوہ کبیر، میرابائی، میر اور غالب کے انتخابات اور ان کے مقدمات نے اردو دنیا میں ان کی تنقیدی بصیرت، کلاسیکی آگہی اور ادبی دوروں بینی سے متعارف کرایا۔ سردار نے ''اقبال شناسی'' کے اپنے مضامین کے توسط سے فکر اقبال اور کلام اقبال کا محاسبہ کر کے اقبال شناسی میں نئی جہتوں اور نئے زاویوں کا اضافہ کیا''۔ 358

سردار جعفری نے 27/نومبر 1993ء میں اپنے تہنیتی جلسہ میں تقریر کے دوران اپنی شاعری کی انفرادیت کے بارے میں کہا ہے۔ نیز چند نقادوں کی آرا اور ان کے جوابات بھی دیے ہیں۔

چند اقتباسات پیش ہیں:

(ا) ''میں اپنے آپ کو اردو شاعروں کے اس گروہ میں شامل کرتا ہوں جنھوں نے روایت سے انحراف کیا ہے، کچھ گستاخیاں کی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو کبھی لیلیٰ یا شیریں نہیں کہا ہے بلکہ وینس اور ہیلن کہا ہے۔ اردو والوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ اردو کا یہ مزاج برداشت نہیں کر پاتا، بس وہی تہذیب کا مسئلہ آڑے آتا ہے میں شاعری کو گل و بلبل تک محدود نہیں رکھتا، اس سے نکلنا چاہتا ہوں''۔ پتھر کی دیوار'' دیکھئے۔ آپ کو اس میں بدلی ہوئی، میجری ملے گی لیکن کیا کسی نقاد نے اسے محسوس کیا کسی پر اقبال سوار ہیں، کسی پر جوش، کسی پر فیض۔ اب میں کیا کروں۔ اگر انہیں انفرادیت نظر نہیں آتی تو اس کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔

مجھ پر کس کس کے اثرات ہیں یہ تو تلاش کر لیا لیکن کیا اثر ترتیب دے رہا ہوں اسے تلاش کرنے کی کسی نے زحمت نہیں کی .....

(2) ''شمس الرحمن فاروقی نے میری کتاب ''ایک خواب اور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس پر فیض کی نقل ہے۔ میں نے انہیں لکھا آپ فیض کو سمجھ سکے اور نہ مجھے (اس کے بعد وہ فیض اور اپنی شاعری کے فرق کو بیان کرتے رہے)۔ اسی طرح اسی مجموعے کے بارے میں پروفیسر محمد حسن پچھلے چالیس سال سے یہ کہتے آرہے ہیں کہ سردار دراصل شکست خواب کے شاعر ہیں۔ حالاں کہ میں ایک اور خواب دیکھنے اور دکھانے کی بات کر رہا ہوں''.....

(3) ''میں نے اپنے یہاں کلاسیکی تشبیہات سے الگ ہٹ کر نئی تشبیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے مثال کے طور پر میری نظم ''نیند'' (پوری نظم سنائی) نئی دنیا کو سلام میں میں نے روایتی تصور حسن کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس نظم میں میں نے پہلی بار اردو شاعری میں ایک حاملہ عورت کا کردار پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعے تاریخ اور وقت کی گردش کو بھی اٹھایا ہے۔ اگر ہماری تنقید اس نئی امیجری کی داد نہیں دیتی تو میں کیا کروں۔ میں نے رقص کائنات کو نئے سرے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ناقد اس کا ساتھ نہیں دے پاتا''۔

(4) ''مجھ پر سیاست کے حوالے سے بھی اعتراض ہوتا ہے مگر اس قسم کا اعتراض ولوگ کرتے ہیں جن کی تنقید ابھی آہ اور واہ سے آگے نہیں نکل سکی''.....

(5) ''مجھ سے یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ جس مستقبل کی آپ بشارت کرتے ہیں کیا وہ مستقبل آیا؟ میں نے کبھی ایک مستقبل کی بات نہیں کی۔کوئی بھی نہیں کرسکتا۔اقبال نے بھی نہیں کیا۔میں ''ہر منزل ایک منزل ہے نئی آخری منزل کوئی نہیں'' کا قائل ہوں.....

(6) '' کچھ لوگ نعرہ بازی کی شاعری کو بُری شاعری کہتے ہیں۔اقبال کا شکوہ کیا ہے۔نعرہ ہی تو ہے لیکن بڑی شاعری بھی ہے۔ہر شاعر کے یہاں نعرے ملتے ہیں۔ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں کون سے کھوکھلے جاتے ہیں لیکن ہم پھر بھی لگاتے ہیں اور آج ضرورت پڑے گی تو ہم پھر لگائیں گے۔جب دلوں میں چنگاری ہوتی ہے تو نعرے بھی لگتے ہیں، پرچم بھی بلند ہوتے ہیں اور انسان کی جدوجہد کا سفر اسی طرح جاری رہتا ہے''۔ 359

سردار جعفری کی نظر میں ترقی پسندی:

سردار جعفری نے لکھا ہے: ''میں ترقی پسند ہوں لیکن ایک انقلابی نقطۂ نگاہ کا حامل ہوں۔میں نے ترقی پسندی کو ہمیشہ ایک دھنک، ایک قوسِ قزح کہا ہے جس میں بہت سے رنگ ہیں اور ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے اور آج کے عہد میں جب احتجاجی ادب زیادہ لکھا جارہا ہے اس دھنک کے رنگوں میں کچھ میل بھی آگیا ہے۔سارا کا سارا احتجاجی ادب ترقی پسند نہیں ہوسکتا اگر میں انتہائی مبالغہ آمیز مثال دوں تو اس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف ہٹلر اور مسولینی کے ہم خیالوں کا احتجاجی ادب کسی طرح ترقی پسند ادب نہیں تھا جس طرح نازی جرمنی کی نیشنل سوشلزم کا سوشلزم سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا''۔ 360

شاعری میں نئی لوازمات سے متعلق سردار جعفری کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''شاعری میں وہ کسی مخصوص فارم کی قائل نہیں تھے۔نظم وغزل دونوں ان کی دسترس میں تھیں،بحر وزن کے سلسلے میں اگر چہ وہ رہین روایات نہیں تھے مگر شاعری میں صوتی اتار چڑھاؤ اور نغمگی بہر حال ضروری سمجھتے تھے چنانچہ ان کی نظمیں وزن وبحر کی حامل ہیں۔شعری صوتی نظام کے بارے میں ان کا ایک متعین تصور تھا اسے وہ عملاً برتتے تھے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ اردو شاعری پڑھنے والے لوگوں کا ایک طبقہ بھی قدیم اوزان پر اصرار کرتا ہے اور مصارع کے متوازی اور برابر ہونے نیز قافیہ ردیف سے انہیں آراستہ کرنے پر زور دیتا ہے لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ قافیہ ردیف پر اصرار بیجا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے افکار و خیالات کو اس آزادی اور فطری بہاؤ کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا جو سچی شاعری کی خصوصیت ہوتی ہے ..... جب کہ سردار جعفری خیالات کے استحکام اور ان کے اظہار میں روانی و برجستگی کے قائل تھے۔.....وہ اپنا موقف بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری کرتا رہا ہوں۔میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔اس کوشش میں میں ان حدوں کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور ''شاعرانہ'' زبان کے بیچ میں حائل ہے۔جہاں میں ان حدود کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا

مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں ''شاعرانہ'' زبان بھی استعمال کرلیتا ہوں۔یہ دراصل بول چال کی زبان کا عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے''(پتھر کی دیوار)۔ 361

ڈکٹر سید سراج الدین اجملی نے ان نکات کو بتلایا ہے جن سے سردار جعفری کی شاعری کا مطالعہ مناسب وموزوں ہے۔

انہوں نے سردار جعفری کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے دیباچے سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔

''سردار جعفری نے بار بار اپنے دیباچوں،خطبات اور بیانات کے ذریعہ اپنی مذکورہ شاعری کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔عصر اور عصری مسائل پر ان کا زور خارجیت سے ان کی حد درجہ وابستگی،انسان دوستی،عالمی امن اور بھائی چارے کے جذباتی نعروں سے ان کا لگاؤ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ ایک خاص زاویے سے ہی مناسب و موزوں ہے۔

''پتھر کی دیوار'' کے دیباچے سے یہ تین اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''(ا)ہر شاعر اپنے فن کے دامن میں روح عصر کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔کوئی کم اور کوئی زیادہ لیکن کسی نہ کسی حد تک ہر شاعر روح عصر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔جو اپنی اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہورہی ہے۔کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔اس اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے نغموں میں کل کچھ دیرپا قدریں پائی جائیں گی۔دیرپا قدروں کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے جنہیں کبھی کبھی ابدی قدریں کہہ دیا جاتا ہے ورنہ اس تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آکر عدم میں کھو جاتی ہے۔ابدی چیز کیا ہوسکتی ہے۔اسی لیے میں شاعری کو آج کی حقیقت یا روح عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں''(دیباچہ ''پتھر کی دیوار،صفحہ:4)

(2)''حقیقت یہ ہے کہ بول چالی کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر ''شاعرانہ زبان'' بنائی جائے تو وہ مصنوعی ہوجاتی ہے''(صفحہ:11)

(3)''پرانی تشبیہیں اور استعارے پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کرلینا نادانی ہے کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہوجاتا ہے لیکن کبھی وہ خیالات اور حساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر دہ ڈال دیتے ہیں''۔ (صفحہ:11) 362

شافع قدوائی نے سردار جعفری کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے:

(1)''علی سردار جعفری نے ترقی پسند تصور ادب کی توضیح وتشریح کو اپنے تنقیدی اکتسابات کا بنیادی حوالہ بنایا۔''ترقی پسند ادب''،''پیغمبران سخن''،''اقبال ایک مطالعہ''اور بعض ادبی جرائد میں شائع شدہ ان کے متعدد تنقیدی مضامین اسی مرکزی نکتہ کی تعبیر وتشریح سے عبارت ہیں''۔

(2)ادب کی ماہیت،ادب کے عوامی اور سماجی کردار کا تصور حسن اور جمالیاتی احساس کے بارے میں علی سردار جعفری کے خیالات کسی نئی بصرت کی خبر نہیں دیتے مگر جہاں انہوں نے نظری مباحث کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کے انفرادی

مطالعہ پرتو جہ مرکوز کی ہےاوران کا باہمی موازانہ کیاوہاں انہوں نے خیال انگیز نکات تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ان مضامین میں ایک نئی تنقیدی فضاء کا احساس ہوتا ہے۔جوش اور پریم چند کا موازنہ بظاہر بے جوڑ سا لگتا ہے مگر سردار جعفری کا تجزیہ دیکھئے جوان کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے:

پریم چند اور جوش دونوں قومی تحریک آزادی کے ابال کی تخلیق ہیں لیکن ان کا ادب اس تحریک کی کمزویوں اور سمجھوتے بازیوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ایک کے احتجاج نے حقیقت نگاری کی شکل اختیار کی اور دوسرے کے احتجاج نے رومانی بغاوت کی۔اس طرح پریم چند کی حقیقت نگاری اور جوش کی رومانی بغاوت ایک ہی تصویر کے دورخ بن جاتے ہیں۔۔۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پریم چند کی حقیقت نگاری میں رومانیت کی چاشنی ہے ورنہ ان کے ادب میں بھونڈا پن پیدا ہوجاتا اور جوش کی رومانیت میں حقیقت کی آمیزش ہے۔

(3)ترقی پسند ادب کی حد تک تو سردار جعفری کا تنقیدی نقطۂ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے مگر پیغمبران سخن میں شامل دیباچوں اور بعض دیگر مضامین کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سردار جعفری کے تنقیدی نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور انہوں نے فن پارہ کی تعین قدر کے لیے تنقید کے مختلف دبستانوں سے بیک وقت استفادہ کیا ہے۔اگر چہ سردار جعفری خود اپنے کو نقاد کہلانے سے انکاری ہیں، تاہم ان کا تنقیدی نقطہ نظر Electic جو سردار جعفری کے رچے ہوئے ادبی ذوق پر دال ہے"۔ 364

سردار جعفری کی تنقید میں تاریخی شعور کی کارفرمائی اور تاریخ ی اہمیت کو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنے ایک مضمون میں اجاگر کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

(1)سردار جعفری ہمارے ادب کی ان معدودے چند شخصیتوں میں سے تھے جن کے ادبی کارنامے پچاس پچپن سال کے طویل عرصے کو محیط ہیں..... "پچپن برس سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کے بے حد اہم سال ہیں۔ان میں انقلاب کی دھمک بھی ہے، جنگ آزادی کے فلک شگاف نعرے بھی، سرفروشوں کا لہو بھی، سنگینوں کا شور بھی، فرنگیوں کا زور بھی، صبح آزادی کی روشنی بھی اور آزادی کی مایوسیاں اور ناکامیاں بھی اور جمہوریت کی ابھرتی ہوئی تصویر بھی۔ بدلتے ہوئے ہندوستان کے مختلف رنگ بھی۔پنج سالہ پلان اور صنعتی ترقی بھی گاندھی، نہرو، ابو الکلام آزاد اور لال بہادر شاستری کی موتیں بھی۔اندرا گاندھی اور راجیو گاندی کا سفاکانہ قتل بھی۔چین، پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگیں بھی۔کشمیر کا مسئلہ بھی اور تاشقند معاہدہ بھی۔گولڈن ٹمپل آپریشن اور بابری مسجد کا سانحہ بھی "دل بدلو" سیاستیں بھی اور حوالے گھوٹالے بھی۔ 1992ء کے منحوس واقعات اور خون ریز فسادات بھی۔بم بلاسٹ بھی اور پوکھرن کا ایٹمی دھماکہ بھی۔یہی نہیں بلکہ ایک عالمی منظر نامہ بھی ان کے سامنے رہا جس میں ویت نام، فلسطین، اسرائیل، عراق، ایران، افغانستان اور جنوبی افریقہ کی جنگیں اور تحریکیں بھی شامل ہیں۔روس کا پارہ پارہ نظام بھی۔وہ نظام جس کے نقیبوں میں خود سردار جعفری بھی تھے۔365

(سردار جعفری کا شعری سفر مطبوعہ سہ ماہی جامعہ، اکتوبر 1980ء)

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے 1980ء میں لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون کا اقتباس دینے کے بعد سردار جعفری کے تاریخی

شعور پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

(ا) یہ سارے واقعات جوانہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور ماضی کے وہ تمام قصے جوانہوں نے اپنے کانوں سے سنے تھے سردار جعفری کے تاریخی شعور کی نشو ونما اور پختگی کے لیے کافی تھے۔ ویسے بھی تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اور اس کا مطالعہ وہ بے حد ضروری خیال کرتے تھے ....."

2)..... ان کا خیال تھا کہ کسی بھی آرٹ یا لٹریچر کو تاریخی پس منظر جانے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا....."

3)۔ "سردار جعفری کا تاریخی شعور اتنا پختہ، اتنا قوی اور اتنا بیدار تھا کہ ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک تحریر سے ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چاہے وہ ان کی نثر نگاری ہو تنقید ہو، افسانہ ہو، ڈرامہ ہو، مکتوب ہو، کوئی خطبہ ہو یا پھر ان کی شاعری بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے کلاسیکی شعراء کے جو دواوین مرتب کیے ہیں ان کے پیش لفظ یا مقدمے بھی اسی تاریخی شعور کے غماز ہیں.....

4)۔ "..... وہ ادب کے مطالعے کے لیے تاریخی شعور کو لازمی قرار دیتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ماضی کے ادیبوں کو ان کے عصری ماحول کے پس منظر ہی میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے تبھی ان فن پاروں کی تنقید کا حق ادا ہو سکتا ہے بلکہ ماضی کے ان ادبی کارناموں سے ہم نہ صرف یہ کہ استفادہ اور بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ انہیں اپنے اندر انگیز کر کے اپنے ذوق جمال کی تربیت بھی کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ "ماضی کی صحت مند روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے اور تاریخ کو وہی مٹاتا ہے جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے"۔ (ترقی پسند ادب صفحہ:6)

.....ان کے نزدیک کلاسیکی روایات کے مطالعے ہی سے ایک تنقیدی نظر پیدا کی جا سکتی ہے وہ چاہتے تھے کہ ترقی پسند نقاد آگے بڑھ کر "ماضی کے پتھروں کے نیچے سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالیں جن سے صدیوں تک ہماری کشت ادب کی آبیاری ہوتی رہی" .....

5)۔ پیغمبران سخن، میں وہ کبیر، میر اور غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر عام نقادوں کی طرح رائے نہیں دیتے بلکہ ہر فن کار کے تاریخی پس منظر میں اس کے فن کا تجزیہ کرتے ہیں۔

(6) .....تدوین و ترتیب کے اہم کارناموں کے علاوہ ان کی جو تنقیدی تحریریں ہیں ان میں بھی ان کا تاریخی شعور نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے مثلاً شبلی (جنہوں نے اردو میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کو فروغ دیا) کے فردوسی پر لکھے گئے مضمون کا سردار جعفری نے جو تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف خود ان کے تاریخی شعور کا غماز ہے بلکہ شبلی کے تاریخی شعور کی طرف اشارہ کناں ہے"۔.....

(7) "..... سردار جعفری ادب کو اپنے عہد کے تاریخی حالات کی دین قرار دیتے ہیں اور تاریخی حالات دراصل سماجی حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں....."

(8) "..... ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ انسانی سماج کی یا کسی مخصوص علاقے کی یا کسی مخصوص دور یا ادوار کی تاریخ سلسلہ وار بیان کر دی جائے، بلکہ مختلف سماجی حقائق کی صحیح تفہیم اور زمان و مکان کے اعتبار سے ان کا بیان

اور اظہار اصل تاریخی شعور ہے۔366

سردار جعفری کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

1۔سردار کے تنقیدی مضامین ان کی شاعری سے کم اہم نہیں ہیں اس لیے کہ وہ ادبی مطالعہ اور تفہیم کی ایک نئی سمت و رفتار کا تعین کرتے ہیں جس کی بنیاد متن، تہذیب، شعر اور شعر کی جمالیات پر ہے۔انھوں نے اس سارے کام میں تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب کو سامنے رکھا ہے۔

2۔بقول سردار جعفری تاریخ محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ سماجی اور معاشی رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی ہے اور فکر و شعور کا سفر بھی۔ (پیغمبران سخن صفحہ 14)

تاریخی واقعات عصری حالات کی بنیاد پر رونما ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ان کی حیات اور اثرات وقتی ہوتے ہیں لیکن ان سے نمو پانے والی فکر عصری قیود کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہے اور صدیوں بعد بھی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

3۔سردار جعفری ایک انسان دوست تحریک کے علمبردار ہیں اور ساری زندگی اپنی تحریروں اور اپنی شاعری کے ذریعہ اسی انسان دوستی کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ان کے لیے انسان دوستی ہر طرح کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔وہ زبان کی قید و بند کو توڑ کر موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔وہ عطار، رومی، حافظ اور کبیر، میرا، میر، غالب اور اقبال کے فرق اور لسانی امتیازات کو نہیں جانتی۔وہ نسلوں اور رنگوں کے فرق سے بھی نہیں واقف ہے۔وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے اور مشترک اقدار کے درمیان پل بناتی جاتی ہے۔

4۔سردار جعفری نقد شعر میں بنیادی طور پر متن پر زور دیتے ہیں لیکن متن کے ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی سیاق کو فراموش نہیں کرتے اس لیے کہ کبھی کبھی متن اس کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے اور الفاظ، استعارے اور علامتیں پورا اظہار نہیں کر پاتیں۔سردار جعفری اس کے پورے سیاق میں شاعر اور اس کے کلام کو دیکھتے ہیں۔367

5۔سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی۔ان کی بعض تحریریں تحریک میں زبردست اعتراض اور بحث کا موضوع بنیں۔قدیم ادب، کلاسیکی ادبی قدروں اور ترقی پسندی کے مفہوم کے بارے میں ان کے رویے پر شدید اعتراضات ہوئے ہیں جو وقتی جوش اور انقلاب کی جذباتی تاویل کا نتیجہ تھا۔لیکن ان کی تنقید کی اہمیت ان کے اُن مضامین یا ترقی پسند تحریک کی تاریخ سے نہیں بلکہ کبیر بانی، میرا اور دیوان غالب کے دیباچے کی شکل میں شامل ان کے مضامین اور ان کے بعد کے دوسرے مضامین سے ہے جو یقیناً اردو تنقید میں کلاسیکی ادب کے تجزیے کے ترقی پسند معیار کو پیش کرتے ہیں۔368

سردار جعفری کی تنقید نگاری کو بہت سے ادیبوں نے وقیع مانا۔ذیل میں چند ادیبوں کے اقتباس پیش ہیں:

پروفیسر شارب ردولوی:

سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ایک ترقی پسند تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں ملی۔ایک ناقد کی حیثیت سے اگر کبھی کوئی حوالہ آیا بھی تو وہ ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے مباحث میں الجھ کر رہ

گیا۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔انھوں نے خود بھی اصطلاحی معنوں میں نقاد کی حیثیت سے کبھی خود کو ظاہر (project) نہیں کیا حالاں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ بہت سے سکہ بند ناقدوں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے۔دراصل سردار جعفری کو بہ حیثیت ناقد سمجھنے میں اسی لیے دشواری ہوئی کہ وہ اپنی نثری تحریروں میں اپنی شاعرانہ شخصیت سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اردو کے ان ناقدوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی جو تنقید سے زیادہ نظریہ سازی کے شکار تھے۔369

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید:

میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا (سردار جعفری، پیغمبران سخن دیباچہ) سردار جعفری خود کو نقاد نہ کہتے ہوں لیکن ان کے نکھرے ہوئے تنقیدی شعور سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ ان کی تنقیدی بصیرت اردو ادب کے لیے وجہ افتخار ہے۔ 370

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے (سردار جعفری) جن تنقیدی افکار پر سخت تنقید کی ہے اور ان افکار کو ان کی ذہنی اور فکری سوانح عمری قرار دیا ہے،ان کا تعلق بھی ''ترقی پسند ادب'' میں شامل بیانات اور اسی زمانے میں شائع شدہ مضامین میں سامنے آنے والے تنقیدی رویوں سے ہے مگر سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی کتابوں ''پیغمبران سخن'' اور ''اقبال شناسی میں نظر آتی ہیں۔ان تحریروں میں مصنف کا زاویہ نظر نسبتاً لچک دار،قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔371

ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کی تنقید کا بنیادی رویہ تاثراتی تنقید کے دبستان کے قریب معلوم ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے مارکسی تنقید کے علاوہ نئی مغربی تنقید کے طریق کار سے بھی استفادہ کیا ہے۔372

بقول شافع قدوائی:

معنی کی تشکیل میں قاری کے عمل پر اصرار قاری اساس تنقید کا مابہ الامتیاز عنصر ہے۔متن اصلاً جامد اور بے جان شئے ہوتا ہے اور جن کی زندگی کا انحصار قرأت پر ہوتا ہے۔اس طرح موضوع اور معروض کی حد بندی ختم ہوجاتی ہے اور معنی indeterminate ہوجاتے ہیں اور اس طرح ہر قاری subjected object سے معنی کی ایک نئی جہت پیدا کرتا ہے۔سردار جعفری کو بھی قرأت کے عمل میں قاری کے اساسی کردار کا احساس ہے اور وہ لکھتے ہیں:

''دراصل شعر گوئی کی طرح شعر فہمی کی بھی تخلیقی سطح ہوتی ہے اور اس کا اپنا جمالیاتی عمل ہے جس طرح شاعر تخلیق کرتا ہے اس طرح قاری کو بھی از سر نو ایک اور مگر ذرا کم شدت کے تخلیقی عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔اس لیے جس طرح ایک شخص شعر کو سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے اس طرح دوسرے کے لیے ممکن نہیں۔373

ان کے (سردار جعفری) خیال میں انسانی عظمت محض اسی وجہ سے قائم ہے کہ زندگی کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔لوگ مرتے ہیں مگر انسان زندہ رہتا ہے۔اس کے اندر سانس لینے والی نیکیاں اور سچائیاں زندہ رہتی ہیں اور ہر دور میں اپنے آپ کو

منواتی رہتی ہیں۔374

پروفیسر سید فضل امام رضوی نے ''سردار جعفری کا انتقادی عمل'' عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں سردار جعفری کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔اس مضمون کے چند اقتباسات پیش ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے:

1۔ان (سردار جعفری) کی انتقادی کاوشیں بھی بالکل سعی لاحاصل کے ذیل میں نہیں آتیں۔

2۔ وہ (سردار جعفری) کوئی بہت بڑے نقاد یا نظریہ ساز نقاد نہیں ہیں لیکن شعروادب کی افہام وتفہیم کے کچھ اہم نکات بیان کیے ہیں جس میں جوش، جذبہ اور ذہانت وفطانت کے عنصر نمایاں ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ تھے۔اردو، ہندی، انگریزی، فارسی کے ساتھ روسی زبان وادب پر اچھی نظر رکھتے تھے۔وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے اور یہی انداز خطابت ان کی تنقیدوں میں بھی اکثر جھلکیاں دکھلا دیتا ہے۔ان کی پہلی تنقیدی کاوش جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات، علی گڑھ میگزین میں 1936ء میں شائع ہوئی، دوسری کاوش، ترقی پسند مصنفین کی تحریک نیا ادب لکھنو کے اپریل 1939ء میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے ترقی پسند ادب جیسی کتاب تحریر کر کے اس کے مختلف جہات اور نشیب وفراز سے متعارف بھی کرایا ہے۔

3۔ دیوان میر اور دیوان غالب پر لکھے جانے والے ان کے مقدمات بھی انتقادی اہمیت کے حامل ہیں۔ان مقدمات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن وادب کے ذیل میں ان کا نقطۂ نظر خالص اشتراکی ہے۔کبیر کے سلسلہ میں بھی ان کا انداز فکر بھکتی سے زیادہ مارکسی ہے اور وہ کبیر کی شاعری میں مارکسی فکر ونظر کا سراغ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔انھوں نے ترقی پسند تحریک کو ادبی سائنس کی حیثیت سے اپنایا ہے۔وہ رقمطراز ہیں: میں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے رجحانات کا جائزہ مادی، تاریخی اور سماجیاتی (عمرانی) نقطۂ نظر سے لیا ہے۔یہ نقطۂ نظر میرے لیے سائنس کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے لیے خارجی کسوٹی ضروری ہے۔(ترقی پسند ادب 67)

4۔علی سردار جعفری کی تنقیدی کاوشوں میں ہر مقام پر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فن وادب کوئی الہامی شئے اور ماورائی طلسم نہیں ہے بلکہ کائنات فن وادب ہمارے طبقاتی سماج کے مادی وخارجی حقائق کی سچی دستان ہے جس میں ہمارے عوام اور محنت کش طبقے کے افراد کی زندگیاں رقص کناں ہیں۔سردار جعفری کی انتقادی نگارشات ہمیں یہی باور کراتی ہیں کہ جو ادب ہمارے سماج کی عوامی زندگی کو نظر انداز کر کے سماج کے صف اعلی اور خوش حال طبقے کو مرکزی فن وادب بناتا ہے جس میں صرف عیش و عشرت سامانیاں اور اس کے ترانے گونجتے ہیں وہ صحیح معنوں میں فن اور ادب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

5۔وہ بہر طور پر ہر لحہ ادب اور زندگی کے رشتے کے ارتباط کو قائم رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ کسی بھی ایسے حسن کو حسین کہنے کے حق میں نہیں ہیں جو حیات انسانی کے لیے سماجی، اخلاقی، ذہنی یا جسمانی کسی بھی طرح سے مفید وکارآمد نہیں ہو۔ان کا خیال ملاحظہ ہو، اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے لیے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔(ترقی پسند ادب صفحہ 89)

6۔وہ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی میں یقین رکھتے ہیں اور رقمطراز ہیں 'بغیر ہیئت کے موضوع اور بغیر موضوع کے ہیئت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ (ترقی پسند ادب صفحہ 78)

7۔ابتدأ سردار جعفری مشرقی انتقادیات اور اس کے پیمانوں میں یقین رکھتے تھے جیسا کہ خود لکھتے ہیں ''روایت قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعری مین ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا ہے لیکن بعض نوجوان اسے بے جا قیود کا نام دے کر مغرب کی تنقید میں بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیز پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبا ہیں، لیکن بعد میں خود اپنے اس معیار و میزان پر وہ قائم نہیں رہ سکے اور اسی بلینک ورس میں ''نئی دنیا کو سلام'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔

8۔سردار جعفری عوامی ادب اور عوامی زبان پر زور دیتے ہیں اور لکھتے ہیں: اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک بنیادی جزو عوامی کردار ہے اور ہماری ساری جدوجہد یہ ہے کہ ہمارا ادب عوامی ادب بنے (ترقی سند ادب صفحہ 227) اس ذیل میں انھوں نے ایک مشاعرہ کا واقعہ مجروح سلطان پوری کے حوالے سے درج کیا۔ مجروح سلطان پوری نے جب مزدوروں کے سامنے ایک غزل پڑھی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستان بنتا گیا

تو مزدور آپس میں باتیں کرنے لگے ''مجروح بھی ہمارے شاعر ہیں'' مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تو ایک مزدور نے آکر مجھ سے پوچھا ''آبلہ پایانِ شوق کا کیا مطلب ہے؟ یہ الفاظ اس نے گھٹیا قسم کی سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھ لیے تھے جسے مزدور اپنا شعر کہہ دیں اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔(ترقی پسند ادب صفحہ 56)

حالاں کہ خود سردار جعفری کے یہاں اس طرح کی تراکیب اور الفاظ ملتے ہیں جیسے شیوۂ دلداری، شعلہ شعر و دانش فسوں کاری، رفیق محبس و زنداں، شعلہ پیکر گل عذاروں، سیل رواں، خفیف ارتعاش وغیرہ، درج بالا الفاظ کیا عوامی شاعری کے ترجمان ہیں؟ اور مزدوران کے مطلب اور معانی سے آشنا ہوں گے؟ معلوم نہیں اس طرح کے الفاظ مزدوروں نے کس معیار کی سگریٹ کی ڈبیا پر لکھے ہوں گے؟ 375

ڈاکٹر وحید اختر نے سردار جعفری کی تحقیق و تنقید میں ناقدانہ نظر کی کارفرمائی اور کٹر ترقی پسندی سے کلاسیکیت کی طرف مراجعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر کے ساتھ جعفری نظریہ ساز بھی ہیں اور نقاد بھی۔انہوں نے میر اور غالب کے دیوانوں کا انتخاب کرنے کے ساتھ ان پر بسیط مقدمے بھی لکھے ہیں جن کے لیے انہیں کلاسیکی روایت اور تصوف کے مسائل کی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا۔اسی کے ساتھ انہوں نے کبیر اور میرابائی کا انتخاب بھی کیا۔بظاہر یہ تحقیق و تدوین کے کام ہیں لیکن جعفری صرف محقق نہیں، ان کی ناقدانہ نظر اور سیاسی سماجی شعور تحقیق میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔کٹر ترقی پسندی سے کلاسیکیت کی طرف یہ مراجعت ان کے ذہنی سفر کی ایک اور سمت ہے۔وہ عصر حاضر اور اس کے تقاضوں سے باخبر ہونے کے ساتھ کلاسیکی روایت کے بھی مزاج دان ہیں۔اس طرح ان کی نظم و نثر کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک عمر میں کئی عمریں گزارنے کے ساتھ ہر عمر کو کئی سطحوں پر بھی تخلیقی لحاظ سے برتا ہے''۔376

سردار جعفری کی تنقید نگاری کے بارے میں عمر رضا نے اپنی تصنیف علی سردار جعفری (سنہ اشاعت 2008) میں لکھا ہے:

سردار جعفری نے اپنی مختلف تنقیدی تحریروں میں فکر وفن کے حسین امتزاج کی بات کی ہے لیکن ابتداء میں انہوں نے فکر کو مقدم رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اگر چہ ان کے یہاں فکر وفن کے حسین امتزاج پر زور ملنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں وہ طبعاً اور مزاجاً فن سے زیادہ فکر کو اہمیت دینے کی بات کہتے ہیں ا۔ البتہ مذکورہ عہد کی تخلیقات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب وہ فکر وفن کے حسین امتزاج کو خصوصی اہمیت دینے لگے تھے۔ تنقیدی تحریروں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک موضوع اور مواد ہی کو ادب کے حسن سے تعبیر کیا۔ اگر چہ اسے ھی قطعی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس مسئلے کو لے کر سردار کے یہاں مختلف نشیب وفراز آئے"۔ 377

سید محمد مہدی نے سردار جعفری کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"ان (سردار جعفری) کی نثری تحریروں میں ان کا یہ مارکسی نقطہ نظر ان کی اہم تصنیف "ترقی پسند ادب" میں سب سے پہلے واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ادب اور فن کے ارتقاء کی تاریخ کے متعلق جو کچھ انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے وہ اہم بھی ہے اور معلوماتی بھی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی کتاب میں اور اس کے علاوہ بھی کچھ مضامین میں انہوں نے کچھ شاعروں، خاص کر دو ایک اہم ہمعصر شاعروں کے متعلق ذرا درشتی سے کام لیا ہے۔ دراصل وہ اپنے نظریات کی حد تک بہت راسخ العقیدہ تھے.....

.....اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چند ہم عصر ادیبوں پر درشت تنقید کی وجہ سے سردار جعفری کی ابتدائی تحریریں بے معنی ہیں۔ ادب اور فن کی تاریخ ارتقا کو سمجھنے کے لیے اور انجمن ترقی پسند مصنفین غرض وغایت کے متعلق ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" ایک اہم کتاب ہے لیکن ابی وہ دوسرے مارکسی عالموں کا سہارا لے کر اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ تھامس، کاڈویل، پلاخنوف وغیرہ بولتے محسوس ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھتے ہیں۔ نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ کبیر، میر، غالب، اقبال پر ان کی پر مغز اور انتہائی دلکش تحریریں ان شاعروں پر ان کی شاعری پر اور ان کے عہد پر ایک نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ مارکسی سوشیالوجی اور جمالیات کے بہترین نمونے ہیں اور تخلیقی نثر کے شہ پارے۔ یہ ان کی شاعری اور تنقید نگاری کا دوسرا دور نہیں ہے۔ یہ ان کے تخلیقی سفر کی توسیع ہے۔ اس سفر کے دوران انہیں نئے مناظر نظر آتے ہیں، نئے زمین و آسمان نظر آتے ہیں۔ نئے امکانات روشن ہوتے ہیں، نئے تجربات عوت دیتے ہیں"۔ 378

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے سردار جعفری کی تنقید نگاری کے عمدہ نمونوں کی نشاندہی کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"جعفری صاحب ایک نقاد کی حیثیت سے بھی معروف تھے۔ ان میں مقابلے وموازنے کی قوت شدید اور نکتہ فہمی کی صلاحیت بے پناہ تھی۔ ایک ناقد کی حیثیت سے انہوں نے تنقید کی کوئی بوطیقا مرتب کی اور نہ ہی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو احاطہ تحریر میں لا کر تنقید کی ماہیت اور منصب سے بحث کی ہے۔ ان کی تنقید میں وہی اصول وضابطے ملتے ہیں جو ترقی پسند تحریک یا مارکسی تنقید سے عبارت ہے۔ ان کی سب مشہور تنقیدی تصنیف "ترقی پسند ادب" ہے جسے ترقی پسندی کی تاریخ بھی کہہ سکتے

ہیں اور تجزیہ بھی۔کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود جعفری صاحب کو جمالیات سے عار نہیں تھا۔انسان اور دوستی کا سبق ان کے تنقیدی رویے میں بھی ملتا ہے۔''اقبال شناسی'' اور ''پیغمبران سخن'' انہیں ایک اعلیٰ تنقیدی منصب پر لا کھڑا کرتی ہے۔صرف یہ دونوں کتاب ہی انہیں اردو نقادوں کی پہلی صف میں رکھنے کے لیے کافی ہیں۔یہاں ان کا قلم خاصا منجھا ہوا اور چوکس معلوم ہوتا ہے۔سردار جعفری میں ایک بڑا نقاد چھپا ہوا تھا۔ان کی قوت تنقید کا اندازہ صرف ''ترقی پسند ادب'' کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا ہے بلکہ اس امر کا اندازہ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں،مقدموں،تبصروں،تنقیدی مضامین اور اداریے کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔میر،غالب،کبیر داس،میرا،اقبال اور دیگر شعرا پر تحریر کردہ مضامین سے بھی ان کی قوت استدلال،منطقی توضیحات،استدلالی تجزیے اور جمالیاتی احساسات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے''۔379

پروفیسر کوپی چند نارنگ نے سردار جعفری کی تنقیدی نظر کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے۔''میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں میں جیسی تنقیدی نظر علی سردار جعفری کی تھی ویسی کسی کی نہیں۔میر تقی میر،میرا بائی اور کبیر کے انتخابات بھی انہوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کیے۔بعد میں ان کے یہ مضامین ''پیغمبران سخن'' نام کی کتاب میں شائع ہوئے،غالب،حافظ،رومی اور اقبال کے وہ عاشق تھے۔اساتذہ کا بیشتر کلام ان کو حفظ تھا۔''ترقی پسند ادب'' میں انہوں نے جن لوگوں کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا،ان میں اقبال اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔بعد میں ان کی رائے میں تبدیلی آئی اور انہوں نے ''اقبال شناسی'' شائع کی اور اقبال صدی منانے میں بھی پیش پیش رہے۔نظریاتی طور پر جس طرح ان کی پسند و ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہیں''۔380

تنقید کا اسلوب کے سلسلہ میں راشد انور راشد نے لکھا ہے:

(1)۔تنقید بذات خود جس سنجیدگی کا تقاضہ کرتی ہے،اس کے پیش نظر انشا پردازی کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا کئی سطحوں پر حد درجہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔ایک خاص دائرے میں مقید رہ کر شعور کی گتھیوں کو سلجھانا نقاد کی مجبوری ہوتی ہے،کیونکہ ذرا سی غفلت کی بنا پر ساری محنت رائیگاں ہو جانے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ان حالات میں تنقید تخلیقیت اور انشا پردازی کی دولت سے مالا مال کرنا اپنے آپ میں ایک ایسا اجتہادی قدم ہے جس سے نئی منزلوں کا سراغ ملتا ہے''۔

(2)''عام طور پر تنقید سے بے رغبتی کی ایک بنیادی وجہ خشک اور ثقیل زبان کا استعمال بھی ہے۔اگر کوئی تحریر اظہار بیان کے فطری بہاؤ سے محروم ہو تو مطالعے کے دوران قاری کی دلچسپی خود بخود کم ہوتی چلی جاتی ہے۔اردو تنقید کے سرمایے پر اگر ہم اپنی نگاہ مرکوز کریں تو اندازہ ہوگا کہ تنقید کے نام پر وہی چیزیں آج بنیادی حوالوں کا درجہ رکھتی ہیں جن میں تنقید اور تخلیق کی سرحدیں آپس میں ملنے لگتی ہیں''۔ 381

تنقید میں اسلوب کے سلسلہ میں فدا المصطفیٰ فدوی لکھتے ہیں:

(3)''تنقید میں طرز اور اسلوب سے زیادہ مواد اور موضوع کی اہمیت مسلّم ہے،نقاد کے پیش نظر کس طرح کہنا چاہیے؟ اس سے زیادہ اہم کیا کہنا چاہئے؟ ہوتا ہے۔اس لیے یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی بات سادہ و سلیس زبان میں کسی پیچیدگی اور الجھاؤ کے بغیر بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو لیکن غیر معمولی ذہن و فکر کے حامل نقاد کیا کہنا چاہئے کے ساتھ،کس طرح کہنا

چاہئے، یہ بھی جانتے ہیں کیوں کہ وہ اس راز سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ اسلوب یا طرز نگارش میں تحریر کو تا دیر زندہ و تابندہ رکھنے کی قوت ہوتی ہے"۔381

ابوالفیض سحر نے سردار جعفری کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک اور خدمت سردار نے یہ بھی انجام دی ہے کہ حالی، عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی مقدمہ نگاری کے فن کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے بلکہ بہت اونچا اٹھایا ہے۔ دیوان میر، دیوان غالب اور کبیر بانی، کے دیباچے اردو ادب میں یقیناً اہمیت رکھتے ہیں۔ سردار کے مزاج کی طرح تقریر، اور ان کی تقریر کی طرح ان کی تحریر میں ایک بلند آہنگ ملتا ہے، جس میں زندگی کا حوصلہ اور جینے کا جذبہ پایا جاتا ہے جو تحریر کی ہر سطح پر رواں دواں رہتا ہے۔ اس طرح کی شدت احساس اور قوت اظہار سے ہی عظمت تحریر عبارت ہوتی ہے۔ رجز یہ جوش، جذبہ اور حرکت، رومانی رنگینی اور روانی جعفری کی نثر کے مخصوص عناصر ہیں۔

(ابوالفیض سحر، سردار جعفری کا اسلوب نگارش، شاعر، ستمبر 1970 ص:10)

''اسی کے ساتھ غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری ہے، جو تصویر گری کی معراج ہے، جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک حرف نرت کرنے لگتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں۔ مجرد خیال ایک پیکر رنگ و بو بن کر سامنے آجاتا ہے، دشت گرمئی رفتار سے جلنے لگتے ہیں"۔382

تنقید میں سردار جعفری کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے نصرت جبین نے مثالیں بھی پیش کیں۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

''بحیثیت نقاد سردار جعفری کے سفر کا آغاز 1950ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضامین کے لیے توضیحی نثر کا استعمال کیا۔ توضیحی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں کسی خیال کی وضاحت کی جائے۔ خیال ایک مجرد حقیقت ہے۔ اس مجرد حقیقت کا اظہار ہم جن صوتی علامتوں کی مدد سے کرتے ہیں وہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ الفاظ کے تانے بانے سے فقرے اور جملے بنتے ہیں اور اس طرح خیال ظہور میں آتا ہے۔ گویا الفاظ کی ایک منطقی ترتیب توضیح خیال کے لیے اولین شرط قرار پائی۔ اب جہاں تک خیال کی ساخت کا تعلق ہے یہ مشتمل ہے دو چیزوں پر۔ ایک دعویٰ دوسرے دلیل۔ دعویٰ اگر دلیل سے عاری ہے تو خیال وضاحت سے محروم رہ جائے گا۔ یہ تو ہوئے وہ لوازم جن کے بغیر توضیح خیال ممکن ہی نہیں۔ اب لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرے۔ نثری اسلوب کے اسی وصف کو کمیت الفاظ کے اعتبار سے ایجاز اور کیفیت الفاظ کے لحاظ سے بلاغت کہتے ہیں۔ گویا توضیحی نثر کی چار بنیادی خصوصیات قرار پائیں۔

(i) وضاحت۔ (ii) ترتیب۔ (iii) استدلال۔ (iv) ایجاز اور بلاغت۔ وضاحت اور استدلال کے بہت سے طریقے ہیں جن میں سے ایک خطابت بھی ہے، علی سردار جعفری نے اپنی نثر کے لیے خطیبانہ اسلوب کو ہی منتخب کیا ہے۔ الفاظ کا آہنگ، جملوں کا زیر و بم، تشبیہوں سے بیان کی دلکشی بڑھانا۔ استفہامیہ لہجہ فن خطابت کے ناگزیر اجزا ہیں ..... وہ اپنی باتوں کو دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(II) ''غالب کی تعریف میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس سے نثر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت منضبط اور مرتب انداز میں الفاظ کا استمال کیا ہے جس سے جملے زیادہ مربوط اور مستحکم ہوجاتے ہیں۔

''اس شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ شعروں کو بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ پھر لفظ حرفوں کے مجموعہ کی شکل میں نہیں بلکہ تصویروں کی شکل میں پہچانے جائیں گے۔ آدمیوں کے چہروں کی طرح وہ آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے اور اپنی شخصیت ظاہر کریں گے۔ لفظوں کا صوتی لوچ محسوس ہوگا اور ان کے باہمی ٹکراؤ کی جھنکار سے کان آشنا ہوں گے تب جا کر معنوی ترنم اور داخلی آہنگ کے دروازے کھلیں گے۔ اس طرح لفظی مفہوم سے گزر کر شاعرانہ مفہوم تک پہنچنے کا راستہ ملے گا اور وہ وجدانی کیفیت پیدا ہوگی جہاں وفا کا لفظ محبوب کی زلفوں کی طرح مہک اٹھے گا اور سرو چراغاں کرتا نظر آئے گا۔ عشق ذوق اور عمل بن جائے گا۔ حسن محبوب حسن کائنات میں تبدیل ہوجائے گا۔ نازو آدرش بن جائے گا جس کے حصول کے لیے دل وجان کی بازی لگانا خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ شمشیر وسناں کا جلال اور انداز و ادا کا جمال جلوہ گر ہوگا۔ فراق کا درد آرزو کی لطافت میں تبدیل ہوجائے گا اور وصال لذت طلب کی سرشاری میں۔ شوق ایک قوت تخلیق بن کر ابھرے گا اور جستجو بن جائیگا جس کی راہیں کبھی زندان کی زنجیریں روکیں گی اور کبھی دیر وحرم کی دیواریں۔ جنہوں نے اپنے اندر شوق کی درماندگی کو سجا رکھا ہے اور میخانہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی کی منزل بن کر ابھرے گا۔ پھر ''دیوان غالب'' کے ورق پر اس کے تخئیل کی مخلوق انگڑائیاں لینے لگے گی۔ اس کے سراپا ناز محبوب آنکھوں کے سامنے مسکرائیں گے اور اور دنیا زیادہ خوبصورت ہوجائے گی اور انسان زیادہ قابل احترام''۔

جلال و جمال، فراق و وصال، دیر وحرم وعلامتیں ہیں جن کو اکثر شاعر اپنی شاعری میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن سردار جعفری نے ان علامتوں کو نثر میں استعمال کر کے نثر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان علامتوں میں معانی کی وہ وسعتیں پنہاں ہیں جن کی گہرائی میں جا کر ہی ہم مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ حروف عطف اور مترادفات کا بکثرت استعمال خطابت کا مخصوص طریقۂ کار ہے۔ سردار جعفری نے اپنی نثر میں جوش وولولہ کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ شمشیر وسنان، انداز وادا، دشت وصحرا، دیر وحرم جیسے الفاظ کا استعمال ان کی نثر کے زوریاں کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی خطابت کا لازمہ ہے اور سردار جعفری نے اپنی نثر میں الفاظ کی تکرار سے بھی جوش وولولہ اور زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے خطابت کی اس خوبی کا استعمال نثر میں بہت کم کیا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کی تکرار کے نمونے مل جاتے ہیں جیسے:

''غالب کی شاعری میں ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب کے مضامین شاذونادر ہی ملیں گے۔''

ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب جیسے الفاظ عبارت کو خطابت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

(III) ''علی سردار جعفری نے جہاں فن خطابت کی بیشتر فنی خصوصیات کو اپنی نثر میں استعمال کر کے جوش وولولہ اور بیان میں زور پیدا کیا ہے وہیں الفاظ کا شکوہ، لہجہ کی گونج، تشبیہ و کنایہ کا استعمال، جملوں کی نحوی ساخت کا استعمال ان کی نثر کو شاعرانہ نثر کی حدوں میں داخل کر دیتے ہیں''۔

(IV) ''میر کی شاعری کی تعریف میں الفاظ کے تضادات سے نثر میں ایک خوبصورت کیفیت پیدا کی ہے:

''میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صدرنگ گلستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔بلبل بھی ہے صیاد بھی۔نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بھول جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے''۔

(V) ''اقبال شناسی'' میں اقبال کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس منزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زوردار ہو جاتی ہے۔اس میں سیلاب کا بہاؤ اور آبشاروں کی روانی آجاتی ہے اور ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جس کی مثال ایک ہزار برس کی فارسی شاعری اور اردو شاعری کی روایت میں نہیں ہے۔اس کی سامنے کوئی منزل منزل نہیں ہے، کوئی حد حد نہیں۔بے قراری اور آگے بڑھے جانے کا جذبہ۔جب کسی حسین چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے زیادہ خوبصورت محبوب کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔شرر سے ستارے اور ستاروں سے آفتاب بن رہے ہیں۔فقط ذوق پرواز ہے زندگی، سکون و قرار موت کا دوسرا نام ہے''۔

اس اقتباس میں ''سیلاب کا بہاؤ'' اور آبشاروں کی روانی'' جیسے الفاظ عبارت میں ایک شان پیدا کر دیتے ہیں۔منزل منزل نہیں، حد حد نہیں، بے قراری اور تڑپ ایسے الفاظ ہیں جو عبارت میں خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں۔

(VI) ''سردار جعفری نے اپنی نثر میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے لیکن دوسرے نثر نگاروں کی طرح نثری آرائش و زیبائش کیلیے نہیں بلکہ جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری کو بڑھانے کے لیے کیا ہے''۔

''غالب نے یقیناً اس عقیدے سے بڑا رجائی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے جو اس کی شاعری میں خون بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔''

اس جملے میں سردار جعفری نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس سے جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔

''سبط حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ستر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ، کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو یادوں کے محلوں اور بارہ دریوں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں۔حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان۔'' 384

تنقید میں علی سردار جعفری کے اسلوب میں سادگی، سلاست، نرمی شگفتگی، روانی، وضاحت، جامعیت، ساری دنیا کے اہم ادیبوں سے مثالیں، تقابل، تشبیہات، اتفاق کی جگہ فراخ دلی، اختلاف کی جگہ دلائل جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔

☆☆☆

حواشی

1۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 19

2۔پروفیسرفصیح احمدصدیقی،اردو یک بابی ڈراما:جنگ آزادیٔ ہند(85)تاحصول آزادیٔ ہند،1947ء،
تاریخی،تحقیقی وتنقیدی جائزہ،صفحہ 242

3۔پروفیسرسیدمحمودالحسن،اردونقید میں نفسیاتی عناصر،(جدیدتنقیدی رجحانات کی روشنی میں)،صفحہ 263تا265۔

4۔ڈاکٹرظہیراحمدصدیقی،ادب میں جمالیاتی اقدار:ایک مطالعہ،صفحہ 93،92

5۔خالدعلوی،غزل کےجدیدرجحانات،صفحہ 78

6۔خالدعلوی،غزل کےجدیدرجحانات،صفحہ 77,78

7۔ڈاکٹرسیدمحمدعقیل،مارکسی ادب اورادیب مشمولہ سماجی تنقیداورتنقیدی عمل ازسیدمحمدعقیل رضوی،
صفحہ 37,46,53,59۔

8۔پروفیسرشارب ردولوی،احتشام حسین اورجدیدتنقید مشمولہ تنقیدی مطالعے،صفحہ 51

9۔ڈاکٹرعرشیہ جبیں،شارب ردولوی:شخصیت اورتنقیدنگاری،صفحہ 174

10پروفیسرشارب ردولوی،جدیداورتنقید:اصول ونظریات،چھٹاایڈیشن،1994ء،صفحہ 479

11۔پروفیسرشارب ردولوی،اردوتنقید کےدس سال مشمولہ تنقیدی مطالعے،صفحہ 39

12۔پروفیسرشارب ردولوی،جدیداردوتنقید:اصول ونظریات،صفحہ 355

13۔فداالمصطفیٰ ندوی،احتشام حسین:حیات اورشخصیت،صفحہ 104

14۔ڈاکٹرعبدالمغنی،تشکیل جدید(تنقیدی مقالات)صفحہ 173,174,175

15۔ ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 29تا34

16۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 35

17۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،عملی تنقید:ایک مطالعہ:شاداب،حیدرآباد،مارچ 1992،صفحہ 35

18۔راشدانوورراشد،سرورکی تنقیدی بصیرت،آج کل،جون 2002ء،صفحہ 23

19۔سردارجعفری:دیباچہ،پیغمبران سخن،صفحہ 8

20۔راہی معصوم رضا،سردارجعفری،گفتگوبندنہ ہو،افکار،سردارجعفری نمبر،نومبر،دسمبر 1991،صفحہ 94

21۔علی سردارجعفری،کالوبھنگی:ایک کردار،ایک علامت مشمولہ کرشن چندر:شخص اورادیب،
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی،صفحہ 105

22۔محمدایوب واقف،مکاتیب علی سردارجعفری مشمولی علی سردارجعفری(شخص،شاعراورادیب)
مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی،صفحہ 446

23۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 9,10

24۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 15

25۔علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، صفحہ 18

26۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 326 تا 331

27۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری اور مارکسی تنقید مشمولہ تعبیر و تحلیل مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، صفحہ 285,283,282۔

28۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ادبی ڈائری (جلد اول) صفحہ 38,39

29۔محمد اجمل خان، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ،
مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی 2010 (غیر مطبوعہ) صفحہ 116,115

30۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 49

31۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 40,62,63

32۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 338,339

33۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ 102 تا 108، بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 339,340,341

34۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ 114 تا 116، بحوالہ عمر رضا، علی سردار جعفری 340,342

35۔عمر رضا علی سردار جعفری، صفحہ 342

36۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 234

37۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 117

38۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 201,202

39۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 106

40۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، طبع دوم، 1957، صفحہ 256

41۔منٹو کے ادبی مضامین، صفحہ 297

42۔ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، صفحہ 145,146,149,150

43۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998ء، صفحہ 30

44۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل اپریل 1998ء، صفحہ 30

45۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، طبع اول، علی گڑھ، صفحہ 165

46۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 165,166,167

47۔پروفیسر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، صفحہ 484,485,500

48۔کلیم الدین احمد، ترقی پسند ادب پر دو کتابیں مشمولہ اردو تنقید پر ایک نظر، صفحہ 366,368,375

49۔عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل (1936 تا 1970) صفحہ 70

50۔سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 244

51۔پروفیسر بیگ احساس، کرشن چندر: شخصیت اور فن، صفحہ 230

52۔پروفیسر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام،
ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 9

53۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 71

54۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1981، ص 457,459

55۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید آج کل، اپریل 1998ء، صفحہ: 28

56۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل اپریل 1998 ص: 30

57۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 152

58 علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 158

59۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص: 114

60۔پروفیسر سید فضل امام رضوی، سردار جعفری کا انتقادی عمل مشمولہ سردار جعفری،
شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، ص: 155- 154

61 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 327

62۔پروفیسر یوسف سرمست، ترقی پسند تحریک اور اقبال مشمولہ ادب نقد حیات (مرتبہ یوسف سرمست)
ص: 36, 38, 39

63۔شافع قدوائی۔علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل 1998ء صفحہ 29

64۔ڈاکٹر عبدالقیوم، ترقی پسند ادب پر ایک نظر، صفحہ 55,65,69,70,80,81

65۔پروفیسر قمر رئیس، علی سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار،
سردار جعفری نمبر نومبر، ڈسمبر 1991ء ص: 459, 460

66 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 517

67 علی سردار جعفری، دیباچہ، اقبال شناسی، ص: 11-12

68 عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 518, 521, 522

69 علی سردار جعفری، اقبال شناسی ص: 43 بحوالہ علی سردار جعفری، از عمر رضا، ص: 521 , 522

70 علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، مقالات حیدرآباد سمینار مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری،
ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 58, 59

71۔علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، فکر اقبال۔مقالات۔حیدر آباد سمینار۔
مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 82
72۔علی سردار جعفری، اقبال اور فرنگی، فکر اقبال، مقالات۔حیدر آباد سمینار۔
مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص: 89, 90,91
73۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، ص:89
74۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، ص: 90
75۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، 91
76۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:95
77۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:102, 103
78۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:107 , 108
79۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:108
80۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:110
81۔علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ:111
82۔عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ:528تا533
83۔مظہر جمیل، سردار جعفری اور اقبال شناسی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 576
84۔مظہر جمیل، سردار جعفری اور اقبال شناسی، افکار، سردار جعفری نمبر، صفحہ 576 تا 580۔
85۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، صفحہ 188,189
86۔پروفیسر قمر رئیس سے انٹرویو، شرکا محمد علی صدیقی، پروفیسر عتیق احمد، پروفیسر حسن عابدی، مسلم شمیم،
راحت سعید، مظہر جمیل، اشفاق حسین، سہ ماہی تناظر، نئی دہلی، دسمبر 1987ء ص:135
87۔علی سردار جعفری، پیغمبران سخن (دیباچہ) ص:8,9
88۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل، 1998ء، ص:30
89۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار از علی فاطمی، ص:146 تا148
90۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص:184
91۔پروفیسر قمر رئیس، سردار جعفری، اور نیا تنقیدی شعور، ص:461
92۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری کی تنقید، آج کل، اپریل، 1998ء، ص:31
93۔سردار جعفری، پیغمبران سخن، ص:28-27
94۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص:494، 496، 498، 499

95۔ڈاکٹرعلی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ:302
96۔عمر رضا،علی سردار جعفری،ص:510 '509 '502'508 500
97۔علی سردار جعفری،پیغمبران سخن،ص:50
98۔علی سردار جعفری،پیغمبران سخن،ص:49بحوالہ:شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،
آج کل،اپریل1998،ص:32-31
99۔ڈاکٹر صاحب علی،علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین،مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:455'454
100۔سردار جعفری،پیغمبران سخن،ص:173
101۔عمر رضا،علی سردار جعفری،ص:516 '515 '514'513 511
102۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:187
103۔ڈاکٹرعلی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ:304 '303 '302
104۔علی سردار جعفری،پیغمبران سخن،ص:157
105۔علی سردار جعفری،پیغمبران سخن،ص:173
106۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید،غالب کے چند نقاد،صفحہ205 '203 '201 200
107۔علی سردار جعفری،دیباچہ۔دیوان غالب (مرتبہ سردار جعفری)ص:27بحوالہ سلیمان اطہر جاوید،
سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراور ادیب)مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:
108۔پروفیسر شارب ردولوی،سردار جعفری اور نقد شعر،مشمولہ،علی سردار جعفری (شخص،شاعراور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ:391
109۔پروفیسر شارب ردولوی،کلیدی خطبہ،سردار جعفری:ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ،
مشمولہ سردار جعفری (شخصیت اور فن)مرتبہ اصغر عباس،صفحہ:33-32
110۔ڈاکٹر اسلم پرویز،شاعر علی سردار جعفری،مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،
گاندھی نگر،صفحہ 95-94
111۔علی سردار جعفری،کالو بھنگی:ایک کردار،ایک علامت،مشمولہ کرشن چندر:شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 110
112۔ خالد علوی،غزل کے جدید رجحانات،ص:84

113۔پروفیسر نظیر صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 54-61

114۔مظہر امام،سردار جعفری کی ہمہ جہتی،اردو دنیا،ستمبر 2000،صفحہ 26

115۔پروفیسر شارب ردولوی،تنقیدی مباحث،صفحہ 46-45

116۔سید شاہد مہدی،پیش گفتار،سرمایہ سخن جلد اول از علی سردار جعفری،صفحہ 10-9

117۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 572

118۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 575

119۔علی سردار جعفری،سرمایۂ سخن،صفحہ 31-30

120۔علی سردار جعفری،سرمایۂ سخن،صفحہ 47 -46

121۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ:591 - 590

122۔سردار جعفری،ذوق جمال مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،صفحہ:333-332-331-328

123۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: 589- 586 - 585

124۔سردار جعفری،ذوق جمال مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز،صفحہ:327 - 326

125۔آج کل،اکتوبر 2001،صفحہ:43

126۔محمد اجمل خاں،علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ(مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)
شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،2010(غیر مطبوعہ)،صفحہ:357

127۔۔محمد اجمل خاں،علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ(مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)
شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،2010(غیر مطبوعہ)،صفحہ:22

128۔پروفیسر محمد حسن،خطبہ صدارت:سردار جعفری کی وراثت مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،صفحہ:22

129۔ڈاکٹر صاحب علی،علی سردار جعفری کے مرتبہ کلاسیکی دواوین مشمولہ علی سردار جعفری(شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ:468 ,464 ,463 ,460 ,456 ,453

130۔علی سردار جعفری،جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات،مشمولہ علی گڑھ میگزین،
جلد:14 نمبر 3،جولائی 1936ء،صفحہ:15

131۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: 85 , 74

132۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ: ,76, 77

133۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز،صفحہ:69 - 74

134۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ عربک کالج میگزین (دہلی)
شمارہ مارچ 1938ء صفحہ:38بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا،صفحہ:86
135۔علی سردار جعفری،نوجوانوں کے ادبی رجحانات مشمولہ عربک کالج میگزین (دہلی)
شمارہ مارچ 1938ء صفحہ:42بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا،صفحہ:86
136۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ:86
137۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار نظر از علی احمد فاطمی،صفحہ:151 ,150
138۔علی سردار جعفری،کالو بھنگی:ایک کردار،ایک علامت،مشمولہ کرشن چندر:شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 105
139۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،صفحہ:29
140۔یوسف ناظم،مجروح کو الوداع کہتے ہوئے،نیا سفر،علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر،
جولائی تا دسمبر 2000،صفحہ:168-167
141۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:53
142۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:54
143۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:,54,55
144۔سردار جعفری،بدزبان،افکار،منٹو نمبر،1945،صفحہ:55,64
145۔عبدالشکور،تنقیدی سرمایہ حصہ دوم،صفحہ:,129,126
146۔ای اے حیدری،ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج و میلان،صفحہ:43
147۔۔ای اے حیدری،ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج و میلان،صفحہ:,131,132
148۔پروفیسر ابوالکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،صفحہ:182 ,181
149۔ڈاکٹر ایوب مرزا،فیض نامہ،صفحہ:,74,75
150۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،اردو شاعری میں اشاریت،صفحہ:,200 ,199
151۔فیض احمد فیض،میزان،ناشرین لاہور،فروری 1962،طبع اول،صفحہ:
17بحوالہ اردو شاعری میں اشاریت از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،صفحہ:200
152۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،اردو شاعری میں اشاریت،صفحہ:210
153۔پرکاش،پنڈت،ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس (17/اپریل 1976بمقام دہلی)
مشمولہ اردو میں رپورتاژ نگاری از عبدالعزیز،صفحہ:256
154۔عقیل احمد صدیقی،جدید اردو نظم:نظریہ و عمل 1936 تا 1970،صفحہ:75

155۔نظیرصدیقی،فیض احمدفیض (نقش فریادی سے زنداں نامہ تک)مشمولہ نقدفیض

مرتبہ نسیم عباسی،صفحہ:210, 209

156۔ہمعصر ادبی مسائل،سردارجعفری سے انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001ء صفحہ:142,143

157۔ہم عصر ادبی مسائل،سردارجعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر،

سردارجعفری:فن اور شخصیت،صفحہ:, 148,150,165,166,167

158۔پروفیسرمحمدحسن،خطبہ صدارت:سردارجعفری کی وراثت مشمولہ سردارجعفری شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:17

159۔پروفیسرمحمدحسن،خطبہ صدارت:سردارجعفری کی وراثت مشمولہ سردارجعفری شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:, 16,17

160۔پروفیسروارث کرمانی،ملک الشعراءسردارجعفری مشمولہ سردارجعفری،شخصیت اورفن

مرتبہ اصغرعباس،صفحہ:, 103, 104

161۔سردارجعفری،ادب میں تنگ نظری،شاہراہ،دہلی،فروری مارچ 1952،صفحہ: 6,27

162۔علی سردارجعفری،عوامی شاعری اورعوامی زبان،شاہراہ دہلی،اکتوبر 1952،صفحہ:6تا12

163۔علی سردارجعفری،یہ ترقی پسندی نہیں ہے،شاہراہ دہلی،ستمبر اکتوبر 1954ء،صفحہ:, 57,64,65,67

164۔ سردارجعفری،وجد کی شاعری،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 157,158,159

165۔سردارجعفری،وجد کی شاعری،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:160 تا165

166۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 168,169

167۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:171 ,170

168۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:173,174

169۔سردارجعفری،کفن بردوش،مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:175 ,174

170۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:182

171۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:182,183

172۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:, 183,184,185,190

173۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:192

174۔سردارجعفری،میرتقی میر کی شاعری مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں مرتبہ ڈاکٹرمحمدفیروز،صفحہ:201

175۔سردار جعفری، میر تقی میر کی شاعری مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:203

176۔سردار جعفری، نیا عہد نامہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:205

177۔سردار جعفری، نیا عہد نامہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:207,208

178۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:4,5,6,

179۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:8

180۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:12

181۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ (موت زندگی کے آئینے میں) آج کل، جنوری 1996ء، صفحہ:8

182۔علی سردار جعفری لمحوں کے چراغ قسط 1 تا قسط 4، آج کل، جنوری 1996، صفحہ:4,5,6,8,

183۔سردار جعفری، مراٹھی زبان کا انقلابی شاعر نارائن سروپ، ماہنامہ کتاب، لکھنو،
اپریل مئی 1974ء، صفحہ: 85, 86,

184۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ، نئی تنقید نئے اقدار، از علی احمد فاطمی، صفحہ:153

185۔علی سردار جعفری، غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ اور جمالیاتی فضاء کی بازیافت، نقوش،
غالب نمبر 3، شمارہ:116، 1971ء، صفحہ:345, تا 356

186۔ سردار جعفری، رقص شرر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:266, 267,

187۔ سردار جعفری، رقص شرر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:269

188۔ سردار جعفری، ن۔م۔راشد، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:261

189۔ سردار جعفری، ن۔م۔راشد، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:263,264

190۔علی سردار جعفری، میری دھرتی میرے لوگ (ایک مطالعہ)، پونم، اگست 1977، صفحہ:3,4,

191۔علی سردار جعفری، میری دھرتی میرے لوگ (ایک مطالعہ)، پونم، اگست 1977، ص:5

192۔سردار جعفری، اقبال کی غزل، سہ ماہی گفتگو، مارچ 1977، ستمبر 1977، ڈسمبر 1977، صفحہ:25 تا 29

193۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110, تا 118

194۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 108,

195۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 105,106,

196۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 117,

197۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110,
198۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی: ایک کردار، ایک علامت، مشمولہ کرشن چندر: شخص اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 110, 111,
199۔سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ: 236, 244,
200۔سردار جعفری، دیباچہ، ''ہم وحشی ہیں'' بحوالہ کرشن چندر: شخصیت اور فن از پروفیسر بیگ احساس، صفحہ:225
201۔علی سردار جعفری، کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، صفحہ:199
202۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید۔نئے اقدار نظر از علی احمد فاطمی، ص: 151,152,
203۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ:140
204۔علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب صفحہ:160
205۔شافع قدوائی، علی سردار جعفری، آج کل، اپریل 1998، صفحہ:29
206۔سردار جعفری، قتیل شفائی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 279,280,
207۔سردار جعفری، قتیل شفائی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 281,
208۔''لمحے لمحے'': راحت اندوری: شاعر اور شخص مرتبہ طارق شاہین و عزیز عرفان، الف پبلی کیشنز، خضر آباد،
کھجرانہ، اندور، 2002، صفحہ:378
209۔پروفیسر ضیاء (علیگ)، جعفری صاحب کینڈا میں، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 صفحہ:246
210۔علی سردار جعفری، عندلیب گلشن نا آفریدہ، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:286
211۔سردار جعفری، ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری بحوالہ عزیز قیسی سردار جعفری کی نظمیں،
افکار، نومبر 1991، صفحہ:475
212۔سردار جعفری، حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ 453, 452,
213۔سردار جعفری: حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:450
214۔سردار جعفری: حرف حق کے شدید احساس کی شاعری (تمنا کا دوسرا قدم: پروین فنا)
مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ:452
215۔سردار جعفری، انیس کی معجز بیانی مشمولہ انیس شناسی مرتبہ پروفیسر کوپی چند نارنگ، صفحہ:30
216۔سردار جعفری، انیس کی معجز بیانی مشمولہ انیس شناسی مرتبہ پروفیسر کوپی چند نارنگ، صفحہ:33 تا 35

217۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 297,298

218۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 305,306,307,

219۔سردار جعفری، چراغ لالہ مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، صفحہ: 301 تا 304

220۔سردار جعفری، پابلو نرودا، نیا ورق، فبروری تا جولائی 2004ء، ص: 47,48

221۔سردار جعفری، پابلو نرودا، نیا ورق، فبروری تا جولائی 2004ء، ص: 54

222۔علی سردار جعفری، اقبال اور کمیونزم مشمولہ اقبال اور مغرب مرتبہ آل احمد سرور، ص: 125, تا 141

223۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 47

224۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 47

225۔علی سردار جعفری، کمیونیزم کی ناکامی؟ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، ص: 48

226۔ڈاکٹر تاج پیامی، شعور تنقید، ص: 80,81,83,

227۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558

228۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558

229۔ظفر امام، مارکسزم: ایک مطالعہ، مسلمانوں کا سوشلسٹ سنٹر، نئی دہلی، 1971ء، ص: 111

230۔عمر رضا، علی سردار جعفری ص: 558 تا 563

231۔عمر رضا، علی سردار جعفری ص: 142

232۔حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر، افکار، سردار جعفری نمبر، ص: 74,71

233۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 558 تا 566

234۔علی سردار جعفری، تین ہندوستانی: ایک بادشاہ، ایک شہنشاہ، ایک شاعر، نیا دور، مارچ اپریل 1993ء، ص: 12

235۔سردار جعفری، شہری کلچر کا پہلا شاعر، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 394,395,397,398,400

236۔عمر رضا، علی سردار جعفری، ص: 567 تا 571

237۔علی سردار جعفری، سرمایہ سخن جلد اول، صفحہ: 189,190,

238۔علی سردار جعفری، میر انعرہ روئی اور کتاب ہے مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 401,402,

239۔سردار جعفری، دیباچہ: ہم وحشی ہیں از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 414,415,

240۔سردار جعفری، دیباچہ: چغد از سعادت حسین منٹو مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،

مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص: 416,417,

241۔سردار جعفری، دیباچہ:چغدا زسعادت حسین منٹومشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 417,
242۔سردار جعفری، دیباچہ:چغدا زسعادت حسین منٹومشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 417,
243۔سردار جعفری، پیش لفظ،نئی دنیا کوسلام،ازسردار جعفری،ص:8
244۔پروفیسر زاہدہ زیدی،نئی دنیا کوسلام،ایک تجزیاتی مطالعہ،نیا سفر،
علی سردار جعفری ومجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000ص:57
245۔سردار جعفری، پیش لفظ،نئی دنیا کوسلام،ازسردار جعفری،ص:9
246۔پروفیسر زاہدہ زیدی،نئی دنیا کوسلام،ایک تجزیاتی مطالعہ،نیا سفر،
علی سردار جعفری ومجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000ص: 58,59,60,78,79,
247۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 419,
248۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 420,421,
249۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 425,
250۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 426,427,
251۔سردار جعفری، دیباچہ:جب کھیت جاگے از کرشن چندر مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 428,
252۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 430,
253۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 430,431,432,
254۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص: 434,
255۔سردار جعفری،تعارف،غزل ازمجروح سلطان پوری،مشمولہ سردار جعفری کی نا درتحریریں،
مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:431

256۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:435

257۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:437

258۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں،
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:438,439۔

259۔علی سردار جعفری، دیباچہ، پرچھائیاں بحوالہ، آؤ کہ کوئی خواب بنیں: ساحر لدھیانوی،
ص:90 بحوالہ ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر انور ظہیر انصاری، ص:65

260۔علی سردار جعفری، دیباچہ: پرچھائیاں، از ساحر لدھیانوی بحوالہ کلیات ساحر مرتبہ صفدر حسین، ص:168

261۔ڈاکٹر انور ظہیر خاں، ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے، ص:83,84

262۔علی سردار جعفری، دیباچہ: ساحر لدھیانوی، از ساحر لدھیانوی مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:435

263۔سردار جعفری، حرف آغاز: آتش تر، از خمار بارہ بنکوی مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:440,441,442

264۔علی سردار جعفری، پیش لفظ: ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ (از کیفی اعظمی)
مشمولہ کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، ص: 471,472

265 ۔ علی سردار جعفری، پیش لفظ: ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ (از کیفی اعظمی)
مشمولہ کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، ص:473,474

266 ۔سردار جعفری، نئی خوشبو، سہ ماہی گفتگو، مارچ 1977، ستمبر 1977
دسمبر 1977 ص:236,237,241

267۔علی سردار جعفری، دیباچہ: ساون بھادوں از رفعت سروش، فکر و آگہی، رفعت سروش نمبر 434

268۔سردار جعفری: دیباچہ: نگاہ از اختر سعید خاں مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:459

269۔علی سردار جعفری، عشرت آفریں ی شاری (دیباچہ: کنج پیلے پھولوں کا) مشمولہ سردار جعفری کی نادر تحریریں
مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص:467,468,470,474,476,477,478,479

270۔سردار جعفری، پیش لفظ: کیا دن تھے از قاضی جلیل عباسی، ص: 11

271۔سردار جعفری، پیش لفظ: خزاں کے پھول از عادل رشید بحوالہ اردو میں رپورتاژ نگاری: فن اور ارتقا از ڈاکٹر ایس
ایم زیڈ گوہر، ص:62,63

272۔ڈاکٹرایس ایم زیڈ گوہر،اردو میں رپورتا ژنگاری:فن اورارتقاء،ص:63

273۔سردارجعفری،پیش لفظ،کیادن تھےازقاضی جلیل عباسی،ص:10,11

274۔شکیل الرحمٰن،مشاہیر کےسوچ فلک پر،انتخاب وترتیب ازافتخارامام صدیقی،شاعر،جولائی 2010،ص:15

275۔انٹرویو18/اپریل 1990 ممبئی،راہی معصوم رضا۔علی سردارجعفری،گفتگوبندنہ ہو،

افکار،سردارجعفری نمبرنومبردسمبر ,1991ص:83

276۔ڈاکٹررفیعہ شبنم عابدی،مشاہیر کےجل ترنگ لہریوں میں،شاعر،مارچ 2010،ص:19

277۔بیکل اتساہی بزرگ اورمعاصرین کےکینوس پر،شاعر،جنوری 2010،ص:14

278۔سردارجعفری:دیباچہ:نگاہ ازاختر سعیدخاں مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں

مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:454,455

279۔سردارجعفری:دیباچہ:نگاہ ازاختر سعیدخاں مشمولہ سردارجعفری کی نادرتحریریں،مرتبہ ڈاکٹرمحمد فیروز،ص:460

280۔سردارجعفری:تبصرہ:خموشی بول اٹھی ہے(بتقریب رسم اجراء،فبروری, 1991 شاعر،ستمبر 2000،ص:10

281۔ڈاکٹرملک زادہ منظوراحمد،تاثرات مشمولہ لمحے لمحے ازراحت اندوری،شاعراورشخص

مرتبہ طارق شاہین اورعزیزعرفان،الف پبلی کیشنز،فیض آباد کھجرانہ،اندور, 2002،ص:389

282۔ہم عصرادبی مسائل،سردارجعفری سےایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001

سردارجعفری:فن اورشخصیت،ص:142

283۔شکیل الرحمٰن،آشرم(خودنوشت سوانح حیات)ص:277

284۔فن اورشخصیت کملیشورنمبر،ص:34

285۔نکہت کاظمی،سردارجعفری کی ایک خواہش،اردو دنیا،ستمبر 200،ص: 90

286۔ڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،سردارجعفری کےخطوط،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004ص:90

287۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری،مورخہ 6/اکتوبر 1949بحوالہ سردارجعفری،خطوط،

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004ص:90

288۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری،مورخہ 13/مئی 1950بحوالہ سردارجعفری کےخطوط،

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004،ص:89- 90

289۔سردارجعفری،مکتوب بنام سلطانہ جعفری مورخہ 17/مئی 1950بحوالہ سردارجعفری کےخطوط

ازڈاکٹرمحمد نسیم الدین فریس،فکروتحقیق،اپریل تاجون 2004،ص: 90

290۔سردارجعفری،مکتوب بنام ماہنامہ صبا،حیدرآباد،مورخہ 16/اگست 1956،صبا،دسمبر 1956،صفحہ:79

291۔سردارجعفری،مکتوب بنام پروفیسرگیان چندجین،مورخہ 10/دسمبر 1969بحوالہ سردارجعفری کےخطوط

مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص: 50,51

292۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:84,83 اور
سردارجعفری کے مکتوب بنام مظہرامام مورخہ 4/اگست 1995 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:94

293۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:,78,79

294۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:87اورسردارجعفری،
مکتوب بنام ڈاکٹرسیدمحمدعقیل رضوی،مورخہ 10/نومبر 1979 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق احمد،ص:141 to 139

295۔ڈاکٹرمحمدنسیم الدین فریس،سردارجعفری کے خطوط،فکروتحقیق،اپریل تا جون 2004،ص:87-86اور
سردارجعفری،مکتوب بنام سیدمحمدعقیل رضوی،مورخہ،3/مئی، 1991 مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،
مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:,154,155

296۔سردارجعفری،مکتوب بنام عادل اسیردہلوی،مورخہ 23/اپریل 1996
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط،مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:207,208

297۔علی سردارجعفری کے مکتوب بنام جاں نثار،فن اورشخصیت،جاں نثاراختر نمبر،ص:54 تا 51

298۔علی سردارجعفری کے مکتوب بنام جاں نثار،فن اورشخصیت،جاں نثاراختر نمبر،مارچ 1976،ص:51

299۔سردارجعفری،مکتوب بنام ڈاکٹرعلی احمدفاطمی،مورخہ 10/اگست 1998
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم ،ص:186

300۔سردارجعفری،مکتوب بنام ڈاکٹرعلی احمدفاطمی مورخہ 16/مارچ،1992
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:174

301۔سردارجعفری مکتوب بنام ڈاکٹرسیدمحمدعقیل رضوی مورخہ 14/جنوری 1988
مشمولہ سردارجعفری کے خطوط مرتبہ ڈاکٹرخلیق انجم،ص:146

302۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:,21,22

303۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:50

304۔علی سردارجعفری،ترقی پسندتحریک کی نصف صدی،ص:57

305۔عمررضا،علی سردارجعفری،ص:555

306۔ہم عصری ادبی مسائل:سردارجعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردوادب،سردارجعفری نمبر 2001،
سردارجعفری:فن اورشخصیت،صفحہ:146

307۔تقریرسردارجعفری،سمینارعصمت چغتائی اورنیااردوافسانہ،دہلی اردواکادمی،10 تا 12 جنوری 1992
بحوالہ جڑیں اورکونپلیں(دورپورتاژ)ازعلی احمدفاطمی،ص:104,105

308۔تقریر علی سردار جعفری، شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی میں منعقدہ سردار جعفری کا تہنیتی جلسہ 27/نومبر 1993،
بحوالہ جڑیں اور کونپلیں (دو رپورتاژ) از علی احمد فاطمی، ص:39,38

309۔علی سردار جعفری، اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہئے، کتاب نما، جولائی 1998، ص:33

310۔علی سردار جعفری، اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہئے، کتاب نما، جولائی 1998، ص:34,35,36

311۔علی سردار جعفری، غالب کی کہانی سردار کی زبانی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں منعقدہ پروگرام،
نوائے ادب، اکتوبر تا دسمبر 2000 ص: 5,7,8,9,

312۔علی سردار جعفری، میں اور میرا فن، ریڈیائی تقریر، ہماری زبان، 8/مئی 1976، سہ ماہی اردو ادب،
جولائی اگست سپٹمبر 2000ص: 33,34,

313۔علی سردار جعفری، میں اور میرا فن، ریڈیائی تقریر، ہماری زبان، 8/مئی 1976، سہ ماہی اردو ادب،
جولائی، اگست، سپٹمبر ص:34

314۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، یاترا (رپورتاژ)، ص:57,58,59,68,69,

315۔سردار جعفری، پتھر کی دیوار، ص:13,12 بحوالہ علی سردار جعفری، میں اور میرا فن،
ریڈیائی تقریر، ہماری زبان، 8/مئی 1976ء، سہ ماہی اردو ادب، جولائی، اگست، سپٹمبر، 2000، ص:38,39,

316۔محمد علی صدیقی، حسن عابدی، مسلم شمیم، شاہد نقوی، مظہر جمیل، ہم عصر ادبی مسائل،
افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 128

317۔گفتگو (ترقی پسند تحریک سے متعلق مشاہرین ادب سے بات چیت تالیف مظہر جمیل، مکتبہ دانیال، کراچی،
مارچ 1986) صفحہ 40، بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ادب مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، صفحہ 109۔

318۔یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (ادیبوں کے انٹرویو) از ظاہر مسعود، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، صفحہ 27،
اشاعت دوم ستمبر 1985، صفحہ 161,160، بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ادب،
مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، صفحہ 109

319۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو،
افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 89,90,91

320۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سردار جعفری، (انٹرویو) گفتگو بند نہ ہو
،افکار سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 98

321۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سردار جعفری، (انٹرویو) گفتگو بند نہ ہو،
افکار سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر 1991ء، صفحہ 82,100

322۔ ہم عصر ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، شرکا محمد علی صدیقی، حسن عابدی، مسلم شمیم، شاہد نقوی،
مظہر جمیل مشمولہ عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001، جلد 19، صفحہ 135

323۔ ہم عصر ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001ء،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 162

324۔ فصیح احمد، اردو یک بابی ڈرامہ، جنگ آزادی ہندی 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947
تاریخی، تحقیقی جائزہ، ص:82

325۔ راہی معصوم رضا، سردار جعفری (انٹرویو)، گفتگو بند نہ ہو،
افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، ص:104,105

326۔ راہی معصوم رضا، سردار جعفری (انٹرویو)، گفتگو بند نہ ہو، افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991 ص:84

327۔ اعتراف، اپریل 2005، کتابی سلسلہ 1، ندا فاضلی نمبر، ملاقاتیں، ص:,382,383

328۔ علی سردار جعفری سے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کی ملاقات، اردو دنیا، جنوری تا مارچ 1998، ص:78

329۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب،
سردار جعفری نمبر 2001، سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ:135 تا 137

330۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,146,147,149,150

331۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,159,160,161

332۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ 102,103

333۔ ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001،
سردار جعفری: فن اور شخصیت، صفحہ,139,140,142

334۔ ڈاکٹر قمر رئیس، سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور، افکار، سردار جعفری نمبر، ص:460

335۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو حسن عابدی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:75

336۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو حسن عابدی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:75

337۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ (انٹرویو) کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:71

338۔ حسن عابدی، سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔ انٹرویو کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر، ص:74

339۔حسن عابدی،سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔انٹرویو کراچی، سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر،ص:74

340۔حسن عابدی،سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر۔انٹرویو کراچی،سردار جعفری،
افکار سردار جعفری نمبر،ص:74

341۔ہم عصری ادبی مسائل(سردار جعفری سے ایک انٹرویو،عالمی اردو ادب،سردار جعفری نمبر 2001
سردار جعفری:فن اور شخصیت،صفحہ 143

342۔ڈاکٹر اسلم پرویز،شاعر علی سردار جعفری،علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:86

343۔احمد جلیس(مرتب)سردار جعفری سے باتیں،صبا،فروری مارچ 1966،ص:23

344۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

345۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:,155,156

346۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

347۔عظمیٰ ناز،سردار جعفری سے ایک ملاقات،افکار،سردار جعفری نمبر،ص:153

348۔ڈاکٹر انیس اشفاق،سردار جعفری کی شعریات سازی مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:114، 121 تا 126

349۔ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی،اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر،ص:512

350۔ڈاکٹر اسلم پرویز،شاعر علی سردار جعفری،علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،
گجرات اردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،ص:90

351۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:178 تا 181

352۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:,184,185,187,189

353۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،ص:32

354۔اعتراف،اپریل 2005،کتابی سلسلہ 1،ندا فاضلی نمبر(ملاقاتیں)،ص:,384,385

355۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ نئی تنقید اور نئے اقدار از علی احمد فاطمی،ص: 154,155

356۔پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی،عہد عزم و پیکار کی یادگار مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 75

357۔پروفیسر سید محمد عقیل،سردار جعفری:ایک جائزہ،الہ آباد کے حوالے سے،مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،ص:90

358۔ڈاکٹر سلطان احمد،علی سردار جعفری،شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،ص:,265,266
359۔تقریر علی سردار جعفری،شعبہ اردو،ممبئی یونیورسٹی میں منعقدہ سردار جعفری کا تہنیتی جلسہ 27/نومبر 1993
بحوالہ جڑیں اور کونپلیں(دو رپورتاژ)از علی احمد فاطمی ص:38 تا41
360۔علی سردار جعفری، کالو بھنگی:ایک کردار،ایک علامت مشمولہ کرشن چندر:شخص اور ادیب،
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:106
361۔پروفیسر علیم اللہ حالی،روح عصر کا شاعر،آج کل،اکتوبر 2000ص:24,25
362۔ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی،سردار جعفری کا نظریہ،شعر،مشمولہ سردار جعفری،شخصیت اور فن
مرتبہ اصغر عباس،ص:363،362 اور پتھر کی دیوار از سردار جعفری ص:(4،11+11)
363۔علی سردار جعفری،ترقی پسند ادب،ص:120
364۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،صفحہ: ,28,29,32
365۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کا شعری سفر،جامعہ،اکتوبر 1980
366۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری: تاریخی شعور کا زندہ استعارہ
مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ،ص:92,93,94,95,96,98
367۔پروفیسر شارب ردولوی،سردار جعفری اور نقد شعر مشمولہ علی سردار جعفری(شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:,390,391,392,399
368۔پروفیسر شارب ردولوی تنقیدی مباحثہ،ص: 45,46
369۔پروفیسر شارب ردولوی،سردار جعفری اور نقد شعر مشمولہ علی سردار جعفری(شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:390
370۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید،غالب کے چند نقاد،ص:195
371۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:184
372۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی،معاصر تنقیدی رویے،ص:189
373۔شافع قدوائی،علی سردار جعفری کی تنقید،آج کل،اپریل 1998،ص:31اور
علی سردار جعفری،پیغمبران سخن ص:8
374۔ادارہ،حرف آغاز،ماہنامہ ایوان اردو،دہلی،ستمبر 2000،ص:4
375۔پروفیسر سید فضل امام رضوی،سردار جعفری کا انتقادی عمل مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن،ص:149 تا153
376۔ڈاکٹر وحید اختر،سردار جعفری:خواب اور شکست خواب مشمولہ علی سردار جعفری(شخص،شاعر اور ادیب)
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،ص:185

377۔عمر رضا،علی سردار جعفری،ص:570

378۔سید محمد مہدی،سردار جعفری اور ترقی پسندی مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس،ص:

379 ۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت و انقلاب کا استعارہ علی سردار جعفری،ایوان اردو،ستمبر 2000،ص:90,89

380۔پروفیسر کوپی چند نارنگ،علی سردار جعفری:ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ مشمولہ جدیدیت کے بعد

از کوپی چند نارنگ،ص:469,470

381۔راشد انور راشد،سرور کی تنقیدی بصیرت،آج کل،نئی دہلی،جون 2002 ص:21,24

382۔فدا المصطفیٰ فدوی،احتشام حسین:حیات و شخصیت اور کارنامے،ص:187,188

383۔سردار جعفری،دیباچہ:دیوان غالب،ص:21

384۔نصرت جبیں،سردار جعفری بحیثیت نثر نگار،عالمی اردو ادب،سردار جعفری نمبر 2001،

سردار جعفری:فن اور شخصیت،ص:205 تا 209

☆☆☆

بابِ ششم

”صحافتی خدمات“

صحافت

لغات کشوری کے مطابق صحافت عربی لفظ ہے اور اسم مونث ہے۔اس کے معنی اخباری کاروبار یا اخبار نویسی ہے۔

عبدالسلام خورشید کے مطابق:

''صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے اور صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایک ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقتوں پر شائع ہوتا ہے۔چنانچہ تمام اخبارات و رسائل صحیفہ ہیں۔ 1

صحافت کے وسیع دائرہ عمل اور دائرہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد قادری نے لکھا ہے:

''صحافت کا کینوس واقعی وسیع و عریض ہے۔اس کا دائرہ عمل اور دائرہ کار اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس کی سماجی' سیاسی معاشرتی 'تہذیبی' تمدنی اور اخلاقی ہمہ گیری' وسعت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔جیسے جیسے دنیا پھیل رہی ہے' انسانی ذہن ترقی کے منازل طے کر رہا ہے' ویسے ویسے صحافت کے قدم بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔کل تک جو صحافت سرکاری اعلانات تک محدود تھی آج ترقی کے منازل طے کرتی ہوئے سرکار کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اہل بن گئی ہے۔صحافت نگاروں' ڈرم اور لاوڈ اسپیکر کی آواز سے نکل کر پرنٹ میڈیا اور پھر الیکٹرانک میڈیا تک اپنا قبضہ جمانے میں کامیاب ہے۔کل تک جو صحافت چند راجاؤں' مہاراجاؤں کے ہاتھوں تک محدود تھی وہ آج پوری دنیا پر اپنا سکہ جما چکی ہے اور قلمی اخبار سے الیکٹرانک اخبار تک کا لمبا سفر طے کر کے اپنے وجود و اہمیت اور افادیت منوانے پر مجبور کر چکی ہے۔صحافت اپنے اندر اتنی طاقت' وسعت اور ہمہ گیری رکھتی ہے کہ جیسے جیسے سائنس اور ٹکنالوجی ترقی کے منازل طے کر رہی ہے ویسے ویسے صحافت بھی اپنے لیے راستہ ہموار کرتی جا رہی ہے۔اکیسویں صدی میں یہ زیادہ مثبت اور تاریخی رول ادا کرے گی۔'' 2

صحافت کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے سمیع احمد قمطراز ہیں:

''یہ سچ ہے کہ روز بروز ہماری زندگی میں صحافت کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔تہذیبی' ثقافتی' سیاسی اور تعلیمی ہر میدان میں اس سے مدد مل رہی ہے۔میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سیاست بلکہ جمہوری سیاست میں سیاست کے بعد صحافت کی برتری ثابت ہے۔یوں بھی مملکت کے چار ستونوں میں صحافت کو ایک ستون مانا گیا ہے مگر اس ستون کی اہمیت اس لیے دوسرے ستونوں سے زیادہ ہے کہ یہ قانون سازیہ اور انتظامیہ پر لگام لگاتی ہے' انھیں صحیح سمت میں چلاتی ہے اور انھیں راہ راست پر رکھتی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے دلوں میں پیوست ہوتی ہیں۔یہ گویا عوام کے دل کی دھڑکنوں کے ناپنے اور جاننے کا پیمانہ ہے۔'' 3

محمد علی جوہر نے صحافتی کے اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو پوری صحت سے درج کرے۔اسے خیال رکھنا چاہیے کہ واقعاتی صحت اتنی بلند ہو کہ مورخ اس کی تحریروں کی بنیاد پر تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کر سکے۔صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں ہوتا راہ نما بھی ہو

تا ہے۔اسے صرف عوام کی باتوں کی تائید ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ صحافتی ہنر سے عوام کو درس بھی دینا چاہیے۔'' 4

مولانا ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

''صحافیوں کی ذمہ داری بہت زیادہ اور نازک ہے۔ان کے قلم کی ذراسی لغزش سے بعض اوقات قوموں اور ملکوں کے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوجاتے ہیں اوران کی تحریریں ہزاروں اور لاکھوں افراد کو صحیح یا غلط خطوط پر سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قلم کی طاقت تلوار سے کہیں زیادہ موثر اور کارکر دہوتی ہے اوراس کے پیدا کردہ اثرات کہیں زیادہ دوررس اور دیرپا ہوجاتے ہیں۔'' 5

حق وصداقت کے سرچشموں اوراس کی طاقت کو اُجاگر کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

''دنیا میں حق وصداقت کی آواز کبھی بھی تخت وتاج اور ایوان ومحل کے اندر سے نہیں اُٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں،پھوس کی جھونپڑیوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے اور پھر بھی شاید عجائب پسند کا عجیب وغریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور افتادگی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے زخمی دلوں کو اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے خشک حلقوں سے،اپنی نگاہ کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خونچکاتی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹانوں کو،پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا ہاتھ اقلیم فقر ومسکین سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت وتاج کو الٹ دیتا ہے۔یہ کس کی تماشہ آرائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے اور وہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے تسلط سے نکل کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سربسجود کروالیتے ہیں۔'' 6

رفعت سروش نے ممبئی کو صحافت کا بڑا مرکز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اپنی کوناکوں خصوصیات کے پیش نظر ممبئی اُردو صحافت کا بڑا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔نیا ادب،نیا زمانہ اور شاعر ۔۔۔نظام اور رشاہد جیسے نقشہ وار بھی ممبئی کی صحافتی زندگی کا ایک روشن باب ہیں ان کے علاوہ کئی روزنامے نکلتے تھے۔۔۔میرے نزدیک سب سے اہم اخبار تھا''اجمل''۔اجمل کے ایڈیٹر معین الدین حارث جامی تھے۔'' 7

علی سردار جعفری شاعر کے ساتھ ساتھ ادیب،دانشور اور صحافی بھی تھے۔جس زبان کی صحافت کا خمیر روز اول ہی سے ادب اور دانشوری سے گوندھا گیا ہو تو اس زبان کی خوش قسمتی قابل رشک بن جاتی ہے۔اردو کی اس خوش قسمتی کو اُجاگر کرتے ہوئے پروفیسر محمد انورالدین نے اردو صحافت کی کہکشاں کے چند ستاروں کے نام بطور مثال پیش کیے ہیں:

''اردو صحافت نہایت خوش قسمت رہی کہ اسے روز اول ہی سے ایسے صحافیوں کی سرپرستی حاصل رہی جو بنیادی طور پر ادیب تھے۔مولوی محمد باقر،ناتھ سرشار،عبدالحلیم شرر،مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا عبدالماجد دریابادی،حسرت موہانی،نیاز فتح پوری،مولوی عبدالحق اور بیشتر دیگر مشاہیر اردو صحافی ادیب پہلے تھے اور صحافی بعد۔اردو کے صف اول کے ادیب صحافیوں کی اس کہکشاں کا ایک روشن ستارہ علی سردار جعفری بھی تھے جن کی صحافت کا خمیر ادب،انقلاب اور دانشوری کی روایات سے گوندھا گیا تھا۔'' 8

پرچم (ہفتہ روزہ)

مجاز، سردار جعفری اور سبط حسن نے مل کر ہفتہ روزہ پرچم لکھنو سے جاری کیا۔ بقول علی جواد زیدی پہلے ہفتہ وار پرچم اور پھر ماہنامہ نیا ادب شائع کیا۔ 9

نیا ادب کا پہلا شمارہ اپریل 1939ء میں شائع ہوا۔

سبط حسن نے اس وقت کے عالمگیر منظر نامہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسری جنگ عظیم سر پر کھڑی تھی۔ جس وقت مجاز، سردار جعفری اور میں نے مل کر ماہنامہ ''نیا ادب'' اور ہفتہ روزہ ''پرچم''، لکھنو سے جاری کیا، اسپین میں جمہوریت کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ جنرل فرانکو نے ہٹلر اور مسولینی کی مدد سے اپنی فاشسٹ حکومت قائم کر لی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فاشسٹ نواز حکومتوں نے چیکوسلواکیہ کو ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا اور سبھی مغربی طاقتوں کی کوشش تھی کہ نازی لٹیروں کا رخ کسی صورت سوویت یونین کی جانب پھیر دیا جائے۔'' 10

ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے رسالہ کی ضرورت تھی اس کو اُجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر عفت آرا شمسی لکھتی ہیں:

''دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ٹیگور اور اقبال، پریم چند، عبدالحق جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش جیسے عالموں ادیبوں اور سیاست دانوں نے اس تحریک کو لبیک کہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نوجوان ادیب ادھر توجہ دینے لگے اور رفتہ رفتہ ان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تو نشر و اشاعت کا مسئلہ سامنے آیا۔ بنگالی زبان میں اس قماش کے مضامین اور نظمیں رسالہ پرچے میں شائع ہونے لگے۔ حیات اللہ انصاری نے ''ہندوستان'' لکھنو سے جاری کیا۔ سبط حسن نے لکھنو سے ''پرچم'' نکالا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس تحریک کا مستقل آرگن بن کر رسالہ ''نیا ادب'' منظر عام پر آ گیا۔'' 11

بقول مناظر عاشق ہرگانوی، شاہد لطیف نے اس کا نام ''نیا ادب'' تجویز کیا۔12

نیا ادب (ماہنامہ)

رسالہ نیا ادب کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۳۹ء کو نکلا یہ ۴۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں ٹائٹل کے نیچے قلمی معاونین کے اسمائے گرامی درج ہیں جن میں منشی پریم چند، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور دوسرے شامل ہیں۔ اس شمارہ کی قیمت چار آنہ فی پرچہ درج ہے۔ اندرونی ٹائٹل ''نیا ادب'' کے نیچے ہندوستان کا ترقی پسند ماہنامہ اور بریکٹ میں سالانہ چندہ تین روپیہ درج ہے۔ اس کے بعد ''ادارہ'' درج ہے جس میں سبط حسن، علی سردار جعفری اور مجاز لکھنوی کے نام ہیں۔ پتہ ۷ لال باغ روڈ، لکھنو درج ہے۔ دوسرے صفحہ پر فہرست دی گئی ہے۔ اداریہ ''نیا ادب'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس شمارے میں سردار جعفری کا مضمون ''ترقی پسند مصنفین کی تحریک'' شامل ہے۔ دیگر شعرا اور مصنفین کی منظومات، ڈرامے اور افسانے بھی شامل ہیں۔ مجلس ادارت نے ''نیا ادب کی اشاعت کی اطلاع اس طرح دی ہے:

''نیا ادب نے اپنی زندگی کی پہلی منزل میں قدم رکھ دیا ہے۔ یہ اس ذہنی انقلاب کی آواز ہے جو انفرادی حدود سے گزر کر

بھی تیزی کے ساتھ اجتماعی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔'' 13

رسالہ نیا ادب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد اجمل خاں لکھتے ہیں:

''سردار جعفری نوجوان ترقی پسند ادیبوں میں سب سے زیادہ فعال اور سنجیدہ ادیب تھے۔ وہ اپنے انہماک اور دانشورانہ طرز استدلال کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سردار جعفری نے سبط حسن اور مجاز کے ساتھ مل کر اردو کا ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تینوں مل کر ایسا رسالہ نکالنا چاہتے تھے جو ترقی پسند تحریک کے معیار پر پورا اُترے۔ اس میں ترقی پسند مصنفین کی تخلیقات شائع ہوں۔ اس کے ذریعے تنظیمی کاموں کو بھی انجام دیا جا سکے اور نوجوانوں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہو۔ یہ ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کا ترجمان بن جائے چاہے اس کی حیثیت بھلے ہی آفیشیل نہ ہو لیکن یہ اس کی کسوٹی پر پورا اُترے۔ اس رسالے کا نام نیا ادب رکھا گیا۔'' 14

''نیا ادب باقاعدہ اور آفیشیل طور پر ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کا ترجمان نہیں تھا لیکن غیر رسمی طور پر اور فی الحقیقت یہ بہت جلد ہماری تحریک کا ترجمان بن گیا اور اردو کا ہر ترقی پسند مصنف اور تحریک سے دلچسپی رکھنے والا اسے پڑھنا ضروری سمجھنے لگا۔'' 15 سجاد ظہیر، روشنائی، صفحہ ۲۴۶

نیا ادب انجمن ترقی پسند کا ترجمان تھا۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس سبھی ترقی پسند ادیبوں نے اس رسالہ میں اپنی تخلیقات شائع کیں۔ نیا ادب کا پہلا شمارہ 1939ء میں شائع ہوا جس میں ملک راج آنند، لطیف الدین احمد علی اور سردار جعفری کے مضامین کے علاوہ مخدوم محی الدین کا افسانہ ''آدم کی اولاد'' اور احتشام حسین کا افسانہ ''کھنڈر'' بھی شامل تھا۔'' 16

''نیا ادب'' کے پہلے ہی شمارے میں سردار جعفری کا ایک مضمون ''ترقی پسند مصنّفین کی تحریک'' شامل تھا۔ اس مضمون میں نئے ادبی رجحانات، سماجی تبدیلیاں، نوجوان نسل کا رجحان اور ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ادب کے سماجی پس منظر اور اعلیٰ شاعری یا ادب کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا تھا:

''شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات گرد و پیش کی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جہاں تمام انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ محرکات خود اس سماجی اور اقتصادی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ اس لیے اعلیٰ شاعری یا ادب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہوتا ہے۔'' 17

''ادب کا تناور درخت جو شاعری اور ادیبوں کی ذہنی فضا میں پھلتا پھولتا ہے اپنی جڑوں کی آبیاری کے لیے عوام کے دماغوں کا محتاج ہوتا ہے اس لیے عام زندگی سے ادب کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔'' 18

کلاسیکی ادب کے تئیں سردار جعفری کے مثبت رویہ پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد اجمل خاں لکھتے ہیں:

''اس مضمون میں انہوں نے (سردار جعفری) غزل پر بھی تنقید کی۔ حالاں کہ سردار جعفری کی ذہنی نشو و نما میں اردو کی قدیم ادبی روایات کلاسیکی اقدار کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ شروع میں اس کا اپنے اپنے پہلے تنقیدی مضمون میں اعتراف کرنے کے باوجود وہ دوسرے اور تیسرے مضمون میں منحرف ہو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے دور میں پھر کلاسیکی ادب کی

طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کے محاسن بیان کرتے ہیں۔"19

انجمن ترقی پسند مصنّفین کا اپنا رسالہ "نیا ادب" کے نام سے 1939ء میں منظر عام پر آیا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری سردار جعفری، مجاز اور سبط حسن کے سپرد ہوئی۔ سردار جعفری نے گراں قدر اداریے بھی تحریر کیے۔

"نیا ادب" کے اداریہ میں ترقی پسند ادب کی وضاحت کی گئی ہے۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادب ہر پرانی چیز کے خلاف نفرت اور احتجاج کا نام ہے۔ ترقی پسند ادب ہر چیز کو اس کے ماحول اور تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہے اور ادبی کارناموں کی سچی کسوٹی یہی ہے۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا وہ پرانے ادب کی بہترین روایتوں کا حامل ہوتا ہے اور انہیں روایتوں کی بنیاد پر نئی عمارتیں کھڑی کرتا ہے۔ زیادہ عالی شان اور زیادہ کارآمد۔۔۔۔۔ ترقی پسند ادب ہی دراصل قدیم ادب کا سب سے معتبر امین اور سب سے مستحق وارث ہے۔

۔۔۔ ہمارے ملک کے ترقی پسند ادب نے انہیں بدلتے ہوئے سماجی حالات کی کوکھ میں جنم لیا ہے اور اس کے ماتھے کی شکنیں بتا رہی ہیں کہ وہ ہماری موجودہ زندگی اور اس کی کشمکش سے پورا اثر لے رہا ہے لیکن یہ ترقی پسند ادب ہے کیا چیز۔۔۔ ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ادب ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے۔ ان کا پرتو ہو۔ ان کی چھان بین کرتا ہوا اور ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو لیکن وہ صرف زندگی کی ہلچل اور ہیجان ہی کا نقیب اور نبض شناس اور رہبر نہیں ہوتا۔ وہ صرف سطح پر کروٹیں لینے والی موجوں ہی کے ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر ان خاموش اور میٹھے دھاروں سے بھی سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے رہتے ہیں۔ وہی ادب ترقی پسند ادب کہلانے کا مستحق ہے جو زندگی کے ان عناصر سے اثر لیتا ہو اور ان کی آبیاری کرتا ہو، جن میں نمو اور افزائش کی قوت پائی جاتی ہے اور جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا روحانی اور مادی معیار اونچا کرے۔ ان عناصر کی کھوج لگانا اور ان کا پرکھنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر ادیب کبھی کبھی راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ترقی پسند ادب فرد اور جماعت کی تمام ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے اور ان میں عمل اور خود اعتمادی اور تخلیق تعمیر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔"20

شمس الرحمٰن فاروقی نے نیا ادب کے پہلے شمارے کے اداریہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اختر حسین رائے پوری نے ادب کو انسان کا 'ایک اہم معاشی فریضہ' تو قرار دیا لیکن اس نظریے کی رو سے ادب کی خوبصورتی کے بارے میں تصورات میں کیا تبدیلیاں عمل میں آئیں گی، اس سلسلہ میں وہ خاموش ہیں۔ سردار جعفری کی فکر اور اسلوب میں وضاحت اور پختگی نسبتاً زیادہ تھی (وہ "نیا ادب" کے شریک مدیر تھے اور اس کے پہلے شمارے کا اداریہ اس تنبیہ کے لیے اہم ہے کہ "مانا کہ ہر پرانی عمارت کو ڈھائے بغیر نئی تعمیر نہیں بنائی جا سکتی لیکن ایسی تخریب بھی کس کام کی جس کے بعد تعمیر کے لیے مسالہ ہی نہ مل سکے") لیکن انہوں نے بھی اعلیٰ شاعری کو فرد نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان بنانے کے علاوہ یہ واضح نہیں کیا کہ جو ادب پوری جماعت کا ترجمان نہیں ہے وہ خوبصورت کیوں نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ عقدہ تمام ترقی پسند شعری نظریات کے پس منظر میں ایک Distubring Element کی طرح موجود رہا ہے کہ وہ شاعری جو ترقی پسند سیاسی یا سماجی نظریات کی ترجمان نہ ہوتے ہوئے بھی خوبصورت ہے اس کو کس خانے میں رکھا جائے؟ سردار جعفری نے اپنے انگریز

ی مضمون میں اس عقدے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔'' 21

اساتذہ کے اشعار:

نیا ادب کے پہلے شمارے میں جا بجا اساتذہ کے ایسے اشعار بھی شریک کیے گئے تھے جو اس تحریک (ترقی پسند تحریک) کے موضوع سے ہم آہنگ تھے مثلاً

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخی نظارا نہیں

(اقبال)

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہن ِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

(جوش)

اس انجمن دہر کا ہر تازہ تغیر
میرے لیے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

(جگر)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

(اصغر)

جوش اور ساغر نظامی کے مشترکہ بیان سہ ماہی نیا ادب ممبئی کے پہلے شمارے میں آزادی، جمہوریت، عالم انسانیت کی فلاح و بہبود، اُخوت و مساوات اور ظلم کا خاتمہ جیسی انسانی تہذیب و تمدن کی بنیادوں کی اہمیت اور ان کی حفاظت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ہم محسوس کرتے ہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن کی وہ بنیادیں خطرے ہیں جن پر آزادی اور نسل انسانی کی ارتقائی عمارت چنی جارہی ہے۔۔۔۔آزادی، جمہوریت، انسان پر انسان کے ظلم کا خاتمہ، تمام انسانوں کے لیے فلاح و مسرت عالمگیر اُخوت و مساوات اور ایک غیر طبقاتی سماجی نظام جس کا مظہر ہمارے نزدیک اشتراکی روس ہے اور جس کے باشندوں نے جرمنی کا مقابلہ کر کے ایثار و قربانی کے جذبے کو تاریخ میں روشن کر دیا ہے۔اگر یہ مٹ گیا اگر مساوات و ترقی کا پرچم سرنگوں ہو گیا تو تمام اقدار راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گی جن کی طرف ہمیں ارتقاء لیے جارہا ہے۔ان حالات میں کوئی متمدن اور مہذب انسان غیر جانبدار نہیں رہ سکتا ہے۔ہندوستان بطور خاص اس وقت نہایت عظیم خطرات سے گھرا ہوا ہے۔غیر ملکی وحشی جنھوں نے چین میں تہذیب سوز مظالم کو آخری حد تک پہنچا دیا ہمارے ملک کو لوٹنے کے لیے ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ایسی حالت میں ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کرے۔'' 22

سردار جعفری نے نیا ادب میں جمہوریت پسند مجاہد خاتون کی تصویر چھاپی ہواس بارے میں سبط حسین نے لکھا ہے:

''انھیں دنوں (دوسری جنگ عظیم سے قبل) کسی رسالے میں ایک جمہوریت پسند مجاہد خاتون کی تصویر چھپی ۔۔۔شانوں پر بکھرے ہوئے بال، جسم پر فوجی وردی، ہاتھ میں رائفل، چہرے پر عزم وجلال کی چھوئیں اور تیور ایسے کہ شیر افگنوں کے دل دہل جائیں ۔سردار جعفری کو یہ تصویر اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے بڑی سائز کا فوٹو بنوایا اور فریم کروا کر ''نیا ادب'' کے دفتر میں لگا دیا۔ جو آتا تصویر کی تعریف کرتا البتہ ایک دن قبلہ رندان جہاں جوش صاحب تشریف لائے تو انہوں نے تصویر کو اپنے ہاتھ سے الٹ دیا اور فرمایا صاحب !عورت کی یہ سپاہیانہ سج دھج مجھ کو ہرگز گوارا نہیں ۔۔۔۔وہ تو پیار و محبت کا سرچشمہ ہے۔وردی پہن کر تلوار بندوق چلانا اُن کا منصب نہیں ۔سردار نے جوش صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود یہ تصویر بمبئی میں سردار کے پاس تھی۔'' 23

دوسرا شمارہ مئی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔اس میں لکھنے والوں میں جوش، عصمت چغتائی کے علاوہ جدید چینی ادب کا ترجمہ شائع ہوا۔پروفیسر ہالڈین کے مضمون ''سائنس اور زندگی'' کا ترجمہ سعید انے کیا تھا۔گورکی کی کہانی ''وہ لڑکا'' کا ترجمہ مجاز نے کیا تھا اور خالی جگہ میں جگر کے دو شعر شریک تھے۔

وہی شورش ہے لیکن جیسے موج تہ نشیں کوئی
وہی دل ہے مگر آواز مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانہ و ساقی وہی شیشہ وہی صہبا
مگر آواز نوشا نوش مدھم ہوتی جاتی ہے

''نیا ادب'' کا جون 1939ء کا شمارہ 72 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے قلم کار سید مطلبی فرید آبادی، علی عباس حسینی، محمود الظفر ہیں۔اداریہ کا عنوان ''ادب اور سیاست'' ہے۔صفحہ نمبر 5، 6، 7 پر اُس زمانے میں ہونے والے واقعات کے علاوہ سامراجوں، سرمایہ داروں اور فاشسٹوں کی سازشوں کو بے نقاب کر کے ان پر طنز کیا گیا ہے۔''نیا ادب'' کے ایک شمارے میں محمد حسن عسکری کا افسانہ ''پھسلن'' چھپا تھا۔اس سلسلہ میں مظہر امام نے لکھا ہے:

''محمد حسن عسکری کی بدنام کہانی ''پھسلن'' جس کا موضوع ہم جنسی ہے، ترقی پسندوں کے اسی خاص الخاص رسالے ''نیا ادب'' میں چھپی تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب نئے ادیبوں پر عریاں نویسی اور فحش نگاری کے الزامات شدومد سے لگائے جا رہے تھے۔اس لیے جب یہ کہانی الٰہ آباد سے ایک نئے افسانہ نگار کی جانب سے موصول ہوئی تو ''نیا ادب'' کا ادارتی عملہ اس کی اشاعت کے سلسلہ میں جلد کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔اس موقع پر سردار جعفری نے رہنمائی کی اور ڈی ایچ لارنس کا ایک مضمون دکھایا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ جنسی تجربات کے ذکر یا جنسی رشتے سے لذت یابی کے بیان کو فحاشی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اگر اس اظہار سے عورت کی تحقیر اور مرد کی فتح یابی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔یہ سند ملی تو کہانی شائع کر دی گئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی سردار کے مطالعے کا دائرہ محدود نہیں تھا۔یہ اور بات ہے کہ جب محمد حسن عسکری ترقی پسندوں کی کھلم کھلا

مخالفت کرنے لگے تو اس افسانے کی اشاعت کو لے کر ''نیا ادب'' کی پالیسی پر سخت اعتراض کیے گئے۔ شاید ایسے ہی اعتراضات کا اثر تھا کہ جب اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد میں ترقی پسندوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی کو اس میں عریاں نگاری کے خلاف ایک قرارداد سبط حسن نے پیش کی اور سردار جعفری نے اس قرارداد کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی لیکن شاید بہتوں کو یہ جان کر حیرت ہو کہ جہاں نوجوان اس قرارداد کی حمایت کر رہے تھے، وہاں قاضی عبدالغفار اور حسرت موہانی جیسے ثقہ بزرگوں نے یہ کہتے ہوئے کہ جو جذبہ یا احساس ادب کا حصہ بن گیا اُسے فحش کیسے کہا جا سکتا ہے، اس قرارداد کی مخالفت کی۔ حسرت موہانی نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اسے لطیف ہوس کہہ سکتے ہیں۔ قرارداد منظور نہیں ہوئی۔'' 24

(مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، اُردو دنیا، ستمبر 2000، ص 25)

نیا ادب میں شائع کی گئیں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی چند تخلیقات کی تفصیلات دیتے ہوئے سبط حسن لکھتے ہیں:

''نیا ادب'' انجمن ترقی پسند مصنّفین کا ترجمان تھا۔ اس مختصر سے رسالے نے جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس غرض یہ کہ سبھی ترقی پسند ادیبوں نے اس پرچے کو اپنی تحریروں سے نوازا۔ منشی پریم چند کا ترقی پسند مصنّفین کا کانفرنس کا خطبۂ صدارت، اُن کی مشہور کہانی ''کفن'' اور سجاد ظہیر کے نام ان کے خطوط پہلی بار ''نیا ادب'' ہی میں چھپے منٹو کی کہانی ''نیا قانون'' بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی۔ ایک روز الہ آباد سے ایک کہانی موصول ہوئی جس کا عنوان تھا ''پھسلن'' اور مصنف تھے محمد حسن عسکری۔ ہم لوگ کئی ہفتے اس شش و پنج میں رہے کہ کہانی کو چھاپیں یا نہ چھاپیں۔ بات یہ تھی کہ ان دنوں قدامت پرست ادیب اور انگریزی سرکار کے گماشتے دونوں پنجے جھاڑ کر ترقی پسند ادیبوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور ان پر فحش نگاری اور عریاں نویسی کی تہمتیں دھر رہے تھے لہٰذا ہم لوگ ہچکچا رہے تھے۔ مبادا دشمنوں کو نیا حربہ ہاتھ آ جائے مگر ان دن سردار جعفری نے مشہور انگریزی ناولسٹ ڈی ایچ لارنس کا ایک مضمون دکھایا جس میں لارنس نے فحاشی پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا۔ لارنس کا کہنا تھا کہ جنسی واردات سے لذت یابی کا اظہار ہرگز فحاشی نہیں بشرطیکہ اس کے تذکرے سے جنس (عورت) کی تضحیک اور توہین مقصود نہ ہو یا مرد کی فتح و کامرانی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ یہ سند ملی تو کہانی شائع کر دی گئی مگر کسی جانب سے احتجاج یا اعتراض کی آواز نہ اُٹھی ۔۔۔۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' نیا ادب ہی میں شائع تھی۔ وہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا اور انگریزی فوجیں ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں یہ نظم چھپی تو ''ایوان اقتدار'' میں تہلکہ مچ گیا۔ ''نیا ادب'' کے دفتر کی تلاشی ہوئی اور وہ شمارہ جس میں نظم شائع ہوئی تھی بحکم سرکار ضبط کر لیا گیا مگر تیر ترکش سے نکل چکا تھا اور ہر طرف اس نظم کا چرچا تھا لہٰذا اس ضبطی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی ملک گیر تحریک چلی تو یہ نظم ہزاروں کی تعداد میں غیر قانونی طور پر چھپی اور ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہوئی۔''25

''نیا ادب'' میں ''کلیم'' کی شمولیت:

''نیا ادب'' نوجوانوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے اپنا رسالہ کلیم

بھی اس (نیا ادب) میں ضم کر دیا اور اگست، ستمبر 1939ء سے یہ رسالہ ''نیا ادب'' اور ''کلیم'' کے نام سے جاری ہوا۔''26

ڈاکٹر عفت آرا شمسی نے لکھا ہے:

''حلقہ ادب۔۔۔۔ کچھ دنوں کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنا رسالہ ''کلیم'' (دہلی) کو لکھنؤ آکر نیا ادب میں ضم کر دیا ۔۔۔جوش نے اس انضمام کی وجہ مقصد کا اتحاد بتایا اور اداریہ کو اس مصرعہ پر ختم کیا ؎

دو دل یک شود بشکند کوہ را

27

اگست و ستمبر 1939ء کے مشترکہ شمارہ (نیا ادب اور کلیم) کے اداریہ میں جوش نے دونوں پرچوں کے مقاصد کی یکسانیت پر روشنی ڈالی ہے۔

''اگر نیا ادب اور کلیم کے ادبی و سیاسی مقاصد میں ذرہ برابر بھی اختلاف ہوتا یا ترقی پسند مصنفین کی پالیسی ''کلیم'' کی سیاسی پالیسی سے ذرا بھی مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ ان دنوں پرچوں یعنی نیا ادب اور کلیم کو کسی عالم میں بھی یک جان و قالب نہیں بنایا جا سکتا تھا لیکن چوں کہ ان دونوں پرچوں کی ''جان'' میں وحدت پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان دونوں کے قالبوں میں بھی وحدت پیدا کر دی گئی ہے مجھے اُمید ہے کہ ''دوئی'' کو مٹا کر ہم لوگوں نے جو یہ وحدت پیدا کی ہے اس کے نتائج نہایت ہی مفید اور شاندار ثابت ہوں گے۔'' 28

جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی بارات'' میں رسالہ نیا ادب کے بند ہو جانے کا ذریعہ بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

''ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہ نامہ ''کلیم'' کو کامیابی سے چلا کر اور ایک ایسے روحانی عذاب میں گرفتار ہو کر جس نے میرے حواس چھین لیے تھے میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آباد چلا گیا اور چوں کہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا میں نے اپنے داماد التفات احمد کو مینیجر بنا دیا لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نام خدا بالکل نکھٹو ہیں میں نے کلیم بند کر کے مجاز، علی سردار اور سبط حسن کی درخواست پر اس کو ان لوگوں کے رسالے ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا۔''29

نیا ادب اور کلیم کا پہلا جڑواں رسالہ اگست و ستمبر 1939ء کا مشترکہ شمارہ ہے جو ستمبر میں شائع ہوا اس کے ٹائٹل پر قلمی معاونین کے نام درج ہیں جن میں جوش، چودھری محمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند، پروفیسر اعجاز حسین اور احمد علی شامل ہیں۔ اندرونی ٹائٹل میں لوح پر ''ہندوستان کا ترقی پسند ماہ نامہ'' لکھا ہوا ہے اس کے بعد پرچے کا نام ''نیا ادب اور کلیم'' دیا گیا ہے۔ اس کے نیچے ''ادارہ'' لکھ کر جوش ملیح آبادی کا نام بحیثیت مدیر اعزازی اور سبط حسن، علی سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز کے نام ہیں۔ شمارے کی ابتداء میں جوش نے عہد نو کا آغاز کے عنوان سے یہ اطلاع درج کی ہے۔

''قارئین کو مسرت کے ساتھ مطلع کیا جاتا ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے لائق ارکان اور اُردو زبان کے ماہ نامے ''نیا ادب'' کے سرگرم کارکنوں یعنی مجاز، سبط حسن اور علی سردار جعفری کی اس مفید تجویز پر عمل کرتے ہوئے کلیم اور نیا ادب دونوں کو یکجا کر دیا جائے، ان دونوں کہ رسالوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔''

حلقہ ادب:

رسالہ نیا ادب کی مقبولیت کے پیش نظر ترقی پسند نوجوان ادیبوں نے مل کر نیا ادب کے تیسرے شمارے کے بعد سے ایک اشاعتی ادارہ (پبلشنگ ہاوس) کی بنیاد ڈالی۔اس سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں جیسے سجاد ظہیر کی کتاب لندن کی ایک رات ‘حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ’انوکھی مصیبت‘‘ مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ‘ سردار جعفری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ منزل‘ سجاد ظہیر کا ناولٹ ’’لندن کی ایک رات‘‘ شائع ہوئے۔

نیا ادب اور کلیم کا دوسرا شمارہ اکتوبر 1939ء کو شائع ہوا۔اس میں مجاز‘ جوش‘ جاں نثار اختر کی نظمیں‘ رشید جہاں کا افسانہ ’’مبتلا‘‘ حیات اللہ انصاری کا ’’کالا دیو‘‘ اور قاضی عبدالغفار کا مقالہ ’’ادب کا تجارتی پہلو‘‘ شامل ہیں۔اداریہ ’’جنگ اور ادب‘‘ میں ادیب کے حساس اور باشعور ہونے کی بات واضح کی گئی ہے اور سامراجی طاقتوں کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

انسانی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی جنگ چھڑی ہو‘ کوئی سماجی آفت آئی ہو یا کوئی انقلاب رونما ہوا ہو اور ادب اس سے متاثر نہ ہوا ہو اور کترا کر چلا گیا ہو۔جو لوگ ادیبوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں جنگ اور دوسرے ہنگاموں سے اثر نہ لینا چاہیے۔وہ ادب کی تاریخ سے واقف ہیں نہ ادیبوں کی فطرت سے۔ادیب سماج کا سب سے ذکی الحس عضو ہے اور سماجی حادثوں اور ہنگاموں کے نقوش کا اثر سب سے پہلے اس کے ذہن پر پڑتا ہے۔۔۔لالچ کے شعلے ایک بار پھر بھڑک اُٹھے ہیں اور انسان اور اس کی ساری کمائی سرمایہ دار حکومتوں کے خون آلود جبڑوں کی زد میں آ گئی ہے۔اور سامراجی قوتیں امن آزادی اور چھوٹے ملکوں کی حفاظت کے نام پر انسان کے خون سے ہولی کھیل رہی ہیں اور موت کے شعلہ فشاں رقص میں بھولے انسانوں کو شرکت کی دعوت دے رہی ہیں۔ادیب ایک بار پھر ان تخلیقی مناظر سے اثر قبول کر رہا ہے لیکن اس کا سماجی شعور بیدار ہو گیا ہے اور وہ جان گیا ہے کہ یہ ساری آفتیں کس کی لائی ہوئی ہیں۔

نیا ادب اور کلیم کے نومبر 1939ء شمارہ کا اداریہ مدیروں نے نہیں لکھا بلکہ ڈاکٹر عبدالعلیم کے مضمون ’’ہندی ساہتیہ سمیلن کی بھول‘‘ کو اداریہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔جس میں انہوں نے سنسکرت آمیز ہندی رائج کرنے کے ہندی والوں کے مطالبہ پر روشنی ڈالی ہے۔اس شمارے میں سردار جعفری کا ایک مضمون ’’ادب اور رجعت پسندی‘‘ شامل ہے۔

نیا ادب اور کلیم کے دسمبر 1939ء کے شمارے میں سردار جعفری نے اردو کے رسم الخط پر خالص افادی اور سائنٹفک اصولوں کے تحت غور کرنے کی بات کہی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

رسم خط میں اصلاح کی جائے یا مکمل تبدیلی اس مسئلے پر خالص علمی اور سائنٹفک نقطہ نظر سے غور کرنا بہت ضروری ہے رومن‘ ناگری یا فارسی رسم خط کی سیاسی یا مذہبی تعصب کی بنا پر خواہ مخواہ مخالفت یا موافقت سے کوئی مدد نہ ملے گی بلکہ گتھیاں اور بڑھیں گی۔ناگری رسم خط پر اردو رسم خط کی برتری یا رومن رسم خط پر ناگری اور رسم خط کی فضلیت کی بحثوں سے بچ کر اس مسئلہ پر خالص افادی اور سائنٹفک اُصولوں کے تحت غور کرنا چاہیے۔

سبط حسن نے نیا ادب میں اپنے مضمون فلسفہ شاہین میں یہ سوال کیا ہے کہ بیسویں صدی کا مرد بغیر جماعت یا تحریک کے شاہین کی خصوصیت رکھنے اور خودی کا حامل اقبال کا مرد کامل ہوسکتا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''اقبال پر خودی کا فلسفہ اتنا حاوی ہے کہ وہ انسانی کردار کا مطالعہ کرتے وقت اس کی انفرادی زندگی ہی کو نظر کے سامنے رکھتا ہے اور اس کی کھوج نہیں لگاتا کہ انسانی کردار پر جماعتی تعلقات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ زندگی کے اس پہلو پر کبھی بحث بھی کرتا ہے تو صرف اس خیال کی تائید میں کہ جماعت افراد کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جس سے انفرادی خودی کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ انسان جماعت سے بے پرواہ ہو کر فرد کی حیثیت سے بلند ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افراد کے ''کارناموں'' کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ ان کی تقلید کی تعلیم دیتا ہے لیکن جماعت کے کارناموں کو بھول جاتا ہے اور جماعت کی تقلید کی تعلیم نہیں دیتا۔ اقبال کے اس فلسفۂ خودی کا لازمی اور منطقی نتیجہ فرد پرستی ہے جس کو کہیں ''میر کارواں'' کہیں ''مرد مومن'' کہیں ''مجاہد'' کہیں ''قافلہ سالار'' اور اسی قسم کے دوسرے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اقبال شخصیت پرست ہے تحریک پرست نہیں۔ اس کے کلام میں غالباً تین درجن گزری ہوئی ہستیوں کے تذکرے ملیں گے۔ ان میں سقراط بھی ہے، ہیگل بھی، طارق بھی ہے اور خالد بھی، غالب بھی ہیں اور مولانا روم بھی۔ لینن بھی ہے اور مسولینی بھی اور ڈیوک ونڈسر، نادر شاہ اور امان اللہ خاں بھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے افراد کسی نہ کسی تحریک کے نمائندے ضرور ہوتے ہیں لیکن اقبال نے ان کی تحریکوں پر زور نہیں دیا ہمیشہ ان کی شخصیتوں کو اچھالا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال اقتدار پرست ہے اور دیوانگی کی حد تک اقتدار پرست۔ وہ ہر قوت کا استقبال کرتا ہے۔ ہر صاحب اقتدار سے متاثر ہوتا ہے۔ قوت و اقتدار کی مدح سرائی میں اس کی شاعری کا اضطراری پہلو ہے اور راس دھن میں وہ تحقیق و جستجو اور عقل و تمیز کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ شاہین کا فلسفہ اسی اقتدار پرستی کا نتیجہ ہے جس کی تلقین اقبال نے یورپ کے آخری سفر اور مسولینی سے ملاقات کے بعد شروع کی ۔۔۔۔ اس نے شاہین اور عقاب کو جان بوجھ کر چنا ہے کیوں کہ ان میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اقبال کے مکمل انسان میں ہونی چاہئیں ۔۔۔۔ وہ مجاہد ہیں اور جابر و قاہر ہیں، بلندی کی طرف جاتے ہیں، کسی سے خوف نہیں کھاتے۔ کیا بیسویں صدی کا مرد کامل ایسا ہی ہوگا؟ کیا انسان کی روحانی و مادی ترقی فلسفۂ شاہین کی مرہون منت ہوگی؟ 30

1939ء کے ''نیا ادب'' میں سجاد ظہیر کا مضمون ''اُردو کی جدید انقلابی شاعری'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں سجاد ظہیر نے اشتراکی نظام کو تہذیب و تمدن کی ترقی اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے بہتر قرار دیتے ہوئے لکھا کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دوسرے انسانوں کا خون چوسنے کی ضرورت نہیں۔

''سرمایہ داری نظام جس نے آج دنیا کو تباہی کی اس حد تک پہنچا دیا ہے جس کا قیام تہذیب و تمدن کے مسلسل انحطاط و بے حد بربادی کے مرادف ہے آج صرف اشتراکی نظام سے ہی بدلا جا سکتا ہے۔ دنیا کے غریبوں نے دنیا کا ایک چھٹا حصہ سرمایہ داری سے آج سے بیس برس پہلے چھین کر ثابت کر دیا کہ سرمایہ داروں، زمینداروں، راجاؤں، نوابوں اور ان کے ہالی موالی کے بغیر بھی دنیا کا کاروبار چل سکتا ہے۔ انہوں نے دکھایا کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو خون چوسیں۔ انہوں نے بتلا دیا کہ انسانی تمدن کی ترقی کے راستے سوشلسٹ نظام کے ماتحت برق رفتاری کے ساتھ

طے کیے جاسکتے ہیں۔یہ ہے وہ ماحول جس میں ہمارے نوجوان انقلابی شاعر رہتے ہیں۔یہ وہ نوجوان ہیں جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے مسائل کے بارے میں اپنی رائے قائم کرلی ہے۔" 31

نیا ادب اور کلیم کی جلد 2 کے شمارے 1 تا 3 جنوری، فروری، مارچ 1940ء کا مشترکہ شمارہ ہے اور چوتھے شمارے اپریے 1940ء کے اداریوں میں مرزا جعفری علی خاں اثر کے مضمون "نیا ادب کدھر جارہا ہے" کا جواب "معترضین کی خدمت میں" کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔جعفر علی خاں اثر نے اپنے مضمون میں ترقی پسند مصنّفین کی نظریاتی وابستگی اور ادب میں نعرہ بازی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"نئے ادب کے علمبردار مزدور اور سرمایہ دار کی نزاع شاعری کے میدان میں طے کرنا چاہتے ہیں۔" اداریوں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر عہد کا ادب ہمعصر زندگی کے مسائل کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ کہ سماج میں مزدوری اور سرمایہ دار کی نزاع موجود ہو تو ادب پر اس کے اثرات کا مرتب ہونا لازمی ہے۔اداریے کے بعد جعفر علی خاں اثر کا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔اس اداریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد انورالدین نے لکھا ہے کہ اداریے کا اسلوب سنجیدہ، زبان سائستہ اور لہجہ مہذب ہے، کہیں بھی مناظراتی رنگ نہیں جھلکتا۔" 32

نیا ادب کے اداریہ میں اشتراکی اور جمہوری تحریکوں کو ترقی کے سچے راستوں سے تعبیر کیا گیا:

"اس ملک میں شہنشاہیت کی کمزوری سے ساری دنیا کی ترقی پسند قوتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ہندوستان اور چین سامراج دشمن محاذ کے سب سے اہم مورچے ہیں۔ظاہر ہے کہ ہماری جمہوری تحریک دنیا کی انقلابی اشتراکی تحریک سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔اس قسم کی علیحدگی کی کوشش کرنا اپنی طاقت کو گھٹانا ہوگا۔ترقی پسند مصنّفین کی جگہ اسی اشتراکی اور جمہوری تحریک میں ہی ہونی چاہیے۔یہی وہ تحریکیں ہیں جن میں زندگی ہے۔یہی وہ ذرائع عمل ہیں جو دراصل انسانی سماج میں انقلاب پیدا کریں گے۔یہی ترقی کے سچے راستے ہیں۔" 33

نیا ادب اور کلیم کے شمارے بابتہ اکتوبر 1940ء کے اداریوں میں ادب اور سماج کے گہرے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے:

"ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ ادب کا سماجی ماحول سے بہت قریبی تعلق ہے اور ادب کو سماجی مسئلوں کو سمجھنے اور سماج کو بدلنے اور ترقی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔"34

"سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ترقی پسند ادیب امن، آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت کی طاقتوں سے ملحق ہونے کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ عمل کے اور بھی دائرے ہیں اور جمہوریت و اشتراکیت کے علاوہ بھی دنیا میں سماجی نظریے ہیں۔دراصل آج کارل مارکس کا اشتراکی نظریہ ہی ہمیں جامع طور سے سرمایہ داری نظام کی اصلیت بتا کر یہ ثابت کرتا ہے کہ سرمایہ داری کا غلبہ ختم کرنے کے لیے دنیا کی مزدور جماعت دوسرے مظلوم طبقوں (غریب کسانوں، درمیانی طبقوں کو ساتھ لے کر سیاسی طاقت کو سرمایہ داری سلطنت کے ہاتھ سے چھین لے گی اور پھر کارخانوں، فیکٹریوں اور زمین پر سے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے ذاتی قبضہ اور ملک کو ختم کرکے پیداوار کے تمام ذرائع و وسائل کو محنت کش طبقوں کی اجتماعی ملکیت میں دے دے گی۔اس سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے بہت گہرے تہذیبی اور تمدنی نتائج ہوں گے جنھیں ہم آج کل سوویت روس

میں پاتے ہیں۔" 35

مذکورہ بالا اداریہ کی تشریح کرتے ہوئے عقیل احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''ترقی پسند ادب کی تحریک میں یہ بات دلچسپ ہے کہ بہت جلد افادیت کا رخ اشتراکیت' کی طرف موڑ دیا جاتا ہے جس کی رو سے ادب کا مقصد سماجی حقیقت نگاری ہے جو اشتراکی حقیقت نگاری کے مترادف ہے۔اس تصور کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ سماجی زندگی کی کشمکش کو طبقاتی لوٹ کھسوٹ اور سرمایہ دارانہ استحصال کی روشنی سے دیکھا جائے وہ اس طرح کہ جدلیاتی طریقہ کار کو اپناتے ہوئے سماجی طبقات کی توضیح وتعبیر معاشی حوالے سے کی جائے۔ایسی صورت میں سماج دو طبقوں میں تقسیم نظر آئے گا۔ایک طبقہ وہ کہ وہ استحصال کرنے والا یعنی بورژوا طبقہ ہے دوسرا وہ کہ جس کا استحصال کیا جارہا ہے۔یہ مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ ہے۔اس استحصال کے خلاف آواز اُٹھانا شاعروں اور ادیبوں کی ذمہ داری ہے۔اس طبقہ وارانہ جدوجہد میں شاعروں کو مزدوروں اور کسانوں کا ہمنوا ہونا چاہیے تا کہ یہ استحصال کا شکار طبقہ استحصال کرنے والے گروہ کے خلاف صف آرا ہو اور ایک ایسے سماج کے قیام کی جدوجہد کرے جو غیر طبقہ وارانہ بنیادوں پر قائم ہو۔یہ سماج کے تاریخی ارتقاء کی فطری منزل ہے۔اکتوبر 1940ء کے ''نیا ادب'' کے (مذکورہ) اداریے میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔''36

''نیا ادب اور کلیم'' نومبر 1940ء کے اداریہ میں سردار جعفری نے بتایا کہ سامراجی حکمراں ہندوستانیوں کی شہری آزادی کو سلب کیے ہوئے ہیں انہوں نے ادیبوں کو شہری آزادی کے حصول کے لیے اُٹھ کھڑے رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔

''شہری آزادی جس کے لیے سرمایہ داروں نے سیکڑوں سال جدوجہد کی اور جسے کامیابی کے بعد اپنے دستور اساس کی پہلی شرط قرار دیا آج ان کے لیے مہلک ثابت ہورہی ہیں اور سرمایہ دار حکومتیں لوگوں کو شہری آزادی سے محروم کرتی چلی جارہی ہیں کیوں کہ جس شہری آزادی کے بل بوتہ پر انہوں نے اقتدار کے زینے طے کیے تھے وہ آج یہ مطالبہ کررہی ہے کہ سرمایہ داری نظام اپنی تاریخی خدمت انجام دے چکا ہے۔اب اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت باقی نہیں بلکہ وہ سماج کے حق میں مضر ہے لہذا اس کی جگہ کوئی بہتر نظام زندگی رائج ہونا چاہیے۔سرمایہ دار حکومتوں کو خودکشی اور شہری آزادی کی موت میں سے ایک کو پسند کرنا ہوگا۔انتخاب مشکل نہیں۔۔۔ہندوستان میں آج یہی ہورہا ہے۔جمہوریت کی آواز اُبھرنے نہیں پاتی اور شہری آزادی کی شہزادی لال قلعہ میں قید ہے۔ایسے قانون بنائے گئے ہیں کہ جمہوران کے خلاف ورزی کیے بغیر بات بھی نہیں کرسکے۔ چالیس کروڑ انسانوں کے منہ سئے جارہے ہیں۔ان کے قلم کو جنبش کی اجازت نہیں اور پریس پر پابندیوں کا ایک جال بچھ گیا ہے۔خود انگریز شہری چیخ اُٹھے ہیں حکومت کے مخالفین کا تو ذکر ہی کیا۔۔۔۔۔ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ اہم ایسا ماحول پیدا کریں جس میں شہری آزادی بھی نصیب ہو اور سہولتیں بھی کہ علم وادب کی آوازیں مرگھٹوں سے نکل کر جن میں پیٹ بھرے مردے حرکت کرتے رہتے ہیں انسان کی آبادی تک پہونچ سکیں۔علم وادب کے سوتے کھیتوں اور کارخانوں سے بھی نکلیں۔ان میں زندگی کی تازگی ہوگی اور تڑپ اور گرمی بھی۔۔۔موت کی اُداسی اور ٹھنڈک اور راس کا جمود موجودہ ماحول کو ہی مبارک رہے۔''37

اداریہ میں ''اطلاعاً عرض ہے'' کے تحت سجاد ظہیر، شفیق احمد نقوی، محمود الظفر اور سید مطلبی فرید آبادی کی گرفتاری کی خبر دی

گئی ہے۔اداریہ کے آخر میں ''ترقی پسند ادب کیا ہے'' کے تحت سردار جعفری نے لکھا:

''ترقی پسند ادب کی پہلی شرط حقائق زندگی کا ایسا مطالعہ ہے جس کی بنیاد قوت عمل پر ہو۔پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر سرمایہ دار اور زمیندار کو گالیاں دینے اور گونگی بہری چٹانوں کو انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے سنانے سے ممکن ہے ذوق گفتار کی تسکین ہو جائے لیکن ترقی پسند ادب کی خدمت نہیں ہوتی۔۔۔جنوری 1941ء کا ''نیا ادب اور کلیم'' ترقی پسند ادب نمبر ہوگا۔ہمیں اُمید ہے کہ ترقی پسند ادیب اور اس تحریک سے دلچسپی لینے والے حضرات ہماری ہمت بڑھائیں گے۔''38

یکم دسمبر 1940ء کو سردار جعفری کو گرفتار کر لیا گیا۔2 دسمبر 1940ء کو سردار جعفری لکھنو ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیئے گئے۔ 20 دسمبر کو ان کے مقدمے کی سماعت ہوئی اور عدالت نے انھیں چھ مہینے کی سزا سنائی۔28 دسمبر 1940ء کو انھیں بنارس سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔نیا ادب اور کلیم کا دسمبر والا شمارہ آیا تو اس میں جوش ملیح آبادی نے سردار جعفری کی گرفتاری پر بڑا بے باک اداریہ لکھا۔

''یکم دسمبر کو گورنمنٹ نے علی سردار جعفری کو گرفتار کر لیا۔پولیس نے انھیں رات بھر حوالات میں بند رکھا۔حوالات کیا ایک کال کوٹھری تھی جس میں فنائل کی بو اور مکڑی کے جالے ہر طرف گھر بنائے ہوئے تھے۔سردار نے بیان کیا کہ ''حوالات معزز مہمان'' کے اعزاز میں فنائل سے دھوئی گئی تھی (تا کہ دونوں ایک دوسرے کے زہریلے جراثیم سے محفوظ رہ سکیں) حوالات کے ذرہ ذرہ پر قدامت کی مہر لگی تھی۔موٹے موٹے لوہے کے سلاخوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔دروازہ کی زنجیر اتنے بل کھا چکی تھی اور دروازہ کے دونوں پٹ حوادث زمانہ کی چوٹوں سے اپنی ابتدائی شکل اس درجہ بدل چکے تھے کہ ہمارے سامنے ایک طالب علم حوالات میں لایا گیا تو دروازہ بند کرنے کے لیے سب انسپکٹر کو پہرہ دار کی مدد لینی پڑی۔پہرہ دار دروازہ اور زنجیر کے رازوں سے واقف تھا۔دیوار کے کونوں میں مکڑیوں نے اپنے خیمے تان رکھے تھے۔دروازہ سے لگی ہوئی چھوٹی سی لالٹین رکھی تھی۔علی سردار نے بتایا کہ اس سے مطالعہ میں مدد نہ ملی' البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جب مچھروں کا دھاوا ہوتا یا کوئی مکڑی قریب رینگنے لگتی تو نیم روشن کوٹھری کے کسی دوسرے حصے میں جا کر پناہ لے لیتے۔'' 39

دسمبر 1940ء میں جنگ آزادی کے خلاف شاعری کرنے کے جرم میں سردار جعفری گرفتار ہوئے تو سبط حسن اور مجاز نے رسالہ ''نیا ادب'' میں غالب کے ان دو اشعار سے اس گرفتاری کا استقبال کیا۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

40

پریم چند کا وہ مشہور زمانہ خطبہ جس میں حسن کا معیار تبدیل کرنے کی بات کہی گئی تھی' نیا ادب جنوری 194ء میں شائع ہوا۔

1938ء میں الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کی دوسری کانفرنس ہوئی۔اس میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے تقریر کی ملک اور قوم کے تئیں ادیبوں کی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا اور ترقی پسند مصنّفین سے اُمیدیں وابستہ کیں کہ وہ ملک کو آگے لے جائیں گے:

''آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجئے' ان کو راستہ بتایئے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعے ہونی چاہیے۔ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور اس سے ہمیں بڑی اُمیدیں ہیں۔۔۔ٹیگور نے اپنے پیغام میں کہا تھا۔

''۔۔۔آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سر نو زندگی کے چمن کی آبیاری کرنا ہے۔ادیب کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے' بیداری اور جوش کے گیت گائے' ہر انسان کو اُمید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو نا اُمید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر بڑے چھوٹے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین ہونا چاہیے۔قوم' سماج اور ادبی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔'' 41

لکھنؤ کی طرح الہ آباد بھی ترقی پسند تحریک کا بڑا مرکز تھا۔یہاں 1937ء میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔اس میں مولوی عبدالحق کا خطبہ صدارت پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے انجمن سے وابستہ ادیبوں کو قابل قدر مشورے دیئے تھے۔

اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔بھونڈے پن کے لفظ میں ادب کے ظاہر و باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ترقی پسند مصنّفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی''۔ 42

مولوی عبدالحق نے اپنے خطبہ صدارت میں ترقی پسند مصنّفین کو ماضی کے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ کرنے اور ان سے استفادہ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

''ممکن ہے زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کارآمد ہو یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے نئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی۔اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پرانا بوسیدہ مکان نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر ممکن نہیں۔یہ تشبیہ ممکن ہے بعض صورتوں میں درست ہو لیکن ادب کے معاملے میں کامل طور پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ترقی کے لئے تخریب ضروری ہو یہ لازم نہیں۔ادب میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔سوکھی شاخیں چھانٹی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں لیکن اگر آپ درخت کو ہی جڑ سے کاٹ دیں تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ہمیں

پچھلوں کے کاموں اوران کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم واصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے"۔ 43

ڈاکٹر عبدالعلیم نے ادیبوں اور ناقدین کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والوں کے تجربات اور مشاغل سے لگاؤ پیدا کرے تا کہ انسانی ماحول کا خاکہ سامنے آسکے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی کارناموں کو اسی معیار سے جانچے"۔ 44

سجاد ظہیر نے "یادیں" میں جولائی 1935ء میں پیرس میں منعقدہ کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ادیبوں کو چاہئے کہ وہ فاشزم اور سامراجی طاقتوں کی جانب سے ان پر لگائی گئی پابندیوں اور مظالم کے خلاف احتجاج کریں۔

وہ رقمطراز ہیں:

"مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی لگاتار کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیرس میں جولائی 1935ء میں ایک ورلڈ کانگریس آف رائٹرس فار دی ڈیفنس آف کلچر یا بین الاقوامی مصنّفین کی کانگریس برائے تحفظ کلچر ہونا قرار پائی۔ اس کانفرنس کو مدعو کرنے والوں میں میکسم گورکی، رومین رولان، آندرے مالرو، ٹامس مان، والڈو فرینک جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں تھیں۔ یہ اجتماع جو پیرس کے ایک مشہور ہال بولئے میں ہوا، دنیائے ادب میں بہت بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح ومشورے کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے.....ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادی خیال ورائے کے حق کے تحفظ کی کوشش کرنا چاہئے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جارحانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بناء پر ان پر مظالم کریں اس کے خلاف پرزور احتجاج کرنا چاہئے۔ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے متحدہ محاذ کا جزو بن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی حاصل کریں"۔ 45

ترقی پسند تحریک کی مختلف ہندوستانی زبانوں میں ترویج کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا:

"یہ تو ہم شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ لندن میں رہ کر ہندوستانی ادب پر نہ اثر ڈالا جا سکتا ہے اور نہ کوئی اعلیٰ قسم کا تحقیقی کام ہی ہو سکتا ہے۔ لندن کی انجمن کے قائم ہونے سے جہاں بہت سے فائدے ہوئے، وہاں یہ احساس بھی پکا ہو گیا کہ دس پانچ جلاوطن ہندوستانی سوائے اس کے کہ آپس میں مل جل کر طرح طرح کے منصوبے باندھیں اور یوروپی کلچر سے اثر قبول کر کے یتیم قسم کا ایک ادب پیدا کریں، زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑی بات جو ہم نے اس زمانہ میں یوروپ میں سیکھی وہ یہ تھی کہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اس وقت بارآور ہو سکتی ہے جب ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی ترویج ہو اور جب ہندوستان کے ادیب اس تحریک کی ضرورت کو سمجھ کر اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں"۔ 46

"نیا ادب" کے ایک اداریے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ترقی پسند مصنّفین اپنی تخلیقات میں سرمایہ دارانہ نظام

کے خلاف غم وغصہ کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ دراصل فن کار کی کامیابی ہے اور یہ ترقی کا سچا راستہ ہے ان پر لگائے گئے الزام کہ وہ شاعری کے دائرے کے باہر ہیں غلط قرار دیا گیا ۔سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف شاعری میں غم وغصہ اور شدید جذباتیت کے اظہار کا جواز پیش کیا گیا ہے:

''ترقی پسند شعرا اگر ایک نظام کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ شاعری کے دائرے سے باہر قدم رکھتے ہیں ۔غصہ 'نفرت' محبت' یہی تو وہ جذباتی مادہ ہے جس سے شاعری اپنے خیال کا مجسمہ لفظی توازن کی شکل میں تیار کرتا ہے ۔سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے اگر وہ مزدوروں اور کسانوں کے خفتہ جذبات کو جگانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو یہ اس کی شاعری کی کامیابی ہے ۔جس مقصد کے لیے اس نے جانفشانی کی وہ حاصل ہوگیا ۔47

واعظانہ 'خطیبانہ انداز' صرف نعرے' صرف ندا سے زیادہ فنی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''واعظانہ اور خطیبانہ انداز بھی ہماری انقلابی نظموں میں کافی پایا جاتا ہے ۔یہ بھی پرانے طرز کی شاعری کا ایک ترکہ ہے جس سے ہم اپنا دامن چھڑا لیں تو اچھا ہے'' ----

''آرٹ ایک ایسا آلہ ہے جو ہمارے ذہن پر نازک طریقوں سے اثر ڈالتا ہے ۔جذبات کو بیدار کرنا' دماغ کو ہوشیار کرنا ایک مشکل کام ہے اور بہترین اور کامیاب آرٹ وہی کہا جا سکتا ہے جو ہمارے جذبات و ادراک کی سطح ہی نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں تک اور ان کی پیچیدہ راہوں تک سے واقف ہو ۔اس لیے صرف نعرے' صرف ندا' خطاب اور پکار سے کام نہیں چل سکتا' بلکہ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ہر چیز ضرورت سے زیادہ کی گئی یا بھونڈی طرح سے کی گئی تو سننے والے کے جذبات پر الٹا اثر پڑسکتا ہے'' ----

''شاعری کا پہلا کام شاعری ہے' وعظ دینا نہیں اشتراکیت و انقلاب کے اُصول سمجھانا نہیں ۔اُصول سمجھنے کے لیے کتابیں موجود ہیں ۔اس کے لیے ہمیں نظمیں نہیں چاہییں ۔شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے' اگر وہ اپنے تمام ساز و سامان' تمام رنگ و بو' تمام ترنم و موسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا ۔اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا ۔اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے سے قاصر رہے گا تو اچھے سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر زمین میں ہوتا ہے ۔'' 48

ڈاکٹر وسیم بیگم نے سجاد ظہیر کے نقطہ نظر کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سجاد ظہیر کا یہ بیان قابل توجہ اور لائق تحسین ہے کہ انہوں نے پروپگنڈا اور ادب میں امتیاز کو باقی رکھنے پر زور دیا اور اس خاص دائرے میں خیال و عمل کو گڈمڈ ہونے سے بچالیا ۔'' 49

بقول سجاد ظہیر ''اس کے (نیا ادب) کے جاری ہونے سے ہماری تحریک کے اردو حصہ میں کسی حد تک مرکزیت آگئی ۔'' 50

نیا ادب نے دوسری زبانوں میں رسائل کی اشاعت پر مہمیز لگائی ۔

ڈاکٹر عشرت آرا شمسی رقمطراز ہیں:

''نیا ادب کے عروج اور غیر معمولی اشاعت نے دوسری زبانوں کے ہم مسلک ادیبوں کو بھی اپنی زبانوں میں رسالوں کی

اشاعت پر مائل کیا۔ بنگالی زبان میں ''پرچھوئیا'' اور ''پرگتی'' مہاراشٹرا میں ''چترا'' اور ہندی میں ''رویاب'' و ''یلو'' اشاعت پذیر ہوئے۔ 51

''نیا ادب'' کی مالی مشکلات:

رسالہ ''نیا ادب'' جس مفلوک الحالی کی حالت میں جاری ہوا اس کے بارے میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

''1937ء میں جب پہلی بار بعض صوبوں میں کانگریس کا راج قائم ہوا تو اُتر پردیش میں بھی کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اسی زمانے میں اردو کی تین کتابوں پر ڈھائی سو یا پانچ پانچ سو روپے کے انعامات ملے۔ اسرار الحق مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ علی سردار جعفری کا افسانوں کا مجموعہ اور سید سبط حسن کی تاریخ سے متعلق کوئی کتاب (نام اب یاد نہیں) تینوں دوستوں نے انعام کی یہ رقم جمع کر کے رسالہ نیا ادب نکالنے کا ارادہ کیا۔ سید حسن ظہیر کا ایک مکان حضرت گنج کے نواح میں خالی پڑا تھا وہاں دفتر قائم ہو گیا اور رسالہ اس مفلوک الحالی کی حالت میں نکلنے لگا۔۔۔''

''۔۔۔مالی دشواریوں کا ذکر سردار جعفری نے ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں کیا ہے۔ خاص طور پر وہ واقعہ جب یہ لوگ (سردار جعفری، سبط حسن اور مجاز) کسی دوست کے ہاں نیا ادب کا زرسالانہ وصول کرنے گئے تھے اور انہوں نے جو کرنسی نوٹ دیا اس کی نقدی بھی ان تینوں دوستوں کے پاس نہ تھی۔'' 52

نیا ادب کو روپیہ کی ضرورت تھی تو چندہ جمع کیا گیا تھا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''انجمن کو اور نیا ادب کو روپیہ کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم اس اجتماع (ادبی اجتماع) میں داخلے کا ٹکٹ لگائیں اور پھر اگر فضا سازگار ہو تو حاضرین سے بھی چندہ جمع کریں۔۔۔۔ بمبئی کے ایک مرکزی مقام انجمن اسلام ہائی اسکول کے خوبصورت ہال میں یہ ادبی اجتماع ہوا۔ داخلہ کا ٹکٹ صرف آٹھ آنے کا تھا۔۔۔ اس اجتماع میں کوئی دو ڈھائی سو کی حاضری رہی ہوگی۔۔۔ جلسے کے خاتمے کے کچھ پہلے میں نے حاضرین سے چندے کی اپیل کی۔ ٹکٹوں کے فروخت سے ہمیں شاید سوڈیڑھ سو روپے ہی ملے تھے جو ہماری توقعات سے کم تھے۔ لوگوں نے ایک ایک دو دو روپیہ اٹھنیاں چونیاں دینا شروع کیں اور اس طرح سو روپے کے قریب اور جمع ہوئے۔۔۔ میرا جی نے اپنی جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر چندہ کی جھولی میں ڈال دیا اور خود لوگوں سے زیادہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ نرگس اور جدن بائی۔۔۔ نے کافی بڑی رقم معذرت کے ساتھ ہماری جھولی میں ڈال دی جو شاید باقی سب لوگوں کی دی ہوئی کل رقم کے برابر تھی۔۔۔۔ ماہر القادری، راجہ صاحب محمود آباد او رحکم مرزا حیدر بیگ۔۔۔۔ نے اپنی خاص نظر عنایت نہ کی ہوتی تو ہم نہ اتنا کامیاب اور دلچسپ جلسہ کرتے اور نہ انجمن کے لیے اتنی بہت سی رقم جمع کرتے۔'' 53

مناظر عاشق ہرگانوی نے ''نیا ادب'' کے ان مدیران کی معاشی مشکلات کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کن حالات میں یہ پرچہ نکلتا رہا۔

''لکھنو میں ہی سردار جعفری، مجاز اور سبط حسن پر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب شام ہو رہی تھی۔ ہم نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ سگریٹ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہمارا نوکر محمد جو ہمارے ساتھ فاقہ کشی کا عادی ہو چکا تھا آج وہ بھی کوئی انتظام نہیں

کرسکا تھا۔وہ عام طور سے ہماری عدم موجودگی میں ''نیا ادب'' کے پرانے پرچے نہ جانے کہاں اور کیسے بیچ آتا تھا اور کھانا پکالیتا تھا۔اگر غلطی سے کوئی شامت مارا سی آئی ڈی کا آدمی چکر لگالیتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔محمد اسی کو پرانے پرچے تھما کر دو تین روپے ضرور وصول کرلیتا تھا۔لیکن آج اتفاق سے سی آئی ڈی والے بھی ہمیں بھول گئے تھے۔'' 54

ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

''نیا ادب اور ''پرچم'' کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔

سبط حسن نے مجھے خط لکھا:

''تمہارا خاندان ماشاءاللہ بہت بڑا ہے اگر ایک ایک روپیہ بھی چندہ جمع کروگی تو ہمارے لیے کافی سرمایہ جمع ہوجائے گا۔''میری بہن رباب جعفری اور میں نے جب خاندان والوں سے چندہ مانگا تو کسی نے خاموشی سے اور کسی نے خوشی کے ساتھ دے دیا.....بہر حال کچھ دن کی کوشش کے بعد تھوڑی سی رقم جمع ہوگئی اور ہم نے وہ بذریعہ منی آرڈر سبط بھائی کو بھیج دی۔وہ بہت خوش ہوئے۔''55

پروفیسر محمد حسن نے اپنے خطبہ صدارت ''سردار جعفری کی وراثت''میں سردار جعفری کے مجموعے ''لکھنو کی پانچ راتیں'' سے ایک واقعہ نقل کیا ہے،ملاحظہ کیجے کہ کن مالی مشکلات سے دوچار لوگوں نے اس رسالہ کو جاری کیا تھا۔

''تینوں دوست (مجاز،سبط حسن اور سردار جعفری) نیا ادب کے سالانہ خریدار بنانے کی مہم پر نکلے۔گھر پر صرف نوکر کو چھوڑ گئے تھے اور تینوں دوستوں کے جیب میں اس روز کھانے کے اخراجات بھی نہ تھے۔جن جن حضرات کے در پہ پہنچے یا تو وہ ملے نہیں یا انہوں نے سالانہ خریداری کا چندہ دینے سے انکار کردیا۔لے دے کے ایک افسر قسم کے دوست اوڑم روڈ کے بنگلے پر ملے۔انہوں نے زرسالانہ ادا کرنے کے لیے سو روپیہ کا نوٹ دیا کہ باقی رقم انھیں واپس کردی جائے۔اب تینوں دوستوں نے باری باری اپنے جیب کی تلاشی لی تو بھی کل ملا کر باقی رقم بھر کے پیسے نہ نکلے۔آخر مجبور ہوکر وہ نوٹ انھیں واپس کیا اور کھوٹی اٹھنی کی مونگ پھلی خرید کر اس سے شغل کرتے ہوئے گھر پہنچے تو نوکر نے اطلاع دی کہ اس نے ردی اخبارات بیچ کر کھانا پکانے کا انتظام کرلیا ہے۔اور یہ اس رسالے کا حال تھا جس نے اُردو دنیا کی صورت بدل ڈالی تھی اور جس سے اردو ادب میں نئے رجحانات کا عمل دخل شروع ہوا تھا''۔56

رسالہ نیا ادب کے شمارے:

رسالہ نیا ادب کے شمارے خاصی بے ترتیبی سے نکلے۔مالی دشواریاں بھی تھیں۔

1942 میں نیا ادب کے صرف ایک یا دو پرچے لکھنو میں شائع ہوتے تھے۔سردار جعفری کی رہائی کے بعد سبط حسن اسے دوبارہ زندہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے کہ سردار کو بمبئی آنا پڑا اور وہ منصوبے وہیں کے وہیں دھرے رہ گئے۔

نیا ادب کا جو خاص نمبر شائع ہوا اس میں 1939 تک کی نظمیں شامل کی گئی تھیں۔رضی عظیم آبادی کی نظم ''نوجوان کی دنیا'' کو بھی شائع کیا گیا۔سبط حسن کی مرتبہ کتاب ''آزادی کی نظمیں'' میں بھی اس کو جگہ دی گئی۔''57

خالد علوی نے غزل کے تعلق سے سردار جعفری کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سردار جعفری..... غزل کی زبان اور ڈکشن میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ سردار جعفری ترقی پسند ادیبوں کے اس گروہ کی امامت کرتے ہیں جو غزل میں بعض تبدیلیوں کا خواہاں ہے لیکن غزل کی گردن مار دینے والوں کا بھی مخالف ہے۔'' 58

''نیا ادب'' میں شائع ہونے والے وہ مضامین جو غزل سے متعلق ہیں اُن کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے۔

''جس طرح ماضی کی روایات کے سلسلہ میں ترقی پسندوں نے کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا اس طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں بنی۔ غزل موضوع بحث رہی اور نیا ادب اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور حمایت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ غزل پر بحث بھی ہو رہی تھی لیکن ترقی پسند غزل بھی کہی جا رہی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں بہترین غزلیں صرف جگر اور حسرت نے ہی نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں نے بھی کہی ہیں جن میں فراق گورکھپوری، مجاز، فیض، جذبی، مجروح بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔'' 59

''نیا ادب'' کی ساکھ متاثر ہونے کے خوف سے ''خیال'' میں نہ لکھنے کے لیے ترقی پسند ادیبوں پر پابندی عائد کی گئی۔

اس سلسلہ میں رفعت سروش نے لکھا ہے:

''اختر الایمان، میراجی، مدھوسودن اور ظ۔ انصاری ان چار ادیبوں کی ادارت میں ایک ماہانہ رسالہ ''خیال'' نکلا۔ خالص ادبی اور معیاری رسالہ۔ ادھر ''نیا ادب'' نکل رہا تھا جس پر کمیونسٹ پارٹی کے نظریات کا غلبہ تھا اور دار و رسن کا بازار گرم تھا۔ جس پرچے کے ایڈیٹر میراجی ہوں اس میں جنسیات زدہ ادب کا نہ چھپنا تعجبات میں سے ہے۔ ''خیال'' ہمہ رنگ ''نیا ادب'' کی ساکھ پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ چناں چہ دار و رسن والے خدائی فوجدار بن کر میداں میں نکل آئے..... صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں حشر برپا ہوا اور سب اپنے اپنے اعمال نامے لے کر حاضر ہو گئے..... صدر صاحب بحیثیت علی سردار جعفری کے شروع ہی میں شعلہ زن ہو گئے اور حسب معمول دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ''خیال'' ترقی پسند نظریات کا حامل نہیں ہے اور کہا کہ کسی بھی ترقی پسند ادب کو خیال میں نہیں لکھنا چاہئے..... اختر الایمان نے نرم لہجہ میں تقریر شروع کی..... کہا..... کیا ادب پر پارٹی ڈسپلن عائد ہوتا ہے یا ہونا چاہئے..... کیوں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور میں بھی کہیں نہیں ہے کہ انجمن کمیونسٹ پارٹی کے مقرر کردہ اصولوں پر چلے گی بلکہ لفظی طور پر اس مفروضے کی نفی کی جاتی رہی ہے۔ یہ ادب کا ذاتی معاملہ ہے کہ وہ کیا سیاسی خیالات رکھتا ہے..... مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ کرسی صدارت کے فیصلہ کے مطابق تمام ہندوستان میں انجمن کی شاخوں کو سرکلر بھیج دیے گئے تھے ''خیال'' کے لیے کوئی نہ لکھے..... اختر نے تو یہ بات محض تفریحاً کہی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ یوں عدالتیں قائم کر کے ادب نہیں پیدا کیا جا سکتا اور ادب اور ادیب پر آسانی سے لیبل لگانا اپنی کور ذوقی کا مظاہرہ ہے۔ ڈنڈے کے زور سے نہ کبھی ادب تخلیق ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اختر الایمان میں غضب کی خود اعتمادی ہے۔ وہ کسی وقت بھی جعفریا نہ پروپگنڈے سے مرعوب نہیں ہوئے اور اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لکھتے رہے اور بیرونی اثرات کے باعث اپنا شعری رویہ نہیں بدلے اور ان کا ادبی مرتبہ وقت کے ساتھ بلند ہوتا گیا۔'' 60

''دارورسن''عنوان سے جارحانہ مضامین کا سلسلہ

ادب کو دیکھنے اور مقصدیت یا ترقی پسند کی سلپ لگانے کا سلسلہ نیا ادب میں ''دارورسن''(انجمن ترقی پسند مصنّفین) کی زمام آتے ہی اس کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے اور آہستہ آہستہ وسیع النظری اور ادبی رواداری میں کمی آنی شروع ہوئی مگر اس کا احساس شروع شروع میں اس لیے نہیں ہوا کہ ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے اور بین الاقوامی تبدیلیوں کا دباؤ بھی انجمن کی کارکردگی پر پڑنا لازمی تھا۔اب ''مقصدیت'' کی سلپ ہر تخلیق کے ماتھے پر چپکائی جانے لگی اور ادبی محاسن کو طاق میں رکھنے کا چلن شروع ہوگیا اور سردار جعفری کی شہرت نے فراٹے بھرنے شروع کیے۔ان کے نثری مضامین ان کے پشت پناہی کا فرض انجام دینے لگے اور انہوں نے فیض کی

''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' والی نظم کو رجعت پرستانہ قرار دیا اور دلیل دی کہ آزادی کے اجالے کو داغ داغ تو مسلم لیگ بھی کہتی ہے اور آر ایس ایس بھی۔چوں کہ یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ تاثر ''عوام'' کا ہے اور نظم واضح نہیں ہے اس لیے ترقی پسند نہیں ہے ....سردار کے ان ''ترقی پسندانہ تجزیوں'' نے ان کے لیے ایک نئی راہ کھول دی اور انہوں نے ادب میں ''دارورسن'' کے عنوان سے جارحانہ مضامین کا ایسا سلسلہ شروع کیا جس میں شعراء کی تخلیقات کا جائزہ لے کر انھیں دارورسن پر چڑھایا جاتا تھا اور سادہ لوح قارئین سے کہا جاتا تھا کہ ان کی شاعری زہرناک ہے .....حیدرآباد میں مخدوم کو چھوڑ کر باقی سب شاعر، پنجاب میں احمد ندیم قاسمی کو بھی نہیں بخشا گیا، بمبئی میں ساغر نظامی کو بھی دار پر کھینچ دیا۔اور سردار کے ان کارناموں کی اتنی واہ واہ ہوئی کہ اس وقت کے نئے شاعروں اور ادیبوں کی عاقبت خراب ہوئی سو ہوئی، اچھے خاصے مقبول شاعر اور ادیب بھی اپنی اپنی روش سے بہک گئے .....ادیبوں اور شاعروں پر عجیب وقت پڑا تھا کہ ان کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں یہ جواب دینا پڑتا تھا کہ ان کی اس تخلیق سے عوام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔مدن پورے کے ایک صاحب تھے عبد الجبار.....ایک جلسے میں میں نے اپنی نظم ''تخلیق'' پڑھی۔چند مصرعوں پر مشتمل یہ نظم سن کر جبار صاحب نے .... کہا یہ شاعر یہ ادیب عوام کو کیا دیتے ہیں۔عوام کو ایسی مہمل شاعری کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ حد یہ ہے کہ ان کی تنقید کے غیر ادبی لہجے سے کیفی اعظمی نے اٹھ کر اختلاف کیا اور کہا کہ جبار صاحب نے ''یہ ادیب، یہ شاعر'' اس انداز سے کہا ہے جیسے یہ کیڑے مکوڑے۔''

لکھنو میں رسالے نیا ادب کے بند ہونے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالقیوم ابدالی نے لکھا ہے:

''جون 1942ء میں پارٹی نے صدر دفتر بمبئی سے اپنا ہفتہ وار اخبار People's War پہلے انگریزی میں پھر گیارہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس کے اُردو ایڈیشن کی ادارت کے لیے سجاد ظہیر کو بمبئی بلایا گیا .....قومی جنگ میں معاونت کے لیے ڈاکٹر محمد اشرف، سردار، سبط حسن، کیفی، علی اشرف، محمد مہدی، ظ۔انصاری اور کلیم اللہ وغیرہ کو بھی بلا یا گیا .....قومی جنگ ایک طرف تو مزدوروں، کسانوں، طلباء اور پارٹی کارکنان، ملک کے اندر جدوجہد کر رہی جمہوری تنظیموں کے ساتھ جنگ کے مختلف محاذوں اور فاشسٹ قوتوں کے خلاف لڑتی ہوئی لال فوج کی تازہ ترین خبریں عوام تک پہونچا رہا تھا

اور دوسری طرف اس نے اُردو صحافت کی زبان اور معیار کو اتنا اونچا اٹھا دیا تھا کہ اس کے نظریاتی مخالفین بھی اسے شوق سے پڑھتے تھے۔ اتنے سارے ادیبوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے اب ترقی پسند ادبی تحریک کا مرکز بھی بمبئی ہی بن گیا''۔ 62

عمر رضا لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا شاعروں اور ادیبوں کے بمبئی آجانے سے لکھنو میں ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں کسی حد تک ماند پڑ گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1942ء میں ''نیا ادب'' کے چند پرچوں کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی بعد ازاں 1943ء میں جب سبط حسن بمبئی آ گئے تو اسے سہ ماہی کی شکل میں بمبئی سے جاری کیا گیا جو اگر چہ بے ترتیبی سے نکلتا رہا لیکن سبط حسن کے ذاتی سلسلے میں امریکہ چلے جانے کے سبب یہ پرچہ بہت جلد بند بھی ہو گیا تھا۔'' 63

لکھنو سے ''نیا ادب'' کے بند ہونے اور دوبارہ بمبئی سے جاری ہونے کے بارے میں یعقوب یاور نے لکھا ہے:

'' 1942 کے نصف آخر میں حالات میں کچھ اس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ بیشتر ترقی پسند ادیب اور شاعر شمالی ہند سے ممبئی منتقل ہونے لگے۔ بمبئی میں انجمن کی شاخ پہلے سے متحرک تھی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ خواجہ احمد عباس انجمن کی بمبئی شاخ کے سکریٹری تھے۔ یہاں آنے والوں میں سردار جعفری سب سے پہلے آئے۔ یہاں انجمن کے زیر اہتمام ہونے والے عمومی جلسوں میں مراٹھی، گجراتی، ہندی اور اُردو زبان کے ادیب و شاعر شرکت کرتے تھے۔ لکھنو سے جاری ہونے والا رسالہ ''نیا ادب'' دو تین شمارے نکلنے کے بعد ہی بند ہو گیا تھا۔ سردار جعفری کے بعد جب سبط حسن بھی بمبئی آ گئے تو اس رسالے کو دوبارہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس بار اسے ماہانہ کے بجائے سہ ماہی رسالے کی شکل دیتے ہوئے اس کا حجم بھی کم کر دیا گیا لیکن اس کے بعد بھی یہ رسالہ پابندی سے شائع نہ ہو سکا'' 64

حصول آزادی کے کچھ عرصہ بعد سردار جعفری نے ''نیا ادب'' کا ضخیم نمبر ''آزادی کی منزلیں'' نکالا۔ اس میں 1947ء تک کے اُردو ادب کا انتخاب تھا۔ اس میں رفعت سروش کی کوئی نظم شامل نہ تھی جس کا انھیں افسوس تھا۔

وہ رقمطراز ہیں۔

''وہ نمبر دیکھ کر مجھے پہلی بار اس امر کا احساس ہوا کہ میں ''بلیک لسٹ'' کر دیا گیا ہوں کیوں کہ اس میں میری کوئی نظم شامل نہیں کی گئی۔ حالاں کہ آزادی کے موضوع پر اور رسائل کے علاوہ خود ''نیا ادب'' میں میری کئی نظمیں شائع ہو چکی تھیں اور میں 1943ء سے ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، شاہکار، نیا دور اور نیا ادب وغیرہ میں مسلسل چھپ رہا تھا۔ اس وقت مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ یہ بات میں زبان پر لاتا کہ اسی نیا ادب کے اداریہ میں مجھے ایک نئی نسل کا نمائندہ کہا جا چکا ہے اور اس کے علاوہ میرے بعد آنے والے کئی شاعروں کی نظمیں اس انتخاب میں شامل تھیں..... آج جب میری کتابوں کے دیباچے لکھتے وقت علی جواد زیدی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر انور صدیقی اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے غیر جانبدار ناقدین نے میری ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا کہ رفعت سروش کو ترقی پسند نقادوں نے نظر انداز کر دیا اور اسے اس کا جائز مقام نہیں دیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ اصل میں وقت سب سے بڑا نقاد ہے۔ 65

مقام

رسالہ نیا ادب نے جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔

نیا ادب میں شائع نظم ملازمت کا باعث بنی۔

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت سے قبل رفعت سروش لکھتے ہیں:

''یہ نوکری (کلرک دفتر مذکورہ) آرام سے چل رہی تھی یعنی ایک مہینہ ہونے والا تھا اور کسی سے جھڑپ نہیں ہوئی تھی۔ 22یا23 دسمبر کو حبیب تنویر سے ملاقات ہوئی۔معلوم ہوا وہ ریڈیو اسٹیشن پر اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازم ہو چکے ہیں اور خاص بات یہ بتائی کہ ''نیا ادب'' میں میری نظم ''مداوا'' پڑھنے کے بعد بخاری صاحب نے میری تعریف کی اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ابھی میں نووارد ہوں'' انہوں نے حبیب سے کہا کہ اس لڑکے کو بلاؤ۔ہمارے دفتر میں بڑے دن کی چھٹیاں تھیں۔ میں غالباً 24 دسمبر 1945 کو حبیب کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گیا ..... بخاری صاحب وہاں آئے اور بغیر کسی تعارف کے مجھ سے بات چیت شروع کردی..... انہوں نے میرے ذہن کو کھنگال ڈالا۔ادبیات حاضرہ پر بات چیت کی شاعری کے بارے میں میرا نقطۂ نظر معلوم کیا۔میرے رہن سہن اور اخلاق وعادات کے بارے میں استفسار کیا۔اور یہ بے قاعدہ انٹرویو لینے کے بعد بولے۔ریڈیو اسٹیشن میں نوکری کروگے .....اگلے دن 26/دسمبر 1945 کو میں ریڈیو اسٹیشن کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔'' 66

رسالہ نیا ادب اور کلیم کے اداریوں کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر محمد انوار الدین رقمطراز ہیں:

''نیا ادب اور کلیم کے اداریے تازہ بتازہ سماجی وسیاسی مسائل اور عصری، ادبی وتخلیقی رجحانات کے گہرے مشاہدے پر مبنی ہوتے تھے .....نیا ادب اور کلیم کے بیشتر اداریوں پر سردار جعفری کے قلم کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔'' 67

بقول ڈاکٹر ریاض احمد ''نیا ادب'' نے ترقی پسند ادب کی ترویج واشاعت میں نمایاں رل ادا کیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک حلقہ اس تحریک کے ساتھ ہوگیا۔'' 68

پروفیسر محمد انوار الدین نے رسائل کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رسائل کے اجراء سے مختلف تحریکات کے فروغ میں بھی مدد ملی۔اُردو میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی تحریکوں کو مقبول بنانے میں ان رسائل کا بڑا حصّہ ہے جو کسی خاص مسلک کی ترجمانی کرتے تھے۔مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں ''نیا ادب'' ادب لطیفہ، شاہراہ، سویرا اور صبا جیسے رسائل نے نمایاں حصہ لیا۔'' 69

ایک دوسرے مضمون میں پروفیسر محمد انوار الدین نے لکھا ہے:

''نیا ادب نے ترقی پسند نظریات کے فروغ میں اہم حصّہ لیا۔اس نے ترقی پسند ادیبوں کی نئی نسل کو ترقی پسند تحریک کے اصول وتقاضوں سے آگاہ کیا اور اس تحریک کے تحت معرض وجود میں آنے والی تخلیق وتنقید کی ترویج واشاعت اور رہنمائی کے فرائض انجام دیے'' .....نیا ادب اور کلیم نے ترقی پسند تحریک کی بھرپور ترجمانی کی اور اس تحریک کے اصول و

نظریات کا موثر دفاع کیا۔اس تحریک پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا اور اس کے بارے میں لوگوں کے ذہنی تحفظات اور شکوک وشبہات دور کرنے کی کوشش کی'' 70

سردار جعفری نیا ادب کے روح رواں تھے۔

سبط حسن نے لکھا ہے:

''نیا ادب'' کی مجلس ادارت میں یوں تو مجاز بھی تھے اور میرا نام بھی شامل تھا مگر پرچے کے روح رواں دراصل سردار جعفری تھے۔انہیں کی لگن اور انتھک محنت سے یہ پرچہ چلتا تھا۔لکھائی چھپائی کا بندوبست، کاغذ کی فراہمی، ادیبوں سے خط و کتابت، آمدنی اور خرچ کا حساب سب کا بوجھ انہی کے کندھوں پر تھا''71

مظہر امام نے لکھا ہے:

''اپریل 1939 سے ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ ترجمان ''نیا ادب'' کے نام سے لکھنو سے شائع ہونے لگا۔اس کے اداریے میں مجاز، سبط حسن اور علی سردار جعفری کا نام تھا لیکن ''نیا ادب'' کا سب سے زیادہ کام سردار ہی کرتے تھے۔ مضامین کی فراہمی، کتابت وطباعت رسالے کا حساب کتاب ایک طرح جعفری ہی کے ذمے تھا''72

پروفیسر محمد انورالدین رقمطراز ہیں:

سبط حسن اور مجاز مجلس ادارت میں شامل ضرور تھے لیکن رسالے کے روح رواں سردار جعفری تھے۔پرچے کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داریاں زیادہ تر انہیں کے سپرد تھیں اور انہوں نے بوجوہ احسن ان ذمہ داریوں کو نبھایا اور اپنے صحافیانہ سلیقے سے اس رسالے کو ترقی پسند تحریک کا علمبردار، ترجمان، شارح، داعی اور نقیب بنادیا۔''73

قومی جنگ (ہفت روزہ)

سردار جعفری لکھنو سے ممبئی بلا لیے گئے اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن بن کر ہفت روزہ قومی جنگ سے وابستہ ہو گئے۔

محمد اجمل خان لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی نے (سردار جعفری) کو ایم اے انگریزی کی تعلیم کو مکمل کرنے کی اجازت نہ دی۔یہ خالی رہ کر اپنے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہو گئے اور مایوسی نے ان کو آگھیرا۔اسی دوران سجاد ظہیر نے ان کی تصنیفی وتالیفی صلاحیتوں کو دیکھ کر مشورہ دیا کہ پارٹی اخبار قومی جنگ کے اُردو ایڈیشن کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔چنانچہ سجاد ظہیر کے مشورے پر سردار جعفری بھی پارٹی کے ممبر بن کر لکھنو سے بمبئی 1943 میں چلے گئے۔سجاد ظہیر بھی ان کے ساتھ تھے۔وہاں سردار جعفری بھی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار قومی جنگ کے عملہ میں شامل ہو گئے''۔ 74

1942 میں سردار جعفری کی جیل سے رہائی، قومی جنگ ہفت روزہ میں کام کرنے کی دعوت بمبئی شفٹ ہونے کے لیے والدین کی رضامندی، اخباری کام اور ساتھیوں کی تفصیلات عمر رضا نے اس طرح دی ہیں:

''14/مارچ 1942 کو وہ (سردار جعفری) غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے تھے..... کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے پابندی ہٹالی گئی تھی اور سجاد ظہیر نے پارٹی کے لیے کھلے بندوں کام کرنا شروع کر دیا تھا..... کمیونسٹ پارٹی کے اس وقت کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی اور سجاد ظہیر نے سردار جعفری کو بمبئی میں کمیونسٹ اخبار ''قومی جنگ'' کے اُردو ایڈیشن میں کام کرنے کا مشورہ دیا تو انھیں اپنا مستقبل تابناک نظر آنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے لیے بہت جلد راضی ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے گھر بلرام پور واپس آئے اور والدین سے سجاد ظہیر کے ساتھ بمبئی جانے کی اجازت مانگی جس کے لیے وہ راضی ہو گئے ۔چند ہی دنوں بعد وہ بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ بقول سردار جعفری:

''1942 میں جب لکھنو یونیورسٹی میں مجھے ایم اے کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی اور مستقبل کا خیال مجھے ستانے لگا تو اس دوران کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی سی جوشی اور سجاد ظہیر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یوں خالی نہ رہوں اور بمبئی میں ایک کمیونسٹ اخبار کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لاؤں۔ چنانچہ سجاد ظہیر اور میں ....نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور اُردو میں پہلا اڈیشن نکالنے کے لیے دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ ترجمہ اور کتابت سے لے کر سڑکوں پر اخبار بیچنے تک کا سارا کام ہم دونوں نے سنبھالا۔ اس اخبار کی اشاعت نے میری صلاحیتوں کو جلا بخشی اور کمیونسٹ پارٹی نے مجھے باقاعدہ اپنا کارڈ ہولڈر بنالیا''۔75

عمر رضا لکھتے ہیں:

''سردار جعفری اب سجاد ظہیر کے ساتھ کمیونسٹ ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' میں صحافتی فرائض انجام دینے لگے جہاں کچھ ہی دنوں بعد رفتہ رفتہ ڈاکٹر اشرف، سبط حسن، اسرار الحق مجاز، کیفی اعظمی، محمد مہدی، ظ۔ انصاری اور کلیم اللہ وغیرہ بھی آ گئے اور یہ پورا گروپ بمبئی کی سڑکوں پر چیخ چیخ کر اخبار بیچتا تھا''۔76

کمیونسٹ پارٹی کے اُردو اخبار میں سردار جعفری کی مصروفیات کے بارے میں سید محمد مہدی نے لکھا ہے:

''کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی سے مختلف زبانوں میں ہفتہ وار رسالے شائع کرنے کے فیصلہ کیا تو اُردو رسالے کے لیے سجاد ظہیر اور سردار جعفری کو بمبئی طلب کیا گیا۔ 1942 میں سردار جعفری پارٹی کے اخبار میں کام کرنے کے لیے بمبئی پہنچ گئے .... یہی تو وہ شہر تھا جس کے ساحل پر کھڑے جہازوں کے فوجی ملاحوں نے انگریزی راج کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرایا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انقلاب اب آیا کہ اب آیا..... میرے پاس ایک ڈائری ہے جس میں کمیونسٹ پارٹی کے اُردو اخبار میں کام کرنے والوں کی یونٹ کی ہر ہفتے میٹنگ کی کاروائی درج ہے۔ یہ 1942 سے 1947 کی طویل مدت پر محیط ہے۔ اگر اس کا سرسری مطالعہ بھی کیجیے تو ہر ہفتے کی روداد اور فیصلوں میں اس قسم کے فیصلے نظر آئیں گے۔ سردار کاغذ کا انتظام کریں گے۔ سردار پروف دوبارہ پڑھیں گے۔ سردار اخبار چھپتے وقت پریس میں موجود رہیں گے، سردار اُردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملیں گے۔ کل کمرے کی صفائی سردار کریں گے۔ پچھلے ہفتے سردار نے کمرے میں جھاڑو نہیں دی۔ یہ غلط بات ہے وغیرہ وغیرہ''۔ 77

قومی جنگ میں سردار جعفری کی ادارتی ذمہ داریوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن نے بتایا ہے:

''اُردو اخبار ''قومی جنگ'' کی ادارتی ذمہ داری سے یوں تو کنور اشرف، سجاد ظہیر بھی وابستہ تھے مگر عملاً سب کچھ سردار جعفری کے سر تھا۔ کیفی اعظمی کے بمبئی جانے تک اس کی نظم ونثر کا بار سردار جعفری ہی پر تھا۔''78

عبداللہ ملک نے قومی جنگ سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سید سجاد ظہیر نے پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے قائد سردار موہن سنگھ جوش سے کہا کہ وہ عبداللہ ملک کو بمبئی میں ہی ''قومی جنگ'' کے ادارتی عملے میں شرکت کی اجازت دے دیں کیوں کہ قومی جنگ کے سب سے زیادہ پڑھنے والے پنجاب میں ہی ہیں اور ہمارے ادارتی عملے میں کوئی پنجاب کی سیاست پر لکھنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر میرے بمبئی میں ٹھہرنے کا فیصلہ ہوا اور سجاد ظہیر نے ہی سبط حسن اور سردار جعفری کو کہا کہ عبداللہ ملک تمہارے ساتھ ہی ٹھہرے گا۔ اس طرح بائکلہ کے اس فلیٹ میں جہاں سردار جعفری اور سبط حسن ٹھہرے تھے میرا بھی زمین پر بستر لگ گیا۔ یہ فلیٹ دراصل شاکر علی کا تھا جو اُس زمانے میں بمبئی کے آرٹس اسکول میں زیر تعلیم تھے..... پھر سبط حسن اور سردار آ گئے۔ اور سب سے آخر میں میں پانچواں شخص تھا..... ہم تین آدمی دن بھر اکٹھے ایک ہی دفتر میں کام کرتے''۔79

قومی جنگ کا دفتر کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں ہی تھا اور وہیں سے ''نیا ادب'' نکلتا تھا۔ سردار جعفری بمبئی آئے تو وہ قومی جنگ سے وابستہ ہو گئے۔

انور ظہیر خاں رقمطراز ہیں:

''1942 میں کمیونسٹ رہنما پی سی جوشی اور ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزار سید سجاد ظہیر کے کہنے پر عرب کے ساگر کے کنارے بمبئی میں قدم دھرتا ہے اپنے ساتھیوں سبط حسن اور سید سجاد ظہیر کے ساتھ کمیونسٹ آرگن قومی جنگ جاری کرتا ہے۔ وہ اخباری عملے کے ساتھ اخبار تیار کرتا ہے، پریس میں چھپواتا ہے۔ مدن پورہ، ناگپاڑہ، جے جے اسپتال اور بھنڈی بازار کے چوراہوں پر ہانک لگا لگا کر بیچتا ہے۔'' 80

رفعت سروش نے بھی لکھا ہے:

قومی جنگ کے ایڈیٹران سردار جعفری اور کیفی اعظمی وغیرہ پھیری والے کی طرح بھنڈی بازار اور دیگر علاقوں میں اپنا اخبار بیچنے میں گریز نہیں کرتے تھے۔ 81

پروفیسر محمد انوار الدین نے بتایا ہے:

''1942 میں علی سردار جعفری کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''قومی جنگ'' سے وابستہ ہو گئے جو بمبئی سے نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید سجاد ظہیر تھے بعد میں اس جریدے کا نام ''نیا زمانہ'' ہو گیا تھا۔82

محمد اسد اللہ لکھتے ہیں:

ان دنوں، سردار بھائی کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے اور پارٹی کے اخبار ''نیا زمانہ'' میں کام کرتے تھے اور اپنے دوست شاکر علی کے ساتھ ایک مختصر سے فلیٹ میں (جو صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا) رہتے تھے۔ یہ جگہ بمبئی کی ایک گنجان اور مصروف گلی میں تھی جہاں بے پناہ شور ہوتا تھا۔ رات کے وقت بھی اس گلی میں ایک خلقت جمع رہتی تھی۔ پرانی اور دقیانوسی

ٹرامیں ادھر سے ادھر گزرتی تھیں۔ان کی رفتار سست ہوتی تھی اور وہ شور بہت کرتی تھیں"۔83

کمیونسٹ اخبار میں سردار جعفری کے کاموں کی تفصیل دیتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں رقمطراز ہیں۔

"یہ 1940 کا سال تھا۔اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے اونچے عہدہ داروں نے انھیں بمبئی بھیج دیا جہاں انہوں نے سید سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر ایک کمیونسٹ اخبار "نیا زمانہ" کے لیے کام کیا۔اس زمانے میں انہوں نے اخبار کے لیے مضامین اور کالم بھی لکھے،اس کی ادارت بھی کی اور بمبئی کی سڑکوں پر خود اخبار فروخت کیے۔یہاں وہ اپنی خدمتوں کے صلے میں کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ کارڈ ہولڈر بنائے گئے"۔84

قومی جنگ سے وابستہ افراد اخبار کا صحافتی معیار، کارکردگی اور مقبولیت کے بارے میں پروفیسر قمر رئیس نے بتایا:

"جب حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھالی اور پارٹی نیز انجمن ترقی پسند مصنّفین کا مرکزی دفتر بمبئی منتقل ہو گیا تو تحریک میں جوش وخروش کی نئی فضا پیدا ہوگئی۔سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" کے مدیر اعلی ہو گئے۔ان کے ساتھ پارٹی کے کئی ذہین کل وقتی یا جز وقتی ممبران بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ان میں سردار جعفری، محمد اشرف، سبط حسن، کیفی اعظمی، سید محمد مہدی، حمید اختر، کلیم اللہ اور ظ۔انصاری کے نام نمایاں تھے۔اسی لیے "قومی جنگ" کا صحافتی معیار بے حد بلند ہو گیا اور کمیونسٹ پارٹی کا پرترجمان دور دور تک دلچسپی سے پڑھا جانے لگا پھر یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار نشستیں پابندی سے ہونی لگیں۔اُن کی تفصیلی روداد انجمن کے سکریٹری حمید اختر لکھتے تھے جو ہفتہ وار "نظام" میں شائع ہوتی تھیں' یہ پرچہ بھی سارے ملک میں پھیلے ہوئے ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں میں پہنچتا تھا۔یہ ہفتہ وار جلسے اپنی سنجیدہ بحث کی وجہ سے دوسری شاخوں کے لیے ایک نمونہ بن گئے تھے۔85

"قومی جنگ" کی اشاعت کے بارے میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

"ہم مضامین لکھتے، کاپیاں جڑواتے، انہیں پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ چکتا تو پوری ادارتی ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر چیخ چیخ کر اخبار بیچتی۔" 86

گفتگو (سہ ماہی رسالہ)

1967ء سے سردار جعفری نے اپنی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ "گفتگو" نکالنا شروع کیا۔یہ رسالہ 11 x 9 سائز پر مشتمل ہوتا تھا۔اس کے ٹائٹل میں لوح پر "ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان" لکھا ہوا ہوتا۔قیمت چھ روپیہ اور سالانہ چندہ بیس روپیہ تھا۔بیرون ہند فیس (مع ڈاک خرچ بذریعہ رجسٹری) 40 شلنگ تھی۔یہ یونیورسل لیتھو پریس، 23/نوروجی اسٹریٹ، بمبئی سے طبع ہوتا تھا۔اس کے مالک، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر علی سردار جعفری۔گفتگو ترقی پسند نظریات کا علمبردار تھا۔

سہ ماہی رسالہ گفتگو کے پہلے شمارہ فبری 1967 کے اداریہ کی ابتداء میں رسالہ کا تعارف کرایا گیا ہے:

"یہ گفتگو کا پہلا شمارہ ہے۔اس میں گفتگو تخلیقی سطح پر ہے۔پرانی سے پرانی صنف رباعی اور غزل، نئی سے نئی صنف اکھڑے اکھڑے لہجے اور کھردری لفظی تصویروں کی آزاد نظمیں، طویل افسانے اور مختصر افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین، سماجی اور سیاسی موضوعات اور محض داخلی سرگوشی، رجائی انداز اور پسپا ہو جانے کی کیفیت غرض سب ایک دوسرے سے مصروف

گفتگو ہیں۔یہ خاموش گفتگواوراق پر سنی جائے گی اور قاری اس میں شریک ہے۔" 87

گفتگو کے آغاز کے زمانے میں جدیدیت اور ترقی پسندی کا حال اوراس نئے رسالے کے رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے محمد حسن نے لکھا ہے:

''سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' کا آغاز ہوا جو خاصہ ضخیم رسالہ تھا اور ہر قسم کے ادبی مال مسالے سے مالامال تھا۔یہی دور جدیدیت کے عروج اور ترقی پسندی پر ان کے بڑھتے ہوئے حملوں کا زمانہ بھی تھا مگر ''گفتگو'' نے خاصہ بین بین کا رویہ اختیار کیا۔''88

علی سردار جعفری نے اپنے رسالے گفتگو میں کچھ جدتیں کی ہیں۔

اس کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر محمد انوارالدین نے لکھا ہے:

''سردار جعفری نے گفتگو میں ایک جدت یہ کی تھی کہ اس میں وہ ''پیش گفتار'' کے مستقل عنوان سے جو اداراتی شذرات لکھا کرتے تھے اس میں بعض وقت وہ اپنی مختصر نظمیں یا دوسرے اہل قلم کی تحریریں بھی شائع کرتے تھے..... سردار جعفری نے گفتگو میں اداراتی صفحے کی روایتی ڈگر اور پارینہ نوعیت کو بھی بدل دیا۔عموماً اداراتی تحریر رسالے کے آغاز میں ہوتی ہے۔سردار جعفری نے اس کو بعض دیگر تحریروں کے بعد رکھا۔اداریہ نثر میں ہوتا ہے سردار جعفری نے اداریہ میں اپنی اور بعض دیگر شعراء کی نظمیں بھی شامل کی ہیں۔''89

گفتگو کے شمارے

گفتگو کے شمارے بڑی بے ترتیبی سے نکلے مثلاً 1967 کے چاروں شمارے باقاعدگی سے یک بعد دیگرے شائع ہوئے لیکن پانچواں (فروری 1968)، چھٹا (مئی 1968)، ساتواں (اگست 1968) اور آٹھواں (نومبر 1968)شمارہ ایک سال کی تاخیر سے جون 1969 میں منظر عام پر آیا تھا کیوں کہ 1968 کے اخیر میں سردار جعفری کے دل میں ہلکی سی تکلیف ہوگئی تھی۔مذکورہ شماروں کے بعد تقریباً چھ سال تک اس کے پرچے نہیں نکلے۔چھ سال بعد 1975 میں مارچ اور جون دونوں کا مشترکہ شمارہ 10'9 ایک ساتھ شائع ہوا۔سردار جعفری کے بقول ''چھ سال کے بعد میرے ایک دوست روشن لال وڈیرا صاحب کی کوششوں سے یہ پرچہ دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔اس کا انتظام انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ادارت کے فرائض میرے سپرد کر دیے ہیں۔اس تقسیم کار کی وجہ سے گفتگو کی اشاعت جاری رکھنے کے سارے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔"90

نویں اور دسویں شمارے کے بعد گیارہواں ،بارہواں، تیرہواں اور چودھواں شمارہ پھر مشترکہ طور پر شائع ہوا جو جون 1976ء میں منظر عام پر آیا جس کے لیے اس کے مینجنگ ایڈیٹر روشن لال وڈیرا کا معذرت نامہ بھی چھپا لیکن اس کی بے ترتیبی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا البتہ اس بار یہ ضرور ہوا کہ اس کے اگلے دو شمارے یعنی پندرھواں اور سولھواں دسمبر 1976 میں مشترکہ طور پر شائع ہوئے۔اس کے چار شمارے، شمارہ نمبر 11 (مارچ 1977)18(جون 1977)19(دسمبر 1977) 20(دسمبر 1977)ایک سال کی تاخیر کے بعد مشترکہ طور پر جنوری 1978 میں منظر عام پر آئے لیکن تاخیر کی معذرت کے

ساتھ اس بات کی یقین دہانی بھی کی گئی کہ ''ہم کوشش کریں گے کہ 1978 سے ''گفتگو'' باقاعدہ وقت پر شائع ہو سکے۔''91

''گفتگو'' کے تین شمارے 21، 22 اور 23 مشترکہ طور پر مارچ 1978 سے ستمبر 1978 تک کے شائع ہوئے۔ اس کے بعد کل چھ شمارے یعنی 24 '25 '26 '27 '28 اور 29 (دسمبر 1978 تا مارچ 1980) مشترکہ طور پر شائع ہوئے جو ''ترقی پسند ادب نمبر (جلد اول) کے طور پر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد اگر چہ کہ یہ رسالہ بند ہو گیا تھا لیکن بارہ سال کے بعد ''گفتگو'' کے معاون مدیر سید احمد شمیم نے اپنی ادارت میں اس کی تجدید کی کوشش کی اور ''ترقی پسند ادب نمبر'' سے مربوط کر کے شمارہ 30 (جون 1992) 31 (ستمبر 1992) اور 32 (دسمبر 1992) مشترکہ طور پر شائع کیا۔ اس ضمن میں سید احمد شمیم نے اداریے میں لکھا ہے: گفتگو کی تجدید اشاعت کا پہلا شمارہ پیش خدمت ہے۔ گفتگو کی اشاعت 1997 میں شروع ہو تی تھی جو شمارہ نمبر 8 (مشترکہ شمارہ نمبر 5 تا 8) کے بعد 1968 میں بند ہو گئی۔ اشاعت کا دوسرا دور 1974 میں روشن وڈیرا صاحب کے تعاون سے شروع ہوا۔ اس دور کا آخری شمارہ ''ترقی پسند ادب نمبر (جلد اول) تھا جو 1980 میں شائع ہوا''92

رسالہ گفتگو (سہ ماہی) کے شمارے

سلسلہ نشان	شمارہ/شمارے نمبر	شمارہ کا ماہ و سال	کب شائع ہوا
1	1	فبروری 1967	فبروری 1967
2	2	مئی 1967	مئی 1967
3	3	اگست 1967	اگست 1967
4	4	نومبر 1967	نومبر 1967
5	5	فبروری 1968	جون 1969
	6	مئی 1968	
	7	اگست 1968	
	8	نومبر 1968	
6	9	مارچ 1975	جون 1965
	10	جون 1975	
7	11	ستمبر 1975	جون 1976
	12	دسمبر 1975	
	13	مارچ 1976	
	14	جون 1976	
8	15	ستمبر 1976	دسمبر 1976
	16	دسمبر 1976	

9	17	مارچ 1977	جنوری 1978
	18	جون 1977	
	19	ستمبر 1977	
	20	دسمبر 1977	
10	21	مارچ 1978	ستمبر 1978
	22	جون 1978	
	23	ستمبر 1978	
11	24	دسمبر 1978	مارچ 1980
	25	مارچ 1979	
	26	جون 1979	
	27	ستمبر 1979	
	28	دسمبر 1979	
	29	مارچ 1980	
12	30	جون 1992	دسمبر 1992
	31	ستمبر 1992	
	32	دسمبر 1992	

رسالہ ''گفتگو'' میں مختلف مکاتیب فکر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کی جانے لگی۔ ''گفتگو'' کے پہلے شمارہ میں سردار جعفری نے ادب میں سماجی ذمہ داری اور اچھے ادب کی تخلیق کو ملک، قوم اور انسانیت کے لیے ناگزیر بتایا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

''اس شمارے میں اتنے سارے اچھے اور بڑے، پرانے اور نئے ادیب ایک ساتھ شامل ہوئے ہیں جو برسوں سے ایک جگہ جمع نہیں ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر ایک نئے اور اہم ناول کے ساتھ آئی ہیں جو گفتگو میں قسط وار شائع ہوگا۔ میں ان احباب کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے خطوں کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ گفتگو کا شمارہ ان کے پاس بھی پہونچے گا اور پھر ایک بار ان کو اس حلقے میں شریک ہونے کی دعوت دے گا۔ گزشتہ دسمبر میں تیرہ سال کے التوا (1953 تا 1966) کے بعد ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مختلف زبانوں کے درجنوں ممتاز ادیبوں نے شرکت کی ..... اس کانفرنس میں پرانی انتہاپسندی اور ادعائیت کا جائزہ لیا گیا۔ کھلے دل سے غلطیوں کا اعتراف کیا گیا اور انجمن کو وسیع تر بنیادوں پر ازسرنو منظم کیا گیا۔ یہ ایسے ہم خیال ادیبوں کی انجمن ہے جو ادب میں سماجی ذمہ داری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا مقصد ایسے اچھے ادب کی تخلیق ہے جو ملک، قوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لیجانے

میں مفید ثابت ہو۔وہ مستقل جنگ کی شیطنت اور انسانی استحصال کی خباثت سے پاک ہو جس میں قوموں کی ترقی اور فرد کی بالیدگی کے سارے امکانات بروئے کار آئیں۔ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ تصور محض ایک آدرش، ایک خواب معلوم ہو لیکن اتنا خوبصورت خواب دیکھنا زندہ رہنا کے لیے ضروری ہے اور بہتر اور حسین تر ادب کی تخلیق کی ضمانت ہے"93

ڈاکٹر عمر رضا نے مذکورہ بالا اداریے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محولہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سردار جعفری کا وہ مصالحانہ عمل جو جولائی 1950 میں ناسک جیل سے رہائی کے بعد شروع ہو گیا تھا جس کا عکس "پتھر کی دیوار" کی نظموں میں کسی حد تک نظر بھی آنے لگا تھا، اب رفتہ رفتہ تقویت حاصل کر رہا تھا۔گفتگو کے ذریعے سردار جعفری نے جس طرح سے تمام مکاتب فکر کے ادیبوں کو متحد کرنے کی کوشش کی اور حالات کے پیش نظر انہوں نے اپنے ادبی نظریے میں قدرے تبدیلی کا تحریری اعتراف کیا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔اب وہ ترقی پسندی کو تحریک کے بجائے "رجحان" کہنے میں عافیت سمجھ رہے ہیں۔اس اداریے کے شروع میں ان کا یہ لکھنا کہ:

"یہ گفتگو کا پہلا شمارہ ہے، اس میں گفتگو تخلیقی سطح پر ہے۔پرانی سے پرانی صنف رباعی اور غزل نئی سے نئی صنف، اکھڑے اکھڑے لہجے اور کھردری لفظی تصویروں کی آزاد نظمیں، طویل افسانے اور مختصر افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین، سماجی اور سیاسی موضوعات اور محض داخلی سرگوشی، رجائی انداز اور پسپا ہو جانے کی کیفیت، غرض سب ایک دوسرے سے مصروف گفتگو ہیں۔"

اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سردار جعفری اب "جدیدیت" سے متاثر ہونے لگے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اداریے کے اختتامی اقتباس میں سردار جعفری کے سابقہ ادبی نظریے کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جس سے ان کی نظریاتی کشمکش کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"94

سہ ماہی رسالہ گفتگو شمارہ مئی/ 1967 (مدیر سردار جعفری) اپنے وقت پر نکلا۔

ابتدا میں ایک صفحہ پر جلی حروف میں حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"گفتگو ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان ہے۔اس میں لکھنے والے وہ ترقی پسند ادیب ہیں جنھوں نے نئی راہوں سے نئی منزلوں کو طرف سفر کیا ہے۔ان پر جدید اُردو ادب کو بجا طور سے ناز ہے اور ان کی تخلیقات دنیا کے بہترین ادب سے آنکھیں ملا سکتی ہیں۔اس میں لکھنے والے وہ بزرگ ادیب ہیں جو اپنے نام کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ پسند نہیں کرتے ہیں۔اُن کی تحریریں اُردو ادب کی آبرو ہیں۔اس میں لکھنے والے وہ جدید تر ادیب ہیں، جو تذبذب، تشکیک اور بے دلی کی نیم تاریک، نیم روشن فضاؤں سے گزر رہے ہیں۔اگر وہ پرانی اقدار سے مایوس ہیں تو یقیناً ان کے دل میں نئی اقدار کی روشنی موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس روشنی کو تلاش کر لیں گے۔اُردو ادب کا مستقبل ان کے وجود سے تابناک ہے۔"

اس شمارہ میں سردار جعفری کا لکھا پیش گفتار شامل ہے۔اس کی ابتداء میں اُردو رسائل کی مالی مشکلات کا ذکر ملتا ہے اس کے بعد گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتلایا کہ یہ رسالہ بھی دیگر اُردو رسائل کی طرح فقیرانہ انداز میں نکلا،

اس میں کام کرنے والے ادب اور زبان کی خدمت کو اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں، گفتگو کا حلقہ احباب ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں پر مشتمل ہے جو قلمی تعاون کر رہے ہیں، گفتگو کے قارئین نے بھی اس رسالے کا خیر مقدم اس انداز سے کیا ہے کہ فقیری میں بھی امیری کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ سردار جعفری نے گفتگو کے ہر قاری سے ایک اور خریدار بنانے کی اپیل بھی کی ہے۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ رسالہ کا معیار بلند ہو اور باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے تو خریداروں کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ سردار جعفری نے پریم چند کے 1936 میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں کہا گیا فقرہ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا'' اس کو مثالوں سے واضح کیا اور کہا کہ انسان کا تخلیق کیا ہوا حسن چاہے وہ دھات اور پتھر سے ہو چاہے رنگوں اور آوازوں سے برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے وہ ارتقا پذیر بھی ہے اور انحطاط پذیر بھی..... انسان طرح طرح کی اختراعات سے حسن کاری کرتا ہے..... انسان اپنے تخئیل اور تصور کی مدد سے اپنی تعمیر و تخلیق کو پہلے سے دیکھ سکتا ہے اور بدل بھی سکتا ہے.... لیکن پریم چند کے اس چھوٹے سے فقرے کی معنویت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے دامن میں کیا کچھ ہے ''..... ''مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں'' کے تحت مرزا جعفری علی خاں اثر کو نفاست، شرافت اور شائستگی کا نمونہ بتلایا، ان کے ادبی اختلافات کو نیک دل اور خلوص پر مبنی بتایا، ترقی پسند تحریک سے انہوں نے شدید اختلاف کیا اور 1940-41 میں نیا ادب کے اوراق پر ان کے اور سجاد ظہیر کے درمیان طویل مباحث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اس آویزش میں کئی معرکے کے مضامین شائع ہوئے، یہ اختلاف صرف ادبی سطح تک تھا اس میں ذاتی تلخی کا دور دور کہیں اثر نہیں تھا، سجاد ظہیر سے اور ہم لوگوں سے مرحوم کے مراسم ہمیشہ خوشگوار رہے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود ترقی پسند شاعری کے بعض حصوں کو سراہتے بھی تھے..... نظم ''نئی دنیا'' کو سلام''.... کی دل کھول کر داد دی.... فیض کی شاعری بھی انھیں بہت پسند تھی۔ شاہد احمد کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ ساقی ہے جو انہوں نے 1930 میں جاری کیا، ساقی کا شمار ان رسالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد میں ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے.... ساقی بک ڈپو نے بھی اُردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ سو کتابیں شائع کیں۔ سردار نے لکھا کہ انہوں نے پہلی بار شاہد لطیف سے 1934 میں ملاقات کی تھی اس شام ان کی ملاقات مجاز اور منٹو سے بھی ہوئی تھی تینوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم تھے اور تینوں بغاوت اور انقلاب کی آگ میں جل رہے تھے..... ہم تینوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم بنائی اور شاہد لطیف نے اس کا نام ''نیا ادب'' تجویز کیا... پانچ چھ برس بعد ..... سبط حسن اور مجاز نے میرے ساتھ لکھنو سے نیا ادب نکالا .... بمبئی کے ترقی پسند ادیب ہم آپس میں پیار بھی کرتے ہیں معاصرانہ چشمکیں بھی رکھتے ہیں، لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن دکھ درد میں ایک ہو جاتے ہیں'' (صفحہ 16,17,18)

اس شمارہ میں سردار جعفری کی تین نظمیں برہنہ فقیر، اب بھی روشن ہیں اور شعور پیش کی گئی ہیں۔ تبصرے عنوان کے تحت سردار جعفری کے وحید اختر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ پتھروں کا مغنی' اور ناصر شہزاد کی نظموں، گیت اور غزلوں کا مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں'' پر تبصرے شامل ہیں۔ پتھروں کا مغنی پر تبصرہ میں سردار جعفری نے وحید اختر کو دانشور قرار دیا ہے انھیں ترقی پسند ادب سے متاثر بتلایا ہے، انہوں نے نظم ''صحرائے سکوت'' کو اس مجموعے کا شاہکار قرار دیا ہے۔ سردار جعفری نے آخر میں

لکھا ہے ''میں اس نئے شاعر کو محبت سے سلام کرتا ہوں''۔ناصر شہزاد کی شاعری کے مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں'' پر سردار جعفری نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ اس مجموعے میں شامل نظموں اور غزلوں سب پر گیتوں کی روح چھائی ہوئی ہے۔گیتوں کی لے اور آہنگ کو نظموں اور غزلوں میں سمویا ہے،نظموں میں کلاسیکی موسیقی میں گائے جانے والے بول،عوامی اور فلمی گیتوں کے ٹکڑے موجود ہیں۔آخر میں انہوں نے بتایا کہ ناصر شہزاد کو خود اپنی شاعری کے سفر میں اس سے زیادہ وسیع اور اس سے زیادہ صلاحیت رکھنے والی زبان کی ضرورت پڑے گی۔

اس شمارہ میں ن.م. راشد کی تین نظمیں،قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' کی دوسری قسط شامل ہے (پہلے شمارہ میں قسط اول دی گئی تھی) خورشید الاسلام کی غزلیں،نظمیں وحید اختر کی تین اور شہریار کی پانچ نظمیں،عصمت،صالحہ عابد حسین،عاتق شاہ خاں،تنویر نیر،کھانڈیکر،واستوفسکی کے افسانے،بیدی،کی چھ کہانیاں،احتشام حسین،نظر صدیقی،رشید حسن خاں،قمر رئیس،علی رضا نقوی،دیوندر اسر،عباس ازل کے مضامین اور کئی غزل گو شعرا کی تخلیقات اور تنقید وتبصرے شامل ہیں۔رسالہ ''گفتگو'' شمارہ 4 (نومبر 1967) پر سہ ماہی جنوری،فروری،مارچ 1968 درج ہوا جس کی تصحیح شمارہ 5 میں کر دی گئی۔اس شمارہ کے پیش گفتار میں سردار جعفری کی مختصر نظم ''ویت نام'' کے بعد مشہور مورخ آرنلڈ ٹوائن بی کے ایک اقتباس ''ہمارا ادب'' کو بطور اداریہ پیش کیا گیا ہے۔

''انعام واکرام'' اور ''یادرفتگان'' عناوین کے تحت سردار جعفری کی تحریریں ہیں۔انعام واکرام عنوان کے تحت سردار جعفری نے فراق گورکھپوری کو سوویت لینڈ نہرو ادبی انعام اور پدم بھوشن انعامات پر مبارک باد دی ہے نیز قرۃ العین حیدر کو ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعہ پت جھڑ کی آواز پر مبارک باد دی گئی۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ناول نویسی میں قرۃ العین حیدر کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے ..... ''آگ کا دریا'' کے بعد ''آخر شب کے ہم سفر'' رسالہ گفتگو میں قسط وار شائع ہوا۔یادرفتگان میں محترمہ نذر سجاد ظہیر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔مشاہیر سے ملاقات عنوان کے تحت اقبال،حکیم اجمل خاں،وحید الدین سلیم،ای ایم فارسٹر،مولانا محمد علی،عنایت اللہ،عظمت اللہ اکبرالہ آبادی وغیرہ پر ادیبوں کے مضامین ہیں۔فراق کی غزل اور فیض کی نظم قرۃ العین حیدر کے ناول آخر شب کے ہم سفر کی چوتھی قسط،کیفی حسن نعیم اور وحید اختر کی ایک ایک نظم،رفیق ذکریا کی تاریخی داستان ''رضیہ سلطانہ'' کی آخری قسط،سکندر علی وجد کی تین غزلیں اور چار نظمیں،اسلوب احمد انصاری کا مضمون احمد ندیم قاسمی اور اُردو افسانہ اور یوندر اسر کا مضمون مرتا ہوا آدمی اور جدیدیت،زہرہ نگاہ کی دو نظمیں ویت نام اور ایک نظم رھوڈیشیا،افسانے اور افسانوں کے تراجم محمد مہدی کا مضمون ''انقلاب روس میں شامل ہونے والے چند ہندوستانی،قمر رئیس کا مضمون جدید ازبکی شاعری،چنگیز احمدوف کا ناول الوداع گلسری (ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر)،جذبی کی پانچ غزلیں،شاذ کی پانچ غزلیں،کمال احمد صدیقی کی ایک رباعی پانچ غزلیں،14 شعرا کی غزلیں اور آخر میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' پر قمر رئیس کا تبصرہ شامل ہے۔یہ رسالہ 398 صفحات پر مشتمل ہے۔

سہ ماہی رسالہ گفتگو کا شمارہ 8,7,6,5 (فروری 1968،مئی 1968،اگست 1968 اور نومبر 1968) مشترکہ طور

پر شائع ہوا۔اس کے مدیر سردار جعفری نے جون 1969 کو ''پیش گفتار'' میں باعث تاخیر عنوان کے تحت لکھا ہے:

''گفتگو کا پیش نظر شمارہ ایک سال سے زیادہ کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔باعثِ تاخیر میری علالت ہے۔میں اسپتال میں تھا کہ میرے معاون ظفر قریشی اپنی اہلیہ کی تشویش ناک علالت کی وجہ سے چھٹی لیکر گھر چلے گئے اور اب تک واپس نہیں آسکے ہیں۔اس لیے 1968 کے چار شمارے ایک شمارے کی شکل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔شمارہ 4 دراصل نومبر / 1967 کا شمارہ تھا جس پر جنوری، فروری، مارچ 1968 کی تاریخ اشاعت درج تھی۔شمارہ 5 فروری 1968 سے نومبر 1968 تک کا شمارہ ہے۔اس پرچے کی نصف ترتیب ظفر قریشی نے کی ہے اور نصف ترتیب اعجاز سیمابی نے۔ذمہ داری بہر حال میری ہے، میں دونوں کا شکر گزار ہوں''95

اس کے بعد سردار جعفری کی غزل نذر غالب شائع ہوتی ہے۔بلراج کومل کا مضمون، ''سردار جعفری کا تحریری بیان'' اس کے بعد سردار جعفری کا مضمون ''سردار جعفری کا دوسرا تحریری بیان'' اس شمارے میں شامل ہیں۔طوالت سے بچنے کی خاطر راقم الحروف ''سردار جعفری کا دوسرا تحریری بیان'' سے ہی اقتباسات پیش کرتا ہے تا کہ سردار جعفری کے جوابات اور ان کا انداز واضح ہو سکے۔

ملاحظہ کیجیے:

''گذشتہ سال 1967 آخر مارچ میں بلراج کومل مجھ سے علی گڑھ میں ملے اور پھر دہلی پہونچ کر انہوں نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔یہ ملاقاتیں بے تکلف اور دوستانہ تھیں لیکن چند ماہ کے بعد ان کا ایک خط شب خون میں شائع ہوا جس میں ان دو ملاقاتوں کے حوالے سے انہوں نے میرے متعلق بعض مہمل اور بے بنیاد باتیں لکھی تھیں۔میرے نزدیک ذاتی گفتگو کے حوالے سے معاندانہ خطوط یا مضامین لکھنا قطعی غیر ادبی رویہ ہے ...جب ان کے نزدیک میں نے ان کے پہلے مقالے مطبوعہ (گفتگو شمارہ 3) کے بنیادی حصوں سے اتفاق کر لیا ہے تو انھیں خوش ہونا چاہئے تھا لیکن وہ خفا ہو گئے اور مہمل ذاتی حملوں کی سطح پر اُتر آئے۔حقیقت یہ ہے کہ بلراج کومل کی طرح کے بعض حضرات نے ترقی پسندی اور اشتراکیت کی مخالفت کو جدیدیت کے پروگرام میں شامل کر لیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس مخالفت کے بغیر جدیدیت کا پرچم بلند نہیں ہو سکتا۔یہ ان کی بنیادی غلطی ہے۔جدیدیت آج کے عہد کا ایک صالح رجحان ہے، جسے بعض غیر صالح عناصر اپنے مقاصد کے لیے ترقی پسندی اور اشتراکیت کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔بلراج کومل کی طرح کے سنجیدہ لوگوں کو اس میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے..... لیکن میں نے اپنی بات یہاں ختم نہیں کی تھی، اس کے آگے چند سطریں اور تھیں جن کے بغیر یہ اقتباس ادھورا رہتا ہے اور میرا مفہوم واضح نہیں ہوتا میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''معنی کی جستجو میں آج کے عہد میں انسانیت کے معنی بھی تلاش کیے جائیں گے اور ان غیر انسانی طاقتوں اور رویوں کو بھی بے نقاب کیا جائے گا جو انسان سے اس کی انسانیت چھین رہے ہیں، فرد اور جماعت کے رشتے بھی تلاش کیے جائیں گے اور اداروں اور تحریکوں کی افادیت اور جبر سے بھی بحث کی جائے گی اور اس بحث میں سامراج کا نام بھی آئے گا، اور اس آدرش اور یقین کا بھی جس کے خالق ہم خود ہوں گے اور جس کے بغیر ہم ایک لمحہ سانس نہیں لے سکتے''

اس عبارت کو حذف کر کے بلراج کومل نے یہ ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ میرے اور ان کے اختلافات فروعی نہیں ہیں بلکہ

بنیادی ہیں.....

لیکن جس چیز پر انہوں نے نظر ثانی نہیں کی ہے وہ ان کا ترقی پسند شاعری کے متعلق معاندانہ رویہ ہے۔ بلراج کومل کے الفاظ یہ ہیں ''اُردو نظم کا ایک قابل ذکر رویہ یہ ہے کہ زندگی کو بحیثیت مجموعی ایک خوشگوار عمل سمجھا جائے گا اور اُسے مزید خوشگوار بنانے کے لیے عملی جدوجہد کی جائے، یہ رویہ طبقاتی جنگ اور پیداواری رشتوں پر مبنی ہے۔ میں اس رویے سے پیدا ہونے والی بیشتر ترقی پسند شاعری کو خط مستقیم کی شاعری قرار دیتا ہوں'' (گفتگو شمارہ 30 صفحہ 167)..... کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں خود بلراج کومل کی شاعری میں زندگی ایک خوشگوار عمل ہے ..... (نظم موسم گل کے اشعار درج کیے گئے ہیں) .... یہ ایک نظم کا آخری ٹکڑا ہے۔ زندگی کتنا خوشگوار عمل ہے۔ یہ بلراج کومل کی ایک مکمل نظم میں دیکھئے (نظم وصال کے اشعار درج کیے گئے ہیں)..... زیادہ بہتر مثال خود بلراج کومل کے یہاں سے دی جا سکتی ہے وہ بھی عملی جدوجہد سے زندگی کو بہتر بنانے کے قائل ہیں چنانچہ انہوں نے ساغر نظامی کی کتاب ''نہرو نامہ'' میں 3/جولائی 1967 کو جو دیباچہ سپرد قلم کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں ''تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری ہے لیکن انسان کی عظیم ترین خواہش بہتر زندگی اور مسرت کی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے مسلسل عمل اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے'' (نہرو نامہ صفحہ 27)

..... طبقاتی کش مکش ترقی پسندوں کی ایجاد یا دریافت نہیں ہے۔ یہ لینن اور مارکس کی بھی دریافت نہیں ہے۔ اُن سے پہلے یورپ کے بورزوا ماہرین معیشت سماج کے اس بنیادی کردار کو دریافت کر چکے تھے۔..... یہ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا احساس فارسی اور اُردو کے عظیم شعرا کو رہا ہے ..... یورپ کی صنعتی ترقی اور صنعتی تنظیم نے طبقاتی کشمکش کے عمل کو تیز کر دیا۔ اور جب یورپ کا سرمایہ ایشائی اور افریقی ملکوں میں بھیجا گیا اور اس کی حفاظت کے لیے فوجیں تیار ہوئیں اور پسماندہ ملک غلام بنائے گئے تو ایک بین الاقوامی سامراج نے جنم لیا جس کے نتیجے کے طور پر طبقاتی کشمکش نے غلام ممالک کی تحریک آزادی کی شکل بھی اختیار کی اور ایک بین الاقوامی تحریک آزادی کا پرچم بلند ہوا جس نے ہندوستان، روس، چین اور اسپین سب کو ایک محاذ پر لا کھڑا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جو سامراجوں کی شکست اور غلام ممالک کی آزادی کا عہد ہے، جاپان سے لے کر امریکہ تک ہر قابل ذکر ادیب اور شاعر نے طبقاتی کشمکش اور طبقاتی جنگ کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ یہی زمانہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ہے ..... علی گڑھ کے سیمنار میں میں موجود نہیں تھا، میرے پاس ڈاکٹر قمر رائیس نے جو رپورٹ ایک خط میں لکھ کر بھیجی اس کا اقتباس ''گفتگو'' شمارہ 3 میں شائع ہوا (پورا خط پیش نظر شمارے میں شامل ہے)۔ اس نے بلراج کومل کو کچھ اتنا بوکھلا دیا کہ ان کا قلم قابو سے باہر ہو گیا بجائے اس کے کہ وہ ڈاکٹر قمر رائیس سے باز پرس کرتے انہوں نے مجھ پر برسنا شروع کیا، گڑے مردے اکھاڑنا شروع کیے کہ 1949 میں میں نے فیض پر کیا اعتراضات کیے تھے..... ان سب باتوں سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رائیس کا بیان غلط ہے اور بلراج کومل نے علی گڑھ کے سیمنار میں فیض کا نام نہیں لیا تھا اور یہ سوال پھر اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے کہ باز پرس قمر رئیس سے کیوں نہیں کی گئی.....'' 20 مئی 1968ء

اس مضمون کے نیچے اعجاز سیمابی کا 7 جنوری 1969 کو لکھا یہ نوٹ درج ہے:

نوٹ: سردار جعفری کا یہ مضمون نوٹس (Notes) کی شکل میں تھا اس کو مکمل کرنے سے پہلے وہ بیمار ہو گئے اور اب میں نے ان کے نوٹس (Notes) کو ان کی اجازت سے مرتب کر دیا ہے۔'' (اعجاز سیمابی ، 7 جنوری 1969۔96)

اس شمارہ میں قرۃ العین حیدر کے ناول آخر شب کے ہم سفر کی پانچویں قسط بھی شامل ہے ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا مضمون ''اُردو زبان میں تلفظ کا مسئلہ'' وحید اختر کا مقالہ آدمی ایک مسئلہ، شمیم حنفی کا مقالہ ادب میں روایت اور بغاوت اور ذکا صدیقی کا مقالہ ترسیل کی ناکامی یا کمزوری بھی شامل ہیں۔ نیز نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامہ وغیرہ بھی موجود ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مارچ / 1968 میں ادب پر منعقدہ دو سیمناروں پر ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کی رپورٹیں شامل ہیں۔ رسالہ گفتگو کا یہ مشترکہ شمارہ 345 صفحات پر مشتمل ہے۔

رسالہ سہ ماہی گفتگو کا شمارہ 5، 10 (مارچ و جون 1975) مشترکہ طور پر شائع ہوا۔ صفحہ 5 پر ایڈیٹر سردار جعفری کی نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' شائع کی گئی ہے جسے انہوں نے 1950ء میں سنٹرل جیل ناسک میں لکھا تھا۔ اس کے بعد پیش گفتار ''گفتگو بند نہ ہو'' کے عنوان سے ابتداء میں سردار جعفری نے گفتگو کے 1969 میں بند ہونے کی وجہ بتائی کہ انھیں 1968 میں دل کی ہلکی سی تکلیف ہو گئی تھی جس کے بعد گفتگو کو جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ چھ سال بعد ان کے دوست روشن لال وڈیرا صاحب کو کوششوں سے یہ پرچہ دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔ پیش گفتار میں سردار جعفری نے اس پرچہ کا ادبی مسلک ترقی پسندی اور صحت منداور باشعور قدروں کی ترجمانی بتایا ہے۔

انہوں نے نئے لکھنے والوں کو گفتگو میں تخلیقات شائع کرنے کی پیشکش بھی کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ''جدیدیت کے نام پر زہر نا کی قنوطیت اور کلبیت کو جو ایک طرح کی انسان دشمنی ہے، کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی..... جدیدیت کا ایک صحت مند رجحان بھی ہے جسے میں ترقی پسندی کی توسیع کہتا ہوں اور وہ ہمارے ساتھ ہے اور اس میں بہت اچھے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔97

کالم ''یادرفتگان: یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں'' میں وفات ہو جانے والوں کا دل کی گہرائیوں ں سے تعارف کروایا ہے۔ سجاد ظہیر کو تحریک کے بانی اور میر کارواں کہا، مخدوم کی شاعری کو بیک وقت شمشیر ساز اور جام کا امتزاج قرار دیا، احتشام حسین کو روشن خیال نقاد، پروفیسر اعجاز حسین کو معتبر وقائع نگار اور تحریک کے سرپرست کا درجہ دیا اور ان سب کے تخلیقی کاموں کو نئی طاقت بتایا ہے فرقت کاکوروی، روش صدیقی اور شمیم کرہانی ترقی پسند تحریک سے براہ راست وابستہ نہیں تھے لیکن سردار جعفری نے ان تینوں کو اپنی تخلیقات اور زندگی میں ترقی پسند قرار دیا ہے۔ فرقت کاکوروی کے بارے میں سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے اپنے طنز و مزاح کے نشتروں سے سماج کی بہت سی دکھتی رگوں کو چھیڑا اور دکھ درد سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے سامعین اور قارئیں کو ہنسے ہنسانے کا موقع دیا۔ روش صدیقی کے بارے میں لکھا کہ وہ اپنی شاعری میں کبھی کبھی سیاست کو بھی رومانی جھروکوں سے داخل کر لیتے تھے اور شمیم کرہانی نے اپنے عہد کی سیاست اور مسائل کی ترجمانی کی اور شاعری سے تحریک آزادی میں پورا حصہ لیا۔ مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ان کی ذات پر پاکستان کی طرح ہندوستان کو بھی ناز تھا، مغلیہ دور کے معمار استاد احمد نے دہلی کے لال قلعہ اور آگرہ کے تاج محل کا ڈیزائن شاہجہاں کے لیے

بنائے تھے اور عبد الرحمٰن چغتائی اس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔سردار جعفری نے انھیں محبت، دوستی اور امن کا نشان قرار دیا ہے اور ہندوستان کے دوستوں پر ان کے خطوط اور مہربانیوں کی ستائش کی ہے ملکہ غزل بیگم اختر کے بارے میں لکھا کہ خیال، ٹھمری اور دادرے خوب گاتی تھیں انہوں نے بیگم اختر کی صورت اور سیرت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ خوبصورت ،مہذب اور خوش اخلاق تھیں اور انھیں سن کر روح کو نئی لذت محسوس ہوتی تھی۔ درگا پرشاد دھر کے تعلق سے 12 جون 1975 کو لکھا کہ وہ ان کے ساتھ طالب علمی کے زمانے میں آزادی کی تحریک میں شریک تھے سردار جعفری نے انھیں خوش گفتار شیریں بیاں اور ملی جلی ہندوستانی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ بتلایا ہے۔

اس شمارے میں سردار جعفری کا ایک طویل مضمون شاعر پابلو نرودا پر بھی ہے جسمیں انہوں نے پابلو نرودا کو اپنے سے بڑا شاعر بتلایا ہے اسکی شخصیت اور شاعری کو دلنواز بتلایا ۔اسے بین الاقوامی امن انعام،لینن انعام اور پھر نوبل انعام دیا گیا۔سردار جعفری نے پابلو نرودا کی شاعری پر اظہار خیال بھی کیا اور اپنی نظم پابلو نرودا بھی درج کی ہے۔

سردار جعفری کا ایک مضمون ''اقبال کا تصور وقت'' بھی اس شمارے کی زینت بنا ہے یہ دراصل ایک تقریر تھی جسے سردار جعفری نے داؤد بھائی فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ میں یکم دسمبر 1974 کو کی تھی جس کی صدارت سید عالم خوندمیری نے کی تھی۔تقریر کی ابتداء میں سردار جعفری نے بتایا کہ تصور وقت فلسفے اور سائنس کا مسئلہ ہے جسے اقبال نے شعر کے سانچے میں ڈھال کر جمالیاتی رنگ دے دیا ہے اور نہایت خوب صورت اشعار کی تخلیق کی ہے۔وہ وقت کا ایک نیا اور حسین احساس پیدا کر کے بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کو زندگی کی پیچیدہ راہوں پر خود اعتمادی سے چلنے کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔98

سردار جعفری نے 1975 اپنے ایک اداریہ میں ایسے ادب کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا جو عوام کے لیے لکھے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدیدیت پر تنقید کے ساتھ اس کے صحت مند اقدار کو قبول کرنے کی بھی بات کہی تھی۔

وہ رقمطراز ہیں:

''گفتگو کا ادبی مسلک ترقی پسندی اور صحت منداور باشعور قدروں کی ترجمانی ہے....بدقسمتی سے اس وقت اُردو میں وسیع پیمانے پر ایک ایسا رجحان پایا جاتا ہے جس کے پرچم پر اس قسم کے مہمل نعرے لکھے ہوئے ہیں کہ بکھر گیا ہوں، میں ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں میں کھو گیا ہوں، کوئی مجھے تلاش کرے، میں اندھیرے کی گرفت میں ہوں کوئی مجھے نکالے میں بے چہرہ ہوں، سب انسان بے چہرہ ہیں تمام نظریے مر چکے ہیں سب آدرش دم توڑ چکے ہیں۔الفاظ بے معنی ہو گئے ہیں۔انسان بے بس ہے، انسان مجبور ہے۔اس رجحان کے ادیبوں کے پاس کئی رسالے ہیں۔ان کی مطبوعات آتی رہتی ہیں جلسے اور سمینار ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنے رجحان کو تحریک کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں (تو کیا اسے سازش سمجھا جائے؟) ان کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ترقی پسند ادب اور تحریک ہے جس نے گذشتہ چالیس سال میں اُردو ادب کے دامن کو بہترین تخلیقات سے بھر دیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔اس لیے جدیدیوں کے انحطاطی اور رجعت پرست حلقے ترقی پسند ادب اور ادیبوں کو ختم کرنے پر آمادہ ہیں (جدیدیت کا ایک صحت مند رجحان بھی ہے جسے میں ترقی پسندی کی توسیع کہتا ہوں، اور وہ ہمارے ساتھ ہے اور اس میں بہت اچھے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں.....باقر مہدی جھوٹ کا پرچار کر رہے ہیں کہ ترقی پسند ادیب حکومت اور

اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ بک گئے ہیں ..... خاص طور سے کرشن چندر، کیفی، اعظمی، جانثار اختر، سردار جعفری وغیرہ کے کردار اور شخصیتوں کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ سجاد ظہیر کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس لیے ان کی یاد کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ باقر مہدی سے چار قدم آگے بڑھ کر وارث علوی نے بہیمانہ تشدد Brakfore کے استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے .... یہ جدیدیت کے داخلی انسان کا نیا بہیمانہ روپ ہے۔ لیکن ہماری طاقت ہمارے عوام ہیں جن کے لیے ہم لکھتے ہیں اور جن سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں۔"99

سردار جعفری کے مذکورہ بالا اداریے کا پس منظر اور ان کے اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمر رضا قمطراز ہیں:

"محض آٹھ پرچوں (دسمبر 1968 میں شمارہ 8,7,6,5 ایک ساتھ شائع ہوئے تھے۔ ان کے نکلنے کے بعد "گفتگو" کی اشاعت بند ہوگئی تھی تقریباً چھ سال کے بعد 1975 میں مارچ اور جون دونوں کا شمارہ 9 اور 10 ایک ساتھ شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "جدیدیت" کی لہر اپنے عروج پر تھی لیکن اب اس کا زوال بھی شروع ہوگیا تھا۔ جن ادیبوں نے فیشن کے طور پر ادب میں ابہام اور علامتوں کا استعمال کرنا شروع کیا تھا اس سے قاری اور ادیب کے درمیان ایک ترسیلی خلا پیدا ہوا رہا تھا جس سے ان میں بیزاری بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ ان حالات میں سردار جعفری نے اس زمانے میں جدیدیت پر کھل کر تنقید کی تھی .... مذکورہ بالا اقتباس سے سردار جعفری کی وہ نظریاتی کشمکش جو 1960 اور اس کے بعد کچھ عرصے تک نظر آتی ہے جس کے دھندلکے میں انھیں کسی خاص نتیجے تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا، اب واضح ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ سردار جعفری اب ترقی پسند کی ادعائیت اور انتہاپسندی سے برگشتہ نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی جدیدیت کی قنوطیت، مایوسی، اعصاب زدگی، اکتاہٹ، احساس شکستگی اور اقدار کی بے قدری سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان دونوں رویوں کے برعکس اب وہ ایک اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں جہاں ادب کا رشتہ سماجی سروکار سے بہرحال برقرار ہے کیوں کہ ادب کا منصب وہم وگمان سے شعور ویقین کی طرف، حبّ ذات سے حبّ بشر کی طرف اور جمود سے حرکت وعمل وجہاد کی طرف لے جانا ہے۔ اچھا ادب وہ ہے جو ملک و قوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لے جائے۔"100

گفتگو کا شمارہ 11 اور 14 (ستمبر 1975 تا جون 1976) مشترکہ شمارہ ہے۔ اس شمارے سے رسالے کی قیمت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ فی شمارہ چھ روپیہ سے بڑھا کر آٹھ روپیہ اور سالانہ چندہ تیس روپیہ کیا گیا ہے۔ مجلس ادارت میں میں سید احمد شمیم کا نام شامل کیا گیا ہے۔ پیش گفتار سے پہلے مجروح سلطان پوری کی دو غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ پیش گفتار کے تحت جوش کا ایک شعر اور جارج لیوکاش کا اقتباس بعنوان اندھیرے سے اجالے تک درج کیا گیا ہے، ن۔م۔ راشد کی وفات پر سردار جعفری کے تاثرات شامل ہیں۔ اس شمارہ میں گوشہ اقبال کے تحت سردار جعفری کا مقالہ، اقبال اور فرنگی اور سردار جعفری کی دو غزلیں 18/اپریل 1979 کو دہلی کے غالب اکیڈمی میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس اور مذاکرہ ہوا تھا جس میں عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، آنند نرائن ملا، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، پروفیسر محمد حسن، غلام ربانی تاباں، کوثر چاندپوری، کشمیری لال ذاکر وغیرہ کے علاوہ علی سردار جعفری بھی موجود تھے ..... علی سردار جعفری کو صدر، قمر

رئیس کو جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔اس اجلاس میں سردار جعفری نے تنظیم میں شامل اور تنظیم کے باہر کے ادیبوں کی تخلیقات میں ترقی پسند اقدار پر زور اور آزادی کے قبل تحریک کے مقاصد اور موجودہ حالات میں ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کرنے والی دوسری انجمنوں سے الحاق کے سلسلہ میں تجاویز پیش کی تھیں:

''تنظیم میں شامل ہونے والے ادیب وہی تھے جو اس مینی فیسٹو سے اتفاق رکھتے تھے لیکن تنظیم کے باہر بھی بہت سے ادیب اپنی تخلیقات میں ترقی پسند اقدار پر زور دے رہے تھے ..... آزادی کے قبل ہمارے سامنے کچھ واضح اور قومی مقاصد تھے جن کی وجہ سے ادیبوں کے اتحاد تنظیم میں آسانی ہوئی۔انہوں نے آج کے حالات میں تنظیم کی ضرورت اور اس کے نام کے بارے میں اظہار خیال کی دعوت دی۔سردار جعفری نے کہا کہ اگر کل ہند تنظیم اسی نام سے بنائی جائے تو ایسی دوسری انجمنوں کو اس سے الحاق کی اجازت دی جاسکتی ہے جو کسی دوسرے نام سے ہیں لیکن ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہیں''101

رسالہ گفتگو (سہ ماہی) کا شمارہ 15 ر ستمبر 1976 شمارہ 16 دسمبر 1976 دونوں مشترکہ طور پر دسمبر 1976 میں شائع ہوئے۔ٹائٹل پر ایڈیٹر سردار جعفری، معاون ایڈیٹر سید احمد شمیم مینجنگ ایڈیٹر روشن لال وڈیرہ کے نام دے گئے ہیں۔پیش گفتار میں سردار جعفری نے عصمت چغتائی کے پاکستان میں استقبال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہندوستان اور پاکستان ایک برصغیر کے دو ملک ہیں، ایک درخت کی دو شاخیں ہیں، ایک درخت کے دو پھول ہیں، ایک خوب صورت چہرے کی دو آنکھیں ہیں۔ایک دریا کی دو موجیں ہیں۔ہماری باہمی محبت بے شمار تشبیہیں اور استعارے تراش سکتی ہے اس لیے پاکستان میں عصمت چغتائی کا شاندار استقبال ہمارے لیے حیرت کا باعث نہیں ہے صرف مسرت کا باعث ہے ..... یہ مظاہرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام اور دانش ور ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں بشرطیکہ اس کے مورقع فراہم کیے جائیں۔ہمارے دونوں ملکوں کے ادیب اور دانشور محبت کے سفیر اس۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ پاکستان جائیں اور نفرت کی ان جھوٹی دیواروں کو گرا دیں جو سیاست نے کھڑی کر رکھی ہیں۔102

سردار جعفری نے جاں نثار اختر پر تعارفی ٹوٹ بھی لکھا ہے۔اس میں انہوں نے لکھا ہے: ''میں نے 43 سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جاں نثار اختر سے پہلے ملاقات میں جو شعر سنا تھا وہ یکا یک یاد آ گیا''۔ ؎

ہم ہی گلشن میں نہ آئے لوٹ کر
موسم گل بار بار آتا رہا

ہم ان کے ہمعصر اپنے عہد سے بہت زیادہ قریب ہیں۔اس لیے ہم اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ جاں نثار کا اُردو شاعروں میں کیا مقام ہوگا۔اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ہم صرف یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ جاں نثار کی شاعری خوبصورت ہے، مقبول ہے اور ہر دلعزیز ہے اور یہ شاعری زندہ رہے گی۔''103

اس شمارہ میں عصمت چغتائی کا جیلانی بانو کی ناول ایوان غزل پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔اس میں عصمت چغتائی نے خواتین مصنّفین کو مشورہ بھی دیا ہے۔

لکھتی ہیں:

''خواتین مصنّفین کی ایک مصیبت ہے۔وہ گھر میں بیٹھ کر لکھتی ہیں۔مردوں کوتو کچھ زیادہ زندگی سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے۔وہ باہر کی دنیا میں گھومتے ہیں۔میں خود گھر کی چار دیواری میں لکھنے کی عادی رہی۔بہت آگے بڑھی تو فلم کی دنیا میں پہونچ گئی یا آیاؤں، برتن کپڑا دھونے والیوں تک رسائی ہوگئی۔دنیا کہاں پہونچ گئی ہے۔ہم وہیں بیٹھے گھٹ رہے ہیں۔ کم سے کم وہ جن میں ابھی دم خم ہے، کارخانوں اور کھیتوں میں جائیں۔وہاں کیا ہورہا ہے۔انسان کیا سوچ رہا ہے۔مزدور عورت کیا اور کیوں سوچتی ہے۔کسان عورت کے دل میں کیا ہے۔اس پر کیا گزرتی ہے اور کیسے گزرتی ہے۔''104

اس شمارہ میں گوشہ اقبال پر چار مضامین ہیں۔وامق جونپوری کی آٹھ غزلیں،ایک ڈرامہ جس کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔ڈاکٹر وارث کرمانی کا سفر روس،تاجیک شعرا کا انتخاب،افسانے،نظمیں غزلیں اور تبصرے شامل ہیں۔

رسالہ گفتگو کا شمارہ 17 اور 20 (مارچ 1977 تا دسمبر 1977) مشترکہ شمارہ ہے پروفیسر محمد انورالدین نے لکھا ہے''یہ شمارہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں پیش گفتار کے تحت سردار جعفری نے جشن اقبال کی مکمل روداد سپرد قلم کی ہے۔وہ کل ہند صد سالہ جشن اقبال کمیٹی کے سکریٹری تھے۔جشن کی تیاریوں میں اس قدر مصروف تھے کہ گفتگو کی ادارت کے لیے وقت نہ نکال سکے جس کی وجہ سے پرچے کی اشاعت میں سال بھر کی تاخیر ہوئی۔جشن کے سلسلہ میں وزارت اطلاعات ونشریات کے شعبے فلمز ڈویژن کے تحت سردار جعفری نے اقبال کی زندگی،شاعری اور فلسفے پر ایک رنگین دستاویزی فلم تیار کی۔ پیش گفتار میں سردار جعفری نے نہایت دلچسپ انداز میں اقبال کے سلسلے کی تمام تقریبات کی روداد قلمبند کی ہے جو ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔اس شمارے میں انہوں نے کرشن چندر کی وفات پر نہایت پر اثر تعزیتی نوٹ بھی لکھا ہے''۔105

پیش گفتار کا ابتدائی حصّہ جس میں رسالہ کی اشاعت میں تاخیر کی وجوہات اور معذرت ہے،ملاحظہ کیجئے''گفتگو سال بھر کی تاخیر سے شائع ہورہا ہے اور وہ بھی چار اشاعتوں کی جگہ ایک اشاعت کی شکل میں۔ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ باعث تاخیر کچھ مالی اور کچھ انتظامی مشکلات تھیں لیکن سب سے بڑا سبب ہمارے ایڈیٹر سردار جعفری کی مصروفیت تھی۔وہ کل ہند صد سالہ جشن اقبال کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جشن اقبال کی تیاریوں میں اتنے مصروف تھے کہ گفتگو کی ادارت کے لیے وقت نہ نکال سکے۔سال بھر میں چھ سات ماہ وہ بمبئی سے باہر رہے۔ان کا ایک قدم بمبئی میں رہتا تھا اور ایک قدم دہلی میں۔ہمیں مسرت ہے کہ جشن اقبال کامیاب طریقے سے منعقد ہوا۔اس مقصد کے لیے گفتگو کی اشاعت میں تاخیر ایک معمولی سی قربانی ہے۔ہم کوشش کریں گے کہ 1978 سے گفتگو باقاعدہ وقت پر شائع ہوسکے۔'' 106

کرشن چندر کی وفات پر سردار جعفری کے قلم سے لکھا ہوا تعزیتی نوٹ میں کرشن چندر کے کارناموں کا ذکر کیا گیا اور ساتھ ہی اردو حلقوں نے اُردو کے اس عظیم فن کار کے انتقال پر جو آنسو بہائے اور سوگ منایا اسے ناکافی قرار دیا گیا ہے اور اُردو حلقے کے اس رویے پر بے باک تنقید کی گئی ہے۔

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''لیکن اُردو والوں نے جس طرح کرشن چندر کا سوگ منایا وہ ہمارے لئے افسوس ناک ہے اور اُردو حلقے کی بے حسی کا

ثبوت ہے۔اس کے جنازے میں سو سے زیادہ آدمی شریک نہ ہوئے ۔تعزیتی جلسے میں مشکل سے ڈیڑھ سو آدمی رہے ہوں گے۔انتقال کے بعد سے اب تک جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں محبت اور خلوص کا اظہار ہے،لیکن لکھنے والوں کے خون جگر شامل نہیں اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور اس لیے ان میں کرشن کی تمام تصانیف کے مطالعے کی روشنی نہیں ملتی۔''107

پیش گفتار میں 1977 میں منائی گئی علامہ اقبال کی صد سالہ جشن ولادت کی روداد ہے جسے سردار جعفری نے لکھا ہے۔ اس جشن کے اہتمام میں سردار جعفری کا رول اور جشن کی کامیابی کا اندازہ اس روداد سے لگایا جا سکتا ہے۔گفتگو کا شمارہ 21 تا 23 (مارچ 1978 تا ستمبر 1978) کا مشترکہ شمارہ ہے کپل شرما نے لکھا ہے:''اس شمارے کے پیش گفتار میں سب سے پہلے ''سما و گلشن لاہور سے چمن بر و دوش'' کے عنوان سے سردار جعفری نے فیض احمد فیض کے ہندوستانی کے سفر اور ان کے خیر مقدم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے عہد کے ادبا و شعراء کی عزت و احترام کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے:

''یہ محبت خلوص اور احترام دراصل اس عہد کے مجاہد شاعروں اور ادیبوں کا مقدر رہے جو آج تک اپنے رنگ و نکہت سے پورے عہد کے دل و جان کو سرشار کر رہے ہیں۔انہوں نے اپنے فن کا رشتہ ایک اعلی اور بلند تر نصب العین کے ساتھ جوڑا اور عوامی دلوں کی دھڑکنوں سے اپنا آہنگ حاصل کیا اور اس عہد کی آرزوؤں اور تمناؤں کو خوبصورت لفظوں میں مجسم کر دیا۔ظلم و ستم ،افلاس،غلامی،اور طبقاتی جبر کے اندھیرے میں اس ستارے سے روشنی حاصل کی جیسے انسان کہتے ہیں۔وہ کسی منزل پر کسی موڑ پر انسان سے مایوس نہیں ہوئے اور کسی لمحے میں انسان کو ذلیل و رسوا نہیں کیا۔اس کی توہین نہیں کی۔اس کو حقیر اور بے معنی نہیں سمجھا۔''108

''پیش گفتار کے ساتھ سردار جعفری نے ''ہدیۂ تہنیت'' کے عنوان سے اقبال کی نظم کے ساتھ اقبال ہی کی طرز اور زمین پر اپنی نظم ''اے بانکے افغان'' کو پیش کیا ہے اور اُردو کے مشہور نقاد اور شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی وفات پر اظہار افسوس کیا ہے۔پیش نظر شمارے میں علی سردار جعفری نے ڈاکٹر محمد اقبال کی زندگی،شاعری اور فلسفے پر بنائی گئی تیس منٹ کی رنگین دستاویزی فلم کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔اس منظر نامے میں یہ اطلاع بھی شامل ہے کہ فروری 1978 کے پہلے ہفتہ میں حکومت ہند کے وزیر خارجہ شری اٹل بہاری واجپئی نے اس فلم کا پہلا پرنٹ حکومت پاکستان کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔''109

گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر

گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر مارچ 1980 میں شائع ہوا۔گفتگو کے چھ شمارے 24 تا 29 (دسمبر 1978 تا مارچ 1980) مشترکہ طور پر ترقی پسند ادب نمبر جلد اول کے طور پر شائع ہوئے۔

اس شمارے کے بارے میں عمر رضا نے لکھا ہے:

''1980 میں گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر (جلد اول) منظر عام پر آیا وہ اگر چہ 597 صفحات پر مشتمل ہے لیکن سردار جعفری نے اس کی ضخامت آٹھ سو صفحات متعین کی تھی یہ اور اسی طرح کی دیگر باتوں کا سردار جعفری کے اس خط سے پتہ

چلتا ہے جسے انہوں نے خورشید سمیع کے نام 31 جولائی 1979 کو گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں لکھا تھا۔یہ خط ماہنامہ شاعر (بمبئی) کے 1993 (..... شمارہ 11) میں شائع ہوا ہے۔اس سے سردار کے ادبی وفکری رویوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے..... اپنے خط میں جعفری صاحب نے نمبر کے جن مضامین کا ذکر کیا ہے وہ ترقی پسند ادب نمبر (جلد اول) میں شامل نہیں ہیں اور جلد دوم طبع نہیں ہوئی''110

عمر رضا نے مذکورہ خط کے اہم اقتباسات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خط سردار جعفری جیسے شاعر اور دانشور کے فکری رویوں کی غمازی کرتا ہے اور جس سے 1980 کے آخر میں ان کی ادبی وفکری سطح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خط کے اہم اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

''آپ کا مضمون جس سیکشن میں شامل کیا جا رہا ہے اس میں ایک مضمون اصغر علی انجینئر کا ہے ''لوکاچ اور جدیدیت'' اچھا مضمون ہے۔ایک مضمون ڈاکٹر محمد حسن کا ہوگا اس کا عنوان ہے'' مارکسی تنقید'' وہ ابھی موصول نہیں ہوا ہے۔تیسرا مضمون میں لکھ رہا ہوں، ٹی ایس ایلیٹ، کولنگ ورلڈ اور اقبال'' اس میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے خطوط بہت واضح ہوں گے .....ہمارے یہاں ایک کنفیوژن ہے۔جدّت پسندی اور جدیدیت کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔حالاں کہ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔جدیدیت منفی رجحان ہے جو حقیقت کو جامد سمجھنے پر مجبور ہے اور جدّت پسندی مثبت رجحان ہے جس میں حقیقت، فعال اور متحرک ہے .....جدیدیت اور ترقی پسند تخلیقات کا اصل فرق تنقیدی مباحث میں ظاہر نہیں ہوتا، تخلیقات کے تقابلی مطالعے میں ظاہر ہوتا ہے۔1945 میں روسی ادیبوں کی کانفرنس کے وقت وہاں کے ایک میگزین Erocodite میں ایک دلچسپ کارٹون چھپا تھا۔میز کے ایک طرف طالسطائی، پشکن، چیخوف، گورکی وغیرہ بیٹھے ہیں اور دوسری طرف سامنے نئے ادیب کھڑے ہیں۔اس کے نیچے کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ زبانی امتحان میں تو آپ بہت کامیاب ہیں۔اب ذرا اپنی کتابیں پیش کیجئے اور وہ سب اپنی کتابیں پشت کے پیچھے چھپائے کھڑے ہیں۔یہی حال جدیدیت کا ہے۔میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ترقی پسند تحریک کی از سر نو دریافت اور بازدید ضروری ہے۔ترقی پسند ادب نمبر میں اس کی کوشش کی جائے گی..... جدیدیت کی انفرادیت پسندی معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اور ذات کے نہاں خانے کو شعور کا زنداں بنا دیتی ہے۔وہ لوگ جو اپنی تخلیقی صلاحیت کی آنچ سے اس زنداں کی سلاخوں کو پگھلا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان کو جدیدیت قابل ملامت سمجھتی ہے اور اپنے قبیلے میں شامل کرنے سے انکار کرتی ہے.....پروپگنڈے اور ادب میں وہی فرق ہوتا ہے جو پیٹر کی پتی اور پھول کی پنکھڑی میں ہوتا ہے۔پھول کی پنکھڑی نباتات کے علم کے اعتبار سے پتی ہوتی ہے لیکن اپنے مخصوص حسن و رنگ اور نکہت کے ساتھ۔آل احمد سرور نے کہیں اپنے انداز سے لکھا ہے کہ ہر ادب پروپگنڈہ ہوتا ہے لیکن ہر پروپگنڈہ ادب نہیں ہے۔اس معاملے میں قاری اور ناقد کے عقیدے کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔وہ جس عقیدے کا حامی ہوتا ہے اس میں اس کو پروپگنڈہ نظر نہیں آتا۔دوسرا عقیدہ پروپگنڈہ معلوم ہوتا ہے''111

بقول رفیعہ شبنم عابدی گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر کافی مقبول ہوا۔112

پروفیسر محمد انور الدین نے رسالہ گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر کو مواد اور معیار کے اعتبار سے سردار جعفری کی صحافیانہ

صلاحیتوں کا شاہ کار کہا ہے۔113

گفتگو کا ترقی پسند ادیب نمبر (جلد وال) چھ شماروں، شمارہ 24 تا 29 دسمبر 1978 تا مارچ 1980 کا مشترکہ شمارہ ہے۔ 597 صفحات پر مشتمل یہ ایک ضخیم رسالہ ہے جسے کتابی شکل دی گئی ہے۔اس کے مدیر اعلیٰ علی سردار جعفری ہیں۔مجلس ادارت میں ڈاکٹر قمر رئیس ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر عتیق اللہ شامل ہیں۔معاون مدیر سید احمد شمیم، منیجنگ ایڈیٹر روشن لال وڈیرا ہیں۔تقسیم کار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ہے۔اس شمارہ کی قیمت پچاس روپیہ مقرر کی گئی ہے۔

اس شمارے میں پیش گفتار کے سلسلہ میں سردار جعفری کا لکھا دیباچہ اور مضمون تخلیق کی نئی سمت ہے۔سجاد ظہیر کی شخصیت پر ان کا مضمون رقص شرر بھی اس میں شامل ہے۔ان کے علاوہ ان کے خطوط سلطانہ کے نام اور چھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ادبی دستاویز میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ 1936 پریم چند کا خطبہ صدارت ادب کی غرض و غایت، ٹیگور کا افتتاحی خطبہ ادیب کے فرائض۔۔۔۔جواہر لال نہرو کی تقریر ترقی پسند مصنّفین اور مولوی عبدالحق خطبہ جدید ادب شامل ہیں۔میر کارواں عنوان کے تحت قمر رئیس کا مضمون اُردو افسانے میں انگارے کی روایت، علی باقر کا کالی پوتھ کے لچھے (سجاد ظہیر کا طرز تحریر) سجاد ظہیر کا مضمون ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس (روشنائی) اور سجاد ظہیر کا مضمون با مقصد ادب (روشنائی) شامل ہیں۔نقوش زنداں کے عنوان سے سجاد ظہیر فیض اور سردار جعفری مخطوط سردار جعفری، مخدوم، تاباں، مجروح، کی نظمیں، ہاجرہ مسرور کا مضمون احمد ندیم قاسمی کی اسیری اور ظہیر کاشمیری کا مضمون ظہیر کاشمیری کی اسیری شامل ہیں۔اس کے بعد افسانے ہیں جن میں پریم چند، علی عباس حسینی سجاد ظہیر، رشید جہاں، کرشن چند، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، اشک، غلام عباس، بلونت سنگھ، عزیز احمد، مہندر سنگھ، قرۃ العین حیدر، سہیل عظیم آبادی، انور عظیم، رام لعل، انتظار حسین، عابد سہیل، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار، جیلانی بانو، اقبال متین، انور سجاد، اقبال مجید، سریندر پرکاش، انور قمر کلام حیدری، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف کے افسانے شامل ہیں۔

اس شمارے میں سردار جعفری کا دسمبر 1979 میں لکھا مختصر دیباچہ شامل ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بہار اُردو کانفرنس (پٹنہ) 1951 کے خطبۂ صدارات کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں رشید صاحب نے ترقی پسند مصنّفین کے کاناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا:

''بذات خود میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد جو کچھ بھی رہا ہو گذشتہ پندرہ سولہ سال میں اُردو میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے نئے کامیاب اور مفید تجربے ہوئے ہیں اتنے۔۔۔تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے .....ترقی پسند مصنّفین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک انسانیت کے بہترین مقاصد انسانیت ہی کے بہترین طور طریقوں سے پورے نہ کیے جائیں، نہ اعلیٰ انسان وجود میں آئے گا نہ اعلیٰ ادب تقسیم ملک کے بعد جو قیامت مچی اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر لینے میں ترقی پسند مصنّفین کا قلمی جہاد نہ صرف اُردو ادب میں بلکہ اس دیس کی تاریخ میں شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔اس قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود میں آئیں جن کا اُردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔''114

''تخلیق کی نئی سمت'' عنوان کے تحت سردار جعفری نے گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر (جلد وال) ترقی پسند تحریک کی دین

کے بارے میں کچھ باتیں اور آخر میں ترقی پسند ادب، کے الگ الگ انتخابات (اصناف وار) کی اشاعت کے سلسلہ میں اشاعتی اداروں سے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پیش نظر انتخاب میں اس حقیقت کی صرف ایک جھلک ملے گی کہ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو کیا کچھ دیا ہے۔ اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال کے بعد شاعری کو نئے افق بھی اسی تحریک نے عطا کیے ہیں۔ شعر کی دنیا میں یہ تنوع اور وسعت پہلے نہیں تھی..... ترقی پسند تحریک ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک ہے جس کا تخلیقی رشتہ ہندوستان کی تمام زبانوں اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہے۔ اس کے اثرات صرف ادب تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے زیر اثر سینما، تھیٹر اور پینٹنگ نے بھی نئی نئی صورتیں اختیار کی ہیں..... ہمیں افسوس ہے کہ صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے یہ انتخاب اتنا مکمل نہیں ہے جتنا ہونا چاہئے۔ اس کے لیے کم سے کم دو ہزار صفحات درکار تھے۔ ہماری فہرست میں ایک سو بیس افسانہ نگار تھے اور تقریباً دو سو شاعر۔ سب کے لیے جگہ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں جن کے نام چھوٹ گئے ہیں لیکن ہم ان کو اپنی محفل میں شریک سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند ادب دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلی جلد آپ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری جلد اسی سال کے اندر منظر عام پر آجائے گی..... میں خاص طور سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری دیوانگی کو اپنی فرزانگی سے سنبھال لیا اور اتنا خوبصورت شمارہ منظر عام پر آسکا۔ آج کے گرانی کے زمانے میں اتنا ضخیم رسالہ نکالنا اور وہ بھی آفسیٹ کے ذریعے سے اچھے کاغذ پر، ایک طرح کی دیوانگی ہی ہے۔ یہ نفع بخش کاروبار نہیں ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی اچھا اور بڑا کام دیوانگی کے بغیر ممکن نہیں ہے..... مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند ادب نمبر کا استقبال تمام علمی اور ادبی اداروں میں کیا جائے گا اور ممکن ہے کہ کسی اشاعتی ادارے کے دل میں یہ امنگ پیدا ہو کہ ترقی پسند افسانے، ناول، غزل، نظم، تنقید، ڈراما اور رپورتاژ کے الگ الگ مستند انتخابات شائع کرے جو ہمارے عہد کی اہم ادبی دستاویزوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ دنیا کی بڑی زبانیں اپنے ادب کے عہد بہ عہد انتخابات شائع کرتی ہیں اور وہ آنے والے زمانوں اور نسلوں کے کام آتے ہیں۔ اُردو ادب میں بھی اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔''115

ترقی پسند مصنّفین کا اعلان نامہ بھی اس شمارے میں شامل ہے اور اس کے بعد ادب کی غرض و غایت کے عنوان سے ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس 1936 کا منشی پریم چند کا طویل خطبہ شامل ہے جس کے چند اقتباسات پیش ہیں۔

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن مرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے..... ادب حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے..... ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخئیل میں جا کر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے..... جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ ادب ہمارے لئے بے کار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا..... جس میں صحیح ذوق حسن ہے، جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کیسے رہ سکتی ہیں۔ محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا

کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور محبت کی گرمی اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ ہمارے اندر ایسے جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبہ حسن سے سرشار نہ ہو اور اس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیوں کر عطا کر سکتا ہے..... ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے ..... اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو..... اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیش نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں، جنھیں دولت اور ثروت پیاری ہے ان کے لیے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو ان اُپاسکوں کی ضرورت ہے جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے جن کے دل میں تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو..... وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لیے نمائش کی ضرورت نہیں۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''116

اس شمارہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کا مضمون ''ادیب کے فرائض'' شامل ہے جس میں ٹیگور نے لکھا ہے ''اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا''۔

جاوید در بھنگوی نے لکھا ہے:

''نیا ادب کے بعد ''گفتگو'' نے اُس کی جگہ لی اور ''واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں'' کے مصداق جعفری نے ترقی پسند تحریک کا بھرپور جائزہ اس کے ذریعے پیش کر دیا جو ابھی تک غالباً سب سے مفصل جائزہ ہے ترقی پسند ادبی تحریک کی خدمات کا ترقی پسند بوطیقا کے سلسلہ میں جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' ان اولین کتابوں میں سے ایک ہے جس نے پہلی مرتبہ ترقی پسند نظریات کو ادبی حلقے میں عام کرنے کی باضابطہ کوشش کی۔ اس سے پہلے اختر حسین کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' لکھی ضرور گئی تھی لیکن وہ ترقی پسند تحریک کی طرف ایک اشارے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ سردار جعفری نے متفرق مضامین کے حوالے سے بھی ترقی پسند نظریات پر سب سے زیادہ بحث کی ہے اور ان تمام باتوں کے پیش نظر آنے والا زمانہ انھیں ترقی پسند ادب کی بوطیقا کے مؤلف کی حیثیت سے یاد کرے گا۔''117

منشی پریم چند نے 10/اپریل 1936 کو لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ارسطو کا حوالہ دیا جس نے ادیبوں کے لیے تربیت کی شرط عائد کی تھی۔ منشی پریم چند کا یہ حوالہ گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔

ملاحظہ کیجیے۔

''ارسطو نے بھی اور دوسرے حکماء نے بھی ادیبوں کے لیے سخت شرطیں عائد کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی،

جذباتی تہذیب وتربیت کے لیے اصول اور طریقے مقرر کر دیئے گئے ہیں مگر آج تو ادیب کے لیے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لیے ضرورت نہیں۔ وہ سیاسیات، معاشیات، یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو پھر بھی وہ ادیب ہے۔118

(رسالہ گفتگو، بمبئی، ترقی پسند ادب نمبر، مدیر سردار جعفری، صفحہ 25)

منشی پریم چند نے اپنے خطبہ صدارت میں ترقی پسند مصنّفین کے عنوان اور لفظ ترقی کے مفہوم پر اظہار خیال کیا ہے۔

انہوں نے کہا تھا:

''ترقی پسند مصنّفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ شاید ادیب نہ ہوتا'' ''..... ترقی کا مفہوم ہر مصنف کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے انھیں کو دوسری جماعت عین زوال سمجھتی ہے۔ اس لیے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔''119

پروفیسر نظیر صدیقی، شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے رسالہ گفتگو میں اپنے ایک مضمون، دو ایک غزلوں کی اشاعت اور سردار جعفری کی فرمائش کے بارے میں لکھا ہے:

''جس زمانے میں سردار جعفری کا رسالہ گفتگو شائع ہوتا تھا انہوں نے ایک مرتبہ میرے ایک طویل مضمون اظہار یا ابلاغ سے رسالہ ''گفتگو'' میں کئی صفحے شائع کیے۔ ان صفحات میں اس ابہام کی مخالفت کی گئی ہے جو عہد حاضر کے ادب خصوصاً شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ان صفحات کے شائع ہونے تک انھیں میرا پتہ معلوم نہ تھا۔ مجھے ان صفحات کے شائع ہونے کی اطلاع ایک ہندوستانی دوست نے دی تھی۔ جب میں نے سردار جعفری کو خط لکھا تو وہ خوش ہوئے اور انہوں نے رسالہ گفتگو میرے نام جاری کر دیا۔ میری دو ایک غزلیں شائع کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں کرشن چندر کی ناول نگاری پر ایک مضمون لکھ دوں۔ افسوس ہے کہ میں اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر ان کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا۔ اس معذوری کے باوجود ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بمبئی کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ میں بیگم کی علالت کے باعث اس مشاعرے میں نہ جا سکا۔''120

رسالہ نیا ادب سے جو کام لیا گیا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے لکھا:

''(1) جب اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اور نیا ادب نکلنے لگا تو سردار جعفری نے سبط حسن اور مجاز سے مل کر اس رسالے کے ذریعہ قدامت پرستی اور بیرونی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ مہم ہر قسم کی قدامت پسندی کے خلاف تھی۔ انگارے کے نام سے افسانوں کا جو انتخاب چھپا تھا وہ ضبط ہو چکا تھا اور اسے فحش قرار دیا گیا تھا۔ انگارے کی اسی روایت آزادی تحریر و تقریر کو نیا ادب نے اپنا منشور بنا رکھا تھا.....

(2) نیا ادب نے اُردو ادب میں نیا رجحان پیدا کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ترقی پسندی کی طرف میلان عام کیا۔''121

(3) رفعت سروش ان کی ایک نظم پر نیا ادب کی صحت مند تنقید سے متاثر ہوئے اور یاسیت کی جگہ رجائیت ان کی زندگی اور شاعری کے مزاج کا ایک حصہ بن گئی۔

وہ رقمطراز ہیں:

''نیا ادب کے ادارہ نے میری پذیرائی کی اور یکے بعد دیگرے میری تین نظمیں چھاپیں ''مداوا'' ''غروب وطلوع ''اور ''ہمارا ملک''۔ان دنوں سردار جعفری فتح برلن سے متعلق نظموں پر مبنی ایک کتاب ترتیب دے رہے تھے اس میں انہوں نے میری ایک غیر مطبوعہ نظم ''کامرانی شامل کی۔اب تک میری نظموں میں یاسیت کا عنصر غالب تھا۔''گلاب کا پھول''،''اندھیری رات''،رہگور''،''ستارے''اس قبیل کی نظمیں تھیں جن میں زندگی کی بے ثباتی کا رونا رویا گیا تھا۔میں نے ایسی ہی ایک اور نظم کہی۔''بستر شام پر دم توڑ رہا ہے سورج''اور اس کے بعد اس کے طلوع ہونے کی کیفیت کو پیش کیا گیا تھا۔ ؎

کل نئی شان سے نکلا تھا بہ صد ناز وقار

اپنے پہلو میں لئے ایک جہان بیدار

وغیرہ وغیرہ۔اور پھر غروب آفتاب کا منظر تھا۔اختتام اس مصرع پر ہونا تھا۔بستر شام پہ دم توڑ رہا ہے سورج''۔میں نے یہ نظم نیا ادب کے لیے دی۔دو تین روز بعد جب سبط حسن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نظم کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک ابھی یہ نظم نامکمل ہے۔سورج غروب ہونے کے بعد پھر بھی تو نکلتا ہے۔یہ پہلو واضح ہونا چاہئے۔میں نے اس شعر پر غور کیا۔سبط حسن کے مشورہ کو قبول کیا اور نظم میں ایک بند اور بڑھایا جس میں سورج کے طلوع ہونے کی پھر بشارت ہے اور نظم یوں ختم ہوتی ہے۔ ؎

نئے انداز سے تزئین گلستاں ہوگی

پھر جبین چمن دہر درخشاں ہوگی

اور یہ نظم غروب وطلوع کے عنوان سے نیا ادب میں چھپی۔اس صحت مند تنقید کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور آہستہ آہستہ رجائیت میری زندگی اور شاعری کے مزاج کا ایک حصہ بن گئی۔''122

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے رسالہ گفتگو کو ادبی حلقوں میں پسندیدہ رسالہ بتایا اور اسے دستاویز قرار دیا۔''جعفری صاحب ممبئی سے ترقی پسند ادب کا ترجمان رسالہ گفتگو نکالتے تھے جسے ادبی حلقے میں پسند کیا جاتا تھا۔گفتگو کے ''ترقی پسند ادبی نمبر''کو ایک دستاویز قرار دیا جاتا ہے۔''123

پروفیسر محمد حسن نے رسالہ گفتگو کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ صدارت میں کہا تھا:

''انہوں نے (سردار جعفری) نے رسالہ گفتگو نکالنا شروع کیا۔ان کا سارا زور ادبی دستاویز سازی پر تھا۔رسالے کے تو چند ہی شمارے نکلے مگر اس رسالے کے ذریعے انہوں نے پرانے ادیبوں کی کاوش کو نئے اور جدید طرز کے ادیبوں کے ساتھ پیش کر کے ایک درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کی۔''124

عمر رضا نے سردار جعفری کی اس زمانہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا ذکر کیا وہ لکھتے ہیں۔

''سردار جعفری کی ادارت میں ''گفتگو''ترقی پسند ادیبوں کی ترجمانی کرنے لگا جس میں تقریباً تمام نظریات کے حامل ادیبوں کی شعری وادبی تخلیقات شائع ہونے لگی تھیں۔فیض ن۔م۔راشد،شمس الرحمٰن فاروقی،قرۃ العین حیدر،اختر الایمان،

راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احتشام حسین، قاضی عبدالستار، وحید اختر، شہریار، خلیل الرحمٰن اعظمی اور راہی معصوم رضا جیسے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں سردار جعفری نے اعتدال کی راہ اختیار کر کے اس تحریک یا رجحان میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔''125

ترقی پسند تحریک کے فروغ میں ''گفتگو'' کے اداریوں کے رول کے بارے میں پروفیسر محمد انورالدین رقمطراز ہیں:

''سردار جعفری ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند مصنفین پر کیے جانے والے اعتراضات کا دانشورانہ سطح پر جواب بھی دیا کرتے تھے۔ نیا ادب کی طرح گفتگو کے اداریوں کو بھی انہوں نے ترقی پسند نظریات کی تشریح وتفہیم اور مدافعت کا وسیلہ بنایا۔''126

ہندوستانی بک ٹرسٹ

سردار کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے ''ہندوستانی بک ٹرسٹ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے اُردو اور ہندی کے چار کلاسیکی شعراء غالب، میر، کبیر اور میرا کے کلام کا انتخاب اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی لپیوں میں آمنے سامنے رکھ کر اپنے سیر حاصل مقدموں کے ساتھ ضخیم کتابوں کی شکل میں شائع کیا ہے۔127

کتاب نما

سردار جعفری ماہنامہ ''کتاب نما'' کے مہمان مدیر بھی رہے۔

رسائل کی مجلس مشاورت میں سردار جعفری

ششماہی ''فن اور شخصیت'' (بمبئی) کملیشور نمبر'' مارچ 1977 (جلد 2، شمارہ 4، 5 شائع ہوا جو 556 صفحات پر مشتمل ہے اس کے مدیر صابر دت اور معاون مدیر محمود ایوبی تھے۔ اس کے پبلیشرز ''فن اور فن کار''۔ بمبئی اور تقسیم کار علوی بکڈپو بمبئی اور اُردو گھر نئی دہلی۔ مجلس مشاورت میں خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، خلیق انجم، فکر تونسوی، پرکاش پنڈت حسن کمال، حسن خان، سکھدیو پرشاد، سریندر ناتھ ورما۔ اس کے سرپرست سلیم جاوید تھے جب کہ سرپرستوں کی فہرست میں عزت ماب اندر کمال گجرال، کنہیالال پوسوال، قرۃ العین حیدر، رامانند ساگر، سنیل دت، نوشاد، نرگس دت، پریم جی، آنند بخشی اور پریم رتن دھرہ کے نام شامل ہیں۔ سرورق پر ادارہ کی جانب سے لکھا گیا ہے ''رسالہ فن اور شخصیت'' ہر سال آپ کی خدمت میں دو شاہکار پیش کرتا ہے۔ ان فن کاروں اور شخصیتوں کے بارے میں جنھوں نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں انسانیت کے فلاح وفروغ کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ اس خصوصی شمارہ کی قیمت پچیس روپیہ مقرر تھی جب کہ عام شمارہ کی قیمت دس روپیہ ہوا کرتی ہے۔ اس نمبر کا ایک حصہ محبت نامے پر مشتمل ہے جس میں سردار جعفری کا حسب ذیل محبت نامہ مورخہ 18 فروری 1977 شامل ہے۔

''کملیشور ہندی زبان کے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ وہ روشن خیال ہیں، ترقی پسند ہیں اور فنی اعتبار سے ہندوستان کے ادیبوں کی صف اول میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات اس قابل ہیں کہ ان کا ہندوستان کی ہر زبان میں

ترجمہ کیا جائے۔اسی طرح دوسری زبانوں کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہندی اور اُردو میں آنی چاہئیں۔ صابر دت مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے مشہور جریدے ''فن اور شخصیت'' کا ایک خاص نمبر کملیشور کی زندگی اور تخلیق کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس طرح اُردو تک ہندی کی اس دولت کو پہونچانے کا انتظام کیا ہے جس کو ہندی تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ایک اور اعتبار سے بھی ''فن اور شخصیت'' کا کملیشور نمبر اہم ہے۔ادھر اُردو زبان اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے ہندی تخلیقات کے اتنے ترجمے شائع نہیں کر رہی ہے جتنے اُردو کے تراجم ہندی میں شائع ہو رہے ہیں۔یہ تبادلہ ان دونوں زبانوں کے لیے مفید ہے۔زبانیں جو الگ الگ ہونے کے باوجود اتنی قریب ہیں۔میں اس خاص نمبر کا خیر مقدم کرتا ہوں۔''128

اس نمبر میں جن ادیبوں کے مضامین شامل ہیں ان میں مجتبیٰ حسین، کملیشور، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، باقر مہدی شامل ہیں۔

فن و شخصیت کا غزل نمبر (نگران سردار جعفری)

ششماہی ''فن اور شخصیت''، ممبئی سے صابر دت کی ادارت میں مارچ 1978 میں غزل نمبر شائع ہوا (جلد 4 شمارہ 6)۔اس کے معاون مدیر رفیق جعفر، پبلشرز فن اور فن کار اور سول ڈسٹری بیوٹر علوی بک ڈپو ممبئی۔اس شمارہ کے نگراں علی سردار جعفری تھے۔مرتبین میں جاں نثار اختر، قرۃ العین حیدر، حسن کمال اور مظہر حسین قیصر۔ٹائٹل صفحہ پر ادارہ نے حسب معمول یہ تحریر کیا ہے کہ یہ رسالہ ہر سال دو شاہکار پیش کرتا ہے۔ان فن کاروں اور شخصیتوں کے بارے میں جنھوں نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں انسانیت کی فلاح و فروغ کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔اس شمارہ کے سرپرست اعلیٰ سلیم جاوید تھے۔شمارہ کی قیمت 40 روپیہ مقرر کی گئی تھی جب کہ عام شمارہ کی قیمت 10 روپیہ بتلائی گئی ہے۔

اس شمارہ کی ابتدا علی سردار جعفری کے خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے سفارت خانۂ ہند، ماسکو سے صابر دت کے نام 30/اپریل 1978 کو تحریر کیا تھا۔چوں کہ یہ شمارہ غزل نمبر ہے اسی مناسبت سے سردار جعفری نے غزل سے متعلق دو فقرے کہ ''غزل اُردو زبان کی آبرو ہے'' اور یہ کہ ''غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے'' ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

''غزل ہماری زبان کی نہایت خوب صورت صنف سخن ہے اور تم مبارک باد کے مستحق ہو کہ اتنا ہی خوبصورت غزل نمبر نکال رہے ہو.....غزل کے بارے میں دو فقرے بہت مشہور ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں ایک یہ ہے کہ ''غزل اُردو زبان کی آبرو ہے'' اور دوسرا یہ کہ ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے''۔دونوں باتیں بے انتہا مبالغہ آمیز ہیں۔پہلا فقرہ میرے استاد محترم رشید احمد صدیقی صاحب کا ہے جو اقبال کی شاعری کے عاشق تھے۔اگر اقبال کی شاعری سے غزل خارج کر دی جائے تو اقبال کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔فارسی زبان میں غزل کو حافظ کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔اسی مقبولیت میں کوئی دوسرا شاعر حافظ کے قریب نہیں پہنچ سکتا لیکن مثنوی نگار فردوسی کا درجہ جس نے کبھی غزل نہیں کہی، بلند تر ہے۔وہ زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔خود ہمارے یہاں انیس کی شاعری ہے جو غزل کے بغیر بھی عظمت کی حامل ہے اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ غزل اُردو زبان کی آبرو ہے لیکن غزل کے بے پناہ حسن سے انکار کفر ہوگا۔جس طرح ہم اپنے

محبوب کودنیا کی سب سے حسین شخصیت سمجھتے ہیں اسی طرح رشید صاحب نے اُردو زبان کی آبرو کا تاج غزل کے سر پر رکھ دیا۔ ہم اس پر رشید صاحب سے کوئی شکایت نہیں کریں گے صرف ان کی حسن پرستی کی داد دیں گے۔لیکن دوسرا فقرہ کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے، ہر اعتبار سے قابل اعتراض ہے۔جن صاحب نے یہ فقرہ ارشاد فرمایا ہے وہ نہ تو غزل کے حسن اور لطافت اور بلاغت کو سمجھ سکے اور نہ وحشی اقوام کے فنون کی خوبصورتی کو پہچان سکے۔آج بھی وحشی اقوام کا رقص اور نغمہ دلوں کو موہ لیتا ہے اور غزل کی یہ نیم وحشی کیفیت اس کے فطری حسن کا اظہار ہے۔"129

میرا صفحہ کے عنوان سے صابردت (مدیر) نے فن اور شخصیت کے غزل کے متعلق بتایا کہ سردار جعفری اس کام کے محرک ہیں اور انہوں نے ہندوستانی بک ٹرسٹ سے مالی امداد کا انتظام بھی کیا تھا۔

صابردت لکھتے ہیں:

''ایک شام حسب معمول میں ان کے (جاں نثار اختر) کے گھر گیا۔کہنے لگے۔''بھئی ہم آج ''غزل کا سفر'' کے عنوان سے ولی سے لے کر ترقی پسند شعرا تک انتخاب کر کے دیں گے اور وہ ہمیں ہندوستانی بک ٹرسٹ سے اتنے پیسے دلوائے گا۔ہم تو ایڈوانس بھی لے آئے..... میں جو کتابیں بتاوں وہ مجھے لائبریری سے لا کر دے دیا کرو۔تبھی ہو سکے گا.... میں حسب وعدہ ان کو کتابیں لا کر دیتا رہا اور وہ کام کرتے رہے۔آخرش 10/جون 1971 کو میں ''غزل کا سفر'' کے مسودے کی پوری فائل سردار جعفری کو دے آیا۔آج ساتویں برس جب کہ اختر صاب ہمارے درمیان نہیں ہیں میں انھیں کے مرتب کردہ مسودہ کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"130

غزل کا مزاج عنوان کے تحت حالی، حامد حسن قادری، مسعود حسن رضوی، نیاز فتح پوری، یوسف حسین خاں، سید عبداللہ، اعجاز حسین، آل احمد سرور، احتشام حسین، عبادت بریلوی، وقار عظیم، ابواللیث صدیقی، سید باقر حسین اور فیض احمد فیض کے خیالات درج کئے گئے ہیں۔اس کے بعد ولی سے لے کر ترقی پسند تحریک کے غزل کو شعرا کا مختصر تعارف اور نمونے کے طور پر ایک اردو غزل یا شعر دیا گیا ہے۔640 صفحات پر مشتمل یہ ایک اہم رسالہ ہے۔

اداریے

علی سردار جعفری بحیثیت مدیر

''جاوید دربھنگوی نے لکھا ہے''نیا ادب'' کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے (سردار جعفری) ترقی پسند ادب کی جو خدمت انجام دی اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی .....اگر نیا ادب کے فکر انگیز اداریے لکھے نہ گئے ہوتے تو ترقی پسند شاعری کو پایۂ اعتبار حاصل ہوتا یا نہیں؟ تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہیں۔ترقی پسندی قبل از وقت دم توڑ دیتی اور یہ شیرازہ بکھر گیا ہوتا .....نیا ادب کا پہلا شمارہ اپریل 1939 میں شائع ہوتا ہے اور اس کا اداریہ ترقی پسند ادب کے نام سے عام بے راہ روی کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔

..... یہ کہنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادب ہر پرانی چیز کے خلاف نفرت و احتجاج کا نام ہے۔وہ پرانے ادب کی بہترین

روایات کا حامل ہوتا ہے ..... ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے۔ان کا پرتو ہو ..... وہ صرف سطح کی کروٹیں لینے والی موجوں کے ساتھ نہیں بہتا، جی ہاں۔یہ جعفری کی آواز ہے۔اسی طرح ''نیا ادب'' کے دوسرے شمارے کا اداریہ بھی ترقی پسند ادب کے اوصاف کو محیط ہے۔نیا ادب کا ایک شمارہ ترقی پسند ادباء وشعراء کے پہلے مفصل جائزے کی حیثیت سے بھی شائع ہوا اور یہ رسالہ واقعی ترقی پسند ادب کا ترجمان بن گیا۔اس کے اداریے بیشتر ترقی پسند تحریک کے نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے اور ان کی خوبی وخامی کا جائزہ لیتے۔اسی لیے میں نے سردار جعفری کو ترقی پسند بوطیقا کا مؤلف کہا ہے۔''131

ترقی پسند ادبی تحریک کے فروغ کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے ایک سبب یہ بتایا کہ ادبی رسائل میں شائع ہونے والی نگارشات سے ترقی پسند تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔

''1937 سے 1939 تک ترقی پسند ادبی تحریک کے فروغ کا سبب یہ تھا کہ 1937 کے الیکشن کے بعد کانگریس وزارتیں یوپی اور دوسرے کئی صوبوں میں بن گئی تھیں جن کو بائیں بازو کی حمایت حاصل تھی۔نتیجہ میں کسان مزدور تحریکوں کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کے پھلنے پھولنے کی سہولتیں اور آزادیاں بھی حاصل ہوئیں۔یہ نئی سیاسی بیداری کا دور تھا اور نوجوان ادیب ذوق اور شوق سے اس نئی ادبی تحریک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ادبی رسائل ان کی تخلیقات شائع کر رہے تھے۔اختر حسین رائے پوری، اختر انصاری، احتشام حسین، سبط حسن، سردار جعفری اور سجاد ظہیر کی تنقیدی نگارشات سے اس نئی ادبی تحریک کی راہیں روشن ہو رہی تھیں۔''132

صحافتی خدمات (پرنٹ میڈیا)

ڈاکٹر سلطان احمد نے سردار جعفری کی صحافتی خدمات (پرنٹ میڈیا) کی ستائش کرتے ہوئے لکھا:

''سردار جعفری ایک بلند پایہ صحافی تھے۔انہوں نے سبط حسن اور مجاز کے اشتراک سے لکھنو سے ''نیا ادب'' اور ہفتہ وار اخبار ''پرچم'' نکالا جسے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔علاوہ ازیں کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''قومی جنگ'' اور ''نیا زمانہ'' کے ادارتی بورڈ کے رکن اعلیٰ رہے۔''نیا ادب'' کے عرصے بعد انہوں نے بمبئی سے ترقی پسند ادب کا ترجمان رسالہ گفتگو جاری کیا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر کو ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ان سب کے علاوہ ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی کے مدیر اور کتاب نما (دہلی) کے مہمان مدیر رہے۔ان کی صحافتی نگارشات اور ادبی اداریوں نے ترقی پسند تحریک جیسی مفید اور کارآمد کتاب کی صورت اختیار کر لی۔ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی نثر کا دوٹوک لہجہ صحافت کی کوکھ سے ہی پھوٹا تھا''134

ریڈیائی تقریر

علی سردار جعفری کی ایک ریڈیائی تقریر ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے ہماری زبان 8 مئی 1976 میں شائع ہوئی تھی جسے سہ ماہی اُردو ادب نے اپنے شمارہ بابتہ جولائی تا ستمبر 2000 کے صفحات 33 تا 39 میں بھی شائع کیا ہے۔

اس تقریر کے دو اقتباسات پیش ہیں۔

(1)۔''شاعر کا موضوع زندگی کا کرب ونشاط ہے۔انسانی دکھ اور سکھ ہیں''۔

(2)''ظلم سے نفرت اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ ہر دل میں ہوتا ہے لیکن شاعر اپنے انفرادی تجربے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کو وہ بات اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔''135

سردار جعفری نے اپنی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' پرانی تشبیہ اور استعارے کے ساتھ نئی تشبیہات واستعارات کے استعمال کی اہمیت اور اپنی شاعری کی چند خصوصیات پر اشارے کئے ہیں اور اپنی نظم ''اودھ کی خاک حسین'' کا ایک بند بھی پیش کیا ہے۔

سردار جعفری اور ان کی شاعری اور انٹرویو ریڈیو آرکائیوز کے لیے

پروفیسر سید محمد عقیل نے بتایا ہے کہ ''الہٰ آباد ریڈیو نے جعفری صاحب اور ان کی شاعری پر ایک انٹرویو بھی ریڈیو آرکائیوز کے لیے ریکارڈ کیا جو جعفری صاحب کی شاعری پر اچھا ریکارڈ ہے۔انٹرویو راقم نے لیا تھا۔'' 136

گیارہ ہزار لڑکیاں (فلم)

پروفیسر محمد حسن کے مطابق:

''سردار جعفری نے فلمساز کی حیثیت سے بھی اپنا ہنر آزمایا اور ایک فلم ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' بنائی۔فلم کو زیادہ مقبول نہیں ہوئی مگر اس کوشش میں بھی وہ منفرد ضرور رہے''۔137

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے اس فلم کی ستائش کی ہے۔

''انہوں نے (سردار جعفری) کئی فلموں کے لیے نغمے لکھے اور بعض فلمیں بھی بنائیں۔ایک فلم کا تو راقم الحروف کو بھی پتا ہے وہ فلم ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' کے نام سے انہوں نے بنائی تھی۔راقم کو یہ فلم کافی پسند آئی تھی۔تعلیم یافتہ حلقے میں بھی اس کو خاص طور پر پسند کیا گیا تھا۔اس میں ترقی پسند نقطۂ نظر سے اس دور کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے مسائل پیش کیے تھے۔''139

بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے:

''سردار جعفری خواتین کا بہت احترام کرتے تھے۔کسی بھی مجلس میں خواہ نجی ہو،دوستوں کی ہو یا ہم خیال رفیقوں کی کبھی خواتین کے بارے میں ریمارک پاس نہیں کرتے تھے۔کسی کی داستان عشق کو چھیڑا بھی جائے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے تھے کہ اس میں پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔انہوں نے بمبئی کی ورکنگ گرلز کے مسائل پر ایک فلم بنائی تھی ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' اس میں خاص طور پر اس نغمہ کو شامل کیا تھا ۔

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
روشنی لے کے اندھیرے سے نکلنا ہے تجھے

فلمی کہانیاں

سردار جعفری نے فلم ''میلہ''،''سازش'' اور ''جبہ خاتون'' کی کہانیاں لکھیں۔141

فلمی گیت

سردار جعفری نے فلمی گیت بھی لکھے جن کی تفصیل بتاتے ہوئے ملکہ نسیم لکھتی ہیں:

''سردار جعفری فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے لیکن سنجیدہ ادب کا دامن تھامے رکھا۔ انہوں نے خواجہ احمد عباس کی فلموں کے لیے جو نغمے لکھے وہ عرصے تک دھوم مچاتے رہے۔ ''انہونی'' فلم کے لیے لکھا گیا ان کا نغمہ یا دلیپ کمار کی فلم فٹ پاتھ کا یہ نغمہ ''شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم'' نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

اس کے علاوہ ''زلزلہ'' ''پردیسی''، ''شہر اور سپنا''، ''دھوبی ڈاکٹر'' وغیرہ فلموں کے گیت لکھے''۔141

دستاویزی فلمیں

رفیعہ شبنم کے مطابق:

سردار جعفری نے جو دستاویزی فلمیں بنائیں ان میں یہ شامل ہیں:

(1) پھر بولوا ے سنت کبیر ..... کہانی، مکالمے سردار جعفری نے لکھے ہیں۔

(2) ہندوستان ہمارا ..... کہانی، مکالمے سردار جعفری نے لکھے ہیں۔

(3) جدوجہد آزادی کے سو سال (انگریزی) کہانی، ڈائرکشن سردار جعفری کا ہے

(4) علامہ اقبال پر ڈاکیومنٹری فلم جس کی شوٹنگ ہندوستان اور پاکستان میں ہوئی اور اس کی دو کاپیاں حکومت ہند نے حکومت پاکستان کو تحفتاً دیں۔

گیت

مجروح سلطان پوری کے ساتھ سردار جعفری نے گیت بھی لکھے۔142

بولوا ے سنت کبیر (ڈاکیومنٹری)

سردار جعفری نے کبیر کی زندگی پر مشتمل ڈاکیومنٹری کا مسودہ بعنوان ''بولوا ے سنت کبیر'' تیار کیا تھا جسے خواجہ احمد عباس نے ڈائرکٹ کیا تھا۔

ہندوستان ہمارا (ڈاکیومنٹری)

سردار جعفری نے ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تہذیب پر ایک ڈاکیومنٹری مسودہ بعنوان ''ہندوستان ہمارا'' تیار کیا جسے خواجہ احمد عباس نے ڈائرکٹ کیا۔

تحریک آزادی میں ادب کا حصہ (ڈاکیومنٹری)

تین حصوں 1857 سے 1905، 1905 سے 1920 اور 1947 پر مشتمل آسامی، بنگالی، اڑیہ، ہندی، اُردو اور انگریزی میں سردار جعفری نے ایک ڈاکیومنٹری فلم بعنوان ''تحریک آزادی میں ادب کا حصہ'' کا نہ صرف یہ کہ مسودہ تیار کیا بلکہ

اس کوانہوں نے خود ہی ڈائرکٹ بھی کیا تھا۔

مہاتما گاندھی کا ڈانڈی مارچ (ڈاکیومنٹری)

مہاتما گاندھی کا کے ڈانڈی مارچ کو پیش کرتی ڈاکیومنٹری فلم کا مسودہ سردار جعفری نے تیار کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد اقبال (دستاویزی فلم)

حمید اختر نے اقبال پر سردار جعفری کی بنائی ہوئی دستاویزی فلم کے بارے میں لکھا:

''علامہ اقبال کے سو سالہ یوم پیدائش پر سردار جعفری نے ہی سب سے پہلے ایک خوبصورت دستاویزی فلم بنائی ۔اس کے لیے وہ خود او رہدایت کار خواجہ احمد عباس کافی دن لاہور میں رہے۔اس وقت پاکستان میں حکومت یا کسی دوسرے ادبی یا ثقافتی ادارے نے ایسی کسی کوشش کی ضرورت کا احساس تک نہیں کیا تھا۔فلم بنانے کے سلسلہ میں سردار جعفری نے لاہور میں طویل قیام کیا۔اس کے علاوہ بھی وہ لاہور متعدد بار آئے۔''143

سردار جعفری نے جشن اقبال کے سلسلہ کے تحت حکومت ہند نے اقبال پر جو فلم بنوائی اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وزارت (انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ، حکومت ہند) کے ایک اور شعبے فلمز ڈویژن نے اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفے پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کو خواجہ احمد عباس اور علی سردار جعفری نے مکمل کیا۔اس فلم کی تکمیل حکومت پاکستان کے اشتراک اور تعاون سے ہوئی جس کے لیے حکومت ہند کی وزارتِ خارجہ اور پاکستانی سفارت خانے نے خاص طور سے کوشش کی۔فلم کی شوٹنگ بمبئی، دہلی، کشمیر، لاہور اور سیال کوٹ میں ہوئی۔اس فلم کی خوبصورتی میں جن تصویروں نے اضافہ کیا ہے وہ برصغیر کے مشہور و معروف مصور مرحوم عبدالرحمٰن چغتائی اور عہد حاضر کے عظیم پاکستانی مصور صادقین کی بنائی ہوئی ہیں۔ایک تصویر خاص طور سے ہندوستان کے مشہور مصور لائیبا نے بنائی ہے۔چغتائی کی تصویروں کو استعمال کرنے کی اجازت ان کے صاحبزادے عارف رحمٰن چغتائی صاحب نے عنایت فرمائی اور صادقین نے انتہائی فراخ دلی سے اپنی ساری تصویریں ہماری نذر کر دیں جو انہوں نے پاکستان کے جشن اقبال کے لیے اقبال کی شاعری کو رنگین خط و خال دینے کے لیے بتائی ہیں۔ میرے پاس ان کی عنایت کی ہوئی 36 ٹرانس پیرنسی ہیں۔اس فلم کے لیے اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے خاص طور سے انٹرویو دیا جو فلم میں شامل ہے اور جس کمرے میں علامہ کا انتقال ہوا تھا اس کی چیزوں کو اسی شکل میں پھر سے ترتیب دے دیا جو 21/اپریل 1938 کو صبح پانچ بجے تھی۔اس کی وجہ سے اس دستاویزی فلم کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔یہ فلم 1978 میں اقبال کی وفات کی چالیس سالہ برسی کے موقع پر نمائش کے لیے پیش کی جائے گی لیکن اس کی پہلی کاپی وزیر خارجہ جناب اٹل بہاری واجپائی نے حکومت ہندوستان کی طرف سے حکومت پاکستان کو تحفے کے طور پر پیش کی ہے۔اس کی مزید تین کاپیاں جسٹس جاوید اقبال، صادقین اور چغتائی میوزیم کے لیے بھیجی جا رہی ہیں۔یہ فلم دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے بیرونی ممالک کے ہندوستان سفارت خانوں کو بھیجی جا رہی ہیں۔''ڈاکٹر محمد اقبال'' دستاویزی فلم کے سلسلہ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو تعاون اور اشتراک کی صورت پیدا ہوئی ہے وہ ہماری تیس سالہ تاریخ کا ایک بڑا واقعہ

ہےاوردونوں ملکوں کے مستقبل کے لیے نیک فال ہے۔"144

پروفیسرضیاء(علیگ) نےلکھاہے:

"یہ تقریب 17 جولائی 1988ءکومنعقدہوئی۔علامہ اقبال کی شاعری اورشخصیت سے متعلق جوفلم حکومت ہند نے تیار کرائی تھی اورجس کی پروڈکشن میں علی سردارجعفری نے اہم کردارادا کیا تھا،وہ فلم بھی دکھائی گئی۔"145

علی سردارجعفری یکم اکتوبر 1983 کوجموں تشریف لائے اور 31/دسمبر تک یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں وزیٹنگ پروفیسر کےطور پرمقیم رہے۔اس تین ماہ کی مدت میں جعفری صاحب نے طلبہ کے لیےلیکچر بھی دیے..... آخری لیکچر کے بعدسردارجعفری کی بنائی ہوئی ڈاکیومنٹری "اقبال" دکھائی گئی جس کاانتظام ڈائرکٹریٹ جنرل انفارمیشن،حکومت جموں وکشمیر نے کیا۔اس فلم کی تشکیل وتکمیل میں سردارجعفری پروڈیوسر کےطور پرخواجہ احمدعباس ڈائرکٹر کےطور پراوررراقم التحریر (پروفیسر جگن ناتھ آزاد) کےطور پرشریک رہے۔"146

سردارجعفری نے اقبال پرجوڈاکیومنٹری بنائی ہےاس تعلق سےاپنے مضمون چراغ لالہ میں وضاحت کی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

"میں نے اقبال پرجوڈاکیومنٹری فلم بنائی ہےاس میں آبجوکوپیغمبری اورشاعری کی علامت کےطور پراستعمال کیاہے۔ لالے کاپھول خودی کامظہرجمال ہےاورشاہین خودی کامظہرجلال۔یہ تینوں علامتیں نئی ہیں اورنئے مفاہیم کےشاعرانہ ابلاغ کے لیےاستعمال ہوئی ہیں۔پہلی علامت جوئے آب کی شکل میں گوئٹے کے یہاں سے آئی ہےاور پیام مشرق کی نظم نغمہ محمدی کےترجمے میں ظاہرہوئی ہے۔اس علامت کواقبال نے دوبارہ استعمال نہیں کیالیکن اس نے شاعری کے لیےعلامت پیدا کرلی اورجاویدنامے میں اپنے لیےزندہ رودکانام اختیارکیا۔خودی کامظہرجمال بننے کے لیےلالے کےپھول کوشاعرانہ عمل کی ایک طویل مدت سے گزرنا پڑا ہےاورخودی کامظہرجلال بننے کے لیےشاہین نے بھی ایک شاعرانہ سفرطے کیاہے۔یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ خودی کےمکمل اظہار کےلیےشاعرنے ایک پھول اورایک طائر سے کام لیا ہے۔"147

The Literary Storm(انگریزی ڈاکیومنٹری فلم)

علی سردارجعفری نے ڈاکٹرراہی معصوم رضا کو18/اپریل 1990 کواپنے سیتامحل والے رہائشی فلیٹ میں ایک انٹرویو دیا تھاجس میں انہوں نے اپنی اس ڈاکیومنٹری کےمتعلق بتایا:

"اس زمانے میں میں نے ایک کام ایسا کیا کہ ڈاکیومنٹری فلم بنائی۔انگریزی میں The Literary Storm کے نام سے۔اس میں چودہ زبان کا Role of literature in freedom struggle شامل ہے۔148

محمدعلی صدیقی،حسن عابد،مسلم شمیم،شاہدنقوی،مظہرجمیل نے سردارجعفری سے ایک انٹرویولیا تھا۔

اس انٹرویومیں سردارجعفری نے اس ڈاکیومنٹری کےمتعلق بتایا:

"ہمارے ہاں جدیدادب ایک واضح رجحان کےطور پر1857 کےلگ بھگ شروع ہوتا ہے.....میں ان دنوں ایک

ڈاکیومنٹری فلم پر کام کر رہا ہوں جس کا نام ہے دی لٹریری اسٹارم اور اس کا موضوع ہے ہندوستان کی بڑی زبانوں میں جو کردار ادا کیے ہیں اور جو رشتے قائم رکھے ہیں ان کو سمجھنا۔''149

تمثیلیں

رباب جعفری نے لکھا ہے:

''سردار بھائی نے لائٹ اینڈ ساؤنڈ کے لیے لال قلعہ دہلی، شالیمار باغ سرینگر، مہاتما گاندی اور جواہر لال نہرو کی تمثیلیں لکھی ہیں۔عوام نے انھیں بے حد پسند کیا ہے۔''150

روشنی اور آواز (لال قلعہ میں پیش کیا جانے والا پروگرام)

عہد شاہ جہاں سے ہندوستان کی آزادی تک کے سفر کو پیش کرنے والا پروگرام ''روشنی اور آواز'' جسے لال قلعہ میں پیش کیا جاتا ہے، اس کا اسکرپٹ بھی سردار جعفری نے لکھا ہے۔

روشنی اور آواز (تین مورتی نواس میں پیش کیا جانے والا پروگرام)

جواہر لال نہرو کی آزادی کے بعد کی کہانی کو پیش کرنے والا پروگرام ''روشنی اور آواز'' جو تین مورتی ہے نواس (جواہر لال نہرو کی قیام گاہ) میں پیش کیا جاتا ہے، اس کا اسکرپٹ سردار جعفری نے لکھا تھا۔

روشنی اور آواز (سری نگر کے شالیمار باغ میں پیش کیا جانے والا پروگرام)

سری نگر کے شالیمار باغ میں پیش کیے جانے والے پروگرام ''روشنی اور آواز'' کا اسکرپٹ سردار جعفری نے لکھا ہے۔اس میں لیلیٰ اور مجنوں کی کہانی کو پھولوں اور پودوں کی زبانی بیان کیا ہے۔

اس اسکرپٹ کے متعلق سردار جعفری نے لکھا ہے:

''باغ میں بہتی ہوئی نہر وقت کا استعارہ ہے۔پانی پر تیرتے ہوئے پھول لیلیٰ کا استعارہ ہیں اور نہر کے دونوں طرف جھکی ہوئی بید مجنوں کی شاخیں پھولوں کو چھو نہیں سکتیں، مجنوں کا استعارہ ہیں۔نہر کے دونوں طرف کیاریوں میں لیمو اور سنترے کے دو دو پودے جنت میں لیلیٰ مجنوں کی یکجائی کی علامت ہیں۔ناقۂ لیلیٰ کی علامت اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔یہ علامت سبز گھاس کے قطعات پر بیلوں کی شکل میں تھی جس پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔کشمیری کہانی بھوزا اور نرگس تحریک آزادی کی کہانی سناتی ہے جس میں بھوزا مجاہد کی علامت ہے اور نرگس (محبوبہ) آزادی کی علامت ہے۔جاڑے کی برف پگھل جانے کے بعد جب زنبور بہار گنگنا تا ہوا نرگس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے تو آزادی کی بہار آتی ہے۔تین رنگ کے کشمیری کنول کے پھول برہما، وشنو اور مہیش کی علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔سرخ کنول صبح آزادی کا طلوع آفتاب ہے۔نیا کنول کائنات کی دوپہر ہے اور سفید کنول موت کی علامت ہے جو تجدید حیات کی آئینہ دار ہے۔151

کہکشاں

''علی سردار جعفری نے اُردو کے معروف شعراء حسرت موہانی جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور اسرار الحق مجاز کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر 17 اپی سوڈ پر مشتمل ایک سیریل کہکشاں بنایا جس کے توسط سے سردار نے روایات اور ادبیات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔''152

سردار جعفری نے ''کہکشاں'' کا مسودہ تیار کیا تھا اور جلال آغا نے ڈائرکٹ کیا تھا۔

فراق کی زندگی کی فلم کے بارے میں پروفیسر سید محمد عقیل نے لکھا ہے:

''جعفری صاحب الہ آباد اس وقت آئے جب وہ ٹی وی کے لیے اپنا سیریل کہکشاں بنا رہے تھے۔ ان کا قیام سول لائنس کے ہوٹل ریذیڈنسی میں تھا۔ انھیں فراق صاحب کی زندگی فلمانی تھی۔ یہ پروگرام بے حد مشغولیت کا تھا۔ بمبئی سے دو ایک آرٹسٹ بھی وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ فراق کا رول کرنے کو کوئی تیار نہ تھا کہ فراق صاحب کی سخت سست کون سنتا۔ آخر جعفری صاحب نے اسکرپٹ سے ایسے حصے حذف کر دے اور پھر یہ رول ایک خاتون نے ادا کیا۔ فراق صاحب کی داستان حیات کو جعفری صاحب نے بہت سنبھال کر فلمایا تھا۔''153

محفل یاراں

سردار جعفری کے پروگرام محفل یاراں کے متعلق فیصل جعفری بتاتے ہیں:

''بمبئی میں ٹی وی سنٹر نیا نیا قائم ہوا تھا اور علی سردار جعفری ہر ہفتے دوردرشن پر ''محفل یاراں'' کے عنوان سے ایک پروگرام پیش کرتے تھے جو جعفری صاحب کی شخصیت اور ان کے انداز گفتگو کے سبب غیر اُردو داں طبقے میں بھی کافی مقبول تھا۔ اس پروگرام میں ایک بار انہوں نے (غالباً اختر الایمان کی سفارش پر) مجھے بھی مدعو کیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت پر کھل کر بحث ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات چیت میں قائل ہونے یا قائل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس پروگرام کا بھی یہی حشر ہوا، ہاں بات چیت کے دوران کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہوئی۔''154

سردار جعفری محفل یاراں کے پانچ سال پروڈیوسر رہے۔

(ابرر حمانی، علی سردار جعفری، مہد سے لحد تک، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 3)

محفل یاراں پروگرام کے سلسلہ میں کالی داس گپتا رضا نے بتایا:

''کوئی بیس سال پہلے جعفری صاحب ہر ہفتے ٹی وی پر آدھے گھنٹے کا ایک پروگرام دیا کرتے تھے، جو کسی نہ کسی مشہور شاعر یا ادیب کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے مخصوص تھے۔ ایسا ہی ایک پروگرام انہوں نے مجھ پر ترتیب دیا تھا جو 15/اپریل 1981 کو بمبئی ٹیلی ویژن سے نشر ہوا تھا اس کا نام انہوں نے ''کتابوں کا خزانہ'' رکھا تھا۔ تفصیل سہ ماہی ''تناظر'' دہلی کے کالی داس گپتا رضا نمبر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اسے جعفری صاحب کی کشادہ دلی ہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے یہ پروگرام مجھ حقیر پر مرتب کیا۔ ان کے آغاز کے چند جملے یہ تھے۔ ''آج رات، محفل یاراں'' میں شمع محفل'' کالی داس گپتا رضا ہیں۔ آپ

ان سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔

ان کا نام ڈھکا چھپا نہیں ہے۔اپنے پیشے کے لحاظ سے بیوپاری ہیں لیکن اگر دوسری طرف سے دیکھا جائے تو یہ کتابیں جمع کرنے والے، شعر کہنے والے، تحقیق کرنے والے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ہم انھیں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے بیوپار کرتے ہیں اور زندگی کو حسین بنانے کے لیے ادب کی خدمت کرتے ہیں۔155

آئینہ خانہ (ادبی پروگرام ٹی وی پر)

انور ظہیر خاں نے سردار جعفری کے ٹی وی پروگرام آئینہ خانہ پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''ان کے (سردار جعفری) کے علم اور جادو بیانی پر کلام نہیں۔جب شروع شروع میں ٹیلی وژن آیا تھا تو وہ ایک ادبی پروگرام ''آئینہ خانہ'' بمبئی دوردرشن سے پیش کرتے تھے جس میں شرکا، کو بولنے کا موقع بہت کم ملا کرتا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پروگرام نہایت معلوماتی اور یادگار ہوتا تھا۔آج جب کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کے رہ گئی ہے یا منصوبہ بند طریقے سے بنا دی گئی ہے، میں ذاتی طور پر ایسے کئی غیر مسلموں کو جانتا ہوں جن کے یہاں ''آئنہ خانہ'' دیکھ کر اُردو زبان پڑھنے لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔''

صحافتی خدمات (الیکٹرانک میڈیا)

ڈاکٹر سلطان احمد نے علی سردار جعفری کی صحافتی خدمات (الیکٹرانک میڈیا) کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادب اور صحافت کی دنیا میں انقلاب آفریں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ جب ان کا رجحان فلمی دنیا کی طرف مائل ہوا تو ابتداء میں بعض چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کے بعد فلم پروڈیوسر بن گئے اور ''ایک ہزار لڑکیاں'' جیسی فلم پیش کی۔علاوہ ازیں ہندوستان کے ادبی و ثقافتی سرمایہ کی نشاندہی کے سلسلے میں متعدد ڈاکیومینٹری فلمیں تیار کیں، ان میں ''پھر بولوا ے سنت کبیر'' ڈاکٹر محمد اقبال ''ہندوستان ہمارا'' اور جدوجہد آزادی کے سو سال'' قابل ذکر ہیں۔بعد ازاں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ دہلی جیسی عظیم درس گاہوں کی سرگرمیوں کو سلولائڈ پر منتقل کیا۔اور جب ویڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا میں قدم رکھا تو اُردو کے معروف شعراء، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور اسرار الحق مجاز کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر 17 اپی سوڈ پر مشتمل ایک سیریل کہکشاں بنایا جس کے توسط سے سردار نے روایات کو ہم آہنگ کرنیکی کوشش کی۔''159

سید عاشور کاظمی نے لکھا ہے:

سردار جعفری نے ادبی موضوعات پر ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔اور وہ ٹیلی ویژن کے اعزازی پروڈیوسر بھی ہیں.....مجھے تعجب ہوتا ہے جب یہ سنتا ہوں کہ سردار جعفری جب چاہتے ہیں فلم بنا ڈالتے ہیں، جب چاہتے ہیں ٹیلی ویژن پر اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔یہ سب کچھ سردار جعفری کے کردار کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔''158

عمر رضا نے سردار جعفری کی صحافتی خدمات کے تئیں ان کے عظیم مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''علی سردار جعفری نے نہ صرف یہ کہ ادب اور صحافت بلکہ فلم اور ٹیلی ویژن کی دنیا میں بھی اپنی ایک حیثیت قائم کر رکھی تھی اور ان تمام ذرائع کا استعمال انہوں نے اپنی صحت مند فکر کو عوام تک پہنچانے کے لیے کیا جس کے ذریعے انہوں نے مشرق و مغرب کی تفریق مٹانے، معاشرتی استحصال و عدم مساوات جیسے مسائل کی طرف پوری دنیا کی توجہ مرکوز کر کے عالمی امن انسانی مساوات اور رواداری کی دعوت دی ہے۔159

مظہر امام کے مطابق:

''روشنی اور آواز (Light and Sound) کے لیے انہوں نے جو اسکرپٹ لکھے وہ ان ہی کا حصہ ہیں خصوصاً وہ جو لال قلعہ، دہلی اور شالیمار باغ، سری نگر کشمیر کے لیے لکھے گئے۔''160

فصیح احمد صدیقی اور سید مجاہد حسین حسینی نے لکھا ہے کہ سردار جعفری ایک کامیاب صحافی ہیں۔''161

☆☆☆

حواشی

1 عبدالسلام خورشید، فن صحافت، صفحہ 9

2 ڈاکٹر سید احمد قادری، اُردو صحافت بہار میں، صفحہ 18

3 سمیع احمد، فن صحافت کا، شاعر، جولائی 2010، صفحہ 38

4 محمد علی جوہر، کامریڈ، 6/جون 1913

5 مولانا ابوالحسن علی ندوی، مجلّہ بہار اُردو ایڈیٹرس کاونسل 1984 صفحہ 27 بحوالہ سمیع احمد، فن صحافت کا، شاعر، جولائی 2010، صفحہ 38

6 مولانا ابوالکلام آزاد، آج کل مولانا آزاد نمبر

7 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 125، 124

8 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 413

9 علی جواد زیدی، رفیق زنداں سردار مشمولہ افکار، سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 170

10 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں، عالمی اُردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر جولائی تا دسمبر 2001 (سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 73

11 ڈاکٹر عفت آرا شمسی، خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری، صفحہ 119

12 مناظر عاشق ہوگانوی، پوشیدہ لمحے، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 28

13 نیا ادب، لکھنو شمارہ 1 اپریل 1939، صفحہ 3

14 محمد اجمل خاں، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے بی ایچ ڈی 2010 شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی (غیر مطبوعہ)، صفحہ 59-58

15 سجاد ظہیر، روشنائی، صفحہ 246

16 ڈاکٹر سیما صغیر، ترقی پسند تحریک کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، نوائے ادب، جولائی تا ستمبر 2002، صفحہ 49

17 سردار جعفری، نیا ادب، جلد 1، شمارہ، 1 اپریل 1939، صفحہ 61

18 سردار جعفری، نیا ادب، اپریل 1939

19 محمد اجمل خاں، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے بی ایچ ڈی 2010 شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی (غیر مطبوعہ)، صفحہ 219

20 نیا ادب جلد 1، شمارہ 1 اپریل 1939 صفحہ 4، 5

21 شمس الرحمٰن فاروقی،تنقیدی افکار،صفحہ 45

22 نیا ادب 1943 شمارہ 1،بحوالہ ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری از یعقوب یاور،صفحہ 91

23 سبط حسن،سردار جعفری:چند یادیں،علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 67

24 مظہر امام،سردار جعفری کی ہمہ جہتی،اُردو دنیا،ستمبر 2000،صفحہ 25

25 سبط حسن،سردار جعفری:چند یادیں،عالمی اُردو ادب 2001،سردار جعفری نمبر جولائی تا دسمبر 2000 (سردار جعفری:فن اور شخصیت) صفحہ 74-73

26 محمد اجمل خاں،علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ،مقالہ برائے بی ایچ ڈی 2010 شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی (غیر مطبوعہ)،صفحہ 59

27 ڈاکٹر عفت آرا شمسی،خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری،صفحہ 121

28 جوش ملیح آبادی،نیا ادب اور کلیم،اداریہ،اگست ستمبر 1939

29 جوش،یادوں کی بارات بحوالہ،"جوش کی ادبی صحافت" از پروفیسر محمد انور الدین،مشمولہ ہندوستانی زبان،ممبئی، جولائی تا ستمبر 2000،صفحہ 60

30 سبط حسن،فلسفہ شاہین،نیا ادب،1939

31 سجاد ظہیر،اُردو کی جدید انقلابی شاعری،نیا ادب 1939

32 پروفیسر محمد انور الدین،علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 420,421

33 نیا ادب،اکتوبر 1940

34 نیا ادب،اکتوبر 1940

35 نیا ادب،اکتوبر 1940

36 عقیل احمد صدیقی،ترقی پسند شعری تصور مشمولہ جدید اُردو نظم نظریہ و عمل 1936 تا 1970،صفحہ 70

37 سردار جعفری،نیا ادب اور کلیم،نومبر 1940،صفحہ 7,12,13,14,15

38 سردار جعفری،ترقی پسند ادب کیا ہے،نیا ادب اور کلیم،نومبر 1940 صفحہ 16,17

39 جوش ملیح آبادی،نیا ادب اور کلیم،اداریہ،جلد 3 شمارہ 3،دسمبر 1940 صفحہ 4,5

40 سردار جعفری،اگر آرزو اور تمنا ہو تو،تاخیر میں بھی لذت ہے مشمولہ اُردو دنیا،جولائی تا ستمبر 1996،صفحہ 14

41 نیا ادب اور کلیم،اداریہ،جلد 4 شمارہ 2,1،جنوری فروری 1941 صفحہ 85,65

42 نیا ادب،جنوری فروری 1941

43 نیا ادب،جنوری فروری 1941

44 ڈاکٹرعبدالعیم، ادبی تنقید کے بنیادی اصول، نیا ادب، جنوری 1941

45 سجاد ظہیر، یادیں مشمولہ نیا ادب اور کلیم، جلد 4 شمارہ 2,1 جنوری فروری 1941، صفحہ 75

46 سجاد ظہیر، یادیں مشمولہ نیا ادب اور کلیم، جلد 4 شمارہ 2,1 جنوری فروری 1941، صفحہ 75

47 نیا ادب بحوالہ سجاد ظہیر کے تنقیدی رویے (معاصر تنقیدی روّیے) از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، صفحہ 169

48 نیا ادب بحوالہ سجاد ظہیر کے تنقیدی رویے (معاصر تنقیدی روّیے) از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، صفحہ 70,71,72

49 ڈاکٹر وسیم بیگم، آزادی کے بعد اُردو غزل: تہذیبی مضمرات، ادبی تحریکات اور اہم شعرا، صفحہ 165

50 سجاد ظہیر، بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ شمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) صفحہ 117

51 ڈاکٹر عفت آرا شمسی، خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری، صفحہ 119

52 پروفیسر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام، ایوان اُردو، ستمبر 2000، صفحہ 7,8

53 سجاد ظہیر، بمبئی ترقی پسند تحریک کا منظر نامہ مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 132 تا 135

54 مناظر عاشق ہرگانوی، پوشیدہ لمحے، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 28

55 ستارہ جعفری، سردار بھائی، عالمی اُردو ادب، 2001 سردار جعفری نمبر (سردار جعفری: فن اور شخصیت) جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 28

56 پروفیسر محمد حسن، خطبہ صدارت سردار جعفری کی وراثت مشمولہ (سردار جعفری: شخصیت اور فن) مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 87

57 ڈاکٹر وسیم بیگم، آزادی کے بعد اُردو غزل: تہذیبی مضمرات، ادبی تحریکات اور اہم شعرا، صفحہ 140,141

58 خالد علوی، ترقی پسند رجحانات (مشمولہ غزل کے جدید رجحانات)، صفحہ 87

59 سردار جعفری، ترقی پسند ادب، صفحہ 221

60 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 91,92

61 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 81,82

62 عبدالقیوم ابدالی، بنّے بھائی، محرک پبلی کیشنز، آسنسول، بہار، اپریل 1986، صفحہ 30 بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 141

63 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 141,142

64 یعقوب یاور، ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری، صفحہ 90

65 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 83

66 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 29,30

67 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 420,422

68 ڈاکٹر ریاض احمد، ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول، صفحہ 40,41

69 پروفیسر محمد انورالدین، فکر و نظر، صفحہ 99

70 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 415,420

71 سبط حسن، سردار جعفری: چند یادیں، عالمی اُردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000 (سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 74

72 مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، اُردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 24,25

73 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، صفحہ 422

74 محمد اجمل خاں، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے بی ایچ ڈی 2010 شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی (غیر مطبوعہ) صفحہ 61

75 سردار جعفری، بمبئی اور کمیونسٹ پارٹی، کتاب نما، سردار جعفری نمبر، جلد 30، شمارہ 11، نومبر 1990، صفحہ 60

76 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 96

77 سید محمد مہدی، سردار جعفری، شخصیت کے چند پہلو، نیا سفر، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 81

78 ڈاکٹر محمد حسن، خطبہ صدارت: سردار جعفری کی وراثت مشمولہ (سردار جعفری: شخصیت اور فن) مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 15

79 عبداللہ ملک، سردار جعفری: نصف صدی پہلے کی یادیں، عالمی اُردو ادب 2001، سردار جعفری نمبر، (سردار جعفری: فن وار شخصیت)، صفحہ 118

80 انور ظہر خاں، سردار جعفری، جامعہ، جولائی تا ستمبر 1996، صفحہ 126

81 رفعت سروش، بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958 صفحہ 18

82 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 429

83 محمد اسداللہ، سردار جعفری مشمولہ خطوط ہمہ رنگ، صفحہ 397

84 محمد ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جدید، ستمبر 1999، صفحہ 92

85 پروفیسر قمر رئیس، مقدمہ، ترقی پسند ادب کے معمار، صفحہ 43,44

86 سردار جعفری، حیات، سجاد ظہیر نمبر 1973 بحوالہ پروفیسر قمر رئیس، مقدمہ، ترقی پسند ادب کے معمار صفحہ 43,44

87 ''گفتگو'' (سہ ماہی) ممبئی، شمارہ 1 فروری 1967، صفحہ 6

88 ڈاکٹر محمد حسین، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام، عالمی اُردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001 (سردار جعفری: فن اور شخصیت) جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 126

89 پروفیسر محمد انور الدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 426-425

90 سردار جعفری، پیش گفتار (باعث تاخیر) مشمولہ سہ ماہی گفتگو (بمبئی) شمارہ 5 تا 8 (فروری 1968 تا نومبر 1968) صفحہ 5

91 سردار جعفری، پیش گفتار، سہ ماہی گفتار، شمارہ 17 تا 20 (مارچ 1977 تا دسمبر 1977 صفحہ 5

92 سید شمیم احمد، گفتگو کی آزادی، سہ ماہی گفتگو، ممبئی، شمارہ 30 تا 32 (جون 1992 ت دسمبر 1992) صفحہ 9 بحوالہ علی سردار جعفری از عمر رضا، صفحہ 220,221

93 سردار جعفری، پیش گفتار، سہ ماہی گفتار، ممبئی، جلد 1، شمارہ 1، 1967 صفحہ 6,7,8

94 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 446, 447

95 سردار جعفری، پیش گفتار، "باعث تاخیر، سہ ماہی گفتگو، ممبئی، شمارہ 5 تا 8 (فروری 1968 تا نومبر 1968)، صفحہ 5

96 سردار جعفری، سردار جعفری کا دوسرا تحریری بیان، سہ ماہی گفتگو، ممبئی، شمارہ 5 تا 8 (فروری 1968 تا نومبر 1968، صفحہ 293 تا 283

97 سردار جعفری، پیش گفتار، گفتگو بند نہ ہو، سہ ماہی گفتگو، شمارہ 9، 10 (مارچ، جون 1975)، صفحہ 7,8

98 سردار جعفری، اقبال کا تصور وقت، سہ ماہی گفتگو، شمارہ 9، 10 (مارچ، جون 1975)، صفحہ 41

99 سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو، اداریہ، سہ ماہی گفتگو، ممبئی، شمارہ 9، 10 (مارچ، جون 1975)، صفحہ 6,7,8

100 عمر رضا، علی سردار جعفری، صفحہ 447,448,449

101 قمر رئیس، دلی میں ترقی پسند مصنفین کا اجتماع، گفتگو، ممبئی، شمارہ 11 تا 14 (سپٹمبر 1975 تا جون 1976)، صفحہ 10

102 سردار جعفری، پیش گفتار، سہ ماہی گفتگو، شمارہ 15، سپٹمبر 1976، شمارہ 16، دسمبر 1976 صفحہ 4,5

103 سردار جعفری، پیش گفتار، سہ ماہی گفتگو، شمارہ 15 سپٹمبر 1976 شمارہ 16، دسمبر 1976 صفحہ 6

104 عصمت چغتائی،تبصرہ ایون غزل(ناول از جیلانی بانو)،سہ ماہی گفتگو،شمارہ15،ستمبر 1976،شمارہ16، دسمبر1976،صفحہ 279

105 پروفیسرمحمد انورالدین،علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراورادیب) مرتبہ عبدالستاردلوی،صفحہ 428

106 گفتگو(پیش گفتار)،شمارہ17 تا20(مارچ تا ستمبر 1977)صفحہ 5

107 سردار جعفری،تعزیتی نوٹ،گفتگو،ممبئی،شمارہ17 تا20(مارچ تا ستمبر 1977)صفحہ 7

108 گفتگو،شمارہ21 تا23(مارچ تا ستمبر 1978)صفحہ 4

109 کپل شرما،علی سردار جعفری بحیثیت نثر نگار مقالہ برائے پی ایچ ڈی 2007،وکرم یونیورسٹی، اجین(مدھیہ پردیش)غیر مطبوعہ،صفحہ 256,257

110 عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 485,486

111 مکتوب سردار جعفری بنام خورشید سمیع،ماہنامہ شاعر،ممبئی،جلد 64،شمارہ11(نومبر 1993)صفحہ 6تا14

112 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری:ایک جائزہ ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی،گاندھی نگر،صفحہ 18

113 پروفیسرمحمد انورالدین،علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص،شاعراورادیب) مرتبہ عبدالستاردلوی،صفحہ 428

114 خطبہ صدارت پروفیسر رشید احمد صدیقی(بہار اُردو کانفرنس،پٹنہ،1951)بحوالہ سردار جعفری،دیباچہ،گفتگو،ممبئی شمارہ24 تا 29(دسمبر 1978 تا مارچ 1980)،صفحہ 12

115 سردار جعفری،تخلیق کی نئی سمت،گفتگو،شمارہ24 تا29(دسمبر 1978 تا مارچ 1980)،صفحہ 14,15

116 منشی پریم چند،خطبہ صدارت مشمولہ گفتگو،شمارہ24 تا29(دسمبر 1978 تا مارچ 1980)،صفحہ 20تا27

117 جاوید دربھنگوی،ترقی پسند بوطیقا کا مؤلف سردار جعفری،ہماری زبان،نئی دہلی،یکم تا21 اکتوبر 2000، صفحہ 16

118 منشی پریم چند،خطبہ صدارت مشمولہ گفتگو،شمارہ24 تا29(دسمبر 1978 تا مارچ 1980)،صفحہ 25

119 منشی پریم چند،خطبہ صدارت مشمولہ گفتگو،شمارہ24 تا29(دسمبر 1978 تا مارچ 1980)،صفحہ 23

120 پروفیسر نظیر صدیقی،علی سردار جعفری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس،صفحہ 53

121 محمد حسین،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جیسے:سردار جعفری کو آخری سلام،ماہنامہ ایوان اُردو،دہلی، ستمبر 2000 صفحہ 8

122 رفعت سروش،بمبئی کی بزم آرائیاں(خودنوشت)1945 تا 1958،صفحہ 18,19

123 ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت وانقلاب کا استعارہ:علی سردار جعفری،ایوان اُردو،ستمبر 2000،صفحہ 87

124 محمد حسین، خطبۂ صدارت: سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 22

125 ماہنامہ پونم، حیدرآباد، اگست 1980، صفحہ 6

126 پروفیسر محمد انورالدین، علی سردار جعفری کی ادبی صحافت مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) مرتبہ عبدالستار دلوی، صفحہ 424,425

127 ماہنامہ پونم، حیدرآباد، اگست 1980، صفحہ 6

128 سردار جعفری، محبت نامہ مورخہ 18 فروری 1977 ششماہی ''فن اور شخصیت''، کملیشور نمبر، مارچ 1977، صفحہ 34

129 سردار جعفری، مکتوب بنام صابر دت مورخہ 30 اپریل 1978، ششماہی فن و شخصیت کا غزل نمبر صفحہ 21,22

130 صابر دت، میرا صفحہ، فن اور شخصیت غزل نمبر، صفحہ 31

131 جاوید دربھنگوی، ترقی پسند بوطیقا کا مولف سردار جعفری، ہماری زبان، یکم تا 21/ اکتوبر 2000، صفحہ 16

132 قمر رئیس، مقدمہ، ترقی پسند ادب کے معمار، صفحہ 43

133 ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جرنل، ستمبر 1999، صفحہ 94

134 ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 266

135 سردار جعفری، ریڈیائی تقریر ''میں اور میرا فن''، مشمولہ سہ ماہی اُردو ادب، جولائی تا ستمبر 2000، صفحہ 33 تا 39

136 پروفیسر محمد عقیل، سردار جعفری کا ایک جائزہ الہ آباد کے حوالے سے مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 89

137 پروفیسر محمد حسن، خطبہ صدارت سردار جعفری کی وراثت مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 22، 23

138 ڈاکٹر محمد حسن، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے: سردار جعفری کو آخری سلام، عالمی اُردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001 (سردار جعفری: فن اور شخصیت)، صفحہ 16

139 ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، علی سردار جعفری اور عوامی ادب، ہماری زبان، یک تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 10

140 بشیر احمد انصاری، علی سردار جعفری اور انسانی اقدار مشمولہ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب) صفحہ 87

141 ملکہ نسیم، خوش آ گئی تھی جہاں کو قلندری اس کی، نخلستان، جولائی تا دسمبر 2000، صفحہ 90

142 ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سردار جعفری: ایک جائزہ ایک مطالعہ مشمولہ علی سردار جعفری: ایک مطالعہ گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، صفحہ 5

143 حمید اختر، ایک چراغ اور بجھا، مشمولہ سردار جعفری، شخصیت اور فن، مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 111

144 سردار جعفری، جشن اقبال، سہ ماہی گفتگو، مارچ، ستمبر، دسمبر 1991، صفحہ 651

145 پروفیسر ضیاء (علیگ) جعفری صاحب کینڈا میں، افکار کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر، دسمبر 1991 صفحہ 250

146 پروفیسر جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری جموں یونیورسٹی میں، افکار کراچی، سردار جعفری نمبر، صفحہ 632

147 سردار جعفری، چراغ لالہ، افکار سردار جعفری نمبر، نومبر، دسمبر 1991، صفحہ 651

148 سردار جعفری، گفتگو بند نہ ہو (ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا سردار جعفری سے لیا گیا انٹرویو 18/اپریل 1990، کتاب نما، علی سردار جعفری نمبر، نومبر 1990، صفحہ 37

149 سردار جعفری، ہم عصر ادبی مسائل، افکار سردار جعفری نمبر، نومبر دسمبر 1991، صفحہ 102

150 رباب جعفری، بھائی کے شب و روز، عالمی اُردو ادب 2001 سردار جعفری نمبر (سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 92

151 سردار جعفری، زندگی کا مختصر سفر نامہ، عالمی اُردو ادب 2001 سردار جعفری نمبر (سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 22,23

152 ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: فن اور شخصیت مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 88,89

153 پروفیسر سید محمد عقیل، سردار جعفری کا ایک جائزہ الہٰ آباد کے حوالے سے مشمولہ (سردار جعفری: شخصیت اور فن) مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 276

154 فضیل جعفری، علی سردار جعفری: چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں، ایوان اُردو، صفحہ 32

155 کالی داس گپتا رضا، میرے بزرگ دوست، آج کل، اکتوبر 2000، صفحہ 4

156 انور ظہیر خاں، سردار جعفری، جامعہ، جولائی تا ستمبر 1996، صفحہ 141

157 ڈاکٹر سلطان احمد، علی سردار جعفری: شخصیت اور فن کے آئنے میں مشمولہ سردار جعفری: شخصیت اور فن مرتبہ اصغر عباس، صفحہ 266,267

158 سید عاشور کاظمی، لندن کی ایک شام علی سردار جعفری کے نام مشمولہ سخن گسترانہ باتیں از سید عاشور کاظمی، صفحہ 30,31

159 عمر رضا علی سردار جعفری صفحہ 104

160 مظہر امام، سردار جعفری کی ہمہ جہتی، اُردو دنیا، ستمبر 2000، صفحہ 26

161 فصیح احمد صدیقی اور سید مجاہد حسین حسینی، انوار ادب، صفحہ 194

☆☆☆

سردار جعفری۔ادیبوں، دانشوروں اور ممتاز شخصیتوں کی نظر میں----------

عظیم فن کار کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر رضا رقمطراز ہیں:

''عظیم فن کار وہ ہے جو نوع انسان کی اکائی بن کر انسانی درد وغم سے اپنا رشتہ جوڑنے کی سعی کرے۔شاعر اپنے شعر کو ایسا پیرہن عطا کرے جس میں شرر اور شبنم دونوں عناصر شامل ہوں کیوں کہ انسانی زندگی کچھ اسی طرح کے پیراہن میں ملبوس نظر آتی ہے۔موجودہ دور ہی نہیں بلکہ ہر دور میں فن کار یا شاعر کو اگر چہ ایک مجاہدانہ رویے کا حامل ہونا چاہئے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ شاعر یا فن کار کا جہاد میدان جنگ میں نہیں بلکہ دلوں اور ذہنوں میں ہوتا ہے۔اس کے لیے اسے تلوار، یلغار اور بغاوت کے بجائے ایسے قلم سے جہاد کرنا چاہئے جو شاخ گل کا کام کرے اور دلوں، ذہنوں اور جذبوں کو شعلہ و شبنم دونوں کی ملی جلی کیفیت سے آشنا کرے اور ادبی حظ بھی فراہم کرے۔ 1

سردار جعفری کی شاعری کی خصوصیات، فکر وفن، امن مساعی، انسان دوستی اور اعلیٰ آفاقی اقدار کی پاسداری اور ان کے مقام کا ذکر بہت سے ادیبوں، دانشوروں، نقادوں، ممتاز شخصیتوں اور ان کے ساتھ وقت گزارنے والوں نے کیا ہے۔

اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

عزیز قیسی :

سردار جعفری پر لکھنا بہت جی داری کا کام ہے
سفینہ چاہئے اس بحر پیکراں کیلئے

سردار جعفری پچاس برس سے اردو کے بہت اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔انہوں نے بہت لکھا۔ان پر بھی بہت لکھا گیا۔اردو میں، اردو کے علاوہ دنیا کی اور کئی زبانوں میں ان کی شاعری کے ترجمے ہوئے۔شعر کے علاوہ ان کی تنقیدیں، تقریریں، دوسری کتابوں کے دیباچے، تقریظیں کئی رسالوں کی ادارتی تحریریں، ان کی تشریحات اور مرتب کردہ کتابوں کے حواشی سب ہی اہم تحریریں ہیں''۔ 2

پروفیسر عبدالستار دلوی :

''سردار جعفری کے افکار چاہے ان کا اظہار شاعری ہو امیں ہو یا نثر میں یا ان کی تقاریر میں ان کے پیش نظر یہی بنیادی مقصد رہا ہے کہ زبان وادب کو اظہار محبت، دوستی و یگانگت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے اظہار کا وسیلہ بنایا جائے۔ان کے شعری ونثری کارنامے اولاً ملک وقوم کے اتحاد، بھائی چارہ اور انصاف پسندی کو محدود جغرافیے میں جگانے کا کام کرتے رہے، پھر انہوں نے براعظم ایشیاء کو استعماری طاقتوں کے خلاف للکارا اور اپنی مشہور نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' لکھی جس کی تہہ میں عالمی برادری، محبت، عزت واحترام اور انسان دوستی .....کو اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا۔.....سنسکرت ادب کے جستہ جستہ حصوں کے اور بطور خاص کالیداس کی منظومات کو اردو کے شعری پیکروں میں ڈھال دیا.....چارلیس اور لیمپ کی شیکسپیر کی کہانیوں کے اردو تراجم ہیں۔.....دیوان غالب کو اپنے عالمانہ اور فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ اردو اور ہندی میں 1958ء میں مرتب کیا۔

دیوان میر کو بھی اردو اور ناگری میں شائع کیا تا کہ اس خدائے سخن کو غیر اردو داں بھی پڑھ اور سمجھ سکیں..... جعفری صاحب نے برج کے عظیم صوفی شاعر کبیر کو ناگری اور اردو لکھاوٹ میں اپنے فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ پیش کیا..... پریم بانی میر میرابائی کے الوہی گیت اور بھجن مرتب کیے..... اس طرح زبانوں کے تخلیقی لین دین میں بھی جعفری صاحب نے ایک اہم رول ادا کیا ہے اور اس اہم کام سے یکجہتی، بھائی چارہ اور قومی فکری دھارے کو وسعت اور توانائی عطا کی ہے..... جعفری صاحب کے موضوعات میں تنوع ہے، مغرب سے مشرق تک، ویتنام، کوریا، کشمیر بلکہ ساری دنیا کے غم کو اپنے سینے میں جگہ دی وہیں پر وہ ملکی مسائل، ہندوستان کی تہذیبی روایات اور مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری اور بھائی چارے اور صلح و آشتی کو اپنی شاعری کی ایک بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں..... سردار جعفری کی شاعری..... انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری ظالم کے خلاف بغاوت اور مظلوم سے ہمدردی کی شاعری ہے مذہبی منافرت، تنگ نظری اور استحصال کے خلاف، احتجاج اور بغاوت ادیب اور شاعر کا ایک اہم مطمح نظر ہوتا۔ وہ ہمارے عہد میں اردو زبان و ادب اور عصری دانشوری کا مینارہ نور تھے"۔ 3

پروفیسر عبدالستار دلوی نے سردار جعفری اور قومی شعور پر ایک مبسوط مضمون تحریر کیا۔

اس کے اقتباسات پیش ہیں:

1۔ ''ان کے (سردار جعفری) قومی شعور اور تصور قومیت پر اقبال کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا قومی شعور اقبال کے قومی شعور سے ہم آہنگ ہے جس میں استحصال اور ظلم و جبر اور غلامی، بلا تخصیص ملک و ملت آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ ان کا قومی شعور اور قومیت، انسان دوستی اور بین اقوامیت سے مربوط ہے''۔

2۔ ''مجموعی طور پر یہ (سردار جعفری) قومی حریت پسندی کے شاعر ہیں اور یہ آزادی اور حریت پسندی کا جذبہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام ممالک میں جو غلامی کے دیو استبداد کا شکار تھے اور جس پر یورپی سامراج کی حکومت تھی۔ یہ غلامی، یہ جبر اور یہ استحصال افریقی اور ایشیائی ممالک پر زیادہ تھا۔ ایشیا ء جاگ اٹھا'' سردار جعفری کی ایسی نظم ہے جو اسی سیاسی غلامی اور معاشی استحصال کے پس منظر میں کہی گئی ہے۔ ایشیائی ممالک کمزوروں کے گھر تھے۔ لیکن ایک زندہ اور توانا دل اور حوصلے یہاں کے عوام کے دلوں کو گرماتے تھے۔ جب وہ اپنی شاعری میں ہندوستان کی غلامانہ زندگی پر رائے دیتے ہیں تو وہ سارے کمزور ایشیائی و افریقی ممالک کی بھی بات کرتے ہیں اور اس طرح ان کی قومیت کا یہ تصور صرف ہندوستانی، قومیت کی علامت نہیں بنتا بلکہ وہ سارے عالم کی اور سارے انسانوں کی باعزت اور باوقار زندگی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے''۔

3۔ ''ہندوستان کسی ایک مذہب، کسی ایک عقیدے اور کسی ایک تہذیب کی پناہ گاہ نہیں ہے۔ اس میں مختلف مذہب، مختلف عقیدے، مختلف زبانیں اور مختلف تہذیبیں پرورش پاتی رہی ہیں۔ لہذا یہ ایک مشترکہ تہذیبی قومیت کا ملک ہے جس میں ہندو، مسلمان، بدھ، سکھ، عیسائی اور پارسی سبھی شامل ہیں اور یہاں قوم اور قومیت کی اصطلاح وسیع تر سیاق میں استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قومیت اور قومی شعور کی اصطلاح یورپی قومیت سے، یا عرب قومیت کے ہم معنی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک آزادانہ شناخت ہے جو اپنے اندر ایک وزن و وقار رکھتی ہے۔ اس کا اپنا ایک حسن ہے جو قابل رشک ہے''۔

4۔ ''قومیت'قومی شعوریاحب الوطنی کے معنی صرف قصیدہ خوانی نہیں ہے کہ شاعریا ادیب وطن اورقومی کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ملک میں ابھرنے والی ہرتحریک'ہرآواز اور ہرفلسفہ قومیت کی علامت نہیں ہوتا بلکہ اس میں فاشزم کی بو بھی آسکتی ہےاورشاعر کی تمام تر وطن دوستی کے باوجوداس پرایک ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہےاوروہ ذمہ داری یہ ہے کہ منفی نظریات اورفاشزم کےتعلق رکھنے والےنظریات کی نفی بھی کرے۔ایسے غیرصحت مند خیالات جوملی جلی تہذیبی قدروں کو پامال کرتے ہوں انہیں روکنا بھی شاعرودانشور کافرض ہے'چنانچہ سردارجعفری کا قومی شعورانہیں اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ وہ حالات حاضرہ میں پیش آنے والے ہرنظریہ کواگر چہ وہ قوم اورقومیت کے نام پرہی کیوں نہ پیش کیا گیا ہو'اس کے خلاف بھی آوازاٹھائے۔قوم پرستی جہاں سامراجی طاقتوں کےخلاف اظہاربغاوت ہے وہیں پرقومی طاقتوں کےاقلیتوں پراوران سے جڑی ہوئی تاریخ پرحملوں کےخلاف احتجاج کابھی نام ہے''اجودھیا''پرجعفری صاحب کی نظم جودوسال قبل ایک تنازعہ کاشکار ہوئی'وہ بھی قوم پرستی کےمنفی رجحان کےخلاف غم وغصہ کامظہرتھی اوریہ بھی عین قومی شعورکاحصہ ہے''۔صرف بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کےخلاف ہندوستانیوں کومجتمع کرنا اوراحساس یکجہتی پیدا کرنا ہی قومیت کی بنیادنہیں ہے بلکہ ہم وطنوں میں اکثریت کے نشے میں چورا قلیتوں کےخلاف ظلم وجوراوراستبداد کےخلاف معرکہ آرائی بھی قومی شعورقومیت کاحصہ ہےاوریہ شعورسردارجعفری کی شاعری میں بدرجہ اماتم موجود ہے'یہ ورثہ سردارجعفری کوا قبال کی دین ہے جسے انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں اپنے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ 4

ڈاکٹرہمایوں اشرف نےعلی سردارجعفری کی شاعری پرتبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

1۔''سردارجعفری کی شاعری ترقی پسندافکاراورعوام کےاحساسات کی ترجمانی کرتی نظرآتی ہے۔موضوع'ہیئت اور اسلوب ہرپہلو سےان کی شاعری کامقصدرومحورعوام ہیں۔اپنی شاعری کےذریعےوہ عوام میں تاریخی شعور پیدا کرنے اوران کےذہن کوانقلاب کےلیے تیارکرنے کےمتمنی تھے۔جعفری صاحب کی شاعری میں عوامی فکروفلسفہ'انسان دوستی'جمہوری اقدار' انقلاب کی لے'جوش وولولہ'للکار'سرشاری کےساتھ ساتھ شعری حسیت اور جمالیاتی احساس بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں سیاسی وسماجی حقیقتوں کی کھردارہٹ کےساتھ ساتھ مترنم ڈکشن کا جمال بھی موجود ہے۔

2۔''سردارجعفری کی شاعری آفاقیت'گہرائی اوردائمی قدروں کی حامل ہے۔انہوں نے کلاسیکی نظم وضبط اورشائستگی کے ساتھ جدیداظہارخیال واسالیب بیان کوبڑی خوبی سےاپنایا ہے۔ان کےاسلوب میں ندرت اورتازگی کےساتھ ساتھ جاندار کلاسیکی روایات کاامتزاج بھی پایا جاتا ہے۔علی سردارجعفری بے پناہ شعری قوت کے مالک تھے۔ان کا جو Potential ہے وہ بہترین شاعر کا Potential ہے۔جسے انہوں نے زیادہ تر Exploit کیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اکثروبیشتر ان کےفن پر ان کا پیغام حاوی ہوجاتا ہے اوران کی تمام تر Poetic Sensibility کراہنے لگتی ہے۔جہاں بھی انہوں نے شعری مطالبات کاخیال رکھاہے وہاں وہ تمام ترقی پسند شاعروں میں سب سے بلندوبرترمعلوم ہوتے ہیں۔ان کےشعری مجموعے پرواز(1978)اورنومبرمیرا گہوارہ(منظوم سوانح)کےمطالعہ سےمذکورہ نکات کی نشاندہی ہوتی ہے''۔5

ڈاکٹر ہمایوں اشرف :

1۔ ''اردو کے عالمی شہرت یافتہ شاعر' ذی فہم ادیب' صاحب نظر نقاد' محقق اور دانشور علی سردار جعفری بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت سے اردو ادب ہی نہیں پورے ہندوستانی ادب کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس وقت ہندوستان کے ادبی منظر نامے پر ان جیسا انقلابی شاعر' شعلہ بیان مقرر' بے باک صحافی' دانشور اور مشترکہ تہذیب کا علمبردار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 87 سال تھی' جس میں سے ستر سال سے زیادہ حصہ اردو شعر و ادب کی خدمت اور سامراجیت' ظلم و جبر اور طبقاتی تفریق کے خلاف جہاد میں گزرا۔ انہوں نے خدمتِ لوح و قلم کے ساتھ عمل سیاست میں بھی حصہ لیا تھا۔ تحریک آزادی کی لڑائی کے ساتھ ساتھ کسانوں' مزدوروں' دلتوں' پسماندوں کی بیداری اور ان کی سرگرمیوں میں بھی شریک رہے اور حکومت برطانیہ کے خلاف مختلف قسم کی بغاوتوں کے الزام میں جیل بھی گئے۔ جعفری صاحب آخری لمحے تک ادبی و ثقافتی اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ وہ زندگی بھر قلم کے سپاہی بنے رہے۔ انہوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ ساری زندگی اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کیلئے ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے پسماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو اپنی تخلیقات سے جگایا اور ہمیشہ زندگی کی کھردری سچائیوں کو لفظوں کے ذریعہ بیان کیا۔ سردار جعفری کو کھلی روحانیت' ماضی پرستی' فراریت' فرقہ پرستی' نسلی تعصب اور انسانی استحصال کے کٹر مخالف تھے اور اپنے آپ کو مذہب' قومیت' فرسودہ سماج اور ملکی دائرے میں قید کر کے نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ آزادی' مساوات' حق و انصاف' اجتماعیت' جمہوریت' سماجی حقیقت نگاری' انسان دوستی' رجائیت' مصروفیت' آزادی فکر و اظہار اور انقلابی اقدار پر زور دیا۔ وہ انسانیت کے شیدائی اور علمبردار تھے۔ ان کا دل سوز محبت سے لبریز تھا۔ تمام انسانوں کے دل کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں ہر ایک کے غم میں اشک بار ہوتیں اور سب کی خوشیوں پر مسکراتی تھیں۔ غریبوں' دکھیوں اور غمزدوں کیلئے رحم کے جذبات سے چھلک جاتی تھیں''۔

2۔ ''انہوں نے (سردار جعفری) اپنے آپ کو کسی ایک میدان تک محدود نہیں کیا۔ صحافت و ادب' افسانہ و ڈراما' تنقید و تحقیق' خطابت و شاعری' سیاست و اشتراکیت' فلم و ٹی وی' ریڈیو و اسٹیج' مکالمے و غنائیے' ہر میدان میں انہوں نے اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھائیں۔ انہوں نے جس صنف ادب پر قلم اٹھایا' اس میں تخلیق کی جوت سے اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا۔ شاعری کی جملہ اصناف پر طبع آزمائی کے ساتھ نثر میں بھی ان کے قلم نے افسانے' ڈرامے' خودنوشت سوانح' رپورتاژ' تنقیدی و تحقیقی مضامین' تبصرے' اداریے سے لے کر کالم تک ہر نوع کے موضوعات پر اہم ترین تحریریں پیش کیں۔ ایسی تحریریں جن میں اپنے عصر کا آئینہ بننے کی صلاحیت بھی تھی۔ اسی لیے ان کا شمار بین الاقوامی شہرت کے حامل تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ یوروپ اور ہندوستان کی متعدد زبانوں' انگریزی' فرانسیسی' روسی' ازبک' چینی' فارسی' ہندی' تلگو' ملیالم وغیرہ میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہو چکا ہے''۔

3۔ سردار جعفری فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔ انہوں نے متعدد فلموں مثلاً 'انہونی' 'زلزلہ' 'فٹ پاتھ' 'پردیسی' 'شہر اور سپنا' 'دھوبی ڈاکٹر' وغیرہ کے گیت اور فلم 'میلہ' 'سازش' اور 'رضیہ خاتون' کی کہانیاں لکھی تھیں''۔ 6

''علی سردار جعفری کے انتقال سے اردو ادب ہی نہیں پورے ہندوستانی ادب کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ان جیسا انقلابی شاعر' بے باک صحافی شعلہ بیاں مقرر' دانشور اور مشترکہ تہذیب کا علمبردار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ 7

''عصری ادب میں ان کی (سردار جعفری) حیثیت ایک سردار کی سی تھی' اردو شعر و ادب کے ایوان میں ان کی آواز مدتوں گونجتی رہی اور آئندہ بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی''۔ 8

مظہر امام :

سردار جعفری کی وفات اردو ادب ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب کا ایسا نقصان ہے کہ اس کی تلافی شائد ہی ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری نے عالمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دنیا کی شائد ہی کوئی بڑی زبان ہو جس میں سردار جعفری کے کلام کا ترجمہ نہ ہوا ہو اور دنیا کا شائد ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں انہیں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے نہ جانا جاتا ہو۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے' سردار جعفری کا مرتبہ ایک شاعر یا ادیب سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ یعنی انہیں نظر میں رکھے بغیر اس زمانے کے ادبی مزاج' ادبی رویے اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ فیض کے انتقال کے بعد وہ برصغیر کے سب سے بڑے شاعر تھے اور جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے بعد کی نسل میں جو ممتاز شاعر ہوئے یعنی مجاز' جذبی' فیض' مخدوم' جاں نثار اختر' ساحر لدھیانوی' کیفی اعظمی' سردار جعفری اسی کہکشاں کا ایک بے حد چمکتا ستارہ تھے''۔ 9

ضیاء الدین اصلاحی:

''غزل میں بھی فکر سخن کی ہے مگر ان کا (سردار جعفری) جوہر نظموں میں زیادہ کھلتا تھا' زبان و بیان پر پوری قدرت تھی اور فن کی نزاکتوں اور باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے' ان کی نظمیں اپنے جلال و جمال کی وجہ سے اردو شاعری میں جاوداں رہیں گی۔ ان میں انسان دوستی اور انسان سے محبت' عام لوگوں کے دکھ درد' امن اور صلح و آشتی کو اصل موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری سامراجیت' جبر و استبداد اور طبقاتی امتیاز کے خلاف ایک للکار معلوم ہوتی ہے جس سے وہ ہندوستان ہی نہیں ایشیاء بلکہ دنیا کی پسماندہ تمام اقوام کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور غریب مزدور' محنت کش طبقہ اور دبے کچلے عوام کے دلوں میں انقلاب کی شمع روشن کر کے ان کو ہمت و حوصلہ اور طاقت و جرأت عطا کرنا چاہتے تھے۔ جعفری صاحب ظلم و ناانصافی' فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف نبرد آزما رہنے کے علاوہ کمزور اور پس ماندہ لوگوں اور اقلیتوں کے حقوق و مفاد کے لیے زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے' ملک کی تقسیم' بابری مسجد کے انہدام اور ان دونوں واقعات کے ہونے والے فسادات سے وہ بہت دلگیر اور دل شکستہ تھے' بابری مسجد کے انہدام کے خلاف بڑی جرأت و بے باکی سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور اس پر نظم بھی لکھی۔ ہندو پاک کی دوستی ان کی شاعری کا اہم موضوع تھا۔ اپنی مشہور نظم ''سرحد'' میں بتایا ہے کہ سرحد مصنوعی اور انسان کی خود ساختہ ہے۔ اس سے ہمیں کیا غرض؟ ہمارا تو پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ 10

پروفیسر علیم اللہ حالی نے سردار جعفری کو روح عصر کا شاعر قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سردار جعفری کے نظریے

اور شاعری سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

1۔"یہ بات صحیح ہے کہ تمام نظریات واصول کا سب سے اہم منصب یہی ہے کہ انسان اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگیوں میں مہذب، خوشحال، انصاف پسند، ایثار کے جذبے سے معمور کشادہ قلب، ذہنی واقتصاری اعتبار سے مطمئن پرامن اور مدنی جذبات کا حامل رہے۔سردار جعفری کے نزدیک یہ نسخہ کیمیا آج کے دور میں اشتراکی اصول کے کامیاب نفاذ سے حاصل ہوسکتا ہے۔اس نظریئے کے طفیل وہ ایک آسودہ حال اور مسرور انسانی معاشرے کے قیام کو ممکن الحصول سمجھتے ہیں"۔

2۔ان کی (سردار جعفری) شاعری اپنے عصر کی اصلاح کی فکر کرتی ہے۔کوئی ایک عصر لازمی طور پر اپنے مابعد کے ماہ وسال سے وابستہ ہوتا ہے لہذا اپنے عصر کی تعمیر واطمینان کا ضامن بھی بن جاتا ہے اور آنے والے ادوار کا بھی۔اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سردار جعفری کی شاعری امروز سے فردا کی طرف سفر کرتی ہے۔ایک خوشگوار وطن سے ہی آنے والا کل خوشگوار ہوسکتا ہے۔گویا اگر میں سردار جعفری کو روح عصر کا شاعر کہتا ہوں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ فردا کے لیے بھی اثاثہ راحت مہیا کرتے ہیں"۔

3۔"سردار جعفری کی شاعری اکثر وبیشتر انسانی معاشرت کو فطرت سے قریب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ فطرت کی خوبصورت پیکر تراشی کرتے ہیں لیکن کسی رومانی شاعر کی طرح اس کی آغوش میں سو رہنے کے قائل نہیں۔فطرت کے ان پیکروں سے وہ تحرک، تفاعل، رفتار، جودت اور توانائی کے خصائص حاصل کر کے انہیں تمام انسانوں کے لیے مفید کار بنانا چاہتے ہیں۔عام رومانی شاعروں کی خودغرضانہ مسرت کوشی کبھی سردار جعفری کا رویہ نہیں رہا"۔

4۔"انہوں نے اردو شاعری کو نئی معنویت عطا کی ہے۔عصری موضوعات کی صلابت کو انہوں نے حسین ولطیف شعری اظہارات کے ذریعہ محبوب ومطبوع بنادیا ہے۔سردار جعفری نے اپنے فن کیلئے جس روح عصر کی بات کہی ہے وہ دراصل انسان کے تہذیبی وتمدنی ارتقا کی ایک بے حد وسیع تاریخ پر محیط ہے۔ماضی، حال اور مستقبل کو بیک وقت اپنے فطری تناظر میں دیکھنے اور انہیں شعری وقار بخشنے والی دوسری شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ 11

سردار جعفری کی وقتی اور ہنگامی نظموں کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر روشن اختر کاظمی رقمطراز ہیں:

"سردار جعفری عوام کی اہمیت، عظمت اور بیداری میں یقین رکھتے ہیں۔انہیں ایک بہتر مستقبل کی صرف تمنا نہیں بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مستقبل روشن وتابناک ہوگا۔چنانچہ ان کی وہ نظمیں جو ہنگامی ضروریات کے پیش نظر وجود میں آئیں ان میں بھی زندگی کی دھڑکنیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ایسی نظموں میں معاہدہ تاشقند، قتل آفتاب وغیرہ اہم ہیں کیوں کہ وقتی اور ہنگامی ہونے کے باوجود یہ اردو نظم نگاری کی طویل روایت میں اہمیت کی حامل ہیں۔یہ نظمیں اپنے مزاج اور فن کے اعتبار سے ایک نئے دور کی علامت ہیں جن میں ملکوں کی سرحدوں کے تقسیم ہوجانے کا ماتم ہے اور ساتھ ہی عظمت رفتہ اور ماضی کی الفتوں کے تخلیقی سرچشموں کی حقیقی اور ابدی مشترک قدروں کا بھرپور احساس بھی۔سردار اپنی نظموں کے باعث اردو نظم میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے"۔ 12

کوثر مظہری نے سردار جعفری کے تہذیبی سروکار کے بارے میں لکھا ہے:

1۔ ''یوں تو بظاہر سردار جعفری کی زیادہ تر نظمیں ہنگامی نوعیت کی ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تہذیبی وثقافتی ویژن بیدار رہے۔ بلکہ اس عہد میں جب ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا' دو تین شعراء ایسے نظر آتے ہیں جن کی جڑیں اس قدر اپنی تہذیبی وتمدنی اقدار میں پیوست ہیں۔ میرے ذہن میں تین نام آتے ہیں۔ فیض' اختر الایمان اور سردار جعفری۔ اس عہد کی تہذیبی تثلیث ان تینوں سے تیار ہوتی ہے۔ اگر اختر الایمان کو حذف کر دیں تو صرف دو نام رہ جائیں گے جن کے یہاں آفاقی انسانیت وہمدردی اور اپنی تہذیبی قدروں کے عناصر کافرما نظر آتے ہیں''۔

2۔ سردار جعفری کی نظموں میں ہندوستانی حکائی واسطوری تلازمات کی واضح نشانیاں مل جاتی ہیں۔ مور کا خوشی سے رقص کرنا' پیپل کے نیچے پتھر کے دیوتا کا ہونا' برگد کی جٹاؤں کا ذکر' کسانوں کے کھردرے ہاتھ' لوہار کا گھن' کمہار کا چاک' آنگن میں دوپٹے کا ٹنگا ہونا اور پھر خاک اودھ کا اپنی طرف بلانا۔ سردار کے تاریخی وتہذیبی شعور کے پختہ ہونے پر دال ہیں۔ ان کی نظموں کے تہذیبی رویے صاف ہیں۔ ان کی فکری وتہذیبی اساس پر کسی طرح کے تصنع کی دھند نہیں''۔

3۔ ''ان کی (سردار جعفری) تخلیقی بصیرت ہمیشہ اپنی تہذیبی وثقافتی پونجی اور اس کے تلازموں پر مرکوز رہی' جس فنکار کی تہذیبی وتمدنی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں' اس کا فن پارہ ہمیشہ معاشرے اور زمانے کو روشنی دیتا ہے۔ سردار کی بیشتر نظمیں تہذیب اور اپنی ثقافت اور اس کے متعلقات کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کی صحیح تفہیم کے لیے تہذیبی سروکار تک رسائی شرط اولین ہے''۔ 13

راشد انور راشد نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری میں زمین اور مٹی کی خوشبو قدم قدم پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ بمبئی جیسے صنعتی شہر میں طویل مدت گزارنے کے باوجود وہ تیز رفتار مشینی زندگی کا حصہ کبھی نہیں بن پائے۔ ان کے ذہن میں یادوں کا وہی قافلہ محو سفر رہا جو گاؤں اور بچپن کے غیر معمولی جذبات واحساسات کا آئینہ دار تھا۔ سردار جعفری اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ جب تک فن پارے میں اپنی مٹی سے لگاؤ کا احساس شامل نہیں ہوگا' پڑھنے والا ان محسوسات میں کبھی شریک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس کسوٹی کو اپنے پیش نگاہ رکھا اور اپنی تخلیقات میں ان یادوں کو پوری شدت کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی جو شائد گردش زمانہ کے سبب وقت کی گرد سے ڈھکتی چلی جاتیں''۔ 14

حبیب الرحمٰن چغانی نے سردار جعفری کی آزاد نظموں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے ان کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظمیں خاص کر آزاد نظمیں جاندار معلوم ہوتی ہیں۔ براہ راست دل پر اثر کرتی ہیں۔ کہیں ان میں موجوں کی روانی ہے تو کہیں باد صبا کی لطافت' کہیں تلوار کی کاٹ ہے تو کہیں گیسوئے سنبل کے نرمی' کہیں زمانہ کا دکھ ہے تو کہیں ضمیر کی آواز' کہیں ظلم وتشدد کی چیرہ دستیاں ہیں تو کہیں صبح کا انتظار کہیں جنگ کے شعلے ہیں تو کہیں امن کا پیغام' غزلوں میں وہ زور نہیں۔ ان کے معاصرین میں فیض' مخدوم' مجروح اور جذبی غزل گو کی حیثیت سے زیادہ قد آور ہیں۔ ویسے تو بعض ناقدین کا یہ بھی خیال ہے کہ اختر الایمان اور ساحر لدھیانوی نظموں میں سردار جعفری کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں کی نظمیں اچھی ہیں اور بعض بہت اچھی ہیں لیکن سردار سردار ہیں وہ نظموں کے شہنشاہ ہیں۔ ان کی ابتدائی نظمیں نعرہ

بازی کی مظہر ہیں لیکن اس کا اطلاق ان کی سب نظموں پر نہیں ہوتا۔ یہ توقع کرنا کہ شاعر کا ہر شعر اچھا ہونا ممکن ہے۔ غالب قو مومن کے صرف ایک شعر پر ہی اپنا دیوان دینے کو تیار تھے۔ اگر کسی شاعر کے کلام کا معتد بہ حصہ اچھا ہے تو اسے اچھا ہی کہیں گے۔ اگر کچھ حصہ ہی سہی بہت اچھا ہے تو بھی اسے اچھے شعراء کے زمرے میں ہی رکھیں گے"۔ 15

ڈاکٹر شمیم رضوی :

"ان کی (سردار جعفری) شاعری میں اگر ایک طرف انیس کے مرثیوں کی واقعہ نگاری اور سرداری ہے تو دوسری طرف اقبال کی ژرف نگہی کا ہنر بھی، جوش کی سی گھن گرج ہے تو فیض کی سی آراستگی بھی اور ان سب خصوصیات کو انہوں نے اپنی "بصارت" و "بصیرت" سے وہ آگہی دی کہ ہزاروں میں ان کی آواز کی ایک پہچان قائم ہوئی۔ اس شناخت اور پہچان کو بنانے کیلئے قطرے کو گہر ہونے تک کتنا لمبا سفر درکار ہوتا ہے، اسے کن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا تصفیہ تو ایک پارکھ ہی بخوبی کرسکتا ہے"۔.....

"آسمان ادب کے ترقی پسند قلم کاروں کے تابندہ ستاروں کے جھرمٹ کا درخشندہ ستارہ پدم شری علی سردار جعفری، کثیر الجہات شخصیت، ذی فہم ادیب، شعلہ نوا شاعر، صاحب نظر نقاد، بالغ نظر مفکر، انسان دوست، امن کا شیدائی، اشتراکیت کا علم بردار، صحافت و خطابت کا مرد میدان اور میڈیا کا جانکار"۔ 16

ڈاکٹر شمیم رضوی نے سردار جعفری کی شاعری کی بنیاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

1۔ "اذان و اقامت کے بعد جو پہلی آواز علی سردار کے کانوں میں پڑی تھی وہ تھی میر انیس کے مرثیے۔ امام حسین کی عظیم الشان شہادت اور ان کے جاں نثاروں کی جرأت نے علی سردار کو بچپن ہی سے صداقت و جرأت کا سبق پڑھایا اور حق و باطل کے فرق کو سمجھا دیا۔ گاؤں میں رہ کر بھوک، افلاس اور بے کسی کے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کچھ ہوش سنبھالا تو اردگرد جاگیرداروں کی جابرانہ زندگی اور کسانوں پر بے پناہ ظلم کا نظارہ دیکھ کر ان کا دل دردمند جاگیردارانہ نظام سے بیزار ہوگیا۔ سوشلسٹ نظام حکومت میں انسانوں کی فسادات کا سبق انہیں بھا گیا اور وہ کمیونسٹ اصولوں کی طرف مائل ہوگئے"۔

2۔ 1936ء میں علی گڑھ کی تعلیم کے دوران برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں تقریر کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دیئے گئے۔ یہ گویا ان کا پہلا احتجاجی قدم تھا۔ 1940ء میں لکھنو یونیورسٹی کے دوران تعلیم باغیانہ جرأت مندی پر پہلی بار جیل ہوئی اور پھر لکھنو ڈسٹرکٹ جیل، بنارس سنٹرل جیل کی زندانی زندگی کے لمحات نے ان کی متاع لوح و قلم کو اور بھی جلا بخشی۔

3۔ "1933ء سے 1939ء کا زمانہ تاریخ میں بہت اہم رہا ہے۔ ایک طرف جرمنی اور اٹلی میں فاشزم نے سر اٹھایا، دوسری طرف ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے اس زمانے میں زور پکڑا۔ ملک راج آنند، سجاد ظہیر، پریم چند، ڈاکٹر رشید جہاں، مجاز، سبط حسن، جذبی، فیض، مخدوم محی الدین اور کیفی جیسے قلم کار اس تحریک سے وابستہ تھے۔ علی سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کا پیغام طالب علمی کے زمانے میں سنا تھا، انہوں نے اسے شعوری طور پر قبول کیا اور اپنے شعری عمل کو شعوری طور پر اشتراکیت کے مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنایا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں علی سردار

جعفری کی شاعری کو پر وبال عطا ہوئے۔اس تحریک سے وابستہ لکھنے والوں کا رویہ عموماً احتجاجی ہے۔ان کے اظہار کے تین وسیلے ہیں: اول ۔طبقاتی کشمکش کے طور پر مزدور اور محنت کش طبقے کا ذکر۔ دوم ۔نظام کہنہ کے خاتمے کے لیے انقلاب اور بغاوت کا ذکر۔سوم۔عورت کے بجائے عروس وطن سے التفات اور اس کا خصوصی ذکر۔یہ موضوعات بالکل اچھوتے اور نئے نہیں تھے۔سرمایہ داری کی مذمت اور انقلابی نعروں کے نقوش اقبال اور جوش کی شاعری میں واضح طور پر موجود ہیں۔البتہ ترقی پسند شعراء کا واحد مقصد حصول آزادی اور باطل و جابر کے خلاف آواز بلند کرنا تھا۔سردار جعفری کی شاعری کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی گئی"۔ 17

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید:

"مجموعی طور پر سردار جعفری کی شاعری آفاقیت، گہرائی اور ان دائمی قدروں کی حامل ہے جو ہر دور میں انسانیت کو عزیز رہی ہے"۔ 18

پروفیسر عبدالستار دلوی:

"سردار جعفری کی شاعری، انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی شاعری ہے۔ان کی شاعری ظالم کے خلاف بغاوت اور مظلوم سے ہمدردی کی شاعری ہے۔مذہبی منافرت، تنگ نظری اور استحصال کے خلاف احتجاج اور بغاوت ادیب اور شاعر کا ایک اہم مطمح نظر ہوتا ہے۔ 19

ڈاکٹر فیروز:

سردار جعفری کی شاعری کی قومی و ملکی اہمیت ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت اور معنویت بھی مسلم ہے جب تک دنیا کے کسی بھی ملک میں غریبی، بے روزگاری، ظلم و ستم، نفرت تفرقہ پروری اور کسی بھی قسم کا جابرانہ استحصال نظام قائم رہے گا۔سردار کی شاعری اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا پیام دیتی رہے گی۔ان کی شاعری دراصل تیسری دنیا کے انسان کی پکار اور اس کے تمام مسائل کی موثر آواز ہے۔اس آواز کو نہ دبایا جا سکتا ہے نہ ہی بھلایا جا سکتا ہے۔سردار جعفری نے شاعری کو اپنے عہد کی تعمیری فکر و دانش کا ترجمان بنایا ہے۔ان کی شاعری میں زمانے اور زمین کے متنوع مسائل کا بیان بھی ہے اور انہیں حل کرنے کی تدابیر کا واضح اظہار بھی"۔ 20

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید:

"وہ (سردار جعفری) ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن ہیں لیکن ان کا شاعرانہ منصب و مقام ترقی پسند تحریک کے حدود سے ماورا ہے۔ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث کئی شعراء کو ادب میں مقام ملے گا جب کہ سردار جعفری کی شخصیت اور شاعرانہ انفرادیت کے باعث ترقی پسند تحریک ہمیشہ یاد رکھی جائے گی"۔ 21

ڈاکٹر ہمایوں اشرف:

"علی سردار جعفری، فیض کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ان کی شاعری اور دانشوری ایک امر مسلمہ ہے۔"22

''جعفری صاحب' فیض احمد فیض کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ان کی تخلیقی شخصیت متنوع جہات کی حامل ہے۔اردو ادب اور اردو رجحانات کا ایک پورا دور ان کی شخصیت اور کارناموں سے وابستہ ہے''۔ 23

سید انور سعید' رجسٹرار' جامعہ اردو' علی گڑھ:

''انہوں نے (سردار جعفری) ملک کی آزادی کیلئے اپنی نظموں کو ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔'' 24

راج بہر عظم اسٹار ممبر پارلیمنٹ:

''علی سردار جعفری کو کسی مذہب یا سرحد میں قید نہیں کیا جاسکتا۔وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن کے آگے حکومتیں بھی اپنا سر جھکانے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔انہوں نے پوری زندگی ملک وقوم کیلئے وقف کردی''۔ 25

''ان کا (سردار جعفری کا) کلام ہمارے لیے مشعل راہ ہوتا تھا''۔ 26

احمد سعید ملیح آبادی' ایڈیٹر آزاد ہند' کلکتہ:

''سردار جعفری کی وفات سے نہ صرف اردو اور ہندوستان بلکہ برصغیر نے ایک عظیم شاعر اور مفکر کو کھودیا۔سردار نے اپنی مادری زبان کی خدمت کی اور اسے اپنی شاعری اور علمی وادبی تحریروں سے مالا مال کیا''۔ 27

سردار جعفری کی شاعری میں آفاقی اقدار ملتے ہیں۔بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔سرور الہدیٰ نے بہت ہی خوبصورت اور مدلل انداز میں اس کی تصدیق کی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

1۔''سردار جعفری کی پوری شاعری اس بات کی غماز ہے کہ وہ کسی بھی دور میں انسان کی آرزوؤں' تمناؤں' دکھوں اور محرومیوں سے بے نیاز نہیں رہی۔اس نے اپنا مواد اور موضوع براہ راست زندگی سے حاصل کیا ہے۔ادب میں بہت سارے رجحانات اور میلانات داخل ہوتے رہے مگر سردار جعفری اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کرسکے کہ اس زمین کی خوبصورتی اور بدصورتی کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔سردار جعفری کی شاعری انسانوں کے دکھ درد سے تحریک پاتی رہی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان تمام مسائل کو دیکھا جاسکتا ہے جو وقتے وقتے سے سامنے آرہے ہیں۔یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ کوئی شاعری اپنے عہد کے مسائل ومیلانات سے اس قدر ہم آہنگ ہو۔سردار جعفری کی شاعری کا رشتہ سماج اور معاشرے سے اتنا گہرا اس لیے ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ زندگی سے پھوٹتی ہے''۔

2۔''سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں بھی یہ رائے عام رہی ہے کہ ان کی شاعری وقتی اور ہنگامی ہے۔ان کی نظموں کے عنوانات سے بھی اس رائے کو تقویت پہنچی ہے مگر سردار جعفری کی پوری شاعری اس الزام کو برداشت نہیں کرسکتی۔سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات سے یہ شبہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ جلد ہی اپنا رنگ کھودے گی مگر میرا خیال ہے کہ جس شاعری کو ہم جلد بازی میں وقتی اور ہنگامی کہہ کر اس کے مرجانے کی بات کہتے ہیں وہ شاعری بھی کسی نہ کسی پہلو سے اپنی معنویت باقی رکھتی ہے۔سردار جعفری کی شاعری میں اگر وقتی عناصر ہیں تو ایسا نہیں ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی معنویت ختم ہوجائے گی۔سردار جعفری کی ایک نظم ''گفتگو'' ہے جس کے نیچے لکھا ہے ''ہندو پاک دوستی کے نام''۔اس نظم میں کونسی وقتی اور عصری

حقیقت ہے جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔بات سے بات چلے، صبح تک شام ملاقات چلے، ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے۔کیا یہ باتیں ختم ہو جانے والی ہیں۔اس طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو سردار کے یہاں بظاہر وقتی معلوم ہوتی ہیں۔اس لیے کہ ان پر عنوانات قائم ہیں مگر ان کے پڑھنے کے بعد وسعت اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے"۔

3۔"سردار کی باتوں کی اہمیت اس لیے بھی باقی رہے گی کہ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں اور غزلوں میں انسان کی بنیادی ضرورتوں اور تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔سردار کی پوری شاعری میں ایک فکر جو ہر فکر کو جنم دیتی ہے وہ ان کی انسان دوستی ہے ملک، قوم، مذہب، مسلک، رنگ، نسل کے سارے بت ٹوٹ کر ایک بت بن جاتے ہیں اور وہ بت ہے انسانیت کا۔ان کی ایک نظم "مشرق و مغرب" میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔(38) اشعار پر مشتمل یہ نظم اتحاد و اتفاق انسانی ہمدردی رواداری اور ذہنی کشادگی کی ایک انوکھی مثال ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ انسانی برادری کو ایک دھاگے میں اس طرح باندھنے کی تحریری طور پر کوئی کوشش اس سے پہلے ہوئی ہے۔شاعر نے مشرق و مغرب کے فرق کو مٹانے کیلئے جتنی مثالیں اور جتنے دلائل پیش کئے ہیں وہ شاعر کی قادرالکلامی اور فکری بلندی کا احساس دلاتے ہیں۔زندگی ایک، زمین ایک ہے، انسان بھی ایک، فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک اور ہی سورج ہے وہی چاند ہے، تارے ہیں وہی، نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی، شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک، دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر کو کسی تنظیم یا تحریک کے تناظر میں دیکھ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس ایک نظم "مشرق و مغرب" کو ہی لیجئے تو کیا اس میں ایک وسیع تر انسانی برادری کی ضرورت صرف ہمارے دور ہی کو ہے یا بعد کے زمانے کو بھی رہے گی؟ یا اس کی ضرورت ماضی میں نہیں تھی۔محبت، اخوت، رواداری، ہم آہنگی اور امن کی باتیں کرنے والا کسی تحریک یا کسی تنظیم کا خریدار نہیں ہوتا وہ تمام عالم انسانیت کی میراث ہوتا ہے۔ان کی فکر کے سرچشمے کیا ہیں، انہوں نے کب کس سے اثر قبول کیا اس کا مطالعہ اہم ضرور ہے مگر صرف متن کو سامنے رکھ کر شاعر کی جو تصویر بنتی ہے وہ زیادہ اہم ہے"۔ 28

ڈاکٹر سید معصوم رضا نے علی سردار جعفری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شاعری میں ظلم و استبداد اور استحصال کے خلاف جو احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں ان میں سردار کے یہاں انقلاب و احتجاج کی لو کافی تیز تھی۔وہ اردو کی حق تلفی کے خلاف ساری عمر سینہ سپر ہے۔وہ ادیب کی سماجی ذمہ داری کو ہمیشہ نبھاتے رہے۔انسان، انسانیت اور انسان دوستی کی فکری بصیرت اور روشن خیالی ان کی شاعری کے پسندیدہ موضوعات تھے۔مشترکہ تہذیب کی پاسداری کی فکر موصوف کو ہمیشہ رہتی"۔ 29

ترقی پسند تحریک کے اصول شعر و ادب پر سردار جعفری نے عمل کیا۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں:

"ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب کے لئے جو اصول وضع کیے جو راہیں متعین کیں، جو قاعدے ترتیب دیئے ان کو روبہ عمل لانے میں کسی بھی ترقی پسند شاعر سے زیادہ سردار جعفری نے کامیابی حاصل کی ہے۔ان کے موضوعات، اسالیب اور زبان، سب کچھ ترقی پسند تحریک سے ہم آہنگ ہیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (لکھنو) اپریل 1936ء کے اعلان

نامے میں کہا گیا تھا: ''ہم ادب کو عوام سے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں''۔ 30

پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے سردار جعفری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سب لوگ مانتے ہیں کہ سردار کے دوسرے کارناموں پر شاعری غالب رہی کسی شاعر کے کلام پر توجہ دیتے ہی سوالات ابھرتے ہیں کہ (1) بامعنی شعریت کتنی ہے؟ (2) عام معیار سے بلند ہے یا نہیں؟ (3) شاعر کی کوئی انفرادیت بھی ہے؟ (4) اور اگر ہے تو کیا؟ علی سردار کی پوری شاعری بامعنی ہے۔ شعریت ہر جگہ نہیں مگر بہت سی غزلوں، چھوٹی اور متوسط نظموں اور طویل نظموں کے اجزاء میں خوب ملتی ہے۔ انفرادیت ہے جوانکے لہجہ، ذخیرۂ الفاظ، بے لچک سیکولرزم، بین الاقوامیت، رجائیت اور خاک اودھ کی محبت پر مبنی ہے''۔ 31

ڈاکٹر سلطان احمد نے لکھا ہے:

''انہوں نے (سردار جعفری) زندگی کو قریب سے دیکھا، تلخ حقائق کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اس طرح ان پر ان سماجی عوامل کا انکشاف ہوگیا جن کے سبب ظالم اور مظلوم، جبر و استبداد اور آزادی اور غلامی جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان سماجی ناانصافیوں کے سدباب کے لئے ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ سردار کے پیش نظر دنیا کے تاریخ ساز واقعات بطور خاص حضرت حسینؓ کی بے مثال قربانی تھی جس کی رو سے ان کے نزدیک حق وصداقت کیلئے جان کی بازی لگادینا انسانی کردار کا نمایاں وصف تھا''۔ ہر بڑے شاعر کی طرح سردار نے بھی اپنی شعری روایت بالخصوص انیس، اقبال اور جوش سے کسب فیض کیا''۔

''بحیثیت مجموعی سردار ایک مفکر اور فطری شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا کینوس اور فکر ونظر کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقاء پذیر ہیں۔ شدت فکر واحساس، وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار کی شاعری کی بعض نمایاں خصوصیات ہیں''۔ 32

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''سردار کی شاعری زور بیان، گرمی کلام، سلامت، صفائی اور روانی کی شاعری ہے''۔ 33

شمس الرحمٰن فاروقی:

1۔ ''سردار کے اچھے شعر میں جو چیز فوراً ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ ان کے لہجے کی علویت اور اشرافیت ہے۔ ہر اچھے شاعر کے یہاں اسلوب کی جو صفائی اور انداز گفتگو کا جو اعتماد نظر آتا ہے وہ تو سردار کے یہاں ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے شعر میں ایک ایسی گرمی اور بلندی بھی ہے جو فوراً ان کے کلام کو ممتاز کر دیتی ہے''۔

2۔ ''سردار کے شعر کی اساس محسوس کئے ہوئے پیکروں Felt Images پر ہے جو سراسر واقعی Concrete ہیں۔ تجریدی abstract نہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کا کلام بلاواسطہ ابلاغ کی حدوں کو چھولیتا ہے''۔

3۔ ''سردار اس مکتب فکر کے ایک نمایاں فرد ہیں جو شعر میں تفصیلی بیان یعنی discourse کا قائل ہے لہذا ان پر یہ

اعتراض کرنا کہ وہ شعر کو تمثیل سمجھ کر کیوں نہیں برتتے' ایک لاحاصل سی بات ہوگی ۔اگر ہمیں ان کی شاعری کو صحیح طور پر پرکھنا ہے تو ہم اسے انہیں اصولوں کی روشنی میں پرکھ سکتے ہیں' جنہوں نے اسے جنم دیا ہے۔سردار کی شاعری زور بیان' گرئی کلام' سلامت صفائی اور روانی کی شاعری ہے۔ہم ان سے نیم روشنی Transflucence' ذومفہومیت Ambivalence اور ارادی ابہام کا مطالبہ نہیں کر سکتے''۔

4۔''سردار کے کلام کا سب سے اہم پہلو اس کی ٹھوس واقعیت ہے' ان کے قدم زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں ۔اگر عوامی شاعری کوئی چیز ہے تو اس کی جھلکیاں سردار کے یہاں ملتی ہیں ۔اپنے بہترین لمحات میں ان کا کلام ''ترقی پسند'' شاعری کا بہترین سرمایہ کہا جا سکتا ہے لیکن کلام کا بلند و بالا لہجہ' مریضانہ شکست خوردگی سے احتراز' محاورہ اور استعارے کی ٹھوس آب و تاب انہیں اردو کے کلاسکی شعراء سے قریب تر کرتی ہے۔اسی لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ سردار اردو شاعری کی کلاسکی روایت کے غالباً آخری نمایاں اور ممتاز فرد ہیں''

5۔''اقبال کا اثر ان کی شاعری میں جا بجا نمایاں ہے''۔

6۔''سردار کی عشقیہ شاعری پر فیض کا رنگ بہت غالب ہے''۔ 34

رسالہ ''اردو دنیا'' (اداریہ)

''سردار جعفری علیگڑھ میں حصول علم کے دوران سامراجیت اور فسطائیت کے خلاف لڑائی میں علمی طور پر شریک ہو گئے اور تب سے اب تک انسانی معاشرے کی آزادی اور انسان کی سربلندی کی لڑائی لڑتے رہے ہیں ۔علی سردار جعفری نے اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کیلئے ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے''۔ 35

انور عظیم :

''شاعر (سردار جعفری) نے مغربی نو آبادیاتی بربریت کا جرأت رندانہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس کی قیمت ہنس کر ادا کی۔شاعر کبھی مشرق کی افسردہ طربنا کیوں سے آبدیدہ نہیں ہوا بلکہ ہر تاریخی تجربے کو شاعر نے اپنے شعور کے جام و سبو میں ڈھال لیا اور تلوار کی دھار پر اپنی منزل کی طرف چلتا رہا۔اس میں ایشیا کی تاریخ اور فلسفیانہ عرفان کی تازہ کاری ہے''۔36

ساقی فاروقی' سردار جعفری (ایک سپاس نامہ):

''عمر کی اس منزل پر پہنچ کر آپ نے وہ کام کیا جو میں کبھی نہ کر پاؤں گا۔اس طویل سفر میں آپ نے دکھ بھی اٹھائے ہیں اور سکھ بھی دیکھے ہیں ۔اس عرصے میں وہ مزدور اور کسان جن کی تقدیر سے آپ کو بحث تھی' غریب تر ہو گئے ہیں ۔جنوبی افریقہ' جنوبی امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں مغربی ممالک کی سنگ دلی بڑھ گئی ہے۔اشتراکی ملکوں کی چادریں بھی داغ دھبوں سے خالی نہیں ہیں۔افسوس کہ دنیا کی 75 فیصد آبادی ظلم سہہ رہی ہے۔آپ نے اگر تمام نہیں تو بیشتر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ بڑے جگر کی بات ہے۔45 سال تک ایک آدرش سے وفاداری حوصلہ اور طاقت چاہتی ہے اور یہ ذخیرہ آپ کے پاس وافر ہے۔اگر آپ دنیا کو بدل نہیں سکے تو اس میں آپ کا قصور کم ہے۔اپنی تمام خوش گمانیوں کے باوجود شاعر تن تنہا نہ انقلاب لاتا ہے نہ قوموں کی تقدیر بدلتا ہے نہ یہ اس کا کام ہے۔شاعر کوئی آسمانی چیز نہیں ۔وہ اسی معاشرے میں سانس لیتا ہے جس میں

سیاست داں بھی ہوتے ہیں اور پروفیسر بھی' ڈاکٹر بھی' انجینئر بھی' سائنس داں بھی اور علم کلام کے جاننے والے بھی' مزدور بھی' کسان بھی یہ سب مل ملا کر معاشرے کو بدلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شاعر اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اندر سے لوگوں کی تطہیر ضرور کرتا ہے۔ ظلم سہتے ہوئے آدمی کے زخموں اور داغوں پر اپنی دردگسار نظر کی سرچ لائٹ پھینکتا ہے اور انہیں منظر عام پر لاکر سوسائٹی کی بے حسی اور لاتعلقی کو چیلنج کرتا ہے۔ آپ نے یہ سارے کام اتنی خوش سلیقگی سے نپٹائے ہیں کہ آپ کی ہنرمندی کی داد نہ دینا آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی''۔ 37

ڈاکٹر علی احمد فاطمی:

''ہر عظیم شخصیت' فن کار بہر حال تنازعہ کو بھی چھوتی ہے۔ بحث وتکرار' پسند وناپسند کا مرکز بنتی ہے سردار جعفری کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ ان کی علمیت' مقبولیت اور محبوبیت تھی۔ ان کا علم وفضل' ان کا منطقی واستدلالی انداز' خطابت کا بہتا ہوا اسلوب۔ الفاظ کے ابلتے ہوئے چشمے کہ بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ لیکن یہ سب یونہی تو نہیں ہوتا اس کے پس پردہ نہ جانے کتنی دہائیوں کی ریاضت' غور وفکر کے لامتناہی سلسلے' مطالعہ ومشاہدہ کی لامحدود وسعت اور ان سب کو اپنی ذات میں تحلیل وتزئین کا کربناک تخلیقی عمل' جلنے پگھلنے کا ایک طویل سلسلہ اور پھر اس کو ایک ترتیب وتنظیم' ایک نظریہ عطا کرنا اور پھر اس نظریہ کو تاریخ' تہذیب میں جذب وپیوست کردینا۔ ظاہر ہے کہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کیلئے تاریخ انسانیت کے بوسیدہ اوراق سے لے کر نت نئے علوم وافکار سے باخبر وباعمل ہونا پڑتا ہے اور بلاشک وشبہ سردار جعفری اپنی عمر وفکر کی ہر منزل پر' ہر موڑ پر باخبر' باعمل اور بااثر رہے اور اپنے علم وفلسفہ' شعور وہنر اور انسان دوستی کے ذریعہ نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہے۔ کبھی تخلیق وتنقید کے ذریعہ' کبھی تحریر وتقریر کے ذریعہ' کبھی انفرادی طور پر' کبھی اجتماعی طور پر' کبھی ڈھال بنے' کبھی تلوار' کبھی مفاہمت کبھی تکرار' غرض کہ ہر دور میں وہ علم وفضل' فکر وعقل کے ذریعے اپنے گروپ میں اپنے عہد میں کلیدی وقائدانہ رول ادا کرتے رہے ایسے سردار جعفری کو جس نے اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک میں بنیادی کلیدی رول ادا کیا' جس نے شاعری کے کم وبیش دس مجموعے دیئے ہوں' جس نے نثری تخلیقات میں بے پناہ توجہ اور شہد کا رس گھول دیا ہو' جس کی تقریروں نے ہنگامے برپا کررکھے ہوں' جس نے اپنے خطبوں' اداریوں' بحثوں' انشائیوں' فلموں وغیرہ کے انبار لگا رکھے ہوں' جس نے انسان کی عظمت سے لے کر انسانی ذہن کی تمام بوالعجبی وبوقلمونی پر دسترس حاصل کررکھی ہو۔ جمالیات' نفسیات' فلسفہ' تصوف' بھگتی' مارکسزم' کمیونزم' سوشلزم' کانگریس' میڈیا' صحافت وغیرہ پر اپنی مہریں ثبت کررکھی ہوں۔ اس سردار جعفری کو سمجھ پانا اور بھلا پانا ناممکن ہے۔ تخلیق وتنقید' تقریر وتصور' جلال وجمال' شعلہ وشبنم غرض یہ کہ ہر طرح کے جذبات سے معمور سردار جعفری کی شخصیت اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔ ایک داستان اور ایک دبستان''۔ 38

علی احمد فاطمی:

1۔ ''عجب بات ہے کہ ادبی حلقہ میں سردار نے اپنی شاعری سے زیادہ دانشوری سے عزت وشہرت پائی لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہی ہیں لیکن میر' غالب' سودا' درد' مومن' حسرت کے قبیل کے کم حافظ' سعدی' نانک' کبیر' انیس' اقبال' جوش کے قبیل کے زیادہ جس میں پابلو نرودا' ناظم حکمت' مارکس' لینن وغیرہ نے نئے نئے رنگ بھر دیئے۔ اس لیے جن کا مطالعہ نہیں ہے'

جوانسانوں کی صدیوں کی تاریخ کے پیچ وخم اور کیف وکم پر نظر نہیں رکھتا اور جولب ورخسار سے ہاتھوں کی اہمیت نہیں سمجھتا وہ اصل سردار اور اس کی شاعری کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے اردو کے روایتی' عام اور محدود مشروط قارئین کے درمیان سردار کو وہ درجہ مل ہی نہیں سکتا تھا جو بعض دیگر شاعروں کو مل سکا۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ دنیا کے حادثات وتغیرات کا جو نیا ادراک وعرفان ظاہر ہوگا سخن فہمی کے ساتھ ساتھ انسان شناسی کا مزاج قائم ہوگا' وہ سردار کی شاعری کی پرتوں کو کھولے گا اور پھر سردار کا انداز سخن ہی نہیں' معیار سخن اور مقصد سخن سب کچھ واضح ہونے لگے گا۔ اس لیے کہ بڑے شاعر کی بڑی شاعری ہر عہد میں اپنی پرتوں کو کھولتی ہے عہد شناسی' تہذیب شناسی اور انسان شناسی کا حوصلہ مانگتی ہے۔ بلاشک وشبہ علی سردار جعفری کی شخصیت وشاعری کے معاملات اور تصورات کچھ اسی طرح اور نوع کے ہیں جس کے لیے تھوڑا وقت درکار ہے''۔ 39

2۔ ''ان کی (سردار جعفری) شاعری کی ان اعلیٰ قدروں کو سمجھنا ہوگا جہاں ایسا ممکن نہیں وہاں سردار کو سمجھ پانا بھی ممکن نہیں۔ سردار صرف شاعر نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ قسم کے دانشور اور اسکالر تھے اور اپنی شاعری اور اس سے زیادہ دانشوری کے زور پر پوری ترقی پسند تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ کئی نسلوں کو پروان چڑھایا' وہ ایک ہیرو کی طرح کئی دہائیوں تک چھائے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک لیجنڈ اور ایک تاریخ بن گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب یوں ہی تو نہیں تھا اس کے پس پردہ کئی دہائیوں کا تیاگ اور تپسیا' محنت ولگن' ایثار وقربانی اور ہمہ دانی' ان کا منطقی انداز خطابت کا سوز وگداز الفاظ کے ابلتے ہوئے چشمے کہ بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ بڑے بڑے کے چراغ گل ہوجاتے تھے۔''

3۔ ''سردار اپنی زندگی' اپنی فکر کے ہر موڑ پر باعمل' باخبر اور بااثر ہے اور اپنے شعور وہنر اور ادب دوستی وانسان دوستی کے ذریعہ نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہے' جس نے میڈیا' فلم' صحافت' ثقافت' سیاست پر اپنی مہریں ثبت کر رکھی ہوں''۔

4۔ ''اقبال کے بعد سردار ہی ہیں جنہوں نے شاعری کو دانشوری اور دانشوری بنا دیا۔ دونوں کو باہم شیر وشکر کر کے ایک نئے طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اور اسے عالمی شاعری کے مقابلے لا کھڑا کیا' صوفی ازم اور مارکسزم دونوں کو بے حد قریب کیا اور شاعری کو ایرانی جمالیات سے نکالنے کا جو کام جوش نے شروع کیا تھا اسے سردار نے انتہائے کمال تک پہنچایا اور ہندوستانی اور انسانی جمالیات کے نئے ابعاد بنائے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اس کی دیرینہ روایات کا نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ کبیر' نانک' میر وغیرہ پر کام کر کے اردو والوں کو اصل ہندوستانی جمالیات سے اور اسی طرح میر' غالب وغیرہ کو ہندی میں پیش کر کے غیر اردو والوں کو اردو شاعری کے اصل صوفیانہ مزاج سے آشنا کیا۔ علم وعمل کے درمیان کے فاصلے کو کم کیا اور اپنی زندگی کی سرگرمیوں' حرکت وعمل سے یہ ثابت کیا کہ ادیب وشاعر اگر باعمل Activist نہ ہو تو اس کی حیثیت بقول مارکس ایک بانجھ عورت سے زیادہ نہیں''۔

5۔ ''گفتگو' بحث' اختلاف' تنازعہ' چیلنج وغیرہ زندگی کی کھردری حقیقتوں کو کہ جس سے بڑے۔ ادیب وشاعر گھبراتے ہیں سردار نے ایک حرف شیریں اور دلنواز تبسم سے زیر کیا اور ادب میں اختلاف کو احترام بخشا اور ادبی تبادلہ خیال کو عام کیا۔ اپنی بات کہنے سے زیادہ انہوں نے دوسروں کی بات سننے کا مزاج عام کیا اور کہا کہ سماجی جمہوریت سے زیادہ بڑی ہوتی ہے ادبی جمہوریت۔''

6۔ ''ہندوستان کی تمام زبان وادب میں ان کی شہرت وعزت تھی ۔امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی نے انہیں دنیا کا بڑا اسکالر تسلیم کیا جس سے اردو زبان کی شہرت وعزت میں غیر معمولی اضافہ ہوا''۔

7۔ ''ان کی ہوش ربا مسکراہٹ' ان کی گفتگو کا سلجھا ہوا منطقی انداز سب کے سب ان کے علم ودانش کی گواہی دیتے''۔

8۔ ''سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں''۔ 40

رفعت سروش:

1۔اس (سردار جعفری) نابغہء روزگار نے چار ماہ کم 87 سال کی عمر پائی اور عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ علم کے حصول' فروغ اور انسانیت کے لیے بہتر سے بہتر کی جستجو اور جدوجہد میں گزارا۔سردار جعفری کی زندگی بیسویں صدی کے ایک مرد مجاہد اور انقلاب کے لیے چومکھی لڑائی لڑنے والے انقلابی کی داستان ہے۔اس داستان کو کسی جگہ سے شروع کیجئے سردار جعفری جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ان کی ولولہ انگیز انقلابی تقریروں نے ہی اس وقت کی حکومت کے کان کھڑے کر دیئے تھے اور انہیں 1940ء میں ہی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا تھا۔سردار جعفری بنیادی طور پر انقلابی شاعر تھے۔محبّ وطن تھے۔عالمی بھائی چارے کے تصور کو عام کرنے میں انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزارا۔وہ عالمی امن کے سپہ سالاروں میں تھے اور ہر اس جنگ سے نفرت کرتے تھے جس کی بنیاد تعصب اور نفاق ہو۔وہ ہمارے ان شاعروں میں تھے جو ادبی محفلوں' گروہوں اور طبقوں میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے عوام میں' مشاعروں میں' انہیں ہزاروں لاکھوں کے مجمعے کو خطاب کرنے کا ڈھنگ آتا تھا اور ان کے اس فن نے انہیں تحت اللفظ اشعار پڑھنے کے باوجود ساری عمر مقبول بنائے رکھا جب کہ اردو شاعری کی عوامی مقبولیت ننانوے فیصدی ترنم پر ہے۔سردار جعفری شاعری برائے شاعری کے قائل نہیں تھے۔وہ مقصدیت کو اولیت کا درجہ دیتے تھے' اور ان کا مقصد اپنی ذات کی تشہیر نہیں' بلکہ ان اقدار کی تشہیر تھا جو انسان کو ارفع واعلیٰ بناتی ہیں۔ان کی اسی خصوصیت نے انہیں مقبولیت کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیا تھا۔سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ' غالب ایوارڈ' اقبال سمان اور گیان پیٹھ تک ان کی مقبولیت کا ایک بہت طویل سلسلہ ہے۔وقت کے ساتھ حکومتوں نے بھی ان کی ذہانت اور فن کی عظمت کا لوہا مان لیا تھا۔وہ پدم شری بنا دیے گئے تھے۔پنڈت جواہر لعل نہرو سے لے کر اندرا گاندھی' اندر کمار گجرال اور اٹل بہاری باجپئی جیسے ملک کے پرائم منسٹروں نے سردار جعفری کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔1965ء کی ہند و پاک جنگ کے موقع پر ان کی نظم'' صبح فردا'' محبت کی نئی کرن کی طرح طلوع ہوئی تھی وہ نظم ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔اس نظم کی مقبولیت کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے دل سے نکلی جس نے جنگ آزادی میں قربانیاں دیں اور اپنی زندگی کو امن ومحبت کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔سردار جعفری کا موت کے ہاتھوں بے بس ہو کر ہمارے درمیان سے اٹھ جانا اردو والوں کا تو نا قابل تلافی نقصان ہے ہی' یہ برصغیر کا نقصان ہے' پوری عالم انسانیت کا نقصان ہے۔ایسا ہمہ جہت اور اولوالعزم فن کار اور یار طرحدار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے''۔ 41

2۔ 'علی سردار جعفری ایسی ہمہ جہت شخصیت' ادیب اور شاعر تھے جن کی زندگی' صحافت' شاعری اور خطابت کا مثلث ہے۔اقبال کے بعد جعفری نے اردو ادب میں اپنا مقام ایسا پیدا کیا کہ ان کا جیسا قد آور شاعر وادیب کوئی نظر نہیں آتا۔''42

پروفیسر وارث علوی:

1۔ ''سردار کی شاعری میں تضادات کو توازن میں بدلنے کا ایک نہایت ہی دلکش طریقہ کار ملتا ہے جو بیک وقت فن کارانہ بھی ہے اور فلسفیانہ بھی مثلاً کامرانی ہو یا تشنہ لبی سردار کے نزدیک دونوں راہ عشق اور راہ زندگی کے مقامات ہیں اور دونوں سے پیہم گزرتے رہنا انسان کا مقدر ہے۔ سردار کے یہاں کامرانی کی مسرت کا انکار نہیں اور نہ ہی اس پر فخر و مباہات کا اظہار ہے۔ اسی طرح تشنہ لبی کی اذیت سے بھاگ کھڑے ہونے کا جذبہ بھی نہیں، نہ ہی اذیت طلبی کا مریضانہ احساس ہے۔ ان کے یہاں کامرانی اور تشنہ لبی دونوں کی اپنی قدر ہے۔'' 43

وارث کرمانی:

''وہ (سردار جعفری) ہمارے عہد کے ان سربرآوردہ شاعروں میں ہیں جنہیں محض شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بلند پایہ ادیب عالم اور باخبر ہیں اور یہی حیثیت انہیں اپنے ہم عصر اور ہم خیال شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ ان کے چاروں طرف فیض، مجاز، جذبی، مخدوم، غلام ربانی تاباں، علی جواد زیدی، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، اختر انصاری اور نجانے کتنے باکمال شاعروں کی کہکشاں سی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں دبی ہوئی چنگاریاں نظر آنے لگتی ہے اور یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر کا فن جسے فکر سے علیحدہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے ایک خاص بانکپن رکھتا ہے، جس کی کشش اور طمطراق نے شاعر کو مقامی اور ہنگامی موضوعات میں بھی چمکائے رکھا ہے اور معاشی اور سیاسی نظریات میں غرق ہونے سے بچا لیا ہے۔ ویسے سردار کی فن کاری ان کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے لیکن ان کا پورا جوہر ان نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے جنہیں شاعر نے غمگین موڈ میں لکھا ہے جب انہیں شدید دکھ کا احساس ہوا ہے یا انہوں نے اپنے خوابوں اور آرزوؤں کو بکھرتا ہوا پایا ہے۔ 44

ڈاکٹر سلطان احمد:

''ہمارے ادب میں ان کی (سردار جعفری) حیثیت ایک سردار کی تھی۔ ان کی کمی کا احساس تا دیر رہے گا اور اردو ادب کے ایوانوں میں ان کی آواز کو نجتی رہے گی اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی''۔ 45

اختر الواسع:

''سردار کی شاعری ایک خاص نظریاتی وابستگی کی ترجمان ہونے کے باوجود ہمارے یا میرے لیے اس لیے بامعنی اور متاثر کن ہے کہ اس میں ہمارے عہد کے بنیادی آشوب اور ہماری زندگی کے دکھوں کا بیان ملتا ہے اور اس انداز سے ملتا ہے کہ ہمارے عام انسانی تجربات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور ہماری اپنی آواز معلوم ہونے لگتا ہے''۔ 46

سید محمود الحسن:

ان کے (سردار جعفری) فن میں پورے عہد کی بصیرت کی ترجمانی شامل ہے۔ ان کی تمام تخلیقات میں یہ احساس چھایا ہوا ہے کہ ''عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں'' چنانچہ سردار جعفری کی تخلیقات محض اپنے عہد کی زندگی کی ترجمان نہیں ہیں جو عظیم روایت کا حصہ بن کر تاریخ میں اہمیت حاصل

کرتا رہے گا۔وہ اس حقیقت پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اعلاقدریں اور انسانیت کی عظمت کے نقوش کبھی مٹائے نہیں جاسکتے۔ انہوں نے بارہا یہ احساس دلایا ہے کہ ادیب محض زخمی خوابوں کے ویرانوں میں نہیں بھٹکتا ہے بلکہ نئے خواب دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے وہ فن کے ذریعے درندگی اور جہالت کی تاریکی کے بجائے شائستگی پیدا کرنے پر زور دیتا ہے۔غرض یہ کہ سردار جعفری ایک روشن خیال معاشرے کی تشکیل کیلئے ساری عمر کوشاں رہے"۔ 47

معزہ ابراہیم قاضی:

"سردار جعفری کی شاعری کا بیشتر حصہ عصری شعور کی نغمہ ریزیوں سے پر ہے۔ان کے شاعری ابتداء تا انتہاء اپنے دامن میں عصری شعور کو سموئے ہوئے ہے جس کی وسعتیں لامتناہی ہیں' ان کی سرحدیں خاک اودھ' بمبئی اور پھر برصغیر یعنی ہندوستان اور پاکستان سے ہوتی ہوئی ایشیاء اور پھر انسانیت کا نغمہ الاپتی ہیں اور انسانیت کے غم میں لہولہان نظر آتی ہے اور ساری انسانی زندگی اور اس کی اونچ نیچ اور بلند و پست کو محیط ہے"۔ 48

پروفیسر رفیعہ شبنم:

1۔"سردار جعفری' کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ایک مضبوط اور چھتنا درخت کی مانند بدلتے موسموں کا ہروار سہتی ہوئی' ہر رت میں تروتازہ سرسبز شاداب' زندہ و تابندہ۔ساتھ اور پاس کے درختوں کی سازشوں سے بے نیاز۔آندھیوں اور طوفانوں کی عیاریوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ مطمئن و مستحکم۔گرد و غبار اور خس و خاشاک کی گستاخیوں پر خنداں و تبسم فشاں اور ننھے چوزوں اور کیڑے' مکوڑوں کی شرارتوں اور بوڑھے گھاگ حشرات الارض کی خباثتوں سے محفوظ و شاداں' بحث و تمحیص کے میدان کا فاتح' یاروں کا یار' قدردانوں کا قدردان' ذوق جمال کا آئینہ بردار' میر و میرا کا مزاج دان' ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نمائندہ' حافظ و کبیر کا عاشق' صحافی' اسٹیج ڈراموں کا خالق' افسانہ نگار' ترجمہ نگار' کلاسیکی ادب کا تدوین کار اور سب سے بڑھ کر ایک بالغ نظر مفکر اور دانشور' متانت ایسی کہ بد کوئی بالکل پسند نہ کرتے۔کسی کے فن پر کوئی رائے دینا تو خیر الگ بات ہے۔اس میں تو وہ خود بھی بے باک تھے۔ایفائے عہد اس حد تک کہ کسی جلسے یا تعزیت میں شرکت کی منظوری دے دی تو ہر حال میں بذات خود بغیر کسی قیل و قال' مانگ یا طلب کے وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں حاضر۔فیض رسانی کا حال تو یہ کہ وہ لوگ جو انہیں پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے' ضرورت پڑھنے پر خود ان کے در پر دستک دیتے اور جعفری صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے' ان کی ضرورتیں پوری کرتے اور انہیں ممکنہ حد تک فیض پہنچاتے اور لطف یہ کہ کبھی زبان پر نہ لاتے' نہ کسی کو خبر ہونے دیتے۔مرنجان مرنج طبعیت ایسی کہ ہر کسی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔کسی کو ناراض نہ ہونے دیتے اور اس اقدام کو" دفع شر" کا نام دیتے۔شہر' بیرون شہر اور بیرون ملک سے آنے جانے والے اعزہ' اقربا' ادبا' شعرا اور احباب و ارباب کی مہمان نوازی"۔ 49

سردار جعفری کی شاعری میں تاریخی شعور کی کارفرمائی پر پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

"یہ خطیبانہ پر جوش لہجے سے بھری ہوئی نظمیں اس بات کا بھی اعلان کر رہی ہیں کہ سردار جعفری ایک گہرا شعور رکھتے ہیں جو ہمیں اردو کے بہت کم شاعروں کے ہاں اس سطح پر ملتا ہے۔میر' سودا' غالب اور اقبال کے بعد غالباً سردار جعفری تاریخی ادراک

وبصیرت کے حامل شاعر ہیں۔ دراصل سردار جعفری ادب کو اپنے عہد کے تاریخی حالات کی دین قرار دیتے ہیں اور تاریخ دراصل اس عہد کے سماجی حالات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سردار جعفری کی شاعری میں بھی ہندوستان' ایشیاء بلکہ سارے عالم کی تاریخ پر ہے جس کا ذکر وہ موقع سے کرتے ہیں۔ ''ایشیاء جاگ اٹھا'' ان کی تاریخی شعور سے بھرپور ایک زندہ نظم ہے''۔ 50

پروفیسر عبدالحق :

''پروفیسر عبدالحق نے سردار جعفری کے علمی کارناموں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے لسانیات شعری جیسے کام پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک انتہائی وقت طلب اور تحقیق طلب کام تھا جس سے سردار جعفری جیسی علمی شخصیت ہی عہدہ برآ ہو سکتی تھی۔ سردار جعفری ایک عالی ترقی پسند ہونے کے باوجود اردو اور فارسی کے کلاسکس اور کلاسیکی رموز فکر و فن سے کماحقہ آگاہ تھے۔ اس آگہی کے ذریعہ انہوں نے لسانیات شعری سے متعلق الفاظ کے تہذیبی تناظرات اور سرچشموں تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ یہ سعی اسی لیے کامیاب ہے کہ اسے سردار جعفری جیسے صاحب علم نے انجام دیا تھا''۔ 51

ڈاکٹر علی جاوید:

''ڈاکٹر علی جاوید نے سردار جعفری کو مرد مجاہد کے نام سے یاد کیا' جو وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے کہ مصداق' ترقی پسند تحریک سے ابتداء تا آخر وابستہ رہے اور اسے اعتبار کے درجے تک پہنچایا۔ سردار جعفری زندگی بھر ظلمت پرستوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اب ہمارا عہد بڑی تیزی کے ساتھ ان مایہ ناز ہستیوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں''۔ 52

''جناب علی سردار جعفری صاحب کی وفات نہ صرف اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہے بلکہ ایک بڑی ہندوستانی شخصیت سے آج ہم محروم ہو گئے ہیں جنہوں نے ہندوستان بھر میں ہی نہیں دنیا کے متعدد ممالک میں ہندوستان کی نمائندگی کی' ان کی شاعری ہمارے درمیان ہمیشہ رہے گی جو ہمیں ان کی یاد دلاتی رہے گی اور ہماری رہنمائی بھی کرتی رہے گی''۔ 53

ڈاکٹر جسبیر سنگھ اہلووالیہ' وائس چانسلر' پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ:

''وہ قلم کار مرنے اور مٹنے سے ہمیشہ بالاتر ہوتے ہیں جو سماج کے مظلوم اور مفلوک الحال عوام کی آواز میں آواز ملا کر نئے شعور کو بیدار کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے اپنی تحریروں اور تدبیروں سے جو عوام کی خدمت کی ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا''۔ 54

پروفیسر شمیم کمہت' دہلی یونیورسٹی:

''علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری میں ایک بات مشترکہ تھی کہ دونوں ہی ترقی پسند ادب کے قلم کار تھے اور ادب کی ان قدروں کے حامل تھے جن سے ادب آفاقی بنتا ہے۔ انہوں نے دونوں ہی قلم کاروں کی تحریروں کو آج کی ضرورت کے مطابق تحریر کئے گئے ادب سے تصور کیا اور کہا کہ یہ ادب رہتی دنیا تک زندہ رہنے والا ہے''۔ 55

ڈاکٹر مدھوکر آریہ' صدر شعبہ اردو' پنجاب یونیورسٹی:

''علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری دونوں نے نئی نسل کے ادیبوں اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو آگے

لانے کیلئے مستقل جدوجہد کی۔یہ بات ایسے دوسرے ادیب کسی بھی زبان کیلئے باعث بلندی ادب ہو سکتے ہیں"۔ 56

ڈاکٹر محمد حبیب سکریٹری، ہریانہ اردو اکادمی:

"ایسے بلند پایہ ادیب اور عظیم شخصیتیں (علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری) برسوں میں پیدا ہوتی ہیں جن کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔علی سردار جعفری کو اکادمی سے خاص رغبت تھی اور وہ اکادمی کی تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتے تھے"۔ 57

ڈاکٹر مدبر علی زیدی، چیرمین، راجستھان اردو اکادمی:

"ڈاکٹر مدبر علی زیدی نے علی سردار جعفری کو اردو ادب کا ایک ایسا دیب بتایا جس نے اپنی تحریروں سے سماج میں ہونے والے انتشار کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔انہوں نے کہا کہ جعفری صاحب ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ قومی ایکتا کے بھی علمبردار تھے"۔ 58

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا:

"جعفری صاحب آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تنہا ادیب تھے جنہوں نے قوموں کے ٹکراؤ کو ختم کرانے میں اہم رول ادا کیا"۔ 59

معظم علی، سکریٹری، راجستھان اردو اکادمی:

جعفری صاحب کا اہم کارنامہ اردو ادب میں دوسری زبانوں کے ترجمے کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔اگر جعفری صاحب ان ترجموں کو ہم تک نہیں پہنچاتے تو دوسرے ممالک کے ادب سے ہم قطعی روشناس نہ ہوتے"۔ 60

عبدالاحد ساز:

1۔ان کی (سردار جعفری) پرانی نظموں سے نئی نظموں تک ہمیں باور ہوا ہے کہ یہ شاعری صرف اپنے عہد کے دائرے میں رہ جانے والی نہیں، بلکہ اس حصار سے باہر نکل کر آئندہ زمانوں کی کھلی ہواؤں میں پرواز کرنے والی، آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سایہ دراز کرنے والی اور اپنی نگاہوں کا عکس اردو شعریات کی پیشانی پر چھوڑ جانے والی شاعری ہے۔یہ شاعری روایتوں کی امین بھی ہے اور جدتوں کی نقیب بھی۔ہم نے معاصرین ان کے ساتھ نہ صرف قدر و منزلت کا بلکہ شوق و رغبت کا بھی آہنگ رکھتے ہیں"۔(عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم نئی ساعتوں کے درمیان، کتاب نما، مارچ 1998، صفحہ 22) اردو کے زرین صفحات میں رکھتے ہیں بلکہ عالمی شاعری کے تناظر میں اردو شاعری کی اہمیت کی دلیل کے طور پر اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں"۔ 61

حکومت بہار نے (توصیفی سند پیش کرتے ہوئے) یہ اعلان کیا:

"عالم انسانی کے عظیم فرد، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے علمبردار اور شعر و ادب کو ان کے منصب سے آشنا کرنے والی ممتاز شخصیت پدم شری علی سردار جعفری کا گزشتہ سات دہائیوں پر مشتمل شعری و ادبی سفر ملک و قوم کیلئے سرمایہ افتخار ہے"۔62

ممبران جیوری، اقبال سمان (بشمول شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت کے علمبردار):

''جدید اردو شاعری میں سردار جعفری انتہائی منفرد اور معتبر مرتبے کے مالک ہیں۔انہوں نے کلاسیکی نظم وضبط دور شائستگی کے ساتھ جدید اسالیب اظہار وبیان کو بڑی خوبی سے اپناتے ہوئے آج کی، خاص کر تیسری دنیا کے انسان کی آواز کو اپنی آواز میں سمولیا ہے''۔ 63

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ڈی لٹ کی ڈگری دینے کے موقع پر):

''علی سردار جعفری کی شاعری کے اب تک دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان مجموعوں میں ہمارے عوام کی کشمکش، زیست اور امنگوں کی عکاسی ہوتی ہے اور علاوہ ازیں انسانیت کی ابدی امنگوں کی ناقابل فراموش الفاظ میں عکاسی ونت نئے اسالیب شاعری، خصوصیت کے ساتھ نظم آزاد کے مجدد رہے ہیں۔انہیں خاص طور پر الفاظ کے نت نئے مفاہیم کی ادائیگی پر بڑی قدرت حاصل ہے''۔ 64

نرمل ورما (گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ):

''میں انسانی مقاصد کیلئے علی سردار جعفری کی لگن کا ہمیشہ معترف رہا''

علقمہ شبلی (شاعر):

جعفری صاحب نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنی شاعری سے معاشرے کے مظلوم اور پس ماندہ لوگوں کو زبان بخشی اور سامراجی طاقتوں کی مخالفت کرتے ہوئے امن اور یکجہتی کے پیغام کو عام کیا''۔ 65

نظیر احمد (دھنباد):

''جعفری صاحب ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے، ان کی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے صرف ہوا، وہ ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت اور اعلیٰ کردار کے حامل انسان تھے جن کا پیغام صرف اور صرف محبت تھا''۔ 66

ڈاکٹر منصور عمر، سی ایم کالج دربھنگہ:

''علی سردار جعفری نے پہلی مرتبہ ترقی پسند ادب کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا اور عمر بھر ترقی پسند ادب کے نمائندہ رہے۔انہوں نے اپنی انفرادی شناخت پر کبھی حرف نہ آنے دیا''۔ 67

اسد ظہیر:

''علی سردار جعفری ایک صاحب طرز شاعر، اچھے نقاد اور بہترین خطیب بھی تھے''۔ 68

سید احتشام الدین:

''سید احتشام الدین نے علی سردار جعفری کو نئی روش کا خالق قرار دیا اور ان کی شاعری کو عصائے کلیمی سے تعبیر کیا۔''69

جمال اویسی:

''سردار جعفری کی شاعری رنگا رنگ اور متنوع جذبات وکیفیات کی آئینہ دار ہے''۔ 70

ڈاکٹر عارفہ سلطان، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، ٹونک (راجستھان):

''سردار جعفری نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کے اہم شاعر تھے۔ بنیادی طور پر سردار جعفری کو ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کا علمبردار کہا جاسکتا ہے''۔ 71

ڈاکٹر ارشد عبدالحمید:

''سردار جعفری کی شخصیت میں متعدد اور اوصاف یکجا ہو گئے تھے۔ وہ سیاست داں تھے، مدبر تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، تاریخ داں، مترجم اور مقرر بھی تھے۔ وہ اشتراکیت کے زبردست علمبردار اور ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے۔ وہ جس ادبی نظریے سے وابستہ ہوئے اسے انہوں نے آخری سانس تک پورے یقین، اعتماد اور عقیدت کے ساتھ اپنائے رکھا۔''

سجاش یادو، ڈپٹی چیف منسٹر، مدھیہ پردیش:

''انہوں نے (سردار جعفری) نہ صرف ہندوستانی بلکہ دنیا کی متعدد زبانوں کے شعراء اور شاعری کو متاثر کیا ان کی شاعری عالمی سطح پر پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔

عزیز قریشی، چیرمین، مدھیہ پردیش اردو اکادمی:

''علی سردار جعفری ہماری زبان کے ایک عظیم جینیس اور ریجنل شاعر، مفکر اور ماہر خطیب تھے۔'' 72

ڈاکٹر بشیر بدر:

''ڈاکٹر بشیر بدر نے سردار جعفری کو انسانیت کا شاعر قرار دیا''۔ 73

آگنے، سکریٹری ساہتیہ پریشد، بھوپال:

سردار جعفری برصغیر کی عظیم وراثت کے نمائندہ شاعر تھے جو ہندی میں بھی اردو کی ہی طرح مقبول تھے۔'' 74

ڈاکٹر کپل تیواری، سکریٹری، لوک کلا پریشد، بھوپال:

''سردار جعفری کی شاعری اور فکر نسل در نسل پسند کی جاتی رہے گی اور ہم کو شب سیاہ میں روشنی دکھاتی رہے گی۔'' 75

پروفیسر آفاق احمد:

''سردار جعفری اپنی شاعری میں سماجی ماحول کو اجاگر کرتے رہے۔ وہ ایسے شاعر تھے جو انسانی تصادم اور اس کے مستقبل میں بھرپور یقین رکھتے تھے اور اسی یقین کا اظہار ان کی شاعری تھی''۔ 76

تعزیتی قرارداد شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی:

(صدر تعزیتی جلسہ پروفیسر محمد زماں خان آزادہ)۔ (شرکاء: شعبہ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات)

''علی سردار جعفری ایک ادبی شخصیت ہی کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک انجمن کا بھی نام ہے اردو میں ترقی پسند تحریک کے روح رواں کی حیثیت سے ان کا نام اس لحاظ سے سب سے بڑا ہے کہ انہوں نے اپنے نظریے کی سپر زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کو سامنے نہیں ڈالی۔ ان کے اشعار و افکار اور ان کی تحریروں سے ہمیشہ اسی وفاداری بشرط استواری کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ جب تک ادب کے سماجی سروکار کا کوئی بھی تصور موجود ہے، سردار جعفری کے فکر و فن کی اہمیت اور ان کی دانشوری کو قدر و منزلت

کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔یوں بھی انہوں نے ایک جنوین شاعراورادیب کی حیثیت سے اردوادب کی جوخدمات انجام دی ہیں وہ بجائے خودوقیع اورنا قابل فراموش ہیں۔ 77

ڈاکٹرسید عبدالمنان صدرانجمن ترقی اردو آندھراپردیش:

''اردو دنیاان کی انسان دوستی اورزبان کے لیے انجام دی گئی خدمات کوکبھی فراموش نہیں کرسکتی''۔ 78

انجمن ترقی اردوکانپور:

''علی سردارجعفری کے انتقال سے اردوتہذیب کے ایک ایسے دورکا خاتمہ ہوگیا جوقلم کی حرمت اورطاقت کا امین تھااورظلم وناانصافی،فرقہ پرستی اورتنگ نظری کے خلاف نبردآزاتھا''۔ 79

نامی انصاری:

''سردارجعفری ایک عہدساز شاعرتھے جنہوں نے اردوشاعری کوکلاسیکی روایات کوملحوظ رکھتے ہوئے اس میں انقلابی افکار کوراہ دی اورایک ایسا پیا نہ صفات وضع کیا جواردوشاعری کوایک نیاراستہ دکھاتا ہے۔'' 80

تسکین زیدی،افسانہ نگار:

''سردارجعفری قومی سطح پربھی اس عہدکے سب سے زیادہ فعال اورسب سے زیادہ معتبرشاعراوردانشورتھے''۔ 81

عشرت ظفر،شاعراورصحافی:

''سردارجعفری صرف شاعراورادیب ہی نہیں تھے،بلکہ برصغیر میں امن ودوستی کے حامی،فرقہ پرستی،توہم اورجہالت کے خلاف جدوجہدکرنے والے ایک ہمہ صفت انسان تھے''۔ 82

حیدرجعفری سید:

''سردارجعفری کی نظموں اورغزلوں کے مطالعے سے ان کی انسان دوستی،دل سوزی اوردردمندی کا بھرپوراحساس ہوتا ہے۔بلاشبہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے دانشوراورایک حساس قلم کارتھے''۔ 83

شیخ محمداحمد،ایڈوکیٹ،صدرانجمن ترقی اردوناندیڑ:

''محمداحمدصاحب ایڈوکیٹ نے اپنی تقریر میں علی سردارجعفری کواردوادب کاعظیم مجاہدقراردیا۔انہوں نے کہا کہ جعفری صاحب نہ صرف ایک فنکاراورشاعربلکہ انسانیت اورامن عالم کیلئے ہمیشہ سرگرم اورفعال رہنے والے سپاہی تھے''۔ 84

طارق شمسی،جنرل سکریٹری،انجمن ترقی اردو،ناندیڑ:

''جعفری صاحب کی شخصیت ہردل عزیزاورمسحورکن تھی۔وہ شاعرتوتھے ہی اس کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثرنگاربھی تھے اورنقادبھی۔ایک نظریہ سازترقی پسندقلم کارکی حیثیت سے انہوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی۔جعفری صاحب نے اردو کے علاوہ کبیراورمیرابائی پرجوکام کیا ہے وہ ہندی ادب والوں کیلئے بھی اہمیت اورافادیت کا حامل ہے۔جعفری صاحب نہ صرف اردوزبان وادب بلکہ پورے ہندوستانی ادب کے آئیڈیل اورنا قابل فراموش شخصیت ہیں''۔ 85

انجمن ترقی اردو ویشالی بہار:

''انجمن ترقی اردو ویشالی کے زیر اہتمام منعقدہ تعزیتی نشست میں ایک تعزیتی قرارداد میں کہا گیا کہ ''علی سردار جعفری اردو کے عظیم انقلابی شاعر تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو انسانیت، محبت، امن اور بھائی چارے کا جو پیغام دیا ہے اسے ہمیشہ قدر کی نظروں سے دیکھا جائے گا''۔ 86

عبداللطیف کاظم، صدر انجمن ترقی اردو، امت پور:

''علی سردار جعفری کی شخصیت عہد ساز تھی ایک مینارہ نور تھی، جس کی روشنی میں متعدد تخلیق کاروں نے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے''۔ 87

راشٹریہ سہارا (اردو)، نئی دہلی:

''روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو)، نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تعزیتی جلسے میں مقررین نے کہا ''علی سردار جعفری تمام زندگی سامراجیت کے خلاف قلم سے جہاد کیا اور ان کی شاعری میں امن بھائی چارے، دوستی، محبت اور ہم آہنگی کا پیام کوٹ کوٹ کر بھرا ہے''۔ 88

ڈاکٹر اے کے والیا، وزیر صحت، دہلی:

''آزادی میں سردار جعفری کے رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے اپنی شاعری سے پوری زندگی اتحاد، یکجہتی اور امن کا پیغام دیا۔''

پروفیسر عتیق اللہ، صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی:

''سردار جعفری مظلوموں، مجبوروں اور نکبت کے ماروں کے حق میں اور فاشسٹ قوتوں کے خلاف تا بہ آخر برسر جنگ رہے۔سردار جعفری ایک عالی ترقی پسند ہونے کے باوجود اردو اور فارسی کے کلاسکس اور کلاسیکی رموز فکر و فن سے کماحقہ، آگاہ تھے۔اسی آگہی سے انہوں نے لسانیات شعری سے متعلق الفاظ کے تہذیبی تناظرات اور سرچشموں تک پہنچنے والی سعی کی ہے۔ یہ سعی اسی لیے کامیاب ہے کہ اسے سردار جعفری جیسے صاحب علم نے انجام دیا تھا''۔ 89

ڈاکٹر فرحت فاطمہ:

''ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے سردار جعفری کو ایک بے مثال دانشور کے نام سے یاد کیا۔'' 90

اکرام الحق، صدر، اردو ٹیچرس یونین ویشالی (بہار):

''جعفری صاحب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے بڑے علمبردار تھے''۔ 91

پروفیسر سید شاہد مہدی، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ:

''سردار جعفری کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ان کی شاعری کے مخصوص اوصاف انسان دوستی، رجائیت، انسان کے تقدیر کی عظمت پر یقین، حب الوطنی، قومی یکجہتی اور بین الاقوامیت ہیں۔'' 92

پروفیسر شمیم حنفی:

''سردار جعفری نہیں ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک عہد رخصت ہوگیا۔تاریخ کا ایک دروازہ بند ہوگیا۔ 93

مخدوم محی الدین:

''اپنے ریپورتاژ''پودے'' میں کرشن چندر نے صحیح کہا تھا کہ آپ سردار جعفری سے بات کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تحریک سے مل رہے ہیں''۔ 94

ڈاکٹر واجد قریشی' صدر شعبہ اردو' گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج' اندور:

''علی سردار جعفری برصغیر کے ادبی افق پر فیض احمد فیض کے بعد دوسرے ایسے بڑے شاعر ہیں جو عالمی ادب اور سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔انہوں نے اپنے مشن اور تحریک میں کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی اپنے اصولوں کے خلاف سمجھوتے کیے۔وہ ترقی پسند تحریک کا ایک مضبوط ستون تھے۔وہ عمر کے آخری پڑاؤ تک ملک وقوم اور زبان وادب کی فلاح وبہبودی کیلئے سرگرم عمل رہے''۔ 95

ڈاکٹر شکنتلا سنگھ' صدر شعبہ ہندی' گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج' اندور:

''سردار جعفری صاحب اردو کے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب کے شاعر تھے جس پر ہر زبان فخر کرسکتی ہے''۔96

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی:

علی سردار جعفری ترقی پسند ادب کے صف اول کے شعراء میں تھے بلکہ فیض احمد فیض کے بعد ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا شاعر ہونے کا اعزاز انہیں حاصل تھا''۔ 97

شیر جنگ گرگ' مشہور ہندی شاعر:

''جعفری صاحب نے ہندی اور اردو کو قریب لانے میں بہت کام کیا۔وہ جتنے اردو کے تھے اتنے ہی ہندی کے بھی تھے''۔ 98

تندکشور وکرم' مدیر عالمی اردو ادب:

سردار جعفری ایک عظیم المرتبت شاعر تھے۔ان کی شاعری ترقی پسند نظریات' انسان دوستی' کلاسیکی اقدار' فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عالمی بھائی چارے کا ایک ایسا امتزاج ہے جس نے انہیں اس دور کا ایک ایسا آفاقی شاعر بنا دیا ہے جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکے گا۔'' 99

ندا فاضلی (شاعر):

''فیض احمد فیض کے بعد علی سردار جعفری اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے''۔ 100

شمیم جہاں (اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند):

''سردار جعفری جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ان کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ وہ' ایک بہت اچھے انسان بھی تھے''۔ 101

سالک لکھنوی (چیرمین مغربی بنگال اردو اکیڈیمی):

''جب تک اردو زندہ رہے گی سردار جعفری زندہ رہیں گے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون تھے۔ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ زبردست مقرر بھی تھے''۔ 102

پروفیسر مشتاق اعظمی (صدر شعبہ اردو، ڈی بی کالج، رانی گنج:

''سردار جعفری کے انتقال سے ترقی پسند تحریک کا سب سے اونچا مینار منہدم ہوگیا''۔ 103

پروفیسر سید مظر امام (دھنباد):

''فیض کے بعد یہ دوسرے بڑے شاعر تھے جنہوں نے اپنے کلام کے ذریعے عوام کے بجھتے ہوئے دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن کیے۔ ان کی تمام تخلیقات شعری ونثری ہمارے اردو ادب کا بہت ہی قیمتی اثاثہ ہیں''۔ 104

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، صدر انجمن ترقی اردو ہند:

''ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سنی تو دل و دماغ کو زبردست دھچکا لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوہ ہمالیہ زمین پر گر گیا ہو۔ سردار جعفری اردو شعر و ادب کے کوہ ہمالیہ تھے۔ ان کے چلے جانے سے دنیائے ادب ہی میں نہیں بلکہ میں اپنی زندگی میں بھی ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔'' 105

ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند:

''جعفری صاحب ہمارے عہد کے اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار، ادیب، انشا پرداز، صف اول کے نقاد اور ماہر اقبالیات تھے۔ جن حضرات نے سردار جعفری کی تقریریں سنی ہیں وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے زمانے میں ان سے بڑھ کر ادبی موضوعات پر تقریر کرنے والا اور کوئی نہیں تھا اور آئندہ بھی یہ امید نہیں کہ ان جیسا کوئی پیدا ہو۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جعفری صاحب ترقی پسند شاعری پر چھائے رہے اور اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اردو میں ان سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں تھا''۔ 106

خلیق انجم:

''شدت احساس، زندگی کے ساتھ والہانہ وابستگی، مظلوم انسانوں کے ساتھ دلی ہمدردی، انسانیت کو روشن مستقبل کی طرف لے جانے کا خواب، خواب کو تعبیر کی منزل کی طرف پہنچانے کا عرفان، ایک واضح نظریہ حیات، تخلیقی جوہر اور رہبات کے فن کارانہ اظہار پر قدرت، یہ تمام چیزیں جب ایک جگہ جمع ہوجاتی ہیں تو سردار جعفری پیدا ہوتا ہے۔ کسی ملک کی تاریخ میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔'' 107

سلام بن رزاق:

''علی سردار جعفری پچھلے ستر برس سے اردو ادب کے افق پر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد انہیں کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ وہ مارکسی نظریے کے حامل تھے اور اپنی شاعری کو عوام کی بہبود کیلئے استعمال کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے قلم سے جبر و استحصال، ناانصافی اور تشدد کے خلاف جہاد کیا

ہے۔ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے ایک بہتر سماج کا خواب دیکھا اور شاعر کی حیثیت سے عمر بھر اس خواب کی عکس بندی کرتے رہے۔بعض شخصیتیں اس قدر مقبول ہوتی ہیں کہ وہ اکثر عوام کے درمیان موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اپنی زندگی میں ہی ایک Legend کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔جعفری صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ان کی شاعری،ان کی گفتگو،ان کی تقریریں،ان کے مضامین،ان کی فلمیں یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا معمولی سے معمولی فقرہ بھی فوراً موضوع بحث بن جاتا تھا۔یقیناً اس کا سبب ان کی غیر معمولی مقبولیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔جعفری صاحب سے قربت سب چاہتے تھے مگر ان کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب، کچھ ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ ان سے قربت ہونے کی جرأت کم ہی لوگ کر پاتے تھے۔مگر جب کوئی ان سے ایک مل لیتا تھا ان کی سحر انگیز شخصیت کا جادو،ان کا دلنواز طرز گفتگو اور ان کے بصیرت افروز خیالات سے ایسا متاثر ہوتا کہ عمر بھر پھر انہیں کا دم بھرتا رہتا۔جعفری صاحب کی نظمیں،غزلیں،مضامین اور تقریریں ہمیں امید،رجائیت اور روشن مستقبل کا پیغام دیتی ہیں۔جعفری صاحب کے ادبی کارناموں کا جائزہ لینے کے لیے دفتر درکار ہے۔وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے،ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔علی سردار جعفری ایک شخص کا نہیں ایک عہد کا نام تھا۔سچ تو یہ ہے کہ ان کی رحلت کے ساتھ اردو زبان و ادب کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔''۔ 108

میڈیا فورم آف انڈیا:

میڈیا فورم آف انڈیا نے علی سردار جعفری کو صدی کی ایک ممتاز شخصیت قرار دیا اور کہا کہ ان کی انسانیت نوازی،شرافت،متانت،تواضع اور انکساری اور علم دوستی نے ان کو ایک مثالی شخصیت بنا دیا تھا۔انہوں نے اپنی لگن اور محنت سے بلند ترین مقام حاصل کیا جو نسل انسانی کیلئے قابل تقلید ہے''۔ 109

منصور احمد عثمانی سکریٹری اردو اکادمی،دہلی:

''اردو کے مشہور و معروف شاعر،ادیب اور مفکر جناب علی سردار جعفری 87 سال کی مجاہدانہ زندگی گزار کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ان کی وفات اردو دنیا کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔علی سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لیتی تھیں وہ ایک شاعر آتش نوا،ایک بے بدل خطیب،ایک صاحب نظر نقاد،ایک ذی فہم ادیب،اپنی پارٹی کے ایک سرگرم اور فادار رکن،اشتراکیت کے شیدائی،ایک پر امن انقلابی اور انسان دوستی کے حامی تھے۔غرض یہ کہ ان کا ذہن کئی جہتوں میں بٹا ہوا تھا۔ان کی کثیر الجہات شخصیت کی وجہ سے ان کے چاہنے والے ان گنت تعداد میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں''۔110

قومی اردو کونسل برائے فروغ زبان اردو:

قومی اردو کونسل نے ایک قرارداد میں کہا کہ علی سردار جعفری ادب کی ترقی پسند تحریک کے اہم ترین ستون سمجھے جاتے ہیں۔1936ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے وہ اس سے وابستہ رہے۔ان کی شاعری اور ان کی نثری نگارشات دونوں اس تحریک کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرتی ہیں۔جعفری صاحب نظم کے شاعر تھے اور ان کی نظموں نے ہم عصر اردو شاعری کو موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر متاثر کیا۔ایک بڑے نظم نگار کی حیثیت سے وہ اردو کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ان کی شاعری ہمیشہ ہمارے درمیان زندہ رہے گی''۔ 111

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، ہندوستانی زبانوں کا مرکز:

''علی سردار جعفری ایک صاحب علم شاعر تھے۔ان کی شاعری میں روایت کا شعور بھی ہے۔حال کا آشوب بھی اور مستقبل کا خواب بھی۔غیر ترقی پسندانہ رویئے کے خلاف سردار کے ادبی جدوجہد کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔سردار جعفری ترقی پسند اقدار کے امین اور علامت تھے۔ان کی شاعری میں جو ترقی پسندی ہے اس کا رشتہ کلاسیکی شاعری کی ترقی پسندی سے قائم ہو جاتا ہے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سردار ہمیشہ اردو کے مسائل کے حل کیلئے کوشاں رہے۔آج جو اردو کی صورت حال میں کوئی بہتری ہے تو اس میں نمایاں حصہ علی سردار جعفری کی کوششوں کا ہے''۔ 112

انجمن ترقی اردو ہند:

اردو گھر میں ..... کہا گیا کہ علی سردار جعفری نے فرد کی آزادی، امن عالم، مساوات اور منصفانہ نظام کے لئے ہمیشہ آواز بلند کی۔ترقی پسند تحریک کے فروغ میں جعفری صاحب نے کلیدی رول نبھایا۔آج ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اس دنیا سے رخصت ہو گیا''۔ 113

آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن:

''فاؤنڈیشن کے صدر دفتر ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی میں ایک تعزیتی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں فاؤنڈیشن کے تمام ارکان کے ساتھ ساتھ علاقہ کے معزز اور ادب شناس لوگوں نے بھی شرکت کی۔کہا گیا کہ وہ (سردار جعفری) زندگی بھر دوستی کے پیغام کو عام کرنے کیلئے کام کرتے رہے''۔ 114

بزم ہم قلم:

''ان کی (سردار جعفری) فنی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ان کی تنقید نگاری، نثر نگاری، تقریر کرنے کی صلاحیت اور ایک دانشور کی حیثیت سے ان کی شخصیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔علی سردار جعفری کسی ایک تہذیب یا تحریک کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل دبستان کا نام ہے۔علی سردار جعفری اردو ادب کا روشن ستارہ ہیں جس کی روشنی سے کئی نسلوں نے استفادہ کیا ہے''۔ 115

بدر وزیر احمد سکریٹری، غالب انسٹی ٹیوٹ:

''ان کی (سردار جعفری) شاعری اس لیے بھی خصوصیت کی حامل ہے کہ انہوں نے سماج کے دبے ہوئے لوگوں کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی''۔ 116

''مقررین نے علی سردار جعفری کو اردو ادب کا ایک ایسا ادیب بتایا جس نے اپنی تحریکوں سے سماج میں ہونے والے انتشار کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔انہوں نے کہا کہ جعفری صاحب ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کے بھی علمبردار تھے۔جعفری صاحب آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تنہا ادیب تھے جنہوں نے قوموں کے ٹکراؤ کو ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔معظم علی نے کہا کہ جعفری صاحب کا اہم کارنامہ اردو ادب میں دوسری زبانوں کے ترجمے کے ساتھ شروع ہوتا ہے اگر جعفری صاحب ان ترجموں کو ہم تک نہیں پہنچاتے تو دوسرے ممالک کے ادب سے ہم قطعی روشناس نہ ہوتے''۔ 117

غالب اکیڈیمی:

''مختلف لوگوں نے کہا کہ جعفری صاحب کا غالب اور اقبال سے خاص لگاؤ تھا۔انہوں نے ہی سب سے پہلے کلام غالب کو اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے غالب اردو کے علاوہ ہندی والوں میں بھی مقبول ہوئے ۔انہوں نے عملی طور پر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مظلوموں کی ہمدردی کی' امن وآشتی کا پیغام دیا' انسانیت کا درس دیا۔اس وقت ہمارے سماج اور اردو کو جعفری صاحب کی سخت ضرورت تھی ایسے وقت میں ان کا چلا جانا اردو دنیا کا نا قابل تلافی نقصان ہے''۔ 118

خلیق ابراہیم خلیق:

''جوش وفراق اور ان کے ہمعصروں کے بعد ترقی پسند شعراء کی جو کہکشاں نمودار ہوئی اس کے چھوٹے بڑے سارے ہی ستارے ہر کہکشاں کی طرح روشن اور تابناک تھے۔اس کہکشاں میں شامل صف اول کے شعراء میں مجاز' فیض' سردار جعفری مخدوم' جان نثار اختر احمد ندیم قاسمی اختر الایمان' جذبی' مجروح' کیفی' ساحر' وامن اور ظہیر کاشمیری نمایاں ہیں۔پھر ان میں بھی اول الذکر سات شعراء یعنی مجاز' فیض' سردار جعفری مخدوم' جاں نثار اختر' احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان ممتاز نظر آتے ہیں۔معروضی انداز نظر اختیار کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نواز فکری رویئے کے اشتراک اور اپنے الگ الگ رنگ وآہنگ کی دلکشی کے ساتھ یہ ساتوں شعراء یکساں بلندیوں پر کھڑے ہیں۔آج 1991ء کے اواخر میں ہم ترقی پسند شعراء کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو موضوعات کے تنوع' تخیل کی ندرت' فکر کی سلامت روی اور تہہ داری اور لفظیات اور اسالیب کی تازہ کاری کے لحاظ سے فیض' سردار جعفری اور اختر الایمان اپنے ہم پلہ معاصرین سے آگے نظر آتے ہیں۔مجاز اور مخدوم کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور مجاز شراب میں نہ ڈوبے ہوتے اور مخدوم کو عملی سیاست سے کچھ فرصت ملتی تو ان دونوں میں بھی مزید بلندیاں سر کرنے کے امکانات تھے۔علمی فضیلت کے بھاری بھرکم پن' بصیرت افروز' دانشوری کی گمبھیرتا اور تجربات کی بوقلمونی کے باعث فیض' سردار جعفری اور اختر الایمان کا فنی کینوس خاصا وسیع ہے۔تینوں نے اپنے اپنے کینوس پر اپنی پسند کے رنگوں سے اپنی اپنی طبع رسا کے تقاضوں کے مطابق حقائق حیات کی نقش گری کی ہے۔علی سردار جعفری اور فیض کثیر الجہات فنی شخصیتوں کے حامل ہیں۔شعر وادب کے علاوہ دیگر فنون کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی ان کی تخلیقی اور ترغیباتی سرگرمیاں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ادب وفن کے ساتھ یہ دونوں صحافت اور سیاست کے میدانوں میں بھی سرگرم عمل رہے ہیں نظم ونثر دونوں میں ان کا ادبی اثاثہ اور عملی زندگی میں ان کا کام بہت گراں مایہ ہے۔رہے اختر الایمان تو وہ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی رہے اور ان سے الگ بھی۔ان کی اٹھان تو جدیدیت پسندوں ہی میں ہوتی مگر وہ کبھی اپنی ذات کے گنبد میں بند نہیں ہوئے۔انہوں نے اجتماعی تناظر میں ہی اپنی ذات کی شناخت کی اور عام انسانوں کے دکھ سکھ سے لاتعلق نہیں رہے۔سماجی عوامل اور معروضی حقائق پر ہمیشہ ان کی نظر رہی یہی سبب ہے کہ خواہ وہ ترقی پسندوں کے فنی نظریات سے اکیڈمک طور پر پوری طرح متفق نہ ہوں مگر ان کی شاعری ترقی پسندی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے''۔ 119

ڈاکٹر علی احمد فاطمی:

(1) ''سردار جعفری خالص روایتی شاعر نہ تھے بلکہ اپنے باغیانہ و دانشورانہ فکر و عمل کی وجہ سے ایک بڑے ادیب و ناقد' مفکر و دانشور بھی تھے۔ افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' صحافی' ہدایت کار کے علاوہ اور بھی بہت کچھ' ترقی پسند تحریک کے بانیان اور رہنمایان میں سے ایک تھے۔ ادب' تاریخ' تہذیب' ثقافت' سیاست وغیرہ کے گہرے رمز شناس' فارسی و عالمی ادبیات کے عمدہ نباضی' رومی' حافظ' گوشے' مارکس' پابلو نرودا' ناظم حکمت' نانک' کبیر' میرا' میر' غالب اقبال سے لے کر فیض و فراق تک ان کے دائرہ فکر میں سمٹے ہوئے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر میں سمائے ہوئے جرأت گفتار ایسی کہ بڑے سے بڑے صاحبان علم و فضل کے چراغ گل ہو جائیں۔ دلیل ایسی کہ پیشہ ور وکیل دستاویز پھاڑ دیں۔ کبیر' نانک کا تصوف' سعدی' حافظ کا تعزل' غالب کا تفکر' اقبال کا تعمل اور مظلوم انسانوں کے تشہد نے سردار جعفری کو علم و عمل اضطراب و احتجاج کی صرف ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک عہد' ایک تاریخ اور ایک علامت بنا دیا تھا۔ ایسی ہمہ جہت و باکمال شخصیت' تاریخ ساز و عہد آفریں شاعر و ادیب کا تخلیقی سفر تلاش کرنا نیز اس کی شاعرانہ پرتوں اور دانشورانہ دبازتوں کو تلاش کرنا' تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بڑے بڑوں کے قلم میں کپکپی اور ذہن میں تھرتھری سی ہونے لگتی ہے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی' سردار جعفری کے انقلابی و آفاقی ذہن نے ابتداء سے ہی شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے شعری عوامل اور فکری محرکات و نظریات میں عالمی شاعری اور عالم کے حوادث کو ذہن میں رکھا۔ نظریہ شعر و ادب ترتیب دیا۔ کچھ ایسے مفکرانہ اور بلند آہنگ شعری پیکر تراشے جس سے عام اردو والے زیادہ مانوس نہ تھے۔ وہ اردو شعر و ادب کو قدیم رومانی روایات و تناظرات میں دیکھنے اور سمجھنے کے عاری تھے۔ اس لیے رد و قبول' قرأت و مفاہمت کے درمیان کھانچے تو آنے ہی تھے''۔ 120

(2) ''ان کا علم و فضل' ان کا منطقی و استدلالی انداز خطاب کا بہتا ہوا اسلوب' الفاظ کے ابلتے ہوئے چشمے کہ بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب یونہی تو نہیں ہوتا۔ اس کے پس پردہ نجانے کتنی دہائیوں کی علمی ریاضت' غور و فکر کے لامتناہی سلسلے' مطالعہ و مشاہدہ کی لامحدود جہتیں اور ان سب کو اپنی ذات میں تحلیل و تزئین کرنے کا کربناک عمل' جلنے پگھلنے کا ایک طویل سلسلہ اور پھر اس سلسلہ کو ایک ترتیب و تنظیم' ایک نظریہ' ایک زاویہ عطا کرنا اور پھر اس زاویہ کو تاریخ و تہذیب میں جذب و پیوست کر دینے کا عمل' اس کے لیے تاریخ انسانیت کے بوسیدہ اوراق سے لے کر نت نئے علوم و افکار' تجربات سے باخبر' باعمل ہونا پڑتا ہے اور بلاشک و شبہ سردار جعفری اپنی عمر و فکر کی ہر منزل پر' ہر موڑ پر باخبر باعمل اور بااثر رہے اور اپنے علم و فلسفہ' شعور و ہنر اور انسان دوستی کے ذریعہ نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہتے۔ کبھی تخلیق و تنقید کے ذریعہ' کبھی تحریر و تقریر کے ذریعہ' کبھی انفرادی طور پر' کبھی اجتماعی طور پر کبھی ڈھال بنے' کبھی تلوار' کبھی مفاہمت' کبھی تکرار غرض کے ہر دور میں وہ علم و فضل' فکر و عقل کے ذریعہ اپنے گروپ میں' اپنے عہد میں کلیدی و قائدانہ رول ادا کرتے رہے۔ ایسے سردار جعفری کو جس نے اردو کی سب سے بڑی تحریک میں بنیادی و کلیدی رول ادا کیا ہو۔ جس نے نثری تخلیقات جس بے پناہ اثر و توجہ کا رس گھول دیا ہو' جس کی تحریروں نے ہنگامے برپا کر رکھے ہوں۔ جس نے خطبوں' اداروں' بحثوں' فلموں' انشائیوں وغیرہ کے انبار لگا رکھے ہوں' جس نے انسان کی عظمت' فلسفہ' تصوف' بھگتی' مارکسزم' کمیونزم' سوشلزم'

کانگریس‘میڈیا‘صحافت وغیرہ پر اپنی مہریں ثبت کر رکھی ہوں‘‘۔ 121

ڈاکٹرنصرت چودھری نے لکھا ہے:

’’یوں تو ہر عہد کی شاعری یا اچھی شاعری اپنے معاشرے کی بڑی حد تک عکاسی ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ شاعر کا وژن (Vision) فنکارانہ ہو۔کوئی بھی تجربہ اس کی شاعرانہ صلاحیتوں میں اس طرح رچ بس جائے کہ جب وہ الفاظ کے روپ میں ڈھل کر سامنے آئے تو وہ اس عہد کی آواز نظر آئے ۔ دراصل یہی وہ منزل ہے‘ جہاں ترقی پسند گروپ کے شعراء ایک گروپ کے بجائے ایک لائن میں نظر آتے ہیں‘ جن میں کچھ آگے ہیں اور کچھ پیچھے۔موضوعات‘واقعات‘نظریات کم وبیش مشترک ہیں مگر سب کی شاعرانہ صلاحیتیں مختلف ہیں اور نتیجے کے طور پر ان کا مقام بھی مختلف نظر آتا ہے۔سردار جعفری بھی اپنے خطیبانہ لہجے کی بناء پر ترقی پسند شعراء میں الگ سے پہچانے جاتے ہیں‘‘۔ 122

ڈاکٹرشارب ردولوی :

’’اقبال کے بعد اردو شاعری میں فکری بصیرت کی توسیع اگر ملتی ہے تو سردار جعفری کے کلام میں ملتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اس صدی کی ابتداء اقبال جیسے نظریہ ساز سے ہوئی اور جس کی آخری کڑی سردار جعفری ہیں جنہیں اس عہد میں ایک نظریہ ساز کی اہمیت حاصل ہے۔بعض لوگوں کے یہاں ایک عمر پر پہنچتے پہنچتے تخلیقی سوتے خشک ہوجاتے ہیں اور فکر وخیال کا ارتقا رک جاتا ہے اور وہ صرف اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں لیکن سردار جعفری کے یہاں فکر وخیال کا ارتقاء کا یہ عمل آخر عمر تک جاری رہا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر نظم اور غزل ان کے فکر کے نئے پہلوؤں امن اور زندگی کے بارے میں ان کے شدید تفکر کی تصویر ہے۔اردو تنقید ہو یا شاعری‘ اپنی فکری بصیرت اور اپنے شعری اسلوب کی وجہ سے ادبی تاریخ میں ہمیشہ انہیں ایک منفرد مقام حاصل رہے گا‘‘۔ 123

اختر سعید خان :

(1) ’’سردار جعفری شاعر بھی تھے‘ خطیب بھی تھے اور نثر نگار بھی اور تینوں صفات میں بھی یکتا تھے۔ایسا کم دیکھنے میں آیہ ہے کہ کسی شخص میں یہ تینوں صفات اعلیٰ معیار کے ساتھ یکجا پائی گئی ہوں‘ جس طرح ان کی شاعری فکر ونظر اور جذبات کی ایسی آواز تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی‘ اسی طرح ان کی تقریر سامعین کو مسحور کر دیتی تھی اور سننے والے بت بنے سنتے رہتے تھے۔عام طور پر تقریر کی طوالت سننے والوں کو اکتا دیتی ہے۔لیکن ان کے سامعین کا جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور سامعین سنتے رہیں۔ان کی شاعری کی طرح ان کی خطابت بھی اسی ذہن اور جذبے کی ترجمان تھی جو ان کا مشن تھا۔ان کا مشن جو تیسری دنیا کے لوگوں کے حقوق کی آواز تھی جو انصاف کی طالب تھی اور انصاف نہ ملنے پر آمادہ جنگ تھی۔سردار جعفری اپنے شعر میں تاریخ‘ منطق اور متداولہ علوم سے کام لیتے تھے جن کے ذریعہ انسان کو ایک بہتر زندگی حاصل ہو سکے جو استحصال شکنجوں سے آزاد ہو اور ہر طرح کی نا آسودگیوں کا مداوا ہو۔وہ ساری زندگی شعر وادب کی مشعل لیے استحصالی طاقتوں سے لڑنے والوں کی رہنمائی کرتے رہے۔شعور کی عمر پاتے ہی انہوں نے اسی فلسفہ حیات کو اپنا لیا تھا جسے اختیار کر کے تیسری دنیا کا انسان سر اٹھا کر چل سکے۔ان کے نزدیک اشتراکی نظام ہی وہ نظام حیات تھا جو انسانوں کی تقدیر بدل سکتا تھا جس کا عملی نمونہ روس کا معاشی اور

سیاسی نظام تھا۔ان کی عملی زندگی کی وجہ کا آغاز اسی فلسفہ حیات کی روشنی میں ہوا''۔

(2) ''سردار جعفری کا دوسرا نام انجمن ترقی پسند مصنفین بھی ہے۔اس انجمن کی بنیاد سجاد ظہیر نے ڈالی تھی جس کی تعمیر میں حسرت موہانی اور پریم چند جیسے بزرگ اہل قلم شریک کار تھے۔پریم چند کا خطبہ صدارت آج تک انجمن کے مینی فسٹو کا حصہ رہا ہے۔خطبہ کا یہ معنی خیز جملہ کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا' ترقی پسند ادیبوں کا لائحہ عمل بن گیا۔حسن زندگی کا استعارہ ہے اور جس شئے کا زندگی سے تعلق ہے وہ اس میں شامل ہے۔حسن جاگیری سماج میں بھی تھا اور اشتراکی نظام حیات میں بھی۔بدقسمتی سے جاگیری نظام نے تیسری دنیا کے انسان کو حسن کی ساری اقدار سے محروم کر دیا تھا اور صرف جاگیری سماج کے حسن کو حسن قرار دیا جاتا تھا۔پریم چند نے جب حسن کے معیار کو بدلنے کی بات کہی تو یہ اشارہ تھا غریب اور محنت کش عوام کی زندگی میں حسن کی تلاش کرنے اور جاگیری سماج کے حسن کی ادعایت کو ختم کرنے کا۔ترقی پسند مصنفین کی تحریک ایک نئے نظام زندگی کی طرف گامزن ہونے کی تحریک تھی جس کا عملی نمونہ اس عہد میں سوویٹ روس تھا۔ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے ترقی پسند مصنفین نے اپنے قلم کو وقف کر دیا۔تقسیم ہند کے بعد کچھ سیاسی اسباب کی بناء پر ترقی پسند تحریک کے روح رواں بنے بھائی پاکستان چلے گئے اور وہاں قید کر لیے گئے۔ادھر 1951ء میں سردار جعفری ناسک جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ان کی عملی جدوجہد اور ردبی وعلی بصیرت کے سبھی قابل قائل تھے اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک (کو) آگے بڑھانے کیلئے ان سے معتبر کوئی اور نام نہ تھا۔انہیں اپنا قطب نما سمجھتے تھے جس سے وہ اپنے سفر کی سمت متعین کرتے تھے تقریباً چالیس سال تک ترقی پسند مصنفین کی تنظیم تحریک کی شکل میں جاری رہی''۔جانے والے تجھے سلام تیرے قلم کو سلام جو ساٹھ سال تک اجالا لکھتا رہا''۔ 124

ڈاکٹر انیس اشفاق :

''سردار کی سی ہمہ گیری کسی اور ترقی پسند ادیب میں نہیں ہے۔الگ الگ زبانوں پر یکساں قدرت' مختلف ادبیات وعلوم سے گہری واقفیت اور سیاسی اور سماجی مسائل کے عملی تجربے نے انہیں ترقی پسند ادیبوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز کر دیا ہے۔وہ اس تحریک کے ان معدودے چند قلم کاروں میں ہیں جنہیں ادبی اور تخلیقی نثر لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ان کی نثر کو اچھی مستحکم' رواں اور بے عیب نثر لکھنے کیلئے نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔وہ نثر کے مختلف میدانوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نثر کی مختلف صنعتوں میں قدم رکھنے سے پہلے ان کے تقاضوں کے سمجھ لیتے ہیں۔ہمیں ان کے شاعرانہ ذوق اور ان کی شعرفہمی کا معترف ہونا پڑے گا۔وہ میر' غالب اور اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ سردار جعفری کی یہ کثیر الجہت شخصیت نہ صرف ان کے معاصرین بلکہ ان کے بعد کی نسل کے ادیبوں کے لیے بھی قابل رشک ہے''۔ 125

اندر کمار گجرال' سابق وزیر اعظم ہند:

(1) ''علی سردار جعفری کا انتقال علمی دنیا کیلئے ایک سانحہ ہے۔ سردار جعفری نے عمر بھر ادب کی خدمت جس جاں فشانی سے کی اس کی دوسری مثالیں کم ملتی ہیں۔اردو ادب کو ایک نئی وسعت اور سماجی گہرائی دینے میں سردار کی تمام شخصیت ابھر کر آجاتی ہے۔ادب کے علاوہ سردار جعفری جنگ آزادی کے مجاہدوں میں بھی صف اول میں کھڑے تھے اور اس ناطے سے ان کو کئی مرتبہ جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں بھی رہنا پڑا۔سردار سے میری دوستی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہوئی

تھی ۔اس وقت بھی ان کی شخصیت اپنے ہم نواؤں کو متاثر کن تھی ۔ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو کامیاب بنانے میں سردار کا اہم کردار رہا ہے اور اگر آج اردو کے ترقی پسند مصنفین کی تحریروں کی دنیا بھر میں تعریف ہے تو اس کے لیے سردار ہمارے شکریے کے مستحق ہیں''۔ان کے قریب رہنے سے سردار کی دانشورانہ اڑان اور انسان دوستی کا نقش آج بھی ہمارے دلوں پر ہے''۔

(2) ''علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے علمبردار اور اس کے بانیوں میں سے تھے اور میرا تعلق بھی اس تحریک سے تھا۔ترقی پسند تحریک نے جنگ آزادی کو ایک نئی سمت عطا کی اور اردو ادب کو بھی بہت کچھ دیا۔میں نے ان کی شاعری کا مطالعہ دل سے کیا ہے۔ان کی شاعری میں امن' بھائی چارے' دوستی' محبت اور ہم آہنگی کا پیغام کوٹ کوٹ کر بھرا ہے''۔ 126

اٹل بہاری واجپائی' وزیر اعظم ہند:

''سردار جعفری کو ہمیشہ ایک انقلابی دانشور اور خطیب کے طور پر یاد کیا جائے گا۔اپنے تعزیتی پیغام میں انہوں نے کہا کہ جعفری صاحب نے اپنی دانشورانہ صلاحیتوں کا سامراجیت ظلم اور طبقاتی نابرابری کے خلاف استعمال کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جدوجہد آزادی میں شمولیت کے وقت انہوں نے مجاہد آزادی کے طور پر شہرت پائی اور کئی مواقع پر انہیں جیل بھی جانا پڑا۔مگر اس سے ان کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی ۔ہندوستانی ادب میں ان تخلیقات کی جگہ ہمیشہ محفوظ رہے گی ۔سردار جعفری سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پچھلے سال میں ان کی نظموں کی ایک کتاب لے کر لاہور گیا تھا'' 127

سید شاہد مہدی' وائس چانسلر' جامعہ ملیہ اسلامیہ:

(1) ''علی سردار جعفری نے اردو ہندی کو نزدیک لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔وہ ہمیشہ ظلم کے خلاف جہاد کرتے رہے اور مشترکہ تہذیب کے پاسدار رہے۔علی سردار جعفری کی شاعری یا شخصیت پر بھلے ہی کسی کو اختلاف ہو لیکن ان کی حب الوطنی' انسان دوستی اور بین الاقوامیت پر کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔وہ دنیا بھر میں ترقی پسند تحریک کے ترجمان تھے''۔

(2) ''اردو نے ایک عملی ادیب و شاعر کو کھو دیا۔امن کا پیغامبر رخصت ہو گیا۔مرحوم جعفری نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے دبے کچلے افراد کی آواز کو عام کرنے کا کام کیا۔ انکی شاعری امن و آشتی کا پیغام تھی''۔ 128

محمد افضل' سابق ممبر پارلیمنٹ :

ہمارے درمیان سے ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ رخصت ہو گئی۔یہ اردو ادب کا ایک بہت بڑا نقصان ہے''۔ 129

شری کرشن کانت' نائب صدر جمہوریہ :

''سردار جعفری ترقی پسند دانشوروں کی اگلی صف میں تھے۔ان کی ذہانت' اردو ادب سے ان کی گہری وابستگی اور محنت کش عوام سے ان کی محبت نے ہندوستانیوں کی کئی نسلوں کے ذہن کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے''۔ 130

شری کے۔آر نارائن' صدر جمہوریہ ہند:

''مجھے علی سردار جعفری کی موت سے سخت تکلیف پہنچی ہے جو اپنی تحریروں میں ایک انقلابی تھے اور عام آدمی کے کاز کیلئے

لکھتے تھے اور عام انسانوں کو فیض پہنچاتے تھے۔ اپنے کاموں کی وجہ سے وہ بے شمار قارئین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے"۔ 131

شری ارون جیٹلی، مرکزی وزیر اطلاعات:

"سردار جعفری اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے مشعل بردار تھے۔ جناب جعفری نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جس طرح سے دبے کچلے طبقہ کے لوگوں کے مسائل اور زندگی کی سچائیوں کو ابھارا ہے اس کے لیے انہیں برسوں یاد رکھا جائے گا"۔132

شری یونس سلیم، سابق گورنر بہار:

"علی سردار جعفری کی قد آور شخصیت اردو ادب میں بے مثال تھی۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کا جتنا زبردست نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کے امکانات مستقبل قریب میں نظر نہیں آتے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ معیار کے ترقی پسند شاعر تھے بلکہ نثر نگاری میں بھی اپنا منفرد اسلوب رکھتے تھے اور انہوں نے تنقید و تحقیق پر جتنا کام کیا ہے اور جو سرمایہ انہوں نے اردو زبان کے لیے چھوڑا ہے زبان و ادب کی تاریخ میں انکا نام ایک درخشاں ستارے کی طرح روشن رہے گا"۔ 133

شری امر سنگھ، جنرل سکریٹری سماج وادی پارٹی:

"ہمیں ناز ہے علی سردار جیسی شخصیتوں پر جو صحیح معنوں میں انسانیت کے پیکر تھے جن کی شخصیت کسی ذات یا مذہب کے دائرے میں نہیں بندھی تھی انہیں ہر ہندوستانی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ سیکولر تھے۔ جنگ آزادی میں ان کا اہم کردار رہا۔ وہ جیل گئے۔ آج ہم جس آزاد ہندوستان میں سانسیں لے رہے ہیں یہ ان کی دین ہے اور رہتی زندگی تک ہماری سانسیں ان کی قرض دار رہیں گی"۔ 134

کیفی اعظمی:

"ان کے (سردار جعفری) کے انتقال سے اردو ادب کا بہت بڑا نقصان تو ہوا ہی ساتھ ہی سیکولرازم کو بھی دھچکا لگا ہے۔ علی سردار جعفری دنیا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ پاک و ہند تنازعہ سے انہیں بڑی تکلیف تھی جس کو اکثر انہوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے"۔ 135

ادیبوں اور نقادوں کی نظروں میں سردار جعفری کی اچھی نظمیں

فضیل جعفری :

"اودھ کی شام حسیں، نیند، پتھر کی دیوار، میرا سفر اردو شاعری میں بے مثال ہیں اور یقینی طور سے اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ 136

سجاد ظہیر:

"ایک خواب اور" پر تبصرہ کرتے وقت سجاد ظہیر نے لکھا:

"سردار جعفری کی شاعری جدید اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اردو کی ترقی پسند خلاقی اپنی پوری آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے"۔

عمیق حنفی:

''سردار جعفری کی نظمیں نئی دنیا کو سلام' ایشیاء جاگ اٹھا' پتھر کی دیوار' سیلاب چین' صبح فردا' اودھ کی خاک حسین' دشمن کون ہے اچھی نظمیں ہیں اور وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں''۔ 137

وارث علوی:

''سناٹا'' کو میں سردار کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں ۔اس نظم میں سردار انسان کو تاریخ ہی میں نہیں بلکہ وقت کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔سردار کی ایک شاہکار نظم ہے ''پیغمبر مسیحا دست''۔ 138

نظم ''فریب'' جو پندرہ اگست پر ہے۔فارم پر شاعر کی گرفت مضبوط ہے اور کہیں جھول نہیں پڑتا۔پوری نظم خوب صورت تشبیہوں اور لفظی پیکروں سے مالا مال ہے۔خطابت سنبھلی ہوئی' طنز کا ٹ دار اور ہر وار نپا تلا ہے۔نظم کا باغیانہ لب ولہجہ پر عتاب اور پر وقار ہے۔نظم مشرق ومغرب بہت خوب صورت ہے۔نظم ایک خواب اور ''اتنی خوب صورت اور مکمل منفرد نظم ہے کہ اسے بلا تکلف سردار کی شاعرانہ عظمت کا نقش اولین کہا جا سکتا ہے''۔حسین تر اردو کی چند بے مثال نظموں میں سے ہے۔سردار کی خوبصورت نظم ''بہت قریب ہو تم'' ہے۔''میرا سفر'' سردار کی بہت ہی شاندار نظم ہے۔میں نہیں سمجھتا کہ اردو کے علاوہ ہمارے ملک کی کسی اور زبان میں اس پایے کی کوئی اور نظم لکھی گئی ہو۔'' 139

محمد حسین پرکار :

''سردار جعفری کی تینوں نظمیں (ایشیاء جاگ اٹھا' کون دشمن ہے اور صبح فردا) آگ میں پھول کھلانے کا کامیاب تجربہ ہیں ۔باد سموم کو باد نسیم میں بدلنے کا بہترین نسخہ ہیں اور سب سے بڑھ کر انسانی اقدار کی معراج ہیں''۔ 140

ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

نظم ''تو الا' مختصر لیکن موثر نظم ہے جو حساس قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔اس کا شمار جعفری کی اعلیٰ درجے کی نظموں میں ہونا چاہئے۔سردار کی نہایت اہم اور اعلیٰ درجہ کی نظموں میں میرے خواب'' اور ''پتھر کی دیوار'' کا شمار کرنا چاہئے۔'' 141

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید:

''سردار جعفری اردو ہی کے نہیں' کسی بھی زبان کے ان چند شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جن کی شاعری کا مقصد ومحور عوام ہیں۔موضوعات' زبان اور اسلوب ہر کسی اعتبار سے سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔انہوں نے نہ صرف عوام کے لیے شاعری کی ہے بلکہ اپنی شاعری کو عوامی جدوجہد کے کام بھی لایا ہے۔عوامی فلاح' بہبودی' مسرت اور خوشحالی کے حصول کے لیے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔انسان دوستی اور انسانیت کے خوشگوار مستقبل کی تعمیر ان کی شاعری کا مقصد ہے جو رنگ ونسل' مذہب وملت' ملک وقوم اور علاقہ واریت اور زبان' غرض تمام تعصّبات سے بالاتر ہے''۔ 142

سردار جعفری نے اپنے مقصد شاعری کے بارے میں کہا تھا۔

تا کہ ہوں آسان پیکار حیات
کر رہا ہوں فاش اسرار حیات

پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

''سردار جعفری کی شاعری مسلسل پیکار حیات کی علامت ہے۔انہوں نے زندگی سمجھنے اور سمجھانے میں بدلتی ہوئی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کو ملحوظ خاطر رکھا اور اسی سے ان کا قومی شعور بھی ابھرا''۔ 143

راشد انور راشد لکھتے ہیں:

''سردار جعفری اپنی شاعری کے ذریعے آنکھوں کے بجھتے ہوئے دیوں میں ہر لمحہ زندگی کی چمک برقرار رکھنے کیلئے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔آس کی ٹمٹماتی لو کا تحفظ ان کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے کیوں کہ اس ضمن میں ذرا سی کوتاہی اپنے آپ کو زندہ دفن کرنے کے مترادف ہے۔ہاتھوں کے کنول ان کی شاعری میں شگفتہ پھولوں کی مانند کھلتے بھی ہیں اور حالات کی ستم ظریفی سے ان کی شادابی اثر انداز بھی ہونے لگتی ہے۔زندگی کا یہ متضاد رویہ موجودہ عہد کا زبردست المیہ ہے اور ہر فرد اس جال میں الجھا دکھائی دیتا ہے، جس سے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔کیا زندگی کا کارواں بے سمت منزلوں کی طرف یونہی بھٹکتا رہے گا؟ کیا سفینۂ غم دل کسی مقام پر جا کر نہیں تھمے گا؟ لیکن ہزار دشواریوں کے باوجود امید کی ہلکی سی کرن جب اپنے وجود کا احساس کراتی ہے تو دل کو یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے کہ شاید مصائب کی تاریکیوں سے جلد ہی نجات ملے گی، شائد سحر کا کارواں بہت جلد دلوں پر دستک دے گا۔ 144

علی سردار جعفری نے اپنے فن کے بارے میں ایک ریڈیو تقریر ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے کی تھی جو ہماری زبان 8 مئی 1979ء میں شائع ہوئی۔سہ ماہی اردو ادب جولائی اگست ستمبر 2000ء میں اسے دوبارہ شائع کیا گیا۔

اس تقریر سے چند اقتباسات پیش ہیں:

(1) ''شاعری کو اس قابل ہونا چاہئے کہ کاغذ کے صفحے پر چھپ سکے اور خاموشی سے پڑھی جا سکے اور صدیوں کا سفر طے کر سکے''۔

(2) ''شاعر کا موضوع زندگی کا کرب و نشاط ہے۔انسانی دکھ اور سکھ ہیں۔اس کی ذاتی خوشیاں اور محرومیاں بھی عام عالم انسانی کی خوشیوں اور محرومیوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔وصل کی لذت اور ہجر کا درد بھی محسوس کرتے ہیں۔ظلم سے نفرت اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ ہر دل میں ہوتا ہے۔لیکن شاعر اپنے انفرادی تجربے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کو وہ بات اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔لحن و آہنگ الفاظ کو نئی خوب صورتی عطا کرتے ہیں جو سامع اور قاری کیلئے دلکشی کا باعث ہوتی ہے۔تشبیہ اور استعارے نئی معنوی تہیں پیدا کرتے ہیں''۔

(3) ''میں نے معاشرے کو طبقات کی شکل میں پہچانا ہے۔اس میں کچھ طبقے ہیں جو ظالم سفاک اور استحصال کرنے والے ہیں اور کچھ طبقے ہیں جو مظلوم ہیں اور تخلیق کرنے والے ہیں۔یوں کہ شاعر خود خلاق ہے اس لیے اس کا رشتہ دراصل

محنت کش اور خلاق مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ جڑنا چاہئے اور یہ رشتہ میری شاعری میں بہت واضح ہے"۔

(4) "میری شاعری میں محنت کش ہاتھوں کی قصیدہ خوانی ہے۔میری شاعری میں ہاتھوں کا ترانہ میرے مارکسی شعور کی دین اور اقبال کی اس روایت کی توسیع اور تسلسل ہے۔یہ محنت کش اور خلاق ہاتھ ہیں جو تہذیب وتمدن کی تعمیر کرتے ہیں اور انقلاب کی تلوار بن جاتے ہیں۔" 145

شعری مجموعہ "پتھر کی دیوار" کا حرف اول کافی طویل ہے۔

اقتباس پیش ہے:

"میں اپنے نالہ و بکا' آہ وفریاد سے اس غموں سے بھری ہوئی دنیا کو اور زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔سماج کی انحطاطی طاقتیں تو یہ چاہتی ہیں کہ اس زہر آلود فضا کو اور زیادہ زہر آلود کیا جائے لیکن ترقی پسند طاقتوں کا تقاضا یہ ہے کہ فضا کو زہر سے صاف کر کے پاکیزہ کر دیا جائے۔آج یہ شاندار جدوجہد دنیا کے ہر ملک میں ہو رہی ہے اور اس نے ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ہندوستان' ایران' افریقہ' انگلستان' امریکہ وغیرہ میں جدوجہد کے دوران میں نئے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔چین اور سوویت یونین وغیرہ میں یہ تخلیق تکمیل کی منزلوں کے قریب پہنچ رہی ہے۔جب ہم روح عصر کو اس طرح سمجھتے ہیں تو وہ ہمارے دلوں میں نشاط اور حوصلہ مندی پیدا کرتی ہے۔مایوسی اور قنوطیت نہیں۔یہی میری شاعری کا مقصد ہے جس میں کامیاب ہونے کی میں ابھی کوشش کر رہا ہوں"۔

پروفیسر زاہدہ زیدی:

"علی سردار جعفری کی شاعری میں جو خصوصیات سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں وہ ان کے وژن کی وسعت' شعری اسلوب کی بلند آہنگی' پیکر تراشی کی ندرت اور تنوع اور ڈرامائی طرز احساس اور طریقہ کار کی مرکزیت ہیں۔ان کی شاعری کے بہتر نمونوں میں یہ سب خصوصیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور کم وبیش لازم وملزوم ہیں۔" 146

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

(1) "علی سردار جعفری کی منتخب نظموں کے مختصر جائزے سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک خلاق مفکر اور اوریجنل شاعر تھے جن کی شاعری کا کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا۔پروٹسٹ کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طئے کئے اور ہر منزل پر ان کی فکر والہانہ جذبوں سے سرشار رہی۔شدت فکر واحساس' وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں اور اگر چہ ان کا انداز فکر مجموعی طور پر رجائی ہے لیکن آخری دور کی شاعری میں اس رجائی انداز کی جگہ گہرے تفکر' تحیر اور داخلی تلاش نے لے لی اور ایک المیہ عنصر بھی موج تہ آب کی طرح ان کی فکر میں مرتعش ہے اور یہاں بلند آہنگی کی جگہ شعری اسلوب میں جذبہ فکر کی ایک گہری مگر مدھم آنچ ہے جو نور ہی نور ہے نار نہیں"۔

(2) "سردار جعفری کی شاعری صرف انقلابی فکر اور اشتراکی نظریات کا بیان ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔اس

میں تاریخی شعور کی گہرائی بھی ہے اور سائنٹفک وژن کی نور افشانی بھی اور انہوں نے صرف سماجی ناانصافی، معاشی نابرابری اور کشمکش اور انقلابی تحریکوں کی تصویر کشی ہی نہیں کی ان کے شعری سروکار میں موت، زندگی، وجود، عدم، وقت اور ارتقاء جیسے پیچیدہ تصورات بھی شامل ہیں جن کو عام طور پر انہوں نے بے حد لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی کچھ عمدہ مثالیں "میرا سفر" اور "آبلہ پا" وغیرہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے سردار جعفری کی شاعری بڑے کینوس اور وسیع وژن کی شاعری ہے جس نے فکر واحساس کے سبھی رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مہابیانیہ بھی کہہ سکتے ہیں"۔ 147

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"سردار جعفری اپنے دور کے ایک اہم اور ممتاز شاعر تھے اور اس دور میں ان کے قد وقامت کے شاعر صرف فیض احمد فیض، اختر الایمان اور ن۔م۔ راشد ہیں، جو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی نسل کے شاعروں میں صرف مخدوم محی الدین ایسے شاعر تھے جن کی شاعری فکر واحساس کی شدت انہیں ایک بڑا شاعر بنا سکتی تھی لیکن وہ شاعری کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا شعری اثاثہ محدود ہے۔ اس نسل کے شاعروں میں اچھے شاعروں کی کمی نہیں مثلاً جذبی، مجاز، مجروح، ساحر وغیرہ لیکن یہ سب چھوٹے کینوس اور فنی یک رنگی کے شاعر تھے اور انہیں Good Minor Poets ہی کہا جا سکتا ہے جب کہ سردار جعفری ایک میجر شاعر تھے اور فیض احمد فیض بھی اور گو کہ ان کی شاعری پوری طرح کمزوریوں سے پاک نہیں لیکن پھر بھی وہ Major شاعروں کی تخلیق ہے۔ اختر الایمان بھی ایک میجر شاعر تھے اور ان کی شاعری میں بھی بڑی وسعت اور گہرائی اور تہہ داری ہے اور انہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کی شاعری اس قسم کی کمزوریوں سے بھی پاک ہے جو سردار جعفری اور فیض احمد فیض میں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے۔ بہر طور سردار جعفری کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مستقبل قریب میں شاید ہی پر ہو سکے کیوں کہ دوسرے میجر شاعر تو پہلے ہی رخصت ہو چکے ہیں"۔ 148

ڈاکٹر شاداب ردولوی نے سردار جعفری کی شاعری پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

وہ رقمطراز ہیں:

"ان کی (سردار جعفری) شاعری پر اعتراضات ہوئے کہ وہ خطیبانہ ہے، بیانیہ ہے، وقتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر فکر بیانیہ ہوتی ہے۔ اگر برائیوں سے جنگ کرنے کی طاقت پیدا کرنی ہو تو خطابت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ایک طرح سے ہر شاعری وقتی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہ وہ اپنی وقت کی آواز ہے۔ ماضی کی آواز بے اثر ہو سکتی ہے اور مستقبل کی آواز کیسی ہوگی، اس کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہمارے سامنے اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ ہمارا "عصر" ہے اور وہی سب سے بڑی طاقت ہے، یہ شاعر کی قوت اظہار پر منحصر ہے کہ وہ اپنی آواز اور اپنی فکری توانائی سے مستقبل میں بھی زندہ رہے۔ اقبال کی فکر آج بھی تابندگی رکھتی ہے۔ کوئی شاعر آنے والے زمانے کیلئے شعر نہیں کہتا۔ غالب اور اقبال نے بھی مستقبل کے لیے شعر نہیں کہے تھے۔ انہوں نے بھی جو کچھ لکھا تھا وہ اپنے "عصر" کے لیے ہی لکھا تھا۔ لیکن ان کی فکر میں اتنی توانائی تھی، ان کے جذبے میں اتنی وسعت اور اظہار میں ایسی تہہ داری تھی کہ عصر کی تبدیلی کے باوجود ان کی معنویت اسی طرح برقرار رہی۔ سردار جعفری کا بیانیہ بھی انسان دوستی کے وسیع تر احساس اور فکر کی مضبوط بنیاد پر قائم ہے اور جس کے عناصر روشن خیالی، محبت، انسانی ہمدردی،

خوش حالی اور امن ہیں جس میں ہر نا انصافی، بدی، احساس برتری اور جنگ کے خلاف احتجاج ہے جس کی اس دنیا کو ہمیشہ ضرورت تھی اور ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ سردار جعفری نے وقتی اور خطیبانہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ بھی وقت کا ایک تقاضا تھا لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان میں جمالیاتی قدروں کی کمی ہے۔ ان کے نظریے سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت سے نہیں۔ شعری محاسن، خوبصورت الفاظ، دلکش تراکیب، نازک پیکر، حسین استعارے، محبت کی زبان اور الفاظ کا فنکارانہ انتخاب سردار جعفری کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ان کی ذہنی و فکری تربیت اردو فارسی کلاسیکی شاعری کے زیر سایہ ہوئی۔ لہذا حسن بیان، حسن الفاظ اور حسن اظہار کا دامن ان سے کبھی نہیں چھوٹتا''۔ 149

پروفیسر زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شاعری پر دوسروں کے اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے:

''سردار جعفری کی شاعری پر یہ اعتراض کہ وہ نعرے بازی یا تک بندی کے سواء کچھ نہیں تو صرف حاسدوں کے پراگندہ ذہن کی اختراع ہے۔ سردار جعفری شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈر شپ کی صلاحیتیں بھی ان میں خداداد تھیں۔ ساتھ ہی وہ ایک فعال اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے ان کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے ہمعصروں میں فیض احمد فیض کے علاوہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس لیے یہ کم عیار لوگ سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری دونوں پر چھینٹے اچھالنے میں مصروف رہے۔ جہاں تک کچھ اور الزامات کا سوال ہے مثلاً یہ کہ سردار جعفری کا شعری اظہار ضرورت سے زیادہ وضاحتی اور سپاٹ ہے تو یہ الزام بھی غلط ہے۔ سردار جعفری کی ابتدائی نظموں میں طوالت اور پھیلاؤ ہے لیکن اکثر جگہ مثلاً ''پتھر کی دیوار'' ایشیاء جاگ اٹھا'' اور ''اودھ کی خاک حسیں'' میں وہ موضوع کا تقاضا ہے اور آخری دو نظموں میں تو یہ براہ راست انداز ان کی دلکشی میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کی شاعری کا ارتقائی سفر وضاحتی انداز سے اختصار، ارتکاز اور ایمائیت کی طرف تھا اور ان کے دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری میں تو فکر، جذبہ، موضوع اور فنی وسائل اس طرح ایک دوسرے سے ہم آمیز ہیں کہ ان کو الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا''۔ 150

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے سردار جعفری کی شاعری پر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مثالیں بھی پیش کی ہیں، اور خوبیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

''ان کے (سردار جعفری) مخالفین، ان کو اکثر ایک پارٹی کارکن (Party Activist) کی شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو جعفری صاحب کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے اور ان کی نظموں ''ہم آج یلغار کر رہے ہیں'' یا صفیں جما رہے ہیں ہم، قدم بڑھا رہے ہیں ہم، یہ وقت وقت سرکشی ہے سر اٹھا رہے ہیں ہم، نشان فتح آسمان پر اڑا رہے ہیں ہم.....

یا پھر ایشیاء سے بھاگ جاؤ، چھوڑ دیں گے ہم یہ آنکھیں ہم کو مت آنکھیں دکھاؤ، ایشیاء سے بھاگ جاؤ تیوریاں بدلے ہوئے ہیں اب زمیں و آسماں، بجلیاں لے کر اٹھا ہے دل کی آہوں کا دھواں، آنکھ سے آنسو کے بدلے ڈھل رہی ہیں گولیاں،

بن گئے ہیں رائفل کی آنکھ اب سینے کے گھاؤ۔ایسی شاعری کو محض پروپگنڈا کا نظمانہ (Versification) کہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ضرورتاً کبھی کبھی ایسی شاعری کرنی پڑتی ہے۔ساری War Poetry اس کی مثال ہے جس میں Sasoon اور Edmund Blunden اور ان کی تمام Undertones of War جیسی شاعری شامل ہے۔خود آڈن اور اسنڈر نے ایسی شاعری کی ہے۔تمام Trench Poets اسی طرح کی شاعری کرتے تھے تو پھر ایسی شاعری' شاعری کیوں نہیں؟ یہ تمام باتیں جعفری صاحب کی شاعری میں ہیں۔"ہاتھوں کا ترانہ" بھی ہے اور "ایشیا جاگ اٹھا" بھی ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایسی خوبصورت شاعری بھی ہے۔

یہ سورج کی رنگین کرنوں کا جال' کہ جس طرح فطرت نے کھولے ہوں بال' کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے' چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے' ہرے اور بھرے جنگلوں کی بہار' جھلا جھل چمکتے ہوئے ریگ زار' کہستان کے یہ سنہرے عقاب' ہواؤں میں اڑتے ہوئے آفتاب' وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک' وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک' دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا' فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا' اندھیرے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں' ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں' افق پر کرن خواب سا بن رہی تھی' ڈوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی' ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا' مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا۔

جعفری صاحب کی شاعری کا محاسبہ کرنے والوں کو ان کے اس رنگ کو بھی دیکھنا چاہئے' جو اتفاقی طور پر (Casual) نہیں ہے بلکہ ان کی ہر دور کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔پرواز' نئی دنیا کو سلام' خون کی لکیر' پتھر کی دیوار' ایک خواب اور اور دوسرے مجموعوں میں بھی یہ رنگ اور یہ لہر موجود ہے۔یہاں تک کہ ان کی Shooting اور ہنگامی شاعری بھی اس سے خالی نہیں۔"ایشیا جاگ اٹھا" جیسے ہنگامی مجموعے میں بھی جو امیجری اور پیکر تراشیاں ہیں۔ان کا جواب ان کی ہم عصر شاعری میں اس تیور اور جمالیاتی Flavour کے ساتھ شاید ہی کہیں ملے۔مثال کے طور پر کچھ امیجز (Images) دیکھتے ہیں۔یہ شاعری 'شاعری نہیں ہے' رجز کی آواز بادلوں کی گرج ہے طوفان کی صدا ہے' کہ جس کو سن کر' پہاڑ آتے ہیں سبز ماتھوں پہ برف کی کلغیاں لگائے' دھوئیں کے بالوں میں سرخ شعلوں کے ہار گوندھے' سمندر آتے ہیں جھاگ کی جھانجھنیں بجاتے' ہوائیں آتی ہیں اپنے جھونکھوں کی نیلگوں کو پھنیں گھماتی' گھٹائیں آتی ہیں بجلیوں پر سوار ہو کر' پٹھار آتے ہیں اپنے کاندھوں پہ ندیوں کی کمنڈالے' چٹانیں آتی ہیں اپنا گرزگراں سنبھالے' وہ جنگل آتے ہیں آندھیوں کے نشاں اڑاتے' کہاں ہے اے نوعروس صبح بہار آجا' ہماری بیتاب مٹھیوں میں' شفق کا سیندور چاندتاروں کے پھول' کرنوں کی سرخ افشاں بھر ہوئی ہے۔

یہ شاعری عہد آفریں یعنی (Epochmaking) شاعری ہے۔اسے صرف ہنگامی شاعری کہنا' صحیح محاسبہ نہیں۔ یہاں Signfier اور Signified کے ساتھ ساتھ امیجز (Images) کی' ان پرتوں کو بھی دیکھنا ہوگا جو بجلیوں پر سوار گھٹاؤں' پٹھاروں کے کاندھوں پر ندیوں کی کمنڈ' چٹانوں کے گرزگراں' شفق کا سیندور' چاندتاروں کے پھول اور کرنوں کی سرخ افشاں میں متشکل ہو کر ایک ہیولے کی طرح انقلاب کا تحرک اور جمالیات کی چمکتی بجلیاں بھی اپنے ساتھ لے کر سامع کے ذہن اور اعصاب پر پھیل جاتی ہیں اور پھر وہ گھن گرج' جو وقت ملک اور سیاست کا تقاضہ بنتی ہے' فکر اور جمالیات کے تحت الشعاع کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں۔جعفری کی شاعری میں شعر کی اوپری پرتوں اور اکہری صورتوں پر نظر رکھنے والوں کو پیکروں

(Images) کی ان تحت الشعاؤں کی زیریں اور اندرونی لہروں کو بھی دیکھنا چاہئے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے سردار جعفری کی شاعری پر بعض ناقدین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

ان کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

''سردار جعفری کی شاعری پر اردو کے بعض ناقدوں مثلاً کلیم الدین احمد وغیرہ کا الزام و اعتراض ہے کہ ان کی شاعری میں پروپگنڈا زیادہ ہوتا ہے۔ان ناقدین کا خیال ہے کہ سردار جعفری کی آواز میں گھن گرج' بلند آہنگی اور خطابت کا زور ہے' اس لیے ان کی شاعری کمتر درجے کی ہے۔ان ناقدوں کے اعتراضات کا جواب یہ ہے:

(1) ''اردو میں میر' غالب اور مومن اپنے اپنے رنگ کے یقیناً بڑے اور عظیم شاعر ہیں لیکن انیس' حالی' اکبر' اقبال اور فیض بھی بڑے اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔موخر الذکر شاعروں کے یہاں پروپگنڈا ہے اور یقیناً کو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ہر شاعر و ادیب کے کچھ افکار و خیالات ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے۔فکر و خیال کی اہمیت سے انکار کوئی بدتوفیق ہی کرسکتا ہے اس لیے شاعری میں پروپگنڈا اچھے معنوں میں پروپگنڈا ہوتا ہے اور ضرور ہونا چاہئے جس کی شاعری میں یا جس کے فن میں پروپگنڈا نہیں' اس کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ وہ فکری اعتبار سے دیوالیہ ہے۔اقبال کی شاعری پیامی شاعری ہے اور بڑی شاعری ہے۔سردار جعفری کی شاعری بھی اسی ڈگر پر چلتی ہے' گرچہ وہ اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے اقبال سے مختلف ہیں۔لیکن ان کے درمیان بہت سی باتیں مشترک بھی ہیں۔انسان کی عظمت' غلامی کی مذمت اور آزادی کی حمایت' سارے انسانوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے برابر سمجھنا اور ان میں تفریق نہ کرنا وغیرہ دونوں شاعر اپنے اپنے طور پر نظام ظلم و جور کے خلاف لکھتے ہیں۔سماج کی خرابیوں کو آئنہ دکھانے کا کام اقبال نے بھی کیا اور جعفری نے بھی۔شاعری اگر سماج کا درپن ہے تو سردار جعفری کی شاعری صحیح معنوں میں سماج کا آئنہ ہے''۔

(2) ''اب اعتراض بلند آہنگی' خطابت اور Declamation کا رہ گیا تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ باتیں اگر موقع و محل کے اعتبار سے ہوں تو خوبیاں ہیں ورنہ عیب سردار جعفری کی نظموں اور غزلوں میں جہاں عوام کو ابھارنے' جوانوں کو للکارنے اور ظالموں کو پھٹکارنے اور لتاڑنے کا موقع آتا ہے یقیناً ان کی آواز بلند' گرج دار اور پرخروش ہوتی ہے لیکن جب اپنے مرحوم دوستوں اور بچھڑے اور کھوئے ہوئے ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں تو ان کا لہجہ نرم' شکستہ اور خستہ ہوجاتا ہے۔مندرجہ ذیل غزل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے جس میں اپنے دوستوں کی مفارقت کا ذکر کرتے ہیں: ؎

یاد آئے ہیں عہد جنون کے کھوئے ہوئے دلدار بہت
انہوں نے دور بسائی بستی جن سے ہمیں تھا پیار بہت
اک اک کر کے کھلی تھیں کلیاں' اک اک کر کے پھول بنے
اک اک کر کے ہم سے بچھڑے باغ جہاں سے یار بہت

اس طرح یہ غزل دیکھئے جس میں تلقین و ترغیب اور پند و نصیحت کے باوجود خطابت' بلند آہنگی اور جوش و خروش بالکل نہیں۔غزل کی ایمائیت و اشاریت اور استعاراتی رنگ قائم ہے: ؎

فصل گل، فصل فزاں جو بھی ہو خوش دل رہئے
کوئی موسم ہو ہر اک رنگ میں کامل رہے

چند متفرق اشعار بھی ملاحظہ ہو: ؎

طلوع آدمیت ہے بہت آہستہ آہستہ
ابھی انسان کو کرنا ہے صدیوں انتظار اپنا

اور جب سردار جعفری اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے لہجے میں نرمی اور گھلاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور آواز میں شیرینی گھل جاتی ہے۔ مصائب حیات اور مشکلات زیست کی گفتگو میں بھی شعریت و لطافت کا رنگ قائم رہتا ہے۔ مختصر نظم "تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ" مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے: ؎

تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ
تیری پلکوں کے نرم سائے میں
دھوپ بھی چاندنی سی لگتی ہے
اور مجھے کتنی دور جانا ہے
ریت ہے گرم، پاؤں کے چھالے
یوں دہکتے ہیں جیسے انگارے
پیار کی یہ نظر رہے نہ رہے
کون دشت وفا میں چلتا ہے
تیرے دل کو خبر رہے نہ رہے
تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ

152

سبط حسن:

سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کے بانیوں ہی میں نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنی حسی ریاضتوں سے ترقی پسند ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اس میں نئے معنی اور نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔ 153

حمید اختر:

"سردار جعفری نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نہ صرف تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ مظاہرہ کیا بلکہ اپنے کام کی مقدار اور معیار میں بھی سب سے آگے رہے۔ وہ انتہائی وسیع المطالعہ انسان تھے اور انہیں اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ محض شاعر ہی نہیں، ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے۔ انہوں نے پرانے کلاسیکی ادب اور اس ادب کو تخلیق کرنے والے ادباء اور شعراء پر تحقیقی و تنقیدی کام بھی کیا اور ان کا یہ کام اتنا معیاری اور اس حد تک مستند ہے کہ آنے والے

زمانوں میں ادب کے طالب علم اس سے مدتوں رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔ابتدائی دور کی مخالفتوں کے باوجود علی سردار جعفری نے اپنے ریاض، محنت اور فراواں تخلیقی جوہر کے بل بوتے پر جلد ہی اپنے آپ کو بڑے شاعر اور مستند نقاد کے طور پر منوالیا اور گزشتہ تیس چالیس برس کی مدت میں ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے انہیں جینوین شاعر قرار دینے میں کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ان کی تخلیقات پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں انہوں نے کتنا کام کیا۔اگر میں یہ کہوں کہ علی سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی کے انتہائی اہم اردو شاعروں میں ہوتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔انہوں نے بہت لکھا اور خوب لکھا۔مجھے تو وہ شاعر سے زیادہ ایک سچے، کھرے، ہمدرد اور انسان دوست فرد کی حیثیت سے ہمیشہ بہت عزیز رہے۔علی سردار جعفری جدوجہد کے آدمی تھے۔اپنی پوری زندگی انہوں نے بنی نوع انسان کی بہتری اور فلاح کیلئے وقف کئے رکھی"۔

سردار جعفری کی بھی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔مگر یہ ایک بہت پیار کرنے والے، پاکیزہ جذبات سے معمور دل رکھنے والے ہمدرد انسان کی روشن اور دمکتی ہوئی یادیں ہیں، جس نے پوری زندگی ظلم، جبر، استحصال اور منافقت کے خلاف جنگ جاری رکھی۔جو چٹان کی طرح اپنے نظریات پر آخر وقت تک قائم رہا اور جس نے ہمیشہ انسان کو سربلند کرنے اور دنیا میں مساوات کے قیام کے خواب دیکھے اور انہیں سچ ثابت کرنے کیلئے عملی جدوجہد کی۔" 154

ادارہ، ماہنامہ ایوان اردو، دہلی:

"علی سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں پنہاں تھیں۔ان کا شمار ایک ترقی پسند شاعر، مفکر، دانشور، فلسفی اور ہندو پاک کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ان کی شاعری میں قومیت پر جو پختہ یقین اور انسان دوستی کا جو گہرا جذبہ تھا وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔سردار نوجوانی سے ہی اشتراکی نظریہ فکر سے متاثر تھے۔سوشلزم، مساوات اور امن کو زندگی بھر وہ اپنی فکر کے لیے مشعل راہ بنائے رہے۔اردو میں ترقی پسند تحریک کا کوئی تذکرہ سردار جعفری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔سردار جعفری صرف ایک شاعر، نقاد، مفکر، دانشور اور مدبر ہی نہیں تھے بلکہ ادبی تاریخ داں بھی تھے۔وہ ایک شاعر آتش نوا، پرجوش خطیب، صاحب نظر نقاد، ایک پرامن انقلابی اور انسان دوستی کے حامل تھے۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہیئت کے تجربے بھی کئے اور نئے موضوعات کو سمویا بھی۔انسان دوستی کا پیغام اور امن کی محافظت کا احساس ان کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔سردار جعفری کے یہاں مسلسل حیات کے خیال کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ان کے خیال میں انسانی عظمت محض اس وجہ سے قائم ہے کہ زندگی کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔لوگ مرتے ہیں مگر انسان زندہ رہتا ہے۔اس کے اندر سانس لینے والی نیکیاں اور سچائیاں زندہ رہتی ہیں اور ہر دور میں اپنے آپ کو منواتی رہتی ہیں۔سردار جعفری کی شخصیت آج کے پرتشدد اور فرد دشمن معاشرے میں رواداری، سیکولرازم اور انسانیت کا مینارہ نور تھی۔ان کے انتقال سے نہ صرف اردو سماج بلکہ تمام دنیا ایک ممتاز شاعر، ایک حساس مفکر اور ایک معزز دانشور سے محروم ہوگئی ہے، جس نے اپنی روشن فکر، بلند آہنگ اور محنت کش عوام کے تئیں اپنی دردمندی کے واشگاف اظہار کے ذریعہ ہندوستان کی کئی نسلوں کی ذہنی نشوونما کی"۔ 155

فضیل جعفری:

"قومی اور بین الاقوامی سطح پر تا حال فیض احمد فیض کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے

(سردار جعفری) حصے میں آئی۔ دھلی سردار جعفری ایک وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ میں نے خود دیکھا اور بارہا دیکھا ہے کہ جو لوگ انہیں دن رات برا بھلا کہتے تھے وہی اگر مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو جعفری صاحب ان کی مدد کرنے والوں میں پیش پیش رہتے۔ مثال کے طور پر کئی سال پہلے جب ایک کاغذی، سرکش، شاعر کو بیماری کے عالم میں بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے ممبئی لایا اور پھر ایر پورٹ سے سیدھا بامبے اسپتال لے جایا گیا تو جعفری صاحب پہلے ہی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح دو ضخیم جلدوں میں اردو کی بہترین کہانیوں کو مرتب کرنے والے اور خواجہ احمد عباس کے ایک سابق سکریٹری جناب وحید انور ہندوستان سے پاکستان تک جعفری صاحب کو گالیاں دیتے پھرتے تھے لیکن جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو جعفری صاحب نے ہی ان کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اس کشادہ ذہنی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے مذہبی آدمی تھے"۔

156

ڈاکٹر اسلم پرویز:

ڈاکٹر اسلم پرویز نے جعفری صاحب کی شعری اور ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری اس وقت برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا اور آخری نام تھا۔ مرحوم نظریاتی اور عملی دونوں سطح پر سچے ترقی پسند تھے۔ اگر اردو میں دانشوری کی کوئی روایت ہے تو جعفری صاحب کا شمار بجا طور پر دانشوری کے روایت سازوں میں ہوتا ہے۔ سردار جعفری نے زندگی میں جتنا کچھ پڑھا کم لوگ پڑھتے ہیں اور جتنا انہوں نے لکھا اتنا لکھنے والوں کی تعداد بھی اردو میں کم ہے"۔

پروفیسر محمد حسن:

"سردار جعفری چلے گئے دکھ ہے تو یہ کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں والا ایک ہی ادیب ہمارے درمیان تھا اور وہ بھی اپنی صلاحیتوں کا بہت تھوڑا بہت چھوٹا حصہ ہی قومی وراثت کو دے پایا تھا کہ موت نے اس کے ہاتھوں سے قلم اور زبان سے جادو چھین لیا۔"

157

کوثر مظہری:

"بحیثیت قائد سجاد ظہیر کے بعد سردار جعفری کو ہی تسلیم کیا گیا مگر فن اور تخلیقی بصیرت کے لحاظ سے سردار کو سجاد ظہیر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہے گی۔"

158

راشد انور راشد:

"انہوں نے (سردار جعفری) ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ محبت اور اپنائیت کا ثبوت پیش کیا۔ علی سردار جعفری سے ذہنی اور جذباتی طور پر قریب آنے کے بعد ہی مجھے اس بات کی صداقت کا علم ہوا کہ جو پیڑ زیادہ پھل دار ہوتا ہے، اس کی شاخیں جھکی ہوتی ہیں تاکہ کوئی بھی بیش قیمتی پھلوں کے بے مثال ذرائع سے لطف اندوز ہو سکے اور حسب ضرورت اس کی ٹھنڈی اور نرم چھاؤں میں سستا سکے۔ ان کی موت سے یقیناً ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ تصنیف و تالیف کے معاملے میں وہ ہر لمحہ بے حد سنجیدہ رہے۔ ادب، ثقافت اور سیاست پر اردو اور انگریزی میں تین سو سے زیادہ مضامین کے علاوہ ان کے شعری اور نثری تصانیف کی تعداد پندرہ ہے۔ سردار جعفری صحیح معنوں میں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اپنے وقت کے تمام مشاہیر ادب اور

سیاست سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا جس سے ان کی شخصیت میں ایک خاص نکھار پیدا ہو گیا۔ اپنے اپنے شعبوں میں نمائندہ حیثیتوں کی حامل یہ شخصیتیں صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہیں متعدد موقعوں پر دنیا کے اہم ترین لوگوں سے ملنے اور قریب آنے کا موقع ملا لیکن انہیں عظیم شاعر علامہ اقبال سے نہیں مل پانے کا افسوس آخر تک رہا۔" 159

راشد انور راشد:

"علی سردار جعفری بلاشبہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ہمعصر شاعروں کے مابین ان کے معیار اور مقام کے متعلق آرا میں اختلاف ممکن ہے لیکن جہاں تک ان کی مجموعی شخصیت کا سوال ہے تو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ ان کا قد اپنے ہمعصروں میں سب سے بلند تھا"۔ 160

حمید اختر:

جناب علی سردار جعفری کا شمار اس دور کی فکری، تہذیبی اور ادبی تحریکوں کے ممتاز نمائندوں میں ہوتا ہے اور وہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک بلند پایہ شاعر، نقاد اور ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ تنقید کو انہوں نے نئے زاویوں کی نظر اور عصری آگہی کی روشنی دی۔ ان کی شاعری جدید حسیت سے آراستہ ہے اور عصری شعر کی نمائندہ علامت سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی حسیں اور فکری فضاء کو ابھارنے اور اردو زبان کو نئے تجربات اور نئے رجحانات سے روشناس کرانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی شخصیت عہد حاضر کے لیے بامعنی اور کیف سامان ہے۔" 161

ڈاکٹر زتشی گلزار دہلوی:

علی سردار جعفری جعفری گہرے مطالعے، علوم پر نظر، فن پر گرفت، کلاسیکل ادب کے غائر عالم، ادیب، شاعر اور ایسے مفکر اور دانشور ہیں جو کسی قوم اور معاشرے میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں"۔ 162

انوار الحسن وسطوی:

"علی سردار جعفری ممتاز انقلابی شاعر، اعلیٰ پائے کے دانشور، صاحب طرز افسانہ نگار، معروف ناقد، جادو بیاں مقرر اور بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور فلم ساز بھی تھے۔ ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہندوستان کی متعدد زبانوں کے علاوہ کئی یورپی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اردو ادب کے علاوہ ہندی، انگریزی، روسی، ترکی اور فارسی ادب کا بھی انہیں گہرا مطالعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علی سردار جعفری کا شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا رہا ہے"۔ 163

پروفیسر گوپی چند نارنگ:

(1) "علی سردار جعفری ترقی پسندوں کے سب سے بڑے قافلہ سالار تھے۔ ترقی پسندی کی نظریاتی باگ ڈور عملاً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ شاعری، خطابت اور نثر تینوں کے وہ بادشاہ تھے۔ اسی لیے فعال شخصیت کا اثر بھی زیادہ ہوتا تھا۔ ان کی شاعری کے امتیازی عناصر انسان دوستی، انسان سے محبت، عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، امن اور آشتی ہیں اور جن موضوعات کو انہوں نے جیسا نبھایا انہیں کا حصہ تھا۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی دلنوازی اور کشش تھی جو ان کی مقبولیت کی ضامن تھی۔" 164

(2) ''سردار جعفری کی وفات اردو دنیا کیلئے ایک سانحہ عظیم ہے۔علی سردار جعفری کی وجہ سے اردو زبان وتہذیب کی رسائی ایوان حکومت میں بلندیوں تک ہوئی۔'' 165

''اردو کے اہم ترین شاعر اور ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون علی سردار جعفری کے انتقال سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔جعفری صاحب گزشتہ پچاس سالوں سے اردو ادب کے افق پر چھائے رہے۔آپ نے فرد کی آزادی، امن عالم، مساوات اور منصفانہ نظام کیلئے ہمیشہ آواز بلند کی، جس کیلئے انہیں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔'' 166

ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین:

''علی سردار جعفری ایک صاحب علم شاعر تھے۔ان کی شاعری میں روایت کا شعور بھی ہے، حال کا آشوب بھی اور مستقبل کا ایک خواب بھی۔ 167

''پروفیسر گنگا پرساد:

''علی سردار جعفری گنگا جمنی تہذیب کی ایک علامت تھے۔'' 168

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی:

بیسویں صدی کے ادب پر سب سے زیادہ اثر ترقی پسندی نے ڈالا اور اس میں نمایاں رول سردار نے انجام دیا''۔169

عرفان زیدی:

عرفان زیدی نے سردار جعفری کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ ان کو خط لکھا ہو اور جواب نہ آیا ہو۔کسی ادبی موضوع پر مشورہ چاہا ہو انہوں نے تفصیل سے جواب نہ دیا ہو۔'' 170

پروفیسر ابوالکلام قاسمی:

سردار جعفری کو دانشوری کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے بتایا کہ شاعری پر شائد ہی کوئی جلسہ، سمینار اور سمپوزیم ہو جس میں جعفری صاحب کی عظمت اور شخصیت کا اعتراف نہ کیا جاتا ہو۔وہ فارسی شاعری کی ایرانی اور ہندوستانی روایات پر مکمل عبور رکھتے تھے''۔ 171

ڈاکٹر عقیل احمد:

''جعفری صاحب کا غالب اور اقبال سے خاص لگاؤ تھا۔انہوں نے ہی سب سے پہلے کلام غالب کو اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے غالب اردو کے علاوہ ہندی والوں میں بھی مقبول ہوئے۔انہوں نے عملی طور پر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مظلوموں کی ہمدردی کی، امن وآشتی کا پیغام دیا، انسانیت کا درس دیا''۔ 172

ظفر احمد نظامی:

ظفر احمد نظامی نے اپنے مخصوص اسٹائل اور مقفیٰ نثر میں سردار کا خاکہ پیش کیا:

''عالمی علوم کا خزینہ تھے۔علم وادب کا دفینہ تھے۔دوران علالت موت سے لڑ گئے ہم سے بچھڑ گئے لیکن تاریخ میں زندہ رہیں گے۔دل کے نہاں خانوں میں تابندہ رہیں گے''۔ 173

سلیم احمد:

''سلیم احمد نے سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور نقاد قرار دیا۔'' 174

پروفیسر شارب ردولوی:

''علی سردار جعفری ترقی پسند اقدار کے امین اور علامت تھے۔ان کی شاعری میں جو ترقی پسندی ہے اس کا رشتہ کلاسیکی شاعری کی ترقی پسندی سے قائم ہوجاتا ہے''۔ 175

پروفیسر نصیر احمد خان:

سردار جعفری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اردو کے مسائل کے حل کیلئے کوشاں رہے۔آج جو اردو کی صورت حال میں کوئی بہتری ہے تو اس میں نمایاں حصہ علی سردار جعفری کی کوششوں کا ہے''۔ 176

ہماری زبان دہلی:

''موت تو برحق ہے ایک کے بعد ایک کو اس دار فانی سے کوچ کرنا ہے۔انسانی موت کی خبر ہر روز ہمیں ملتی رہتی ہے مگر جب کسی ایسی شخصیت کی موت کی خبر سامنے آتی ہے جس نے اپنی پوری زندگی بنی نوع انسان کی فلاح کیلئے وقف کردی ہو یا ایسی شخصیت جن کی ساری سرگرمیاں انسانی خدمت اور مظلوم انسان کے درد کے مداوا پر محیط ہو تو ایسی صورت میں اس موت کا غم نہ صرف ایک خاندان کا غم ہوتا ہے بلکہ پوری انسانیت ایسے سانحے پر آنسو بہاتی ہے۔ایسی ہی شخصیتوں میں ایک اہم نام علی سردار جعفری کا ہے۔علی سردار جعفری نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کے گیسوؤں کو سنوارنے میں صرف کردی۔انہوں نے اردو ادب کو اپنی لازوال تحریروں سے مالا مال کیا اور جو کچھ ان کے دل و دماغ میں انسان کی فلاح و بہبود کے منصوبے تھے وہ آخری دم تک اس کے لیے فکرمند رہے۔ہندو مسلم اتحاد انسانی مساوات اور اردو کی ترویج و بقاء کیلئے انہوں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔'' 177

انوار الحسن وسطوی نے علی سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''علی سردار جعفری نے اردو ادب کی جتنی خدمت کی ہے اس سے کم خدمت ملک وقوم کیلئے ان کی نہیں رہی ہے۔انہوں نے جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جیل کی سلاخوں میں بھی بند رہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے وطن کی آزادی کیلئے خود بھی لڑتے رہے اور دوسروں کو بھی للکارتے رہے۔انہوں نے اپنی نظموں کو ملک کی آزادی کیلئے بطور اسلحہ استعمال کیا۔تحریک آزادی کی لڑائی کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے انہوں نے ساری زندگی سامراجیت، ظلم و جبر اور طبقاتی تفریق کے خلاف انتھک جدوجہد کی اور اپنی شاعری کے ذریعے غریبوں اور محنت کشوں کی ترجمانی کرتے رہے۔انہوں نے ہمیشہ پس ماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو اپنی تخلیقات سے جگانے کا کام کیا۔انسانی زندگی کی بہتری کیلئے انہوں نے اپنے قلم کو ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔'' 178

پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کی عظمت یوں بھی مقرر ہو جاتی ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر فلسفیانہ اور توانا و مستحکم ذہن کے حامل ہیں۔ دہند' تشکیک' مصلحت نوازی یا غلط اندیشوں کی خوشنودی کیلئے فکری دوراہے پر چلنے کا وطیرہ سردار جعفری نے کبھی سیکھا نہیں۔ ذہن وفکر کی ایسی بلوریت Transparancy اور ایسی Consistancy دور حاضر کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔'' 179

عبدالاحد ساز:

''اگر نظریاتی اور زمانی حد بندیوں سے ماورا ہو کر دیکھا جائے تو کسی بھی زبان کے نمائندہ اور عہد آفریں ادیبوں کی حیثیت اس موج کی سی ہوتی ہے جو پورے سمندر کی وقعت کا اظہار کرتی ہے اور ان کی تخلیقات اس زبان کے شعر و ادب کی بھرپور توانائیوں اور بلیغ تر امکانات کا مظہر ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر علی سردار جعفری بلاشبہ اردو کے ایسے ہی محترم شعراء میں سے ہیں جن کی شاعری کو ہم نہ صرف تاریخ ادب اردو کے زرین صفحات میں رکھتے ہیں بلکہ عالمی شاعری کے تناظر میں اردو شاعری کے مقام کی دلیل وتوثیق کے طور پر اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'' 180

ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

''سردار جعفری کی شاعری میں رنگا رنگی ہے۔ وہ کھل کر لکھتے ہیں اور بھرپور لکھتے ہیں۔ انکے یہاں تخلیقی وفور کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں عموماً بھرپور اور مناسب طوالت کی ہوتی ہیں۔ ان کا تخلیقی سرمایہ اپنی کمیت کے اعتبار سے بھی اتنا ہے کہ انہیں بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں جگہ دی جائے گی۔ سردار جعفری کے یہاں اعلیٰ درجے کے فن پارے ہیں۔ جعفری کو ناقدین بالکل رد نہیں کر سکتے اس لیے کہ خیر و شر اور ظالم و مظلوم کی جس آویزش سے ان کی شاعری عبارت ہے وہ آج بھی جاری ہے۔ انسانی حرمت و شرافت' سماجی عدل و انصاف' عالمی امن اور شانتی اور معاشی مساوات کے مسائل جب تک زندہ ہیں۔ سردار کی شاعری زندہ رہے گی۔ جب تک ظالموں اور استحصالی قوتوں کے خلاف انسان صدائے احتجاج بلند کرتا رہے گا' جعفری کی شاعری کی معنویت قائم رہے گی۔ آج انسانیت جس موڑ پر کھڑی ہے وہاں نفیس عشقیہ جذبات' لطیف جنسی احساسات اور خالص جمالیاتی تجربات کی شاعری کی ضرورت نہیں ہے۔ آج جھنجھوڑ دینے والی' حوصلوں کو بلند کرنے والی' ظالموں کو بے نقاب کرنے والی اور مظلوموں کی اصل حالت کو سامنے لانے والی شاعری کی ضرورت ہے۔ ایسی شاعری جو آج کے انسانی مسائل سے آنکھیں چراتی ہو اور مبہم جمالیاتی تجربات اور بے سمت رومانیت کی طرف ہمیں لے جاتی ہو اور جو ہمارے گرد و پیش کے حقائق سے گھبراتی ہو' ہمارے لیے سراسر نقصان و خسران کا باعث ہے۔ جعفری کی سب سے بڑی عطایہ ہے کہ انہوں نے نصف صدی سے بھی زائد عرصے تک اول الذکر قسم کی شاعری کی حمایت اور ثانی الذکر قسم کی شاعری کی مخالفت جس مضبوطی سے کی ہے' کسی نے نہیں کی۔ اس لیے آج وہ بلند قامت ہیں''۔ 181

ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

''علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالاروں میں تھے۔ انہوں نے اس تحریک اور نظریہ ادب کا ساتھ اس وقت

بھی دیا جب بہت سے لکھنے والے اس سے الگ ہونے لگے۔اردو میں 1960 کے بعد جب جدیدیت کی گرما گرمی شروع ہوئی تو وہ بڑی پامردی اور ثابت قدمی سے ترقی پسند نظریات پر جمے رہے۔جدیدیت کے زمانہ مقبولیت میں وہ سب سے زیادہ مخالفت اور تنقید و تنقیص کا نشانہ بنے لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ وہ ادب اور شاعری کی سماجی افادیت اور ادیب و شاعری کی سماجی ذمہ داری کے ہمیشہ علمبردار رہے۔انہوں نے فن برائے فن اور ادب برائے ادب کے نظریئے کی ہمیشہ مخالفت کی اور اس کے اخلاقی و انسانی نقصانات بیان کیے۔جدیدیوں اور جمالیاتی گروہ کے ادبا و شعران کا مذاق اڑاتے رہے' ان کی شاعری کو پروپگنڈہ کہتے رہے لیکن وہ اپنے موقف اور اپنی روش پر مضبوطی سے قائم رہے۔سردار جعفری نے ہر زمانے میں ظلم و ستم' استبداد و استحصال' ناانصافی و نابرابری' عصبیت و تنگ نظری' فرقہ پرستی و غلامی کی مذمت کی۔وہ آزادی اور حریت' امن و شانتی' محبت و مساوات کے علمبردار رہے۔انہوں نے غریبوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی ہمیشہ وکالت و حمایت کی۔دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کا خون بہا وہ اس پر تڑپ اٹھے۔دنیا کے چنگیزوں' ہٹلروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جس طرح کھل کر اور جتنا بڑھ چڑھ کر انہوں نے لکھا شاید ہی کسی شاعر نے لکھا ہوگا"۔ 182

بکل اتساہی:

"سید جعفر طیار کی حویلی (جو کوٹھی سید صاحب کہلاتی تھی) میں 29 نومبر 1913ء میں ایک چاند اگا جس نے دنیا کو روشنی دی۔اس کا نام علی سردار جعفری رکھا گیا۔(بڑے ہونے کے بعد) والدین نے سردار کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیجا۔اینگلو عربک کالج (دہلی) سے بی اے پاس کر کے لکھنو آ گئے جہاں ایم اے میں داخلہ لیا اور کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ سرگرم کارکن ہو گئے اور آزادی وطن' انگریزوں کے ظلم و تشدد' سامراجیت کے خلاف اندولن شروع کر دیا۔دبے کچلے سماج کے لیے اپنے قلم سے الکھ جگایا۔پھر 1942ء میں بمبئی جا کر اپنی تحریک میں مصروف ہو گئے اور سیاسی' سماجی' ادبی' تحقیقی' تنقیدی اور فلمی سرگرمیوں کی امامت کرتے رہے۔علی سردار جعفری اب فرد نہیں انجمن بن چکے تھے۔ان کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت سے ان کے ہمنواؤں ہمسفروں کو فائدہ پہنچنے لگا اور ترقی پسند ادب کو گہرائی ملی۔ان کے فکر و فن کے اتنے پہلو ہیں کہ کسی بھی پہلو پر اظہار خیال کے لیے وقت اور صفحات درکار ہیں"۔ 183

☆☆☆

حواشی

1۔عمر رضا،علی سردار جعفری،صفحہ 424

2۔عزیم قیسی،سردار جعفری کی نظمیں،افکار،سردار جعفری نمبر،نومبر دسمبر 1991،صفحہ 471

3۔پروفیسر عبدالستار دلوی،ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری،ایوان اردو ستمبر 2000 صفحہ 27,25 تا 30

4۔پروفیسر عبدالستار دلوی،سردار جعفری اور قومی شعور،کتاب نما،جنوری 2003،صفہ 33 تا 35،39،40

5۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت و انقلاب کا استعارہ،علی سردار جعفری،ایوان اردو،ستمبر 2000،87, 89

6۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت و انقلاب کا استعارہ،ایوان اردو ستمبر 2000 صفہ 86,85

7۔انوار الحسن وسطوی،علی سردار جعفری مرحوم: ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے،ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 16

8۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف،حرکت و انقلاب کا استعارہ،ایوان اردو ستمبر 2000 صفہ 90

9۔کہتی ہے تجھ کو خلق خدا،تعزیتی پیغامات،ایوان اردو،ستمبر 2000 صفحہ 115

10۔ضیاء الدین اصلاحی،وفیات: اردو کا سردار چلا گیا،معارف اگست 2000،صفحہ 147,146

11۔پروفیسر علیم اللہ حالی،روح عصر کا شاعر،آج کل،اکتوبر 2000 صفحہ 24 تا 26

12۔ڈاکٹر روشن اختر کاظمی،اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء صفحہ۔245،246

13۔کوثر مظہری،سردار جعفری کی نظمیں،تہذیبی سروکار،ایوان اردو،ستمبر 2000 صفحہ

14۔راشد انور راشد علی سردار جعفری: چند تاثرات،ایوان اردو،ستمبر 2000 صفحہ 99

15 حبیب الرحمٰن چغانی،علی سردار جعفری،شخصیت و شاعری،جرنل 121 ستمبر 2000 ڈاکٹر شمیم رضوی، قطرے سے گہر ہونے تک،ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 28

16۔ڈاکٹر شمیم رضوی قطرے سے گہر ہونے تک''،ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000'۔صفحہ 28

17۔ڈاکٹر شمیم رضوی قطرے سے گہر ہونے تک،ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 28

18۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل از سلیمان اطہر جاوید، صفحہ 117

19۔پروفیسر عبدالستار دلوی،ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری مشمولہ علی سردار جعفری: شخص،شاعر اور ادیب۔صفحہ 274

20۔ڈاکٹر فیروز علی سردار جعفری کی حقیت نگاری۔ہندوستان میں صفحہ 61

21۔ڈاکٹر پروفیسر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید'سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
ازسلیمان اطہر جاوید'صفحہ 117
22۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف'سردار جعفری کی غزل گوئی'جنرل 124'جون 2001 صفحہ 176 ڈاکٹر ہمایوں اشرف'
حرکت وانقلاب کا استعارہ علی سردار جعفری'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 86۔
24۔سعیدا نور'کہتی ہے تجھ کو خلق خدا'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 102 تا 104
29۔ڈاکٹر سید معصوم رضاء'اردو کا بیباک شاعر علی سردار جعفری'ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 13
30۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید'سردار کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل ازسلیمان اطہر جاوید'
صفحہ 113'114 اور ترقی پسند ادب از مسرور جعفری'صفحہ 24
31۔پروفیسر سعید الظفر چغتائی'دانشور شاعر سردار جعفری مشمولہ سردار شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتب)'
صفحہ 132'133
32۔ڈاکٹر سلطان احمد'علی سردار جعفری:شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب)'صفحہ 257'259'265
33۔عقیل احمد صدیقی'جدید اردو نظم'نظریہ وعمل 1936 تا 1970'صفحہ 118
34۔ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی'فاروقی کے تبصرے'پیراہن شرر اور ایک خواب اور'
عصری ادب پر مضامین جو تبصروں کی شکل میں لکھے گئے'صفحہ 46 تا 49
35۔اردو دنیا''اداریہ''دہلی'جنوری تا مارچ 1998ء صفحہ 1
36۔انور عظیم'شعر وادب کا شاہین'گردوں کا شکار'ایوان اردو'دہلی'ستمبر 2000'صفحہ 48
37۔ساقی فاروقی'ہدایت نامہ شعر:تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین 1955 تا 1994 میل پہلی ی کیشنز لاہور'
1995 صفحہ 98'99
38۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی'سردار کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی'ایوان اردو ستمبر 2000'صفحہ 84
39۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی'علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند سردار'مجروح' کیفی از علی احمد فاطمی'صفحہ 27ے
40۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی'علی سردار جعفری:ایک علمی ایک طلسمی شخصیت مشمولہ تین ترقی پسند شاعر'سردار'مجروح' کیفی
از علی احمد فاطمی'صفحہ 62 تا 64
41۔رفعت سروش'درد کا ساحل (بیاد علی سردار جعفری)'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 40,39,35,34۔
42۔شکیل انور (مرتبہ)'علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات'ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 26

43۔وارث علوی،علی سردار جعفری کی شاعری مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتبہ)
صفحہ 102،103،109،10

45۔ڈاکٹر سلطان احمد،علی سردار جعفری شخصیت اور فن کے آئینے میں مشمولہ سردار جعفری شخصیت اور فن
از اصغر عباس (مرتب)،صفحہ 267

46۔اختر الواسع،سردار جعفری:نظریاتی وابستگی اور شعری تجربہ،جامعہ،دہلی،جنوری تا مارچ 2002،صفحہ 145

47۔سید محمود الحسن،علی سردار جعفری:فکر و فن کے چند پہلو مشمولہ سردار جعفری،شخص،شاعر اور ادیب
مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی،صفحہ 382،384

48۔معزہ ابراہیم قاضی سردار جعفری کی شاعری میں عصری شعور مشمولہ علی سردار جعفری،شخص،شاعر اور ادیب،
مرتبہ عبدالستار دلوی،صفحہ 382،384

49۔پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،مجھ سے نظریں چرا کے کہاں جاؤ گے،ایوان اردو ستمبر 2000 صفحہ 68 تا 70

50۔پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی،سردار جعفری کی شاعری میں لہو کا تلازمہ مشمولہ علی سردار جعفری:ایک مطالعہ
از رفیعہ شبنم عابدی،صفحہ 278

51۔پروفیسر عبدالحق،کہتی ہے جسے خلق خدا،تعزیتی پیغامات،ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 118۔

52۔ڈاکٹر علی جاوید،کہتی ہے جسے خلق خدا،تعزیتی پیغامات،ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 119,118

53۔سبرت رائے سہارا،کہتی ہے جسے خلق خدا،تعزیتی پیغامات،ایوان اردو،ستمبر 2000،صفحہ 119

54۔ڈاکٹر جسبیر سنگھ اہلووالیہ،سردار جعفری کو پنجاجی یونیورسٹی میں یاد کیا گیا،ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000
صفحہ 23

55۔پروفیسر شمیم نکہت،ہریانہ اردو اکادمی میں سردار جعفری اور مجروح کو خراج عقیدت،ہماری زبان
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

56۔ڈاکٹر مدھو کر آریہ،ہریانہ اردو اکادمی میں سردار جعفری اور مجروح کو خراج عقیدت،ہماری زبان
یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 22

57۔ڈاکٹر محمد حبیب،ہریانہ اردو اکادمی میں سردار جعفری اور مجروح کو خراج عقیدت،
ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 22

58۔ڈاکٹر مدبر علی زیدی،راجستھان اردو اکادمی کا اظہار تعزیت،ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

59۔ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشاء راجستھان اردو اکادمی کا اظہار تعزیت ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000،صفحہ 22

60۔معظم علی،راجستھان اردو اکادمی کا اظہار تعزیت،ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22۔

61۔عبدالاحد ساز،سردار جعفری کے دو اسالیب نظم،سہ ماہی نیا ورق،بارہ،جولائی تا ستمبر 2001،صفحہ 190

62۔حکومت بہار کا توصیفی سند پیش کرتے ہوئے اعلان مشمولہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی' سردار جعفری کی نظم کوئی:
پرواز سے نومبر میرا گھوارہ تک (علی سردار جعفری: ایک مطالعہ از رفیعہ شبنم عابدی) صفحہ 48

63۔ممبران جیوری اقبال سمان کا اعتراف مشمولہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی' سردار جعفری کی نظم کوئی
پرواز سے نومبر میرا گھوارہ تک (علی سردار جعفری: ایک مطالعہ از رفیعہ شبنم عابدی' صفحہ 47

64۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈی لٹ کی ڈگری دینے کے موقع پر اعلان مشمولہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی'
سردار جعفری کی نظم کوئی: پرواز سے نومبر میرا گھوارہ تک (علی سردار جعفری: ایک مطالعہ از رفیعہ شبنم عابدی' صفحہ 48

65۔علقمہ شبلی' علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات مرتبہ شکیل انور' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 26

66۔نظیر احمد' خراج عقیدت' حلقہ ادب شاخ دھنباد' ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000' صفحہ 24۔

67۔ڈاکٹر منصور عمر' علی سردار جعفری کے سانحہ ارتحال پر سی ایم کالج' دربھنگہ میں تعزیتی نشست' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000' صفحہ 24

68۔اسد ظہیر' علی سردار جعفری کے سانحہ ارتحال پر سی ایم کالج' دربھنگہ میں تعزیتی نشست' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000' صفحہ 24

69۔سید احتشام الدین' علی سردار جعفری کے سانحہ ارتحال پر سی ایم کالج' دربھنگہ میں تعزیتی نشست' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 24

70۔جمال اویسی' علی سردار جعفری کے سانحہ ارتحال پر سی ایم کالج' دربھنگہ میں تعزیتی نشست' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 24

71۔ڈاکٹر عارف سلطان' گورنمنٹ کالج ٹونک میں علی سردار جعفری کو خراج عقیدت' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000' صفحہ 24

72۔عزیز قریشی' ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000' صفحہ 23

73۔ڈاکٹر بشیر بدر' ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

74۔آگنے' ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

75۔ڈاکٹر کپل تیواری' ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

76۔پروفیسر آفاق احمد' ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

77۔تعزیتی قرارداد شعبہ اردو' کشمیر یونیورسٹی' ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

78۔ڈاکٹر سید عبدالمنان' انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا خراج عقیدت' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 19

79۔انجمن ترقی اردو کانپور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 19

80۔نامی انصاری انجمن ترقی اردو کانپور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 19

81۔تسکین زیدی'انجمن ترقی اردو کانپور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

82۔عشرت ظفر'انجمن ترقی اردو کانپور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبانیکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

83۔حیدر جعفری سید'انجمن ترقی اردو کانپور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

84۔شیخ محمد احمد'انجمن ترقی اردو'اناوہ کی تعزیتی نشست'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

85۔طارق شمس'انجمن ترقی اردو'اناوہ کی تعزیتی نشست'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

86۔انجمن ترقی اردو'ویشالی'تعزیتی نشست'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

87۔عبداللطیف کاظم'انجمن ترقی اردو'امت پور کا تعزیتی جلسہ'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

88۔راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی تعزیتی جلسہ'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 20

89۔پروفیسر عتیق اللہ صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

90۔ڈاکٹر فرحت فاطمہ'دہلی یونیورسٹی'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

91۔اکرام الحق صدر اردو ٹیچرس یونین ویشالی (بہار) ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

92۔پروفیسر سید شاہد مہدی'جامعہ ملیہ اسلامیہ'جلسہ بیاد سردار جعفری ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

93۔پروفیسر شمیم حنفی'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

94۔مخدوم محی الدین'پودے (رپورتاژ) بحوالہ رفعت سروش'درد کا ساحل بیاد علی سردار جعفری'ایوان اردو' ستمبر 2000'صفحہ 35

95۔ڈاکٹر واحد قریشی'گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج اندور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

96۔ڈاکٹر شکنتلا سنگھ'صدر شعبہ ہندی'گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج اندور'تعزیتی جلسہ'ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 23

97۔پروفیسر سید محمد عقیل رضوی'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں خراج عقیدت'ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

98۔شیر جنگ گرگ'اردو فاؤنڈیشن'تعزیتی جلسہ نوئیڈا' یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

99۔نند کشور وکرم'مدیر عالمی اردو ادب'پیش لفظ'عالمی اردو ادب'2001 جلد 19'سردار جعفری نمبر (سردار جعفری فن اور شخصیت) صفحہ 14

100 ۔ندا فاضلی ،علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 'صفحہ 26
101 ۔شمیم جہاں' علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات مرتبہ شکیل انور' ہماری زبان'
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 26
102 ۔سالک لکھنوی ،علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات مرتبہ شکیل انور
ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 26
103 ۔پروفیسر مشتاق اعظمی ،علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات' ہماری زبان
یکم تا 21 اکتوبر 200 'صفحہ 26
104 ۔پروفیسر سید منظر امام' خراج عقیدت' حلقہ ادب شاخ دھنباد' ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 200 'صفحہ 24
105 ۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد' علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات' مرتبہ شکیل انور'
ہماری زبان' یکم تا 21 اکتوبر 200 'صفحہ 14
106 ۔ڈاکٹر خلیق انجم' انجمن ترقی اردو (ہند) تعزیتی جلسہ' ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 200 'صفحہ 19
107 ۔ڈاکٹر خلیق انجم' سردار جعفری: انقلاب سے خواب تک' عالمی اردو ادب' جلد 19 'سردار جعفری نمبر
(سردار جعفری: فن اور شخصیت) صفحہ 286
108 ۔سلام بن رزاق ،علی سردار جعفری کی یاد میں' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 116
110 ۔منصور احمد عثمانی' کہتی ہے تجھ کو خلق خدا' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 116
111 ۔قومی اردو کونسل برائے فروغ زبان اردو کہتی ہے تجھ کو خلق خدا: تعزیتی پیغامات'
ایوان اردو ستمبر 2000 کو 117,116
112 ۔جواہر لعل نہرو یونیورسٹی' ہندوستانی زبانوں کا مرکز' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 117
113 ۔انجمن ترقی اردو نمبر' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 117
114 ۔آل انڈیا تعلیمی و ملی فاؤنڈیشن' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو ستمبر 2000 'صفحہ 117
115 ۔بزم ہم قلم' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 117
116 ۔بدر وزیر احمد' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 117
117 ۔راجستھان اردو اکیڈیمی' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو ستمبر 2000 'صفحہ 118
118 ۔غالب اکیڈیمی' تعزیتی پیغامات' ایوان اردو' ستمبر 2000 'صفحہ 118
119 ۔خلیق ابراہیم خلیق' چند معروضات' افکار' کراچی' سردار جعفری نمبر' نومبر و ستمبر 1991 'صفحہ 485
120 ۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی ،علی سردار جعفری کا تخلیقی سفر مشمولہ تین ترقی پسند شاعر (سردار' مجروح' کیفی) صفحہ 9

121 ۔ڈاکٹرعلی احمد فاطمی'سردارجعفری اورترقی پسندادب'مشمولہ تین ترقی پسند شاعر:سردارمجروح' کیفی'صفحہ 29,28

122 ۔ڈاکٹرنصرت چودھری'فیض کی شاعری(ایک مطالعہ)صفحہ 162,161

123 ۔پروفیسرشارب ردولوی'کیدی خطبہ'سردارجعفری:ترقی پسندادب کاایک بلیغ استعارہ'مشمولہ سردارجعفری: شخصیت اورفن مرتبہ اصغرعباس'صفحہ 33,27

124 ۔اختر سعیدخان'علی سردارجعفری'نیاسفر(16)علی سردارجعفری ومجروح سلطان پوری نمبر جولائی تا دسمبر 2000'صفحہ 32,30'27,26

125 ۔ڈاکٹرانیس اشفاق'سردارجعفری کی شعریات سازی'مشمولہ علی سردارجعفری:ایک مطالعہ گجرات اردوساہتیہ اکاڈمی گاندھی نگر'صفحہ 114,113

126 ۔شری اندرکمارگجرال'سابق وزیراعظم ہند'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 113,112

127 ۔شری اٹل بہاری واجپئی وزیراعظم ہند'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 112

128 ۔سیدشاہدمہدی'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 116

129 ۔محمدافضل'تعزیتی پیغمات'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 116

130 ۔شری کرشن کانت'نائب صدرجمہوریہ ہند'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 112

131 ۔شری کے آرنارائنن'صدرجمہوریہ ہند'علی سردارجعفری کے بارے میں چندممتازشخصیتوں کے تاثرات ہماری زبان یکم تا21اکتوبر 2000 صفحہ 14

132 ۔شری ارون جیٹلی'مرکزی وزیراطلاعات'تعزیتی پیغامات'ایوان اردوستمبر 2000 صفحہ 114

133 ۔شری یونس سلیم سابق گورنربہار'تعزیتی پیغامات'ایوان اردو'ستمبر 2000'صفحہ 114

134 ۔شری امرسنگھ'تعزیتی پیغمات'ایوان اردو'ستمبر 2000 صفحہ 114

135 ۔کیفی اعظمی'تعزیتی پیغامات'ایوان اردوستمبر 2000'صفحہ 115,114

136 ۔فضیل جعفری'علی سردارجعفری:چندٹوٹے پھوٹے تاثرات اورکچھ شکستہ یادیں'ایوان اردو' ستمبر 2000 صفحہ 31

137 ۔عمیق حنفی'شعلے کی شناخت'صفحہ 115,114

138 ۔وارث علوی'سردارجعفری کی شاعری کااستعاراتی نظام'مشمولہ سرزنش خار'ازوارث علوی'صفحہ 17,12

139 ۔پروفیسروارث علوی'علی سردارجعفری کی شاعری'مشمولہ علی سردارجعفری شخص'شاعراورادیب مرتبہ پروفیسرعبدلستاردلوی'صفحہ 153

140 ۔محمدحسین پرکار'سردارجعفری اوران کی تین نظمیں ایشیاجاگ اٹھا' کون دشمن ہے'صبح فردا'مشمولہ علی سردارجعفری: شخص'شاعراورادیب مرتبہ پروفیسرعبدالستاردلوی'صفحہ 32

141 ۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان،علی سردار جعفری:شخصیت اور شاعری،جرنل،ستمبر 1999 ،صفحہ 105,100

142 ۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،سردار جعفری کی شاعری مشمولہ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل

از سلیمان اطہر جاوید،صفحہ 104,94,93

143 ۔پروفیسر عبدالستار دلوی،سردار جعفری اور قومی شعور،کتاب نما جنوری 2003 ،صفحہ 36

144 ۔راشد انور راشد،علی سردار جعفری:چند تاثرات،ایوان اردو،ستمبر 2000 ،صفحہ 100,49

145 ۔علی سردار جعفری،میں اور میرا فن،سہ ماہی اردو ادب،جولائی تا ستمبر 2000 ،صفحہ 36,34,33

146 ۔پروفیسر زاہدہ زیدی،سردار جعفری کی پیکر تراشی،آج کل،دسمبر 1999 ،صفحہ 13

147 ۔پروفیسر زاہدہ زیدی،علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)

ایوان اردو،ستمبر 2000 ،صفحہ 55 ،56

148 ۔پروفیسر زاہدہ زیدی،علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)

ایوان اردو،ستمبر 2000 ،صفحہ 56

149 ۔پروفیسر شارب ردولوی،کلیدی خطبہ،سردار جعفری:ترقی پسند ادب کا ایک بلیغ استعارہ مشمولہ سردار جعفری:

شخصیت اور فن از اصغر عباس (مرتبہ)،صفحہ 28,27

150 ۔پروفیسر زاہدہ زیدی،علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات (منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)

ایوان اردو،ستمبر 2000 صفحہ 56,55

151 ۔پروفیسر سید محمد عقیل رضوی،سردار جعفری کا ایک جائزہ الہ آباد کے حوالے سے مشمولہ سردار جعفری:شخصیت اور فن

از اصغر عباس (مرتب)صفحہ 88,85

152 ۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان،علی سردار جعفری:شخصیت اور شاعری،جرنل ستمبر 1999 صفحہ 108 تا 112

153 ۔سبط حسن،سردار جعفری:چند یادیں،عالمی اردو ادب 2001 ،سردار جعفری نمبر،جلد 19 سردار جعفری:

فن اور شخصیت،صفحہ 71

154 ۔حمید اختر،ایک چراغ اور بجھا،عالمی اردو ادب،2001 جلد 19 ،سردار جعفری نمبر سردار جعفری:

فن اور شخصیت،صفحہ 106 تا 112,109

155 ۔ایوان اردو،دہلی،ادارہ،حرف آغاز،ستمبر 2000 صفحہ 4

156 ۔فضیل جعفری،علی سردار جعفری:چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں

ایوان اردو ستمبر 2000 صفحہ 32,31

157 ۔پروفیسر محمد حسن،ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے:سردار جعفری کو آخری سلام

ایوان اردو،ستمبر 2000 ،صفحہ 11

158 ۔کوثر مظہری، سردار جعفری کی نظمیں، تہذیبی سروکار، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 95

159 ۔راشد انور راشد، علی سردار جعفری: چند تاثرات، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفہ 99,98,97

160 ۔راشد انور راشد، علی سردار جعفری: چند تاثرات، ایوان اردو، ستمبر 2000 صفحہ 100

161 ۔حمید اختر، ایک چراغ اور بجھا، عالمی اردو ادب 2001، جلد 19 سردار جعفری نمبر،
سردار جعفری، فن اور شخصیت صفحہ 110,109

162 ۔ڈاکٹر زتشی گلزار دہلوی، عالمی اردو ادب 2001 جلد 19 سردار جعفری نمبر، سردار جعفری فن اور شخصیت صفحہ 110

163 ۔انوار الحسن وسطوی، علی سردار جعفری مرحوم، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سے کہیں جسے
ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 15

164 ۔پروفیسر گوپی چند نارنگ تعزیتی پیغامات، ایوان اردو ستمبر 2000 صفحہ 115

165 ۔گوپی چند نارنگ، علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات
ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 14

166 ۔شاہد ماہلی، انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام تعزیتی جلسہ، ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 19

167 ۔خواجہ اکرام الدین، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تعزیتی جلسہ
ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 21

168 ۔پروفیسر گنگا پرساد، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تعزیتی جلسہ
ہماری زیادہ یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21

169 ۔پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی جواہر لعلہ نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تعزیتی جلسہ
ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 200 صفحہ 21

170 ۔عرفان زیدی، عرفان زیدی لائبریری رام پور میں تعزیتی نشست، ہماری زبان
یکم تا 21 اکتوبر 2000، صفحہ 23

171 ۔پروفیسر ابو الکلام قاسمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں خراج عقیدت، ہماری زبان
یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

172 ۔ڈاکٹر عقیل احمد، غالب اکیڈیمی میں تعزیتی جلسہ، ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

173 ۔ظفر احمد نظامی، اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تعزیتی جلسہ، نوئیڈا بحوالہ بہت حسین روایت ہے اب علی سردار
از رفعت سروش، ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

174 ۔سلیم احمد، اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تعزیتی جلسہ، نوئیڈا بحوالہ بہت حسین روایت ہے اب علی سردار
از رفعت سروش، ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 22

175 ۔پروفیسر شارب ردولوی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تعزیتی جلسہ
ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21
176 ۔پروفیسر نصیر احمد خان، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں تعزیتی جلسہ
ہماری زبان یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 21
177 ۔علی سردار جعفری کے بارے میں چند ممتاز شخصیتوں کے تاثرات مرتبہ شکیل انور
ہماری زبان نئی دہلی، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 14
178 ۔انوار الحسن وسطوی، علی سردار جعفری مرحوم ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 15
179 ۔پروفیسر علیم الہ حالی، روح عصر کا شاعر، آج کل اکتوبر 2000، صفحہ 24
180 ۔عبدالاحد ساز، سردار جعفری کی نظم: نئی سماعتوں کے درمیان، کتاب نما، مارچ 1998 صفحہ 16
181 ۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان، علی سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، جنرل، ستمبر 1999 صفحہ 112 تا 114
182 ۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، سردار جعفری کی شاعری، ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 صفحہ 3
183 ۔بیکل اتساہی، وطن گلاب، ایوان اردو، ستمبر 2000، صفحہ 66,65

☆☆☆

باب ہشتم

اِختتامیہ

اختتامیہ

ادب میں سردار جعفری کا نظریہ افادیت پسندانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک جبر و استحصال کے خلاف آواز تھی۔ آزادی، انقلاب، انسان دوستی، امن، جمہوریت، سرمایہ پرستی، سامراجیت، مزدور، کسان، غربت، بھوک، افلاس وغیرہ موضوعات پر ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقی قوت صرف کردی۔ سردار جعفری ترقی پسند شاعر، ادیب و رہنما تھے۔ معاشی و سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں اور دنیا سے جنگوں کے خاتمے نیز نفرت، ہوس، بدی، خودغرضی، احساس برتری جیسی برائیوں کے خاتمے کو وہ بے حد ضروری سمجھتے۔ اس کام کے لیے وہ ادب کو ذریعہ سمجھتے۔ زندگی کی حقیقتوں، سچائیوں اور پیچیدگیوں کو وضاحت سے پیش کرنے کا موثر ذریعہ "نظم" خیال کرتے ہوئے بیشتر ترقی پسند شعرا کی طرح انہوں نے بھی اپنا ذریعہ اظہار اسی صنف کو بنایا۔ سردار جعفری نے آزاد نظم میں وسعت پیدا کی۔ عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسے کھلی فضا، ہجوم، جلسہ گاہوں میں لائے۔ ان کے شعری سرمایہ میں ہمیں اپنے ملک کے ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے انسانیت کش واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے احوال کا انعکاس واضح طور پر ملتا ہے۔

ادب کو وہ اپنے زمانے اور ماحول کی تاریخ، قوتوں اور کوائف کا زائدہ و پروردہ سمجھتے ہیں۔ سماجی انصاف اور انسانیت سے محبت کی ترویج و اشاعت کو وہ ایک دیانت دار فن کار کا فرض منصبی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے عام انسان کی خوشحالی اور ترقی کے لیے انسان اور فن کار دونوں کو متحرک و فعال رہنے کا پیغام دیا۔ انہوں نے ادیب و قاری کے درمیان ترسیلی خلا کی مخالفت کی ہے۔ شعر و ادب کے سماجی تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان سماجی و عصری ضروریات کے لیے شعر و ادب سے بہتر وسیلہ اظہار ملنا مشکل ہے۔ شاعر کا قلم انعام و اکرام کے لیے نہیں لکھتا۔ وہ اپنی آزادانہ رائے اور آزادیٔ فکر کو ہی اپنے قلم کی آبرو سمجھتا ہے۔ یہی اس کا انعام ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ عصری سیاست کے آگے سپر نہیں ڈالتا۔ نہ اسے اسیری کی فکر ہوتی ہے اور نہ تونگری کی، اس کے خیال کو بیڑی نہیں پہنائی جاسکتی۔ وہ جب لکھتا ہے تو اپنی انگلیاں خون دل میں ڈبو کر لکھتا ہے، جو درد وہ محسوس کرتا ہے اسے وہ اپنی فگار انگلیوں سے اور خوں چکاں خامہ سے زیب قرطاس کرتا ہے۔ سردار جعفری کا ایقان اور عمل ایسا ہی رہا ہے۔

سردار جعفری نے امن کے ادیبوں کو یوں ہی اپنا سفر جاری رکھنے کی تمنا اور آرزو کی ہے۔

سردار جعفری نے انسانیت، عالمی اخوت اور مساوات کے لیے لڑنے والے بین الاقوامی سطح کے شاعروں اور ادیبوں کی صف میں شامل ہو کر خدمت انسانیت کے لیے لکھنا اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ انسانی عظمت کے اعتراف، خودداری اور اپنے قوت بازو پر اعتماد کے ذریعہ ہی وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے علمبردار ہیں۔ اس تحریک کے بیشتر قلم کاروں کی طرح انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ ادب کے ذریعہ بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کلام

اس تحریک کے نظریات اور افکار کا بھرپور ترجمان ہے۔ وہ عمر بھر ترقی پسند تحریک کو قوت و توانائی دیتے اور اس کے ادبی سرمایے کو مالامال کرتے رہے۔

سردار جعفری کا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے ارتقائی زمانے سے شروع ہوا۔ سردار جعفری کی طبع بنیادی طور پر نظم کی طرف راغب تھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مختلف قسم کے تجربے کیے۔ پابند، معریٰ، آزاد نظمیں، سہ مصرعی نظمیں، کثیر البحری نظمیں، طویل نظمیں، مختصر نظمیں، تمثیلی نظمیں وغیرہ۔ ان کی نظموں میں رومانی، انقلابی اور رومان و انقلاب کا امتزاج ملتا ہے۔ ابتداء میں وہ آزاد نظم کے شدید مخالف رہے لیکن 1947ء کے آس پاس انہوں نے اپنے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور ''نئی دنیا کو سلام'' آزاد ہیئت میں لکھی۔ انہوں نے آزاد نظم کو بھی عوامی جدوجہد کے لیے استعمال کیا۔

شعری مجموعوں ''پرواز''، ''خون کی لکیر''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''امن کا ستارہ'' اور ''ایشیا جاگ اٹھا'' میں ظلم اور سامراجیت کے خلاف سردار جعفری کی نفرت، حقارت، غم و غصہ براہ راست بے باک اور تشدد آمیز ہے۔ مجموعہ ''پتھر کی دیوار'' (1953) سے ان کی شاعری میں ایک خوبصورت موڑ نظر آتا ہے۔ سیاسی اور ملکی حالات بدل چکے تھے۔ سابقہ شعری مجموعوں کی بہ نسبت اس مجموعہ میں اشتراکی نظریہ کی تبلیغ، مارکسزم اور سرخ پرچم کا ذکر بھی قدرے کم ہے۔ آزادی سے قبل سردار جعفری کے یہاں جس طرح کا انقلابی اور اشتراکی نظریہ کارفرما تھا، اگرچہ اب بھی ہے مگر پیشکش کی سطح پر کسی قدر تبدیلی ضرور پائی جانے لگی تھی۔ ''پتھر کی دیوار'' میں شامل نظموں میں انقلابی اور باغیانہ عناصر قدرے کم ہیں۔ اس کے بعد کے مجموعوں میں سردار جعفری کی یہ سنبھلی ہوئی کیفیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ مجموعہ ''ایک خواب اور'' (1965) کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور فکری پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ یہاں تک آتے آتے سردار کی شاعری کا آہنگ سڈول اور لہجہ زیادہ غنائی ہوگیا ہے۔ نظموں کا انداز بھی شیریں، نرم اور مدھم لب و لہجہ سے عبارت ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں برمحل تشبیہوں، استعاروں، علامتوں، مناسب ترکیبوں، محاکات کا استعمال اور الفاظ کی بندش سے جو شیرینی، حلاوت، نغمگی، موزونیت اور موسیقیت پیدا کی ہے وہ بے حد دلچسپ ہے۔ پیشکش کا انداز بھی دلفریب، حسین اور دلکش ہے۔

مجموعہ ''پیراہن شرر'' (1965) کا زیادہ تر کلام اگرچہ سیاسی ہے لیکن اس کا انداز بے حد نرم اور معتدل ہے۔ وہ شاعر جو کبھی قلم سے تلوار کا کام لیا کرتا تھا، اسی قلم کو شاخ گل بناتا نظر آتا ہے۔ ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ موضوعات کی سطح پر اب بھی وہ اپنے سابقہ موقف پر قائم ہیں لیکن پیشکش یا فن میں تبدیلی کے عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' (1978) کے بعد سرداری جعفری کے شعری سفر میں متعدد اسباب کے باعث کمی واقع ہوئی جن میں ان کے آٹھ دس افراد خاندان کی معاشی ضرورتوں کے لیے تگ و دو، بیماریاں جیسے Prostrate، دل کا دورہ، پیشاب رک جانے کی شکایت، آنکھوں کا آپریشن وغیرہ شامل ہیں۔

آزادی سے قبل سیاسی اور سماجی نظریات کو تخلیق پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ادب چند سیاسی نعروں اور سماجی نظریوں کے مطابق تخلیق کیا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد یہ باتیں کسی حد تک فرسودہ سمجھی جانے لگیں۔ اب تخلیق کا عمل کسی بندھے ٹکے سیاسی و سماجی نظریے یا فارمولے کا پابند نہیں رہا بلکہ ذاتی اور شخصی تجربہ تخلیق کی بنیاد بنا۔ 1980 کے بعد سردار

جعفری کی شاعری جلال و جمال اور شعلہ و شبنم کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ اپنے نظریئے ادب میں جلال و جمال کے توازن کو جگہ دیتے ہیں اور مناسب اور برمحل تشبیہات' استعارے اور تلمیحات کا استعمال کرتے ہیں۔ 1980 کے آتے آتے سردار جعفری پر یہ آشکار ہو گیا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی انتہاپسندی ادب کے لیے مضر ہے۔ لہٰذا انہوں نے ترقی پسندی میں در آئی انتہاپسندی کو ختم کر کے معتدل اور متوازن ترقی پسندی کی بات کی۔ انہوں نے بنیادی طور پر ترقی پسند ادب ہی کو اعلیٰ ادب تصور کیا۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اب وہ جمالیاتی اقدار کی اہمیت کو کھلے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔

سردار جعفری' انیس' اقبال اور جوش سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ سردار پر شروع سے اقبال کا گہرا اثر ہے۔ ننانوے فیصد ان کی شاعری اقبال کے اثر کی علامتیں لئے ہوئے ہے۔ اقبال اور سردار کے کلام کی مماثلت کے متعدد پہلو میں مظلوم طبقے کی ہم نوائی' رجائیت فکر و حکمت کے موضوعات' معاشرتی افادے کے عناصر کی تلاش اور اجتماعیت شامل ہیں۔ فرانس کا عظیم شاعر اور ناول نگار آراگوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانسیسی ادیبوں کو منظم کیا تھا۔ سردار جعفری اس سے متاثر تھے۔ چلی کا ہسپانوی زبان کا سب سے بڑا شاعر پابلو نرودا سے بھی وہ متاثر تھے۔ سوویت یونین کے ادیب صحافی اور بین الاقوامی امن تحریک کے زبردست رہنما ایلیا اہرن برگ سے متاثر تھے۔ فرانس کا مشہور عالم ایٹمی سائنس داں جولیو کیوری عالمی امن کانفرنس کا صدر تھا' سردار جعفری اس سے بھی متاثر تھے۔ میر اور کبیر پسندی کے پس پردہ سردار جعفری کا انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے۔

سردار جعفری عشق و عاشقی کے قصے بیان نہیں کرتے۔ وہ کسی معشوق فتنہ گر کے حسن و جمال اور عشوہ و ادا کا ذکر مریضانہ تکرار کے ساتھ نہیں کرتے۔ وہ زندگی کے ایسے مسائل و حقائق کو بھی اپنی شاعری کا موضوع نہیں بناتے جن کی حیثیت حاشیہ کی ہے۔ وہ کونے کھدرے کے مسائل سے صرف نظر کرتے ہیں۔ جنگ و اسلحہ سازی' قوموں کے تصادم و محاذ آرائی کو وہ ناپسند کرتے ہیں۔ انہوں نے نسلی اور فرقہ وارانہ امتیاز اور کشمکش سے اپنے آپ کو آزاد رکھا۔

سردار جعفری نے عورت کی تقدیس و حرمت کی۔ عورت کے فعال کردار کو اجاگر کیا۔ ابتداء میں سردار جعفری نے بہت کم خالص رومانی شاعری کی جب وہ سلطانہ کے عشق میں گرفتار ہوئے تھے۔ بہت جلد انہوں نے اپنی شاعری کا رخ موڑ دیا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی نے جب شدت اختیار کی تو سردار جعفری نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا جس کے لیے انقلابی رنگ و آہنگ کی شاعری ناگزیر ہو گئی تھی۔ جہاں تک رومانی شاعری کا تعلق ہے اس میں انہوں نے محبوب کی دل کھول کر تعریف کی۔ حسن کی رنگینی' شادابی' دلکشی' دوشیزگی' شگفتگی کو نہایت رنگین اور حسین تشبیہ و استعارے اور شعری لطافتوں کے ساتھ پیش کیا۔ وہ محبوب کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ محبوب کے لیے محبت کا گیت گاتے ہیں۔ سچے عاشق کی طرح ان کا عشق خزاں میں بہتی ہوئی بہاروں کا حسن دیکھنے کی نظر رکھتا ہے۔ انہوں نے معشوق کی ڈھلتی عمر میں بھی حسن تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے دور شباب سے بھی زیادہ حسین تر قرار دیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ماضی کی مسرتیں' مستقبل میں سہانی یادوں میں بدل جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کی آنکھوں کی تعریف کی۔ ان باتوں کے علاوہ انہوں نے بسنت کو دلکش

اور پُر کشش انداز میں پیش کیا۔شام اودھ کی عمدہ تصویر کشی کی۔ممبئی سے اپنی گہری محبت کا اظہار کیا ہے۔بیشتر ترقی پسند شعرا کی طرح سردار جعفری نے بھی رومان اور انقلاب کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی کہ ان کا الگ سے تصور کر پانا مشکل ہو جاتا ہے۔سردار جعفری کی ابتدائی تخلیقات سے لے کر 1960 کے آس پاس تک کی تخلیقات میں یوں تو رومانی اور انقلابی دونوں پہلو ملتے ہیں لیکن انقلابی رویے پر نسبتاً زیادہ زور ملتا ہے۔انہوں نے معاشی عدم مساوات اور اس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی سماجی ناانصافیوں کے خلاف علم احتجاج بلند کیا۔ترقی پسند جھنڈے تلے سردار جعفری نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عملی طور پر بھی انگریزوں کے خلاف احتجاج کیا۔اس زمانے کی بیشتر تخلیقات انقلابی ہیں۔سردار جعفری کی جن تخلیقات میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے اس سے قاری لطف وانبساط کی کیفیت کے ساتھ ساتھ جوش اور حوصلے کی امنگ سے سرشار ہونے لگتا ہے۔سردار جعفری نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔عوام میں انگریزوں کے خلاف شدید غم وغصہ تھا۔عوام اندر ہی اندر بوکھلا کر رہ جاتے۔سردار جعفری کی شاعری میں ان کا انداز قدرے سخت ہے لیکن اس کے ساتھ امید اور حوصلے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔کہیں کہیں باغیانہ لہجہ حاوی ہے۔

سردار جعفری کی شاعری میں بیشتر جگہوں پر نرم، حسین اور پُر کیف لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔اسلوب کی لطافت اور شعریت بھی پائی جاتی ہے۔بعض میں رومانی انداز حاوی ہے۔قید وبند کے دوران پُر امیدی کا اظہار بے حد خوب صورت ہے۔ان کا نرم لہجہ اور انقلابی آہنگ نظموں میں عجیب وغریب ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔زنداں کی تلخیوں، سختیوں اور ناانصافیوں کو پیش کرتے وقت انہوں نے یہ بھی بتایا کہ زندگی میں مصیبتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔انسان کو ان کا پامردی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ سردار جعفری پر جتنی مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے اتنے زیادہ ان کے حوصلے بلند ہوتے۔معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دیکھ کر سردار جعفری انہیں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے مثلاً جب چور بازاروں اور ذخیرہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں اناج چلا جاتا ہے تو خود کسان بھی اناج کے دانے دانے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔سردار جعفری نے اس حالت کو بڑے دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔کشمیر کی پُر بہار وادیوں کے ذکر کے ساتھ وہاں کی بے چارگی، مفلسی اور افراتفری پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔ موضوع کچھ اس طرح ہے کہ اس میں رومان کے ساتھ انقلاب اور جلال کے ساتھ جمال کا در آنا فطری امر ہے۔ان کی رومانی نظموں میں انقلاب کی آمیزش ہے تو انقلابی نظموں میں رومانیت کی آمیزش ہے۔ممبئی کی تعریف میں رومانی انداز اختیار کیا گیا ہے۔وہیں موجودہ حکومت کی لاپروائیوں اور بے اعتنائیوں کے سبب وہاں گندگی، غلاظت سرایت کرتی جا رہی ہے، اسے منظر عام پر لاتے ہوئے حکومت وقت اور سرمایہ داروں سے شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔یہاں طنز کی کاٹ اور لہجہ بے حد انقلابی ہے۔لکھنو کی مٹی کی خوشبو، مٹی کے چاک، ترکاریوں کے خوبصورت و دلکش ذکر کے ساتھ بھوک سے بلکتی کانپتی مفلسی، غم، مصیبتیں، غریب کسانوں کے استحصال کو دور کرنے کا شدت سے ذکر ملتا ہے۔

حب الوطنی سردار جعفری کا شعار ہے لیکن یہ وطن دوستی ان کی عالمی اخوت کی راہ میں حائل نہیں بلکہ اس کو تقویت پہنچاتی ہے۔وہ صرف ہندوستانیوں کی بہبودی کے خواہاں نہیں۔مجموعی طور پر کل انسانیت کے مسرت بخش مستقبل کے متلاشی ہیں خواہ رنگ، نسل، مذہب، زبان اور علاقے کے امتیازات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔سردار جعفری نے ساری عمر اپنے قلم سے امن عالم اور

انسانیت کی آفاقی اقدار کے لیے مخالفین سے جنگ کی ہے وطنیت اور قوم پرستی کے نام پر جارحیت سردار جعفری کی شاعری کا موضوع نہیں۔ظلم واستحصال کی نفی کر کے ہندوستانیوں کو نا صرف بلاتفریق مذہب وملت متحد رہنا ہے بلکہ اپنے انسانی اور ذہنی و فکری رشتے دنیا کے دوسرے حصوں سے اور علم وفکر کے دیگر چشموں سے بھی وابستہ کرنے کا انہوں نے پیام دیا ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کی آزادی ومساوات کی کوششیں ہورہی تھیں' سردار جعفری نے ان کوششوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے۔ہندوستان کی جنگ آزادی کو تیز تر کرنے اور ملک کے عوام وخواص کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے کے لیے انہوں نے نظمیں لکھیں۔غلامی ومحکومی کی انہوں نے ہر جگہ مذمت ومخالفت کی۔عوام کے ذہنوں میں حق آزادی کو حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کرنے اور آزادی کے حصول کے لیے متحد کرنے میں اقبال اور جوش کے بعد سردار جعفری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔سردار جعفری اپنے انقلابی فکر وآہنگ کے ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی جہالت' بے حسی' بے ضمیری' تعصب' افلاس' غربت' کمینگی' رذالت جیسی گندگی اور خباثتوں کو ختم کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔وہ انسانیت،امن اور محبت کے شاعر ہیں۔ جب کبھی انہوں نے اس پر کوئی آنچ آتے دیکھی تو اس کے خلاف نبرد آزمائی کی دعوت دیتے ہیں۔سردار کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب وآلام کا شکار رہونا ہے جس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ سماجی اور معاشی نابرابری' ناانصافی اور مال ودولت کی بڑھتی ہوئی ہوس ہے اور اس سے انسان اور انسانیت مجروح ہورہی ہے۔وہ ایک بہتر دنیا کے متمنی ہیں۔ان سے مظلوم کی حالت دیکھی نہیں جاتی اس لیے وہ ظلم کے خنجر کو توڑ ڈالنا چاہتے ہیں۔وہ اس بات میں ایقان رکھتے ہیں کہ معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے۔صدیوں کی نفرت' ہوس' بدی' خودغرضی' غلط احساس برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل ودماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہوسکتی ہیں۔وہ دنیا میں ہوس' نفرت اور خودپروری جیسی غلط روایتوں کو ختم کرنے پر اصرار کرتے ہیں تاکہ دنیا میں امن واتحاد قائم ہو اور ہمہ جہتی ترقی کا حصول ممکن ہوسکے۔حق وصداقت کا سبق انہوں نے بچپن ہی میں پڑھ لیا تھا اور حق وصداقت کے زبردست حامی ہوکر لہو کے تحفظ میں جٹ گئے۔غم دنیا سے اپنا رشتہ استوار کرلیا۔

سردار جعفری کی انقلابی شاعری کے موضوعات میں تنوع ہے۔انہوں نے ظلم واستبداد' جبر وتشدد کے خلاف آواز اٹھائی۔ جاگیردارانہ اور سامراجی ظلم واستحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔تحریک آزادی میں جٹ گئے۔غلام ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کے ظلم وستم اور اہل وطن کی مجبوری ومظلومیت اور ان کے سماجی' سیاسی' معاشی مسائل کو شدت سے محسوس کیا۔انہوں نے ہندوستان کے نوجوانوں' کسانوں' مزدوروں کو للکارا اور انہیں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی دعوت دی۔انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے افلاس' مایوسی' فاقہ کشی' بے کاری' قحط' جہل' انگریزوں کے ظلم وستم اور کالے کرتوتوں کا ذکر بڑی جرأت وبیباکی کے ساتھ بیان کیا۔ان کے ظلم کا پردہ فاش کیا۔غلامی کی لعنت آشکار کردی' آزادی کی اہمیت اجاگر کی۔تاریخ عالم میں حریت اور آزادی کے اہم واقعات کی طرف اشارے کئے جن سے جذبہ آزادی بیدار ہوتا ہے۔ایشیا کی تہذیب و تمدن کو بیان کیا اور پورے ایشیا کو متحد ہونے کی دعوت دی۔ان کا ایقان تھا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی ایک عالمگیر جدوجہد کا حصہ تھا۔سامراجی استحصال کے خلاف' اس میں جغرافیائی' نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ان کی ہمدردیاں دنیا بھر

میں برپا ہونے والے ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ انسانوں کی آزادی کے مبلغ اور خوشحالی کے آرزومند ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مزدوروں، محنت کشوں اور عام انسانوں کو جینے کا حق ملے، عزت و شرافت، تعلیم و ترقی اور خوشحالی پر سب کا حق ہے۔ انہوں نے غم سے نڈھال آدمی کی کیفیات اور اس کے جذبات کی عکاسی کی۔ ویت نام، کوریا کی جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے ظلم و بربریت کا پردہ فاش کیا۔ آفریقہ کی غربت و افلاس کا نقشہ کھینچا۔ افغانستان کے حالات کی عکاسی کی۔ کمزور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی طاقتور اور دولت مند اقوام کی کوششوں اور جنگی تیاریوں پر احتجاج کیا۔

سردار جعفری نے استحصالی اور ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے سخت غم و غصے کا اظہار کیا۔ دنیا کی وہ تمام چیزوں، قوتوں، رویوں کے خلاف اعلان بغاوت کیا جنہوں نے سادہ دل بندگانِ خدا کو مجبور اور مظلوم بنا کر رکھا ہے۔ انہوں نے قتل و غارت گری خوں ریزی اور دیگر انسانیت پامال عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ سماجی عزت و انصاف، انسانی حرمت و شرافت اور مساوات و برابری کا سوال اٹھایا۔ انہوں نے معصوم بھولے بھالے انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے ہر ایک زخم کو گویائی عطا کی۔ انہوں نے ہٹلری، قیصری، فریب، ہوس، جنگ کی زرگری، ظل و ستم پر یلغار کی اور ان تمام رویوں کو مٹانے کے لیے جٹ گئے۔

سردار جعفری نہ صرف انقلاب پسند ہیں بلکہ عملی طور پر انقلابی ہیں۔ ان کے لہجے میں تلوار کی کاٹ، لفظوں میں شعلوں کی لپک اور آواز میں پہاڑوں کی گونج ہے کیوں کہ وہ کبھی سرمایہ داروں سے مخاطب ہوتے ہیں، کبھی برطانوی سامراجیوں سے کبھی مغرب کے آقاؤں سے اور کبھی ظلم و جبر کے خداؤں سے اور کبھی آزاد ہند کے قومی حکمرانوں سے۔ ہر جگہ ان کا بے باک اور دبنگ لہجہ پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی انقلابی شاعری سے مجاہدین آزادی کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑکاتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کو وہ جنگ آزادی ہی کا ایک بازو سمجھتے ہیں۔

دیگر ترقی پسندوں کی طرح سردار جعفری کو ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں ملی جو انہوں نے آزادی سے قبل دیکھی تھی تو انہیں بہت جلد اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ نظام تو وہی ہے، بس حکمراں بدل گئے ہیں۔ آزادی سے قبل انگریز تھے اب قومی حکمراں ہیں۔ سرمایہ دارانہ عناصر نے اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی تھیں، اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مساعی کی۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں بغاوت کا عنصر حاوی ہے۔ حکمرانوں کا عیش و عشرت میں پڑا رہنا اور معاشرہ کی طرف سے بے فکر ہو جانا۔ آزادی کے بعد بھی بھوک، افلاس غریبوں کا مقدر بنا رہا۔ مزدوروں، کسانوں کے مسائل حل نہیں ہوئے ہیں۔ سردار جعفری نے امیر و حاکم طبقے کے غاصبانہ اور استحصالی رویوں کے خلاف انقلاب و بغاوت کا اظہار کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی انسانیت کش منصوبوں اور کوششوں اور ہر طرح کے جبر و جور کے خلاف لکھا۔ حکومت کی کارکردگی اور موجودہ صورتحال پر عدم اطمینانی اور برہمی اور افسوس کا اظہار کہیں نرم مدھم لب و لہجہ اور کہیں تلخ و تند لہجہ میں کیا۔ ملوں کے مالکوں اور زمینداروں سرمایہ داروں کے ہاتھوں محنت کشوں اور غریبوں کی ذلت، بے حرمتی اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے ہندوستانی سماج میں سرمایہ داروں کے غریب طبقے پر بڑھتے ہوئے استحصال اور جبر کا مشاہدہ کیا۔ سماج، معاشرے میں بڑھتے ہوئے

تعصب، نفرت، بھوک، بیکاری اور مفلسی کا شدید احساس رہا ہے۔

سردار جعفری کی فکر مقصدی فکر ہے۔ مقصدیت کے تیز بہاؤ میں شعری حسیت ضائع ہو جاتی ہے مگر فن پر ابہام، ہیئت پرستی اور دور از کار اشاریت کا سایہ نہیں پڑتا۔ انہوں نے دنیا کے تمام محنت کشوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا اور تمام مزدوروں اور کامگاروں کو متحد کر کے سرمایہ داروں اور سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی کی دعوت دی۔ سردار نے جن سے بھی بغاوت کی ہے اس کے پیچھے انسانیت کی خدمت کا جذبہ کارفرما رہا۔ سردار بغاوت کرتے ہیں عظمت رفتہ پر رونے والوں سے، حکومت سے، سامراجی نظم و قانون و سیاست سے، دکھ درد برداشت کرنے والے جذبے سے۔ یہ بغاوت بھی ان کی انسانیت اور انسانوں سے محبت کی علامت ہے۔ جن باتوں سے وہ بغاوت کرتے ہیں، انہوں نے ہی انسان کو مجبور و معذور بنا رکھا ہے اور اس سے ایک باعزت زندگی گذارنے کا حق چھین لیا ہے۔ یہ بغاوت بھی برائے بغاوت یا صرف ایک نعرہ نہیں بلکہ انسان کے دکھ درد سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور انسان دوستی ہے۔ انہیں انسان اور انسانی زندگی سے پیار ہے۔ انہوں نے انسان دوستی کے فروغ کے لیے تا عمر محنت کی۔ انہوں نے عظمت انسان، انسان کی سربلندی اور انسانیت کا پیغام دیا۔ دنیا کی تمام قوموں کے دلوں میں کدورتوں کو دور کر کے ہر طرف محبت کے گیت کی فضا پیدا کرنے کی پر خلوص مساعی کی۔ انسانی وحدت اور آفاق گیر انسانی محبت کے اس پیام کو بہ طریق احسن پیش کیا۔ ان کی مساعی یہ تھی کہ رنگ و نسل اور ذات و فرقہ کی حدود سے نکل کر ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے۔ انہوں نے بتایا وہ انسان خواہ ہندوستان میں ہو خواہ یوروپ و امریکہ میں ہو، اس کی فطرت، اس کی جبلت، اس کا مذاق اور اس کی خواہشات یکساں ہے۔ انہوں نے مشرق و مغرب میں مماثلتیں بتا کر ان کے درمیان اتحاد، امن مصالحت، ہم آہنگی اور پیار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تمام انسانیت کے خون کو ایک ہی طرح کا خون متصور کر کے ظالموں، سفاکوں اور قاتلوں سے اسے نہ بہانے کے لیے دردمندانہ اپیل کی۔ ان کی نظموں میں انسانیت کی فضاء قائم ہے جو دلوں میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ نفرت سے نفرت کا جذبہ بھی بیدار کرتی ہے۔ بدامنی، انتشار پھیلانے والے ظالموں کو ان کے بھیانک انجام کی تنبیہ دی اور ان سے خواہش کی گئی کہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر انسانیت کو گلے لگالیں۔ سردار کے لیے سب سے عظیم چیزیں انسان اور انسانیت ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ زندگی اس وقت تک حسین کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام انسان کو مظلومی اور جبر سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ سردار کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب و آلام کا شکار رہنا ہے جس کا سبب سماجی اور معاشی نابرابری ناانصافی اور ہوس ہے، مال و دولت کی ہوس بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انسان اور انسانیت مجروح ہو رہی ہے۔

سردار ساری زندگی اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعہ انسان دوستی کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کے لیے انسان دوستی ہر طرح کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔ وہ نسلوں اور رنگوں کے فرق سے واقف نہیں۔ وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے۔ امن، دوستی، خلوص، رواداری جیسی بنیادی قدروں سے سردار جعفری کی شاعری بھری پڑی ہے۔ پیار و محبت کی وہ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ محبت سے محبت ہو جاتی ہے اور تمام کدورتوں کو دور کر کے ایک ایسی دنیا آباد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے جہاں ہر طرف محبت کے گیت گائے جائیں۔ سردار جعفری اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے آخر عمر تک الفاظ کے ذریعہ انسان

دوستی، روشن خیالی، امن و محبت، رواداری اور زندگی کے خوبصورت تصور کی مصوری کرتے رہے۔انسانی اقدار انہیں ہمیشہ عزیز رہیں۔

سردار جعفری انسانی ہاتھ کے تقدس و تکریم کے قائل ہیں۔انہوں نے انسان کی محنت، کاوش اور تخلیقیت کو خراج عقیدت پیش کیا۔انہوں نے محنت کشوں کے ہاتھوں کی عظمت اور حرکت و عمل کی برکتوں کے گیت گائے ہیں۔کلاسیکی شاعری میں انسان کا تصور بالعموم ایک مجبور اور بے بس انسان کا ہے جسے کوئی اختیار نہیں ہے اور جو مجبور محض ہے، وہ صرف زندگی کا بوجھ اٹھا کر چلنے والا بے بس انسان ہے لیکن ترقی پسند فکر نے اس نئے انسان کا تصور دیا جو مجبور ہونے کے ساتھ باغی بھی ہے اور اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے، جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کو زیادہ خوبصورت، زیادہ دلکش اور زیادہ حسین بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔یہی انسان سردار کی فکر کا محور ہے۔آج انسان علم کے نئے نئے دروازے وا کرتا جا رہا ہے اور رازہائے تخلیق سے ہر روز نئے پردے اٹھاتا جا رہا ہے۔انسان کی ہنرمندی کا پرچم بلند کر رہا ہے۔سردار انسان کی اسی عظمت کے نغمہ خواں ہیں۔ان کا کہنا ہے ''اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔اس منزل کا تصور شوق کو مہمیز کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا''۔سردار جعفری نئی نسل کی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

سردار جعفری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے علمبردار ہیں۔انہوں نے کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کی تعلیم دی۔

سردار جعفری نے ملک کی تقسیم کو غلط بتایا اور کہا کہ اس سے جغرافیہ بدلا، تاریخ نہیں بدلی۔دونوں میں خون ایک، نفسیات ایک، رہن سہن ایک، زندگی گزارنے کا طریقہ، سوچنے سمجھنے کا طریقہ، رسم و رواج، غربت و مفلسی میں دونوں برابر کے شریک ہیں، آزادی کی خاطر سب سامراج سے لڑ رہے تھے۔انہوں نے ملک کی تقسیم معاشی زبوں حالی، محنت کشوں، غریبوں کے بلکتے ہوئے بھوکے بچوں، بیمار عورتوں، ان کے ان پڑھ نوجوانوں، ان کے ٹوٹے ہوئے گھروں، ان کے بے رونق گاؤں اور محلوں کی عکاسی کی۔تقسیم ہند کے مسائل پیش کیے۔تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے دکھ بھرے واقعات اور جو قیامت مچی تھی اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر لینے میں قلمی جہاد سے کام لیا۔

سردار جعفری نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ ملکوں کی سرحدات پھولوں کی خوشبو اور رنگوں کی بہاروں سے بھری جائیں۔انسانیت کا یہ نغمہ خواں سرحدوں پر اسی صبح کا منتظر ہے۔

ہندو پاک تنازعے کو جس امن پسندانہ طریق سے سردار جعفری نے اپنی شاعری میں برتا، برصغیر کے کسی اور شاعر کے ہاں سوائے ساحر کے نظر نہیں آتا۔انہوں نے ہندوستان و پاکستان میں جذبہ محبت کے فروغ، کشیدگی دور کرنے، جنگ سے نجات پانے، آنے والے خطرات سے بچنے اور مل کر محبت سے آواز دینے اور دونوں میں خون کے رشتے کی موجودگی، تنازعات کے حل کے لیے بات چیت، گفتگو جاری رکھنے کی بات کی گئی ہے۔

سردار جعفری فطرتاً یاس پسند اور قنوطی نہیں ہیں بلکہ اُمید و یقین کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔وہ ملک اور

ملک سے باہر ظلم وستم کے کاروبار کو ختم ہوتا ہوا نہیں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے ہیں۔انہوں نے ایک خوش حال اور خوبصورت سماج کا جوخواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔انہوں نے روس میں اشتراکیت کی ناکامی کا دردبھرے انداز میں اعتراف کیا۔ سردار جعفری کسی خواب کے ٹوٹنے پر کبھی سپر نہیں ڈالتے بلکہ اسے جدوجہد کی ایک لازمی منزل سمجھتے ہیں جس کی انتہا کامرانی ہے۔یہ رجائیت ان کے یہاں حاوی ہے۔سردار جعفری کی شاعری نالہ وفریاد' آہ وبکا' قنوطیت' حسرت وحرمان کی نہیں۔ان کے ہاں رجائیت ہے' للکار ہے' جس میں شاندار مستقبل کی بشارت ہے۔ان کی شاعری ہماری رگوں میں اُمید کا انبساط اور حوصلہ کا جوش پیدا کرتی ہے۔سردار جعفری رجائی اور حوصلہ سے پُر شاعری کے طرفدار ہیں۔ان کی غزلوں میں اگر مایوسی کی جھلک ملتی بھی ہے تو اُس کا اختتام امید وانبساط اور حوصلہ مند فکر پر ہوتا ہے۔سردار جعفری ظلم و جور اور استبداد واستحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور سینہ سپر ہونے میں ایقان رکھتے ہیں۔ان کی تمام شاعری شر پر خیر کی فتح کی داستان سناتی ہے۔وقتی اور واقعاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی حدوں میں داخل ہوجاتی ہے۔

سردار جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، بالخصوص آزاد نظموں میں ان کے جوہر خوب نمودار ہوئے ہیں۔اگرچہ ابتدائی طور میں انہوں نے غزلوں پر توجہ نہیں دی اور جو غزلیں کہیں، اُن میں بھوک' افلاس' مساوات' ظلم' استبداد' جابر حکمراں طبقے کے خلاف جارحانہ انداز' غلامی کا کرب' آزادی وامن کی خواہش جیسے موضوعات ہی کو پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پیار' محبت' عشق وعاشقی' محبوب کے سراپا اور اس کے ناز وادا کا بھی ذکر ملتا ہے۔سردار جعفری طبعاً حسن وعشق کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے عورت کی صنفی پاکیزگی کو ملحوظ رکھا۔انہوں نے اپنی بیشتر غزلوں میں کلاسیکی روایات اور اس کی چاشنی ولطافت کو ملحوظ رکھا ہے۔انہوں نے مجازی عشق کے ساتھ عام انسانی محبت کے جذبے کو بھی فروغ دینے کی کوشش کی۔سردار جعفری کی غزلوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔حسن وعشق' سیاسی افکار' فلسفیانہ خیالات' سماجی رجحانات' سیاسی موضوعات' سماجی سروکار' معاشی مسائل' عصری مسائل' حالات حاضرہ۔ان کے ہاں ترقی پسند افکار غزلوں کا موضوع بن کر اکثر اشعار سے جھانکنے لگتے ہیں۔مثلاً جبر و تشدد' استحصال' ظالم ومظلوم کی کشاکش' انقلاب کی خواہش' ایک نئی دنیا کی امید' سرمایہ داری سے نفرت' ضمیر فروشوں پر لعنت' دنیا میں بھوک' افلاس' ظلم واستحصال خاص طور پر ایشیا اور آفریقہ کے عوام کی بے بسی اور بیقراری کا نقشہ' غلامی کا کرب' فرسودہ روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی مساعی' آزادی کے بعد کے حالات میں حکمرانوں کی کارکردگی پر عدم اعتماد' محبت' محبوب کی آمد پر عاشق کی کیفیات کا نقشہ' جنگ سے پاک دنیا کا خواب اور اس کی مساعی' ہندو پاک دوستی' امن وغیرہ۔انہوں نے بلند آہنگ اور بارعب الفاظ کا بھی سہارا لیا۔ان کی غزلوں میں زندگی کی سچائیوں کا دوٹوک اظہار ہوا ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں کو سیاسی و سماجی مقاصد کے لیے زیادہ استعمال کیا۔اپنی غزلوں میں خیالات ونظریات کو اہمیت دی۔

سردار جعفری کی غزلوں میں خطابیہ، بیانیہ اور باغیانہ انداز بھی حاوی ہے لیکن آزادی کے بعد نرم لب ولہجہ در آیا ہے۔اس عہد کی غزلوں میں انہوں نے اگرچہ عصری اور ہنگامی موضوعات کو جگہ دی ہے لیکن اب انداز پیشکش میں ایک رچاؤ اور سلیقہ مندی بھی آگئی ہے۔اب وہ لفظیات کے استعمال میں کلاسیکی اور روایتی انداز کو اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔البتہ نظم کا سا تسلسل اور کسی ایک خاص مرکزی احساس یا فکر کی اتباع ضرور نظر آتی ہے۔ایسی غزلوں کو نظم نما غزل کہہ سکتے ہیں۔انہوں نے تسلسل

بیان کے ساتھ غزل کی ریزہ خیالی کو بھی برتا اور غیر مردف غزلیں بھی کہیں۔ ابتدائی دور کی غزلوں میں نظم کا انداز حاوی ہے۔ ان میں تفصیل، تسلسل بیان اور براہ راست گفتگو کی خوبیاں ہیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ جس طرح ان کی نظموں میں نکھار آتا گیا اسی طرح ان کی غزلیں بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ حسین اور دلنشین ہونے لگی تھیں۔ استعجابی، استفہامی اور سوالیہ لب و لہجے نے ان کی بعض غزلوں میں ایک خاص قسم کی لطافت پیدا کر دی ہے۔ ان کی غزلوں میں رجائیت اور پُر امیدی شد و مد کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان مواقع پر وہ شعریت کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ پُر مسرت حالات کی عکاسی کے لیے سردار جعفری نے اسی مناسبت سے الفاظ، تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس سے غزل میں تغزل، شعریت، موسیقیت، نغمگی اور تمام شعری لطافتیں در آئی ہیں۔

سردار جعفری کی شعری تربیت مرثیہ نگاری کے ماحول میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے کانوں میں پہلی آواز انیس کی سنی تھی۔ پانچ چھ برس کی عمر میں وہ منبر پر بیٹھ کر سلام پڑھے اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنا شروع کیے۔ ان کی شاعری پر مرثیوں کا اثر ہے۔ ان کے مرثیے مجلس میں پڑھے جاتے۔ ان کے پہلے ہی مرثیہ میں غضب کی خود اعتمادی کا احساس ملتا ہے۔ انہوں نے مرثیے کے بعض لوازمات جیسے بہاریہ مضامین بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیے۔ سردار جعفری لفظوں سے خوب صورت سمعی، بصری، لمسی اور حرکی پیکر تراشتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا حسن ملتا ہے۔ ان کے ہاں "آمد" میں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ انہوں نے آمد کو پُر جلال بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں جلال و جمال کی کیفیات ملتی ہیں۔ تشبیہ، استعارے، تلمیح اور علامات کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ سردار جعفری نے اپنی بہن کی رحلت پر جو اشعار کہے تھے، وہ اشعار ان کے دل سے نکلی ہوئی آہیں اور آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو تھے۔ سردار جعفری نے اپنے ایک دوست کی وفات پر ایک نظم لکھی جس پر مرثیہ کا رنگ حاوی ہے۔ انہوں نے ماضی کی یادوں کو بے حد غمناک اور پُر درد انداز میں پیش کیا۔ سردار جانتے تھے کہ مرثیہ نگاری محض شاعری نہیں بلکہ فن کاری اور صناعی ہے اور یہ سپہر سخن کا وہ سدرۃ المنتہیٰ ہے جہاں غالب جیسے اچھے اچھے بلند پروازوں کے پر جلنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں کے باوجود انہوں نے مستقل طور پر اس کوچے میں قدم رکھنا مناسب نہ سمجھا اور انقلابی نظموں کے میدان میں چلے آئے۔ وہ موضوع جو انہوں نے مرثیے سے حاصل کیا تھا، اپنی انقلابی شاعری میں علامت کے طور پر استعمال کیا۔ مظلوم کے لہو کی پکار کو وہ کبھی نہیں بھول سکے۔

سردار جعفری نے ایک سیاسی مثنوی "جمہور" بھی لکھی تھی جس میں انہوں نے نوجوانوں، مزدوروں، کسانوں بلکہ پورے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جانے کی دعوت دی۔ جمہوریت کے فوائد اور شہنشاہیت و سامراجیت کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا۔ مثنوی میں انقلابی آہنگ اور بغاوت کا رنگ غالب نظر آتا ہے جو روایتی مثنویوں سے بالکل الگ ہے۔

سردار جعفری نے قطعات لکھے ہیں۔ ان میں رومان، انقلاب اور دونوں یعنی رومان و انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے قطعات کے موضوعات میں دنیا کی بے ثباتی، ویت نام کی جنگ کے دوران ظلم و بربریت کا نقشہ، سرمایہ دار اور مزدور کی کشاکش، حکومت وقت کی نکتہ چینی، مارکس کے نظریات کی تبلیغ شامل ہے۔ سردار جعفری کے لکھے قطعات میں ادبیت اور

شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔

سردار جعفری کی شاعری خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سمجھیں۔ادب کو عوام سے قریب لانے' زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کے لیے وسیلہ واضح اور عوامی ہونا ضروری تھا۔ان کے ہاں عام فہم سیدھے سادھے اور سلیس الفاظ کی بہتات ہے۔کسانوں اور کلرکوں کی روزانہ زندگی ہے' گاؤں ہے' چوپال ہے' کارخانہ ہے' مزدور ہیں' میلے ٹھیلے تماشے ہیں' عورتوں کے جمگھٹے ہیں۔سردار کی شاعری عوام سے قریب ہوگئی ہے۔یہ عوام اور خواص دونوں میں پسند کی جاتی ہے۔زبان کے استعمال میں سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کی ترجمانی کی ہے۔ان کے ہاں عام استعمال کے الفاظ ملتے ہیں۔ان کی زبان پر جہاں ہندوستان کے عوام کی بولی کے الفاظ ہیں وہیں فارسی کی خوبصورت ترکیبیں بھی ہیں۔ ان کی نظمیں ان کے بیدار شعور اور دردمند دل کی عکاسی کرتے ہیں۔الفاظ کا فنکارانہ انتخاب' خوبصورت اور نئی تشبیہات و استعارات' علائم کا برموقع استعمال ان کی نظموں کے ظاہری حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔سردار جعفری جذبات واحساسات کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جس سے نظم میں شدت اور تاثیر بھر جاتی ہے۔انہیں الفاظ کے محل استعمال پر بلا کا عبور حاصل ہے۔ان کے یہاں بظاہر غیر فصیح نظر آنے والا لفظ محل استعمال سے منہ سے بول پڑتا ہے۔وضاحت اور قطعیت کے باعث سردار جعفری کے کلام میں استعارات اور اشارات کی تصویر مدھم ہے۔وہ مافی الضمیر کے دوٹوک اور بلا تکلف اظہار پر زور دیتے ہیں۔ان کے اپنے موقف کی روشنی میں ایسا ضروری بھی ہے۔انہوں نے اشکالی وابہام اور پیچ در پیچ معانی آفرینی سے گریز کیا۔

بقول سردار جعفری' ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے کردار' کردار نہیں علامتیں ہیں۔جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہیں۔بچہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے وہ نئی دنیا کی علامت ہے۔سردار جعفری کا لہجہ خطیبانہ ہے۔وہ اقبال کے آہنگ کے قریب ترین نظر آتے ہیں۔سردار جعفری کی شاعری میں گفتگو کا وہ انداز نہیں جو ہمیں فیض کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔فیض کی آہستگی' دھیمی دھیمی پکار رقاری کو دلآویز معلوم ہوتی ہے۔سردار جعفری اپنی گفتگو کو باوقار اور باوزن بنانے کے لیے الفاظ کی بندش اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں تیزی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے۔آواز کی بلند آہنگی میں سردار جعفری' اقبال سے قریب نظر آتے ہیں۔دنوں کی نظر میں یہ بات زیادہ اہم تھی کہ بات کو پوری قوت سے پیش کیا جائے۔ سردار جعفری کے ہاں جوش وجذبہ' ولولہ اور ہمہمہ بے حد زیادہ ہے۔فطرت کا حسن ان کے لیے خاص طور سے کشش رکھتا ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی میں انیس اور جوش کے بعد اگر پورے اعتماد کے ساتھ کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ علی سردار جعفری ہیں۔ ان کا سماجی و سیاسی شعور و مسلک بھی انہیں جادۂ اعتدال سے ہٹنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ان کی نظموں میں خطابت' بلند آہنگی' وضاحت وصراحت اور تکرار خیال موجود ہے تا کہ ترسیل خیال میں زبان دانی کے سبب دشواری حائل نہ ہو۔تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس وضع احتیاط کے باوجود کہیں کہیں ڈوران کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور شاعرانہ تخئیل نے ایسی جولانیاں دکھائی ہیں جو دید کے قابل ہیں۔علامتوں کو تو راہ نہیں مل سکی ہے لیکن تشبیہ' تمثیل اور استعاروں نے اکثر مشترکہ تہذیبی و تاریخی حقائق کے بیان میں بھی اپنا جادو جگایا ہے۔اس طرح بعض نایاب شعری مرقعے سامنے آگئے ہیں۔

بیسویں صدی کی اسّی کی دہائی تک کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات بھی ہوئے جن سے متاثر ہو کر سردار جعفری آزادی سے قبل کے اپنے انقلابی اور باغیانہ لب و لہجے کو پھر سے اختیار کر سکتے تھے لیکن اب ان پر یہ فلسفہ آشکار ہو گیا تھا کہ شاعری میں ابہام' استعارہ اور علامت بے حد ضروری ہے اور کسی بھی خیال یا واقعہ کو نرم اور مدھم لب و لہجے میں کہنا شاعری ہے۔ لہٰذا دورِ حاضر کے سنگین اور پُرخوں حالات کے اظہار کے لیے سردار جعفری نے اسی طرح کا انداز اختیار کیا۔ اس عہد کی نظموں اور غزلوں میں سردار جعفری نے جلال و جمال دونوں کو کچھ اسطرح برتا ہے جس سے ان کی شاعری مزید نکھر گئی۔ اب سردار جعفری کی ادبی اور فکری زندگی بھرپور جمالیات سے عبارت نظر آتی ہے۔ اس عہد کی شاعری میں انہوں نے نرم' مدھم' دلچسپ اور دلنشیں لب و لہجے کو اختیار کیا۔ تشبیہات' استعارات اور تلمیحات کے استعمال نے ان کی شاعری کو تمام تر شعری لطافتوں سے مزین کر دیا جو دلوں کو گرماتی بھی ہے اور شعری حظ بھی عطا کرتی ہے۔ الفاظ کے دلکش دروبست سے ایک خاص طرح کی جھنکار کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

سردار جعفری کی مقصدی شاعری کے مخاطب عوام ہیں۔ ایسی مقصدی شاعری کے لیے اشاریت اور ابہام مناسب نہیں لیکن شعری مجموعہ ''ایک خواب اور'' اور اس کے بعد کی چند منظومات سے پہلو تہی نہیں کر سکے۔ ابہام کی سرحدوں سے دور ہی رہے۔ اشاریتی فضا ضرور ہے۔ کاشتکاروں کی بے بسی' افلاس اور بھوک کی تصویر اشاریتی انداز میں ملتی ہے۔ ان کے پاس اشارات کم ملتے ہیں۔ بعد کی منظومات میں اشاریتی فضا سے کام لیا گیا ہے۔ سردار جعفری کی شاعری میں مختلف اقسام کی پیکر تراشی کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً بصری پیکر (شام کے مختلف رنگ)' سماعی پیکر (مختلف آوازیں)' لمسی پیکر' حرکی یا متحرک پیکر (انسانی ہاتھ جو دنیا کو سنوارتے ہیں' سجاتے ہیں اور تعمیر کرتے ہیں)' حسّی پیکر (دورانِ حمل میں عورتوں کے جذبات و احساسات)۔ ان کے علاوہ استعاراتی پیکر' تشبیہی پیکر' علامتی پیکر' تلمیحی پیکر' نظریاتی یا تصوراتی پیکر کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ موضوع بسا اوقات اپنے جمالیاتی پس منظر ہی میں کھلتا اور پھلتا ہے۔ فکر کی تابندگی اور جذبے کی گرمی حسّی و بصری کیف کے ساتھ گھل مل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ ایسی امیجری کی مثالیں سردار جعفری کی نظموں میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔

سردار جعفری کے شعری اسلوب کی خصوصیات میں وضاحت' صراحت' روانی' ابہام سے گریز' تکرار کی موجودگی' خوبصورت تراکیب' استعارے اور ایجاز کا جزوی عمل دخل تو ضرور ملتا ہے مگر بنیادی طور پر یہ وضاحتی اور بیانیہ اسلوب' تشبیہ اور تمثیل سازی کا رجحان' براہ راست تخاطب' زورِ خطابت کی بلند آہنگی' انیس کا بیانیہ انداز ہے۔ سردار جعفری' اقبال اور جوش سے متاثر ہیں۔ خاص طور پر جوش کے اثرات تو سردار جعفری کی شاعری میں اول سے آخر تک دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان شعراء سے اثر پذیری کے باعث سردار کے ہاں بیانیہ رنگِ سخن نمایاں ہے اور یہی شعری اسلوب ان کی خاص پہچان بن گیا۔ شروع میں وہ آزاد نظم سے متفق نہیں تھے مگر بعد میں اس صنف کو انہوں نے وسیلہ اظہار بنایا اور اس صنف کے امکانات روشن کیے۔

سردار جعفری کی شاعری کی خصوصیات میں درجہ ذیل باتیں شامل ہیں۔

(1) زوربیاں' (2) گرمئ کلام (3) سلاست' صنعائی (4) روانی (5) مقصدیت (6) ان اقرار کی تشہیر جو انسان کو اعلیٰ اور ارفع بناتی ہیں (7) عصری شعور جس کی وسعتیں لامحدود ہیں (8) اپنے عہد کے دائرے سے نکل کر آئندہ زمانوں کی

کھلی ہواؤں میں پرواز کرنے والی خصوصیت (9) روایتوں کی امین (10) جدتوں کی نقیب (11) مظلوم سے ہمدردی (12) زبان و بیان پر پوری قدرت (13) فن کی نزاکتوں اور باریکیوں پر نظر (14) زمانے اور زمین کے متنوع مسائل کا بیان اور انہیں حل کرنے کی تدابیر کا واضح اظہار (15) شعری محاسن' خوبصورت الفاظ' دلکش تراکیب' نازک پیکر' حسین استعارے' محبت کی زبان اور الفاظ کا فنکارانہ انتخاب' شعریت' لطافت (16) ان کی شاعری میں ہمارے عوام کی کشمکش' زیست اور امنگوں کی عکاسی (17) انسان دوستی' دل سوزی اور دردمندی کا بھرپور احساس (18) شاعری کا مقصد و محور عوام۔ موضوعات' زبان اور اسلوب ہر کسی اعتبار سے (19) عام انسان کی زندگی سے متعلق موضوعات (20) مغرب سے مشرق تک' ایشیا' آفریقہ بشمول ویتنام' کوریا' کشمیر بلکہ ساری دنیا کا غم۔

سردار جعفری کی شاعری میں جو چیزیں نظر آتی ہیں، ان میں یہ شامل ہیں۔

(1) ہمارے سماج کی تصویر (2) آزادی سے قبل اور بعد کی تمام معاشرتی' اقتصادی' سماجی' سیاسی حالات و حقائق کی پیچیدگی کا موثر بیان (3) سماجی انصاف' انسانیت سے محبت' دیہاتی اور مزدور پیشہ طبقے سے ہمدردی (4) جدوجہد اور امن و ترقی کی آرزو (5) انسان' سماج کی طرح کی خوشحالی' ترقی اور قدر و منزلت (6) حریت پسندی (7) ایشیاء کی آزادی (8) ہندوستان' ایران' عرب' عراق' چین' روس وغیرہ کی تاریخ (9) اشتراکی نظریات (10) امن عالم (11) مذہبی رواداری' بھائی چارہ' صلح و آشتی (12) دوسری جنگ عظیم (13) ہندوستانی آزادی کی تحریک (14) مغرب کی مادہ پرستی (15) دولت کی ہوس (16) کمیونزم (17) انقلاب روس' لینن' اسٹالن (18) چین سکون' امن و امان (19) دنیا کی بے ثباتی (20) ویت نام جنگ میں ظلم و بربریت (21) مارکس کے نظریات کی تبلیغ (22) فکر و حکمت کے موضوعات (23) معاشرتی افادے کے عناصر کی تلاش (24) اجتماعیت (25) بین الاقوامی امن تحریک۔

سردار جعفری کی شاعری محبت' زندگی کی اعلیٰ قدروں' مستقبل اور کامیابی پر یقین کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکی اقدار اور ترقی پسند فکر کے خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے۔ سردار جعفری کی شاعری مقصدی و تبلیغی شاعری ہے۔

فطری ادراک کے علاوہ دیش بدیش کے علوم و فنون کے ذخائر کے گہرے اور گمبھیر مطالعہ نے سردار جعفری کی فکر و نظر کو جو وسعت اور آگہی عطا کی ہے اس کی مثال ان کے معاصرین میں کسی اور کے ہاں کم ملتی ہے۔ مطالعہ کی وسعت اور غور و فکر نے ان کے ذہن کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ سردار جعفری بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ دور حاضر کے تغیرات سے آنے والے دور کی تصویر دیکھ لینے پر وہ قادر ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی شاعری اپنے قلم کو حسب ذیل مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

(1) عوام کی فلاح و بہبود' مسرت خوشحالی

(2) مظلوموں سے ہمدردی

(3) دبے کچلے افراد کی آواز کو عام کرنے

(4) عوامی جدوجہد کے کام

(5)انسانیت کے خوشگوار مستقبل کی تعمیر

(6)انسان دوستی جو رنگ و نسل، مذہب و ملت، ملک و قوم اور علاقہ واریت اور زبان وغیرہ سے بالاتر

(7) کمزور، پس ماندہ اور اقلیتوں کے حقوق و مفاد

(8) تمام غلام ممالک کی آزادی

(9) سارے عالم، سارے انسانوں کی باعزت اور باوقار زندگی

(10) ہندوستان، ایشیا ہی نہیں دنیا کی پس ماندہ تمام اقوام کی بیداری

(11) غریب، مزدور، محنت کش طبقہ اور دبے کچلے عوام کو جگانا اور ان کے دلوں میں انقلاب کی شمع روشن کر کے انہیں ہمت و حوصلہ، طاقت و جرأت عطا کرنا۔

(12) غریبوں اور محنت کشوں کی ترجمانی۔

سردار جعفری کی شاعری نے کیا پیام دیا ہے، اس میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں۔

(1) کامرانی اور تشنہ لبی دونوں سے گزرتے رہنا انسان کا مقدر ہے۔ کامرانی میں غرور کا دخل نہ ہو۔

(2) تشنہ لبی کی اذیت سے بھاگ کھڑے ہونے کا جذبہ بھی نہ ہو۔

(3) انسان اور انسانیت کی اعلیٰ آفاقی اقدار۔ انسان دوستی۔ انسانوں سے محبت۔ انسانیت کا درس

(4) تاریخی شعور پیدا کرنا اور ذہن کو انقلاب کے لیے تیار کرنا۔

(5) عالمی امن، صلح و آشتی کا پیغام

(6) سامراجیت، جبر و استبداد و طبقاتی امتیاز کے خلاف للکار

(7) حصول آزادی کی جدوجہد

(8) باطل اور جابر کے خلاف آواز بلند کرنا

(9) روشن خیالی، انسانی ہمدردی، خوش حالی

(10) انسان دوستی، بھائی چارہ

(11) انسان سے محبت، یگانگت

(12) انسانی حرمت و شرافت

(13) سماجی عدل و انصاف

(14) سامراجی طاقتوں کی مخالفت

(15) رجائیت

(16) حب الوطنی، قومی یکجہتی

(17) عالمی برادری، محبت، عزت و احترام

(18)ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

(19)مذہبی رواداری

سردار جعفری کی شاعری میں جن چیزوں سے بغاوت اور احتجاج ملتا ہے،ان میں یہ شامل ہیں:

(1)ظالم کے خلاف بغاوت

(2)ظلم،جبر و استحصال

(3)ناانصافی

(4)غلامی

(5)سامراج،سامراجیت

(6)فاشزم

(7)فرقہ پرستی،نسلی تعصب،تنگ نظری

(8)تشدد

(9)بدی،احساس برتری اور جنگ

سردار جعفری نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جیل کی سلاخوں میں بھی بند رہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعہ وطن کی آزادی کے لیے خود بھی لڑتے رہے اور دوسروں کو بھی للکارتے رہے۔انہوں نے اپنی نظموں کو ملک کی آزادی کے لیے بطور اسلحہ استعمال کیا۔آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد انہوں نے قوموں کے ٹکراؤ کو ختم کرانے میں اہم رول ادا کیا۔انہوں نے غریبوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی ہمیشہ وکالت وحمیت کی۔دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کا خون بہا،وہ تڑپ اٹھے۔دنیا کے چنگیزوں،ہٹلروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جس طرح کھل کر اور جتنا بڑھ چڑھ کر انہوں نے لکھا،شاید ہی کسی شاعر نے لکھا ہوگا۔انہوں نے ظلم وستم،استبداد و استحصال،جنگ،ناانصافی و نابرابری،عصبیت،مذہبی منافرت،نسلی تعصب،بدی،احساس برتری،تنگ نظری،منافقت،فرقہ پرستی،غلامی،سامراجیت کی مذمت کی اور اس کے خلاف نبرد آزما رہے۔انہوں نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے قلم سے جبر و استحصال،ناانصافی اور تشدد کے خلاف جہاد کیا۔سردار جعفری آزادی اور حریت،امن و شانتی،محبت و مساوات،منصفانہ نظام کے علمبردار تھے۔انہوں نے مظلوموں کی ہمدردی کی،امن و آشتی کا پیغام دیا،انسانیت کا درس دیا۔ان کی شاعری میں امن،بھائی چارے،دوستی،محبت،ہم آہنگی کا پیام کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔وہ آخری عمر تک ملک وقوم،ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل رہے۔

سردار جعفری کی آزاد نظمیں جاندار ہیں،براہ راست دل پر اثر کرتی ہیں۔وہ نظموں کے شہنشاہ ہیں۔ان میں روانی،نرمی،لطافت،تلوار کی کاٹ،اضافہ زمانہ کے دکھ،ضمیر کی آواز،ظلم کی چیرہ دستیاں،جنگ کے شعلے،صبح کا انتظار،رجائیت اور امن کا پیغام ہے۔وہ امن عالم کے لیے ہمیشہ سرگرم اور فعال رہنے والے سپاہی ہیں۔وہ ہمیشہ اردو کے مسائل کے حل کے لئے کوشاں رہے اور عملی طور پر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔انہوں نے اردو اور ہندی کو نزدیک لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

وہ مشترکہ تہذیب کے علمبردار رہے۔سردار جعفری نے بہت سی اچھی نظمیں کہی ہیں،مثال کے طور پر چند کے نام یہ ہیں۔''کون دشمن ہے''،''پتھر کی دیوار''،''امن کا ستارہ''،''خون کی لکیر''،''رومان سے انقلاب تک''،''ایشیا جاگ اٹھا''،''نئی دنیا کو سلام''، ''اودھ کی خاک حسیں''،''تجدید وفا''،''انتظار نہ کر''،''سیہ لہو''،''پیاس کی آگ''،''پیراہن شرر''،''میرے عزیز و میرے رفیقو''،''ایک خواب اور''وغیرہ وغیرہ۔

علی سردار جعفری کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔انہوں نے اردو شعر و ادب کا عمیق مطالعہ کیا۔عالمی ادب پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔مذہبیات'سیاسیات'عمرانیات'سماجیات اور اقتصادیات میں وہ درک رکھتے تھے۔ان کے تنقیدی مضامین'دیباچے'پیش لفظ'انٹرویو اور تقاریر میں تنقیدی افکار ملتے ہیں۔انہوں نے ادب اور ادیب'شاعر اور شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔انہوں نے بتایا کہ ادب کو زندگی اور نمو کی ترجمانی کرنی چاہیے'ادب کا خام مواد زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں'ادیبوں کو مسائل پر غور و بحث کرنے تبادلہ افکار کے لیے ملتے رہنا چاہیے۔قلم کی طاقت کے سلسلہ میں سردار جعفری کا ماننا ہے کہ ادیب کا قلم گولیوں کے وار سے بھی زیادہ کارگر ہے۔منٹو کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ منٹو کو یہ نہیں معلوم کہ اس کا پستول اس کا قلم ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وار گولیوں سے بھی زیادہ کارگر ہے۔انہوں نے اچھے اور بُرے ادب کی خصوصیات بھی بتلائی ہیں۔ ان کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جس کا مواد صحت مند'مفید اور حوصلہ بخش ہو۔بُرا مواد وہ ہے جو بیمار'غیر مفید'مایوس کن'تاریک اندیش یا گندہ ہو۔انہوں نے وضاحت کی کہ بُرے مواد کی ہیئت بظاہر جتنی خوبصورت ہو'اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدت ہو'اس ادب کو وہ اتنا ہی بُرا اور خطرناک سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا زہر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے۔سردار جعفری نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے تا حیات کوششیں کیں'اردو کے فروغ کے لیے مشورے دیے'اردو کی تعریف کی۔انہوں نے بتایا کہ تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔سردار جعفری نے عوامی زبان و ادب کی اہمیت کو اجاگر کیا۔بیکل اتساہی کے حوالہ سے سردار جعفری نے کہا کہ بیکل اتساہی نے اردو زبان کو گاؤں کے عوام کی زندگی'دبی کچلی مظلوم انسانیت کے کرب سے روشناس کرایا ہے'یہ سب سے بڑا معیاری کام ہے'مستقبل کی نقد و نظر انہیں خسرو'نظیر اکبر آبادی کی عوامی روایت کا عظیم علمبردار ماننے پر مجبور ہوگی۔سردار جعفری نے کہا کہ شاعری کا رشتہ جب تک عام انسانوں اور زندگی سے نہیں ہوگا تب تک وہ معیاری یا قابل قبول نہیں ہوگی۔انہوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ آمریت'دنیا میں چاہے جہاں بھی اپنی گرفت قائم کر لے لیکن ادب میں آمریت نہیں چلتی'جلد یا بدیر اسے بہر طور ختم کرنا ہوگا۔تخلیق کار اور قاری کے رشتہ کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا کہ ہر زمانہ میں شعر و ادب کی مقبولیت کا سبب یہی رہا کہ ادیب اور قاری ایک دوسرے کے قریب رہے۔ادیب اُن کے دکھ درد اور ان کے مطالبوں سے واقف ہو۔سردار جعفری عوام سے متعارف تھے۔

شاعر اور معاشرے کے رشتہ کے سلسلہ میں سردار جعفری نے وضاحت کی اور بتایا کہ شاعری میں لذت ہے اور یہ لذت شاعر کے لیے تسکین کا باعث ہے اور اسے معاوضے اور انعام سے بے نیاز کر دیتی ہے'شاعر کا موضوع زندگی کا کرب اور نشاط ہے'انسانی دکھ سکھ ہیں'اس کی ذاتی خوشیاں اور محرومیاں بھی عام عالم انسانی کی خوشیوں اور محرومیوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہے' ظلم سے نفرت اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ ہر دل میں ہوتا ہے لیکن شاعر اپنے انفرادی تجربے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص

کو وہ بات اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے، ہر شخص اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ شعر کو سمجھنا اور اس سے لطف ہونا بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس طرح دونوں اس تخلیقی عمل میں شریک ہوتے ہیں اور یہ شاعر اور معاشرے کا رشتہ ہے۔ سردار جعفری نے شاعر کو معاشرہ کا ضمیر بتایا ہے، معاشرہ کو شاعر لفظوں کا پیکر دیتا ہے، معاشرے میں وہ صرف خبر کی حیثیت رکھتا ہے، کاروبار، محنت و مشقت، زندگی کی سخت جدوجہد سے تھک جانے کے بعد روحانی سکون اور بالیدگی کے لیے شاعری کو وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ سردار جعفری نے کہا کہ شاعر معاشرے سے الگ اور بے نیاز ہوکر شاعری نہیں کرسکتا۔ انہوں نے شعر میں معنی و مفہوم کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی وسعت کو "ماورائے سخن بھی ہے اک بات" کے مصداق اور آگے کی چیز بتلایا ہے۔ سردار جعفری نے اچھی، بڑی اور زندہ رہنے والی شاعری کی خصوصیات بھی بتلائیں۔ اچھی شاعری کے لیے انہوں نے بتایا کہ شاعر اپنے عہد کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اپنے عہد کے انسانوں کے دلوں کو سن سکے، محسوس کرسکے اور عوام کی زبان میں بات کرسکے۔ یہ مواد ہے۔ شاعر تخلیقی پیکر پیدا کرتا ہے اور اپنی ذات کا اضافہ کرتا ہے۔ کمتر شاعر کا شعر کمتر اور بہتر شاعر کا بہتر اور خوبصورت بتایا ہے۔ اظہار میں سہولت، ندرت (تخئیل کی کارفرمائی، عظمت اظہار (فکر کی کارفرمائی) کی وجہ سے شاعری میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جو شاعری اپنے عہد کی پوری بصیرت لیے ہو اور جس میں ماضی و حال کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی دھمک بھی سنائی دے وہ زندہ رہتی ہے۔

سردار جعفری تحریک آزادی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے قاضی جلیل عباسی کی تصنیف "کیا دن تھے" (1985) میں مصنف کو تحریک آزادی کا ایک نڈر اور بے باک، حوصلہ مند اور پُر جوش سپاہی قرار دیا، کتاب میں گزرے ہوئے عہد کو سانس لیتا ہوا بتلایا۔ گزرے ہوئے عہد کی شمولیت کو سردار جعفری، کتاب کی اہمیت کے ایک جزو کی طرح دیکھتے ہیں۔ سردار جعفری ظلم سے مدافعت کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اس مدافعت کو جو تشدد سمجھتے ہیں اُن کے لیے کرشن چندر کے ناول "جب کھیت جاگے" کا یہ اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"اگر ظلم سے مدافعت کرنا تشدد ہے، اگر اپنی جان کی حفاظت کرنا تشدد ہے تو پھر خود جینا بھی تشدد ہے اور سانس لینا بھی تشدد ہے اور دل کا دھڑکنا بھی تشدد ہے"۔

سردار جعفری حوصلہ مندی میں ایقان رکھتے۔ انہوں نے مجاز کی نظموں میں عصری حسیت اور حوصلہ مندی کی تعریف کی۔ خمار بارہ بنکوی کی شاعری میں زندہ رہنے کا حوصلہ دینے والے اشعار کی نشاندہی کی اور یہ بھی کہا کہ خمار کے ترنم میں نشاط انگیز سوز بھی ہے۔ سردار جعفری آگے ہی آگے بڑھتے رہنے میں ایقان رکھتے ہیں اور جہاں اس کی ترغیب یا نمونہ ملتا ہے اس کی ستائش کرتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری میں انہوں نے دیکھا کہ غالب انتہائی مشکل حالات میں بھی جی کھول کر ہنسنا جانتا ہے۔ غالبؔ، شوق اور طلب کی راہ میں ایک لمحے کے لیے آسودہ نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے کہا کہ منزل سے کہیں زیادہ لذت منزل کی جستجو میں ہے کیونکہ منزل آسودگی ہے اور آسودگی روح و دل کی موت۔

سردار جعفری، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے دلدادہ اور علمبردار تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی اہمیت کو اجاگر کیا اور کہا کہ ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی ہم وقیع ترقومی اتحاد کا تصور

کرسکتے ہیں اور حب وطن کے چمن میں مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔انہوں نے کبیر کی شاعری میں انسانیت، یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کی۔سردار جعفری نے ملک کے ثقافتی ورثہ کی تعمیر کی اہمیت اجاگر کی اور ہندوستان کے ہر شہر میں اسٹیشنوں، شاہراہوں وغیرہ کو وہاں کے مشہور شاعروں کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز پیش کی جنہوں نے ملک کے ثقافتی ورثے کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ ہر شخص کی شخصی ذمہ داری ہے کہ وہ محبت کا پیغام جہاں تک پہنچ سکے، پہنچاتا رہے اور جگر کے اس شعر کو مرادآباد کے ریلوے اسٹیشن پر جلی حروف سے لکھا جائے۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

انہوں نے کہا کہ دوسری زبانوں کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہندی اور اردو میں آنی چاہئیں۔سردار جعفری نے غالبؔ کے ہاں موجود مشترکہ تہذیب کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ غالب انیسویں صدی کی مشترکہ تہذیب کی ایک شاندار علامت تھے، غیر معمولی فہم وفراست اور ماورائی دوراندیشی سے بہرہ مند اس شاعر کی نظروں میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔مثالی انسان کا ان کا تصور ان کی شاعری میں جگہ جگہ عیاں ہے۔

سردار جعفری نے اقبال پر اپنی پہلی رائے جو انہوں نے اپنی تصنیف ترقی پسند ادب (1951) میں دی تھی، اس کی بھرپور تلافی اپنی اگلی تصنیف ''اقبال شناسی'' (1976) میں کردی اور یہ اقبال کو نئے انداز سے بازیافت کا کام تھا۔سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' اور اس سے قبل کی تحریروں میں سردار جعفری کا تنقیدی نقطہ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے۔وہ ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کی بعد کی تصانیف ''پیغمبران سخن'' اور ''اقبال شناسی'' میں ان کے نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور انہوں نے فن پارہ کی تعیین قدر کے لیے تنقید کے مختلف دبستانوں سے بیک وقت استفادہ کیا ہے۔ان کا نظریہ ادب قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔انہوں نے اقبال شناسی میں نئی جہتوں اور نئے زاویوں کا اضافہ کیا۔سردار جعفری نے اقبال کے کلام سے اس بات کی نشاندہی کی کہ اقبال نے تیسری دنیا، خاص طور پر اردو، فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبردار اور بیدار ہونے کا پیغام دیا۔سردار جعفری نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی ہندوستان کی تحریک آزادی کی عطا کی ہوئی بیداری سے ہم آہنگ تھا، اقبال مسلم بیداری، ہندوستان کی بیداری، ایشیا کی بیداری اور عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے، وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خواں تھے۔سردار جعفری نے کہا کہ ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرہ میں سانس نہیں لے سکتا۔سردار جعفری اس بات کے معترف ہیں کہ اقبال سے ترقی پسندوں نے بہت ساری چیزیں لی ہیں جیسے تصور انسانیت، انسانی خلاقی، انسان کی تخلیقی قوت، انسانی ہاتھوں کی عظمت، نظریۂ حیات، آہنگ۔نظم جدید کی عظیم الشان عمارت جو اقبال اور جوش نے تعمیر کی تھی، ترقی پسند شعراء نے اسے استحکام دیا، مقدور بھر آگے بڑھایا۔سردار جعفری نے بہت سے شعرا اور ادیبوں کے کارناموں پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اپنی رائے کا اظہار کیا جن میں چند اس طرح ہیں۔سجاد ظہیر کو سردار جعفری نے میر کارواں قرار دیا۔مخدوم کی شاعری کو بیک وقت شمشیر ساز اور جام کا امتزاج بتایا۔انہوں نے احتشام حسین کو روشن خیال سے

تعبیر کیااور پروفیسر سید اعجاز حسین کومعتبر وقائع نگاراور تحریک کے سرپرست کا درجہ دیا۔فرقت کاکوروی کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا کہ انہوں نے اپنے طنز ومزاح کے نشتروں سے سماج کی بہت سی دکھتی رگوں کو چھیڑا اور دکھ درد سے بھری دنیا میں ہنسنے ہنسانے کا موقع دیا۔روشن صدیقی کے بارے میں لکھا کہ وہ اپنی شاعری میں کبھی کبھی سیاست کو بھی رومانی جھروکوں سے داخل کر لیتے تھے اور شمیم کرہانی کے تعلق سے لکھا کہ انہوں نے اپنے عہد کی سیاست اور مسائل کی ترجمانی کی اور شاعری سے تحریک آزادی میں پورا حصہ لیا۔سردار نے مصور عبدالرحمٰن ضحائی کے بارے میں لکھا کہ ان کی ذات پر پاکستان کی طرح ہندوستان کو بھی ناز ہے۔پروین شاکر کی شاعری کو سردار جعفری نے حسن صورت، حسن سیرت، حسن زبان اور حسن بیان سے آراستہ بتلایا ہے۔پروین شاکر کی شاعری میں سردار جعفری نے اس بصیرت کی نشاندہی کی جو زندگی کو شائستہ بناتی ہے اور انسانی تہذیب کو وقار بخشتی ہے۔

سردار جعفری نے تقابلی مطالعے بھی کیے ہیں۔کبیر کے کلام کا رومی سے موازنہ اُن کا قابل قدر تنقیدی کارنامہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے۔میر اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی اولین کوشش کا سہرا بھی سردار جعفری کے سر ہے۔سردار جعفری نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ فارسی الفاظ کے استعمال میں میر، ہندوستانی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔سردار جعفری نے غالب کو شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا۔سردار جعفری میر، غالب کے بعد اقبال کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔سردار جعفری نے اصناف ادب کی ترقی میں کلچر کی فضا کے ہموار ہونے کے تعلق کو اجاگر کیا۔انہوں نے بتایا کہ اصناف جو ہیں، کسی زبان میں ایک صنف ترقی کرتی ہے کسی اور زبان میں دوسری صنف ترقی کرتی ہے کیونکہ کلچر کی جو فضا ہوتی ہے وہ اس کے لیے ہموار نہیں ہوتی۔سردار جعفری نے مثالیں بھی پیش کیں اور کہا کہ جو مقام اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں، ناول میں روس کو، موسیقی میں جرمنی کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔سردار جعفری نے صنف رپورتاژ کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اس صنف سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں اور یہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کا ایک اہم وسیلہ بن سکتا ہے۔سردار جعفری نے ہندو پاک کی اردو شاعری کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی شعرا کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے، احتجاج ہے اور ہجرت کا تصور۔اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک نشاط کی لہر ہے، جمہوری مزاج ہے۔

ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے سردار جعفری نے بتایا کہ ترقی پسند تخلیق کار فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور یہ تینوں کسی کامیاب فن پارے کے لیے ضروری اجزا ہیں جبکہ غیر ترقی پسند تخلیق کاروں کے ہاں فن اور حسن کاری پر اصرار تو ہے لیکن فن کی آمیزش کو وہ نہ صرف غیر ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اسے مہلک تک کہتے رہے ہیں اور یہی ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں کا بنیادی اختلاف بتایا گیا ہے۔حلقہ ارباب ذوق کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے سردار جعفری نے ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق میں ایک دوسرے کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔انہوں نے بتایا کہ حلقہ ارباب ذوق کے ساتھیوں نے اردو نظم کو ہیئتی اعتبار سے بہت کچھ دیا جیسے انہوں نے نئے نئے فارمز کے تجربے کیے، نئی لفظیات کے سلسلہ میں بھی ان کا کام زیادہ وسیع اور قابل تحسین ہے۔اسلوبی اعتبار سے ترقی پسندوں نے ان کے

اثرات قبول کیےاور ترقی پسندوں کے اثرات بھی ان کے ہاں موجود ہیں۔

سردار جعفری کی لڑائی جاگیرداری اور سامراجی ذہنیت کے خلاف ہے اس لیے انہیں اپنی نوا تیز کرنی پڑی۔انہوں نے منٹو کے ہاں سرمایہ دار سماج کی لوٹ کھسوٹ کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ منٹو نے ان کرداروں کی تصویر کشی کی ہے جن سے سرمایہ دارانہ نظام نے ان کی انسانیت چھین لی ہے' یہ سب پہلے کبھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی لیکن اس سماج نے جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے' ان سب کو جانور بنا دیا ہے' وہ جانور جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن پھر بھی انسان نہیں ہیں۔منٹو نے ان کی روح کے اندر جھانک کر دیکھا کہ ان کے سینوں میں انسانی دل دھڑک رہے ہیں۔سردار نے بتایا کہ منٹو انسان سے محبت کرتا ہے' اس نے سماج کی گندگی کو دیکھا' اس میں سماجی اور سیاسی مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی قوت ہے' وہ سرمایہ دار سماج کے خلاف بڑا تلخ طنز کر سکتا ہے۔سردار جعفری کمیونسٹ تھے۔انہوں نے روس میں کمیونزم کی ناکامی کا اعتراف تو کیا ہے لیکن ہندوستان میں اسے وہ ناکام نہیں بتاتے بلکہ اس کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہنے کی صلاح دیتے اور کہتے ہیں کہ کمیونزم میں زندگی کی بہتری کی صورت نکل آئے گی۔انہوں نے بتایا کہ معاشرے میں جب تک نابرابری اور بے انصافی موجود رہے گی' سوشلزم کا خواب ایک زندہ حقیقت کے طور پر باقی رہے گا اور ادب اس خواب کی تعبیر کے لیے اپنی مدد فراہم کرتا رہے گا۔سردار جعفری محنت' حرکت و عمل' بہتر زندگی کے خواب اور اس کے حصول کے لیے پیہم جدوجہد کو ادب' اور فن کا مستقل موضوع سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں انسان ناقابل شکست ہے کیونکہ اس کی محنت' عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔انہوں نے انسان کو سب سے زیادہ شاندار' سب سے زیادہ عظیم المرتبت اور سب سے زیادہ حسین بتایا ہے۔بہتر زندگی کے لیے انسانوں کو خواب دیکھتے رہنے اور مقاصد کو تر و تازہ رکھنے کی اہمیت اجاگر کی کہ خواب پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ پیہم جدوجہد کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔

سماجی زندگی کو سنوارنے کی پوری کوشش کو سردار جعفری نے شاعر کے فرائض میں شامل کیا ہے۔انہوں نے غالبؔ کی مثال دیتے ہوئے لکھا کہ غالب پورے عہد پر حاوی ہیں۔غالبؔ آج زندہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں شریک ہیں۔سردار جعفری نے لکھا ہے کہ غالب کی شاعری میں ایسے اشعار ملیں گے جو ہماری زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں' دکھوں' مایوسی' اداسی کی گھڑیوں سے باہر نکالنے میں مدد دیتے ہیں' نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کرشن چندر نے ان میں عصری حسیت کی نشاندہی کی' ہندوستان میں سامراجی تشدد' جاگیرداری ظلم اور غلامانہ بربریت دیکھی' افلاس' جہالت' وہم دیکھا' آنسو بہائے' طنز کے تیر چلائے۔سردار جعفری نے مجاز کی نظموں میں عصری حسیت اور حوصلہ مندی دیکھی اور اس کی تعریف کی۔انہوں نے منٹو کے خلوص' دیانت داری' انسانیت دوستی' حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا اعتراف کیا اور بتایا کہ منٹو کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے سماج کے سامنے اس کی ننگی تصویر لا کر کھڑی کر دی' اس نے چکلوں سے' بازاروں سے' شراب خانوں سے' گھروں کی چار دیواری اور دفتروں سے سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظر عام پر کھڑے ہو کر کہا'' دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے''۔

سردار جعفری نے ماضی کے ادبی ورثے کی قدر کی اور روح عصر کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔سردار جعفری بہتر طور پر لمحہ ادب اور زندگی کے رشتے کے ارتباط کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔سردار جعفری کی تنقیدی کاوشوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن و ادب کوئی الہامی شئے اور ماورائی طلسم نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے طبقاتی سماج کے مادّی و خارجی حقائق کی سچی داستان ہے۔اس میں ہمارے عوام اور محنت کش طبقے کے افراد کی زندگیاں ہیں۔سردار جعفری کی تنقیدی نگارشات بتلاتی ہیں کہ جو ادب ہمارے سماج کی عوامی زندگی کو نظر انداز کر کے سماج کے صف اعلیٰ اور خوشحال طبقے کو مرکز بناتا ہے، جس میں صرف عیش و عشرت سامانیاں اور اس کے تراشے کو نجتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں فن اور ادب نہیں کہا جا سکتا۔انہوں نے کہا کہ دنیا کا بہترین ادب عوامی رہا ہے۔ سردار جعفری نے کبیرؔ (پندرھویں صدی) میرؔ (اٹھارویں صدی) اور غالبؔ (انیسویں صدی) کی شاعری کو ان کے عہد اور حالات کے پیش نظر دیکھا اور اُسی کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی۔سردار جعفری نے شاعری میں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کو حق بجانب بتلایا۔سردار جعفری نے میر کی شاعری کو اس عہد کی ترجمان بتلایا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میر کا دیوان ان کے اپنے نہیں بلکہ سارے زمانے کے درد و غم کا مجموعہ ہے۔سردار جعفری نے میر کے کلام میں حوصلہ مندی، عصری حسیت، انسان دوستی، معاشی حالات، سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج کی نشاندہی کی۔انہوں نے بتایا کہ غالب کی شاعری اس عہد کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات سے متاثر تھی۔انہوں نے غالب کی شاعری میں اس دور کے عہد، غم میں نشاط کی کیفیت، انسانی عظمت، شوق، آرزو، منزل کی جستجو، کائنات اور حرکت و عمل کی نشاندہی کی۔

سردار جعفری کا پسندیدہ موضوع تاریخ تھا۔اس کے مطالعہ کو وہ بے حد ضروری خیال کرتے۔ان کا تاریخی شعور پختہ، قوی اور بیدار تھا۔ان کا خیال تھا کہ کسی بھی آرٹ یا لٹریچر کا تاریخی پس منظر جانے بغیر اسے سمجھا نہیں جا سکتا۔انہوں نے ادب کے مطالعے کے لیے تاریخی شعور کو لازمی قرار دیا ہے اور کہا کہ ماضی کے ادیبوں کو ان کے عصری ماحول کے پس منظر ہی میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے اور ان کے ادبی کارناموں سے ہم بصیرت حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ذوق جمال کی تربیت بھی کر سکتے ہیں۔ سردار جعفری نے کہا کہ کسی بھی زمانے کی شاعری پر اُس وقت کی زندگی، سماج اور ادب کے دھاروں سے واقف ہوئے بغیر تنقید نہیں کی جا سکتی۔سردار جعفری نے کبیرؔ، میرؔ اور غالبؔ کے فن کا تجزیہ تاریخی پس منظر میں کیا ہے۔سردار جعفری کی تنقیدی تحریروں میں اُن کا تاریخی شعور نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔وہ ادب کو اپنے عہد کے تاریخی حالات کی دین قرار دیتے ہیں۔انہوں نے وضاحت کی کہ تاریخی حالات دراصل سماجی حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔تاریخی شعور کا مطلب مختلف سماجی حقائق کی صحیح تفہیم اور زماں و مکاں کے اعتبار سے ان کا بیان اور اظہار ہے۔تاریخی شعور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانی سماج کی یا کسی مخصوص علاقے کی یا کسی مخصوص دور یا ادوار کی تاریخ سلسلہ وار بیان کر دی جائے۔شاعری اور ادب میں سردار جعفری کے پیش نظر یہی رہا کہ وہ کہاں تک اپنے سماجی مسائل کی ترجمان ہے، کہاں تک اس میں زندگی کے مقاصد شامل ہیں اور کہاں تک یہ زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتی ہے۔ان مبادیات کی روشنی میں سردار جعفری نے ادبی تخلیقات کا تجزیہ کیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سردار جعفری کے نزدیک جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔وہ کسی بھی ایسے حسن کو حسین کہنے کے حق میں نہیں جو حیات انسانی کے لیے سماجی، اخلاقی، ذہنی یا جسمانی کسی بھی طرح سے مفید و کارآمد نہ ہو۔سردار جعفری نے کبیرؔ اور میرؔ

کی شاعری میں بھگتی اور تصوف کے مسلک کا مطالعہ تاریخی حوالوں سے کیا اور انسانی مساوات کے تصور پر زور دیا۔ سردار جعفری کے تنقیدی مضامین ان کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ اس کام میں انہوں نے تخلیقی جمالیات، لسانی اقدار اور تہذیب اور انسان دوستی کو سامنے رکھا ہے۔ سردار جعفری طبعاً اور مزاجاً فن سے زیادہ فکر کو اہمیت دینے کی بات کہتے ہیں۔ وہ فکر و فن کے حسین امتزاج کو خصوصی اہمیت دینے لگے تھے۔ سردار جعفری تنقید میں فن پر زور دیتے ہیں۔ وہ متن کے ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی اسباق کو فراموش نہیں کرتے، اس کے بغیر متن کبھی کبھی نامکمل رہ جاتا ہے اور الفاظ، استعارے اور علامتیں پورا اظہار نہیں کر پاتے۔ سردار جعفری اس کے پورے سیاق میں شاعر اور اس کے کلام کو دیکھتے ہیں۔

سردار جعفری ایک انسان دوست تحریک کے علمبردار ہیں۔ وہ ساری زندگی اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعہ اسی انسان دوستی کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ ان کے لیے انسان دوستی ہر طرح کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔ وہ زبان کی قید و بند کو توڑ کر موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔ وہ نسلوں اور رنگوں کے فرق سے بھی نہیں واقف ہے۔ وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے اور مشترک اقدار کے درمیان پل بناتی ہے۔ رفعت سروش کے غنائیہ ''ساون بھادوں'' کے دیباچہ میں سردار جعفری نے اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں محبت کی ندیاں سوکھ رہی ہیں اور باہمی رفاقت اور ہمدردی کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ریگزاروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس عالم میں انہوں نے ساون بھادوں کو رحمت بتلایا ہے اور اپنی اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے دیس کے کونے کونے میں نفرت و عداوت کے خس و خاشاک ساون بھادوں کی بارش سے بہہ جائیں۔ سردار جعفری نے اختر سعید خاں کی غزلوں میں اجتماعی غموں کی نشاندہی کی، پرانی زمینیں، نئی زمینیں، جمالیاتی کیفیات اور سادگی کی نشاندہی کی۔ عشرت آفریں کے یہاں محنت کش اور عورت کے استحصال کے خلاف احتجاج کی نشاندہی کی ہے۔ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ عشرت آفریں کی سب سے بڑی دولت محبت ہے۔ دھرتی سے زندگی سے انسان سے۔ سردار جعفری نے جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس میں ماضی کی فنی روایات، اس کے موضوعات، دکھی انسانیت اور اس کی تمناؤں، ماحول کی سخت گیری کا احساس، حوصلہ مندی کی نشاندہی کی ہے۔ سردار جعفری، نیوکلیر جنگ کے خیال ہی سے یہ کہتے ہوئے خوف زدہ ہیں کہ اگر خدانخواستہ نیوکلیر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا، کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اتر کر سوا نیزے کے فاصلے پر آجائے گا۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا نیوکلیر جنگ قیامت سے کم بھیانک ہوگی۔ سردار جعفری نے اپنی پرورش اور تربیت کے ماحول کے بارے میں بتایا کہ ان کی پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ سردار جعفری نے ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نظم امن عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔

سردار جعفری چاہتے ہیں کہ ہمارا کوئی صاحبِ فکر نقاد یہ بھی لکھے کہ ہماری روایات میں عوامی قدریں کیا ہیں اور جاگیر داری اور سامراجی قدریں کیا ہیں، کن قدروں کو لے کر آگے بڑھنا ہے اور کن قدروں کو ترک کرنا ہے۔

سردار جعفری مارکسسٹ ہیں۔ وہ مارکس کے نظریہ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں

ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعہ ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعہ پرکھنے کی کوشش کی۔ ان کی تنقید میں وہی اصول اور ضابطے ملتے ہیں جو ترقی پسند تحریک یا مارکسی تنقید سے عبارت ہے۔کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود ان کو جمالیات سے عار نہیں تھا۔انسان اور انسان دوستی کا سبق ان کے تنقیدی رویے میں بھی ملتا ہے۔

''ترقی پسند ادب'' اور اس سے قبل کی تحریروں میں سردار جعفری کا تنقیدی نقطہ نظر خاصہ محدود اور یک رخا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کی بعد کی تصانیف ''پیغمبران سخن'' اور ''اقبال شناسی'' میں ان کا نظریۂ ادب قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ان کے نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور انہوں نے فن پارہ کی تعیین قدر کے لیے تنقید کے مختلف دبستانوں سے بیک وقت استفادہ کیا ہے۔سردار جعفری نے شاعری کی لغت ''سرمایہ سخن'' جلد اول میں چند شعرا کے منتخب کلام سے الفاظ اور ترکیبیں جمع کیں' شاعری میں علامات' تلمیحات' استعارات اور دیگر فنی لوازمات کی اہمیت اجاگر کی۔معنی' مثالیں اور بعض جگہ ان کا مفہوم بیان کیا۔سردار جعفری نے منٹو کی زبان کی سادگی' پُر کاری' اثر' کردار نگاری کا تیکھا پن' پلاٹ کا گٹھاؤ' کہانی پن' طنز کو اجاگر کیا۔فن میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی جو اہمیت ہوتی ہے، اُسے اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے مثالیں دیں اور بتایا کہ زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑی بنتی ہے' تاج محل اپنے آپ بڑا نہیں بن گیا۔چھوٹے چھوٹے پتھروں سے تراشا گیا تب جا کر فن کا ایک شاہکار بنا۔سردار جعفری نے بتایا کہ لحن و آہنگ' الفاظ کو نئی خوبصورتی عطا کرتے ہیں جو سامع اور قاری کے لیے دلکشی کا باعث ہوتی ہے' تشبیہ اور استعارے نئی معنوی تہیں پیدا کرتے ہیں اور لطف پیدا کرتے ہیں۔تکرار کو سردار جعفری نے ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت بتلایا اور کہا غزل میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دہرائے جاتے رہے ہیں۔انہوں نے اقبال کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال، فلسفہ خودی کو مختلف پیرایوں سے پیش کرتے رہے اس کے باوجود اقبال کی عظمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔

سردار جعفری رومانیت کے خلاف نہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ بغیر رومانیت کے شاعری ممکن نہیں۔انہوں نے خود اپنی شاعری میں رومانیت کا اعتراف کیا البتہ وہ Obscure Romanticism کے خلاف ہیں۔انہوں نے لکھا کہ پریم چند کی حقیقت نگاری میں رومانیت کی چاشنی ہے ورنہ ان کے ادب میں بھونڈا پن پیدا ہوجاتا اور جوش کی رومانیت میں حقیقت کی آمیزش ہے۔سردار جعفری نے کہا کہ غالبؔ کے ہاں خوشی اور غم کے جذبات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔گویا غالبؔ نے غم کو نشاط اور نشاط کو غم میں تحلیل کردیا۔سردار جعفری نے عبدالاحد سازؔ کی شاعری میں لطافت' نرمی' جمالیاتی اور تلخ کلامی کی نشاندہی کی ہے۔سردار جعفری نے بتایا کہ جمالیاتی اعتبار سے جوش نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے' ان کے ہاں نئے الفاظ' استعارے' علامتیں ملتی ہیں اور ترقی پسندوں نے شعوری طور پر جوش سے اکتساب کیا ہے۔سردار جعفری ایک خطیب بھی تھے اور یہی انداز خطابت ان کی تنقیدوں میں بھی اکثر جھلکیاں دکھلا دیتا ہے۔دیوان میرؔ اور دیوان غالبؔ پر لکھے جانے والے ان کے مقدمات بھی انتقادی اہمیت کے حامل ہیں۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن و ادب کے ذیل میں ان کا نقطہ نظر خالص اشتراکی ہے۔کبیرؔ کے سلسلہ میں بھی ان کا انداز فکر بھکتی سے زیادہ مارکسی ہے۔وہ کبیر کی شاعری میں مارکسی فکر و نظر کا سراغ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔تنقید میں سردار جعفری کے اسلوب میں سادگی' سلاست' نرمی' شگفتگی' فراخ دلی' دلائل جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔

سردار جعفری نے عوامی ادب کی ضرورت ابہام سے گریز، عام فہم اسلوب کی ضرورت اور حالی اور شبلی کے کارناموں کی ستائش کی ہے۔انہوں نے عوامی ادب کے لیے رمزیت اور علامت پن کی مخالفت کی ہے۔

علی سردار جعفری نے غالبؔ، میرؔ، کبیرؔ اور میرؔا بائی کے دواوین مرتب کیے۔دیوان غالب بیک وقت دو زبانوں اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھپا ہے۔دیوان میرؔ، کبیرؔ کی نظموں کا انتخاب کبیر بانی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں اور میرا بائی کی نظموں کا انتخاب بھی بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے۔ان کی تنقید کی اہمیت ان کے مضامین اور ترقی پسند تحریک کی تاریخ سے نہیں بلکہ کبیر بانی، میرا اور دیوان غالب کے دیباچے کی شکل میں شامل ان کے مضامین اور بعد کے دوسرے مضامین سے ہے۔سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ایک ترقی پسند تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں۔سردار جعفری خود کو نقاد نہ کہتے ہوں لیکن ان کے تنقیدی شعور، ان کی تنقیدی بصیرت اردو ادب کے لیے وجہ افتخار ہے۔''اقبال شناسی'' اور ''پیغمبران سخن'' انہیں ایک اعلیٰ تنقیدی منصب پر لا کھڑا کرتے ہیں۔صرف یہ دو کتابیں ہی انہیں اردو نقادوں کی پہلی صف میں رکھنے کے لیے کافی ہیں۔سردار جعفری میں ایک بڑا نقاد چھپا ہوا تھا۔ان کی قوت تنقید کا اندازہ ان کے لکھے دیباچوں، مقدموں، تبصروں، تنقیدی مضامین اور اداریے کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔میرؔ، غالبؔ، کبیرؔ داس، میرا، اقبال اور دیگر شعراء پر تحریر کردہ مضامین سے ان کی قوت استدلال، منطقی توضیحات، استدلالی تجزیے اور جمالیاتی احساسات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

علی سردار جعفری شاعر کے ساتھ ساتھ ادیب، دانشور اور صحافی تھے۔انہوں نے سبط حسن اور مجاز کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''پرچم'' پھر ماہنامہ ''نیا ادب'' لکھنو سے جاری کیا۔نیا ادب کا پہلا شمارہ اپریل 1939 میں شائع ہوا۔یہ ترقی پسند تحریک کا مستقل آرگن اور ترجمان بن کر منظر عام پر آیا۔اردو کے ہر ترقی پسند مصنف اور تحریک سے دلچسپی رکھنے والے نے اسے پڑھنا ضروری سمجھا۔کسمپرسی کے دور میں اسے جاری رکھا گیا۔جوش نے اپنے رسالہ کلیم کو بھی ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا۔اگست ستمبر 1939 سے یہ رسالہ نیا ادب اور کلیم کے نام سے جاری ہوا۔1942 میں نیا ادب کے چند پرچوں کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔1943 میں ممبئی سے اسے سہ ماہی شکل میں جاری کیا گیا لیکن اس کے بعد بھی یہ رسالہ پابندی سے شائع نہ ہو سکا۔سجاد ظہیر کے ساتھ سردار جعفری کمیونسٹ ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' میں صحافتی فرائض انجام دینے لگے۔کمیونسٹ پارٹی کا یہ ترجمان اخبار دور دور تک دلچسپی سے پڑھا جانے لگا۔1967ء سے سردار جعفری نے اپنی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' نکالنا شروع کیا۔گفتگو خاصہ ضخیم رسالہ تھا۔اس کے شمارے بے ترتیبی سے نکلے۔فروری 1967 تا نومبر 1967 تک رسالہ گفتگو کے شمارے پابندی سے نکلے۔اس کے بعد رسالہ گفتگو کے جون 1969 پھر چھ سال مارچ جون 1975، جون 1976، دسمبر 1976، جنوری 1978، ستمبر 1978، مارچ 1980، دسمبر 1992 کو اس کے شمارے نکلے۔

گفتگو کے جملہ 32 شمارے نکلے۔ہندوستانی بک ٹرسٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سردار جعفری نے غالبؔ، میرؔ، کبیرؔ اور میرا کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی لپیوں میں آمنے سامنے رکھ کر مقدموں کی شکل میں شائع کیا۔ششماہی ''فن اور شخصیت'' (ممبئی) کملیشور نمبر کی مجلس مشاورت میں سردار جعفری شامل تھے۔''فن اور شخصیت'' کے غزل نمبر کے نگران

سردار جعفری تھے۔

سردار جعفری نے ایک فلم ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' بنائی جو چلی نہیں۔فلم میلہ' سازش اور حبہ خاتون کی کہانیاں لکھیں۔فٹ پاتھ' انہونی' زلزلہ' پردیسی' شہر اور سپنا' دھوبی ڈاکٹر وغیرہ فلموں کے گیت لکھے۔انہوں نے دستاویزی فلمیں پھر بولوا ے سنت کبیر' ہندوستان ہمارا' جدوجہد آزادی کے سو سال (انگریزی)' علامہ اقبال' مہاتما گاندھی کا ڈانڈی مارچ' The Literary Storm کی کہانی اور مکالمے لکھے۔لال قلعہ دہلی' شالیمار باغ سری نگر' مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی تمثیلیں لکھیں۔لال قلعہ' تین مورتی نواس' سرینگر کے شالیمار باغ میں پیش کیا گیا پروگرام روشنی کی آواز کا اسکرپٹ لکھا۔اردو کے معروف شعرا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سترہ اپی سوڈ پر مشتمل ایک سیریل کہکشاں کا مسودہ تیار کیا۔دوردرشن پر محفل یاراں کے عنوان سے ہر ہفتہ آدھے گھنٹے کا پروگرام پیش کرتے رہے جو کسی نہ کسی مشہور شاعر یا ادیب کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ سردار جعفری دوردرشن پر ایک ادبی پروگرام آئینہ خانہ پیش کرتے رہے۔سردار جعفری خواتین کا بہت احترام کیا کرتے۔انہوں نے کبھی بھی خواتین کے بارے میں ریمارک پاس نہیں کیا۔

سردار جعفری نوجوان ترقی پسند ادیبوں میں سب سے زیادہ فعال اور سنجیدہ ادیب تھے اور اپنے انہماک اور دانشورانہ طرز استدلال کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔تحریری و تصنیفی ذمہ داریاں زیادہ تر انہیں ہی سونپی جاتی تھیں اور یہ بہت توجہ سے ان کو پورا کرتے تھے۔نیا ادب کی مجلس ادارت میں مجاز' سبط حسن اور سردار جعفری کے نام تھے مگر پرچے کے روح رواں دراصل سردار جعفری تھے۔ان کی لگن اور انتھک محنت سے یہ پرچہ چلتا تھا۔لکھائی' چھپائی کا بندوبست' کاغذ کی فراہمی' ادیبوں سے خط و کتابت' آمدنی اور خرچ کا حساب سب کچھ انہیں کے کندھوں پر تھا۔کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' میں سردار جعفری کئی اقسام کا کام کرتے جیسے کاغذ کا انتظام' پروف ریڈنگ' اخبار چھپتے وقت پریس میں موجودگی' اردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملاقاتیں وغیرہ۔کمرے کی صفائی بھی وہ خود کیا کرتے۔سردار جعفری اور ان کے ساتھی مضامین لکھتے' کاپیاں جڑواتے' پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ جاتا تو پوری ادارتی ٹیم بشمول سردار جعفری اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر چیخ چیخ کر اخبار بیچتی۔بعدازاں ''قومی جنگ'' کا نام ''نیا زمانہ'' ہو گیا۔

سردار جعفری نے نیا ادب میں گراں قدر اداریے تحریر کیے۔نیا ادب اور کلیم کے اداریے تازہ بتازہ سماجی' سیاسی مسائل اور عصری ادبی و تخلیقی رجحانات کے گہرے مشاہدے پر مبنی ہوتے تھے۔اس رسالہ میں جو مضامین شائع کئے گئے ان میں آزادی' جمہوریت' عالم انسانیت کی فلاح و بہبود' اخوت و مساوات اور ظلم کے خاتمے' انسانی مساوات' تہذیب و تمدن کی بنیادوں کی اہمیت کو جاگر کیا گیا۔ادب اور سماج کے گہرے تعلق پر روشنی ڈالی گئی۔یہ بتایا گیا کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خون چوسیں۔سامراجوں' سرمایہ داروں اور فاشسٹوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا۔سردار جعفری نے نئے ادبی رجحانات' سماجی تبدیلیوں' نوجوان نسل کے رجحانات اور ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالی' اعتراضات' الزامات کا جواب دیا۔ترقی پسند ادب کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا' پرانے ادب کی بہترین روایتوں کا حامل اور انہیں روایتوں کی بنیاد پر نئی عمارتیں کھڑا کرتا ہے' یہ زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے' نئی اور

بہتر زندگی کا راہبر ہوتا ہے' انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا معیار اونچا کرتا ہے' ان میں عمل' خود اعتمادی' تخلیق اور تعمیر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔عوامی ادب کی اہمیت اجاگر کی۔اس رسالے نے ترقی پسند نظریات کے فروغ میں حصہ لیا۔اس تحریک کی بھرپور ترجمانی اور اس کے اصول ونظریات کا موثر دفاع کیا۔

سردار جعفری نے اس تحریک کے بارے میں لوگوں کے ذہنی تحفظات اور شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کی۔شہری آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کی ضرورت پر زور دیا۔نیا ادب نے ترقی پسند ادب کی ترویج واشاعت میں نمایاں رول ادا کیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک حلقہ اس تحریک کے ساتھ ہوگیا۔سردار جعفری کی فکر اور اسلوب میں وضاحت اور پختگی نسبتاً زیادہ تھی۔سردار جعفری نے قومی جنگ میں ادارت کے ساتھ مضامین اور کالم بھی لکھے۔سجاد ظہیر اس کے مدیر اعلیٰ ہوگئے۔کمیونسٹ پارٹی کے کئی ذہین کل وقتی وجزوقتی ممبران بھی اس سے وابستہ ہوگئے۔ان میں سردار جعفری' محمد اشرف' سبط حسن' کیفی اعظمی' سید محمد مہدی' حمید اختر' کلیم اللہ' ظ۔انصاری وغیرہ شامل تھے۔اس لیے قومی جنگ کا صحافتی معیار بے حد بلند ہوگیا۔

سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' میں مختلف مکاتب فکر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کی گئیں اور انہیں متحد کرنے کی کوششیں کی گئیں۔یہ رسالہ ترقی پسند نظریات کا علمبردار تھا۔اس میں سردار جعفری ''پیش گفتار'' کے مستقل عنوان سے ادارتی شذرات لکھا کرتے۔بعض وقت اپنی مختصر نظمیں یا دوسرے اہل قلم کی تحریریں بھی شائع کرتے تھے۔اس رسالہ میں کام کرنے والے ادب اور زبان کی خدمت کو اپنا مشن بنائے ہوئے تھے۔سردار جعفری نے گفتگو کا ادبی مسلک ترقی پسندی' صحت مند اور باشعور قدروں کی ترجمانی بتایا ہے۔انہوں نے بتایا کہ جدیدیت کا ایک صحت مند رجحان بھی ہے جسے انہوں نے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا ہے' اپنے ساتھ بتلایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں بہت اچھے لکھنے والے پیدا ہورہے ہیں۔جن ادیبوں نے فیشن کے طور پر ادب میں ابہام اور علامتوں کا استعمال کرنا شروع کردیا تھا اس سے قاری اور ادیب کے درمیان ایک ترسیلی خلا پیدا ہورہا تھا۔ان حالات میں سردار جعفری نے اس زمانے میں جدیدیت پر کھل کر تنقید کی تھی۔سردار جعفری کی وہ نظریاتی کشمکش جو 1960 اور اس کے بعد کچھ عرصے تک نظر آتی تھی جس کے دھندلکے میں انہیں کسی خاص نتیجے تک پہنچنا مشکل ہورہا تھا' بعد میں وہ واضح ہوا۔سردار جعفری ترقی پسندی کی ادعائیت اور انتہاپسندی سے برگشتہ نظر آئے اور ساتھ ہی جدیدیت کی قنوطیت' مایوسی' اعصاب زدگی' اکتاہٹ' احساس شکستگی اور اقدار کی بے قدری سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ان دونوں رویوں کے برعکس انہوں نے ایک اعتدال کی راہ اختیار کرلی جہاں ادب کا رشتہ سماجی سروکار سے بہرحال برقرار رہا کیونکہ ادب کا منصب وہم وگمان سے شعور ویقین کی طرف حب ذات سے حب بشر کی طرف اور جمود سے حرکت وعمل وجہاد کی طرف لے جانا ہے۔

اس رسالہ میں سردار جعفری نے بتایا کہ ادب تنقید حیات ہے۔ادب حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے' شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اتنا ہی اس کا کلام دلکش' بلند ہوتا ہے' جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو' روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے' ہم میں قوت وحرکت پیدا نہ ہو' ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے' جو ہم میں سچا ارادہ اور

مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال پیدا نہ کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا' ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے اس کا مرتبہ اتنا نہ گرایئے' وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ جس دل میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کیسے رہ سکتی ہیں' محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہے اور خدمت کا معیار ہمارے پیش نظر ہے جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پاسکیں۔ جنہیں دولت اور ثروت پیاری ہے ان کے لیے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو اُن اپاسکوں کی ضرورت ہے جنہوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے' جن کے دل میں تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو' خدمت میں جو روحانی مسرت ہے' وہی ہمارا صلہ ہے' جو سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہوسکتا' اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لیے نمائش کی ضرورت نہیں۔ سردار جعفری نے ادب میں سماجی ذمہ داری اور اچھے ادب کی تخلیق کو ملک' قوم اور انسانیت کے لیے ناگزیر بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ اچھا ادب وہ ہے جو ملک وقوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لے جائے۔

اس رسالہ میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک برصغیر کے دو ملک ہیں' ایک درخت کی دو شاخیں' ایک درخت کے دو پھول' ایک خوبصورت چہرے کی دو آنکھیں' ایک دریا کی دو موجیں' ہماری باہمی محبت بے شمار تشبیہیں اور استعارے تراش سکتی ہیں.....اس لیے پاکستان میں عصمت چغتائی کا شاندار استقبال ہوا' ہمارے لیے حیرت کا باعث نہیں ہے صرف مسرت کا باعث ہے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام اور دانشور ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں بشرطیکہ اس کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ہمارے دونوں ملکوں کے ادیب اور دانشور محبت کے سفیر ہیں' ہماری دلی تمنا ہے کہ پاکستان جائیں اور نفرت کی ان جھوٹی دیواروں کو گرادیں جو سیاست نے کھڑی کر رکھی ہیں۔

گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں سردار جعفری نے بتایا کہ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ اس تحریک سے شاعری کو نیا افق' تنوع' وسعت ملی۔ اس کے اثرات صرف ادب تک محدود نہیں' اس کے زیر اثر سنیما' تھیٹر' پینٹنگ نے بھی نئی نئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ رسالہ گفتگو میں سردار جعفری اور دیگر ادباء اور شعراء کی شعری ونثری تخلیقات' ملکی وبیرونی شعرا کی شعری تخلیقات پر سردار کے تبصرے وتنقیدی جائزے' سمیناروں' ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنسوں کی مختصر روداد یں' جدیدیت پر اظہار' شعرا وادبا کو انعام واکرام کی تفصیلات' یادرفتگان اور کئی موضوعات پر نگارشات شائع ہوئیں۔

بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سردار جعفری ایک بلند پایہ اور کامیاب صحافی ہیں۔ انہوں نے ادب اور صحافت کی دنیا میں انقلاب آفریں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے فلم اور ٹی وی ذرائع کا استعمال اپنی صحت مند فکر کو عوام تک پہنچانے کے لیے کیا۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کرکے انہوں نے مشرق ومغرب کی تفریق مٹانے' معاشرتی استحصال وعدم مساوات سے مسائل کی طرف پوری دنیا کی توجہ مرکوز کرکے عالمی امن' انسانی مساوات اور رواداری کی دعوت دی۔

سردار جعفری عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا۔ وہ سماجی عوامل ان پر واضح ہوتے گئے

جن کے سبب ظالم اور مظلوم کا المیہ جنم لیتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر کہ حق وصداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے' انسانی دکھوں کا علاج ڈھونڈنے نکل پڑے اور ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ وہ اشتراکیت کے قائل تھے لیکن مذہب کے منحرف نہیں تھے۔ خدا' رسولؐ اور اہل بیت اطہار سے عقیدت ومحبت انہیں گھٹی میں ملی تھی جو براہ راست انہیں انسانیت اور انسان دوستی کی منزل تک لے جاتی تھی۔ ان کی سیرت اسلامی اقدار سے متصف تھی۔ خوف خدا انہیں نصیب تھا' خیر کے راستے میں ہی نجات کا ایقان تھا۔ وہ نئی نسل کو اس کی ترغیب دیتے۔ انہوں نے ادب کے ساتھ انسانیت کی خدمت کی۔ وہ وقت کے پابند تھے، خدا نے انہیں غضب کا حافظہ عطا کیا تھا۔ مصلحت بینی سے وہ محروم تھے۔ کبھی بے محابا اور مبتذل گفتگو نہ کرتے۔ تہذیب وشائستگی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں جھلکتی ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی خوشحال تھی۔ دونوں میں خلوص تھا' ایک دوسرے کی خوشی وغم میں برابر کے ساتھی تھے' زندگی کے ہر قدم پر ایک دوسرے کے مددگار تھے' دونوں ایک دوسرے کی پسند اور جذبات کا خیال رکھتے۔ ان دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا' دوستی کی فضا قائم رہی اور گھر کا ماحول پرسکون۔ آٹھ افراد خاندان کے ساتھ وہ چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے۔ سردار کی جیل کی زندگی میں ان کی اہلیہ نے معاشی اور گھریلو ذمہ داریوں کو نبھایا اور طویل مسافت طے کر کے ان سے ملنے بھی آیا کرتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو بہت چاہتے تھے' ان کا بے حد خیال رکھتے۔ دوسرے بچوں سے بھی بے حد پیار کرتے' انہیں اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ گھر کے ملازمین سے محبت سے پیش آتے۔ کاریگر' کسانوں کو برابر کی عزت دیتے' اپنے ساتھ کھانا کھلاتے' اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیتے۔ گھر والوں کی ضروریات کا خیال کرتے' سب کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے۔ وہ خاندان والوں کا ایک مضبوط سہارا' ایک بڑی طاقت اور ہمیشہ سب کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ اپنی بہنوں سے ان کی محبت' سلوک' تعلیم وتربیت' پرورش مثالی تھی۔ اپنے پوتی پوتے کو بہت چاہتے' ان سے کھیلا کرتے' ان کے شور شرابے سے ہرگز جز بز نہ ہوتے۔ بھتیجے کی تعلیم وتربیت اور شادی میں ان کا خلوص اور خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہو سے بیٹی جیسا سلوک کرتے۔ بیٹے کی شادی بغیر لین دین سے کی۔ پڑوس سے ان کے بہت اچھے روابط تھے۔ پڑوسی کہتے اس بلڈنگ میں ایک دیوتا رہتا ہے۔ کسی کے ساتھ کیا بھلائی کرتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی خوشی وغم میں شریک ہوتے' دامے' درمے' سخنے ان کی مدد کے لیے کوشاں رہتے۔ بے تکلف دوستوں کی بے ریا صحبت میں بے محابا قہقہے لگاتے۔ دوستوں کی دعوت کرتے اور مہمانوں کی عزت کرتے' خود تکلیف اٹھاتے لیکن مہمانوں کو اس کا احساس تک ہونے نہیں دیتے۔ سردار جعفری بزرگوں سے احترام وعقیدت سے اور چھوٹوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ سردار جعفری دولت کی ہوس اور مادہ پرستی سے کوسوں دور تھے۔ سردار جعفری حق تلفی کرنے والوں میں نہ تھے' نہ ادب میں اور نہ ہی عام زندگی میں۔ وہ بے تکان محنت' لگن اور خلوص کے ساتھ اپنے فرائض نبھاتے۔ وہ دھن کے پکے تھے۔ وہ فعال' متحرک اور مستعد انسان تھے۔ ان کی زندگی عملی جدوجہد کا بے مثال نمونہ تھی۔ وہ انسانی ہاتھوں کی عظمت کے قائل تھے کیونکہ وہ خام پتھر سے آئینہ بنانے کا ہنر جانتا ہے۔

سردار جعفری ایک وسیع القلب' عالی ظرف' وضع دار اور حقیقت شناس انسان تھے۔ دوسروں کی خوبیوں پر ہمت افزائی کرتے' خوش ہوتے' ہمعصر شعرا کی خوبیوں کو اجاگر کرتے۔ ان کا انداز گفتگو بڑا شائستہ ہوتا تھا۔ وہ صاف گو تھے اور صاف گوئی

کوپسند کرتے تھے۔لگی لپٹی رکھنے کے عادی تھے نہ سننے کے۔

سردار جعفری کو نہ کسی کی دل شکنی پسند ہے نہ کسی کی تضحیک۔کہنے والا بڑا ہو یا چھوٹا' وہ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتے۔ سردار کو ذرا بھی غرور نہ تھا۔انہوں نے مسائل کو انا کا مسئلہ کبھی نہیں بنایا۔وہ علمیت جتانے سے کوسوں دور تھے۔وہ منکسر المزاج' نرم خو اور سادہ دل انسان تھے۔سمیناروں اور جلسوں میں سردار مدعو ہوتے مگر انہوں نے منتظمین جلسہ کو کبھی لانے اور لے جانے کی زحمت نہیں دی۔سردار جعفری نے کبھی کسی کو اپنے سے کم تر نہیں سمجھا' کسی کو کبھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی کسی کو اپنے سے چھوٹا سمجھا۔انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس رہتا۔سردار جعفری وقت اور وعدے کے بہت پکے تھے۔سردار جعفری جھوٹ' دھوکا اور منافقت سے کوسوں دور تھے۔وہ بے جا تکلفات اور تصنع آمیز اخلاق سے گریز کرتے۔ان کی شخصیت کدورت سے پاک تھی۔سردار جعفری شگفتہ مزاج' بذلہ سنج اور ہنس مکھ قسم کے آدمی تھے۔وہ صاحب بصیرت تھے۔ان کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ حوادث تاریخ کے سامنے سپر انداز ہوتی۔وہ مستحکم ذہن رکھتے تھے۔جیل کی زندگی میں بھی وہ پرسکون اور باہمت رہتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آدرش کی خاطر ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کیا۔انہوں نے نظریے پر اپنی ذات کو کبھی ترجیح نہ دی اور نہ اپنے نام کا ڈنکا بجوانے کے عمل میں ملوث ہوئے۔وہ اپنے خیالات' اپنے خواب اپنے بعد کی نسلوں پر مسلط نہیں کرتے بلکہ آنے والے والی نسلوں کو حسین خواب دیکھنے کی ترغیب دیتے۔وہ درویشانہ اور طالب علمانہ زندگی بسر کرتے اور اپنے چھوٹوں سے بھی جہاں علمی مشورے کی ضرورت ہوتی' ان سے مشورہ کرنے میں کبھی جھجھک محسوس نہ کرتے۔

سردار جعفری نے ہمیشہ امید و یقین کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔انہیں یقین تھا کہ ظالموں کا بیڑا ضرور غرق ہو کر رہے گا اور مظلوموں' محکوموں اور ستم رسیدہ لوگوں کو ایک نہ ایک دن آزادی' خوشحالی' عزت و عافیت کے دن دیکھنا نصیب ہوں گے۔قنوطیت کے تاریک ایوانوں میں رجائی فکر کے دیے جلانے والی شخصیت کے مالک تھے۔وہ ہمت کے پہاڑ تھے اور ہر حال میں دوسروں کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔سردار جعفری اگر اختلاف بھی کرتے تو اس خوبی سے کہ دل شکنی نہ ہو۔بین السطور کسی پر طنز یا کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش ان کے ہاں سرے سے نہ تھی۔وہ کبھی جلال یا اشتعال میں نہیں آئے بلکہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہی ہر معاملے کو سلجھایا۔سردار جعفری کی تقریر علم و معانی' حقائق و دلائل سے بھرپور ہوتی۔سردار جعفری ایک Legend تھے۔سردار جعفری کی ذات میں فکر' علم اور عمل کا حسین امتزاج تھا۔وہ علم کے سمندر' بحر ذخار تھے۔ادب' فلسفہ' منطق' سیاست' معاشیات' سماجیات' تاریخ' تصوف اور مذہب جس موضع پر بولنے پر اترتے ایسا لگتا جیسے وہی موضوع ان کا خاص موضوع تھا۔انہیں مطالعہ کا اس قدر شوق تھا' جہاں کہیں کچھ پڑھنے کا موقع مل جاتا' وہ وقت ضائع نہ کرتے اور مطالعہ کرتے۔سردار جعفری کی شخصیت میں توازن تھا۔سردار جعفری ذمہ دار قسم کے آدمی تھے۔ان سے کسی ایسے موضوع پر تقریر کرنے کو کہا جاتا جس پر ان کا مطالعہ نہیں ہوتا تو وہ اس کا برملا اعتراف کرتے اور معذرت چاہ لیتے۔سردار جعفری جونیر ادیبوں اور شاعروں کو اولیت دیا کرتے جس سے وہ حوصلہ پاتے اور آگے بڑھنے میں تیزی پیدا کرتے۔ان کے گھر میں کتابوں کی ایسی قدر و منزلت تھی جو بعض کتب خانوں میں بھی نہیں ملتی۔اردو زبان' شعر و ادب کی ناقدردانی کہیں دیکھنے کو مل جاتی تو انہیں بہت تکلیف ہوتی۔

سردار جعفری تمام انسانوں کو ایک اکائی اور ساری دنیا کو ایک شہر سمجھتے تھے۔انہوں نے تمام دانشوروں' elite 'ادیبوں' امراء اور عوام اور آنے والی نسل سے اپیل کی تھی کہ فسطائیت کے خلاف کمر بستہ رہیں' انسانیت کی شمع فروزاں بجھنے نہ پائے اور یہ کہ انسان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو روکا جائے۔سردار جعفری تحریکی آدمی تھے۔اردو' ہندی' روسی اور دوسری بہت سی زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں سے ان کے تعلقات و مراسم تھے۔ان کے علاوہ اساتذہ' صحافی' موسیقی و مصوری کے آرٹسٹ سے بھی ان کے مراسم تھے۔انہوں نے ہندوستان کے کئی شہروں اور گانوؤں کا سفر بھی کیا۔غریبوں' دکھ کے ماروں' مریضوں' بے روزگاروں کے بُرے وقتوں میں کام آنے کا جذبہ خدا نے ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔وہ حتی المقدور پہل کرتے اور ختم ہونے پر اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی انہیں دلواتے۔اپنی تہی دستی کے باوجود اپنے وسائل سے کوئی نہ کوئی صورت نکال کر ان مجبوروں کی مدد کرتے اور اس بات کی احتیاط کرتے کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہو۔غیبت' انتقام یا کسی کو نقصان پہنچانے جیسے گندے جذبوں سے ان کا دل پاک تھا۔ان کے سامنے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں ہتک آمیز بات کرتا تو یہ اس گفتگو کو بالکل برداشت نہ کرتے اور اس کو اسی جگہ روک دیتے۔ادب ہو کہ زندگی' انہوں نے کبھی بھید بھاؤ اور علمی و ادبی تعصب سے کام نہیں لیا۔سردار جعفری نے ساری زندگی سچائی کے لیے وقف کی تھی وہ ہمیشہ حق کی آواز بلند کرتے رہے اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ان کی گفتگو میں سلیقہ تھا۔اس میں نہ چڑ چڑا پن تھا نہ کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن' ایک تحریک اور ایک کارواں کی حیثیت رکھتے تھے۔سردار جعفری کی شخصیت اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے' ایک داستان اور ایک دبستان ہے۔

سردار جعفری مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے۔وہ دوسروں کی سازشوں سے بے نیاز' ایفائے عہد میں مثالی' منافقین کو جانتے ہوئے بھی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے اور بغیر نام و نمود کے ان کی ضرورتیں پوری کرتے۔نوجوانی سے ہی وہ اشتراکی نظریہ فکر سے متاثر تھے۔وہ مارکسی نظریہ کے حامل تھے۔سوشلزم' مساوات اور امن کو زندگی بھر وہ اپنی فکر کے لیے مشعل راہ بنائے رہے۔سردار جعفری نظریاتی اور عملی دونوں سطح پر سچے ترقی پسند تھے۔سردار جعفری ایک وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف انسان تھے۔وہ بے پناہ صلاحیتوں کے حامل ادیب تھے۔سردار جعفری نے اپنے آپ کو کسی ایک میدان تک محدود نہ کیا۔صحافت' ادب' افسانہ' ڈرامہ' تنقید' تحقیق' خطابت' شاعری' سیاست' اشتراکیت' فلم' ٹی وی' ریڈیو' اسٹیج' مکالمے' غنائیے' خودنوشت' سوانح' رپورتاژ' تنقیدی و تحقیقی مضامین' تبصرے' اداریے سے لے کر کالم تک ہر نوع کے موضوعات پر ہر میدان میں انہوں نے فکر و فن کی جولانیاں دکھائیں۔سردار جعفری کی شخصیت میں کئی شخصیتیں تھیں۔وہ ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں شاعر' ذی فہم ادیب' صاحب نظر و بالغ نظر نقاد' اعلیٰ درجے کے نثر نگار' انشا پرداز' ماہر اقبالیات' محقق' ایک پر امن انقلابی' بے باک صحافی' سیاست داں' مترجم تھے۔وہ ایک عظیم جینیس تھے۔ادب' تاریخ' تہذیب' ثقافت' سیاست کے گہرے رمز شناس' میڈیا کے جانکار' فارسی اور عالمی ادبیات کے عمدہ نباض' لیڈر شپ کی صلاحیتوں کے حامل' کلاسیکی ادب کے تدوین کار اور ان سب سے بڑھ کر وہ ایک بہت سچے' کھرے' ہمدرد' انسان دوست تھے۔بیسویں صدی کی یہ ممتاز شخصیت انسان نوازی' شرافت' متانت' تواضع' انکساری اور علم دوستی جیسے صفات سے متصف تھی۔انہوں نے اپنی لگن اور محنت سے بلند ترین مقام حاصل کیا۔

وہ مجاہدانہ زندگی گزارنے والے تھے۔

زندگی کے ساتھ والہانہ وابستگی، مظلوم انسانوں کے ساتھ دلی ہمدردی، انسانیت کو روشن مستقبل کی طرف لے جانے کا خواب، خواب کو تعبیر کی منزل کی طرف پہنچانے کا عرفان، ایک واضح نظریہ حیات، تخلیقی جوہر اور بات کے فنکارانہ اظہار پر قدرت۔ یہ تمام چیزیں سردار کے پاس تھیں۔ سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن تھے لیکن ان کا شاعرانہ منصب و مقام ترقی پسند تحریک کے حدود سے ماورا ہے۔ ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہندوستان کی متعدد زبانوں کے علاوہ یوروپی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اردو ادب کے علاوہ ہندی، انگریزی، روسی، ترکی اور فارسی ادب کا بھی انہیں گہرا مطالعہ تھا۔ ان کا شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اقبال کے بعد سردار نے شاعری کو دانشوری بنا دیا اور اسے عالمی شاعری کے مقابلے لا کھڑا کیا۔ سردار جعفری نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ علم کے حصول اور بنی نوع کی بہتری اور فلاح کی جستجو اور جدوجہد میں گزارا۔ وہ عالمی امن کے سپہ سالاروں میں تھے۔ وہ ایک اعلیٰ کردار کے حامل انسان تھے جن کا پیغام صرف محبت تھا۔ انہیں ہندوستانی اور بیرونی ممالک کے مشاہیر ادب اور سیاست سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ عالمی علوم کا خزینہ اور علم و ادب کا دفینہ تھے۔

سردار جعفری انسانیت کے شیدائی تھے۔ وہ تمام انسانوں کے دل کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو امن و محبت کے فروغ کے لیے وقف کر لیا تھا۔ انہوں نے ادب میں اختلاف کو احترام بخشا اور ادبی تبادلہ خیال کو عام کیا۔ اپنی بات کہنے سے زیادہ انہوں نے دوسروں کی بات سننے کا مزاج عام کیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ اردو زبان و ادب اور عصری دانشوروں کے مینارۂ نور تھے جس کی روشنی میں متعدد تخلیق کاروں نے اپنا تخلیقی سفر طے کیا۔

جب تک دنیا کے کسی بھی ملک میں غریبی، بے روزگاری، ظلم و ستم، نفرت، تفرقہ پروری اور کسی بھی قسم کا جابرانہ و استحصالی نظام قائم رہے گا، سردار کی شاعری اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا پیام دیتی رہے گی۔ انسانی حرمت و شرافت، سماجی عدل و انصاف، عالمی امن اور شانتی اور معاشی مساوات کے مسائل جب تک زندہ ہیں، سردار کی شاعری زندہ رہے گی۔ جب تک ظالموں اور استحصالی قوتوں کے خلاف انسان صدائے احتجاج بلند کرتا رہے گا، سردار جعفری کی شاعری کی معنویت قائم رہے گی۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ عوام کے بجھتے ہوئے دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن کیے۔ وہ نظریہ ساز اور روح عصر کے شاعر تھے۔ وقت کے ساتھ حکومتوں نے بھی ان کی ذہانت اور فن کی عظمت کا لوہا مان لیا تھا۔ انہیں بہت سے انعامات و اعزازات ملے جیسے سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، سجاد ظہیر ایوارڈ، اتر پردیش اکادمی ایوارڈ، اقبال میڈل، مخدوم ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، کمارن آسن ایوارڈ، خصوصی تمغہ ماسکو، ہند روس دوستی میڈل، فیض احمد فیض ایوارڈ، بین الاقوامی اردو ایوارڈ، گنگا دھر مہر ایوارڈ، مولانا آزاد ایوارڈ، میر ایوارڈ، ظ۔ انصاری ایوارڈ، مولانا مظہر الحق ایوارڈ، ہارورڈ یونیورسٹی گولڈ میڈل، اقبال سمان، سنت گیانیشور ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ، اودھ سمان، خصوصی ایمریٹس فیلوشپ ڈپارٹمنٹ آف کلچر حکومت ہند وغیرہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسی نے انہیں ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔

فیض احمد فیض کے بعد سردار جعفری اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ایک بڑے نظم نگار کی حیثیت سے وہ اردو کی

ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ان کا شمار بیسویں صدی کے شہرت کے حامل تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔علی سردار جعفری گہرے مطالعے' علوم پر نظر' فن پر گرفت' کلاسیکل ادب کے غائر عالم' ادیب و شاعر اور ایسے مفکر و دانشور ہیں جو کسی قوم اور معاشرے میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

سردار جعفری جیسا بلند پایہ ادیب' عظیم شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے جس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔اردو تنقید' تدوین' صحافت' مجاہدین آزادی' اردو کے عالمی شہرت یافتہ شعراء' ادبا' دانشوروں' جینیس اور انسان دوست شخصیتوں اور ان کے عظیم کارناموں کی جب جب تاریخ لکھی جاتی رہے گی' وہ تواریخ علی سردار جعفری کے ذکر کے بغیر ادھوری سمجھی جائیں گی۔

راقم الحروف نے علی سردار جعفری جیسی ہمہ جہت شخصیت کے تین پہلوؤں شاعری' تنقید اور صحافتی خدمات کو حتی المقدور سمیٹنے اور ان کا جائزہ پیش کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے' یہ منزل نہیں' نشان منزل ہے۔ایک چراغ جلایا ہے' چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔سردار جعفری جیسے Stalwart عالم' دانشور' مدبر اور انسان دوست کی شخصیت اور عظیم کارناموں پر عالمانہ مقالے لکھے جاتے رہیں گے۔روشنی پھیلتی رہے گی۔

☆☆☆

’’ ببلیوگرافی ‘‘

ببلیو گرافی

سلسلہ	مصنف	کتاب	شہر	ناشر	سال
1	پروفیسر آل احمد سرور	مسرت سے بصیرت تک	دہلی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	1994
2	پروفیسر آل احمد سرور	پہچان اور پرکھ	دہلی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	1990
3	پروفیسر آل احمد سرور	اقبال اور مغرب	کشمیر	اقبال انسٹی ٹیوٹ	-
4	ڈاکٹر ابدار رحمانی	تلخ و شیریں	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2005
5	ڈاکٹر ابن کنول	تنقید و تحسین (مجموعۂ مضامین)	دہلی	کتابی دنیا	2006
6	ابوالفیض سحر	تناظر اور تجزیے	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	1989
7	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	معاصر تنقیدی رویے	علی گڑھ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2007
8	پروفیسر ابوالکلام قاسمی (مرتب)	شاعری کی تنقید	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	2001
9	سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	لکھنو	ادارۂ فروغ اردو	1961
10	اختر حسین رائے پوری	ادب اور انقلاب	ممبئی	نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ	
11	محمد اسداللہ	خطوط ہمہ رنگ	دہلی	نگارشات	2005
12	اسلم عمادی	(ادبی گفتگو کا انتخاب) نثری تحریروں کا انتخاب	-	مرزا فرحت اللہ بیگ اکیڈیمی	2007
13	ڈاکٹر اشفاق حسین	اردو شاعری میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی)	الہ آباد	شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی	1986
14	اصغر عباس (مرتب)	سردار جعفری: شخصیت اور فن	علی گڑھ	مسلم یونیورسٹی	2002
15	ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	2004
16	ای اے حیدری	ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج و میلان	لکھنو	احتشام عباس حیدری	1987

17	ڈاکٹر ایس ام زیڈ گوہر	اردو میں رپورتاژ نگاری کا فن اور ارتقا	مظفر پور	سرشٹی پبلی کیشنز	-
18	ایس کے بھٹناگر (مرتب)	گل دستہ			
19	ڈاکٹر ایوب مرزا	فیض نامہ	پٹنہ	خدا بخش اورینٹل لائبریری	2002
20	برج پریمی	ذوق نظر (تحقیق وتنقید)	جموں	رچنا پبلی کیشنز	2000
21	ڈاکٹر تاج پیامی	شعور تنقید	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2004
22	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر اور دیگر مشمولات	دہلی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس	2004
23	خالد علوی	غزل کے جدید رجحانات	دہلی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس	1996
24	ڈاکٹر خلیق انجم	سردار جعفری کے خطوط	دہلی	انجمن ترقی اردو ہند	2001
25	ڈاکٹر درخشاں تاجور	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ	گورکھپور	مصنف	1991
26	ڈاکٹر نیر جہاں	تنقیحات	دہلی	تخلیق کار پبلشرز	2005
27	ڈاکٹر رفعت النساء بیگم	طرز نگارش	حیدرآباد	ادارہ شعر وحکمت	1987
28	رفعت سروش	بمبئی کی بزم آرائیاں (خودنوشت) 1945 تا 1958	نئی دہلی	نورنگ کتاب گھر	1986
29	پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی	علی سردار جعفری: ایک مطالعہ	ممبئی	شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی	2002
30	ڈاکٹر روشن اختر کاظمی	اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء	دہلی	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	1984
31	ڈاکٹر ریاض احمد	ترقی پسند تحریک اور اردو ناول	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2007
32	ساحل احمد	غزل: پس منظر، پیش منظر	الہ آباد	اردو رائٹرس گلڈ	1976
33	ساقی فاروقی	ہدایت نامہ شعر: تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین 1955 تا 1994	لاہور	سنگ میل پبلی کیشنز	1995
34	سجاد ظہیر	روشنائی	نئی دہلی	سیما پبلی کیشنز	1985
35	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	ادبی ڈائری۔ جلد اول	دہلی	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	2005
36	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	اردو شاعری میں اشاریت	دہلی	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	1983

37	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	غالب کے چند نقاد	دہلی	غالب انسٹی ٹیوٹ	1995
38	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	ادب میں ابہام اور اس کے مسائل	حیدرآباد	نیشنل بک ڈپو	1974
39	سید عاشور کاظمی	سخن گسترانہ بات	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	1992
40	پروفیسر سید محمد عقیل رضوی	سماجی تنقید اور تنقیدی عمل	الہ آباد	انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز	1980
41	پروفیسر سید محمد عقیل رضوی	لندن اُولندن: ایک سیاحت نامہ' ایک رپورتاژ	الہ آباد	مصنف	1987
42	پروفیسر سید محمود الحسن	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر (جدید تنقیدی رجحانات کی روشنی میں)	لکھنو	فروغ اردو	1968
43	پروفیسر شارب ردولوی	تنقیدی مطالعے	لکھنو	نصرت پبلشرز	1972
44	پروفیسر شارب ردولوی	تنقیدی مباحث	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	1995
45	پروفیسر شارب ردولوی	تنقیدی مباحث	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	1995
46	ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی	تنقیدی افکار	نئی دہلی	قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو	2004
47	ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی	فاروقی کے تبصرے			
48	پروفیسر شمیم حنفی/مظہر مہدی (مرتبین)	آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)	دہلی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	2005
49	شاہد ماہلی (مرتب)	کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں	دہلی	معیار پبلی کیشنز	1992
50	شہزاد انجم (مرتب)	آزادی کے بعد اردو شاعری (مقالات ومباحث)	دہلی	ساہتیہ اکیڈیمی	2002
51	ڈاکٹر صادق	ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ	دہلی	اردو مجلس	1981
52	طارق شاہین/عزیز عرفان	''لمحے لمحے''۔ راحت اندوری: شاعر اور شخص	خضر آباد کھجرانہ اندور	الف پبلی کیشنز	2002
53	ظفر امام	مارکسزم: ایک مطالعہ	نئی دہلی	مسلمانوں کا سوشلسٹ	1971
54	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	ادب میں جمالیاتی اقدار: ایک مطالعہ	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	1979

56	ڈاکٹر عالم خوندمیری/ ڈاکٹر مغنی تبسم (مرتبین)	فکر اقبال۔مقالات۔ حیدرآباد سمینار	حیدرآباد	۔	1977
57	پروفیسر عبدالستار دلوی (مرتب)	علی سردار جعفری (شخص شاعر اور ادیب)	پونے	حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ	2002
58	پروفیسر عبدالستار دلوی (مرتب)	کرشن چندر: شخص اور ادیب	ممبئی	شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی	1993
59	عبدالشکور	تنقیدی سرمایہ: حصہ دوم	لکھنو	ادارہ فروغ اردو	1956
60	عبدالعزیز	اردو میں رپورتاژ نگاری	دہلی	مکتبہ شاہراہ	1977
61	ڈاکٹر عبدالقیوم (مرتب)	تنقیدی نقوش	دہلی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس	1972
62	عبدالقیوم ابدالی	بنے بھائی	آسن سول بہار	محرک پبلی کیشنز	1986
63	عبدالسلام خورشید	فن صحافت	لاہور	مکتبہ کاروان	1966
64	ڈاکٹر عبدالمغنی	تشکیل جدید (تنقیدی مقالات)	پٹنہ	۔	1976
65	ڈاکٹر عرشیہ جبیں عزیز احمد	شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری۔ترقی پسند ادب	حیدرآباد دہلی	مصنفہ چمن بک ڈپو	2005 1996
66	ڈاکٹر عفت آرا شمسی	خلیل الرحمٰن اعظمی	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	1996
67	عقیل احمد صدیقی	جدید اردو نظم: نظریہ و عمل 1936 تا 1970	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	1989
68	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	یاترا (رپورتاژ)	لندن	انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر	1996
69	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	تین ترقی پسند شاعر (سردار، مجروح، کیفی)	الہ آباد	ادارہ نیا سفر	2005
70	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	جڑیں اور کونپلیں (دو رپورتاژ)	الہ آباد	مصنف	1994
71	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	نئی تنقید، نئے اقدار نظر (مضامین)	الہ آباد	مصنف	1999
72	علی سردار جعفری	پرواز	حیدرآباد	اشاعت گھر	1944
73	علی سردار جعفری	جمہور	ممبئی	کتب پبلشرز	1946
74	علی سردار جعفری	نئی دنیا کو سلام	ممبئی	کتب پبلشرز	1946
75	علی سردار جعفری	مخدوم محی الدین	ممبئی	کتب پبلشرز	1948

76	علی سردار جعفری	خون کی لکیر	ممبئی	نوہند پبلشرز	1949
77	علی سردار جعفری	امن کا ستارہ	ممبئی	کتب پبلشرز	1950
78	علی سردار جعفری	ایشیا جاگ اٹھا	دہلی	مکتبہ شاہراہ	1950
79	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب	علی گڑھ	انجمن ترقی اردو ہند	1951
80	علی سردار جعفری	پتھر کی دیوار	دہلی	مکتبہ شاہراہ	1953
81	علی سردار جعفری	لکھنو کی پانچ راتیں	دہلی	مکتبہ جامعہ	1964
82	علی سردار جعفری	ایک خواب اور	ممبئی	حلقۂ ادب	1965
83	علی سردار جعفری	پیراہن شرر	ممبئی	حلقۂ ادب	1966
84	علی سردار جعفری	پیغمبران سخن		ایڈشاٹ پبلی کیشنز	1987
85	علی سردار جعفری	اقبال شناسی	دہلی	مکتبہ جامعہ	1976
86	علی سردار جعفری	لہو پکارتا ہے	دہلی	مکتبہ جامعہ	2001
87	علی سردار جعفری	ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	دہلی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی	1987
88	علی سردار جعفری	سرمایۂ سخن	دہلی	مکتبہ جامعہ	2001
89	علی سردار جعفری	کلیات علی سردار جعفری جلد اول (مرتبہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی)	دہلی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	2004
90	علی سردار جعفری	کلیات علی سردار جعفری جلد اول (مرتبہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی)	دہلی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	2005
91	ڈاکٹر عمر رضا	علی سردار جعفری	دہلی	کتابی دنیا	2008
92	عمیق حنفی	شعلے کی شناخت	لکھنو	نصرت پبلشرز	–
93	ڈاکٹر فاطمہ تنویر	اردو شاعری میں انسان دوستی	لکھنو	مصنفہ	1994
94	فدا المصطفٰے ندوی	احتشام حسین: حیات و شخصیت اور کارنامے	ناگپور	مصنف	1985
95	پروفیسر فصیح احمد صدیقی	اردو یک بابی ڈراما' جنگ آزادی ہند 1857 تا حصول آزادیٔ ہند 1947: تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ	ممبئی	ادارہ ادب اردو	–

96	فصیح احمد صدیقی/سید مجاہد حسین حسینی	انوار ادب	ممبئی	مکتبہ جامعہ	1977
97	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو شاعری کا فنی ارتقا	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2008
98	قاضی جلیل عباسی	کیا دن تھے	دہلی	مصنف	1985
99	پروفیسر قمر رئیس (مرتب) پروفیسر قمر رئیس/سید عاشور کاظمی	تعبیر و تحلیل (مضامین کا مجموعہ) ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر	دہلی دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نیا سفر پبلی کیشنز	1996 1987
100	پروفیسر قمر رئیس (مرتب)	ترقی پسند ادب کے معمار جلد اول	دہلی	نیا سفر پبلی کیشنز	2006
101	کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	لکھنو	ادارہ فروغ اردو	1981
102	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر (اہتمام و انتخاب پروفیسر وارث علوی)	علی سردار جعفری: ایک مطالعہ	گاندھی نگر	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی	2001
103	پروفیسر گوپی چند نارنگ	جدیدیت کے بعد	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2005
104	پروفیسر گوپی چند نارنگ	(ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری)	دہلی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	2003
105	پروفیسر گوپی چند نارنگ (مرتب)	انیس شناسی	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2000
106	پروفیسر گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2000
107	محسن حیدرآبادی	مرقع شعرائے اردو: مصوری، تحریر و تدوین	حیدرآباد	-	2007
108	پروفیسر محمد انور الدین	فکر و نظر	حیدرآباد	اردو ریسرچ سنٹر	1995
109	پروفیسر محمد بیگ احساس	کرشن چندر: شخصیت اور فن	حیدرآباد	مصنف	1999
110	ڈاکٹر محمد ذاکر	آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب 1947 تا 1962: رجحانات اور تجزیہ	نئی دہلی	مکتبہ جامعہ	1981
111	حکیم محمد سعید	ماہ و روز: روزنامچہ سفر روس	کراچی، پاکستان	ہمدرد اکیڈمی	1980

112	ڈاکٹرمحمد ضیاءالدین انصاری (مرتب)	آل احمد سرور کے تبصرے	پٹنہ	خدا بخش لائبریری	2003
113	معین الدین حسن علوی کاکوروی	ادبی نگارشات	لکھنو	مصنف	1985
114	ڈاکٹرمحمد فیروز (مرتب)	سردار جعفری کی نادر تحریریں	دہلی	ساقی بک ڈپو	2004
115	ڈاکٹرممتاز الحق	اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2004
116	نادیہ اتم	اردو شاعری میں عورت کا تصور	لکھنو	مصنفہ	1991
117	نسیم عباسی (مرتب)	نقد فیض	دہلی	بک سروس	1978
118	ڈاکٹرنصرت چودھری	فیض کی شاعری (ایک مطالعہ)	کشمیر	شان پبلشنگ ہاؤس	1985
119	ڈاکٹرنیر جہاں	تنقیحات	دہلی	تخلیق کار پبلشرز	2005
120	وارث علوی	سرزنش خار	احمد آباد	مصنف	2005
121	ڈاکٹروسیم بیگم	آزادی کے بعد اردو غزل: تہذیبی مضمرات ادبی تحریکات اور اہم شعراء	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2009
122	پروفیسر وہاب اشرفی	قصہ بے سمت زندگی کا	دہلی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2008
123	ہما جمال (رضوی (مرتب)	رام لعل کے شب و روز 1953 سے: ادبی ڈائری کے اوراق	لکھنو	مرتب	1996
124	ہنس راج رہبر	ترقی پسند ادب: ایک جائزہ	دہلی	آزاد کتاب گھر	1967
125	پروفیسر یوسف سرمست	ادب نقد حیات	حیدرآباد	آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل	1993
126	ڈاکٹر یعقوب یاور	ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	علی گڑھ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	1997

☆☆☆

غیر مطبوعہ:

(1) کپل شرما، علی سردار جعفری بحیثیت نثر نگار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، وکرم یونیورسٹی، اجین (مدھیہ پردیش)، 2007

(2) محمد اجمل خان، علی سردار جعفری کی نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، 2010

☆☆☆

اردو رسائل:

1۔ ماہنامہ آج کل، دہلی

جنوری 1996، فروری 1996؛ مارچ 1996؛ اپریل 1996؛ اپریل 1998؛ دسمبر 1999؛ اگست 2000؛ اکتوبر 2000؛ اکتوبر 2001؛ جون 2002؛ مئی 2003؛ اگست 2003؛ اور مولانا آزاد نمبر

2۔ اثبات، ممبئی جلد 2، شمارہ 7

3۔ سہ ماہی اذکار، بنگلور نمبر 14

4۔ سہ ماہی اردو ادب، جولائی، اگست، ستمبر 2000، اپریل مئی جون 2007

5۔ اردو بک ریویو، ستمبر، اکتوبر 2000

6۔ اردو دنیا، دہلی، جولائی تا ستمبر 1996، جنوری تا مارچ 1998، جولائی تا ستمبر 1998

7۔ اعتراف، ممبئی، اپریل 2005

8۔ افکار، کراچی۔ منٹو نمبر 1945ء، سردار جعفری نمبر، نومبر، دسمبر 1991، منتخب منظومات نمبر جلد 50، شمارہ 300۔ مارچ 1995،

9۔ ایوان اردو، دہلی، علی سردار جعفری نمبر ستمبر 2000

10۔ پونم، حیدرآباد، اگست 1977، اگست 1980

11۔ پیام اردو، حیدرآباد۔ سالنامہ مئی 2001

12۔ ترسیل، جنوری جون 1990، جنوری تا جون 1998

13۔ تمثیل نو، جنوری تا جون 2006

14۔جامعہ، دہلی، اکتوبر 1980ء، جولائی تا ستمبر 1996؛ اپریل تا جون 1998؛ جنوری تا مارچ 2000؛
اپریل تا جون 2000؛ جنوری تا مارچ 2002

15۔جرنل، پٹنہ، 1995؛ ستمبر 1999؛ ستمبر 2000؛ جون 2001

16۔ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، ستمبر 2007

17۔ماہنامہ شاداب، حیدرآباد، مارچ 1992

18۔صبا، حیدرآباد، دسمبر 1956؛ فروری مارچ 1966

19۔شاعر، ممبئی، نومبر 1993؛ مارچ 1998؛ ستمبر 2000؛ فروری 2001؛ جنوری 2010؛
مارچ 2010؛ جولائی 2010

20۔شاہراہ، دہلی، فروری مارچ 1952ء، اکتوبر 1952؛ ستمبر اکتوبر 1954

21۔شعائیں، بنگلور، مئی 2010

22۔شعر و حکمت، حیدرآباد، دور سوم، کتاب 3، 4

23۔عالمی اردو ادب، سردار جعفری نمبر 2001

24۔علی گڑھ میگزین، جلد 14، نمبر 3، جولائی 1936

25۔فکر و آگہی، رفعت سروش نمبر

26۔سہ ماہی فکر و تحقیق، اکتوبر تا دسمبر 2001ء، اکتوبر تا دسمبر 2002ء، اپریل تا جون 2004ء، اپریل مئی جون 2007

27۔فن اور شخصیت، کملیشور نمبر: جاں نثار اختر نمبر مارچ 1976؛ غزل نمبر

28۔کامریڈ، 6/جون 1913

29۔کتاب، لکھنو، اپریل مئی 1974

30۔کتاب نما، دہلی، جولائی 1986؛ نومبر 1990؛ اپریل 1993؛ فروری 1998؛ مارچ 1998؛
جولائی 1998؛ جون 2002؛ جنوری 2003؛ مارچ 2003 اپریل 2003۔

31۔سہ ماہی گفتگو، ممبئی، فروری 1967؛ فروری 1968 تا نومبر 1968، مارچ و جون 1975؛
ستمبر 1975 تا جون 1976؛ ستمبر 1976؛ دسمبر 1976؛ مارچ 1977؛ ستمبر 1977،
ستمبر 1977؛ مارچ تا ستمبر 1978؛ دسمبر 1978 تا مارچ 1980

32۔نیا ادب، اپریل 1939ء، اگست ستمبر 1939ء، اکتوبر 1940، نومبر 1940، دسمبر 1940،
جنوری فروری 1941

33۔نیا دور، لکھنو، مارچ اپریل 1993، دسمبر 2009

34۔نیا سفر، دہلی، جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، جون 1993، علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری نمبر

جولائی تا دسمبر 2000ء جولائی تا دسمبر 2001

35۔سہ ماہی نے ورق ممبئی، 10؛12 جولائی تا ستمبر 2001؛فروری تا جولائی 2004

36۔نخلستان، جولائی تا دسمبر 2000

37۔نقوش، غالب نمبر 3ء شمارہ 116ء 1971

38۔نگار، اگست 1951

39۔نوائے ادب ممبئی، اپریل 1986؛ اکتوبر تا دسمبر 2000؛ جولائی تا ستمبر 2002

40۔مریخ، پٹنہ، ستمبر، اکتوبر 2000

41۔معارف اعظم گڑھ، اگست 2000

42۔ماہنامہ ہمارا ادب، بھوپال، ستمبر 2000

43۔ہماری زبان، دہلی، 8رمئی 1976ء علی سردار جعفری نمبر یکم تا 21ر اکتوبر 2000

☆☆☆